رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"مَنْ يَقُلْ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"

"جس نے میری طرف وہ بات منسوب کی جو میں نے نہیں کہی ہے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے"

(بخاری: ۱۰۹)

موضوع اور منکر روایات

ڈاکٹر سید سعید احسن عابدی

تقدیم

ڈاکٹر شعیب نگرامی

مكتبة بيت السلام - الرياض

سلسلہ: یہ حدیث نہیں ہے (۲)

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"مَنْ يَقُلْ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"

"جس نے میری طرف وہ بات منسوب کی جو میں نے نہیں کہی ہے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے" [بخاری:۱۰۹]

موضوع اور منکر روایات

حصّہ دوم

ڈاکٹر سیّد سعید احسن عابدی

تقدیم

ڈاکٹر شعیب نگرامی

ناشر

مکتبة بیت السلام - الریاض

فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
عابدي، سيّد سعيد أحسن
الروايات الموضوعة والمنكرة- الجزء الثاني./ سيّد سعيد أحسن عابدي.- الرياض، ١٤٢٩هـ
٥٢٨ ص؛ ١٧ × ٢٤ سم
ردمك: ٣ - ٠٩٤٧ - ٠٠ - ٦٠٣- ٩٧٨
(النص باللغة الأوردية)
١- الحديث الضعيف ٢- الحديث الموضوع أ- العنوان
ديوي ٦, ٢٣٢ ١٤٢٩/٤٢١٤

رقم الإيداع: ١٤٢٩/٤٢١٤
ردمك: ٣ - ٠٩٤٧ - ٠٠ - ٦٠٣- ٩٧٨

باراوّل
1429ھ - 2008ء

ناشروتقسیم کار
مکتبہ بیت السلام
پوسٹ بکس: 16737 الریاض:11474 سعودی عرب
فون:4460129 فیکس:4462919
موبائل: 0542666646-0505440147

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

کتاب ''موضوع و منکر روایات'' جلد دوئم میرے انتہائی عزیز دوست ڈاکٹر سید سعید احسن عابد کی صدر شعبہ اردو جدہ ریڈیو کی احادیث مطہرہ صلی اللہ علی صاحبہا کے دفاع میں اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے، اس کتاب پر خود ڈاکٹر عابد کا اپنا انتہائی عالمانہ اور محققانہ مقدمہ ہے جس کے بعد کتاب کا تعارف کرانے کی قطعی ضرورت نہ تھی لیکن بھلا ہو کتاب کے ناشر حافظ عابد الٰہی سلمہ ڈائریکٹر بیت السلام ریاض کا جو کسی کے بہکاوے میں آکر میرے نا اہلی کے باوجود کتاب کا تعارف کرانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی۔ حافظ عابد سلمہ مشہور محقق اور عالم دین علامہ احسان الٰہی مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں جو میرے چھوٹے بھائی پروفیسر یونس نگرائی مرحوم کے مدینہ یونیورسٹی میں ہم سبق تھے، قصبہ نگرام لکھنؤ اور مرکز علم وادب لاہور کے مابین اس مستحکم علمی رشتہ کے علاوہ حافظ عابد سلمہ کی کتاب وسنت سے متعلق علوم کی سرپرستی اور ان کی نشر واشاعت کے پیش نظر یہ سطریں تحریر کی جارہی ہیں۔

کتاب ''موضوع و منکر روایات'' کی انفرادیت کو سمجھنے کے لئے احادیث مطہرہ کی اہمیت اور ان کی شریعت اسلامی میں قدر ومنزلت سمجھنا انتہائی ناگزیر ہے احادیث نبوی قرآن کریم کے بعد ہماری شریعت اسلامی کا دوسرا بنیادی ماخذ ہے اور سورۃ الحشر کی آیت نمبر ے میں ان پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، احادیث مطہرہ کی اسی اہمیت کے پیش نظر امام شافعی نے لکھا ہے کہ اگر احادیث نہ ہوتیں تو ہم قرآن کریم کو سمجھ ہی نہ سکتے تھے اور امام ابن قیم کا کہنا تھا کہ جس نے احادیث کا انکار کیا تو اُسے دین کے بارے میں قطعی طور پر نہ صرف معلومات نہ ہوں گی بلکہ وہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی تکذیب کا بھی مجرم ہوگا، اور ابن حزم رحمہ اللہ رقمطراز ہیں کہ جس شخص نے یہ کہا کہ وہ قرآن کے علاوہ احادیث پر یقین نہیں رکھتا ہے وہ امت کے متفقہ فیصلے کے بموجب دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

احادیث مطہرہ ﷺ کی اس اہمیت اور قدر ومنزلت کے پیش نظر ترمذی کی حدیث نمبر

2666ابوداود کی حدیث نمبر 4105اور مسند احمد کی حدیث نمبر 130 قابل مطالعہ ہیں۔ پہلی صدی ہجری کے اواخر سے اسلامی عقائد کو مسخ کرنے کی نامراد مہم کے ضمن میں احادیث کے ساتھ دست درازی کا سلسلہ شروع ہوا اور وضع احادیث کے فتنہ نے جنم لیا اور ایسی خود ساختہ احادیث کا انبار لگ گیا جن کا مقصد صحیح احادیث کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنا اوران کے راویوں کی شخصیتوں کو مجروح کرنا تھا، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''منہاج السنۃ'' کی جلد اول میں ایک حدیث گھڑنے والے حماد بن سلمہ کا ایک قول نقل کیا ہے جس میں اس کا کہنا تھا کہ جب ہم یکجا ہوتے اور کوئی چیز ہم کو پسند آجاتی تو ہم اس پر حدیث کا لیبل لگا کر صحیح احادیث کے مجموعوں میں شامل کردیتے۔ان موضوع احادیث کے حوالے سے ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی مرحوم نے اپنی کتاب ''السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی'' میں لکھا ہے کہ تقریباً تین لاکھ ایسی گھڑی احادیث ہیں جو اس گستاخ اور فحش ادب کا نمونہ ہیں جس کی بنیاد پر یہودیوں نے اپنے انبیاء کرام کی اجتماعی اور ازدواجی زندگی کی تصویر کشی کرکے ڈالی تھی۔احادیث نبویہ کے خلاف اس ناپاک مہم کا توڑ کرنے اور ان کی حفاظت کے خاطر ہمارے محدثین رحمہم اللہ نے مختلف علوم وفنون کو مرتب کیا اور ایسے قواعد وضوابط مرتب کئے جن کے ذریعے کھرے کھوٹے اور سچ وجھوٹ کے درمیان فرق کیا جاسکے ان قواعد وضوابط میں ''اسماء الرجال'' جرح وتعدیل اور مصطلحات الحدیث خاص طور سے قابل ذکر ہیں جن کے ذریعے احادیث نبویہ میں شامل لاکھوں من گھڑت اور جھوٹی احادیث کی نشاندہی کی گئی دوسری جانب محدثین رحمہم اللہ نے احادیث نبویہ کے مجموعوں سے ان روایات اور جھوٹی ومن گھڑت خودساختہ احادیث کو نکالنے کا اہم علمی ومحققانہ کام بھی کیا۔ جناب عبدالعلیم السلفی نے ''کیا تضعیف حدیث انکار حدیث ہے؟'' ماہنامہ ''طوبیٰ'' دہلی جنوری ۲۰۰۲ء میں اپنے مضمون میں مذکورہ موضوعات پر اہم اور قابل مطالعہ کتابوں کی فہرست دی ہے۔

کتاب ''موضوع ومنکر روایات'' جو اردوداں طبقہ کے لئے لکھی گئی ہے اس کی علمی اہمیت وانفرادیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں برصغیر میں احادیث نبویہ کی تعلیم وتدریس اور ان کی نشر واشاعت پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالنا انتہائی ضروری ہے۔

برصغیر پہلی صدی ہجری ہی میں اسلام کی روشنی سے منور ہو چکا تھا اور یہ سرزمین صحابہ کرام اور تابعین رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کے بابرکت قدموں سے بھی محروم نہیں رہی، مشہور تابعی، ''ربیع بن صبیح السعدی البصری'' پہلی صدی ہجری کے آخر میں ہندوستان تشریف لائے اور وہ نواب صدیق حسن خان مرحوم کی کتاب ''ابجد العلوم'' کے بموجب برصغیر کے پہلے محدث تھے''۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آفتاب اسلام کی پہلی کرنیں برصغیر کے ساحلی علاقوں سے آگے نہ بڑھ سکیں اور طلوع اسلام کے چار سو سال بعد درہ خیبر سے ملک گیری اور جنگی صلاحیتوں سے مالا مال اسلام کے ایسے پیامبر آئے جو خود کتاب وسنت اور توحید خالص سے اچھی طرح واقف نہ تھے اور توحید خالص کا وہ دین رحمت جو تمام ادیان اور نظامہائے حیات پر غالب ہونے کے لئے آیا تھا وہ برصغیر پہنچ کر مشرکانہ عقائد کے انبار میں دب کر رہ گیا اور سبط وحی سے توحید خالص کا جو صاف وشفاف چشمہ رواں ہوگیا تھا گنگا وجمنا کی آمیزش نے اسے گدلا کردیا توحیدی عقائد شرک کی آلودگیوں میں لت پت ہوگئے۔ نیز اسلامی عقائد کو تصوف اور ویدانتی فلسفوں نے مسخ کردیا۔ ہر طرف بدعتوں کی گرم بازاری میں منطق الطیر، کلیلہ دمنہ اور انوار سہیلی نامی کتاب پڑھنے والے مسلم صوفیا نے وحدۃ الوجود کے مشرکانہ نظریہ کی نہ صرف تبلیغ کی بلکہ کتاب وسنت کی تحقیر کے بھی مرتکب ہوئے۔ ان گمراہ صوفیوں نے قبروں پر چراغاں کرنے کے فتاوی کی لفظی پرستش کرنے میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کردیں۔ سلطنت مغلیہ میں تصوف کے بینر تلے قرآن وحدیث کی تعلیمات کو مسخ کرنے کی جو نامراد کوشش کی گئی ان کی نشاندہی مجدد الف ثانی نے اپنے مکاتب میں اور ملا بدایونی نے اپنی کتاب منتخب الالباب میں کی ہے۔ دبستان مذاہب، اور تذکرہ صوفیا نامی کتابوں کے بموجب تصوف کے سلسلہ ''روشنیہ'' کے روح رواں پیر روشن میاں بایزید انصاری جنہوں نے اپنے اوپر نزول وحی کا بھی دعوی کیا تھا وہ ان روایتوں کو جو اس زمانے میں احادیث کے نام سے مشہور تھیں ان کو بنیاد بنا کر اپنے گمراہ کن صوفیانہ عقائد پیش کرتے تھے، پیر روشن نے توحید خالص مخالف اپنے صوفیانہ عقائد کا ذکر اپنی خود نوشت سوانح حیات ''حالنامہ'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے جس کا قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائبریری میں موجود ہے۔ ملا بدایونی نے اپنی کتاب ''منتخب التواریخ'' کی جلد دوئم میں

سلطنت مغلیہ کے ابتدائی عہد میں صوفیوں کی فکری آوارگی کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صوفیوں نے وحدۃ الوجود کا راگ الاپ کر ابن عربی کی تصانیف سے ایسی چیزیں لائے جن سے مذہبی وفکری آزادی کا سبق ملتا ہے اور انہوں نے آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی ایسی تاویلیں کیں کہ خود شہنشاہ اکبر حیران رہ گیا، لیکن جب زمین تپتی ہے تو بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے چنانچہ دیوی دیوتاؤں کی سرزمین پر پہلی بار توحید خالص کا علم بلند کرنے کی سعادت احمد بن عبدالاحد فاروقی سرہندی، مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کو حاصل ہوئی جنہوں نے کفر وشرک کی اندھیاری اور تصوف کے طوفان میں کتاب وسنت کی شمع روشن کی اور توحید خالص کی سربلندی کی لیے وہی طریقہ کار اپنایا جو احمد بن حنبل اور امام ابن تیمیہ رحمہما اللہ نے اپنے زمانوں میں اپنایا تھا یہاں پر مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے صاحب علم معاصر شیخ عبدالحق محدث رحمہ اللہ کا ذکر انتہائی ضروری ہے کیونکہ انہیں کی ذات سے ہندوستان میں علم حدیث کو زندگی ملی اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا عام ہوا انہوں نے علم حدیث پر کئی کتابیں لکھیں عربی میں ان کی کتاب ''لمعات'' ہے جو مشکاۃ کی شرح ہے اس کے دیباچے میں انہوں نے حدیث کی مختلف قسموں اور علم حدیث پر تبصرہ کیا اور طویل اقتباسات دے کر بقول نواب صدیق حسن خاں مرحوم فقہ حنفی کو احادیث کے مطابق ثابت کیا ہے، شیخ عبدالحق محدث رحمہ اللہ جنہوں نے تقریباً ایک سو کتابیں لکھیں وہ برصغیر کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے سیرت نبوی پر ''مدارج النبوۃ'' نام کی بارہ سو صفحے کی ایک ضخیم کتاب لکھی جس کا علمی پایہ اب تک مسلّم ہے۔

اورنگ عالمگیر رحمہ اللہ جو برصغیر میں ناموس ملت کا آخری پاسبان تھا اس کی وفات ۱۱۱۸ھ میں ہوئی لیکن اس کے جانشین ایسے کمزور اور بودے تھے کہ نصف صدی کے اندر دیکھتے دیکھتے سلطنت مغلیہ کا اقتدار ختم ہو گیا بدعات اور مشرکانہ رسوم جو اورنگ زیب رحمہ اللہ کی کوششوں سے دب گئے تھے از سر نو منظر عام پر آنے لگے۔ باطنیت جو برصغیر میں ایران سے ہمایوں کا لایا ہوا تحفہ تھی پھر سے سر چڑھنے لگی، صوفیا اپنی پرانی روش پر قائم رہے مدرسوں کا نظام تقلید جامد کے اصول پر اپنی ڈگر پر چلتا رہا اور کتاب وسنت سے بے پرواہی اپنے حال پر قائم رہی ان حالات میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے آنکھیں کھولیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ ایکس

فروری ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے جو سیاسی اعتبار سے اسلام کا عہد زوال تھا لیکن مذہبی و علمی اعتبار سے اصلاح وتجدید کا زمانہ بھی یہی تھا چنانچہ جس سال شاہ صاحب رحمہ اللہ پیدا ہوئے اسی کے قریب اسلام کا دور جدید کا دوسرا بڑا مصلح ومجدد شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ ریگستان نجد میں ظہور پذیر ہوا، شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کے علمی وفکری کارناموں کا ذکر ہمارا موضوع نہیں ہے لیکن ان کے تجدیدی مشن کی ان بنیادوں کا ذکر ضروری ہے جو کتاب ''موضوع ومنکر روایات'' کا محور ہیں۔ وہ بنیادیں یہ ہیں۔

۱- بارہویں ہجری سے قبل برصغیر کے علمی ودینی حلقوں میں قرآن کریم کی تعلیم تقریباً نصاب سے خارج تھی، شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اصول تفسیر پر ایک گراں قدر کتاب ''الفوز الکبیر'' لکھ کر کتاب اللہ کے درس ومطالعہ کی دعوت دی اور قرآن کریم کے معانی کا فارسی میں ترجمہ کر کے عام لوگوں کو قرآن حکیم پڑھنے اور سمجھنے کی راہ کھول دی اور ساتھ ہی یہ ترجمہ وقت کی ضرورت بھی تھا کیونکہ پرتگیزی مشینری جو سلطنت مغلیہ کے ایوان اقتدار میں کینسر کی طرح پھیلی ہوئی تھی ان کے قرآن کریم پر ظالمانہ اعتراضات کا جواب دینے کے لئے ان علماء کے لئے ضروری تھا جو بغیر سمجھے بطور تبرک قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

۲- انہوں نے تقلید جامد کے خلاف آواز بلند کر کے تحقیق واجتہاد کے عملی نمونے پیش کئے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اور ''الانصاف'' میں انہوں نے اس موضوع پر بحث کی جس کو پڑھنے سے ذہن خود بخود کتاب وسنت کی طرف مائل ہوتا ہے اور طبیعت تقلید جامد کی طرف قطعی راغب نہیں ہوتی۔

۳- شاہ صاحب رحمہ اللہ سے قبل اور ان کے زمانے میں اسلامی مدارس صرف فقہ نحو وصرف اور منطق پر زور دیتے تھے لیکن شاہ صاحب نے حدیث نبوی کا خزانہ عام کرنے کے لئے علم حدیث پر انتہائی اہم کتابیں لکھیں انہوں نے مؤطا کی شرح فارسی وعربی دونوں زبانوں میں لکھی عربی شرح کا نام ''المسوی'' اور فارسی کا ''المصفی'' رکھا اور عوام کے لئے ''چہل حدیث'' النوادر من الحدیث۔ اور الدار الثمین فی مبشرات الرسول الکریم ﷺ'' نامی کتابیں لکھیں، شاہ صاحب رحمہ اللہ کی ایک نہایت اہم کتاب ''رسالۃ انصاف فی بیان سبب الاختلاف'' ہے۔ جس میں انہوں نے محدثین کے مجموعوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اجتہاد وتقلید کے مسئلہ پر

روشنی ڈالی اور ان وجوہات کا ذکر کیا جن کی بنا پر مسلمانوں میں تقلید کا رواج عام ہو گیا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے حالات کی پوری طرح اصلاح کی کیونکہ جس سیلاب کو عالمگیر جیسا دور اندیش شخص نہ روک سکا اس کا سد باب ایک مذہبی عالم سے کس طرح ہو سکتا تھا اس جلیل القدر عالم کی کوششوں سے اتنا ہوا کہ انہوں نے اس سیلاب جس میں مغلوں کا تخت وتاج بہہ گیا اس میں انہوں نے قوم کو قرآن وحدیث فہمی کی نعمت عظمیٰ عطا کی اور یہ واضح کیا کہ اسلامی درسگاہوں سے فقہ ومنطق کا آنے والا سیلاب مذہبی کشمکش میں قطعی مفید نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ''کتاب وسنت'' کی قوت کی ضرورت ہے جو فقہ منطق سے نہیں بلکہ قرآن وحدیث سے حاصل ہوتی ہے۔ ولی اللہ کی تحریک نے اسلامی عقائد کے دفاع کے لئے ایسا نظام قائم کر دیا جو انیسویں صدی کی مذہبی کشمکش میں ہماری سب سے بڑی ڈھال رہا، شاہ صاحب رحمہ اللہ کی ان گراں قدر خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ ہم شاہ صاحب رحمہ اللہ کو محض اپنی تقلید پسندی کی وجہ سے امام نہیں کہتے ورنہ جہاں تک ان کی تبحر علمی، مجتہدانہ نظر، اور کتاب وسنت کی اشاعت کے سلسلے میں ان کی خدمات ہیں وہ انہیں امام کا درجہ دیتی ہیں۔

برصغیر کے مذکورہ علمی رجحانات اور احادیث نبویہ کی نشر واشاعت کی کوششوں کے جائزہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم حدیث کے سلسلہ میں ہمارے علماء رحمہ اللہ کی خدمات کو قطعی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن ساتھ ایسی حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ خزانہ حدیث کو عام کرنے کے سلسلہ میں صرف احادیث کے ترجموں، شرحوں اور حواشی ہی پر اکتفا کیا گیا۔ ہمارے جن علماء نے احادیث کی کتابوں کا ترجمہ یا ان کی شرحیں لکھی انہوں نے ان احادیث کو جن کو محدثین ومحققین ساقط جانتے تھے اور خوش الحان واعظوں اور صوفیوں کے ملفوظات کو بھی احادیث کے مجموعوں میں شامل کر دیا، موضوع ومنکر روایات پر محققانہ کام ہونے کے حوالے سے فارسی میں دو اور عربی میں صرف ایک کتاب کا ذکر ملتا ہے پہلی دو کتابوں یعنی ''تذکرۃ الموضوعات دربیان احادیث موضوعہ'' اور قانون الموضوعات فی ذکر الضعفاء کے مصنف شیخ محمد بن طاہر پٹنی متوفی ۱۵۷۸ء تھے اور تیسری عربی کتاب ''الآثار المرفوعۃ فی الاحادیث

الموضوعہ" مولانا عبدالحی لکھنوی مرحوم کی ہے مذکورہ کتابوں کی نشاندہی نواب صدیق حسن خان مرحوم نے اپنی کتاب "اتحاف النبلاء" میں کی ہے۔

موجودہ پرآشوب اور پرفتن دور میں صرف قرآن حکیم کی مصداقیت ثابت نہ کرنے پر انسانیت دشمنی ذرائع ابلاغ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، بلکہ ساتھ ہی دوسری جانب احادیث مطہرہ سے متعلق مختلف اور متضاد نظریات سامنے آرہے ہیں، برصغیر میں "فتنہ انکار حدیث" سلطنت مغلیہ میں مذہبی بے راہ روی کا منطقی نتیجہ تھا، ۱۹۲۰ء یہ فتنہ نئے لباس میں ظاہر ہوا اس مولود خبیث کی پرورش لکھنؤ کے نیاز فتحپوری کے نگار خانے میں ہوئی اور یہ فتنہ آج اس وقت باضابطہ اور منظم ہوکر سرگرم عمل ہے دوسری جانب ضعیف، موضوع اور منکر روایات پر مبنی فضائل کی کتابوں کا انبار لگایا جارہا ہے جن میں غلط نظریات وخیالات اور غیر شرعی امور کے لئے جو لوگوں کے ذہن ودماغ میں راسخ ہوچکے ہیں ان غیر صحیح روایت سے مواد فراہم کیا جاتا ہے۔

فتنہ انکار حدیث پر ہمارے علماء نے جو محققانہ کام کیا وہ دین حنیف کی فکری تاریخ میں ایک سنہرے باب کا اضافہ ہے لیکن موضوع ومنکر روایات کی محققانہ دلائل کے ذریعے نفی پر اردو میں شاید ہی کوئی کتاب ہو اس کار خیر کی سعادت میرے محترم دوست ڈاکٹر سید سعید احسن عابد کو حاصل ہوئی۔

پیش نظر کتاب "موضوع ومنکر روایات" کی جلد دوئم ہے ڈاکٹر عابدی نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے جلائے ہوئے چراغوں سے اپنا چراغ جلا کر پانچویں صدی ہجری میں موضوع ومنکر روایات کی نشاندہی کرنے کے طریقہ کو اپنا کر احادیث مطہرہ کے دفاع میں بیشمار راتیں آنکھوں میں کاٹ کر یہ نفیس اور اپنی نوعیت کی منفرد کتاب اردو لائبریری کو بطور تحفہ دی اس کتاب کی انفرادیت کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ڈاکٹر عابدی نے ان بدعقیدگیوں فکری آوارگیوں اور مشرکانہ رسم ورواج کو اپنا موضوع سخن بنایا جو اسلام کی عالمگیر دعوت وپیغام کو مسخ کرنا چاہتی ہیں کتاب میں موضوع ومنکر روایات بلکہ اسرائیلیات پر مبنی نام ونہاد صلحائے نے امت کی ان غیر ذمہ دارانہ کتابوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو مسلمانوں کو کتاب وسنت سے دستبردار ہونے کی دعوت دے رہی ہیں اور آج کل

بعض ٹی وی چینلوں پر نمودار ہونے والے ان علمائے سو کے چہروں پر سے بھی نقاب اٹھایا گیا ہے جو اپنے گمراہ کن عقائد کی تبلیغ کے لیے دیو مالائی قصوں کو احادیث کی عبا پہنا کر مسلمانوں کو تعویذ وگنڈوں میں جکڑنا چاہتے ہیں اور جن کے بارے میں اقبال عظیم نے کہا تھا:

وہ لوگ جنہیں پاس شریعت بھی نہیں ہے
پہنے ہوئے بیٹھے ہیں شخصیت کے لبادے

۲- کتاب میں حدیث سازوں قصہ گو واعظیں گمراہ صوفیا کے عقائد پر تاریخی وعلمی دلائل وشواہد کی روشنی میں بحث کرنے کے علاوہ انبیاء کرام علیہم السلام، خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور ائمہ رحمہم اللہ کے ان فضائل ومناقب کی حقیقت بیان کی گئی ہے جو منبر ومحراب کے پیشہ ور واعظوں کی تقریروں اور مینہ کی طرح برسنے والے کنبوں کا سرمایہ ہیں۔

۳- کتاب ''موضوع ومنکر روایات'' میں عقائد وایمانیات کے حوالے سے اسلام کے نام پر توحید خالص کے منافی کاموں درگاہوں پر ہونے اور غیر اللہ کو وسیلہ بنا کر جہنم کی راہ اختیار کرنے کا کتاب وسنت سے ماخوذ دلائل سے ابطال کیا گیا ہے۔

۴- کتاب میں ڈاکٹر عابدی نے نام ونہاد صلحائے امت کی موضوع ضعیف اور منکر روایات کی پرستش کی نشاندہی کرتے ہوئے توحید خالص کے منافی ان عقائد کا علمی دلائل کے ذریعے ابطال کیا ہے جنہیں علمائے سو نے مسلمانوں کو بطور تحفہ دیا ہے یہودیوں کی قبر پرستی کی لعنت ہندوؤں کے شرادہ کو مشرف باسلام کر کے دسواں اور چالیسواں، ہندوؤں کی جنم آشٹمی اور عیسائیوں کے کرسمس کو مشرف بہ اسلام کر کے عید میلاد النبی کو مذہب کا جز قرار دینا انہیں علمائے سو کا کارنامہ انجام ہے جو آج بھی اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے مشرکانہ عقائد کو گلے لگانے کی دعوت دے رہے ہیں۔

۵- نور محمدی، نبی رحمت ﷺ کی بشریت اور آپ کی وفات اہل بدعت علماء وصوفیاء کا محبوب موضوع ہے جسے گمراہ واعظ اسرائیلیات پر مبنی روایتوں کا سہارا لے کر پرکشش اور دلفریب بنا کر پیش کرتے چلے آرہے ہیں ڈاکٹر عابدی نے موضوع سے متعلق تمام احادیث یا منکر روایات کا عالمانہ انداز میں علمی حوالوں کے ذریعے ابطال کر کے عید میلاد النبی کے موقع پر

تروتازہ گلدستے سجانے والوں، کافوری شمعوں کے خوبصورت فانوس اور برقی روشنی کے بکثرت کنول سجانے والوں کو یہ بتادیا کہ نور محمدی کا عقیدہ ایک خرافاتی عقیدہ ہے اور قرآنی کریم کی زبان میں آپ ﷺ نے اپنی بشریت کی متعدد بار یقین دہانی فرمائی ہے اس لئے آپ ﷺ سے سچی محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں اور قدم قدم پر آپ ﷺ کا اتباع کیا جائے اور اطاعت کی جائے کیونکہ وہ محبت جو سنت رسول اللہ ﷺ پر عمل کرنا نہ سکھائے وہ محض دھوکہ اور فریب ہے وہ محبت جو رسول رحمت ﷺ کی اطاعت و پیروی نہ سکھائے وہ محض جھوٹ اور نفاق ہے۔

۶- کتاب میں ولی کون ہے؟ لوح محفوظ، روح کی حقیقت، جادو کیا ہے، صور پھونکنے والا فرشتہ کون ہے؟ فرشتوں کی حقیقت اور انبیاء کرام علیہم السلام کے قصوں سے متعلقہ تحریریں بڑی فاضلانہ ہیں اور متعلقہ موضوعات کے سلسلہ میں شک وشبہات میں مبتلا حضرات کے لئے یہ مباحث چراغ راہ ہیں۔

۷- خواتین کے سلسلہ میں اسلام کی رہنمائی سے جو لوگ ناواقف ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں خواتین کو مناسب درجہ نہیں دیا گیا ہے، ان کے ذہنوں میں طرح طرح کے شبہات ہیں جن کی بنیاد مخالفین اسلام کی تحریروں اور گمراہ کن بیانات پر ہے، ڈاکٹر عابد نے اپنی کتاب میں اس حساس اور اہم موضوع پر صحیح احادیث کی روشنی میں سیر حاصل بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے خواتین کو ہر جہہ عزت واحترام کی نظر سے دیکھا ہے وہ اسلام کی نظر میں جس طرح مکمل انسان ہیں اسی طرح انہیں جملہ سماجی حقوق حاصل ہیں جن کی بنیاد پر وہ معاشرے کی ترقی وتحفظ میں کلیدی کردار ادا کرسکتی ہیں۔

آیئے آخر میں کتاب "موضوع ومنکر روایات" کے اسلوب وبیان پر بھی ایک نظر ڈالی جائے۔

اردو کو دنیا کی تیسری اسلامی زبان کہا جاتا ہے اور برصغیر میں اسلامی فکر ودعوت کا اظہار فارسی کے بعد اردو ہی کے ذریعہ ہوا، اردو نثر کے اسلوب متعدد نقطہ نظر اور روایات کے حامل ہیں مثلاً ایک روایت کا حامل بیسویں صدی کی دوسری دہائی کا وہ دینی ادب تھا جسے روایتی علماء نے

عیسائیت اور آریہ سماج کے اسلام پر اعتراضات کے جوابات دینے کے لئے تیار کیا تھا جس میں زبان کی صحت کا پورا اہتمام تو ضرور تھا مگر اسلوب کے حسن کی زیادہ فکر نہیں کی گئی تھی۔

دوسری روایت کے بانی سرسید ہیں انہوں نے دینی ادب کی اس روایت صف کر ایک نئی راہ نکالی ان کی نثر سادہ اور صاف ستھری ہے انہوں نے خالص مذہبی امور کے ساتھ معاشرتی، سیاسی، اور علمی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔ شبلی کو بنیادی طور پر اس دوسری روایت سے متعلق تھے مگر ان کے قلم نے ایک نئی اور زیادہ حسین اور متوازن روایت قائم کی، انہوں نے اپنی نثر کو عربی فارسی ادب کے جاندار اجزاء سے مالا مال کیا اگر سرسید کے سامنے شعوری یا غیر شعوری طور پر وکٹورین تمدن اور وکٹورین ادب کی قدریں تھی تو شبلی نے اپنی نگاہیں عباسی دور کی تہذیب اور فارسی کی ادبی روایات پر مرکوز کیں شبلی کی نثر میں سادگی وضاحت کے ساتھ رنگینی اور شیرینی کا عنصر بھی موجود ہے۔

ڈاکٹر عابد کی کتاب کا اسلوب علیگڑھ اسکول اور شبلی کی نثری روایات کا جامع تو ضرور ہے اس میں سرسید کی نثر کی سادگی اور شبلی کی وضاحت تو ضرور ہے لیکن تازگی اور شگفتگی کے عنصر کی کمی ہے۔

ڈاکٹر عابد کی تحریر میں فکری نظم وضبط تو ضرور ہے لیکن عربی آمیز بوجھل عبارتیں غیر عربی داں طبقہ کو اس منفرد کتاب سے خاطر خواہ استفادے سے محروم بھی کرسکتی ہیں، کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اس امر پر توجہ کی ضرورت ہے کام یقیناً بہت صبر آزما ہوگا لیکن کتاب کی افادیت اور مقبولیت میں مدد معاون ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر عابد کی عربی آمیز بوجھل اسلوب کے باوجود ان کی تحریروں میں احادیث مطہرہ کا جذبہ اور ان کی محققانہ ذات کی جھلک بخوبی دیکھی جاسکتی ہے، شخصیت کے اسی نمو کو اقبال نے خون جگر کیا ہے، اور میر آمن نے اسے خون دل سے تعبیر کیا ہے اور جس تحریر میں شخصیت کا اظہار نہ ہو اسے اسلوب و بیان کی کسی بھی تقسیم میں کوئی مرتبہ نہیں مل سکتا ہے۔

ڈاکٹر شعیب نگرامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

۱۔ فہرست موضوع اور منکر روایات ۱۱
۲۔ فہرست صحیح احادیث ۱۶
۳۔ مقدمہ ۲۵

باب اوّل: غیبیات

۱۔ آغاز آفرینش ۷۱
۲۔ اہل کتاب کے صحیفوں سے استدلال کے اصول وضوابط ۷۲
۳۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا ۷۵
۴۔ احادیث "بدء الخلق" میں نور محمدی کا کوئی ذکر نہیں ۷۸
۵۔ "نور محمدی" کی روایت کا متن ۷۹
۶۔ نور محمدی کے واقعہ کے مآخذ ۸۰
۷۔ رسول اللہ ﷺ بشر تھے اور بشر کا مادۂ تخلیق مٹی ہے ۸۱
۸۔ بشریت رسول کا عقیدہ ایمان بالرسالت کی صحت کے لیے شرط ہے ۸۸
۹۔ رسول اکرم ﷺ کی وفات کا عقیدہ ۹۱
۱۰۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیجا تعریف سے منع فرمایا ہے ۹۵
۱۱۔ نور محمدی، نظریہ حلول کا ترجمان ہے ۹۸
۱۲۔ ولی کون ہے ۱۱۶
۱۳۔ ہر مومن اللہ کا ولی ہے ۱۱۹
۱۴۔ اولیاء اللہ کا صوفیانہ تصور غیر اسلامی ہے ۱۲۰

۱۵۔ نبی اور ولی میں موازنہ کرنا کفر ہے ۱۲۰
۱۶۔ تکمیل دین والے الٰہی اعلان کے بعد یہ دعویٰ ۱۲۲
۱۷۔ کشف والہام حق ہے لیکن ۱۲۴
۱۸۔ لوح محفوظ ۱۳۴
۱۹۔ روح کی حقیقت ۱۳۸
۲۰۔ شفق کی حقیقت ۱۴۲
۲۱۔ کہکشاں کی حقیقت ۱۴۲
۲۲۔ فرشتوں کی حقیقت ۱۴۵
۲۳۔ صور کیا ہے؟ ۱۵۲
۲۴۔ قرآن پاک میں غور وتدبر کا صحیح طریقہ ۱۵۳
۲۵۔ صحیح مسلم کی حدیث کا مفہوم ۱۵۳
۲۶۔ صور پھونکنے والا فرشتہ کون ہے؟ ۱۵۴
۲۷۔ ہاروت وماروت کا قصہ ۱۵۷
۲۸۔ ہاروت وماروت کا قصہ قرآنی بیان کے خلاف ہے ۱۶۴
۲۹۔ جادو کیا ہے؟ ۱۶۵
۳۰۔ رسول اللہ ﷺ پر جادو ۱۷۲
۳۱۔ رسول اللہ ﷺ پر جادو کا اثر منصب نبوت کے منافی نہیں ۱۷۵
۳۲۔ سورج اور چاند ۱۸۰
۳۳۔ زمین کی اساس ۱۸۴
۳۴۔ عرش اور کرسی ۱۸۸

باب دوم: قصص الانبیاء

۱۔ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ۱۹۷
۲۔ خلیفہ کی حقیقت ۱۹۷

۳۔ قول فیصل ۲۰۰
۴۔ انسان زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے ۲۰۳
۵۔ سجدۂ آدم ۲۰۵
۶۔ عورت کے پسلی سے پیدا کیے جانے کا مفہوم ۲۱۰
۷۔ انسان کے اجزائے ترکیبی ۲۱۳
۸۔ حضرت آدم علیہ السلام کا ہند میں نزول ۲۱۴
۹۔ اصل دین توحید ہے ۲۳۱
۱۰۔ ہر بچہ دین اسلام پر پیدا ہوتا ہے ۲۳۲
۱۱۔ مشرکین کے نابالغ بچوں کا انجام ۲۳۴
۱۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے شہر مکہ نہیں تھا ۲۳۹
۱۳۔ بیت اللہ کے بانی اول حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں ۲۴۱
۱۴۔ حجر اسود ۲۴۳
۱۵۔ حجر اسود کو بوسہ دینا ۲۴۴
۱۶۔ حجر اسود کے بارے میں منکر اور موضوع روایات ۲۴۶
۱۷۔ البیت المعمور ۲۴۹
۱۸۔ نہر حیوان ۲۵۱
۱۹۔ حضرت نوح علیہ السلام ۲۵۴
۲۰۔ نبی اور رسول میں فرق ۲۵۵
۲۱۔ حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ۲۵۵
۲۲۔ حضرت نوح علیہ السلام کی وصیت ۲۵۷
۲۳۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قبر ۲۵۹
۲۴۔ ازرقی اور تاریخ مکہ ۲۶۳
۲۵۔ مسجد حرام میں انبیاء (۹۸) کی قبروں کی حقیقت ۲۶۴
۲۶۔ تحریف کی بدترین مثال ۲۶۷

۲۷۔ مسجد نبوی میں رسول اکرم ﷺ کی قبر مبارک سے غلط استدلال ۲۷۰
۲۸۔ کشتی نوح کا طواف کعبہ ۲۷۵
۲۹۔ عوج بن عوق ۲۷۶
۳۰۔ کیا تمام انسان حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں؟ ۲۷۹
۳۱۔ یاجوج ماجوج سے کون سی قوم مراد ہے؟ ۲۸۵
۳۲۔ کیا یاجوج ماجوج ابھی تک بند ہیں؟ ۲۸۷
۳۳۔ کیا تاتاری یاجوج ماجوج تھے؟ ۲۸۹
۳۴۔ مسلمانوں کی نکبت کے اسباب ۲۹۵
۳۵۔ حضرت یوسف علیہ السلام ۳۰۲
۳۶۔ سورۂ یوسف کی آیت نمبر ۵۰ کا معنی ومفہوم ۳۰۸
۳۷۔ رَاوَدَ یُرَاوِدُ عَنِ الشَّیْءِ کی لغوی تحقیق ۳۰۹
۳۸۔ هَمَّ یَهُمُّ کی لغوی تحقیق اور طریقہ استعمال ۳۱۱
۳۹۔ بے گناہ اور مظلوم کا اپنی رہائی کے لیے دنیوی تدابیر اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ۳۲۳
۴۰۔ اوپر کی وضاحتوں کی روشنی میں زیر بحث روایت ۳۲۴
۴۱۔ کلام اللہ میں تحریف ۳۲۵
۴۲۔ برادران یوسف موحد تھے ۳۳۰
۴۳۔ یہودیوں کی حق دشمنی کی مثالیں ۳۳۲
۴۴۔ یہودیوں کے انکار حق کے اسباب ۳۳۳
۴۵۔ اسراء ومعراج کا پیغام ۳۳۹
۴۶۔ بخت نصر کا افسانہ ۳۵۱
۴۷۔ غزوۂ خندق ۳۵۹
۴۸۔ خیبر کے یہودیوں کی بیخ کنی ۳۶۲
۴۹۔ ایک اعتراض اور اس کا جواب ۳۶۴
۵۰۔ یہود خیبر کی شرانگیزیاں ۳۶۵

۵۱۔ یہود کا پہلا فساد ۳۶۶
۵۲۔ بنو اسرائیل کا دوسرا اور آخری فساد ۳۷۱
۵۳۔ ساتویں آیت کی تشریح ۳۷۴
۵۴۔ قول فیصل ۳۷۶

باب سوم: حج اور زیارت مدینہ

۱۔ دجال مکہ اور مدینہ میں داخل نہ ہو سکے گا ۳۸۲
۲۔ مسجد نبوی ۳۸۷
۳۔ مسجد نبوی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہے ۳۹۰
۴۔ زیارت قبور ۳۹۲
۵۔ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت ۳۹۶
۶۔ زیر بحث روایت ۴۰۷
۷۔ صلحائے امت کی قبروں کی زیارت ۴۱۸
۸۔ درود وسلام پڑھنے کے لیے نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت ۴۲۵
۹۔ ایک جھوٹا واقعہ ۴۲۷
۱۰۔ قرآن پاک کی ایک آیت سے غلط استدلال ۴۳۰
۱۱۔ رسول اکرم ﷺ کی طرف زائرین کے ذریعے سلام بھیجنا ۴۴۰
۱۲۔ قبر مبارک کی زیارت کی دعا ۴۴۲
۱۳۔ روضہ شریف میں نماز ۴۴۳
۱۴۔ مسجد قبا میں ایک نماز عمرہ کے برابر ہے ۴۴۷
۱۵۔ مدینہ میں وفات پا جانے والا مسلمان شفاعت کا مستحق ہے ۴۴۸

باب چہارم: معاشرت

۱۔ اسلام میں عورت کا مقام ودرجہ ۴۴۹

۲۔ ایک اشکال اور اس کا جواب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵۶
۳۔ عورتوں سے صلاح و مشورہ؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵۷
۴۔ کیا عورت کا وجود عبادت میں مانع ہے؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۶۵
۵۔ تعلیم نسواں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۶۹
۶۔ کفاءت کا مسئلہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۸۶
۷۔ اسلام کی نگاہ میں ذات پات کا تصور ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۹۰
۸۔ آل بیت سے محبت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۹۷
۹۔ عربی زبان سے محبت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۹۸
۱۰۔ حرفت اور پیشہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۰۱

***

فہرست موضوع و منکر روایات

نمبر	روایات کا ابتدائی فقرہ	صفحہ
۱۸۲	أتاني مَلَكٌ برسالة	۱۴۷
۲۶۸	اتّقوا الدنيا واتّقوا النِّساء	۳۷۳
۲۸۱	احبّوا العربَ لِثلاثٍ	۳۹۸
۲۱۶	اَلْحَجرُ الاسودُ يمينُ الله	۲۴۲
۲۱۷	الحجرُ يمين الله	۲۴۲
۲۱۹	الحجر الاسود كان مَلَكًا	۲۴۷
۲۱۸	اَلْحَجَرُ الْاَسْوَدُ نَزَلَ بِهِ	۲۵۰
۲۷۷	الاحرار من اهل التوحيد	۳۸۲
۲۷۹	اذا ذلت العرب ذل الاسلام	۳۹۳
۲۷۵	اذا قالت المرأة لزوجها	۳۸۱
۱۹۹	الأرض على الماء والماء	۱۸۴
۱۸۰	الأرواح خمسة أجناس	۱۳۱
۱۸۹	اسرافيل له اربعة اجنحة	۱۵۰
۲۵۵	أَصَابَ النَّاسَ قَحْطٌ	۳۳۲
۲۸۵	اكذب الناس الصباغون	۵۰۳
۱۹۲	الا احدثكم بما سمعت من رسول الله ﷺ	۱۸۱
۲۰۵	إنّ آدم اتى البيت الف اتية	۲۱۱
۲۲۳	انّ آدم غسلته الملائكة	۲۵۲
۲۱۸	إنّ آدم قام خطيبا	۲۲۱
۲۲۴	انّ آدم قبل أن يُصيب	۲۵۳

۱۹۲	إنّ آدم لما اهبطه الله الى الارض	۱۶۰
۳۸۳	إنّ ابغض الكلام الى الله	۵۰۱
۳۲۰	إنّ الحجرَ الْاَسْوَدَ يَمِينُ اللهِ	۳۴۷
۱۷۹	إنّ اوّل ما خلق الله الروحَ	۱۳۰
۱۸۵	إنّ العرشَ لَمَطُوقٌ بحية	۱۳۵
۲۷۶	إنّ الفساق هم اهل النار	۳۸۲
۲۷۸	إنّ قريشاً أعطيت	۳۹۳
۲۰۳	إنّ كرسيه وسع السموات والارض	۱۹۳
۱۷۳	إنّ الله تبارك وتعالى خلق نور محمد ﷺ	۱۰۰
۱۹۵	إنّ الله تبارك وتعالى خلق شمسين	۱۸۱
۲۰۴	إنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى لَمَّا خَلَقَ آدَمَ	۲۰۷
۲۷۱	إنّ الله تعالى لا يعذب حسان الوجوه	۴۷۶
۲۰۶	إنّ الله خلق آدم من طينة	۲۱۲
۱۷۶	إنّ الله خلق لَوحًا محفوظًا	۱۳۳
۱۷۸	إنّ الله عزوجل خلق الأرواح	۱۳۰
۱۸۷	إنّ لِلّٰهِ مَلَائِكَةً وهم الكروبيُّون	۱۳۹
۱۸۸	إنّ لله ملكا لو قيل له	۱۵۰
۱۷۹	إنّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ	۱۳۰
	إنّ المراة اذا خرجت من بيتها	۴۷۴
۱۹۲	إنّ الملائكة قالت	۱۵۷
۲۶۳	إنّ النساء سفهاء	۴۶۳
۲۳۰	إنّ ياجوج وماجوج	۲۸۱
۲۱۵	أوحى الله تعالى إلى آدم	۲۳۷
۲۷۹	ايما امرأة خرجت	۴۷۴
۲۳۳	جاء الى رسول الله ﷺ يهودى	۳۳۲
۱۹۱	جاء نى جبريل وهو يبكى	۱۵۶

۱۸۱	الحمرة التي في السّماء	۱۴۲
۱۸۲	الحمرة من زينة الشيطان	۱۴۲
۴۵۶	حَيَاتِي خَيْرٌ لَكُمْ تُحَدِّثُوْنَ	۳۴۰
۲۰۰	خلق الله الارض	۱۸۵
۱۷۳	خُلِقْتُ اَنَا وَعَلِيٌّ مِن نُور	۱۰۰
۱۷۱	خلقني الله من نوره	۹۹
۴۳۶	دخل جبريل على يوسف	۳۲۶
۴۳۳	رحم الله يوسف	۳۲۳
۴۲۸	سام ابو العرب	۲۸۰
۴۸۰	سالتُ رَبِّيْ عزوجل	۳۹۵
۴۵۷	السلام عليك يا رسول الله ﷺ	۳۴۳
۴۵۸	شاوروهن يعني النساء	۳۵۷
۴۸۶	شرار اُمّتِي الصائغون	۵۰۳
۴۹۱	شِرارُ النَّاسِ التُّجارُ	۵۰۶
۴۵۹	طاعة المرأة ندامة	۳۵۹
۴۹۲	عليكم بالتجارة	۵۰۷
۴۷۲	عليكم بالوجوه الملاح	۳۷۷
۴۹۰	عمل الأبرار من رجال امتي	۵۰۶
۴۴۴	في السماء نهر يقال له	۲۵۴
۱۹۸	قال النبي ﷺ لِجبرِيْلَ	۱۸۳
۴۴۱	قبر في مسجد الخيف سبعون نبيًا	۲۹۷
۴۵۳	قدم علينا أعرابيٌّ	۳۳۳
۴۴۷	كان طُوله ثلاثة آلافِ ذراعٍ	۲۷۶
۴۴۶	كان مَعَ نوح في السفينة	۲۷۵
۱۷۴	كان نوراً حول العرش	۱۰۱
۴۸۳	كان جبريلُ يوحي إليه بالعربية	۵۰۰

۱۹۳ لعن اللہ الزہرۃ ۱۹۰

۲۲۱ لقد مر بهذا نوح وهود ۳۳۸

۲۱۳ لَمّا أذنب آدم ۳۲۵

۲۰۷ لما اهبط الله آدم ۳۱۳

۲۱۲ لَمّا أهْبطَ الله آدمَ إِلَىَ الْاَرضِ ۳۲۲

۲۱۴ لَمّا حملتْ حوّاء ۳۲۷

۲۱۰ لَمّا خلق الله آدم ۳۱۹

۲۰۹ لَمّا خلق الله الارض ۳۱۶

۲۳۷ لَمّا قال یوسف: ذٰلك ليعلم ۳۳۱

۲۶۲ مَن اطاع امرأتَه ۴۶۲

۱۷۷ مَا مِن شَيءٍ قضي الله ۱۳۷

۲۵۱ مَا مِن اَحد مِن اُمتي ۴۱۴

۲۳۵ مَن جاء نِي زائرًا ۴۰۵

۲۳۰ من حج ولم يزرني ۳۹۷

۲۳۱ من حج فزار قبري ۳۹۸

۲۳۸ من حج حجة الاسلام ۴۱۱

۲۴۲ من زارني بعد موتي ۴۰۰

۲۴۳ من زار قبري ۴۰۱

۲۴۴ من زار قبري ۴۰۳

۲۴۶ من زار قبري بعد موتيو ۴۰۷

۲۴۷ مَن زار قبري اَو زارني ۴۰۸

۲۴۹ مَن زارني بعد موتي ۴۱۲

۲۵۰ من زارني محتسبا ۴۱۳

۲۵۲ من زارني حتي ينتهي إلي ۴۱۵

۲۵۳ من لم يمكنه زيارتي ۴۱۷

۲۶۴ لولا النسـاء لَعُبِد الله ۴۶۵

۲۶۵ لولا النساء دخل الرجال الجنة ۴۶۹

۲۳۵ لو لم يقل يوسف الكلمة ۳۲۵

۲۶۲ لا تسكنوهن الغرف ۴۶۹

۲۶۷ لا تُعلِّموا نساءَکُم الكتابة ۴۷۳

۲۸۷ لا تستشيروا الحاكة ۵۰۴

۲۸۸ لا تشاوروا الحاكة ۵۰۵

۲۸۹ لا تشاوروا الحجامين ۵۰۵

۲۶۰ لا يفعلن احدكم امراً ۴۵۹

۱۸۳ اَلْمَجَرَّةُ التي في السماء ۱۴۳

۲۰۸ نزل آدم بالهند ۲۱۴

۱۹۰ النفاخان في السماء الثانية ۱۵۱

۱۹۷ وكل بالشمس تسعة املاك ۱۸۲

۲۲۹ ولد لنوح ثلاثة ۲۸۰

۲۴۴ وهم بها: حل سراويله ۳۲۰

۲۰۱ هل تدرون كم بين السماء والأرض؟ ۱۹۱

۲۶۱ هلكت الرجال ۴۶۰

۲۸۲ والذى نفسى بيده ۴۹۸

۲۰۲ ويحك انه لا يستشفع بالله ۱۹۳

۲۳۱ ياجوجُ اُمَّةٌ وَماجوجُ اُمَّةٌ ۲۸۳

۱۷۰ يَارَسُولَ اللّٰهِ! بِأَبِيْ أَنْتَ وَأُمِّيْ ۷۹

۲۷۳ يا معشر النساء اتقين الله ۴۷۸

۱۸۴ يا معاذ الي مرسلك الى قوم ۱۴۴

۲۳۸ يرحم الله اخي يوسف ۳۳۳

۲۷۴ يسلم الرجال على النساء ۴۷۹

۱۷۵ يوقف عبدان بين يدى الله ۱۰۱

فہرست صحیح احادیث

نمبر	احادیث کے ابتدائی فقرے	صفحہ
۱	بلغوا عنی ولو آیة	۷۲
۲	لا تصدقوا اهل الکتاب	۷۳
۳	امتهوکون انتم؟	۷۳
۴	والذی نفس محمد بیده	۷۳
۵	ان اول ما خلق الله القلم	۷۵
۶	اول شیء خلق الله تعالی القلم	۷۶
۷	اول ما خلق الله تعالی القلم	۷۶
۸	کان الله ولم یکن شیء قبله	۷۷
۹	کتب الله مقادیر الخلائق	۷۷
۱۰	إنّما أنا بشر	۸۵
۱۱	انه لو حدث شیء فی الصلوة	۸۶
۱۲	إنّما أنا بشرٌ إذا أمرتکم	۸۷
۱۳	ترکت فیکم أمْرَین	۹۲
۱۴	لا تطرونی کما أطرت النصاری	۹۵
۱۵	اوّلُ ما بدئ به رسولُ الله ﷺ	۱۰۹
۱۶	من عادی لی ولیًّا	۱۱۹
۱۷	یا معشرَ الشبابِ مَن استطاع منکم	۱۲۳
۱۸	النکاح من سنتی	۱۲۳
۱۹	یعذبان وما یعذبان فی کبیر	۱۲۷
۲۰	أنا سیّدُ وُلد آدم یومَ القیامة	۱۳۰

۲۱	یا جابر الا أُخْبِرُكَ ما قال الله لابيك؟	۱۳۰
۲۲	لا تتخذوا شيئا فيه الروح غرضًا	۱۳۱
۲۳	خلقت الملائكة من نور	۱۳۵
۲۴	انا اول هٰذِهِ الْأُمَّةِ من سأل عن ذلك	۱۳۹
۲۵	رأيت رسول الله ﷺ يوم أحد	۱۴۸
۲۶	كيف انعم وقد التقم صاحب القرن	۱۵۲
۲۷	مَا بَين النَّفْخَتَيْنِ اَرْبَعُون	۱۵۳
۲۸	اللهم رب جبرائيل وميكائيل واسرافيل	۱۵۵
۲۹	من اتى كاهنا فصدقه	۱۷۰
۳۰	اذا قضى الله امرًا في السماء	۱۷۱
۳۱	اجتنبوا السبع الموبقات	۱۷۲
۳۲	سحر رسول الله ﷺ رجل	۱۷۲
۳۳	سحر النبي ﷺ رجل من اليهود	۱۷۴
۳۴	يا عائشة ان عيني تنا مان ولا ينام قلبي	۱۷۶
۳۵	لما كسرت بيضة النبي ﷺ	۱۷۷
۳۶	لما فتحت خَيْبَرُ اُهديت لِلنَّبِيّ ﷺ	۱۷۷
۳۷	كان النبي ﷺ يقولُ	۱۷۹
۳۸	سمعتُ رسولَ الله ﷺ يقول	۱۸۳
۳۹	أرأيتم ما أنفق منذ خلق السماء	۱۹۱
۴۰	استوصوا بالنساء خيراً	۲۱۰
۴۱	إنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ	۲۱۰
۴۲	ان الله تعالى خلق آدم من قَبْضَةٍ	۲۱۲
۴۳	ما من مولود الا يولد	۲۳۲
۴۴	سئل رسول الله ﷺ عَنْ اَوْلَادِ الْمُشْرِكِيْنَ	۲۳۵

۴۵ واما الرجل الطويل فهو ۲۳۶
۴۶ يا ابراهيم! اين تذهب وتتركنا؟ ۲۴۰
۴۷ يا رسول الله! اى مسجد وضع فى الارض اول ۲۴۱
۴۸ ان سليمان بن داؤد لما بنى بيت المقدس ۲۴۲
۴۹ انّه جاء إلى الحجر الأسود فقبّله ۲۴۳
۵۰ رأيتُ رسول اللهِ ﷺ يطوفُ بِالبيتِ ۲۴۵
۵۱ نَزَلَ الحجَرُ الأسودُ من الجنّة ۲۴۵
۵۲ انِ الرُّكنُ والمقام ياقوتتانِ من ياقوت الجنة ۲۴۵
۵۳ وَاللهِ لَيَبْعَثَنَّهُ اللهُ يَومَ القِيامة ۲۴۵
۵۴ فاتينا السماء السابعة ۲۴۹
۵۵ هذا ابوك فلم عليه ۲۵۰
۵۶ يجتمع المؤمنون يوم القيامة ۲۵۴
۵۷ ان رجلا قال: يا رسول الله ﷺ ۲۵۶
۵۹ كان بين نوح وآدم عشرة قرون ۲۵۶
۶۰ ان نبى الله نوحًا ﷺ ۲۵۸
۶۱ اللهم لا تجعل قبرى وثنا ۲۶۰
۶۲ لعنة الله على اليهود والنصارى ۲۶۲
۶۳ إنّى أبرَأُ إلَى الله ان يكون لى منكم خليل ۲۶۴
۶۴ ان الله حرم على الارض ۲۶۶
۶۵ صَلّى فى مسجدِ الخِيفِ ۲۶۷
۶۶ لَعَنَ اللهُ اليَهُودَ اتّخذُوا ۲۷۱
۶۷ ان اولئك اذا ماتوا ۲۷۱
۶۸ ألا وان من كان قبلكم ۲۷۱
۶۹ لعن رسول الله ﷺ زائرات القبور ۲۷۱

۶۹ سمعت رسول اللہ ﷺ ۲۷۲
۷۰ انّہ ﷺ نھی أن ۲۷۳
۷۱ خَلَقَ اللّٰہُ آدَمَ وَطُولُہ ۲۷۸
۷۲ انما انا لکم بمنزلۃ الوالد ۲۷۹
۷۳ سُئِل النبیُّ ﷺ ۲۳۵
۷۴ اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ ۱۰۴
۷۵ لا الہ الا اللہ ۲۸۷
۷۶ فبینما ھو کذلک ۲۹۰
۷۷ والذی نفسی بیدہ ۲۹۱
۷۸ انھا لن تقوم حتی ترون ۲۹۲
۷۹ لا تقوم الساعۃ حتی تقاتلوا ۲۹۳
۸۰ یوشک الامم ان تداعی ۲۹۵
۸۱ فاکرم الناس یوسف نبی اللہ ۳۰۷
۸۲ ولو لبثت فی السجن ما لبث ۳۰۸
۸۳ الکریم ابن الکریم ۳۰۷
۸۴ فاذا انا بیوسف ﷺ ۳۰۸
۸۵ من ھم بحسنۃ فلم یعمل ۳۱۲
۸۶ یا رسول اللہ تنام قبل ان توتر ۳۱۸
۸۷ وکذلک الانبیاء تنام اعینھم ۳۱۸
۸۸ والذی نفس محمد بیدہ ۳۳۷
۸۹ انکم واللہ لا تأمنون عندی ۳۵۸
۹۰ لما رجع النبی ﷺ ۳۶۱
۹۱ کان رسول اللہ ﷺ ۳۶۳
۹۲ لما فدع اھل خیبر ابن عمر ۳۶۶

۹۳	كن في الدنيا كانك غريب	۳۷۱
۹۴	رَحِم الله موسى فقد اُوذى	۳۸۰
۹۵	المُؤمنِ القَوِىُّ خَيْرٌ	۳۸۴
۹۶	اُمرت بقرية تاكل القرى	۳۸۵
۹۷	اللهم حَبِّب الينا المدينة	۳۸۵
۹۸	ما عندنا شيء الا كتاب الله	۳۸۶
۹۹	ليس من بلد سيطؤه الدجال	۳۸۶
۱۰۰	صلاة في مسجدى هذا خير من الف صلاة	۳۸۸
۱۰۱	صلاة في مسجدى	۳۸۸
۱۰۲	الصلاة في المسجد الحرام	۳۸۸
۱۰۳	لا تشد الرحال الا الى ثلاثة مساجد	۳۸۹
۱۰۴	دخلت على رسول الله ﷺ	۳۹۱
۱۰۵	نهيتكم عن زيارة القبور	۳۹۲
۱۰۶	قد كنت نهيتكم عن زيارة القبور	۳۹۳
۱۰۷	إسْتَاذَنتُ ربى فى اَن اَستغفرلها	۳۹۳
۱۰۸	السلام عليكم اهل الديار من المؤمنين	۳۹۴
۱۰۹	قولى السلام على اهل الديار	۳۹۴
۱۱۰	نهيتكم عن زيارة القبور	۳۹۵
۱۱۱	قال رسول الله ﷺ في مرضه	۳۹۵
۱۱۲	لا تسبوا اصحابى	۳۹۸
۱۱۳	من حدث عنى بحديث	۴۱۵
۱۱۴	من رآنى فى المنام فقد رآنى	۴۱۷
۱۱۵	من رآنى فى المنام فسيرانى	۴۱۷
۱۱۶	إِنِّىْ اَبْرَأُ إِلَى اللّٰهِ	۴۲۰

۱۱۷	إنَّ أُولٰئكَ اذا كان فيهم	۳۲۰
۱۱۸	منى رسول الله ﷺ ان يحصص	۳۲۱
۱۱۹	الا ابعثك على ما بعثني رسول الله ﷺ	۳۲۱
۱۲۰	ألا وَإنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ	۳۲۳
۱۲۱	لا يومن احدكم حتى اكون احب اليه	۳۲۹
۱۲۲	لا والذى نفس بيده	۳۲۹
۱۲۳	لا تجعلوا قبرى عيدا	۳۲۹
۱۲۴	لَا تَجْعَلُوْا بُيُوتَكُمْ قُبُوْرًا	۳۳۰
۱۲۵	اذا مات الانسان انقطع عمله	۳۳۲
۱۲۶	ما بين بيتي ومنبرى	۳۴۳
۱۲۷	ان النبي ﷺ كان ياتى قباء	۳۴۷
۱۲۸	من تطهر فِيْ بيته ثم اتى مسجد قباء	۳۴۷
۱۲۹	يرحم الله المستقدمين منا	۳۴۸
۱۳۰	من استطاع ان يموت بالمدينة	۳۴۸
۱۳۱	اى خديجة! لقد خشيت على نَفْسِيْ	۳۵۰
۱۳۲	أَبْشِرُ فو الله لا يخزيك الله ابدا	۳۵۰
۱۳۳	اتى جبريلُ النبيَّ ﷺ	۳۵۱
۱۳۴	إنَّ اللّٰه هُوَ السلام	۳۵۲
۱۳۵	من عال جاريتين	۳۵۵
۱۳۶	مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ	۳۵۵
۱۳۷	خيركم خيركم لاهله	۳۵۵
۱۳۸	اكمل المومنين إِيْمَانًا	۳۵۶
۱۳۹	لا تُنْكَحُ الْبِكْرُ	۳۶۰
۱۴۰	البكر يستأذنها ابوها	۳۶۰

۱۴۱ لن یفلح قوم ۴۶۴
۱۴۲ جاء ثلاثة رهط الى بيوت ازواج النبی ﷺ ۴۶۵
۱۴۳ یا عَائِشَةُ ذرینی اتعبّد ۴۶۷
۱۴۴ الدنیا متاع ۴۶۸
۱۴۵ الا تعلیمن هذه رقیة النملة ۴۷۱
۱۴۶ طلب العلم فریضة ۴۷۴
۱۴۷ ان الله لا ینظر الی اَجْسَادِكم ۴۷۶
۱۴۸ لَوْ تَعْلَمُ الْمَرأةُ حَقَّ الزَّوْجِ ۴۷۹
۱۴۹ تُنكح الْمَرأة لِأرْبع ۴۸۷
۱۵۰ اَلْعَرَبُ بَعضُهم اَكْفَاءٌ ۴۸۷
۱۵۱ اذا اتاكم من ترضون دينه ۴۸۸
۱۵۲ ثلاثة حَقٌّ على الله ۴۸۹
۱۵۳ ان الله قد اذهب عنكم عبية الجاهليه ۴۹۰
۱۵۴ يا ايها الناس ان الله قد اذهب عنكم ۴۹۰
۱۵۵ يا ايها الناس الا ان ربكم واحد ۴۹۱
۱۵۶ اللهم اِنّي اُحِبُّهُما ۴۹۴
۱۵۷ يا معشر قريش اشتروا انفسكم ۴۹۶
۱۵۸ عمل الرجل بيده ۵۰۷
۱۵۹ ما اَكَلَ احد طعاما قط ۵۰۷
۱۶۰ ان الله يحب اذا عمل احدكم ۵۰۸

***

خطبہ مسنونہ

((إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ[1]، وَنَسْتَغْفِرُهُ[2]، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا[3] وَمِنْ سَيِّآتِ أَعْمَالِنَا[4]، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ[5]

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾[6]

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ﴾[7]

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴾[8]

أَمَّا بَعْدُ : فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهُدٰى هُدٰى مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) وَشَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا ، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ[9] وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ ، اَلضَّلَالَةُ فِي النَّارِ))[10]

---

[1]، [3]، [4]، [5] صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، باب تخفیف الصلاۃ والخطبۃ : ۲۰۰۸،

[2]، [4]، [5] ابوداؤد، کتاب النکاح ، باب في خطبۃ النکاح : ۲۱۱۸(نَحْمَدُہُ کے بغیر) مسند احمد ۱/۳۹۲(إنّ اور نَحْمَدُہُ کے بغیر)جامع الترمذی ، کتاب النکاح ،باب ماجاء فی خطبۃ النکاح : ۱۱۰۵ (نَحْمَدُہُ کے بغیر) ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح: ۳۱۴۹ تصحیح فضیلۃ الشیخ الالبانیؒ وقال: حدیثٌ صحیحٌ [3] جامع الترمذي بحوالہ سابقہ [6] آل عمران: ۱۰۲

[7] النساء : ۱ [8] الاحزاب : ۷۰۔۷۱

[9] فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ...... کے الفاظ مسند احمد ۴/ ۱۲۷(حلدنمبر ۵) کے ہیں۔

[10] صحیح مسلم : ۲۰۰۵

ترجمہ خطبہ مسنونہ

بلا شبہ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ہم اس کی تعریف کرتے ہیں۔اس سے مدد مانگتے اور اسی سے ہم بخشش طلب کرتے ہیں۔ہم اپنے نفسوں کے شر اور اپنی بداعمالیوں سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ جسے اللہ (سیدھی) راہ سجھا دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں (ہوسکتا۔) میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔اور تمہیں موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔''...... '' اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور (پھر) اس (جان) سے اس کی بیوی کو پیدا کیا۔پھر ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پیدا کر کے (زمین پر) پھیلا دیے۔اور ڈرو اللہ سے کہ جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے (حاجت براری کے لیے) سوال کرتے ہو اور ناطہ توڑنے سے (بھی ڈرو) بلا شبہ اللہ تمہارے اوپر نگہبان ہے۔''

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور بات سیدھی (سچی) کہا کرو۔(ایسا کرو گے تو) اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح کر دے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔اور جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت کی، اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔''

حمد وصلوٰۃ کے بعد: یقیناً تمام باتوں سے بہتر اللہ کی کتاب ہے۔تمام طریقوں سے بہتر طریقہ محمد (رسول اللہ ﷺ) کا ہے۔اور تمام کاموں سے بدترین کام وہ ہیں جو (دین اسلام میں) اپنی طرف سے وضع کیے جائیں۔دین میں ہر نیا کام بدعت اور ہر بدعت گمراہی ہے۔گمراہی کا انجام جہنم کی آگ ہے۔''

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدّمہ

اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بے پایاں فضل و احسان ہے کہ اس نے ''موضوع اور منکر روایات'' کی پہلی جلد کو مختلف طبقہ ہائے فکر و خیال اور مذہب و مسلک میں حسن قبول عطا کرنے کے بعد مجھے اس کی دوسری جلد قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی توفیق بخشی۔ اس موقع پر میں جو خوشی اور مسرت محسوس کر رہا ہوں، اس کو الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ اس کتاب کی پہلی جلد کا مطالعہ کرنے والے بعض محترم قارئین کے دو تاثرات ایسے ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے۔

(۱) پہلا تاثر یہ ہے کہ کتاب میں اسلام کے مختلف شعبوں سے متعلق جس کثرت سے ضعیف، موضوع اور منکر روایات کی مثالیں پیش کی گئی ہیں، ان سے ان لوگوں کے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہدایت کے لیے قرآن کافی ہے اور حدیث کی ضرورت نہیں۔ ان کے خیال میں دین کا جو عقائدی اور عملی ماخذ ہو جس سے متعلق ہزاروں کی تعداد میں روایات وضع کر کے اور گھڑ کر گھروں میں پھیلائی جا چکی ہوں، اس کے اس حصے پر جس کی صحت اور رسول اکرم ﷺ سے اس کی نسبت کا حکم لگایا گیا ہے یا لگایا جاتا ہے کس طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

(۲) دوسرا تاثر یہ ہے کہ ذکر و اذکار اور فضائل و مناقب کے باب میں پھیلی ہوئی اور زبان زد موضوع اور باطل روایات کو رواج دینے کا سب سے زیادہ ذمہ دار ''صوفیا'' کو قرار دے کر اس طبقے پر ظلم کیا گیا ہے، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ تصوف سے نسبت رکھنے والوں میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے بزرگوں کی بھی رہی ہے جنہوں نے علم حدیث میں بڑا نام پیدا کیا ہے اور ان کا شمار محدثین میں ہوتا ہے۔ تو کیا یہ بات قرین عقل ہے کہ جو لوگ حدیث کے پاسبان، محافظ اور خادم رہے ہوں وہی ایسے اقوال، عبارتوں اور روایات کو پھیلانے کے بھی مرتکب رہے ہوں جن کی نسبت نبی اکرم ﷺ سے صحیح نہیں ہے؟

کتاب کا مطالعہ کرنے والے بعض احباب کے یہ دونوں تاثرات بظاہر بڑے وقیع ہیں اور ان کو بنیاد بنا کر بعض مستند اور مسلمہ حقائق تک کو رد کیا جا رہا ہے، لیکن امر واقعہ کے تناظر میں یہ دونوں تاثرات بلکہ اعتراضات کسی گہری سوچ کے ترجمان نہیں ہیں، جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

جہاں تک حدیث یا سنت کے دین کا دوسرا ماخذ ہونے کا مسئلہ ہے، تو یہ کوئی اجتہادی یا قیاسی مسئلہ

نہیں ہے جس میں کسی غلطی کا بھی امکان ہو۔ بلکہ قرآن پاک نازل کرنے والے اللہ نے صریح الفاظ میں اپنے رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا جس طرح رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان مسلمان ہونے کی بنیادی شرط ہے، ٹھیک اسی طرح آپ کے ارشادات کو دین کا دوسرا ماخذ ماننا بھی مسلمان ہونے کی شرط ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴾ [الاحزاب:٣٦]

"کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو انہیں اس معاملے میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔"

مطلب یہ ہے کہ کسی بھی مسلمان کے لیے کسی بھی معاملے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم اور فیصلے کے مقابلے میں اپنی رائے اور پسند پر عمل کرنا جائز نہیں۔ جو کوئی ایسا کرے گا تو وہ اللہ و رسول کا نافرمان شمار ہوگا۔

صرف یہی نہیں بلکہ اگر کوئی مسلمان رسول اللہ ﷺ کے کسی حکم اور فیصلے سے اپنے دل میں تنگی محسوس کرے تو اس کا ایمان محل نظر ہے:

﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ [النساء:٦٥]

"نہیں، اے نبی! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ تم کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں اور سر تسلیم خم کر دیں۔"

نبی کریم ﷺ کے فرائض منصبی میں جس طرح اللہ کی کتاب کی آیتوں کو سنا دینا تھا، ٹھیک اسی طرح کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا اور لوگوں کا تزکیہ کرنا بھی تھا۔

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾

[آل عمران:١٦٤]

”درحقیقت اللہ نے اہل ایمان پر اس وقت بہت بڑا فضل فرمایا جب ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو اس کی آیات ان کو سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، بلاشبہ اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔“

ظاہری بات ہے کہ تزکیہ اور تعلیم ”تلاوت کتاب“ کے علاوہ ہے۔ یعنی نبی معلّم ﷺ اہل ایمان کو صرف کتاب اللہ کی آیتوں کو سنا دینے پر اکتفا نہیں فرماتے تھے بلکہ اپنے ارشادات سے اللہ کی کتاب کی تشریح بھی فرماتے تھے اور اپنا عملی نمونہ پیش کر کے ان کا تزکیہ اور ان کی اصلاح بھی کرتے تھے اور ان کو پاک بھی کرتے تھے۔

چونکہ رسول اللہ ﷺ مبلّغ عن اللہ تھے، آپ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے احکام اللہ کے احکام تھے اور آپ کی عملی زندگی کتاب اللہ کی ترجمان تھی، اس لیے آپ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔

فرمایا: ﴿ مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ [النساء:۸۰]

”جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔“

معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن پاک شرعی حجت ہے اسی طرح حدیث بھی شرعی حجت ہے۔ اور حدیث کا انکار کرنے والا خود قرآن کا منکر ہے۔ کیونکہ نبی ﷺ کی یہ حیثیت قرآن نے متعین کی ہے۔

مسلمانوں میں جس گروہ نے سب سے پہلے انکار حدیث کا فتنہ پیدا کیا یا حدیث کے شرعی ماخذ ہونے کو مشکوک بنانے کی کوشش کی وہ معتزلہ کا گروہ تھا۔ معتزلہ اہل علم اور اہل قلم تھے۔ وہ جہاں تمام متداول نقلی اور عقلی علوم میں مہارت رکھتے تھے وہیں زبان و بیان پر بھی حیرت ناک قدرت رکھتے تھے۔ معتزلہ نے فہم دین کے لیے عقل کو غیر معمولی اہمیت دی اور عقائد اور غیبی امور کو بھی عقل کے ذریعہ سمجھنا چاہا۔ اور جب اس راہ میں صحیح احادیث کو مزاحم پایا تو...... یا تو ان کا انکار کر دیا' یا نبی کریم ﷺ سے ان کی نسبت کو مشکوک قرار دے دیا۔

دوسری طرف انہی معتزلہ نے فہم دین میں عقل کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے عقل کے فضائل میں حدیثیں گھڑ کر لوگوں میں پھیلانے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ اپنے نہاں خانہ دل میں یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ اپنے باطل افکار و تصورات کو اس وقت تک پھیلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ اسی ذریعہ علم کا سہارا نہ لیں جس کی حجیت کو وہ اپنے مقاصد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور کر رہے تھے۔ اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مصداق بن گئے:

﴿ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ﴾ [النمل:١٤]

''سراسر ظلم اور غرور کے نتیجے میں انہوں نے اس کا انکار کیا حالانکہ ان کے دل اس کا یقین رکھتے تھے۔''

لیکن معتزلہ اپنے ان دونوں مقاصد میں سے کسی بھی مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ نہ ان کا انکارِ حدیث برگ و بار لایا اور نہ عقل کے فضائل میں ان کی گھڑی ہوئی روایات قبولیت حاصل کر سکیں۔ محدثین نے ایک ایک کر کے ان کی وضع کردہ حدیثوں کے تار و پود بکھیر دیے اور علمی دلائل سے یہ بھی ثابت کر دیا کہ عقل اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود عقائد اور ایمانیات کی توجیہ کرنے سے قاصر ہے اور غیبیات تک اس کی رسائی نہیں ہے۔ نیز یہ کہ عقل کے فضائل میں ایک بھی صحیح حدیث نہیں ہے۔

معتزلہ کے علاوہ مسلمانوں میں جو دوسرے فرقے پیدا ہوئے انہوں نے بھی اپنے باطل اور گمراہ عقائد و افکار کی تائید میں اور ان کو رواج دینے کے لیے حدیثیں وضع کیں، کیونکہ ان سب کو دین کے اہم اور بنیادی ماخذ ہونے کی حیثیت سے حدیث کی قدر و قیمت کا پتا تھا اور ان کو یہ معلوم تھا کہ حدیث کی تائید کے بغیر وہ اپنی کسی بات کو دینی رنگ دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہے کہ جو چیز جتنی زیادہ اہم اور قیمتی ہوتی ہے اسی کے بقدر اس میں جعل سازی بھی کی جاتی ہے۔

رہی یہ بات کہ دین کے مختلف شعبوں سے متعلق ہزاروں کی تعداد میں ضعیف، منکر اور موضوع روایات کے پھیل جانے کی وجہ سے وہ حدیثیں بھی مشکوک ہو گئیں جن کی نسبت رسول اکرم ﷺ سے صحیح ہے۔ تو یہ بات علم حدیث کے کسی گہرے مطالعہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کی پھیلائی ہوئی ہے جو حدیث کو شرعی ماخذ نہیں مانتے یا کم از کم جن کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن پاک میں جو عقائد، عبادات اور شرعی احکام بیان ہوئے ہیں ان کو حدیث کے بغیر سمجھا جا سکتا ہے۔

اوپر بیان کردہ دعویٰ کے غلط ہونے کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ دین کے مختلف شعبوں سے متعلق کتابوں میں درج اور لوگوں میں زبان زد جتنی بھی ضعیف، منکر اور موضوع روایات ملتی ہیں وہ سب ریکارڈ میں آچکی ہیں۔ علمائے حدیث نے ان روایتوں کی اسناد اور ان کے متون اپنی کتابوں میں درج کر کے ان کے ساقط الاعتبار ہونے اور ان کے ناقابل استدلال ہونے کو واضح کر دیا ہے اور جن راویوں نے ان کی روایت کی ہے یا جن کے ذریعہ ان کو وجود ملا ہے ان میں سے ''ہر ایک'' کے مکمل کوائف ''علم الرجال'' کی کتابوں میں پوری علمی دیانت داری کے ساتھ بیان کر دیے گئے ہیں۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں بلکہ عین

حقیقت ہے کہ محدثین کا گروہ دنیا کا وہ مقدس گروہ ہے جس نے راویوں کی جرح و تعدیل اور ان کی ثقاہت اور عدم ثقاہت کے بیان میں راویوں کے زہد و ورع، ان کے صلاح و تقویٰ اور ان سے اپنی قرابت اور رشتہ داری جیسی کسی بھی چیز کو رکاوٹ نہیں بننے دیا ہے۔ اگر کسی کو ثقہ کہا ہے تو صرف اس وجہ سے کہ وہ ثقاہت اور اپنی روایت میں قابل اعتماد ہونے کی جملہ صفات سے متصف تھا، اس وجہ سے نہیں کہ وہ بہت بڑا بزرگ، متقی، عبادت گزار اور زاہد تھا یا وہ فلاں محدث کا باپ، بیٹا یا استاد تھا۔

اسی طرح جس راوی کو نا قابل اعتبار، ضعیف، منکر، متروک اور حدیثیں گھڑنے والا قرار دیا گیا ہے تو اسی وقت جب اس کے حالات کا تتبع کرے، اس کی ذہانت، قوت حافظہ، اخلاقی حالت، صدق گوئی اور حاضر دماغی جیسے تمام اوصاف میں سے ہر چیز کو پرکھا اور جب وہ ان صفات سے عاری ملا یا ان میں سے کسی سے متصف ملا اور کسی سے عاری تو اسی کی روشنی میں اس کو ضعیف اور نا قابل اعتبار قرار دیا۔ اور یہ بھی بیان کر دیا کہ فلاں راوی فلاں سبب سے نا قابل اعتبار یا نا قابل استدلال تھا جس کو اصطلاح میں ''جرح مفسر'' کا نام دیا گیا ہے۔ رہے ضعیف، منکر اور موضوع روایتوں کے ''متون'' اور ان کی عبارتیں تو قرآنی آیات اور صحیح احادیث کی روشنی میں رکھ کر ان کو ضعیف اور نا قابل اعتبار قرار دیا گیا ہے۔

ایسی کتابیں جو نا قابل اعتبار روایتوں کے بیان کے لیے خاص ہیں وہ کثیر تعداد میں ہیں اور ان کے عالی مرتبت مصنفین کا شمار حفاظ حدیث میں ہوتا ہے۔ اسی طرح جن کتابوں میں حدیث کے راویوں کی جرح و تعدیل سے بحث کی گئی ہے ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے، جن میں پوری تفصیل سے راویوں کی ثقاہت و عدم ثقاہت کو بیان کیا گیا ہے اور ہر راوی کی مرویات کو مثال میں پیش کر کے ان کی سندوں کو بیان کرتے ہوئے ہر سند کے راویوں کی ثقاہت اور عدم ثقاہت کا حکم لگایا گیا ہے اور ہر راوی کے بارے میں علمائے جرح و تعدیل کے اقوال کو مکمل دیانت داری کے ساتھ انہی کے الفاظ میں نقل کر دیا گیا ہے۔

اگر کسی روایت کی سند کے راوی تو ثقہ ہیں، مگر اس سند اور روایت کے متن میں کوئی ایسی مخفی علت ہے جو روایت کو مجروح بنا رہی ہے تو علل الحدیث کے ماہر محدثین نے اس کو کھول دیا ہے اور اگر روایت کی سند کے تمام راوی تو ثقہ ہیں اور سند کی تمام کڑیاں بظاہر متصل اور مربوط بھی نظر آ رہی ہیں، لیکن حقیقت میں وہ متصل نہیں ہیں بلکہ درمیان سے کوئی کڑی غائب ہے تو ائمہ فن نے اس کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔

ائمہ حدیث کی وسعت معلومات کا یہ حال تھا کہ ان کو حدیث کے ہر راوی کے بارے میں یہ معلوم تھا کہ اس سے کتنی حدیثیں مروی ہیں۔ یا فلاں راوی سے فلاں راوی نے کتنی حدیثیں روایات کی ہیں۔ یا

کسی روایت میں کون سا راوی منفرد ہے اور وہ کون سے راوی ہیں جن کی روایت حدیث میں انفرادیت یا تفرد قابل اعتبار تھا اور کن کا نہیں؟

دین کے مختلف شعبوں سے متعلق موضوع اور منکر روایتوں کی وجہ سے صحیح احادیث کے بھی مشکوک اور نا قابل اعتبار ہونے کے دعوٰی کے غلط ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ صحیح حدیثوں کے مجموعے معلوم و معروف ہیں۔ مثال کے طور پر صحیحین کے بارے میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں۔

''محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ صحیحین کی وہ تمام حدیثیں جن کی سندیں متصل ہیں اور جو نبی کریم ﷺ سے منسوب، مرفوع ہیں وہ قطعی طور پر صحیح ہیں اور صحیحین کے مصنفین سے ان کی نسبت بھی تواتر سے ثابت ہے۔ لہٰذا صحیحین کی قدر و قیمت گھٹانے والا، نئی راہ نکالنے والا...... مبتدع...... اور اہل ایمان کے سوا دوسروں کے طریقے کی پیروی کرنے والا ہے۔[1]

واضح رہے کہ صحیحین کی بعض حدیثوں کی صحت کے بارے میں بعض علمائے حدیث سے منسوب جو اقوال ملتے ہیں وہ یا تو بعض حدیثوں کے بعض فقروں یا الفاظ سے متعلق ہیں' پوری حدیث یا اس کی سندوں سے متعلق نہیں ہیں۔ یا وہ صحت کے اس مقام اور درجے پر نہیں ہیں جس کے التزام کا ان کے عالی مرتبت مصنفین نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا۔

صحیحین کے علاوہ موطا امام مالک، سنن اربعہ، مسند امام احمد، صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان کی بیشتر اور غالب حدیثیں صحیح ہیں اور ان میں درج جن حدیثوں کی صحت مختلف فیہ ہے یا جو صحیح نہیں ہیں ان کو ان کی سندوں کے ذریعہ اہل علم بڑی آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں۔

اس وضاحت سے ان لوگوں کے دعوٰی کی جڑ کٹ جاتی ہے جو یہ تأثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ دین کے مختلف شعبوں سے متعلق ہزاروں کی تعداد میں ضعیف، منکر اور موضوع روایات کے پھیل جانے کی وجہ سے وہ حدیثیں بھی نا قابل اعتماد اور مشکوک ہوگئی ہیں جو محدثین کے نزدیک صحیح سندوں کے ساتھ رسول اکرم ﷺ سے منسوب ہیں۔ اور جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے کہ محدثین نے تمام ساقط الاعتبار راویوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر علم الرجال کی کتابوں میں ان کے نام ثبت کر دیے ہیں۔ اسی طرح تمام ضعیف، منکر اور موضوع روایتوں کو ان کی پوری سندوں کے ساتھ نا قابل اعتماد، ضعیف، منکر اور موضوع روایتوں کی کتابوں میں درج کر دیا ہے۔

اسی طرح عقائد، عبادات، تفسیر، سیرت پاک، تاریخ اور فضائل و مناقب وغیرہ کی کتابوں میں جو

[1] حجة الله البالغه، ص ۳۸٦، ۳۸۷، ج:۱

حدیثیں بطور استدلال نقل کی گئی ہیں ان تمام کی خالص علمی تخریج کر کے ہر حدیث کی صحت و سقم کو بیان کر دیا گیا ہے۔ اس طرح دین کے کسی بھی شعبے سے متعلق تحقیقی کتابیں لکھنے والوں کے لیے یہ بات نہایت آسان ہوگئی ہے کہ وہ ہر موضوع کے بارے میں حد درجہ قابل اعتماد حدیثیں معلوم کر سکتے ہیں۔

برصغیر کے ملکوں میں بعض شہرت یافتہ مصنفین نے اپنی کتابوں میں جو یہ دعوے کیے ہیں کہ محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل نے راویوں کی توثیق اور تضعیف مسلکوں کی بنیاد پر کی ہے تو یہ دعویٰ جہاں محدثین جیسے مقدس گروہ کے بارے میں ان کے برے گمان کی پیداوار ہیں وہیں ان کے علمی افلاس اور علم حدیث سے ان کے نابلد ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ اس جھوٹ اور افتراء کا پردہ چاک کرنے کے لیے علم الرجال کے موضوع پر کسی بھی مستند کتاب کا مطالعہ کر لینا کافی ہے کیونکہ اس میں کسی بھی راوی حدیث کی ثقاہت اور عدم ثقاہت بیان کرتے ہوئے اس کے فقہی مسلک کو بنیاد بنانا تو درکنار اس کا ذکر بھی نہیں ملے گا۔ البتہ گمراہ فرقوں سے تعلق رکھنے والے راویوں کے حالات بیان کرتے ہوئے اس طرح کے الفاظ ضرور ملیں گے: اس میں تشیع تھا، یا وہ رافضی تھا، یا خوارج سے تعلق رکھتا تھا یا ''ارجاء'' کا عقیدہ رکھتا تھا وغیرہ۔

اب رہا دوسرا تأثر جو اس کتاب کی پہلی جلد میں جھوٹی اور موضوع روایتوں کے بیان کے ضمن میں بار بار اہل تصوف کے ذکر کے بارے میں پیش کیا گیا ہے تو وہ صحیح ہے لیکن جھوٹی، باطل اور موضوع روایتوں کی ترویج میں ان کے ''اشتراک عمل'' کا دعویٰ کر کے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا گیا۔ ظلم تو تب ہوتا جب اس سے ان کا دامن پاک ہوتا، جب کہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اہل تصوف نے دین کے مختلف شعبوں سے متعلق اپنی تصنیفات کو اس ضعیف، منکر اور موضوع روایتوں سے بھر دیا ہے جن سے ان کے عقائد و افکار کی تائید ہوتی ہے۔

دراصل تصوف کتاب و سنت سے ماخوذ مسلک حیات نہیں بلکہ اسلام کے بالکل متوازی طریقہ حیات ہے۔ اگرچہ اس میں اسلامی باتیں بھی ہیں اور یہ محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ تصوف کی امہات الکتب کا صحیح اور سنجیدہ مطالعہ اس کے غیر اسلامی یا اسلام کے متوازی طریقہ حیات ہونے پر دلالت کرتا ہے اور خود علماء تصوف نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تفہیمات الٰہیہ اور فیوض الحرمین میں تحریر فرماتے ہیں:

''اللہ تک پہنچانے والے راستے دو قسم کے ہیں: ایک تو وہ ہے جسے وحی الٰہی اور تعلیمات انبیاء

نے بتایا ہے اور دوسرا وہ ہے جسے الہام اور معارف اولیاء نے متعین کیا ہے[1]...... اللہ تک پہنچنے کے دو راستے ہیں: ایک راستہ تو وہ ہے جو نبی ﷺ کے واسطے سے خلق تک پہنچا ہے۔ اور دوسرا راستہ وہ ہے جو اللہ اور اس کے بندے کے درمیان براہ راست ہے۔ اس جہت سے کہ وہ اس کے وجود میں لانے سے وجود میں آیا اور اس کے فیضان سے اس کو ظہور ملا ہے۔ اس راستے اور طریقے میں کوئی درمیانی واسطہ نہیں ہے۔''[2]

شاہ ولی اللہ کی ان دونوں وضاحتوں سے اتنی بات تو معلوم ہوگئی کہ طریق نبوت کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے کا طریقہ ہے جس کا یقین انسان خود کرسکتا ہے۔ اس مسئلے کو مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے خاص انداز میں زیادہ صراحت سے بیان کردیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب: شریعت و طریقت'' میں لکھا ہے: سلوک دو قسم پر منقسم ہے: سلوک نبوت اور سلوک ولایت۔ اور ہر ایک کے آثار و خواص جدا جدا ہیں......

اس کے بعد مولانا نے ایک دوسرے سے متوازی دو خانے بنائے ہیں، جن میں سے پہلے خانے کے اوپر ''آثارِ سلوکِ ولایت'' کا عنوان قائم کیا ہے اور دوسرے خانے کے اوپر ''آثارِ سلوکِ نبوت'' کا۔ اور ہر عنوان کے تحت نمبر وار اس کے آثار بیان کیے ہیں۔[3]

جس طرح ''طریق ولایت'' اپنے اعمال و اشغال میں طریق نبوت کے اعمال و اشغال سے مختلف ہے اسی طرح اپنے مقاصد میں بھی اس سے مختلف ہے۔

طریق ولایت کے اعمال و اشغال کا مقصد وصول الی اللہ اور فنا فی اللہ بیان کیا جاتا ہے جب کہ شریعت محمدی اور طریق نبوت کا مقصد کتاب و سنت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان کی تخلیق اس لیے ہوئی ہے کہ وہ اپنے خالق کی عبادت کرے اور اس عبادت سے اس کا مقصد اپنے خالق کی رضا اور خوشنودی کا حصول ہو۔ جیسے کہ قرآن میں ارشاد ہے:

﴿ قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ١ۚ۬ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا١ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۝ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ

[1] تفہیمات الٰہیہ ص ۲۸ بحوالہ بدعت وضلالت کے محرکات ص ۲۷۴ـ دین کا قرآنی تصور ص ۱۹۰
[2] فیوض الحرمین ص ۵۰ بحوالہ بدعت وضلالت کے محرکات ص ۲۷۴ـ دین کا قرآنی تصور ص ۱۹۰
[3] دیکھئے: اشرف علی تھانوی کی ''شریعت وطریقت'' ص ۴۵ـ ۴۷

الْعٰلَمِیْنَo ﴾ [الانعام:۱۶۱۔۱۶۲]

''اے نبی اعلان کرو کہ بے شک میرے رب نے مجھے سیدھے راستے کی ہدایت کی ہے جو درست دین اور ابراہیم کی ملت ہے کہ جو اللہ کے لیے یکسو تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔ اے نبی! کہہ دو، بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا صرف اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔''

اس ارشاد الٰہی سے دو چیزیں معلوم ہوئیں: (۱) طریق نبوت یا شریعت محمدی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کی متعین کردہ ہے۔ (۲) شریعت محمدی کے تمام اعمال اور عبادتیں صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اور صرف اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہیں۔

دراصل اسلام میں ''طریق ولایت'' نام کی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ صوفیا کا ذہنی اختراع ہے اور کسی ''ولی'' کی صفت کے طور پر ''ولایت'' کا بھی کوئی ذکر قرآن پاک میں نہیں آیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر صرف ایک جگہ اس کا ذکر ہے (الکہف: ۴۴) جس سے مراد اللہ تعالیٰ کا مطلق اختیار اور اس کی مطلق بالا دستی ہے۔ البتہ قرآن پاک میں ''ولی'' اور اس کی جمع ''اولیاء'' کا ذکر متعدد بار آیا ہے مگر ''اولیاء اللہ'' کی تعریف صرف ایک جگہ آئی ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَo الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَo ﴾ [یونس:٦٢۔٦٣]

''آگاہ رہو، درحقیقت اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کسی خوف کا موقع ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے تھے۔''

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ''ولی'' کوئی مافوق البشر یا کوئی غیر معمولی انسان نہیں ہوتا بلکہ ہر مومن اور متقی اللہ تعالیٰ کا ولی ہے۔ اسی وجہ سے امام ابوجعفر وراق طحاوی رحمہ اللہ عقیدہ طحاویہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

((اَلْمُؤْمِنُوْنَ كُلُّهُمْ اَوْلِيَاءُ الرَّحْمٰنِ وَاَكْرَمُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَطْوَعُهُمْ وَاَتْبَعُهُمْ لِلْقُرْآنِ))[1]

''تمام مومنین رحمٰن کے دوست ہیں اور ان میں جو سب سے زیادہ اللہ کا مطیع اور قرآنی

[1] عقیدہ طحاویہ ص ۲۲

تعلیمات کا متبع ہے وہ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ باعزت ہے۔"

معلوم ہوا کہ ولی یا ولایت کی صفت سے متصف ہر وہ شخص ہے جو اللہ و رسول کا مطیع و فرماں بردار ہو اور کتاب و سنت کے احکام اور تعلیمات کی پیروی اور اتباع کرے۔ نہ کہ وہ جو طریق نبوت یا شریعت محمدی کے متوازی اور مقابل کوئی اور طریقہ ایجاد کرے۔ اس تناظر میں "طریق ولایت" اللہ تعالیٰ تک لے جانے والا اور پہنچانے والا نہیں بلکہ اس سے دور کرنے والا راستہ اور طریقہ ہے۔ جیسا کہ اللہ عزوجل قرآن میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ﴾ [الانعام:۱۵۳]

"اور بلاشبہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ لہٰذا تم اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر مت چلو ورنہ وہ تم کو اس (اللہ رب العالمین) کے راستے سے دور اور منتشر کر دیں گے۔"

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ اللہ کے ہاں مقبول دین صرف اسلام ہے۔ تمام انبیاء اور رسولوں کا دین بھی اسلام تھا اور نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ کا دین بھی اسلام ہے اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے گا تو اللہ کے ہاں وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔[1]

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ نظریاتی تصوف سے متعلق تھا لیکن یہ دکھانے کے لیے کہ تصوف کی کتابوں میں کثرت سے ضعیف، منکر اور موضوع روایتوں سے کیوں استدلال کیا گیا ہے، اسلامی عقائد اور اعمال کے بارے میں صوفیا کے نقطۂ نظر کی وضاحت ضروری ہے۔

یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام میں عقائد کا باب سرفہرست ہے اور اسلامی عقائد کی روح عقیدۂ توحید ہے جس پر ایمان کے بغیر کوئی بھی عمل قابل قبول نہیں ہے۔

عقیدہ توحید کے بارے میں ارباب تصوف کی رائے پیش کرنے سے پہلے مختصراً توحید کو واضح کر دینا چاہتا ہوں تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ صوفیا کا عقیدۂ توحید وہ نہیں ہے جس کی دعوت کتاب و سنت میں دی گئی ہے اور جس توحید کی دعوت دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور رسول مبعوث فرمائے۔

چنانچہ کتاب و سنت کی نصوص کے تتبع سے اس توحید کے تین اجزاء کا ثبوت ملتا ہے جس کی دعوت دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور رسول بھیجے اور اپنی کتابیں نازل فرمائیں:

---

[1] آل عمران:۱۹، ۸۵،۸۴

(۱) توحید ربوبیت ...... جس کا مطلب ہے کہ کسی شخص کے مومن اور مسلم ہونے کے لیے یہ بنیادی شرط ہے کہ اس شخص کا اس بات پر ایمان ہو کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی خالق و مالک، رازق، اپنی تمام مخلوقات کے امور کی تدبیر کرنے والا اور ان کا نگہبان و محافظ اور دنیا و آخرت میں ان کے تمام معاملات میں تنہا صاحب تصرف ہے اور کائنات کے انتظام و انصرام میں اس کے ساتھ نبیوں، ولیوں، فرشتوں اور جنوں وغیرہ میں سے کوئی بھی شریک نہیں ہے۔

توحید کی اس قسم کا اقرار ہر دور میں کفار و مشرکین بھی کرتے تھے اور آج بھی کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں ایسی بے شمار آیات ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ کفار و مشرکین توحید ربوبیت کے قائل تھے۔ لہٰذا صرف توحید ربوبیت کے اقرار سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا۔

(۲) توحید الوہیت ...... یا توحید عبودیت کا مطلب ہے: اس بات پر ایمان لایا جائے کہ تنہا اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے۔ لہٰذا صرف اسی کی ذات مقدس ہی اس بات کی سزاوار ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور عبادت کی ہر صورت و شکل اور ہر نوع کو اس کے لیے خاص رکھا جائے۔

اللہ تعالیٰ ہی ہمارا معبود برحق ہے۔ اس لیے کہ صرف وہی ہمارا خالق و رازق ہے۔ صرف وہی ہماری حاجت روائی کرتا ہے۔ وہی ہماری مشکل کشائی کرتا ہے اور وہی ہمیں بیماریوں سے شفا دیتا ہے وغیرہ۔

قرآن پاک میں سب سے زیادہ زور اسی توحید الوہیت پر دیا گیا ہے جس کی دعوت تمام انبیاء اور رسولوں نے دی ہے۔ کیونکہ ہر دور اور ہر زمانے میں اہل کفر و شرک اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور عبادت ہی میں شرک کا ارتکاب کرتے تھے۔ اس طرح توحید الوہیت کے اقرار اور اس کے مطابق عمل کرنے میں توحید ربوبیت بھی داخل ہے۔ لیکن توحید ربوبیت میں توحید الوہیت داخل نہیں ہے ورنہ مشرکین جو توحید ربوبیت کے قائل تھے، الوہیت اور عبادت میں شرک کے مرتکب نہ ہوتے۔

دراصل قرآن نے توحید ربوبیت کو توحید الوہیت کے لیے بطور دلیل بیان کیا ہے۔ یعنی قرآن پاک میں کفار و مشرکین کو مخاطب کرکے بار بار یہ فرمایا گیا ہے کہ جب تمہیں معلوم ہے اور تم یہ اقرار کرتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور خالق نہیں ہے۔ اس کے سوا کوئی اور نہیں ہے جو تمہیں نفع و نقصان پہنچا سکے تو پھر تم اس کو چھوڑ کر دوسروں کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ یا اس کے ساتھ دوسرے معبود کیوں ٹھہراتے ہو؟

لیکن کفار و مشرکین یہ جانتے اور مانتے ہوئے بھی الوہیت اور عبادت میں شرک کرتے تھے کہ تنہا اللہ تعالیٰ ہی ان کا خالق و مالک اور رب ہے اور وہ اپنے اس شرک کی توجیہ یہ کرتے تھے کہ ہم اپنے

معبودوں کی عبادت ان کو مستقل بالذات معبود سمجھ کر نہیں کرتے ہیں، بلکہ ان کو اپنے اور اللہ کے درمیان واسطہ سمجھ کر ان کی عبادت کرتے ہیں۔

﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ [الزمر:۳]

''اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب تر کردیں۔''

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں یہ واضح فرما دیا کہ اس کے ہاں جو عبادت مقبول ہے وہ بے آمیز اور خالص عبادت ہے۔ اس کے نزدیک وہ لوگ بھی مشرک ہیں جو اس کے ساتھ دوسروں کو بھی معبود مانتے ہیں اور وہ بھی جو غیر اللہ کی عبادت، ان کو واسطہ سمجھ کر کرتے ہیں۔

دراصل اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے یا اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے اس کے مقرب بندوں میں سے کسی کو واسطہ بنانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ایسا کرنے والا اللہ تعالیٰ کی غیر محدود اور مطلق قدرت و اختیار اور اس کے بندوں کے احوال کا مکمل علم و واقفیت رکھنے کے بارے میں ناقص اعتقاد رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ واحد یکتا کے علم و قدرت کو مخلوق کے علم و قدرت پر قیاس کرکے دوسروں کا سہارا لیتا اور ان کو سفارشی بناتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا علم، اس کی قدرت اور اس کی تمام رحمت مخلوقات کو گھیرے ہوئے ہے: جیسا کہ اللہ کریم فرماتے ہیں:

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ﴾ [البقرہ:۱۸۶]

''اے نبی! اگر میرے بندے تم سے میرے بارے میں پوچھیں، تو میں ان سے قریب بھی ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔''

مطلب یہ ہے کہ میرا علم میرے بندوں کو محیط ہے ان کے دلوں میں ابھرنے والے خیالات تک سے میں واقف ہوں اور ان کی دعاؤں اور فریادوں کو فوراً سنتا بھی ہوں اور ان کی ضرورتوں اور حاجتوں کو فوراً پورا کرنے پر قدرت بھی رکھتا ہوں۔ پھر کتنے نادان ہیں وہ لوگ جو اس کو چھوڑ کر بے اختیار ہستیوں اور نقص و عیب سے متصف مخلوقات کو پکارتے اور ان سے اعانت طلب کرتے ہیں۔

(۳) توحید کا تیسرا حصہ اور جزء توحید اسماء و صفات ہے۔ یعنی اس بات پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ

کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں اس کے جو اسمائے ذات وصفات بیان ہوئے ہیں وہ سب حق ہیں۔لہٰذا ان اسماء میں کوئی تحریف وتبدیلی کیے بغیر اور ان کی کوئی مثال اور کیفیت بیان کیے بغیر ان کو تسلیم کیا جائے اور یہ ایمان رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اسمائے ذات وصفات میں اپنی کسی بھی مخلوق کی مانند نہیں ہے جیسا کہ فرمایا: ''لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ [الشوریٰ:۱۱]''

''اس کی مانند (ذاتِ اقدس وصفات عالیہ میں) کوئی بھی چیز نہیں ہے۔اور وہی (سب سے زیادہ) سننے والا، دیکھنے، جاننے والا ہے۔'' اور جب اللہ تعالیٰ کو پکارا جائے تو اس کے اسماء ہی کے ذریعہ پکارا جائے۔

﴿ وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ﴾ [الاعراف:۱۸۰]

''اللہ ہی کے لیے ہیں عمدہ نام، سو اس کو انہی ناموں سے پکارو''

اللہ تعالیٰ کے تمام اسمائے ذات وصفات ایسے ہیں جو اس کی عظمت وکبریائی، اس کے تفوق و برتری، اس کے تقدس و پاکیزگی، اس کی بے پایاں رحمت وشفقت اور اس کی صفات کمالیہ پر دلالت کرتے ہیں۔واضح رہے کہ انسان اپنے ذہن میں اللہ کے بارے میں جو تصور رکھتا ہے اسی کے مطابق اس کو نام بھی دیتا ہے۔اسی لیے جہاں اللہ تعالیٰ کے تمام اسمائے ذات وصفات پر ایمان لانا ضروری ہے وہیں اس کو اپنی طرف سے کوئی نام دینا بھی حرام ہے:

﴿ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝ ﴾ [النحل:۷٤]

''اللہ کے لیے مثالیں نہ گھڑو، کیونکہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''

اوپر توحید کے تینوں اجزا کو قدرے تفصیل سے اس لیے بیان کر دیا گیا ہے تاکہ اہل تصوف اللہ تعالیٰ کی جس توحید کا عقیدہ رکھتے ہیں اس کو سمجھنے اور اس پر صحیح یا غلط ہونے کا حکم لگانے میں آسانی ہو جائے۔

تصوف کی کتابوں میں عام طور پر عقائد کی بحث نہیں ملتی بہت کم ایسی کتابیں ہوں گی جن میں عقائد کا تذکرہ کیا گیا ہوگا۔اور اگر کسی کتاب میں عقائد کی بحث ملے گی بھی، تو صرف عقیدۂ توحید سے۔جن صوفیا نے توحید سے بحث کی ہے ان میں ابو اسماعیل انصاری ہروی کا نام سرفہرست ہے انہوں نے اپنی کتاب ''منازل السائرین'' میں توحید کی تین قسمیں بیان کی ہیں: (۱) عوام کی توحید (۲) خواص کی توحید (۳) خاص الخواص کی توحید۔

لکھتے ہیں: توحید کی پہلی قسم عوام کی توحید ہے جو بذریعہ شواہد درست اور صحیح ہے۔یہی وہ ظاہری اور

واضح توحید ہے جس سے شرک اعظم کی نفی ہوتی ہے۔[1]

شیخ ہروی نے جس توحید کو عوام کی توحید قرار دیا ہے وہ توحید الوہیت ہے جس کی دعوت اللہ تعالیٰ کے حکم سے تمام انبیاء اور رسولوں نے اپنی قوموں کو دی اور جس کی دعوت اللہ کے آخری اور محبوب رسول محمد ﷺ نے اپنی قوم کو دی۔ یعنی "لا الہ الا اللہ......" اللہ کے سوا کوئی اور معبود برحق نہیں ہے۔ اور اسی توحید کی دعوت نبی کریم ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کو ان کی وفات کے موقع پر ان الفاظ میں دی تھی:

((يَا عَمِّ! قُلْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، كَلِمَةً اَشْهَدُ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللّٰهِ))

"چچا جان لا الہ الا اللہ کہیے (نہیں ہے کوئی معبود برحق مگر اللہ) یہ ایک ایسا کلمہ ہے جس کے ذریعہ میں اللہ کے ہاں آپ کے حق میں ایمان کی گواہی دوں گا۔"

ایک دوسری روایت میں ہے:

((كَلِمَةً أُحَاجُّ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللّٰهِ))

"یہ ایک ایسا کلمہ ہے جس کے ذریعہ میں اللہ کی بارگاہ میں آپ کے ایمان کی دلیل پیش کروں گا۔"[2]

اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ))

"جو اس حال میں مرے گا کہ اس کو اس بات کا یقین ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود برحق نہیں ہے تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔"[3]

توحید الوہیت یا کلمہ اخلاص: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ...... ایک ایسی کنجی ہے جس کے ذریعہ ایک انسان "قصر اسلام" میں داخل ہوتا ہے اور اسی کے ذریعہ اس دنیا سے بحالت ایمان رخصت ہوتا ہے۔ اس توحید الوہیت کو عوام کی توحید قرار دینے سے یہ لازم آتا ہے کہ نعوذ باللہ سید المرسلین ﷺ اور آپ سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیاء اور رسول نیز انبیاء کے بعد دنیا کی مقدس ترین جماعت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عوام کے درجے کے مؤحد رہے تھے۔ خواص اور خاص الخواص تو وہ صوفیا ہیں جنہوں نے

---

[1] بحواله مدارج السالكين ص ٣٧٥۔ ٣٨٠ ج: ٣

[2] صحيح بخاری/ ح: ١٣٦٠۔ ٣٨٨٤، ٤٦٧٥، ٤٧٧٢، ٦٦٨١۔ صحيح مسلم/ ح: ٢٤

[3] صحيح مسلم/ ح: ٢٦

کتاب وسنت سے آزاد ہو کر اپنے ذہن ودماغ سے نیا دین اور اس کے عقائد اور احکام گھڑ لیے ہیں۔

شیخ ابو اسماعیل ہروی نے توحید کی دوسری قسم یعنی خواص کی توحید کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''توحید کی دوسری قسم جو حقائق کے ذریعہ وجود میں آتی ہے خواص کی توحید ہے۔ جس کا مفہوم ہے کہ ظاہری اسباب کو کالعدم کر دیا جائے۔ عقلی حجت بازیوں اور شواہد سے تعلق جوڑنے سے بلند ہو جایا جائے۔ بایں معنی کہ موحد کی نظر نہ تو توحید کے سلسلے میں کسی دلیل پر جائے، نہ وہ توکل کے سلسلے میں کسی سبب پر اعتماد کرے اور نہ نجات کے سلسلے میں کسی وسیلے کو اختیار کرے......''[1]

ہروی نے خواص کی جس توحید کی تعریف پیش کی ہے اس کا ہر لفظ نہایت مبہم اور اپنے مدلول میں حد درجہ غیر واضح ہے۔ کیونکہ یہ ایک خیالی توحید ہے جس کا عالم خارجی میں کوئی وجود نہیں ہے، نہ اس کو کتاب وسنت کی تائید حاصل ہے اور نہ آئمہ اسلام نے اس کو اپنی عملی زندگی میں اپنایا ہے۔

خواص کی اس توحید میں پہلی چیز ظاہری اسباب سے صرف نظر کر لینا ہے جبکہ ظاہری اسباب میں اعمال بھی داخل ہیں اور اسلام نے جن اعمال کا حکم دیا ہے اور ان کو فرض قرار دیا ہے ان کا انکار اور ان کو ترک کر دینا کفر ہے۔

شیخ ہروی کی یہ بات صحیح ہے کہ توحید کے اثبات میں عقلی حجت بازیوں سے دور رہا جائے کیونکہ اس طرح کے امور میں عقل کی رسائی بہت محدود ہے۔

لیکن توحید کے مسئلے میں کسی دلیل کو نہ دیکھنے سے اگر انسانی دلیل مراد ہے تو یہ بات صحیح ہے۔ لیکن خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنی توحید کے جو دلائل دیے ہیں ان پر غور وتدبر سے دل کے یقین و اذعان کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ''آفاق وانفس'' میں غور و تدبر کرنے کا حکم دیا ہے۔

انہوں نے توحید کے تقاضوں کے ضمن میں اسباب پر توکل سے بلند ہو رہنے اور نجات کے لیے کسی وسیلہ اور ذریعہ کو خاطر میں نہ لانے کی جو بات کہی ہے؟ وہ خالص صوفیانہ نقطہ نظر کی ترجمان ہے۔ اس عالم اسباب میں اسباب کو اس طرح عمل میں لانا کہ اعتماد اسباب کے خالق پر رہے عین اسلام ہے۔ اسی طرح آخرت کی کامیابی اور دوزخ سے نجات کے لیے اعمال شرط کا درجہ رکھتے ہیں۔ قرآن پاک میں ایمان

---

[1] مدارج السالکین/ ص ۳۸۷، ج:۳

اور عمل صالح کو لازم وملزوم قرار دیا گیا ہے۔

شیخ ہروی نے خاصان خاص یا خاص الخواص کی توحید جس چیز کو قرار دیا ہے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

رہی توحید کی تیسری قسم تو وہ ہے جس کو اللہ نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ جو اس کے مقام و مرتبے کے لحاظ سے اس کے شایان شان ہے۔ اس توحید کی صرف ایک جھلک اس نے اپنے برگزیدہ بندوں میں سے کچھ لوگوں کے باطن کو دکھائی ہے اور پھر ان کی زبانوں کو اسے بیان کرنے سے گونگا بنا دیا ہے اور دوسروں تک اسے پھیلانے سے ان کو درماندہ کر دیا ہے۔[1]

یہ پوری عبارت حد درجہ گمراہ کن اور صوفیا کی غیر اسلامی ذہنیت کی ترجمان ہے۔ کیونکہ جو چیز مطلوب ہو اس کا ممکن الحصول ہونا ضروری اور لازمی ہے۔ توحید کا اقرار بندوں سے مطلوب ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام انبیاء اور رسولوں کو اس بات کا مکلف بنایا تھا کہ وہ اپنی قوموں میں توحید کو پھیلائیں اور عام کریں۔ اب اگر اللہ کے نبی اور رسول نعوذ باللہ توحید کے بیان سے عاجز اور ان کی زبانیں اس توحید کا وصف بیان کرنے سے گونگی تھیں تو پھر وہ ان سے مطلوب کیونکر ہو سکتی تھی؟!

قرآن تو یہ صراحت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور محبوب بندے اس کے انبیاء اور رسول تھے اور ان رسولوں میں اس کے ''اولو العزم'' رسولوں کا درجہ دوسروں سے بلند تھا اور ان سب سے افضل حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت محمد خلیل اللہ وحبیبہ صلوات اللہ وسلامہ علیہما تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان تمام برگزیدہ بندوں کے دلوں میں جس توحید کی شمع روشن کی اور جس کے الفاظ ان کی مبارک زبانوں سے جاری کرائے وہی کامل ترین توحید تھی جس کو انہوں نے نہایت واضح طریقے سے بیان کیا۔ اس کے اوصاف بتائے اور اپنی قوموں کو اس کی دعوت دی۔

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں شیخ ہروی کے درج ذیل اشعار:

مَا وَحَّدَ الْوَاحِدَ مِنْ وَاحِدٍ ۔۔۔ إِذْ كُلُّ مَنْ وَحَّدَهُ جَاحِدٌ

تَوْحِيدُ مَنْ يَنْطِقُ عَنْ نَعْتِهِ ۔۔۔ عَارِيَةٌ أَبْطَلَهَا الْوَاحِدُ

تَوْحِيدُهُ إِيَّاهُ تَوْحِيدُهُ ۔۔۔ وَنَعْتُ مَنْ يَنْعَتُهُ لَاحِدٌ

واحد کی توحید تو کسی نے بیان ہی نہیں کی کیونکہ جس نے اس کی توحید بیان کی وہ اس کی توحید کا

[1] مدارج السالکین/ ص ۴۰۱، ج:۳

انکاری ہے۔

اس شخص کی توحید جو اس کا وصف بیان کرے صداقت سے عاری ہے، جس کو خود ذات واحد نے باطل قرار دے دیا ہے۔

اس نے خود اپنی توحید بیان کی ہے۔ وہی اس کی توحید ہے اور جو شخص اس کی توحید کا وصف بیان کرے وہ راہ راست سے ہٹا ہوا ہے۔"

کفر سے عبارت ہیں۔ اور ان لوگوں کے عقائد کے ترجمان ہیں جو "اولیاء اللہ" کے ساتھ اللہ کے اتحاد اور ان کے اندر اس کے حلول کر جانے کے قائل ہیں۔ یہی عقیدہ نصاریٰ بھی رکھتے ہیں۔ لیکن حلول اور وحدۃ الوجود کے قائل صوفیا نصاریٰ سے بھی زیادہ برے ہیں۔ کیونکہ نصاریٰ صرف حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق حلول کے قائل ہیں جبکہ صوفیا کا عقیدہ ہے کہ (نعوذ باللہ) اللہ اپنے تمام منتخب اور برگزیدہ بندوں کے دلوں میں حلول کر گیا ہے۔ اس طرح ان کے اندر اپنے حلول اور ان کے ساتھ اپنے اتحاد سے اپنی توحید بیان کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں "توحید بیان کرنے والے اور وہ جس کی توحید بیان کرتے ہیں۔ دونوں ایک ہو چکے ہیں۔

﴿ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ﴾

"بڑی (سخت اور کفریہ) بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ یہ لوگ بالکل جھوٹ کہہ رہے ہیں۔"

صوفیا میں تو ایسے لوگ بھی گزرے ہیں کہ جب ان پر اعتراض کیا گیا کہ آپ لوگوں کی بیان کردہ توحید اس توحید کے خلاف ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے تو انہوں نے یہاں تک کہہ دیا:

قرآن تو سارے کا سارا شرک ہے۔ توحید تو وہ ہے جو ہم کہتے ہیں[1]!!

کہا جا سکتا ہے کہ سارے صوفیا تو حلول اور وحدۃ الوجود کے قائل نہیں ہیں، بلکہ معدودے چند ہی ایسا عقیدہ رکھتے ہیں جبکہ ان کی اکثریت ایسا عقیدہ نہیں رکھتی، تو یہ بات کسی حد تک صحیح ہے۔ کیونکہ جن صوفیا نے حلول اور وحدۃ الوجود کے مسئلے میں سکوت اختیار کیا ہے یا اس کی نکیر کی ہے وہ ان لوگوں کے لیے اپنے دلوں میں نہ صرف یہ کہ نرم گوشے رکھتے تھے اور اب تک رکھتے ہیں بلکہ ان کو "اولیاء اللہ" میں شمار کرتے ہیں۔ ان کی مدح سرائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ایسی صورت میں وہ حلول اور

[1] مدارج السالکین/ ص ۴۰۷، ج:۳

وحدۃ الوجود کا عقیدہ رکھنے والوں کے مؤید ہوئے۔

جب صوفیا کے نزدیک "توحید الوہیت" عوام کی توحید قرار پائی تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کلمہ اخلاص "لا الہ الا اللہ" عوام کا ذکر قرار پایا جس کو زبان نبوت "افضل الذکر" قرار دے چکی ہے جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا۔ اس طرح تصوف اپنی اصل تشکیل میں طریق نبوت...... شریعت محمدی...... کا مغایر، اس کی توحید، اسلامی توحید کی مخالف اور اس کا ذکر کتاب وسنت میں بیان کردہ ذکر کی ضد ثابت ہوا جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ کا ذکر عبادت ہے اور عبادت وہی مقبول ہے جو مطابق شرع ہو۔ یعنی جس کا طریقہ اللہ نے یا اس کے رسول نے بتا دیا ہو۔ یہ چیز شہادتین میں داخل ہے۔ بایں معنی کہ جب کوئی یہ گواہی دیتا ہے: "لا الہ اِلا اللّٰہ" اللہ کے سوا کوئی اور معبود برحق نہیں وانّ محمّدًا رسولُ اللّٰہ...... اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو وہ یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کو بھی معبود نہیں بنائے گا اور اس کی عبادت اس طریقے سے کرے گا جو طریقہ اللہ نے خود یا اس کے رسول نے بتا دیا ہے۔ اور محمد ﷺ کو اللہ کا رسول ماننے کا مطلب یہ اقرار ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ مبلغ عن اللہ ہیں۔ آپ نے جو خبر دی ہے وہ سچ ہے اور جو احکام دیے وہ واجب الاطاعت ہیں۔ اور عبادت کا جو طریقہ آپ نے بتا دیا ہے صرف وہی صحیح اور قابل عمل ہے۔ نبی مکرم ﷺ کے سوا کسی بھی انسان کا بتایا ہوا طریقۂ عبادت مردود اور نا قابل عمل ہے۔

احادیث میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کی متعدد شکلیں اور متعدد صیغے بیان کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہتے ہیں:

میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((أَفْضَلُ الذِّكْرِ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَفْضَلُ الدُّعَاءِ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ))[1]

"بہترین ذکر: لا الہ الا اللہ ہے اور بہترین دعا الحمد للہ ہے"

حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((أَفْضَلُ مَا قُلْتُ أَنَا وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ قَبْلِي: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ))[2]

---

[1] جامع ترمذی/ ح: ۳۳۸۳، ابن ماجہ/ ح: ۳۸۰۰

[2] موطا الإمام مالک کتاب القرآن/ ح: ۳۲۔ کتاب الحج/ ح ۲۴۶۔ جامع ترمذی/ ح: ۳۵۸۵۔ الفاظ ہیں: خیر الدعاء دعاء یوم عرفة وخیر ما قلت انا والنبیون من قبلی......

"بہترین بات جو میں نے اور مجھ سے پہلے انبیاء نے کہی یہ ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں ہے۔ ملک اس کا ہے، تعریف اس کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَقِّنُوْا مَوْتَاكُمْ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ))[1]

"اپنے قریب المرگ عزیز کو "لا الہ الا اللہ" پڑھنے کی تلقین کرو"

ایک طرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات ہیں تو دوسری طرف صوفیا ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ "لا الہ الا اللہ" عوام کا ذکر ہے۔ خواص کا ذکر یہ ہے کہ اسم مفرد اللہ کا ورد کیا جائے اور خاص الخواص کا ذکر یہ ہے کہ اسم ظاہر کے بجائے مضمر "یا ھو" کا ورد کرے۔[2]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اسم مفرد کے ذکر کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

اسم مفرد چاہے وہ اسم ظاہر ہو یا اسم مضمر مکمل کلام نہیں ہے اور نہ مفید جملہ ہے۔ اس سے نہ ایمان کا تعلق ہے اور نہ کفر کا۔ نہ اس سے امر کا مفہوم نکلتا ہے اور نہ نہی کا۔ اس کا ذکر نہ تو اسلاف میں سے کسی نے کیا ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مشروع قرار دیا ہے۔[3]

صوفیا کے جو تین بڑے سلسلے ہیں: قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ...... ان میں اس اسم مفرد کے ذکر کی مشق کرائی جاتی ہے۔

سلسلۂ قادریہ میں اس کا طریقہ یہ ہے کہ سالک اسم ذات اللہ کی ضرب لگائے یعنی لفظ "اللہ" کو مد کے ساتھ کھینچ کر زور سے ایک ضرب میں ادا کرے...... جب اس کی مشق ہو جائے تو اسی اسم ذات کو دو ضربوں کے ساتھ ادا کرے۔[4]

مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی اسم ذات کے ذکر کا طریقہ بتایا ہے، لکھتے ہیں:

اسم ذات کا ذکر اس طرح کرے کہ اللہ اللہ کے ذکر کے موقع پر اول حرف ہائے لفظ اللہ کو پیش اور دوسرے ہائے لفظ اللہ کو ساکن کرے۔ یعنی جزم دے اور آنکھیں بند کر کے اور سر کو داہنے مونڈھے پر لا

---

[1] صحیح مسلم/ ح: ۹۱۶، ۹۱۷۔ ابوداؤد/ ح: ۳۱۱۷۔ جامع ترمذی/ ح: ۹۸۳۔ سنن نسائی/ ح: ۱۸۲۵۔ سنن ابن ماجہ/ ح: ۱۴۴۴

[2] العبودیہ ص ۹۶

[3] ص ۹۷

[4] تصوف اور شریعت ص ۵۸، ج:۱

کر لفظ مبارک اللہ: اللہ کی دونوں ضرب جہر اور قوت سے دل پر مارے۔ اس ذکر اسم ذات دو ضربی کو چھ سو بار مداوم کرے۔[1]

ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری نے اپنی کتاب ''تصوف اور شریعت'' میں ''سلسلہ قادریہ'' کے مطابق اسم ذات کے ذکر بالجہر اور لا الہ الا اللہ کے ذکر کے جو طریقے لکھے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

سالک اسم ذات: اللہ کی ضرب لگائے۔ یعنی لفظ 'اللہ' کو مد کے ساتھ کھینچ کر زور سے ایک ضرب میں ادا کرے۔ ایسا کرتے وقت اسے قلب و حلق کی ساری قوت لگا دینی ہوتی ہے۔ جب اس کی مشق ہو جائے تو اسی اسم ذات کو دو ضربوں کے ساتھ ادا کرے..... پھر ذکر نفی و اثبات کی ابتدا کرے۔ یعنی لا الہ نفی الا اللہ اثبات کو اس طرح ادا کرے جیسے یہ لفظ ناف سے نکال کر اپنے داہنے کندھے تک کھینچ رہا ہو۔ پھر لفظ اللہ کو اس طرح ادا کرے جیسے یہ لفظ پیشانی سے نکال رہا ہو اور آخر میں ''الا اللہ'' کو بھر پور قوت سے ادا کرے۔ یہ الفاظ ادا کرتے وقت خود کو ایسے عالم میں محسوس کرنے کی کوشش کرے جہاں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہ مطلوب ہے اور نہ محبوب۔ بلکہ اس کے سوا کچھ بھی موجود نہیں ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

ان دونوں اذکار کی مدد سے ذہن اللہ تعالیٰ پر مرکوز ہو جائے گا اور عشق الٰہی کی آگ دل میں بھڑک اٹھے گی۔[2]

شریعت و طریقت میں اسم مفرد کے ذکر بالجہر اور تصوف و شریعت میں اسم ذات اور کلمۂ اخلاص کے ذکر کے جو طریقے بتائے گئے ہیں کیا، ان کا کوئی ثبوت کتاب اللہ اور نبی اکرم ﷺ کے عمل اور صحابہ کرام کے عمل سے ملتا ہے؟ نہیں۔ اور کیا کلمۂ اخلاص کے ذکر کا مقصد اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت میں کہیں اشارۃً بھی یہ بتایا گیا ہے کہ مومن اللہ کے سوا کسی اور کو مطلوب و محسوس نہ کرے بلکہ اللہ کے سوا کچھ بھی محسوس نہ کرے؟

یا یہ بتایا گیا ہے کہ مومن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو اپنا رب اور معبود نہ مانے اور اپنے دل کو غیر اللہ کی ربوبیت اور الوہیت کے خیال سے بالکل پاک کر لے؟!

پھر کیا کتاب و سنت میں کہیں ایک بار ہی سہی ''دل میں عشق الٰہی کی آگ بھڑکانا'' عبادت کا مقصود

[1] شریعت اور طریقت ص ۲۷۱

[2] ص ۵۸، ج ۱

قرار دیا گیا ہے؟ بلکہ کیا اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات میں ایک بار بھی اس لفظ "عشق" کا ذکر کہیں آیا ہے؟ قطعاً نہیں۔ تو پھر شریعت میں ایک غیر مطلوب چیز کے حصول کے لیے ایک غیر شرعی عمل کیونکر جائز ہوسکتا ہے؟ مطلوب ہونا تو دور کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب تو یہ کہتی ہے کہ مومن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے اور اس کو اللہ تعالیٰ کا محبوب بنانے کا واحد ذریعہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے اور رسول محمد النبی الکریم ﷺ کی شریعت کی بے چون و چرا پیروی ہے اور آپ کے نقش قدم پر چلنا۔

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ط ﴾ [آل عمران:۳۱]

"اے نبی! کہو، اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا"

صوفیا کہتے ہیں کہ صحابہ کرام کو رسول اکرم ﷺ کی صحبت اور رفاقت سے توجہ الی اللہ میں یکسوئی حاصل ہو جاتی تھی اور دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی شمع روشن رہتی تھی۔ لیکن عصر نبوی کے بعد نبی ﷺ کی صحبت و رفاقت ممکن نہیں رہی اس لیے بزرگان دین نے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی روشنی باقی رکھنے اور توجہ الی اللہ میں یکسوئی قائم رکھنے اور غیر اللہ کی محبت سے ان کو پاک رکھنے کے لیے "ذکر بالجہر" کے طریقے ایجاد کیے ہیں۔

ارباب تصوف کی اس بات سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول ﷺ کے ذریعہ انسانوں کے لیے جو شریعت نازل کی ہے اور اس میں اپنی عبادت کے جو طریقے بتائے ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد ناکافی ہو چکے ہیں اور بعد کے زمانوں میں تا قیامت نام نہاد بزرگان دین کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ دلوں کے روگ اور بیماریوں کے علاج کے لیے حسب حال علاج تجویز کرتے رہیں۔ اب اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر "تکمیل دین" کا کیا مطلب ہے؟ جس کا اعلان اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کر دیا ہے۔ (المائدہ:۳) اور یہ دعویٰ کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ "اسلامی شریعت قیامت تک کے لیے صالح ہے"۔

درحقیقت صوفیا کا یہ دعویٰ کہ عصر نبوی میں رسول اکرم ﷺ کی صحبت و رفاقت دلوں کی بیماریوں کے علاج کے لیے کافی تھی اور اس کے ذریعہ تعلق مع اللہ کی نعمت حاصل ہو جایا کرتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور رفاقت کے ذریعہ توجہ الی اللہ میں یکسوئی قائم رہتی تھی۔ یہ دعویٰ صوفیانہ تصور دین کا غماز ہے اور امر واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حالت ایمان میں جن خوش نصیبوں کو اللہ تعالیٰ

کے محبوب رسول ﷺ کی رفاقت حاصل تھی وہ انبیاء اور رسولوں کے بعد اس زمین پر بسنے والوں میں سب سے زیادہ مقدس لوگ تھے۔ لیکن ان کا یہ تقدس اور دوسروں پر ان کی اس فضیلت کا سبب صرف نبی کریم ﷺ کی صحبت و رفاقت نہیں بلکہ نبی معظم ﷺ کی کامل اطاعت اور پیروی تھی:

﴿ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۠ ﴾ [الاعراف:۱۵۷]

''پس جو لوگ اس پیغمبر (محمد رسول اللہ ﷺ) پر ایمان لائے اور اس کی حمایت و نصرت کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ نازل کی گئی درحقیقت وہی فلاح یاب ہیں''

یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ صحابہ کرام میں ایسے لوگ بھی تھے جن کو رسول اکرم ﷺ کی صحبت و رفاقت ہمہ وقت حاصل نہیں تھی۔ یعنی وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ سے احکام و تعلیمات لے کر اپنے قبیلوں میں واپس چلے جاتے اور نبی مکرم ﷺ کی تعلیمات پر حرف بحرف عمل کرتے۔ خود مدینہ منورہ کے اندر بسنے والوں میں بھی جہاں ایسے صحابہ کرام تھے جن کو دن رات نبی ﷺ کی رفاقت حاصل ہوتی وہیں ایک بہت بڑی تعداد ایسے صحابہ کرام کی بھی تھی جو اپنے کاروبار حیات میں مشغول ہوتے اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور احکام پر عمل پیرا رہتے مگر سیرت کی کتابوں سے اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ جن صحابہ کرام کو آپ کی زیادہ رفاقت حاصل تھی وہ ان لوگوں سے افضل تھے جن کو یہ رفاقت کم حاصل ہوتی دراصل فضیلت کا معیار یہ تھا کہ کون اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا زیادہ مطیع و فرماں بردار ہے۔

اوپر یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ ذکر عبادت ہے اور اسلام میں عبادت کے قبیل کی جتنی چیزیں ہیں وہ جزئیات کی حد تک مکمل ہیں اور کسی بھی قادری، چشتی اور نقشبندی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ تعلق مع اللہ کو مضبوط بنانے کے لیے کسی طرح کا ذکر تجویز کرے۔ اور جو ایسا کرے گا تو اس کا بتایا ہوا طریقۂ ذکر باطل، گمراہی اور مردود ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد آنے والوں کو کتاب و سنت پر مضبوطی سے جمے رہنے کی تعلیم دی ہے، نئی راہیں نکالنے کی نہیں۔

تصوف کی چوتھی چیز جو اسلام کے توحیدی مزاج کے لیے مہلک زہر ہے وہ اس کا ''تصور شیخ'' ہے۔ اس تصور نے صوفیا میں شیخ کی عقیدت میں غلو کے جراثیم پیدا کیے۔ پھر یہ غلو پیر پرستی میں تبدیل ہو گیا، جس کے نتیجے میں عالم اسلام میں عموماً اور برصغیر میں خصوصاً مشہور اولیاء اللہ اور صلحائے امت کی قبریں

بت کدوں میں تبدیل ہوگئیں۔تصور شیخ کے بارے میں مولانا اشرف علی تھانوی تحریر فرماتے ہیں:

"شیخ کی صورت اور اس کے کمالات کے زیادہ تصور کرنے سے اس سے محبت پیدا ہو جاتی ہے اور نسبت قوی ہوتی ہے اور قوت نسبت سے طرح طرح کی برکات حاصل ہوتی ہیں...... اصل مقصود تصور حق تعالیٰ کا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ چونکہ مرئی نہیں ہے اس لیے جن لوگوں کی قوت فکریہ ضعیف ہوتی ہے ان کو یہ تصور جچتا نہیں۔ کیونکہ ان کے ذہن میں خیالات بہت آتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یکسوئی حاصل کرنے کے واسطے تصور شیخ تجویز کیا گیا ہے کیونکہ یہ علاج بالضد ہوتا ہے۔ یعنی خیال کے دفع کرنے کے لیے دوسرے خیال کو ذہن میں جمایا جائے گا خواہ وہ کوئی خیال ہو۔ پس ان خیالات مختلفہ کے دفع کرنے کے واسطے ہر دیکھی ہوئی چیز کا تصور کافی ہے جس پر خیال جم سکے۔ لیکن ان سب خیالات میں سے شیخ کا تصور انفع ہے کہ وہ محبوب ہونے کی وجہ سے ذہن میں زیادہ جمے گا۔ اس لیے دفع خیالات میں زیادہ مؤثر ہوگا۔

تصور شیخ کوئی بالذات مطلوب نہیں ہے، صرف توجہ الی اللہ کے وقت جو وساوس مجرد کا ہجوم ہوتا ہے وہ قطع وساوس کے لیے ہے، اس سے یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے، پھر اس یکسوئی سے توجہ الی اللہ کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس استعداد کو مقصود میں صرف کرنا اور جب مقصود حاصل ہو جائے تو پھر ان ہیئات و قیود کی ضرورت نہیں رہتی۔[1]

توجہ الی اللہ یا اللہ تعالیٰ کی عبادت کے موقع پر خصوصیت کے ساتھ دوران نماز ذہن و دماغ میں وسوسوں کے پیدا ہونے سے اگرچہ یکسوئی باقی نہیں رہتی مگر یہ انسان کا چونکہ اختیاری فعل نہیں ہے اسی وجہ سے کتاب وسنت میں اس پر کوئی وعید نہیں آئی ہے اور نہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کہیں یہ فرمایا ہے کہ ذہن و دماغ میں وسوسوں کی حالت میں نماز باطل ہو جاتی ہے اور عند اللہ مقبول نہیں ہوتی۔ لہٰذا ایک مومن کو چاہیے کہ وہ توجہ الی اللہ یا عبادتوں کے موقع پر اپنے ذہن کو اس بات پر مرکوز رکھے کہ وہ اپنے معبود حقیقی اور اپنے رب کی بارگاہ میں کھڑا ہے جو اس کی تمام حرکات وسکنات کو دیکھ رہا ہے۔ اس خیال کو بار بار تازہ کرتے رہنے سے بہت حد تک یکسوئی آجاتی ہے۔ لیکن ذہن و دماغ میں یکسوئی پیدا کرنے کا جو "علاج بالضد" صوفیا نے تجویز کیا ہے کہ "ذہن میں شیخ کے تصور کو جما لیا جائے" تو اس پر یہ مثل صادق آتی ہے۔

"گئے تھے زکام کی دوا لینے اور لے آئے جذام"

جو شخص بھی سلیم الفطرت اور توحید آشنا ہوگا وہ "تصور شیخ" کی بات سنتے ہی اس پر شرک اور بت

---

[1] شریعت اور طریقت/ص:۲۸۵

پرستی کا حکم لگا دے گا۔ جیسا کہ سید احمد شہید نے شاہ عبدالعزیز سے بیعت کے موقع پر "تصورِ شیخ" کی تلقین کے جواب میں فرمایا تھا:

"حضرت اس میں اور بت پرستی میں کیا فرق ہے؟ اس میں صورت سنگی اور قرطاسی ہوتی ہے اور اس میں صورت خیالی۔ جو دل میں جگہ پکڑ لیتی ہے اور اس کی طرف توجہ اور اس سے استعانت ہوتی ہے"[1]

کس قدر مبنی بر صداقت اور حق کا ترجمان تھا سید صاحب کا تبصرہ! اور اس کے جواب میں شاہ عبدالعزیز نے حافظ شیرازی کا درج ذیل شعر پیش کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان کے پاس کتاب وسنت کی کوئی دلیل نہیں ہے جیسا کہ سید صاحب نے فرمایا تھا:

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید   کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ و رسمِ منزلہا

کون پیر مغاں اور کون شیخ یہ مقام رکھتا ہے کہ اس کے حکم کی اطاعت کی جائے اور اللہ سے تعلق جوڑنے اور اس کی طرف توجہ میں یکسوئی پیدا کرنے کے لیے "شیخ کے بت" کو ذہن میں جما لیا جائے۔ ایسا تو اللہ تعالیٰ کے سب سے محبوب بندے اور اشرف الخلق ﷺ کے حق میں بھی جائز نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے موقع پر آپ کی ذاتِ مبارک کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا جائے۔ تو پھر کس من گھڑت مقبول بندے اور ولی کے حق میں جائز ہو سکتا ہے؟!

اب آیئے ذرا دیکھیں کہ پیران پیر مولانا رومی کیا فرماتے ہیں:

پیر کامل صورت ظلِ علی   یعنی دید پیر دید کبریا

ہر کہ پیرو ذات را یکجا ندید   نے مرید و نے مرید نے مرید

پیر کامل ذات بلند (اللہ تعالیٰ) کا پرتو ہے۔ یعنی پیر کو دیکھنا ذات کبریا کو دیکھنا ہے۔

جو کوئی پیر اور ذات الٰہی کو ایک مقام پر نہ دیکھے وہ مرید نہیں، مرید نہیں، مرید نہیں ہے۔

دراصل تصور شیخ اور عقیدت شیخ کا نشہ اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ مولانا تھانوی کے ہاتھ پر بیعت کے بعد "سیرت النبی ﷺ" کے مصنف کی زبان سے اس طرح کے اشعار نکلنے لگے تھے۔

پا کر تجھے اپنے کو میں بھول گیا ہوں   ہر سود و زیان دوسرا میں بھول گیا ہوں

جس دن سے مرے دل میں تری یاد بسی ہے   ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں

آتا ہے خدا بھی ترے صدقے میں مجھے یاد   گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں[2]

---

[1] سیرت سید احمد شہید ص ۱۴۱، ج ا
[2] بحوالہ دین تصوف وطریقت ص: ۸۱

صوفیا کے نظریہ حلول اور وحدۃ الوجود کا سب سے بڑا مظہر یہی تصور شیخ ہے۔ حلول اور وحدۃ الوجود کے مؤید تو تمام صوفیا نہیں ہیں۔ یا کم از کم بظاہر نہیں ہیں لیکن تصور شیخ کے تو سب مؤید ہیں۔ بلکہ یہ تصور تو سب کا مشترکہ عقیدہ ہے۔ اسلام میں بڑوں کے احترام اور توقیر کی تاکید آئی ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَيُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا))[1]

''وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کی تعظیم واحترام نہ کرے۔''

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَيَعْرِفْ شَرَفَ كَبِيْرِنَا))[2]

''وہ ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کی عظمت و شرف نہ پہچانے۔''

ایک انسان بڑا اپنے علم ومعرفت کے اعتبار سے بھی ہوتا ہے اور اپنے مقام ومرتبے کے اعتبار سے بھی۔ اپنے عہدے اور منصب کے اعتبار سے بھی اور اپنی عمر کے اعتبار سے بھی۔ اور کسی بڑے آدمی کے احترام وتوقیر کرنے اور اس کی قدر ومنزلت پہچاننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ معاملات کرتے وقت اور اس کو مخاطب بناتے ہوئے اس کی بڑائی کا لحاظ کیا جائے اور جس مقام ومرتبے پر وہ فائز ہے اس کو گھٹایا نہ جائے۔ لیکن اس احترام وتوقیر کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کی پرستش کی جائے یا اس کی ہر بات کو واجب الاطاعت سمجھا جائے اور اس کی باتوں کو کتاب وسنت کے بالکل متوازی سند کا درجہ عطا کیا جائے۔

جہاں تک عبادت وپرستش اور اس قبیل کی چیزیں ہیں مثلاً: استمداد واستعانت، مشکل وقت میں پکارنا، عبادت اور توجہ الی اللہ کے وقت اپنا مرکز خیال بنانا...... تو ان سب کی سزاوار صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کے سوا کسی اور کی مستقل اور غیر مستقل عبادت اور بندگی، عبادت کے وقت اس کو مرکز خیال بنانا اور اس کی رضا اور خوشنودی چاہنا شرک اعظم ہے۔ چاہے وہ نبی ہو، ولی ہو، پیر ہو، اور امیر وحاکم ہو، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ ﴾ [الزمر:۲]

''اے نبی! ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ لہٰذا تم اللہ کی عبادت

[1] جامع ترمذی/ ح: ۱۹۱۹ [2] جامع ترمذی/ ح: ۱۹۲۰

بندگی کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے کرو۔"

دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی بندگی میں کسی اور کی بندگی شامل نہ ہو۔ اس بندگی سے اس کے سوا کسی اور کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کا جذبہ شامل نہ ہو اور اس کے سوا کوئی اور مرکز توجہ و خیال نہ ہو۔

اس سورت میں آگے چل کر اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴾ [الزمر:۱۱]

"اے نبی کہہ دو! مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت اس کے لیے دین کو خالص کر کے کروں"

اللہ تعالیٰ نے اپنی اس خالص اور بے آمیز عبادت کا حکم اہل کتاب کو بھی دیا تھا:

﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ ﴾ [البینہ:۵]

"اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت دین کو اس کے لیے خالص کر کے اور بالکل یکسو ہو کر کریں"

تصوف کی کتابوں میں عبادت، تزکیہ نفس اور ریاضت وغیرہ کا مقصد اللہ کی معرفت، اس کے وصال اور دیدار وغیرہ کو قرار دیا گیا ہے جبکہ کتاب وسنت میں کہیں ایک جگہ بھی عبادت کا یہ مقصد نہیں بتایا گیا۔ بلکہ اس کے برعکس ایمان اور عمل صالح کا مقصد رضائے الٰہی، اللہ کی مغفرت، آخرت کی فلاح، جنت کا حصول اور جہنم سے نجات کو قرار دیا گیا ہے:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ﴾ [الفتح:۲۹]

"محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ تم انہیں رکوع سجدہ کرتے ہوئے دیکھو گے کہ وہ اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں"

﴿ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ﴾ [الحدید:۲۰]

"اور آخرت میں سخت عذاب اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے"

﴿ وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اُعِدَّتْ

لِلْمُتَّقِيْنَ ○ ﴾ [آل عمران:۱۳۳]

''اور جلدی لپکو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین اور آسمانوں کے برابر ہے، جو اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے''

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ ﴾ [النساء:۱۳]

''...... جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اسے ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اُن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے''

مشرکین اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں شرک نہیں کرتے تھے۔ قرآن پاک میں ایک سے زیادہ مقام پر یہ صراحت ہے کہ کفار و مشرکین صرف اللہ تعالیٰ کو ہی کائنات کا رب، خالق، مالک، رازق، نظام عالم کا مدبر و منتظم مانتے تھے اور مصائب و آفات کے موقع پر اپنے تمام خود ساختہ بتوں کو چھوڑ کر صرف اللہ تعالیٰ کو پکارنے لگتے اور اسی سے فریادیں کرنے لگتے تھے۔

لیکن صوفیا اللہ تعالیٰ کی توحید الوہیت و معبودیت میں شرک کے ساتھ اس کی ربوبیت میں بھی اپنے من گھڑت ''اولیاء اللہ'' کو شریک مانتے ہیں۔ وہ اپنے بزرگوں اور مرشدوں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں مخلوق کے امور ہیں جن میں وہ تصرف کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں۔ عام لوگوں کی یا اپنے مریدوں اور پیروکاروں کی مشکلات کو ختم کر سکتے ہیں۔ ان کی مصیبتوں اور بلاؤں کو دور کر سکتے ہیں۔ کسی بھی تصوف کی کتاب اور کشف و کرامت یا فضائل و مناقب کی کتاب میں بزرگان دین کے فضائل کے باب کے مطالعہ سے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ مصائب و آفات کے موقع پر اور آڑے وقت میں بھی اولیاء اللہ سے استعانت کے اس قدر واقعات ملتے ہیں کہ جن سے اللہ تعالیٰ کی قدرت و اختیار اور اولیاء اللہ کی قدرت و اختیار میں معمولی سا بھی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

ابتدائے اسلام میں رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت سے لوگوں کو منع فرما دیا تھا کیونکہ سابقہ قوموں میں شرک کی بیماری صلحاء اور بزرگوں کی قبروں کی زیارت کی راہ سے آئی تھی، جب ان قبروں کو مزارات اور عبادت گاہوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ لیکن جب مسلمانوں کے دلوں میں عقیدۂ توحید راسخ ہو گیا اور یہ اندیشہ باقی نہ رہا کہ وہ اہل قبور سے کسی طرح کی کوئی امید وابستہ کر سکتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے اس مقصد کے لیے لوگوں کو قبروں کی اجازت دے دی کہ اس سے موت اور آخرت کی یاد

تازہ ہوتی ہے۔ چونکہ یہ مقصد ہر طرح کی قبروں کی زیارت سے حاصل کیا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ مشرکین کی قبروں کی زیارت سے بھی، اس لیے نبی مکرم ﷺ نے زیارت کے لیے کسی قبر کی تخصیص نہیں فرمائی۔ مگر بعد میں جب صلحائے امت اور بزرگان دین کی عقیدت میں غلو کی بیماری پیدا ہوگئی تو اولاً زیارت کے لیے ''نام نہاد'' اولیاء اللہ اور بزرگوں کی قبروں کو مخصوص کر دیا گیا۔ ثانیاً ان قبروں کی زیارت کے موقع پر انہی اعمال کا ارتکاب ہونے لگا جن سے محفوظ رکھنے کے لیے ابتداء میں مسلمانوں کو زیارت قبور سے منع فرمایا گیا تھا۔

برصغیر کے ملکوں میں قبروں کو مزارات میں بدلنے اور بزرگوں کے مزارات کے پاس میلہ اور عرس لگانے، قبروں کے پاس مراقبہ کرنے اور اہل قبور سے استعانت و استمداد کرنے، ان سے مصائب و مشکلات کے ازالے کی درخواست کرنے، بیماریوں سے شفا اور اولاد طلب کرنے کا کام اہل تصوف اور ان کے معتقدین نے شروع کر دیا اور انہوں نے ہی مسلمانوں میں یہ عقیدہ پھیلا کر کہ ''اولیاء اللہ بعد از وفات بھی اپنے فیوض و برکات کی بارش جاری رکھتے ہیں'' مسلمانوں میں قبر پرستی کی وباء پھیلا دی۔ اس طرح برصغیر کی سرزمین درگاہوں، آستانوں، مزارات اور خانقاہوں سے بھر گئی جہاں توحید کی بجائے شرک کی تعلیم دی جاتی ہے اور کھلے عام مشرکانہ اعمال کا ارتکاب کیا جاتا ہے اور برصغیر کے جن مسلمانوں کو حج و زیارت کے مواقع ملتے ہیں ان کی اکثریت زیارت مسجد نبوی کے موقع پر، نبی اکرم فداہ ابی و امی ﷺ کی قبر مبارک کے پاس شرعی سلام کے علاوہ رسول اللہ ﷺ سے دعائیں بھی مانگتی ہے اور آپ سے فریادیں بھی کرتی ہے جو ائمہ اسلام کے نزدیک بالاجماع حرام ہے۔

تصوف کی کتابوں میں صوفیا کے فضائل و مناقب کے ضمن میں کشف، الہام، غیبی امور کے مشاہدے، اور دل میں علوم و معارف کے نزول وغیرہ کا ذکر بہت ملتا ہے۔ اور ان کو نہ صرف یہ کہ مستقل ذرائع علم کا درجہ حاصل ہے، بلکہ ان کی بنیاد پر بہت سی حلال چیزوں کو حرام اور حرام چیزوں کو حلال قرار دے لیا گیا ہے۔

صوفیا کو ان کے دعویٰ کے مطابق یہ کشف و الہام اور قلبی معرفت ان کی خود ساختہ ریاضتوں سے حاصل ہوتی ہے۔ متعدد صوفیا نے اسی کشف و الہام کی بنیاد پر اپنے آپ کو ''مجدد امت'' کے طور پر متعارف کروایا ہے۔ مثال کے طور پر شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ کے نام کے ساتھ ''مجدد الف ثانی'' اس لیے لکھا جاتا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ تھا: ''اللہ تعالیٰ نے بذریعہ الہام ان کو اپنے زمانے کا مجدد بنایا ہے''۔

صاحب الہام کے لیے حدیث میں "محدَّث" کی تعبیر استعمال ہوئی ہے جس کی جمع "محدَّثون" ہے۔ یہ تحدیث کا اسم مفعول ہے۔ تحدیث کے معنی کسی صحیح بات کو دل میں ڈال دینے اور الہام کرنے کے ہیں۔ اس طرح محدَّث وہ شخص ہوتا ہے جس کے دل میں کوئی صحیح خیال یا بات ڈال دی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَقَدْ كَانَ فِيمَا قَبْلَكُمْ مِنَ الْأُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ ، فَإِنْ يَكُ فِي أُمَّتِي أَحَدٌ ، فَإِنَّهُ عُمَرُ))[1]

"تم سے سابقہ قوموں میں صاحب الہام یا صحیح خیال رکھنے والے لوگ ہوا کرتے تھے اور اگر میری امت میں ایسا کوئی ہے تو وہ عمر ہیں رضی اللہ عنہ۔"

یہی حدیث درج ذیل الفاظ میں بھی مروی ہے:

((لَقَدْ كَانَ فِيمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ رِجَالٌ يُكَلَّمُوْنَ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَكُوْنُوْا أَنْبِيَاءَ ، فَإِنْ يَكُنْ مِنْ أُمَّتِي مِنْهُمْ أَحَدٌ فَعُمَرُ))

"درحقیقت تم سے پہلے بنو اسرائیل کے جو لوگ گزرے ہیں ان میں ایسے مرد ہوتے تھے جن سے کلام کیا جاتا تھا، بغیر اس کے کہ وہ نبی ہوں اور اگر میری امت میں ایسا کوئی ہوگا یا ہے تو وہ عمر ہیں" (رضی اللہ عنہ وارضاہ)

چونکہ سابقہ قوموں نے اپنے انبیاء پر اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعتوں کو بھلا دیا تھا یا ان میں تحریفات کر ڈالی تھیں اس لیے ان میں جو صالح لوگ ہوتے اور ان کے سامنے راہ حق مشتبہ ہو جاتی یا حق و باطل کے خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے ان کو صحیح بات کا سراغ نہ ملتا تو اللہ تعالیٰ بذریعہ الہام، کشف یا قلبی واردات کے ان کی رہنمائی فرما دیتا۔ رہی اسلامی شریعت تو یہ ہر طرح کی تحریفات سے قیامت تک کے لیے محفوظ ہے۔ اس کے دونوں بنیادی ماخذ کتاب و سنت مکمل طور پر محفوظ ہیں۔ لہٰذا مسلمان کسی بھی مسئلہ کے بارے میں اللہ و رسول کا حکم معلوم کرنے کے لیے الہام، کشف یا قلبی واردات کے محتاج نہیں ہیں۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے سابقہ قوموں میں الہام اور غیبی خطاب سے موصوف لوگوں کے وجود کے لیے یقینی ذریعۂ بیان "لقد کان" اختیار فرمایا ہے اور اس امت میں کسی صاحب الہام کے ہونے کے

---

[1] صحیح بخاری/ ح: ۳۴۶۹، ۳۶۸۹۔ صحیح مسلم/ ح: ۲۳۹۸

لیے حرف شرط "إِنْ" استعمال فرمایا ہے جو حرف "تشکیک" ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اگر اس امت میں ایسا کوئی ہوا ہے کہ جس کو بذریعہ الہام یا بذریعہ کشف یا صحیح خیال کے ذریعہ مشتبہ امور اور معاملات میں صحیح بات کی رہنمائی کر دی جائے گی تو وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہوں گے۔

زبانِ نبوت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحب الہام ہونے کی شہادت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان اور دل پر حق غالب تھا[۱] اور شیطان ان پر اثر انداز ہونے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔[۲]

(۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوا اس امت میں کوئی ایسا صاحب الہام نہیں ہوگا جس کے الہام، قلبی واردات اور خیالات کو شیطان کی دراندازی سے محفوظ قرار دیا جا سکے۔

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں اس امت سے نسبت رکھنے والے صلحاء اور بزرگوں سے کشف والہام کے جو واقعات منسوب ہیں یا جن کی زبانوں سے ایسے جملے صادر ہوئے ہیں، جیسے کہ: اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ حکم دیا، اللہ تعالیٰ نے مجھے اس منصب پر فائز کیا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے مطلع فرمایا وغیرہ وغیرہ۔ ان کے صلاح وتقویٰ اور روحانی فضیلت پر دلالت نہیں کرتے بلکہ ان کی کمزوریوں یا دوسرے لفظوں میں ان کے "ہفوات" پر دلالت کرتے ہیں۔

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

بہت سے لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ "حَدَّثَنِي قَلْبِي عَنْ رَبِّي "میرے دل نے مجھ سے میرے رب کے حوالہ سے بیان کیا....." تو یہ صحیح ہے کہ کہنے والے سے اس کے دل نے بیان کیا، لیکن کس کی نسبت سے؟ اس کے شیطان کی نسبت سے یا اس کے رب کی نسبت سے؟ اور جب اس نے یہ کہا: میرے دل نے مجھ سے میرے رب کی نسبت سے بیان کیا تو اس نے اس بات کو اس ذات سے منسوب کیا جس کے بارے میں اس کا یہ علم نہیں ہے کہ اسی نے اس سے وہ بات بیان کی ہے۔ ایسی صورت میں اس کا یہ دعویٰ جھوٹ ہے۔ اس امت کے جو صاحب الہام اور مبنی برحق خیال سے موصوف تھے، انہوں نے بھی کبھی ایسی بات نہیں فرمائی، بلکہ وہ اس طرح کی بات زبان سے نکالنے سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے کاتب نے جب ایک دن یہ لکھا کہ یہ وہ بات ہے جو اللہ نے امیر المومنین عمر بن خطاب

[۱] دیکھئے: جامع ترمذی/ ح: ۳٦۸۲

[۲] دیکھئے: صحیح بخاری/ ح: ۳٦۸۳۔ صحیح مسلم/ ح: ٦۲۰۲

(نبیﷺ) کو دکھائی ہے تو اس سے فرمایا: اس عبارت کو مٹا دو اور لکھو: یہ عمر بن خطاب کی رائے ہے۔ اگر یہ درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر غلط ہے تو عمر کی طرف سے جس سے اللہ اور اس کے رسول بری ہیں۔[1]

تصوف کی کتابوں میں کشف و الہام کی طرح ''علم لدنی'' کا ذکر بھی بہت ملتا ہے جس سے اہل تصوف کی مراد علم ربانی یا علم الٰہی ہے جو اللہ کے مقرب بندوں کو منجانب اللہ کسی واسطہ کے بغیر حاصل ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لیے فکر و استنباط اور اجتہاد کی ضرورت نہیں پڑتی اور اس علم سے موصوف انسان اور غیب کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔

"لَدُنِّیْ......لدن" اور واحد متکلم کی ضمیر ''ی'' سے مرکب ہے۔ لدن کے معنی ہیں: پاس، نزدیک۔ یہ لفظ ظرف مکان ہے جو ''عند'' کا مترادف ہے لیکن اس میں ''عند'' کے مقابلے میں قرب کا مفہوم زیادہ ہے۔ کتاب و سنت میں بطور اصطلاح ''علم لدنی'' کا ذکر نہیں ملتا۔ قرآن پاک میں صرف ایک جگہ اس کا استعمال ہوا ہے جو حضرت خضر علیہ السلام سے متعلق ہے ارشاد ربانی ہے:

﴿ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۝ ﴾

[الکھف:٦٥]

''(موسیٰ اور اس کے ساتھی کو) ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ ملا جس کو ہم نے اپنی خاص رحمت سے نوازا تھا اور اس کو اپنے پاس سے ہم نے ایک خاص علم عطا کیا تھا''

اس آیت مبارکہ میں "عَبْدًا" سے مراد حضرت خضر علیہ السلام ہیں جیسا کہ صحیح احادیث میں صراحت ہے۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ نے جس خاص علم سے نوازا تھا وہ شرعی علم نہیں بلکہ تکوینی علم تھا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بعض غیبی حقائق سے آگاہ فرما دیا تھا اور اسی علم کی روشنی میں انہوں نے وہ تین کام کیے تھے جن پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا تھا۔ اگر وہ شرعی کام ہوتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان پر اعتراض نہ کرتے۔ کیونکہ ایک جلیل القدر رسول ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام تمام شرعی علوم سے واقف تھے اور شرعی علوم جن ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں وہ قرآن پاک کی درج ذیل آیت میں بیان کر دیے گئے ہیں:

﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ۝ ﴾ [الشوریٰ:٥١]

[1] مدارج السالکین ص: ٤٠، ج١

"کسی بشر کے شایان شان یہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے بات کرے سوائے اس کے کہ وہ بات بذریعہ وحی ہو یا پردے کے پیچھے سے یا وہ کوئی پیغام پہنچانے والا فرشتہ بھیجے جو اس کے حکم سے اس کو وحی کرے جو اللہ چاہتا ہے۔ بے شک وہ برتر اور صاحب حکمت ہے"

حضرت خضر علیہ السلام سے متعلق اللہ تعالیٰ نے صرف یہ بات فرمائی ...... وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا...... اور ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا۔" جس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ علم عطا کرنے میں کوئی واسطہ اور ذریعہ نہیں استعمال فرمایا۔ لیکن مذکورہ فقرے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس علم کی نوعیت کیا تھی؟ البتہ حضرت خضر علیہ السلام کے تصرفات سے یہ بات واضح فرما دی کہ ان کے اس علم کا تعلق اسرار کائنات سے تھا اور یہ قصہ بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ تعلیم دی ہے کہ اس مادی دنیا میں ان کو بعض اوقات بظاہر جن نقصانات اور جن مصائب کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے وہ اپنے پیچھے بڑی حکمتیں رکھتے ہیں، لہٰذا ان پر صبر سے کام لینا چاہیے۔

بات صرف اتنی ہی تھی۔ لیکن حضرات صوفیا نے حضرت خضر علیہ السلام کو عطا کیے جانے والے مذکورہ علم سے "علم لدنی" ایجاد کر لیا اور خود فریبی میں مبتلا ہو گئے۔ دنیا کو اس فریب میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو صوفیا خاص مقام پر پہنچ جاتے ہیں ان کو بھی وہ "علم لدنی" حاصل ہو جاتا ہے جو حضرت خضر علیہ السلام کو حاصل تھا اور اس طرح وہ شرعی علوم اور ان کے تقاضوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ لیکن اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کے تا قیامت محفوظ کر دیے جانے کے بعد نہ تو کوئی نام نہاد "علم لدنی" کا محتاج ہے اور نہ کتاب و سنت کی شکل میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کے مقابلے میں اس کا کوئی اعتبار ہے۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جب یہ پوچھا گیا: کیا رسول اللہ ﷺ نے آپ کو کوئی خاص علم دیا ہے تو فرمایا:

((لَا، وَالَّذِي فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ، إِلَّا فَهْمًا يُؤْتِيهِ اللّٰهُ عَبْدًا فِي كِتَابِهِ))[1]

"نہیں، اس ذات کی قسم جس نے بیج کو پھاڑا اور جان کو پیدا کیا، سوائے اس فہم کے جو اللہ کسی بندے کو اپنی کتاب کے بارے میں عطا کرتا ہے"

معلوم ہوا کہ "علم لدنی" صوفیا کی ذہنی اختراع ہے جو ان کے خاص ذوق و پسند کی ترجمان ہے۔ اور جس طرح انہوں نے اپنے ذوق و پسند سے بہت ساری عبادتیں اور ریاضتیں ایجاد کر ڈالی ہیں اسی

---

[1] صحیح بخاری/ ح: ۱۱۱۔ صحیح مسلم/ ح: ۱۳۷۰

طرح "علم لدنی" کے نام سے یہ علم وضع کرلیا ہے جوان کے دعویٰ کے مطابق اللہ تعالیٰ کے مقرب اور خاص بندوں کو کسی واسطہ اور ذریعہ کے بغیر عطا کیا جاتا ہے اور اس کی بنیاد پر ان کو کائنات کے بہت سے اسرار معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی وجہ سے ان کو ایسے تصرفات کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے جو بظاہر شرعی احکام سے ٹکراتے ہیں مگر وہ اللہ کی مرضیات کے خلاف نہیں ہوتے۔ تو یہ دعویٰ فریب نفس کے سوا کچھ اور نہیں ہے اور بقول امام ابن القیم رحمہ اللہ کے:

اگر کوئی "علم لدنی" ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عبودیت، اس کے احکام کی پیروی، صدق مع اللہ اس کی بے آمیز عبادت اور اس کے رسول ﷺ کی کامل اطاعت و پیروی کا نتیجہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کتاب و سنت کے فہم کے دروازے کھول دیتا ہے...... رہا اس شخص کا علم جو کتاب و سنت سے بیگانہ ہو اور ان کے احکام کی پابندی نہ کرے تو وہ "لدنی" ضرور ہے مگر نفس، خواہش اور شیطان کے پاس سے......[1]

تصوف کے بارے میں دلائل و براہین کی زبان میں اتنی تفصیل سے اس لیے گفتگو کی گئی ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اس کا ماخذ کتاب و سنت نہیں بلکہ خاص ذوق ہے۔ اور اگر اس میں بہت ساری باتیں کتاب و سنت سے ماخوذ ملتی بھی ہیں تو صرف وہی جو صوفیانہ مزاج سے ہم آہنگ ہیں یا ہم آہنگ بنادی گئی ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان کی نظر میں کتاب و سنت پر عمل کر کے ہی کوئی انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب اور مقرب بندہ بن سکتا ہے۔

اوپر کی وضاحتوں کے بعد یہ دعویٰ کہ:

اولین صوفیا نے تصوف کی عمارت قرآن و سنت اور صحابہ کرام کے عمل ہی پر اٹھائی۔ طریقت ہو یا معرفت، زندگی کا نقطہ نظر ہو یا دین کا تصور، ہر جگہ انہوں نے قرآن و سنت ہی کو سامنے رکھا......[2]

امر واقعہ کا ترجمان نہیں ہے، کیونکہ تصوف کے خمیر میں عقیدۂ توحید خالص کی گنجائش نہیں ہے، جبکہ اسلام کی روح توحید خالص ہے۔ مزید یہ کہ طریقت اور معرفت نہ اسلامی اصطلاحیں ہیں اور نہ قرآن و حدیث کی نصوص سے مستنبط۔ اسی طرح زندگی کا جو نقطہ نظر کتاب و سنت نے دیا ہے وہ اس نقطہ نظر سے مکمل طور پر مختلف ہے جو تصوف نے دیا ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ تصوف میں بہت سی باتیں قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں جن میں سے کچھ تو اپنی اصلی شکل میں ہیں اور زیادہ تر تصوف کے خراد پر چڑھا کر کچھ سے

[1] مدارج السالکین/ ص: ۳۷۷، ج:۲
[2] مقدمہ تصوف اور شریعت ص:۱۲،۱۳

کچھ بنادی گئی ہیں۔

تابعین اور تبع تابعین کے دور میں جن ائمہ کا نام تصوف سے منسوب ملتا ہے تو دراصل صرف اس وجہ سے کہ ان کو صوفیا میں شامل کر لیا گیا۔ اس لیے کہ زہد و ورع اور تسلیم و رضا وغیرہ میں بظاہر وہ صوفیا سے مشابہہ تھے۔ رہے صوفیانہ عقائد اور نظریات تو ان سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ مثال کے طور پر امام سفیان ثوری رحمہ اللہ متوفی ۱۶۱ھ کا نام بھی صوفیا کے ضمن میں ملتا ہے۔ تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ طریق ولایت سے تعلق رکھتے تھے۔ یا طریقت کے نام سے ان کا کوئی صوفیانہ مسلک تھا۔ نہیں بلکہ وہ اپنے ہم عصر محدثین کے عقائد رکھتے تھے۔ البتہ زہد و ورع اور کثرت عبادت وغیرہ میں ان سے ممتاز تھے۔

اس کے برعکس ابوالقاسم جنید متوفی ۲۹۷ھ صوفیا میں ''سید الطائفہ'' کے لقب سے مشہور ہیں۔ وہ توحید کے مفہوم تک سے نا آشنا تھے۔ ان کا دعویٰ ہے:

قدیم کو حادث سے علیحدہ کر دینے کا نام توحید ہے۔[1]

یہ کون سی توحید ہوئی؟ اللہ تعالیٰ کی ذات کو حدث سے پاک اور منزہ کرنا تو حق ہے، مگر اس کا توحید سے کیا تعلق؟ یونانی اور غیر یونانی فلاسفر کہ جو اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ حق سے دور تھے وہ بھی یہ کہتے تھے کہ: ''اللہ واجب الوجود ہے جو قدیم ہے اور حدث سے پاک ہے۔''

دراصل ''قدیم'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں شامل نہیں ہے بلکہ اس کو علمائے کلام نے اپنی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر استعمال کیا ہے اور اس سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی سے بھی پہلے سے ہے۔ لیکن اس لفظ ''قدیم'' سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ یہ جدید کی ضد ہے جو مرورِ وقت کے ساتھ قدیم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یعنی ''قدیم'' اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ اس سے پہلے ''عدم'' نہیں تھا۔ قرآن پاک میں چاند کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِO ﴾ [یٰس:۳۹]

''اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دوبارہ پرانی شاخ کی مانند رہ جاتا ہے''

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ''ازلیت'' کے لیے اپنا نام ''الاول'' رکھا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌO ﴾ [الحدید:۳]

[1] مدارج السالکین/ ص: ۳٤٦، ج:۳

''وہی اول ہے اور وہی آخر اور وہی ظاہر ہے اور وہی باطن اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔''

اس کی بہترین تفسیر وہ طویل دعا ہے جو پیارے نبی ﷺ نے اپنی لخت جگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اس وقت سکھائی تھی جب وہ آپ کی خدمت میں ایک خادم کی درخواست لے کر حاضر ہوئی تھیں۔ اس دعا کے آخر میں ہے:

((اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الْأَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَأَنْتَ الْآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ، وَأَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ، وَأَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ))[1]

''اے اللہ! تو ہی پہلا ہے کوئی تجھ سے پہلے نہیں۔ تو ہی آخر ہے کوئی تیرے بعد نہیں۔ تو ہی ظاہر ہے کوئی تجھ سے اوپر نہیں۔ اور تو ہی باطن ہے کوئی تجھ سے مخفی نہیں''

چونکہ اللہ تعالیٰ کی حسی اور عقلی معرفت محال ہے اس لیے وہ ماورائے حواس و عقل ہے۔ نہ تو حواس کے ذریعہ اس کو محسوس کیا جاسکتا ہے اور نہ عقل اس کی کنہہ اور حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتی ہے۔ اس تناظر میں تصوف کی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کی معرفت یا عرفان الٰہی کی جو باتیں ملتی ہیں وہ صوفیانہ ''بڑ'' کے سوا کچھ بھی نہیں۔ البتہ ایک صادق الایمان مؤمن کو اللہ تعالیٰ کی صفاتی معرفت ضرور حاصل ہوتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان فرما دی ہیں ان کے ذریعہ اور انہی کے دائرہ میں اس کی معرفت حاصل ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان صفات اور اس کے صفاتی ناموں میں غور و تدبر سے یہ ایمان و یقین قوی سے قوی تر ہوتا چلا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں واحد و اَحد...... ایک اور یکتا ہے۔ وہ اپنی مخلوق سے جدا اور بے مثل ہے۔ اس نے اپنے آپ کو جن صفات سے موصوف اور جن ناموں سے موسوم کیا ہے وہی اس کے کمال کی سچی تعبیریں ہیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ''جس نے اللہ تعالیٰ کے جملہ اسمائے حسنیٰ میں سے ۹۹ ناموں کو سمجھ کر یاد کر لیا اور ان کے تقاضوں کے مطابق عمل کیا وہ جنت میں جائے گا''[2]

واضح رہے کہ جس طرح اہل تصوف کے یہاں وہ توحید کبھی بھی محل توجہ و اہتمام نہیں رہی جس کی دعوت نبی مکرم ﷺ نے دی اور جس سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے اور جس کی دعوت اس کے تمام انبیاء اور رسول دیتے رہے تھے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے اسمائے ذات وصفات کا تذکرہ بھی

---

[1] صحیح مسلم/ ح: ٢٧١٣، ٦٨٨٩، ٦٨٩١

[2] دیکھئے: صحیح بخاری/ ح: ٦٤١٠۔ صحیح مسلم/ ٢٦٧٧

تصوف کی کتابوں میں نہ ہونے کے برابر ہے بلکہ سارا زور مراقبوں اور ریاضتوں کے ذریعہ عرفان الٰہی حاصل کرنے پر دیا جاتا ہے۔ یہ من گھڑت مراقبے اور ریاضتیں نہ تو اللہ تعالیٰ کی معرفت سے ہمکنار کر سکتی ہیں اور نہ ان کے ذریعہ اس صحیح اور سیدھی راہ کو ہی معلوم کیا جا سکتا ہے جس پر چل کر ایک انسان اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور اس دنیا کے بعد دوسری زندگی میں فلاح و کامرانی حاصل کر سکتا ہے۔

ابھی میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کے رد میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیشتر صوفیا نے اپنی کتابوں میں کتاب و سنت کی کامل پیروی کرنے، شریعت کے آداب اور رسول اللہ ﷺ کے "اسوہ حسنہ" پر مضبوطی سے کاربند رہنے کی بڑی تاکید کی ہے۔ تصوف کی کتابوں میں عبادات اور مسنون اذکار پر بڑا زور دیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تصوف کے بہت سارے تضادات میں سے ایک تضاد یہ بھی ہے جس کو تصوف کی کتابوں اور صوفیا کے اقوال و افعال میں بکثرت دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تصوف چونکہ سراسر ذوق و احساس کی پیداوار ہے اور اس کا کوئی واضح اور متعین ماخذ نہیں ہے اس لیے جب کسی صوفی پر کبھی دین و شریعت کے احکام کی پیروی کا رنگ یا جذبہ غالب ہوتا ہے تو وہ کتاب و سنت کی تعلیمات کی پابندی کی باتیں کرنے لگتا ہے، تلاوت قرآن کے اجر و ثواب بیان کرنے لگتا ہے اور عمل اخلاص کی اہمیت اجاگر کرنے لگتا ہے مگر جوں ہی اس کی ذاتی پسند اس پر غالب آجاتی ہے اور اس کا صوفیانہ رنگ شوخ ہو جاتا ہے تو اس کی زبان سے ایسی باتیں بھی نکلنے لگتی ہیں:

جس کسی نے تین چیزیں کیں وہ دنیا کی طرف مائل ہو گیا، جس نے معاش کے لیے کاوش کی، عورت سے شادی کی یا حدیث کی کتابت کی۔[1]

اس عبارت کو اگر کھول دیا جائے تو یہ مطلب ہوگا کہ معاذ اللہ نبی مکرم ﷺ، صحابہ کرام، ائمہ حدیث و فقہ دنیا دار لوگ تھے۔ اس طرح کے تضادات و خیالات اور من گھڑت باتوں اور دعووں سے تصوف کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

تصوف کے بارے میں یہ بحث مکمل نہ ہوگی اگر ان اثرات میں سے بعض کا سرسری جائزہ نہ پیش کر دیا جائے جو صوفیا نے غیر صوفیا پر لاشعوری طور پر ڈالے ہیں۔

جو لوگ تصوف کے خلاف ہیں یا نظریاتی طور پر صوفیا کے مؤید نہیں ہیں ان کی تحریروں میں بھی نبی

[1] تصوف اور شریعت ص ۱۶ ج ۱۔ یہ قول تصوف کے ایک بہت بڑے بزرگ ابو سلیمان عبد الرحمٰن بن احمد دارانی کی طرف منسوب ہے۔

اکرم ﷺ، بزرگان دین اور صلحائے امت کی ''وفات'' کی جگہ ''وصال'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ بادی النظر میں یہ محض ایک لفظ ہے جو موت اور وفات کا مترادف لفظ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف ایک لفظ نہیں ہے بلکہ ایک فکر اور نظریہ کا ترجمان ہے۔ یہ لفظ جس شخص کے لیے بولا جاتا ہے اس کے بارے میں کہنے والا اپنا یہ نقطہ نظر بیان کرتا ہے کہ نبی کریم ﷺ یا فلاں بزرگ عشق الٰہی کے ذریعہ اپنی ذات سے فانی اور خدا کی ذات سے واصل ہو گئے۔

قرآن پاک اور احادیث میں محبت اور اس کے بعض مترادف مثلاً مودۃ اور خلہ وغیرہ کا ذکر تو آیا ہے لیکن کسی ایک جگہ بھی ''عشق'' کا ذکر نہیں آیا۔ جس کا سبب یہ ہے کہ محبت اور مودت وغیرہ نہایت پاکیزہ جذبے سے عبارت ہیں جبکہ ''عشق'' نفسانی جذبے کو کہتے ہیں۔ عقیدہ طحاویہ کے شارح علامہ ابن ابی العز نے عشق کو بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی صفت اور اللہ تعالیٰ کے لیے بندوں کی صفت قرار نہ دیے جانے کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بتایا ہے کہ عشق ایسی محبت کو کہتے ہیں جو شہوت کے ساتھ کی جائے۔[1] اور امام اللغۃ ابو ہلال عسکری اپنی کتاب "الفروق فی اللغۃ" میں لکھتے ہیں:

''عشق اس شدید خواہش کا نام ہے جو معشوق سے اپنی مراد حاصل کرنے کے لیے عاشق کے دل میں ہوتی ہے''[2]

عشق کے مفہوم اور مزاج کے بارے میں اوپر دو مستند عالموں کے اقوال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ دنیا کا کوئی بھی انسان اپنی محرم عورتوں...... جیسے ماں، بہن، پھوپھی اور خالہ وغیرہا کے حق میں یہ لفظ استعمال نہیں کرتا۔ لیکن تصوف کی پوری عمارت اسی عشق پر قائم ہے اور اس کے وضع کردہ تمام اعمال، کردار، اذکار، مراقبوں اور ریاضتوں کا مقصد اللہ تعالیٰ کا وصال اور اس کی ذات میں فنا ہو جانا ہی ہے۔ صوفیا کے نزدیک دراصل عاشق مرتا نہیں بلکہ واصل ہو جاتا اور پردہ کر لیتا ہے وغیرہ۔

صوفیا اور غیر صوفیا دونوں نبی اکرم ﷺ کی تعریف و توصیف اور فضائل و مناقب کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

نبی مکرم محمد رسول اللہ ﷺ اللہ کے بعد سب سے بڑے اور افضل ہیں اور اسی سلسلے میں درج ذیل مصرع نے ضرب المثل کی شکل اختیار کر لی ہے:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

---

[1] شرح العقیدۃ الطحاویہ ص ١٦٥ [2] الفروق فی اللغۃ ص: ١١٦

تو کیا ایسا کہنے والوں کے نزدیک (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ بھی مخلوق کی صف میں شامل ہے یا رسول اللہ ﷺ بشریت کے مقام سے بلند ہو کر الوہیت کے درجے پر پہنچ گئے ہیں؟ کیونکہ ایسا حکم ہمیشہ ایسی دو یا اس سے زیادہ چیزوں پر لگایا جاتا ہے جو ایک ہی نوع اور قسم سے تعلق رکھتی ہوں اور ان میں سے ایک دوسری سے افضل ہو۔ تصوف سے متاثر سیرت نگاروں اور مفسرین نے رسول اکرم ﷺ کی حیات پاک کے قبل از بعثت یا نبوت کے مرحلے کو ''ولایت'' سے تعبیر کیا ہے۔ اوپر یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ''ولایت'' صوفیا کی گھڑی ہوئی اصطلاح اور نبوت کے متوازی ہے۔ لیکن اولاً تو قرآن پاک میں ولایت کا ذکر صرف ایکبار آیا ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر نہ کہ اس کے کسی رسول یا مقرب بندے کی صفت کے طور پر۔

ثانیاً: اگر اس کو اللہ تعالیٰ کے کسی مقرب بندے کی صفت قرار دیا جائے تو قرآن پاک میں اولیاء اللہ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان کی روشنی میں ''ولایت'' سے ایمان اور تقویٰ کی صفت مراد ہوگی اور یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہے کہ کسی انسان پر مومن اور متقی ہونے کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب وہ مکلف ہو اور اللہ و رسول کا مطیع ہو۔ اب جہاں تک نبی مکرم ﷺ کے قبل از بعثت یا نبوت کے مرحلے کا تعلق ہے تو اس میں آپ شرعی احکام کے مکلف نہیں تھے بلکہ ایمان اور احکام کے مجموعے: ''کتاب کے مفہوم تک سے ناواقف تھے۔'' ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ﴾ [الشوریٰ:٥٢]

''اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تمہاری طرف ایک روح وحی کی ہے۔ تمہیں کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں؟ لیکن اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔ اور یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہو''

قرآن پاک کے اس نہایت صریح، واضح اور دوٹوک اعلان کے بعد سیرت نگاروں اور مفسرین نے صوفیانہ افکار سے متاثر ہو کر نبی کریم ﷺ کے ایمان اور شرائع سابقہ خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے مطابق عبادت کرنے کی جو بات لکھی ہے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ قبل از

بعثت رسول اللہ ﷺ اس شریعت سے نہ صرف یہ کہ واقف تھے بلکہ اس کے مکلف بھی تھے۔ جبکہ قرآن پاک کی مذکورہ آیت اس کی نفی کرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ''بدء الوحی'' کی حدیث میں "یَتَحَنَّثُ" کا لفظ آیا ہے جس کی تفسیر امام زہری نے "یتعبد" کی ہے۔[1] لیکن اس تعبد کی کوئی بھی تفصیل کسی حدیث میں بیان نہیں ہوئی ہے۔ نہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے کبھی قبل از بعثت غار حراء میں اپنے ''تعبد'' کا ذکر فرمایا اور نہ آپ سے آپ کے کسی صحابی نے اس کے بارے میں کبھی کچھ دریافت کیا۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ مکہ کی مشرکانہ زندگی، مکہ میں ہر طرف پھیلی ہوئی اخلاقی اور معاشرتی برائیوں اور کمزوروں اور بے سہارا لوگوں پر روا رکھے جانے والے ظلم و جور سے نبی مکرم ﷺ کے پاکیزہ دل میں اضطراب اور جو بے چینی پیدا ہوگئی تھی اس پر قابو پانے اور سکون قلب کی خاطر آپ کوئی ایسا عمل انجام دیتے رہے ہوں جس کی تعبیر ام المومنین رضی اللہ عنہا نے "تَحَنَّث" سے فرمائی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس مرحلے میں نبی ﷺ کے احوال و کیفیات کے لیے لفظ "ضالا" کی تعبیر استعمال فرمائی ہے۔ جس کے معانی قرآنی سیاق و سباق اور اس مرحلے میں نبی معظم ﷺ کی کیفیات اور آپ کے ذہنی و قلبی اضطراب کی روشنی میں ناواقفِ راہ، حیران و پریشان، صحیح راہ سے لاعلم وغیرہ کے ہوتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ ﴾ [الضحى:٧]

''اور کیا اس نے تم کو ناواقفِ راہ نہ پایا پس راہ دکھائی''

لیکن یہ سب کچھ صرف دین و شریعت کے حوالہ سے تھا جس کو انسان خود نہیں معلوم کرسکتا، چاہے وہ آگے چل کر کوئی بہت بڑا نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہونے والا ہو۔ لیکن اس مرحلے میں رسول اکرم ﷺ کی حیات پاک شرک اور بت پرستی سے بالکل پاک تھی اور بچپن سے لے کر منصب نبوت و رسالت سے سرفراز کیے جانے تک آپ جاہلیت کے اعمال، رسوم اور طور طریقوں سے ہمیشہ دور رہے۔

اسی طرح رسول اکرم ﷺ قبل از بعثت کے زمانے میں بھی فضائل اخلاق کی سب سے بلند چوٹی پر فائز تھے اور تمام انسانی کمالات سے متصف تھے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول محمد بن عبداللہ ﷺ کے اخلاقی فضائل اور انسانی کمالات کی فہرست بیان کرنے کی بجائے ان کو ایسے معانی سے پُر ایک فقرے میں بیان فرما دیا ہے۔

[1] صحیح بخاری/ ح: ٦٩٨٢

﴿ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍO ﴾ [القلم:٤]

''اور اے نبی، بے شک تم خلق عظیم پر فائز ہو''

اس قرآنی شہادت کے علاوہ نبی اکرم ﷺ پر پہلی وحی کے نزول کے موقع پر خوف اور گھبراہٹ دور کرنے اور اندیشوں کے اثرات کم کرنے کے لیے آپ کی غمگسار اور وفا شعار رفیقہ حیات ام المومنین سیّدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے خود آپ سے آپ کے جو اوصاف حمیدہ بیان فرمائے ان میں سے ہر وصف بجائے خود مکمل ایک کتاب کا عنوان بن سکتا ہے۔

لیکن اہل تصوف نے بعثت سے متصل قبل والے زمانے میں نبی اکرم ﷺ کی غار حرا میں خلوت گزینی اور کئی کئی راتیں نامعلوم عبادت میں گزارنے کو جو اہمیت دی ہے اور اس سے اپنی ذہنی وفکری اور بدنی ریاضتوں اور مراقبوں، نیز انسانی آبادیوں سے دور جا کر گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر ذکر وفکر کی صحت پر جو استدلال کیا ہے اور کرتے ہیں وہ چند وجوہ سے ان کے حق میں نہیں بلکہ ان کے خلاف ہے۔

۱...... نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے اس مرحلے کا کوئی بھی عمل امت کے کسی بھی فرد کے لیے شرعی نمونۂ عمل نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس وقت تک آپ نبوت و رسالت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے ورنہ کتاب وسنت میں اس کو بیان کیا جاتا۔

۲...... نبی اکرم ﷺ کو ملنے والی نبوت غار حرا میں آپ کی عبادت و ریاضت کا نتیجہ نہیں بلکہ عطیہ الٰہی تھی۔

۳...... کوئی شخص اپنے خود ساختہ مراقبوں، روحانی ریاضتوں اور ذکر وفکر کے ذریعہ کوئی طریقۂ رشد و ہدایت نہیں معلوم کر سکتا۔

۴...... اسلامی شریعت کے دائرے سے باہر رہ کر نہ کوئی ذکر وفکر، روحانی ریاضت اور تزکیۂ نفس علم و معرفت پر منتج ہو سکتا ہے اور نہ عند اللہ مقبول ہے۔

بعثت سے قبل رسول اکرم ﷺ کے کسی طرح کا علم ومعرفت نہ رکھنے، طریق رشد و ہدایت نہ جاننے، ایمان اور کتاب کے مفہوم سے ناواقف ہونے میں آپ کی تنقیص قطعاً نہیں ہے۔ کیونکہ آپ تمام سابق انبیاء اور رسولوں کی طرح بشر تھے اور کوئی بھی بشر ماں کے پیٹ سے علم ومعرفت کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی قدر ہے:

﴿ وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَO ﴾ [النحل:۷۸]

''اور اللہ نے تم لوگوں کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور اس نے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنا دیے تا کہ تم شکر ادا کرو''

صرف یہی نہیں کہ دین و شریعت اور ایمان و کتب آسمانی سے متعلق نبی ﷺ کو نبوت سے قبل کوئی علم حاصل نہیں تھا بلکہ پہلی وحی الٰہی کے نزول سے چند لمحے پہلے تک آپ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ آپ اس دین فطرت پر تو بلا شبہ قائم تھے جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے اور شرک سے آپ کی ذات اطہر یکسر پاک تھی مگر آپ یہ نہیں جانتے تھے کہ نبوت کیا ہے اور نبی کیا ہوتا ہے؟ اسی وجہ سے پہلی بار حضرت جبریل علیہ السلام کی غار حرا میں آمد اور سورہ العلق کی ابتدائی آیات کے نزول کے موقع پر آپ گھبرا گئے۔ جیسا کہ ''بدء الوحی'' کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

عربی زبان میں متکلم کے سوا مخاطب اور غائب کے لیے ضمائر تعظیمی نہیں ہیں۔ یعنی اگر بذریعہ ضمیر کسی غیر موجود فرد واحد کا ذکر کیا جائے یا مخاطب کا تو اس کے لیے ضمیر واحد ہی استعمال ہوتی ہے چاہے اس سے مراد کوئی بڑا انسان ہو یا چھوٹا۔ البتہ متکلم کے لیے ضمیر تعظیمی کا استعمال عربی زبان میں پہلے ہی سے ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن پاک جو قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے متعدد مقامات پر جمع متکلم کی ضمیر منفصل ''نَحْنُ''..... ہم۔ اور افعال کے ساتھ ضمیر متصل، جیسے خَلَقْنَا..... ہم نے پیدا کیا۔ دونوں صورتوں میں استعمال کی ہے جو واحد متکلم کے لیے ضمیر تعظیمی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ واحد اور احد یعنی ایک اور یکتا ہے۔

لیکن اردو زبان میں جس طرح واحد متکلم کے لیے ضمیر تعظیمی ''ہم'' ہے اسی طرح واحد غائب اور واحد مخاطب کے لیے ''آپ'' ہے۔ غائب اور مخاطب کے لیے ضمیر تعظیمی اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب مخاطب اور غائب عمر، علم و فضل اور مرتبہ و منصب میں کہنے والے سے بڑا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق اور رب ہے کہ جس میں انسان، جن اور فرشتے نیز دوسری تمام مخلوقات اور اشیا شامل ہیں۔ انسانوں میں اس کے محبوب اور مقرب بندے اس کے نبی اور رسول ہیں۔ ان نبیوں اور رسولوں میں محمد عربی ﷺ اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ محبوب اور مقرب بندے ہیں۔

یہ بات تو عقلاً اور شرعاً صحیح اور مناسب اور قرین قیاس ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کی عموماً اور رسول اکرم ﷺ کی خصوصاً تکریم فرمائے۔ ان پر انعام و اکرام کی بارش کرے اور ان پر اس کی نظر عنایت زیادہ ہو۔ مگر اس کی ذات مقدس کہ جس کا کوئی ہم مثل اور ہم رتبہ نہیں ہے اس سے بہت بلند و برتر

ہے کہ وہ اپنے کسی بندے کی تعظیم اور اس کا ادب واحترام کرے۔

بلاشبہ رسول اکرم ﷺ سید البشر اور افضل الرسل ہیں۔ آپ کی ذات پاک تمام مسلمانوں کے نزدیک نہایت ہی قابل احترام، قابل تعظیم اور قابل ادب ہے اور آپ سے جان و مال اور آل واولاد سے زیادہ محبت کرنا صحت ایمان کی شرط ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور الوہیت میں آپ کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ قرآن پاک از اول تا آخر اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس نے اپنے آخری رسول اور نبی محمد بن عبداللہ ﷺ پر نازل فرمایا ہے تا کہ آپ اس کو لوگوں کو تک پہنچا دیں اور خود اس پر عمل کر کے اس کی عملی تفسیر پیش کر دیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے اور رسول ﷺ کو بہت سے مقامات پر مخاطب بھی کیا ہے اور آپ کو جہاں بہت سی باتوں پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے وہیں، بہت سی باتوں کے کرنے سے منع بھی فرمایا ہے۔

اگر کسی کو کسی چیز کا حکم دیا جائے تو اس کے لیے فعل ''امر'' استعمال کیا جاتا ہے اور اگر کسی کو کسی چیز سے روکا جائے تو اس کے لیے فعل ''نہی'' استعمال کیا جاتا ہے۔

فعل امر اور نہی اس وقت ''حکم'' اور ''فرمان'' کے معنی دیتا ہے جب اس کا صدور بڑے کی طرف سے چھوٹے کے لیے ہو۔ لیکن اگر کوئی اپنے بڑے سے فعل امر اور نہی کے ذریعہ کوئی چیز طلب کرے تو اس کو درخواست، التماس یا گزارش کہتے ہیں۔ چونکہ عربی زبان میں فعل امر و نہی کے صیغے بڑے سے چھوٹے اور چھوٹے سے بڑے کے لیے ایک ہی طرح کے ہیں اس لیے مخاطب اور مخاطب کے رتبہ و مقام کے اعتبار سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کہاں حکم ہے اور کہاں درخواست۔

لیکن اردو زبان میں دونوں صورتوں کے لیے الگ الگ تعبیرات ہیں۔ مثلاً اگر باپ اپنے بیٹے سے، استاد اپنے شاگرد سے، مالک اپنے غلام سے اور حاکم اپنے ماتحت سے کچھ طلب کرے، کوئی کام کرنے کو کہے یا کسی کام سے روکے تو اس کی یہ طلب حکم اور فرمان کا درجہ رکھتی ہے۔ جیسے سچ بولو، جھوٹ مت بولو۔ اور اگر کوئی چھوٹا اپنے بڑے سے کوئی چیز طلب کرے تو یہ درخواست، التماس اور گزارش ہے۔ جیسے میری مدد فرمایے۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھے محروم نہ کیجیے اور مجھے اجازت دیجیے وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کے حق میں ہمارا یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ وہ ہمارا خالق و مالک اور رب ہے۔ ہم سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ عموماً اور اپنے آخری نبی محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ خصوصاً اپنے بندوں کو جو احکام دیے ہیں وہ انہی کے فائدے کے لیے ہیں۔ بندوں کے ان پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ تو کیا اس عقیدہ اور ایمان

کی روشنی میں یہ بات صحیح ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے قطع نظر اس کے کہ اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے، کوئی درخواست کرے یا اس سے کوئی التماس کرے؟ کیونکہ کسی سے کوئی اس وقت درخواست اور التماس کرتا ہے جب وہ اس کا محتاج ہو اور اللہ تعالیٰ کی ذات تو اس سے منزہ اور پاک ہے۔

لیکن گزشتہ تیس چالیس برسوں میں قرآن پاک کے جو اردو ترجمے شائع ہوئے ہیں ان میں "امر و نہی" کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے اور رسول ﷺ کی تعظیم اور آپ سے درخواست اور التماس کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ المائدہ میں ارشاد ربانی ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ﴾ [المائدہ:٦٧]

"اے رسول! پہنچا دیجیے جو نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو نہیں پہنچایا آپ نے اس کا پیغام......"

واضح رہے کہ یہ قرآن پاک کی نہایت ہی اہم آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو یہ حکم دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا جو کلام نازل فرمائے آپ اس کو لوگوں تک پہنچاتے رہیں۔ جبکہ آیت کا ترجمہ یہ بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو حکم نہیں دیا ہے بلکہ آپ سے درخواست کی ہے کہ آپ ایسا کریں۔ اس طرح کے صیغوں سے قرآن پاک کے مترجم نسخے بھرے ہوئے ہیں۔

واضح رہے کہ قرآن پاک کا ترجمہ لفظاً تو قرآن نہیں ہے لیکن معناً اور حکماً قرآن ہی ہے۔ لہٰذا کسی بھی زبان میں اس کا ترجمہ کرنے والے کو یہ بات اپنے ذہن میں تازہ رکھنی چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو جیسا کچھ وہ ہے ترجمہ کی زبان میں منتقل کر رہا ہے۔ اس ترجمہ میں اپنی طرف سے کوئی حذف یا اضافہ کرنا یا انداز تخاطب کو تبدیل کرنا کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے۔ اگر مترجم اپنی طرف سے تفسیر و توضیح کے طور پر کچھ کہنا چاہتا ہے تو اس کا اظہار وہ تفسیری نوٹ میں کرے۔ چونکہ تفسیر و توضیح اس کے اپنے کلام اور اپنی تعبیر سے عبارت ہوتی ہے اس لیے وہ اس میں شرح کے دائرے میں رہتے ہوئے جو اسلوب چاہے اختیار کر سکتا ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کا عموماً اور اپنے آخری رسول اور نبی محمد ﷺ کا ذکر خصوصاً القاب کے بغیر کیا ہے، لیکن جدید اردو ترجموں میں انبیاء کے ناموں سے پہلے بریکٹ میں "حضرت" اور ناموں کے بعد بریکٹ میں "علیہم السلام، اور "صلی اللہ علیہ وسلم" لکھنے کا التزام کیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض شخصیتوں کے ناموں سے پہلے بھی بریکٹ میں "حضرت" کا اضافہ کیا

گیا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ حضرت مریم کے نام سے پہلے "پاکباز بی بی" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اگر یہ اضافے ترجمہ میں بریکٹ کے اندر نہ لکھے جاتے تو ترجمہ میں خیانت شمار ہوتے، لیکن بریکٹ کے اندر لکھنے سے یہ "استدراک" میں شمار ہوتے ہیں۔ استدراک کے معنی ہیں گرفت کرنا اور تصحیح کرنا۔ گویا مترجم نے اللہ تعالیٰ کے کلام میں تصحیح کی ہے۔ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں کا احترام وادب ملحوظ نہ رکھا اس لیے مترجم نے تصحیح کر کے یہ کمی پوری کر دی اور اس کا تدارک کر دیا!!

ابھی میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ قرآن پاک کے ایسے ترجموں کے بارے میں تھا جن کا تصوف کے اسکول سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اس سے ان ہمہ جہت اور ہمہ گیر اثرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو "فکر صوفی" نے مسلمانوں کے مختلف طبقوں پر ڈالے ہیں۔ یہاں تک کہ بظاہر تصوف کا مخالف مترجم قرآن بھی اللہ تعالیٰ کے کلام کا ترجمہ کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی عظمت کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے اور ہوا کا رخ دیکھ کر ترجمہ کرتا یا تفسیر لکھتا ہے۔

یہ چند نہایت اہم اور ناگزیر باتیں تھیں جو قدرے تفصیل سے عرض کی گئی ہیں، جن کا مطالعہ نہ صرف اس کتاب کے اصل مباحث کے مطالعہ سے قبل ان شاء اللہ تعالیٰ مفید ثابت ہوگا بلکہ یہ باتیں سیرت، فضائل اعمال، فضائل ومناقب اور تصوف کی کتابوں کے مطالعہ سے پہلے بھی مفید ہوں گی اور ان کی روشنی میں موجودہ دور میں کیے جانے والے قرآنی ترجموں اور تفسیری حواشی میں عقائدی غلطیوں کو معلوم بھی کیا جا سکے گا۔

چونکہ تصوف سے کسی نہ کسی شکل میں وابستہ مسلمانوں کی اکثریت وہ فکر وعقیدہ نہیں رکھتی جو ہر دور میں "حقیقی" صوفیا کا رہا ہے۔ بلکہ وہ صرف ظاہری اعمال میں یا بعض بدعتوں کے حوالہ سے تصوف سے نسبت رکھتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ یہ مقدمہ اور پھر یہ کتاب ان کے لیے صحیح اسلامی عقیدہ معلوم کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

کتاب کی یہ دوسری جلد چار ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول: غیبیات	باب دوم: قصص الانبیاء
باب سوم: حج اور زیارت مدینہ	باب چہارم: معاشرت

ہر باب کے تحت جتنے ذیلی مسائل زیر بحث آئے ہیں اور ان کے بارے میں موضوع اور منکر روایتوں سے تعرض کیا گیا ہے، پہلے ان کے بارے میں پوری تفصیل سے اسلامی نقطہ نظر واضح کر دیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ کتاب وسنت سے باہر دلائل نہ دیے جائیں۔ اس لیے زیر بحث مسائل اور امور

کے بارے میں ائمہ اور علماء کے اقوال سے بہت کم استدلال ملے گا۔ انتہائی ناگزیر حالت میں کسی اسلامی عقیدے کی تائید یا توضیح کے موقع پر کسی اہل علم کا قول نقل کیا گیا ہے۔ اور ہر مسئلے کی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ اس پر کسی بھی مسلک کی چھاپ نظر نہیں آئے گی۔ کسی بھی عقیدے اور فکر کی تنقید کرتے ہوئے کسی بھی شخصیت کی تجریح اور تشہیر سے گریز کیا گیا ہے۔ اور ہر عالم کا ذکر ادب واحترام سے کیا گیا ہے۔

روایات کی صحت وسقم معلوم کرنے کا ذریعہ صرف "علم الرجال" کی کتابیں ہیں۔ اس لیے کوشش کی گئی ہے کہ کسی بھی روایت کی صحت وسقم کو ثابت کرنے کے لیے یا کسی راوی کو ثقہ یا مجروح دکھانے کے لیے صرف ان ائمہ فن کے اقوال نقل کیے جائیں جو اس میدان میں مستند مانے جاتے ہیں اور جن کا علم و فضل اور نزاہت ودیانتداری متفق علیہ ہے۔

اس جلد میں سارے حوالے حاشیہ میں منتقل کر دیے گئے ہیں تا کہ مطالعہ کے دوران تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔ صحیح احادیث کی سند نقل کرنے کی بجائے صرف حدیث کا متن، حدیث کے راوی صحابی اور حدیث کے ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ رہیں موضوع اور منکر روایات تو اولاً ان کی سندوں کو مختصر کر دیا گیا ہے۔ ثانیاً صرف ان کا ترجمہ دیا گیا ہے تا کہ اردو قارئین اکتاہٹ محسوس نہ کریں۔ رہے اہل علم تو وہ حاشیہ میں مذکور حوالوں سے ان کتابوں تک پہنچ سکتے ہیں جن سے یہ روایتیں لی گئی ہیں۔

نہایت افسوس ناک بات ہے کہ اس امت میں عقائدی بگاڑ تصوف کی راہ سے آیا ہے۔ قرآن پاک کی من مانی اور باطنی تفسیر کے بانی بھی اہل تصوف ہیں۔ ذکر واذکار اور طہارت وریاضت کے من گھڑت اور خود ساختہ طریقوں کو بھی امت کے افراد میں انہوں نے متعارف کرایا ہے۔ اس کے بعد دعویٰ یہ ہے کہ حقیقی اسلام تصوف ہی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کتاب کے مباحث سے اس دعویٰ کی قلعی کھل جائے گی۔

اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمے میں مکتبہ بیت السلام کے مالک محترم جناب حافظ عابد الٰہی ظہیر صاحب حفظہ اللہ کا ذکر خیر آ چکا ہے اور جیسا کہ میں اس میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ کتاب کی کمپوزنگ تک ذاتی طور پر میں ان سے واقف نہیں تھا۔ کتاب کی کمپوزنگ کے بعد ان سے چند منٹ کی ملاقات رہی۔ اسی طرح میری فطری کم آمیزی اور تصنیف وتالیف کے میدان میں غیر معروف ہونے کی وجہ سے محترم جناب حافظ عابد الٰہی صاحب بھی میرے بارے میں خاطر خواہ واقفیت نہیں رکھتے رہے ہوں گے۔ اس کے باوجود انہوں نے نہ صرف یہ کہ یہ ایڈونچر (Adventure) لیا اور انجام سے بے پروا ہو کر کتاب شائع کرنے پر تیار ہو گئے بلکہ میری خواہش کے مطابق انہوں نے اسے نہایت اعلیٰ پیمانے پر اور فن طباعت کے عصری تقاضوں کے

مطابق شائع کیا اور کاغذ بھی نہایت عمدہ استعمال کیا جس کی وجہ سے کتاب بہت دیدہ زیب اور جاذب نظر ہوگئی۔اس سے محترم جناب حافظ عابد الٰہی صاحب کی نیک نیتی، اخلاص اور خیر کی اشاعت میں تعاون کا بھر پور جذبہ عیاں ہوتا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ وہ موصوف کے اس جذبہ خیر کو قبول فرمائے اور دنیا وآخرت دونوں کی بھلائیوں سے انہیں ہم کنار رکھے اور ہمارے اس تعلق کو پائیدار بنائے۔ آمین

حافظ صاحب کتاب کی یہ دوسری جلد بھی اپنے مکتبہ سے شائع کر رہے ہیں جس پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔ جدہ، سعودی عرب میں مقیم محترم جناب مولانا مختار احمد عثمانی صاحب مشہور داعی الی اللہ ہیں۔ وہ موجودہ پرفتن دور میں دعوت دین کی نزاکتوں سے واقف ہیں اور اسلام کے منہج اعتدال پر چلتے ہوئے لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے ہیں اور مسلکی تعصب سے دور رہ کر اسلام سے نسبت رکھنے والے ہر طبقہ فکر کے لوگوں میں حق کی آواز بلند کر رہے ہیں۔ آپ نے اس کتاب کی پہلی جلد کی اشاعت کے بعد اسے لوگوں میں پھیلانے اور عام کرنے کے لیے اپنے وقت اور پیسوں کی جو قربانی دی ہے اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور ان کو اور ان کے جملہ اہل خانہ کو اپنی عنایتوں اور برکتوں سے ہمیشہ نوازتا رہے۔ اپنے علم وفضل اور حب خیر میں راقم سے برتر ہونے کے باوجود اس سے ان کو جو تعلقِ خاطر ہے اس کو سدا بہار رکھے آمین۔

کتاب کی اس دوسری جلد کے لیے میرے بڑے بھائی، محسن اور مربی ڈاکٹر محمد شعیب نگرامی حفظہ اللہ نے از راہ عنایت جو ''پیش لفظ'' تحریر فرمایا ہے اس پر میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ وہ مجھے اور میری اس کاوش کو ان کی تعریفوں کا حقیقی مظہر بنائے۔

اللہ تعالیٰ سے اس بات کے لیے بھی دعا گو اور ملتجی ہوں کہ وہ اس کتاب کی پہلی جلد کی طرح اس دوسری جلد کو بھی قبولیت عام سے نوازے اور یہ اسلام سے نسبت کا دعویٰ کرنے والوں کے عقائد کی اصلاح میں مؤثر ثابت ہو۔ یہ کتاب اگر حسن بیان سے خالی ہے تو ان شاء اللہ تعالیٰ حسن اخلاص سے مملو ملے گی۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور اس کو میرے صالح اعمال میں شامل کر لے۔

إِنّه تعالیٰ سمیعٌ مُجیبٌ وَصَلّی اللّٰه علی رسولنا وحبیبنا محمد وعلی آله وصحابته وبارك وسلم

سید سعید احسن عابدی

۹/ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ

جدہ۔ مملکتِ عربیہ سعودیہ

باب اول

غیبیات

آغاز آفرینش:

بدء الخلق یعنی آغاز آفرینش، عرش الٰہی، آسمان و زمین، لوح و قلم، شمس و قمر، اور جنت و جہنم کی تخلیق، جنوں اور انسانوں کی پیدائش، فرشتوں کی حقیقت اور نبی آخر الزمان محمد بن عبداللہ ﷺ سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیاء، رسولوں اور ان کی قوموں کے واقعات اور اس طرح کے بے شمار امور کا تعلق غیبیات سے ہے۔ غیب کے لغوی معنی ہیں: مخفی اور پوشیدہ۔ یعنی جو چیز ہماری نگاہوں سے اوجھل اور ہمارے دائرہ معلومات سے باہر ہے وہ غیب ہے۔ یہ غیب کے لغوی معنی ہیں۔ دینی اصطلاح میں غیب سے مراد ہر وہ مخفی اور پوشیدہ چیز ہے جس تک ذرائع معلومات کی رسائی نہ ہو۔ رہیں وہ مخفی اور پوشیدہ چیزیں جن کی حقیقت انسان علمی ذرائع اور وسائل کے ذریعہ حاصل کرتا ہے وہ غیب نہیں ہیں۔

اوپر جن غیبی امور کا ذکر آیا ہے ان کا تعلق ماضی سے ہے اسی طرح اس دنیا کے بعد آخرت میں حشر ونشر، حساب و کتاب اور جزاء و سزا کا تعلق بھی غیبی امور سے ہے جن کا علم صرف اللہ کو ہے۔ اور ان میں سے بعض امور کا جو علم نبی ﷺ اور دوسرے انبیاء کو حاصل تھا وہ اللہ تعالیٰ کے بتانے سے حاصل تھا۔

اس تناظر میں غیبی امور کے بارے میں صرف وہی معلومات صحیح اور قابل اعتماد ہیں جن کی صراحت قرآن پاک میں یا ان حدیثوں میں کر دی گئی ہے جن کی نسبت نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے۔ رہے دوسرے ذرائع معلومات، جیسے: آثار صحابہ اور تابعین کے اقوال؟ تو وہ صرف ان امور کے بارے میں قابل اعتبار ہیں جن کی قرآن پاک اور صحیح مرفوع احادیث میں کوئی اصل ہو۔ یہ آثار صحابہ اور تابعین کے اقوال صرف تفصیل مزید کا درجہ رکھتے ہوں۔

رہیں اسرائیلی روایات تو ائمہ حدیث نے تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں ان سے استدلال کے لیے چند اصول وضوابط وضع کرا دیے ہیں جن کی پابندی ضروری ہے۔

اہل کتاب کے صحیفوں سے استدلال کے اصول وضوابط:

(۱) اہل کتاب کے صحیفوں میں درج جو باتیں اسلامی عقیدے کے خلاف نہیں ہیں، عصمت انبیاء کے منافی نہیں ہیں اور کتاب وسنت کی صریح تعلیمات کے خلاف نہیں ہیں، بلکہ عام واقعات کے قبیل سے یا ایسے واقعات کی تفصیلات سے عبارت ہیں جو کتاب وسنت میں کسی نہ کسی شکل میں مذکور ہیں ان کو بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

(۲) اہل کتاب کے صحیفوں میں مذکور جن باتوں کی کتاب وسنت کے بیان سے تصدیق ہوتی ہو ان کے ذکر میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

(۳) اہل کتاب کی جو مرویات عقیدۂ توحید کے منافی ہیں اور جن سے عصمت انبیاء پر زد پڑتی ہے ان کو بیان کرنا حرام ہے الا یہ کہ واضح کر دیا جائے: یہ اسرائیلی روایات ہیں۔

(۴) جو باتیں عام ہیں اور جن کا اسلامی شریعت میں کوئی ذکر نہیں آیا ہے تو ایسی باتوں کی نہ تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب۔

(۵) کوئی ایسی بات جو نبی اکرم ﷺ نے نہیں فرمائی ہے اور جس کی نسبت آپ سے بذریعہ صحیح سند ثابت نہیں ہے اس کو نبی ﷺ کی نسبت سے بیان کرنا حرام اور اس کی سزا جہنم ہے۔

تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں اسرائیلی روایات کے ذکر سے متعلق اوپر جو اصول وضوابط بیان کیے گئے ہیں۔ وہ نبی اکرم ﷺ کے درج ذیل ارشادات سے ماخوذ ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کرم ﷺ نے فرمایا:

((بَلِّغُوْا عَنِّي وَلَوْ آيَةً وَحَدِّثُوْا عَنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ وَلَا حَرَجَ. وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ))

''اگر تم کو ایک آیت کے بقدر بھی میری کوئی حدیث معلوم تو اس کو پہنچا دو اور بنو اسرائیل کے حوالہ سے واقعات بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جو کوئی جان بوجھ کر میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔''[1]

ایک دوسری حدیث میں رسول اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

[1] صحیح بخاری حدیث نمبر، ۳۴۶۱

((لاَ تُصَدِّقُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ وَ﴿ قُوْلُوْا: آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ إِلَيْنَا ﴾))

''اہل کتاب کی تصدیق کرو نہ تکذیب۔ اور (قرآن کے موجب) کہو: ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس چیز پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے۔''[1]

واضح رہے کہ جب تک اسلامی تعلیمات ذہن و دماغ میں پوری طرح راسخ نہیں ہوئی تھیں تو رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو اہل کتاب کے صحیفے پڑھنے سے منع فرما رکھا تھا، تاکہ ان کے دماغوں میں قرآن پاک اور تورات کے معانی خلط ملط نہ ہوں۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ہم یہودیوں سے بعض ایسی باتیں سنتے ہیں جو ہمیں پسند آتی ہیں۔ تو آپ کا کیا خیال ہے، کیا ہم ان میں سے بعض باتیں لکھ لیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أَمُتَهَوِّكُوْنَ أَنْتُمْ كَمَا تَهَوَّكَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى، لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً وَلَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِي))

''کیا تمہیں بھی اسی طرح حیرانی اور تذبذب ہے جس طرح یہود و نصاریٰ کو حیرانی اور تذبذب تھا۔ میں تو اسلامی شریعت تمہارے پاس نہایت روشن اور ہر نقص وعیب سے پاک لایا ہوں۔ اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔''[2]

اور سنن دارمی میں ہے:

((وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ بَدَالَكُمْ مُوْسٰى فَاتَّبَعْتُمُوْهُ وَتَرَكْتُمُوْنِي لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيْلِ وَلَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا وَأَدْرَكَ نُبُوَّتِي لَاتَّبَعَنِي))

''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے اگر موسیٰ تمہارے سامنے ظاہر ہو جائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی اتباع کرنے لگو تو تم صحیح راہ سے بھٹک جاؤ گے۔ اور اگر موسیٰ زندہ ہوتے اور ان کو میری نبوت کا زمانہ ملتا تو وہ ضرور میری اتباع کرتے۔''[3]

---

[1] صحیح بخاری حدیث نمبر ٤٤٨٥، ٧٣٦٢، ٧٥٢٢

[2] مسند احمد حدیث نمبر ١٥٢٢٣ اور شعب الایمان بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح حدیث نمبر: ۱۷۷

[3] سنن الدارمی حدیث نمبر ٤٣٩

تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں بدء الخلق یعنی آغاز آفرینش سے متعلق اور سابق انبیاء اور رسولوں کے بارے میں اسرائیلی روایات جن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے منسوب ہیں ان میں حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابی بن کعب اور حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہم کے نام سرفہرست ہیں۔ اس طرح کی روایات حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم سے بھی منسوب ہیں۔ لیکن اول الذکر کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ جو روایات اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں، ان سے ان کی نسبت صحیح نہیں اگرچہ تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں عام ہیں۔ البتہ کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ جن کا نام اور نسب کعب بن مانع بن عمرو بن قیس ہے تو وہ صحابی نہیں بلکہ تابعی تھے [1] اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اسلام لائے تھے۔ چونکہ ان کا تعلق یمن کے یہودی علماء سے تھا اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے کعب الحبر یا کعب الاحبار کے لقب سے مشہور تھے۔ اس لیے اسرائیلی روایات ان سے زیادہ منسوب ہیں۔ اگرچہ وہ ثقہ تھے، پھر بھی ان سے منسوب روایتوں کو روایت و درایت کی کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول نہیں کرنا چاہیے۔

جہاں تک حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا تعلق ہے تو چونکہ فہم قرآن میں ان کو ممتاز اور بلند درجہ و مقام حاصل تھا، اس لیے تفسیری روایات ان سے بہت زیادہ منسوب ہیں۔ حتیٰ کہ بہت سی قرآنی آیات کی متضاد تفسیریں بھی ان کے حوالہ سے نقل کر دی گئی ہیں جن کی نسبت ایسے جلیل القدر صحابی سے صحیح نہیں ہو سکتی۔ جس کا لقب بجا طور پر ''ترجمان القرآن'' تھا اور جن کے فہم قرآن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی دعا فرمائی تھی۔ چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول قرین حقیقت ہے کہ:

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منسوب صرف سو روایتیں صحیح ہیں'' [2]

تابعین میں جن لوگوں کو اسرائیلی روایات بیان کرنے میں شہرت حاصل تھی ان میں سرفہرست ابوعبد اللہ وہب بن منبہ متوفی ۱۱۰ھ اور عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج متوفی ۱۵۰ھ ہیں۔

تفسیر کی کتابوں میں صحیح احادیث کے علاوہ حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے جو تفسیری روایات منقول ہیں ان میں سے بیشتر روایات صحیح نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر:

(۱) جو روایات اسماعیل بن عبدالرحمٰن السدّی نے ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہیں وہ اسباط بن نصر کے طریق سے مروی ہیں اور اسباط بن نصر کی ثقاہت پر ائمہ حدیث کا اتفاق نہیں تھا۔

---

[1] فتح الباری/ ص: ۳۲۸۷ ج:۳ [2] دیکھیے: الاتقان/ ص ۴۷۲ ج:۲

اگر چہ یہ روایتیں سفیان ثوری اور شعبہ بن حجاج جیسے ائمہ حدیث کے ذریعہ منقول ہیں۔

(۲) مقاتل بن سلیمان کے طریق سے جو تفسیری روایات منقول ہیں وہ بھی مردود ہیں کیونکہ ائمہ حدیث نے اس کو کذاب بتایا ہے۔

(۳) عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے جو تفسیری روایات محمد بن سائب کلبی کے طریق سے مروی ہیں وہ بھی باطل ہیں۔ کیونکہ اس پر کذب بیانی اور رافضیت کا الزام تھا۔ الثعلبی اور الواحدی کی تفسیروں میں اس کی روایات بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ تفسیر کی کتابوں میں منقول کسی بھی روایت کو اس وقت تک قبول نہیں کرنا چاہیے اور نہ اس سے استدلال کرنا چاہیے جب تک کہ نبی اکرم ﷺ سے یا صحابہ کرام سے صحیح سند کے ذریعہ اس کی نسبت ثابت نہ ہو۔ سوائے ان حدیثوں کے جو صحیحین میں مروی ہیں یا حدیث کی دوسری مستند کتابوں میں منقول ہیں اور ان کو کسی ماہر فن حدیث نے صحیح قرار دیا ہو۔ تفسیر کی مشہور کتابوں میں کسی روایت کا منقول ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ روایت صحیح ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا:

متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا۔ چنانچہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((اِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى الْقَلَمُ، ثُمَّ قَالَ: اُكْتُبْ، فَجَرَى فِي تِلْكَ السَّاعَةِ بِمَا هُوَ كَائِنٌ اِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ))

"اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو پہلی چیز پیدا کی وہ قلم ہے۔ پھر فرمایا: لکھ۔ تو وہ اسی گھڑی قیامت تک پیدا ہونے والی تمام چیزوں کو لکھنے کے لیے چل پڑی۔" [1]

سنن ترمذی میں یہ حدیث ان الفاظ میں مروی ہے:

((اِنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمُ، فَقَالَ: اُكْتُبْ، قَالَ: مَا أَكْتُبُ قَالَ: اُكْتُبِ الْقَدَرَ مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ اِلَى الْأَبَدِ))

---

[1] مسند امام احمد حدیث نمبر ۲۳۰۸۱

"درحقیقت پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی وہ قلم ہے۔ فرمایا: لکھ۔ اس نے عرض کیا: کیا لکھوں؟ فرمایا تقدیر لکھ: جو ہو چکا اور ابد تک جو ہونے والا ہے۔"[1]

اسی طرح کی ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں مروی ہے، کہتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا:

((اَوَّلَ شَيْئٍ خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالَى الْقَلَمُ ، فَاَمَرَهُ ، فَكَتَبَ كُلَّ شَيْئٍ يَكُوْنُ))

"پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی قلم ہے۔ اور اس کو حکم دیا کہ وہ آئندہ ہونے والی ہر چیز کو لکھے۔"[2]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالَى الْقَلَمُ: فَاَخَذَهُ بِيَمِيْنِهِ ، وَكِلْتَا يَدَيْهِ يَمِيْنٌ ، قَالَ: فَكَتَبَ الدُّنْيَا وَمَا يَكُوْنُ فِيْهَا مِنْ عَمَلٍ مَعْمُوْلٍ بِرٍّ اَوْ فُجُوْرٍ ، رَطْبٍ اَوْ يَابِسٍ ، فَاَحْصَاهُ عِنْدَهُ فِي الذِّكْرِ ، فَقَالَ: اِقْرَاُوا مَا شِئْتُمْ: ﴿ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ط اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ o ﴾ فَهَلْ تَكُوْنُ النُّسْخَةُ اِلَّا مِنْ شَيْئٍ قَدْ فَرَغَ مِنْهُ))

"پہلی چیز جو تعالیٰ نے پیدا کی قلم ہے۔ اس نے اس کو اپنے داہنے ہاتھ میں پکڑا اور اس کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس نے دنیا اور اس میں ہونے والے نیک اور برے اعمال لکھے، تر اور خشک چیزیں لکھیں اور اس نے اپنے پاس موجود تمام چیزوں کو شمار کر ڈالا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم لوگ چاہو تو (قرآن میں) پڑھ لو: یہ ہے ہمارا تیار کرایا ہوا نامہ اعمال جو تمہارے اوپر ٹھیک ٹھیک شہادت دے رہا ہے، جو کچھ بھی تم کرتے تھے اسے ہم لکھواتے جا رہے تھے[3] اور کیا نسخہ اور کاپی صرف اسی چیز کی نہیں ہوتی جو

[1] جامع حدیث نمبر ۲۱۵۵

[2] الاسماء والصفات الحدیث ۸۰۳۔ السنن الکبری ص ۹ ج ۳۔ مسند ابویعلی ص ۱۲۶، ج ۱، کتاب السنة ص ۵۰، ج ۱، حدیث نمبر: ۱۰۸

[3] سورۃ الجاثیہ آیت: ۲۹

پوری کرلی گئی۔"[1]

اوپر نقل کردہ صحیح حدیثوں سے بصراحت یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کی تخلیق فرمائی۔ البتہ صحیح بخاری میں مروی ایک حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت آسمان و زمین کی تخلیق فرمائی تو اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔ چنانچہ حضرت عمران ابن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْئٌ قَبْلَهُ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ، ثُمَّ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ وَكَتَبَ فِي الذِّكْرِ كُلَّ شَيْئٍ))

"اللہ تعالیٰ تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی اور اس کا عرش پانی پر تھا۔ پھر اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ذکر (لوح محفوظ) میں ہر چیز لکھی۔"[2]

اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے جو حدیث مروی ہے اس کے الفاظ ہیں:

((كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيْرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ، قَالَ: وَعَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ))

"اللہ نے مخلوقات کی تقدیریں آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے لکھیں آپ نے فرمایا: اور اس کا عرش پانی پر تھا۔"[3]

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی مذکورہ حدیثوں سے یہ بات تو بصراحت معلوم ہو رہی ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق عرش اور پانی کی تخلیق کے بہت بعد میں ہوئی، مگر یہ حدیثیں اس امر میں صریح نہیں ہیں کہ عرش اور پانی کی تخلیق قلم کی تخلیق سے پہلے ہو چکی تھی۔ لہٰذا جب دوسری صحیح حدیثوں میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کی تخلیق فرمائی ہے تو یہ بات طے اور متعین ہو گئی اور امام بیہقی رحمہ اللہ کا یہ فرمانا: اللہ تعالیٰ نے پانی ہوا اور عرش کی تخلیق کے بعد جو پہلی چیز پیدا کی وہ قلم ہے[4] کسی نقلی دلیل سے عاری ہے۔

---

[1] كتاب السنة ص ٤٩-٥٠ ح: ١٠٦

[2] صحيح بخاري حديث نمبر ٣١٩١، ٤٧١٨

[3] صحيح مسلم، حديث نمبر ٦٧٤٨ (٢٦٥٣)

[4] الاسماء والصفات ص ٢٣٨، ج٢

مزید یہ کہ عرش اور پانی کے ضمن میں "ہوا" کا ذکر کسی صحیح حدیث میں نہیں آیا ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ پانی اور عرش میں سے اللہ تعالیٰ نے پہلے کس کو وجود بخشا تو اس کا ذکر بھی کسی صحیح حدیث میں نہیں آیا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں رسول اکرم ﷺ کے ارشاد "وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ" کی شرح کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے: اللہ تعالیٰ نے پہلے پانی پیدا فرمایا پھر پانی پر عرش کو وجود بخشا اور اس کی دلیل میں حضرت ابورزین عقیلی رضی اللہ عنہ سے مروی جس حدیث کا مسند امام احمد اور سنن ترمذی میں حوالہ دیا ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

"إِنَّ الْمَاءَ خُلِقَ قَبْلَ الْعَرْش" پانی کی تخلیق عرش سے پہلے ہوئی[1] تو یہ حدیث مسند امام احمد اور سنن ترمذی کے مطبوعہ نسخوں میں مجھے نہیں ملی۔ لہٰذا عرش سے پہلے پانی کی تخلیق کی کوئی نقلی دلیل نہیں ہے۔ البتہ عرش کے پانی پر ہونے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پانی کی تخلیق پہلے ہو چکی تھی۔

اوپر آغاز آفرینش سے متعلق جو متعدد صحیح احادیث نقل کی گئیں ہیں ان سے پوری وضاحت سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں جو چیزیں سب سے پہلے پیدا فرمائیں وہ درج ذیل ہیں:

قلم۔ لوح محفوظ۔ عرش۔ آسمان۔ زمین

احادیث بدء الخلق میں "نور محمدی" کی تخلیق کا کوئی ذکر نہیں۔

بدء الخلق یا آغاز آفرینش کی حدیثوں میں صراحۃً یا اشارۃً "نور محمدی" یا رسول اکرم ﷺ کی تخلیق کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ حتیٰ کہ کتب حدیث میں بدء الخلق کے بارے میں جو ضعیف اور منکر روایات آئی ہیں ان میں بھی "نور محمدی" کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ جبکہ امت کے ایک بہت بڑے طبقہ میں "نور محمدی" نے عقیدہ کی شکل اختیار کر رکھی ہے اور اس "نور" کو پوری کائنات کی اصل قرار دے دیا گیا ہے۔

اس کتاب کی پہلی جلد (ص ۲۸۴۔ ۲۸۷) میں اس موضوع اور باطل روایت پر مفصل گفتگو کی گئی ہے جس میں "نور محمدی" کا ذکر آیا ہے۔ یہاں "تفصیل مزید" کے طور پر اس روایت کا مکمل متن پیش کر دینا چاہتا ہوں، جس کے بعد ان کتابوں کا ذکر کروں گا جن میں یہ بے بنیاد روایت مذکور ہے پھر یہ واضح کروں گا کہ اس روایت کو جن لوگوں نے گھڑا ہے وہ رسول اکرم ﷺ کو صرف رسول نہیں مانتے بلکہ آپ کو کائنات کی اصل مانتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نعوذ باللہ کائنات میں

---

[1] ص ۱۵۰۲ ج ۲

صاحب تصرف ہیں اور اللہ تعالیٰ کی الٰہیت و ربوبیت میں آپ کا بھی حصہ ہے بلکہ یہ دنیا اور آخرت دونوں آپ کی جود و سخا کے مظہر ہیں اور ''لوح محفوظ'' کا علم آپ کے علم کا صرف ایک حصہ ہے (''موضوع اور منکر روایات'' کی جلد اوّل کے تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے) لیجیے! اب اگلی روایات کا مطالعہ کیجیے۔

''نور محمدی'' کی روایت کا متن:

اس عجیب و غریب روایت کی کوئی سند کسی کتاب میں بیان نہیں ہوئی بلکہ ہر کتاب میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ روی عبد الرزاق بسندہ عن جابر ......عبدالرزاق نے اپنی سند کے ذریعہ جابر سے روایت کیا...... وہ کہتے ہیں:

۱۷۰ ......((يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي أَخْبِرْنِي عَنْ أَوَّلِ شَيْءٍ خَلَقَهُ اللّٰهُ قَبْلَ الْأَشْيَاءِ قَالَ: يَا جَابِرُ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى خَلَقَ قَبْلَ الْأَشْيَاءِ نُوْرَ نَبِيِّكَ مِنْ نُوْرِهِ فَجَعَلَ ذٰلِكَ النُّوْرَ يَدُوْرُ بِالْقُدْرَةِ حَيْثُ شَاءَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ فِي ذٰلِكَ الْوَقْتِ لَوْحٌ وَلَا قَلَمٌ وَلَا جَنَّةٌ وَلَا نَارٌ وَلَا مَلَكٌ وَلَا سَمَاءٌ وَلَا أَرْضٌ وَلَا شَمْسٌ وَلَا قَمَرٌ وَلَا جِنِّيٌّ وَلَا إِنْسِيٌّ۔ فَلَمَّا أَرَادَ اللّٰهُ أَنْ يَخْلُقَ الْخَلْقَ قَسَّمَ ذٰلِكَ النُّوْرَ أَرْبَعَةَ أَجْزَاءٍ، فَخَلَقَ مِنَ الْجُزْءِ الْأَوَّلِ الْقَلَمَ وَمِنَ الثَّانِي اللَّوحَ وَمِنَ الثَّالِثِ الْعَرْشَ۔ ثُمَّ قَسَّمَ الْجُزْءَ الرَّابِعَ أَرْبَعَةَ أَجْزَاءٍ، فَخَلَقَ مِنَ الْجُزْءِ الْأَوَّلِ حَمَلَةَ الْعَرْشِ وَمِنَ الثَّانِي الْكُرْسِيَّ وَمِنَ الثَّالِثِ بَاقِي الْمَلَائِكَةِ۔ ثُمَّ قَسَّمَ الْجُزْءَ الرَّابِعَ أَرْبَعَةَ أَجْزَاءٍ فَخَلَقَ مِنَ الْجُزْءِ الْأَوَّلِ السَّمٰوَاتِ وَمِنَ الثَّانِي الْأَرْضِيْنَ وَمِنَ الثَّالِثِ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ۔ ثُمَّ قَسَّمَ الرَّابِعَ أَرْبَعَةَ أَجْزَاءٍ، فَخَلَقَ مِنَ الْجُزْءِ الْأَوَّلِ نُوْرَ أَبْصَارِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمِنَ الثَّانِي نُوْرَ قُلُوْبِهِمْ وَهِيَ الْمَعْرِفَةُ بِاللّٰهِ وَمِنَ الثَّالِثِ نُوْرَ أُنْسِهِمْ وَهُوَ التَّوْحِيْدُ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ......الحديث))

''یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان مجھے اس پہلی چیز کے بارے میں بتایئے جس کی اللہ نے تمام اشیاء سے پہلے تخلیق فرمائی؟ فرمایا: اے جابر! دراصل اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور سے پیدا کیا اور اس نور کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ

جہاں اللہ چاہے، اپنی قدرت و استطاعت سے گھومتا پھرے۔ اس وقت نہ لوح محفوظ تھی، نہ قلم، نہ جنت تھی، نہ جہنم، نہ فرشتہ تھا، نہ آسمان اور نہ زمین، نہ سورج تھا، نہ چاند، نہ جن تھے، اور نہ انسان۔ اور جب اللہ نے مخلوق کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو اس نور کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے پہلے حصے سے قلم کی تخلیق فرمائی، دوسرے سے لوح محفوظ اور تیسرے سے عرش۔ پھر اس کے چوتھے حصے کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلے حصے سے حاملین عرش کی تخلیق فرمائی، دوسرے سے کرسی اور تیسرے سے بقیہ فرشتوں کو پیدا کیا۔ پھر اس کے چوتھے حصے کو چار اجزاء میں تقسیم کر دیا۔ پہلے جزء سے آسمانوں کو بنایا، دوسرے سے زمینوں کو اور تیسرے سے جنت اور جہنم کو۔ پھر اس کے چوتھے جزء کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلے حصے سے مؤمنین کی بصارت کا نور بنایا۔ دوسرے سے ان کے دلوں کا نور بنایا جو اللہ کی معرفت سے عبارت ہے۔ اور تیسرے سے ان کے اُنس کا نور پیدا کیا جو توحید، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے......"[1]

اس روایت کو جن علماء نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے ان کے اور ان کی کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

نور محمدی کے واقعہ کے مآخذ:

(۱) علامہ شیخ شہاب الدین احمد بن محمد قسطلانی متوفی ۹۲۳ھ۔ شیخ قسطلانی کا شمار ممتاز علمائے حدیث میں ہوتا ہے۔ ان کی صحیح بخاری کی شرح ارشاد الساری لشرح البخاری، علم حدیث میں ان کی گہری اور وسیع نظر کی ترجمان ہے۔ شیخ قسطلانی نے سیرت رسول ﷺ کے موضوع پر اپنی مشہور کتاب "المواهب اللدنية" میں "نور محمدی" کی روایت کا ذکر، رواه عبد الرزاق بسنده عن جابر" سے کیا ہے اور روایت کی صحت وسقم سے تعرض کیے بغیر قلم کی تخلیق کی حدیثوں اور اس روایت کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔

(۲) شیخ حسین الدیار البکری متوفی ۹۹۰ھ نے اپنی کتاب "الخمیس فی انفس نفیس" میں اس روایت کا ذکر کیا ہے اور اس کو نبی اکرم ﷺ کے مناقب میں شمار کیا ہے۔ لیکن روایت کی صحت وسقم سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے۔

(۳) شیخ اسماعیل بن محمد عجلونی متوفی ۱۱۶۲ھ نے اپنی کتاب "کشف الخفاء و مزیل

[1] ص ۴۲، ۴۳، ۴۴

الإلباس عما اشتهر من الاحادیث علی السنة الناس" میں نور محمدی کی روایت کا ذکر کیا ہے اور اس پر کوئی تبصرہ کرنے کی بجائے "المواهب اللدنية" سے قسطلانی کی پوری عبارت نقل کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔

(۴) چوتھے بزرگ شیخ ابو الحسنات عبد الحی لکھنوی متوفی ۱۳۰۴ھ ہیں جنہوں نے اپنی کتاب "الآثار المرفوعه في الاخبار الموضوعه" میں یہ روایت نقل کی ہے لیکن اس کی سند لکھنے کی بجائے "المواہب" کی عبارت نقل کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔ البتہ اس باطل روایت سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں ان کی تردید کی ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مذکورہ بالا روایت ثابت نہیں کیونکہ اس کی کوئی سند ہی نہیں ہے۔

اوپر جن علماء کا ذکر آیا ہے ان سب نے مذکورہ روایت "روی عبد الرزاق بسنده عن جابر" عبدالرزاق نے اپنی سند کے ذریعہ حضرت جابر سے روایت کیا ہے...... کے الفاظ سے نقل کی ہے اور یہ نہیں لکھا کہ عبدالرزاق کون ہے؟ جب کہ عبدالرزاق دراصل تین ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) ابوبکر عبدالرزاق بن عمر الدمشقی: ان کا تعلق تبع تابعین کے درمیانی طبقہ سے تھا۔ یہ امام زہری سے اپنی روایت میں "متروک" اور دوسروں سے اپنی روایت میں بے حد ضعیف تھے۔[1]

(۲) عبدالرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری: ان کا شمار چھوٹے تبع تابعین کے طبقہ میں ہوتا ہے۔ یہ ثقہ اور حافظ حدیث تھے۔ آخری عمر میں نابینا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے ان کی عدالت متاثر ہو گئی تھی۔ ان پر تشیع کا بھی الزام تھا۔[2]

(۳) عبدالرزاق بن عمر البزیعی: ان کا تعلق تبع تابعین کے بعد کے طبقہ سے ہے جس کی کسی تابعی سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ وہ سچے[3] صدوق تھے۔ واضح رہے کہ علم حدیث میں صدوق ثقہ کا مترادف نہیں ہے۔ یعنی کسی راوی کی روایت صرف اس کے سچے ہونے کی وجہ سے قبول نہیں کی جاتی بلکہ حفظ و ضبط میں اس کا ماہر ہونا بھی شرط ہے۔

لیکن شیخ ابو عبداللہ محمد بن عبدالباقی الزرقانی نے "المواهب اللدنيه"[4] کی اپنی شرح میں مذکورہ روایت کے راوی کا نام عبدالرزاق بن ہمام الحمیری لکھا ہے۔ یاد رہے کہ علامہ زرقانی کا شمار علمائے حدیث میں ہوتا ہے اور ان کی مذکورہ شرح بہت مشہور ہے۔ مگر انہوں نے بھی اس کی مکمل سند نہیں لکھی۔

---

[1] التقريب ص ۲۹۶۔ ترجمه: ۴۰۶۴ — [3] التقريب ص ۲۹۶ ترجمه: ۴۰۶۴

[2] التقريب ص ۲۹۶، ترجمه: ۴۰۶۳ — [4] دیکھئے: المواهب اللدنيه ص ۸۹، ج ۱

کیونکہ کسی کتاب میں اس کی کوئی سند بیان ہی نہیں کی گئی۔ اور ہر مصنف نے اپنی کتاب میں "روی عبد الرزاق بسنده عن جابر" والے صیغہ کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے۔ چنانچہ حافظ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی متوفی ۹۱۱ھ سے جب یہ پوچھا گیا: کیا حدیث میں یہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے محمد ﷺ کا نور پیدا کیا اور اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا......؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ''اس حدیث کی کوئی ایسی سند نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جا سکے''[1] حافظ سیوطی فضائل ومناقب کے باب میں کسی روایت کو بڑی مشکل سے موضوع اور باطل قرار دیتے تھے بلکہ صوفی المشرب ہونے کی وجہ سے موضوع سے موضوع روایات کو صرف ضعیف کہنے پر اکتفا کرتے تھے۔ خاص طور پر ان روایتوں کو جن کا تعلق رسول اکرم ﷺ کے فضائل ومناقب سے ہے۔ لیکن یہ روایت ان کے نزدیک بھی نا قابل اعتبار تھی۔ اس لیے انہوں نے اس کی کوئی تاویل کرنے کے بجائے اس کو بے سند کہنے میں کوئی تردد نہ کیا۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ عبدالرزاق بن ہمام الحمیری کی طرف اس کی نسبت بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی کسی کتاب میں بھی اس باطل اور جھوٹی روایت کا ذکر نہیں ہے، حتیٰ کہ المصنف میں بھی نہیں۔

مندرجہ بالا وضاحتوں سے ''نور محمدی'' والی روایت کا بے اصل اور باطل ہونا ثابت ہو گیا۔ لگتا ہے کہ کسی صوفی المشرب شخص نے مذکورہ روایت گھڑ کر اس کے شروع میں ''رواہ عبدالرزاق بسندہ عن جابر'' کی عبارت لگا کر لوگوں میں پھیلا دی۔ چونکہ اس میں رسول اکرم ﷺ کی ایک ایسی صفت بیان ہوئی ہے جس سے آپ کا ''فوق البشر'' ہونا ظاہر ہو رہا ہے اس لیے اس طبقہ میں اس کو رواج مل گیا جو آپ کی بشریت کا قائل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس بے اصل روایت سے صرف صوفی المشرب علماء نے استدلال کیا ہے اور قدیم علمائے حدیث اور ارباب سیر کی کتابوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

دراصل اس روایت کا اسلوب بیان صحیح احادیث کے اسلوب بیان سے بہت مختلف اور صوفیانہ اسلوب بیان سے بہت مشابہ ہے: مثلاً "نور ابصار المومنین" "المعرفة باللہ" اور "انس القلوب" جیسی تعبیرات صرف تصوف کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

اس جھوٹی روایت میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنے نور سے اپنے نبی ﷺ کا نور پیدا کیا تھا، دوسرے لفظوں میں پوری کائنات ''نور محمدی'' سے پیدا کی گئی ہے۔ تو یہ دعویٰ بلا دلیل اور اسلامی عقیدے کے منافی ہے۔

---

[1] الحاوی للفتاوی ص ۳۸٦، ج:۱

رسول اللہ ﷺ بشر تھے اور بشر کا مادہ تخلیق مٹی ہے:

قرآن پاک کی دسیوں آیات مبارکہ میں پوری وضاحت سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی اکرم محمد ﷺ بشر تھے اور بشر کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا واقعہ بیان کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نہایت واضح اور دوٹوک انداز میں یہ بیان فرمادیا ہے کہ انسان مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴾ [الحجر:۲۶]

''ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے پیدا کیا ہے''

اور ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ﴾ [الحجر:۲۸، ۲۹]

''اے نبی! یاد کرو اس وقت کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر...... انسان...... پیدا کرنے والا ہوں۔ پس جب میں اسے مکمل بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا''

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مٹی سے پیدا کرنے کو اپنی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴾ [الروم:۲۰]

''اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اب تم (کئی حالتوں سے گزر کر) بشر ہو کہ پھیلتے جارہے ہو''

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی زبانی ان کی بشریت کا اعلان کروایا ہے تاکہ ان کے پیروؤں پر حجت رہے:

﴿ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِیَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ

الْمُؤْمِنُوْنَ○ ﴾ [ابراهيم:١١]

''ان کے رسولوں نے ان سے کہا: ہم تو تمہاری طرح کے صرف انسان ہیں۔ لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فضل فرماتا ہے۔ اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ ہم تمہارے پاس کوئی معجزہ ظاہر کر دیں الا یہ کہ اللہ اس کی اجازت دے اور اللہ ہی پر مومنوں کو بھروسہ کرنا چاہیے''

مطلب یہ ہے کہ رسول اپنی خلقت کے اعتبار سے انسان ہی ہوتے تھے، البتہ عام لوگوں پر ان کو یہ فضیلت حاصل تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو رسالت سے نوازا تھا اور وہ لوگوں کو جس حق کی دعوت دیتے تھے اس کے حق ہونے پر ان کو ''علم الیقین'' حاصل تھا۔ لوگوں کے مطالبے اور خواہش پر وہ معجزات دکھانے کا اختیار نہیں رکھتے تھے بلکہ ایسا اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اجازت پر موقوف تھا کہ وہ کب ان کو معجزات دکھانے کی اجازت اور حکم دیتا ہے۔

چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ بھی اللہ کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کے سلسلے کی ایک آخری کڑی تھے، اس لیے آپ بھی لازماً بشر اور انسان تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے خود آپ کی زبان سے آپ کی بشریت کا اعلان کروایا۔

ارشاد الٰہی ہے:

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ [الكهف:١١٠]

''اے محمد! کہہ دو کہ میں تو محض تمہی جیسا ایک انسان ہوں۔ مجھ کو وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود تو صرف ایک ہی معبود ہے''

نبی مکرم ﷺ کی بشریت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آپ کو الوہیت کی صفت سے متصف نہ کیا جائے، کیونکہ الٰہ اور معبود تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

سابق انبیاء اور رسولوں کی طرح محمد رسول اللہ ﷺ بھی معجزات دکھانے پر قدرت نہیں رکھتے تھے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا○ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا○ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا○ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ

تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴾ [الاسراء: ۹۰-۹۳]

''کافروں نے کہا: ہم تیری تصدیق اس وقت تک نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے۔ یا تو، جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے۔ یا اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو رو در رو ہمارے سامنے لے آئے یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے۔ یا تو آسمان پر چڑھ جائے۔ اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی کتاب کو نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔ اے محمد! کہہ دو پاک ہے میرا رب! کیا میں ایک انسان رسول کے سوا کچھ اور بھی ہوں؟''

کس قدر واضح اور دوٹوک طریقے سے یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ کسی کے نبی اور رسول ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس کو خدائی اختیارات حاصل ہو گئے ہیں اور وہ اپنی صداقت ثابت کرنے کے لیے جب چاہے معجزے دکھا سکتا ہے۔ قادر مطلق تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے اس دنیا میں اپنے رسول اور نبی صرف لوگوں کو توحید کی تعلیم دینے کے لیے بھیجے۔ محمد ﷺ بھی اللہ کے نبیوں اور رسولوں کی جماعت کے ایک فرد تھے۔ لہٰذا آپ کو نبی اور رسول ماننے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آپ کو ایسا انسان مانا جائے جو نور سے نہیں بلکہ گوشت پوست سے بنا ہے۔ خدائی اختیارات کا مالک نہیں ہے اور اس کے ہاتھ میں کائنات کی باگ ڈور نہیں ہے اور نہ اس کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ ہر ایک کے مطالبے پورے کر دے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں نہایت واضح اور دوٹوک طریقے سے یہ بیان کر دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بشر اور انسان تھے اس طرح خود رسول اکرم ﷺ نے بذات خود مختلف موقعوں پر نہایت واضح طریقے سے اپنی بشریت کا اعلان فرما دیا تھا۔

ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَإِنَّهُ يَأْتِينِي الْخَصْمُ، فَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُونَ أَبْلَغَ مِنْ بَعْضٍ، فَأَحْسِبُ أَنَّهُ صَادِقٌ فَأَقْضِي لَهُ بِذٰلِكَ فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ بِحَقِّ مُسْلِمٍ، فَإِنَّمَا هِيَ قِطْعَةٌ مِنَ النَّارِ، فَلْيَأْخُذْهَا أَوْ لِيَتْرُكْهَا))[1]

---

[1] صحيح بخاری ۲۴۵۸، ۷۱۸۱، ۷۱۷۵۔ صحيح مسلم: ٤٤٧٥ (١٧١٣)

''میں تو صرف ایک انسان ہوں اور میرے پاس معاملات والے آتے ہیں، اس کا امکان ہے کہ تم میں سے کوئی کسی دوسرے سے زیادہ زبان آور ہو اور میں اس کو سچا سمجھ کر اس کے حق میں اس کا فیصلہ کر دوں۔ تو جس کے لیے میں کسی ایسی چیز کا فیصلہ کر دوں جس کا حقدار دوسرا مسلمان ہے، تو یہ درحقیقت آگ کا ایک ٹکڑا ہے، چاہے اس کو لے لے یا چھوڑ دے''

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں تو صرف انسان ہوں''۔ اس سے مراد نبی کریم ﷺ کی انسانی حیثیت پر متنبہ کرنا ہے کہ بشر غیب کا علم نہیں رکھتے اور ان کو پوشیدہ امور میں سے صرف اسی کا علم ہوتا ہے جس سے اللہ ان کو مطلع کر دیتا ہے۔ چنانچہ معاملات میں فیصلے سے متعلق نبی مکرم ﷺ سے بھی ایسے فیصلے کا امکان تھا جس کا امکان عام بشر سے ہوتا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان ظاہری قرائن کی بنیاد پر فیصلے فرماتے تھے اور اس کا امکان رہتا تھا کہ امر واقعہ اس کے خلاف ہو۔[1]

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی (حدیث کے راوی: ابراہیم کہتے ہیں: مجھے نہیں معلوم کہ جناب عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد اور میرے استاذ حضرت علقمہ رحمہ اللہ نے کون سا صیغہ بیان کیا؟ یعنی آپ نے زیادہ رکعتیں پڑھا دیں یا کم؟) اور جب آپ نے سلام پھیرا تو آپ سے عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! کیا نماز میں کوئی تبدیلی ہوگئی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ کیا؟ صحابہ نے عرض کیا: آپ نے اس اس طرح نماز پڑھی ہے۔ راوی کہتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے اپنے دونوں پاؤں موڑے، قبلہ رخ ہوئے، دو سجدے کیے، پھر سلام پھیرا اور ہماری طرف چہرۂ مبارک کر کے فرمایا:

((إِنَّهُ لَوْ حَدَثَ فِي الصَّلٰوةِ شَيْءٌ لَنَبَّأْتُكُمْ بِهِ، وَلٰكِنْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ، أَنْسَى كَمَا تَنْسَوْنَ، فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُونِي، وَإِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلٰوتِهِ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ، فَلْيُتِمَّ عَلَيْهِ، ثُمَّ يَسْجُدُ سَجْدَتَيْنِ))[2]

''اگر نماز میں کوئی نئی بات پیدا ہوئی ہوتی تو میں تمہیں اس کی خبر دے دیتا، لیکن میں تو محض تمہاری مانند ایک انسان ہوں اور اسی طرح بھولتا ہوں جس طرح تم بھولتے ہو۔ لہٰذا اگر میں

---

[1] المنهاج ص: ۱۱۰۱

[2] صحيح بخاری/ ۴۰۱، ۴۰۴، ۱۲۲۶، ۶۶۷۱، ۷۲۴۹۔ صحيح مسلم/ ۱۲۷۴ (۵۷۲)

بھول جاؤں تو مجھے یاد دلا دو اور جب تم میں سے کسی کو اپنی نماز میں شک ہو جائے تو وہ یقینی بات کو اختیار کرے اور اسی کو بنیاد بنا کر نماز پوری کرے پھر دو سجدے کرلے"

اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ شرعی اعمال میں بھول چوک سے دو چار ہوتے تھے۔ یہی جمہور علماء کا مسلک ہے۔ البتہ تبلیغ دین کے معاملے میں آپ بھول چوک اور غلطی سے محفوظ تھے۔

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو اہل مدینہ کھجور کے درختوں میں" گابھا" لگاتے تھے۔ کہتے ہیں: قلم کاری کرتے تھے۔ نبی ﷺ نے دریافت فرمایا: تم لوگ کیا کرتے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا: ہم ایسا کرتے آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: شاید اگر تم ایسا نہ کرو تو بہتر ہو۔ جب لوگوں نے قلم کاری ترک کردی (یعنی نر کھجوروں کا گابھا مادہ کھجوروں میں رکھنے والا عمل بند کردیا) تو درختوں سے یا تو پھل گر گئے یا کم آئے۔ لوگوں نے نبی مکرم ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا:

((إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْئٍ مِنْ دِينِكُمْ فَخُذُوْا بِهِ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْئٍ مِنْ رَأْيٍ فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ))[1]

"میں تو صرف ایک انسان ہوں، جب میں تمہیں تمہارے دین کی کسی بات کا حکم دوں تو اسے لے لو۔ اور اگر میں تمہیں کسی رائے کا حکم دوں تو میں صرف ایک انسان ہوں"

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دین کے معاملات میں تو رسول اللہ ﷺ کا ہر حکم واجب الاطاعت ہے کیونکہ دین کے معاملات میں آپ کا ہر ارشاد وحی الٰہی پر مبنی ہوتا تھا:

جیسا کہ اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ ﴾ [النجم:٣، ٤]

"نبی اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا یہ تو ایک وحی ہے جو اس کو کی جاتی ہے"

لیکن دنیاوی معاملات میں آپ کی کوئی بات واجب الاطاعت نہیں ہے۔

اوپر جو تین احادیث نقل کی گئی ہیں ان میں رسول اللہ ﷺ نے نہایت صریح الفاظ میں اپنی بشریت کا اعلان فرمایا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ آپ کوئی فوق البشر ہستی نہیں تھے بلکہ تمام انبیاء اور رسولوں کی طرح بشر تھے اور عام بشر پر جو فضیلت اور برتری آپ کو حاصل تھی وہ یہ تھی کہ آپ اللہ کے

[1] صحيح مسلم/ ٦١٢٧ (٢٣٦٢)

رسول تھے اور آپ کا مادہ تخلیق مٹی تھا نور نہیں تھا۔ لہٰذا آپ کا جسم مبارک گوشت، خون اور ہڈیوں سے عبارت تھا جس کو غذا اور پانی کی حاجت رہتی تھی۔

بشریت رسول کا عقیدہ ایمان بالرسالت کی صحت کے لیے شرط ہے:

قرآن پاک اور احادیث میں تمام انبیاء اور رسولوں کی بشریت کو عمومی طور پر اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی بشریت کو خصوصی طور پر اتنی شد و مد اور اتنی تفصیل سے اس لیے پیش کیا گیا ہے تاکہ اس کو ایسا عقیدہ سمجھ کر قبول کیا جائے جس کے بغیر انبیاء اور رسولوں کی نبوت و رسالت پر ایمان کا دعویٰ قابل قبول نہیں ہوتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزماں محمد بن عبداللہ ﷺ تک اپنے جتنے انبیاء اور رسول مبعوث فرمائے ان سب کو نبی اور رسول ماننے کے ساتھ ساتھ یہ ماننا بھی صحت کے لیے شرط ہے کہ وہ سب بشر اور انسان تھے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ٥ وَ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ مَا كَانُوْا خٰلِدِیْنَ٥ ﴾ [الانبیاء:۷، ۸]

”اے نبی! ہم نے تم سے پہلے انسانی مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا، جن کو ہم وحی کرتے تھے، اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر...... اہل کتاب سے پوچھ لو۔ ان کا ہم نے ایسا جسم نہیں بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ ہمیشہ رہنے والے تھے۔“

اس آیت مبارکہ میں پہلے تو حید کے ساتھ یہ واضح کر دیا گیا کہ اگر محمد بن عبداللہ ﷺ بشر ہیں تو آپ سے پہلے آنے والے رسول بھی بشر تھے جس کے گواہ اہل کتاب ہیں۔ دوم یہ کہ وہ تمام انسانوں کی طرح کھانے پینے کے محتاج تھے۔ سوم یہ کہ ان میں سے کسی کو دوام حاصل نہیں تھا۔ اس طرح اس آیت نے اس عقیدے کی جڑ کاٹ دی کہ اللہ کے نبی اور رسول غیر معمولی اور مافوق الفطرت صفات سے متصف تھے۔

سابقہ قوموں میں سے جس قوم نے اپنے نبی کو الوہیت کی صفت سے متصف کیا وہ نصاریٰ ہیں۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی باپ کے بغیر معجزاتی پیدائش کو اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت پر محمول کرنے کی بجائے ان کو الوہیت میں شریک بنالیا۔ قرآن ان کی کج فہمی واضح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر کسی کا اعجازی شکل میں پیدا ہونا اس کے الٰہ ہونے کی دلیل ہوسکتا ہے تو اس کے زیادہ مستحق حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ کیونکہ وہ باپ اور ماں دونوں کے بغیر پیدا کیے گئے تھے:

﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [آل عمران:۵۹]

"اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اس کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اس کو کہا: ہو جا، تو وہ ہو گیا۔"

مگر اس بات کو تسلیم کرنے کے باوجود کہ کسی کا باپ اور ماں کے بغیر پیدا کیا جانا اپنے اندر اس سے بڑی اعجازی شان رکھتا ہے جو صرف باپ کے بغیر پیدا ہوا ہے، عیسائی حضرت آدم علیہ السلام کے اندر کسی الٰہی صفت کے قائل نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ عیسائیوں میں عقیدۂ تثلیث یا اُلوہیتِ مسیح کے پیچھے کوئی ٹھوس منطق کارفرما نہیں ہے۔ اور جو مخلوق ہے وہ کسی بھی حال میں خالق یا الٰہ نہیں ہو سکتا اور نہ الٰہی صفات میں شریک ہو سکتا ہے۔ اس بدیہی حقیقت کے باوجود عیسائیوں میں عقیدۂ الوہیتِ مسیح کیسے پیدا ہوا؟

قرآن اس سوال کا جواب بڑی تفصیل سے دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام نبیوں کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی توحید ہی کی دعوت دیتے تھے۔ وہ اور ان کی ماں دونوں بشری صفات ہی سے متصف تھے۔ لیکن ان کی عقیدت میں غلو اور انتہا پسندی نے عیسائیوں کو شرک میں مبتلا کر دیا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ ﴾ [المائدہ:۷۲، ۷۳]

"یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے کہ جنہوں نے کہا اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے، حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ اے بنو اسرائیل! اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے۔ حالانکہ ایک معبود کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے"

یہ آیتیں اپنے مدعا میں اتنی واضح ہیں اور مسیح علیہ السلام کی دعوت توحید اور شرک باللہ کی تردید اتنی دوٹوک ہے کہ کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی رسالت اور ان کی اور ان کی والدۂ ماجدہ کی بشریت واضح کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴾ [المائدہ:۷۵]

"مسیح ابن مریم صرف ایک رسول تھا، اس سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں، اس کی ماں ایک راست باز عورت تھی اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ اے نبی! دیکھو ہم ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں کس طرح واضح کر رہے ہیں، پھر دیکھو یہ کدھر الٹے پھرے جاتے ہیں"

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے عقیدہ الوہیتِ مسیح کی تردید کرتے ہوئے ان کے انسان ہونے کی ایک ایسی علامت اور نشانی بیان کی ہے جس کا انکار کوئی نہیں کر سکتا۔ یعنی مسیح علیہ السلام ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔ وہ اور ان کی ماں مادی جسم رکھتے تھے کہ جو اپنی بقاء کے لیے کھانا کھاتے تھے۔

آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ عیسائیوں میں شرک کی بیماری اور مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا عقیدہ، ان کی عقیدت و محبت میں "غلو" گمراہ قوموں کی پیروی سے پیدا ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ارشادات اور ان پر نازل ہونے والی کتاب اس عقیدے سے پاک ہے:

﴿ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴾ [المائدہ:۷۷]

"اے نبی! کہو اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔"

اس آیت مبارکہ میں عیسائیوں کی گمراہی کے دو اسباب بیان کیے گئے ہیں: ایک تو دین میں غلو، یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کی عقیدت و تعظیم میں غلو جو بعد میں ان کی الوہیت کے عقیدے پر منتج ہوا۔ دوم ہمسایہ قوموں کے اوہام، باطل فلسفوں، مشرکانہ عقائد اور ان کی خواہشات نفس کے ترجمان خیالات و افکار کی پیروی۔ گمراہ قوموں سے مراد اس دور کی وہ قومیں تھیں جو مشرک تھیں۔ خصوصاً یونانی فلاسفہ جن کا فکری اور عقائدی سرمایہ اللہ تعالیٰ کی کسی شریعت سے ماخوذ نہیں تھا۔

امت مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل و احسان ہے کہ اس نے جہاں اپنے آخری ہدایت نامے، قرآن کو قیامت تک کے لیے ہر طرح کی تبدیلی اور تحریف سے محفوظ کر دیا، اسی طرح اس نے اپنے آخری نبی محمد ﷺ کی سیرت پاک اور آپ کی قولی اور فعلی سنت کو بھی محفوظ کر دیا اور اس کی حفاظت کے

لیے ہر دور میں ایسے ماہر فن اور مخلص علماء پیدا کرتا رہا جو رسول اکرم ﷺ کی سیرت پاک، آپ کی قولی و فعلی سنت اور عقیدۂ توحید کو ہر طرح کی آمیزش سے محفوظ کرتے رہے، جس کا سلسلہ ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت تک جاری رہے گا۔

کتاب وسنت میں مسلمانوں کو غلو اور انتہاء پسندی سے محفوظ رکھنے کے لیے اور رسول اکرم ﷺ سے بے پناہ اور انتہائی محبت کرنے کا مطالبہ کرنے کے ساتھ ساتھ، بار بار آپ کی بشریت کی تاکید کی گئی ہے تا کہ رسول اکرم ﷺ کی بشریت کا عقیدہ ذہن و دماغ میں رچ بس جائے۔ کیونکہ مشرکانہ خیالات وافکار سے دل و دماغ کو محفوظ رکھنے کے لیے بشریتِ رسول کا عقیدہ سب سے قوی ذریعہ ہے۔ اگر یہ عقیدہ پختہ اور بیدار رہے تو پھر ممکن نہیں ہے کہ اُلوہیتِ غیر اللہ کا عقیدہ دل و دماغ پر حملہ کر سکے۔

رسول اکرم ﷺ کی وفات کا عقیدہ:

رسول اکرم ﷺ کی بشریت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔ چنانچہ اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ ﴾ [الزمر:٣٠]

''اے نبی! تم بھی مرنے والے ہو اور یہ لوگ بھی مرنے والے ہیں''

مطلب یہ ہے کہ موت تو لازمۂ بشریت ہے۔ لہٰذا اے نبی! موت کی وادی سے آپ کو بھی گزرنا ہے اور آپ کی دعوت کو ٹھکرانے والوں کو بھی گزرنا ہے۔ اس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں، نہ عام لوگ اور نہ رسول۔

غزوۂ احد میں جب رسول اکرم ﷺ کی ہدایات کی خلاف ورزی کے نتیجے میں جیتی ہوئی جنگ شکست میں بدل گئی اور دشمنوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ رسول اللہ ﷺ شہید کر دیے گئے تو مسلمانوں میں بددلی پھیل گئی، ان کا عزم کمزور پڑ گیا اور ان کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ اس موقع پر سورۂ آل عمران کی درج ذیل آیت مبارکہ نازل ہوئی:

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ﴾ [آل عمران:١٤٤]

''محمد تو صرف ایک رسول ہیں۔ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔تو کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ جو الٹے پاؤں پھر جائے گا وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا۔اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو ضرور بدلہ دے گا''

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں بہت سے رسول گزر چکے ہیں اسی طرح محمد ﷺ بھی اللہ کے ایک رسول ہیں۔جس طرح کی آزمائشوں اور مصیبتوں سے دوسرے رسول گزرے ہیں اس طرح کی آزمائشیں اور مصیبتیں محمد ﷺ کو بھی پیش آ سکتی ہیں۔اور جس طرح آپ سے پہلے آنے والے رسولوں کو موت کے مرحلے سے گزرنا پڑا ہے اسی طرح محمد ﷺ کو بھی وفات پانا ہے۔چاہے وہ قدرتی موت ہو یا قتل کے ذریعہ آپ کی وفات ہو۔آپ کے رسول ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ کو حیات دائمی حاصل ہوگی اور آپ ہمیشہ رہیں گے۔ہمیشہ رہنے والا تو صرف معبود حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔

﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ٥ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ٥ ﴾ [الرحمن:٢٦، ٢٧]

''ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے''

رسولوں کی بعثت کا مقصد لوگوں تک ان کے رب کا پیغام پہنچانا اور اس کے احکام کو نافذ کرنا تھا۔ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام و ہدایات بندوں کو دی ہیں ان کی پابندی رسولوں کی بقاء پر موقوف نہیں تھی۔اسی طرح رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کی پابندی بھی آپ کے لوگوں کے درمیان ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے پر موقوف نہیں ہے۔آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا ہے:

((تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا مَسَكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهِ))[1]

''میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اگر تم ان کو پکڑے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے: ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اس کے نبی کی سنت''

لہٰذا اگر محمد ﷺ کے اس دنیا سے رحلت فرما جانے کے بعد کوئی قبل از اسلام کی زندگی کی طرف

---

[1] مؤطا امام مالك، كتاب القدر، حديث نمبر٣

پلٹ جانا چاہتا ہے تو پلٹ جائے وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا بلکہ اپنی ہی دنیا اور آخرت برباد کرے گا۔

چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی تو اس صدمے نے صحابہ کرام کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان کو یہ بات معلوم تھی کہ پیارے نبی فداہ ابی وامی ﷺ ان کے درمیان ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ مگر یہ ایک عقائدی اور نظری بات تھی۔ جب کسی انسان کو کسی سے غیر معمولی تعلق ہوتا ہے اور وہ اس کو اپنی جان سے زیادہ چاہنے لگتا ہے تو اس کی نگاہوں سے وہ وقت اوجھل رہتا ہے جب وہ ذات اس سے جدا ہو جائے گی۔ مگر آج وہ وقت آ گیا تھا۔ وہ عظیم سانحہ وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ وہ مقدس اور محبوب ہستی ان سے جدا ہوگئی تھی۔ اور وہ زبان مبارک خاموش تھی جس سے وہ وحی الٰہی سنتے تھے۔ اس طرح ان کی نگاہوں میں پوری دنیا تاریکی میں ڈوب گئی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

> ''جس دن رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے اس دن اس کی ہر چیز روشن اور منور ہوگئی تھی۔ اور جس دن آپ کی وفات ہوئی اس دن مدینہ کی ہر چیز تاریک ہوگئی اور ابھی ہم نے نبی ﷺ کے دفن سے اپنے ہاتھ ہی جھاڑے تھے کہ ہم نے اپنے دلوں کو بیگانہ پایا''[1]

کس قدر جانکاہ اور دل ہلا دینے والا تھا یہ صدمہ جس سے صحابہ کرام کے ہوش و حواس اڑ گئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر یہ خبر بجلی بن کر گری، ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور ان کی حالت غیر ہوگئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شجاعت و بہادری میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ سے والہانہ محبت و تعلق تھا۔ علم نفس کے مطابق آدمی جتنا بڑا بہادر ہوتا ہے اسی قدر رقیق القلب بھی ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نبی مکرم ﷺ سے جو محبت تھی وہ ایک منفرد شان رکھتی تھی۔ مگر ان کے اندر صدمات کو برداشت کر لینے کی جو قوت تھی وہ دیگر صحابہ کرام میں سے کسی میں نہیں تھی۔ ان کا دل زیادہ مضبوط اور زیادہ قوت برداشت کا مالک تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اپنی خالہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ ''جس وقت رسول اکرم ﷺ نے رحلت فرمائی اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سنح کے مقام پر اپنے گھر میں تھے۔ ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وفات کی خبر سن کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ اللہ کی قسم رسول اللہ ﷺ نے وفات نہیں پائی ہے۔ ام المومنین نے فرمایا کہ حضرت عمر نے بعد میں بتایا کہ میرے دل میں یہی خیال پیدا ہوا۔ یعنی یہ کہ آپ کی وفات نہیں ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ آپ کو ضرور بیدار کرے گا اور آپ لوگوں کے ہاتھ پاؤں

[1] سنن ابن ماجه حديث نمبر ١٦٥٤

کاٹ ڈالیں گے۔ یا ''منافقین کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیں گے''[1] اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پہنچ گئے اور کسی سے بات کیے بغیر سیدھے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رخ انور سے چادر ہٹائی، بوسہ لیا اور فرمایا: میرے ماں باپ آپ پر قربان، کس قدر پاکیزہ ہیں آپ، زندگی اور موت دونوں حالتوں میں! اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اللہ آپ کو دو موتیں نہیں دے گا اور جو موت آپ پر لکھ دی گئی تھی وہ آپ کو مل گئی۔ اس کے بعد وہ حجرے سے باہر نکلے اور دیکھا کہ حضرت عمر لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے ان سے کہا بیٹھ جاؤ۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ دوبارہ کہا: بیٹھ جاؤ، انہوں نے پھر انکار کر دیا۔ اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صرف نظر کرتے ہوئے کلمہ شہادت پڑھا۔ لوگ حضرت عمر کو چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

((أَمَّا بَعْدُ، فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ))

''تم میں سے جو محمد کی عبادت کر رہا تھا تو بے شک محمد وفات پا گئے اور جو اللہ کی عبادت کر رہا تھا تو یقیناً اللہ زندہ ہے جس کو موت نہیں آئے گی''

اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سورۂ زمر کی آیت نمبر ۳۰ اور سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۴۴ پڑھیں جو اوپر نقل کی جا چکی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب میں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ آیت (آل عمران:۱۴۴) تلاوت کرتے ہوئے سنا تو مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا اور میرے پاؤں میرا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ میں زمین پر گر پڑا اور مجھے یقین ہو گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں۔ ادھر صحابہ کرام کا یہ حال ہو گیا کہ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔[2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہو جانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے اپنے اس موقف کی وضاحت فرمائی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۱۶۵۰

[2] صحیح بخاری حدیث نمبر ۱۲۴۱، ۳۶۶۷، ۳۶۶۹، ۴۴۵۲، ۴۴۵۵، ۵۷۱۰، ۵۷۱۱، ۷۲۱۹

وفات کی خبر سن کر انہوں نے اختیار کیا تھا۔ فرمایا: مجھے یہ امید تھی کہ رسول اللہ ﷺ زندہ رہیں گے اور آپ ہم سب سے آخر میں وفات پائیں گے۔[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس امت میں سب سے افضل اور سب سے بلند مقام حاصل ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی مسلسل رفاقت کی وجہ سے بھی ان کا علم و معرفت اور ان کی فراست و دانائی دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ اس تناظر میں آپ کا یہ فرمانا کہ "تم میں سے جو محمد کی عبادت کر رہا تھا تو محمد وفات پا گئے اور جو اللہ کی عبادت کرتا ہے تو یقیناً اللہ زندہ ہے جس کو موت نہیں آئے گی...... یہ معنی رکھتا ہے کہ عبادت کا سزاوار تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو سدا سے ہے، جبکہ سدا رہے گی اور محمد ﷺ تو صرف اللہ کے رسول اور بندے تھے۔ اللہ کا رسول اور بندہ معبود نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ فانی ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیجا تعریف سے منع فرمایا ہے:

خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: میں نے نبی مکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((لاَ تُطرُونِي كَمَا أَطرَتِ النَّصَارَى ابنَ مَريَمَ، فَإِنَّمَا أَنَا عَبدُهُ، فَقُولُوا عَبدُ اللهِ وَرَسُولُهُ))[2]

"میری بے جا تعریف نہ کرنا جس طرح نصاریٰ نے ابن مریم کی بے جا تعریف کی۔ کیونکہ میں تو صرف اللہ کا بندہ ہوں۔ اور کہو: اللہ کا بندہ اور اس کا رسول"

أَطرَى يُطرِي إِطرَاءً...... کے معنی ہیں کسی کی ایسی تعریف کرنا جو باطل، بے بنیاد اور حق سے متجاوز ہو۔

اس تشریح کی روشنی میں حدیث کا مطلب ہے کہ میری مدح سرائی اور نعت گوئی کرتے ہوئے میرا کوئی ایسا وصف مت بیان کرو جو میرے اندر نہیں ہے۔ عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی مثال دے کر آپ نے یہ تعین فرما دیا کہ جس طرح نصاریٰ نے ابن مریم کو اللہ کے بندے اور رسول کے مقام سے اٹھا کر الوہیت کے مقام پر بٹھا دیا ویسا تم لوگ نہ کرنا۔ کیونکہ جس طرح وہ اللہ کے رسول تھے اسی طرح میں بھی

[1] صحيح بخاري حديث نمبر ٧٢١٩
[2] صحيح بخاري حديث نمبر ٣٤٤٥، ٦٨٣٠

اللہ کا رسول ہوں۔ اور جیسا کہ اس آیت مبارکہ سے واضح ہے:

﴿ مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ﴾ [المائدہ:۷۵]

''مسیح ابن مریم صرف ایک رسول تھے۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں''

اسی طرح

﴿ وَ مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ﴾ [آل عمران:۱٤٤]

''اور محمد بھی صرف ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔''

واضح رہے کہ اللہ کے کسی بندے کو الٰہ یا معبود بنا لینے یا اس کے اندر کسی الٰہی صفت کا عقیدہ رکھنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ﴾ [المائدہ:۷۲]

''درحقیقت کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے''

قرآنی آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بالاتری اور بالادستی، حاجت روائی اور مشکل کشائی، پناہ دہندگی، خبرگیری، حفاظت اور دستگیری، عزت و ذلت دنیا اور قبولیت دعاء کا تعلق ان صفات سے ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں اور ان میں سے کسی بھی صفت سے کسی مخلوق کو متصف کرنے سے کوئی انسان مؤمن اور مؤحد نہیں رہ سکتا۔

﴿ فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ ۝ وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ ۝ ﴾

[المؤمنون:۱۱٦، ۱۱۷]

''پس بالا و برتر ہے اللہ، بادشاہ حقیقی، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ عرش بزرگ کا رب ہے اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ بے شک کافر کبھی فلاح نہیں پائیں گے''

اسلام سے نسبت کا دعویٰ کرنے والے جس گروہ نے سب سے پہلے رسول اکرم ﷺ کی مبالغہ آمیز اور بیجا تعریف شروع کی اور آپ کو ان صفات سے متصف کیا جو اللہ کے لیے خاص ہیں وہ صوفیا کا گروہ ہے۔ اس وقت اس گروہ کے عقائد کی تفصیلی بحث ہمارا موضوع نہیں ہے۔ لہٰذا ہم ''نور محمدی'' کے باطل عقیدے کے پس منظر میں مذکور بالا رسول اکرم ﷺ کے ارشاد کے حوالے سے اس گروہ کے ایک

مشہور شاعر کے نعتیہ قصیدہ کے چند اشعار پیش کر کے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ یہ گروہ نبی کریم ﷺ کے حق میں اسی غلو اور مبالغہ آمیزی کا مرتکب ہوا ہے جس سے آپ نے منع فرمایا تھا۔

شرف الدین ابو عبداللہ محمد بن سعید بوصیری متوفی ۶۹۵ھ مطابق ۱۲۹۵م ایک مشہور صوفی شاعر گزرے ہیں۔ انہوں نے ''بردہ'' کے نام سے رسول اکرم ﷺ کی ایک طویل نعت نظم کی ہے۔ اس نعت کو دنیا کے گوشے گوشے میں پائے جانے والے صوفیا میں بڑی شہرت حاصل ہے۔ اس کو دنیا میں برکت اور آخرت میں نجات نیز کشف و کرامات کے حصول کے لیے وظیفہ کے طور پر پڑھا جاتا ہے۔ اس نعت کا وہ بند جس کا تعلق رسول اللہ ﷺ سے ''مناجات'' سے ہے اس کے چند اشعار، ان کا ترجمہ اور پھر ان کی مختصر اور ضروری تشریح پیش کرنا چاہتا ہوں تا کہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ صوفیا نے رسالت کا ڈانڈہ الوہیت سے کس طرح ملا دیا ہے۔ ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے انبیاء اور رسول مبعوث ہوئے اور ان کو جو معجزات دیے گئے تھے وہ سب رسول اکرم ﷺ کے معجزات ہی سے ماخوذ تھے اور اس دنیا میں جس کا نام محمد ہوگا اس کی بخشش یقینی ہے۔ یہ دنیا اور آنے والی دنیا نبی اللہ ﷺ کے جود و سخا کا مظہر ہے اور لوح محفوظ کا علم محمد ﷺ کے خزانہ علم و معرفت کا معمولی سا حصہ ہے۔ قیامت کے دن جس مقام محمود یا شفاعت کبریٰ سے رسول اللہ ﷺ سرفراز کیے جائیں گے وہ آپ کا حق ہے:

وَكُلُّ آيٍ أَتَى الرُّسُلُ الْكِرَامُ بِهَا فَإِنَّمَا اتَّصَلَتْ مِنْ نُوْرِهِ بِهِمْ

''جو معجزات اور کرامتیں معزز رسولوں کے ہاتھوں ظاہر ہوئی ہیں وہ سب نبی ﷺ کے ''نور'' سے نکل کر ان تک پہنچی ہیں''

قصیدہ بردہ کے شارح احمد بن محمد بن حجر ہیتمی متوفی ۹۷۳ھ اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سابق انبیاء اور رسولوں کے معجزات ان کو رسول اکرم ﷺ کے ''نور سے عن طریق استمداد'' حاصل ہوئے ہیں۔ یعنی انہوں نے اس نور سے مدد طلب کی جس کے نتیجے میں ان کے ہاتھوں یہ معجزات ظاہر ہوئے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ''نور'' آدم علیہ السلام بلکہ آسمانوں اور ان کی مخلوقات، زمین اور اس پر پائی جانے والی تمام مخلوقات سے پہلے پیدا کیا جا چکا تھا''[1]

[1] العمدة فی شرح البردة ص ۲۸۹

ھیثمی کی یہ بات سراسر جھوٹ اور بے بنیاد ہے۔ مندرجہ بالا صفحات میں "نور محمدی" والی روایت کا بطلان اور اس کا بے اصل ہونا ثابت کیا جا چکا ہے۔ یہ "نور محمدی" درحقیقت صوفیا کی ذہنی اختراع ہے، کتاب وسنت میں اس کا کوئی وجود نہیں ملتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ تک جتنے انبیاء اور رسول مبعوث فرمائے وہ سب مستقل بالذات تھے اور ہر ایک کو اللہ نے بذریعہ وحی اپنے احکام دیے اور جن کے ہاتھوں چاہا معجزات ظاہر فرمائے۔ دراصل معجزات کا اظہار کسی بھی نبی یا رسول کا اختیاری فعل نہ تھا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۝ ﴾ [ابراھیم:١١]

"ان سے (قوموں سے) ان کے رسولوں نے کہا: ہم تو تم ہی جیسے انسان ہیں، لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنا فضل فرماتا ہے۔ اور ہمارے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ ہم تمہارے پاس کوئی معجزہ لے آئیں الا یہ کہ اللہ اس کی اجازت دے اور اللہ ہی پر مومنوں کو بھروسہ کرنا چاہیے"

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں کی زبانی یہ اعلان کرا دیا ہے کہ وہ سب بشر ہیں۔ البتہ عام انسانوں پر ان کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اللہ نے ان کو اپنی رسالت کے لیے منتخب کر لیا اور ہر قوم میں انہیں میں سے رسول مبعوث فرمایا۔ اور جس کے ذریعہ جو معجزہ دکھانا چاہا اپنی قدرت سے دکھایا نہ کہ ان رسولوں کی قدرت واختیار سے۔

نور محمدی، نظریہ حلول کا ترجمان ہے:

دراصل "نور محمدی" صوفیا کے نظریہ حلول کا ترجمان ہے۔ حلول کا مطلب ہے: دو جسم اس طرح ایک ہو جائیں کہ اگر ایک کی طرف اشارہ کیا جائے تو وہ دوسرے کی طرف بھی ہو۔ اور صوفیا کے ایک بہت بڑے طبقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے میں حلول کیے ہوئے ہے۔ اس کا نعرہ سب سے پہلے ابو مغیث حسین بن منصور حلاج متوفی ۳۰۹ھ نے لگایا تھا۔ حلاج کا شمار اکابر صوفیا میں ہوتا ہے۔ اس نے حلول کا نظریہ یونان اور ہندوستان کے فلسفیوں سے اخذ کیا تھا جہاں یہ نظریہ عام تھا۔ اسی حلول کے نظریہ سے "وحدۃ الوجود" کا نظریہ پیدا ہوا جس کی رو سے اللہ، انسان اور کائنات سب ایک ہیں۔ صوفیا میں اس

کا نعرہ محی الدین ابن عربی متوفی ۶۳۸ھ نے لگایا۔

حسین بن منصور حلاج نے اپنی کتابوں میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دو شکلیں ہیں: نورانی ازلی و قدیم...... یہ شکل عالم کے وجود پانے سے پہلے سے ہے۔ اسی نورانی شکل سے علم و معرفت کے چشمے پھوٹے ہیں۔ انبیاء اور اولیاء نے اسی نور سے علم و معرفت حاصل کی ہے۔ دوم نبی مرسل کی شکل...... جو حادث ہے اور ہر جگہ اور ہر زمانے میں موجود رہی ہے۔ نبی مرسل نے اپنی رسالت اپنے ازلی اور قدیم نور سے اخذ کی ہے۔[1]

حلاج وحی الٰہی کا منکر تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات سے رسالت اخذ کی ہے (بالفاظِ دیگر حلاج یہ کہتا تھا کہ: نبی کریم محمد رسول اللہ ﷺ پوری زندگی وحی کے معاملے میں جھوٹ بولتے رہے۔ العیاذ باللہ۔) اور جس طرح عیسائی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ذات الٰہی ازلی ناسوت، انسان عیسیٰ میں حلول کر گئی۔ اسی طرح حلاج اور اس کے پیروؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول محمد ﷺ ایک ایسا مظہر ہیں جس میں اللہ نے حلول کر لیا ہے۔ یا ناسوت...... انسان...... میں لاہوت...... الہٰ...... نے حلول کر لیا ہے۔

یوں تو اعتدال پسند صوفیا نے بظاہر حلاج اور اس کے عقیدہ ''حلول'' سے براءت کا اظہار کیا ہے لیکن ''نور محمدی'' کو پوری کائنات کی اصل قرار دینے میں وہ حلاج کے ہمنوا ہیں۔ اس وجہ سے ''نور محمدی'' کا ذکر صوفیا یا تصوف سے متاثر لوگوں کی کتابوں میں ملتا ہے اور ''نور محمدی'' سے متعلق بعض روایتیں سند کے ساتھ ملتی ہیں اور بعض بلا کسی سند کے:

۱۷۱ ...... خَلَقَنِي اللّٰهُ مِنْ نُوْرِهِ، وَخَلَقَ أَبَا بَكْرٍ مِنْ نُوْرِي وَخَلَقَ عُمَرَ مِنْ نُوْرِ أَبِي بَكْرٍ وَخَلَقَ أُمَّتِي مِنْ نُوْرِ عُمَرَ، وَعُمَرُ سِرَاجُ أَهْلِ الْجَنَّةِ۔

''اللہ نے مجھے اپنے نور سے پیدا کیا۔ اور ابوبکر کو میرے نور سے پیدا کیا اور عمر کو ابوبکر کے نور سے پیدا کیا اور میری امت کو عمر کے نور سے پیدا کیا اور عمر اہل جنت کے چراغ ہیں''

یہ روایت باطل اور جھوٹ ہے اس کی تخریج ابونعیم نے اپنی امالی میں کر کے اس کو باطل قرار دیا ہے۔ اس کی سند کے راویوں: ابومعشر، ہیثم بن جمیل اور ابوشعیب کو ''متروک'' لکھا ہے۔ لیکن امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ یہ جھوٹ ہے۔ مذکورہ تینوں راویوں میں سے اس کی روایت کسی نے نہیں

[1] الفلسفة الصوفيه في الاسلام ص ۳۷۹۔ ۳۸۰

کی ہے، بلکہ اس کی مصیبت احمد بن یوسف مسیحی ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ کا مطلب ہے کہ مذکورہ روایت گھڑنے والا احمد بن یوسف مسیحی نصرانی ہے۔ [1]

۱۷۲ ...... إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى خَلَقَ نُوْرَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ خَلْقِ آدَمَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ بِأَلْفَي عَامٍ وَجَعَلَهُ فِي عَمُوْدٍ أَمَامَ عَرْشِهِ يُسَبِّحُ اللّٰهَ وَيُقَدِّسُهُ ثُمَّ خَلَقَ آدَمَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ مِنْ نُوْرِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَخَلَقَ نُوْرَ النَّبِيِّيْنَ عَلَيْهِمُ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ مِنْ نُوْرِ آدَمَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ۔

"بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے محمد ﷺ کا نور آدم علیہ الصلاۃ والسلام کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل پیدا کیا اور اس کو اپنے عرش کے سامنے ایک ستون میں ڈال دیا کہ وہ اللہ کی تسبیح وتقدیس کرتا رہے۔ پھر محمد ﷺ کے نور سے آدم علیہ الصلاۃ والسلام کو پیدا کیا اور آدم علیہ الصلاۃ والسلام کے نور سے نبیوں کا نور بنایا" [2]

یہ عبارت جھوٹ ہے حدیث نہیں ہے۔ قرآن پاک میں آدم علیہ السلام کی تخلیق کے واقعہ کے سراسر خلاف ہے۔ مزید یہ کہ یہ عبارت حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے منسوب جھوٹی روایت کے بھی خلاف ہے۔ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نور سے پہلے عرش کی تخلیق ہو چکی تھی۔ جبکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منسوب روایت میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ عرش کی تخلیق "نور محمدی" سے ہوئی ہے۔ دراصل اس روایت کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے۔

۱۷۳ ...... خُلِقْتُ أَنَا وَعَلِيٌّ مِنْ نُوْرٍ، وَكُنَّا عَنْ يَمِيْنِ الْعَرْشِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ اللّٰهُ آدَمَ بِأَلْفَي عَامٍ، ثُمَّ خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ فَانْقَلَبْنَا فِي أَصْلَابِ الرِّجَالِ، ثُمَّ جُعِلْنَا فِي صُلْبِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، ثُمَّ اشْتَقَّ أَسْمَاءَ نَا مِنِ اسْمِهِ: فَاللّٰهُ مَحْمُوْدٌ وَأَنَا مُحَمَّدٌ وَاللّٰهُ الْأَعْلَى وَعَلِيٌّ عَلِيٌّ۔

"میں اور علی نور سے پیدا کیے گئے اور ہم اللہ کے آدم کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال قبل عرش کے داہنے کنارے تھے۔ پھر اللہ نے آدم کو پیدا کیا تو ہم مردوں کی پیٹھوں میں منتقل ہو گئے۔

[1] تنزیہ الشریعہ ص ۳۳۷، ج ۱

[2] المدخل لابن الحاج ص ۳۰، ج ۲ بحوالہ محبۃ الرسول ص ۱۸۳

پھر اللہ نے ہم کو عبد المطلب کی پیٹھ میں ڈال دیا اور پھر ہمارے ناموں کو اپنے نام سے نکالا،
پس اللہ کا نام محمود ہے اور میں محمد ہوں۔ اللہ الاعلیٰ ہے اور علی علی ہیں۔"

یہ روایت جھوٹ ہے، حدیث نہیں ہے۔ اس کا گھڑنے والا جعفر بن احمد ہے۔ امام عبد اللہ بن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہم نے اس سے مروی موضوع حدیثیں لکھی ہیں جن کو اسی نے وضع کیا ہے۔ اس روایت کو امام ابن الجوزی، حافظ سیوطی اور ابن عراق نے بھی موضوع قرار دیا ہے۔[1]

١٧٤ ...... كَانَ نُوْرًا حَوْلَ الْعَرْشِ ، فَقَالَ: يَا جِبْرِيْلُ! أَنَا كُنْتُ ذٰلِكَ النُّوْرَ۔

"عرش کے گرد نور تھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا اے جبریل! وہ نور میں ہی تھا"

یہ عبارت بھی حدیث نہیں ہے۔ اس کا ذکر حدیث کی کسی بھی مستند کتاب میں نہیں آیا ہے۔[2]

یہ ہے "نور محمدی" کی حقیقت۔ اس کی روشنی میں اس جھوٹ کا اندازہ لگایئے جو بوصیری کے مذکورہ شعر میں مضمر ہے۔ اس کے بعد یہ کہنا مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ فضائل و مناقب کے باب میں صوفیا کی باتیں جھوٹ کا پلندا ہیں۔ بلکہ انہوں نے اپنے عقائد اپنے ذوق و خیال سے گھڑ لیے ہیں جن کا کتاب و سنت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ (بوصیری کا دوسرا شعر) ؎

فَإِنَّ لِي ذِمَّةً مِنْهُ بِتَسْمِيَتِي مُحَمَّدًا وَهُوَ أَوْفَى الْخَلْقِ بِالذِّمَمِ

"اپنا نام محمد ہونے کی وجہ سے مجھے رسول اللہ ﷺ کا ذمہ اور عہد حاصل ہے اور آپ تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ ذمہ اور عہد پورا کرنے والے ہیں"

قصیدہ بردہ کے شارح ھیتمی کہتے ہیں: چونکہ شاعر کا نام رسول اللہ ﷺ کے اسم مبارک کے مطابق ہے اس لیے اس کو آپ کی شفاعت کا ذمہ حاصل ہے۔ گناہوں کے ارتکاب سے اس اسم مبارک اور اس سے حاصل ہونے والی برکتوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لہٰذا قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ "محمد" نام رکھنے والوں کی شفاعت فرمائیں گے اور ان کی حمایت کریں گے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

١٧٥ ...... يُوْقَفُ عَبْدَانِ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ تَعَالَى فَيَأْمُرُ بِهِمَا إِلَى الْجَنَّةِ، فَيَقُوْلَانِ: رَبَّنَا بِمَ اسْتَأْهَلْنَا الْجَنَّةَ وَلَمْ نَعْمَلْ عَمَلًا يُجَازِيْنَا الْجَنَّةَ؟ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالَى:

---

[1] الكامل ص ٥٧٨، ج٢۔ الموضوعات: ص ٩٥۔٩٦، ج٢، ح ٦٣٤۔ تنزيه الشريعة: ص ٣٥١، ج١، اللآلي: ص ٣٢٠، ج١، الفوائد: ص ٣٤٢

[2] عبد المتعال محمد الجبري: المشتهر من الحديث الموضوع: ح ١٣

أُدْخُلَا الْجَنَّةَ فَإِنِّي آلَيْتُ عَلَى نَفْسِي أَنْ لَا يَدْخُلَ النَّارَ مَنِ اسْمُهُ أَحْمَدُ وَلَا مُحَمَّدٌ۔

''اللہ تعالیٰ کے سامنے دو بندے کھڑے کیے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل کیے جانے کا حکم فرمائے گا۔ وہ دونوں عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم جنت کے حقدار کیسے ہوئے؟ حالانکہ ہم نے ایسا کوئی عمل نہیں کیا ہے جو بدلے میں ہمیں جنت کا مستحق بنائے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم دونوں جنت میں داخل ہو جاؤ۔ کیونکہ میں نے اپنے آپ سے یہ عہد کیا ہے کہ وہ شخص جہنم میں داخل نہیں ہوگا جس کا نام احمد یا محمد ہوگا''[1]

یہ روایت حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی رو سے ایمان وعمل غیر ضروری قرار پاتے ہیں۔ اس کو تمام ائمہ حدیث، امام ابن الجوزی، امام ذہبی، امام ابن حبان، امام شوکانی، امام ابن القیم، ابن عراق اور حافظ سیوطی نے موضوع اور من گھڑت قرار دیا ہے۔ اس کی سند کے ایک راوی حسین بن بکیر کا شیخ احمد بن عبداللہ بن فتح، جس کا لقب ''ذارع'' ہے کذاب اور جھوٹا تھا۔ اور ذارع کا شیخ صدقہ اور اس کا باپ موسیٰ دونوں غیر معروف ہیں۔[2] (بوصیری کا تیسرا شعر) ۵

يَا أَكْرَمَ الْخَلْقِ مَالِي مَنْ أَلُوذُ بِهِ　سِوَاكَ عِنْدَ حُلُوْلِ الْحَادِثِ الْعَمِمِ

''اے مخلوقات میں سب سے زیادہ معزز و مکرم! آپ کے سوا میرا کوئی نہیں ہے کہ میں پر ہجوم مصائب اور کثرت آفات میں اس کی پناہ لوں''

قصیدہ بردہ کے شارح ہیتمی کہتے ہیں:

شاعر کی مراد ہے: قیامت کے دن جب منظر ہولناک ہوگا اور مصائب و آلام کی کثرت اور شدت ہوگی تو مخلوقات میں رسول اللہ ﷺ کے سوا میرا کوئی نہیں ہوگا جس کی میں پناہ لوں گا۔[3]

شارح ہیتمی کی تشریح پر چند ملاحظات قابل ذکر ہیں:

(۱) پہلی بات تو یہ کہ اس شعر میں قیامت کے دن کی شدت اور ہولناکی کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ عموی

---

[1] العملة في شرح البردہ: ص ۲۳۵، ۲۳۶

[2] الموضوعات: ص ۲۴۱ ج۱، ح ۳۲۶۔ المیزان: ص ۳۱۳ ج۲۔ المجروحین ص ۳۷۲، ج۱۔ الفوائد: ص ۴۷۱۔ المنار المنیف: ح ۹۳۔ تنزیہ الشریعہ: ص ۱۷۳ ج۱، اور اللآلی المصنوعة: ص ۹۷، ج۱

[3] العمله فی شرح البردة: ص ۶۵۹

مصائب و آفات بیان ہوئے ہیں۔

(۲) دوسری بات یہ کہ شاعر نے یہ بات اس دنیا میں کہی ہے اور یہ اعتراف کرتے ہوئے کہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مخلوق ہیں، خالق نہیں ہیں۔ تو پھر اس نے رسول اللہ ﷺ کو پکارنے کے بجائے اللہ کو کیوں نہ پکارا؟ اور یہ کیوں نہ کہا کہ اے اللہ! جب قیامت کے دن مصائب و آفات کا ہجوم ہوگا اور ہر طرف نفسی نفسی کا عالم ہوگا، اس ہولناک دن میں تو مجھے اپنے محبوب رسول اور بندے کی شفاعت کا مستحق بنائیو۔ کیونکہ کتاب و سنت سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کے اذن سے شفاعت فرمائیں گے اور آپ کی شفاعت کبریٰ لوگوں کے حساب کتاب کے لیے ہوگی۔ ان کی بخشش کے لیے نہیں۔ چنانچہ متعدد احادیث میں شفاعت کبریٰ کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان کا خلاصہ ہے کہ تمام خلقت ایک ایک کر کے ہر نبی سے شفاعت کی درخواست کرے گی۔ مگر سب پر اللہ کا خوف اس قدر طاری ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کچھ عرض کرنے سے معذرت کر دیں گے۔ آخر میں لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور آپ سے درخواست کریں گے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ ان کا حساب کتاب کر کے ان کو اس مصیبت سے نجات دے۔ رحمۃ للعالمین فداہ ابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم تیار ہو جائیں گے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے اذن باریابی طلب فرمائیں گے اور جب آپ کو اذن مل جائے گا تو آپ اپنے رب کو دیکھتے ہی سجدے میں گر جائیں گے اور جب تک آپ کا رب چاہے گا سجدے میں پڑے رہیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ آپ سے فرمائے گا: محمد! سر اٹھاؤ اور جو کہنا ہے کہو، تمہاری بات سنی جائے گی، تم شفاعت، سفارش کرو تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی اور تم مانگو تم کو عطا کیا جائے گا۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ میرے دل میں اپنی حمد و ثنا کے ایسے کلمات ڈال دے گا جو مجھے اس وقت معلوم نہیں ہیں۔ میں انہی الہامی کلمات کے ذریعہ اپنے رب کی حمد و ثنا بیان کروں گا۔[1]

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ سے شفاعت کی درخواست کرنا جب آپ کی حیات پاک میں جائز نہیں تھا تو پھر آپ کی رحلت کے بعد کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟ شاعر کو یہ بات معلوم ہے کہ مخلوق سے دعا کرنا شرک اکبر ہے۔ صحابہ کرام نبی معظم ﷺ سے دعا نہیں کرتے تھے بلکہ آپ سے دعاء کی درخواست کرتے تھے۔

قاضی ابوالفضل عیاض فرماتے ہیں: سلف صالحین سے منقول ہے کہ قیامت کے دن نبی اکرم ﷺ

[1] صحیح بخاری: ۷۵۱۰۔ صحیح مسلم: ۴۷۹، ۴۸۰

کی شفاعت کی اللہ تعالیٰ سے درخواست کرنی چاہیے۔ یعنی بندہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرے کہ وہ اس دن اس کو اپنے نبی کی شفاعت سے سرفراز فرمائے۔[1]

اور احادیث میں اذان کے بعد جو دعا پڑھنے کا حکم آیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ سے رسول اکرم ﷺ کو ''مقام محمود'' پر سرفراز کرنے کی درخواست مذکور ہے۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جو شخص اذان کے بعد کہے:

((اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ آتِ مُحَمَّدًا الْوَسِيلَةَ وَالْفَضِيلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَحْمُودًا الَّذِي وَعَدْتَهُ، حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

''اے اللہ! جو اس پوری دعاء اور قائم ہونے والی نماز کا رب ہے! تو محمد ﷺ کو وسیلہ اور فضیلت عطا فرما اور جس مقام محمود کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اس پر ان کو سرفراز فرما۔ تو اس کے لیے قیامت کے دن میری شفاعت واجب ہو جائے گی''[2]

(۳) تیسری بات یہ کہ نبی اکرم ﷺ سے شفاعت کبریٰ یا مقام محمود سے متعلق جو احادیث مروی ہیں ان میں یہ صراحت ہے کہ لوگ نبی ﷺ سے دعاء نہیں کریں گے یا آپ کی پناہ میں آنے کی آپ سے درخواست نہیں کریں گے بلکہ آپ سے شفاعت کی درخواست کریں گے۔ دوسرے لفظوں میں آپ سے یہ درخواست کریں گے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ان کو ان کی پریشانیوں سے نجات دے۔ کیونکہ شفاعت بھی دعاء ہی ہے۔ البتہ عام دعاء اور شفاعت میں یہ فرق ہے کہ دعاء اپنے اور غیر دونوں کے لیے کی جاتی ہے جبکہ شفاعت صرف غیر کے لیے کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں: شَفَعَ فُلَانٌ لِفُلَانٍ اِلَى فُلَانٍ...... فلاں نے فلاں کے لیے فلاں سے سفارش کی۔ اور اس دنیا میں رسول اللہ ﷺ سے شفاعت کی درخواست کرنا آپ کو پکارنے اور آپ سے دعاء کرنے کی طرح ہے جو جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا سزاوار صرف خالق ہے اور کسی کو پکارنے اور اس سے دعا کرنے کا مطلب اس کو معبود بنانا ہے۔

﴿ وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۟ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ

[1] الجامع لأحكام القرآن للقرطبي: ص ٢٢٥، ٢٢٦، ج:٥
[2] صحيح البخاري: ٦١٤، ٤٧١٩

الْحُكْمُ وَ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ [القصص:۸۸]

''اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو۔ نہیں ہے کوئی معبود برحق مگر وہی۔ ہر چیز ہلاک ہوجانے والی ہے سوائے اس کی ذات کے۔ فرمانروائی اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جاؤ گے''

مذکور بالا وضاحت کی روشنی میں مذکورہ شعر:

يَا أَكْرَمَ الْخَلْقِ مَالِي مَنْ أَلُوْذُبِه سِوَاكَ عِنْدَ حُلُوْلِ الْحَادِثِ الْعَمِمِ

''اے مخلوقات میں سب سے زیادہ معزز و مکرم! آپ کے سوا میرا کوئی نہیں ہے کہ میں پر ہجوم مصائب اور کثرت آفات میں اس کی پناہ لوں''

صریح مشرکانہ شعر ہے جس کو کسی بھی تاویل کے ساتھ صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (دیکھیے اگلا شعر) ؏

فَإِنَّ مِنْ جُوْدِكَ الدُّنْيَا وَضَرَّتَهَا وَمِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمَ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

''آپ کے جود و سخا ہی سے دنیا اور آخرت کو وجود ملا ہے اور لوح و قلم کا علم آپ کے علوم کا ایک حصہ ہے''

شارح ہیثمی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دنیا اور آخرت میں جو کچھ ہے اور آئندہ ہوگا وہ سب رسول اللہ ﷺ کے جود و سخا کا نتیجہ ہے اور لوح و قلم میں جو علم محفوظ ہے وہ رسول اکرم ﷺ کے علوم و معارف کا صرف ایک حصہ ہے۔ شاعر کے اس شعر کی توجیہ کرتے ہوئے ہیثمی آگے لکھتے ہیں: لوح و قلم کا علم اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے علوم و معارف کا صرف ایک حصہ ہے کیونکہ ''اسراء'' کی رات اللہ تعالیٰ نے آپ کو لوح محفوظ کے تمام علوم سے مطلع فرما دیا تھا اور اپنی ذات و صفات کے اسرار سے متعلق مزید علوم سے بھی آپ کو سرفراز فرمایا تھا۔[1]

مبالغہ کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور اگر مبالغہ کی کوئی بنیاد ہو بھی تو اس صورت میں بھی وہ اللہ اور رسول کے نزدیک ایک ناپسندیدہ چیز ہے۔ جبکہ یہاں اس دعویٰ کی سرے سے کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز اور رسول پاک ﷺ نے اپنے ارشادات میں کب اور کہاں یہ فرمایا ہے کہ ''اسراء اور معراج میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو لوح محفوظ میں درج تمام علوم اور مزید اپنی ذات و صفات کے اسرار سے متعلق دوسرے تمام علوم سے مطلع فرما دیا تھا۔

[1] العمدة في شرح البردة: ص ٦٦٦-٦٦٩

جہاں تک قرآن پاک کا تعلق ہے تو سورۃ الاسراء کی پہلی آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے "اسراء" کی حکمت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ٥ ﴾ [الاسراء:۱]

"پاک ہے وہ اللہ جو لے گیا اپنے بندے کو ایک رات مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے گرد و پیش ہم نے برکتیں پھیلا رکھی ہیں تا کہ ہم اسے اپنی بعض نشانیوں کا مشاہدہ کرائیں بلاشبہ وہ اللہ رب العالمین سننے والا دیکھنے والا ہے۔"

اور سورۃ النجم کی اٹھارہویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے:

﴿ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی٥ ﴾

"درحقیقت اس نے اپنے رب کی بعض بڑی نشانیاں دیکھیں"

رہیں احادیث...... تو اسراء و معراج کے بارے میں بکثرت صحابہ کرام سے مروی ہیں اور ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں میں اختصاراً اور تفصیلاً ان کا ذکر کیا ہے۔ مگر کسی ایک صحیح حدیث میں بھی یہ اشارۃ نہیں فرمایا گیا کہ "اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو لوح محفوظ کے علوم اور اپنی ذات و صفات کے اسرار سے متعلق دوسرے تمام علوم سے مطلع فرما دیا تھا۔ درحقیقت تصوف کی کتابوں کا تفصیلی مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ارباب تصوف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماخذ کتاب و سنت سے کہیں زیادہ ان کا خاص ذوق ہے۔ اور اگر وہ کبھی اللہ کی کتاب کی کسی آیت یا رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث سے استدلال کرتے بھی ہیں تو اس وقت بھی ان کا خاص "صوفیانہ ذوق" ان کے ذہن و دماغ پر حاوی رہتا ہے اور وہ اس آیت یا حدیث کی اس طرح تفسیر یا تاویل کرتے ہیں کہ وہ ان کے تصور دین سے ہم آہنگ ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں وہ کتاب و سنت کو اپنے فاسد اور باطل خیالات کا ترجمان بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر صوفیا کا ایک بہت بڑا طبقہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ پر قرآن پاک کے نزول سے پہلے ہی وہ مجملاً آپ کو عطا کیا جا چکا تھا۔ اور تفصیلی قرآن جبریل علیہ السلام کے ذریعہ آپ پر نازل کیا گیا۔ چنانچہ سورہ طٰہٰ کی آیت نمبر ۱۱۴:

﴿ فَتَعٰلَی اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ وَ لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰۤی اِلَیْكَ وَحْیُهٗ وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا٥ ﴾ [طٰهٰ:۱۱۴]

''تو بہت بلند و مرتبہ ہے اللہ بادشاہ برحق۔ اے محمد! قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کرو جب تک کہ تمہاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ اور کہو: اے میرے رب! مجھے مزید علم عطا کر''

کی تفسیر کرتے ہوئے ''وحدت الوجود'' کے بانی محی الدین محمد بن علی المعروف بابن عربی کہتے ہیں:

جان لو کہ رسول اللہ ﷺ کو جبریل کے نزول سے پہلے ہی قرآن مجمل شکل میں، آیتوں اور سورتوں کی تفصیلات کے بغیر عطا کا چکا تھا۔ اس آیت میں آپ سے فرمایا گیا ہے کہ جو قرآن تمہارے پاس موجود ہے جبریل سے پہلے اس کو پڑھنے میں جلدی نہ کرو اور اس طرح امت کے سامنے اجمالی قرآن مت پیش کرو کیونکہ اس کے مفصل نہ ہونے کی وجہ سے اس کو کوئی سمجھ نہیں سکے گا۔ [1]

کیا اس ہرزہ سرائی سے بڑی کوئی اور ہرزہ سرائی ہوسکتی ہے۔ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں یہ صراحت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر قرآن پاک کا نزول حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعہ ہوا ہے اور اس سے قبل آپ کو کتاب اور ایمان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ﴾ [الشوری:۵۲]

''اور اے محمد! اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ تمہیں معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے؟ لیکن اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس کے ذریعہ ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں جسے چاہتے ہیں اور بلاشبہ تو بھی لوگوں کو سیدھی راہ دکھلاتا رہتا ہے۔''

کس قدر واضح ہے یہ آیت مبارکہ اپنے مدعا میں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قرآن پاک کو روح قرار دیا ہے۔ کیونکہ عام روح جسموں میں زندگی سے عبارت ہے اور قرآن پاک ایسی روح ہے جس سے دلوں کو اور عام روحوں کو زندگی ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرما رہا ہے کہ منصب نبوت پر سرفراز کیے جانے اور قرآن کے نزول سے قبل تو آپ کے ذہن میں کتاب الٰہی اور ایمان کا کوئی تصور تک نہ تھا۔ اسی چیز کو سورۃ الضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے ''ضالاً'' سے تعبیر کیا ہے ارشاد ربانی ہے:

[1] الکبریت الاحمر فی علوم الشیخ الأکبر للشعرانی: ص ٦ بحوالہ محبة الرسول ﷺ ص: ٢٠٠

﴿ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ ﴾ [الضحیٰ:٧]

''اے نبی! تمہارے رب نے تم کو ناواقف راہ پایا پس ہدایت بخشی''

مطلب یہ ہے کہ نبوت کے منصب پر سرفراز کیے جانے سے پہلے تک رسول اللہ ﷺ کو اس دین حق اور اس کے اصول و احکام کا کوئی علم نہیں تھا اور شرک و بت پرستی کے اس کلی ماحول میں آپ کو یہ معلوم نہ تھا کہ آپ کدھر جائیں اور کون سا طریقہ اختیار کریں؟ اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ فضل و احسان کیا کہ آپ پر کتاب نازل فرمائی جس نے ایمان کی تعلیم دی، صحیح راہ دکھائی اور حسن عمل اور حسن اخلاق کا طریقہ بتایا۔

اور سورۃ النجم میں اللہ تعالیٰ کفار مکہ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

﴿ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ۝ ﴾ [النجم:٢تا٦]

''تمہارا ساتھی نہ بھٹکا ہے اور نہ بہکا ہے۔ وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا ہے۔ یہ تو صرف ایک وحی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔ اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے جو بڑا صاحب حکمت ہے''

اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ میں کفار مکہ کو یہ یاد کرایا ہے کہ محمد ﷺ جو خود تمہارے اپنے آدمی ہیں جن کے اخلاق و کردار سے تم خوب اچھی طرح واقف ہو اور جن باتوں کی طرف وہ تم کو دعوت دے رہے ہیں وہ ان کے اپنے ذہن و دماغ کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ یہ باتیں تو دراصل وحی الٰہی ہیں جو اللہ کے حکم سے آپ پر ایک نہایت عظیم، زبردست قوت والے اور صاحب حکمت نے نازل کی ہیں۔ یعنی اس قرآن کو لے کر نبی اکرم ﷺ پر نازل ہونے والے حضرت جبریل علیہ السلام ہیں۔

آغاز وحی سے متعلق جو احادیث مروی ہیں ان سے بھی بصراحت یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ پر جب پہلی بار وحی الٰہی نازل ہوئی تو آپ وحی، نبوت اور فرشتہ وحی کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتے تھے۔ اگرچہ آپ فطری طور پر شرک و بت پرستی سے بالکل پاک تھے اور جاہلی معاشرے کی تمام برائیوں سے آپ کا دامن پاک تھا مگر اس سب کے باوجود آپ نبوت و رسالت سے خالی الذہن تھے، چہ جائیکہ آپ اس کے امیدوار ہوتے۔

﴿ وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ﴾ [القصص:٨٦]

”تم اس بات کے امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی مگر یہ تو تمہارے رب کی طرف سے مہربانی ہوتی۔“

چنانچہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی خالہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو طویل حدیث روایت کی ہے، اس میں وہ فرماتی ہیں:

((أَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّادِقَةُ فِي النَّوْمِ، فَكَانَ لا يَرَى رُؤْيَا إِلَّا جَاءَتْهُ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ، فَكَانَ يَأْتِي حِرَاءَ فَيَتَحَنَّثُ فِيهِ۔ وَهُوَ التَّعَبُّدُ۔ اللَّيَالِيَ ذَوَاتِ الْعَدَدِ، وَيَتَزَوَّدُ لِذَلِكَ، ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى خَدِيجَةَ فَتُزَوِّدُهُ لِمِثْلِهَا حَتَّى فَجِئَهُ الْحَقُّ وَهُوَ فِي غَارِ حِرَاءٍ، فَجَاءَهُ الْمَلَكُ فِيهِ فَقَالَ: اقْرَأْ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ، فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدُ، ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ: اقْرَأْ، فَقُلْتُ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدُ، ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ: اقْرَأْ، فَقُلْتُ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ، فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّالِثَةَ حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدُ، ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ: اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ. حَتَّى بَلَغَ...... عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ [العلق:١......٥]))

فَرَجَعَ بِهَا تَرْجُفُ بَوَادِرُهُ حَتَّى دَخَلَ عَلَى خَدِيجَةَ فَقَالَ: "زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي، فَزَمَّلُوهُ حَتَّى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ

فَقَالَ: "يَا خَدِيجَةُ مَا لِي؟" وَأَخْبَرَهَا الْخَبَرَ وَقَالَ: "قَدْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي"، فَقَالَتْ لَهُ: كَلَّا أَبْشِرْ۔ فَوَاللَّهِ لا يُخْزِيكَ اللَّهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَصْدُقُ الْحَدِيثَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ۔ ثُمَّ انْطَلَقَتْ بِهِ خَدِيجَةُ حَتَّى أَتَتْ بِهِ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ أَسَدِ بْنِ عَبْدِالْعُزَّى بْنِ قُصَيٍّ وَهُوَ ابْنُ عَمِّ خَدِيجَةَ أَخُو أَبِيهَا وَكَانَ امْرَأً تَنَصَّرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعَرَبِيَّ، فَيَكْتُبُ بِالْعَرَبِيَّةِ مِنَ الْإِنْجِيلِ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ يَكْتُبَ، وَكَانَ شَيْخًا كَبِيرًا قَدْ عَمِيَ۔

فَقَالَتْ لَهُ خَدِيجَةُ: أَيِ ابْنَ عَمِّ! اسْمَعْ مِنِ ابْنِ أَخِيكَ، فَقَالَ وَرَقَةُ: ابْنَ

أَخِي مَاذَا تَرَى! فَأَخْبَرَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا رَأَى فَقَالَ وَرَقَةُ: هَذَا النَّامُوسُ الَّذِي أُنْزِلَ عَلَى مُوسَى ، يَا لَيْتَنِي فِيهَا جَذَعًا أَكُونُ حَيًّا حِينَ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَوَمُخْرِجِيَّ هُمْ؟ فَقَالَ وَرَقَةُ: نَعَمْ ، لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهِ إِلَّا عُودِيَ ، وَإِنْ يُدْرِكْنِي يَوْمُكَ أَنْصُرْكَ نَصْرًا مُؤَزَّرًا......))

"پہلے پہل وحی کی ابتدا سچے یا اچھے خوابوں سے ہوئی اور آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ صبح کے اجالے کی مانند ہوتا۔ آپ غار حراء میں جا کر کئی کئی راتیں تحنث......عبادت......کرتے۔ اس کے لیے آپ ضروری توشہ لے جاتے۔ پھر خدیجہ کے پاس واپس آتے تو وہ اسی طرح کا سامانِ ضرورت ساتھ کر دیتیں۔ یہاں تک کہ ایک دن اسی غار حراء میں اچانک حق۔ وحی۔ کا ظہور ہو گیا اور آپ کی خدمت میں فرشتہ حاضر ہو گیا اور کہا: پڑھو، نبی ﷺ نے فرمایا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس نے مجھے پکڑ کر اس طرح بھینچا کہ میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھو میں نے کہا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس نے دوبارہ مجھے پکڑ کر بھینچا کہ میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھو، میں نے کہا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس نے تیسری بار پھر مجھے پکڑ کر بھینچا یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ. پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ یہاں تک کہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ اس نے انسان کو وہ علم سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔ تک پہنچ گیا۔

رسول اللہ ﷺ لرزاں و ترساں واپس ہوئے اور خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: مجھے کپڑا اڑھا دو۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو کپڑا اڑھا دیا یہاں تک کہ آپ کی گھبراہٹ جاتی رہی۔ آپ نے فرمایا: خدیجہ! مجھے کیا ہوا؟ اور ان کو اپنے ساتھ پیش آمدہ واقعہ کی خبر دی اور فرمایا: مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔

خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ہرگز نہیں! خوش ہو جایئے۔ اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا؟ آپ رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کے مصائب کو برداشت کرنے میں مدد

دیتے ہیں۔ پھر خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کو لے کر بھاگیں اور آپ کو ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبد العزی بن قصی کے پاس لے گئیں۔ وہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچا زاد بھائی یعنی ان کے باپ کے بھائی کے بیٹے تھے۔ وہ ایسے شخص تھے جس نے جاہلیت میں نصرانیت اختیار کر لی تھی، عربی میں لکھتے تھے اور انجیل سے عربی میں جو اللہ چاہتا ترجمہ کرتے تھے۔ بہت بوڑھے اور نابینا ہو چکے تھے۔

خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا: اے ابن عم! اپنے بھتیجے سے سنئے۔ ورقہ نے کہا: بھتیجے تم نے کیا دیکھا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جو دیکھا تھا بیان کیا۔

ورقہ نے کہا: یہ وہی ناموس...... عالم بالا سے وحی لانے والا فرشتہ...... ہے جو موسیٰ پر نازل کیا گیا تھا۔ کاش میں آپ کے زمانہ نبوت میں قوی ہوتا۔ کاش میں اس وقت زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا وہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟ ورقہ نے کہا: ہاں کبھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ کوئی وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لائے ہیں اور اس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر مجھے آپ کا زمانہ ملا تو میں آپ کی پر زور مدد کروں گا"[1]

اس حدیث کا لفظ لفظ یہ صراحت کر رہا ہے کہ اس پہلی وحی کے نزول اور حضرت جبریل علیہ السلام کی آمد سے ایک لمحہ قبل تک آپ کا ذہن اس وحی کے تصور سے خالی تھا۔ امام محی الدین ابو زکریا یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۷۶ھ "حَتّٰی فَجِئَهُ الْحَقُّ" کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی بالکل اچانک آئی جس کی آمد کی آپ کو توقع نہیں تھی۔[2]

قرآن و حدیث کے ان صریح اور واضح بیانات کے باوجود بکثرت صوفیا کا یہ عقیدہ ہے کہ وحی کی آمد سے قبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کا علم رکھتے تھے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی تعلیم دینی چاہی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں۔ اور جب انہوں نے اس کا سبب معلوم کرنا چاہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب وحی تمہارے حوالے کی جائے تو پردہ اٹھا کر دیکھنا۔ چنانچہ حضرت جبریل علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور دیکھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی ان کو وحی کر رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر جبریل علیہ السلام زور سے چیخے: سبحان اللہ! مِنْكَ

---

[1] صحیح بخاری ۳، ۳۳۹۲، ۴۹۵۳، ۴۹۵۵، ۴۹۵۷، ۶۹۸۲۔ صحیح مسلم: ۱۶۰ (۴۰۳)

[2] المنهاج فی شرح صحیح مسلم: ص ۱۹۵

وَاِلَيْكَ يَا مُحَمَّدُ! اے محمد! آپ سے آپ کی طرف؟ مطلب یہ ہے کہ آپ ہی وحی کر رہے ہیں اور آپ ہی وحی وصول بھی کر رہے ہیں۔[1]

یہ من گھڑت اور جھوٹا واقعہ کسی صوفی کی زبان سے "حالت سکر" میں نکلنے والی "بڑ" نہیں ہے بلکہ تصوف کے نظریہ "حلول" اور نظریہ "وحدت الوجود" کا ترجمان ہے۔ یعنی محمد ہی اللہ ہیں اور اللہ ہی محمد ہے۔

حلول کا مطلب یہ ہے کہ لاہوت (اللہ) ناسوت (انسان) میں حلول کر گیا اور دونوں ایک ہو گئے۔ اس کا نعرہ سب سے پہلے حلاج نے لگایا تھا جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ اشاعرہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"امت میں ایک ایسی جماعت ہے جو تصوف پر عمل پیرا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اللہ کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ مادی جسموں میں حلول کر لے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ جب کسی ایسی چیز کو دیکھتے ہیں جو ان کو خوش منظر لگتی ہے تو کہتے ہیں: ہمیں معلوم نہیں، شاید وہ ہمارا رب ہو"

میں...... ابن القیم رحمہ اللہ ...... کہتا ہوں کہ یہ عقیدہ رکھنے والا فرقہ دو گروہوں میں بٹا ہوا ہے:

(۱) ایک گروہ اس بات کا مدعی ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہر خوبصورت اور خوش منظر شکل میں حلول کر لیتا ہے۔

(۲) دوسرے گروہ کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کامل انسانوں میں حلول کر لیتا ہے، وہ کامل انسان جن کے دل خواہشات سے آزاد ہو چکے ہوں، اعلیٰ اخلاق سے موصوف ہوں اور برے اخلاق سے پاک ہوں۔ ادھر نصاریٰ کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسیح کے بدن میں حلول کر لیا ہے اور اس کو ڈھال بنا لیا ہے۔ جبکہ اتحادی (وحدت الوجود کے داعی) یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وجود مطلق ہے جس کو ہر اصلی اور حقیقت نے زیب تن کر لیا ہے۔ اس لیے اللہ ہی موجودات کے عین وجود سے عبارت ہے۔[2]

وحدت الوجود کے بانی محی الدین محمد بن علی المعروف با بن عربی ہیں۔ اس نظریہ کی رو سے موجود صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ کائنات اور انسان سب عین اللہ تعالیٰ ہیں۔ اس نظریہ کی رو سے جو خالق ہے وہی مخلوق ہے۔ جو معبود ہے وہی عابد ہے۔ وحدت الوجود کے نظریہ کی رو سے بت پرست، صلیب پرست، آتش پرست اور نجوم پرست سب مؤحد قرار پاتے ہیں۔ کیونکہ جب حقیقت میں اللہ کے سوا کچھ بھی نہیں

---

[1] هذه هي الصوفيه ص: ۸۷ بحواله محبة الرسول ﷺ ص ۱۹۹

[2] مدارج السالكين ص: ۳٤٦، ۳٤۷، ج:۳

ہے اور اللہ ہی وجود مطلق ہے جو تمام موجودات میں جاری وساری ہے تو پھر مؤحد و مشرک برابر ہیں۔ اور جو توحید ہے وہی شرک ہے اور جو شرک ہے وہی توحید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے جو احکام وہدایات دی ہیں وہ بے معنی ہو جاتی ہیں۔

کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ ''نور محمدی' حلول اور وحدت الوجود کے قائل تمام صوفیا نہیں ہیں بلکہ صرف غالی صوفیا یہ عقائد یا نظریات رکھتے ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اہل تصوف میں جو لوگ اعتدال پسند اور کتاب وسنت کی تعلیمات کے داعی معروف ہیں ان کے یہاں بھی حلاج اور ابن عربی جیسے الحاد و زندقہ کے داعیوں کے لیے نرم گوشے ہیں اور دبے لفظوں میں وہ ان کو ''معذور'' مانتے رہے ہیں۔

شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ متوفی ۱۰۳۴ھ مطابق ۱۶۲۴ء کی تصوف کی دنیا میں بہت بڑا نام ہے۔ کچھ لوگ ان کو گیارہویں صدی ہجری کا مجدد مانتے ہیں۔ تحریر فرماتے:

صاحب حق اور صاحب باطل میں امتیاز کا معیار شریعت میں استقامت اور عدم استقامت ہے۔ صاحب حق سکر و بے تمیزی کے باوجود شریعت کے کسی اصول سے سرمو انحراف نہیں کرے گا۔ منصور جس نے ''انا الحق'' کہا تھا قید خانے میں پابہ زنجیر ہونے کے باوجود روزانہ پانچ سو رکعت نفل نماز پڑھتا تھا اور وہ کھانا جو اسے ظالموں کے ہاتھ سے پہنچتا تھا اگرچہ حلال تھا، لیکن اسے نہیں کھاتا تھا۔ لیکن جو صوفی صاحب باطل ہوتا ہے اس پر شریعت کے احکام کی پابندی کوہ قاف جیسی مشکل ہوتی ہے۔[1]

یہ عبارت اس امر پر بصراحت دلالت کرتی ہے کہ شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ حلاج کو صاحب حق اور صاحب استقامت سمجھتے تھے۔ حلاج کے افکار و نظریات سے وہ مکمل طور پر واقف تھے جن کو کسی بھی تاویل سے حق نہیں قرار دیا جا سکتا۔ تو کیا وہ اس کو اس وجہ سے صاحب حق اور صاحب استقامت سمجھتے تھے کہ وہ قید خانے میں روزانہ پانچ سو رکعتیں نفل نماز ادا کرتا تھا اور کیا حالت کفر میں عبادت کا کوئی اعتبار ہے؟ کیا ان کے سامنے قرآن پاک کی یہ آیت نہیں تھی:

﴿ وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴾ [الزمر:٦٥]

''اے نبی! تمہاری طرف اور تم سے پہلے مبعوث کیے جانے والے تمام انبیاء کی طرف یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا اور یقیناً تم خسارہ

[1] مکتوب ۳:۱۰۔ بحوالہ تصوف اور شریعت ص ۱۳۱، ج ۲

اٹھانے والوں میں شامل ہو گئے"

مطلب ہے کہ شرک کے ساتھ کسی عمل کو عمل صالح نہیں قرار دیا جائے گا اور جو شخص بھی مشرک رہتے ہوئے اپنے نزدیک کسی کام کو نیکی سمجھ کر کرے گا تو اس پر وہ کسی اجر کا مستحق نہ ہوگا۔

شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ نے محی الدین ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود پر سخت تنقید کی ہے اور اوپر کی سطروں میں بھی اس کی نکارت اور اس کے خلاف اسلام ہونے کو واضح کیا جا چکا ہے۔ اس کے باوجود شیخ سرہندی ابن عربی کو مقبول بندوں اور مقبول اولیاء میں شمار کرتے ہیں اور ان کے ملحدانہ افکار و نظریات کو ان کے کشف کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ تحریر فرماتے ہیں:

''عجیب بات ہے کہ شیخ محی الدین ابن عربی مجھے اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں میں نظر آئے حالانکہ ان کے بیشتر خیالات و افکار غلط ہیں اور اہل حق کی آراء کے خلاف ہیں۔ ممکن ہے کہ کشف میں غلطی کی وجہ سے انہیں معذور قرار دیا گیا ہو اور خطا اجتہادی کے مرتکب کی طرح انہیں قابل ملامت نہ گردانا گیا ہو۔

شیخ محی الدین کے بارے میں اس طرح کے خیالات صرف اس فقیر کے ہیں۔ کیونکہ میں ان کو مقبول سمجھتا ہوں۔ لیکن ان کے علوم کو غلط اور مضر جانتا ہوں۔ اس کے برخلاف ایک گروہ ایسا بھی ہے جو شیخ کو ان خیالات کی وجہ سے قابل ملامت سمجھتا ہے اور ان کے خیالات و تصورات کو غلط قرار دیتا ہے۔ دوسری طرف ایک گروہ ایسا ہے جو ان کے خیالات کی اتباع کرتا ہے اور ان کو درست سمجھتا ہے۔ نیز دلائل و شواہد کی بنیاد پر ان کی تصدیق کرتا ہے۔

مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں گروہوں نے افراط و تفریط کی راہ اختیار کی ہے اور میانہ روی سے کوسوں دور ہیں۔ شیخ ابن عربی جو ''مقبول اولیاء'' میں سے ہیں، ان کو کشف کی غلطیوں کے سبب کیسے مطعون کیا جا سکتا ہے؟ دوسری طرف ان کے وہ علوم و معارف جو صحیح نہیں ہیں اور اہل حق کی آراء کے خلاف ہیں ان کی تقلید کیسے کی جا سکتی ہے اور ان کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے؟ حق تو وہ راہ وسط ہے جس کی توفیق اللہ تعالیٰ نے اس فقیر کو عطا فرمائی ہے۔ [1]

دیکھ لیا آپ نے شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ جیسا نقد آور عالم، مصلح اور داعی شیخ ابن عربی کو اللہ کا مقبول بندہ اور مقبول ولی قرار دے رہا ہے۔ جبکہ اسی عبارت میں وہ ان کے علوم کو غلط اور مضر بھی قرار دے چکے ہیں۔ اپنی دوسری تحریروں میں ان کے افکار و تصورات کو قرآن و سنت کی واضح اور صریح تعلیمات کے خلاف قرار

[1] مکتوب نمبر ۲:۷، بحوالہ تصوف اور شریعت: ص ۲۹۰ ج ۲

دے کر ان پر سخت تنقید بھی کر چکے ہیں۔ شیخ نے منصور حلاج اور محی الدین ابن عربی کی کتابوں کا بغائر نظر مطالعہ کیا تھا اور پورے یقین قلب کے ساتھ ان کے افکار وعقائد کو کتاب وسنت کے خلاف پایا تھا۔ کیونکہ قرآن کی کسی ایک بھی آیت اور رسول اکرم ﷺ کے کسی ایک بھی ارشاد سے حلول اور وحدت الوجود کا اشارہ تک نہیں ملتا۔ اس کے باوجود وہ ان دونوں کے لیے اپنے دل میں یہ نرم گوشہ کیوں رکھتے تھے؟

اس سوال کا جواب ان کی مذکورہ تحریر میں موجود ہے۔ یعنی وہ ابن عربی کے ملحدانہ افکار وعقائد کو اجتہادی غلطی یا کشف کی غلطی تصور کرتے تھے۔ اس لیے ان کی نظر میں وہ ''معذور'' تھے۔

رہا منصور حلاج تو اس کو وہ صاحب حق اور صاحب استقامت قرار دے چکے ہیں۔

شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ کتاب وسنت کے جید عالم تھے۔ ان کو اتنی بات تو معلوم رہی ہوگی کہ اجتہاد کی کوئی شرعی بنیاد اور اصل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شرعی نص اپنے مدلول میں واضح اور دوٹوک نہ ہو تو دوسرے شرعی دلائل اور شریعت کے مزاج اور منشا کی روشنی میں (غور وفکر) کے ذریعہ اس شرعی نص کا حکم معلوم کیا جاتا ہے۔

لیکن اگر کوئی نص قطعی الثبوت اور قطعی الدلالہ ہو بایں معنی کہ اس نص کی نسبت اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے یقینی ہو اور اپنے مفہوم ومدلول میں بالکل واضح ہو تو اس مسئلے سے متعلق اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے جس مسئلے سے متعلق وہ نص ہے۔

اور تمام ائمہ اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ کتاب وسنت میں عقائد کو ان کی تمام تفصیلات کے ساتھ واضح کر دیا گیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ توحید کا مسئلہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اور توحید کی تینوں قسموں: توحید الوہیت، توحید ربوبیت اور توحید الاسماء والصفات میں سے کوئی بھی ایسی قسم نہیں ہے جس کو لوگوں کے اجتہاد کے لیے تشنہ چھوڑ دیا گیا ہو کیونکہ توحید اساسِ دین ہے۔

سوال یہ ہے کہ کتاب وسنت کی کسی دلیل سے بذریعہ اجتہاد حلول اور وحدت الوجود کا ثبوت ملتا ہے؟ اشارۃً ہی سہی؟ بلکہ یہ نظریہ تو اسلامی عقیدے کی روشنی میں سراسر کفر والحاد ہے۔ جیسا کہ اوپر کی سطروں میں واضح کیا گیا ہے تو پھر حلول اور وحدت الوجود کا عقیدہ رکھنے والا، اسی کو صحیح دین تصور کرنے والا اور لوگوں کو اس کی دعوت دینے والا اجتہادی غلطی کا مرتکب کیونکر قرار نہیں دیا جا سکتا؟ اس منطق کی رو سے تو دنیا کا کوئی مذہب بھی غلط نہیں ہے اور کسی بھی مذہب اور نظریہ کا ماننے والا کافر یا مشرک نہیں

ہے۔ بلکہ سب صاحب حق اور صاحب استقامت اور سب اللہ کے مقبول بندے بلکہ مقبول اولیاء قرار پاتے ہیں۔ العیاذ باللہ۔

شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''شیخ ابن عربی جو مقبول اولیاء میں سے ہیں ان کو کشف کی غلطیوں کے سبب کیسے مطعون کیا جا سکتا ہے؟ شیخ کی مراد یہ ہے کہ ابن عربی کی زبان وقلم سے شریعت کے خلاف جو باتیں نکل گئی ہیں وہ ان کے کشف کا نتیجہ ہیں، اس لیے ان کی بنیاد پر ان کی طعن وتشنیع صحیح نہیں ہے۔

تصوف کی کتابوں میں اولیاء اللہ یا عارفین باللہ کے حوالے سے کشف وکرامت اور الہام کا ذکر بڑی کثرت سے ملتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اسلام کے شرعی ماخذوں کتاب وسنت کے متوازی اولیاء اللہ کا کشف اور ان کا الہام بھی شرعی ماخذ ہے، بلکہ بسا اوقات اس کو کتاب وسنت کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اس تناظر میں کشف والہام کی شرعی حیثیت کو واضح کر دینا ضروری ہے۔ لیکن کشف وکرامت اور الہام اولیاء اللہ کے لیے چونکہ خاص ہیں اس لیے پہلے اولیاء اللہ کی تعریف کر دینا ضروری ہے تاکہ سلسلۂ کلام میں ایک منطقی ربط قائم رہے۔

ولی کون ہے:

ولی جس کی جمع اولیاء ہے، ''وَلِيَ يَلِيْ'' سے بنا ہے جو فعیل کے وزن پر ''صفت مشبہ'' ہے۔ صفت مشبہ اس اسم کو کہتے ہیں جس میں فعل کا مصدری معنی دائمی ہو، عارضی نہ ہو۔ اور اپنے موصوف سے کبھی جدا نہ ہوتا ہو۔ وَلِيَ يَلِي وَلْيًا وَوِلَايَةً وَ وَلَايَةً کے معنی ہیں: بالکل قریب ہونا، ملا ہونا، دوست ہونا، محبت کرنا اور مدد کرنا وغیرہ۔

اَلْوَلِيُّ...... اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے اور قرآن پاک میں متولی، کارساز، حامی، ناصر، آقا، سرپرست، نگران کار، ساتھی اور دوست وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بندوں کا ولی ہونے کا مطلب ہے کہ وہ ان کا حامی وناصر، متولی وکارساز اور آقا وسرپرست ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ﴾ [البقرۃ:۲۵۷]

''جو لوگ مومن ہیں ان کا متولی اور کارساز اللہ ہے وہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں

لاتا ہے اور جنہوں نے کفر کیا ہے ان کے کار پرداز طاغوت ہیں جو ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں"

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ان کے امور کا متولی اور ان کا حامی و ناصر اور کارساز اللہ تعالیٰ ہے جو ان کی دست گیری فرماتا ہے اور ان کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر معرفت حق کی روشنی میں لے جاتا ہے۔ اور جو لوگ کفر کا راستہ اختیار کرتے ہیں ان کی نکیل طاغوت کے ہاتھ میں دے دیتا ہے جو اسے معرفت حق کی روشنی اور فلاح و سعادت کی راہ سے بہت دور غلط راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔ طاغوت سے مراد ایسا شخص ہے جو حق تعالیٰ کا باغی ہو۔ صحیح راہ سے دور اور دین فطرت سے منحرف ہو۔ طاغوت انسانوں میں بھی ہوتا ہے اور شیطانوں میں بھی۔

﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴾ [البقرة:١٠٧]

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ زمین اور آسمانوں کی فرماں روائی اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے سوا تمہاری خبر گیری اور مدد کرنے والا کوئی نہیں۔"

اس آیت میں ولی بمعنی متولی، نگران کار، اور خبر گیری کرنے والے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بندوں کے اللہ کا ولی ہونے کا مطلب ہے کہ وہ اس کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔ اس کے احکام بجا لاتے ہیں۔ جن باتوں سے اس نے منع فرمایا ہے ان کا ارتکاب نہیں کرتے۔

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ ﴾ [یونس:٦٢، ٦٣]

"سن لو اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یعنی جو ایمان لائے اور جو ڈرتے ہیں"

قرآن پاک کی یہ واحد آیت ہے جس میں اولیاء اللہ کی تعریف اور ان کا وصف بیان کیا گیا یعنی اللہ کے ولی مؤمن اور متقی ہوتے ہیں۔ "آمَنُوا" میں ایمانیات وعقائد سے متعلق تمام باتیں داخل ہیں اور یَتَّقُون میں تمام اعمال صالحہ داخل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ولی اور دوست مؤمن اور متقی لوگ ہوتے ہیں۔ یعنی جو شخص بھی ان دو صفات: ایمان اور تقویٰ سے موصوف ہو وہ ولی ہے۔ ایمان اور تقویٰ کے تمام

ارکان کتاب وسنت میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ لہٰذا ولی بننے کے لیے یونانی فلاسفہ، مسیحی راہبوں، ہندو سادھوؤں اور بدھ بھکشوؤں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے لیے اللہ اور رسول کافی ہیں۔

﴿ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ۝ ﴾ [المائدہ:۵۵]

''تمہارے دوست تو صرف اللہ، اس کے رسول، اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں''

اسی سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۴۱ سے منافقین کا ذکر آ رہا تھا۔ آیت نمبر ۵۱ میں مسلمانوں سے فرمایا گیا ہے کہ تم یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست مت بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست نہیں اور تم میں سے جو ان کو دوست بنائے گا تو اس کا شمار بھی انہیں میں ہوگا۔ پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اللہ عزوجل، اس کے رسول اور مومنوں کو اپنا دوست بنائیں کیونکہ اہل ایمان کی دوستی اور ولایت کے حق دار تو صرف اللہ تبارک وتعالیٰ، اس کے رسول اور مومنین ہیں۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے دوستی اور ولایت یا ان کو دوست بنانے کا مطلب ان سے حد درجہ محبت اور ان کے احکام و ہدایات کی بے چون و چرا اطاعت ہے۔ اور اہل ایمان کے ایک دوسرے کا ولی اور دوست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے محبت کریں اور ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں۔

﴿ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝ ﴾ [التوبہ:۷۱]

''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ رحم فرمائے گا۔ بے شک اللہ غالب اور صاحب حکمت ہے''

ہر مومن اللہ کا ولی ہے:

اوپر جو قرآنی آیات نقل کی گئی ہیں ان میں مسلمانوں کی کسی خاص جماعت، گروہ یا افراد کو اولیاء اللہ قرار نہیں دیا گیا ہے اور نہ کہیں ایسی خاص ظاہری اور باطنی صفات بیان ہوئی ہیں جن سے موصوف ہونے والوں کو عام مسلمانوں میں کوئی امتیازی مقام حاصل ہوتا ہو۔ اسی وجہ سے ''عقیدہ طحاویہ'' میں لکھا ہے۔

((وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلُّهُمْ أَوْلِيَاءُ الرَّحْمٰنِ وَأَكْرَمُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَطْوَعُهُمْ وَأَتْبَعُهُمْ لِلْقُرْآنِ))[1]

''تمام مومنین رحمٰن کے دوست ہیں اور اللہ کے نزدیک ان میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہیں جو قرآن کے سب سے زیادہ اطاعت گزار اور تابع فرمان ہوں''

امام طحاوی رحمہ اللہ کی مذکور عبارت اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے جس کی قرآنی بیانات سے مکمل تائید ہوتی ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی وہ حدیث قدسی بھی اس کے خلاف نہیں ہے جس کی تخریج امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں کی ہے اور جس کا پہلا فقرہ ہے:

((إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى قَالَ: مَنْ عَادَى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ......))[2]

''جو میرے کسی ولی سے دشمنی کرے گا تو میں نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔''

اس حدیث میں اللہ کے ولی سے مراد اس کا مومن و مطیع بندہ ہی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''اللہ کے ولی سے مراد اللہ کی معرفت رکھنے والا ہے جو اس کی اطاعت کا پابند اور اس کی عبادت میں مخلص ہو۔''[3] یعنی جس مومن بندے کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو اور وہ اس کی اطاعت و فرماں برداری سے کبھی غافل نہ ہوتا ہو اور اللہ کی عبادت میں غیر اللہ کو شریک نہ کرتا ہو تو ایسا شخص اللہ کا ولی اور دوست ہے۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت سے مراد اس کی حسی معرفت نہیں ہے، کیونکہ ہمارے احساسات ذات الٰہی کا ادراک نہیں کر سکتے اور نہ عقلاً ہی ہم اس کا تصور کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔ ''لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ'' اور بصارت و بصیرت کے ذریعہ اسی چیز کا تصور اور ادراک ممکن ہوتا ہے جس کی

---

[1] شرح عقیدہ طحاویہ: ص ۲۲ [2] صحیح البخاری: ۶۵۰۲

[3] فتح الباری: ص ۲۸۵۶، ج ۳

کوئی تشبیہ ہو۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شبیہ ہے نہ مماثل۔ لہٰذا اس کی معرفت سے مراد اس کے ان اسماء و صفات کی معرفت ہے جو کتاب اللہ اور رسول اکرم ﷺ کے ارشادات میں بیان کردی گئی ہیں اور یہ سب توقیفی ہیں۔ بایں معنی کہ کوئی بھی شخص اپنی طرف سے اللہ کو کوئی نام دینے یا اس کو کسی صفت سے متصف کرنے کا مجاز نہیں ہے:

﴿ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [النحل:٧٤]

''اللہ کے لیے مثالیں نہ بناؤ۔ بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''

اولیاء اللہ کا صوفیانہ تصور غیر اسلامی ہے:

تصوف کی کتابوں میں ولایت یا اولیاء اللہ کے بارے میں جو تصورات ملتے ہیں ان کا کتاب وسنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ وہ صوفیا کے ذہنوں کی پیداوار ہیں۔ مزید یہ کہ اولیاء اللہ کے متعلق اہل تصوف کا یہ عقیدہ کہ وہ تدبیر کائنات اور دنیا کے انتظامات میں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بٹاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں بدترین شرک ہے جو دور جاہلی کے مشرکین کے شرک سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ مشرکین اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں شرک کے قائل نہیں تھے۔ وہ تو صرف الوہیت میں شرک کا ارتکاب کرتے تھے۔

نبی اور ولی میں موازنہ کرنا کفر ہے:

جو لوگ نبوت اور ولایت یا نبی اور ولی میں موازنہ کرتے ہیں وہ درحقیقت منصب نبوت سے ناواقف ہیں۔ اگر کسی کا عقیدہ یہ ہو کہ ولی نبی سے افضل ہوتا ہے تو ایسا شخص کسی بھی حال میں مسلمان نہیں ہوسکتا چہ جائیکہ وہ اللہ کا محبوب اور صالح بندہ ہو۔ اس دنیا میں اللہ کی بندگی اور عبادت کا صحیح طریقہ آغاز آفرینش سے صرف وہی رہا ہے جس کی دعوت اللہ کے رسولوں اور نبیوں نے دی ہے اور جن کی آخری کڑی خاتم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اللہ کا محبوب اور برگزیدہ بندہ وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی سنت اور طریقے کا سالک ہو۔

طریق نبوت یا اس شریعت پر عمل کرکے ہی ایک مومن اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرسکتا ہے جسے دے کر اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ کو اس دنیا میں بھیجا تھا۔

﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾

''اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور شریعت اختیار کرنا چاہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کی

جائے گی اور آخرت میں وہ نامرادلوگوں میں سے ہوگا‘‘[آل عمران:۸۵]

جو دین اور شریعت لے کر رسول اکرم ﷺ اس دنیا میں بھیجے گئے تھے وہی سیدھی اور صحیح راہ ہدایت ہے جس پر چل کر انسان اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تمام طریقہ ہائے بندگی اللہ تعالیٰ اور اس کی رضا سے دور کر دینے والے ہیں:

﴿ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝ ﴾ [الانعام:۱۵۳]

’’اور فی الواقع یہ ہے میرا راستہ جو سیدھا ہے لہٰذا اسی کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو، ورنہ وہ تم کو اس کے راستے سے ہٹا دیں گے۔ یہی وہ حکم ہے جو اللہ نے تمہیں دیا ہے تاکہ تم اس کے غضب سے بچ سکو‘‘

﴿ وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ۝ ﴾ [المائدہ:۱۲]

’’درحقیقت اللہ نے بنو اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ہم نے ان میں بارہ نقیب بھیجے تھے اور اللہ نے کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نے نماز قائم کی، زکوۃ دیتے رہے اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی پشت پناہی کرتے رہے۔ اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقیناً میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا۔ اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ پس اس کے بعد تم میں سے جس نے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا‘‘

معلوم ہوا کہ صحیح اور سیدھی راہ ہمیشہ سے صرف وہی رہی ہے جس پر چلنے کی دعوت اللہ کے رسول اور نبی دیتے رہے ہیں اور ان کے بعد نبی آخر الزماں، خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ نے جس ’’صراط مستقیم‘‘ کی ہدایت فرمائی ہے اور جو دین و شریعت دے کر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دنیا میں مبعوث فرمایا صرف وہی دین و شریعت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول و معتبر ہے اور صرف اسی کی پیروی کر کے انسان

اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی سے سرفراز ہو سکتا ہے۔ آخرت کی فلاح اور کامیابی صرف اسی شریعت کی پیروی پر موقوف ہے۔

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝ ﴾ [التوبۃ:۳۳]

''وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔''

یہ دین حق اور یہ ہدایت نامہ عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت اور معیشت سب پر محیط ہے۔ اس میں تزکیہ نفس، تہذیب اخلاق اور احسان کے طریقے بھی ہیں اور محبت، خشیت، زہد، توکل اور اخلاص کی روح پیدا کرنے کے ذرائع بھی۔ اور مختصراً اللہ اور بندے کے درمیان تعلق پیدا کرنے اور اس کو مضبوط بنانے کا کوئی بھی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس کو اس ''دین حق'' میں نظر انداز کر دیا گیا ہو:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۝ ﴾ [المائدہ:۳]

''آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے پسند کر لیا ہے''

تکمیل دین والے الٰہی اعلان کے بعد یہ دعویٰ:

''سلوک دو قسم پر منقسم ہے، سلوکِ نبوت اور سلوکِ ولایت اور ہر ایک کے آثار و خواص جدا جدا ہیں...... اولیاء میں سے کسی پر کسی وقت فیضِ نبوت کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی فیضِ ولایت کا۔''[1]

باطل ہے اور اپنے پیچھے کتاب و سنت سے کوئی دلیل نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ:

(ا)......: طریق ہدایت صرف ایک ہے اور صرف وہی ہے جس کی دعوت تمام انبیاء اور رسولوں نے دی ہے اور جس کی آخری کڑی اسلام ہے۔ جو ایک مکمل دین ہے اس میں عقائد سے لے کر عبادات، معاملات اور سلوک سب کچھ شامل ہے۔

(ب)......: اسلامی عقائد میں نبوت کے متوازی ''ولایت'' نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی اور اگر اللہ اور رسول سے محبت اور دوستی کو ''ولایت'' قرار دے لیں تو پھر یہ نبوت کے تابع ہے بایں معنیٰ کہ جو

[1] شریعت و طریقت ص ۴۵

شخص اللہ اور رسول کی متعین کردہ ''راہ ہدایت'' کو چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کرے یا اس کے ساتھ اس کو بھی ''راہ نجات'' فلاح و کامیابی کا ذریعہ اور دل میں اللہ کی محبت اور خشیت پیدا کرنے کا وسیلہ تصور کرے تو وہ ''ولی اللہ'' نہیں بلکہ ''ولی الشیطان'' ہے۔

﴿ فَرِيقًا هَدٰى وَ فَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۝ ﴾ [الاعراف: ۳۰]

''ایک فریق کو اللہ نے ہدایت دی اور دوسرے گروہ پر گمراہی ثبت ہوگئی کیونکہ انہوں نے اللہ کی بجائے شیطانوں کو اپنے دوست بنالیا (اولیاء) اور گمان کر رہے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں''

(ج)......: اسلام نے اللہ سے تعلق جوڑنے کے لیے خلق سے تعلق توڑنے کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ اجتماعیت تو اسلام کی روح ہے اور اس کے سارے فرائض میں اجتماعیت کی روح کارفرما ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی سیرت پاک اہل ایمان کے لیے اسوہ حسنہ ہے۔ آپ نے اللہ سے تعلق مضبوط بنانے کے لیے اللہ کے بندوں سے تعلق منقطع کر لینے کا نہ حکم دیا ہے اور نہ عملاً اس کا نمونہ پیش کیا ہے۔ نکاح جو معاشرتی زندگی کی بنیاد ہے اسلام میں اس کا حکم دیا گیا ہے:

((يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ))[1]

''اے نوجوانو! تم میں سے جس کو نکاح کرنے پر قدرت ہو اس کو چاہیے کہ وہ شادی کر لے۔ کیونکہ یہ نگاہ کو نیچی رکھنے اور شرم گاہ کو محفوظ رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اور جسے نکاح کرنے کی قدرت حاصل نہ ہو تو اسے چاہیے کہ روزہ رکھے اس لیے کہ روزہ شہوت کو توڑ دیتا ہے''

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي، فَمَنْ لَمْ يَعْمَلْ بِسُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي، وَتَزَوَّجُوا، فَإِنِّي مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْأُمَمَ، وَمَنْ كَانَ ذَا طَوْلٍ فَلْيَنْكِحْ وَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَعَلَيْهِ بِالصِّيَامِ، فَإِنَّ الصَّوْمَ لَهُ وِجَاءٌ))[2]

---

[1] صحيح بخاري: ٥٠٦٥۔ صحيح مسلم: ١٤٠٠

[2] سنن ابن ماجه، حديث: ١٥٠٨، (١٨٧٣)

''نکاح میری سنت سے تعلق رکھتا ہے، پس جس نے میری سنت پر عمل نہ کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور شادیاں کرو، کیونکہ قیامت کے روز میں دوسری قوموں سے تمہاری کثرت پر فخر کروں گا اور جو شخص نکاح کی قدرت رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ نکاح کرے اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو اسے چاہیے کہ وہ روزہ رکھے، اس لیے کہ روزہ شہوت کو کم کرنے والا ہے''

اس کے علاوہ کتاب وسنت میں بیویوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان سے محبت آمیز برتاؤ، والدین کے ساتھ نرمی، الفت اور اللہ تعالیٰ کی معصیت کے سوا دوسرے تمام معاملات میں ان کی اطاعت وفرماں برداری، قرابت داروں سے صلہ رحمی، دوسرے بندگانِ خدا کے ساتھ حسنِ سلوک حتیٰ کہ جو لوگ غیر مسلم ہیں مگر وہ مسلمانوں کو کوئی اذیت نہیں دیتے ان کے ساتھ نیکی اور عدل وانصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ایسی صورت میں کیا ''مزعومہ طریق ولایت'' کتاب وسنت سے ماخوذ قرار دیا جاسکتا ہے؟ لہٰذا جو چیز کتاب وسنت سے ماخوذ نہیں ہے وہ سراسر گمراہی ہے اگر چہ اس میں زہد وتوکل، محاسن اخلاق، احسان واخلاص، صبر وشکر، تزکیہ نفس اور طہارتِ قلب کی بھی باتیں ملتی ہیں۔

کشف والہام حق ہے لیکن......:

اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور صالح بندوں کو بعض اوقات ''خلاف عادت'' باتوں سے نوازتا ہے۔ اس کی یہ نوازش اور تکریم ''اولیاء اللہ'' کے نام سے کسی خاص جماعت اور گروہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا ہر مومن اور متقی بندہ اس تکریم سے نوازا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بعض مخفی امور اور باتیں اس پر منکشف فرما دیتا ہے۔

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًاO وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ط ﴾ [الطلاق:۲، ۳]

''جو اللہ سے ڈرتا ہے تو اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دیتا ہے اور ایسی جگہ سے اس کو روزی دیتا ہے جدھر اس کا گمان بھی نہیں جاتا۔''

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِO ﴾ [الانفال:۲۹]

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمہارے لیے (حق وباطل، ہدایت وگمراہی کی پہچان کے لیے) دلیل وبرہان پیدا کر دے گا اور تم سے تمہاری برائیوں کو

دور کر دے گا اور تمہاری مغفرت فرما دے گا اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے"

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ [العنکبوت:٦٩]

"جو لوگ ہماری راہ میں بھرپور جدوجہد کرتے ہیں ہم انہیں اپنی راہیں دکھا دیتے ہیں اور بے شک اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے"

ان آیتوں سے اللہ کے نیک اور صالح بندوں کے لیے کشف و کرامت اور الہام کا ثبوت ملتا ہے۔

ان تینوں آیتوں میں ایک ہی بات کو مختلف انداز میں ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ اللہ کا تقویٰ اور اللہ کی راہ میں جہاد دونوں ایک ہی ہیں۔ اسی طرح "مخرج، فرقان" اللہ کی رضا اور خوشنودی کے راستے بھی ایک ہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں اس کے احکام کی پابندی کرتے ہیں اور جن باتوں سے اس نے روکا ہے ان سے اجتناب کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی توفیق و عنایت ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ان کے حال پر نہیں چھوڑتا بلکہ ان کی دستگیری و رہنمائی فرماتا رہتا ہے۔ مشکلات کے موقع پر ان سے ان کے بچ نکلنے کے راستے پیدا کر دیتا ہے اور رزق کی تنگی کے وقت ان کو دوسروں کا دست نگر نہیں بننے دیتا بلکہ ان کی توقع کے برخلاف ایسی جگہوں سے ان کے لیے رزق کے دروازے کھول دیتا ہے جدھر ان کا گمان بھی نہیں جاتا۔ مگر یہ سب کچھ ان کے لیے ہے "جو مومن اور متقی ہوں"۔

رہے وہ لوگ جنہوں نے اس دین میں عقائد سے لے کر عبادات، معاملات اور معاشرت تک ہر باب میں اپنے ذوق و خیال سے ایسی باتیں داخل کر دی ہیں جن کا اس دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہوں نے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیا ہے تو ایسے لوگ مومن اور متقی نہیں ہیں۔ چاہے وہ ہر روز ایک ہزار رکعتیں نوافل کی پڑھتے ہوں، بلا ناغہ روزے رکھتے ہوں اور اللہ کے ذکر سے ان کی زبانیں تر رہتی ہوں۔ اگر ایسے لوگوں سے خلاف عادت کشف و کرامت جیسے امور کا ظہور ہوتا بھی ہے تو ان کا تعلق اس کشف اور الہام سے ہرگز نہیں ہے جس کا ثبوت اوپر نقل کردہ قرآنی آیات سے ملتا ہے۔ بلکہ کشف و الہام کی شکل میں یہ خارق عادت احوال "فریب نفس" کے سوا کچھ اور نہیں ہیں۔

پھر کشف کی صفت سے کوئی نیک اور صالح انسان ہر وقت متصف نہیں ہوتا اور نہ یہ اس کی اختیاری صفت ہے۔ بلکہ یہ ایک تکریم ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بعض محبوب بندوں کو کبھی کبھی نوازتا ہے۔

کشف اس اعتبار سے تو معجزات کی مانند ہے کہ معجزات کی طرح یہ بھی خلاف عادت ہوتا ہے، مگر معجزات کی طرح یہ یقینی اور فریب نفس سے پاک نہیں ہے۔ چونکہ نبی معصوم ہوتا ہے اس لیے اس کے

ہاتھوں ظاہر ہونے والے معجزات یقین کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی لیے انبیاء اور رسولوں کے جو معجزات ثابت ہیں ان پر ایمان ضروری ہے۔ لیکن کوئی نبی عام طور پر اور رسول اکرم ﷺ خاص طور پر ہر وقت معجزہ دکھانے پر قادر نہیں تھے۔

اللہ کے نیک اور صالح بندوں کا کشف نہ ان کے لیے کوئی شرعی دلیل ہے اور نہ غیروں کے لیے۔ اگر کشف مسلمات دین سے ٹکراتا ہو تو وہ مردود ہے اور اگر اس کا تعلق غیبی امور سے ہو جن کا علم اللہ تعالیٰ کے بتانے سے صرف انبیاء علیہم السلام کو حاصل تھا تو یہ کشف بھی مردود ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو عمومی طور پر اور رسول اکرم ﷺ کو خصوصی طور پر جن غیبی امور کا علم حاصل ہوتا تھا وہ ان کو بذریعہ وحی الٰہی حاصل ہوتا تھا۔ رہی وحی الٰہی تو وہ یقینی ذریعہ علم ہے جبکہ کشف والہام یقینی ذریعہ علم نہیں ہے حتیٰ کہ مختلف فیہ شرعی دلائل میں سے کسی دلیل کو بذریعہ کشف یا الہام کسی دوسری دلیل پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک ایسے اطمینان قلب کی ہے جو جائز اور مباح امور میں سے کسی امر کو اختیار کرنے سے متعلق کسی مؤمن بندے کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس کشف یا الہام کی بنیاد پر کسی حلال چیز کو حرام قرار دینا یا کسی حرام کو حلال کر دینا صریح گمراہی ہے کیونکہ حلت یا حرمت قطعی دلائل سے ثابت ہوتی ہے۔

اللہ کے صالح اور نیک بندوں کے کشف والہام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کی طرف کی جانے والی وحی، حضرت خضر علیہ السلام کے الہام اور حضرت مریم علیہا السلام سے فرشتے کی بصورت انسان دُو بدو گفتگو پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اولاً تو ان تینوں واقعات کو قرآن میں بیان کرنے کا مقصد کوئی شرعی اصول اور قاعدہ بیان کرنا نہیں ہے۔ ثانیاً یہ تینوں واقعات نا قابل تکرار ہیں۔

کشف والہام کے بارے میں اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے کتاب وسنت کی روشنی میں وہی حق ہے۔ مگر برا ہو اندھی عقیدت کا جس نے ارباب تصوف کو اس باب میں حق سے بہت دور کر دیا ہے اور انہوں نے اولاً تو کشف والہام کا دائرہ حد درجہ وسیع کر دیا ہے۔ دوم اس کو اپنے ''مزعوم اولیاء اللہ'' کی دائمی صفت بنا دیا ہے جس سے وہ اپنی من گھڑت اور خود ساختہ ریاضتوں کے نتیجے میں متصف ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر آپ کے دل میں کیا ہے؟ آپ نے کتنے گناہ کیے ہیں؟ اہل قبور کن حالات سے گزر رہے ہیں؟ کون جنتی ہے اور کون جہنمی؟ آپ کے ذکر و اذکار قبول ہو رہے ہیں یا نہیں؟ یہ ساری باتیں اگر اہل کشف والہام کو معلوم ہو جاتی ہیں تو سوال یہ ہے کہ پھر علام الغیوب اللہ تعالیٰ کے لیے کیا بچا؟

کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے یہ محض دعویٰ ہے۔ نہیں، کیونکہ اس طرح کی

باتوں سے تصوف کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

ایک مشہور صوفی بزرگ لکھتے ہیں، شیخ ابو یزید قرطبی فرماتے ہیں: میں نے یہ سنا کہ جو شخص ستر ہزار مرتبہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھے اس کو دوزخ کی آگ سے نجات ملے۔ میں نے یہ خبر سن کر ایک نصاب یعنی ستر ہزار کی تعداد اپنی بیوی کے لیے بھی پڑھا اور کئی نصاب خود اپنے لیے پڑھ کر ذخیرۂ آخرت بنایا۔ ہمارے پاس ایک نوجوان رہتا تھا جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ یہ صاحب کشف ہے۔ جنت اور دوزخ کا بھی اس کو کشف ہوتا ہے۔ مجھے اس کی صحت میں کچھ تردد تھا۔ ایک مرتبہ وہ نوجوان ہمارے ساتھ کھانے میں شریک تھا کہ دفعتہً اس نے ایک چیخ ماری اور سانس پھولنے لگا۔ کہا کہ میری ماں دوزخ میں جل رہی ہے۔ اس کی حالت مجھے نظر آئی ہے۔ قرطبی کہتے ہیں کہ میں اس کی گھبراہٹ دیکھ رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ایک نصاب اس کی ماں کو بخش دوں جس سے اس کی سچائی کا بھی مجھے تجربہ ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے ایک نصاب ستر ہزار کا ان نصابوں میں سے جو اپنے لیے پڑھے تھے، اس کی ماں کو بخش دیا۔ میں نے اپنے دل میں چپکے ہی سے بخشا تھا اور میرے اس پڑھنے کی خبر بھی اللہ کے سوا کسی کو نہ تھی۔ مگر وہ نوجوان کہنے لگا کہ چچا میری ماں دوزخ کے عذاب سے ہٹا دی گئی ہے۔ قرطبی کہتے ہیں کہ مجھے اس قصے سے دو فائدے ہوئے۔ ایک تو اس برکت کا جو ستر ہزار کی مقدار پر میں نے سنی تھی، اس کا تجربہ ہوا۔ دوسرے اس نوجوان کی سچائی کا یقین ہو گیا۔[1]

غور فرمایئے! ستر ہزار مرتبہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ورد من گھڑت، اس کا یہ مبالغہ آمیز ثواب من گھڑت اور اس کو کسی دوسرے کے نام بخشنا یہ بھی من گھڑت۔ مگر نتیجہ یہ کہ ادھر اس کو بخشا، ادھر دوزخ میں جلنے والی عورت جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دی گئی اور صاحب کشف کی نگاہوں کے سامنے جو غیب کے پردے حائل تھے وہ سب چاک ہو گئے۔ اس نے یہ سب کچھ دیکھ لیا اور حضرت "ولی" نے اس کی کشفی خبر کی تصدیق بھی کر دی۔

ایک طرف اس من گھڑت واقعہ کو رکھیے اور دوسری طرف حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث کو رکھیے جس میں آیا ہے کہ نبی معظم ﷺ نے قبروں میں مدفون دو ایسے انسانوں کی آوازیں سنیں جو عذاب میں مبتلا تھے۔ تو آپ نے فرمایا:

((يُعَذَّبَانِ، وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ، ثُمَّ قَالَ: بَلَى، كَانَ أَحَدُهُمَا لَا يَسْتَتِرُ

[1] فضائل اعمال: ص ۴۰۳-۴۰۲، ج ۱

مِنْ بَوْلِهِ وَكَانَ الْآخَرُ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ، ثُمَّ دَعَا بِجَرِيدَةٍ فَكَسَرَهَا كِسْرَتَيْنِ، فَوَضَعَ عَلَى كُلِّ قَبْرٍ مِنْهُمَا كِسْرَةً، فَقِيلَ لَهُ! يَا رَسُولَ اللّٰهِ لِمَ فَعَلْتَ هٰذَا؟ قَالَ: لَعَلَّهُ أَنْ يُخَفَّفَ عَنْهُمَا مَا لَمْ تَيْبَسَا أَوْ إِلَى أَنْ يَيْبَسَا))[1]

''ان دونوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور کسی بڑی چیز کے نتیجے میں ان کو عذاب نہیں دیا جا رہا۔'' پھر آپ نے فرمایا: کیوں نہیں، ان میں کا ایک اپنے پیشاب سے احتیاط نہیں برتتا تھا اور دوسرا چغل خوری کیا کرتا تھا۔ پھر آپ نے کھجور کی ایک ٹہنی طلب کی۔ اس کو دو حصوں میں توڑا اور ہر قبر پر ایک حصے کو گاڑ دیا۔ عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول آپ نے ایسا کیوں کیا؟ فرمایا: شاید ان ٹہنیوں کے خشک ہونے تک ان کے عذاب میں تخفیف رہے''

اور صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے:

((إِنِّي مَرَرْتُ بِقَبْرَيْنِ يُعَذَّبَانِ، فَأَحْبَبْتُ بِشَفَاعَتِي، أَنْ يُرَفَّهَ عَنْهُمَا، مَا دَامَ الْغُصْنَانِ رَطْبَيْنِ))[2]

''میرا گزر دو ایسی قبروں سے ہوا جن میں مدفون دونوں مردوں پر عذاب ہو رہا ہے۔ پس میں نے چاہا کہ میری شفاعت (دعاء) سے اس وقت تک ان کے عذاب میں تخفیف رہے جب تک دونوں ٹہنیاں ہری رہیں''

مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے دونوں قبروں کے مردوں پر ہونے والے عذاب سے مطلع فرمایا اور آپ نے ان کے لیے دعاء فرمائی۔ آپ کی دعاء ان کے حق میں ایک مدت کے لیے قبول ہوئی۔ یعنی جب تک ان قبروں پر گاڑی ہوئی ٹہنیاں تر رہیں گی اس وقت تک ان پر ہونے والے عذاب میں تخفیف رہے گی۔

مذکورہ دونوں قبروں میں مدفون مردے نبی اکرم ﷺ کے صحابی تھے اور وہ جس عذاب میں مبتلا تھے اس کا سبب یہ تھا کہ ان میں سے ایک پیشاب کرتے ہوئے احتیاط نہیں برتتے تھے اور پیشاب کے چھینٹے ان کے کپڑوں پر پڑتے تھے اور دوسرے چغل خور تھے۔ جب رسول اکرم ﷺ نے ان کے حق میں دعاء فرمائی تو وہ صرف عارضی مدت کے لیے قبول ہوئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا کہ آپ

---

[1] صحیح بخاری: ح ۲۱٦، ۲۱۸، ۱۳٦۱، ٦۰۵۲، ٦۰۵۵۔ صحیح مسلم: ۲۹۲

[2] صحیح مسلم: ح ۳۰۱۲ (۷۵۱۸)

کھجور کی ایک ہری شاخ کو دو حصوں میں تقسیم کرلیں اور ان میں سے ہر ایک کو مذکورہ قبروں پر گاڑ دیں۔ جب تک یہ شاخیں خشک نہ ہوں گی، تر رہیں گی اس وقت تک ان کے عذاب میں تخفیف رہے گی۔

رسول رحمت ﷺ کی دعاء سے دو مسلمان بندوں پر ہونے والے عذاب میں صرف تخفیف ہوتی ہے اور وہ بھی عارضی طور پر۔ لیکن ایک ''ولی'' کی من گھڑت دعاء سے عذاب میں مبتلا ایک عورت کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ یہ نہیں معلوم کہ اس کے عذاب کا سبب کیا تھا؟ مزید یہ کہ ''عالم برزخ'' میں اہل معصیت اور کفار و مشرکین قبروں ہی میں رہیں گے اور ان کو صبح و شام جہنم کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ قیامت تک ان کا یہی حال رہے گا اور قیامت میں حساب کتاب کے بعد ان کو جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ (یٰس: ۵۱، ۵۲، غافر: ۴۶)

حافظ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابوبکر سیوطی لکھتے ہیں:

بعض اولیاء کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک فقیہہ کی مجلس میں حاضر ہوئے جس نے ایک حدیث بیان کی۔ تو مذکورہ فقیہہ سے ولی نے کہا: یہ حدیث باطل ہے۔ اس پر فقیہہ نے اس ولی سے دریافت کیا: تم کو کہاں سے یہ معلوم ہوا؟ ولی نے جواب دیا: یہ نبی ﷺ تمہارے سر پر کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں: میں نے یہ حدیث نہیں بیان کی ہے۔ اور اس ولی نے فقیہہ پر کشف کیا تو اس نے بھی رسول اللہ ﷺ کو دیکھا......[1]

یا سبحان اللہ! فقیہہ جو شریعت کا عالم ہے اور دوسروں کو شریعت کی تعلیم دے رہا ہے وہ ایسی حدیث سے استدلال کر رہا ہے جس کے بارے میں اس کو تو یہ معلوم نہیں کہ وہ صحیح ہے یا باطل۔ اور ایک نام نہاد ولی اپنی من گھڑت ریاضتوں کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کو دیکھ لیتا ہے اور آپ اس سے یہ بھی فرماتے ہیں کہ: فقیہہ جو حدیث بیان کر رہا ہے وہ آپ نے نہیں بیان فرمائی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ صحیح حدیثوں کا یہ ذخیرہ جو شریعت کا دوسرا بنیادی ماخذ ہے اور جس کو ہزاروں علمائے حدیث نے روایت و درایت کی کسوٹی پر پرکھ کر جمع کیا ہے، اس میں سے کسی بھی حدیث کو کوئی ولی اپنے کشف کے زور پر باطل قرار دے سکتا ہے۔ اور کسی بھی باطل اور جھوٹی روایت کو جس سے ولی کی خود ساختہ عبادتوں اور ریاضتوں کی تائید ہوتی ہو صحیح قرار دے سکتا ہے۔

پھر کشف کے نام پر اس ''فریب نفس'' کو تسلیم کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے

---

[1] الحاوی للفتاوی: ص ۱۹۷، ج ۲

صرف یہ کہ زندہ ہیں بلکہ آپ مختلف جگہوں پر تشریف لے جاتے ہیں اور غیر مرئی حالت میں ہوتے ہیں۔ اس حالت میں آپ کو صرف اولیاء اللہ ہی کشف کے زور پر دیکھ سکتے ہیں۔ جبکہ قرآنی آیات میں یہ صراحت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ دوسرے سابق انبیاء اور رسولوں کی طرح وفات پا چکے ہیں اور قیامت سے پہلے اپنی قبر مبارک سے باہر نہیں نکلیں گے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا خود ارشاد ہے:

((أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَوَّلُ مَنْ يَنْشَقُّ عَنْهُ الْقَبْرُ وَأَوَّلُ شَافِعٍ وَأَوَّلُ مُشَفَّعٍ))[1]

''میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور میں پہلا شخص ہوں گا جس کی قبر کھلے گی۔ اور میں پہلا شفاعت کرنے والا ہوں گا، سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قیامت سے پہلے نبی کریم ﷺ اپنی قبر مبارک سے نہیں نکلیں گے اور اس مسئلے کو ایک عقیدہ کی حیثیت حاصل ہے۔ جس پر ائمہ حدیث وفقہ کا اجماع ہے۔ لہٰذا بیداری میں آپ کو دیکھنے کا دعویٰ اس اجماع کے خلاف ہے۔ مزید یہ کہ کوئی بھی شخص مرجانے کے بعد اس دنیا میں واپس نہیں آسکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے اور اس حکم میں انبیاء، اولیاء اور شہداء سب داخل ہیں۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ احد میں ان کے والد حضرت عبداللہ بن حرام رضی اللہ عنہ کی شہادت کے موقع پر ان سے فرمایا:

((يَا جَابِرُ! أَلَا أُخْبِرُكَ مَا قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ لِأَبِيكَ؟ قُلْتُ: بَلَى ، قَالَ: مَا كَلَّمَ اللّٰهُ أَحَدًا قَطُّ إِلَّا مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ، وَكَلَّمَ أَبَاكَ كِفَاحًا ، فَقَالَ: يَا عَبْدِي! تَمَنَّ عَلَيَّ أُعْطِكَ ، قَالَ: يَا رَبِّ! تُحْيِينِي فَأُقْتَلُ فِيكَ ثَانِيَةً۔ قَالَ: إِنَّهُ سَبَقَ مِنِّي "أَنَّهُمْ لَا يُرْجَعُونَ" (الانبياء:٩٥) قَالَ: يَا رَبِّ! فَأَبْلِغْ مَنْ وَرَائِي ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ هٰذِهِ الْآيَةَ: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا))[2]

''اے جابر! کیا میں تمہیں اس بات کی خبر نہ دوں جو اللہ عزوجل نے تمہارے باپ سے فرمائی ہے؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں، فرمایا: اللہ نے کسی شخص سے بے پردہ بات نہیں کی

---

[1] صحیح مسلم: ٢٢٧٨

[2] جامع ترمذی: ح ٣٠١٠۔ سنن ابن ماجه ١٨٧ ، ٢٨٥٠

ہے، مگر تمہارے باپ سے اس نے آمنے سامنے بات کی ہے اور فرمایا: اے میرے بندے! مجھ سے اپنی خواہش بیان کر میں تجھے وہ عطا کروں گا۔ تیرے باپ نے عرض کیا: اے میرے رب! تو مجھے زندہ کر دے تاکہ تیری راہ میں دوبارہ قتل کیا جاؤں۔ اللہ نے فرمایا: یہ تو میرا فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہ لوگ (جو مر چکے ہیں) دنیا میں واپس نہیں کیے جائیں گے۔ تیرے باپ نے عرض کیا: اے میرے رب! جو لوگ میرے پیچھے ہیں ان کو (میرے مقام بلند سے) مطلع کر دے، تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں ان کو مردہ مت سمجھو"

اس حدیث اور اُس حدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے جس میں قبروں میں انبیاء علیہم السلام کی زندگی کی خبر دی گئی ہے۔ کیونکہ قبر عالم برزخ سے عبارت ہے۔ عالم برزخ اس دنیا اور آخرت کے درمیانی مرحلے کا نام ہے۔ لہٰذا قبر میں رسول اکرم ﷺ کو جو زندگی حاصل ہے وہ برزخی زندگی ہے۔ آپ کا جسم اطہر تو مدینہ منورہ میں آپ کی قبر مبارک میں ہے اور آپ کی روح مبارک "اعلیٰ علیین" یا رفیق اعلیٰ میں ہے اور آپ پر سلام بھیجنے کے وقت آپ کے جسم اطہر میں آپ کی روح مبارک کو لوٹا دینے سے یہ قطعاً مراد نہیں ہے کہ جسم و روح کا یہ اتصال اس طرح ہو جاتا ہے جس طرح دنیاوی زندگی میں تھا۔ یا جس طرح کا اتصال قیامت کے دن ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو احادیث میں اس کی صراحت ہوتی۔ جبکہ قرآن و حدیث میں اس دنیا سے آپ کی رحلت کو "موت" سے تعبیر کیا گیا ہے اور موت اس دنیاوی زندگی کے خاتمہ کا نام ہے۔ لہٰذا حالت بیداری میں کسی شخص کا آپ کو دیکھنا محال ہے۔ کیونکہ اس کے لیے آپ کا اپنی قبر مبارک سے جسم اور روح کے ساتھ باہر نکلنا ضروری ہے۔ جبکہ اوپر جو حدیث نقل کی گئی ہے وہ یہ صراحت کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ وفات پا جانے کے بعد کوئی بھی شخص اس دنیا میں واپس نہیں آ سکتا۔

اسی طرح کسی شخص کا بحالت بیداری رسول اللہ ﷺ کو غیر مرئی شکل میں دیکھنا بھی محال ہے۔ کیونکہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ آپ اس مادی جسم سے نکل کر روحانی یا غیر مرئی وجود اختیار کرنے پر قدرت رکھتے ہیں اور یہ چیز آپ کی بشریت کے منافی ہے۔

اور اگر بفرض محال یہ مان لیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی مادی ہیئت کو بدل کر روحانی ہیئت اختیار کرنے پر قادر تھے تو پھر کسی بشر کے لیے اس حالت میں آپ کو دیکھنا ناممکن ہے۔ جس طرح کوئی بشر فرشتوں اور جنوں کو ان کی اصلی ہیئت اور شکل میں نہیں دیکھ سکتا۔ شیطانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے:

﴿ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝ ﴾ [الاعراف:٢٧]

''شیطان اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے''

اور سورۃ التوبۃ میں اللہ تعالیٰ نے غزوۂ حنین میں اپنی نصرت و تائید کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا۝ ﴾ [التوبة:٢٦]

''پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول اور مومنین پر نازل فرمائی اور ایسے لشکر نازل فرمائے جنہیں تم نے نہیں دیکھا''

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس کے رد میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ان حدیثوں کو نہیں پیش کیا جا سکتا جن میں یہ صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام کو دو بار ان کی اصلی شکل میں دیکھا ہے[1] کیونکہ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا جو آپ کے لیے خاص تھا۔ بایں معنی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے اور محبوب بندے کے اندر ایسی قدرت پیدا کر دی تھی کہ آپ روح الامین کو ان کی اس شکل میں دیکھ سکیں جس پر اس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ یہ قدرت تزکیہ نفس اور ریاضت سے نہیں پیدا کی جا سکتی۔ اسی وجہ سے ان دو بار کے علاوہ حضرت جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انسانی شکل میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح سابق انبیاء اور رسولوں کے پاس بھی فرشتے ہمیشہ انسانی شکل میں آیا کرتے تھے۔

خلاصہ کلام یہ کہ نام نہاد اولیاء اللہ کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بحالت بیداری دیکھنے کے واقعات ان کے ذہنی تخیلات اور فریب نفس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں۔

قارئین کرام! نام نہاد اولیاء اللہ کی تعبیر پر تعجب نہ کریں۔ میں یہ تعبیر کا لفظ سہواً نہیں قصداً استعمال کر رہا ہوں۔ اور اس سے میرا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اولیاء اللہ کسی مافوق البشر ہستیوں کا نام نہیں ہے جیسا کہ اوپر کے صفحات میں قرآنی آیات اور احادیث سے ثابت کیا جا چکا ہے۔ ان کو مافوق البشر ہستیوں کی

[1] صحيح بخاري: ح ٣٢٣٢، ٤٨٥٥۔ صحيح مسلم ح ٤٣٢، ٤٣٩

حیثیت ارباب تصوف نے ایک خاص عقیدے اور تصور کے تحت دی ہے۔ ورنہ اللہ کے تمام مومن اور متقی بندے اولیاء اللہ ہیں۔

ان خود ساختہ اور من گھڑت اولیاء کے بارے میں تصوف کی امہات الکتب اور فضائل اعمال کی کتابوں میں صوفیاء کے جو عقائد بیان ہوئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ: ''اولیاء اللہ'' کے ہاتھوں میں مخلوق کے امور ہیں اور وہ کائنات کے انتظام و انصرام میں تصرف کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کی مشکلات کو حل کرنے، ان کے مصائب اور آفتوں کے ازالے اور ان کو نفع و نقصان پہنچانے پر قدرت رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ''مرجانے کے بعد بھی اولیاء سے تصرفات و خوارق سرزد ہوتے ہیں[1] بلکہ اولیاء (عاشق) مرتے ہی نہیں۔[2]

''رسالہ قشیریہ'' میں ''فراست'' کے باب میں اولیاء اللہ کے کشف و کرامت کے جو واقعات درج ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ غیب کی کوئی بھی ایسی قسم نہیں ہے جس سے اولیاء اللہ مطلع نہ رہے ہوں۔ اس تناظر میں تو اللہ تعالیٰ کی صفت ''علم غیب'' بے معنی ہو جاتی ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ انبیاء کرام ﷩ کے معجزات عام طور پر اور رسول اکرم ﷺ کے معجزات خاص طور پر ان کے اختیاری فعل نہ تھے۔ بلکہ یہ معجزات وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی توفیق سے دکھاتے تھے اور اس صفت سے وہ ہمیشہ متصف نہ ہوتے تھے۔ جبکہ اولیاء اللہ کے بارے میں صوفیاء کا جو عقیدہ ہے وہ یہ کہ کشف و کرامت ان کی لازمی صفت تھی۔ اور وہ جب چاہتے کشف کے ذریعہ غیب کا پردہ چاک کر کے مخفی حقائق کا ادراک کر لیتے حتیٰ کہ دلوں میں پیدا ہونے والے خیالات و افکار، لوگوں کے مخفی اعمال اور ان سے سرزد ہونے والے گناہوں کی تعداد اور ان کے درجات تک سے واقف ہوتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ''مستعمل پانی'' کے ناپاک ہونے کا جو فتویٰ دیا تھا تو اس وجہ سے کہ ''جب وہ کسی شخص کو وضو کرتے ہوئے دیکھتے تو اس پانی میں جو گناہ ڈھلتا ہوا نظر آتا اس کو معلوم کر لیتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ کبیرہ گناہ ہے یا صغیرہ، مکروہ فعل ہے یا خلاف اولیٰ''[3]!!

دراصل اولیاء اللہ کے کشف و الہام اور ان کے دوسرے فضائل و مناقب کے باب میں صوفیاء کی مبالغہ آرائیوں بلکہ گمراہ کن عقائد کا سبب یہ ہے کہ وہ ''توحید'' کے صحیح مفہوم سے ناآشنا رہے ہیں اور ہیں۔ اکابر صوفیاء کی کتابوں اور ان کے ملفوظات کے سنجیدہ مطالعہ سے جو افسوسناک حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ کہ انہوں نے ''توحید'' کو کتاب و سنت سے سمجھنے کی بجائے اپنے ذوق، الحادی فلسفہ اور غیر مسلم

---

[1] شریعت و طریقت ص ۳۲۷ [2] فضائل اعمال: ص ج ۱ [3] فضائل اعمال: ص ۴۶۹، ج ۱

راہبوں کے اقوال سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ بسا اوقات اپنے خاص ''ترنگ'' میں آ کر بعض صوفیا نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ: قرآن تو پورے کا پورا شرک ہے اور توحید تو صرف وہ ہے جو ہم کہتے ہیں''[1]

﴿ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ﴾ بڑی سنگین بات ہے جوان کے منہ سے نکلتی ہے.....(الکہف:۵)

میں نے اولیاء اللہ اور کشف والہام کے مسئلے میں اتنی تفصیل سے اس لیے گفتگو کی ہے تاکہ یہ واضح کرسکوں کہ تصوف کی کتابوں میں اولیاء اللہ کے فضائل ومناقب اور ان کے کشف والہام سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اور اس سلسلے میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ کتاب وسنت سے ماخوذ دلائل پر مبنی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ واقعات ایک ایسی ذہنیت کے ترجمان ہیں جو اسلامی ذہنیت نہیں ہے۔ اور ان سے ایک ایسے دینی تصور کی ترجمانی ہوتی ہے جو کتاب وسنت سے ماخوذ نہیں ہے۔

مذکورہ بحث سے اس خاص عقیدے کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے جو اہل تصوف کے حلقوں میں ''نور محمدی'' کے پھیلنے اور رواج پانے کے پیچھے کارفرما رہا ہے اور میں نے اس سلسلے میں جو کچھ عرض کیا وہ کتاب وسنت کے دلائل کی زبان میں عرض کیا ہے۔ اور کسی کی تضحیک یا تجریح کی بجائے خالص اصولی بحث کی ہے۔ اس لیے کہ اس تحقیقی بحث سے میرا مقصد احقاقِ حق اور ابطال باطل کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

لوح محفوظ:

۱۷۶......إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ لَوْحًا مَحْفُوظًا مِنْ دُرَّةٍ بَيْضَاءَ، صَفْحَاتُهَا مِنْ يَاقُوتَةٍ حَمْرَاءَ قَلَمُهُ نُورٌ وَكِتَابُهُ نُورٌ، لِلَّهِ فِيهِ فِي كُلِّ يَوْمٍ سِتُّونَ وَثَلَثمِائَةِ لَحْظَةٍ، يَخْلُقُ وَيَرْزُقُ وَيُمِيتُ وَيُحْيِي وَيُعِزُّ وَيُذِلُّ وَيَفْعَلُ مَا يَشَاءُ۔

''بے شک اللہ نے لوح محفوظ کو سفید موتی سے بنایا ہے۔ اس کے صفحات سرخ یاقوت کے ہیں۔ اس کا قلم بھی نور ہے اور اس کی کتابت بھی نور ہے۔ اس لوح محفوظ میں اللہ تعالیٰ ہر دن تین سو ساٹھ بار نظر ڈالتا ہے اور وہ تخلیق فرماتا ہے، رزق عطا کرتا ہے، مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے۔ عزت اور ذلت دیتا ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے''

یہ ایک ضعیف روایت ہے جو غیبی امور کے بارے میں قابل استدلال نہیں ہے۔ اس کی تخریج حافظ طبرانی نے المعجم الکبیر[2] میں کی ہے۔ اس کی سند میں زیاد بن عبداللہ بکائی اور لیث بن ابوسلیم دو راوی

[1] مدارج السالكين: ص ٤٠٧، ج٣ [2] ص ١٦٥، ج٣
[3] ص ٨٨، ج٣

شامل ہیں اور دونوں ضعیف ہیں۔ حافظ طبرانی نے یہ روایت مذکورہ کتاب میں ایک دوسری سند سے بھی روایت کی ہے[1] جو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے۔ اس موقوف روایت کی سند کے تمام راوی، بکیر بن شہاب کے سوا ثقہ ہیں۔ بکیر کا ذکر امام ابوحاتم نے "شیخ" کے لقب سے کیا ہے جو ضعیف کا ہم معنی ہے۔ اگرچہ امام ابن حبان نے بکیر بن شہاب کا ذکر اپنی کتاب "الثقات"[2] میں کیا ہے لیکن تنہا ابن حبان کی توثیق قابل اعتبار نہیں ہے جیسا کہ ائمہ حدیث نے تصریح کی ہے۔

اس روایت کو حافظ سیوطی نے الجامع الصغیر[3] میں اور علامہ ابن ابی العز نے "شرح العقیدۃ الطحاویہ"[4] میں نقل کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی "البدایہ والنہایہ"[5] میں یہ روایت نقل کی ہے مگر اس کی صحت وسقم پر کوئی حکم نہیں لگایا۔ پھر ایک روایت ابن عباس سے موقوفاً بھی نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اسحاق بن بشر کہتے ہیں: مجھے مقاتل اور ابن جریج نے مجاہد سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے خبر دی کہ ابن عباس نے فرمایا: لوح محفوظ کے بیچ میں لکھا ہوا ہے:

((لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ، دِينُهُ الْإِسْلَامُ، وَمُحَمَّدٌ عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ))

"نہیں ہے کوئی معبود برحق مگر تنہا اللہ، اس کا دین اسلام ہے۔ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں"

جو اللہ پر ایمان لایا اور جس نے اس کے وعدے کو سچ مانا اور اللہ کے رسولوں کی اتباع کی تو وہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: لوح سفید موتی کی ایک تختی ہے جس کی لمبائی آسمان اور زمین کے درمیان پائی جانے والی مسافت کے برابر اور اس کی چوڑائی مشرق ومغرب کے درمیان پائی جانے والی مسافت کے برابر ہے۔ لوح کے دونوں کنارے موتیوں اور یاقوت کے ہیں۔ اور اس کی جلد سرخ یاقوت کی ہے۔ اس کا قلم نور ہے اور اس کا کلام عرش کے ساتھ مربوط ہے۔ اس کی اصل ایک فرشتے کی حفاظت میں ہے۔

حافظ ابن کثیر نے مزید لکھا ہے: حضرت انس رضی اللہ عنہ اور دوسرے علمائے سلف کا قول ہے: لوح محفوظ اسرافیل کی پیشانی پر ہے۔[5]

---

[1] ص ۳۲، ج ۲ [2] ح ۱۶۰۸ [3] ص ۲۶۳
[4] ص ۱۷، ج ۱ [5] البدایہ والنہایہ ص ۱۷، ج ۱

لہٰذا مذکورہ روایات اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔ کیونکہ کسی بھی روایت کی نسبت نبی مکرم ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ یعنی کوئی روایت مرفوع نہیں ہے۔

مزید یہ کہ عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مجاہد اور دوسرے تابعین کے واسطوں سے جو روایتیں نقل کی ہیں ان میں انہوں نے صحت روایت کا اہتمام نہیں کیا ہے۔ بلکہ جو کچھ ان کو ملا اس کی روایت کر دی۔ یہی حال مقاتل بن سلیمان کا بھی ہے۔ محدثین کے نزدیک وہ ضعیف بھی ہیں۔[1]

ایک اور روایت امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے:

((إِنَّ اللَّوْحَ الْمَحْفُوْظَ الَّذِي ذَكَرَ اللّٰهُ ﴿ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴾ [البروج: ٢١، ٢٢] فِي جَبْهَةِ إِسْرَافِيْلَ))[2]

''بے شک وہ لوح محفوظ جس کا ذکر اللہ نے اپنے قول میں کیا ہے: بلکہ یہ بلند پایہ قرآن ہے جو لوح محفوظ میں ثبت ہے'' اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی میں ہے''

تو یہ روایت بھی منکر ہے۔ اس کی تخریج امام طبری نے قرۃ بن سلیمان کی سند سے کی ہے۔ ہم سے حرب بن سریج نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالعزیز بن صہیب نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔

امام ابو محمد عبدالرحمٰن رحمہ اللہ بن امام ابو حاتم محمد بن ادریس الرازی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب ''علل الحدیث'' میں لکھا ہے: میں نے اپنے والد سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا جس کو عمرو بن علی نے قرہ بن سلیمان ازدی سے، انہوں نے حرب بن سریج سے، انہوں نے عبدالعزیز بن صہیب سے اور انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴾ کے بارے میں روایت کیا اور بیان کیا ہے کہ لوح محفوظ حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر ثبت ایک تختی کا نام ہے تو میرے والد نے فرمایا: یہ حدیث منکر ہے۔ قرہ مجہول اور ضعیف الحدیث ہے۔[3]

ابن ابی حاتم نے اپنی کتاب ''الجراح والتعدیل'' میں لکھا ہے: قرہ بن سلیمان جہضمی، حماد بن زید کا

---

1. الاتقان ص ٤٧١، ج ٢
2. تفسیر طبری ص ٩٠، ج ٣
3. ص ٣١٤، ج ٣

ہم نشین تھا۔ اس نے ہشام بن حسان اور معاویہ بن صالح سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ اس سے ابوالولید طیالسی اور عمرو بن علی نے۔ میرے والد نے اس کو ضعیف الحدیث قرار دیا ہے۔[1]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے "تقریب التہذیب" میں لکھا ہے: قرہ سچا تھا لیکن روایت حدیث میں غلطیاں کرتا تھا"[2] حافظ ابن کثیر نے بھی اپنی تفسیر میں یہ روایت نقل کی ہے لیکن اس کی صحت و سقم کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔[3]

حافظ ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کی سند سے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے:

ہم سے معاویہ بن صالح نے بیان کیا کہ ابوالاعیس (عبدالرحمٰن بن سلمان) نے کہا:

۱۷۷ ...... مَا مِنْ شَيْئٍ قَضَى اللّٰهُ، اَلْقُرْآنَ فَمَا قَبْلَهُ وَمَا بَعْدَهُ إِلَّا وَهُوَ فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ وَاللَّوْحُ الْمَحْفُوْظُ بَيْنَ عَيْنَي إِسْرَافِيْلَ لَا يُؤْذَنُ لَهُ بِالنَّظَرِ فِيْهِ۔

"اللہ نے قرآن سے پہلے اور قرآن کے بعد جس چیز کا بھی فیصلہ کیا ہے وہ لوح محفوظ میں درج ہے اور لوح محفوظ اسرافیل کی دونوں آنکھوں کے درمیان ہے۔ ان کو اس پر نظر ڈالنے کی اجازت نہیں ہے"

یہ روایت اولاً تو مقطوع ہے۔ تابعی کے قول یا فعل کو مقطوع کہتے ہیں۔ ثانیاً ابوالاعیس عبدالرحمٰن بن سلمان سے اس کی روایت کرنے والے معاویہ بن صالح، امام لیث بن سعد کے کاتب تھے اور حافظے کے اعتبار سے ضعیف تھے۔ رہے ابوالاعیس عبدالرحمٰن بن سلمان تو ان کی توثیق امام ابن حبان کے علاوہ کسی اور نے نہیں کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں ان کی جرح و تعدیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا اور ابن حبان کے قول کا حوالہ دینے پر اکتفا کیا ہے[4] اور کسی راوی کے بارے میں تنہا ابن حبان کی توثیق اس کی ثقاہت کے لیے کافی نہیں ہے۔ اگر ان روایتوں کی سندیں صحیح بھی ہوتیں تب بھی غیبی امور کے بارے میں موقوف اور مقطوع روایتوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

حافظ ابوجعفر محمد بن الصباح البزار الدولابی نے کتاب الکنی میں لوح محفوظ کے بارے میں مزید

---

[1] الجرح والتعدیل: ص ۱۳۱، ج ۳
[2] ص ۹۵ ترجمہ ۱۱٦٤
[3] ص ٦۲٦ ج ۳
[4] ص ۲۸۳، ترجمہ: ۳۸۸۳

موقوف روایات نقل کی ہیں[1] مگر انہوں نے اس سلسلے میں ایک بھی مرفوع حدیث نقل نہیں کی ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ لوح محفوظ کے بارے میں کوئی بھی روایت مرفوع نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ لوح محفوظ کے بارے میں تفسیر یا حدیث کی کتابوں میں جو تفصیلات ملتی ہیں وہ نا قابل اعتماد اور نا قابل استدلال ہیں۔ لہٰذا عرش و کرسی کی طرح اس پر ایمان رکھنا بھی اسی صورت میں واجب ہے جس شکل میں کتاب و سنت میں اس کا ذکر آیا ہے۔

عقیدۂ طحاویہ میں ہے:

((نُؤْمِنُ بِاللَّوْحِ وَالْقَلَمِ وَبِجَمِيعِ مَا فِيهِ قَدْ رَقَمَ))

''ہم لوح و قلم اور اللہ نے اس میں جو کچھ رقم فرمایا ہے ان پر ایمان رکھتے ہیں''[2]

روح کی حقیقت:

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر روح کا ذکر آیا ہے اور اس کا اطلاق متعدد اشیاء پر کیا گیا ہے۔ کہیں روح سے مراد قرآن پاک ہے تو کہیں عام وحی۔ اسی طرح کہیں روح بول کر حضرت جبریل علیہ السلام مراد لیے گئے ہیں تو کہیں اس کا اطلاق اس چیز پر کیا گیا ہے جس کو اردو میں ''جان'' کہتے ہیں۔ یعنی جس کے ذریعہ جاندار مخلوق زندہ رہتی ہے اور جسم سے جس کے نکل جانے سے موت طاری ہو جاتی ہے۔ ہر جگہ سیاق و سباق سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ روح سے کیا مراد ہے۔

پھر جسم سے روح کے نکلنے کے بھی مختلف درجات ہیں۔ نیند کی حالت میں بھی روح جسم سے کسی نہ کسی شکل میں نکل جاتی ہے مگر جسم کے ساتھ اس کا ایک طرح کا رشتہ باقی رہتا ہے۔ اسی وجہ سے جسم کے اعضائے رئیسہ کام کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن موت کے وقت روح مکمل طور پر جسم کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور اس کے تمام اعضاء معطل ہو جاتے ہیں لیکن خود روح نہیں مرتی۔

قبر یعنی عالم برزخ میں جسم کے ساتھ روح کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ قبر میں انسان جس ثواب یا عذاب سے دو چار ہوتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے اس میں اتنی حس پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ثواب یا عذاب کو محسوس کر سکے اگر چہ اس دنیا میں بسنے والے نہ تو قبر میں مردوں کے احوال کو محسوس کرتے ہیں اور نہ کسی کو ان کے احوال کی حقیقت کا علم ہی حاصل ہے۔ جس شکل میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں اور رسول اکرم ﷺ نے اپنے ارشادات میں اہل قبور کے ثواب یا عذاب

[1] ص ١١٨، ج ١

[2] ص ١٦۔ شرح العقیدۃ الطحاویۃ: ص ٢٦٣

کی خبر دے دی ہے اس پر اسی شکل میں ایمان رکھنا ضروری ہے۔

روح سراسر ایک ایسے غیبی وجود سے عبارت ہے جس کی حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ انبیاء، اولیاء اور فرشتوں کو بھی نہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ طقُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَ مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [الاسراء:۸۵]

''اے نبی! لوگ تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تم لوگوں کو بہت معمولی علم دیا گیا ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں روح سے مراد...... روح نبوت اور وحی ہے یا روح حیات؟ جس کو جان کہتے ہیں یہ میرا موضوع نہیں ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کی طرح صحیح احادیث میں بھی روح کی کوئی تفصیل نہیں بیان ہوئی۔ مثلاً روح فانی ہے یا غیر فانی؟ اس کی تخلیق کب ہوئی اور اس کی حقیقت اور ماہیت کیا ہے؟

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: ایک موقع پر میں نبی مکرم ﷺ کے ساتھ ایک کھیت یا نخلستان میں تھا اور آپ کھجور کی ایک ٹہنی پر ٹیک لگائے ہوئے تھے کہ اتنے میں کچھ یہودی وہاں سے گزرے۔ انہوں نے آپس میں کہا: ان سے روح کے بارے میں سوال کرو۔ ان میں سے ایک نے کہا: تم لوگوں کو اس کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟ دوسرے نے کہا: وہ (نبی ﷺ) تمہیں کوئی ایسی چیز نہیں بتائیں گے جو تمہیں ناپسند ہو۔ پھر انہوں نے کہا: ان سے دریافت تو کرو۔ لہٰذا انہوں نے آپ سے روح کے بارے میں پوچھا۔ نبی معظم ﷺ ان کا سوال سن کر خاموش رہے اور ان کو کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر میں سمجھ گیا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ لہٰذا میں اپنی جگہ کھڑا رہا اور جب وحی نازل ہو چکی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

﴿ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَ مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾[1]

لیکن دین کے دوسرے شعبوں کی طرح وضاعینِ حدیث نے اس غیبی شعبے کو بھی نہیں بخشا۔ اس باب میں جہاں انہوں نے خود حدیثیں گھڑ کر لوگوں میں پھیلائی ہیں وہیں اسرائیلی روایات سے بھی اس شعبے

[1] صحیح بخاری: ح ۱۲۵، ۴۷۲۱۔ صحیح مسلم: ۲۷۹۴۔ ترمذی ۳۰۶۶۔ مسند امام احمد ۳۶۸۸

کو گندا کیا ہے۔

امام ابن الجوزی فرماتے ہیں: ہم کو محمد بن ناصر نے خبر دی، کہا: ہم کو مبارک بن عبدالجبار نے خبر دی، کہا: ہم کو عبدالباقی بن احمد نے خبر دی، کہا: ہم کو محمد بن جعفر بن علان نے خبر دی، کہا: ہم کو ابوالفتح ازدی حافظ نے خبر دی، کہا: ہم سے ہاشم بن نصیر نے بیان کیا، کہا: ہم سے شیبان بن محمد نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبداللہ بن ایوب بن ابی علاج نے بیان کیا، کہا: مجھ سے میرے باپ نے ابوجعفر محمد بن علی بن حسین سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ان کے دادا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

۱۷۸ ...... إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ خَلَقَ الْأَرْوَاحَ قَبْلَ الْأَجْسَادِ بِأَلْفَي عَامٍ، ثُمَّ جَعَلَهَا تَحْتَ الْعَرْشِ، ثُمَّ أَمَرَهَا بِالطَّاعَةِ لِي، فَأَوَّلُ رُوْحٍ سَلَّمَتْ عَلَيَّ رُوْحُ عَلِيٍّ۔

"بے شک اللہ عزوجل نے روحوں کو جسموں سے دو ہزار سال قبل پیدا کیا، پھر ان کو عرش کے نیچے رکھ دیا، پھر ان کو یہ حکم دیا کہ وہ میری اطاعت کریں۔ پس جس پہلی روح نے مجھے سلام کیا وہ علی کی روح ہے"

یہ روایت جھوٹ ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہے:

امام ابن الجوزی رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: حافظ ابوالفتح ازدی نے عبداللہ بن ایوب اور اس کے باپ ایوب بن ابی علاج کو جھوٹا قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ ان دونوں سے حدیثوں کی روایت جائز نہیں ہے۔ حافظ سیوطی اور ابن عراق نے اس روایت کے موضوع ہونے میں امام ابن الجوزی کی تائید کی ہے۔[1]

۱۷۹ ...... إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الرُّوْحُ۔

"بے شک اللہ نے جو پہلی چیز پیدا کی وہ روح ہے"

یہ روایت بھی باطل اور جھوٹ ہے جس کا ذکر ائمہ حدیث میں سے کسی نے اپنی کتاب میں نہیں۔ اور متاخرین میں صرف علامہ ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی نے اس کو اپنی کتاب الآثار المرفوعة فی الاخبار

---

[1] الموضوعات: ص ۱۹۰، ج ۲، ح ۷٤۷۔ اللآلی المصنوعة: ص ۳٤۹، ج۱۔ تنزیه الشریعة: ص ۳٦۸، ج۲، ح ۸۱

الموضوعہ میں درج کیا ہے۔[1]

١٨٠......اَلْأَرْوَاحُ فِي خَمْسَةِ أَجْنَاسٍ: فِي الْإِنْسِ وَالْجِنِّ وَالشَّيَاطِيْنِ وَالْمَلَائِكَةِ، وَالرُّوْحِ وَسَائِرُ الْخَلْقِ لَهَا أَنْفَاسٌ وَلَيْسَتْ لَهَا أَرْوَاحٌ۔

''مخلوقات کی پانچ قسموں اور صنفوں میں روح پائی جاتی ہے: انسانوں، جنوں، شیطانوں، فرشتوں اور روحوں میں۔ رہیں بقیہ مخلوقات؟ ان میں سانس تو ہوتی ہے روح نہیں ہوتی۔''

یہ روایت بھی جھوٹ ہے۔ اس روایت کی سند کے ایک راوی صالح بن حیان کو امام نسائی نے غیر ثقہ قرار دیا ہے۔[2] اور امام ابو حاتم نے لکھا ہے کہ صالح بن حیان ثقہ راویوں کے نام سے ایسی حدیثیں روایت کیا کرتا تھا جو ثقہ راویوں کی روایت کردہ حدیثوں کی طرح نہیں ہوتی تھیں۔[3]

عجیب بات یہ ہے کہ اس جھوٹی روایت میں جنوں اور شیطانوں کو الگ الگ صنف قرار دیا گیا ہے جبکہ دونوں ایک ہی ہیں۔ اسی طرح اس روایت میں حیوانوں کو ذی روح میں نہیں شمار کیا گیا ہے جبکہ صحیح حدیث میں حیوانوں کو ذی روح قرار دیا گیا ہے:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا تَتَّخِذُوْا شَيْئًا فِيْهِ الرُّوْحُ غَرَضًا))[4]

''ایسی کسی چیز کو نشانہ مت بناؤ جس میں روح ہو''

اور حضرت سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ایسے لوگوں کے پاس سے گزر ہوا جنہوں نے ایک مرغی کو نشانہ بنا رکھا تھا اور اس پر تیر اندازی کر رہے تھے۔ جب انہوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ نشانہ بازی کرنے والے کون ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے والوں پر لعنت بھیجی ہے۔[5]

---

[1] حدیث نمبر ٤٣ [2] الضعفاء والمتروکین: ص ٥٧، ح ٢٩٠

[3] کتاب المجروحین: ص ٣٦٥، ج١۔ الموضوعات ص ٢٣٠، ج ١، ح ٣١٤۔ تنزیہ الشریعہ ص ١٧٠، ج١، ح٤۔ اللالی المصنوعہ: ص ٨٩ ج١۔ الاباطیل والمناکیر ح ٤٣٣۔ الفوائد المجموعۃ: ح ١٣٢٣

[4] صحیح مسلم ح ١٩٥٧ (٥٠٥٩)

[5] صحیح مسلم ح ١٩٥٨ (٥٠٦١)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ حیوانوں میں روح ہوتی ہے کیونکہ مرغی حیوانوں ہی کی ایک قسم ہے۔

شفق کی حقیقت:

جب سورج غروب ہوتا ہے تو اپنے پیچھے افق پر سرخ رنگ چھوڑ جاتا ہے جو تقریباً ایک گھنٹے میں ختم اور معدوم ہوتا ہے۔ اس سرخی کو عربی میں شفق کہتے ہیں۔ سورۃ الانشقاق میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝ ﴾ [الانشقاق:١٦، ١٧]

''نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے''

حدیثیں وضع کرنے والوں نے اس سرخی یعنی شفق کے بارے میں بھی حدیثیں گھڑ کر لوگوں میں پھیلا دی ہیں۔ چنانچہ تفسیر کی کتابوں میں بعض روایتیں ان الفاظ میں ملتی ہیں:

١٨١ ...... اَلْحُمْرَةُ الَّتِي فِي السَّمَاءِ مِنْ عَرَقِ الْأَفْعَى الَّتِي تَحْتَ الْعَرْشِ۔

''آسمان میں جو سرخی ہوتی ہے وہ اس سانپ کے پسینے سے پیدا ہوتی ہے جو عرش کے نیچے ہے''

یہ ایک باطل اور بے اصل روایت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد نہیں ہے۔ اس کا ذکر صرف شیخ شمس الدین محمد بن خلیل طرابلسی نے، جو قاوقجی کے لقب سے معروف تھے، اپنی کتاب ''اللُّؤْلُؤُ الْمَرْصُوعِ فِيمَا لَا أَصْلَ لَهُ أَوْ بِأَصْلِهِ مَوْضُوعٌ'' میں کیا ہے۔[1]

اس باطل روایت میں پہلا دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ شفق کی سرخی سانپ کے پسینے کا نتیجہ ہے۔ اور دوسرا دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ عرش کے نیچے سانپ ہے۔ ''افعی'' ایک نہایت ہی زہریلے خبیث سانپ کو کہتے ہیں جس کا رنگ ''چتکبرا'' ہوتا ہے۔

ایک دوسری روایت حافظ جلال الدین سیوطی نے الجامع الصغیر میں ان الفاظ میں نقل کی ہے:

١٨٢ ...... اَلْحُمْرَةُ مِنْ زِينَةِ الشَّيْطَانِ۔[2]

''آسمان کی سرخی شیطان کی زینت سے پیدا ہوتی ہے''

یہ روایت مرسل بھی ہے اور ضعیف بھی۔

مذکورہ دونوں روایتیں اسرائیلات سے ماخوذ معلوم ہوتی ہیں۔

کہکشاں کی حقیقت:

رات میں اگر آسمان صاف ہو تو وسط آسمان میں بے شمار چھوٹے بڑے تاروں کے مجموعے سے

---

[1] ح ١٧٩ [2] ضعيف الجامع الصغير: ح ٢٧٢٩

ایک شاہراہ سی بنی ہوئی نظر آتی ہے جس کو عربی میں "المجرّۃ" اور اردو میں کہکشاں کہتے ہیں۔

اوپر دو ایسی باطل روایتیں نقل کی گئی ہیں جن میں سے ایک شفق کی سرخی کو عرش کے نیچے پائے جانے والے سانپ کے پسینے کا اور دوسری میں شیطان کی زینت کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

جبکہ بعض موضوع اور جھوٹی روایتوں میں کہکشاں کو عرش کے نیچے پائے جانے والے سانپ کے پسینے کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے:

۱۸۳ ...... اَلْمَجَرَّةُ الَّتِي فِي السَّمَاءِ عَرَقُ الْحَيَّةِ الَّتِي تَحْتَ الْعَرْشِ۔

"آسمان میں کہکشاں اس سانپ کا پسینہ ہے جو عرش کے نیچے ہے"

یہ روایت باطل ہے۔ اس کی تخریج حافظ سیوطی نے اللآلی المصنوعۃ میں کی ہے۔[1] انہوں نے ایک اور روایت حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی نقل کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

جب رسول اللہ ﷺ نے مجھے یمن روانہ فرمایا تو مجھ سے فرمایا:

((إِنَّكَ تَأْتِي قَوْمًا أَهْلَ الْكِتَابِ: فَإِنْ سَأَلُوْكَ عَنِ الْمَجَرَّةِ، فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهَا مِنْ عَرَقِ الْأَفْعَى الَّتِي تَحْتَ الْعَرْشِ))

"تم وہاں اہل کتاب کے پاس جاؤ گے۔ لہٰذا اگر وہ تم سے کہکشاں کے بارے میں سوال کریں تو انہیں بتانا کہ وہ اس سانپ کے پسینے سے بنی ہے جو عرش کے نیچے ہے"

یہ روایت نقل کرنے کے بعد حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

حافظ طبرانی نے یہ روایت عبد الاعلیٰ بن حکیم کے ترجمہ کے ضمن میں نقل کی ہے اور لکھا ہے: یہ محفوظ نہیں ہے (یعنی شاذ ہے)۔ عبد الاعلیٰ مجہول ہے۔ سند کا دوسرا راوی: ابوبکر بن ابی سبرہ متروک ہے اور اس کی سند کا تیسرا راوی: سلیمان بن شاذ کونی بھی متروک ہے۔

اور حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں اس روایت کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی سند تاریک ہے اور متن صحیح نہیں ہے۔

اس زیر بحث روایت کی جو سند حافظ طبرانی نے بیان کی ہے وہ یہ ہے:

ہم سے محمد بن ابوزرعہ نے بیان کیا۔ کہا: ہم سے ہشام بن عمار نے بیان کیا۔ کہا: ہم سے عبداللہ بن یزید نے بیان کیا۔ کہا: ہم سے شعیب بن ابی حمزہ نے، عبد الاعلیٰ بن ابی حمزہ سے، انہوں نے عبادۃ بن نسی

[1] ص ۷۸، ج ۱

سے، انہوں نے عبدالرحمٰن بن غنم سے اور انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

((اَلْمَجَرَّةُ الَّتِي فِي السَّمَاءِ عَرَقُ الْحَيَّةِ الَّتِي تَحْتَ الْعَرْشِ))

حافظ طبرانی لکھتے ہیں:

یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے صرف اسی سند سے مروی ہے جس کی روایت میں ہشام بن عمار منفرد ہیں۔[1] ہشام بن عمار اگرچہ امام بخاری کے شیوخ میں شمار ہوتے ہیں لیکن ان کی ثقاہت مختلف فیہ ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہشام بن عمار بن نصیر سلمی دمشقی سچے تھے۔ جب سن رسیدہ ہوگئے تو جیسا ان کو بتایا جاتا اسی طرح روایت کرنے لگتے۔ ان کی روایت کردہ قدیم حدیثیں صحیح ہیں''[2]

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ہشام بن عمار صحیح بخاری کے راویوں میں سے ہونے اور سچے ہونے کے باوجود حافظہ کے کمزور تھے جس کی وجہ سے ناقابل استدلال تھے۔[3]

لہٰذا غیبی امور کے بارے میں یہ روایت مردود ہے۔ کیونکہ ضعیف الاسناد ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے متن سے اسرائیلیات کی بو بھی آتی ہے۔

۱۸٤...... يَا مُعَاذُ إِنِّي مُرْسِلُكَ إِلَى قَوْمٍ أَهْلِ الْكِتَابِ فَإِذَا سُئِلْتَ عَنِ الْمَجَرَّةِ الَّتِي فِي السَّمَاءِ فَقُلْ: هِيَ لُعَابُ حَيَّةٍ تَحْتَ الْعَرْشِ۔

''اے معاذ! میں تم کو اہل کتاب کی قوم میں بھیج رہا ہوں۔ اگر تم سے کہکشاں کے بارے میں پوچھا جائے تو کہنا: یہ اس سانپ کا لعاب ہے جو عرش کے نیچے ہے''

حافظ سیوطی نے لکھا ہے: یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی سند کا ایک راوی: فضل بن مختار ''منکر الحدیث'' تھا۔[4]

---

[1] المعجم الاوسط: ص ۳۸۹۔ ۳۹۰، ج ۷، ح: ٦٧٥٦

[2] تقریب التھذیب: ص ٥٠٤۔ ترجمہ: ۷۳۰۳

[3] معجم اسامی الرواۃ: ص ۳۲۱، ج ٤

[4] اللآلی المصنوعۃ: ص ۷۹، ج ۱

۱۸۵ ...... إِنَّ الْعَرْشَ لَمُطَوَّقٌ بِحَيَّةٍ۔

''عرش ایک سانپ سے گھیرا ہوا ہے یا عرش کے گرد سانپ طوق کی مانند لپٹا ہوا ہے''

یہ اسرائیلی روایت ہے اس کی تخریج سیوطی نے جس سند سے کی ہے وہ درج ذیل ہے:

ہم سے محمد بن اسحاق بن راہویہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے میرے والد نے بیان کیا۔ کہا: ہم کو معاذ بن ہشام نے خبر دی۔ کہا: مجھ سے ابوقتادہ نے کثیر بن ابی کثیر سے، انہوں نے ابوعیاض سے، اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔

ابوالحسن علی بن محمد بن عراق نے ''تنزیهه الشریعه'' میں یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

اس کے راوی ثقہ ہیں۔[1]

لیکن ''تنزیه الشریعه'' کے محققین، عبدالوہاب عبداللطیف اور عبداللہ محمد صدیق نے اس کی تعقیب کرتے ہوئے لکھا ہے:

اس کا تعلق اسرائیلیات سے ہے۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کثرت سے اسرائیلی روایات بیان کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نسبت باطل ہے۔

یہ روایت موقوف بھی ہے جس سے اس کی نکارت مزید بڑھ جاتی ہے۔

درحقیقت کہکشاں ہو یا سورج اور چاند...... ان کی تخلیق غیبی امور سے تعلق رکھتی ہے جن کے بارے میں کوئی بھی روایت صرف اسی صورت میں قابل قبول ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نسبت صحیح ہو۔ اس باب میں بعض صحابہ کرام کی موقوف روایات یا تابعین کے اقوال (مقطوعات) قابل قبول نہیں ہیں۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں بہت سی روایات صحابہ کرام کی نسبت سے ایسی منقول ہیں جن کا تعلق اسرائیلیات سے ہے۔

فرشتوں کی حقیقت:

فرشتوں کا تعلق بھی غیبی امور سے ہے اور وہ غیر مرئی مخلوق ہیں۔ ان کی تخلیق ''نور'' سے ہوئی ہے:

((خُلِقَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ نُورٍ، وَخُلِقَ الْجَانُّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ وَخُلِقَ آدَمُ مِمَّا وُصِفَ لَكُمْ))[2]

---

[1] ص ۱۹۱ ج ۱، ح ۳۹

[2] صحیح مسلم: ح ۷۴۹۵ (۲۹۹۶)

''فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں اور جن آگ کی لپٹ سے اور آدم اس مادے سے پیدا کیے گئے ہیں جو تم سے بیان کیا جا چکا ہے''

لہٰذا فرشتوں کے بارے میں صرف وہی تفصیلات صحیح اور قابل اعتبار ہیں جو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں بیان کر دی گئی ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک میں فرشتوں کی جو عمومی صفات بیان ہوئی ہیں وہ یہ کہ: وہ اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرماں بردار بندے ہیں اور ہر حال میں اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں:

﴿ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴾ [الانبياء:٢٧]

''وہ اللہ کے حضور بڑھ کر نہیں بولتے اور اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں''

﴿ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴾ [التحريم:٦]

''وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور انہیں جو حکم دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں''

فرشتوں کی ذات غرور و تکبر سے پاک ہے اور وہ دن رات اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی بڑائی بیان کرنے میں لگے رہتے ہیں۔''

﴿ وَ مَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ لَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ٥ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴾ [الانبياء:١٩، ٢٠]

''اللہ کے پاس جو فرشتے ہیں وہ تکبر میں آ کر اللہ کی عبادت سے سرتابی نہیں کرتے اور نہ عبادت سے تھکتے ہیں۔ وہ رات دن بلا توقف اللہ کی تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں''

اوپر جو صفات بیان ہوئی ہیں ان سے تمام فرشتے موصوف ہیں۔ البتہ قرآن پاک میں اور احادیث میں حضرت جبریل علیہ السلام کی متعدد مزید صفات بیان ہوئی ہیں: مثلاً الروح الامین، روح القدوس، شدید القویٰ وغیرہ۔

اور صحیح مسلم میں ہے کہ جب حضرت مسروق بن اجدع رحمہ اللہ نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے قرآن پاک کی ان آیتوں ''وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ'' اور نبی نے اس کو روشن افق پر دیکھا۔ (التکویر: ٢٣) اور ''وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى'' (النجم: ١٣) ''اور اس نے اس کو ایک بار اور اترتے ہوئے دیکھا۔'' کے بارے میں پوچھا کہ ان آیتوں میں کس کا دیکھنا مراد ہے؟ تو ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

((اَنَا اَوَّلُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ سَاَلَ عَنْ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،

فَقَالَ: إِنَّمَا هُوَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ۔ لَمْ أَرَهُ صُوْرَتِهِ الَّتِي خُلِقَ عَلَيْهَا غَيْرَ هَاتَيْنِ الْمَرَّتَيْنِ، رَأَيْتُهُ مُنْهَبِطًا مِنَ السَّمَاءِ، سَادًّا عِظَمُ خَلْقِهِ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ))[1]

''اس امت میں سب سے پہلے میں نے ہی رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ تو آپ نے فرمایا: وہ تو جبریل علیہ السلام تھے جن کو میں نے اس اصلی صورت میں جس پر اللہ نے ان پیدا کیا ہے، ان دو موقعوں (ابتداء بعثت اور معراج) کے سوا کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے ان کو آسمان سے اس طرح اترتے دیکھا کہ ان کی عظیم ہستی آسمان سے زمین تک چھائی ہوئی تھی''

لہٰذا فرشتوں کی تخلیق، ان کی قدرت وتوانائی اور ان کے اوصاف اور اعمال کا تعلق غیبات سے ہے جن کی حقیقت تک ہمارے علم کی رسائی نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات میں ان کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں صرف انہی پر اکتفا کرنا لازمی ہے۔ مزید تفصیلات جاننے کا نہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہے اور نہ اس کا کوئی اعتبار ہے۔

مذکورہ وضاحتوں کی روشنی میں تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں فرشتوں سے متعلق جو روایات بیان ہوئی ہیں وہ مردود ہیں۔ مثلاً:

۱۸۶ ......أَتَانِي مَلَكٌ بِرِسَالَةٍ مِنَ اللّٰهِ تَعَالَى، ثُمَّ رَفَعَ رِجْلَهُ فَوَضَعَهَا فَوْقَ السَّمَآءِ وَالْأُخْرَى فِي الْأَرْضِ لَمْ يَرْفَعْهَا۔

''میرے پاس ایک فرشتہ اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر آیا۔ پھر اس نے اپنا پیر اٹھا کر آسمان پر رکھا درآنحالیکہ دوسرا پیر زمین ہی پر تھا جس کو اس نے نہیں اٹھایا''

یہ روایت اگرچہ موضوع تو نہیں ہے لیکن بے حد ضعیف ہے۔ اس کی تخریج امام ابن عدی نے الکامل[2] میں الثعلبی نے اپنی تفسیر میں[3] الواحدی نے الوسیط[4] میں، سیوطی نے الجامع الصغیر[5] میں اور محمد بن طاہر بن علی مقدسی ظاہری نے ذخیرہ الحفاظ[6] میں کی ہے جس کی سند درج ذیل ہے:

صدقہ بن عبداللہ سے روایت ہے، وہ موسیٰ بن عقبہ سے روایت کرتے ہیں، وہ اعرج سے اور وہ

---

[1] ح ۴۳۹ (۲۸۶) [2] ص ۲۰۱، ج ۱ [3] ص ۸۴، ج ۴

[4] ص ۱۹۹، ج ۳ [5] ضعیف الجامع: ح ۸۱ [6] ذخیرۃ الحافظ ح ۶۸

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا......

محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صدقہ بن عبداللہ کی وجہ سے یہ حدیث ضعیف ہے۔[1] حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں اس کو ضعیف لکھا ہے۔[2] امام ذہبی نے الضعفاء میں لکھا ہے کہ امام احمد اور امام بخاری نے اس کو بے حد ضعیف لکھا ہے۔[3]

یہاں یہ واضح رہے کہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں اللہ کا پیغام لے کر ہمیشہ حضرت جبریل علیہ السلام آیا کرتے تھے اور اوپر صحیح مسلم کی وہ حدیث پیش کی جا چکی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو رسول اللہ ﷺ نے صرف دو باران کی اصلی شکل میں دیکھا ہے۔ ورنہ وہ آپ کی خدمت میں انسانی شکل میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

البتہ غزوۂ بدر میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ○ ﴾ [الانفال:٩]

''اس وقت کو یاد کرو جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے۔ تو اس نے تمہاری فریاد یہ کہہ کر قبول فرمائی کہ میں تمہاری مدد ایسے ایک ہزار فرشتوں سے کر رہا ہوں جو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ہیں۔''

صحیحین میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے یہ ثابت ہے کہ غزوۂ احد میں دو فرشتوں نے انسانی شکل میں حصہ لیا۔ حضرت سعد فرماتے ہیں:

((رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ أُحُدٍ، وَمَعَهُ رَجُلَانِ يُقَاتِلَانِ عَنْهُ، عَلَيْهِمَا ثِيَابٌ بِيْضٌ، كَأَشَدِّ الْقِتَالِ، مَا رَأَيْتُهُمَا قَبْلُ وَلَا بَعْدُ))[4]

''میں نے غزوۂ احد میں رسول اللہ ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ کے ساتھ دو مرد سفید کپڑے پہنے ہوئے، آپ کے دفاع میں پوری قوت سے لڑ رہے تھے۔ میں نے ان کو نہ

---

[1] الضعیفہ: ح ١٦٨٨ [2] ترجمہ: ٢٩١٣

[3] الضعیفہ: ص ١٨٤، ١٨٥، ج ٤

[4] صحیح بخاری ح ٤٠٥٤، ٥٨٢٦، صحیح مسلم ح ٢٣٠٦

پہلے دیکھا اور نہ بعد میں دیکھا"

۱۸۷ ...... إِنَّ لِلّٰهِ مَلَائِكَةً وَهُمُ الْكَرُوبِيُّوْنَ، مِنْ شَحْمَةِ أُذُنِ أَحَدِهِمْ إِلَى تَرْقُوَتِهِ مَسِيْرَةُ سَبْعَمِائَةِ عَامٍ لِلطَّائِرِ السَّرِيْعِ فِي انْحِطَاطِهِ۔

"اللہ کے کچھ فرشتے جو کروبی ہیں، ان کے کانوں کی لو سے گلے تک کا فاصلہ اتنا ہے جو ایک تیز پرواز کرنے والا پرندہ زمین پر اترتے وقت کی رفتار سے سات سو سال میں طے کرتا ہے"

یہ روایت حد درجہ ضعیف اور ساقط الاعتبار ہے۔ اس کی روایت حافظ ابن عسا کر نے اپنی تاریخ میں اس سند سے کی ہے:

محمد بن ابی السری سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں: ہم کو عمرو بن ابی سلمہ نے صدقہ بن عبد اللہ القرشی سے، انہوں نے موسیٰ بن عقبہ سے، انہوں نے محمد بن منکدر سے، اور انہوں نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے خبر دی۔[1]

محدث العصر محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ سند بے حد ضعیف ہے، جس کی دو علتیں ہیں:

(۱) محمد بن ابی السری جن کا نام محمد بن متوکل بن عبد الرحمٰن ہاشمی ہے۔ روایتِ حدیث میں بہت غلطیاں کرتے تھے۔[2]

(۲) دوسری علت یہ ہے کہ صدقہ بن عبد اللہ القرشی ضعیف ہیں جن کو امام احمد اور امام یحییٰ بن معین نے ضعیف قرار دیا ہے اور امام بخاری رحمہم اللہ جمیعاً نے ان کو حد درجہ ضعیف قرار دیا ہے۔[3]

حافظ ابن حجر نے ابن ابی السری کو "سچا" ہونے کے ساتھ وہم کا مریض قرار دیا ہے۔[4] اور صدقہ بن عبد اللہ کو ضعیف لکھا ہے جن کی کنیت ابو معاویہ یا ابو محمد اور لقب "السمین" تھا۔[5]

دراصل "کروبیوں" کے نام سے فرشتوں کی کسی جماعت کا ذکر صحیح احادیث میں نہیں آیا ہے اور جن مفسرین نے اپنی تفسیروں میں ان کا ذکر کیا ہے تو انہوں نے اس کا کوئی ماخذ نہیں بتایا۔ چنانچہ حافظ

---

[1] ص ۲۳۱، ج ۱۲

[2] الصحيحة: ص ۸۵، ج ۱، ح ۳۶۔ معجم اسامی الرواۃ: ص ۲۰، ج ٤

[3] معجم اسامی الرواۃ: ص ۳٤۰، ۳٤۱ ج ۲

[4] تقريب التهذيب ص ٤۳۸ ترجمه: ٦۲٦۳

[5] ص ۲۱٦۔ ترجمه: ۲۹۱۳

ابن کثیر رحمہ اللہ نے "البدایہ والنہایہ"[1] میں لکھا ہے کہ "کروبیوں" سے مراد وہ فرشتے ہیں جو عرش الٰہی کے گرد موجود ہیں اور حاملین عرش کے ساتھ ان کا شمار بھی اشرف الملائکۃ میں ہوتا ہے اور وہ مقرب فرشتے ہیں۔

حافظ ابن کثیر نے اپنے اس قول کی کوئی دلیل نہیں دی ہے اور سورۃ النساء کی آیت ۱۷۲ کو پیش کرنے پر اکتفاء کیا ہے جس میں مقرب فرشتوں کا ذکر آیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴾

"مسیح اللہ کا بندہ ہونے میں کوئی عار سمجھے گا اور نہ مقرب فرشتے"

۱۸۸ ...... اِنَّ لِلّٰهِ مَلَكًا لَو قِيلَ لَهُ: اِلْتَقِمِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِيْنَ بِلُقْمَةٍ وَاحِدَةٍ لَفَعَلَ، تَسْبِيْحُهُ: سُبْحَانَكَ حَيْثُ كُنْتَ۔

"یقیناً اللہ کا ایک ایسا فرشتہ ہے کہ اگر اس سے کہا جائے: آسمانوں اور زمینوں کو ایک لقمہ بنا کر نگل جا تو وہ نگل جائے گا۔ اس کی تسبیح ہے! پاک ہے تو جہاں بھی ہو"

حافظ ابن کثیر نے اس روایت کو "البدایہ والنہایہ" میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ بے حد ضعیف (غریب جدا) ہے۔[2] نیز یہ موقوف بھی ہو سکتی ہے۔

حافظ ہیثمی نے بھی المجمع میں یہ روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی روایت میں وہب اللہ بن رزق منفرد ہے۔ اور میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے کتب تراجم میں اس کا ذکر کیا۔ ہو[3] یعنی وہ مجہول ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ امام ذہبی نے "العلو" (ص ٦٦) میں اس کو منکر لکھا ہے۔ لیکن اس کی کوئی علت نہیں بیان کی۔ میرے خیال میں اس کی نکارت کا سبب وہب اللہ ہے جس کے مجہول اور قلیل الحدیث ہونے کی وجہ سے ائمہ حدیث نے اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔[4]

۱۸۹ ...... اِسْرَافِيْلَ لَهُ اَرْبَعَةُ اَجْنِحَةٍ، مِنْهَا جَنَاحَانِ اَحَدُهُمَا بِالْمَشْرِقِ وَالْاٰخَرُ بِالْمَغْرِبِ، وَاللَّوْحُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ، فَإِذَا أَرَادَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اَنْ يَّكْتُبَ الْوَحْيَ يَنْقُرُ بَيْنَ جَبْهَتِهِ۔

"اسرافیل کے چار بازو ہیں۔ جن میں سے دو ایسے ہیں کہ ان میں سے ایک مشرق میں ہے

[1] البدایہ والنہایہ: ص ٥٦، ج ١ [2] ایضًا: ص ٤٩، ج ١
[3] ص ٨٠، ج ١ [4] الضعیفہ: ص ١٨٢، ج ٧، ص ٣١٩٩

اور دوسرا مغرب میں۔ اور لوح محفوظ ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان ہے۔ پس جب اللہ عزوجل وحی لکھنا چاہتا ہے تو ان کی پیشانی کے درمیان چوٹ لگاتا ہے"

یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے جس کی تخریج حافظ ابوالشیخ عبداللہ بن محمد بن جعفر اصبہانی نے اپنی کتاب "العظمہ" میں ابوایوب کے طریق سے کی ہے:

ہم سے خالد واسطی نے بیان کیا۔ کہا: ہم سے خالد حذاء نے ولید ابو بشر سے، انہوں نے عبداللہ بن رباح سے اور انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ کعب رحمہ اللہ نے ان سے عرض کیا: کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسرافیل کے بارے میں کچھ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے......[1]

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

یہ سند موضوع ہے۔ ابوایوب کے سوا اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ ابوایوب کا نام اور لقب سلیمان بن داؤد شاذ کونی ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے "المغنی" میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

امام یحییٰ بن معین نے اس پر کذب بیانی کا الزام لگایا ہے اور امام بخاری کا قول ہے کہ: اس کی ثقاہت محل نظر ہے۔[2]

۱۹۰ ......اَلنَّفَّاخَانِ فِي السَّمَاءِ الثَّانِيَةِ، رَأْسُ اَحَدِهِمَا بِالْمَشْرِقِ وَرِجْلَاهُ بِالْمَغْرِبِ، اَوْ قَالَ رَأْسُ اَحَدِهِمَا بِالْمَغْرِبِ وَرِجْلَاهُ بِالْمَشْرِقِ يَنْتَظِرَانِ مَتَى يُؤْمَرَانِ يَنْفُخَانِ فِي الصُّوْرِ فَيَنْفُخَانِ۔

"دونوں صور پھونکنے والے فرشتے دوسرے آسمان میں ہیں۔ ان میں سے ایک کا سر مشرق میں ہے اور اس کے دونوں پیر مغرب میں ہیں۔ یا ان میں سے ایک کا سر مغرب میں ہے اور اس کے دونوں پاؤں مشرق میں ہیں۔ دونوں اس انتظار میں ہیں کہ کب ان کو صور پھونکنے کا حکم دیا جاتا ہے کہ وہ پھونکیں"[3]

یہ روایت منکر ہے اور اس کی نکارت کی دلیل یہ ہے کہ اس میں صور پھونکنے والے فرشتوں کی تعداد دو بتائی گئی ہے۔ جبکہ صحیح احادیث سے صور پھونکنے والے صرف ایک فرشتے کا ثبوت ملتا ہے:

---

[1] ص ۸۲۰، ج۳، ح۳۸۵ [2] الضعیفہ: ۹۱۹، ۹۲۰، ج:۱٤، ح ٦٨٩٥

[3] مسند امام احمد: ح ٦٨٠٤

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كَيْفَ أَنْعَمُ وَقَدِ الْتَقَمَ صَاحِبُ الْقَرْنِ الْقَرْنَ وَحَنَى جَبْهَتَهُ وَأَصْغَى سَمْعَهُ يَنْتَظِرُ أَنْ يُؤْمَرَ أَنْ يَنْفُخَ، فَيَنْفُخُ، قَالَ الْمُسْلِمُوْنَ: فَكَيْفَ نَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: قُوْلُوْا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ، تَوَكَّلْنَا عَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا))[1]

''کس طرح اطمینان وسکون محسوس کروں؟ حال یہ ہے کہ صاحبِ صور، صور کو منہ میں لیے، پیشانی جھکائے اور کان لگائے اس انتظار میں ہے کہ اس کو پھونکنے کا حکم ہو اور وہ پھونکے، مسلمانوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہمیں کیا کہنا چاہیے؟ فرمایا: کہو: اللہ ہی ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ ہم نے اپنے رب اللہ پر بھروسہ کیا''

صور کیا ہے؟

صور اور قرن ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ اردو میں اس کا ترجمہ نرسنگھا یا بگل کیا جا سکتا ہے۔ اس کی صحیح جسامت اور اس میں پھونکنے کی صحیح کیفیت کے ادراک سے عقل انسانی قاصر ہے۔ البتہ قرآنی آیات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ''صور پھونکنے'' سے جو آواز پیدا ہوگی وہ اس قدر ہولناک ہوگی کہ پہلے آسمان وزمین کی تمام مخلوق خوف زدہ ہو جائے گی اور پھر ہر جاندار فنا ہو جائے گا۔

قرآن پاک میں مختلف مقامات پر صور پھونکنے کا ذکر آیا ہے۔ تمام آیتوں کو ایک ساتھ جمع کرنے سے تین بار صور پھونکنے کا ثبوت ملتا ہے: (۱) نفخة الفزع...... خوف وہراس طاری کر دینے والا صور (۲) نفخة الصعق...... ہلاک کر دینے والا صور (۳) نفخة البعث...... وہ صور جسے پھونکتے ہی تمام انسان زندہ ہو کر اپنی قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۝ ﴾ [الزمر:٦٨]

''اور صور پھونکا جائے گا تو وہ سب مر جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ سوائے ان کے جن کو اللہ (زندہ رکھنا) چاہے۔ پھر دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو یکایک سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے''

---

[1] جامع ترمذی: ح ٣٢٤٤، السنن الكبرى للنسائی: ح ١١٣١٢، الصحيحة: ١٠٧٩

اس آیت سے دو مرتبہ صور پھونکنے کا ثبوت ملتا ہے۔لیکن سورۃ النمل کی آیت ۸۷ سے بصراحت ایک ایسے صور پھونکنے کا ثبوت ملتا ہے جو تمام جانداروں کو خوف زدہ کر کے رکھ دے گا۔ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ﴾ [النمل:۸۷]

''جس دن صور پھونکا جائے گا تو وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، خوف زدہ ہو جائیں گے سوائے ان کے جن کو اللہ (اس ہولناکی سے محفوظ رکھنا) چاہے''

قرآن پاک میں غور و تدبر کا صحیح طریقہ:

قرآن پاک میں ایک ہی مضمون کو مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔کہیں اجمال ہے تو کہیں تفصیل۔کہیں کسی واقعہ کے صرف ایک حصہ کو بیان کیا گیا ہے تو کہیں پورا واقعہ۔لہٰذا قرآن کا مطالعہ کرنے اور اس سے کسی مسئلے کا استنباط کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ کسی مضمون سے متعلق تمام آیتوں کا بدقت نظر مطالعہ کر کے کوئی نتیجہ اخذ کیا جائے۔مذکورہ وضاحت کے تناظر میں ''نفخِ صور'' سے متعلقہ تمام آیتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تین مرتبہ صور پھونکا جائے گا۔

(۱) نفخة الفزع (۲) نفخة الصعق (۳) نفخة البعث

صحیح مسلم کی حدیث کا مفہوم:

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث تین مرتبہ نفخ صور کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس میں صرف دو ''نفخون'' کے درمیان کی مدت بیان کی گئی ہے جسے حدیث کے راوی جلیل القدر صحابی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یاد نہ رکھ سکے۔حدیث کے الفاظ ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((''مَا بَيْنَ النَّفْخَتَيْنِ اَرْبَعُوْنَ'' قَالُوْا: يَا اَبَاهُرَيْرَةَ! اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا؟ قَالَ: اَبَيْتُ، قَالُوْا: اَرْبَعِيْنَ شَهْرًا؟ قَالَ: اَبَيْتُ، قَالُوْا: اَرْبَعِيْنَ سَنَةً؟ قَالَ: اَبَيْتُ، ''ثُمَّ يُنْزِلُ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيَنْبُتُوْنَ كَمَا يَنْبُتُ الْبَقْلُ''))[1]

''دو مرتبہ صور پھونکنے کی درمیان کی مدت چالیس ہے''۔لوگوں نے کہا: اے ابو ہریرہ! کیا

[1] ح: ۷۴۱۴

چالیس دن؟ فرمایا: مجھے اس کا تعین کرنے سے انکار ہے (کیونکہ یا تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایسا نہیں سنا یا میں نے اس کو یاد نہیں رکھا) لوگوں نے کہا: تو کیا چالیس ماہ؟ فرمایا: میں یہ بھی نہیں کہتا۔ لوگوں نے پوچھا: کیا چالیس سال؟ فرمایا: میں اس سے بھی انکاری ہوں۔ پھر اللہ آسمان سے پانی نازل فرمائے گا اور مرے ہوئے لوگ اس طرح جی اٹھیں گے جس طرح سبزی اگتی ہے۔"

اس حدیث پاک میں نفخة الصعق اور نفخة البعث کے درمیان کی مدت بیان ہوئی ہے اور اس سے "نفخة الفزع" کی نفی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس میں صور پھونکنے کی تعداد نہیں بلکہ دو نفخوں کے درمیان کی مدت بیان ہوئی ہے۔

صور پھونکنے والا فرشتہ کون ہے؟

قرآن پاک میں صور پھونکنے کا ذکر مبنی للمجہول کے فعل (نُفِخَ اور يُنْفَخُ) سے کیا گیا ہے۔ فعل مبنی للمجہول میں فاعل محذوف ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن پاک سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ صور پھونکنے والا فرشتہ کون ہے؟

اسی طرح جن صحیح حدیثوں میں صور پھونکنے کا ذکر آیا ہے ان میں سے کسی بھی حدیث میں اس فرشتے کے نام کی صراحت نہیں ہے جو صور پھونکے گا۔ بلکہ نام کی بجائے "صاحب القرن...... قرن والا" یا "صاحب الصور...... صور والا" کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ رہیں وہ حدیثیں جن میں یہ صراحت ہے کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکیں گے تو ان میں سے کوئی بھی حدیث صحیح نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں تحریر فرماتے ہیں:

مشہور ہے کہ صاحب صور حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں اور حلیمی (ابو عبد اللہ حسین بن حسن بن محمد) نے اس مسئلے میں "اجماع" نقل کیا ہے۔ وہب بن منبہ کی حدیث، بیہقی میں ابو سعید کی حدیث اور ابن مردویہ کے یہاں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اسرافیل کے نام کی صراحت ہے۔ اسی طرح وہ طویل حدیث جس کی تخریج عبد بن حمید، طبری، اور ابو یعلی نے الکبیر میں، طبرانی نے الطوالات میں، علی بن معبد نے کتاب الطاعة والمعصية میں اور بیہقی نے البعث میں کی ہے۔ اور جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے اور جس کا دار و مدار اسماعیل بن رافع پر ہے تو ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی سند میں "اضطراب" بھی ہے۔ کبھی تو اس نے اس حدیث کی روایت محمد بن کعب قرظی سے براہ راست کی ہے

اور کبھی ایک مبہم اور غیر معلوم شخص کے واسطے سے کی ہے۔ اسی طرح محمد بن کعب قرظی نے یہ حدیث کبھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے براہ راست اور کبھی انصار کے ایک مبہم شخص کے واسطے سے روایت کی ہے۔ اس حدیث کی تخریج ایک اور ضعیف راوی: اسماعیل بن ابی زیاد شامی نے اپنی تفسیر میں ''عن محمد بن عجلان عن محمد بن کعب قرظی'' کی سند سے کی ہے۔ مغلطائی نے اسماعیل بن رافع کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف قرار دینے پر عبدالحق پر اعتراض کیا ہے اور ان پر یہ بات مخفی رہی کہ شامی اس سے زیادہ ضعیف تھا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ اس نے اس روایت کو اس سے سرقہ کر کے ابن عجلان کے سر منڈھ دیا ہو۔ امام دارقطنی نے اس کو متروک اور وضع حدیث کا مرتکب قرار دیا ہے اور خلیلی کا قول ہے: اسماعیل بن ابی زیاد شامی ضعیف شیخ تھا جس نے اپنی تفسیر میں ایسی روایتیں بھر دی ہیں جن میں اس کا کوئی متابع نہیں ہے۔[1]

میں نے حافظ ابن حجر کی یہ طویل عبارت اس لیے نقل کر دی ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ جن روایتوں میں صور پھونکنے والے فرشتے کے طور پر حضرت اسرافیل علیہ السلام کے نام کی صراحت ہے، ان میں سے کوئی بھی روایت قابل اعتبار نہیں ہے۔

واضح رہے کہ قرآن پاک میں حضرت جبریل علیہ السلام اور حضرت میکائیل علیہما السلام کا تو ذکر آیا ہے لیکن حضرت اسرافیل علیہ السلام کا ذکر نہیں آیا۔ البتہ صحیح حدیث میں حضرت جبریل اور حضرت میکائیل علیہما السلام کے ساتھ حضرت اسرافیل علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز کے آغاز میں یہ دعاء پڑھا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ! رَبَّ جِبْرَائِيلَ وَمِيكَائِيلَ وَإِسْرَافِيلَ، فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ، اِهْدِنِي لِمَا اخْتُلِفَ فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ، إِنَّكَ تَهْدِي مَنْ تَشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ))[2]

''اے اللہ! جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل کے رب، آسمانوں اور زمین کے بنانے والے، غیب و شہود کے عالم! تو ہی اپنے بندوں کے درمیان اس معاملے میں فیصلہ فرماتا ہے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ تو مجھے اپنی توفیق سے اس حق کی رہنمائی فرما جس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بے شک تو ہی جسے چاہے سیدھے راستے کی رہنمائی کر سکتا ہے''

---

[1] فتح الباری: ص ۲۸۶۷، ج ۳   [2] صحیح مسلم: ح ۱۸۱۲ (۷۷۰)

١٩١ ......جَاءَنِي جِبْرِيلُ وَهُوَ يَبْكِي ، فَقُلْتُ: مَا يُبْكِيكَ؟ قَالَ: مَا جَفَّتْ لِي عَيْنٌ مُنْذُ خَلَقَ اللّٰهُ جَهَنَّمَ مَخَافَةَ أَنْ أَعْصِيَهُ ، فَيُلْقِيَنِي فِيهَا۔

''جبریل میرے پاس روتے ہوئے آئے،تو میں نے ان سے پوچھا: تمہیں کونسی چیز رلا رہی ہے؟ انہوں نے کہا: جب سے اللہ نے جہنم بنائی ہے،اس وقت سے میری آنکھ اس خوف سے خشک نہیں ہوئی ہے کہ میں اس کی نافرمانی کر بیٹھوں اور وہ مجھے اس میں ڈال دے''

یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے۔اس کو حافظ سیوطی نے ''الجامع الکبیر'' میں نقل کیا ہے اور صرف یہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ابو عمران سے مرسلاً روایت ہے اور اس کی صحت وسقم سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

یہ روایت علامہ علاء الدین علی متقی ہندی نے کنز العمال[1] میں اور امام بیہقی نے شعب الایمان[2] میں حسین بن جعفر کی سند سے روایت کی ہے۔ہم سے عبداللہ بن ابی زیاد نے بیان کیا، کہا: ہم سے سیار بن حاتم نے بیان کیا، کہا: ہم سے جعفر بن سلیمان نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابو عمران نے بیان کیا، انہوں نے کہا: ہمیں خبر ملی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روتے ہوئے حاضر ہوئے ......

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ روایت مرسل ہونے کے ساتھ ضعیف الاسناد بھی ہے۔کیونکہ اس کی سند کا ایک راوی حسین بن جعفر غیر معروف ہے۔اس کا بھی امکان ہے کہ یہ وہی حسین بن جعفر ہو جس کا ذکر ''ثقات ابن حبان''[3] میں آیا ہے۔یعنی حسین بن جعفر بن محمد القتّات، جو کوفی تھا اور ابو نعیم سے روایت کیا کرتا تھا اور اس سے اہل عراق احادیث روایت کرتے تھے۔

حافظ ابو بکر محمد بن ابو مظفر سمعانی نے کتاب الانساب کے مادہ ''القتات'' کے ضمن میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

حسین بن جعفر بن محمد قتات نے یزید بن مہران بن ابی خالد خباز اور منجاب بن حارث اور عبدالحمید بن صالح سے حدیثیں روایت کی ہیں۔

سمعانی نے اسی پر اکتفا کیا ہے اور اس کی جرح وتعدیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔صرف اتنا اضافہ کیا ہے: حسین، محمد بن جعفر بن محمد بن حبیب بن ازہر قتات کوفی کا بھائی تھا، جس کو ''لسان

[1] کنز العمال: ح: ٥٨٩٦ [2] شعب الایمان: ص: ٥٢١، ج ١، ح: ٩١٥ [3] الثقات: ص: ١٩٣، ج: ٨

المیزان" میں ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

البانی آگے لکھتے ہیں:

میرے خیال میں یہ حسین غیر مشہور ہے اور اس کا تعلق ان راویوں سے ہے جو "قِلّتِ روایت" میں مشہور تھے اور وہ حافظ طبرانی کے شیوخ میں شمار ہوتا ہے۔ جنہوں نے "المعجم الاوسط" میں اس سے دو حدیثیں (۳۵۰۴۔۳۵۰۵) روایت کی ہیں۔

البانی مزید لکھتے ہیں:

اس حدیث کا متن منکر بلکہ موضوع ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے خلاف ہے:

﴿ لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۝ ﴾ [التحریم:٦]

"فرشتے اس حکم میں اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے جو وہ انہیں دیتا ہے۔ اور انہیں جو حکم دیا جاتا ہے اس کو بجالاتے ہیں"

شاید اس روایت کا تعلق اسرائیلیات سے ہو جو کسی راوی پر مشتبہ ہوگئی اور اس نے اس کو نبی کریم ﷺ سے منسوب کر دیا۔ جیسا کہ "ہاروت و ماروت" والی روایت کو نبی کریم ﷺ سے منسوب کر دیا گیا ہے۔[1]

محدث البانی نے ہاروت و ماروت والی جس روایت کی جانب اشارہ کیا ہے وہ درج ذیل ہے:

ہاروت و ماروت کا قصہ:

۱۹۲ ...... إِنَّ الْمَلَائِكَةَ قَالَتْ: يَا رَبِّ! كَيْفَ صَبْرُكَ عَلَى بَنِيْ آدَمَ فِي الْخَطَايَا وَالذُّنُوْبِ؟ إِنِّيْ اِبْتَلَيْتُهُمْ وَعَافَيْتُكُمْ، قَالُوْا: كُنَّا مَكَانَهُمْ مَا عَصَيْنَاكَ، قَالَ: فَاخْتَارُوْا مَلَكَيْنِ مِنْكُمْ، فَلَمْ يَأْلُوْا أَنْ يَخْتَارُوْا، فَاخْتَارُوْا هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ، فَنَزَلَا، فَأَلْقَى اللّٰهُ تَعَالَى عَلَيْهِمَا الشَّبَقَ، قُلْتُ: وَمَا الشَّبَقُ؟ قَالَ: الشَّهْوَةَ، قَالَ: فَنَزَلَا، فَجَاءَتْ إِمْرَأَةٌ يُقَالُ لَهَا "الزُّهْرَةُ" فَوَقَعَتْ فِيْ قُلُوْبِهِمَا، فَجَعَلَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا يُخْفِيْ عَنْ صَاحِبِهِ مَا فِيْ نَفْسِهِ، فَرَجَعَ إِلَيْهَا، ثُمَّ جَاءَ الْآخَرُ، فَقَالَ: هَلْ وَقَعَ فِيْ نَفْسِكَ مَا وَقَعَ فِيْ قَلْبِيْ؟ قَالَ:

[1] الضعيفة: ص ۱۱۳٤۔۱۱۳۵، ج۱۳، ح: ٦٤٩٧

نَعَمْ، فَطَلَبَاهَا نَفْسَهَا، فَقَالَتْ: لَا أُمَكِّنُكُمَا حَتَّى تُعَلِّمَانِي الْإِسْمَ الَّذِيْ تَعْرُجَانِ بِهِ إِلَى السَّمَاءِ وَتَهْبِطَانِ، فَأَبَيَا، ثُمَّ سَأَلَاهَا أَيْضًا فَأَبَتْ، فَفَعَلَا، فَلَمَّا اسْتُطِيْرَتْ طَمَسَهَا اللّٰهُ كَوْكَبًا وَقَطَعَ أَجْنِحَتِهَا، ثُمَّ سَأَلَا التَّوْبَةَ مِنْ رَبِّهِمَا، فَخَيَّرَهُمَا، فَقَالَ: إِنْ شِئْتُمَا رَدَدْتُكُمْ إِلَى مَا كُنْتُمَا عَلَيْهِ، فَإِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ عَذَّبْتُكُمَا، وَإِنْ شِئْتُمَا عَذَّبْتُكُمَا فِي الدُّنْيَا، فَإِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ رَدَدْتُكُمَا إِلَى مَا كُنْتُمَا عَلَيْهِ، فَقَالَ أَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهِ: إِنَّ عَذَابَ الدُّنْيَا يَنْقَطِعُ وَيَزُوْلُ، فَاخْتَارَا عَذَابَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ، فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلَيْهِمَا أَنِ ائْتِيَا بَابِلَ، فَانْطَلَقَا إِلَى بَابِلَ فَخَسَفَ بِهِمَا، فَهُمَا مَنْكُوْسَانِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ مُعَذَّبَانِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔

''فرشتوں نے عرض کیا: اے ہمارے رب! آپ اولاد آدم پر ان کے گناہوں، اور خطاؤں کے معاملے میں کس طرح صبر کرتے ہیں؟ فرمایا: میں نے ان کو آزمائش میں ڈالا ہے اور تم کو (آزمائش سے) محفوظ رکھا ہے۔ فرشتوں نے کہا: اگر ہم اولاد آدم کی جگہ ہوتے تو آپ کی نافرمانی نہ کرتے۔ اللہ نے فرمایا: تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو چن لو۔ انہوں نے کسی تاخیر کے بغیر ہاروت اور ماروت کو چن لیا۔ وہ دونوں زمین پر اتر گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر ''شبق'' ڈال دیا (راوی کا بیان ہے کہ میں نے پوچھا) شبق کیا ہے؟ فرمایا: شبق جنسی خواہش ہے۔ دونوں جب زمین پر اترے تو ان کے پاس ایک عورت آئی جس کا نام زہرہ تھا۔ اس نے ان دونوں کے دلوں میں جگہ بنالی۔ ان میں سے ایک دوسرے سے اپنے دل کی بات چھپاتا رہا اور ان میں سے ہر ایک اس کے پاس جاتا رہا۔ پھر ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے دریافت کیا: کیا تیرے دل میں اس کی وہی محبت ہے جو میرے دل میں ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں: ان دونوں نے اس سے اپنی خواہش نفس کا اظہار کیا تو اس نے جواب دیا: میں تم دونوں کو اس وقت تک خواہش نفس پوری کرنے کا موقع نہ دوں گی جب تک کہ تم مجھے وہ نام نہ سکھا دو جس کے ذریعہ تم آسمان پر چڑھتے اور اس سے اترتے ہو۔ ہاروت اور ماروت نے وہ نام سکھانے سے انکار کر دیا اور دوبارہ اس سے اپنی خواہش پوری کرنے کا سوال کیا۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ تب انہوں نے اسے وہ نام بتا دیا۔ اس پر

اللہ نے اس کی صورت مٹا کر اسے ایک ستارے میں تبدیل کر دیا اور اس کے بازو کاٹ دیے۔ پھر ہاروت اور ماروت نے اپنے رب سے معافی کی درخواست کی۔ اللہ نے ان کو اختیار دیتے ہوئے فرمایا: اگر تم چاہو تو میں تم دونوں کو اس حالت پر واپس کر دوں جس پر تم پہلے تھے۔ پھر جب قیامت آئے تو تمہیں عذاب دوں۔ یا اگر چاہو تو دنیا میں تم کو عذاب دوں اور جب قیامت آئے تو تم کو اس پہلی حالت میں لوٹا دوں جس پر تم تھے۔ یہ سن کر ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا: دنیا کے عذاب کا سلسلہ تو منقطع ہو کر یہ عذاب ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے آخرت کے عذاب کے مقابلے میں دنیا کا عذاب قبول کر لیا۔ اللہ نے ان کو وحی کے ذریعہ حکم دیا کہ "بابل" جاؤ لہٰذا وہ بابل شہر چلے گئے جہاں اللہ نے ان کو دھنسا دیا۔ وہ آسمان اور زمین کے درمیان الٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ اور قیامت تک اسی طرح عذاب میں مبتلا رہیں گے"

یہ روایت باطل ہے۔ جس کے لفظ لفظ سے اس کے باطل ہونے کی بو آتی ہے۔ اگرچہ بہت سارے مفسرین نے سورۃ البقرہ کی آیت ۱۰۲ کی تفسیر کے ضمن میں اس کو نقل کیا ہے۔ یہ روایت فرشتوں اور نبیوں کے بارے میں یہودیوں کی گندی ذہنیت کی ترجمان ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: ہاروت اور ماروت کا قصہ متعدد تابعین سے مروی ہے۔ جیسے: مجاہد، سدی، حسن بصری، قتادہ، ابو العالیہ، ربیع بن انس اور مقاتل بن حیان۔ نیز قدیم اور متاخر مفسرین میں سے بہتوں نے اس قصہ کو بیان کیا ہے جو اخبار بنو اسرائیل سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ اس مسئلے میں کوئی بھی صحیح حدیث متصل سند کے ساتھ الصادق المصدوق ﷺ سے مروی نہیں ہے اور قرآن پاک میں یہ قصہ تفصیل کے بجائے اجمال کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ لہٰذا جو کچھ قرآن میں بیان ہوا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے اور حقیقت حال کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔[1]

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی "الجامع لاحکام القرآن" میں لکھتے ہیں:

یہ پورا قصہ ناقابل اعتبار ہے اور یہ بات بعید از امکان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کی نسبت صحیح ہو۔ کیونکہ قرآن پاک میں فرشتوں کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں یہ روایت ان کے سراسر خلاف ہے۔[2]

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۹۷، ج ۱ [2] تفسیر قرطبی: ص ۴۱۸۔ ۴۱۹، ج ۱

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

یہ روایت مرفوع حیثیت سے میں باطل ہے۔ اس کی تخریج حافظ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں (ص ۴۲۔۴۳ ج ۸) اور امام ابن جریر نے اپنی تفسیر میں (ص ۳۶۴ ج ۲) حسین کی سند سے کی ہے۔

سنید بن داؤد کہتے ہیں: ہم سے فرج بن فضالہ نے معاویہ بن صالح کے واسطہ سے اور انہوں نے نافع سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......

اس روایت کی مصیبت فرج بن فضالہ یا اس سے روایت کرنے والا سنید ہے۔ یہ دونوں ضعیف ہیں جیسا کہ ''تقریب التھذیب'' میں اس کی صراحت موجود ہے۔ (ص ۳۸۰، ترجمہ: ۵۳۸۳، ص ۱۹۷۔ ترجمہ: ۲۶۴۶)

محدث البانی رحمہ اللہ آگے لکھتے ہیں:

''دومۃ الجندل کی ایک عورت نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس نے بابل میں ہاروت اور ماروت کو پیروں کے ساتھ لٹکتے ہوئے دیکھا ہے اور اس نے ان سے اسی حال میں جادو سیکھا...... یہ بات اس طویل قصہ کے ضمن میں آتی ہے جو اس عورت نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا تھا اور جس کی روایت ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں (۳۶۶۔۳۶۷، ج۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حسن سند سے کی ہے۔ لیکن وہ عورت چونکہ مجہول ہے لہٰذا اس سے منسوب خبر نا قابل اعتبار ہے۔[1]

۱۹۳......لَعَنَ اللّٰهُ الزُّهْرَةَ، فَإِنَّهَا هِيَ الَّتِيْ فَتَنَتِ الْمَلَكَيْنِ: هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ۔

''زہرہ پر اللہ کی لعنت ہو کیونکہ اسی نے دونوں فرشتوں: ہاروت اور ماروت کو فتنہ میں ڈالا تھا''

یہ روایت بھی جھوٹ ہے۔ اس کو حافظ ابوبکر احمد بن محمد بن اسحاق معروف بابن سنی نے اپنی مشہور کتاب۔ ''عمل الیوم واللیلة'' میں (ح ۶۴۸) اور حافظ ابن مندہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

اس کا راوی: جابر بن یزید جعفی ہے جس پر روایت حدیث میں کذب بیانی کا الزام تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دنیا میں واپس آئیں گے اور قرآن میں دابۃ الارض سے وہی مراد ہیں۔[2]

۱۹۴......إِنَّ آدَمَ لَمَّا أَهْبَطَهُ اللّٰهُ تَعَالَى إِلَى الْأَرْضِ، قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ: أَيْ رَبِّ! ﴿ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [البقرہ: ۳۰] قَالُوْا: رَبَّنَا نَحْنُ أَطْوَعُ

[1] الضعیفہ: ص ۳۱۳۔۳۱۵ ج۲، ح ۹۱۲ [2] الضعیفہ: ص ۳۱۵، ج۲، ح ۳۱۹

لَكَ مِنْ بَنِیْ آدَمَ، قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى لِلْمَلَائِكَةِ: هَلُمُّوْا مَلَكَيْنِ مِنَ الْمَلَائِكَةِ حَتّٰى يُهْبَطَ بِهِمَا إِلَى الْأَرْضِ فَنَنْظُرَ كَيْفَ يَعْمَلَانِ؟ قَالُوْا: رَبَّنَا هَارُوْتُ وَمَارُوْتُ۔ فَاهْبِطَا إِلَى الْأَرْضِ، وَمَثَّلَتْ لَهُمَا الزُّهْرَةُ اِمْرَأَةً مِنْ أَحْسَنِ الْبَشَرِ، فَجَاءَتْهُمَا، فَسَأَلَاهَا نَفْسَهَا، فَقَالَتْ: لَا، وَاللّٰهِ حَتّٰى تُكَلِّمَا بِهٰذِهِ الْكَلِمَةِ مِنَ الْإِشْرَاكِ، فَقَالَا: وَاللّٰهِ لَا نُشْرِكُ بِاللّٰهِ، فَذَهَبَتْ ثُمَّ رَجَعَتْ بِصَبِيٍّ تَحْمِلُهُ، فَسَأَلَاهَا نَفْسَهَا، قَالَتْ: لَا وَاللّٰهِ حَتّٰى تَقْتُلَا هٰذَا الصَّبِيَّ فَقَالَا: وَاللّٰهِ لَا نَقْتُلُهُ أَبَدًا، فَذَهَبَتْ ثُمَّ رَجَعَتْ بِقَدَحِ خَمْرٍ، فَسَأَلَاهَا نَفْسَهَا، قَالَتْ: لَا، وَاللّٰهِ حَتّٰى تَشْرَبَا هٰذَا الْخَمْرَ، فَشَرِبَا، فَسَكِرَا، فَوَقَعَا عَلَيْهَا وَقَتَلَا الصَّبِيَّ، فَلَمَّا أَفَاقَا قَالَتِ الْمَرْأَةُ: وَاللّٰهِ مَا تَرَكْتُمَا شَيْئًا مِمَّا أَبَيْتُمَا عَلَيَّ إِلَّا فَعَلْتُمَا حِيْنَ سَكِرْتُمَا، فَخُيِّرَا بَيْنَ عَذَابِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، فَاخْتَارَا عَذَابَ الدُّنْيَا۔

"جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا تو فرشتوں نے عرض کیا: اے ہمارے رب! کیا آپ اس میں ایسے شخص کو مقرر فرما رہے ہیں جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا جبکہ ہم آپ کی حمد و ثناء کے ساتھ آپ کی تسبیح و تقدیس میں لگے ہوئے ہیں؟ اللہ نے فرمایا: "میں جو جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے" (البقرۃ:۳۰) انہوں نے عرض کیا: اے ہمارے رب! ہم اولادِ آدم سے زیادہ تیرے اطاعت گزار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: فرشتوں میں سے دو فرشتے لاؤ جن کو زمین پر اتارا جائے اور ہم دیکھیں کہ وہ کس طرح عمل کرتے ہیں۔ فرشتوں نے عرض کیا: اے ہمارے رب! ہاروت اور ماروت، پس ان کو زمین پر اتارا گیا اور زہرہ نے ان کے لیے انسانوں میں خوبصورت ترین عورت کی شباہت اختیار کی اور ان کے پاس آئی، انہوں نے اس سے اس کا جسم مانگا۔ اس نے جواب دیا: اللہ کی قسم نہیں، یہاں تک کہ تم اس کلمہ کے ذریعہ شرک کا اظہار کردو۔ فرشتوں نے جواب دیا: اللہ کی قسم ہم اللہ کے ساتھ شرک کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔ یہ سن کر وہ چلی گئی پھر ان کے پاس ایک بچہ لیے ہوئے واپس آئی، انہوں نے اس سے اس کا جسم مانگا۔ اس نے جواب دیا: اللہ کی قسم نہیں اِلّا یہ کہ تم لوگ اس بچے کو قتل کردو۔ فرشتوں نے جواب دیا: اللہ کی قسم ہم اس کو

ہرگز نہیں قتل کر سکتے یہ سن کر وہ چلی گئی۔ پھر ایک پیالے میں شراب لے کر ان کے پاس واپس آئی۔ انہوں نے اس سے اس کا جسم مانگا۔ اس نے کہا: اللہ کی قسم ہرگز نہیں یہاں تک کہ تم دونوں یہ شراب پی لو۔ چنانچہ انہوں نے شراب پی اور مدہوش ہو گئے۔ پھر اس کے ساتھ بدفعلی کی اور بچے کو ہلاک کر دیا۔ جب ہوش میں آئے تو اس عورت نے کہا: اللہ کی قسم! تم دونوں نے مجھ سے جن افعال بد کے ارتکاب سے انکار کیا تھا جب نشے میں آئے تو ان کا ارتکاب کر ڈالا تو ان دونوں فرشتوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ یا تو دنیا کا عذاب اختیار کریں یا آخرت کا عذاب۔ اور انہوں نے عذاب دنیا کو اختیار کر لیا''

یہ ایک باطل روایت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے، اس کی تخریج امام ابن حبان نے موارد الظمآن میں [1]۔ امام احمد نے مسند [2] میں۔ عبد بن حمید نے منتخب [3] میں، ابن ابی الدنیا نے العقوبات [4] میں۔ البزار نے الکشف [5] میں اور ابن سنی نے عمل الیوم واللیلہ [6] میں حسب ذیل سند سے کی ہے۔

زہیر بن محمد سے روایت ہے، وہ موسیٰ بن جبیر سے روایت کرتے ہیں، وہ نافع مولی ابن عمر سے اور وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

حافظ البزار نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے اس کو ''نافع عن ابن عمر'' کی سند سے موقوفاً یعنی عبداللہ بن عمر کے قول کی حیثیت سے روایت کیا ہے اور یہ میرے پاس مرفوع شکل میں زہیر کی سند سے پہنچی ہے، کیونکہ زہیر حافظ حدیث نہیں تھا۔

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: اس سند سے یہ حدیث غریب یعنی ضعیف ہے۔ کیونکہ موسیٰ بن جبیر کے سوا اس کی سند کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ [7]

موسیٰ بن جبیر انصاری کا ذکر امام ابن ابی حاتم نے بھی ''الجرح والتعدیل'' میں کیا ہے، لیکن اس کی جرح و تعدیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ [8]

چونکہ موسیٰ بن جبیر مجہول الحال ہے اور نافع سے اپنی اس روایت میں منفرد بھی ہے اسی لیے حافظ ابن کثیر نے اس کو غریب کہا ہے۔

---

[1] موارد: ٧١٧ [2] مسند الامام احمد: ٦١٧٨ [3] منتخب ص ٨٦، ج١
[4] العقوبات: ص ٧٥، ج٢ [5] الکشف: ٢٩٣٨
[6] عمل الیوم واللیلة: ٦٥١ [7] تفسیر ابن کثیر: ص ٢٥٤، ج١
[8] الجرح والتعدیل: ص ١٣٩، ج٤

امام ابن حبان نے موسیٰ کو اگرچہ کتاب الثقات میں درج کیا ہے[1]۔ مگر یہ بھی لکھا ہے کہ وہ روایت حدیث میں غلطیاں کرتا تھا اور ثقہ راویوں کے خلاف حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔ امام ابن حبان نے اگر اس کو صریح لفظوں میں ثقہ قرار دیا ہوتا تو بھی تنہا ان کی توثیق پر اعتماد صحیح نہ ہوتا چہ جائیکہ انہوں نے اس کی ایسی صفت بیان کر دی ہے جس سے اس کی ثقاہت مجروح ہو گئی ہے۔ حالانکہ وہ راویوں کی توثیق میں سہل انگاری سے کام لیتے تھے۔

علامہ رشید رضا نے اس قصہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اہل کتاب کی مقدس کتابوں میں اس قصہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اب اگر یہ ان کتابوں کی روایات کے زمانے میں گھڑا گیا ہے تو یہ ان کتابوں سے ماخوذ ہو سکتا ہے جو خرافات کے قبیل سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس قصہ کو اسرائیلی خرافات میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس طرح کی کوئی روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرفوع حدیث کے طور پر ثابت نہیں ہے۔[2]

اس روایت کی نا قابل اعتماد سند کے علاوہ اس کا متن حد درجہ منکر ہے۔ کیونکہ یہ فرشتوں کے بارے میں قرآن پاک کے صریح بیانات کے خلاف ہے جن میں سے بعض کا ذکر اوپر آ چکا ہے اور جن کا خلاصہ یہ ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے نہایت فرماں بردار بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جو ذمہ داریاں سونپ دی ہیں وہ ان کی من وعن تعمیل میں لگے ہوئے ہیں۔

امام احمد بن حنبل نے بھی اس روایت کو منکر قرار دیا ہے جیسا کہ ابن قدامہ نے "المنتخب" میں لکھا ہے۔[3]

اور امام ابن ابی حاتم نے کتاب ''العلل'' میں لکھا ہے کہ ''میں نے اپنے والد سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا جو معاذ بن خالد عسقلانی نے زہیر بن محمد سے، انہوں نے موسیٰ بن جبیر سے، انہوں نے نافع سے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے...... تو میرے والد نے فرمایا: یہ حدیث منکر ہے۔[4]

اوپر کے صفحات میں ہاروت اور ماروت کے بارے میں جو جھوٹی روایت (۱۹۲) پیش کی گئی ہے اس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جس عورت نے ہاروت اور ماروت کو بدکاری پر آمادہ کیا تھا اس کو مسخ کر کے

---

[1] الثقات: ص ٤٥١، ج ٧
[2] بحواله الضعيفة: ص ٣١٨، ج ١، ح ١٧٠
[3] المنتخب ص ٢١٤، ج ١١
[4] العلل ص ٣١٨، ج ٢، ح ١٦٩٩

''زہرہ'' نامی ستارے میں تبدیل کر دیا گیا جبکہ یہ زیر بحث منکر روایت یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ ''زہرہ'' نے خوبصورت عورت کی شکل اختیار کر کے ہاروت اور ماروت کو بدکاری پر آمادہ کیا۔ دونوں روایتوں کے متن میں یہ اختلاف خود ان کے بطلان کی دلیل ہے۔

ہاروت و ماروت کا قصہ قرآنی بیان کے خلاف ہے:

فرشتے اللہ تعالیٰ کے ''معصوم عن الخطاء'' بندے ہیں۔ وہ نورانی ہونے کی وجہ سے جو مادی شکل چاہیں اختیار کریں مگر اپنے اندر مادی خاصیت پیدا نہیں کر سکتے۔ جس کا مطلب ہے کہ فرشتے اپنی بقاء کے لیے جس طرح کھانے پینے سے بے نیاز ہیں اسی طرح وہ جنسی خواہشات سے بھی پاک ہیں۔ جس کا ثبوت درج ذیل قرآنی واقعہ سے ملتا ہے۔

قرآن پاک میں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب الٰہی کے نزول سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں فرشتوں کی انسانی شکل میں آمد کا ذکر آیا ہے اور سورۂ ہود اور سورۃ الذاریات میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے سامنے کھانے کے لیے بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا جس کو انہوں نے ہاتھ نہیں لگایا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ ﴾

[هود:٦٩، ٧٠]

''درحقیقت ہمارے فرستادہ فرشتے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر پہنچے اور کہا تم پر سلامتی ہو۔ ابراہیم نے جواب دیا تم پر سلام ہو۔ اور کچھ ہی دیر بعد ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آیا۔ مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس تک نہیں پہنچ رہے تو ان سے اجنبیت محسوس کی اور ان سے خوف محسوس کرنے لگا''

اور سورۃ الذاریات میں ہے ابراہیم علیہ السلام نے ان سے پوچھا: ''اَلَا تَاْكُلُوْنَ'' کیا تم لوگ کھاتے نہیں؟ مطلب یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کے سامنے بھنا ہوا بچھڑا رکھا اور پھر دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو حیرت و تعجب سے پوچھا: کیا تم لوگ کھاتے نہیں۔ معلوم ہوا کہ اگر انسانی شکل اختیار کرنے سے فرشتوں کی خاصیت بدل جاتی تو وہ اپنے عظیم میزبان کی دلداری کی خاطر بھنا ہوا بچھڑا کھانا شروع کر دیتے۔

اور سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ہاروت اور ماروت کا قصہ اجمالاً جس سیاق وسباق میں بیان فرمایا ہے وہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ان کو بنو اسرائیل کی آزمائش کے لیے بھیجا گیا تھا نہ کہ خود ان کی اپنی آزمائش کے لیے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ط وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ط ﴾ [البقرۃ:۲:۱۰۲]

"(اہل کتاب کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا) اور پیچھے لگے اس جادو کے جو شیاطین سلیمان کے عہد حکومت میں پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا بلکہ کفر کا ارتکاب ان شیطانوں نے کیا تھا جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے اور پیچھے پڑے اس علم کے جو بابل میں دو فرشتوں، ہاروت اور ماروت پر نازل کیا گیا تھا، جبکہ وہ دونوں فرشتے کسی کو جو بھی سکھاتے تو کہہ دیتے کہ: "ہم محض ایک آزمائش ہیں۔ لہٰذا تو کفر کا ارتکاب مت کر۔"

یہ آیت مبارکہ بصراحت یہ اعلان کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں فرشتوں کو بابل میں جادو کا علم دے کر لوگوں کی آزمائش کی غرض سے نازل کیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ شیطانوں کے برعکس لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے وقت یہ بتا دیتے تھے کہ جادو سیکھنا کفر ہے۔

جادو کیا ہے؟

قرآن پاک کے بیان سے اتنی بات تو ثابت ہے کہ "جادو کا وجود ہے" اور اس کا انکار خود قرآن کا انکار ہے۔ اوپر ہاروت اور ماروت کے قصہ پر مشتمل سورۃ البقرہ کی جس آیت کا ایک حصہ نقل کیا گیا ہے وہ پوری آیت درج ذیل ہے:

﴿ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ط وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ط فَيَتَعَلَّمُوْنَ

مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ط وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ط وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ قف وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ط لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ O ﴾ [البقرة:١٠٢]

''(اہل کتاب کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا) اور پیچھے لگے اس جادو کے جو شیاطین سلیمان کے عہد حکومت میں پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا بلکہ کفر کا ارتکاب ان شیطانوں نے کیا تھا جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے اور پیچھے پڑے اس علم کے جو بابل میں دو فرشتوں، ہاروت اور ماروت پر نازل کیا گیا تھا، جبکہ وہ دونوں فرشتے کسی کو جو بھی سکھاتے تو کہہ دیتے کہ ''ہم محض ایک آزمائش ہیں لہٰذا تو کفر کا ارتکاب مت کر۔ تاہم وہ ان سے ایسی چیز سیکھتے تھے جس کے ذریعہ شوہر اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ حالانکہ وہ اس کے ذریعہ اللہ کے حکم کے بغیر کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے اور وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو ان کو نقصان تو پہنچا سکتی تھی لیکن نفع نہیں پہنچا سکتی تھی۔ درحقیقت انہیں معلوم تھا کہ جس نے اسے خریدا ہے، آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ کتنی بری متاع تھی جس کے بدلے میں انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ کاش انہیں معلوم ہوتا''

اس آیت مبارکہ میں جادو کی عملی ممارست کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں یہودیوں کا ایک گروہ ملوث تھا۔ اور اس کے ذریعہ وہ شوہر اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال دیا کرتا تھا۔

قرآن کی یہ صراحت یہ ثابت کر رہی ہے کہ ایک طرف اگر جادو اپنی تاثیر رکھتا ہے تو دوسری طرف جو لوگ اس وقت جادوگری اور شعبدہ بازی سیکھ رہے تھے وہ اخلاقی گراوٹ کی آخری پستی میں گر چکے تھے۔ کیونکہ کسی انسان کی پست اخلاقی کا اس سے زیادہ نیچا اور کوئی مرتبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی عورت کو اس کے شوہر سے جدا کرنے کی کوشش کرے۔

مذکورہ آیت مبارکہ میں ایک اور نہایت اہم بات یہ بیان کی گئی ہے کہ: جادو سیکھنے اور اس کو استعمال کرنے میں صرف نقصان ہی نقصان ہے۔ اس میں نفع کا کوئی عنصر نہیں ہے۔ اسی بات کو سورۃ طٰہٰ میں یوں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى O ﴾ [طه:٦٩]

''اور جادوگر جہاں سے بھی آئے کامیاب نہیں ہو سکتا''

ہاروت اور ماروت کا یہ قصہ قرآن پاک کی صرف اسی آیت (البقرہ:۱۰۲) میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن قوم فرعون کے جادوگروں کا قصہ قرآن پاک کی متعدد سورتوں میں بیان کیا گیا ہے، جن میں سے سورۃ الاعراف میں ان کے جادو کی یہ حقیقت بیان کی گئی ہے:

﴿ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ۝ ﴾

[الاعراف:۱۱٦]

''جب انہوں نے (اپنی لاٹھیاں اور رسیاں) پھینکیں تو نگاہوں کو سحر زدہ اور دلوں کو خوف زدہ کر دیا اور وہ بہت بڑا جادو لائے تھے۔''

اور سورۃ طٰہ میں ہے:

﴿ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى۝ ﴾ [طٰه:٦٦]

''موسیٰ نے (جادوگروں سے) کہا: بلکہ تم پھینکو۔ یکایک ان کی رسیاں اور لاٹھیاں موسیٰ کو ان کے جادو کے زور سے ایسی لگیں کہ وہ دوڑ رہی ہیں''

ان دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت یہ صراحت کر رہی ہے کہ جادوگروں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا جس کی وجہ سے ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کو سانپ نظر آنے لگے۔ جبکہ دوسری آیت یہ بتا رہی ہے کہ ان کے جادو کے زور سے موسیٰ علیہ السلام کو ایسا خیال ہونے لگا کہ رسیاں اور لاٹھیاں دوڑ رہی ہیں۔

یعنی پہلی آیت میں ان کی شعبدہ بازی اور جادوگری کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور دوسری میں اس کا نتیجہ۔ دونوں کا ماحصل یہ ہے کہ ان کے جادو سے رسیوں اور لاٹھیوں کی ماہیت اور حقیقت تبدیل نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ رسیاں اور لاٹھیاں ہی رہیں۔ البتہ ان کے ہاتھوں کی صفائی اور خاص انداز سے زمین پر ان کو ڈالنے سے لوگوں کی نگاہوں اور خیالات پر یہ اثر پڑا کہ انہوں نے ان کو دوڑتے ہوئے سانپ محسوس کیا جس کی وجہ سے وہ خوف زدہ ہو گئے۔

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے معجزے نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کو حقیقی سانپ میں تبدیل کر دیا جس کو جادوگروں نے فوراً بھانپ لیا۔ کیونکہ وہ اپنے جادو کی حقیقت سے واقف تھے اور وہ فوراً یہ سمجھ گئے کہ چشم زدن میں ایک بے جان لاٹھی کا حقیقی سانپ بن جانا کسی جادو کا نتیجہ نہیں ہو سکتا بلکہ یہ تو ایک معجزاتی

عمل ہے جو اس ذاتِ مطلق کی قدرت کا ایک مظہر ہے جو پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اسی لیے وہ پکار اٹھے: ﴿ اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى ﴾ [طه:۷۰]

''ہم ایمان لائے ہارون اور موسیٰ کے رب پر''

غور کا مقام ہے کہ جادوگروں نے یہ نہیں کہا: ہم ہارون اور موسیٰ پر ایمان لائے۔ کیونکہ ان کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ایک معمولی سی بے جان لاٹھی کو ایک عظیم الجثہ اور ہیبت ناک سانپ میں تبدیل کر دینا کسی مخلوق کا کام نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ وہ ہارون اور موسیٰ علیہما السلام جیسے عظیم المرتبت انسان ہی کیوں نہ ہوں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ظاہر ہونے والے الٰہی معجزے نے ان کے نہاں خانہ دل کی ظلمتوں کو کافور کر دیا اور وہ نورِ توحید سے روشن ہوگئے۔ یہ سب کچھ جس سرعت سے ہوا، اس کو قرآن پاک کے معجزاتی بیان میں محسوس کیا جاسکتا ہے:

﴿ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى ﴾ [طه:۷۰]

''پس گرا دیے گئے جادوگر سجدہ کرتے ہوئے۔ اور وہ پکار اٹھے: ہم ایمان لائے ہارون اور موسیٰ کے رب پر''

کس قدر مؤثر ہے قرآن پاک کی یہ تصویر کشی۔ ادھر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں معجزہ دیکھا، ادھر وہ یکبارگی اور بے ساختہ سجدے میں گر گئے۔ جیسے کسی نے ان کو گرا دیا ہو۔

پھر انہوں نے اپنے ایمان کا مظاہرہ سجدے سے کیا جو عبادت الٰہی کی معراج اور قرب الٰہی کا مظہر ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴾ [العلق:۱۹] ''سجدہ کر اور قریب ہوجا''

اوپر کی وضاحتوں سے معلوم ہوا کہ جادو کے ذریعہ کسی چیز کی ماہیت اور حقیقت کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا اور اس سے انسان کے صرف نظر و خیال پر اثر پڑتا ہے۔ پھر یہ اثر انسان کے نفس اور حواس تک سرایت کر جاتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ سحر زدہ انسان کے اعضاء بھی متاثر ہوجاتے ہیں۔

ایک سحر زدہ انسان کی حالت ایک نفسیاتی مریض کی حالت سے مشابہ ہوتی ہے۔ نفسیاتی مریض کے تمام اعضاء صحیح و سالم ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ اس کے بیمار احساسات و خیالات اس کے جسم پر بھی اثر انداز ہونے لگتے ہیں، خوف، بے خوابی، نسیان، بھوک و پیاس کا فقدان، عزیزوں اور رشتہ داروں کی طرف میلان

میں کمی جو نفرت و کراہیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ٹھیک اسی طرح کی کیفیتوں سے ایک سحر زدہ انسان بھی گزرتا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ سحر زدہ انسان کی یہ حالت جادو کے نتیجے میں ہوتی ہے جبکہ نفسیاتی بیماری کے کچھ اور اسباب ہوتے ہیں جن کی تفصیلات کا نہ یہ موقعہ ہے اور نہ ہمارے موضوع سے متعلق ہیں۔

چونکہ جادو ایک سفلی عمل کا نام ہے، اس لیے ہر زمانے اور ہر معاشرے کے نہایت بدطینت اور رذیل ترین افراد ہی اس میں ملوث رہے ہیں۔آج بھی جادوگری اور شعبدہ بازی وہی لوگ کرتے ہیں جن کی فطرت مسخ ہو چکی ہے اور جن کی فکر و ارادے پر شیطان کا مکمل غلبہ ہو چکا ہے۔

سورۃ البقرہ کی آیت ۱۰۲ میں جادو سیکھنے والوں کی یہ صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیتے ہیں۔

﴿ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ط ﴾ [البقرة:۱۰۲]

''وہ دونوں فرشتوں سے ایسی چیز سیکھتے تھے جس کے ذریعہ شوہر اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں۔''

ظاہری بات ہے کہ جادوگر صرف اسی بداخلاقی اور صرف اسی برے عمل کا ارتکاب نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے اس گندے عمل کے ذریعہ معصوم اور بے قصور لوگوں کو اور بھی ضرر پہنچاتے ہیں۔لیکن شوہر اور بیوی میں جدائی ڈالنا چونکہ نہایت ہی حقیر اور کمینی حرکت ہے جس سے ایک ہرا بھرا گھر اور ایک ہنستا کھیلتا خاندان غم و آلام کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور رحمت و سکینت پر مبنی یہ پاکیزہ رشتہ باہمی نفرت میں تبدیل ہو جاتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے جادو کے صرف اسی ایک نتیجے کا ذکر کر دینے پر اکتفا کیا ہے تاکہ معاشرے کے صالح اور باضمیر افراد اس سفلی اور غیر اخلاقی عمل سے متنفر ہو جائیں۔

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے جادو کو کفر قرار دیا ہے اور اپنے صالح بندے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ذات کو اس سے پاک قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ [البقرة:۱۰۲]

''سلیمان نے کفر نہیں کیا بلکہ کفر کے مرتکب شیاطین ہوئے''

تو آیت مبارکہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام سے جس کفر کی نفی کی گئی ہے وہ جادو ہی ہے۔اس سے یہ معلوم ہوا کہ جادو کفر ہے اور جادو کا پیشہ اختیار کرنے والا کافر ہے۔

اس لیے کہ جادو کا سارا مدار شیاطین، ارواح خبیثہ اور ستاروں پر ہوتا ہے یعنی جادوگر دوسروں پر برا اثر ڈالنے اور ان کو نقصان پہنچانے کے لیے شیطانوں، خبیث روحوں اور ستاروں سے مدد لیتے ہیں۔

کہانت اور تنجیم بھی سحر کے قبیل سے ہیں۔ کاہن الکل پچو سے غیب کی باتیں بتاتا ہے اور منجم ستاروں کی چال اور ان کے طلوع وغروب کے ذریعہ غیبی امور کے علم کا دعویٰ کرتا ہے۔ نبی مکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ اَتَى كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُوْلُ ، فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلَى مُحَمَّدٍ))[1]

''جو کسی کاہن کے پاس جائے اور اس کی باتوں کی تصدیق کرے تو اس نے محمد ﷺ پر نازل ہونے والی شریعت کا انکار کیا''

نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے جن عالم بالا میں جا کر سن گن لینے کی کوشش کرتے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد عالم بالا میں اتنے سخت حفاظتی انتظامات کر دیے گئے کہ ان کے لیے آسمانوں کا رخ کرنا ناممکن ہو گیا۔ اسی کی طرف سورۃ الجن کی درج ذیل آیت میں ارشاد ہے:

﴿ وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝ ﴾

[الجن:٩]

''(جن کہتے ہیں) اور ہم آسمان میں سننے کے لیے بعض جگہوں پر بیٹھا کرتے تھے لیکن اب جو سننے کی کوشش کرتا ہے تو اپنے لیے گھات میں چمکدار شعلے کو پاتا ہے''

اور سورۃ الحجر میں اس مسئلے کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۝ وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾ [الحجر:١٦ تا ١٨]

''درحقیقت ہم نے آسمان میں بہت سی برجیاں بنا دی ہیں اور اس کو دیکھنے والوں کے لیے خوب سجا دیا ہے۔ اور ہر شیطان مردود سے اس کو محفوظ کر دیا ہے۔ اگر کوئی کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک روشن شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے''

رسول اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل شیاطین اور جنات آسمانوں میں جا کر کچھ سن گن لینے کی کوشش اس لیے کرتے تھے تا کہ وہ زمین میں کاہنوں، نجومیوں اور جادوگروں کو عالم بالا کی بعض خبریں، ان میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر پہنچائیں۔ اور یہ کاہن، نجومی اور جادوگر ان کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کریں۔

[1] جامع ترمذی: ح ١٣٥۔ سنن ابن ماجہ: ٥٢٨، ٦٤٤

چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((إِذَا قَضَى اللّٰهُ الْأَمْرَ فِي السَّمَاءِ، ضَرَبَتِ الْمَلَائِكَةُ بِأَجْنِحَتِهَا خُضْعَانًا لِقَوْلِهِ كَالسِّلْسِلَةِ عَلَى صَفْوَانٍ، فَإِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ قَالُوا: مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ: قَالُوا لِلَّذِي قَالَ: الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ۔ فَيَسْمَعُهَا مُسْتَرِقُو السَّمْعِ وَمُسْتَرِقُو السَّمْعِ هَكَذَا، وَاحِدٌ فَوْقَ آخَرَ، فَرُبَّمَا أَدْرَكَ الشِّهَابُ الْمُسْتَمِعَ قَبْلَ أَنْ يَرْمِيَ بِهَا إِلَى صَاحِبِهِ فَيُحْرِقَهُ، وَرُبَّمَا لَمْ يُدْرِكْهُ، حَتَّى يَرْمِيَ بِهَا إِلَى الَّذِي يَلِيهِ، إِلَى الَّذِي هُوَ أَسْفَلَ مِنْهُ، حَتَّى يُلْقُوهَا إِلَى الْأَرْضِ، فَتُلْقَى عَلَى فَمِ السَّاحِرِ، فَيَكْذِبُ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ، فَيُصَدَّقُ، فَيَقُولُونَ: أَلَمْ يُخْبِرْنَا يَوْمَ كَذَا وَكَذَا وَيَكُونُ كَذَا وَكَذَا؟ فَوَجَدْنَاهُ حَقًّا، لِلْكَلِمَةِ الَّتِي سُمِعَتْ مِنَ السَّمَاءِ))[1]

"جب اللہ آسمان میں کوئی فیصلہ صادر کرتا ہے تو فرشتے اس کے فیصلے کی اطاعت میں اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہیں اور ان سے ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسی کسی چکنی چٹان پر زنجیر رگڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جب فرشتوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو وہ دریافت کرتے ہیں: تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ چنانچہ وہ یہ سوال کرنے والے سے کہتے ہیں: (ہمارے رب نے) حق فرمایا، اور وہ بلند و بالا اور بہت بڑا ہے۔ فرشتوں کی ان باتوں کو چوری چھپے سننے والے (شیاطین و جن) سن لیتے ہیں اور چوری چھپے سننے والے اس طرح ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں۔ بسا اوقات تیز شعلہ فرشتوں کی باتیں سننے والے کو، قبل اس کے کہ وہ اس کو اپنے ساتھی تک پہنچائے دھر لیتا اور اس کو جلا دیتا ہے۔ اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ شعلہ اس کو نہیں پکڑ پاتا یہاں تک کہ سننے والا جن فرشتوں کی باتوں کو اپنے سے قریب یعنی اپنے نیچے والے جن کو پہنچا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ان کو زمین پر پھینکتے ہیں اور وہ باتیں جادوگر کے منہ میں ڈال دی جاتی ہیں۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ مزید سو جھوٹ ملا دیتا ہے اور ان کو سچ مان لیا جاتا ہے۔ کاہن اور جادوگر کہتے ہیں: کیا فلاں دن ہمیں اس نے (جادوگر نے) یہ خبر نہیں دی تھی کہ ایسا اور ایسا ہوگا اور ہم نے اس کو اس "کلمہ" کی وجہ سے سچ

[1] صحیح البخاري: ح ٤٧٠١، ٤٨٠٠

نہیں پایا؟ جو آسمان سے سنا گیا تھا؟"

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جادو کو ان سات گناہوں میں سے ایک بڑا گناہ قرار دیا ہے جو انتہائی مہلک اور تباہ کن ہیں اور ان میں سے بعض کے ارتکاب سے ایک مسلمان اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ حدیث پاک کے الفاظ ہیں:

((اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! وَمَا هُنَّ؟ قَالَ: الشِّرْكُ بِاللّٰهِ، وَالسِّحْرُ، وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ، وَأَكْلُ الرِّبَا، وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ وَالتَّوَلِّي يَوْمَ الزَّحْفِ، وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ))[1]

"سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! وہ کیا ہیں؟ فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادوگری، کسی ایسی جان کو ناحق قتل کرنا جسے اللہ نے حرام کیا ہے، سود کا مال کھانا، یتیم کا مال کھانا، جہاد میں دشمن کے مقابلے سے پیٹھ پھیر کر بھاگنا اور پاکدامن مومن بھولی بھالی عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگانا"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو:

صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن نسائی اور ابن ماجہ میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیے جانے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ ذیل میں صحیح بخاری کی حدیث کا متن اور اس کا ترجمہ درج کر رہا ہوں۔ جس کے بعد یہ واضح کیا جائے گا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر آپ کی نبوت کے منافی نہیں ہے۔

((عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ سَحَرَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ مِنْ بَنِي زُرَيْقٍ، يُقَالُ لَهُ لَبِيدُ بْنُ الْأَعْصَمِ، حَتَّى كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ أَنَّهُ كَانَ يَفْعَلُ الشَّيْءَ، وَمَا فَعَلَهُ، حَتَّى إِذَا كَانَ ذَاتَ يَوْمٍ أَوْ ذَاتَ لَيْلَةٍ وَهُوَ عِنْدِي، لَكِنَّهُ دَعَا وَدَعَا، ثُمَّ قَالَ: يَا عَائِشَةُ! أَشَعَرْتِ أَنَّ اللّٰهَ أَفْتَانِي فِيمَا اسْتَفْتَيْتُهُ فِيهِ؟ أَتَانِي رَجُلَانِ فَقَعَدَ أَحَدُهُمَا عِنْدَ رَأْسِي وَالْآخَرُ عِنْدَ رِجْلَيَّ، فَقَالَ أَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهِ مَا

[1] صحیح بخاری: ح ۲۷٦٦ ۔ صحیح مسلم: ح ۸۹

وَجَعُ الرَّجُلِ؟ فَقَالَ: مَطْبُوبٌ، قَالَ: مَنْ طَبَّهُ؟ قَالَ: لَبِيدُ بْنُ الْأَعْصَمِ، قَالَ: فِي أَيِّ شَيْءٍ؟ قَالَ: فِي مُشْطٍ وَمُشَاطَةٍ وَجُفِّ طَلْعِ نَخْلَةٍ ذَكَرٍ، قَالَ: وَأَيْنَ هُوَ؟ قَالَ: فِي بِئْرِ ذَرْوَانَ، فَأَتَاهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي نَاسٍ مِنْ أَصْحَابِهِ، فَجَاءَ فَقَالَ: يَا عَائِشَةُ! كَأَنَّ مَاءَهَا نُقَاعَةُ الْحِنَّاءِ وَكَأَنَّ رُؤُسَ نَخْلِهَا رُؤُسُ الشَّيَاطِينِ". قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَفَلَا اسْتَخْرَجْتَهُ قَالَ: قَدْ عَافَانِي اللَّهُ فَكَرِهْتُ أَنْ أُثِيرَ عَلَى النَّاسِ فِيهِ شَرًّا." فَأَمَرَ بِهَا فَدُفِنَتْ))[1]

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ بنو زریق کے ایک آدمی نے، جس کا نام لبید بن اعصم تھا رسول اللہ ﷺ پر جادو کر دیا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کو کسی کام کے بارے میں یہ خیال ہوتا کہ آپ نے وہ کام کر لیا ہے حالانکہ وہ نہیں کیا ہوتا تھا۔ آخر ایک دن یا ایک رات آپ میرے ہاں تھے اور آپ نے اللہ سے بار بار دعا مانگی۔ پھر فرمایا: اے عائشہ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ نے مجھے وہ بات بتا دی ہے جو میں نے اس سے پوچھی تھی۔ میرے پاس دو آدمی آئے، ان میں سے ایک میرے سرہانے بیٹھ گیا اور دوسرا پائنتی کے پاس۔ میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے پوچھا: آدمی کو کیا تکلیف ہے؟ تو اس نے جواب دیا: ان پر جادو کیا گیا ہے۔ اس نے پوچھا: کس نے کیا ہے؟ جواب دیا: لبید بن اعصم نے۔ دریافت کیا: کس چیز میں؟ جواب دیا: کنگھی اور بالوں میں، ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف کے اندر۔ اس کے ساتھی نے پوچھا: وہ کہاں ہے؟ کہا: ذروان کے کنویں میں۔ پس رسول اللہ ﷺ اپنے چند اصحاب کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے اور جب واپس تشریف لائے تو فرمایا: اے عائشہ! اس کنویں کا پانی ایسا تھا گویا اس میں مہندی گھول دی گئی ہو اور اس کے کھجور کے سرے شیطانوں کے سر کی مانند تھے۔'' میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے اس کا اعلان کیوں نہ کیا؟ فرمایا: اللہ نے مجھے شفا دے دی لہٰذا مجھے یہ ناپسند ہے کہ اس کے بارے میں لوگوں میں برائی پھیلاؤں۔ پس آپ نے حکم دیا اور اس کو دفن

[1] صحیح بخاری: ح ۳۲۶۸، ۵۷۶۳، ۵۷۶۶، ۶۰۶۳، ۶۳۹۱۔ صحیح مسلم: ح ۲۱۸۹۔ سنن نسائی ح ۴۰۹۱، ابن ماجہ: ۲۸۷۲، ۳۶۱۱۔

کر دیا گیا“

اوپر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں جن ”دو آدمیوں“ کا ذکر آیا ہے وہ درحقیقت دو فرشتے تھے جو انسانی شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ چنانچہ سنن نسائی میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے جو حدیث مروی ہے اس میں یہ صراحت ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تھی کہ آپ پر ایک یہودی نے جادو کیا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

((عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ، قَالَ: سَحَرَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ مِنَ الْيَهُوْدِ، فَاشْتَكَى لِذَٰلِكَ أَيَّامًا، فَأَتَاهُ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ: إِنَّ رَجُلًا مِنَ الْيَهُوْدِ سَحَرَكَ، عَقَدَ لَكَ عُقَدًا فِيْ بِئْرِ كَذَا وَكَذَا، فَأَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَاسْتَخْرَجُوْهَا، فَجِيْءَ بِهَا، فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَأَنَّمَا نُشِطَ مِنْ عِقَالٍ، فَمَا ذَكَرَ ذَٰلِكَ لِذَٰلِكَ الْيَهُوْدِيِّ، وَلَا رَآهُ فِيْ وَجْهِهِ قَطُّ))[1]

”حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: ایک یہودی مرد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا جس کی وجہ سے کئی روز تک آپ کی طبیعت ناساز رہی۔ پھر جبریل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ایک یہودی مرد نے آپ پر جادو کر دیا ہے۔ اس نے آپ کے لیے کئی گرہیں لگائی ہیں جو اس اس طرح کے کنویں میں ہیں۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو بھیجا جنھوں نے ان گرہوں کو نکالا اور وہ آپ کے پاس لائی گئیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کھڑے ہوئے گویا کسی بندھن یا قید سے آزاد کر دیے گئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کا نہ اس یہودی سے ذکر کیا اور نہ اس کو اپنے سامنے کبھی دیکھا“

اس حدیث میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے واقعہ کے بیان میں بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ البتہ اس سے اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو آپ کی خدمت میں بھیجا تھا جنھوں نے آپ کو یہ خبر دی کہ آپ پر جادو کیا گیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ صحیح بخاری کی حدیث میں مذکور دونوں مردوں میں

[1] سنن نسائی: ح ۴۰۹۱

سے ''سوال کرنے والے حضرت میکائیل علیہ السلام تھے اور جواب دینے والے حضرت جبریل علیہ السلام۔

انہوں نے اس واقعہ سے متعلق تمام روایتوں کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

نبی کریم ﷺ اس کنویں کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ نے اس میں جھانکا اور ایک آدمی کنویں میں اترا اور کھجور کے اس خوشے کو نکالا جس میں موم کا ایک پتلا بھی تھا جس میں سوئیاں چبھی ہوئی تھیں اور ایک تانت میں گیارہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔ جبریل علیہ السلام ''معوذتین'' لے کر نازل ہوئے اور آپ سے ان کو پڑھنے کے لیے کہا۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو پڑھنا شروع کیا۔ آپ ایک آیت پڑھتے جس کے ساتھ ایک گرہ کھولتے اور پتلے سے ایک سوئی نکالتے۔ سوئی نکالتے وقت آپ درد محسوس کرتے۔ پھر آپ کو آرام آ جاتا۔ اور جب معوذتین کی گیارہ آیتوں کی تلاوت کے ساتھ ساتھ گیارہ گرہیں کھول دی گئیں اور ساری سوئیاں نکال دی گئیں تو نبی مکرم ﷺ ایسے ہو گئے جیسے کسی بندھن سے آزاد کر دیے گئے ہوں۔[1]

رسول اللہ ﷺ پر جادو کا اثر منصب نبوت کے منافی نہیں:

صحیح احادیث میں رسول اللہ ﷺ پر جادو کیے جانے اور آپ کی صحت پر اس کے اثر انداز ہونے کا جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ اس تحفظ اور عصمت کے منافی نہیں ہے جس کا ذکر سورۃ المائدہ میں آیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ط ﴾ [المائدہ:٦٧]

''اے رسول! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ (لوگوں تک) پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تم کو (لوگوں کے شر سے) محفوظ رکھے گا''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کے لیے جس حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اس کا تعلق تبلیغ دین سے ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ شیاطین جن وانس اگر ایک ساتھ مل کر آپ کو تبلیغ دین اور دعوتِ حق کی نشر و اشاعت سے باز رکھنے کی کوشش کریں تو کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ یہ دین پھیلے گا اور کفر و شرک کی تاریکی چھٹے گی۔

---

[1] فتح الباری: ص ۲۵۶۰، ج ۳، بتصرف

﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝ ﴾ [التوبة:٣٣]

”وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پوری جنسِ دین پر غالب کردے۔ خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو“

اسی طرح نبی کریم ﷺ کی عصمت وحفاظت اور اسلام کے غلبہ کا وعدہ اس امر کا بھی متقاضی تھا کہ دشمنانِ اسلام رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے پر قادر نہیں تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے محفوظ ومعصوم ہونے کے معنی یہ بھی ہیں کہ شیاطین جن وانس میں سے کوئی بھی آپ کے فرائض رسالت میں خلل انداز ہونے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ آپ کے خیالات اور آپ کی زبانِ مبارک کو بھی مکمل عصمت حاصل تھی اور کسی بھی حال میں آپ نے نہ کوئی غلط بات سوچی اور نہ زبان مبارک سے کبھی کوئی غلط بات نکالی تھی۔

﴿ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی۝ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۝ ﴾ [النجم:٢-٤]

”تمہارا ساتھی نہ بھٹکا ہے اور نہ بہکا ہے۔ اور وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا۔ یہ تو صرف ایک وحی ہے جو اس کو کی جاتی ہے“

قرآن پاک اپنے نزول سے لے کر رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہونے تک شیاطین کی دسترس سے مکمل طور پر محفوظ رہا ہے۔

﴿ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّیٰطِیْنُ۝ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهُمْ وَمَا یَسْتَطِیْعُوْنَ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ۝ ﴾ [الشعراء:٢١٠، ٢١٢]

”اس (قرآن) کو شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں اور نہ ایسا کرنا ان کے شایانِ شان ہے۔ اور نہ وہ اس کی استطاعت ہی رکھتے ہیں۔ وہ تو اس کی سماعت تک سے دور رکھے گئے ہیں۔“

رسول اکرم ﷺ کو خواب اور بیداری ہر حالت میں شیطانی وسوسوں اور برے خیالات سے تحفظ حاصل تھا۔ فرمایا:

((یَا عَائِشَةُ! إِنَّ عَیْنَیَّ تَنَامَانِ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ))[1]

[1] صحیح بخاری: ١١٤٧، ٢٠١٣۔ صحیح مسلم: ح ٧٣٨

''اے عائشہ! میری آنکھیں تو سوتی ہیں مگر میرا دل نہیں سوتا''

لیکن رسول اللہ ﷺ کو بشر ہونے کے ناطے جب زخمی کیا جا سکتا تھا اور آپ کو زخمی کیا بھی گیا۔ جیسا کہ غزوۂ احد میں آپ کے چہرۂ مبارک کو زخمی کر دیا گیا تھا اور آپ کے سامنے کے چار دانت شہید کر دیے گئے تھے۔ خود کی دو کڑیاں چہرۂ مبارک کے اندر گھس گئیں اور خون جاری ہو گیا۔ چنانچہ حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((لَمَّا كُسِرَتْ بَيْضَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى رَأْسِهِ وَأُدْمِيَ وَجْهُهُ وَكُسِرَتْ رَبَاعِيَتُهُ وَكَانَ عَلِيٌّ يَخْتَلِفُ بِالْمَاءِ فِي الْمِجَنِّ، وَكَانَتْ فَاطِمَةُ تَغْسِلُهُ، فَلَمَّا رَأَتِ الدَّمَ يَزِيدُ عَلَى الْمَاءِ كَثْرَةً، عَمَدَتْ إِلَى حَصِيرٍ فَأَحْرَقَتْهَا وَأَلْصَقَتْهَا عَلَى جُرْحِهِ فَرَقَأَ الدَّمُ))[1]

''جب نبی کریم ﷺ کا خود آپ کے سر مبارک پر توڑ دیا گیا اور آپ کے چہرہ انور کو زخمی کر دیا گیا اور آپ کے سامنے کے چاروں دانت توڑ دیے گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ڈھال میں پانی لاتے تھے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا زخم کو دھوتی تھیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ پانی کے ساتھ خون زیادہ نکلنے لگا ہے تو انہوں نے ایک چٹائی کی طرف رخ کیا، اس کو جلایا اور اس کی راکھ آپ کے زخم پر چپکا دی تب خون بند ہو گیا۔''

اور بشر ہونے کے ناطے آپ کے جسم مبارک پر زہر کا اثر بھی ہو سکتا تھا اور ہوا بھی۔ جیسا کہ بکری کے گوشت کا ایک زہر آلود ٹکڑا صرف منہ میں رکھ لینے سے ہوا تھا حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اس ٹکڑے کو نگلنے کی بجائے تھوک دیا تھا۔ پھر بھی اس کا اثر آپ پر آپ کی زندگی کی آخری سانس تک باقی رہا۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں:

((لَمَّا فُتِحَتْ خَيْبَرُ أُهْدِيَتْ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَاةٌ فِيهَا سُمٌّ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِجْمَعُوا إِلَيَّ مَنْ كَانَ هَا هُنَا مِنْ يَهُودَ، فَجُمِعُوا لَهُ، فَقَالَ: إِنِّي سَائِلُكُمْ عَنْ شَيْءٍ، فَهَلْ أَنْتُمْ صَادِقِيَّ عَنْهُ؟ فَقَالُوا: نَعَمْ۔ قَالَ لَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ أَبُوكُمْ؟ قَالُوا: فُلَانٌ۔ فَقَالَ:

[1] صحیح بخاری: ح ۲۴۳، ۲۹۰۳، ۲۹۱۱، ۳۰۳۷، ۴۰۷۵، ۵۲۴۸، ۵۷۲۲۔ صحیح مسلم: ۱۷۹۰

كَذَبْتُمْ ، بَلْ أَبُوكُمْ فُلَانٌ۔ قَالُوا: صَدَقْتَ ، قَالَ: فَهَلْ أَنْتُمْ صَادِقِيَّ عَنْ شَيْءٍ إِنْ سَأَلْتُ عَنْهُ؟ فَقَالُوا: نَعَمْ يَا أَبَا الْقَاسِمِ ، وَإِنْ كَذَبْنَا عَرَفْتَ كَذِبَنَا كَمَا عَرَفْتَهُ فِي أَبِينَا ، فَقَالَ لَهُمْ: مَنْ أَهْلُ النَّارِ؟ قَالُوا: نَكُونُ فِيهَا يَسِيرًا ، ثُمَّ تَخْلُفُونَا فِيهَا۔ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اخْسَئُوا فِيهَا ، وَاللَّهِ لَا نَخْلُفُكُمْ فِيهَا أَبَدًا ، ثُمَّ قَالَ: هَلْ أَنْتُمْ صَادِقِيَّ عَنْ شَيْءٍ إِنْ سَأَلْتُكُمْ عَنْهُ؟ قَالُوا: نَعَمْ يَا أَبَا الْقَاسِمِ ، قَالَ: هَلْ جَعَلْتُمْ فِي هَذِهِ الشَّاةِ سُمًّا؟ قَالُوا: نَعَمْ۔ قَالَ: مَا حَمَلَكُمْ عَلَى ذَلِكَ؟ قَالُوا: أَرَدْنَا إِنْ كُنْتَ كَاذِبًا نَسْتَرِيحُ ، وَإِنْ كُنْتَ نَبِيًّا لَمْ يَضُرَّكَ)) [1]

''جب خیبر فتح ہو گیا تو نبی مکرم ﷺ کی خدمت میں ایک زہر آلود بکری تحفے میں بھیجی گئی۔ اس پر نبی معظم ﷺ نے فرمایا: یہاں جو یہودی ہوں ان کو میرے پاس جمع کرو۔ چنانچہ ان کو جمع کیا گیا۔ آپ نے فرمایا: میں تم لوگوں سے ایک چیز کے بارے میں پوچھنے جا رہا ہوں۔ کیا تم لوگ اس کے بارے میں مجھ سے صدق بیانی سے کام لو گے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا: تمہارا باپ کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا: فلاں۔ آپ نے فرمایا: تم جھوٹے ہو۔ بلکہ تم لوگوں کا باپ فلاں ہے۔ انہوں نے عرض کیا: آپ نے سچ فرمایا۔ آپ نے فرمایا: اگر میں تم سے کسی چیز کے بارے میں دریافت کروں تو کیا تم اس کے بارے میں مجھے صحیح بات بتاؤ گے؟ انہوں نے جواب دیا: اے ابوالقاسم! ہاں۔ کیونکہ اگر ہم نے کذب بیانی سے کام لیا تو آپ کو ہمارا جھوٹ معلوم ہو جائے گا۔ جس طرح آپ نے ہمارے باپ کے بارے میں ہماری غلط بیانی جان لی ہے۔ نبی معظم ﷺ نے ان سے فرمایا: جہنمی کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ہم جہنم میں بہت تھوڑی مدت رہیں گے۔ پھر ہمارے بعد آپ لوگ اس میں آ جائیں گے۔ آپ نے فرمایا: تم لوگ اس میں ذلیل و خوار ہو کر پڑے رہو۔ اللہ کی قسم تمہارے بعد ہم اس میں کبھی نہیں داخل ہوں گے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا تم لوگ اس چیز کے بارے میں مجھ سے صحیح بات بتاؤ گے جس کے بارے میں، تم سے میں سوال کروں؟ انہوں نے کہا: اے ابوالقاسم ہاں۔ آپ نے فرمایا: کیا تم لوگوں نے اس بکری میں زہر ملایا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں۔ نبی

[1] صحیح بخاری: ح ۳۱۶۹، ۴۲۴۹، ۵۷۷۷

معظم ﷺ نے فرمایا: تم لوگوں کو ایسا کرنے پر کس چیز نے آمادہ کیا؟ انہوں نے عرض کیا: ایسا کرنے سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ دعویٰ نبوت میں جھوٹے ہیں تو ہم (آپ سے) چھٹکارا پالیں گے اور اگر آپ نبی ہیں تو یہ زہر آپ کو نقصان نہ پہنچا سکے گا۔"

مرض الموت میں رسول اکرم ﷺ پر اس زہر کا اثر پوری شدت سے ظاہر ہوگیا تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

((كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ فِي مَرَضِهِ الَّذِي مَاتَ فِيهِ: يَا عَائِشَةُ مَا أَزَالُ أَجِدُ أَلَمَ الطَّعَامِ الَّذِي أَكَلْتُ بِخَيْبَرَ، فَهٰذَا أَوَانٌ وَجَدْتُ انْقِطَاعَ أَبْهَرِي مِنْ ذٰلِكَ السُّمِّ))[1]

"نبی مکرم ﷺ اپنی اس بیماری میں جس میں آپ کی وفات ہوئی فرماتے تھے: اے عائشہ! خیبر میں جو کھانا میں نے تناول کرلیا تھا اس کی تکلیف برابر محسوس کر رہا ہوں اور یہ وقت ایسا ہے کہ میں اس زہر کی وجہ سے اپنی رگِ جاں کٹتی ہوئی پا رہا ہوں"

رسول اللہ ﷺ پر کیے جانے والے جادو کا جو اثر ہوا تھا وہ آپ کے بحیثیت انسان اور بشر کے ہوا تھا بحیثیت نبی اور رسول کے نہیں۔ اور اس واقعہ سے متعلقہ تمام روایتوں کو سامنے رکھنے سے جو صورتحال بنتی ہے وہ یہ کہ آپ کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کرلیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا۔ اپنی ازواج مطہرات کے متعلق خیال فرماتے کہ آپ ان کے پاس تشریف لے گئے ہیں مگر ایسا نہ ہوا ہوتا۔ اور یہ تمام اثرات آپ کی ذات تک محدود رہے۔ دوسروں کو یہ معلوم نہ ہوسکا کہ آپ پر کیا گزر رہی ہے حتیٰ کہ ازواج مطہرات پر بھی آپ کی یہ کیفیت مخفی رہی۔ رہی آپ ﷺ کے نبی ہونے کی حیثیت اور آپ کے کارِ رسالت کا معاملہ تو ان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا تھا۔ کسی بھی روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس زمانے میں آپ قرآن پاک کی کوئی آیت بھول گئے ہوں یا آپ نے کوئی آیت غلط پڑھ دی ہو۔ یا کوئی نماز آپ سے چھوٹ گئی ہو۔ یا کم از کم دنیاوی اعمال کی طرح یہ خیال ہی ہوا ہو کہ فلاں نماز پڑھ لی ہے اور واقعتاً آپ نے وہ نماز نہ پڑھی ہو۔[2] حالانکہ جو جادو آپ پر کیا گیا تھا وہ حد درجہ محکم تھا اور جن چیزوں میں جادو کرکے ان کو جس جگہ چھپایا گیا تھا وہاں تک کسی کا خیال تک نہ جا سکتا تھا۔ پھر بھی اللہ نے اپنے اور اپنے محبوب رسول ﷺ وبارک وسلم تسلیما کثیرا کے دشمنوں کے اس ناپاک منصوبے کو ناکام بنادیا۔

---

[1] صحيح بخاری ح ٤٤٢٨ [2] دیکھئے: فتح الباری: ص ٢٥٥٩، ج٣ بتصرف

رسول اکرم ﷺ پر کیے جانے والے جادو سے متعلقہ صحیح روایتوں اور سورۃ الفلق کی چوتھی آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جادوگر یا جادوگرنیاں جس شخص پر جادو کرنا چاہتے ہوں اس کی کوئی خاص چیز مثلاً ''بال'' وغیرہ حاصل کر کے اس پر بعض دوسری چیزوں کے ساتھ جادو کرتے ہیں اور اس سلسلے میں دھاگے یا تانت میں گرہیں ڈالتے ہوئے ان میں شیطانی کلمات پھونکتے ہیں۔

سورۃ الفلق کی چوتھی آیت میں النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ..... آیا ہے۔ جس کے معنی ہیں ''گرہوں میں پھونکنے والیاں کے'' اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ناپاک اور شیطانی عمل کا ارتکاب زیادہ تر عورتیں کرتی ہیں۔

سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کے شان نزول، نبی کریم ﷺ پر سے جادو کو اتارنے کے لیے اس کی تلاوت اور رسول اللہ ﷺ کے متعدد ارشادات میں ان کے فضائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں عظیم سورتوں کی صبح و شام تلاوت سے جہاں ایک مومن آدمی شیاطینِ جن و انسان کی برائیوں اور اذیتوں سے محفوظ رہ سکتا ہے وہیں کسی سحر زدہ انسان پر ان کو پڑھ کر دم کر کے جادو کو بے اثر بنایا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں عظیم سورتیں درحقیقت دعا ہیں جنہیں ایک مؤمن آدمی صبح کے رب، لوگوں کے رب، لوگوں کے بادشاہ اور لوگوں کے حقیقی معبود کی پناہ میں آکر شیاطین جن و انس کی شر انگیزیوں سے تحفظ کی درخواست کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے: جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ○ ﴾ [البقرة:١٨٦]

''اے نبی! جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو میں قریب ہی ہوں۔ اور پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ میرے احکام کو قبول کریں اور میرے اوپر ایمان لائیں تاکہ وہ راہ ہدایت پالیں۔''

سورج اور چاند:

قرآن پاک میں سورج کو سراج اور چاند کو نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سراج کے معنی چراغ کے ہیں جبکہ نور روشنی کو کہتے ہیں۔ سورۃ النبا کی تیرہویں آیت میں سورج کو ''سِرَاجًا وَّهَّاجًا'' فرمایا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ○ ﴾

''اور ہم نے ایک نہایت روشن اور شعلہ زن چراغ بنایا''

وَهَجَ يَهِجُ کے معنی ہیں نہایت روشن ہونا، شعلہ زن ہونا وغیرہ۔

سورج حد درجہ گرم ہے اور اس کی روشنی اس قدر تیز ہے کہ زمین سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دور ہونے کے باوجود برہنہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنا ناممکن ہے۔ جدید سائنس کے مطابق اس کا درجہ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین سے اتنے فاصلے پر رکھا ہے کہ وہ زمین پر بسنے والے انسانوں اور دوسرے جانداروں کو زندگی کا سامان فراہم کر رہا ہے۔

کتاب و سنت میں سورج اور چاند کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں بیان ہوئی ہے۔ جن روایتوں میں سورج اور چاند کی تخلیق نیز سورج کی حرارت اور رفتار وغیرہ بیان کی گئی ہے ان میں سے کوئی بھی روایت صحیح نہیں ہے۔ مثلاً:

۱۹۵ ......إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى خَلَقَ شَمْسَيْنِ مِنْ نُوْرِ عَرْشِهِ۔

''درحقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورج اور چاند کو اپنے عرش کے نور سے پیدا کیا ہے''

یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج حافظ سیوطی نے الآلی المصنوعة میں اس سند سے کی ہے:

ابوبکر احمد بن موسیٰ بن مردویہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: ہم سے عبداللہ بن اسماعیل بن ابراہیم ہاشمی نے بیان کیا۔ کہا: ہم سے محمد بن احمد بن براء نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالمنعم بن ادریس نے اپنے باپ سے، انہوں نے وہب بن منبہ سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......

حافظ سیوطی نے یہ سند نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: عبدالمنعم بن ادریس کذاب تھا...... وہ آگے لکھتے ہیں: ابن مردویہ نے ایک دوسری روایت ایک دوسری سند سے بیان کی ہے۔ جس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

۱۹۶ ......أَلَا أُحَدِّثُكُمْ بِمَا سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِي الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَبَدْءِ خَلْقِهِمَا وَمَصِيْرِ أَمْرِهِمَا، فَقُلْنَا: بَلَى يَرْحَمُكَ اللّٰهُ۔ فَقَالَ: إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالَ: إِنَّ اللّٰهَ لَمَّا أَبْرَمَ خَلْقَهُ إِحْكَامًا، فَلَمْ يَبْقَ مِنْ خَلْقِهِ إِلَّا آدَمَ خَلَقَ شَمْسَيْنِ مِنْ نُوْرِ عَرْشِهِ......

’’کیا میں تم لوگوں سے وہ حدیث نہ بیان کروں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سورج، چاند، ان کی پیدائش اور ان کے انجام کے بارے میں فرماتے ہوئے سنی ہے؟ ہم نے عرض کیا: کیوں نہیں۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ فرمایا: بے شک رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا تھا، آپ نے فرمایا: جب اللہ نے تخلیق کا فیصلہ کر لیا اور اس کی تخلیق سے صرف آدم کا پیدا کیا جانا باقی رہ گیا تو اس نے اپنے عرش کے نور سے سورج اور چاند کو پیدا کیا......‘‘

اس روایت کی سند میں نوح بن ابی مریم شامل ہے جو بہت بڑا جھوٹا اور وضاع حدیث تھا۔[1]

۱۹۷ ......وُكِّلَ بِالشَّمْسِ تِسْعَةُ أَمْلَاكٍ، يَرْمُوْنَهَا بِالثَّلْجِ كُلَّ يَوْمٍ، لَوْلَا ذٰلِكَ مَا أَتَتْ عَلٰى شَيْئٍ إِلَّا أَحْرَقَتْهُ۔

’’سورج کے ساتھ ۹ فرشتوں کو لگا دیا گیا ہے جو اس پر ہر روز برف ڈالتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جس چیز پر اس کی روشنی پڑتی اس کو جلا ڈالتی۔‘‘

یہ ایک موضوع اور جھوٹی روایت ہے۔ نبی مکرم ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔

اس کی تخریج امام ابن عدی نے الکامل[2] میں اور انہی کے حوالہ سے امام ابن الجوزی نے الواھیات[3] میں۔ حافظ طبرانی نے المعجم الکبیر[4] میں، ابو حفص کنانی نے الامالی[5] میں، حافظ ابو عمر سمرقندی نے الفوائد المنتقاۃ[6] میں اور خطیب بغدادی نے الموضح[7] میں اس سند سے کی ہے:

عفیر بن معدان سے روایت ہے، وہ سلیمان بن عامر الخبائری سے روایت کرتے ہیں وہ ابو امامہ سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے۔

حافظ ابو محمد السراج قاری، امام ابن عدی اور امام ابن الجوزی کا قول ہے:

یہ ضعیف حدیث ہے۔ جو ہمارے علم کے مطابق صرف عفیر بن معدان نے روایت کی ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں: یہ بے حد ضعیف ہے۔ جب کہ ہیثمی نے مجمع الزوائد[8]

---

[1] تفسیر ابن مردویہ: ص ٥٦، ج ١
[2] الکامل: ص ٢٣٠، ج ٢
[3] الواھیات: ص ٣٤، ج ١
[4] المعجم الکبیر: ص ١٩٧، ج ٨، ح ٧٧٠٥
[5] الامالی: ص ٩، ج ١
[6] المنتقاۃ: ص ٧١، ج ١
[7] الموضح: ص ٧٩، ١٦٥-١٦٦، ج ٢
[8] مجمع الزوائد: ص ١٣١، ج ٨

میں لکھا ہے:

اور عبدالرؤف مناوی نے ہیثمی کے عفیر کو ضعیف قرار دینے کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

اس روایت کی غرابت کو صرف عفیر کے سر تھوپنے کے معنی ہیں کہ اس کی روایت کرنے والوں میں کوئی دوسرا ضعیف اور نا قابل اعتبار نہیں ہے جبکہ صورت واقعہ اس کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس کی سند میں مسلمہ بن علی خشنی بھی ہے جس کے بارے میں امام ذھبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے: وہ حد درجہ ضعیف ہے اور ائمہ حدیث نے اس کو متروک قرار دیا ہے اور اس کی روایت کردہ حدیثوں کو منکر بتایا ہے۔ اور مثال میں یہی روایت پیش کی ہے۔

محدث البانی رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں:

اس روایت کی سند سے زیادہ اس کا متن موضوع ہے۔ کیونکہ یہ کلام نبوت و رسالت کی علامتوں سے عاری ہے اور اس پر اسرائیلیات کی چھاپ ہے۔ اس کے متن اور مضمون کے موضوع ہونے کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ یہ علم فلک سے ثابت حقیقت کے خلاف ہے۔ علم فلک کی رو سے زمین پر پائے جانے والے حیوانات و نباتات کے نہ جلنے کا سبب یہ ہے کہ سورج زمین سے بہت زیادہ دور ہے۔[1]

ایک صحیح حدیث میں قیامت کے دن کی شدید گرمی کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ اس دن سورج کو لوگوں کے قریب کر دیا جائے گا۔ حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: تُدْنَى الشَّمْسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْخَلْقِ حَتَّى تَكُوْنَ مِنْهُ كَمِقْدَارِ مِيْلٍ، قَالَ: فَيَكُوْنُ النَّاسُ عَلَى قَدْرِ أَعْمَالِهِمْ فِي الْعَرَقِ، فَمِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ إِلَى كَعْبَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ إِلَى رُكْبَتَيْهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ إِلَى حَقْوَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يُلْجِمُهُ الْعَرَقُ إِلْجَامًا))[2]

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے دن سورج مخلوق سے قریب کر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ ان سے ایک میل کے بقدر فاصلے پر ہوگا اور لوگ اپنے گناہوں کے بقدر عرق آلود ہوں گے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کے ٹخنوں تک پسینہ ہوگا، کچھ لوگوں کے گھٹنوں تک اور بعض کی کمر تک اور بعض لوگوں کو پسینہ لگام لگا دے گا"

---

[1] دیکھئے: الضعیفہ: ص ٤٦١-٤٦٢، ج١، ح ٢٩٣

[2] صحیح مسلم حدیث نمبر: ٧٢٠٦-٢٨٦٤

یعنی ان کے منہ تک پہنچ جائے گا۔

اس صحیح حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دنیا میں سورج انسانوں، دوسرے جانداروں اور نباتات کو اس وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچاتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک خاص دوری پر رکھ دیا ہے۔

۱۹۸......قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِجِبْرِيْلَ: هَلْ زَالَتِ الشَّمْسُ؟ فَقَالَ: لَا، نَعَمْ۔ فَقَالَ: كَيْفَ تَقُوْلُ: لَا، نَعَمْ؟ فَقَالَ: مِنْ حِيْنَ قُلْتُ لَا إِلَى أَنْ قُلْتُ نَعَمْ سَارَتِ الشَّمْسُ مَسِيْرَةَ خَمْسَمِائَةِ عَامٍ۔

"نبی اکرم ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے دریافت فرمایا: کیا سورج اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: نہیں ہاں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم یہ کس طرح کہہ رہے ہو: نہیں ہاں؟ جبریل نے عرض کیا: جب میں نے "نہیں" کہا اس وقت سے میرے "ہاں" کہنے تک سورج نے پانچ سو سال کی مسافت طے کر لی"

یہ روایت باطل اور جھوٹ ہے۔ اس کو امام غزالی نے "احیاء العلوم"[1] میں نقل کیا ہے۔ حافظ زین الدین عراقی نے "المغنی عن حمل الاسفار" میں لکھا ہے کہ اس روایت میں مجھے کوئی اصل نہیں ملی۔[2] یعنی یہ باطل ہے۔ نبی کریم ﷺ سے اس کی نسبت صحیح نہیں ہے۔

زمین کی اساس:

۱۹۹......اَلْأَرْضُ عَلَى الْمَاءِ وَالْمَاءُ عَلَى صَخْرَةٍ وَالصَّخْرَةُ عَلَى ظَهْرِ حُوْتٍ، يَلْتَقِي حَرْفَاهُ بِالْعَرْشِ وَالْحُوْتُ عَلَى كَاهِلِ مَلَكٍ قَدَمَاهُ فِي الْهَوَاءِ۔

"زمین پانی پر ہے اور پانی ایک چٹان پر اور چٹان ایک مچھلی کی پشت پر ہے جس کے دونوں کنارے عرش سے ملے ہوئے ہیں اور مچھلی ایک ایسے فرشتے کندھے پر ہے جس کے دونوں پاؤں فضا میں معلق ہیں"

یہ روایت بھی موضوع اور جھوٹ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔

حافظ ہیثمی نے مسند الفردوس[3] میں اس کو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور لکھا ہے کہ بزار نے اس کی روایت اپنے شیخ عبداللہ بن احمد بن شبیب سے کی ہے جو ضعیف ہے۔

---

[1] احیاء العلوم: ص ۳۲-۳۳، ج ۵ [2] المغنی عن حمل الاسفار: ص ۳۳
[3] مسند الفردوس: ص ۱۳۱، ج ۸

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: عبداللہ بن احمد بن شبیب کو میں نے نہ میزان الاعتدال میں پایا نہ لسان المیزان میں۔ نہ رجال کی کسی اور کتاب میں۔ لگتا ہے کہ اس نام میں تحریف ہوگئی ہے اور روایت کے متن سے ظاہر ہورہا ہے کہ یہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے۔

پھر میں نے یہ روایت الکامل[1] میں دیکھی جو امام ابن عدی نے محمد بن حرب سے روایت کی ہے۔ انہوں نے سعید بن سنان سے، انہوں نے ابوالزاھریہ سے، انہوں نے ابوشجرہ کثیر بن مرہ سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سند نقل کرنے کے بعد ابن عدی نے لکھا ہے: سعید بن سنان نے ابوالزاھریہ سے جو حدیثیں روایت کی ہیں ان میں بیشتر غیر محفوظ یعنی شاذ ہیں۔

محدث البانی اس پر تعقیب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: سعید بن سنان بے حد ضعیف راوی ہے۔ بلکہ اس کے بارے میں جوزجانی نے یہاں تک لکھ دیا ہے: مجھے اس کی روایت کردہ حدیثوں کے موضوع ہونے کا اندیشہ ہے:

البانی آگے لکھتے ہیں: امام ذہبی نے جوزجانی کی جو موضوع حدیثیں میزان الاعتدال میں نقل کی ہیں ان میں یہ زیر بحث روایت بھی شامل ہے۔[2]

واضح رہے کہ سورۃ القلم کی ابتدا میں حرف "ن" کی تفسیر میں متعدد مفسرین نے بہت ساری روایتیں اسرائیلیات سے نقل کردی ہیں۔

۲۰۰......خَلَقَ اللّٰهُ الْاَرْضَ يَوْمَ الْأَحَدِ وَالْإِثْنَيْنِ وَخَلَقَ الْجِبَالَ يَوْمَ الثُّلَاثَاءِ وَمَا فِيهِنَّ مِنْ مَنَافِعَ وَخَلَقَ يَوْمَ الْاَرْبَعَاءِ الشَّجَرَ وَالْمَدَائِنَ وَالْعُمْرَانَ وَالْخَرَابَ، فَهٰذِهِ أَرْبَعَةٌ، ثُمَّ قَالَ: اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗ أَنْدَادًا، ذٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ، وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَا اَقْوَاتَهَا فِیْ أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِلسَّائِلِیْنَ لِمَنْ سَأَلَ، وَخَلَقَ يَوْمَ الْخَمِيْسِ السَّمَاءَ وَخَلَقَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ النُّجُوْمَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالْمَلَائِكَةَ إِلٰى سَاعَاتٍ بَقِيَتْ مِنْهُ، فَخَلَقَ مِنْ هٰذِهِ الثَّلَاثَةِ الْآجَالَ حِيْنَ يَمُوْتُ مَنْ مَاتَ، وَفِى الثَّانِيَةِ أَلْقَى الآفَةَ عَلٰى كُلِّ

[1] الکامل: ص ۱۷۵، ج ۱

[2] الضعیفہ: ص ۴۶۲۔۴۶۳، ج ۱، ح ۲۹۴

شَیْءٍ مِمَّا یَنْتَفِعُ بِهِ النَّاسُ، وَفِی الثَّالِثَةِ آدَمَ وَأَسْكَنَهُ الْجَنَّةَ وَأَمَرَ إِبْلِيسَ بِالسُّجُوْدِ لَهُ وَأَخْرَجَهُ مِنْهَا فِیْ آخِرِ سَاعَةٍ۔ قَالَتِ الْيَهُوْدُ: ثُمَّ مَاذَا يَا مُحَمَّدُ؟ قَالَ: ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ۔ قَالُوْا: قَدْ أَصَبْتَ لَوْ أَتْمَمْتَ، ثُمَّ اسْتَرَاحَ، فَغَضِبَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَضَبًا شَدِيْدًا، فَنَزَلَ: وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوْبٍ، فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُوْلُوْنَ۔

"اللہ نے زمین کو اتوار اور سوموار کے دن پیدا کیا اور منگل کے دن پہاڑ اور ان میں پائی جانے والی نفع بخش چیزیں پیدا کیں بدھ والے دن کو درخت، شہر، آبادی اور ویرانہ پیدا کیا، یہ ہیں چار چیزیں۔ پھر فرمایا: کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کر دیا اور اس کا ہمسر ٹھہراتے ہو۔ وہی تو سارے جہان کا رب ہے۔ اس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ جمائے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا (حم السجدہ:۹) اس کے لیے جو سوال کرتا ہے۔ اور جمعرات کے دن آسمان پیدا کیا اور جمعہ کو ستارے، سورج، چاند اور فرشتے پیدا کیے۔ یہاں تک کہ جمعہ کے دن میں تین گھنٹے باقی بچ گئے تو ان تین گھنٹوں میں سے پہلے گھنٹے میں موت کو پیدا کیا جس سے مرنے والا مرتے وقت دو چار ہوتا ہے۔ دوسرے گھنٹے میں ہر اس چیز پر ہلاکت نازل کر دی جس سے لوگ نفع اندوز ہوتے ہیں۔ آخری تیسرے گھنٹے میں آدم کو پیدا کیا اور ان کو جنت میں بسایا۔ پھر ابلیس کو یہ حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کرے۔ پھر اس گھنٹے کے آخری لمحے میں آدم کو جنت سے نکالا۔ یہودیوں نے کہا: اے محمد! پھر کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ عرش پر متمکن ہوا۔ اس پر انہوں نے کہا: اگر آپ نے پورا واقعہ بیان کیا ہوتا تو درست بات فرماتے۔ انہوں نے کہا: پھر اللہ نے آرام کیا یہ سن کر رسول اللہ ﷺ بے حد غضبناک ہوئے اور قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی: اور ہم نے زمین اور

آسمان کو اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کر دیا اور ہمیں کوئی تکان نہ ہوئی۔ پس اے نبی! جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کر"

یہ روایت منکر ہے۔ اس کی تخریج امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر [1] اور تاریخ [2] میں، امام حاکم نے المستدرک [3] میں اور انہی کے حوالہ سے امام بیہقی نے الاسماء والصفات [4] میں اس سند سے کی ہے۔

ہم سے ہناد بن سری نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابوبکر بن عیاش نے ابوسعید بقال سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔

ہنّاد کہتے ہیں: میں نے یہ پوری حدیث ابوبکر بن عیاش سے سنی ہے جس میں ہے کہ یہودی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا......

امام حاکم یہ نے روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے اور شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے۔ لیکن امام ذہبی نے حاکم کے اس قول کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے: ابوسعید بقال کے بارے میں امام یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ اس کی روایت کردہ حدیثیں قلم بند کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر [5] میں سورۃ حم السجدہ کی مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے یہ روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے: اس میں غرابت پائی جاتی ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری [6] میں ابوسعید بقال کے ضعیف ہونے کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

امام طبری نے یہ روایت ایک دوسری سند سے نقل کی ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی تحریر فرماتے ہیں: بلکہ یہ سند ضعیف ہے اور اس میں کئی علتیں پائی جاتی ہیں:

(۱) اس کے راوی سنان اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مابین سند منقطع ہے۔ کیونکہ ابوسنان شیبانی بُرجمی کو حضرت ابوبکر کا زمانہ نہیں ملا۔ اس لیے اس کا شمار تبع تابعین میں ہوتا ہے اس نے طاؤس، سعید بن جبیر اور ان کے طبقہ کے شیوخ سے حدیثیں روایت کی ہیں لہٰذا یہ روایت منقطع ہے۔

(۲) ابوسنان اگرچہ صحیح مسلم کے راویوں میں سے ہے۔ مگر امام احمد اور دوسرے محدثین نے اس کی

---

[1] تفسیر طبری: ص ٦١، ج ٢٤
[2] تاریخ طبری: ص ٢٣، ج ١
[3] مستدرك حاکم: ص ٧٨٨، ح ٤٠٥٠
[4] الاسماء والصفات: ح ٧٦٥
[5] تفسیر ابن کثیر: ص ٢٥٨، ج ٣
[6] فتح الباری: ص ٢١٠٨، ج ٢

ثقاہت کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس کے بارے میں لکھا ہے: سچا تھا لیکن وہم کا شکار تھا۔[1]

(۳) رہا مہران تو اس کی کنیت ابن ابی عمر عطار رازی ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس کے بارے میں لکھا ہے: وہ وہم کا مریض اور حافظہ کا برا تھا۔[2]

(۴) ابن حمید جس کا نام اور لقب محمد رازی ہے، امام ذہبی نے اس کے بارے میں لکھا ہے: وہ علم کا سمندر تھا مگر ضعیف تھا۔ حافظ ابن حجر نے بھی اس کو ضعیف قرار دیا ہے، البتہ یحییٰ بن معین اس کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔

شاید اس روایت کی اصل اسرائیلیات سے ماخوذ ہے اور بعض راویوں کو وہم ہو گیا اور انہوں نے اس کو "حدیث مرفوع" بنا دیا۔ چنانچہ امام طبری نے اس کا بیشتر حصہ حضرت عبداللہ بن سلام سے "موقوفا" روایت کیا ہے۔[3]

عرش اور کرسی:

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے لیے عرش و کرسی کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں اور اس کے عرش پر متمکن ہونے کی تعبیر بھی استعمال ہوئی ہے۔ یہ الفاظ اور تعبیرات خالص عربی الفاظ اور تعبیرات ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال، اس کی رفعت و بلندی اس کے ملک و اقتدار کی بے پناہ وسعت اور پوری کائنات پر اس کے محیط ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔ قرآن پاک کے اولین مخاطبین نے ان الفاظ اور تعبیرات کو سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کی اور صحابہ کرام نے اللہ تعالیٰ کے عرش پر متمکن ہونے کو "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" "اس کی مانند کوئی نہیں ہے" کی روشنی میں سمجھا۔ یعنی وہ اپنی بے مثل ذات و صفات کے مطابق عرش و کرسی پر متمکن و جلوہ افروز ہے جس کی کیفیت کے ادراک سے عقل انسانی عاجز ہے۔

قرآن پاک میں عرش کا ذکر متعدد بار آیا ہے اور متعدد سیاق و سباق میں آیا ہے۔ البتہ اللہ کے لیے کرسی کا ذکر صرف ایک بار "آیۃ الکرسی" میں آیا ہے۔ اسی طرح "استوی" کا ذکر بھی متعدد بار آیا ہے۔ کہیں "حرف جر" کے بغیر، کہیں حرف جر "اِلیٰ" اور کہیں حرف جر "علیٰ" کے ساتھ۔

---

[1] تقریب التہذیب، ترجمہ: ۲۳۳۲ [2] ایضاً ترجمہ: ۶۹۳۳

[3] الضعیفہ ص: ۹۴۹، ج۱۲، ج ۱۲، ح ۵۹۷۳

حرف جر سے خالی "استوی" کے معنی ہیں مکمل ہوا اور کمال کو پہنچا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰۤی اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ﴾ [القصص:١٤]

"اور جب موسیٰ پوری جوانی کو پہنچ گیا اور اس کا نشوونما مکمل ہوگیا تو ہم نے اس کو قوت فیصلہ اور علم عطا کیا"

حروف جر "الی" اور "علی" کے بغیر "استوی" کا فعل اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال نہیں ہوا اور نہ اس کے شایان شان ہے۔

"استوی الی" کے معنی ہیں: قصد کیا، ارادہ کیا، رخ کیا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے "استوی الی" کا فعل دو بار استعمال کیا ہے۔

سورۃ البقرہ میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴾ [البقرة:٢٩]

"وہی اللہ ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں پھر اس نے آسمان (کی تخلیق) کا ارادہ کیا اور اس نے سات آسمان بنائے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"

اور سورۃ حم السجدہ فصلت میں زمین بنانے، اس کی پشت پر پہاڑوں کو جما دینے، اس میں تمام برکتیں رکھ دینے اور اس میں تمام جانداروں کی خوراک کا سامان مہیا کر دینے کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ ﴾

"پھر وہ آسمان (کی تخلیق) جانب متوجہ ہوا جو دھواں تھا"

اور حرف جر "علیٰ" کے ساتھ استوی کے معنی ہیں: بلند ہوا، متمکن ہوا، جلوہ افروز ہوا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کے لیے "استوی علیٰ" کا فعل قرآن پاک کی متعدد سورتوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ یہ فعل "عرش" سے متعلق ہے۔ مثلاً سورۃ الاعراف میں ارشاد ربانی ہے:

﴿ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ﴾ [الاعراف:٥٤]

"درحقیقت تمہارا رب وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر

وہ عرش پر جلوہ افروز ہوا۔"

تو قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے لیے "استوی" کا فعل ان افعال کی مانند ہے جو اس کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے اس کا دیکھنا اور سننا وغیرہ اور جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات میں بے مثل اور یکتا ہے اسی طرح اپنے فعل میں بھی بے مثل ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۔

لہٰذا جہاں اللہ تعالیٰ کے ان افعال کو تسلیم کرنا اور ان پر ایمان رکھنا فرض ہے جن کا ذکر اس کی کتاب اور صحیح احادیث میں آیا ہے وہیں ان کی حقیقت اور کیفیت معلوم کرنے یا متعین کرنے کی ہر کوشش، ضلالت اور گمراہی ہے۔ کیونکہ ان کی حقیقت اور کیفیت عقل انسانی کی رسائی اور ادراک سے باہر ہے۔

اوپر کی وضاحت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی "حسی معرفت" ناممکن اور محال ہے کیونکہ وہ محسوسات سے ماوراء ہے:

﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ۝ ﴾ [الانعام:۱۰۳]

"نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے۔ وہ بڑا باریک بیں اور نہایت باخبر ہے"

جس طرح اللہ تعالیٰ کے افعال کی حقیقت اور کیفیت عقل انسانی کے ادراک سے باہر ہے اسی طرح عرش و کرسی کی حقیقت و کیفیت اور ان کی عظمت و وسعت کو سمجھنا بھی محال ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ اپنے لیے عرش و کرسی کا ذکر فرمایا ہے اس لیے ان کی تاویل و تعیین کے بغیر ان کو ماننا اور ان پر ایمان رکھنا فرض ہے۔

آیۃ الکرسی میں اللہ تعالیٰ کی کرسی کی عظمت و وسعت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:

﴿ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضَ ۝ ﴾ [البقرۃ:۲۵۵]

"اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو محیط ہے"

قرآن پاک اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کی کرسی کی نہ تو تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور نہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق کب فرمائی۔ البتہ قرآن و حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرش الٰہی کی تخلیق آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پہلے ہو چکی تھی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضَ فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ وَّ كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ ﴾ [ھود:۷]

"وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا درآنحالیکہ اس کا عرش پانی پر تھا" اور سورۃ الحاقہ میں ہے کہ قیامت کے دن عرش الٰہی کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ (آیت:۷) صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَرَاَیْتُمْ مَا اَنْفَقَ مُنْذُ خَلَقَ السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ فَإِنَّهُ لَمْ يَغِضْ مَا فِي يَدِهِ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ))[1]

"کیا تمہیں خبر ہے کہ جو کچھ اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کرنے کے بعد سے خرچ کیا ہے اس نے اس کے ہاتھ میں موجود خزانوں میں کوئی کمی نہیں کی اور اس کا عرش پانی پر تھا"

ذیل میں ایسی ضعیف اور منکر روایات نقل کر رہا ہوں جن میں عرش و کرسی کی ایسی تفصیلات بیان ہوئی ہیں جن کے ذکر سے قرآنی آیات اور صحیح احادیث خالی ہیں۔

امام احمد فرماتے ہیں: ہم سے عبدالرزاق نے بیان کیا، ہم سے یحییٰ بن علاء نے اپنے چچا شعیب بن خالد سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: مجھ سے سماک بن حرب نے عبداللہ بن عمیر سے، انہوں نے احنف بن قیس سے اور انہوں نے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بطحاء میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بادل کا ایک ٹکڑا گزرا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم لوگ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟ ہم نے عرض کیا: یہ بادل ہے۔ آپ نے فرمایا: اور "الْمُزْنُ" پانی سے لبریز بادل۔ ہم نے بھی کہا "الْمُزْنُ" پھر آپ نے فرمایا: "العنان؟" اس پر ہم خاموش رہے۔ تو آپ نے فرمایا:

(۲۰۱)......هَلْ تَدْرُوْنَ كَمْ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ؟ قَالَ: قُلْنَا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ، قَالَ: بَيْنَهُمَا مَسِيْرَةُ خَمْسِمِائَةِ سَنَةٍ وَمِنْ كُلِّ سَمَاءٍ اِلَى سَمَاءٍ مَسِيْرَةُ خَمْسِمِائَةِ سَنَةٍ وَكَثْفُ كُلِّ سَمَاءٍ مَسِيْرَةُ خَمْسِمِائَةِ سَنَةٍ وَفَوْقَ السَّمَاءِ السَّابِعَةِ بَحْرٌ بَيْنَ اَسْفَلِهِ وَاَعْلَاهُ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ، ثُمَّ فَوْقَ ذٰلِكَ

---

[1] صحيح بخاري: ح ٤٦٨٤- صحيح مسلم: ح ٢٣٠٩

ثَمَانِيَةُ أَوْعَالٍ بَيْنَ رُكَبِهِنَّ وَأَظْلَافِهِنَّ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، ثُمَّ فَوْقَ ذٰلِكَ الْعَرْشُ، بَيْنَ أَسْفَلِهِ وَأَعْلَاهُ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، وَاللّٰهُ فَوْقَ ذٰلِكَ، وَلَيْسَ يَخْفَى عَلَيْهِ مِنْ أَعْمَالِ بَنِي آدَمَ شَيْءٌ۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ آسمان اور زمین کے مابین کتنی مسافت ہے؟ ہم نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا: ان کے درمیان پانچ سو سال کے سفر کی مسافت ہے اور ہر آسمان سے دوسرے آسمان تک کی مسافت بھی پانچ سو سال کے سفر کی ہے اور ہر آسمان کی کثافت...... موٹائی...... پانچ سو سال کے سفر کی مسافت کے برابر ہے۔ اور ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی تہہ اور بالائی سطح کے درمیان کا فاصلہ آسمان اور زمین کے درمیانی فاصلے کے برابر ہے۔ پھر اس کے اوپر آٹھ پہاڑی بکرے ہیں جن کے گھٹنوں اور کھروں کے درمیان کی لمبائی آسمان وزمین کے درمیانی فاصلے کے برابر ہے۔ پھر اس کے اوپر عرش ہے جس کے نچلے حصے اور بالائی حصے کے مابین وہی فاصلہ ہے جو آسمان وزمین کے مابین فاصلہ ہے۔ اور اللہ اس کے اوپر ہے جس پر اولاد آدم کے اعمال میں سے کوئی بھی عمل مخفی نہیں ہے۔"[1]

یہ روایت ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔ اس کی تخریج امام احمد نے مسند میں، امام ابوداوُد[2] اور امام ترمذی[3] نے سنن میں اور امام ابن خزیمہ نے کتاب التوحید[4] میں کی ہے شیخ احمد شاکر نے مسند امام احمد کی تحقیق میں اس روایت کو بے حد ضعیف قرار دیا ہے۔ اس روایت کی سند کے ایک راوی عبداللہ بن عمیرہ کے بارے میں امام ذہبی کا قول ہے کہ وہ مجہول ہے۔ اور امام بخاری نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن عمیرہ کی احنف بن قیس سے سماعت ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔

یہ روایت دوسری جتنی سندوں سے مروی ہے ان میں سے کوئی بھی سند صحیح نہیں ہے۔

ابوداوُد سے روایت ہے: ہم سے عبدالاعلیٰ بن حماد، محمد بن مثنیٰ، محمد بن بشار اور احمد بن سعید رباطی نے بیان کیا، انہوں نے کہا: ہم سے وہب بن جریر نے بیان کیا، کہا: مجھ سے میرے والد نے بیان کیا، کہا: میں نے محمد بن اسحاق کو یعقوب بن عتبہ سے، ان کو جبیر بن محمد بن جبیر بن مطعم سے، ان کو ان کے باپ سے اور ان کو ان کے دادا سے روایت کرتے ہوئے سنا کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت

---

[1] مسند الإمام أحمد: ۱۷۷۰ [2] سنن ابی داؤد: ح ۲۷۲٤

[3] جامع الترمذي: ح ۳۳۲۰ [4] كتاب التوحيد: ح ٦٨

میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جانوں پر بن آئی ہے، بال بچے بھوکے مر رہے ہیں۔ املاک تباہ ہو رہی ہیں، چوپائے ہلاک ہو گئے ہیں۔ آپ اللہ سے ہمارے لیے سقیا یعنی بارش طلب فرمایئے۔ ہم اللہ پر آپ سے سفارش چاہتے ہیں اور آپ پر اللہ کی سفارش۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم پر افسوس! کیا تم کو پتہ ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ پھر آپ نے اللہ کی تسبیح اور پاکی بیان کی اور فرمایا:

(۲۰۲)......وَيْحَكَ إِنَّهُ لَا يُسْتَشْفَعُ بِاللّٰهِ عَلَى أَحَدٍ مِنْ خَلْقِهِ، شَأْنُ اللّٰهِ أَعْظَمُ مِنْ ذٰلِكَ، وَيْحَكَ أَتَدْرِيْ مَا اللّٰهُ؟ إِنَّ عَرْشَهُ عَلَى سَمَاوَاتِهِ بِهٰكَذَا وَإِنَّهُ لَيَئِطُّ بِهِ أَطِيْطَ الرَّحْلِ بِالرَّاكِبِ۔

”برا ہو تمہارا، اللہ سے اس کی مخلوق میں سے کسی پر سفارش نہیں کرائی جاتی۔ اس کی شان اس سے برتر اور اعلیٰ ہے۔ افسوس تم پر، کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ کون ہے؟ اس کا عرش آسمانوں پر اس طرح ہے۔ آپ نے اپنی انگلیوں سے ایک گنبد بنا کر سمجھایا اور عرش سے اس طرح چرچراہٹ کی آواز نکلتی ہے جس طرح سوار کے بیٹھنے پر کجاوے سے چرچراہٹ کی آواز نکلتی ہے“

تو یہ روایت بھی ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔ اس کی تخریج ابوداود نے سنن[1] میں، دارمی نے الرد علی الجهمية میں کی ہے۔[2] اس کی روایت میں جبیر بن محمد بن جبیر مجہول ہے اور وہ اس روایت میں منفرد بھی ہے۔

حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ[3] میں لکھا ہے کہ حافظ ابن عساکر نے ایک خصوصی رسالہ لکھا ہے جس میں عرش سے چرچراہٹ کی آواز سے متعلق روایت کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ روایت وہم و خیال کی پیداوار ہے۔ حافظ ابن کثیر آگے تحریر فرماتے ہیں کہ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ اللہ کی کرسی آسمانوں اور زمین پر محیط ہے اور اس سے اس طرح چرچراہٹ کی آواز آتی ہے جس طرح نئے کجاوے سے مگر اس کے راوی عبداللہ بن خلیفہ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے ظلال الجنہ فی تخریج السنہ[4] اور الضعیفہ[5] میں اس روایت کو بجا طور پر منکر قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی صفت میں کجاوے کی صفت سے مشابہت پائی جاتی ہے جس سے اللہ کی ذات پاک ہے۔ مزید لکھا ہے کہ ایسی کوئی روایت صحیح نہیں ہے

---

[1] سنن ابی داؤد: ح ۴۷۲۶
[2] الرد علی الجهمية ص ٤٤
[3] البداية والنهاية: ص ۱۲، ج ۱
[4] ص ۲۵۲-۲۵۳
[5] سلسلة الاحاديث الضعيفة: ص ۲۵۶-۲۵۷، ح ۸۶۶

جس میں ''اطیط'' چرچراہٹ کا لفظ آیا ہے۔ محدث البانی امام ذہبی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی کتاب "العلو" [1] میں مذکورہ روایت کو حد درجہ ضعیف اور اس مضمون میں منفرد قرار دیا ہے۔ ابن اسحاق کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر وہ مغازی میں سند بیان کریں تو حجت ہیں۔ ورنہ ان کی روایتوں میں نکارت پائی جاتی ہے۔ اور اللہ جل شانہ کی مانند کوئی شئی نہیں ہے۔

اوپر علم حدیث کے ماہرین کے جو اقوال نقل کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوا کہ عرش سے متعلق مندرجہ بالا دونوں روایتیں سند کے اعتبار سے اگرچہ صرف ضعیف ہیں مگر ان کا متن منکر ہے۔ کیونکہ وہ صحیح احادیث کے خلاف ہیں۔

(۲۰۳)......إِنَّ كُرْسِيَّهُ وَسِعَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنَّهُ يَقْعُدُ عَلَيْهِ مَا يَفْضُلُ مِنْهُ مِقْدَارُ أَرْبَعِ أَصَابِعَ۔ ثُمَّ قَالَ بِأَصَابِعِهِ فَجَمَعَهَا وَإِنَّ لَهُ أَطِيْطًا كَأَطِيْطِ الرَّحْلِ إِذَا رُكِبَ مِنْ ثِقْلِهِ۔

''بے شک اللہ کی کرسی آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے یا ان پر چھائی ہوئی ہے۔ اور جب وہ اس پر بیٹھتا ہے تو اس سے چار انگلیوں کے برابر بھی جگہ باقی نہیں بچتی۔ پھر آپ نے اپنی انگلیوں کو جمع کر کے اشارہ فرمایا اور اس سے اللہ تعالیٰ کے وزن کی وجہ سے چرچراہٹ کی آواز نکلتی ہے جس طرح نئے کجاوے پر سوار ہونے پر چرچراہٹ کی آواز نکلتی ہے''

یہ روایت منکر اور مردود ہے۔ کیونکہ اس سے ذات الٰہی کی مخلوق سے تشبیہ لازم آتی ہے۔

اس منکر روایت کو حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ [2] میں اور ابوالعلاء حسن بن احمد ہمدانی نے صفات باری تعالیٰ سے متعلق اپنے فتوے [3] میں حافظ طبرانی کی سند سے نقل کیا ہے۔

عبید اللہ بن ابی زیاد قطوانی سے روایت ہے، کہا: ہم سے یحییٰ بن ابی بکیر نے بیان کیا، ہم سے اسرائیل نے ابواسحاق سے، انہوں نے عبید اللہ بن خلیفہ سے اور انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: ایک خاتون نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: اللہ تعالیٰ سے فرمائیے کہ وہ مجھے جنت میں داخل فرمائے۔ تو آپ نے اپنے رب عزوجل کی عظمت و بڑائی بیان کی، پھر فرمایا......

---

[1] العلوّ للذهبي: ص ۲۳
[2] البدايه والنهايه: ص ١٤، ج١
[3] فتویٰ ابو العلاء الهمداني: ص ١٠٠، ج١

اس روایت کو الضیاء مقدسی نے بھی المختارہ[1] میں طبرانی کی مذکورہ سند سے اور دوسری سندوں سے، ابن ابی بکیر سے روایت کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔ اسی طرح اس کا ذکر ابو محمد دشتی نے کتاب اثبات[2] الحد میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کے راوی بخاری و مسلم کی شرطوں پر پورے اترتے ہیں۔

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

یہ دوہری غلطی ہے: اولاً تو یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ دوم اس کے راوی بخاری اور مسلم کی شرطوں پر پورے بھی نہیں اترتے۔ عبید اللہ بن خلیفہ کی توثیق ابن حبان کے سوا کسی اور نے نہیں کی ہے۔ تنہا ان کی توثیق کا محدثین کے یہاں کوئی اعتبار نہیں ہے۔ حافظ ذہبی نے عبید اللہ بن خلیفہ کو غیر معروف اور حافظ ابن حجر نے اس کو مجہول لکھا ہے[3] لہٰذا یہ روایت صحیح کس طرح ہو سکتی ہے۔

البانی آگے لکھتے ہیں: اسی طرح کی حدیث وہ بھی ہے جو ابن اسحاق سے مسند وغیرہ میں مروی ہے اور جس کے آخر میں ہے:

((إِنَّ عَرْشَهُ لَعَلَى سَمَاوَاتِهِ وَأَرْضِهِ مِثْلَ الْقُبَّةِ وَإِنَّهُ يَئِطُّ بِهِ أَطِيطَ الرَّحْلِ بِالرَّاكِبِ))

''اللہ تعالیٰ کا عرش اس کے آسمانوں اور زمین پر اس طرح گنبد کی مانند ہے جس سے اس کے بیٹھنے کی وجہ سے چرچراہٹ کی آواز خارج ہوتی ہے جس طرح کجاوے سے اس پر سوار کے بیٹھنے کی وجہ سے چرچراہٹ کی آواز خارج ہوتی ہے۔''

ابن اسحاق کے بارے میں تمام محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ وہ ''مدلس'' تھے۔ اور اس روایت کی کسی بھی سند میں انہوں نے ''سماع'' کی صراحت نہیں کی ہے''۔

محدث البانی مزید فرماتے ہیں:

رہا اس روایت کا متن تو یہ مردود اور منکر ہے۔ امام ذہبی العلو[4] میں لکھتے ہیں:

''عرش سے اس طرح چرچراہٹ کی آواز کا نکلنا جس طرح کی چرچراہٹ کجاوے سے نکلتی ہے'' تو یہ آواز عرش اور کجاوے کی صفت ہوئی اور اس بات سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ اس آواز کو عرش یا کرسی کی صفت قرار دیں۔ مزید یہ کہ ''اطیط'' کا لفظ کسی بھی صحیح حدیث میں نہیں آیا ہے۔[5]

---

[1] المختارہ: ص ۵۹، ج ۱
[2] اثبات الحد: ص ۱۳۴۔۱۳۵
[3] تقریب التہذیب: ص ۳۱۱۔ ترجمہ: ۴۲۸۶
[4] العلو للذہبی: ص ۲۳
[5] الضعیفہ: ص ۲۵۷، ج ۲، ح ۸۶۶

دراصل عرش وکرسی کے اوصاف، ان کی وسعت اور ہیئت کے بارے میں تفسیر کی بعض کتابوں میں صحابہ کرام کے آثار، سدی اور وہب بن منبہ وغیرہ کے جو اقوال ملتے ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اس لیے کہ عرش وکرسی، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کی وسیع سلطنت...... یہ تمام امور توقیفی ہیں جن کے بارے میں وہی باتیں صحیح ہیں جو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات میں مذکور ہیں۔ اور جن روایتوں کی نسبت نبی معظم ﷺ سے صحیح سندوں کے ساتھ ثابت نہیں یا جن کے متن سے اللہ تعالیٰ کے لیے مخلوق سے تشبیہ اور تجسیم لازم آتی ہو مردود ہیں۔ پھر یہ کہ عرش وکرسی کا مفہوم معلوم ہے مگر مخلوق کی کرسی یا تخت سلطنت کی مانند نہیں ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات بے مثل ہیں۔ لہٰذا ان الفاظ کو لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ..... کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان کی کیفیات اور تفصیلات معلوم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ امور عقل انسانی کی رسائی سے باہر ہیں۔

............*

باب سوم

قصص الانبیاء ﷺ

ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق:

کتاب وسنت کی رو سے حضرت آدم علیہ السلام ابوالبشر اور ابوالانبیاء دونوں ہیں، سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝ ﴾ [البقرۃ:۳۰]

”اے نبی! یاد کرو اس وقت کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے عرض کیا: کیا آپ اس میں کسی ایسے کو پیدا کریں گے جو اس میں فساد پھیلائے اور خون بہائے۔ حالانکہ ہم آپ کی حمد کی ساتھ تسبیح بیان کر رہے ہیں اور آپ کی تقدیس کر رہے ہیں۔ فرمایا: درحقیقت میں جو کچھ جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے نام کی صراحت نہیں کی ہے۔ لیکن بعد کی آیت میں ان کے نام کی تصریح کر کے یہ واضح فرمادیا کہ اس میں لفظ: خلیفہ سے وہی مراد ہیں۔ اسی طرح ان کے نام کی بجائے ان کی صفت خلیفہ کا ذکر کر کے زمین میں ان کی خلافت کی اہمیت بھی واضح کردی۔

خلیفہ کی حقیقت:

خلیفہ: خَلَفَ یَخْلُفُ خَلْفًا وَخِلَافَةً سے بنا ہے اور مبالغہ کا صیغہ ہے۔ خَلَفَ یَخْلُفُ کے معنی ہیں: پیچھے آنا، جانشین ہونا، قائم مقام ہونا اور نمائندگی کرنا۔

اَلْخَلْفُ اس قوم، گروہ اور نسل کو بھی کہتے ہیں جو یکے بعد دیگرے آئے۔[1]

مذکورہ لغوی وضاحت کی روشنی میں لفظ خلیفہ کا اطلاق جانشین، قائم مقام اور نمائندہ پر ہوتا ہے اور اس کو قرناً بعد قرنٍ اور نسلاً بعد نسلٍ آنے والی امت اور قوم کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

[1] القاموس القویم: ص ۲۰۳، ج ۱

امام راغب اصفہانی خَلَفَ یَخْلُفُ کے استعمال کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

((خَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا، قَامَ بِالأَمْرِ عَنْهُ إِمَّا مَعَهُ وَإِمَّا بَعْدَهُ...... وَالْخِلَافَةُ: النِّيَابَةُ عَنِ الْغَيْرِ، إِمَّا لِغَيْبَةِ الْمَنُوْبِ عَنْهُ وَإِمَّا لِمَوْتِهِ وَإِمَّا لِعِجْزِهِ وَإِمَّا لِتَشْرِيفِ الْمُسْتَخْلَفِ))[1]

"فلاں شخص فلاں شخص کی جگہ، اس کے ساتھ یا اس کے بعد معاملہ کا ذمہ دار بنا...... اور خلافت کے معنی ہیں: کسی کا کسی دوسرے کی نیابت کرنا، چاہے یہ نیابت دوسرے شخص کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہو یا اس کے وفات پا جانے کے سبب سے یا اس کے عجز کی بنا پر یا اس نائب بنائے جانے والے شخص کی عزت افزائی کی خاطر ہو"

یہ تو فعل خَلَفَ یَخْلُفُ کی لغوی تحقیق اور اس کے استعمال کے بارے میں اہل لغت کی رائے تھی۔ رہا سورۃ البقرہ کی مندرجہ بالا آیت میں لفظ "خلیفہ" کا مفہوم؟ تو اس کے بارے میں چند مشہور مفسرین کے اقوال درج ذیل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" کی تفسیر کرتے ہوئے حافظ عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن کثیر تحریر فرماتے ہیں:

"میں زمین میں ایک ایسی قوم پیدا کرنے والا ہوں جس میں سے بعض بعض کے پیچھے قرناً بعد قرنٍ نسل در نسل آئیں گے"[2]

یعنی حافظ ابن کثیر خلیفہ سے مراد ایک ایسی قوم لے رہے ہیں جو ایک دوسرے کے بعد آئے گی اور دوسری پہلی کی جانشین ہوگی۔

امام محی السنۃ ابو محمد حسین بن مسعود بغوی نے مذکورہ آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے جنوں کے وجود، ان کے افساد فی الارض اور قتل و خونریزی سے متعلق تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں منقول روایات کا ذکر کرنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کے خلیفہ ہونے کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ایک ضعیف قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ "آدم علیہ السلام کو خلیفہ اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ ان کے بعد آنے والا ان کا جانشین ہوگا۔" پھر نہایت دوٹوک انداز میں لکھا ہے۔

((وَالصَّحِيحُ أَنَّهُ خَلِيفَةُ اللّٰهِ فِيْ أَرْضِهِ لِإِقَامَةِ أَحْكَامِهِ وَتَنْفِيذِ وَصَايَاهُ))

[1] مفردات القرآن: ص ۱۶۲   [2] تفسیر ابن کثیر ص ۴۹، ج ۱

''صحیح یہ ہے کہ وہ آدم علیہ السلام اللہ کی زمین میں اس کے خلیفہ تھے تاکہ اس کے احکام اور ہدایات کو لاگو اور نافذ کریں''[1]

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی تحریر فرماتے ہیں:

آیت میں خلیفہ سے مراد حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور تمام اہل تاویل کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ وہ اللہ کے فیصلوں اور اس کے اوامر کو نافذ و جاری کرنے کے لیے اس کے خلیفہ تھے۔ کیونکہ وہ زمین میں بھیجے جانے والے پہلے رسول تھے۔[2]

امام قرطبی کے اس قول سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی خلافت کا زیادہ حقدار اس کا رسول ہوتا ہے۔ علامہ شیخ ابوعبداللہ عبدالرحمٰن بن ناصر بن عبداللہ بن ناصر آل سعدی سورۃ البقرہ کی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

یہ ابوالبشر آدم علیہ السلام کی تخلیق کی ابتدا اور ان کی فضیلت کے بیان کا آغاز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ان کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو ملائکہ کو اس سے باخبر کیا اور ان کو یہ بھی بتایا کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنانے والا ہے۔[3]

موجودہ دور میں مولانا حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ تفسیر، حدیث، تاریخ اور دوسرے دینی علوم میں بجا طور پر ایک بلند مقام پر فائز ہیں۔ ان کا عظیم کارنامہ احسن البیان کے تفسیری حواشی سے عبارت ہے۔ آپ نے سورۃ البقرہ کی مذکورہ آیت میں لفظ خلیفہ سے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ ایک ایڈیشن سے دوسرے ایڈیشن میں مختلف ہے مثلاً:

احسن البیان کے پہلے ایڈیشن شائع کردہ مکتبہ دارالسلام ریاض ۱۹۹۵ء میں تحریر فرماتے ہیں:

خلیفہ سے مراد یہاں حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اس کے معنی جانشین کے ہیں۔ اہل علم کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ انسان اللہ کا خلیفہ جانشین ہے یا اپنے سے پہلے کسی مخلوق کا۔ ''خلیفۃ اللہ فی الارض'' کے معنی ہوں گے کہ اللہ کے دیے ہوئے اختیارات کو اس کی مرضی ومنشا کے مطابق استعمال کرے تاکہ دنیا میں امن وسکون کا گہوارہ بن جائے۔

---

[1] معالم التنزیل: ص ۱۲۵

[2] الجامع لاحکام القرآن: ص ۲۲۳، ج ۱

[3] تیسیر الرحمن فی تفسیر کلام المنان: ص ٤٦

کتاب کے چوتھے ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں بھی یہی خیال نقل کیا گیا ہے مگر پہلے سے زیادہ واضح مزید یہ صراحت ہے کہ آدم علیہ السلام کے "خلیفۃ اللہ فی الارض" ہونے کا نظریہ ان کا نہیں بلکہ دوسروں کا ہے۔

حافظ صاحب نے دونوں ایڈیشنوں میں سے کسی میں یہ تحریر نہیں فرمایا ہے کہ لفظ خلیفہ کی تفسیر میں ان کے نزدیک کون سا قول دلائل کی روشنی میں راجح ہے۔

لیکن احسن البیان کا جو ایڈیشن "مجمع الملك فهد لطباعة القرآن" نے "ترجمہ معانی القرآن" کے نام سے شائع کیا ہے اس میں انہوں نے "خلیفہ" کے بارے میں دوٹوک اور حتمی رائے کا اظہار فرمایا ہے:

خلیفہ سے مراد ایسی قوم ہے جو دوسرے کے بعد آئے گی اور یہ کہنا کہ انسان اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے غلط ہے۔[1]

قول فیصل:

اوپر "خلیفہ" کے بارے میں متعدد مفسرین کے جو اقوال نقل کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) حضرت آدم علیہ السلام کے خلیفہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اور ان کی اولاد اپنے سے سابقہ کسی مخلوق کی جانشین ہے خصوصیت کے ساتھ جنوں کی۔

(۲) خلیفہ سے مراد ایسی قوم ہے جو ایک دوسرے کے بعد آئے گی۔

(۳) آدم علیہ السلام اور ان کے بعد ان کی ذریت زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے بایں معنی کہ انسان اس دنیا میں اس امر کا مکلف بنایا گیا ہے کہ وہ اس میں اپنے اعمال سے اپنے خالق اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور مرضیات کا مظہر بنے اور اللہ کے احکام اور فیصلوں کو نافذ کرے۔

ان تینوں اقوال میں سے جہاں تک پہلے قول کا تعلق ہے تو اس کی کوئی بنیاد اور اصل نہیں ہے اور حضرت آدم علیہ السلام سے قبل فرشتوں کے سوا کسی اور مخلوق کا قرآن و حدیث سے کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ دراصل لوگوں نے فرشتوں کے اس سوال اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ..... کی بنیاد پر اس طرح کی کسی مخلوق کا وجود خود فرض کر لیا ہے جو ان کے خیال میں آدم علیہ السلام سے پہلے افساد فی الارض اور خونریزی کی مرتکب ہو چکی تھی۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے جنوں کی تخلیق کا ثبوت تو خود

[1] احسن البیان: ص ۱۷

قرآن سے ملتا ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے جنوں کی تخلیق کا کوئی ثبوت قرآن سے نہیں ملتا بلکہ صرف ''الجان'' کی تخلیق کا ثبوت ملتا ہے اور ''الجان'' سے مراد ابوالجن ابلیس ہے۔ جس طرح ''الانسان'' سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں جو ابوالبشر تھے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ٥ وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ٥ ﴾ [الحجر:٢٦، ٢٧]

''درحقیقت ہم نے انسان...... آدم...... کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے تخلیق بخشی اور ہم جن کو اس سے پہلے آگ کی لپٹ سے پیدا کر چکے تھے''

دوم...... قرآن پاک میں یہ صراحت ہے کہ تمام مخلوقات میں صرف جنوں اور انسانوں کو اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ٥ ﴾ [الذاریات:٥٦]

''میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں''

اور کوئی فرد، جماعت اور قوم اللہ تعالیٰ کی عبادت کا طریقہ اپنے دماغ اور عقل سے نہیں معلوم کر سکتی بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول اور معتبر عبادت کا طریقہ معلوم کرنے کے لیے رسولوں کی محتاج رہی ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ ہدایت کے لیے جن ہمیشہ سے انسانوں میں مبعوث ہونے والے رسولوں کے محتاج رہے ہیں۔ کیونکہ ان میں کوئی رسول اور نبی مبعوث نہیں ہوا ہے۔ اس تناظر میں حضرت آدم علیہ السلام جس طرح انسانوں کے لیے پہلے رسول تھے ٹھیک اسی طرح جنوں کے بھی رسول تھے۔ لہٰذا حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے ان کے پیدا کیے جانے کا دعویٰ یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کو عبادت کا مکلف تو بنا دیا گیا مگر ان کو عبادت کا طریقہ نہیں بتایا گیا اور یہ دعویٰ باطل ہے۔ کیونکہ یہ حکمت الٰہی اور عدل ذات باری کے خلاف ہے۔

اور یہ بات کہ جن انسانوں میں مبعوث ہونے والے رسولوں ہی سے عقائد و عبادات کی تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں؟ یہ سورۃ الاحقاف کی آیات ۲۹۔۳۱ اور سورۃ الجن سے بصراحت ثابت ہے۔

اسی طرح احادیث سے بھی ثابت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنوں کی دعوت پر ان کو دعوت حق دینے کے لیے ان کے پاس تشریف لے جایا کرتے تھے۔[1]

[1] صحیح مسلم: ح ٤٥٠۔ ابوداؤد ح ٨٥، جامع ترمذی: ح ١٨، ٣٢٥٨

معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد کا جنوں یا کسی اور مخلوق کا جانشین ہونے کا دعویٰ بلا دلیل ہے اور حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے صرف ابلیس پیدا کیا گیا تھا تمام جن نہیں۔ سورۃ الکہف میں ابلیس کے بارے میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ:

كَانَ مِنَ الْجِنِّ..... وہ جنوں میں سے تھا۔ (آیت: ۵۰)

تو اس کا مطلب ہے کہ وہ جنوں کی صنف اور جنس سے تھا، فرشتوں میں سے نہیں تھا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ابلیس سے پہلے جن پیدا کیے جا چکے تھے۔ کیونکہ جس آیت کا یہ فقرہ: ''كَانَ مِنَ الْجِنِّ '' ہے اسی آیت کا آنے والا فقرہ یہ بتا رہا ہے کہ ابلیس ''ابوالجن'' ہے۔ یعنی سارے جنات اسی کی اولاد ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗۤ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ ﴾ [الکہف:۵۰]

''کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی ذریت کو اپنا سرپرست بناتے ہو''

رہی دوسری رائے کہ ''خلیفہ سے مراد ایسی قوم ہے جو ایک دوسرے کے بعد آئے گی'' تو یہ اگرچہ حافظ ابن کثیر اور بعض دوسرے مفسرین کی رائے ہے لیکن مرجوح ہے۔ کیونکہ کسی قوم کا یکے بعد دیگرے آنا اپنے اندر کوئی بھی فضیلت نہیں رکھتا۔ چہ جائیکہ ایسی فضیلت کہ جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ کہ اپنے فرشتوں سے فرمائے جو ہمہ وقت اس کی عبادت اور حمد وثناء میں لگے رہتے ہیں۔ کسی قوم کے محض یکے بعد دیگرے آنے سے اس کے مفسد اور قاتل ہونے کا مفہوم بھی نہیں نکلتا۔

دراصل کسی مخلوق سے افساد فی الارض اور خونریزی کا اندیشہ اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جبکہ وہ خواہشاتِ نفس رکھتی ہو، اس کو نیکی اور بدی دونوں کا اختیار دیا گیا ہو، اس کے سامنے خیر وشر کے دونوں راستے ہوں، اور دونوں میں سے کوئی بھی راستہ اختیار کرنے کی اس کو آزادی دی گئی ہو۔ اس طرح کی مخلوق صرف انسان اور جن ہیں۔

فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کے ذریعہ اتنی بات کا علم رہا ہوگا کہ وہ نئی مخلوق جس کو وہ پیدا کرنے جارہا ہے وہ ارادہ واختیار کی آزادی سے بہرہ ور ہوگی، اس لیے فساد بھی مچائے گی اور خون بھی بہائے گی۔ مگر ان کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ اس نئی مخلوق میں انبیاء بھی ہوں گے۔ صدیقین، شہداء اور صالحین بھی ہوں گے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے ان سے اولاد آدم کے نام بتانے کو کہا تا کہ یہ معلوم ہو کہ ان کا وہ اندیشہ برمحل ہے یا نہیں تو انہوں نے عرض کیا:

﴿ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴾ [البقرۃ:۳۲]

''پاک ہے تیری ذات ہر نقص سے۔ ہمیں تو صرف اتنا ہی علم حاصل ہے جتنا تو نے ہمیں دے دیا ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو یہ حکم دیا کہ وہ قیامت تک پیدا ہونے والی اپنی اولاد کے وہ نام پیش کریں جو اس نے ان کو سکھا دیے ہیں۔ اور جب انہوں نے اپنی اولاد کے ناموں کی فہرست پیش کی تو ان میں صرف مفسد اور سفاک الدم ہی نہ تھے بلکہ ان میں بڑی تعداد میں انبیاء ورسول، صدیقین، شہداء اور صالحین بھی تھے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾ [البقرۃ:۳۳]

''کیا میں تم لوگوں سے کہہ نہ چکا ہوں کہ میں آسمانوں اور زمین کی تمام غیبیات کو جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اس کا علم بھی رکھتا ہوں اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے۔''

یعنی اس نئی مخلوق یا خلیفہ کے پیدا کرنے کی جو حکمت ہے وہ تمہیں نہیں صرف مجھے معلوم ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس خلیفہ کے پیدا کرنے سے جو خیر و بھلائی حاصل ہوگی وہ اس شر اور برائی سے بہت زیادہ ہوگی جس کا اندیشہ تم نے ظاہر کیا ہے۔ یہ نئی مخلوق اللہ کی زمین میں تسبیح و تقدیس کے ساتھ ساتھ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرے گی، زمین میں عدل و انصاف بھی قائم کرے گی اور حق و راستی کا بول بالا بھی کرے گی۔

انسان زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے:

اوپر لفظ ''خلیفہ'' سے متعلق تفصیلی بحث سے ثابت ہوگیا کہ انسان نہ تو زمین میں اپنے سے پہلے کسی مخلوق کا جانشین ہے اور نہ کسی ایسی قوم سے عبارت ہے جو ایک دوسرے کے بعد آئے گی۔ بلکہ انسان زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے اور اس کی پہلی کڑی حضرت آدم علیہ السلام تھے۔

لیکن انسان کے اللہ کا خلیفہ ہونے کا مطلب بھی نہیں ہے کہ وہ اس کا جانشین ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات، اس کے احکام اور اس کی جملہ مرضیات کے مطابق خود زندگی گزارنے اور دوسروں کو اسی طرح کی زندگی گزارنے کی دعوت دینے اور ان کے درمیان اس کے احکام

کو جاری وساری کرنے کا مکلف اور ذمہ دار ہے۔ اللہ کی خلافت اور اس کی نیابت کا کامل مظہر رسولوں کی ذات تھی اور ان کے بعد ان کی سنت پر چلنے والے صلحاء کی۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنوں تک اپنی ہدایات اور احکام پہنچانے کے لیے ہمیشہ سے اس منتخب اور برگزیدہ گروہ کو مکلف بنایا ہے جس کو ہم رسولوں کے گروہ کے نام سے جانتے ہیں۔ یعنی دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو رسولوں کے ذریعہ ہی صحیح عقائد اور اپنے نزدیک مقبول و معتبر اعمال کی تعلیم دیتا رہا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لانے کے ساتھ رسولوں کی رسالت پر ایمان لانا بھی لازمی رہا ہے۔

دین میں رسالت کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ نوع انسانی کے پہلے فرد حضرت آدم علیہ السلام کو رسول کی حیثیت سے پیدا کیا گیا تاکہ وہ اپنی ذات، اپنی فکر و اجتہاد اور اپنے اعمال سے اللہ کی مرضی کی نمائندگی کریں۔

اس طرح اللہ کا خلیفہ ہونے کا مطلب اللہ کی مرضی کا نمائندہ ہونا بھی ہے۔ جو لوگ اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ انسان زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے وہ بھی ایسی باتیں لکھ گئے ہیں جن سے ہمارے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ سورۃ النساء کی آیت:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾

”اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں صاحب امر ہوں“ [النساء:۵۹]

کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ اصل اطاعت تو اللہ ہی کی ہے کیونکہ (اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ..... خبردار مخلوق بھی اسی کی ہے حکم بھی اسی کا ہے (الاعراف:۵۴) اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ...... حکم صرف اللہ ہی کا ہے۔ (یوسف: ۴۰) لیکن رسول خالص منشاء الٰہی ہی کا مظہر اور اس کی مرضیات کا چونکہ نمائندہ ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ رسول کے حکم کو بھی مستقل طور پر واجب الاطاعت قرار دیا“[1]

بات بالکل واضح ہو گئی اور یہ ثابت ہو گیا کہ انسان زمین میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ یعنی اس کی ہدایات و مرضیات کا نمائندہ۔ زمین میں خلافتِ الٰہی کی کامل و مکمل صورت اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی

[1] احسن البیان: ص ۲۴۵

ذات تھی اور ان کے بعد ان کے تبعین کی۔

دراصل انسان کے کسی سابقہ مخلوق کے جانشین ہونے یا اس کے ایسی قوم ہونے پر جو ایک دوسرے کے بعد آئے، سب سے بڑی زد سورۂ ص کی اس آیت سے پڑتی ہے:

﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [ص:٢٦]

''اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر (ایسا نہ ہو) یہ خواہش نفس تمہیں اللہ کی راہ سے بہکا دے۔''

اس آیت مبارکہ میں لفظ خلیفہ سے ''اللہ کا خلیفہ'' ہونے کے علاوہ کوئی اور مفہوم مراد ہو ہی نہیں سکتا۔

سجدۂ آدم:

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے ہی فرشتوں کو یہ حکم دے دیا تھا کہ جب ان کی تخلیق مکمل ہو جائے اور ان کے پتلے میں روح پھونک دی جائے تو وہ سب ان کے آگے سجدے میں گر جائیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ۝ ﴾ [الحجر:٢٨، ٢٩]

''اے نبی یاد کرو اس وقت کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں پس جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا''

پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق پوری کر لی اور ان کے خاکی پتلے میں اپنی روح پھونک دی تو فرشتوں کو دوبارہ یہ حکم دیا کہ وہ سب ان کو سجدہ کریں۔ [1]

یہ سجدہ اپنی ہیئت اور شکل کے اعتبار سے سجدہ ہی تھا۔ یعنی زمین پر پیشانی رکھ دینا اور مسجود حضرت آدم علیہ السلام ہی تھے۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی عبادت نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت تھی۔ کیونکہ اس کا حکم

[1] (البقرہ: ٣٤، الاعراف: ١١، الاسراء: ٦١، الکہف: ٥٠، طٰہٰ: ١١٦)

دینے والا اللہ تعالیٰ ہی تھا اور عبادت درحقیقت نام ہے ''طَاعَةُ مَخْلُوْقٍ لِخَالِقِهٖ فِیْ اَوَامِرِهٖ وَنَوَاهِيْهِ'' مخلوق کی اپنے خالق کے اوامر ونواہی میں، اس کی فرماں برداری کا۔

اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ'' کی تعمیل کر کے فرشتے اس کے عبادت گزار اور مقرب بندے قرار پائے۔ جبکہ اس حکم کی نافرمانی کر کے ابلیس قیامت تک کے لیے ملعون ومردود قرار پایا۔

بات صرف اتنی ہی ہے۔ پھر نہ جانے مفسرین نے کہاں سے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی سابقہ شریعتوں میں غیر اللہ کو تعظیمی سجدہ کرنا جائز تھا۔ سجدۂ عبادت جائز نہیں تھا اور اسلام میں سجدۂ تعظیمی اور سجدہ عبادت دونوں ناجائز ہیں۔ حالانکہ قرآن وحدیث میں کہیں بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ سابقہ شریعتوں میں غیر اللہ کو سجدہ کرنا جائز تھا۔ قطع نظر اس کے کہ وہ سجدہ بطور تعظیم کے ہو یا بغرض عبادت۔ کیونکہ سجدہ عبادات کی روح اور ان کی سب سے بلند چوٹی سے عبارت ہے۔ اور یہ شرک ہے چاہے کسی بھی نام سے کیا جائے۔ لہٰذا اللہ کی کسی بھی شریعت میں جائز نہیں ہوسکتا تھا۔ ورنہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کی سابقہ شریعتیں توحیدی امور میں بھی ایک دوسری سے مختلف رہی ہیں۔

اگر فرشتوں کے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے واقعہ کو اس تناظر میں لیا جاتا کہ انہوں نے ایسا اللہ تعالیٰ کے صریح حکم سے کیا تھا تو کوئی اشکال پیش نہ آتا کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بھی قول یا فعل میں جواب دہ نہیں ہے:

﴿ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ ﴾ [الانبیاء:۲۳]

''وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں جواب دہ نہیں ہے جبکہ لوگ جواب دہ ہیں۔''

مثال کے طور پر کسی معصوم اور بے قصور انسان کا قتل اللہ کی کسی شریعت میں جائز نہیں تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے بیٹے، اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کریں اور انہوں نے امتثال امر کرتے ہوئے حکم الٰہی کی تنفید شروع کر دی۔ مگر اللہ نے ان کو ایسا کرنے نہ دیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنی رحمت سے بچا لیا۔ (الصافات: ۱۰۲، ۱۰۷)

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے ایک معصوم بچے کو قتل کر دیا۔ (الکہف:۷۴)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ نے حضرت موسیٰ کو دریا میں ڈال دیا۔ (القصص:۷)

تو ان مذکورہ واقعات میں سے کوئی بھی واقعہ تشریعی نہیں تھا اور نہ قابل تکرار تھا۔ بلکہ وہ حکم الٰہی تھا اور اس کی تعمیل ضروری تھی۔

رہا وہ سجدہ جو حضرت یعقوب علیہ السلام ان کی بیوی اور ان کے بیٹوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کیا تھا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا۔ کیونکہ وہ نبی کا خواب تھا اور انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی الٰہی سے عبارت ہوتے ہیں۔ کہ جو حکم کا درجہ رکھتے ہیں اور بعض مفسرین کا یہ قول کہ وہ سجدہ تعظیمی تھا اور سجدۂ تعظیمی حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں جائز تھا۔ تو یہ محض دعویٰ بلا دلیل ہے جو کتاب وسنت کی کسی دلیل پر مبنی نہیں ہے۔

(۲۰۴)......إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى لَمَّا خَلَقَ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَخَرَجَتْ مِنْهُ كُلُّ نَسَمَةٍ هُوَ خَالِقُهَا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَانْتَزَعَ ضِلْعًا مِنْ أَضْلَاعِهِ فَخَلَقَ مِنْهَا حَوَّاءَ عَلَى نَبِيِّنَا وَعَلَيْهِمَا الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ۔

''بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور اس سے وہ تمام روحیں نکل پڑیں جن کو اللہ قیامت تک پیدا کرنے والا ہے اور آدم کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس سے حواء کو پیدا کیا۔ ہمارے نبی اور ان دونوں پر صلاۃ وسلام ہو۔

یہ ایک منکر روایت ہے جس کی تخریج امام ابوحاتم نے اپنی تفسیر[1] میں اور ابوالشیخ عبداللہ بن محمد اصفہانی نے العظمہ[2] میں، محمد بن شعیب کی سند سے کی ہے۔

مجھ سے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے اپنے باپ سے، انہوں نے عطاء بن یسار سے، انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......

اس روایت کو حافظ ابوعبداللہ محمد بن ابی یعقوب بن مندہ نے کتاب التوحید[3] میں، سند کے بغیر معلق اور حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق[4] میں سند کے ساتھ نقل کیا ہے اور لکھا ہے:

یہ سند بے حد ضعیف ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے ضعیف ہونے پر محدثین کا اتفاق ہے۔ بلکہ بعض ائمہ حدیث نے تو اس پر حدیث گھڑنے کا الزام لگایا ہے۔

دراصل عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم وہی ہے جس نے وہ موضوع روایت بیان کی ہے جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جب ممنوعہ درخت کا پھل کھالیا اور ان پر اللہ تعالیٰ کا عتاب نازل ہوا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ اور واسطہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کی۔ اس

---

[1] ص ۲۰۶، ج ۳
[2] العظمة ص ۱۵۵۳، ج ۵
[3] كتاب التوحيد: ص ۲۱۱، ج ۱
[4] تاريخ دمشق ص ۶۲۴، ج ۲

روایت پر مفصل بحث اس کتاب کی پہلی جلد میں گزر چکی ہے[1]۔ دوسرے جتنے الفاظ میں یہ جھوٹی روایت کتابوں میں منقول ہے وہ آئندہ صفحات میں نقل کی جائے گی۔

یہ زیر بحث روایت ہشام بن سعد نے زید بن اسلم سے، انہوں نے ابوصالح سے اور انہوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کی ہے اور یہ سند پہلی سند سے زیادہ کامل ہے۔ اس دوسری روایت کی تخریج امام ترمذی نے سنن[2] میں اور محدث محمد ناصر الدین البانی نے ظلال الجنۃ[3] میں کی ہے۔ سنن ترمذی کی حدیث کا ترجمہ ہے:

"جب اللہ نے آدم کو پیدا کیا تو ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا جس سے ہر وہ روح نکل پڑی جوان کی ذریت میں اللہ قیامت تک پیدا کرنے والا ہے اور ان میں سے ہر انسان کی دونوں آنکھوں کے درمیان کی ایک کرن پیدا کی۔ پھر ان کو آدم کے سامنے پیش کیا تو آدم نے عرض کیا: اے میرے رب! یہ کون لوگ ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تیری ذریت ہے۔ آدم نے ان میں سے ایک مرد کو دیکھا جس کی دونوں آنکھوں کے درمیان چمک ان کو بڑی اچھی لگی۔ آدم نے عرض کیا: اے میرے رب یہ کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تیری ذریت میں پیدا ہونے والی آخری امت کا ایک مرد ہے جس کو داؤد کہا جائے گا۔ آدم نے عرض کیا: اے میرے رب! تو نے اس کی کتنی عمر متعین کی ہے؟ اللہ نے فرمایا: ساٹھ سال۔ آدم نے کہا: اے میرے رب! میری عمر سے ۴۰ سال لے کر اس کی عمر میں بڑھا دے۔ پس جب آدم کی عمر پوری ہوئی اور ان کے پاس موت کا فرشتہ آیا تو آدم نے اس سے کہا: کیا میری عمر میں ابھی چالیس سال باقی نہیں ہیں؟ تو موت کے فرشتے نے جواب دیا: کیا آپ نے یہ چالیس سال اپنے بیٹے داؤد کو نہیں دے دیے ہیں؟ تو آدم نے اس کا انکار کیا۔ اس طرح ان کی ذریت بھی انکار کی روش اختیار کرے گی اور جس طرح آدم سے بھول ہوئی اسی طرح ان کی ذریت بھی بھول سے دو چار ہوگی اور جس طرح آدم نے غلطی کی اسی طرح ان کی ذریت بھی غلطی کی مرتکب ہوگی"

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔ محدث البانی رحمہ اللہ نے بھی اس کو صحیح بتایا ہے[4] ہے اور امام حاکم نے بھی مستدرک[5] میں اس کی تصحیح کی ہے اور امام ذہبی نے ان کی تائید کی ہے۔

---

[1] "موضوع اور منکر روایات جلد اول" ص ۱۰۸
[2] جامع ترمذی: ح ۳۰۷٦
[3] ظلال الجنۃ: ح ۲۰٦
[4] صحیح سنن ترمذی ص ۲۳۹، ج ۳، ح ۳۰۷٦
[5] مستدرك حاكم: ح ٤١٨٨

اس حدیث میں نہ تو حضرت حواء علیہا السلام کا کوئی ذکر ہے اور نہ اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی ایک پسلی نکالی اور اس سے ان کو پیدا کیا۔

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

مذکورہ آیت حضرت حواء کے اضافہ کے ساتھ متعدد صحابہ سے ''موقوف'' شکل میں اسباط بن نصر کی سند سے مروی ہے جس کو انہوں نے اسماعیل سدی سے، انہوں نے ابو مالک سے، انہوں نے ابوصالح سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے، اسی طرح مرہ بن شراحیل سے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے صحابیوں سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا:

اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو ملعون قرار دے کر جنت سے نکال دیا اور آدم علیہ السلام کو یہ کہتے ہوئے جنت میں آباد کیا: اُسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ.... تم اور تمہاری بیوی جنت میں آباد ہو جاؤ'' تو آدم علیہ السلام جنت میں ادھر ادھر گھومتے ہوئے وحشت محسوس کرنے لگے کیونکہ ان کی کوئی بیوی نہیں تھی جس سے وہ سکون حاصل کریں۔ ایک دن جب وہ سوئے اور پھر بیدار ہوئے تو ان کے سرہانے ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی جس کو اللہ نے ان کی پسلی سے پیدا کیا تھا۔ آدم نے اس عورت سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ تو اس نے جواب دیا: ایک عورت، انہوں نے اس سے کہا: تم کو کس لیے پیدا کیا گیا ہے؟ کہا: تاکہ تم مجھ سے سکون حاصل کرو......''

البانی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اس کی تخریج حافظ ابن مندہ نے کتاب التوحید[1] میں کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی روایت مسلم نے مرہ سے، انہوں نے سدی سے، انہوں نے عمر بن حماد اور اسباط بن نصر سے کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ سند ثابت ہے''۔

البانی ابن مندہ کے اس قول پر تعجب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اسباط بن نصر کی ثقاہت مختلف فیہ ہے۔ حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سچے تھے مگر بہت غلطیاں کرتے تھے۔ عجیب و غریب روایتیں بیان کیا کرتے تھے۔[2]

لہٰذا یہ سند موقوف ہونے کے ساتھ ضعیف بھی ہے اور لگتا ہے کہ اس کا تعلق اسرائیلیات سے ہے۔

---

[1] کتاب التوحید: ص ۲۱۳، ۲۱٤، ج ۱ [2] تقریب التہذیب: ص ۳۸۔ ترجمہ: ۳۲۱

عورت کے پسلی سے پیدا کیے جانے کا مفہوم:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ، فَإِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ، فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ، وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ، فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ))[1]

''تم لوگ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک سے کام لو کیونکہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی کا سب سے ٹیڑھا حصہ اس کا بالائی حصہ ہے۔ اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو اسے توڑ دو گے اور اگر اسے اپنے حال پر چھوڑ دو گے تو اس کی کجی برقرار رہے گی''

اور صحیح مسلم کی روایت میں ہے:

((إِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ، لَنْ تَسْتَقِيمَ لَكَ عَلَى طَرِيقَةٍ، فَإِنَ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اسْتَمْتَعْتَ بِهَا، وَبِهَا عِوَجٌ وَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهَا كَسَرْتَهَا وَكَسْرُهَا طَلَاقُهَا))[2]

''عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ وہ کسی ایک طریقے پر برقرار نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا تم اس کی کجی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو لیکن اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو اسے توڑ دو گے اور اس کو طلاق دینا اس کو توڑنا ہے''

محدث البانی نے إِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ...... عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے کی تفسیر میں ملا علی قاری کا یہ قول نقل کیا ہے:

عورتوں کی تخلیق کچھ ایسی ہے کہ اس میں کجی ہے۔ گویا ان کو پسلیوں سے بنایا گیا ہے۔ کیونکہ پسلی کی ہڈی ٹیڑھی ہوتی ہے اور کجی کے لیے یہ تعبیر ''مستعار'' ہے اور اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ انسان جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے۔ تو یہاں ''عجل'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کو اس سے پیدا کیا گیا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جلد بازی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔

البانی فرماتے ہیں:

---

[1] صحیح بخاری: ۳۳۳۱، ۵۱۸۶۔ صحیح مسلم ۳۶۴۴

[2] صحیح مسلم: ۳۶۴۳

میرے نزدیک راجح یہی ہے کہ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ ..... دو وجوں سے استعارہ ہے، حقیقت نہیں ہے:

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ ایسی کوئی صحیح حدیث نہیں جس میں یہ تصریح ہو کہ حضرت حواء کو حضرت آدم علیہما السلام کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔

(۲) دوسری وجہ وہ صحیح حدیث ہے جس میں عورت کو پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے: اِنَّ الْمَرْأَةَ كَالضِّلَعِ ..... بے شک عورت پسلی کی مانند ہے۔[۱، ۲]

(۲۰۵)..... اِنَّ آدَمَ أَتَى الْبَيْتَ أَلْفَ آتِيَةٍ لَمْ يَرْكَبْ قَطُّ ، فِيهِنَّ مِنَ الْهِنْدِ عَلَى رِجْلَيْهِ۔

"بے شک آدم ہندوستان سے اپنے دونوں پیروں پر چل کر ایک ہزار بار بیت اللہ آئے کسی بار سواری پر سوار ہو کر نہیں آئے۔"

یہ روایت بے حد ضعیف اور نا قابل اعتبار ہے جس کی تخریج امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں[۳] میں قاسم بن عبدالرحمٰن کی سند سے کی ہے۔

ہم سے محمد بن احمد بن یزید عبدانی نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن عبداللہ انصاری نے بیان کیا، کہا: مجھ سے قاسم بن عبدالرحمٰن نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابوحازم نے۔ جو ابن عباس کا آزاد کردہ غلام نبتك ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا......

محدث محمد ناصر الدین البانی تحریر فرماتے ہیں:

قاسم بن عبدالرحمٰن کو جس کا لقب انصاری ہے۔ امام یحییٰ بن معین نے بے حد ضعیف قرار دیا ہے جیسا کہ میزان الاعتدال[۴] میں مذکور ہے۔

حافظ منذری نے بھی یہ روایت ترغیب وترہیب[۵] میں نقل کی ہے اور قاسم کو حد درجہ ضعیف قرار دیا ہے۔

رہا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا آزاد کردہ غلام ابوحازم نبتک تو وہ ثقہ ہے۔ جیسا کہ امام ابن

---

۱ صحیح بخاری: ۵۱۸٤۔ صحیح: مسلم ۱٤۷۰، ۳٦۵۰

۲ الضعیفه ص ۱۱۳۷، ۱۱٤۰، ج ۱۲، ح ٦٤۹۹

۳ صحیح ابن خزیمه: ص ۱۳۱۹، ج۲، ح ۲۷۹۲

٤ میزان الاعتدال: ص ۳۷٤، ج۳

۵ الترغیب والترهیب: ص ۳٤۵، ج۲، ح ٦۹۲

ابی حاتم نے امام احمد کے حوالہ سے لکھا ہے۔[1]

(۲۰۶)......إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ مِنْ طِيْنَةِ الْجَابِيَةِ وَعَجَنَهُ مِنْ مَاءٍ مِنَ الْجَنَّةِ۔

''درحقیقت اللہ نے آدم کو جابیہ کی مٹی سے پیدا کیا اور اس مٹی کو جنت کے پانی سے گوندھا''

یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج امام عبداللہ بن عدی نے الکامل[2] میں اور انہی کے طریق سے امام ابن الجوزی نے الموضوعات[3] میں اس سند سے کی ہے:

ولید بن مسلم سے روایت ہے، وہ اسماعیل بن رافع سے روایت کرتے ہیں، وہ مقبری سے اور وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

امام ابن الجوزی نے اس روایت کو درج ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے:

((خَلَقَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ آدَمَ مِنْ تُرَابِ الْجَابِيَةِ وَعَجَنَهُ بِمَاءِ الْجَنَّةِ))

اس سند کا راوی اسماعیل بن رافع مکی ہے جو ضعیف ہے۔ جسے امام احمد اور امام یحییٰ بن معین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ان سے اس کی روایت کرنے والا ولید بن مسلم ''مدلس'' ہے جو نا قابل بھروسہ تھا۔

اس روایت کا متن اس کی سند سے زیادہ منکر ہے۔ کیونکہ یہ اس صحیح حدیث کے خلاف ہے جس کی تخریج امام ترمذی، ابوداؤد اور ابن خزیمہ نے کی ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

((إِنَّ اللّٰهِ تَعَالَى خَلَقَ آدَمَ مِنْ قَبْضَةٍ قَبَضَهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَرْضِ، فَجَاءَ بَنُو آدَمَ عَلَى قَدْرِ الْأَرْضِ، فَجَاءَ مِنْهُمُ الْأَحْمَرُ وَالْأَبْيَضُ وَالْأَسْوَدُ وَبَيْنَ ذَلِكَ، وَالسَّهْلُ وَالْحَزْنُ وَالْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَبَيْنَ ذَلِكَ))

''درحقیقت اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس مٹھی بھر مٹی سے پیدا کیا جو اس نے تمام زمین سے لی۔ اسی وجہ سے بنو آدم زمین کے مطابق ظاہر ہوئے۔ ان میں سے کوئی سرخ ہے تو کوئی گورا، کوئی سیاہ فام تو کوئی درمیانی رنگت کا، کوئی نرم خو ہے تو کوئی سخت مزاج ہے اور کوئی برا ہے تو کوئی اچھا۔ اور کوئی درمیانی خصلتوں کا ہے''[4]

---

[1] الضعیفہ ص ۱۵۹، ج ۱۱، ح ۵۰۹۲، صحیح ابن خزیمہ کے محقق ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے ابو حازم کا نام غلط لکھا ہے۔ لیکن البانی نے کتاب کے حاشیہ پر نام لکھا ہے اور دلیل میں دولابی کی الکنیٰ، ابن ابی حاتم کی جرح و تعدیل اور ابن حبان کی ''ثقات'' کا حوالہ دیا ہے۔

[2] الکامل: ص ۲۷۸، ج ۱ [3] الموضوعات: ص ۳۰۲، ج ۱، ح ۳۹۴

[4] ابوداؤد: ح ۴۶۹۳۔ ترمذی: ۲۹۵۵۔ کتاب التوحید: ص ۴۴

یہ صحیح حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو کسی ایک جگہ کی مٹی سے نہیں پیدا کیا جیسا کہ ''جابیہ''[1] والی جھوٹی روایت میں دعویٰ کیا گیا ہے بلکہ مختلف جگہوں کی مٹیوں کو ملا کر اس سے ان کا پتلا بنایا۔

انسان کے اجزائے ترکیبی:

اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کے پہلے فرد حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے فرمائی۔ لیکن ان کی اولاد کو نطفے سے وجود بخشا اور قیامت تک جتنے انسان پیدا ہوں گے ان سب کا مادۂ تخلیق نطفہ ہی ہوگا۔

﴿ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ٥ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ٥ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ٥ ﴾ [السجدۃ:۶ تا ۸]

''وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا، زبردست اور مہربان۔ اس نے ہر چیز کو عمدہ طریقے سے پیدا کیا اور انسان کی تخلیق کی ابتدا مٹی کے گارے سے کی۔ پھر اس کی نسل حقیر پانی کے جوہر سے چلائی۔''

لیکن حضرت آدم علیہ السلام کے خاکی پتلے میں جو عناصر ترکیبی رکھے گئے تھے یا زمین کے جن مواد سے وہ بنایا گیا تھا وہ مواد اور عناصر ترکیبی ان کے نطفے سے، ان کی ذریت کے نطفوں میں منتقل ہوتے رہے۔ اس طرح صالح مٹی اور انسانی جسم کے مواد اور عناصر ترکیبی ایک ہی ہیں۔ مثال کے طور پر:

کاربن **Carbon**، ہائڈروجن **Hydrogen**، نائٹروجن **Nitrogen**، کلورین **Chlorine**، سلفر **Sulphur**، کیلشیم **Calcium**، فاسفورس **Phosphorus**، پوٹاشیم **Potassium**، سوڈیم **Sodium**، لوہا **Iron**، آیوڈین **Iodine**، آکسیجن **Oxygen** اور منگنیز **Manganese** وغیرہ زرخیز مٹی اور انسانوں کے مشترکہ عناصر ترکیبی ہیں۔

(۲۰۷)......لَمَّا أَهْبَطَ اللّٰهُ تَعَالَى آدَمَ إِلَى الْأَرْضِ: كَانَ أَوَّلَ مَا أَكَلَ مِنْ ثِمَارِهَا النَّبِقُ۔

''جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین پر اتارا تو انہوں نے زمین کے پھلوں میں سے جو پھل سب سے پہلے کھایا وہ بیری کا پھل تھا۔''

---

[1] شام کے ایک گاؤں کا نام جابیہ ہے۔

یہ روایت منکر ہے۔ اس کی تخریج حافظ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد[1] میں اور انہی کے طریق سے امام ابن الجوزی نے العلل المتناھیہ[2] میں بکر بن بکار کی سند سے کی ہے۔

ہم سے ورقاء نے ابن ابی نجیح سے، انہوں نے مجاہد سے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے......

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ابن الجوزی کا قول ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ امام یحییٰ بن معین نے بکر بن بکار کے بارے میں کہا کہ: وہ کچھ بھی نہیں یعنی ناقابل اعتبار ہے۔

البانی فرماتے ہیں: بکر بن بکار کی بعض محدثین نے توثیق کی ہے لیکن اس کی روایت کردہ حدیثوں پر مشتمل ایک ایسا نسخہ ہے جس میں منکر روایتیں ہیں۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ انہی منکر روایتوں کی وجہ سے اس کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

البانی آگے چل کر لکھتے ہیں: بکر بن بکار کے ضعیف ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہی روایت ایک دوسری بار ''عن حماد بن سلمہ، عن علی بن زید، عن یوسف بن مہران، عن ابن عباس کی سند سے اس نے موقوف روایت کی ہے اور اس کو نبی ﷺ سے منسوب نہیں کیا ہے۔[3]

حضرت آدم علیہ السلام کا ہند میں نزول:

(۲۰۸)......نَزَلَ آدَمُ بِالْهِنْدِ وَاسْتَوْحَشَ، فَنَزَلَ جِبْرِيْلُ، فَنَادَى بِالْأَذَانِ: اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (مَرَّتَيْنِ)، اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ (مَرَّتَيْنِ) قَالَ آدَمُ: مَنْ مُحَمَّدٌ؟ قَالَ: آخِرُ وَلَدِكَ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

''آدم علیہ السلام ہندوستان میں نازل ہوئے اور وحشت و گھبراہٹ محسوس کرنے لگے تو جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور اذان دی: الله اکبر، الله اکبر، اشھد ان لا الہ الا الله (دو مرتبہ) اشھد ان محمد رسول الله (دو مرتبہ)۔ آدم نے پوچھا: محمد کون ہیں؟ جبریل نے جواب دیا: انبیاء میں سے تمہاری آخری اولاد ﷺ۔

---

[1] تاریخ بغداد: ص ٦٢، ج ١٣ [2] العلل المتناهیه: ص ١٦٦، ١٦٧، ج ٢

[3] الضعیفة: ص ٤٢١، ج ١٣، ح ٦١٩٣

یہ روایت ضعیف ہے۔ اس کی تخریج حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق [1] میں محمد بن عبد اللہ بن سلمان کی سند سے کی ہے:

ہم کو علی بن بہرام کوفی نے خبر دی، کہا: ہم کو عبد الملک بن ابی کریمہ نے عمرو بن قیس سے انہوں نے عطاء سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے......

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ سند ضعیف ہے۔ علی بن بہرام کو میں نہیں جانتا۔ حافظ ابن حجر نے اس کا ذکر ابو کریمہ سے روایت کرنے والوں کے ضمن میں کیا ہے۔ اور اس کا پورا نام: علی بن یزید بن بہرام لکھا ہے۔ پھر مجھے اس کا ذکر تاریخ بغداد [2] میں مل گیا جس میں ''یزید'' کو اس کا دادا قرار دیا گیا ہے اور لکھا ہے۔

''علی بن بہرام بن یزید ابو جحیہ مزنی عطار...... اس کا تعلق افریقہ سے تھا جہاں سے وہ عراق منتقل ہو گیا اور اپنی وفات تک وہیں سکونت پذیر رہا۔ بغداد میں عبد الملک بن ابو کریمہ انصاری سے حدیثوں کی روایت کی، اس سے احمد بن یحییٰ اودی، موسیٰ بن اسحاق انصاری، علیک رازی اور حسن بن طیب شجاعی نے حدیثیں روایت کیں''

اس کے بعد حافظ خطیب بغدادی نے اس کی روایت کردہ دو حدیثیں مثال میں نقل کی ہیں۔ مگر اس کی جرح و تعدیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔

رہا سند کا بنیادی راوی: محمد بن عبد اللہ بن سلیمان تو اس نام کے دو راوی ہیں:

(۱) ایک کوفی ہے جس کو ابن مندہ نے مجہول لکھا ہے۔

(۲) دوسرے کا لقب خراسانی ہے۔ جس پر امام ذہبی نے موضوع حدیث روایت کرنے کا الزام لگایا ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ وہ پہلا ہے۔ یعنی محمد بن عبد اللہ بن سلیمان کوفی۔

البانی آگے لکھتے ہیں:

یہ زیر بحث حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس کی سند اس حدیث سے قوی ہے جس میں آدم علیہ السلام کے حکم الٰہی کی خلاف ورزی کرنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کے واسطہ سے توبہ کرنے کا ذکر آیا ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

---

[1] تاریخ دمشق: ص ۳۲۳، ج ۲ [2] تاریخ بغداد: ص ۳۵۴، ج ۱۱

((لَمَّا اقْتَرَفَ آدَمُ الْخَطِيئَةَ قَالَ: يَا رَبِّ! أَسْأَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ لَمَّا غَفَرْتَ لِيْ......))

''جب آدم سے گناہ سرزد ہوگیا تو کہا: اے میرے رب! میں محمد کے حق کا واسطہ دے کر تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے معاف کر دے......''[1]

تو اس میں یہ صراحت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نبی مکرم محمد رسول اللہ ﷺ کو جنت میں رہتے ہوئے اور زمین پر اترنے سے قبل جانتے تھے۔ جبکہ یہ زیر بحث روایت یہ صراحت کر رہی ہے کہ آدم علیہ السلام محمد ﷺ سے زمین پر نازل ہونے تک ناواقف تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا: محمد کون ہیں؟ تو یہ روایت اس روایت کے باطل ہونے کی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے۔[2]

اوپر اس روایت کی جو سند بیان ہوئی ہے اس سے اس کا ضعیف ہونا بالکل واضح ہے۔ مگر جیسا کہ محدث البانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ روایت اپنی سند کے اعتبار سے اس روایت سے قوی ہے جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں ''شجر ممنوعہ'' کا پھل کھا کر اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے محمد رسول اللہ ﷺ کو وسیلہ بنا کر اپنی اس لغزش کی معافی کی درخواست کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا تھا۔

تو وہ روایت صرف ضعیف ہی نہیں ہے بلکہ موضوع اور باطل ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کی پہلی جلد میں پوری تفصیل سے واضح کیا جا چکا ہے۔ لیکن نبی مکرم محمد رسول اللہ ﷺ اور اولیاء اللہ کو وسیلہ اور واسطہ بنا کر دعا کرنا چونکہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے اندر عقیدہ کی شکل اختیار کر چکا ہے اس لیے اس کو صحیح دینی رنگ دینے اور مطلوب بنانے کی خاطر مذکورہ روایت گھڑی گئی ہے۔ اسی طرح بعض صحیح حدیثوں سے ایسی عبارتیں جوڑ دی گئی ہیں جن سے اس غلط عقیدے کی تائید ہوتی ہے۔ اسی طرح کی روایتوں میں سے ایک درج ذیل روایت بھی ہے جس کو پہلی روایت کی شاہد کہا جاتا ہے۔

(۲۰۹)......لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْأَرْضَ وَاسْتَوٰى إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ، وَخَلَقَ الْعَرْشَ، كَتَبَ عَلٰى سَاقِ الْعَرْشِ: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ خَاتَمُ الْأَنْبِيَاءِ، وَخَلَقَ الْجَنَّةَ الَّتِيْ أَسْكَنَهَا آدَمَ وَحَوَّاءَ، فَكَتَبَ

---

[1] اس کتاب کی پہلی جلد کے صفحہ ۱۰۸۔۱۱۰ پر اس روایت کا باطل ہونا واضح کیا جا چکا ہے۔ اور آگے روایت نمبر ۲۱۳ کے تحت اسی مضمون کی حامل ایک دوسری روایت مختلف الفاظ میں آ رہی ہے۔

[2] الضعیفہ: ص ۵۷۹۔ ۵۸۰، ج ۱، ح ۴۰۳

اِسْمِیْ عَلٰی جَمِیْعِ الْاَبْوَابِ وَالْاَوْرَاقِ وَالْقِبَابِ وَالْخِیَامِ، وَآدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ، فَلَمَّا اَحْیَاهُ اللّٰهُ تَعَالٰی نَظَرَ اِلَی الْعَرْشِ فَرَاٰی اِسْمِیْ، فَاَخْبَرَهُ اللّٰهُ اَنَّهُ سَیِّدُ وَلَدِكَ، فَلَمَّا غَرَّهُمَا الشَّیْطَانُ تَابَا وَاسْتَشْفَعَا بِاِسْمِیْ اِلَیْهِ))

''جب اللہ نے زمین بنائی تو آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور سات آسمان استوار کیے اور عرش کو وجود بخشا۔ عرش کے ستون پر "محمد رسول الله خاتم الانبياء" تحریر فرمایا اور وہ جنت بنائی جس میں آدم وحوا کو آباد کیا اور میرا نام جنت کے دروازوں، درختوں کے پتوں، گنبدوں اور خیموں پر لکھا۔ حالانکہ آدم ابھی روح اور بدن کی درمیانی حالت میں تھے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو زندگی بخشی تو انہوں نے عرش کی جانب نظر ڈالی۔ وہاں میرا نام دیکھا۔ اللہ نے ان کو بتایا کہ یہ تمہاری اولاد کے سردار ہیں۔ پس جب شیطان نے آدم اور حواء کو بہکایا تو انہوں نے توبہ کی اور اللہ میرے نام سے سفارش کرائی''

یہ روایت منکر ہے۔ جس کی روایت ابوالحسین بن بشران نے کی ہے اور اسی کے طریق سے امام ابن الجوزی نے "الوفاء بفضائل المصفطی" میں اس سند سے روایت کی ہے:

ہم سے ابوجعفر محمد بن عمرو نے بیان کیا، کہا: ہم سے احمد بن اسحاق بن صالح نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن صالح نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن سنان عوفی نے بیان، کہا: ہم سے ابراہیم بن طہمان نے بدیل بن میسرہ سے، انہوں نے عبداللہ بن شقیق سے، اور انہوں نے میسرہ...... الفجر...... سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا:

میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مَتٰی كُنْتَ نَبِيًّا، كُتِبْتَ نَبِيًّا، جُعِلْتَ نَبِيًّا......

آپ کب نبی[1] تھے، آپ کب نبی لکھے[2] گئے، آپ کب نبی[3] مقرر گئے؟ تو آپ نے فرمایا......

یہ روایت امام ابن تیمیہ کے مجموعہ فتاویٰ[4] میں موجود ہے جو دراصل ان کے اس رسالہ سے نقل کی گئی ہے جو آپ نے ''اتحادی'' مذہب کی حقیقت اور اس کے باطل ہونے کے موضوع پر لکھا ہے۔ اور ابن عروہ حنبلی کی کتاب الکواکب الدراری[5] میں محفوظ ہے۔

---

[1] طبقات ابن سعد: ص ۱۴۸، ج ۱، ۵۹، ج ۷ [2] السنة ح ۴۱۰
[3] مسند احمد ح ۱۶۷۴۰، ۲۳۵۹۸۹ [4] مجموعة فتاوى ابن تيمية: ص ۱۵۰، ج ۲
[5] الكواكب الدراري: ص ۳۹، ۱۰۳، ج ۱

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

اس سند کے تمام راوی معروف اور ثقہ ہیں سوائے محمد بن صالح کے جس کو میں نہیں جانتا۔ اس کے اوپر کے راوی ''التہذیب'' کے راویوں میں سے ہیں۔ سند کا ایک راوی احمد بن اسحاق بن صالح ہے جس کی کنیت ابوبکر وزّان اور لقب بغدادی ہے۔ امام ابن ابی حاتم نے الجرح والتعدیل[1] میں لکھا ہے کہ میں نے اپنے والد کے ساتھ اس کے بارے میں لکھا ہے: وہ سچا تھا۔ اور امام دارقطنی کا قول ہے: لَا بَأْسَ بِهِ اس میں کوئی حرج نہیں۔[2]

رہا ابوجعفر محمد بن عمرو؟ تو وہ ابن بختری رزاز ہے۔ جس کو حافظ خطیب بغدادی نے ثقہ قرار دیا ہے۔[3]

اس تحقیق کے بعد البانی تحریر فرماتے ہیں:

لگتا ہے اس کی مصیبت محمد بن صالح ہے جس کو میں نہیں جانتا اور جس کو بغدادی نے ابوبکر احمد بن اسحاق بن صالح وزان کے شیوخ میں شمار کیا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ محمد بن صالح ثقہ تھا تو اس صورت میں یہ روایت ''شاذ'' ہوگی۔ کیونکہ اس نے اس روایت میں اپنے سے زیادہ ثقہ راویوں کی مخالفت کی ہے۔ اس لیے کہ صحیح روایتوں میں صرف اتنا ہی آیا ہے: كُنْتُ ، كُتِبْتُ ، جُعِلْتُ نَبِيًّا وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ'' میں نبی تھا، یا نبی لکھا جاچکا تھا یا نبی مقرر کردیا گیا تھا جبکہ آدم روح اور بدن کی درمیانی حالت میں تھے اور کسی بھی ثقہ راوی نے یہ طویل اور منکر عبارت روایت نہیں کی ہے۔[4]

محدث البانی رحمہ اللہ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ کافی اور شافی ہے۔ مگر اس میں اتنا اضافہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ:

اگر رسول اللہ ﷺ کی منقبت اور فضیلت میں یہ بات شامل ہوتی کہ عرش کو بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام اس کے ستون پر اور جنت بنانے کے بعد اس کے دروازوں، اس کے درختوں کے پتوں، اس کے گنبدوں اور خیموں پر لکھا تھا تو یہ چیز سیرت کی کتابوں میں معروف ہوتی، متعدد صحابہ کرام نے اس کو نقل کیا ہوتا۔ جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ یہ صفات ایسی روایت میں بیان ہوئی ہیں جس کا راوی یا

[1] الجرح والتعدیل: ص ٤١ ، ج ١
[2] تاریخ بغداد ص ٢٨ ، ج ٤
[3] ص ١٣٢ ، ج ٣
[4] الضعیفہ: ص ٤٦٨ ، ٤٧٠ ۔ ج ١٢ ، ح ٥٧٠٩

تو تمام ائمہ حدیث کے نزدیک ضعیف اور نا قابل اعتبار تھا یا مجہول اور نا معلوم۔

آخر میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے غلطی سرزد ہو جانے کے موقع پر نبی مکرم ﷺ کے واسطہ اور وسیلہ سے دعا کرنے سے متعلق تمام روایات اپنی سندوں اور فتنوں کے ساتھ موضوع اور منکر ہیں۔ اگرچہ یہ روایتیں بے حد مشہور اور لوگوں میں زبان زد عام ہیں اور ان کی شہرت کا سبب ان کی صحت نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ یہ ایک خاص ذہنیت اور عقیدہ کی ترجمان ہیں۔

اور جن صحیح حدیثوں میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے قبل محمد رسول اللہ ﷺ کے نبی ہونے کا ذکر آیا ہے تو ان کا مطلب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق سے قبل ہی آپ کے نبی ہونے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ بلکہ بعض حدیثوں میں اس کی صراحت موجود ہے۔[1]

(۲۱۰)......لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، خُبِّرَ بِبَنِيْهِ، فَجَعَلَ يَرَى فَضَائِلَ بَعْضِهِمْ عَلَى بَعْضٍ، فَرَأَى نُوْرًا سَاطِعًا فِيْ أَسْفَلِهِمْ، فَقَالَ: يَا رَبِّ! مَنْ هٰذَا؟ قَالَ: هٰذَا اِبْنُكَ أَحْمَدُ، هُوَ اَوَّلٌ وَهُوَ آخِرٌ، وَهُوَ أَوَّلُ شَافِعٍ۔

"جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کو ان کے بیٹوں کی خبر دی گئی اور انہوں نے ان میں سے بعض کے بعض پر فضائل دیکھے اور ان کے نیچے تیز پھیلی ہوئی روشنی دیکھی تو عرض کیا: اے میرے رب! یہ کون ہے؟ اللہ نے فرمایا: یہ تیرے بیٹے احمد ہیں۔ وہی پہلے ہیں، وہی آخری اور وہی پہلے شفاعت کرنے والے ہیں"

یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ اس کی تخریج حافظ محمد بن اسحاق بن ابراہیم سراج نے اپنی حدیث[2] میں اس سند سے کی ہے۔

ہم سے ابو عبید اللہ یحییٰ بن محمد بن سکن نے بیان کیا، کہا: ہم سے حبان بن ہلال نے بیان کیا، کہا: ہم سے مبارک بن فضالہ نے بیان کیا، کہا: مجھ سے عبید اللہ بن عمر نے خبیب بن عبد الرحمٰن سے، انہوں نے حفص بن عاصم سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، ابو ہریرہ نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اسی سند سے اس کی تخریج ابو محمد مخلدی نے الفوائد[3] میں، مخلص نے الفوائد[4] المنتقاۃ میں، امام

---

[1] ملاحظہ ہو اس کتاب کی پہلی جلد ص ۲۹۰، ۲۹۱
[2] ص ۲۰۰، ج ۱
[3] الفوائد: ص ۲٦٤، ج ۲
[4] الفوائد المنتقاۃ: ص ١٤، ج ١٠

بیہقی نے دلائل النبوۃ [1] میں اور علاؤ الدین علی متقی نے کنز العمال [2] میں کی ہے۔

محدث محمد ناصر الدین رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

یہ سند حسن ہے۔ اس کے تمام راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں سوائے مبارک بن فضالہ کے۔ امام بخاری نے ان کی روایت کردہ صرف معلق حدیث روایت کی ہے اور ان کی ثقاہت مختلف فیہ ہے۔ لیکن اہل تحقیق کا ان کے بارے میں یہ قول ہے کہ اگر وہ اپنی روایت میں حدثنا یا حدثنی کی صراحت کر دیں تو سچے ہیں۔

البانی آگے لکھتے ہیں:

"پھر مجھے یاد آیا کہ مبارک بن فضالہ "مدلس" تھے اور ان کی تدلیس [3] اس قسم کی نہیں تھی جس کی برائی مدلس راوی کی اس صراحت سے دور ہو جائے کہ اس کے شیخ نے اس سے حدیث بیان کی ہے۔ بلکہ ان کی تدلیس وہ تھی جو محدثین کے یہاں "تدلیس التسویہ" کے نام سے معروف ہے۔ ایسی تدلیس کرنے والا سند کے اوپر سے اپنے شیخ کے سوا دوسرے ضعیف راویوں کو حذف کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ولید بن مسلم کیا کرتا تھا...... لہٰذا تدلیس التسویہ کرنے والے راوی کی حدیث صرف اس شرط پر قابل قبول ہے کہ وہ اپنے شیخ کے اوپر کے تمام راویوں کے بارے میں یہ صراحت کرے کہ ان میں سے ہر راوی نے یہ کہا ہے کہ اس کے شیخ نے اس سے حدیث بیان کی ہے۔ یعنی حدثنا یا حدثنی کہے۔ [4]

حافظ ابن حجر نے بھی مبارک بن فضالہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سچا تھا لیکن تدلیس التسویہ کرتا تھا۔ [5]

تعجب ہے کہ محدث البانی نے زیر بحث روایت کے متن سے بالکل تعرض نہیں کیا ہے حالانکہ اس کا متن اس کی سند سے زیادہ برا ہے۔ کیونکہ اس میں نبی مکرم ﷺ کے اول و آخر ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے جو درحقیقت ان لوگوں کے عقیدے کا ترجمان ہے جن کا دعویٰ ہے کہ نبی معظم محمد رسول اللہ ﷺ پیدا تو سب سے پہلے کیے گئے لیکن آپ کی بعثت تمام انبیاء کے آخر میں ہوئی۔ اپنے اس دعویٰ کو صحیح ثابت کرنے

---

[1] دلائل النبوۃ: ص ۴۸۳، ج ۵ [2] کنز العمال: ح ۳۲۰۵٦

[3] دلّس یُدَلِّسُ کے معنی ہیں عیب چھپانا اور دھوکہ دینا۔ محدثین کی اصطلاح میں سند کے عیب چھپانے کو تدلیس کہتے ہیں۔ جس کی بدترین قسم "تدلیس التسویہ" ہے جس میں "مدلس" سند کے ضعیف راویوں کو حذف کر کے صرف ثقہ راویوں کو باقی رکھتا ہے تاکہ سند قابل اعتماد ہو جائے۔

[4] الضعیفہ ص ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ج ۱۳، ح ٦٤٨٢

[5] تقریب التھذیب: ص ٤٥٢۔ ترجمہ: ٦٤٦٤

کے لیے انہوں نے درج ذیل نا قابل اعتبار روایت کا سہارا لیا ہے:

((كُنْتُ أَوَّلَ النَّبِيِّينَ فِي الْخَلْقِ وَآخِرَهُمْ فِي الْبَعْثِ))

میں پیدائش کے اعتبار سے پہلا نبی ہوں اور مبعوث ہونے کے اعتبار سے آخری۔" اس نا قابل اعتبار روایت کے بارے میں تفصیلی بحث اس کتاب کی پہلی جلد میں گزر چکی ہے۔[1]

(۲۱۱)......إِنَّ آدَمَ قَامَ خَطِيبًا فِي أَرْبَعِينَ أَلْفًا مِنْ وَلَدِ وَوَلَدِهِ وَلَدِهِ وَقَالَ إِنَّ رَبِّي عَهِدَ إِلَيَّ ، فَقَالَ: يَا آدَمُ! أَقْلِلْ كَلَامَكَ تَرْجِعُ إِلَى جِوَارِي۔

"آدم نے ایک دن اپنے چالیس ہزار بیٹوں اور پوتوں کے درمیان خطبہ دیتے ہوئے کہا: میرے رب نے مجھے حکم دیتے ہوئے فرمایا ہے: اے آدم! اپنی گفتگو کم کرو تو دوبارہ میری حفاظت میں آجاؤ گے"

یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ اس کی تخریج ابوموسیٰ مدینی نے "منتهى رغبات السامعين"[2] میں اور حافظ دیلمی نے مسند الفردوس[3] میں ابراہیم بن جعفر بن خُلید کے طریق سے کی ہے۔

ہم سے حسن بن شبیب اغر نے بیان کیا، کہا: ہم سے خلف بن خلیفہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابو ہاشم رمانی نے ثابت سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے......

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ سند موضوع ہے جس کا گھڑنے والا حسن بن شبیب ہے۔ امام ابن عدی نے اس کے بارے میں لکھا ہے: اس نے ثقہ راویوں سے باطل روایتیں بیان کی ہیں۔

یہ روایت امام ذہبی نے اس سلسلۂ روایات کے ضمن میں درج کی ہے جن کو انہوں نے منکر قرار دیا ہے۔ مگر انہوں نے یہ روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک دوسری سند سے بھی نقل کی ہے اور اس کو ان پر موقوف قرار دیا ہے۔

البانی اپنی بات ختم کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لگتا ہے کہ یہ روایت اسرائیلیات سے ماخوذ ہے۔

---

[1] موضوع اور منکر روایات: ج ا ص ۲۹۲ [2] منتهىٰ رغبات السالكين: ص ۲۵۵، ج ۱

[3] مسند الفردوس ص ۲۶۵، ج ۲

رہا ابراہیم بن جعفر بن حلید تو مجھے اس کا کوئی ترجمہ نہیں ملا۔[1]

(۲۱۲)......لَمَّا أَهْبَطَ اللّٰهُ آدَمَ إِلَى الْأَرْضِ، قَامَ وِجَاهَ الْكَعْبَةِ فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، فَأَلْهَمَهُ اللّٰهُ هٰذَا الدُّعَاءَ: اَللّٰهُمَّ! إِنَّكَ تَعْلَمُ سَرِيْرَتِيْ وَعَلَانِيَتِيْ، فَاقْبَلْ مَعْذِرَتِيْ، وَتَعْلَمُ حَاجَتِيْ، فَأَعْطِنِيْ سُؤْلِيْ، وَتَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ، فَاغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ۔

اَللّٰهُمَّ! إِنِّيْ أَسْأَلُكَ إِيْمَانًا يُبَاشِرُ قَلْبِيْ وَيَقِيْنًا صَادِقًا حَتّٰى أَعْلَمَ أَنَّهُ لَا يُصِيْبُنِيْ إِلَّا مَا كَتَبْتَ لِيْ وَرِضًا بِمَا قَسَمْتَ لِيْ، فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلَيْهِ:

يَا آدَمُ! إِنِّيْ قَدْ قَبِلْتُ تَوْبَتَكَ وَغَفَرْتُ لَكَ ذَنْبَكَ وَلَنْ يَدْعُوَنِيْ أَحَدٌ بِهٰذَا الدُّعَاءِ إِلَّا غَفَرْتُ لَهُ ذَنْبَهُ وَكَفَيْتُهُ الْمُهِمَّ مِنْ أَمْرِهِ، وَزَجَرْتُ عَنْهُ الشَّيْطَانَ وَاتَّجَرْتُ لَهُ مِنْ وَرَاءِ كُلِّ تَاجِرٍ وَأَقْبَلَتْ إِلَيْهِ الدُّنْيَا رَاغِمَةً وَإِنْ لَمْ يُرِدْهَا۔

''جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین پر اتارا تو انہوں نے کعبہ کی سمت کھڑے ہو کر دو رکعتیں نماز ادا کیں اور اللہ نے ان کے دل میں یہ دعا الہام فرمائی:

اے اللہ! تو میری پوشیدہ اور ظاہری حالت جانتا ہے۔ تو میرا عذر قبول فرما۔ تو میری حاجت مندی سے واقف ہے، تو میری مانگ مجھے عطا فرما۔ اور جو کچھ میرے جی میں ہے تو اس کا علم رکھتا ہے تو میرا گناہ معاف فرما دے۔ اے اللہ! میں تجھ سے ایسے ایمان کا سوال کرتا ہوں جو میرے دل کو چھو لے اور سچے یقین کا طالب ہوں تا کہ مجھے یہ گہرا علم حاصل ہو جائے کہ مجھے صرف وہی کچھ پہنچ سکتا ہے جو تو نے میرے لیے لکھ دیا ہے اور میں تجھ سے اپنے لیے اس نعمت پر قناعت کا طالب ہوں جو تو نے میرے لیے تقسیم کر دی ہے۔ تو اللہ نے ان کو یہ وحی فرمائی۔

اے آدم! میں نے تیری توبہ قبول فرمائی، تیرا گناہ بخش دیا اور جو کوئی بھی مجھ سے یہ دعا کرے گا میں اس کا گناہ معاف کر دوں گا۔ اس کو اس کے غم انگیز معاملے سے محفوظ رکھوں گا، شیطان کو اس سے دور رکھوں گا اور ہر تاجر کے پیچھے اس کے لیے نفع کا سامان کر دوں گا

[1] الضعیفة: ص ۵۳۵۔ ۵۳۶، ج٦ ح ۲۹٦۱

اور دنیا، اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً اس کی طرف مائل ہوگی''

یہ روایت منکر ہے۔ اس کی تخریج حافظ طبرانی نے المعجم الاوسط[1] میں اور ابن عساکر نے تاریخ دمشق[2] میں نضر بن طاہر کی سند سے کی ہے:

ہم سے معاذ بن محمد انصاری خراسانی نے ہشام بن عروہ سے، انہوں نے اپنے باپ عروہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور انہوں نے نبی ﷺ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......

حافظ طبرانی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

اس کی روایت ہشام بن عروہ سے صرف معاذ بن محمد نے کی ہے اور اس کی روایت میں نضر بن طاہر منفرد ہے۔

محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

نضر بن طاہر حد درجہ ضعیف ہے۔ وہ حدیثوں کا سرقہ کرتا تھا اور ایسے لوگوں سے حدیث روایت کیا کرتا تھا جن کو اس نے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ اس کی عمر اس قابل نہیں تھی کہ وہ ان کو دیکھتا۔ جیسا کہ امام ابن عدی نے الکامل میں لکھا ہے اور ایسی چند احادیث نقل کی ہیں جن کا سرقہ کر کے اس نے یہ بیان کرنا شروع کر دیا کہ اس سے یہ حدیثیں فلاں اور فلاں راویوں نے بیان کی ہیں۔ جبکہ یہ حدیثیں اس نے ان سے نہیں سنی تھیں۔ جس کا مطلب ہے کہ وہ ان لوگوں سے ان کو منسوب کرنے میں کذب بیانی سے کام لیتا تھا جن کے بارے میں وہ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ انہوں نے اس سے وہ حدیثیں بیان کی ہیں۔ جبکہ ان راویوں سے اس کی ملاقات ثابت نہیں ہے۔ اس کی اس کذب بیانی کی تفصیل امام ابوبکر عمرو بن ابی عاصم نے ''کتاب السنۃ'' میں بیان کی ہے۔

''بصرہ میں ہمارے پاس ایک شیخ تھا جو کافی سن رسیدہ تھا۔ وہ صاحب خیر تھا اور غزوات میں بھی حصہ لے چکا تھا۔ اس کا نام نضر بن طاہر ابوالحجاج تھا۔ ہم نے اس کی روایت کردہ بہت ساری حدیثیں لکھی بھی تھیں جو اس نے ابوعوانہ، سلیمان اور دوسرے لوگوں سے روایت کی تھیں۔ پھر اس نے دلہم بن اسود کی طویل حدیث روایت کی، تو میں نے اس سے پوچھا: کیا دلہم سے تمہاری ملاقات ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ وہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے ہمراہ ہمارے پاس آیا تھا اور ایک جگہ اس نے قیام کیا۔ اس نے اس جگہ کا نام بھی بتایا۔ چنانچہ میں

---

[1] المعجم الأوسط: ص ٤٥٢، ج ٦، ح ٥٩٧١

نے دریافت کیا مگر مجھے کوئی ایسا نہیں ملا جس کو یہ یاد ہو کہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم بصرہ آیا تھا۔ حالانکہ عبدالرحمٰن کو جو شہرت حاصل تھی اگر وہ بصرہ آیا ہوتا تو لوگ اس کے بارے میں لکھتے۔ پھر اس کے بعد مجھے اس شیخ کی کذب بیانی معلوم ہوئی اور میں نے اس کو اس وقت بھی دیکھا جب اس کی بینائی چلی گئی تھی۔ وہ ولید بن مسلم اور دوسروں سے ایسی حدیثیں روایت کرتا رہا جو انہوں نے روایت نہیں کی تھیں۔ وہ روایت حدیث میں مسلسل کذب بیانی کرتا رہا''[1]

البانی آگے لکھتے ہیں:

''ابن حبان پر نضر بن طاہر کی کذب بیانی مخفی رہی۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس کو کتاب الثقات[2] میں شامل کیا اور لکھا ہے:

''بسا اوقات اس سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں اور وہم کا شکار بھی رہا ہے''

جب حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں نضر بن طاہر کے بارے میں امام ابن ابی عاصم کا مذکور بالا قول نقل کیا تو اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے:

''گویا ابن حبان کو ابن ابی عاصم کا یہ قول معلوم نہ ہوسکا۔''

محدث البانی مزید تحریر فرماتے ہیں:

''یہ حدیث بریدہ بن حصیب سے بھی مروی ہے جس کی روایت حافظ ابن عساکر نے ایک دوسرے طریق سے کی ہے: نضر بن طاہر سے روایت ہے، کہا: ہم کو حفص بن سلیمان نے علقمہ بن مرثد سے، انہوں نے سلیمان بن بریدہ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کرتے ہوئے خبر دی......

''حفص بن سلیمان جس کا لقب قاری تھا بے حد ضعیف تھا۔ اگر نضر بن طاہر نے اس سے بھی یہ حدیث نہیں سنی تھی بلکہ اس کا سرقہ کیا تھا تو اس کے معنی ہیں کہ وہ ان لوگوں کو بھی نہیں جانتا تھا جن کی نسبت سے وہ حدیثوں کا سرقہ کرتا تھا''

''لیکن یہ حدیث اس مذکورہ سند کے سوا بھی ایک دوسری سند سے مروی ہے جس کی روایت کرنے والا محمد بن کثیر عبدی ہے۔ کہتا ہے:

ہم سے عبداللہ بن منہال نے سلیمان بن قسیم سے، انہوں نے سلیمان بن بریدہ سے، انہوں نے بریدہ بن حصیب سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا:

---

[1] کتاب السنہ: ص ۲۸۹ [2] الثقات: ص ۲۱٤، ج۹

اس دوسری سند کی تخریج امام بیہقی نے الدعوات[1] میں اور انہی کی سند سے حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق[2] میں اور حافظ ابن حجر نے المسلسلات[3] میں ایک دوسری سند سے محمد بن کثیر سے اس کی تخریج کی ہے۔

محدث البانی تحریر فرماتے ہیں:

''اس سند کا راوی عبداللہ بن منہال، یا عبیداللہ بن منہال یا عبید بن منہال جو بھی نام ہو، اس کا مجھے کوئی ترجمہ نہیں ملا۔

رہا اس کا شیخ، سلیمان بن قسیم جس کو ابن یسیر کہا جاتا ہے، تو وہ تمام محدثین کے نزدیک ضعیف تھا۔ اس کے بارے میں امام ابن حبان کا قول ہے:

''وہ ثقہ راویوں سے معضل[4] روایتیں بیان کیا کرتا تھا۔[5]

(۲۱۳)......لَمَّا أَذْنَبَ آدَمُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الذَّنْبَ الَّذِیْ أَذْنَبَهُ، رَفَعَ رَأْسَهُ إِلَى الْعَرْشِ، فَقَالَ: أَسْأَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ إِلَّا غَفَرْتَ لِیْ، فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلَيْهِ: وَمَا مُحَمَّدٌ وَمَنْ مُحَمَّدٌ؟ فَقَالَ: تَبَارَكَ اسْمُكَ، لَمَّا خَلَقْتَنِیْ رَفَعْتُ رَأْسِیْ إِلَى عَرْشِكَ فَإِذَا فِيْهِ مَكْتُوْبٌ: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، فَقُلْتُ: إِنَّهُ لَيْسَ اَحَدٌ أَعْظَمَ عِنْدَكَ قَدْرًا مِمَّنْ جَعَلْتَ اسْمَهُ مَعَ اسْمِكَ، فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلَيْهِ: يَا آدَمُ، إِنَّهُ آخِرُ النَّبِيِّيْنَ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ، وَإِنَّ أُمَّتَهُ آخِرُ الْأُمَمِ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ، وَلَوْلَاهُ مَا خَلَقْتُكَ۔

''جب آدم علیہ السلام نے وہ گناہ کر ڈالا جو گناہ انہوں نے کیا تو اپنا سر عرش کی جانب اٹھایا اور کہا: میں تجھ سے محمد کے حق کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے معاف کر دے۔ اللہ نے ان کو وحی فرمائی: محمد کیا ہے اور محمد کون ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا: باعظمت ہے تیرا نام! جب تو نے میری تخلیق فرمائی تو میں نے تیرے عرش کی جانب اپنا سر اٹھایا۔ اس پر لا الہ الا

---

[1] الدعوات: ص ۲۳۱ [2] تاریخ دمشق: ص ۶۴۰۔۶۴۱، ج ۲

[3] قلمی نسخہ المسلسلات: ص ۱۱۳، ج ۱

[4] جس حدیث کی سند سے مسلسل دو یا دو سے زیادہ راوی ساقط ہوں وہ معضل ہوتی ہے۔

[5] الضعیفہ: ص ۹۲۵۔۹۲۷، ج ۱۳، ح ۶۴۱۱

اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا پایا۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ: تیرے نزدیک ان سے زیادہ کوئی اور عظیم المرتبت نہیں جن کے نام کو تو نے اپنے نام کے ساتھ شامل کیا ہے۔ تو اللہ نے ان کو وحی کی: اے آدم! وہ تیری ذریت میں پیدا کیے جانے والے نبیوں میں آخری نبی اور ان کی امت تیری اولاد میں آخری امت ہوگی۔ اگر وہ نہ ہوتے تو میں تجھے پیدا ہی نہ کرتا۔"

یہ روایت بھی باطل اور نبی معظم ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے۔ پہلی روایت جس کی تخریج امام حاکم نے مستدرک[1] میں اور انہی کے طریق سے امام بیہقی نے دلائل النبوۃ[2] میں لَمَّا اقْتَرَفَ آدَمُ الْخَطِيئَةَ...... کے الفاظ میں کی ہے اور اس روایت کی سند، جس کی تخریج طبرانی نے المعجم الصغیر[3] اور المعجم الاوسط[4] میں کی ہے، درج ذیل ہے:

ہم سے محمد بن داؤد بن داؤد بن اسلم صدفی مصری نے بیان کیا، کہا: ہم سے احمد بن سعید مدنی فہری نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبداللہ بن اسماعیل مدنی نے عبدالرحمن بن زید بن اسلم سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے ان کے دادا سے اور انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

یہ روایت نقل کرنے کے بعد حافظ طبرانی نے لکھا ہے:

اس حدیث کو زید بن اسلم سے صرف ان کے بیٹے عبدالرحمن نے روایت کیا ہے اور زید کے بیٹے عبدالرحمن سے صرف عبداللہ بن اسماعیل مدنی نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صرف اسی سند سے مروی ہے اور اس کی روایت میں احمد بن سعید منفرد ہے۔

یہ سند انتہائی تاریک ہے: عبدالرحمن بن زید بن اسلم سے نیچے کے تمام راوی غیر معروف ہیں جیسا کہ حافظ ہیثمی نے مجمع الزوائد[5] میں لکھا ہے کہ اس کی سند میں ایسے راوی شامل ہیں جن کو میں نہیں جانتا۔ اس طرح اس روایت کا سارا "مدار" عبدالرحمن بن زید بن اسلم پر ہے جس کے بارے میں امام بیہقی نے لکھا ہے کہ وہ اس کی روایت میں منفرد ہے اور اس پر حدیثیں گھڑنے اور بنانے کا الزام ہے۔ اس پر یہ الزام خود امام حاکم لگا چکے ہیں۔ اسی وجہ سے ائمہ حدیث نے مستدرک میں اس کے نقل اور پھر اس کو صحیح قرار دینے کی نکیر کی ہے اور امام حاکم کی جانب غلط بیانی اور تضاد کو منسوب کیا ہے۔

---

[1] مستدرك حاكم: ح ٤٢٨٦ — [2] دلائل النبوة: ص ٤٨٩، ج ٥
[3] المعجم الصغير: ص ٨٢-٨٣ — [4] المعجم الأوسط: ص ٢٥٩، ج ٧، ح ٦٤٩٨
[5] مجمع الزوائد: ص ٢٥٣، ج ٨

چنانچہ امام حاکم نے اپنی کتاب "المدخل الی معرفة الصحیح من السقیم" میں لکھا ہے: عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے اپنے باپ سے موضوع اور جھوٹی حدیثیں روایت کی ہیں اور فن حدیث کے ماہرین میں جو لوگ غور وفکر سے کام لیں گے ان پر بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ موضوع حدیثوں کی روایت کا سب سے بڑا ذمہ دار عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم ہے۔[1]

امام ابن الجوزی نے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے ضعیف اور نا قابل اعتبار ہونے پر ائمہ حدیث کا اتفاق نقل کیا ہے۔[2]

اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب[3] میں اور امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے:

امام احمد، ابن معین، ابن مدینی، ابوداؤد، نسائی، ابوحاتم اور تمام اہل مدینہ، عبدالرحمٰن مدنی اور ابن خزیمہ نے عبدالرحمٰن بن زید کو ضعیف اور نا قابل اعتبار قرار دیا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی ذات مقدس کو وسیلہ بنا کر دعا کے قائلین میں ایسے دیانتدار باحثین بھی ہیں جنہوں نے مذکورہ روایت کو باطل قرار دیا ہے۔ انہیں میں شیخ تقی الدین سبکی کی کتاب "السیف المسلول علی من سب الرسول" کے محقق ایاد احمد غوج بھی ہیں جنہوں نے مذکورہ کتاب کے حاشیہ پر اس زیر بحث روایت اور اس کی ہم مثل دوسری روایتوں کو باطل قرار دیا ہے۔[4]

میں نے اتنی تفصیل سے یہ بحث اس لیے کی ہے کہ تا کہ یہ واضح کرسکوں کہ صحیح اسلامی عقائد سے متصادم جتنی روایتیں اہل تصوف کی کتابوں اور ان کے حلقوں میں متداول اور زبان زد عام ہیں وہ سب جھوٹ کا پلندا ہیں۔

(۲۱٤)......لَمَّا حَمَلَتْ حَوَّاءُ طَافَ بِهَا إِبْلِيسُ۔ وَكَانَ لَا يَعِيشُ لَهَا وَلَدٌ۔ فَقَالَ: سَمِّيهِ عَبْدَ الْحَارِثِ، فَسَمَّتْهُ عَبْدَ الْحَارِثِ، فَعَاشَ، وَكَانَ ذٰلِكَ مِنْ وَحْيِ الشَّيْطَانِ وَأَمْرِهِ۔

"جب حوا امید سے ہوئیں تو ابلیس ان کے پاس آیا۔ درآنحالیکہ ان کا کوئی لڑکا زندہ نہیں رہتا تھا اور ان سے کہا: پیدا ہونے والے بچے کا نام عبدالحارث...... حارث کا بندہ...... رکھنا تو انہوں نے اس کا نام عبدالحارث رکھا اور وہ زندہ رہا۔ ایسا انہوں نے شیطان کے ایماء اور حکم سے کیا۔

[1] القاعدة الجليلة: ص ۸۹، الصارم المنكي: ص ۲۹ [2] الموضوعات ص ٦٢، ج ٢
[3] تهذيب التهذيب: ص ١٦١، ١٦٢، ج٦، ص ٥٦٤، ج ٢، ترجمه ٤٨٦٨
[4] السيف المسلول......ص٤٧٧-٤٨١

یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف اور متن کے اعتبار سے منکر اور خلاف واقعہ ہے۔ کیونکہ اس میں حضرت حوا علیہا السلام پر شیطان کی فرماں برداری کا الزام ہے۔ دراصل یہ اس ناپاک مہم کا ایک حصہ ہے جس کا مقصد ہر برائی کی جڑ حضرت حوا کو قرار دینا ہے۔ جس کا ثبوت یہودی لٹریچر اور اسلام کے سوا دوسرے مذاہب کی کتابوں سے ملتا ہے۔ جن میں عورت کو معصیت کا آلہ کار اور گناہوں کا سر چشمہ قرار دیا گیا ہے۔

اس کی روایت امام ترمذی نے سنن[1] میں، امام حاکم نے مستدرک[2] میں، ابن بشران نے امالی[3] میں اور امام احمد نے مسند[4] میں عمر بن ابراہیم کے طریق سے کی ہے۔

قتادہ سے روایت ہے، وہ حسن سے روایت کرتے ہیں اور وہ سمرہ بن جندب سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

امام ترمذی نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

یہ حدیث حسن غریب ہے جس کو ہم صرف عمر بن ابراہیم عن قتادہ کی حدیث کے طور پر جانتے ہیں۔

امام حاکم نے لکھا ہے:

اس کی سند صحیح ہے اور امام ذہبی نے ان کی تائید کی ہے۔

لیکن محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے حسن بصری کا سماع مختلف فیہ ہے۔ مزید یہ کہ حسن بصری ''مدلس'' تھے اور انہوں نے حضرت سمرہ بن جندب سے یہ حدیث سننے کی صراحت نہیں کی ہے۔ امام ذہبی نے ان کے ترجمہ میں لکھا ہے:

''حسن بصری روایت حدیث میں بہت زیادہ تدلیس سے کام لیتے تھے۔ اگر وہ یہ کہتے: ''فلاں سے روایت ہے'' تو ان کی روایت سے استدلال ضعیف تھا۔''

اور امام ابن عدی نے الکامل[5] میں اس کی دوسری علت یہ بتائی ہے کہ اس کی روایت میں عمر بن ابراہیم منفرد ہے اور لکھا ہے: قتادہ سے اس کی روایت کردہ حدیثوں میں ''اضطراب'' ہے۔ تاہم ضعیف ہونے کے باوجود اس کی روایت کردہ حدیث لکھی جاتی تھی۔''

---

[1] جامع ترمذی: ح ۳۰۷۷ [2] مستدرک حاکم: ح [3] الامالی: ص ۱۵۸، ج ۲
[4] مسند الإمام أحمد: ح ۲۰۳۷۸ [5] الكامل: ص ۱۷۰۱، ج ۳

محدث البانی آگے لکھتے ہیں:

اس حدیث کا ضعیف ہونا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ''فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا'' کی تفسیر میں پیش کیا جاتا ہے۔ جبکہ حضرت حسن بصری نے اس آیت کی جو تفسیر کی ہے وہ اس زیر بحث ضعیف حدیث میں مذکور تفسیر سے مختلف ہے۔ مذکورہ آیت کی تفسیر کے بارے میں ان کا قول ہے:

''یہ آدم کی ملت میں نہیں بلکہ دوسری ملتوں میں تھا''۔[1]

حافظ ابن کثیر مذکورہ آیت کی تفسیر کے ضمن میں اس زیر بحث روایت کا ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

حضرت حسن بصری کہا کرتے تھے کہ: وہ یہود و نصاریٰ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ ان کو اولاد عطا فرماتا تھا تو وہ ان کو یہودی اور نصرانی بنا دیتے تھے۔ حسن رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر صحیح سندوں کے ساتھ مروی ہے اور یہی بہترین تفسیر ہے۔ آیت کو اسی مفہوم پر محمول کرنا ہی اچھا ہے۔ اگر مذکورہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے ''محفوظ'' ہوتی تو حسن بصری اس سے صرف نظر نہ کرتے۔

ابن کثیر مزید لکھتے ہیں:

مذکورہ روایت اور اس کے مماثل دوسرے آثار اہل کتاب کے آثار سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں اور اس مسئلے میں ہم حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک پر ہیں کہ مذکورہ آیت کے سیاق و سباق کی روشنی میں، مراد آدم و حوا علیہما السلام نہیں بلکہ ان کی ذریت کے مشرکین مراد ہیں۔[2]

حافظ ابن کثیر اور محدث البانی رحمہما اللہ نے اس زیر بحث روایت کی عدم صحت کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ اگرچہ گراں قدر ہے مگر ان کو اس سے زیادہ واضح اور دوٹوک طریقے سے اس روایت کی نکیر کرنی چاہیے تھی۔ اس لیے کہ اس میں حضرت حوا علیہا السلام کی طرف ابلیس لعین کی فرماں برداری اور صریح شرک کو منسوب کیا گیا ہے۔ کیونکہ عبد الحارث، عبد الرسول، عبد العزیٰ اور عبد الکعبہ وغیرہ جیسے نام رکھنا شرک ہے۔ اس لیے کہ اس میں ''عبد'' کی اضافت غیر اللہ کی جانب کی گئی ہے جو صریح شرک ہے۔

مزید کہ مذکورہ آیت میں تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ لہٰذا اگر مذکورہ روایت کو اس کی تفسیر قرار دیا جائے تو یہ لازم آئے گا کہ نعوذ باللہ آدم و حواء دونوں نے شرک کا ارتکاب کیا!!

[1] الضعيفه: ص ٥١٦، ٥١٧، ج١، ح ٣٤٣

[2] تفسير ابن كثير ص ٧٤، ج٢، معمولی تصرف کے ساتھ

مذکورہ آیت مبارکہ اپنے سابق ولاحق آیتوں کے ساتھ قرآن حکیم میں یوں آئی ہے:

﴿ هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ○ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ ○ وَ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّ لَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ○ ﴾ [الاعراف:۱۸۹تا۱۹۲]

"وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک ہلکا سا حمل رہ گیا جسے لیے لیے وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ، اپنے رب سے دعا کی کہ اگر تو نے ہمیں اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزاروں میں سے ہوں گے۔ پس جب اللہ نے ان کو ایک صحیح وسالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی اس بخشش میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔ اللہ بلند و برتر ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ کیا یہ لوگ ان کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ وہ نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد پر قادر ہیں"

ان آیات مبارکہ کے آغاز میں نسل انسانی کے پہلے جوڑے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ یعنی حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو دوسرے لفظوں میں پہلے نوع انسانی کی پیدائش ایک جان سے ہونے کا ذکر کیا گیا ہے جس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ پھر اسی جان یا اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنانے کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ آدم علیہ السلام اس سے سکون اور اس کے پاس راحت محسوس کریں۔ اس طرح پہلا فقرہ...... لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا...... پر مکمل ہوگیا۔

اس کے بعد نوع انسانی کے عام مردوں اور عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ: توالد و تناسل کا سلسلہ مرد و عورت کے ملاپ سے چلتا ہے۔ اور جس طرح اللہ تعالیٰ نوع انسانی کے پہلے فرد کا خالق تھا اسی طرح مرد و عورت کے ملاپ سے پیدا ہونے والوں کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ جس کا اقرار ہر انسان کسی مشکل میں پڑنے پر یا کسی احتیاج کے وقت کرتا ہے۔ لیکن جونہی وہ اس مشکل سے نجات پا جاتا ہے یا جب اس کی احتیاج پوری ہو جاتی ہے تو وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانے لگتا ہے۔

ان آیات میں قرآن کے اولین مخاطب مشرکین مکہ پیش نظر ہیں جو اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا خالق و مالک

مانتے تھے اور آفات و مصائب میں گھر جانے کے وقت اسی کو پکارتے تھے۔ لیکن جب ان پر انعام واکرام کی بارش ہوتی اور وہ مال واولاد سے نوازے جاتے تو اللہ کے ساتھ ان کو شریک ٹھہرانے لگتے جن کا نہ خلق میں کوئی حصہ ہے اور نہ وہ دوسروں کی کوئی مدد ہی کر سکتے ہیں بلکہ وہ خود اپنی مدد کرنے سے بھی عاجز ہیں۔

اصل دین توحید ہے:

توحید دین فطرت ہے اور اسلام اسی دین فطرت کا نام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [الروم:۳۰]

”اے نبی! ہر طرف سے منہ موڑ کر اپنا رخ ”الدین“ کی طرف کرلو۔ اللہ کے اس دین فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو مت بدلو۔ یہی سیدھا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے“

اس آیت مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ آپ کے متبعین کو تمام ادیان سے منہ موڑ کر جس دین کی طرف رخ کرنے اور یکسو ہونے کا حکم دیا گیا ہے وہ دین فطرت یعنی دین توحید ہے۔ جس کا دوسرا نام ہے اسلام ہے:

﴿ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَھُمْ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴾ [آل عمران:۱۹]

”درحقیقت اللہ کے نزدیک مقبول دین صرف اسلام ہے۔ اور اہل کتاب نے تو اس میں علم حق آجانے کے بعد محض عناد اور سرکشی کی وجہ سے اختلاف کیا اور جو کوئی اللہ کی آیات کا انکار کرے گا تو اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو رسول بھی دنیا کے کسی گوشے اور کسی زمانے میں آیا ہے اس کا دین اسلام ہی تھا اور اس نے اپنی قوم کو اسی دین اسلام کی دعوت دی تھی۔ اس اصل دین کو مسخ کرکے اور اس میں کمی بیشی کرکے بہت سے ادیان اور مذاہب جو دنیا میں رائج کیے گئے تھے تو ان کے وجود کے اسباب سوائے راہ حق سے تجاوز اور انحراف کے کچھ نہ تھے۔

پھر اسی سورۂ آل عمران کی پچاسیویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے نہایت واشگاف الفاظ میں یہ اعلان

فرمادیا کہ اس کے ہاں اسلام کے سوا کوئی اور دین قابل قبول نہیں ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ ﴾

[آل عمران:۸۵]

''اور جو کوئی اسلام کے سوا علاوہ کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ آخرت میں وہ ناکام ونامرادوں میں سے ہوگا۔''

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تمام انبیاء کا دین اسلام تھا اور وہی اللہ کا پسندیدہ دین ہے۔ اس کے سوا کوئی دین قابل تسلیم اور قابل قبول نہیں۔

ہر بچہ دین اسلام پر پیدا ہوتا ہے:

قرآن میں اسلام کو دین فطرت کہا گیا ہے جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا۔ اور صحیح احادیث میں یہ صراحت ہے کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور فطرت سے مراد توحید ہے۔ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی، خالق اور رب نہیں ہے۔ چونکہ دین توحید صرف اسلام ہے اس لیے معلوم ہوا کہ ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ إِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ وَيُنَصِّرَانِهِ كَمَا تُنْتِجُوْنَ الْبَهِيْمَةَ، هَلْ تَجِدُوْنَ فِيْهَا مِنْ جَدْعَاءَ حَتَّى تَكُوْنُوْا أَنْتُمْ تَجْدَعُوْنَهَا))[1]

''ہر بچہ صرف فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ اس کے والدین اس کو یہودی اور نصرانی بنادیتے ہیں۔ جیسا کہ تم جانور کی تولید کا کام کرتے ہو۔ تو کیا تم ان میں کوئی کان کٹا یا ناک کٹا پاتے ہو؟ بلکہ تم اس کو ناک کٹا یا کن کٹا بنادیتے ہو''

اور سورۃ الروم کی تیسویں آیت کے فقرہ...... لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ...... کے تحت صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں جو حدیث آئی ہے، اس کے الفاظ ہیں:

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ إِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ وَيُنَصِّرَانِهِ، أَوْ يُمَجِّسَانِهِ، كَمَا تُنْتَجُ الْبَهِيْمَةُ بَهِيْمَةً جَمْعَاءَ، هَلْ تُحِسُّوْنَ فِيْهَا مِنْ جَدْعَاءَ، ثُمَّ يَقُوْلُ: فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ

[1] صحیح بخاری ح ۶۵۹۹، صحیح مسلم ح ۶۷۶۰ (۲۶۵۸)

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ﴾[1]

"ہر بچہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے۔ مگر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔ جس طرح جانور صحیح سالم جانور پیدا کیا جاتا ہے۔ کیا تم ان میں کوئی کان کٹا یا ناک کٹا محسوس کرتے ہو؟ پھر رسول اللہ ﷺ فرماتے: اتباع کرو اللہ کے اس دین فطرت کی جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی۔ یعنی اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو مت بدلو۔ یہی سیدھا دین ہے۔"

امام بخاری نے "لِخَلْقِ اللّٰهِ" کی تفسیر لِدِيْنِ اللّٰه اور الْفِطْرَةَ کی تفسیر الاسلام کی ہے اور یہی صحیح تفسیر ہے۔ اسی وجہ سے صحیح حدیث میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ "بچہ کے ماں باپ اس کو مسلمان بنا لیتے ہیں" اس لیے کہ اس کے فطرت پر پیدا ہونے کا مطلب اس کا مسلمان پیدا ہونا ہے۔ لہٰذا اس کو مسلمان بنانا تحصیل حاصل ہے۔

حدیث میں فطرت پر پیدا ہونے والے کو صحیح سالم اور بے عیب پیدا ہونے والے جانور سے تشبیہ دی گئی ہے اور خود ساختہ مذاہب کے پیروں کو عیب دار جانور سے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ توحید فکر و عقیدہ کی صحت سے عبارت ہے۔ جبکہ شرک ایک بیماری ہے جو فکر و عقیدہ کو لاحق ہوتی ہے اور جس طرح انسان کا جسم بیمار ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح انسان کا ذہن اور اس کی فکر بھی بیمار ہوتی ہے۔

قرآنی آیات اور احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ توحید انسان کے اندرون اور اس کے دل کی آواز ہے جس کو آفاق و انفس میں پھیلی ہوئی ان بے شمار نشانیوں سے تقویت حاصل ہوتی ہے جو ایک قادر مطلق کے وجود پر دلالت کرتی ہیں۔ جبکہ شرک خارجی شے ہے جو باہر سے اثر انداز ہوتی ہے اور اس کو پیدا کرنے میں خارجی عوامل، ماحول اور معاشرے کے توہمات اور باپ دادا کے غلط افکار و عقائد کارفرما ہوتے ہیں۔ توحید کا عقیدہ ایک نہایت مضبوط اور ٹھوس بنیاد پر قائم ہے جبکہ شرک بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ○ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ○ وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ﹰ اجْتُثَّتْ مِنْ

[1] صحيح بخاري: ح ٤٧٧٥- صحيح مسلم ٦٧٥٥ (٢٦٥٨)

فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍo ﴾ [ابراھیم:۲٤تا۲٦]

''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے کس طرح مثال بیان کی ہے کلمہ طیبہ کی کہ وہ ایک بہترین درخت کی مانند ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری جمی ہوئی ہیں اور اس کی شاخیں آسمان میں بلند ہیں۔ وہ ہر آن اپنے رب کے حکم سے اپنا پھل دے رہا ہے۔ اللہ یہ مثالیں لوگوں کے لیے اس لیے بیان کرتا ہے تاکہ لوگ یاددہانی حاصل کریں۔ اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بدذات درخت جیسی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے، اس کو کوئی استحکام حاصل نہیں ہے''

اسی وجہ سے جب انسان آفات و مصائب میں گھر جاتا ہے اور اس کو نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ اپنے تمام باطل معبودوں کو بھول جاتا ہے اور اللہ وحدہ لاشریک کی جانب دست دعا دراز کر دیتا ہے۔

﴿ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَo ﴾ [یونس:۲۲]

''وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور یکایک طوفانی ہوا کا جھونکا آتا ہے اور موجوں کے تھپیڑے لگنے لگتے ہیں۔ تو مسافر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ طوفان میں گھر گئے ہیں تو اس وقت وہ اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگنے لگتے ہیں کہ: (اے اللہ!) اگر تو نے ہمیں اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے''

مشرکین کے نابالغ بچوں کا انجام:

مشرکین کے وفات پا جانے والے نابالغ بچوں سے متعلق احادیث کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس مسئلے میں کوئی حتمی اور یقینی علم نہیں دیا تھا۔ اس لیے صحابہ کرام کے سوالوں کے جواب میں آپ اس کو اللہ تعالیٰ کے علم پر موقوف قرار دے دیتے تھے۔ پھر رسول اکرم ﷺ نے کچھ ایسے ارشادات فرمائے جن سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ مشرکین کے وفات پا جانے والے نابالغ بچے جنت میں جائیں گے۔ آخر میں نبی مکرم ﷺ نے ایسی تصریح فرما دی جس سے ان

کے جنت میں جانے کا پہلو راجح معلوم ہوتا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ صحیح بخاری میں اس سے متعلق حدیثیں اس ترتیب سے لائے ہیں کہ ان سے اس مسئلے میں توقف، پھر ان کے جنت میں جانے کا غالب گمان اور آخر میں کسی حد تک یقین حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ "باب ما قیل فی اولاد المشرکین" کے تحت حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی جو دو حدیثیں نقل کی ہیں ان کے الفاظ بالترتیب یہ ہیں:

((سُئِلَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ أَوْلَادِ الْمُشْرِكِينَ، فَقَالَ: اللّٰهُ إِذْ خَلَقَهُمْ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا عَامِلِينَ))[1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کے بچوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: اللہ نے جب ان کو پیدا کیا تو اس کو یہ علم تھا کہ وہ کونسا عمل کریں گے"

((سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذَرَارِيِّ الْمُشْرِكِينَ، فَقَالَ: اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا عَامِلِينَ))[2]

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کی ذریت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: اللہ کو ان کے اعمال کا علم ہے"

اس باب کے تحت تیسری حدیث وہی ہے جس میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے اور اس کے ماں باپ اس کو یہودی، یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں جس طرح جانور، جانور ہی پیدا ہوتا ہے، کیا تم ان میں کوئی بچہ ناک کٹا یا کان کٹا پاتے ہو؟[3]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد: ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جب ہر بچہ فطرت یعنی توحید پر پیدا ہوتا ہے تو بلوغت کی عمر کو پہنچنے سے قبل مر جانے کی صورت میں اس کو جنت میں جانا چاہیے۔

اور آخر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک طویل خواب میں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جنت میں ایسی حالت میں دیکھنے کا ذکر فرمایا ہے کہ ان کے گرد ایسے تمام بچے تھے جو فطرت کی حالت میں مرے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں "باب تعبير الرؤيا بعد صلاة الصبح" کے تحت جو طویل حدیث آئی ہے اس کے آخر میں ہے:

---

[1] صحیح بخاری: ح ۱۳۸۳۔ صحیح مسلم: ح ٦٧٦٦ (۲٦٦٠)
[2] صحیح بخاری: ح ۱۳۸٤۔ صحیح مسلم: ٦٧٦٢ (۲٦٥۹)
[3] صحیح بخاری: ح ۱۳۸٥۔ صحیح مسلم: ٦٧٥٥ (۲٦٥۸)

((وَأَمَّا الرَّجُلُ الطَّوِيلُ الَّذِي فِي الرَّوْضَةِ فَإِنَّهُ إِبْرَاهِيمُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَمَّا الْوِلْدَانُ الَّذِينَ حَوْلَهُ فَكُلُّ مَوْلُودٍ مَاتَ عَلَى الْفِطْرَةِ، قَالَ: فَقَالَ بَعْضُ الْمُسْلِمِينَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، وَأَوْلَادُ الْمُشْرِكِينَ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَأَوْلَادُ الْمُشْرِكِينَ))[1]

''رہے وہ طویل شخص جو باغ میں تھے تو وہ ابراہیم علیہ السلام تھے۔ اور ان کے گرد جو بچے تھے تو وہ سب نومولود تھے جن کی وفات فطرت پر ہوئی ہے۔ راوی حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: مسلمانوں میں سے ایک صاحب نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اور مشرکین کے بچے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مشرکین کے بچے بھی۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں ابوالانبیاء اور ابوالمسلمین حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جنت میں ایک درخت کے نیچے بے شمار نومولود بچوں کے ساتھ دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں حضرت جبریل و میکائیل علیہما السلام نے بتایا کہ ''یہ وہ بچے ہیں جو فطرت پر مرے ہیں'' یہاں ایک صحابی نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: کیا ان بچوں میں مشرکین کے بچے بھی تھے؟ آپ نے فرمایا: اور مشرکین کے بچے۔ یعنی ان میں مشرکین کے بچے بھی تھے۔

امام نووی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

مشرکین کے نابالغ بچوں کے انجام کے مسئلے میں تین فریق ہیں:

اکثریت کی رائے ہے کہ وہ اپنے باپوں کے ساتھ جہنم میں جائیں گے۔ دوسرے فریق نے اس مسئلے میں توقف کا مسلک اختیار کیا ہے اور تیسرا مسلک جس کو اہل تحقیق نے اختیار کیا ہے اور وہی صحیح ہے کہ مشرکین کے بچے جنت میں جائیں گے۔ جس کی دلیلوں میں سے ایک دلیل وہ حدیث ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جنت میں ابراہیم خلیل صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کا ذکر ہے جن کے گرد لوگوں کے نابالغ بچے تھے۔ اور دوسری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا ﴾ [الاسراء:۱۵]

[1] صحیح بخاری: ح ۷۰۴۷

"اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں تا آنکہ ایک رسول نہ بھیج دیں"

اور نومولود پر عمل کی پابندی نہیں ہے بلکہ اس پر رسول اللہ ﷺ کا یہ قول منطبق ہے: بچہ غیر مکلف ہے یہاں تک کہ بالغ ہوجائے۔[1]

(۲۱۵)......أَوْحَى اللّٰهُ تَعَالَى إِلَى آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: أَنْ يَا آدَمُ! حُجَّ هٰذَا الْبَيْتَ قَبْلَ أَنْ يَحْدُثَ بِكَ حَدَثُ الْمَوْتِ۔ قَالَ: وَمَا يُحْدِثُ عَلَيَّ يَا رَبِّيْ؟ قَالَ: مَا لَا تَدْرِيْ، وَهُوَ الْمَوْتُ، قَالَ: وَمَا الْمَوْتُ؟ قَالَ: سَوْفَ تَذُوْقُهُ۔ قَالَ: مَنْ أَسْتَخْلِفُ فِيْ أَهْلِيْ؟ قَالَ: أَعْرِضْ ذٰلِكَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ، فَعَرَضَ عَلَى السَّمٰوَاتِ فَأَبَتْ، وَعَرَضَ عَلَى الْأَرْضِ فَأَبَتْ وَعَرَضَ عَلَى الْجِبَالِ فَأَبَتْ، وَقَبِلَهُ ابْنُهُ قَاتِلُ اَخِيْهِ، فَخَرَجَ آدَمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ أَرْضِ الْهِنْدِ حَاجًّا، فَمَا نَزَلَ مَنْزِلًا أَكَلَ فِيْهِ وَشَرِبَ إِلَّا صَارَ عُمْرَانًا بَعْدَهُ وَقُرًى، حَتّٰى قَدِمَ مَكَّةَ، فَاسْتَقْبَلَتْهُ الْمَلَائِكَةُ بِالْبَطْحَاءِ، فَقَالُوْا: السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا آدَمُ! بُرَّ حَجُّكَ، أَمَا إِنَّا قَدْ حَجَجْنَا هٰذَا الْبَيْتَ قَبْلَكَ بِأَلْفَيْ عَامٍ۔

قَالَ أَنَسٌ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَالْبَيْتُ يَوْمَئِذٍ يَاقُوْتَةٌ حَمْرَاءُ جَوْفَاءُ، لَهَا بَابَانِ، مَنْ يَطُوْفُ يَرَى مَنْ فِيْ جَوْفِ الْبَيْتِ وَمَنْ فِيْ جَوْفِ الْبَيْتِ يَرَى مَنْ يَطُوْفُ، فَقَضَى آدَمُ نُسُكَهُ، فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلَيْهِ: يَا آدَمُ! قَضَيْتَ نُسُكَكَ؟ قَالَ: نَعَمْ يَارَبِّ، قَالَ: فَسَلْ حَاجَتَكَ تُعْطَ۔ قَالَ: حَاجَتِيْ أَنْ تَغْفِرَلِيْ ذَنْبِيْ وَذَنْبَ وَلَدِيْ۔ قَالَ: أَمَّا ذَنْبُكَ يَا آدَمُ! فَقَدْ غَفَرْنَاهُ حِيْنَ وَقَعْتَ بِذَنْبِكَ، وَأَمَّا ذَنْبُ وَلَدِكَ، فَمَنْ عَرَفَنِيْ، وَآمَنَ بِيْ، وَصَدَّقَ رُسُلِيْ وَكِتَابِيْ، غَفَرْنَا لَهُ ذَنْبَهُ۔

"اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو وحی فرمائی: اے آدم! تم اس گھر کا حج کرو قبل اس کے کہ تمہارے ساتھ موت کا واقعہ پیش آئے۔ انہوں نے عرض کیا: اے میرے رب! میرے ساتھ

[1] المنہاج: ص ۱۵۷۴

کیا واقعہ پیش آئے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جسے تم نہیں جانتے ہو، وہ موت ہے۔ آدم نے عرض کیا موت کیا ہے؟ فرمایا: عنقریب تم اس کا مزہ چکھو گے۔ عرض کیا: میں اپنے اہل میں کس کو اپنا خلیفہ بناؤں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کرو۔ تو انہوں نے آسمانوں پر خلافت کا مسئلہ پیش کیا۔ انہوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے زمین پر پیش کیا۔ اس نے بھی انکار کر دیا اور انہوں نے پہاڑوں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ انہوں نے بھی یہ ذمہ داری قبول نہیں کی اور ان کے بیٹے، اپنے بھائی کے قاتل نے خلافت کا منصب قبول کر لیا۔ اس کے بعد آدم علیہ السلام حج کے ارادے سے، ہندوستان کی سرزمین سے نکلے، وہ جہاں بھی قیام کرتے اور وہاں کھاتے پیتے وہاں ان کے بعد آبادی اور گاؤں بن جاتا۔ یہاں تک کہ وہ مکہ پہنچے اور فرشتوں سے بطحاء میں ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان سے کہا: اے آدم آپ پر سلامتی نازل ہو اور آپ کا حج قبول ہو۔ ہم نے آپ سے دو ہزار سال پہلے اس گھر کا حج کیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس وقت بیت اللہ سرخ کھوکھلے یاقوت سے بنا ہوا تھا۔ اس کے دو دروازے تھے۔ جو طواف کرتا وہ بیت اللہ کے اندر کے لوگوں کو دیکھتا اور جو اس کے اندر ہوتا وہ طواف کرنے والے کو دیکھتا۔ جب آدم نے حج کے اعمال پورے کر لیے تو اللہ نے ان کو وحی فرمائی: اے آدم! کیا تم نے اپنے مناسک ادا کر لیے؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں اے میرے رب! اللہ نے فرمایا: اپنی حاجت مانگو وہ تمہیں عطا کی جائے گی۔ آدم نے عرض کیا: میری حاجت یہ ہے کہ آپ میرے گناہوں اور میری اولاد کے گناہوں کو بخش دیں۔ اللہ نے فرمایا: تمہارے گناہ تو ہم اسی وقت معاف کر چکے ہیں جب وہ تم سے سرزد ہوا تھا۔ رہے تمہاری اولاد کے گناہ، تو جو مجھے پہچانے گا، میرے اوپر ایمان لائے گا اور میرے رسولوں اور میری کتابوں کی تصدیق کرے گا ہم اس کے گناہوں کو بخش دیں گے۔"

یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج اصبہانی نے ترغیب و ترہیب[1] میں عمران بن عبدالرحیم کے طریق سے کی ہے:

[1] ترغیب و ترہیب: ص ٤٣٤-٤٣٥، ج ١

ہم کو عبدالسلام بن مطہر نے خبر دی، کہا: ہم کو ابو ہرمز نے انس بن مالک سے روایت کرتے ہوئے خبر دی۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ابو ہرمز جس کا نام نافع ہے اس کو امام یحییٰ بن معین نے کذاب اور حافظ ہیثمی نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔ امام نسائی کا قول ہے کہ وہ ثقہ نہیں تھا۔ اور امام ابن حبان الضعفاء والمتروکین [1] میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

وہ حضرت انس سے ایسی حدیثیں روایت کیا کرتا تھا جو ان کی نہیں بلکہ کسی دوسرے انس کی ہیں۔

اسی طرح عمران بن عبدالرحیم کی ثقاہت بھی محل نظر ہے جس نے امام مالک سے امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کی حدیث وضع کی ہے۔ [2]

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے شہر مکہ نہیں تھا:

اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پہلوٹے بیٹے حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو جب بیت اللہ کے پاس لا کر چھوڑا تھا اس وقت وہاں نہ تو کوئی آبادی تھی اور نہ پانی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو وہاں چھوڑ کر واپس پلٹے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی:

﴿ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا آمِنًا ﴾ [البقرۃ:۱۲۶] ”اے میرے رب تو اس جگہ کو ایک پر امن شہر بنا دے“

یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دو چیزوں کی درخواست کی۔ ایک تو یہ کہ اس بے آب و گیاہ وادی کو شہر بنا دے دوم یہ کہ وہ پر امن ہو۔

اور جب وہ وادی غیر ذی زرع ایک چھوٹی سی بستی میں تبدیل ہوگئی تو حضرت ابراہیم نے دوبارہ یہی دعا کی۔ مگر ”بلدًا“ کے بجائے ”البلد“ کہا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا ﴾ [ابراهيم:۳۵]

”اے میرے رب تو اس شہر کو پر امن شہر بنا دے“

---

[1] الضعيفہ: ص ۵۸، ج ۲ [2] الضعيفہ: ص ۶۲۸۔۶۳۹، ج ۱، ص ۲۶۹، ۲۷۰، ج ۱۱

ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس اعلیٰ اور پاکیزہ مقصد کے لیے اپنی بیوی اور بچے کو اللہ تعالیٰ کے محترم گھر کے پاس لاکر آباد کیا تھا اس کا تقاضا تھا کہ وہ وہاں برابر آتے رہیں اور ان کی خبر گیری کرتے رہیں۔ اس طرح یہ دوسری دعا انہوں نے اس وقت مانگی جب وہاں زمزم کا چشمہ پھوٹ پڑا اور قبیلہ جرہم کے لوگ وہاں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ساتھ آباد ہو گئے تھے اور وہ سنسان وادی ایک بستی بن چکی تھی۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جو طویل حدیث مروی ہے، اس میں بھی یہ صراحت ہے کہ اس وقت وہاں مکہ میں نہ کوئی فرد بشر تھا اور نہ پانی۔ اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی اور بچے کو وہاں چھوڑ کر واپس ہوئے تو حضرت ہاجرہ ان کے پیچھے چلیں اور کہا:

((يَا إِبْرَاهِيمُ! أَيْنَ تَذْهَبُ وَتَتْرُكُنَا بِهٰذَا الْوَادِي الَّذِي لَيْسَ فِيهِ إِنْسٌ وَلَا شَيْءٌ، فَقَالَتْ لَهُ ذٰلِكَ مِرَارًا وَجَعَلَ لَا يَلْتَفِتُ إِلَيْهَا، فَقَالَتْ لَهُ: آللّٰهُ الَّذِي أَمَرَكَ بِهٰذَا؟ قَالَ: نَعَمْ۔ قَالَتْ إِذَنْ لَا يُضَيِّعُنَا، ثُمَّ رَجَعَتْ))[1]

"ابراہیم! ہمیں اس وادی میں چھوڑ کر جہاں نہ کوئی انسان ہے اور نہ کوئی اور ہی چیز، کہاں جارہے ہیں۔ انہوں نے ان سے یہ بات کئی بار کہی اور وہ ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ پھر حضرت ہاجرہ نے ان سے کہا: کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: ہاں۔ اس پر وہ بولیں: تب تو وہ ہمیں ضائع نہ فرمائے گا اور واپس چلی گئیں۔"

ابوالولید ازرقی نے تاریخ مکہ میں جو یہ لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مکہ میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کو آباد کرنے سے پہلے وہاں عمالقہ آباد تھے تو وہ اپنی سند اور متن دونوں اعتبار سے غلط ہونے کے ساتھ قرآنی آیات اور صحیح احادیث کے خلاف ہے۔[2]

اور جس صحیح حدیث[3] میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہر مکہ کو اسی دن حرام قرار دے دیا تھا جس دن اس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی تھی تو اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت زمین بنائی تھی اس وقت حدود حرم کا تعین بھی فرما دیا تھا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے اسی فیصلے کا اعلان فرمایا تھا نہ یہ کہ اس وقت مکہ آباد بھی تھا۔

---

[1] صحیح بخاری: ٣٣٦٤ [2] دیکھیے: تاریخ مکہ: ص ٥١٣، ج ٢

[3] صحیح بخاری: ح ١٨٣٢، ٤٢٩٥۔ صحیح مسلم ٣٣٠٢، ١٣٥٣

بیت اللہ کے بانی اول حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں:

بیت اللہ کی سب سے پہلی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اگرچہ اس کی جگہ اور اس کے حدود اربعہ کی تعیین اللہ تعالیٰ نے اسی دن فرما دی تھی جس دن آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی تھی اور ساتھ ہی شہر مکہ کو حرام بھی قرار دے دیا تھا۔ البتہ مکہ کو مادی وجود اس وقت ملا جب حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو وہاں بسایا گیا، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْقَآئِمِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۝ ﴾ [الحج:۲۶]

''اے نبی یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے ابراہیم کے لیے ''البیت'' کی جگہ کی رہنمائی کی تھی۔ اس حکم کے ساتھ کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام، رکوع اور سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھنا۔''

اور اللہ تعالیٰ کے اس گھر کی تعمیر ٹھیک اسی جگہ کی جس جگہ کا تعین اللہ تعالیٰ نے فرما دیا تھا۔

قرآن پاک میں یہ صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے جس گھر کو سب سے پہلے تعمیر کیا گیا وہ یہی بیت اللہ ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ۝ ﴾ [آل عمران:۹۶]

''درحقیقت وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بغرض عبادت تعمیر کیا گیا وہ ہے جو مکہ[1] میں ہے یہ گھر مبارک ہے اور لوگوں کے لیے مرکز ہدایت ہے''

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی بہترین تفسیر رسول اکرم ﷺ کا وہ ارشاد مبارک ہے جو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَيُّ مَسْجِدٍ وُضِعَ فِي الْاَرْضِ اَوَّلَ؟ قَالَ: الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ، قَالَ: قُلْتُ: ثُمَّ اَيٌّ؟ قَالَ: الْمَسْجِدُ الْاَقْصٰى قُلْتُ: كَمْ كَانَ بَيْنَهُمَا؟ قَالَ: اَرْبَعُوْنَ سَنَةً))

---

[1] مکہ وہ خاص جگہ ہے جس میں بیت اللہ واقع ہے۔ یہ لفظ بَكَّ يَبُكُّ سے بنا ہے۔ جس کے معنی گردن توڑ دینے کے ہیں۔ یعنی جو شخص اس گھر کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا اس کی گردن توڑ دی جائے گی۔

''میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! زمین میں پہلی کون سی مسجد تعمیر کی گئی تھی؟ فرمایا: مسجد حرام۔ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: پھر کون سی؟ فرمایا: مسجد اقصیٰ۔ میں نے دریافت کیا: ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ فرمایا: چالیس سال''[1]

قرآنی آیات کی روشنی میں یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ ''بیت اللہ'' کے بانی اول حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ لہٰذا صحیحین کی اس حدیث میں زمین میں جس پہلی مسجد کی تعمیر کا ذکر آیا ہے وہ یہی بیت اللہ ہے۔ چونکہ بیت اللہ کی سب سے پہلی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی تو حدیث پاک میں مذکور پہلی مسجد کے بانی بھی وہی ہوئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے سلسلہ کلام کی روشنی میں یہ بات بھی متعین ہو جاتی ہے کہ مسجد اقصیٰ کی تعمیر بھی انہوں نے ہی فرمائی۔

رہی حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر کی۔ تو ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں یہ صراحت نہیں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کے بانی اول ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

((أَنَّ سُلَيْمَانَ بْنَ دَاوُدَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، لَمَّا بَنَى بَيْتَ الْمَقْدِسِ سَأَلَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ خِلَالًا ثَلَاثَةً......))[2]

''سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے جب بیت المقدس کی تعمیر کی تو اللہ عزوجل سے تین چیزوں کی درخواست کی''

تو اس حدیث سے صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کے وقت اللہ تعالیٰ سے کچھ چیزوں کی درخواست کی تھی۔ مگر اس کے انداز بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ سب سے پہلے مسجد اقصیٰ کی تعمیر انہی کے ہاتھوں سے ہوئی تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیت اللہ کے بانی اول ہونے کی ایک اور دلیل فریضہ حج ہے جو بیت اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ حج کی منادی اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ کے بعد ہی کی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جب ابراہیم علیہ السلام کو اپنے گھر کی جگہ رہنمائی فرمائی اور ان کو یہ حکم دیا کہ وہ اس کی تعمیر کے بعد اس کو طواف کرنے والوں، قیام، رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے شرک کی ہر آلائش

---

[1] صحیح بخاري: ٣٣٦٦۔ صحیح مسلم: ١٦١١۔ ٥٢٠۔ نسائی ٦٨٩۔ ابن ماجہ: ٧٥٣

[2] سنن نسائي: ٦٩٢۔ ابن ماجہ: ١٤٠٨

اور گندگی سے پاک رکھیں تو اس کے معا بعد ان کو یہ حکم بھی دیا تھا:

﴿ وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ﴾ [الحج:۲۷]

''اور لوگوں میں حج کا اعلان عام کردو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور دبلی پتلی اونٹنیوں پر سوار ہو کر آئیں''

اور قربانی جو حج کا ایک اہم رکن ہے اس ''ذبح عظیم'' کی یادگار ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے پہلوٹے اور بردبار بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کے لیے دیا تھا۔

مزید یہ کہ کوئی بھی صحیح مرفوع حدیث ایسی نہیں ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کسی اور نبی کے ہاتھوں بیت اللہ کی تعمیر کا ذکر آیا ہو حافظ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں:

معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی کسی صحیح حدیث میں یہ نہیں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے بیت اللہ تعمیر شدہ تھا اور جس نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''مَكَانَ الْبَیْتِ'' سے استدلال کیا ہے تو یہ استدلال نہ صحیح ہے اور نہ اس سے یہ مفہوم ظاہر ہی ہوتا ہے۔ بلکہ اللہ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس کی جگہ اللہ کے علم میں مقدر ہے۔ نہ یہ کہ بیت اللہ تعمیر شدہ تھا اور اس کے گھر کی جگہ آدم علیہ السلام سے لے کر ابراہیم علیہ السلام کے زمانے تک قابل تعظیم رہی ہے۔ ہم نے اس کتاب میں یہ ذکر کیا ہے کہ آدم نے بیت اللہ پر قبہ نصب کیا اور فرشتوں نے ان سے کہا کہ ہم تم سے پہلے اس گھر کا طواف کر چکے ہیں اور سفینۂ نوح نے چالیس دن یا اس سے لگ بھگ اس کا طواف کیا۔ لیکن یہ تمام خبریں بنو اسرائیل سے منقول ہیں۔ ہمارا اصول یہ رہا ہے کہ ان اسرائیلی خبروں کی نہ تصدیق کی جائے نہ تکذیب۔ لہٰذا یہ قابل استدلال نہیں ہیں۔ بلکہ خود قرآنی صراحت کی روشنی میں مردود ہیں۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴾ [آل عمران:۹۶]

''یعنی درحقیقت جو پہلا گھر تمام لوگوں کے لیے برکت اور ہدایت کی غرض سے تعمیر کیا گیا وہی گھر ہے جو بکہ میں ہے۔ یہ گھر مبارک ہے اور لوگوں کے لیے مرکز ہدایت ہے''

اور ایک قول یہ ہے کہ کعبہ کی جگہ مکہ ہے۔ جس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کعبہ خلیل اللہ، اپنے بعد آنے والے نبیوں کے باپ، اپنی اولاد میں ''دین حنیف'' پر چلنے والوں، اپنی اقتدا کرنے

والوں اور اپنے طریقے پر چلنے والوں کے امام کا تعمیر کردہ ہے۔[1]

حجر اسود:

حجر اسود کو بوسہ دینا یا ہاتھ سے اس کو چھونا یا چھڑی سے اس کو چھو کر چھڑی کو چومنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ لیکن یہ عمل صرف طواف کے موقع پر ''مشروع'' ہے۔ حج یا عمرے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ طواف کرنے والے کے لیے یہ عمل صرف اس صورت میں ''سنت'' ہے جبکہ وہ حجر اسود تک پہنچنے کے لیے کسی کو اذیت نہ دے، کسی کو دھکا نہ دے اور کسی سے مزاحم نہ ہو۔ ورنہ یہ عمل سنت کی بجائے معصیت بن جائے گا۔ کیونکہ اسلام میں کسی کو اذیت دینا حرام ہے۔

ذیل میں پہلے ایسی چند صحیح احادیث نقل کی جارہی ہیں جن سے بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے حجر اسود کو بوسہ دینے کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس کے فضائل کے بارے میں چند صحیح احادیث نقل کروں گا۔

حجر اسود کو بوسہ دینا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((أَنَّهُ جَاءَ إِلَى الْحَجَرِ الْأَسْوَدِ، فَقَبَّلَهُ، فَقَالَ: إِنِّيْ أَعْلَمُ أَنَّكَ حَجَرٌ، لَا تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ، وَلَوْلَا أَنِّيْ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَبِّلُكَ مَا قَبَّلْتُكَ))[2]

''وہ حجر اسود کے پاس آئے اور اس کو بوسہ دیا۔ پھر فرمایا: مجھے معلوم ہے کہ تم ایک پتھر ہو۔ نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہو اور نہ فائدہ۔ اگر میں نے نبی ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو تجھے بوسہ نہ دیتا''

اس حدیث سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ حجر اسود کو بوسہ دینا سنت ہے وہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس سے نفع و نقصان کا عقیدہ رکھنا صحیح نہیں ہے۔

حضرت ابو طفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

---

[1] البدایہ والنہایہ: ص ۱۸۹۔۱۹۰، ج ۱

[2] صحیح بخاری: ح ۱۵۹۷۔ صحیح مسلم: ج ۱۲۷۰

((رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَطُوفُ بِالْبَيْتِ وَيَسْتَلِمُ الرُّكْنَ بِمِحْجَنٍ مَعَهُ، وَيُقَبِّلُ الْمِحْجَنَ))[1]

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں اور اپنی چھڑی سے رکن حجر اسود کو چھوتے ہیں اور چھڑی کو چومتے ہیں''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((نَزَلَ الْحَجَرُ الْاَسْوَدُ مِنَ الْجَنَّةِ، وَهُوَ اَشَدُّ بَيَاضًا مِنَ اللَّبَنِ، فَسَوَّدَتْهُ خَطَايَا بَنِيْ آدَمَ))[2]

''حجر اسود اس حال میں جنت سے نازل ہوا تھا کہ وہ دودھ سے زیادہ سفید تھا، مگر بنی آدم کے گناہوں نے اس کو سیاہ بنا دیا''

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((اِنَّ الرُّكْنَ وَالْمَقَامَ يَاقُوْتَتَانِ مِنْ يَاقُوْتِ الْجَنَّةِ، طَمَسَ اللّٰهُ نُوْرَهُمَا، وَلَوْلَمْ يَطْمِسْ نُوْرَهُمَا، لَأَضَاءَ تَا مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ))[3]

''رکن اور مقام...... حجر اسود اور مقام ابراہیم...... جنت کے موتیوں میں سے دو موتی ہیں جن کی روشنی اللہ نے زائل کر دی ہے۔ اگر اس نے ان کی روشنی زائل نہ کی ہوتی تو وہ مشرق و مغرب کے درمیان روشنی پھیلا دیتے''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ نے حجر اسود کے بارے میں فرمایا ہے:

((وَاللّٰهِ لَيَبْعَثَنَّهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، لَهُ عَيْنَانِ يُبْصِرُ بِهِمَا وَلِسَانٌ يَنْطِقُ بِهٖ يَشْهَدُ عَلَى مَنِ اسْتَلَمَهُ بِحَقٍّ))[4]

''اللہ کی قسم، قیامت کے دن اللہ اس کو اس حال میں ضرور اٹھائے گا کہ اس کی دو آنکھیں ہوں

[1] صحیح مسلم: ح ۱۲۷۵
[2] جامع ترمذی: ح ۸۷۷
[3] جامع ترمذی: ح ۸۷۸
[4] جامع ترمذی: ح ۹۶۱۔ صحیح ابن خزیمہ: ح ۲۷۳۵

سے کی ہے:

مجھ سے مہدی بن ابی مہدی، محمد بن ابی معدی نے بیان کیا، کہا: مجھ سے حکم بن ابان نے بیان کیا، کہا: مجھ سے میرے والد نے عکرمہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔

اس سند کا راوی حکم بن ابان حافظہ کے اعتبار سے ضعیف اور وہم کا بھی شکار تھا[1]۔ اس طرح سند کے اعتبار سے تو یہ روایت صرف ضعیف ہے، لیکن اپنے متن کے اعتبار سے باطل ہے، کیونکہ اس میں حجر اسود کو چھونے اور اس پر ہاتھ پھیرنے والے کو رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کرنے والے کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ یہ بات معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کرنے والے کو شرف صحابیت حاصل ہوتا تھا۔

اوپر جو موضوع اور منکر روایات نقل کی گئی ہیں اس طرح کی نہ جانے کتنی روایات تاریخ اور فضائل کی کتابوں میں منقول ہوئی ہیں جن کی صحت و سقم پر کوئی حکم نہیں لگایا گیا۔ اس کی وجہ سے عام قاری ان کو صحیح احادیث سمجھ کر حجر اسود کے بارے میں وہی عقائد رکھتے ہیں جو ان میں بیان ہوئے ہیں۔

(۲۲۱)......لَقَدْ مَرَّ بِهٰذَا نُوْحٌ وَّهُوْدٌ وَّاِبْرَاهِيْمُ عَلٰى بَكَرَاتٍ لَهُمْ حُمْرٍ خُطُمُهُمُ اللِّيْفُ أُزُرُهُمُ الْعَبَاءُ وَاَرْدِيَتُهُمُ النِّمَارُ، يَحُجُّوْنَ الْبَيْتَ الْعَتِيْقَ۔

"اس جگہ سے نوح، ہود اور ابراہیم علیہم السلام اپنے جوان سرخ اونٹوں پر گزرے تھے جن کی لگامیں کھجور کے درختوں کی چھالوں کی تھیں۔ ان کا لباس چوغہ اور ان کی چادریں سیاہ و سفید دھاریوں والی تھیں۔ اور وہ بیت عتیق کا حج کر رہے تھے"

حافظ ابن کثیر نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: فِيْهِ غَرَابَةٌ...... اس میں غرابت ہے۔[2] یعنی اس میں ضعف ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حج کیا اور جب وادی عسفان میں پہنچے تو فرمایا: ابوبکر! یہ کون سی وادی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: یہ عسفان کی وادی ہے۔ اس پر آپ

---

[1] تقریب التہذیب: ص ۱۱۳، ترجمہ: ۱۴۳۸

[2] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۸، ج۱...... غریب اس حدیث کو کہتے ہیں جو صرف کسی ایک فرد سے مروی ہو۔ چاہے سند کے تمام طبقوں میں اس کا راوی ایک رہا ہو۔ یا کسی ایک طبقے میں۔ اگر اس کا اس کا راوی ضعیف ہو تو یہ روایت مردود ہوتی ہے۔

نے فرمایا:

اس روایت کی تخریج امام احمد نے اپنی مسند میں کی ہے اور اس میں نوح اور ابراہیم کے بجائے ہود اور صالح ہے۔[1] اسی طرح حافظ ھیثمی نے اس کو المجمع[2] میں نقل کیا ہے اور لکھا ہے: اس کی روایت امام احمد نے کی ہے اور اس کی سند میں زمعہ بن صالح شامل ہے جس کی ثقاہت کے بارے میں کلام ہے۔

شیخ احمد شاکر نے مسند کی تحقیق میں اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں زمعہ بن صالح کو ضعیف لکھا ہے۔[3]

محدث محمد ناصر الدین البانی نے متعدد ائمہ حدیث کے اقوال کے حوالہ سے زمعہ کو ضعیف قرار دیا ہے۔[4]

البیت المعمور:

جس طرح اس زمین پر بیت اللہ یا کعبہ ہے ٹھیک اسی طرح ساتویں آسمان پر بھی ایک گھر ہے جس میں فرشتے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ اس گھر کا نام "البیت المعمور" ہے۔ المعمور، عَمَرَ یَعْمُرُ سے اسم مفعول ہے۔ جس کے معنی ہیں "آباد" یعنی ایسا گھر جس کو اللہ کی عبادت کرنے والے ہمیشہ آباد رکھتے ہوں۔

حدیث معراج میں "البیت المعمور" کا ذکر آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((فَأَتَيْنَا السَّمَاءَ السَّابِعَةَ، قِيلَ: مَنْ هٰذَا؟ قِيلَ: جِبْرِيلُ۔ قِيلَ: مَنْ مَعَكَ؟ قِيلَ: مُحَمَّدٌ۔ قِيلَ: وَقَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ، مَرْحَبًا بِهِ وَلَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ، فَأَتَيْتُ عَلَى إِبْرَاهِيمَ، فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ۔ فَقَالَ: مَرْحَبًا بِكَ مِنِ ابْنٍ وَنَبِيٍّ، فَرُفِعَ لِيَ الْبَيْتُ الْمَعْمُورُ۔ فَسَأَلْتُ جِبْرِيلَ، فَقَالَ: هٰذَا الْبَيْتُ الْمَعْمُورُ، يُصَلِّي فِيهِ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعُونَ أَلْفَ مَلَكٍ إِذَا خَرَجُوا لَمْ يَعُودُوا إِلَيْهِ آخِرَ مَا عَلَيْهِمْ))[5]

"ہم...... میں اور جبریل...... ساتویں آسمان پر آئے۔ دریافت کیا گیا: یہ کون ہے؟ جواب دیا گیا: جبریل۔ پوچھا گیا: آپ کے ساتھ کون ہے؟ بتایا گیا: محمد ﷺ۔ سوال کیا گیا: کیا

---

[1] مسند الإمام أحمد: ح ۲۰۶۷ [2] المجمع: ص ۲۲۰، ج ۳

[3] تقریب التهذیب: ص ۱۵۷، ترجمه ۲۰۳۵ [4] معجم اسامی الرواة: ص ٥٤-٥٥، ج ۲

[5] صحیح بخاری: ح ۳۲۰۷۔ صحیح مسلم: ح ٤١٦-١٦٤

ان کو بلایا گیا ہے؟ ان کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ کیا خوب ہے آنے والے کا آنا۔ میں ابراہیم ﷺ کے پاس آیا اور ان کو سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا: بیٹے اور نبی کے لیے خوش آمدید۔ پھر البیت المعمور کو میرے سامنے کر دیا گیا تو میں نے جبریل سے پوچھا: انہوں نے کہا: یہ آباد گھر ہے جس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے نماز ادا کرتے ہیں۔ جب اس سے نکلتے ہیں تو پھر اپنے آخری عہد تک اس میں دوبارہ داخل نہیں ہوتے"

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جب میں ساتویں آسمان پر پہنچا اور دروازہ کھولا گیا تو میں ابراہیم ﷺ کے پاس تھا۔ جبریل علیہ السلام نے کہا:

((هٰذَا أَبُوْكَ، فَسَلِّمْ عَلَيْهِ، قَالَ: فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ، فَرَدَّ السَّلَامَ، قَالَ: مَرْحَبًا بِالْاِبْنِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ))[1]

"یہ آپ کے جد امجد ہیں ان کو سلام کیجیے۔ آپ فرماتے ہیں: میں نے ان کو سلام کیا تو انہوں نے جواب دیا: خوش آمدید صالح بیٹے اور صالح نبی۔"

صحیح مسلم میں ہے:

((فَإِذَا أَنَا بِإِبْرَاهِيْمَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسْنِدًا ظَهْرَهُ إِلَى الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ))[2]

"میں نے اپنے آپ کو ابراہیم ﷺ کے پاس پایا جو البیت المعمور سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے"

ان احادیث میں جس "آباد گھر" کا ذکر آیا ہے وہ وہی البیت المعمور ہے جس کی سورۃ الطور کی چوتھی آیت میں قسم کھائی گئی ہے۔ بعض علماء نے قرآنی البیت المعمور سے کعبہ مشرف کو مراد لیا ہے۔ ان کی یہ تفسیر تکلف سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بات اگرچہ صحیح ہے کہ خانہ کعبہ یا بیت اللہ حج وعمرہ اور طواف و زیارت کرنے والوں سے ہمیشہ آباد رہتا ہے جو درحقیقت اس کی صفت ہے مگر سورۃ الطور اور احادیث میں جس گھر کا ذکر آیا ہے اس کا نام البیت المعمور آباد گھر ہے۔ اور احادیث میں یہ صراحت ہے کہ وہ ساتویں آسمان پر ہے زمین پر نہیں۔

صحیح احادیث میں ساتویں آسمان پر البیت المعمور کے ذکر کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر سے اس امر کی جانب واضح اشارہ ملتا ہے کہ زمین کے کعبہ کے بانی وہی ہیں اور خانہ کعبہ کی جگہ اگرچہ

---

[1] صحیح بخاری: ح ۳۸۸۷ [2] صحیح مسلم: ح ۴۱۱، ۱۶۲

آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے وقت متعین کر دی گئی تھی لیکن بیت اللہ کی عمارت کے معمار اول حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ میں اس کی حکمت کو سورۃ الاسراء میں ارشاد الٰہی: فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا" کی تفسیر اور "بخت نصر کے افسانہ" کے ذکر کے موقع پر بیان کروں گا۔

کہا جاتا ہے کہ "البیت المعمور" بیت اللہ کے اوپر بالکل سیدھ میں اور بالمقابل ساتویں آسمان پر ہے، حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے: قتادہ اور سدی کا قول ہے کہ ہم سے ذکر کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن اپنے صحابہ سے فرمایا:

کیا تمہیں معلوم ہے کہ البیت المعمور کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا: وہ آسمان میں کعبہ کے بالمقابل ایک مسجد ہے جو اگر گرے تو کعبہ پر گرے گی، اس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں وہ جب اس سے نکلتے ہیں تو اپنے اس داخلے کے بعد پھر اس میں کبھی داخل نہیں ہوتے۔[1]

حافظ ابن کثیر نے اس روایت پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے۔

اور یہی روایت حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں طبری کے حوالہ سے، سعید بن ابی عروبہ عن قتادہ کی سند سے نقل کی ہے اور اس کی صحت وسقم کا کوئی حکم نہیں لگایا ہے۔

لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ اسحاق نے اپنی مسند میں اور طبری نے اپنی تفسیر میں نیز دوسروں نے خالد بن عرعر عن علی کی سند سے روایت کی ہے کہ: علی رضی اللہ عنہ سے "السقف المرفوع" کے بارے میں پوچھا گیا تو: آسمان اور "البیت المعمور" کے بارے میں کہا: آسمان میں ایک گھر ہے جو بیت اللہ کے بالمقابل ہے اور وہ آسمان میں اسی طرح محترم ہے جس طرح یہ زمین میں۔ اس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں جو دوبارہ اس میں داخل نہیں ہوتے۔" اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اس طرح مروی ہے البتہ اس میں اتنا اضافہ ہے کہ "وہ البیت الحرام کی مانند ہے اگر گرے تو اسی پر گرے گا۔" اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی عمدہ سند کے ساتھ اس طرح مروی ہے۔[2]

نہر حیوان:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ص ۳۸۹، ج ۳ [2] فتح الباری: ص ۱۵۱۲، ج ۲

ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے:

(۲۲۲)......فِي السَّمَاءِ نَهْرٌ يُقَالُ لَهُ نَهْرُ الْحَيَوَانِ يَدْخُلُهُ جِبْرِيْلُ كُلَّ يَوْمٍ فَيَنْغَمِسُ ثُمَّ يَخْرُجُ فَيَنْتَفِضُ فَيَخِرُّ عَنْهُ سَبْعُوْنَ أَلْفَ قَطْرَةٍ يَخْلُقُ اللّٰهُ مِنْ كُلِّ قَطْرَةٍ مَلَكًا، فَهُمُ الَّذِيْنَ يُصَلُّوْنَ فِيْهِ ثُمَّ لَا يَعُوْدُوْنَ إِلَيْهِ۔

''آسمان میں ایک نہر ہے جس کو نہر حیوان......نہر حیات...... کہتے ہیں۔ جبریل ہر دن اس میں اترتے ہیں اور غوطہ لگاتے ہیں۔ پھر وہ اس سے نکلتے ہیں اور اپنا جسم جھٹکتے ہیں تو اس سے ستر ہزار قطرے گرتے ہیں، جن میں سے اللہ ہر قطرے سے ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے۔ وہ وہی ستر ہزار فرشتے ہیں جو البیت المعمور میں نماز پڑھتے ہیں پھر اس میں دوبارہ واپس نہیں آتے''

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: اس کی سند ضعیف ہے۔[1]

مذکورہ روایت سند کے اعتبار سے اگرچہ ضعیف ہو لیکن متن کے اعتبار سے منکر اور مردود ہے۔ کیونکہ صحیح احادیث میں یہ صراحت ہے کہ فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں۔ یعنی ان کا مادۂ تخلیق نور ہے۔[2]

(۲۲۳)......إِنَّ آدَمَ غَسَّلَتْهُ الْمَلَائِكَةُ بِمَاءٍ وَسِدْرٍ وَكَفَّنُوْهُ وَأَلْحَدُوْا لَهُ وَدَفَنُوْهُ وَقَالُوْا: هٰذِهِ سُنَّتُكُمْ يَا بَنِيْ آدَمَ! فِيْ مَوْتَاكُمْ۔

''فرشتوں نے آدم کو بیری کے پتوں سے ملے ہوئے پانی سے غسل دیا، ان کو کفن پہنایا۔ ان کے لحد تیار کی اور اس میں ان کو دفن کیا اور کہا: اے بنو آدم! تمہارے مردوں کے بارے میں یہ ہے تمہاری سنت''

یہ روایت موضوع تو نہیں ہے، لیکن بے حد ضعیف ہے۔ اس کی تخریج حافظ طبرانی نے المعجم الاوسط[3] میں اس سند سے کی ہے۔

ہم سے ولید نے بیان کیا، کہا: ہم سے حسین ابی سری نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن عبید نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن اسحاق نے، محمد بن ذکوان سے، انہوں نے حسن سے، انہوں نے یحییٰ سے اور انہوں نے حضرت ابن بن کعب رضی اللہ عنہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا......

حافظ طبرانی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

---

[1] فتح الباری: ص ۱۵۱۲، ج ۲ [2] صحیح مسلم: ح ۷۴۹۵۔۲۹۹۶

[3] المعجم الاوسط: ص ۱۲۰، ج ۱۰ ح ۹۲۵۵

اس کی روایت محمد بن ذکوان سے صرف محمد بن اسحاق نے کی ہے۔

محمد بن اسحاق سچے تو تھے لیکن تدلیس [1] کرتے تھے اور محمد بن ذکوان ضعیف تھے۔ [2]

(۲۲۴)......إِنَّ آدَمَ قَبْلَ أَنْ يُصِيبَ الذَّنْبَ كَانَ أَجَلُهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَأَمَلُهُ خَلْفَهُ، فَلَمَّا أَصَابَ الذَّنْبَ جَعَلَ اللّٰهُ أَمَلَهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَأَجَلُهُ خَلْفَهُ فَلا يَزَالُ يَأْمُلُ حَتّٰى يَمُوتَ۔

''درحقیقت آدم (علیہ السلام) کے گناہ کا ارتکاب کرنے سے پہلے ان کی موت ان کی آنکھوں کے سامنے رہتی تھی اور ان کی امید ان کے پیچھے۔ جب ان سے گناہ سرزد ہو گیا تو اللہ نے ان کی امید ان کی آنکھوں کے سامنے کر دی اور ان کی موت ان کے پیچھے۔ تو وہ اپنی موت آنے تک امیدیں کرتے رہے''

یہ روایت منکر ہے۔ اس کی تخریج حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق [3] میں ایک جماعت سے کی ہے:

''انہوں نے کہا: ہم کو ابو بکر محمد بن علی بن حامد شاشی فقیہ نے خبر دی، کہا ہم کو ابوالفضل منصور بن نصر بن عبدالرحیم بن مت کاغدی نے خبر دی، کہا ہم کو ابوسعید ھیثم بن کلیب بن سریج شاشی نے خبر دی، کہا: ہم کو عیسیٰ بن احمد نے خبر دی، کہا: ہم سے نضر بن شمیل نے بیان کیا، کہا: ہم کو عوف نے حسن سے روایت کرتے ہوئے خبر دی اور انہوں نے کہا: مجھے خبر ملی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اس سند کے تمام راوی جو ابوسعید شاشی سے اوپر ہیں، ثقہ ہیں۔ رہا مت کاغدی اور ابو بکر شاشی تو وہ مجہول الحال ہیں۔ مت کاغدی کے بارے میں ابن العماد نے ''شذرات'' میں لکھا ہے: ماوراء النہر کے راوی حدیث۔

رہے ابو بکر شاشی تو وہ مشہور شافعی فقیہ ہیں جن کا ترجمہ ''شذرات'' [4] میں موجود ہے۔

محدث محمد ناصر البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اس روایت کو مرفوع قرار دینا میرے نزدیک منکر ہے۔ امام احمد نے الزہد [5] میں اور ابن عساکر

---

[1] سند کا عیب چھپا دینے کو تدلیس کہتے تھے۔ لیکن اگر مدلس سچا ہو اور اپنے شیخ سے حدیث سننے کی صراحت کرے تو اس کی روایت قابل قبول ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ حدثنا یا حدثنی کی بجائے ''عن فلان'' یعنی فلاں سے روایت ہے کہے تو مردود ہوتی ہے۔

[2] تقریب التهذیب، ترجمه ۵۷۲۵، ۵۸۷۱، معجم اسامی الرواة ص ۵۴۷، ۵۵۱، ص ۶۰۵-۶۰۶، ج۳

[3] تاریخ دمشق: ص ۳۲۴، ج۲

[4] شذرات الذهب: ص ۳۷۵، ج۳

[5] کتاب الزهد: ص ۴۸

نے تاریخ دمشق[1] میں اس کو متعدد طرق کے ساتھ حسن سے روایت کیا ہے اور اس کو ان پر موقوف قرار دیا ہے۔ گمان ہے کہ یہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے۔

البانی آگے لکھتے ہیں:

حافظ سیوطی نے اس کا ذکر الجامع الصغیر[2] میں کیا ہے اور اس کو حافظ ابن عساکر سے منسوب کیا ہے۔ اور عبدالرؤف مناوی نے اس کی صحت وسقم کے بارے میں سکوت سے کام لیا ہے۔[3]

جس کا مطلب ہے کہ وہ اس کی صحت یا سقم معلوم نہ کر سکے۔ لہٰذا ایسی روایت قابل استدلال نہیں ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام:

حضرت نوح علیہ السلام زمین میں مبعوث کیے جانے والے پہلے رسول تھے۔ چنانچہ حدیث شفاعت میں آیا ہے:

((یَجْتَمِعُ الْمُؤْمِنُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ یُحْبَسُ الْمُؤْمِنُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ حَتّٰی یُهِمُّوْا بِذٰلِكَ، فَیَقُوْلُوْنَ: لَوِ اسْتَشْفَعْنَا اِلٰی رَبِّنَا فَیُرِیْحُنَا مِنْ مَكَانِنَا، فَیَأْتُوْنَ آدَمَ، فَیَقُوْلُوْنَ: اَنْتَ اَبُو النَّاسِ، خَلَقَكَ اللّٰهُ بِیَدِهٖ، وَأَسْجَدَ لَكَ مَلَائِكَتَهٗ وَعَلَّمَكَ اَسْمَاءَ كُلِّ شَیْءٍ، فَاشْفَعْ لَنَا عِنْدَ رَبِّكَ حَتّٰی یُرِیْحَنَا مِنْ مَكَانِنَا هٰذَا فَیَقُوْلُ: لَسْتُ هُنَاكُمْ وَیَذْكُرُ ذَنْبَهٗ فَیَسْتَحِیْ، اِئْتُوْا نُوْحًا، فَإِنَّهٗ اَوَّلُ رَسُوْلٍ نَبِیٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ اِلٰی اَهْلِ الْاَرْضِ))[4]

''قیامت کے دن مومنین جمع ہوں گے...... قیامت کے دن اہل ایمان ایک جگہ روک لیے جائیں گے...... وہ کہیں گے: کاش ہم اپنے رب کے پاس کسی سے سفارش کرائیں کہ وہ ہمیں اس جگہ سے راحت بخشے۔ لہٰذا وہ آدم (علیہ السلام) کے پاس حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے: آپ تمام لوگوں کے باپ ہیں۔ اللہ نے اپنے ہاتھ سے آپ کی تخلیق فرمائی ہے اور اپنے فرشتوں سے آپ کا سجدہ کرایا ہے اور آپ کو ہر چیز کے نام کا علم بخشا ہے۔ آپ اپنے رب کے پاس ہمارے لیے سفارش کر دیجیے کہ وہ ہمیں ہماری اس جائے قیام سے راحت بخشے۔

---

[1] تاریخ دمشق: ص ٣٢٤، ج٢ [2] الجامع الصغیر: ح ١٣٥٢
[3] الضعیفہ: ص ٢١، ج٥، ح ٢٠٠٨
[4] صحیح بخاری: ح ٤٤٧٦، ٦٥٦٥، ٧٤١٠، ٧٤٤٠، صحیح مسلم: ح ٤٧٥، ١٩٣

آدم علیہ السلام جواب دیں گے...... میں اس مقام پر نہیں ہوں اور اپنے گناہ کو یاد کر کے شرمندگی محسوس کریں گے۔ نوح کے پاس جاؤ کیونکہ وہ پہلے رسول...... نبی...... ہیں جن کو اللہ نے اہل زمین میں مبعوث فرمایا۔"

نبی اور رسول میں فرق:

اوپر جو حدیث پیش کی گئی ہے اس میں نبی اور رسول کو ہم معنی اور ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں بھی یہ دونوں الفاظ بیشتر مقامات پر ہم معنی اور مترادف ہی استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر رسول اور نبی کے الفاظ اس طرح بھی استعمال ہوئے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں مرتبے یا کام کے لحاظ سے کوئی فرق ضرور ہے، مثلاً سورۃ الحج میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّیْطٰنُ فِیْۤ اُمْنِیَّتِهٖ ﴾ [الحج:٥٢]

"اور اے رسول! تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی ایسا رسول اور نہ ایسا نبی بھیجا ہے مگر جب اس نے کوئی تمنا کی، تو شیطان نے اس کی تمنا میں خلل اندازی کی"

اس آیت مبارکہ سے رسول اور نبی کے درمیان فرق کا ثبوت ملتا ہے مگر وہ فرق کیا ہے اس کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔

قرآنی آیات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کا لفظ نبی کی بہ نسبت خاص ہے۔ یعنی ہر رسول نبی بھی ہوتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ اور رسول کا منصب نبی سے بڑا ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی تعداد رسولوں سے بہت زیادہ ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی عمر:

قرآن پاک اور صحیح احادیث میں حضرت نوح علیہ السلام کی حقیقی عمر کا ذکر نہیں آیا ہے۔ قرآن پاک میں صرف ایک جگہ اس مدت کا ذکر آیا ہے جس میں وہ اپنی قوم کو دعوت دیتے رہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ [العنكبوت:١٤]

"ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، پس وہ پچاس کم ایک ہزار برس انکے درمیان رہا

اور طوفان نے لوگوں کو اس حال میں اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ وہ ظالم تھے"

اس آیت مبارکہ سے یہ اشارہ ضرور ملتا ہے کہ ان کی حقیقی عمر ساڑھے نو سو برس سے زیادہ تھی مگر وہ کتنی تھی نہ اس کا تعین کیا گیا ہے اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ امام محی السنۃ ابو محمد حسین بن مسعود بغوی، جار اللہ محمود بن عمر زمخشری، ابو اسحاق احمد بن ابراہیم ثعلبی، ابوالفداء حافظ ابن کثیر اور امام محمد بن علی شوکانی وغیرہم نے اپنی تفسیروں میں حضرت نوح علیہ السلام کی صحیح عمر کے بارے میں جو روایتیں نقل کی ہیں ان میں سے کوئی بھی روایت صحیح نہیں ہے۔ بلکہ سب اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں۔ حتیٰ کہ اس قبیل کی جتنی روایتیں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منسوب ہیں، ان سے ان کی نسبت بھی صحیح نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے تفسیر کی کتابوں میں جو روایات منسوب ہیں ان میں سے بہت کم روایات صحیح ہیں۔[1]

البتہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان دس صدیوں کا فاصلہ تھا۔ چنانچہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((اِنَّ رَجُلًا قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! أَنَبِیٌّ کَانَ آدَمُ؟ قَالَ: "نَعَمْ مُکَلَّمٌ" قَالَ: فَکَمْ کَانَ بَیْنَهٗ وَبَیْنَ نُوْحٍ؟ قَالَ: عَشَرَۃُ قُرُوْنٍ"))

"ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آدم علیہ السلام نبی تھے؟ فرمایا: ہاں ان سے کلام کیا گیا۔ یعنی اللہ نے ان سے بذریعہ وحی بات کی۔ عرض کی: ان کے اور نوح علیہ السلام کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ تھا؟ فرمایا: دس صدیاں"[2]

اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

(کَانَ بَیْنَ نُوْحٍ وَآدَمَ عَشَرَۃُ قُرُوْنٍ کُلُّهُمْ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ مِّنَ الْحَقِّ فَاخْتَلَفُوْا فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیِّیْنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ))[3]

"نوح اور آدم علیہما السلام کے درمیان دس صدیوں کا فاصلہ تھا جس میں تمام لوگ شریعت

---

[1] امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے: تفسیر کے باب میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے لگ بھگ سو حدیثیں ثابت ہیں۔ الاتقان ص ۴۷۳، ج ۲

[2] صحیح ابن حبان: ح ۶۱۹۰

[3] مستدرک حاکم: ح ۴۰۰۹۔ امام ذہبی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ حافظ ابن کثیر سے سہو ہو گیا جو اس کو صحیح بخاری سے منسوب کر دیا۔ البدایہ والنہایہ: ص ۱۱۷، ج ۱

حقہ پر کاربند تھے۔ پھر ان میں اختلاف ہو گیا، تو اللہ نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے نبی بھیجے۔"

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ تحذیر الساجد من اتخاذ القبور مساجد میں لکھتے ہیں:

علی بن حسین بن عروۃ حنبلی "الکواکب الدراری فی ترتیب مسند امام احمد" میں لکھتے ہیں:

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے اُن مؤرخین کے قول کی تردید ہوتی ہے جن کا دعویٰ ہے کہ قابیل اور اس کی اولاد نے آگ کی پرستش کی تھی۔

میں...... البانی...... کہتا ہوں کہ اس میں ان فلسفیوں اور ملحدین کا بھی رد ہے جن کا دعویٰ ہے کہ انسان میں اصل چیز شرک ہے اور توحید عارضی ہے۔ [1]

اوپر نقل کردہ صحیح حدیثوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد دس صدیوں یا نسلوں میں توحید زندہ رہی اور ان کی اولاد راہ راست پر قائم رہی۔ پھر ان کے اندر اختلافات پیدا ہوئے۔ لوگوں نے نئے نئے راستے نکال لیے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے۔ بتوں کی پرستش شروع ہوگئی اور لوگوں میں اولیاء پرستی پھیل گئی تو اس امت اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ایسے لوگوں کی جانب اپنا رسول بنا کر بھیجا۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"اس امر میں اختلاف ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو ان کی عمر کتنی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بعثت کے وقت ان کی عمر ۵۰ برس کی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ساڑھے تین سو برس کی عمر میں رسول بنائے گئے اور تیسرا قول یہ ہے کہ ان کی بعثت چار سو اسی برس کی عمر میں ہوئی۔ یہ تمام اقوال امام ابن جریر طبری نے نقل کیے ہیں اور تیسرے قول کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منسوب کیا ہے۔ [2]

حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کے وقت ان کی عمر کے بارے میں حافظ ابن کثیر کے نقل کردہ ان اقوال میں سے کوئی بھی قول قابل اعتماد سند پر مبنی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے یہ اقوال نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور ان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

حضرت نوح علیہ السلام کی وصیت:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر

[1] تحذیر الساجد من......ص ۱۳۶ [2] تفسیر طبری: ص ۱۱۷، ج ۱

تھے کہ ایک دیہاتی ریشم کے بنے ہوئے بٹنوں والا ایک سبز ریشمی چوغہ پہن کر حاضر ہوا اور کہنے لگا:
تمہارے ان صاحب نے ہر شہسوار ابن شہسوار کو پست کر دیا اور ہر چرواہے کے چرواہ بیٹے کو بلند کر دیا ہے۔"

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے اس کے پورے چوغے کو پکڑ کر اس سے فرمایا:
"کیا میں تیرے جسم پر بے عقلوں کا لباس نہیں دیکھ رہا ہوں؟!"

پھر فرمایا:

((اِنَّ نَبِیَّ اللّٰهِ نُوْحًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا حَضَرَتْهُ الْوَفَاةُ، قَالَ لِابْنِهٖ: اِنِّیْ قَاصٌّ عَلَيْكَ الْوَصِيَّةَ: آمُرُكَ بِاِثْنَتَيْنِ وَاَنْهَاكَ عَنِ اثْنَتَيْنِ: آمُرُكَ بِلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، فَاِنَّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعَ وَالْاَرَضِيْنَ السَّبْعَ لَوْ وُضِعَتْ فِیْ كَفَّةٍ وَوُضِعَتْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فِیْ كَفَّةٍ، رَجَحَتْ بِهِنَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَوْ اَنَّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعَ وَالْاَرَضِيْنَ السَّبْعَ كُنَّ حَلْقَةً مُبْهَمَةً اِلَّا قَصَمَتْهُنَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ، فَاِنَّهَا صَلَاةُ كُلِّ شَیْءٍ وَبِهَا يُرْزَقُ الْخَلْقُ۔ وَاَنْهَاكَ عَنِ الشِّرْكِ وَالْكِبْرِ قَالَ: قُلْتُ اَوْ قِيْلَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! هٰذَا الشِّرْكُ قَدْ عَرَفْنَاهُ فَمَا الْكِبْرُ؟ قَالَ: اَنْ يَّكُوْنَ لِاَحَدِنَا نَعْلَانِ حَسَنَتَانِ لَهُمَا شِرَاكَانِ حَسَنَانِ؟ قَالَ: لَا، قَالَ: هُوَ اَنْ يَّكُوْنَ لِاَحَدِنَا اَصْحَابٌ يَجْلِسُوْنَ اِلَيْهِ؟ قَالَ: لَا، قِيْلَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! فَمَا الْكِبْرُ؟ قَالَ: سَفَهُ الْحَقِّ وَغَمْصُ النَّاسِ...... غَمْطُ النَّاسِ))[1]

"اللہ کے نبی نوح ﷺ کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے سے فرمایا: میں تمہیں وصیت کرنا چاہتا ہوں: میں تمہیں دو باتوں کا حکم دیتا ہوں اور دو باتوں سے روکتا ہوں۔ میں تمہیں لا الہ الا اللہ یعنی نہیں ہے کوئی معبود برحق مگر اللہ، کا حکم دیتا ہوں۔ کیونکہ اگر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں رکھ دی جائیں اور لا الہ الا اللہ دوسرے پلڑے میں، تو لا الہ الا اللہ ان پر بھاری ہوگا۔ اور اگر ساتوں

---

[1] مسند امام احمد ح ۶۵۸۳۔ الادب المفرد ح ۵۵۸۔ الاسماء والصفات ح ۱۸۶، البدایہ والنہایہ ص ۱۳۹، ج ۱، الصحیحۃ: ص ۲۵۹، تا ۴۶۱ ج ۱، ح ۱۳۴

آسمان اور ساتوں زمینیں ایک غیر واضح حلقہ ہوتیں۔ یعنی غیر واضح اور مبہم بات اور معاملہ ......تو لا اله الا الله ان کو واضح کر دیتا۔

اور میں تمہیں سبحان اللہ وبحمدہ کا حکم دیتا ہوں۔ کیونکہ ہر چیز کی نماز ہے۔ اسی کے ذریعہ مخلوق کو روزی ملتی ہے۔

اور میں تمہیں شرک اور تکبر سے منع کرتا ہوں۔ حضرت عبداللہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا یا عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! یہ شرک تو ہم جانتے ہیں مگر تکبر اور بڑائی کیا ہے؟ کیا تکبر یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کے جوتے اور ان کے تسمے خوبصورت ہوں؟ فرمایا: نہیں۔ عرض کیا: کیا تکبر یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کے دوست اور ساتھی ہوں جو اس کے گرد بیٹھتے ہوں؟ فرمایا: نہیں عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! تو پھر تکبر اور بڑائی کیا ہے؟ فرمایا: حق کا مذاق اڑانا اور اس کی ہتک کرنا اور لوگوں کی تحقیر اور عیب جوئی کرنا۔"

حضرت نوح علیہ السلام کی قبر:

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

ابن جریر اور ازرقی نے عبدالرحمٰن بن سابط اور ان کے علاوہ دوسرے تابعین سے مرسلاً یہ روایت کیا ہے کہ "نوح علیہ السلام کی قبر مسجد حرام میں ہے" اور یہ روایت اس روایت سے زیادہ قوی اور ثابت ہے جس کا ذکر بہت سے متاخر علماء کرتے ہیں کہ وہ البقاع کے ایک قصبہ میں مدفون ہیں۔ جو موجودہ وقت میں "کرک نوح" کے نام سے معروف ہے۔[1]

تعجب ہے کہ حافظ ابن کثیر جیسے جلیل القدر حافظ حدیث اور مفسر قرآن نے لبنان کے البقاع نامی علاقے میں حضرت نوح علیہ السلام کی قبر کو خلاف واقعہ اور غیر ثابت قرار دے دیا۔ مسجد حرام میں ان کی قبر کو صحیح اور مطابق واقعہ بتایا۔ حالانکہ دونوں جگہوں میں ان کی قبر سے متعلق جو روایات تاریخ کی کتابوں میں منقول اور لوگوں میں زبان زد ہیں ان میں سے کوئی بھی روایت قابل اعتماد نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ساری روایتیں تابعین کے اقوال سے عبارت ہیں اور ان میں سے کوئی بھی روایت صحیح سند کے ساتھ الصادق والمصدوق صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ یعنی کسی بھی روایت کا سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتا۔ مزید یہ کہ مسجد حرام میں کسی نبی یا غیر نبی کا مدفون ہونا اپنے اندر جو نکارت رکھتا ہے وہ نکارت کسی دوسری جگہ کسی نبی کے مدفون ہونے میں قطعاً نہیں ہے۔ کیونکہ مسجد حرام "مرکز توحید" ہے۔ اللہ کی زمین میں اللہ کی

[1] البدایہ والنہایہ: ص ۱۴۰، ج ۱

عبادت کے لیے بنایا جانے والا پہلا گھر ہے اور دنیا کے طول وعرض میں پائے جانے والے تمام مسلمانوں کا رہتی دنیا تک قبلہ رہے گا۔

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبٰرَکًا وَّ هُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴾ [آل عمران:۹۶]

"بے شک لوگوں کی عبادت کے لیے جو سب سے پہلا گھر تعمیر ہوا وہ ہے جو مکہ میں ہے۔ یہ گھر بابرکت اور دنیا کے تمام لوگوں کے لیے مرکز ہدایت ہے"

﴿ وَ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ حَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ ﴾ [البقرة:۱۵۰]

"اے نبی! جہاں سے بھی تمہارا گزر ہو اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دو۔ اور اے مسلمانوں جہاں بھی تم لوگ ہو اسی کی طرف اپنا منہ کرلیا کرو۔ تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف بولنے کے لیے کوئی دلیل نہ ملے"

مذکورہ آیت میں نماز میں مسجد حرام کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا، لَعَنَ اللّٰهُ قَوْمًا اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَاءِهِمْ مَسَاجِدَ))[1]

"اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بننے دیجیو۔ اللہ کی لعنت ہو ان لوگوں پر جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنالیا۔"

﴿ وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل:۳۶]

"اور ہم نے ہر امت میں (اس حکم کے ساتھ) ایک رسول بھیجا کہ لوگو! اللہ کی عبادت کرو اور معبودان باطل کی عبادت سے دور رہو۔"

اور تمام انبیاء کی طرح حضرت نوح علیہ السلام نے بھی صرف اللہ کی عبادت کی دعوت دی:

---

[1] مسند امام احمد: ح ۷۳۵۲۔ طبقات ابن سعد: ص ۲۴۱-۲۴۲، ج ۲۔ فضائل المدینہ: ص ۶۶، ج ۱۔ مسند ابویعلی: ص ۳۱۲، ج ۱۔ مسند الحمیدی: ح ۱۰۲۵، حلیة الاولیاء: ص ۲۸۳، ج ۶ ح ۳۱۷

﴿ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّي لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ ﴾

[نوح:۲، ۳]

''(نوح نے) کہا: اے میری قوم کے لوگو میں تمہارے لیے کھلا ہوا خبردار کرنے والا ہوں (اور تم کو یہ دعوت دیتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو، اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔''

اور جب نو سو پچاس برس تک قوم کو توحید اور اللہ کی عبادت کی دعوت دینے کے باوجود معدودے چند افراد کے سوا کوئی ان پر ایمان نہ لایا تو نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ فریاد کی:

﴿ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗ اِلَّا خَسَارًا ۝ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۝ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۝ ﴾ [نوح:۲۱ تا ۲۳]

''نوح نے عرض کیا: اے میرے رب! انہوں نے میری نافرمانی کی روش اختیار کی اور اس کی پیروی کی جس کے مال اور اولاد نے اس کے نقصان ہی میں اضافہ کیا ہے اور انہوں نے بہت بڑی مکاری کی اور آپس میں کہا: ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو اور نہ چھوڑو ود، سواع، نہ یغوث، یعوق اور نسر کو''

اوپر آیت نمبر ۲۳ میں جن بتوں کے نام آئے ہیں یعنی وَد، سُواع، یغوث، یعوق اور نسر...... تو یہ دراصل قوم نوح سے پہلے کے صالح اور نیک لوگ تھے جن کے مرنے کے بعد لوگ ان کی عبادت کرنے لگے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔[1]

تو کیا یہ بات قرین عقل ہو سکتی ہے کہ ایک جلیل القدر رسول جو ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کو توحید کی دعوت دیتا رہا ہو وہ مسجد حرام میں دفن ہونے کی وصیت کرے گا جو مرکز توحید ہے۔ مسجد میں قبر بنانا شرک کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝ ﴾ [الجن:۱۸]

''اور بے شک مسجدیں تو صرف اللہ کے لیے ہیں لہٰذا اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو''

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے رحلت فرماتے ہوئے جس چیز کی تاکید فرمائی وہ شرک اور اسباب شرک سے دور رہنے کی تاکید کی تھی۔

---

[1] صحیح بخاری: ح ۴۹۲۰

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیماری میں جس سے آپ جاں بر نہ ہو سکے فرمایا:

((لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ، قَالَتْ: فَلَوْلَا ذٰلِكَ لَاُبْرِزَ قَبْرُه، غَيْرَ اَنَّهُ خُشِيَ أَنْ يُّتَّخَذَ مَسْجِدًا))[1]

"یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجدیں (عبادت گاہیں) بنالیا۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو آپ کی قبر نمایاں کردی جاتی۔ مگر یہ خوف محسوس کیا گیا کہ کہیں اس کو سجدہ گاہ نہ بنا لیا جائے"

حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات سے پانچ دن پہلے فرماتے ہوئے سنا:

((اِنِّیْ اَبْرَأُ اِلَى اللّٰهِ اَنْ يَّكُوْنَ لِیْ مِنْكُمْ خَلِيْلٌ۔ فَاِنَّ اللّٰهَ قَدِ اتَّخَذَنِیْ خَلِيْلًا، كَمَا اتَّخَذَ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا، وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا، مِنْ أُمَّتِیْ خَلِيْلًا لَا تَّخَذْتُ اَبَا بَكْرٍ خَلِيْلًا اَلاَ وَاِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدَ، اَلَا فَلَا تَتَّخِذُوْا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ، فَاِنِّیْ اَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ))[2]

"میں اللہ کی بارگاہ میں اس بات سے اظہارِ برأت کرتا ہوں کہ تم میں سے میرا کوئی خلیل ہو۔ کیونکہ اللہ نے مجھے اپنا خلیل بنا لیا ہے جس طرح اس نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تھا۔ اور اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا۔ آگاہ رہو! تم سے پہلے کے لوگ اپنے نبیوں اور صلحاء کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیا کرتے تھے، خبردار! تم قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا۔ میں تم لوگوں کو اس سے منع کرتا ہوں۔"

درحقیقت مسجدوں میں قبریں بنانے یا قبروں کو سجدہ گاہوں اور مزارات میں تبدیل کرنے کا آغاز ان لوگوں کے ہاتھوں ہوا جو انبیاء، اولیاء اور صلحائے امت کی عقیدت میں غلو پسندی کے نتیجے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ کائنات میں تصرف کا اختیار رکھتے ہیں۔ ان کے توسط سے اللہ کا قرب اور اس کی رضا حاصل کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا ان لوگوں نے صلحائے امت کو مسجدوں میں دفن کرنا شروع کردیا یا ان کی قبروں

---

[1] صحیح مسلم: ح ۱۱۸٤، ۵۲۹ [2] صحیح مسلم: ح ۱۱۸۸، ۵۳۲

پر مسجدیں بنانا شروع کر دیں۔ یا ان کی قبروں کو مزاروں میں تبدیل کر دیا تا کہ اس طرح وہ اللہ کی عبادت کے ساتھ ان کی عبادت کو بھی شامل کر لیں۔

اور جن لوگوں نے مقدس مقامات کی تاریخیں لکھیں انہوں نے ان میں ان مقامات کے فضائل کے ضمن میں ایسی بے بنیاد روایتیں بھر دیں جو توحید کی روح اور مزاج سے براہ راست متصادم ہوتی ہیں۔ بعد میں یہی روایتیں دوسری کتابوں میں نقل در نقل ہوتی رہیں یہاں تک کہ ان کو مسلمہ تاریخی حقائق قرار دے لیا گیا۔

ازرقی اور تاریخ مکہ:

مکہ کی تاریخ کے موضوع پر پہلی مدون کتاب ابوالولید ازرقی احمد بن محمد بن ولید بن عقبہ بن ازرق کی تصنیف ''تاریخ مکہ'' ہے جس کی تہذیب و تنقیح ان کے پوتے ابوالولید محمد بن عبداللہ بن احمد ازرقی متوفی ۲۵۰ھ نے کی۔[1]

ازرقی نے اپنی اس کتاب میں مسجد حرام کو ''قبرستان'' بنا دیا ہے۔ معروف و غیر معروف تابعین سے ایسی مقطوع اور مرسل روایتیں نقل کی ہیں جن کے ذریعے مسجد حرام میں کثیر تعداد میں انبیاء اور رسولوں کی قبروں کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھا ہے:

محمد بن سابط[2] کا قول ہے:

انبیاء میں سے ایک نبی کی امت جب ہلاک ہوگئی تو وہ مکہ آ گئے۔ وہ اور ان کے اصحاب وہیں اللہ کی عبادت کرنے لگے اور وہیں ان کی اور ان کے اصحاب کی وفات ہوئی۔ چنانچہ نوح، ہود، صالح اور شعیب علیہم السلام کی وفات مکہ میں ہوئی جن کی قبریں زمزم اور حجر اسود کے درمیان موجود ہیں۔[3]

آگے لکھتے ہیں:

میں نے عبدالرحمن بن سابط[4] سے کہتے ہوئے سنا ہے: انہوں نے کہا: میں نے عبداللہ بن ضمرہ سلولی[5] کو کہتے ہوئے سنا ہے:

رکن سے مقام ابراہیم تک اور یہاں سے حجر کے درمیانی رقبہ میں ۹۹ نبیوں کی قبریں ہیں۔ یہ سب حج کے لیے آئے تھے۔ یہیں ان کی وفات ہوئی اور یہیں مدفون ہوئے۔[6]

---

[1] فواد سزکین: تاریخ التراث العربی: ص ۲۰۱-۲۰۲ ج ۱، ۲

[2] غیر معروف تابعی

[3] تاریخ مکہ: ص ۵۱۴ ج ۲

[4] ایک تابعی

[5] ایک تابعی کا نام ہے۔

[6] تاریخ مکہ: ص ۵۱۵

حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے بارے میں ازرقی لکھتے ہیں:

جب اسماعیل علیہ السلام کی وفات ہوئی تو وہ حجر میں اپنی ماں کے ساتھ دفن کیے گئے۔[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

جب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کعبہ کی تعمیر نو کی غرض سے حجر میں کھدائی کی تو ان کو بیت اللہ کی بنیاد میں سرخ پتھر ملے...... اور اس میں ان کو ایک قبر کی جگہ ملی۔ انہوں نے کہا: یہ اسماعیل علیہ السلام کی قبر ہے۔ انہوں نے قریش کو جمع کیا اور فرمایا: گواہ رہو۔[2]

صرف یہی نہیں بلکہ ازرقی نے یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی کنواری بیٹیوں کو مسجد حرام کے رکن شامی کے پاس دفن کیا گیا۔[3]

مسجد حرام میں انبیاء (۲۸) کی قبروں کی حقیقت:

اوپر مسجد حرام میں حضرت نوح اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی قبروں سے متعلق جو روایت نقل کی گئی ہیں وہ سنداً اور متناً مردود اور باطل ہیں۔

سند کے اعتبار سے ان کے مردود اور باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی روایت مرفوع نہیں ہے۔ مزید یہ کہ ان میں سے کسی بھی روایت کی سند تابعین تک قابل اعتبار نہیں ہے۔ بعض روایتیں تو سند سے عاری ہیں اور جن روایتوں کی سند تابعین تک بیان ہوئی ہے ان میں سے بعض تابعی مجہول ہیں۔ جو تابعی سچے اور ثقہ ہیں انہوں نے بھی یہ صراحت نہیں کی ہے کہ وہ جو کچھ بیان کر رہے ہیں وہ کسی صحابی سے سن کر بیان کر رہے ہیں۔

ان روایتوں کے باطل ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی روایت صحیحین، سنن اربعہ، مسند امام احمد، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، امام طبرانی کی تینوں معاجم اور حدیث کی دوسری معروف کتابوں میں بیان نہیں ہوئی ہے۔

رہا مذکورہ روایتوں کا متن تو اس کے باطل ہونے کے دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) یہ روایتیں اسلام کے توحیدی مزاج اور روح کے خلاف ہیں اور رسول اکرم ﷺ کے ان ارشادات سے براہ راست ٹکراتی ہیں جن میں قبروں کو عبادت گاہ بنانے سے منع فرمایا گیا ہے۔ جبکہ یہ جھوٹی روایتیں اس زمین پر اللہ تعالیٰ کی سب سے پہلی عبادت گاہ مسجد حرام کو قبرستان ثابت کر رہی ہیں۔

---

[1] تاریخ مکہ: ص ۱۰۸، ج ۱ [2] تاریخ مکہ: ص ۲۳۲-۲۳۳

[3] ص ٤٤٧، ج ۲

(۲) حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں کعبہ مشرفہ کی تعمیر نو کے موقع پر کھدائی کے دوران حجر میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر پانے کا دعویٰ کیا گیا ہے جبکہ صحیحین اور حدیث کی دوسری مستند کتابوں میں اس واقعہ سے متعلق جو روایات آئی ہیں ان میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ مشہور تابعی حضرت یزید بن رومان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

میں اس وقت حاضر تھا جب ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے کعبہ کی دیواریں گرائیں، اس کی تعمیر کی اور اس میں حجر کو شامل کر دیا۔ میں نے آپس میں جڑے ہوئے پتھروں کی شکل میں ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد دیکھی ہے جو آپس میں ملے ہوئے اونٹوں کے کوہان کی مانند تھی۔[1]

(۳) حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے عہد میں حجر یا حطیم کا حصہ اسی شکل میں تھا جس شکل میں موجودہ وقت میں ہے۔ جب انہوں نے کعبہ کی تعمیر نو کی تو حطیم کو اس میں شامل کر دیا۔ جب کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کردہ عمارت کے اندر تھا لہٰذا اس میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے مدفون ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت ہاجرہ کا انتقال ہوا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ان کو کعبہ کے اندر دفن کیا اور اپنے انتقال سے قبل اپنے بیٹوں کو یہ وصیت فرمائی کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو مجھے کعبہ کے اندر میری ماں کے پہلو میں دفن کرنا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ سورۃ الحج میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿ وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْـًٔا وَّ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىٕفِیْنَ وَ الْقَآىٕمِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۝ ﴾ [الحج:٢٦]

''اے نبی! یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر کی جگہ متعین کی تھی (اور اس کو حکم دیا تھا کہ) میرے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھنا''

اس آیت مبارکہ میں ابراہیم علیہ السلام کو کعبہ مشرفہ کو جس چیز سے پاک رکھنے کا حکم دیا گیا ہے وہ شرک اور آلائش شرک کے سوا کچھ اور ہو سکتی ہے؟ اور کیا قبر سے بڑھ کر شرک کا ذریعہ وسبب کچھ اور ہو سکتا ہے؟ جس کا ثبوت ان قبروں سے ملتا ہے جن کو عبادت گاہوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

پھر اس آیت مبارکہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد:

((اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا))

---

[1] صحیح بخاری: ١٥٨٦، صحیح مسلم: ٣٢٤٥، ٣٢٤٦۔ سنن نسائی ح ٢٩٠٣

''اے اللہ! تو میری قبر کو پوجا کی چیز نہ بننے دیجیو''[1]
کو سامنے رکھ کر ان روایتوں پر غور کیجیے جن میں مسجد حرام کے اندر انبیاء علیہم السلام کے مدفون ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ تو ان کے موضوع اور جھوٹ ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جائے گا۔

(۴) رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى الْأَرْضِ أَنْ تَأْكُلَ أَجْسَادَ الْأَنْبِيَاءِ))[2]

''بے شک اللہ نے زمین پر یہ حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسموں کو کھائے''

اس حدیث پاک کی رو سے تمام انبیاء علیہم السلام کے جسم قبروں میں بالکل صحیح سالم موجود ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ حجر اسود سے مقام ابراہیم اور وہاں سے حجر تک ۹۹ نبیوں کی قبریں ہوں؟ ظاہری بات ہے کہ یہ تمام نبی ایک ہی وقت میں فوت نہیں ہوئے۔ لہٰذا جب ایک کے بعد دوسرے نبی کو دفن کرنے کے لیے قبر کھودی گئی تو پہلے سے مدفون نبی یا انبیاء کی لاش ظاہر ہوگئی ہوں گی۔ ایسی صورت میں اس مختصر سے رقبے میں اتنے سارے نبیوں کو کس طرح دفن کیا گیا؟ بلکہ محمد طاہر کردی نے تو ''التاریخ القویم لمکہ والحرم''[3] میں یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ رکن یمانی سے حجر اسود کے درمیانی حصے میں ۷۳ نبیوں کی قبریں ہیں اور مسجد حرام کے پورے صحن میں ۳۰۰ نبی مدفون ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اتنی مختصر جگہ میں اتنی بڑی تعداد کو کس طرح دفن کیا گیا؟ تو کیا ان تمام نبیوں کو ایک دوسرے پر دفن کیا گیا؟

مزید یہ کہ عہد عثمانی اور عہد سعودی میں مسجد حرام کی متعدد بار تعمیر ہوئی ہے متعدد بار مطاف کو کھودا گیا اور اس میں توسیع کی گئی ہے۔ موجودہ توسیع کے موقع پر پورے مطاف کو کھود کر نیچے خاص قسم کے پائپ ڈالے گئے ہیں اور پورے مطاف میں جدید طرز کے ٹائلز بچھائے گئے ہیں۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کھدائی کے دوران کوئی انسانی لاش ملی ہو۔ ورنہ کہرام مچ جاتا ہے۔ حالانکہ اگر حرم کے صحن یا مطاف میں کسی جگہ کسی ایک نبی کی قبر ہوتی تو وہ کھل جاتی اور لاش ظاہر ہو جاتی۔

مذکورہ وضاحت سے معلوم ہوا کہ مسجد حرام میں انبیاء علیہم السلام کے دفن کیے جانے کے واقعات من گھڑت اور جھوٹ ہیں۔

---

[1] اس کی تخریج اوپر گزر چکی ہے۔
[2] ابوداؤد: ۱۰۴۷، ۱۵۳۱، سنن نسائی: ۱۳۷۳۔ سنن ابن ماجه: ۱۰۸۵، ۱۶۳۶۔ صحیح ابن خزیمه: ۱۷۳۳، ۱۷۳۴
[3] ص ۵۰۰، ج۱

تحریف کی بدترین مثال:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((صَلّٰی فِیْ مَسْجِدِ الْخَیْفِ سَبْعُوْنَ نَبِیًّا مِنْهُمْ مُوْسٰی کَأَنِّیْ انْظُرُ اِلَیْهِ وَعَلَیْهِ عَبَاءَتَانِ قَطْوَانِیَّتَانِ وَهُوَ مُحْرِمٌ عَلٰی بَعِیْرٍ مِنْ اِبِلِ شَنُوْءَةَ مَخْطُوْمٍ بِخِطَامِ لِیْفٍ، لَهُ ضَفِیْرَتَانِ))[1]

"مسجد خیف میں ستر نبیوں نے نماز پڑھی ہے جن میں سے ایک موسیٰ بھی ہیں۔ گویا میں ان کو دیکھ رہا ہوں کہ ان کے اوپر دو جھالر دار عبائیں ہیں اور وہ محرم ہیں۔ وہ شنوءۃ کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ پر سوار ہیں جس کو کھجور کے درخت کی چھالوں سے بنی نکیل ڈالی گئی ہے اور موسیٰ کے بالوں کی دو لٹیں بنی ہوئی ہیں......"

حافظ طبرانی نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

اس حدیث کو عطاء بن سائب سے صرف محمد بن فضیل نے روایت کیا ہے۔ جس کی روایت میں عبداللہ بن ہاشم طوسی منفرد ہیں۔

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

عبداللہ بن ہاشم ثقہ ہیں اور ان کا شمار امام مسلم کے شیوخ میں ہوتا ہے۔ ان کے اوپر کے راوی بھی ثقہ ہیں سوائے عطاء بن سائب کے۔ جن کا ذہنی توازن آخری عمر میں خراب ہوگیا تھا۔ لیکن یہ حدیث حسن ہے۔[2]

یہ حدیث اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ اس سے مسجد خیف کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو اس کی جگہ سے مطلع فرما دیا تھا۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ بعد میں اس حدیث میں "صلی" کی جگہ "قُبِرَ" کر دیا گیا اس طرح عبارت یوں ہوگئی:

(۲۲۵)......قُبِرَ فِیْ مَسْجِدِ الْخَیْفِ سَبْعُوْنَ نَبِیًّا۔

"مسجد خیف میں ستر نبیوں کو دفن کیا گیا"

---

[1] المعجم الاوسط للطبرانی ح ۵۴۰۳۔ کنز العمال ح ۳۴۷۹۳، "شنوءہ" یمن کا ایک قبیلہ ہے جو عبداللہ بن کعب بن عبداللہ بن مالک بن نصر بن الازدی کی طرف منسوب ہے، جس کا لقب "شنوءۃ" تھا۔ اس کو یہ لقب اس کے اور اس کے گھر والوں کے درمیان عداوت کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ (فتح الباری: ص ۱۵۶۴، ج ۲)

[2] الصحیحہ: ص ۳۷، ج ۵

اس طرح یہ حدیث ان لوگوں کے دعویٰ سے ہم آہنگ ہوگی جو مسجدوں میں بزرگوں اور اولیاء اللہ کو دفن کرنے اور ایسی مسجدوں میں نماز کو صحیح کہتے ہیں جن میں قبریں ہوں۔

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ "تحذیر الساجد من اتخاذ القبور مساجد" میں لکھتے ہیں:

مذکورہ لفظ کے ساتھ اس حدیث کو ہم صحیح نہیں سمجھتے۔ کیونکہ صحیح حدیثوں کی تدوین سے جن ائمہ کا تعلق رہا ہے ان میں سے کسی نے اس کی روایت نہیں کی۔ قدیم ائمہ حدیث میں جن کی تصحیح کا اعتبار رہا ہے ان میں سے کسی نے بھی اس کو صحیح نہیں قرار دیا ہے۔ اس کی سند میں ایسے راوی شامل ہیں جو نامانوس اور غیر معقول روایتیں نقل کرنے میں مشہور تھے۔ چنانچہ حافظ طبرانی المعجم الکبیر[1] میں لکھتے ہیں:

ہم سے عبدان بن احمد نے بیان کیا، کہا: ہم کو عیسیٰ بن شاذان نے خبر دی، کہا ہم کو ابو ہمام دلال نے خبر دی، کہا: ہم کو ابراہیم بن طہمان نے منصور سے، انہوں نے مجاہد سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے خبر دی:

((فِیْ مَسْجِدِ الْخَیْفِ قَبْرُ سَبْعِیْنَ نَبِیًّا))

"مسجد خیف میں ستر نبیوں کی قبریں ہیں"

اور حافظ ہیثمی نے مجمع الزوائد[2] میں یہ روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے۔

((فِیْ مَسْجِدِ الْخَیْفِ قُبِرَ سَبْعُوْنَ نَبِیًّا))

"مسجد خیف میں ستر نبی دفن کیے گئے"

ہیثمی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

اس کی روایت حافظ بزار نے کی ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

محدث البانی لکھتے ہیں:

طبرانی کے راوی بھی ثقہ ہیں سوائے عبدان بن احمد کے۔ جس کا لقب اہوازی ہے۔ جب کہ طبرانی نے المعجم الصغیر[3] میں لکھا ہے اور مجھے اس کا کوئی ترجمہ نہیں ملا۔ اور وہ عبدان بن محمد مروزی کے علاوہ ہے۔ یہ مروزی بھی حافظ طبرانی کے شیوخ میں شمار ہوتے ہیں۔ ثقہ اور حافظ حدیث ہیں۔ تاریخ[4] بغداد اور تذکرۃ الحفاظ[5] وغیرہ میں ان کا ترجمہ موجود ہے۔

---

[1] المعجم الکبیر: ص ۲۰۴، ج ۳
[2] مجمع الزوائد: ص ۲۹۸، ج ۳
[3] المعجم الصغیر: ص ۲۳۴
[4] تاریخ بغداد: ص ۱۳۵، ج ۱۱
[5] تذکرۃ الحفاظ: ص ۲۳۰، ج ۲

لیکن اس سند کے راویوں میں ایسے راوی بھی شامل ہیں جو نامعقول اور غریب روایتیں بیان کیا کرتے تھے، جیسے عیسیٰ بن شاذان جس کے بارے میں امام ابن حبان نے ''الثقات'' میں لکھا ہے کہ وہ غریب اور انوکھی روایتیں بیان کرتا تھا۔

ابراہیم بن طہمان کے بارے میں حافظ ابوجعفر محمد بن عبد اللہ بن عمار موصلی کا قول ہے کہ: وہ روایت حدیث میں ضعیف تھا اور اس کی روایتوں میں تضاد ہوتا تھا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مذکورہ روایت:

((فِي مَسْجِدِ الْخَيْفِ قَبْرُ سَبْعِينَ نَبِيًّا))

''مسجد خیف میں ستر نبیوں کی قبریں ہیں'' یا

((فِي مَسْجِدِ الْخَيْفِ قُبِرَ سَبْعُونَ نَبِيًّا))

''مسجد خیف میں ستر نبی دفن کیے گئے تھے''

یا تو ابراہیم بن طہمان کے عجائبات میں سے ایک ہے یا عیسیٰ بن شاذان کے۔[1]

اوپر محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کی مذکورہ روایت کے بارے میں جو وضاحتیں نقل کی گئی ہیں وہ علمی اعتبار سے بے حد وقیع ہیں۔ مگر ان سے صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ روایت سند کے اعتبار سے صرف ضعیف ہے۔ جبکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ایک صحیح حدیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے وہ شاذ ہے۔ اور شاذ روایت مردود ہوتی ہے۔ خاص طور پر جبکہ اس کا متن اسلام کے توحیدی مزاج کے خلاف ہو اور وہ ایسے امر واقعہ سے ٹکراتا ہو جو ہر طرح کے شک وشبہ سے پاک ہو۔ امر واقعہ اور مسلمہ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام ان کی قبروں میں بالکل تر و تازہ اور محفوظ ہیں۔ جیسا کہ اوپر ایک صحیح حدیث کی روشنی میں بیان کیا جا چکا ہے۔

لہٰذا مسجد خیف کی تعمیر کے وقت اس کی بنیاد رکھنے کے لیے جب اس جگہ کھدائی ہوئی ہوگی تو وہاں مدفون انبیاء علیہم السلام کے اجسام ظاہر ہو گئے ہوں گے۔ جبکہ تاریخ کی کتابوں میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ مسجد خیف کی جگہ کھدائی کے موقع پر کسی بھی نبی کا جسم یا اس کا کوئی حصہ ظاہر ہوا ہو۔ حالانکہ اس مسجد کی تعمیر متعدد بار ہوئی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مسجد خیف میں ستر نبیوں کے مدفون ہونے کا واقعہ محض

[1] تحذیر الساجد: ص ۹۳-۹۶

ایک دعویٰ ہے جس کے پیچھے کوئی دلیل نہیں ہے۔

اوپر میں نے جو مفروضہ پیش کیا ہے اس کی دلیل کے طور پر صحیح واقعات نقل کر رہا ہوں جن سے قبروں میں انبیاء علیہم السلام کے جسموں کے بالکل صحیح وسالم شکل میں موجود ہونے کا یقینی ثبوت ملتا ہے۔

(۱) امام مالک رحمہ اللہ مؤطا میں لکھتے ہیں:

حضرت عمرو بن جموح اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی قبر کو سیلاب نے کھول دیا تھا۔ یہ دونوں غزوۂ احد میں شہید ہوئے اور ایک ہی قبر میں دفن کیے گئے تھے۔ چنانچہ ان کی لاشوں کو دوسری جگہ دفن کرنے کے لیے ان کی قبر کو کھودا گیا تو ان کی لاشیں جوں کی توں تھیں جیسے ان دونوں کی کل ہی وفات ہوئی ہو۔ ان دونوں میں سے ایک زخمی ہو گئے تھے اور انہوں نے زخم پر اپنا ہاتھ رکھ لیا تھا اور اسی طرح ان کی تدفین ہوئی تھی اور کھدائی کے بعد جب ان کا ہاتھ زخم سے ہٹا کر چھوڑ دیا گیا تو وہ دوبارہ زخم پر چلا گیا۔ ان دونوں کی قبروں کو کھودنے اور غزوۂ احد کے درمیان ۴۶ سال کی مدت کا فاصلہ تھا۔[۱]

(۲) اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے حکم سے مسجد نبوی شریف کی توسیع اور اس میں امہات المومنین کے حجروں کو شامل کرنے کے لیے قدیم عمارت گرائی گئی اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی مشرقی دیوار کھودی گئی تو ایک پاؤں ظاہر ہو گیا۔ لوگوں کو خوف ہوا کہ کہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک پاؤں نہ ہو۔ مگر تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پاؤں ہے۔[۲] واضح رہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی تدفین ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں ہوئی تھی۔

مسجد نبوی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک سے غلط استدلال:

موجودہ وقت میں پوری دنیا میں بزرگان دین، اولیاء اور صالحین کی حقیقی اور مزعومہ قبروں کے پاس جن مشرکانہ اعمال کا ارتکاب ہوتا ہے ان کی روشنی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کو سمجھا جا سکتا ہے جن میں آپ نے قبروں کو عبادت گاہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس بیماری میں جس

[۱] كتاب الجهاد، باب الدفن في قبر واحد: ص ٤٠٦، ح ٤٩

[۲] البداية والنهاية ص ٤٤٣، ج٦، اور صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عروہ نے کہا: اللہ کی قسم یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاؤں مبارک نہیں بلکہ حضرت عمر کا پاؤں ہے۔ حدیث: ۱۳۹۰

سے آپ جاں بر نہ ہو سکے تھے، فرمایا:

((لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ، اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِهِمْ مَسَاجِدَ، قَالَتْ عَائِشَةُ: لَوْلَا ذٰلِكَ لَأُبْرِزَ قَبْرُهُ، خَشِيَ أَنْ يُتَّخَذَ مَسْجِدًا))[1]

"اللہ لعنت فرمائے یہودیوں پر جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو آپ کی قبر نمایاں کردی جاتی۔ مگر خوف ہوا کہ یہ سجدہ گاہ نہ بنالی جائے"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ أُولٰئِكَ إِذَا كَانَ فِيهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ، فَمَاتَ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهِ مَسْجِدًا وَصَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ، أُولٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))[2]

"درحقیقت یہ وہ لوگ تھے کہ اگر ان میں کوئی صالح مرد ہوتا اور وہ مر جاتا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بنا دیتے، اس میں وہ تصویریں بناتے۔ قیامت کے روز یہ بدترین مخلوق ہوں گے"

حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَلَا وَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِهِمْ وَصَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدَ، أَلَا، فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ، إِنِّيْ أَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ))[3]

"خبردار، درحقیقت تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء اور صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے تھے۔ خبردار، قبروں کو سجدہ گاہ مت بنانا، میں تم لوگوں کو اس سے منع کرتا ہوں"

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِيْنَ عَلَيْهَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ))[4]

"اللہ نے لعنت فرمائی ہے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور قبروں پر مسجدیں بنانے

---

[1] صحيح بخاری: ح ٤٤٤١۔ صحيح مسلم ٥٣١۔ نسائی ٢٠٤٦

[2] صحيح بخاری: ح ٤٢٧۔ صحيح مسلم: ح ٥٢٨۔ نسائی ح ٧٠٣۔ مسند امام احمد ٢٤٧٥٦

[3] صحيح مسلم: ح ٥٣٢

[4] ابوداؤد: ح ٣٢٣٦۔ ترمذی ٣٢٠۔ نسائی ٢٠٤٢۔ مسند امام أحمد: ٢٩٨٥، ٣١١٨۔

اور چراغ روشن کرنے والوں پر۔"

رسول اکرم ﷺ کے یہ ارشادات قبروں پر مسجدیں بنانے کی حرمت پر کس قدر واضح ہیں۔ ایسا کرنے والوں کے لیے ان میں کس قدر وعید ہے۔ مگر برا ہو ذہنیتوں کے فتور کا کہ بدعقیدہ لوگوں نے اس ذات اطہر کی قبر مبارک کو قبر پرستی کی دلیل بنا لیا جس کی زبان مبارک سے یہ ارشادات نکلے ہیں۔ کہتے ہیں:

اگر قبروں پر مسجد یا عمارت بنانا اور مسجد میں قبر بنانا حرام ہوتا تو نبی مکرم ﷺ کو مسجد میں دفن نہ کیا جاتا۔" کس قدر مغالطہ آمیز اور گمراہ کن ہے یہ دعویٰ۔ کیونکہ جس شخص کو بھی سیرت پاک کے واقعات کا علم ہے اسے یہ بات معلوم ہوگی کہ مسجد نبوی علی صاحبہ الصلاۃ والسلام قبروں پر نہیں بنائی گئی ہے۔ بلکہ جس جگہ اس کی تعمیر ہوئی وہاں زمین میں مشرکین کی چند پرانی قبریں، کچھ ویرانہ اور کھجور کے کچھ درخت تھے۔ مشرکین کی قبریں اکھڑوادی گئیں۔ ویرانہ برابر کر دیا گیا اور کھجور کے درختوں کو کاٹ کر قبلے کی جانب لگوا دیا گیا۔[1]

اور جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ کو ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں دفن کیا گیا کیونکہ آپ کی وفات وہیں ہوئی تھی۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی روح قبض کی گئی تو لوگوں میں آپ کے دفن کے بارے میں اختلاف ہو گیا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر اختلاف ختم کر دیا:

((سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا مَا نَسِيْتُهُ، قَالَ: مَا قَبَضَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا فِي الْمَوْضِعِ الَّذِي يُحِبُّ أَنْ يُدْفَنَ فِيْهِ. فَادْفِنُوْهُ فِي مَوْضِعِ فِرَاشِهِ))[2]

"اللہ نے ہر نبی کی روح اس جگہ قبض کی ہے جہاں وہ دفن ہونا چاہتا تھا۔ لہٰذا آپ کو آپ کے بستر کی جگہ دفن کرو۔"

امام ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ جس کا سبب یہ بتایا کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس حدیث کے راوی عبدالرحمن بن ابوبکر ملیکی حافظہ کے کمزور تھے۔ مگر امام ترمذی نے یہ

[1] صحیح بخاری: ح ۳۹۳۲ [2] جامع ترمذی: ح ۱۰۱۸

بھی لکھا ہے کہ یہ حدیث ایک سے زیادہ سندوں سے مروی ہے جن میں سے ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عباس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ اسی وجہ سے محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے احکام الجنائز میں لکھا ہے:

''یہ حدیث دوسری سندوں اور شواہد کی وجہ سے ثابت ہے''[1]

بہر حال یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں ہوئی اور اس کا سبب اوپر نقل کردہ حدیث کے علاوہ یہ بھی تھا کہ آپ کی قبر کھلی جگہ نہ ہو جیسا کہ اوپر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں اس کی صراحت ہے تاکہ وہ سجدہ گاہ، بت اور جشن گاہ نہ بننے پائے۔ جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا میں اپنی حیات پاک کے آخری لمحات میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی اور قبروں کو سجدہ گاہ اور مزار بنانے والوں پر لعنت بھیجی تھی۔

اس کے بعد جب خلیفہ راشد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں اور آپ کے بعد تیسرے خلیفہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں مسجد نبوی میں توسیع فرمائی تو حجروں سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ حجرے جوں کے توں باقی رہے اور دوسری طرف سے ان میں توسیع کی گئی۔

اس سے یہ واضح ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین مسجد نبوی میں نہیں بلکہ اس سے باہر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں ہوئی تھی۔ خلفائے راشدین کے عہد میمون میں جب دو بار اس کی توسیع ہوئی تو اس وقت بھی آپ کی قبر مبارک مسجد سے باہر ہی رہی۔ لہٰذا جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد نبوی میں دفن کیا گیا تھا اس لیے مسجدوں میں مردوں کو دفن کرنا جائز ہے۔ وہ اسلام کی بین اور واضح تعلیمات کے ساتھ ساتھ مسلمہ تاریخی حقیقت کو بھی جھٹلانے کا ارتکاب کرتے ہیں۔

البتہ یہ بات صحیح ہے کہ بعد میں جب مسجد نبوی میں توسیع ہوئی تو امہات المومنین کے حجروں کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا اور اس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک بھی مسجد میں داخل ہو گئی۔ مگر چونکہ یہ کام خلفائے راشدین کے عہد مبارک میں نہیں بلکہ اس سے نصف صدی بعد ایک ایسے مسلم حکمران کے ہاتھوں ہوا تھا جو کسی بھی حال میں شرعی دلیل نہیں ہے۔

۸۸ ہجری میں اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک نے مدینہ منورہ میں اپنے گورنر عمر بن عبدالعزیز کو لکھا کہ امہات المومنین کے حجروں کو گرا کر ان کو مسجد نبوی میں شامل کر دیا جائے۔[2] اس طرح قبر مبارک مسجد

---

[1] احکام الجنائز: ص ۱۷٤
[2] البدایہ والنہایہ: ص ٤٤۳، ج ٦

میں آ گئی۔ ۸۸ ہجری میں اگرچہ بعض صحابہ کرام باحیات تھے لیکن اس وقت مدینہ منورہ میں کوئی بھی صحابی نہیں تھا۔ اگرچہ بعض مورخین نے یہ دعویٰ کیا ہے۔

ولید بن عبدالملک کا یہ عمل رسول اکرم ﷺ کے ان تمام ارشادات کے خلاف تھا جن میں آپ نے مسجدوں میں مردوں کو دفن کرنے اور قبروں پر مسجدیں بنانے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((أَنَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى أَنْ يُجَصَّصَ الْقَبْرُ وَأَنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ وَأَنْ يُبْنَى عَلَيْهِ))[1]

"نبی مکرم ﷺ نے قبر کو پختہ کرنے، اس پر بیٹھنے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے"

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر ولید بن عبدالملک کا یہ عمل غلط تھا تو اس وقت کے علماء نے اس کو اس سے منع کیوں نہیں کیا تھا؟ تو اس کے جواب میں ہم بلاخوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ: ولید کا یہ عمل سو فیصد غلط تھا رہی یہ بات کہ اس وقت کے علماء نے اس کو اس عمل سے روکا نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ تاریخ میں صحیح سند سے کوئی ایسا واقعہ مذکور نہیں ہے کہ کسی عالم نے ولید کو امہات المومنین کے حجروں کی جانب سے مسجد نبوی میں توسیع سے منع کیا ہو۔ لیکن اس وقت کے علماء میں حق کے اظہار و اعلان اور باطل کے انکار کی جو بے مثال جرأت تھی اس کی روشنی میں قرین عقل یہی ہے کہ اس وقت کے علماء نے ولید کو ایسا کرنے سے ضرور روکا ہوگا۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ حکام جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر اس کی تنقید کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں ولید تو خیر ان پڑھ تھا لیکن اس کا باپ عبدالملک بن مروان جو زبردست عالم و فاضل اور فقیہ تھا اس نے بھی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے تعمیر کردہ کعبہ مشرفہ کو بلا کسی تحقیق کے محض حجاج کے کہنے پر منہدم کرا کے دوبارہ اس نقشے کے مطابق تعمیر کرا دیا تھا جس کے مطابق عربوں نے اس کی تعمیر کی تھی۔ اور جب اس کو یہ بتایا گیا کہ ابن زبیر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر کعبہ مشرفہ کی تعمیر اپنی خالہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ سننے کے بعد کی تھی کہ رسول اکرم ﷺ کی خود یہ خواہش تھی مگر تعمیر کے مصارف کی کمی اور عہد جاہلیت کے قرب کی وجہ سے آپ نے ایسا نہیں کیا، تو اس نے افسوس کا اظہار کیا تھا۔[2]

بہرحال ولید بن عبدالملک کی توسیع اور پھر اس کے بعد کی توسیعات اور سعودی عہد کی تاریخی توسیع

---

[1] صحیح مسلم: ۹۷۰

[2] صحیح مسلم: ح ۳۲۴۶، ۳۲۴۸۔ الصحیحۃ: ص ۱۰۵، ج ۱، ح ۴۳

کے بعد اگرچہ قبر مبارک مسجد میں داخل ہے لیکن اس طرح کہ وہ مسجد سے الگ ایک مستقل حجرے میں ہے اور دیواروں میں گھری ہوئی ہے۔ اس کو قبلہ سے الگ رکھا گیا ہے بایں طور کہ نماز پڑھتے ہوئے کسی کا منہ اس کی طرف نہیں ہوتا۔

مزید یہ کہ سعودی عہد کے آغاز سے محافظین کا ایک دستہ ہمہ وقت وہاں موجود رہتا ہے جو کسی بھی شخص کو وہاں کوئی خلاف شرع حرکت کرنے سے باز رکھتا ہے۔

لہٰذا مسجد نبوی میں رسول اکرم ﷺ کی قبر مبارک کا ہونا اہل قبور کے لیے کسی بھی حال میں وجہ استدلال نہیں ہو سکتا۔

کشتی نوح کا طواف کعبہ:

یوں تو کائنات میں جتنی چیزیں پائی جاتی ہیں چاہے ان کا تعلق جمادات سے ہو یا نباتات سے وہ ذی عقل ہوں یا غیر ذی عقل، تکوینی طور پر اللہ کی حمد و تسبیح بیان کرتی رہتی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ط ﴾ [الاسراء:٤٤]

"اس کی پاکی تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں جو ان کے اندر ہیں، بیان کر رہی ہیں۔ کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو"

لیکن اللہ تعالیٰ نے جو حسی عبادات فرض کی ہیں ان کے مکلف صرف ذی عقل ہیں۔ جمادات، نباتات اور غیر ذی عقل حیوانات نہ ان کے مکلف ہیں اور نہ اپنے اختیار و ارادے سے حسی طور پر یہ عبادات کرنے پر قادر ہی ہیں۔

ابو الولید ازرقی تاریخ مکہ میں اور حافظ ابن کثیر البدایۃ والنہایہ میں لکھتے ہیں کہ عکرمہ سے روایت ہے اور وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

(۲۲۶)...... كَانَ مَعَ نُوحٍ فِي السَّفِينَةِ ثَمَانُونَ رَجُلًا، مَعَهُمْ أَهْلُوهُمْ، وَأَنَّهُمْ كَانُوا فِي السَّفِينَةِ مِائَةً وَخَمْسِينَ يَوْمًا وَأَنَّ اللّٰهَ تَعَالَى وَجَّهَ السَّفِينَةَ إِلَى مَكَّةَ، فَدَارَتْ بِالْبَيْتِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا، ثُمَّ وَجَّهَهَا اللّٰهُ تَعَالَى إِلَى الْجُودِيِّ۔

"حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں ۸۰ مرد اپنے اہل و عیال کے ساتھ سوار تھے اور کشتی

میں وہ ۱۵۰ دن تک سوار رہے۔ اللہ تعالیٰ نے کشتی کا رخ مکہ کی طرف پھیر دیا جہاں اس نے چالیس روز تک بیت اللہ کا طواف کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا رخ جودی پہاڑ کی طرف پھیر دیا''۔[1]

یہ روایت بالکل من گھڑت ہے جس کا لفظ لفظ اس کے من گھڑت ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی صحیح حدیث میں حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والوں کی تعداد اور ان کے کشتی میں قیام کی مدت بیان نہیں کی گئی ہے رہا کشتی کا طواف بیت اللہ کرنا تو اس کی غیر معقولیت وضاحت کی محتاج نہیں۔

ازرقی کی کتاب تاریخ مکہ اس طرح کی من گھڑت اور بے بنیاد روایتوں سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن حافظ ابن کثیر نے بھی یہ روایت نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ حالانکہ ان کو اس کی نکارت بیان کرنی چاہیے تھی۔

البتہ البدایہ والنہایہ میں بیت عتیق کے ذکر کے موقع پر انہوں نے دوسری چیزوں کے ضمن میں کشتی نوح کے طواف کعبہ کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کو اسرائیلیات سے ماخوذ قرار دیا ہے۔[2]

عوج بن عوق:

قصص الانبیاء کے موضوع پر عربی، فارسی اور اردو میں جو کتابیں ملتی ہیں ان میں ایک افسانوی انسان کا ذکر ملتا ہے جس کا نام عوج بن عنق بتایا گیا ہے۔ لیکن علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے القاموس المحیط میں لکھا ہے کہ صحیح لفظ عوج بن عوق ہے۔ اس شخص کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کے گھر میں پیدا ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک زندہ رہا۔

تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں عوج بن عوق کے درج ذیل اوصاف بیان ہوئے ہیں:

(۲۲۷)......كَانَ طُوْلُهُ ثَلاَثَةَ آلافَ ذِرَاعٍ وَثَلاَثَمِائَةٍ وَثَلاَثَةً وَثَلاَثِيْنَ وَأَنَّ نُوحًا لَمَّا خَوَّفَهُ الْغَرَقَ، قَالَ لَهُ: إِحْمِلْنِيْ فِيْ قَصْعَتِكَ هٰذِهِ وَأَنَّ الطُّوْفَانَ لَمْ يَصِلْ إِلَى كَعْبِهِ وَأَنَّهُ خَاضَ الْبَحْرَ فَوَصَلَ إِلَى حُجْزَتِهِ وَأَنَّهُ كَانَ يَأْخُذُ الْحُوْتَ الشَّمْسِ وَأَنَّهُ قَلَعَ صَخْرَةً عَظِيْمَةً عَلَى قَدْرِ عَسْكَرِ مُوْسَى وَأَرَادَ أَنْ

---

[1] تاریخ مکہ: ص ۷۰، ج ۱، البدایہ والنھایہ: ص ۱۳۳، ج ۱

[2] البدایہ والنھایۃ: ص ۱۸۹، ۱۹۰، ج ۱

مِنْ قَرَارِ الْبَحْرِ فَيَشْوِيهِ فِيْ عَيْنِ يَرْضَخُهُمْ بِهَا، فَطَوَّقَهَا اللّٰهُ فِيْ عُنُقِهِ مِثْلَ الطَّوْقِ۔

"عوج بن عوق کی لمبائی تین ہزار تین سو تینتیس ذراع یعنی ہاتھ تھی (۱۴۲۳ و ۲۱۴۳ میٹر) اور جب نوح علیہ السلام نے اس کو طوفان میں غرق ہونے کا خوف دلایا تو اس نے کہا: مجھے اپنے پیالے (کشتی) میں سوار کر لیجیے۔ اس وقت طوفانِ نوح کا پانی اس کے ٹخنے تک بھی نہیں پہنچا اور جب وہ سمندر میں اترا تو اس کا پانی صرف اس کی کمر تک تھا۔ وہ سمندر کی گہرائی سے مچھلی پکڑ کر قرصِ آفتاب میں بھون لیا کرتا تھا۔ اس نے ایک بہت بڑی چٹان کو جڑ سے اکھاڑ لیا جو موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کے برابر تھی اور اس کو موسیٰ علیہ السلام کے لشکر پر ڈال دینا چاہا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس چٹان کو اس کے گلے میں طوق بنا کر پہنا دیا۔"

یہ جھوٹی روایت ملا علی قاری نے الاسرار المرفوعہ[1] میں، حافظ بغوی نے معالم التنزیل[2] میں، حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ[3] میں، حافظ سیوطی نے الاوج فی خبر عوج[4] میں اور علامہ مرعی بن یوسف کرمی مقدسی نے الفوائد الموضوعہ[5] میں نقل کی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر جو عذاب آیا تھا اس سے صرف وہی لوگ محفوظ رہے تھے جو ان پر ایمان لائے تھے۔ چاہے وہ ان کے اہل بیت ہوں یا ان کی قوم کے مومن افراد۔ قرآن یہ صراحت کرتا ہے کہ ان کی بیوی اور بیٹا کافروں میں شامل تھے۔ لہٰذا اگر عوج بن عوق کا واقعہ صحیح ہوتا تو اس کی ضخامت کے پیش نظر قرآن یا حدیث میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔ یہ بیان کیا جاتا کہ نوح علیہ السلام کے بیٹے کے ساتھ ایسا ضخیم اور طویل القامت انسان بھی سیلاب سے محفوظ نہ رہ سکا۔ دوسرے مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ نہایت سرکش کافر تھا اور حضرت نوح علیہ السلام کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ تو اس کا تباہ ہونا ضروری تھا تاکہ سرکشوں کے لیے عبرت کا باعث ہو۔

حافظ ابن کثیر عوج بن عوق کی خیالی لمبائی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

عوج بن عوق کی یہ لمبائی یاوہ گوئی کے سوا کچھ اور نہیں ہے کیونکہ یہ عقل و نقل کے خلاف ہے۔

---

[1] الاسرار ص ۴۲۵ [2] معالم التنزیل: ص ۶۲۱
[3] البدایہ والنہایہ: ص ۱۳۱، ج ۱ [4] الأوج فی خبر عوج ص ۵۷۳-۵۷۸، ج ۲
[5] الفوائد الموضوعہ: ص ۸۰، ح ۲۲

حدیث میں ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی لمبائی ساٹھ ذراع بتائی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

((خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ وَطُوْلُهُ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا...... فَلَمْ يَزَلِ الْخَلْقُ يَنْقُصُ حَتّٰى الْآنَ))[1]

"اللہ نے آدم کو اس حال میں پیدا کیا کہ ان کی لمبائی ساٹھ ہاتھ (۴و۲۸ میٹر) تھی اس وقت سے انسانوں کی لمبائی گھٹتے گھٹتے ان کی موجودہ لمبائی تک پہنچی ہے"

اس حدیث مبارک نے اس بات کی وضاحت کردی کہ آدم علیہ السلام کی ذریت میں ان سے زیادہ دراز قامت کوئی نہیں پیدا ہوا۔

درحقیقت عوج بن عوق کا قصہ اہل کتاب کے ان ملحدوں اور فاجروں کا گھڑا ہوا ہے جو انبیاء علیہم السلام سے عدوات رکھتے تھے۔

اور ملا علی قاری یہ جھوٹی روایت نقل کرنے کے بعد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تعجب اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے کذاب کی جرأت پر نہیں، بلکہ ان علماء پر ہے جنہوں نے اپنی تفسیروں اور دوسری تصنیفات میں اس کو نقل کیا ہے اور اس کی حقیقت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔

حافظ حسین بن مسعود بغوی کا قول زیادہ قابل تعجب ہے جنہوں نے معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ عوج بن عوق کے بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قتل کیا تھا۔ طوفانِ نوح سے اس کی نجات کا سبب یہ تھا کہ نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کے لیے ساگوان کی لکڑی کی ضرورت تھی جس کو وہ خود نہیں لاسکتے تھے، لہٰذا انہوں نے عوج بن عوق سے مدد لی اور وہ یہ لکڑی شام سے ان کے لیے لایا۔ اس طرح وہ طوفان نوح میں ڈوبنے سے محفوظ رہا''۔

یعنی اس کی اس خدمت کے عوض اللہ تعالیٰ نے اس کے کفر و عناد کے باوجود اس کو طوفان میں ڈوبنے سے محفوظ رکھا۔

ایک جھوٹے واقعہ کی یہ جھوٹی توجیہہ کس قدر عجیب اور قرآن پاک کی اس تصریح کے کس قدر خلاف ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴾ [الاعراف:۷۷]

---

[1] صحیح بخاری: ح ۳۳۲٦، صحیح مسلم: ۷۱٦۳، ۲۸٤۱

''اور ہم نے صرف نوح کی ذریت ہی کو باقی رکھا''

اور اگر عوج بن عوق کا کوئی وجود ہوتا بھی اور اس کی مذکورہ لمبائی کی کوئی حقیقت بھی ہوتی تو اس کی اس فاصلے سے کیا نسبت تھی جو زمین اور سورج کے درمیان پایا جاتا ہے۔ عوج کی افسانوی لمبائی ۲۱۳۳و۲۱ میٹر تھی جبکہ علم فلک اور سائنس کی تحقیق کی رو سے زمین سے سورج کا فاصلہ ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ سورج کا درجہ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ سنٹی گریڈ ہے۔ اس حرارت کا لاکھواں حصہ بھی لوہا اور پتھر نہیں برداشت کرسکتا تو پھر ایک گوشت پوست کا انسان جو سورج کو براہ راست دیکھ نہیں سکتا، اس میں مچھلی کیونکر بھون سکتا اور خود اس کی حرارت سے محفوظ کیسے رہتا ہوگا؟

کیا تمام انسان حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں؟

سورۃ الصفات کی مذکورہ بالا آیت کے ظاہری الفاظ کی بنیاد پر بیشتر مفسرین اس کے قائل ہیں کہ طوفان کے بعد صرف نوح علیہ السلام کی اولاد ہی دنیا میں باقی رہی اور تمام انسان انہی کی اولاد ہیں۔ لیکن قرآن پاک کی دوسری آیات یہ مراد لینے میں مانع ہیں۔ مثال کے طور پر سورۃ الاسراء کی درج ذیل آیت:

﴿ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ﴾ [الاسراء:۳]

''اے ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کرایا تھا، بے شک وہ ایک شکر گزار بندہ تھا''

یہ آیت اس امر میں صریح ہے کہ نزول قرآن کے وقت زمین میں پائے جانے والے انسان حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد اور ان پر ایمان لانے والوں کی اولاد تھے۔ اسی وجہ سے ان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ تم ان لوگوں کی ذریت اور اولاد ہو جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی نوح پر ایمان لانے کی وجہ سے طوفان میں ڈوبنے اور ہلاک ہونے سے محفوظ رکھا۔ لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کو یاد رکھو اور اپنے نبی کی طرح اپنے رب کے شکر گزار بندے بنو۔

دراصل کسی قوم کا نبی ان کا مجازی باپ ہوتا ہے جیسا کہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ، أُعَلِّمُكُمْ، فَإِذَا أَتَى أَحَدُكُمُ الْغَائِطَ فَلَا يَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَلَا يَسْتَدْبِرْهَا ، وَلَا يَسْتَطِبْ بِيَمِينِهِ))[1]

''بلاشبہ میں تمہارے لیے باپ کے درجے میں ہوں اور تمہیں تعلیم دیتا ہوں۔ لہٰذا جب تم

[1] ابوداؤد: ح ۸۔ نسائی ۴۰۔ ابن ماجہ ۳۱۸۔ مسند امام احمد ۳۷۶۲۔ صحیح ابن حبان ۱۴۴۰

میں سے کوئی قضائے حاجت کے لیے جائے تو نہ قبلے کی طرف منہ کرے اور نہ پیٹھ۔ اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت حاصل کرے۔"

مفسرین نے جس حدیث کی بنیاد پر تمام انسانوں کو حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں کی اولاد قرار دیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

(۲۲۸)......سَامُ أَبُو الْعَرَبِ، وَحَامُ أَبُو الْحَبَشِ وَيَافِثُ أَبُو الرُّوْمِ۔

"سام عربوں کے جد امجد، حام حبشیوں کے جد امجد اور یافث رومیوں کے جد امجد ہیں۔"

یہ روایت ضعیف ہے جس کی تخریج امام ترمذی نے سنن[1] میں، حاکم نے مستدرک[2] میں اور امام احمد نے مسند[3] میں حسن بصری کے طریق سے کی ہے۔

سمرہ بن جندب سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:......

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے حسن بصری کا سماع مختلف فیہ ہے اور اگر یہ سماع ثابت بھی ہوتا تو چونکہ وہ مدلس تھے اور انہوں نے یہ حدیث "عنعنہ" سے روایت کی ہے اس لیے ضعیف ہے۔

یہ حدیث دوسرے الفاظ میں بھی مروی ہے:

(۲۲۹)......وُلِدَ لِنُوْحٍ ثَلَاثَةٌ: سَامُ، وَحَامُ، وَيَافِثُ، فَوَلَدُ سَام: الْعَرَبُ وَفَارِسُ وَالرُّوْمُ وَالْخَيْرُ فِيهِمْ، وَوَلَدُ يَافِثَ، يَاجُوْجُ وَمَاجُوْجُ وَالصَّقَالِبَةُ وَلَا خَيْرَ فِيهِمْ، وَوَلَدُ حَامَ: الْقِبْطُ وَالْبَرْبَرُ وَلَا خَيْرَ فِيهِمْ۔

"نوح کے تین بیٹے ہوئے: سام، حام اور یافث۔ سام کی اولاد عرب، اہل فارس اور رومی ہیں، جن میں بھلائی ہے۔ یافث کی اولاد یاجوج ماجوج، ترک اور سلاوی ہیں۔ ان میں کوئی خیر نہیں۔ اور حام کی اولاد قبطی اور بربر ہیں۔ ان میں بھی کوئی خیر نہیں ہے۔"

یہ روایت بھی صحیح نہیں۔ اس کی تخریج حافظ احمد بن عمرو البزار نے مسند[4] میں اور حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق[5] میں محمد بن یزید بن سنان کی سند سے کی ہے:

ہم سے یزید بن سنان نے بیان کیا، کہا: مجھ سے یحییٰ بن سعد نے، سعید بن مسیب سے اور انہوں

---

[1] جامع ترمذی: ح ۳۲۳۱
[2] مستدرك حاكم: ح ۴۰۶۰
[3] مسند امام احمد ح ۲۰۳۵۹
[4] مسند البزار: ح ۲۹
[5] تاريخ دمشق: ص ۳۳۵، ج ۱۷

نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا:

یہ روایت نقل کرنے کے بعد حافظ بزار لکھتے ہیں:

''اس کی روایت میں یزید بن سنان منفرد ہے اور اس سے اس کا بیٹا محمد منفرد ہے۔ دوسروں نے اس کی روایت مرسل کی ہے اور اس کو سعید بن مسیب کا قول قرار دیا ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

حافظ ھیثمی کا قول ہے: یزید کو یحییٰ بن معین اور دوسروں نے ضعیف قرار دیا ہے۔ جبکہ امام ابو حاتم نے اس کی توثیق کی ہے۔

حافظ زین الدین عراقی نے "محجة القرب الی فضل العرب"[1] میں لکھا ہے:

یہ روایت یزید بن سنان کی سند کے علاوہ دوسری سند سے بھی مروی ہے جس کا ذکر امام ابن عدی نے الکامل میں اور حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں اس سند سے کیا ہے۔

''سلیمان بن ارقم، زہری سے روایت کرتا ہے، وہ سعید بن مسیب سے اور وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے۔ سلیمان بن ارقم متروک الحدیث ہے اور ابن عدی نے بھی الکامل میں یزید بن سنان کے ترجمہ کے ضمن میں اس کو متروک قرار دیا ہے۔ امام نسائی کا قول ہے: اس کی روایت کردہ بیشتر حدیثیں غیر محفوظ ہیں اور یزید بن سنان متروک ہے۔

اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث جتنے طرق سے بھی مروی ہے ان میں سے کسی بھی طریق سے صحیح نہیں۔[2]

معلوم ہوا کہ تمام انسانوں کے حضرت نوح علیہ السلام کے تینوں بیٹوں کی نسل سے ہونے کے بارے میں کوئی بھی روایت صحیح نہیں ہے۔ بلکہ کسی بھی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے صرف تین بیٹے طوفان سے محفوظ رہے تھے۔

(۲۳۰)...... إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَا جُوجَ مِنْ وَلَدِ آدَمَ، وَإِنَّهُمْ لَوْ أُرْسِلُوْا إِلَى النَّاسِ لَأَفْسَدُوْا عَلَيْهِمْ مَعَايِشَهُمْ، وَلَنْ يَمُوْتَ مِنْهُمْ اَحَدٌ إِلَّا تَرَكَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِ أَلْفًا فَصَاعِدًا، وَإِنَّ مِنْ وَرَائِهِمْ ثَلَاثَ أُمَمٍ: تَاوِيْلُ، وَتَارِيْسُ وَمَنْسَكُ۔

---

[1] محجّة القرب إلى فضل العرب: ص ٤، ج ١ [2] الضعيفة: ص ١٦٠-١٦١، ج ٨

"یاجوج ماجوج آدم کی اولاد سے ہیں اور ان کو آزاد کر دیا جائے تو وہ لوگوں کے ذرائع معاش کو تباہ کر کے رکھ دیں۔ اور ان میں سے کوئی اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک کہ اپنی ذریت میں سے ایک ہزار یا اس سے زیادہ نہ چھوڑ دے گا اور ان کے پیچھے تین قومیں ہیں تاویل، تاریس اور منسک"

یہ روایت منکر ہے۔ اوپر جو روایت گزری ہے اس میں یاجوج ماجوج کو حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ اس زیر بحث منکر روایت میں ان کے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے!

اس منکر روایت کی تخریج حافظ ابوداود طیالسی نے اپنی مسند[1] میں کی ہے اور انہی کی سند سے حافظ طبرانی نے المعجم الصغیر[2] میں کچھ مختلف الفاظ میں کی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ[3] میں اس روایت کو مسند طیالسی سے اوپر مذکور الفاظ میں نقل کیا ہے اور لکھا ہے:

یہ بے حد ضعیف ہے۔ اس کی سند کمزور ہے اور اس میں شدید نکارت پائی جاتی ہے۔

حافظ ھیثمی نے یہ روایت مجمع الزوائد[4] میں نقل کی ہے۔ لکھا ہے کہ الطبرانی نے اس کی روایت المعجم الکبیر اور المعجم الاوسط میں کی ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

حافظ ھیثمی کی یہ بات صحیح نہیں ہے اور اس میں دو علتیں پائی جاتی ہیں:

(۱) اس روایت کی سند کا ایک راوی، وہب بن جابر مجہول ہے۔ کیونکہ اس کو ابن حبان کے سوا کسی اور نے ثقہ نہیں قرار دیا۔ ابن حبان نے وہب بن جابر سے روایت کرنے والے صرف ایک راوی ابواسحاق سبیعی کا ذکر کیا ہے۔ اسی وجہ سے امام ذہبی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

امام ابن مدینی نے اس کو مجہول بتایا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ تقریباً غیر معروف ہے اور اس سے یہ حدیث روایت کرنے میں ابواسحاق منفرد ہے۔

(۲) اب رہا ابواسحاق سبیعی تو اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا اور اس روایت کی سند میں اس سے غلطی ہو گئی ہے۔

---

[1] مسند طیالسی: ح ۲۲۸۲ [2] المعجم الصغیر: ص ۲۷۲، ج۹، ح ۸۵۹۳
[3] البدایہ والنہایہ: ص ۵۱۲، ج۱ [4] مجمع الزوائد: ص ۶، ج۸

محدث البانی مزید لکھتے ہیں:

اس روایت کی تیسری علت اس کا موقوف ہونا ہے۔[1]

واضح رہے کہ قرآن پاک میں صرف دو مقام پر یاجوج ماجوج کا ذکر آیا ہے اور وہ بھی اجمال کے ساتھ۔ اسی طرح کسی صحیح حدیث میں ان کی کوئی تفصیل بیان نہیں ہوئی ہے۔

حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ[2] میں امام ابن جریر طبری کے قول: رسول اللہ ﷺ اسراء کی رات ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو اللہ پر ایمان کی دعوت دی تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا اور آپ کی اتباع سے پہلوتہی کی۔ پھر آپ نے وہاں موجود دوسری قوموں تاریس، تاویل اور منسک کو دعوت دی تو انہوں نے یہ دعوت قبول کر لی...... تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ واقعہ موضوع اور جھوٹ ہے۔

(۲۳۱)......يَاجُوْجُ أُمَّةٌ وَمَاجُوْجُ أُمَّةٌ، كُلُّ أُمَّةٍ أَرْبَعُ مِئَةِ أَلْفٍ، لا يَمُوْتُ الرَّجُلُ حَتَّى يَنْظُرَ إِلَى أَلْفِ ذَكَرٍ بَيْنَ يَدَيْهِ مِنْ صُلْبِهِ، كُلٌّ قَدْ حَمَلَ السِّلَاحَ۔ قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! صِفْهُمْ لَنَا۔ قَالَ:

هُمْ ثَلَاثَةُ أَصْنَافٍ: صِنْفٌ مِنْهُمْ أَمْثَالُ الأَرْزِ۔ قُلْتُ: وَمَا الأَرْزُ؟ قَالَ: شَجَرٌ بِالشَّامِ، طُوْلُ الشَّجَرَةِ عِشْرُوْنَ وَمِئَةُ ذِرَاعٍ فِي السَّمَاءِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: هٰؤُلَاءِ لا يَقُوْمُ لَهُمْ جَبَلٌ وَلَا حَدِيْدٌ۔ وَصِنْفٌ مِنْهُمْ يَفْتَرِشُ بِأُذُنِهِ وَيَلْتَحِفُ بِالأُخْرَى، لا يَمُرُّوْنَ بِفِيْلٍ وَلَا وَحْشٍ وَلَا جَمَلٍ وَلَا خِنْزِيْرٍ إِلَّا أَكَلُوْهُ، وَمَنْ مَاتَ مِنْهُمْ أَكَلُوْهُ، مُقَدِّمَتُهُمْ بِالشَّامِ وَسَاقَتُهُمْ بِخُرَاسَانَ، يَشْرَبُوْنَ أَنْهَارَ الْمَشْرِقِ وَبُحَيْرَةَ طَبَرِيَّةَ۔

''یاجوج ایک امت ہے اور ماجوج ایک امت۔ ہر امت کی تعداد چار لاکھ ہے۔ ان میں سے کوئی اس وقت تک نہیں مرتا جب تک کہ وہ اپنی صلب سے ایک ہزار مردوں کو اپنے سامنے نہ دیکھ لے جو سب کے سب ہتھیار اٹھانے کے قابل ہوں۔

میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم سے ان کا وصف بیان فرما دیجیے۔ فرمایا: ان کی تین

[1] الضعیفہ: ص ۱۵۹-۱۶۰، ج۹ [2] البدایہ والنہایہ: ص ۵۱۲، ج۱

قسمیں ہیں: ان کی ایک قسم توارز کی مانند ہے۔ میں نے عرض کیا: ارز کیا ہے؟ فرمایا: شام میں ایک قسم کا درخت۔ ایک درخت کی لمبائی فضاء میں ۱۲۰ ہاتھ (۸و۶۷ میٹر) ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان کی راہ میں نہ کوئی پہاڑ رکاوٹ بن سکے گا اور نہ لوہا۔"

ان میں سے دوسری قسم وہ ہے جو اپنے ایک کان کو بچھاتی ہے اور دوسرے کو اوڑھتی ہے۔ یہ لوگ جب کسی ہاتھی، وحشی جانور، اونٹ یا سور کے پاس سے گزرتے ہیں تو اس کو کھا جاتے ہیں اور جو ان میں سے مرتا ہے اس کو بھی کھا لیتے ہیں۔ ان کی فوج کا اگلا حصہ شام میں ہوگا اور پچھلا حصہ خراسان میں۔ وہ مشرق کی نہروں اور بحیرۂ طبریہ کا پانی پی جائیں گے۔"

یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج امام عبداللہ بن عدی نے الکامل[1] میں اور انہی کے طریق سے امام ابن الجوزی نے الموضوعات[2] میں، حافظ طبرانی نے المعجم الاوسط[3] میں اور ابوالحسن واحدی نے الوجیز[4] میں یحییٰ بن سعید عطاء کی سند سے کی ہے:

ہم کو محمد بن اسحاق نے اعمش سے، انہوں نے شقیق بن سلمہ سے اور انہوں نے حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے خبر دی۔ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے یاجوج و ماجوج کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا......

حافظ طبرانی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

اس کی روایت اعمش سے صرف محمد بن اسحاق نے اور محمد بن اسحاق سے صرف یحییٰ بن سعید عطار نے کی ہے۔ یحییٰ بن سعید عطار ضعیف ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب[5] میں لکھا ہے اور فتح الباری[6] میں اس کو بے حد ضعیف قرار دیا ہے۔

اور اس کا شیخ محمد بن اسحاق عکاشی اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ امام ابن عدی نے اس کے ترجمہ کے ضمن میں اس کی روایت کردہ حدیثوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

"یہ سب منکر اور موضوع ہیں"

---

[1] الکامل: ص ۱۶۹، ج ٦ [2] الموضوعات: ص ۳۳۱، ۳۳۲، ج ۱، ح ٤١٦

[3] المعجم الأوسط: ص ۵۰۹-۵۱۰، ج ٤، ح ۳۸٦۷

[4] الوجیز: ص ۱۹۳، ج ۱ [5] تقریب التهذیب: ترجمه: ۷۵۵۸

[6] فتح الباری: ص ۳۱۹۲، ج ۳

اور امام ابن الجوزی نے لکھا ہے:

محمد بن اسحاق جو عکاشی ہے، اس کو امام ابن معین نے کذاب قرار دیا ہے۔

یاجوج ماجوج سے کون سی قوم مراد ہے؟

قرآن پاک میں جن شخصیتوں، افراد اور جماعتوں کا ذکر مجملاً آیا ہے جیسے: اہل کہف، حضرت خضر علیہ السلام ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج، ان کے بارے میں قدیم مفسرین اور مؤرخین نے بہت کچھ لکھا ہے اور ان کے تعین کے لیے بہت ریسرچ اور بڑی تحقیق کی ہے مگر کوئی مفسر یا مؤرخ یہ ثابت نہیں کر سکا ہے کہ ان سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس میدان میں ریسرچ اور تحقیق کا کام عصر حاضر میں بھی ہوا ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ لیکن کوئی بھی تحقیق ایسی نہیں ہے اور نہ آئندہ ہوگی جس کو حرف آخر کہا جا سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان شخصیتوں اور افراد کا تعلق امور غیب سے ہے۔ جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے یا اللہ تعالیٰ کے بتانے سے رسول اکرم ﷺ کو حاصل تھا۔ لیکن مذکورہ شخصیتوں اور افراد کے بارے میں چونکہ قرآن پاک کی طرح صحیح احادیث میں بھی کوئی تفصیل نہیں بیان ہوئی ہے اس لیے تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں ان کے بارے میں موجودہ تفصیلات یا تو اہل کتاب سے ماخوذ ہیں یا لوگوں کے ذہنوں کی پیداوار ہیں۔

جہاں تک زیر بحث قوم یاجوج ماجوج کا تعلق ہے تو قرآن پاک میں ان کا ذکر جس سیاق وسباق میں آیا ہے اس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج کوئی فوق الفطرت لوگ نہیں ہیں بلکہ وہ اولاد آدم ہی سے تعلق رکھتے ہیں البتہ وہ مفسر لوگ ہیں۔ جس زمانے میں ذوالقرنین ان کے علاقے میں پہنچے تھے اس وقت ان کی ہمسایہ ایک دوسری قوم ان کے شر وفساد سے بے حد پریشان تھی اور وہ ایسے وسائل و ذرائع سے محروم تھی جن کے ذریعہ وہ اپنا دفاع کر سکے۔ یاجوج ماجوج یا تو جسمانی طور پر ایسے طاقت ور تھے کہ وہ جب چاہتے اس قوم کو اپنی زیادتیوں اور اپنے شر وفساد کا نشانہ بنا دیتے یا ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کی ہمسایہ قوم ان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے پر قادر نہ تھی۔ وہ جب چاہتے ان پر چڑھ دوڑتے۔ اسی وجہ سے انہوں نے ذوالقرنین سے یہ درخواست کی کہ وہ ان دو پہاڑوں کے درمیانی خلا کو بند کر دیں جس سے ہو کر یاجوج ماجوج ان پر حملہ کرتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کمزور قوم کا علاقہ یاجوج ماجوج کے علاقے سے الگ تھا اور ان دونوں کے درمیان بلند پہاڑ حائل تھے۔ کسی جگہ دو پہاڑوں کے درمیان ایک درہ یا خلا موجود تھا۔ کمزور قوم نے ذوالقرنین اور ان کے لاؤ لشکر کو دیکھ کر جہاں

یہ اندازہ لگالیا کہ وہ ان کی مدد کر سکتا ہے وہیں اس کو ذوالقرنین اور اس کی عظیم فوج کی نقل وحرکت سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ لوگ مفسد نہیں بلکہ شریف اور صالح لوگ ہیں ورنہ وہ ذوالقرنین سے ایسی مدد کی درخواست نہ کرتے یہ ساری باتیں قرآن پاک کی صرف ایک آیت میں نہایت اعجاز کے ساتھ بیان کردی گئی ہیں۔ ارشادالٰہی ہے:

﴿ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمْ سَدًّا ﴾ [الکہف:۹۴]

”ان لوگوں نے کہا: اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج زمین میں فساد پھیلانے والے لوگ ہیں، تو کیا ہم تجھے اس غرض کے لیے کچھ اجرت ادا کریں کہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک بند بنادے۔“

چونکہ ذوالقرنین ایک مصلح اور خدا ترس بادشاہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے جو مال و دولت دے رکھی تھی اس پر قانع تھا اس لیے ان کی پیش کش کے جواب میں کہا:

﴿ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴾

”(ذوالقرنین نے) کہا: میرے رب نے مجھے جو کچھ مال و اقتدار دے رکھا ہے وہ بہت ہے۔ تم (جسمانی) طاقت کے ذریعہ میری مدد کرو میں تمہارے اور ان کے درمیان کوئی دیوار بنادوں گا۔“ [الکہف:۹۵]

اس طرح ذوالقرنین نے ان دونوں پہاڑوں کے درمیانی خلا کو ایک نہایت مضبوط آہنی دیوار سے بند کردیا جس کی بلندی پہاڑوں کے برابر تھی اور جس پر چڑھنا اور اس میں نقب لگانا ان کے لیے ممکن نہ رہا اور وہ کمزور اور مظلوم قوم یاجوج ماجوج کے شر سے اس وقت تک کے لیے محفوظ ہوگئی جب تک اللہ چاہے۔ ارشادالٰہی ہے:

﴿ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ﴾ [الکہف:۹۷، ۹۸]

”پس وہ (یاجوج ماجوج) نہ تو اس پر چڑھ سکتے تھے اور نہ اس میں نقب ہی لگا سکتے تھے۔ (ذوالقرنین نے) کہا: یہ میرے رب کی رحمت ہے اور جب میرے رب کے وعدے کا

وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوند خاک کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے۔"

کیا یاجوج ماجوج ابھی تک بند ہیں؟

سورۃ الکہف کی مذکورہ آیت سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ ذوالقرنین نے دو پہاڑوں کے درمیان جو دیوار بنائی تھی اس پر چڑھنا یا اس میں سوراخ کرنا اس وقت یاجوج ماجوج کی قدرت میں نہیں تھا۔ لیکن مذکورہ آیت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آئندہ بھی وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ بلکہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۹۶ میں تو یہ صراحت ہے کہ جب یاجوج ماجوج کھول دیے جائیں گے اور آزاد کر دیے جائیں گے تو وہ ہر طرف سے نکل پڑیں گے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ۝ ﴾

"یہاں تک کہ جب یاجوج ماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے نکل پڑیں گے"[الانبیاء:۹٦]

اس آیت مبارکہ میں یاجوج ماجوج کے جس نکلنے یا خروج کی خبر دی گئی ہے وہ ان کا عمومی خروج ہوگا جس پر ...... "مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ" ...... کا فقرہ دلالت کرتا ہے۔ مگر اس آخری اور عمومی خروج سے پہلے ان کے کسی خروج کی اگرچہ قرآن پاک یا کسی صحیح حدیث میں خبر نہیں دی گئی ہے لیکن صحیح حدیث میں سد ذوالقرنین میں شگاف پڑنے کی خبر دی گئی ہے۔ چنانچہ ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن ان کے پاس خوف زدہ حالت میں یہ فرماتے ہوئے تشریف لائے:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ، فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَاجُوْجَ وَمَا جُوْجَ مِثْلُ هٰذِهِ، وَحَلَّقَ بِإِصْبَعَيْهِ الْإِبْهَامَ وَالَّتِيْ تَلِيْهَا))[1]

"اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے۔ عربوں کے لیے اس برائی کی وجہ سے بربادی ہے جو قریب آ گئی ہے۔ یاجوج ماجوج کے بند سے آج اس کی مانند سوراخ ہو گیا ہے۔ آپ نے انگوٹھے اور اس سے ملی ہوئی دونوں انگلیوں سے حلقہ بنایا۔"

یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں سد ذوالقرنین میں اتنا سوراخ ہو گیا تھا جس کی مقدار آپ نے انگوٹھے اور انگشت شہادت سے حلقہ بنا کر واضح فرمائی۔

---

[1] صحیح بخاری: ح ۷۱۳۵۔ صحیح مسلم: ح ۲۸۸۰

تفسیر "تیسیر الکریم الرحمن فی تفسیر کلام المنان" کے مصنف علامہ عبدالرحمن بن ناصر سعدی تحریر فرماتے ہیں:

یہ حدیث اس امر میں صریح ہے کہ جس دن نبی اکرم ﷺ نے یہ بات فرمائی اس دن یاجوج ماجوج کے نکلنے کے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ اس وقت سے ان میں برابر وسعت ہوتی رہی اور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد چاہے تمثیل ہو جس کے ذریعہ آپ نے یہ حقیقت ذہنوں سے قریب کرنی چاہی ہو کہ انہوں نے بند سے نکلنے اور زمین میں پھیل جانے کی ابتدا کر دی ہے یا حدیث کا مطلب یہ ہو کہ یاجوج ماجوج کا بند اس وقت اس مقدار میں کھل گیا تھا اور اس میں برابر اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ پوری دیوار زمیں بوس ہو گئی۔[1]

علامہ سعدی اپنی اس رائے میں منفرد نہیں ہیں۔ بلکہ دوسرے علمائے اسلام نے بھی اس طرح کی رائے پیش کی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے مشہور محدث علامہ محمد انور کشمیری رحمہ اللہ متوفی ۱۳۵۲ھ صحیح بخاری کی شرح فیض الباری میں لکھتے ہیں:

سد ذوالقرنین اس وقت پیوند خاک ہو چکا ہے اور قرآن میں یہ وعدہ نہیں ہے کہ وہ یاجوج ماجوج کے خروج تک باقی رہے گا۔ اور ایسی بھی کوئی خبر نہیں ہے کہ سد ان کے نکلنے کی راہ میں حائل رہے گا بلکہ ایسی بات محض وہم وخیال کی پیداوار ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ..... اس دن ہم ان کو چھوڑ دیں گے کہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں" اور...... حَتَّى إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ "حتیٰ کہ جب یاجوج ماجوج کھول دیے جائیں گے" سے معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج بار بار نکلتے رہے ہیں۔ وہ پہلے بھی نکل چکے ہیں اور زمین میں ایسا فساد مچا چکے ہیں جس سے پناہ مانگی چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ آخری زمانے میں ان کا وہ خروج ہوگا جس کا وعدہ کیا جا چکا ہے اور یہ خروج سب سے زیادہ تباہ کن ہوگا۔ قرآن میں یہ نہیں آیا ہے کہ ان کا یہ آخری خروج سد کے زمیں بوس ہونے کے معاً بعد ہوگا بلکہ قرآن میں صرف سد کے زمین بوس ہونے کی خبر ہے اور اس وعدے کے بموجب وہ زمیں بوس ہو چکا ہے۔ رہی یہ بات کہ سد کے زمیں بوس ہونے کے فوراً بعد بلا کسی فاصلے کے ان کا خروج ہوگا تو اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں ہے۔[2]

ڈاکٹر شفیع ماحی احمد نے اپنی کتاب یاجوج وماجوج، فتنۃ الماضی والحاضر والمستقبل میں لکھا ہے:

---

[1] فتنہ الدجال و یأجوج و ماجوج: ص ۷۹

[2] بحوالہ فتنہ الدجال و یاجوج ماجوج: ص ۵۵

قرب قیامت کے زمانے میں اپنے آخری خروج سے پہلے یاجوج ماجوج اپنے اصلی وطن "منگولیا" سے سات مرتبہ نکل چکے ہیں اور وہ تاریخ میں متعدد ناموں سے معروف رہے ہیں۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں آشوریوں کے ہاں وہ سیتھین Scythians کے نام سے معروف رہے۔

تیسری صدی قبل مسیح میں چینی علماء نے ان کو "ہسیونو" Hsinun-nu کا نام دیا۔

یورپی علماء چوتھی صدی عیسوی میں ان کو ھیون Hun کے نام سے یاد کرتے رہے۔

قرآن کریم میں ان کا ذکر یاجوج و ماجوج کے نام سے کیا گیا ہے۔

تیرہویں صدی عیسوی میں مسلمان، چینی اور یورپی مؤرخین نے ان کا ذکر مغل اور تاتاریوں کے نام سے کیا ہے۔[1]

علامہ عبدالرحمٰن سعدی کی تحقیق یہ ہے کہ "یاجوج ماجوج" "اَجَّ يَؤُجُّ اَجًّا وَاَجِيجًا سے مشتق ہے جس کے معنی تیزی اور سرعت سے چلنے اور حرکت کرنے کے ہیں۔ اگر اس کا فاعل آگ ہو تو بھڑک اٹھنے کا مفہوم نکلتا ہے۔ اس تناظر میں یاجوج ماجوج یفعول اور مفعول کے وزن پر صفت ہے۔ لکھتے ہیں:

یاجوج ماجوج کے صفت ہونے کی بنا پر اس کا "اسم جنس" ہونا اولیٰ ہے۔[2]

کیا تاتاری یاجوج ماجوج تھے؟

امام ابن جریر طبری، حافظ ابن اثیر اور حافظ ابن کثیر وغیرہ نے یاجوج ماجوج سے ترکوں، مغلوں اور تاتاریوں کو مراد لیا ہے۔ ان کے نزدیک ان کی اصل ایک ہے اگرچہ بعد میں ان کی کئی شاخیں ہوگئی ہوں۔ علامہ سعدی کے نزدیک یاجوج ماجوج کا اصلی وطن اگرچہ منگولیا اور مشرقی ترکستان تھا لیکن صفت میں اشتراک کی وجہ سے روسی، چینی، امریکی اور فرنگی سب پر یاجوج ماجوج کا اطلاق ہوتا ہے۔ انہوں نے سورۃ الانبیاء کی آیت: "حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ" میں وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ اور وہ ہر بلندی سے نکل پڑیں گے، سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ صفت عام ہے جو مذکورہ قوموں پر منطبق ہوتی ہے۔ اور عملاً بھی وہ ہر طرف سے دنیا میں پھیل چکے ہیں اور ہر جگہ کے لوگوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔[3]

علامہ سعدی رحمہ اللہ نے یاجوج ماجوج کے مسئلے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ جس سے ان کا

---

[1] یاجوج وماجوج ص ۵ [2] فتنه الدجال ویأجوج و ماجوج: ص ۹۳

[3] فتنه الدجال و یاجوج و ماجوج: ص ۷۶

تشخص باقی نہیں رہا اور انہوں نے ان کو مخصوص قوم کی بجائے اسم جنس قرار دے کر ان میں دنیا کی تقریباً ساری قوموں کو شامل کرنے کی جو سعی کی ہے وہ بڑی دور از کار انہ لگتی ہے۔ اگر وہ سورۃ الانبیاء کی مذکورہ آیت پر صحیح مسلم میں مروی حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کی حدیث کی روشنی میں غور کرتے تو وہ اس دور از کار مبالغہ آرائی سے بچ جاتے۔ اور ان کے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی کہ مذکورہ آیت میں یاجوج ماجوج کے جس ہمہ جہت خروج کی خبر دی گئی ہے اس کا تعلق قرب قیامت کے زمانے سے ہے۔ ان کا یہ خروج ان کو ان کے آخری انجام کو پہنچا دے گا۔ چنانچہ حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو طویل حدیث روایت کی ہے اس میں دجال کے ذکر کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

((فَبَيْنَمَا هُوَ كَذٰلِكَ إِذْ أَوْحَى اللّٰهُ إِلَى عِيسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ: إِنِّي قَدْ أَخْرَجْتُ عِبَادًا لِي، لَا يَدَانِ لِأَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ، فَحَرِّزْ عِبَادِي إِلَى الطُّورِ، وَيَبْعَثُ اللّٰهُ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ، وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ، فَيَمُرُّ أَوَائِلُهُمْ عَلَى بُحَيْرَةِ طَبَرِيَّةَ، فَيَشْرَبُونَ مَا فِيهَا، وَيَمُرُّ آخِرُهُمْ فَيَقُولُونَ: لَقَدْ كَانَ بِهٰذِهِ، مَرَّةً، مَاءٌ، وَيُحْصَرُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيسٰى وَأَصْحَابُهُ، حَتّٰى يَكُونَ رَأْسُ الثَّوْرِ لِأَحَدِهِمْ خَيْرًا مِنْ مِائَةِ دِينَارٍ لِأَحَدِكُمُ الْيَوْمَ، فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيسٰى وَأَصْحَابُهُ، فَيُرْسِلُ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ النَّغَفَ فِي رِقَابِهِمْ، فَيُصْبِحُونَ فَرْسٰى كَمَوْتِ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ، ثُمَّ يَهْبِطُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيسٰى وَأَصْحَابُهُ إِلَى الْأَرْضِ، فَلَا يَجِدُونَ فِي الْأَرْضِ مَوْضِعَ شِبْرٍ إِلَّا مَلَأَهُ زَهَمُهُمْ وَنَتْنُهُمْ، فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيسٰى وَأَصْحَابُهُ إِلَى اللّٰهِ، فَيُرْسِلُ اللّٰهُ طَيْرًا كَأَعْنَاقِ الْبُخْتِ، فَتَحْمِلُهُمْ فَتَطْرَحُهُمْ حَيْثُ شَاءَ اللّٰهُ، ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ مَطَرًا لَا يَكُنُّ مِنْهُ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ، فَيَغْسِلُ الْأَرْضَ حَتّٰى يَتْرُكَهَا كَالزَّلَفَةِ......))[1]

"اسی اثناء میں اللہ عیسیٰ علیہ السلام کو وحی کرے گا کہ میں نے اپنے ایسے بندے نکال دیے ہیں جن سے لڑنے کی کسی کے اندر طاقت نہیں ہے، لہٰذا تم میرے بندوں کو بحفاظت لے کر طور چلے جاؤ۔ اور اللہ یاجوج ماجوج کو بیدار کر دے گا اور وہ ہر بلندی سے نکل کر پھیل جائیں گے

[1] صحیح مسلم: ح ۷۳۷۳-۲۹۳۷

ان کا ہراول دستہ بحیرۂ طبریہ پر سے گزرے گا تو اس کا سارا پانی پی جائے گا اور ان کا پچھلا دستہ وہاں سے گزرے گا تو کہے گا کہ یقیناً یہاں پانی تھا۔ اور اللہ کے نبی اور ان کے ساتھیوں کو روک رکھا جائے گا۔ حالت یہ ہو جائے گی کہ ان میں سے کسی کے لیے بیل کا سر آج تم میں سے کسی کے لیے سو دینار سے بہتر ہوگا، پس اللہ کے نبی عیسیٰ اور ان کے ساتھی دعا کریں گے اور اللہ ان پر ان کی گردنوں میں کیڑے پڑنے کی بیماری نازل فرما دے گا۔ تو وہ یکبارگی ہلاک ہو جائیں گے۔ پھر اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی زمین پر اتر آئیں گے اور انہیں زمین میں ایک بالشت بھر جگہ ایسی نہ ملے گی جو ان کی سڑی گلی لاشوں اور ان کی بدبو سے پاک ہو۔ اللہ کے نبی اور ان کے ساتھی اللہ سے دعا کریں گے تو اللہ اونٹوں کی گردنوں کی مانند پرندے بھیج دے گا جو ان کو اٹھا کر ایسی جگہ پھینک دیں گے جہاں اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ ایسی بارش بھیج دے گا جس سے مٹی کا مکان یا اونٹ کے بالوں کا خیمہ کوئی بھی محفوظ نہ رہ سکے گا اور وہ بارش زمین کو دھو کر آئینہ کی مانند کر دے گی۔"

اس حدیث سے تین چیزیں بصراحت معلوم ہوتی ہیں:

(۱) یاجوج ماجوج کا خروج حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول اور ان کے ہاتھوں دجال کی ہلاکت کے بعد ان کی موجودگی میں ہوگا۔

(۲) یاجوج ماجوج سے لڑنے کی طاقت اس وقت کسی کے اندر نہیں ہوگی اس لیے اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دے گا کہ وہ اپنے ساتھیوں یعنی مسلمانوں کو لے کر طور پر چلے جائیں۔ واضح رہے کہ دجال کی ہلاکت کے بعد یہودیت اور عیسائیت کا خاتمہ ہو جائے گا اور صرف اسلام باقی رہ جائے گا۔

(۳) یاجوج ماجوج کی تعداد بہت زیادہ ہوگی یہاں تک کہ وہ بحیرۂ طبریہ کا سارا پانی پی جائیں گے۔

اور جن احادیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی خبر دی گئی ہے جہاں وہ تواتر کے درجے کو پہنچی ہوئی ہیں وہ اس امر میں صریح ہیں کہ وہ قرب قیامت کے زمانے میں نازل ہوں گے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَيُوشِكَنَّ أَنْ يَنْزِلَ فِيكُمُ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا، فَيَكْسِرَ الصَّلِيبَ وَيَقْتُلَ الْخِنْزِيرَ، وَيَضَعَ الْجِزْيَةَ، وَيَفِيضَ الْمَالُ حَتَّى لَا يَقْبَلَهُ أَحَدٌ حَتَّى تَكُونَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا))

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ضرور اتریں گے تمہارے درمیان ابن مریم حاکم عادل بن کر۔ پھر وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے، خنزیر کو ہلاک کر دیں گے اور جزیہ ختم کر دیں گے۔ مال کی اتنی کثرت ہوگی کہ اس کو کوئی قبول نہیں کرے گا اور حالت یہ ہوگی کہ ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا''۔[1]

اس حدیث میں صلیب توڑ دینے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے سے یہ مراد ہے کہ عیسائیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ چونکہ تمام ملتیں بھی ختم ہو جائیں گی اور صرف اسلام باقی رہ جائے گا اس لیے جزیہ کا خاتمہ بھی کر دیں گے۔ بعض روایتوں میں الجزیہ کے بجائے ''الحرب'' جنگ کا لفظ ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کوئی کسی سے جنگ نہیں کرے گا۔

ایک دوسری حدیث میں رسول اکرم ﷺ نے قیامت سے پہلے جن دس نشانیوں کا ذکر فرمایا ہے ان میں سے ایک یاجوج ماجوج کا ظہور بھی ہے۔ چنانچہ حضرت حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی مکرم ﷺ ہمارے پاس اس حال میں تشریف لائے کہ ہم آپس میں گفتگو کر رہے تھے، آپ نے فرمایا: کس چیز کا ذکر کر رہے ہو؟ عرض کیا: ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔ فرمایا:

((اِنَّهَا لَنْ تَقُوْمَ حَتّٰى تَرَوْنَ قَبْلَهَا عَشْرَ آيَاتٍ۔ فَذَكَرَ الدُّخَانَ، وَالدَّجَّالَ وَالدَّآبَّةَ وَطُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَنُزُوْلَ عِيْسٰى ابْنِ مَرْيَمَ وَيَاْجُوجَ وَمَاْجُوجَ، وَثَلَاثَةَ خُسُوْفٍ: خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ وَخَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ وَخَسْفٌ بِجَزِيْرَةِ الْعَرَبِ وَآخِرُ ذٰلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ اِلٰى مَحْشَرِهِمْ))[2]

''قیامت اس وقت تک ہرگز نہ قائم ہوگی جب تک کہ تم اس سے پہلے دس نشانیاں نہ دیکھ لو اور آپ نے دھویں، دجال، دابۃ الارض، سورج کے مغرب سے طلوع ہونے، عیسیٰ علیہ السلام کے نزول، یاجوج ماجوج، تین خسف (زمین کا دھنس جانا) ایک مشرق میں دوسرا مغرب میں، تیسرا جزیرۃ العرب میں۔ اور ان سب کے آخر میں ایک آگ کا ذکر کیا جو یمن سے نکلے گی اور لوگوں کو ہانکتی ہوئی محشر کی طرف لے جائے گی۔''

---

[1] صحیح بخاری: ح ۲۲۲۲، ۲۴۷۶، ۳۴۴۸، ۳۴۴۹۔ صحیح مسلم ح ۳۸۹۔۱۵۵

[2] صحیح مسلم: ح ۷۲۸۵، ۲۹۰۱۔ ابوداؤد: ح ۴۳۱۱

اس حدیث سے بھی بصراحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج کا خروج قیامت سے بالکل قریبی زمانے میں ہوگا۔

بعض صحیح حدیثوں میں ایسی قوم کا ضرور ذکر آیا ہے جس سے قیامت سے پہلے مسلمانوں کی لڑائی ہوگی اور اس قوم کے کچھ ظاہری اوصاف بھی بیان ہوئے۔ لیکن ان حدیثوں میں اس قوم کو یاجوج ماجوج نہیں کہا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی تُقَاتِلُوا التُّرْكَ صِغَارَ الْأَعْيُنِ، حُمْرَ الْوُجُوْهِ، ذُلْفَ الْأُنُوْفِ. كَأَنَّ وُجُوْهَهُمُ الْمَجَانُّ الْمُطْرَقَةُ، وَلَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی تُقَاتِلُوْا قَوْمًا نِعَالُهُمُ الشَّعْرُ))[1]

”قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم ان ترکوں سے جنگ نہ کرلو گے جن کی آنکھیں چھوٹی، چہرے سرخ اور ناک بیٹھی ہوئی ہوگی۔ ان کے چہرے تہ در تہ ڈھال کی طرح ہوں گے۔ اور قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک ایسی قوم سے جنگ نہ کرلو گے جن کے جوتے بالوں والے چمڑے کے ہوں گے“

اس حدیث میں قیامت کی آمد سے پہلے جس قوم سے مسلمانوں کی جنگ کی خبر دی گئی ہے اس سے یاجوج ماجوج کو مراد لینا اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جبکہ کتاب وسنت میں ان کا کوئی ایسا ظاہری وصف بیان کیا گیا ہو جو مذکورہ حدیث میں بیان کردہ قوم کے وصف کے مطابق ہو۔ جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن پاک یا احادیث میں یاجوج ماجوج کا کوئی ظاہری وصف بیان ہی نہیں کیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ان کو ”مفسد“ کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ صحیح احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفسد ہونے کے ساتھ ساتھ یاجوج ماجوج کی تعداد بہت زیادہ ہوگی اور وہ اتنے طاقت ور ہوں گے کہ مسلمانوں کے اندر ان سے لڑنے کی طاقت نہیں ہوگی۔

رہے تاتاری تو ان کے ہاتھوں مسلمانوں کی جو تباہی ہوئی ہے اور انہوں نے مسلمانوں کا جس طرح قتل عام کیا اس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ انہوں نے لاکھوں مسلمانوں کو نہایت بے دردی سے ہلاک کردیا۔ بخارا، سمرقند، رے، ہمدان، زنجان، قزوین، مرو اور نیشاپور کو تباہ کرکے رکھ دیا۔ ۶۵۶ ہجری میں دنیائے اسلام کے دارالخلافت اور اس دور کے سب سے بڑے علمی مرکز اور متمدن شہر بغداد کی اینٹ

[1] صحيح بخاري: ٢٩٢٨۔ صحيح مسلم: ٧٣١٠، ٢٩١٢۔ ابوداؤد: ح ٤٣٠٤

سے اینٹ بجا دی۔ عباسی خلیفہ مستعصم کو نہایت بے دردی سے قتل کر دیا۔ مشہور مورخ اور محدث حافظ عز الدین ابو الحسن علی بن محمد ابن اثیر رحمہ اللہ متوفی ۵۵۵ھ نے اپنی مشہور تاریخ ''الکامل فی التاریخ'' میں تاتاریوں کے ہاتھوں ہونے والی تباہی و بربادی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

میں کئی برس تک اس پس و پیش میں رہا کہ اس واقعہ کا ذکر کروں یا نہ کروں۔ آخر کون ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی موت کی داستان قلم بند کرے اور کس کے لیے یہ آسان ہے کہ وہ ان کی ذلت و رسوائی بیان کرے۔ کاش میں پیدا نہ ہوا ہوتا۔ کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر جاتا اور بھولی بسری کہانی بن چکا ہوتا۔ لیکن بعض دوستوں نے مجھے یہ واقعہ لکھنے پر آمادہ کیا، پھر بھی مجھے تردد رہا۔ پھر مجھے خیال ہوا کہ اس واقعہ کو نہ لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ حادثہ ایسی سنگین نکبت اور ایسی عظیم مصیبت سے عبارت ہے جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس کی لپیٹ میں پوری خلائق آئی اور خاص طور پر مسلمان اس سے دو چار ہوئے۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ از آدم تا ایں دم ایسا واقعہ اس دنیا میں پیش نہیں آیا ہے تو اس کا یہ دعویٰ سچا ہوگا۔ اس لیے کہ تاریخوں میں اس واقعہ کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا۔[1]

تاتاریوں کی ہیبت اور مسلمانوں کی وحشت کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ اگر ایک تاتاری ایک گلی میں گھستا جہاں سو مسلمان ہوتے تو ان میں سے کسی کو اس کے مقابلے کی ہمت نہ ہوتی۔ وہ ایک ایک کر کے سب کو قتل کر دیتا۔ یہاں تک کہ ان کا ناقابل شکست ہونا ایک اٹل حقیقت بن چکا تھا۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس بظاہر ناقابل شکست قوم کو ایمان و عزم صادق سے بھرپور مسلمانوں کی ایک مختصر سی فوج نے ایسی شکست فاش دی کہ تاتاریوں کا نام و نشان تک مٹ گیا۔

اس وقت کے سلطان مصر الملک المظفر سیف الدین قطز کے کانوں میں تاتاریوں کی تباہ کاریوں کی خبریں پہنچ رہی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ مصر بھی ان کے نشانے پر ہے اس لیے اس نے تاتاریوں کا لقمہ تر بننے کی بجائے یہ فیصلہ کیا کہ قبل اس کے تاتاری مصر پر حملہ کریں وہ خود ان پر حملہ کر دے۔ اس نے اپنے فیصلہ کو اس طرح عملی جامہ پہنایا کہ ۲۵ رمضان ۶۵۸ ہجری مطابق ۱۲۶۰ء کو مصر کی اسلامی فوج لے کر جانب شام نکل کھڑا ہوا اور ارض فلسطین کے مشہور تاریخی مقام ''عین جالوت'' پر ٹڈی دل تاتاری فوج سے جا ٹکرایا۔ تاتاریوں کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ کوئی ایسی فوج دنیا میں موجود ہے جو ان

---

[1] الکامل فی التاریخ: ص ۱۹۰۳

سے ٹکر لے سکتی ہے۔ چونکہ وہ کئی سالوں سے مسلمانوں کو ہر جگہ پیٹتے چلے آ رہے تھے اس لیے مصر کی اس اسلامی فوج کے حملے نے ان کو حواس باختہ کر دیا۔ سابق تجربوں کے برخلاف عین جالوت کے معرکے میں مسلمانوں نے ان کو شکست فاش دے دی جس کے بعد وہ بری طرح بھاگنے لگے۔ اس چیز نے مصریوں کا حوصلہ کافی بڑھا دیا اور انہوں نے تاتاریوں کا تعاقب کر کے کثرت سے ان کو قتل کیا اور بہت بڑی تعداد میں ان کو گرفتار بھی کیا۔

مسلمان کے ہاتھوں تاتاریوں کی اس عبرتناک شکست نے ان کی ذہنیت بدل کر رکھ دی اور وہ مسلمانوں سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ ان کے دین یعنی اسلام میں داخل ہونے لگے۔

اوپر کی وضاحتوں سے بھی یہ معلوم ہوا کہ جن مؤرخین نے تاتاریوں کو یاجوج ماجوج قرار دیا ہے ان کی بات بھی قرآن پاک اور صحیح احادیث سے مطابقت نہیں رکھتی۔

مسلمانوں کی نکبت کے اسباب:

علامہ عبدالرحمٰن سعدی نے اپنے رسالے ''فتنۃ الدجال و یاجوج ماجوج'' میں چینیوں، روسیوں، امریکیوں اور فرنگیوں کو یاجوج ماجوج قرار دیا ہے۔ جہاں تک ان کی قوموں کی اسلام دشمنی کا مسئلہ ہے تو یہ بات بالکل درست ہے کہ عصر حاضر میں صرف وہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ دوسری قومیں بھی اسلام کے خلاف متحد ہو چکی ہیں۔ لیکن صرف اس کی وجہ سے ان تمام قوموں کو یاجوج ماجوج قرار دینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ اگر یہ بات درست ہوتی تو ان صحیح احادیث میں ان قوموں کو یاجوج ماجوج کہنے میں کیا چیز مانع تھی جن میں مسلمانوں کی مغلوبیت بیان ہوئی ہے اور یہ خبر دی گئی ہے کہ تمام قومیں مسلمانوں کے خلاف متحد ہو جائیں گی اور ایک ساتھ ان پر پل پڑیں گی۔ چنانچہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يُوْشِكُ الْأُمَمُ اَنْ تَدَاعَى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْاَكَلَةُ إِلَى قَصْعَتِهَا، فَقَالَ قَائِلٌ: وَمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: بَلْ اَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ! وَلَيَنْزَعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ وَلَيَقْذِفَنَّ اللّٰهُ فِي قُلُوْبِكُمُ الْوَهْنَ" فَقَالَ قَائِلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَمَا الْوَهْنُ؟ قَالَ: حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ"[1]

---

[1] ابوداؤد: ح ٤٢٩٧۔ الصحیحہ: ص ٦٤٧، ج٢، ح ٩٥٨

''قریب ہے کہ قومیں تم پر ٹل پڑنے کے لیے ایک دوسری کو دعوت دیں گی جس طرح کھانے والے ایک دوسرے کو کھانے کے پیالے کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ایک کہنے والے نے کہا: کیا ایسا ہماری قلت تعداد کی وجہ سے ہوگا؟ فرمایا: ''بلکہ تم بہت زیادہ ہوگے۔ لیکن سیلاب کے جھاگ کی طرح جھاگ ہوگے۔ اللہ تمہارے دشمنوں کے سینوں سے تمہاری ہیبت اور رعب کو نکال دے گا۔ اور تمہارے دلوں میں وہن کمزوری ڈال دے گا۔'' پوچھنے والے نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہن کیا ہے؟ فرمایا: ''دنیا کی محبت اور موت سے نفرت''

یہ حدیث درحقیقت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں مسلمان اپنی صحیح تصویر دیکھ سکتے اور ان اسباب کو بھی معلوم کرسکتے ہیں جنہوں نے ان کو اس شرمناک حالت تک پہنچایا ہے۔

آج مسلمان تعداد میں بہت زیادہ ہیں، مگر بے وزن، بے قیمت اور بے ثبات۔ ''غثاء کغثاء السیل'' سیلاب کے جھاگ کی طرح ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد مبارک ''ایک پیشین گوئی'' ہے جس کا لفظ لفظ موجودہ دور کے مسلمانوں پر صادق آرہا ہے۔

موجودہ دور کے مسلمانوں، خاص طور پر ان مسلمانوں پر جن کے آباء و اجداد دعوت اسلامی کے اولین مخاطب تھے، دولت کی بارش ہورہی ہے اور ایسی کوئی دنیاوی نعمت نہیں ہے جو ان کو حاصل نہ ہو یا وہ اس سے محروم ہوں۔ پھر آخر اس قدر بے وزن اور بے قیمت کیوں ہو چکے ہیں؟

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر مسلموں بلکہ اسلام دشمنوں میں اپنی دھاک اور اپنا رعب و دبدبہ قائم رکھنے کے لیے جو واضح تعلیمات دی تھیں ان کو انہوں نے بھلا دیا اور اسلام دشمنوں کو اپنا دوست بنالیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴾ [الانفال:٦٠]

''اور تم لوگ جہاں تک تمہاری استطاعت ہو، ان کے مقابلے کے لیے طاقت اور تیار، بندھے رہنے والے گھوڑے تیار رکھو۔ تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے دشمنوں کو خوف زدہ رکھو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ

کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدلہ تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا۔"

اس آیت کی تفسیر میں علامہ عبدالرحمٰن بن ناصر سعدی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

اپنے کفار دشمنوں کے لیے جو تمہیں ہلاک کرنے اور تمہارے دین کے ابطال کے درپے ہیں۔ اپنی طاقت بھر قوت تیار کرو۔ یعنی عقلی قوت، جسمانی قوت اور مختلف النوع اسلحہ جات۔ جو دشمن کے خلاف جنگ میں تمہارے کام آئیں۔ کفار کے خلاف اس تیاری میں وہ تمام صنعتیں داخل ہیں جن سے اسلحہ اور آلات حرب بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً توپیں، مشین گنیں، بندوقیں، جنگی طیارے، بری اور بحری سواریاں، دفاعی قلعہ بندیاں، مورچے اور دیگر دفاعی آلات حرب۔ اسی طرح اس تیاری میں فوجی حکمت عملی اور سیاست کاری میں مہارت پیدا کرنا بھی داخل ہے...... اور گھوڑوں کو تیار رکھ کر "تیاری" کرنے کا مقصد دشمن کو مرعوب اور خوف زدہ رکھنا بتایا گیا ہے۔ اس حکم کی علت اس زمانے میں بھی موجود ہے۔ یعنی دشمن کو مرعوب اور خوف زدہ رکھنا۔ اگر دنیا میں ایسے آلات اور سامان حرب موجود ہوں جن کے ذریعہ سے دشمن کو مذکورہ چیزوں سے زیادہ خوف زدہ رکھا جاسکتا ہو۔ یعنی گاڑیاں اور جنگی طیارے تو ان کو حاصل کر کے ان کے ذریعہ سے جنگی استعداد بڑھانا فرض ہے۔ حتیٰ کہ اگر اس سامان حرب کی صنعت کو تعلیم کے بغیر حاصل کرنا ناممکن ہو تو یہ تعلیم حاصل کرنا بھی فرض ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے صرف ان لوگوں کو خوف زدہ رکھنے کے لیے جنگی تیاری کرنے کا حکم نہیں دیا ہے جن کی اللہ اور مسلمانوں سے دشمنی عیاں ہے۔ بلکہ ان کو بھی خوف زدہ رکھنے کا حکم دیا ہے جن کی دشمنیاں مخفی ہیں۔ مگر اس واضح اور صریح حکم کے باوجود ان لوگوں کو دوست بنا لیا گیا جو اسلام اور مسلمانوں کے سبب سے بڑے دشمن ہیں اور جن کی ہر نقل و حرکت اسلام کی جڑ کاٹنے اور مسلمانوں کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے ہے۔

طلوع اسلام کے وقت کفار مکہ نے اسلامی دعوت کی مخالفت اس وجہ سے کی کہ یہ دعوت اس مشرکانہ طریقے کے بالکل خلاف تھی جس پر وہ اپنے باپ دادا کے زمانے سے عمل پیرا تھے۔ لیکن جب ان کو حق کی معرفت حاصل ہو جاتی تو اس کی پیروی کرنے لگتے۔

یہود و نصاریٰ تو ایک نبی کی بعثت کے منتظر تھے۔ جس نبی کے منتظر تھے وہ توریت و انجیل کے مطابق محمد ﷺ تھے۔ مگر یہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی انہوں نے اسلام کی مخالفت مشرکین مکہ سے زیادہ

---

[1] تیسیر الکریم الرحمن: ص ۳۶۸

کی اور اُس وقت سے لے کر آج تک اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کی عداوت و دشمنی میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ جبکہ مسلمانوں نے اپنے طویل دور اقتدار میں اہل کتاب ہونے کے ناطے یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہمیشہ منصفانہ برتاؤ کیا اور ان پر کسی طرح کا ظلم نہیں ہونے دیا۔ لیکن اس حسن سلوک کے باوجود وہ ہمیشہ آستین کے سانپ بنے رہے۔ جب بھی موقع ملا مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے سے دریغ نہ کیا۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ محض خیال آرائی نہیں بلکہ ایسے حقائق ہیں جن کا تجربہ مسلمانوں کو آغاز و اسلام سے اب تک مختلف شکلوں میں ہوتا آ رہا ہے۔ قرآن نازل کرنے والے نے تو اہل کتاب سے تعلقات استوار کرنے میں احتیاط برتنے کی تاکید اسی دن کر دی تھی جب مدینہ میں اسلامی معاشرہ تشکیل پا رہا تھا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِھِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ھٰٓاَنْتُمْ اُولَاۗءِ تُحِبُّوْنَھُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّھٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْھُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِھَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُھُمْ شَـيْـــًٔـا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ ﴾ [آل عمران:۱۱۸ تا ۱۲۰]

”اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے سوا دوسرے مذاہب والوں کو اپنا راز دار مت بناؤ۔ وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ تمہاری کلفت و مشقت انہیں عزیز ہے۔ ان کے دلوں کا بغض ان کے مونہوں سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ انہوں نے اپنے سینوں میں چھپا رکھا ہے وہ زیادہ سنگین ہے۔ ہم نے اپنی ہدایات تم سے کھول کر بیان کر دی ہیں اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ یہ تو تم ہو جو ان سے محبت رکھتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں رکھتے۔ اور تم ساری کتابوں کو مانتے ہو۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لائے اور جب تم سے جدا ہو کر آپس میں ملتے ہیں تو تم پر غصہ کی وجہ سے اپنی انگلیاں کاٹ ڈالتے ہیں۔ ان سے کہہ دو اپنے غصے میں مر مٹو۔ اللہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک سے واقف ہے۔ اگر تمہیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو اس سے ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور اگر تم کو

کوئی گزند پہنچتا ہے تو اس پر وہ خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر تم صبر کرو گے اور اللہ کا تقوی اختیار کرو گے تو ان کی چال بازی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے‘‘

کس قدر واضح اور دوٹوک اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جو چودہ سو سال قبل یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوا اور آج بھی ان پر سو فیصد صادق آ رہا ہے۔ یہودی اور عیسائی مذہبی پیشواؤں، ارباب اقتدار اور اصحاب علم و دانش کی زبانوں پر وقفے وقفے سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو زہر افشانیاں ہوتی رہتی ہیں ان سے اسلام اور مسلمانوں کے ان کے دلوں میں چھپے کینہ و بغض کی سنگینی کا اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں۔

لیکن کتاب و سنت کی ان واضح تنبیہات اور اہل کتاب کی طویل خونی تاریخ کے باوجود مسلم رہنما انہی اسلام دشمنوں کو اپنا نجات دہندہ بنائے ہوئے ہیں۔ انہی کے اشاروں پر چلتے ہیں اور کھانے پینے کی اشیاء سے لے کر کمالیات اور اپنے تحفظ و دفاع کے آلات اور فوجی ساز و سامان تک ہر چیز انہی سے خریدتے ہیں۔

رسول اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں جو اسلامی ریاست بنائی تھی وہ متعدد آزمائشوں سے گزر کر اپنے پیروں پر کھڑی ہو چکی تھی۔ غزوۂ بدر، غزوۂ احد غزوۂ خندق، غزوۂ بنو نضیر اور غزوۂ بنو قریظہ میں مسلمان جہاں شجاعت و بہادری کے جوہر دکھا چکے تھے وہیں وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے اپنی سچی محبت اور دین کی راہ میں ایثار و قربانی کے نہایت تابناک نمونے بھی پیش کر چکے تھے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک ایسی اصول ہدایت دی جو ان کے تشخص کو برقرار رکھنے اور مسلم معاشرے کو اہل کتاب کی شرانگیزیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے بے حد ضروری تھی۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۝ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ۝ ﴾

[المائدۃ:۵۱، ۵۲]

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور نصرانیوں کو اپنا دوست مت بناؤ وہ آپس میں

ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا دوست بنائے گا تو اس کا شمار انہی میں ہوگا۔ درحقیقت اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ تم ان کو جن کے دلوں میں روگ ہے، دیکھتے ہو کہ وہ انہیں میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں کہتے ہیں کہ ہمیں یہ خوف ہے کہ ہمیں کوئی مصیبت نہ آلے۔ تو بہت ممکن ہے کہ اللہ فتح یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے تو انہیں اس چیز پر جو یہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں ندامت ہو۔"

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جس وقت یہ حکم دیا تھا اس وقت وہ ایسی طاقت نہیں بنے تھے کہ وہ اپنے آپ کو گردو پیش کی غیر مسلم طاقتوں سے محفوظ تصور کریں۔ ان کو نہ تو کوئی فوجی طاقت حاصل تھی اور نہ ان کی تعداد ہی بہت زیادہ تھی اور خود مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے اندر منافقین کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی جو مسلمانوں کے برعکس یہود و نصاریٰ سے ہمدردی رکھتے تھے اور محض مسلمانوں کی پیہم کامیابیوں اور فتوحات کی وجہ سے انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ ورنہ دل سے وہ مسلمانوں سے سخت پرخاش رکھتے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ صریح اور دوٹوک حکم دیا کہ یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ۔

اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کو مخلص دوست بنانے سے منع فرمایا ہے۔ البتہ ان سے تعلقات رکھنے اور معاملات کرنے سے منع نہیں کیا ہے۔ قرآن پاک میں اولیاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اولیاء ولی کی جمع ہے۔ ولی...... مخلص اور قریبی دوست کو کہتے ہیں۔ ان کو دوست نہ بنانے کا سبب یہ بتایا ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! یہود و نصاریٰ تمہارے دوست نہیں ہیں اور نہ ہوسکتے ہیں۔ وہ تو صرف آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں ایسی صورت میں ان کو دوست بنانا تمہارے حق میں سخت تباہ کن ہوسکتا ہے کیونکہ دوستی دوطرفہ ہوتی ہے اور اس کا سوتا دل سے پھوٹتا ہے۔ لہٰذا جو جذبات وہ تمہارے لیے رکھتے ہیں اگر وہی جذبات تم ان کے لیے رکھو تو تم ان سے تعلقات رکھ سکتے ہو اور ان کے ساتھ معاملات بھی کرسکتے ہو مگر اپنی آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھ کر۔

قرآن کے اعجاز پر غور کیجیے کہ جس وقت یہ آیتیں نازل ہوئی تھیں اس وقت بھی یہ حالات کے مطابق تھیں اور آج اپنے نزول پر چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی حالات کے پہلے سے زیادہ مطابق ہیں۔ البتہ ان عناصر نے مسلمانوں کے خیر خواہ کا روپ دھار لیا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے آیت نمبر ۵۲ میں "دلوں کا روگی" قرار دیا ہے، جو نزول قرآن کے وقت "منافقین" کے نام سے جانے جاتے تھے لیکن

آج ان کو نام عاقبت اندیش، امن پسند اور صلح جو وغیرہ رکھ دیا گیا ہے۔ جبکہ صحیح العقیدہ والمسلک مسلمانوں کو دہشت گرد، تشدد پسند اور تخریب کار کا نام دے دیا گیا ہے۔

اوپر حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں رسول اکرم ﷺ نے مسلمانوں کی جس نکبت اور ان کی جس بے وزنی اور بے ثباتی کی پیشین گوئی فرمائی ہے آج کا مسلمان اس کی سچی تصویر پیش کر رہا ہے۔ اوپر جو قرآنی آیات پیش کی گئی ہیں وہ بیانگ دہل یہ اعلان کر رہی ہیں کہ مسلمانوں کی یہ حالت خود ان کی اپنی پیدا کردہ ہے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی واضح ہدایات پر عمل کرتے اور رسول اکرم ﷺ کی سیرت پاک کو نمونہ عمل بنائے رکھتے تو ان کی یہ حالت کبھی نہ ہوتی۔

﴿ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ۝ ﴾ [الرعد:۱۱]

"اس (انسان) کے آگے اور پیچھے اس کے ایسے نگراں لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ درحقیقت اللہ کسی قوم کے حال کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف اور اپنے اعمال نہ بدل لے۔ اور جب اللہ کسی قوم کے اعمال بد کا برا بدلہ اس کو دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کو ٹالنے والا کوئی نہیں ہوتا اور نہ ایسی شامت زدہ قوم کا کوئی مددگار ہی ہو سکتا ہے"

مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے بلکہ انسانوں کا خالق علیم وخبیر اللہ ان کی تمام حرکات و سکنات سے واقف ہے اور اس نے ہر شخص کے ساتھ ایسے نگراں لگا رکھے ہیں جو اس کے تمام اقوال اور اعمال کو ریکارڈ کرتے ہیں اور اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اللہ کی جو سنت اس دنیا میں جاری وساری ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو انعام و اکرام سے اس وقت تک نہیں نوازتا جب تک کہ وہ اپنے حسن عمل سے اپنے آپ کو اس کا مستحق نہ ٹھہرا لے۔ اسی طرح جب تک کوئی اپنی بدعقیدگی اور بدعملی سے ذلت ونکبت کا مستحق نہیں بن جاتا اس وقت تک وہ اللہ تعالیٰ کی حمایت وحفاظت میں رہتا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ آج مسلمان اپنی کثرت تعداد اور مال و دولت کی فراوانی کے باوجود جس ذلت ونکبت سے دوچار ہیں وہ درحقیقت ان کے اعمال بد کی پاداش ہے۔ مسلمانوں نے اپنے رب کی تعلیمات وہدایات کو پس پشت ڈال دیا، اس کی عطا کردہ نعمتوں اور صلاحیتوں کو تعیش میں ضائع کر رہے ہیں۔ اپنے اور اللہ کے

دشمنوں کو اپنا حامی وسرپرست اور جگری دوست بنالیا ہے۔ ان کے ارشادوں پر مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو ذبح کر رہے ہیں۔ کتاب وسنت کی صریح اور واضح تعلیمات کی تاویلیں کر کے ان کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہیں، ایسی صورت میں ان کا جو انجام ہونا چاہیے تھا وہ ہو رہا ہے۔ دشمنوں کے دلوں سے ان کا رعب ودبدبہ اور ہیبت وخوف نکل چکا ہے اور ان کو جس طرح چاہتے ہیں استعمال کر رہے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام

مکی دور کا وہ آخری زمانہ جو ہجرت مدینہ سے متصل تھا نبی اکرم ﷺ اور آپ کے جان نثار ساتھیوں کے لیے حد درجہ روح فرسا اور حوصلہ شکن تھا۔ رسول اکرم فداہ ابی وامی ﷺ کے چچا ابو طالب اور غمگسار بیوی ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی یکے بعد دیگرے وفات نے قریش مکہ کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف بہت دلیر اور جری بنا دیا تھا۔ ہجرت مدینہ سے متصل زمانے تک پہنچتے پہنچتے وہ یہ ناپاک منصوبہ بنانے لگے تھے کہ نعوذ باللہ نبی مکرم ﷺ کو شہید کر دیں۔

شدید ابتلا وآزمائش کے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ یوسف نازل فرمائی جو اس اعتبار سے قرآن پاک کی ایک منفرد سورت ہے کہ اس میں کسی نبی کا مکمل قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ان کے ساتھ کسی اور نبی کا قصہ شامل نہیں ہے۔ پھر یہ قصہ قرآن کی کسی اور سورت میں دہرایا بھی نہیں گیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کی ایک اور انفرادیت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ''احسن القصص'' بہترین قصہ یا سرگذشت سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس سورت کے اول تا آخر مطالعہ سے اس قصہ کو احسن القصص قرار دیے جانے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اور اس وقت مکہ کے حالات میں نمایاں مماثلت پائی جاتی تھی۔

برادران یوسف نے اپنے معصوم اور فرشتہ صفت بھائی کے خلاف جو ناپاک سازش کی تھی اور ان سے گلو خلاصی کے لیے جو گندا منصوبہ بنایا تھا اور پھر جس انسانیت سوز طریقے سے ان کو لے جا کر ایک اندھے کنویں میں پھینک دیا تھا، ٹھیک ویسا ہی کچھ کفار مکہ بھی کر رہے تھے۔ جبکہ وہ برادران یوسف کی طرح نبی اکرم ﷺ سے نسب اور خون کا تعلق رکھتے تھے اور بقول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما قریش کے گھرانوں میں سے کوئی بھی گھرانہ ایسا نہ تھا جس سے رسول اللہ ﷺ کی کوئی قرابت واری نہ رہی ہو۔''[1]

دعوتِ اسلامی کے اس نہایت صبر آزما اور حوصلہ شکن مرحلے میں اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم سورت نازل کر کے مسلمانوں کو دو نہایت اہم پیغام دیے۔

---

[1] صحیح بخاری: ح ٤٨١٨

(۱) اہل حق بظاہر کتنے ہی کمزور و بے سہارا کیوں نہ ہوں اور اہل باطل کو جو طاقت وشوکت بھی حاصل ہو انجام کار فتح و کامرانی اہل حق کے لیے ہے اور باطل کا انجام شکست وریخت ہے۔ اس طرح حضرت یوسف علیہا السلام کا قصہ سنا کر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ تسلی دی ہے کہ وہ ابتلاء وآزمائش سے پست ہمت نہ ہوں اور یاس وقنوطیت کو اپنے قریب نہ آنے دیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ وہ دن دور نہیں جب فتح ونصرت ان کے ہمرکاب ہوگی۔ حق کامیاب ہوگا اور باطل کو شکست ہوگی۔ اہل باطل رسول اللہ ﷺ سے عفو ودرگزر کی بھیک مانگیں گے۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکیزہ سیرت، ابتلاء وآزمائش کی راہ میں ان کی غیر معمولی استقامت اور ثابت قدمی کی مثال پیش کر کے مسلمانوں کو اللہ عزوجل نے یہ تلقین فرمائی ہے کہ وہ راہ حق میں ثابت قدم رہیں اور اس راہ میں آنے والی آزمائشوں پر نہ دل شکستہ ہوں اور نہ حرف شکایت زبان پر لائیں۔ جس طرح اس کے عظیم بندے یوسف علیہ السلام نے ایک ایک کر کے تمام آزمائش جھیل ڈالیں اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔ نہ کبھی مصائب وآلام کے ہجوم پر ہمت ہاری۔ کم سنی میں جب پیار ومحبت کے محتاج تھے، ظالم بھائیوں نے اذیتیں دیں اور آبادی سے بہت دور لے جا کر ایک تاریک کنویں میں پھینک دیا مگر وہ صبر کا پہاڑ بنے رہے۔ نہ کوئی شور مچایا اور نہ کوئی واویلا کیا۔ جوانی کی عمر کو پہنچے تو ان کی عصمت وعفت کا ایسا امتحان لیا گیا جو ان سے پہلے کسی کا نہیں لیا گیا تھا۔ شیطان نے معصیت کو خوب بنا سنوار کر ان کے سامنے پیش کیا لیکن وہ عصمت وعفت اور پاکیزگی کا مضبوط پہاڑ بنے رہے۔ نہ ان کے دل میں برائی کا کوئی خیال پیدا ہوا اور نہ ان کے قدم ڈگمگائے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو حسن صورت اور حسن سیرت دونوں سے وافر مقدار میں نوازا تھا۔

جہاں تک حسن صورت کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے حسن وجمال کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ تنہا ان کو اور بقیہ آدھا حصہ قیامت تک پیدا ہونے والوں میں تقسیم کر دیا۔[1]

رہا حسنِ سیرت تو وہ اللہ کے نبی تھے۔ جس کی علامتیں ان کے کردار کے ذریعے بچپن ہی سے ظاہر ہونے لگی تھیں۔ ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔'' اور ان کا خواب سن کر ان کے نبی باپ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے نبی ہونے کی پیشین گوئی بھی کر دی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے حسنِ صورت، حُسنِ سیرت اور اپنی شرافت ونجابت کی وجہ سے اپنے والد

[1] صحیح مسلم: ح ۴۱۱

کو زیادہ محبوب تھے۔ اس محبوبیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا خواب سن کر حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ توقع تھی کہ وہی ان کی نبوت کے وارث ہوں گے۔ لیکن اپنے والد کی نظر میں ان کی یہ محبوبیت ان کے سوتیلے بھائیوں کے دلوں میں کانٹا بن کر چبھ رہی تھی۔ بجائے اس کے کہ سارے اپنے والد کی نگاہ میں محبوب بننے کے لیے اپنی سیرت و کردار کو درست کرتے انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے راستے سے ہٹا دینے کا فیصلہ کر ڈالا اور اپنے بوڑھے باپ کا کچھ خیال نہ کیا۔

جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے شیطان صفت سوتیلے بھائیوں نے ان کو گھر سے دور لے جا کر ایک اندھے کنویں میں ڈالنا چاہا اسی وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کو بذریعہ وحی یہ تسلی دی کہ ہماری تائید وحمایت تیرے ساتھ ہے اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ ''تو ان کے اس کالے کرتوت کی ان کو خبر دے کر'' ان کو شرمسار کرے گا جس سے اس وقت یہ بے خبر ہیں۔

اس طرح وہاں سے گزرنے والے ایک قافلے نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکال لیا اور ان کو مصر لے جا کر فروخت کر دیا۔

قرآن پاک میں یہ صراحت نہیں ہے کہ جس وقت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا گیا اور پھر اس سے نکال کر ان کو مصر میں فروخت کیا گیا اس وقت ان کی عمر کیا تھی؟ اور نہ کسی صحیح حدیث میں اس کا ذکر آیا ہے۔ لیکن قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپ ۱۲۔۱۳ سال کے بچے رہے ہوں گے۔ کیونکہ جب ان کے بھائیوں نے اپنے باپ سے ان کو اپنے ساتھ لیجانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ '' کہیں اس کو بھیڑیا نہ کھا جائے۔''

بہر حال جب یوسف علیہ السلام ایک غلام کی حیثیت سے عزیز مصر کے گھر میں داخل ہوئے اس وقت وہ بچے تھے۔ اسی گھر میں جوان ہوئے۔ عزیز مصر کے گھر میں وہ جس آزمائش سے گزرنے والے تھے اس کے ذکر سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرما دیا کہ: ''جب وہ بھرپور جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس کو قوت فیصلہ اور علم عطا کیا'' یہ ایسے دو ہتھیار ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول لیس ہوتے رہے ہیں۔ قرآن پاک میں حضرت لوط، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے بارے میں بھی یہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم اور علم سے نوازا۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کو حکم اور علم عطا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا: اسی طرح ہم نیکو کاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔

عزیز مصر کی بیوی ایک ''بدکار'' عورت تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام اس کے سامنے جوان ہوئے تھے

اور اس کے زر خرید غلام بھی تھے۔ اس لیے اس نے ان سے اپنی جنسی خواہش پوری کرنی چاہی۔ آغاز امر میں اس نے اس غرض کے لیے اشارے کنائے کی زبان استعمال کی۔ قرآن میں اس کے لیے جو لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے معنی ہیں: کسی مقصد کے لیے نرمی سے پھسلانا، ورغلانا اور ڈورے ڈالنا وغیرہ۔ لیکن یوسف علیہ السلام کے اوپر اس کی ان حرکتوں کا کوئی اثر نہ ہوا یعنی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ قرآن میں اس کے لیے "استعصم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں: شدت کے ساتھ گناہ سے باز رہنا۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اشارے کنائے کی زبان سنی ان سنی کر دی تو عزیز مصر کی بیوی نے قصر کے دروازے بند کر دیے اور حیا و شرم کی ردا اتار کر بولی: "آ جا"

اس موقع پر یوسف علیہ السلام نے فرمایا: معاذ اللہ" میں اس برے کام سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

اس صریح اور دوٹوک جواب پر اس نے یہ ارادہ کیا کہ وہ ان کو اپنے ساتھ بدکاری پر آمادہ کرنے کے لیے کوئی عملی اقدام کرے۔ ادھر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے دل میں یہ ارادہ کیا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ مزاحمت کریں گے۔ مگر اس حالت میں جبکہ سامنا نہایت بدکار اور بے شرم عورت سے ہو، مزاحمت سے سنگین نتائج نکلنے کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ وہ عورت مقصد میں ناکامی پر اپنے کپڑے پھاڑ سکتی تھی اور اپنے کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے کوئی بھی حرکت کر سکتی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ اور محبوب بندے کے دل میں یہ خیال (برہان) ڈال دیا کہ وہ دروازے کی طرف بھاگیں۔ اسی لمحے کہ جب وہ دروازے کی طرف بھاگے ان کے پیچھے وہ بھی بھاگی اور ان کو روکنے کے لیے پیچھے سے ان کا کرتہ پکڑ کر زور سے کھینچا اور وہ پھٹ کر ان کی بے گناہی کی ایک اہم دلیل دے گیا۔ عین اسی وقت قصر کا دروازہ کھل گیا اور سامنے عزیز مصر کھڑا ملا۔ یہ سب کچھ لمحوں میں ہو گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکیزگی کے امتحان و آزمائش کا ایک نہایت خطرناک مرحلہ بخیر و خوبی گزر گیا۔

عزیز مصر کا سامنا ہوتے ہی اس کی بیوی نے اپنے چہرے پر معصومیت کا نقاب ڈال لیا اور سارا قصور حضرت یوسف علیہ السلام پر ڈال دیا۔ کہنے لگی:

جس نے تمہاری بیوی کے ساتھ برے کام کا ارادہ کیا اس کی سزا کیا ہے؟ کیا یہی نہیں کہ اس کو قید کر دیا جائے یا المناک سزا دی جائے؟

یہاں اگر یوسف علیہ السلام اس کے اس جھوٹے الزام پر خاموش رہتے تو یہ اعتراف گناہ ہوتا اس لیے فرمایا:

اس نے مجھے بدکاری پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے عزیز مصر کی بیوی کے اہل خانہ ہی میں سے ایک ایسے شخص کو درمیان میں ڈال دیا جو منصف اور حق شناس تھا۔ اس نے یہ گواہی دی کہ اگر یوسف کا کرتہ آگے سے پھٹا ہو تو زیادتی اس نے کی ہے اور اگر اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو تو قصوروار یہ عورت ہے۔ جب عزیز نے یہ گواہی سن کر دیکھا تو یوسف علیہ السلام کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا ملا جس سے اس کو یہ یقین ہو گیا کہ قصور اس کی بیوی کا ہے۔ یوسف علیہ السلام کی طرف سے کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے اس نے یوسف علیہ السلام سے کہا:

"یوسف اس معاملے سے درگزر کرو۔ اور اپنی بیوی سے کہا:

تو اپنے قصور کی معافی مانگ درحقیقت تو ہی خطا کار ہے۔

ادھر کشاں کشاں اس واقعہ کی خبر شہر کی ان عورتوں تک پہنچ گئی جو عزیز کی بیوی کی طرح اس وقت کے بڑے عہدے داروں کی بیویاں رہی ہوں گی اور ان کی اخلاقی حالت اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ رہی ہوگی۔ یہ خبر سن کر ان عورتوں نے عزیز مصر کی بیوی کو قصوروار قرار دیا کہ وہ ایک غلام پر ریجھ گئی ہے اور اس سے اپنی جنسی پیاس بجھانا چاہتی ہے۔

عزیز مصر کی بیوی نے طعنہ سن کر ان کے صبر وضبط کا امتحان لینا چاہا اور انہیں کھانے پر مدعو کیا۔ پھل کاٹنے کے لیے ان کے ہاتھوں میں چھریاں تھما دیں۔ پھر اسی وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ باہر آئیں۔ ان عورتوں نے جب ان کو دیکھا تو ان کی خوبصورتی اور عظمت سے مبہوت ہو کر رہ گئیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے اور بیک زبان بولیں:

ماشاء اللہ۔ ہر عیب اور نقص سے پاکی اللہ کے لیے ہے۔ یہ کوئی انسان نہیں یہ تو کوئی فرشتہ ہے۔

یہ سن کر عزیز کی بیوی بولی:

یہی ہے وہ جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کر رہی تھیں۔ درحقیقت میں نے اس پر ڈورے ڈالے پس وہ پوری شدت سے باز رہا۔ اگر اس نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو یقیناً قید کیا جائے گا اور ذلیل ہوگا۔

اس مرحلے پر حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ محسوس کیا کہ شیطان نے تو معصیت کا جال پر جال بچھا رکھا ہے۔ ان کو معصیت میں ڈالنے کے لیے بڑے جتن کیے جا چکے ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر انہوں نے اللہ کو پکارا:

اے میرے پروردگار! مجھے اس برے کام کے مقابلے میں قید ہو جانا زیادہ محبوب ہے جس کی دعوت زنانِ معصیت۔ مجھے دے رہی ہیں۔ اگر تو نے مجھ سے ان کے مکر وفریب کو دور نہ کیا تو میں انکی طرف

جھک پڑوں گا اور نادانوں میں شامل ہو جاؤں گا''

اوپر سورۂ یوسف کی جن آیتوں کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے ان سے ایک نہایت پاکباز صابر، خداترس اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے کی تصویر بنتی ہے جو اپنی زندگی فکر و خیال اور اخلاق و کردار...... ہر ایک میں اللہ تعالیٰ کی معصیت سے پاک ہے۔ اس سلسلے کی آخری آیت جو دراصل ایک دعا ہے اس امر پر بصراحت دلالت کرتی ہے کہ ان کے اندر عزیز مصر کی بیوی اور دوسری زنان مصر کی طرف ادنیٰ میلان اور جھکاؤ بھی نہیں پیدا ہوا تھا۔

ایک طرف یہ مہکتی ہوئی شخصیت، یہ پاکیزہ کردار اور عصمت و عفت کا پیکر ہے اور دوسری طرف وہ گندی اور موضوع روایات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے اس عظیم اور برگزیدہ بندے کی کردارکشی کی گئی ہے۔ جو وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا کی غلط تاویل کے نتیجے میں تفسیر اور تاریخ کی بہت سی کتابوں میں راہ پا گئی ہیں۔ ان جھوٹی روایتوں سے متاثر ہو کر بیشتر مفسرین اور مؤرخین نے ان کی جو تصویر پیش کی ہے وہ ایک عام مسلمان پر بھی صادق نہیں آتی چہ جائیکہ ایک ایسے برگزیدہ نبی پر صادق آئے جس کے قصے اور سرگزشت کو اللہ تعالیٰ نے ''احسن القصص'' سے تعبیر کیا ہے۔

میں سورۂ یوسف کی چوبیسویں آیت کے اس فقرے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا اور عورت نے درحقیقت اس کا ارادہ کیا اور اس نے اس عورت کا ارادہ کیا'' کے اس کے صحیح سیاق و سباق اور عصمت انبیاء کی روشنی میں ''معنی'' پیش کرنے سے پہلے ایسی چند صحیح احادیث نقل کر دینا چاہتا ہوں جن میں رسول اکرم ﷺ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت کے چند تابناک پہلوؤں کو واضح فرمایا ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: لوگوں میں سب سے زیادہ باعزت کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: جو ان میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو۔ صحابہ نے عرض کیا: ہم آپ سے اس کے بارے میں نہیں پوچھ رہے ہیں، تو نبی ﷺ نے فرمایا:

((فَأَكْرَمُ النَّاسِ يُوْسُفُ نَبِيُّ اللّٰهِ ابْنُ نَبِيِّ اللّٰهِ ابْنِ نَبِيِّ اللّٰهِ ابْنِ خَلِيْلِ اللّٰهِ))

''لوگوں میں سب سے زیادہ باعزت اللہ کے نبی یوسف تھے جو اللہ کے ایک نبی کے بیٹے، اللہ کے ایک نبی کے پوتے اور خلیل اللہ کے پڑپوتے تھے۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَلْكَرِيْمُ ابْنُ الْكَرِيْمِ ابْنِ الْكَرِيْمِ ابْنِ الْكَرِيْمِ يُوْسُفُ بْنُ يَعْقُوْبَ بْنِ

إِسْحٰقَ بْنِ إِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ))

''خود باعزت، باعزت کا بیٹا، باعزت کا پوتا، باعزت کا پڑپوتا یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام تھے۔''[1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((وَلَوْ لَبِثْتُ فِي السِّجْنِ مَا لَبِثَ يُوْسُفُ، ثُمَّ أَتَانِي الدَّاعِيُ لَأَجَبْتُ))[2]

''اگر میں اتنی مدت قید میں رہتا جتنی مدت یوسف رہے، پھر میرے پاس بلانے والا آتا تو میں اس کی دعوت کو قبول کر لیتا۔''

سورۂ یوسف کی آیت نمبر ۵۰ کا معنی ومفہوم:

اور بادشاہ نے کہا: اسے میرے پاس لاؤ پس جب قاصد اس کے پاس گیا تو اس نے کہا: اپنے مالک کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ درحقیقت میرا رب ان کی مکاری سے خوب واقف ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے معراج کی ایک طویل حدیث مروی ہے جس میں مختلف آسمانوں پر مختلف انبیاء اور رسولوں کے نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقاتوں کا ذکر آیا ہے۔ اس حدیث میں تیسرے آسمان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات کا ذکر بھی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسرے آسمان پر پہنچنے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

((فَإِذَا أَنَا بِيُوْسُفَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَإِذَا هُوَ قَدْ أُعْطِيَ شَطْرَ الْحُسْنِ))[3]

''میں نے اپنے آپ کو یوسف صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پایا جن کو حسن کا آدھا حصہ عطا کیا گیا تھا۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انہوں نے میرا خیر مقدم کیا اور میرے لیے دعائے خیر کی۔''

اب آیئے سورہ یوسف کی ۲۳ ویں آیت پر غور کریں جس میں ان کی عصمت وعفت کے امتحان کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ﴾

---

[1] صحیح بخاری: ح ۳۳۸۲، ۳۳۸۳، ۳۳۹۰، صحیح مسلم: ح ۶۱۶۱۔

[2] صحیح بخاری: ح ۳۲۷۲، ۳۳۸۷۔ صحیح مسلم: ح ۲۸۲، ۶۱۳۲

[3] صحیح مسلم: ح ۴۱۱

''اور وہ جس عورت کے گھر میں تھا اس نے اس کو حاصل کرنے کے لیے اس کو پھسلانا شروع کیا۔ عورت نے دروازے مضبوطی سے بند کر دیے اور بولی: آ جا''

اس آیت میں عزیز مصر کی بیوی کی جانب سے حضرت یوسف علیہ السلام کو بدکاری پر آمادہ کرنے کی جس کوشش کا ذکر ہے وہ دو مرحلوں پر مشتمل ہے:

پہلا مرحلہ: وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهِ..... میں بیان ہوا ہے اور

دوسرا مرحلہ: وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ..... میں

رَاوَدَ يُرَاوِدُ عَنِ الشَّيْءِ کی لغوی تحقیق:

رَاوَدَ يُرَاوِدُ کے معنی ہیں:

کسی سے کوئی کام لینے، کسی کام پر آمادہ کرنے، یا اس سے کوئی چیز یا مقصد حاصل کرنے کے لیے اس پر ڈورے ڈالنا، اس کو ورغلانا اور پھسلانا۔ اور مذکورہ شخص سے جو چیز مطلوب ہو اس کا ذکر صراحت کے بجائے اشارے اور کنائے سے کرنا۔ اس میں سختی کے بجائے نرمی کا مفہوم ہوتا ہے اور اس میں دھوکے اور فریب کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ یہ ان افعال سے تعلق رکھتا ہے جن میں تسلسل ہو۔ آغاز میں نرمی اور لطف سے کام لیا جاتا ہے۔ پھر ترغیب کا مرحلہ آتا ہے اور بروقت کامیابی نہ ہونے یا طرف مقابل کے تجاہل کے موقع پر خفگی اور پھر دھمکی کا بھی اظہار کیا جا سکتا ہے۔

اس فعل رَاوَدَ يُرَاوِدُ کے دو مفعول بہ آتے ہیں۔ پہلا مفعول بہ وہ ہوتا ہے جس سے ''مراودۃ'' کیا جائے۔ یہ فعل کے فوراً بعد آتا ہے اور دوسرا مفعول بہ وہ ہوتا ہے جو مطلوب ہو اور اس پر حرف جر ''عن'' آتا ہے۔ آیت مبارکہ میں عَنْ نَّفْسِهِ کی ضمیر کا مرجع حضرت یوسف ہیں۔ اور یہ کنایہ ہے ''جنسی'' عمل کرنے سے۔ پورے فقرے کا مطلب ہے:

یوسف علیہ السلام جس عورت کے گھر میں تھے اس نے ان کو اپنے ساتھ جنسی عمل کرنے پر آمادہ کرنے کی غرض سے، ان کو نرمی اور خوش مزاجی سے پھسلانا اور ورغلانا شروع کیا۔

واضح رہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب عزیز مصر نے خریدا تھا اس وقت وہ بچے تھے۔ قصر میں عزیز اور اس کی بیوی کے سامنے جوان ہوئے۔ خانوادہ نبوت کے آپ چشم و چراغ تھے۔ مسلسل تین پشتوں سے نبوت کا سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ ان کے پردادا حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔ اس لیے اپنی سیرت کی پاکیزگی کے ساتھ ان کا جسمانی کمال بھی جاذب نظر رہا ہوگا۔ مزید یہ کہ ان کو جو حسن و جمال عطا کیا گیا تھا

وہ معجزاتی اور بے مثال تھا۔ ویسے بھی انبیاء علیہم السلام صورت و سیرت میں کامل الخلقت ہوتے تھے۔

عزیز مصر کی بیوی ایک بدکار عورت تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام اس کے زرخرید غلام تھے۔ اس کی خدمت پر مامور تھے جس کی وجہ سے بلا روک ٹوک قصر کے ہر حصے بلکہ اس کی خلوت گاہ میں بھی آتے جاتے رہے ہوں گے۔ لہٰذا عزیز کی بیوی کے دل میں رہ رہ کر یہ شیطانی خواہش پیدا ہوتی رہتی ہو گی کہ وہ ان کو اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے استعمال کرے۔ لیکن یوسف علیہ السلام اپنی صالح فطرت اور اس عصمت کی وجہ سے جو لازمہ نبوت ہے اس کی حرکتوں اور اس کے اشاروں کنایوں کو نظر انداز کرتے رہے جس کی گواہی بعد میں عزیز کی بیوی نے ''زنان مصر'' کی مجلس میں خود دی ہے:

﴿ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهُ عَنْ نَّفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ ﴾

''میں نے اس کو آمادہ گناہ کرنے کے لیے ورغلایا پس وہ پوری قوت سے گناہ سے باز رہا''

یہ لفظ پورے قرآن پاک میں صرف ایک بار اسی جگہ آیا ہے۔ اِسْتَعْصَمَ کا مصدر استعصام ہے۔ جس کے معنی ہیں پورے عزم اور قوت کے ساتھ معصیت سے باز رہنا۔ آیت مبارکہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالہ سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ عصمت کے اندر چلے گئے اور اس میں سما گئے۔[1]

جب عزیز کی بیوی نے دیکھا کہ یوسف علیہ السلام اس کے اشارے کنائے کی زبان سنی ان سنی کرتے جا رہے ہیں تو اس نے شرم و حیا کی ''ردا'' اتار دی اور صنف نازک کی معروف صفت سے بالکل عاری ہو کر نہایت واضح اور دو ٹوک الفاظ میں ان کو دعوت گناہ دے دی۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ﴾

''اور اس عورت نے دروازے مضبوطی سے بند کر دیے اور بولی: آ جا''

اس فقرے میں عزیز کی بیوی کی جو تصویر نظر آتی ہے وہ ایک نہایت بدکار اور بے حیا ''مالکن'' کی تصویر ہے جس نے اپنا حق ملکیت استعمال کرتے ہوئے اپنے غلام کو یہ صریح حکم دے دیا کہ میری شیطانی خواہش کی تکمیل کر۔

اس مرحلے میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے خاموش رہنا مناسب نہیں تھا۔ بلکہ جس قوت، زور اور صاف گوئی کے ساتھ حکم ملا تھا اسی قوت، زور اور صراحت کے ساتھ ان کو جواب بھی دینا تھا۔ لہٰذا اس کھلی دعوت گناہ کے جواب میں زبان نبوت یوں گویا ہوئی:

---

[1] الکشاف: ص ۲۸۱ ج ۳۔ القاموس القویم: ص ۲۴ ج ۲۔ النور المبین: ص ۲۳۹

﴿ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ط اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ o ﴾

''میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ بلاشبہ وہ میرا رب ہے۔ اس نے مجھے بہترین ٹھکانا بخشا درحقیقت ظالم لوگ فلاح یاب نہیں ہوتے''

حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ جواب نہایت واضح اور صریح تھا۔ انہوں نے ایک مومن صادق کی حیثیت سے اللہ کی پناہ لی تھی۔ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں آنے والے کو کبھی خائب و خاسر نہیں کرتا۔ اس جواب نے عزیز کی بیوی کو اس اعتبار سے بالکل مایوس کر دیا کہ یوسف علیہ السلام کی نفسانی خواہش پوری کریں گے۔

آئمہ نحو میں امام ابو اسحاق ابراہیم بن سری زجاج قرآن پاک کا بڑا استخراذوق رکھتے تھے۔ قرآن پاک کی نحوی باریکیوں کو بیان کرتے ہوئے قرآنی آیتوں کی ایسی تاویل و تفسیر کرتے تھے جو دینی اور توحیدی روح سے بڑی ہم آہنگ ہوتی تھی۔ چنانچہ مذکورہ فقرے کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''اِنَّهٗ رَبِّیْ'' میں ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے اور اس فقرے کا مطلب ہے کہ اللہ کی پناہ جو میرا رب ہے۔ اس نے مجھے اپنے لطف و مہربانی سے نوازا ہے۔ لہٰذا میں اس فعل کا ارتکاب نہیں کر سکتا جس کو اس نے حرام کر دیا ہے۔[1]

عزیز کی بیوی نے اپنے ناپاک مقصد کی تکمیل کے لیے اشارے کنائے کی زبان استعمال کی اور ناکام رہی۔ صریح حکم کا سہارا لیا پھر بھی کامیاب نہ ہوئی۔ اب اس کے سامنے تیسرا اور آخری راستہ یہ رہ گیا تھا کہ وہ ان سے اپنا ناپاک مقصد حاصل کرنے کے لیے ان کو مجبور کرے۔ کیونکہ وہ بدکار بھی تھی اور بااختیار بھی۔ رہے حضرت یوسف علیہ السلام تو وہ اس کی صریح دعوت گناہ کا جواب ''معاذ اللہ'' کہہ کر دے چکے تھے۔ لہٰذا ان کے دل میں یہ ارادہ پیدا ہوا کہ اگر عزیز کی بیوی نے کوئی عملی قدم اٹھایا تو وہ مزاحمت کریں گے۔ ان دونوں کے ارادوں کو آیت نمبر ۲۴ میں بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا ط ﴾

''درحقیقت عورت نے اس کا ارادہ کیا اور اس نے عورت کا ارادہ کیا''

هَمَّ يَهُمُّ کی لغوی تحقیق اور طریقہ استعمال

هَمَّ يَهُمُّ هَمًّا کے معنی ہیں:

کسی فعل یا کام کا دل میں ارادہ اور قصد کرنا، مگر اس پر عمل نہ کرنا۔

---

[1] بحوالہ فتح القدیر: ص ۲۲ ج ۳۔ الجامع الاحکام القرآن: ص ۱۱٦ ج ٥

اس فعل کا مفعول بہ یا تو کوئی کام اور عمل ہوتا ہے یا کوئی اسم۔ یعنی شخص اور جماعت۔ اگر اس کا مفعول بہ کوئی کام یا عمل ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ دل میں اس کا ارادہ کیا لیکن اس کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ ﴾ [المائدہ: ۱۱]

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد کرو جب ایک قوم نے تم پر دست درازی کا ارادہ کیا تو اللہ نے ان کے ہاتھ تم سے رد کر دیے''

اس آیت میں قوم سے مراد یہودی ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں پر دست درازی کا ارادہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو ان سے محفوظ رکھا۔

اور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً))[1]

''جس نے کسی نیکی کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہیں کیا تو اللہ اس کے لیے اپنے پاس پوری ایک نیکی لکھے گا۔''

لیکن اگر هَمَّ يَهُمُّ کا مفعول بہ فعل نہیں بلکہ کوئی شخص یا جماعت ہو تو متکلم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ یا تو واضح کرے کہ اس سے اسکی مراد کیا ہے؟ یا کلام میں کوئی ایسا قرینہ چھوڑ دے جو اس کی مراد پر دلالت کرتا ہو۔

پہلی صورت کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مبارک ہے:

﴿ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ ﴾ [المومن:۵]

''ہر امت نے اپنے رسول کا ارادہ کیا کہ وہ اس کو قید کر دیں (یا قتل کر دیں) اور انہوں نے باطل کے ساتھ (ان پیغمبروں سے) جھگڑا کیا، تا کہ اس کے ذریعے حق کو پھسلا دیں۔ تو میں نے ان کفر کو پکڑ لیا۔ پھر میری سزا کیسی تھی؟''

اس ارشاد ربانی میں ''هَمَّتْ'' کا مفعول بہ ''بِرَسُوْلِهِمْ'' ہے اور ارادہ کرنے سے کیا مراد ہے یہ آیت کے پہلے فقرے میں واضح نہیں ہے ''لِيَاْخُذُوْهُ'' کہہ کر اس کو واضح کر دیا۔

یہاں یہ واضح رہے کہ هَمَّ يَهُمُّ کے مفعول بہ پر ہمیشہ حرف ''ب'' آتا ہے جس کا الگ سے کوئی

---

[1] صحیح بخاری ح ٦٤٩١، صحیح مسلم ح ١٣١

مفہوم نہیں ہوتا۔

اب رہی دوسری صورت یعنی کہ متکلم یہ واضح نہ کرے کہ هَمَّ يَهُمُّ کے فاعل کا اپنے مفعول بہ سے کیا ارادہ ہے۔ بلکہ اس سے پہلے کوئی ایسا قرینہ چھوڑ دے جو اس کی مراد پر دلالت کرتا ہو تو اس کی مثال سورہ یوسف کی ۲۴ ویں آیت کا یہ فقرہ ہے:

﴿ وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا ﴾

''اور درحقیقت عورت نے اس کا ارادہ کیا اور اس نے عورت کا ارادہ کیا''

تو اس فقرے میں بھی هَمَّتْ اور هَمَّ کا مفعول بہ فعل نہیں بلکہ اشخاص ہیں۔ مطلب یہ کہ: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ میں ''بِهٖ'' هَمَّتْ کا مفعول بہ ہے اور ''بِهٖ'' کی ضمیر کا مرجع یوسف علیہ السلام ہیں۔ جبکہ ''هَمَّ بِهَا'' میں هَمَّ کا مفعول بہ ''بِهَا'' ہے جس کی ضمیر ''ھا'' سے عزیز مصر کی بیوی مراد ہے۔

آیت مبارکہ میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جو عزیز مصر کی بیوی اور حضرت یوسف علیہ السلام کے ارادوں کو واضح کر رہا ہو۔ البتہ سابقہ آیت کا یہ فقرہ:

﴿ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ﴾

''اور وہ جس عورت کے گھر میں تھا اس نے اس کو حاصل کرنے کے لیے اس کو پھسلانا شروع کیا۔ اور دروازے مضبوطی سے بند کر دیے اور بولی: آ جا''

ایک ایسا واضح قرینہ ہے جو اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ عزیز کی بیوی نے یوسف علیہ السلام سے کس چیز کا ارادہ کیا؟ یعنی اس نے یوسف علیہ السلام سے یہ ارادہ کیا کہ وہ اس کے ساتھ بدکاری کریں۔ اور ''هَمَّتْ'' سے پہلے ''ل'' اور ''قد'' کا مطلب ہے:

عزیز کی بیوی نے یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ بدکاری کرنے پر مجبور کرنے کا نہایت پختہ اور مصمم ارادہ کر لیا۔

رہا اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَهَمَّ بِهَا اور اس نے (یوسف نے) اس کا ارادہ کیا کا صحیح مفہوم متعین کرنے والا قرینہ تو وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○ ﴾

''میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ بلاشبہ وہ میرا رب ہے۔ اس نے مجھے اچھا ٹھکانا بخشا۔ درحقیقت ظالم لوگ فلاح یاب نہیں ہوتے۔''

یہ قرینہ بتا رہا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے یہ ارادہ کیا کہ اگر عزیز کی بیوی ان کو اپنے ساتھ بدکاری پر مجبور کرنے کے لیے کوئی عملی قدم اٹھائے گی تو وہ مزاحمت کریں گے۔ لیکن وہ طالب نہیں بلکہ مطلوب تھے اس لیے ان کا ارادہ اس عزم سے خالی ہے جو عزم عزیز کی بیوی کے ارادے میں ہے۔ کیونکہ وہ طالب تھی۔ اسی وجہ سے ان کے ارادے کی تعبیر کے لیے "وَهَمَّ بِهَا" استعمال کیا گیا ہے جو تاکیدی حروف سے خالی ایک سادہ فعل ہے۔

اوپر حضرت یوسف علیہ السلام کے جس ارادے کا ذکر کیا گیا ہے عصمت انبیاء اور سیاق وسباق کی روشنی میں اس کے سوا ان کا کوئی اور ارادہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ عصمت وعفت کے پیکر جس عظیم انسان کی زبان مبارک سے دعوت گناہ کے جواب میں "معاذ اللہ" نکلا ہو اس کے دل میں بدکاری کے ارتکاب کا ارادہ کرنا ناممکن ہے۔ الا یہ کہ اس نے یہ عظیم اور دل ہلا دینے والا کلمہ صرف زبان سے ادا کر دیا ہو درآنحالیکہ اس کے دل میں برائی کی خواہش بھی ہو۔ تو کسی نبی کے بارے میں اس طرح کی بات وہی شخص سوچ یا کہہ سکتا ہے جو عصمت انبیاء کے مفہوم سے ناواقف ہو یا اس کا دل ایمان سے خالی ہو۔

قدیم مفسرین کی ایک جماعت سے بھی "وَهَمَّ بِهَا" کی یہی تفسیر منقول ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی بیوی کو دفع کرنے اور اس کی مزاحمت کا ارادہ کیا۔ چنانچہ امام ابومحمد عبدالحق بن عطیہ اندلسی اور امام ابوعبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی نے اپنی تفسیروں میں اس کا ذکر کیا ہے۔[1] لیکن ابن عطیہ نے اس کو بہت ضعیف قول قرار دیا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ قول ضعیف کیوں ہے؟ حالانکہ عصمت انبیاء اور سیاق وسباق کی روشنی میں یہ قول ضعیف نہیں بلکہ قوی ہے۔ اور اسلوب زبان کے اعتبار سے بھی یہ مفہوم مراد لینے میں کوئی مانع نہیں ہے۔ بلکہ برائی کا ارادہ کرنا اور مزاحمت کرنا دونوں مفہوم اس سے نکلتے ہیں۔ البتہ عصمت انبیاء اور سیاق وسباق کی روشنی میں "مزاحمت" کا ارادہ یقینی ہے۔

لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں اسرائیلی روایات اور ان روایات کی روشنی میں گھڑی جانے والی دوسری روایات میں یہی دعویٰ کیا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی بیوی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کیا تھا لیکن اپنے رب کی برہان دیکھ لینے کی وجہ سے اس کے ارتکاب سے باز رہے۔ چونکہ بیشتر مفسرین کسی نہ کسی درجے میں ان روایات سے متاثر تھے اس لیے سب نے "وَهَمَّ بِهَا" کی یہی تفسیر کی ہے کہ یوسف علیہ السلام نے عزیز کی بیوی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کیا اور پھر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ "دل میں برائی کا خیال یا ارادہ قابل مواخذہ نہیں ہے۔ بلکہ قابل مؤاخذہ برائی کو عملی جامعہ پہنانا ہے۔

[1] المحرر الوجیز: ص ۹۸۸، الجامع لأحکام القرآن: ص ۱۱۷، ج ۵

بعض مفسرین نے تو یہ لکھا ہے کہ "وَهَمَّ بِهَا" اگلے فقرے "لَوْلَا أَنْ رَّاٰى بُرْهَانَ رَبِّهٖ" کا جواب مقدم ہے۔ اس صورت میں "وَهَمَّ بِهَا" "وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ" پر معطوف نہیں ہے۔ بلکہ مستقل جملہ ہے۔ اس طرح: وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَّاٰى بُرْهَانَ رَبِّهٖ.... کا مطلب ہوگا:

اور یوسف بھی اس کا (عورت کا) ارادہ کرتا اگر اس نے اپنے رب کی برھان نہ دیکھ لی ہوتی"۔

چونکہ انہوں نے اپنے رب کی برھان دیکھ لی تھی اس لیے اس کا ارادہ نہیں کیا۔

مگر یہ دونوں تفسیریں باطل ہیں۔

(۱) جہاں تک پہلی تفسیر کا تعلق ہے یعنی دل میں کسی برائی کا خیال اور ارادہ، برائی نہیں بلکہ اس ارادے اور خیال کو عملی جامہ پہنانا برائی ہے۔ یہ بات عام انسانوں کے حوالے سے تو درست ہوسکتی ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کے حوالہ سے درست نہیں ہے۔ خاص طور پر جبکہ زیر بحث برائی زنا اور بدکاری ہے۔ جو بہیمیت ہے اور پاکیزہ فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حد درجہ برا فعل قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَ سَآءَ سَبِيْلًا ۝ ﴾ [الاسراء:۳۲]

"اور زنا کے پاس نہ پھٹکو کیونکہ یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت بری راہ ہے"

تو ایسی بدکاری کے ارتکاب کا خیال ایک معصوم نبی کے دل میں کیونکر پیدا ہوسکتا ہے۔ جبکہ وہ اس برائی کی دعوت کے جواب میں اللہ کی پناہ مانگ چکا ہو۔

رہی دوسری تفسیر: یوسف علیہ السلام بھی اس کا ارادہ کرتے اگر انہوں نے اپنے رب کی برھان نہ دیکھ لی ہوتی۔ چونکہ انہوں نے اپنے رب کی برھان دیکھ لی تھی اس لیے اس کا ارادہ نہیں کیا۔"

تو یہ تفسیر دو وجوہات کی بنا پر سے باطل ہے۔

(۱) "لَوْلَا" کا جواب "لَوْلَا" سے پہلے نہیں آتا۔ اس قاعدے کی رو سے وَهَمَّ بِهَا کو "لَوْلَا" کا جواب قرار دینے کی صورت میں یہ لازم آئے گا کہ یوسف علیہ السلام نے عزیز کی بیوی کا ارادہ کیا بھی اور ارادہ نہیں بھی کیا اور یہ محال ہے۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ارادے کے لیے فعل ماضی "هَمَّ" استعمال کیا ہے اور فعل ماضی کسی چیز اور کام ہوجانے پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی "وَهَمَّ بِهَا" کے معنی ہیں:

"انہوں نے اس عورت کے بارے میں ارادہ کرلیا۔"

اور لَوْلَا کو حرف امتناع کہتے ہیں جس کے بعد دو جملے آتے ہیں۔ جن میں سے پہلے جملے کے وجود یا ہونے کی بنا پر دوسرا جملہ یا فعل غیر موجود ہوتا ہے یا ناممکن الوجود ہوتا ہے۔ اس طرح اگر "وَهَمَّ بِهَا" کو "لَوْلَا" کا جواب قرار دیا جائے تو عبارت یوں ہوگی وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَاٰى بُرْهَانَ رَبِّهِ لَهَمَّ بِهَا.

"اور یوسف نے اس عورت کا ارادہ کرلیا اگر اس نے اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لی ہوتی تو اس عورت کا ارادہ کرتا۔" اس کا مطلب ہوا"

یوسف علیہ السلام نے اس عورت کا ارادہ کیا، چونکہ انہوں نے اپنے رب کی برہان دیکھ لی اس لیے اس عورت کا ارادہ نہیں کیا۔ اور یہ ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں انہوں نے ایک چیز کا ارادہ کیا بھی اور نہیں بھی کیا۔

اردو کی تفسیر میں مذکورہ فقرے کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

قصد نہ کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نفس میں ہیجان اور تحریک ہی پیدا نہ ہوئی ہو۔ ممکن ہے ہیجان پیدا ہوا ہو۔ مگر ہیجان اور تحریک کا پیدا ہو جانا الگ بات ہے اور قصد کر لینا الگ بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سرے سے ہیجان اور تحریک ہی پیدا نہ ہو تو ایسے شخص کا گناہ سے بچ جانا کوئی کمال نہیں۔[1]

اس عبارت کا مطلب ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے جسم میں بدکاری اور زنا کے لیے ہیجان اور تحریک پیدا ہوئی اور انہوں نے اس پر کنٹرول کیا۔

یاد رہے کہ ہیجان اور تحریک شہوت کی شدت کو کہتے ہیں۔ تو کیا ایک معصوم نبی کے حق میں یہ تصور کہ اس کے دل میں زنا اور بدکاری کے لیے شدید خواہش پیدا ہوئی اور اس نے اس پر کنٹرول کیا، کسی بھی حال میں جائز ہو سکتا ہے؟!

درحقیقت ایک معصوم نبی کی شخصیت کو مسخ کرنے والی اور اس کی کردار کشی کرنے والی یہ ساری تفسیریں اس "مفروضے" پر مبنی ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بہر حال "زنا" کا ارادہ کیا اور یہ مفروضہ ان جھوٹی روایات پر مبنی ہے جو تفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "لَوْلَا أَنْ رَاٰى بُرْهَانَ رَبِّهِ" میں برہان سے مراد ایسی برہان یا حسی دلیل یا نشانی نہیں ہے جو معصیت سے باز رہنے میں مدد دے۔ کیونکہ اگر کوئی نبی زنا جیسی برائی اور بدکاری سے بچنے کے لیے اس طرح کی برہان کا محتاج ہے تو پھر دنیا میں کوئی بھی زانی گنہگار نہیں ہے۔

---

[1] تفسیر احسن البیان: ص ۵۷۹

اس لیے کہ وہ ارتکاب زنا کے وقت اپنے سامنے ایسی کوئی دلیل اور برہان نہیں دیکھتا۔ لہٰذا دنیا کے سارے زانی اور بدکار معذور ہیں۔

درحقیقت مذکورہ فقرے میں برھان سے مراد حسی برھان اور دلیل نہیں ہے۔ جب کہ جھوٹی روایات اور اسرائیلیات میں دعویٰ کیا گیا ہے۔ بلکہ اس ''برھان'' سے مراد کوئی ایسا خیال یا روشنی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں عین اس وقت ڈال دی گئی جب انہوں نے عزیز مصر کی بیوی کی عملی اقدام کی صورت میں ''مزاحمت'' کا ارادہ کیا اور یہ خیال آتے ہی وہ دروازے کی طرف بھاگے۔

امام قرطبی لکھتے ہیں:

یوسف علیہ السلام نے عزیز کی بیوی کو اپنے سے دفع کرنے اور ہٹانے کا ارادہ کیا اور ''برھان'' یہ تھی کہ وہ مزاحمت اور دفع کرنے سے باز رہیں۔ کیونکہ اگر انہوں نے اس کو مارا یا دفع کیا یا مزاحمت کی تو اس سے یہ خیال اور تاثر لل سکتا تھا کہ انہوں نے اس کے ساتھ بدکاری کرنی چاہی اور وہ باز رہی۔ جس پر انہوں نے اس کو مارا''۔[1]

عصمت انبیاء، روح قرآن اور سیاق وسباق سے یہی تفسیر ہم آہنگ ہے اور اس کی تائید دروازے پر عزیز مصر کے سامنے اس کی بیوی کے اس جھوٹے الزام سے ہوتی ہے جو اس نے اچانک یوسف علیہ السلام پر دھر دیا اور خود مظلوم بن گئی۔

﴿ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [یوسف:۲۵]

''اس شخص کی کیا سزا ہے جس نے تیری بیوی کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا سوائے اس کے کہ وہ قید کیا جائے یا اس کو دردناک سزا دی جائے۔''

بعض موضوع اور جھوٹی روایات کے ذکر سے پہلے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام معصیت سے باز رہنے کے لیے کسی برھان کی محتاج نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ یہ برھان ان سے کسی بھی حال میں جدا نہیں ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ نیند میں بھی نہیں۔ اسی وجہ سے نیند میں انبیاء علیہم السلام کی صرف آنکھیں سوتی ہیں ان کے دل نہیں سوتے تھے۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا:

[1] الجامع لاحکام القرآن: ص ۱۱۷ ج ۵

((یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ تَنَامُ قَبْلَ أَنْ تُوْتِرَ؟ قَالَ: تَنَامُ عَیْنِیْ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ))[1]

''اے اللہ کے رسول! کیا آپ وتر پڑھنے سے پہلے سوئیں گے؟ فرمایا میری آنکھیں سوتی ہیں اور میرا دل نہیں سوتا۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ ''اسراء کی رات'' کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

((وَکَذٰلِکَ الْأَنْبِیَاءُ تَنَامُ أَعْیُنُھُمْ وَلَا تَنَامُ قُلُوْبُھُمْ))[2]

''اسی طرح انبیاء بھی ہیں کہ ان کی آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کے دل نہیں سوتے''

امام بخاری نے اپنی صحیح میں حدیث نمبر ۱۳۸ نقل کرنے کے بعد عمرو بن دینار مکی کی روایت سے مشہور تابعی عبید بن عمیر رحمہم اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''انبیاء کے خواب وحی کا درجہ رکھتے ہیں اور دلیل میں سورۃ الصافات کی آیت ۱۰۲ پیش کی ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خواب کا ذکر آیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ چونکہ نیند کی حالت میں بھی انبیاء علیہم السلام کے دل عام لوگوں کے برعکس بیدار رہتے ہیں اس لیے وہ جو خواب دیکھتے ہیں ان کا مصدر ذات الٰہی ہوتی ہے اور اس حالت میں بھی وہ شیطانی وسوسوں سے کلی طور پر محفوظ رہتے ہیں۔ انبیاء اپنی قوم کے حق میں باپ کا درجہ رکھتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((إِنَّمَا أَنَا لَکُمْ بِمَنْزِلَۃِ الْوَالِدِ أُعَلِّمُکُمْ......))[3]

''درحقیقت میں تم لوگوں کے لیے والد کا درجہ رکھتا ہوں اور تمہیں تعلیم دیتا ہوں۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے ہر فرد کے لیے باپ کا درجہ رکھتے تھے اور تمام انبیاء اگرچہ فضائل ومناقب میں ایک دوسرے سے مختلف تھے لیکن امت کے حق میں سب کی یکساں حیثیت تھی۔ لہٰذا کسی بھی نبی کے دل میں اپنی امت کی کسی عورت کے ساتھ بدکاری کا خیال اور ارادہ محال تھا۔

اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم کے بعد فرشتوں اور ابلیس کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ ان کو سجدہ کریں۔ فرشتے تو اس حکم الٰہی کی تعمیل میں فوراً سجدے میں گر گئے مگر ابلیس نے یہ کہہ کر ان کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا کہ اس کی تخلیق جس مادے (آگ) سے ہوئی ہے وہ آدم کے مادہ تخلیق (مٹی) سے بہتر ہے۔ اس حکم

---

[1] صحیح بخاری: ح ۳۵۶۹، صحیح مسلم: ح ۱۷۲۳

[2] صحیح بخاری: ۳۵۷۰

[3] ابوداؤد: ح ۸۔ نسائی: ح ۴۰۔ ابن ماجہ: ۳۱۳

عدولی پر اللہ تعالیٰ نے اس کو قیامت تک کے لیے ملعون قرار دے دیا۔ اس پر ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لیے مہلت عمر مانگ لی اور یہ قسم کھالی کہ وہ آدم کی اولاد کو گمراہ کرنے کے لیے اپنی ساری کوششیں وقف کر دے گا۔ مگر اسی کے ساتھ اس نے یہ اعتراف کیا کہ وہ اولاد آدم میں سے ان لوگوں کو گمراہ نہ کر سکے گا جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خالص کر کے چن لیا ہے۔ اس فضل اور توفیق کے مستحق بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے "اَلْمُخْلَصِیْنَ" کی تعبیر استعمال فرمائی ہے جو "اَلْمُخْلَصُ" کی جمع ہے۔ یہ أُخْلَصَ يَخْلِصُ کا اسم مفعول ہے اور اس کا مصدر الاخلاص ہے۔ جس کے معنی ہیں عبودیت کو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص کر دینا۔ سچے دل اور ریاکاری سے پاک ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا۔

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کا "مخلص" بندہ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید اور اپنی عبودیت کے لیے خاص کر لیا اور چن لیا ہو۔ اس کو شیطان کی فریب کاریوں سے بالکل محفوظ کر دیا ہو۔

عمومی طور پر تمام انبیاء اور رسول اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور "مُخْلَصُ" بندے تھے۔ لیکن قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے مخصوص طور پر اپنے جس بندے کو "مخلصین" میں شمار کیا ہے وہ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں: فرمایا: اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ. بلاشبہ وہ ہمارے برگزیدہ اور چنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔"

اللہ تعالیٰ نے مخصوص طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کو اس فضل سے اس لیے نوازا ہے کہ ان کو جس آزمائش میں ڈالا گیا تھا وہ اپنی نوعیت کی ایک بالکل منفرد آزمائش تھی جس میں ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی بھی نبی اور رسول کو نہیں ڈالا گیا۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عفت وعصمت، ان کے فکر و خیال اور اخلاق و کردار کی پاکی کی ان تمام تاکیدات کے باوجود تقریباً تمام ہی تفسیروں میں ان کی اس قدر گندی تصویر کیوں پیش کی گئی ہے؟ اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ ان کی عظیم شخصیت کو مسخ کرنے والی جھوٹی روایات اس قدر پھیلا دی گئیں اور اس قدر عام کر دی گئیں کہ بڑے سے بڑا مفسر اور مؤرخ بھی ان کی سیرت بیان کرتے وقت اپنے ذہن ودماغ کو ان کے اثر سے پاک نہ کر سکا۔

اب میں ان جھوٹی روایات میں سے بعض کا ذکر کرتا ہوں جن کو تقریباً تمام ہی مشہور تفسیروں میں نقل کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ ان روایات میں سے بیشتر کی کوئی سند بھی نہیں بیان کی گئی۔ البتہ بعض کو حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے منسوب کیا گیا ہے۔ جبکہ ان جلیل القدر صحابیوں کا دامن ان

سے پاک ہے۔

(۲۳٤)......عَنْ مُجَاهِدٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا: وَهَمَّ بِهَا: قَالَ: حَلَّ سَرَاوِيْلَهُ وَقَعَدَ مِنْهَا مَقْعَدَ الرَّجُلِ مِنِ امْرَأَتِهِ، فَإِذَا بِكَفٍّ قَدْ بَدَتْ بَيْنَهُمَا بِلا مِعْصَمٍ وَلا عَضُدٍ مَكْتُوْبٍ عَلَيْهَا: ﴿ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ٥ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ٥ ﴾ فَقَامَ هَارِبًا وَقَامَتْ، فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْهُمَا الرُّعْبُ عَادَتْ وَعَادَ، فَظَهَرَتْ تِلْكَ الْكَفُّ مَكْتُوْبًا عَلَيْهَا: ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيْلًا٥ ﴾ فَقَامَ هَارِبًا وَقَامَتْ، فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْهُمَا الرُّعْبُ عَادَتْ وَعَادَ، فَظَهَرَ فَرَأَ تِلْكَ الْكَفَّ مَكْتُوْبًا عَلَيْهَا: ﴿ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ﴾ فَقَامَ هَارِبًا وَقَامَتْ، فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْهُمَا الرُّعْبُ عَادَتْ وَعَادَ، فَقَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ لِجِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: أَدْرِكْ عَبْدِيْ قَبْلَ أَنْ يُصِيْبَ الْخَطِيْئَةَ، فَانْحَطَّ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَاضًّا عَلَى أُصْبُعِهِ، يَقُوْلُ: يَا يُوْسُفُ: تَعْمَلُ عَمَلَ السُّفَهَاءِ وَأَنْتَ مَكْتُوْبٌ عِنْدَ اللّٰهِ فِي الْأَنْبِيَاءِ۔

''مجاہد سے روایت ہے کہ اور وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: یوسف نے عورت کا ارادہ کیا: کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: یوسف علیہ السلام نے اپنا پائجامہ کھولا اور عزیز مصر کی بیوی کے پیروں کے درمیان اس طرح بیٹھ گئے جس طرح مرد اپنی بیوی کے پیروں کے درمیان بیٹھتا ہے۔ اچانک ایک ہتھیلی کلائی اور بازو کے بغیر ان کے درمیان ظاہر ہوئی جس پر لکھا ہوا تھا: اور بے شک تم پر نگران مقرر ہیں۔ ایسے معزز کاتب جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔ (الانفطار: ۱۰۔۱۲) یوسف کھڑے ہو کر بھاگے اور وہ بھی بھاگی۔ جب ان دونوں کی گھبراہٹ دور ہوگئی تو وہ عورت اور وہ دوبارہ اس حالت میں لوٹ آئے۔ اس وقت وہی ہتھیلی اس طرح نمودار ہوئی۔ اس پر لکھا ہوا تھا: اور تم لوگ زنا کے قریب نہ بھٹکو۔ وہ بہت بڑی بے حیائی اور بڑا برا راستہ ہے (الاسراء: ۳۲) یوسف اٹھ کر بھاگے اور وہ بھی بھاگی۔ جب دونوں کا خوف زائل ہوگیا تو وہ عورت اور وہ دوبارہ وہی عمل کرنے لگے۔ اس وقت انہوں نے وہی ہتھیلی اس شکل میں دیکھی کہ اس پر لکھا ہوا تھا:

تم لوگ اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کے پاس واپس جاؤ گے۔'' یہ دیکھ کر یوسف اور وہ عورت کھڑے ہو کر بھاگے اور جب ان کا ڈر جاتا رہا تو اسی عمل میں دوبارہ مصروف ہو گئے۔ اس وقت اللہ عزوجل نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا: میرے بندے کو، قبل اس کے کہ وہ گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے، پکڑو۔ پس جبریل علیہ السلام اپنی انگلی دانتوں سے کاٹتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے نازل ہوئے: اے یوسف! تم نادانوں کے فعل کا ارتکاب کر رہے ہو جبکہ اللہ کے یہاں تمہارا نام انبیا میں لکھا ہوا ہے۔''

یہ گندی روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نام پر جھوٹ ہے۔ جس کے لفظ لفظ سے ایک معصوم نبی کی کردارکشی کی بو آتی ہے۔ اس روایت میں ان کی جو گندی تصویر پیش کی گئی ہے وہی تصویر یہودیوں نے اپنی کتابوں میں اپنے انبیاء کی پیش کی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جس دشمن اسلام نے یہ روایت گھڑی ہے اس نے ''پلاٹ'' تو اسرائیلیات سے لیا ہے اور اس میں قرآنی آیات ملا کر اس کو حدیث کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ غور فرمایئے: کیا ایسا شخص کوئی نبی ہو سکتا ہے جو برہان پر برہان دیکھتا ہے پھر بھی زنا جیسی بدکاری کرنے پر مصر ہے؟ اس جھوٹی روایت میں ایک معصوم اور برگزیدہ نبی اور ایک بدکار عورت کو ایک ہی مقام پر رکھ دیا گیا ہے ﴿ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ط اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ○ ﴾ بڑی بری بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ وہ تو صرف جھوٹ بکتے ہیں۔

عجیب اور افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ اور اس طرح کی دوسری گندی روایات نقل کرنے میں بغوی، ابن عطیہ اندلسی، قرطبی اور امام شوکانی جیسے بڑے بڑے مفسرین ملوث ہیں۔ البتہ قاضی ابوبکر ابن العربی نے ایسے تمام مفسرین پر سخت تنقید کی ہے جنہوں نے اس طرح کی روایات نقل کی ہیں اور لکھا ہے کہ: ''ان مفسرین کو کیا ہوا: کوئی بات سمجھتے نہیں اور کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے یہ کہا اور یہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے تو صرف یہ فرمایا ہے: هَمَّ بِهَا اس نے اس عورت کا ارادہ کیا۔[1]

بعض مفسرین نے تو یہاں تک جرأت کی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قول: ''مَعَاذَ اللّٰهِ'' پر بھی اعتراض کر دیا ہے۔ چنانچہ ابن عطیہ اندلسی لکھتے ہیں۔

جب یوسف علیہ السلام نے ''مَعَاذَ اللّٰهِ'' کہا اور معاملہ کی احتجاج اور نرمی کے ساتھ مزاحمت کی تو اللہ تعالیٰ نے اس ''ارادے سے جو انہوں نے کیا، ان کا امتحان لیا۔ اگر انہوں نے ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ

[1] احکام القرآن: ص ۳۸ ج ۳

اِلَّا بِاللّٰہِ" کہا ہوتا تو آزمائش میں نہ ڈالے جاتے۔" [1]

انبیاء کی زبان تو حق کی ترجمان ہوتی ہے اور جو بات ان کی زبان مبارک سے نکلتی ہے وہ سراسر صداقت اور حق کی ترجمانی کرتی ہے۔

(۲۳۳)......عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: جَاءَ اِلَی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَھُوْدِیٌّ یُقَالُ لَہُ: بُسْتَانٌ، فَقَالَ: یَا مُحَمَّدُ! أَخْبِرْنِیْ عَنِ الْکَوَاکِبِ الَّتِیْ رَاھَا یُوْسُفُ سَاجِدَۃً لَہُ، وَمَا أَسْمَاؤُھَا؟، قَالَ: فَسَکَتَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلَمْ یُجِبْہُ، فَنَزَلَ جِبْرِیْلُ عَلَیْہِ السَّلَامُ بِأَسْمَائِھَا، فَبَعَثَ اِلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: ھَلْ اَنْتَ مُؤْمِنٌ اِنْ أَخْبَرْتُکَ بِأَسْمَائِھَا؟ قَالَ: نَعَمْ، فَقَالَ: ھِیَ جَرَیَّانُ، وَالطَّارِقُ، وَالذَّیَّالُ، وَذُوْالْکَتِفَیْنِ، وَقَابِسٌ، وَوَثَّابٌ وَعَمُوْدَانُ، وَالْفَیْلَقُ وَالْمُصْبِحُ وَالضَّرُوْحُ وَذُوْالْفَرْعِ وَالضِّیَاءُ وَالنُّوْرُ۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک یہودی حاضر ہوا جس کا نام بستان تھا، اس نے عرض کیا: اے محمد! مجھے ان ستاروں کے نام بتایئے جن کو یوسف علیہ السلام نے انہیں سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تھا؟ حضرت جابر کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چپ رہے اور اس کو کوئی جواب نہیں دیا۔ چنانچہ جبریل علیہ السلام ستاروں کے نام لے کر نازل ہوئے۔ حضرت جابر کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی کو بلوا بھیجا اور فرمایا: اگر میں تجھے ان ستاروں کے نام بتا دوں تو کیا تو ایمان لے آئے گا؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: وہ ستارے ہیں، جریان، طارق، ذیال، ذوکتفین، قابس، وثاب، عمودان، فیلق، مصبح، ضروح، ذوفرع، ضیاء اور نور"

یہ روایت بھی موضوع اور جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج بیہقی نے دلائل النبوہ میں کی ہے۔ [2]

اور الھیثمی نے مجمع الزوائد [3] میں لکھا ہے: اس کی روایت بزار نے المصنف میں کی ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی حکم بن ظہیر شامل ہے جو متروک تھا اور جس کو تمام ائمہ حدیث نے ناقابل

[1] المحرر الوجیز: ص ۹۸۷
[2] دلائل النبوۃ: ص ۴۶۹، ج ۲
[3] مجمع الزوائد: ص ۳۹ ج ۷

اعتبار قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب[1] میں لکھا ہے: حکم بن ظہیر جس کی کنیت ابومحمد اور اس کے باپ کی کنیت ابولیلیٰ تھی متروک ہے۔ امام یحییٰ بن معین نے اس پر وضع حدیث کا الزام لگایا ہے۔ اس پر رافضی ہونے کا بھی الزام ہے۔ امام ابن عدی نے مختصر الکامل[2] میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ امام بخاری نے حکم بن ظہیر عن اسدی عن عاصم کو منکر الحدیث قرار دیا ہے۔ امام نسائی فرماتے ہیں: وہ متروک الحدیث تھا۔ امام ابوداؤد نے امام یحییٰ بن معین کے حوالہ سے اس کو کذاب لکھا ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں اس کی روایت کردہ بیشتر حدیثیں غیر محفوظ یعنی شاذ ہیں۔ امام ابن الجوزی نے الموضوعات[3] میں اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔

(۲۳٤)......عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: رَحِمَ اللّٰهُ يُوْسُفَ لَوْلَا الْكَلِمَةُ الَّتِيْ قَالَهَا: أُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ" مَالَبِثَ فِي السِّجْنِ مَالَبِثَ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اللہ یوسف پر رحم فرمائے۔ اگر انہوں نے یہ کلمہ "أُذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ" اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا" نہ کہا ہوتا تو وہ قید میں اتنی مدت نہ رہتے جتنی مدت وہ رہے"

یہ روایت اپنی سند اور متن دونوں اعتبار سے منکر ہے۔ لیکن اس کی نکارت بیان کرنے سے قبل اس پوری آیت کا سرسری مطالعہ ضروری ہے جس میں مذکورہ فقرہ: "أُذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ" آیا ہے، اور وہ آیت یہ ہے:

﴿ وَ قَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ۝ ﴾ [يوسف:٤٢]

"ان دونوں (قیدیوں) میں سے جس کے متعلق یوسف کا خیال تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا اس سے کہا: اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا" تو شیطان نے اس کو اس کے مالک سے اس کا ذکر کرنا بھلا دیا۔ اس طرح (یوسف) قید میں چند سال اور پڑا رہا"

[1] تقريب التهذيب: ص ١١٤ ترجمه: ١٤٤٥ [2] مختصر الكامل: ص ٢٤٠
[3] الموضوعات: ص ٢١٦۔ ٢١٧ ج ١ ح ٣٠٢

بے گناہ اور مظلوم کا اپنی رہائی کے لیے دنیوی تدابیر اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں:

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کے آغاز سے اوپر نقل کردہ آیت تک ان کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ ایک ایسے پاکیزہ اور فرشتہ صفت انسان کی تصویر ہے جس نے ہر طرف سے شیطانی یلغار کے باوجود اپنے دامن عصمت وعفت کو داغدار نہیں ہونے دیا۔ لیکن ان کی براءت و بے گناہی کے تمام دلائل وشواہد کے باوجود عزیز مصر اور اس کی بدکردار بیوی نے یہی فیصلہ کیا کہ کچھ مدت کے لیے ان کو قید کر دیں تاکہ عزیز مصر کی بیوی کے غرور نفس کو کچھ تسکین ہو جائے:

﴿ وَ لَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَ لَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ٠ ﴾ [یوسف:۳۲]

"اگر اس نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو یقیناً قید کیا جائے گا اور ذلیل ہوگا۔"

اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک خاص مدت کے لیے قید خانے میں ڈالا گیا تھا، کیونکہ ان کی بے گناہی اور پاکدامنی واضح اور عیاں تھی۔

﴿ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ٠ ﴾ [یوسف:۳۵]

"پھر نشانیاں دیکھ لینے کے بعد انہیں مصلحت یہی معلوم ہوئی کہ اس کو کچھ مدت کے لیے ضرور قید کر دیں"

مگر قید کرنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو بھلا دیا گیا۔ اس تناظر میں حضرت یوسف علیہ السلام کا رہائی پانے والے اپنے قیدی ساتھی سے یہ کہنا کہ "اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا" دنیوی تدابیر میں سے ایک تدبیر تھی جو اللہ تعالیٰ پر اعتماد و توکل کے قطعاً منافی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دنیا دارالاسباب ہے جس میں جائز مقصد کے حصول کے لیے مادی اسباب و وسائل کا سہارا لینا اور نتائج کو اللہ تعالیٰ کی رضا پر چھوڑنا ہی عین توکل ہے اور یوسف علیہ السلام نے یہی کیا تھا۔

اوپر کی وضاحتوں کی روشنی میں زیر بحث روایت

اللہ یوسف پر رحم فرمائے اگر انہوں نے یہ کلمہ: "اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ" اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا کرتا...... اپنی سند اور متن دونوں اعتبار سے منکر اور مردود ہے۔

حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں لکھتے ہیں:

یہ روایت منکر ہے اور اس کا راوی محمد بن عمرو بن علقمہ نے ایسی بہت سی حدیثیں روایت کی ہیں جن

کی روایت میں وہ منفرد ہے اور ان میں نکارت پائی جاتی ہے۔ [1]

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

میرے خیال میں اس روایت کی نکارت ابن حبان کے شیخ کی طرف سے ہے محمد بن عمرو کی طرف سے نہیں۔ اور یہ حدیث امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے:

ہم سے سفیان بن وکیع نے بیان کیا، کہا: ہم سے عمرو بن محمد نے ابراہیم بن یزید سے، انہوں نے عمرو بن دینار سے، انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۲۳۵)......لَوْ لَمْ يَقُلْ۔ يُوْسُفُ۔ الْكَلِمَةَ الَّتِيْ قَالَ، مَالَبِثَ فِي السِّجْنِ طُوْلَ مَالَبِثَ، حَيْثُ ابْتَغَى الْفَرَجَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ۔

''اگر یوسف نے وہ کلمہ نہ کہا ہوتا جو انہوں نے کہا تو وہ قید خانے میں اتنی طویل مدت نہ رہتے۔ کیونکہ انہوں نے غیر اللہ کے پاس مصیبت سے چھٹکارا تلاش کیا۔''

اس روایت کو حافظ ابن کثیر نے ہر سند سے حد درجہ ضعیف قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس کی روایت میں ابراہیم بن یزید خوری منفرد ہے اور وہ ''متروک'' تھا۔ [2]

کلام اللہ میں تحریف

بعض مفسرین نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

''وَ قَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ'' کے کلمہ فَاَنْسٰهُ میں ''ہ'' ضمیر مفعول سے حضرت یوسف علیہ السلام کو مراد لیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام میں تحریف کا درجہ رکھتا ہے۔ اس تفسیر کی رو سے مذکورہ فقرے:

فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ کا مطلب ہے:

شیطان نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے رب کی یاد سے غافل کر دیا۔

تو یہ تفسیر نہیں بلکہ تحریف ہے۔ جو سلسلہ کلام سے غیر مربوط ہونے کے ساتھ خود قرآن پاک کی تصریح کے خلاف ہے۔ کیونکہ مذکورہ آیت میں ''فَاَنْسٰهُ'' کی ضمیر کا مرجع وہ قیدی ہے جس کے بارے میں

---

[1] البدایه والنهایه: ص ۲٤۱ ج ۱

[2] الصحیحه: ص ٤٨٤ ج ٤۔ البدایه والنهایه: ص ۲٤۰ ج ۱

حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ گمان تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا۔

چنانچہ قرآن پاک یہ صراحت کرتا ہے کہ جب بادشاہ نے خواب دیکھا اور اپنے درباریوں سے اس کی تعبیر پوچھی تو انہوں نے اسے ''خواب پریشان'' قرار دیا۔ اس موقع پر رہائی پانے والے قیدی کو یہ بات یاد آ گئی کہ یوسف علیہ السلام نے اس سے کچھ کہا تھا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ قَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ۝ ﴾

''ان دو قیدیوں میں سے جو قید سے رہا ہو گیا تھا اور جس کو ایک مدت کے بعد یاد آیا، اس نے کہا کہ میں آپ لوگوں کو اس کی تعبیر کی خبر دیتا ہوں، مجھے بھیجئے''

یاد آنا بھول جانے کے ضد ہے اور وہ شخص جو بات بھول گیا تھا وہ یہی تو تھی کہ اس نے اپنے مالک سے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا۔ لہٰذا لامحالہ اسے بادشاہ کا خواب سن کر جو بات یاد آئی وہ اس کے سوا کوئی اور بات نہیں ہو سکتی تھی۔

حافظ ابن کثیر مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

بادشاہ کے خواب اور اہل دربار کے اس کو ''خواب پریشان'' کہہ کر اس کی تعبیر سے معذرت سن کر ان دونو جوانوں میں سے جو یوسف علیہ السلام کے ساتھ قید میں تھے، رہائی پانے والے کو وہ بات یاد آ گئی جس کی وصیت یوسف علیہ السلام نے اس سے کی تھی کہ وہ ان کے معاملے کو بادشاہ سے بیان کرے جس کو شیطان نے بھلا دیا تھا تاکہ اللہ کے نبی قید سے رہائی نہ پا سکیں۔''[1]

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جہاں ''رب'' سے اللہ تعالیٰ کی ذات مراد لینا راجح ہے وہاں اس سے غیر اللہ مراد لینے پر اصرار ہے (آیت ۲۳) اور جہاں ''رب'' سے یقینی طور پر غیر اللہ مراد ہے وہاں اس سے اللہ تعالیٰ کو مراد لیا گیا ہے۔ (آیت ۴۲) اس غلط تاویل بلکہ ''تحریف'' کو صحیح ثابت کرنے کے لیے جھوٹی روایات کا سہارا لینے سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔ چنانچہ امام قرطبی الجامع لاحکام القرآن[2] اور ابن عطیہ المحرر الوجیز[3] میں لکھتے ہیں۔

(۲۳۶)......دَخَلَ جِبْرِیْلُ عَلَى یُوْسُفَ النَّبِیِّ عَلَیْهِ السَّلَامُ فِی السِّجْنِ فَعَرَفَهٗ یُوْسُفُ. فَقَالَ: یَا أَخَا الْمُنْذِرِیْنَ! مَالِیْ أَرَاكَ بَیْنَ الْخَاطِئِیْنَ؟ فَقَالَ جِبْرِیْلُ

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ص ۲۵۱۔ ۲۵۲ [2] الجامع للأحکام القرآن: ص ۱۳۷ ج ۵

[3] المحرر الوجیز: ص ۹۹۷

عَلَيْهِ السَّلَامُ يَا طَاهِرَ ابْنَ الطَّاهِرِيْنَ! يَقْرَأُكَ السَّلَامَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ وَيَقُوْلُ: أَمَا اسْتَحْيَيْتَ إِذَا اسْتَغَثْتَ بِالْآدَمِيِّيْنَ؟! وَعِزَّتِيْ لَأُلَبِّثَنَّكَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ، فَقَالَ: يَا جِبْرِيْلُ اَهُوَ عَنِّيْ رَاضٍ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: لَا أُبَالِي السَّاعَةَ۔

وَرُوِيَ أَنَّ جِبْرِيْلَ جَاءَهُ فَعَاتَبَهُ عَنِ اللّٰهِ تَعَالٰى فِيْ ذٰلِكَ وَطَوَّلَ سِجْنَهُ، وَقَالَ لَهُ: يَا يُوْسُفُ! مَنْ خَلَّصَكَ مِنَ الْقَتْلِ مِنْ اَيْدِيْ اِخْوَتِكَ؟ قَالَ: اللّٰهُ تَعَالٰى: قَالَ: فَمَنْ أَخْرَجَكَ مِنَ الْجُبِّ قَالَ: اللّٰهُ تَعَالٰى، قَالَ: فَمَنْ عَصَمَكَ مِنَ الْفَاحِشَةِ؟ قَالَ: اللّٰهُ تَعَالٰى. قَالَ: فَمَنْ صَرَفَ عَنْكَ كَيْدَ النِّسَاءِ؟ قَالَ: اللّٰهُ تَعَالٰى، قَالَ: فَكَيْفَ وَثِقْتَ بِمَخْلُوْقٍ وَتَرَكْتَ رَبَّكَ فَلَمْ تَسْأَلْهُ؟ قَالَ: يَا رَبِّ! كَلِمَةٌ زَلَّتْ مِنِّيْ! أَسْأَلُكَ يَا إِلٰهَ إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْحَاقَ وَالشَّيْخِ يَعْقُوْبَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ أَنْ تَرْحَمَنِيْ، فَقَالَ لَهُ جِبْرِيْلُ: فَإِنَّ عُقُوْبَتَكَ أَنْ تَلْبَثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ۔

جبریل نبی یوسف علیہما السلام کے پاس قید خانے میں آئے اور یوسف نے ان کو پہچان لیا۔ کہا: اے خبردار کرنے والوں کے بھائی! میں آپ کو خطا کاروں کے درمیان کیوں دیکھ رہا ہوں؟ جبریل علیہ السلام نے جواب دیا: اے پاکبازوں کے پاکباز بیٹے! سارے جہانوں کا پروردگار آپ کو سلام سناتا ہے اور فرما رہا ہے: کیا تمہیں آدمیوں سے فریاد کرتے ہوئے شرم نہ آئی؟ میری عزت کی قسم! میں تمہیں قید خانے میں مزید چند سال باقی رکھوں گا۔ یوسف علیہ السلام نے کہا: کیا وہ مجھ سے راضی ہے؟ جواب دیا: ہاں۔ کہا: اس وقت مجھے کوئی پروا نہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جبریل جناب یوسف علیہما السلام کے پاس آئے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملامت کی اور ان کے قید کی مدت بڑھا دی اور ان سے کہا: اے یوسف! تمہیں تمہارے بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے کس نے بچایا؟ کہا: اللہ تعالیٰ نے۔ کہا: تم کو کنویں سے کس نے نکالا؟ کہا: اللہ تعالیٰ نے۔ پوچھا: تم کو بدکاری سے کس نے محفوظ رکھا؟ جواب دیا: اللہ تعالیٰ نے۔ دریافت کیا: تم سے عورتوں کی مکاری کس نے دور کی؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے۔ کہا: تو تم نے کس طرح ایک مخلوق پر بھروسہ کر لیا اور اپنے رب کو ترک کر دیا اور اس سے سوال

نہیں کیا؟ یوسف نے کہا: اے میرے رب! یہ ایک کلمہ تھا جو مجھ سے سرزد ہو گیا۔ اے ابراہیم، اسحاق اور بوڑھے یعقوب کے معبود! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو میرے اوپر رحم فرما۔ پس جبریل نے ان سے کہا: تیری سزا یہ ہے کہ تو قید میں کچھ سال اور رہے۔"

دراصل یہ کہانی سراسر جھوٹ اور بیمار ذہن کی پیداوار ہے۔ قرطبی اور ابن عطیہ نے اس کی کوئی سند بیان نہیں کی ہے۔ صرف عبدالعزیز بن عمیر کندی کے قول کی حیثیت سے نقل کر دیا ہے۔ یہ کہانی جس نے بھی گھڑی ہو بہر حال وہ انبیاء علیہم السلام کے مقام سے ناواقف ہے۔ سورہ یوسف کی آیات ۳۸ تا ۴۰ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی جو تقریر بیان ہوئی ہے اس میں انہوں نے اس دعوت توحید کو نہایت مدلل اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے جو دعوت تمام انبیاء دیتے رہے تھے اور جو دعوت مختلف انداز میں پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس تقریر میں یوسف علیہ السلام کی تابناک شخصیت پوری طرح نمایاں ہے۔

جو شخص مذکورہ آیات پر نظر رکھتا ہو اس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ مذکورہ کہانی اور اس جیسی دوسری کہانیاں اور قصے جن لوگوں نے گھڑے ہیں ان کا مقصد حضرت یوسف علیہ السلام کی کردار کشی کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

جب یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے خواب کی تعبیر اس کے قاصد سے بیان کی اور اس نے واپس جا کر بادشاہ کو وہ تعبیر سنائی تو وہ ان کے علم و معرفت سے بے حد متاثر ہوا اور اسی لمحہ یہ حکم دیا کہ ان کو حاضر کیا جائے۔ "ائْتُونِي بِهِ" اور فوراً ایک قاصد یہ حکم لے کر حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کو توقع رہی ہوگی کہ یہ حکم سن کر حضرت یوسف علیہ السلام خوش ہو جائیں گے۔ اور اس کے ساتھ فرحاں و شاداں چل کھڑے ہوں گے، لیکن اللہ کے محبوب نبی نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور اس سے فرمایا: اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے، جنہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے تھے:

﴿ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ﴾ [یوسف: ۵۰]

"جب قاصد اس کے پاس پہنچا تو اس نے کہا: اپنے مالک کے پاس واپس جاؤ اور اس سے دریافت کرو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب ان کی مکاری سے خوب واقف ہے۔"

حضرت یوسف علیہ السلام جس ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہے تھے رہائی سے پہلے ان کے دامن سے اس گناہ کا داغ مٹانا ضروری تھا اور جن لوگوں نے ان کے خلاف بہتان تراشی کی تھی ان کو سامنے آ کر یہ

اعلان کرتا تھا کہ اصل مجرم تو ہم ہیں۔ یوسف کی ذات تو دودھ کی طرح بے داغ ہے۔

اسی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام نے زنان مصر کے معاملے کی تحقیق کا مطالبہ کرنے کے ساتھ اس کا سبب بھی واضح فرمادیا:

﴿ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ○ ﴾ [یوسف:۵۲]

''وہ اس لیے کہ (عزیز مصر) یہ جان لے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کی چالوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتا''

واضح رہے کہ آیت نمبر ۵۰ اور اس آیت کے درمیان کی آیت ۵۱ جملہ معترضہ ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بادشاہ نے زنان مصر کو طلب کر کے ان سے پوچھا کہ جب تم نے یوسف کو آمادہ گناہ کرنے کے لیے ان کو پھسلانے اور رجھانے کی کوشش کی تو ان کو کیسا پایا تھا؟ سب نے یک زبان ہو کر ان کے بے گناہ ہونے اور ہر برائی سے پاک ہونے کی گواہی دی۔ اور عزیز مصر کی بیوی نے یہ اعتراف کیا کہ اسی نے ان کو بدکاری کے ارتکاب پر آمادہ کرنے کے لیے ان پر ڈورے ڈالے تھے۔ رہے جناب یوسف تو وہ اپنے اس قول میں بالکل سچے ہیں۔ انہوں نے ایسی کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے آیت نمبر ۵۲ جو کچھ فرمایا ہے وہ آیت نمبر ۲۶ میں موجود ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

''قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَفْسِيْ'' یوسف نے کہا: اسی نے مجھے پھانسنے کی کوشش کی تھی۔

یہ انہوں نے اس وقت کہا تھا جب دروازے پر اچانک عزیز مصر کو پانے پر اس کی بیوی نے چشم زدن میں اپنے کو بری اور یوسف علیہ السلام کو مجرم قرار دے ڈالا تھا۔

﴿ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ ﴾

''اس نے کہا: جس نے تمہاری بیوی کے ساتھ کسی برائی کا ارادہ کیا ہو اس کی سزا کیا ہو سکتی ہے؟ کیا یہی نہیں کہ اس کو قید کر دیا جائے یا اسے دردناک تکلیف دی جائے۔''

لہٰذا بادشاہ کے سامنے عزیز مصر کی بیوی نے اپنے قصور کا اعتراف اس لیے نہیں کیا تھا کہ اس کا ضمیر بیدار ہو گیا تھا اور خوف الٰہی نے اس کو اس اعتراف پر مجبور کر دیا تھا، بلکہ اس کے قصور کے اعتراف کا سبب زنانِ مصر کا وہ اعلان تھا جس میں انہوں نے کہا تھا:

''اللہ کی پناہ ہمیں اس کی ذات میں کوئی بھی برائی معلوم نہیں ہے۔''

اگر وہ اپنی براءت اور یوسف علیہ السلام کے قصور وار ہونے پر اصرار کرتی تو زنان مصر خود اس کا بھانڈا پھوڑ دیتیں کیونکہ وہ ان کے سامنے پہلے ہی یہ اعتراف کر چکی تھی۔

﴿ وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَ لَئِنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ وَ لَیَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِیْنَ۝ ﴾ [یوسف:۳۲]

"بلاشبہ میں نے اس پر ڈورے ڈالے پس وہ پوری قوت سے باز رہا اور اگر اس نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو یقیناً قید کیا جائے گا اور ذلیل ہوگا"

اوپر کی قرآنی صراحتوں کی روشنی میں:

﴿ ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ كَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ۝ ﴾ [یوسف:۵۲]

"وہ اس لیے کہ (عزیز مصر) یہ جان لے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کی چالوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتا"

عزیز مصر کی بیوی کا قول ہرگز نہیں ہوسکتا۔ چاہے "أَخُنْهُ" کی ضمیر کا مرجع عزیز مصر کو قرار دیا جائے یا حضرت یوسف علیہ السلام کو۔ جہاں تک اس کے شوہر عزیز مصر کو اس کا مرجع قرار دینے کا مسئلہ ہے تو یہ اس وجہ سے صحیح نہیں ہے کہ وہ اس کے حق میں خائن تھی۔ اگر چہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ بدکاری کرنے پر آمادہ نہیں کر سکی تھی۔

اور اگر "اَخُنْهُ" کی ضمیر کا مرجع حضرت یوسف علیہ السلام کو قرار دیا جائے تو یہ بھی درست نہیں ہوگا کیونکہ:

یہاں جو خیانت مراد ہے وہ "زوجیت میں خیانت" ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام اس کے شوہر نہیں تھے۔

اور اگر خیانت سے یہ مراد لیا جائے کہ عزیز مصر کی بیوی نے ان کی غیر موجودگی میں ان کی عیب جوئی نہیں کی اور ان پر کوئی بہتان تراشی نہیں کی تو واقعات کی روشنی میں یہ تفسیر حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ کیونکہ:

حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کی سختیاں صرف اس کے جھوٹے الزام کی وجہ سے برداشت کرنی پڑیں اور جتنی مدت وہ قید میں رہے اس کے پل پل کی اس کو خبر رہی ہوگی۔ اس لیے کہ ملک کے فرماں روا کے بعد دوسرے سب سے بڑے صاحب اقتدار کی وہ بیوی تھی۔ ان کی امانت و راست بازی، عصمت و عفت اور عالی ظرفی سے وہ سب سے زیادہ واقف تھی۔ اس کے دل میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ صرف اس کے جھوٹے الزام کے بنا پر اور اس کی شیطانی خواہش کو ٹھکرا دینے کی وجہ سے ایک

نہایت پارسا اور فرشتہ صفت انسان قید خانے میں دس بارہ سال سے پڑا سڑ رہا ہے۔ اگر اس کا ضمیر زندہ ہوتا تو وہ اپنے شوہر کو صحیح صورتحال سے آگاہ کر کے ان کی رہائی کی کوشش کرتی۔

اس پس منظر میں:

﴿ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ [یوسف:۵۱]

''عزیز کی بیوی نے کہا: اب حق آشکارا ہو گیا۔ میں نے ہی اس کو بدکاری پر آمادہ کرنے کے لیے ورغلایا تھا۔ بے شک وہ ان لوگوں میں سے ہے جو سچ بولتے ہیں''

عزیز مصر کی بیوی کی مجبوری تھی۔ اس کے ضمیر کی آواز نہیں تھی''!!

لہٰذا:

﴿ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴾

حتمی طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کا قول ہے جس کی گواہی آیت ۲۳ تا ۳۳ دے رہی ہیں۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ تو ان مفسرین کے اقوال کا خلاصہ تھا جو اسرائیلی روایات کے خلاف ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے سورہ یوسف کی تفسیر میں ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو اسلامی روح، قرآن کے سیاق وسباق، زبان و بیان اور عصمت انبیاء کے خلاف ہیں۔ اب ذیل میں ایسی چند روایتیں نقل کر دینا چاہتا ہوں جو اپنی سند کے اعتبار سے تو باطل ہیں ہی لیکن اپنے متن کے اعتبار سے بھی قرآن پاک اور عصمت انبیاء کے خلاف ہیں۔ مگر اس کے باوجود بہت سے مشہور مفسرین نے اپنی تفسیروں میں بے دھڑک ان کو نقل کر دیا ہے۔

(۲۳۷)...... احمد بن موسیٰ بن مردویہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

((لَمَّا قَالَ يُوْسُفُ: ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ" قَالَ لَهٗ جِبْرِيْلُ: يَا يُوْسُفُ اُذْكُرْ هَمَّكَ، قَالَ: وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِيْ))

''جب یوسف نے کہا: اس لیے تاکہ وہ...... عزیز مصر...... جان لے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی ہے۔ تو جبریل علیہ السلام نے ان سے کہا: اے یوسف! اپنے ارادے کو یاد کرو۔'' تو یوسف نے کہا: میں اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں''

یہ روایت نبی مکرم ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے۔ اولاً تو یہ روایت ابن مردویہ نے کسی سند کے بغیر بیان کی ہے اور حافظ سیوطی نے بھی الاتقان [1] اور الدر المنثور [2] میں اس کی کوئی سند بیان کرنے کی بجائے اس کو حاکم، ابن مردویہ اور دیلمی سے منسوب کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ دوم اس کا متن اللہ تعالیٰ کے قول وَهَمَّ بِهَا اور اس نے اس کا ارادہ کیا...... کی غلط تفسیر پر مبنی ہے جس کی صحیح تفسیر اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ اور سیاق وسباق اور قرآنی دلائل سے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں عزیز مصر کی بیوی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ تو درکنار اس کا خیال تک نہیں گزرا تھا۔ کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام تمام انبیاء کی طرح معصوم تھے۔

یہ روایت حارث بن اسامہ موقوف شکل میں کی ہے۔ جس کی سند بھی ضعیف ہے۔ کیونکہ اس میں خصیف بن عبدالرحمٰن جزری شامل ہے جو برے حافظہ کا مالک تھا۔ آخری عمر میں اس کا ذہنی توازن بھی بگڑ گیا تھا۔ مزید برآں اس پر ''مرجیہ'' فرقے سے نسبت رکھنے کا بھی الزام تھا [3]۔ انبیاء کرام کے حق میں اس کی روایات نہایت واہیات اور ناقابل اعتبار ہوتی تھیں۔

امام ابومحمد حسین بغوی نے ''معالم التنزیل'' [4] میں یہی روایت صیغۂ تمریض: قیل کہہ کر نقل کی ہے:

((لَمَّا قَالَ يُوسُفُ: ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ" قَالَ لَهُ جِبْرِيلُ: وَلَا حِينَ هَمَمْتَ بِهَا؟ فَقَالَ يُوسُفُ عِنْدَ ذَٰلِكَ وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي))

''جب یوسف علیہ السلام نے کہا: وہ اس لیے تاکہ عزیز مصر جان لے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی ہے۔ تو جبریل نے ان سے کہا: کیا تم نے اس وقت بھی اس کی خیانت نہیں کی جب اس کی بیوی کا ارادہ کیا؟ اس وقت یوسف علیہ السلام نے کہا: میں اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں''

بغوی آگے لکھتے ہیں: سدی کا بیان ہے:

((إِنَّمَا قَالَتْ لَهُ امْرَأَةُ الْعَزِيزِ: وَلَا حِينَ حَلَلْتَ سَرَا وِيلَكَ يَا يُوسُفُ! فَقَالَ: يُوسُفُ عِنْدَ ذَٰلِكَ: وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي))

---

[1] الاتقان: ص ۵۱۰ ج ۲ [2] الدر المنثور: ص ۲۳ ج ٤
[3] تقریب التهذیب ص ۱۳۳ ترجمہ: ۱۷۱۸ [4] معالم التنزیل: ص ٦٤٩

”دراصل یہ عزیز مصر کی بیوی نے کہا تھا: اے یوسف! کیا تم نے اس وقت بھی عزیز کی خیانت نہیں کی جب تم نے اپنا ازار بند کھولا تھا؟ اس موقع پر یوسف علیہ السلام نے کہا: میں اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں۔“

ایک معصوم اور فرشتہ صفت نبی کی عصمت وعفت کو مسخ کر دینے والی ان گندی روایتوں کو نقل کرنے والوں نے اگر اس آیت سے پہلے کی آیت پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال لی ہوتی جس کی تفسیر میں انہوں نے یہ گندی اور جھوٹی روایات نقل کی ہیں تو شاید وہ ایسا نہ کرتے۔ کیونکہ اس سے پہلے کی آیت میں عزیز مصر کی بیوی کا اعتراف بیان ہوا ہے:

﴿ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ الْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ۝ ﴾ [یوسف:۵۱]

”عزیز مصر کی بیوی نے کہا: اب حق آشکارا ہو گیا۔ میں نے ہی اس کو بدکاری پر آمادہ کرنے کے لیے ورغلایا تھا۔ بے شک وہ ان لوگوں میں سے ہے جو سچ بولتے ہیں“

واضح رہے کہ ”وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ“ سے عزیز کی بیوی کا اشارہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول کی طرف ہے:

﴿ هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ۝ ﴾ [یوسف:۲۶]

”اسی نے مجھے پھانسنے کی کوشش کی تھی“

اور اس سے قبل زنان مصر کے درمیان بیٹھ کر عزیز کی بیوی اس سے بھی بڑا اعتراف کر چکی تھی:

﴿ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ۝ ﴾

”بلاشبہ میں نے اس پر (بدکاری کے لیے) ڈورے ڈالے مگر وہ پوری شدت سے باز رہا“

تو کیا عزیز کی بیوی کے ان صریح اعترافات کے بعد اس کی زبان سے اس طرح کے الزامات نکل سکتے تھے جن کا دعویٰ اوپر نقل کردہ جھوٹی روایات میں کیا گیا ہے؟

(۲۳۸)......یَرْحَمُ اللّٰهُ أَخِیْ یُوْسُفَ لَوْ لَمْ یَقُلْ: اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَائِنِ الْأَرْضِ لَاسْتَعْمَلَهٗ مِنْ سَاعَتِهٖ وَلٰكِنْ اَخَّرَ ذٰلِكَ سَنَةً۔[1]

[1] سند کے اعتبار سے بھی یہ روایت ساقط ہے۔ حافظ ابن حجر نے تخریج الکشاف میں اس کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ حاشیہ علی الکشاف ص۳۰۰، ج۳

"اللہ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے اگر انہوں نے یہ نہ کہا ہوتا: مجھے زمین کے خزانوں کا نگراں مقرر کر دیجیے۔ تو اسی وقت ان کو اس منصب پر مقرر کر دیتا۔ لیکن ان کو اس درخواست کی وجہ سے ان کی تقرری کو ایک سال تک مؤخر کر دیا۔"

یہ روایت رسول اللہ ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ بلکہ بعض مفسرین نے اپنی کتابوں میں زیب داستان کے لیے نقل کر دی ہے۔ اور جس نے یہ روایت گھڑ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف اسے منسوب کیا ہے اس نے اپنے ذہن میں یہ فرض کر لیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا یہ کہنا: مجھے زمین کے خزانوں پر نگراں مقرر کر دیجیے نعوذ باللہ ان کی غلطی تھی۔ اس لیے سزا کے طور پر ان کو ایک سال تک زمین کے خزانوں کا نگراں نہیں مقرر کیا گیا۔ اس طرح اس نے دو نبیوں کے حق میں گستاخی کی ہے۔ درحقیقت تفسیر کی بیشتر کتابوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کی ذات، سیرت اور کردار پر ایک نبی کی ذات، سیرت اور کردار کے تناظر میں بحث نہیں کی گئی۔ بلکہ ایک عام انسان کی حیثیت سے بحث کی گئی ہے جو فکر وخیال اور قول وعمل میں مسلسل غلطیوں کا مرتکب ہوتا رہا۔ اس نے دعوت گناہ کے جواب میں "معاذ اللہ" کہنے کی غلطی کی۔ اس لیے عزیز کی بیوی کے ساتھ بدکاری کے قصد کی سزا پائی۔ اپنے قیدی ساتھی کی رہائی کے وقت اس سے کہا کہ اپنے آقا سے میرا حال بیان کرنا...... تو اس کو یہ سزا دی گئی کہ اس کی مدت قید میں اضافہ کر دیا گیا۔ اور جب بادشاہ نے اپنے ساقی کی زبانی اس کی راست روی، حسن اخلاق اور حق شناسی کے بارے میں سنا اور اپنے عجیب وغریب خواب کی نہایت بصیرت افروز اور حق کی ترجمان تعبیر سنی تو اس سے متاثر ہو کر اور اس کی عظمت کا معترف ہو کر یہ حکم دیا کہ "اس کو میرے پاس لاؤ تا کہ میں اس کو اپنا خاص معتمد بنا لوں۔ اور جب بادشاہ نے اس سے بات چیت کر کے اس کے علم ومعرفت کی مزید گہرائی اور وسعت کا حال معلوم کیا اور اس کو اپنے پاس صاحب قدر ومنزلت اور امین بنانے کا فیصلہ کیا تو اس عظیم ہستی نے بادشاہ سے فرمایا: میرا مقام یہ نہیں ہے۔ بلکہ میرا مقام یہ ہے کہ آپ مجھے زمین کے تمام ذرائع آمدنی کا نگراں اور ذمہ دار بنا دیجیے تا کہ ملک جس تباہ کن قحط کا سامنا کرنے والا ہے اس میں ملک کی پیداوار اور ذرائع آمدنی کے حسن استعمال کے اصول وضوابط بنا سکوں۔ اس طرح حسن تدبیر کے ذریعہ قحط سالی کی تباہ کاریوں سے اللہ تعالیٰ کے فضل وتوفیق سے محفوظ رہا جا سکے گا۔ تو اس کے مشورے کو بھی ایک ایسا گناہ قرار دے دیا گیا جس کی سزا یہ ملی کہ ایک سال تک بادشاہ نے اس کو زمین کے خزانوں کا نگراں مقرر نہیں کیا۔

آخر بادشاہ کے خواب کی تعبیر تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ہی بتائی تھی اور صرف تعبیر ہی نہیں بتائی تھی

بلکہ اس خواب میں جس ہولناک اور تباہ کن قحط کی پیشین گوئی کی گئی تھی اس کا مقابلہ کرنے اور اس سے نمٹنے کا طریقہ کار بھی بتایا تھا تو پھر اس میں نعوذ باللہ کیا گناہ تھا جو انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے اپنا معتمد خاص بنانے کی بجائے ملک کے تمام ذرائع آمدنی کا نگران بنا دو۔ کیونکہ صرف مجھے ہی یہ معلوم ہے کہ آئندہ آنے والے قحط کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا۔

دراصل تمام تفسیروں میں اس عظیم سورت کی تفسیر کچھ یوں کی گئی ہے کہ جتنے نقائص ذہنوں میں آسکتے تھے وہ حضرت یوسف علیہ السلام پر تھوپ دیے گئے ہیں۔ اور جو محاسن تھے وہ عزیز مصر کی بدکار بیوی کی جھولی میں ڈال دیے گئے۔ اسرائیلیات اور من گھڑت روایتوں پر مبنی اس کہانی کا بھیانک اور شرمناک انجام جس طرح دکھایا گیا ہے اس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''جب اس دن کے بعد ایک سال گزر گیا جس دن یوسف علیہ السلام نے ''امارت'' طلب کی تھی تو بادشاہ نے ان کو بلایا اور ان کے گلے میں اپنی تلوار حمائل کی۔ ان کے لیے سونے کی چارپائی رکھی گئی جو موتیوں سے آراستہ تھی اور اس پر ریشمی چادر ڈالی گئی۔ اس چارپائی کی لمبائی ۳۰ ہاتھ اور چوڑائی دس ہاتھ تھی اس پر تیس بستر اور ساٹھ تکیے تھے۔ پھر اس نے یوسف علیہ السلام کو نکلنے کا حکم دیا اور وہ تاج پہن کر نکلے۔ ان کا رنگ برف کی طرح سفید اور چہرہ چاند کی طرح روشن تھا۔ وہ چارپائی پر جلوہ افروز ہوئے اور تمام بادشاہ ان کے سامنے عاجزی سے کھڑے ہو گئے۔ بادشاہ اپنی عورتوں کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہو گیا اور مصر کے تمام معاملات یوسف علیہ السلام کو تفویض کر دیے۔ قطفیر ...... عزیز مصر...... کو اس کے عہدے سے بے دخل کر دیا اور یوسف علیہ السلام کو اس کی جگہ تعینات کر دیا۔ شاہ مصر فرعون کے پاس کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ بہت سارے خزانے تھے جن سب کا مالک اس نے یوسف علیہ السلام کو بنا دیا۔ انہی راتوں میں سے کسی رات میں قطفیر کی وفات ہو گئی۔ بادشاہ نے عزیز کی بیوی راعیل سے یوسف کا نکاح کر دیا اور جب یوسف علیہ السلام اس کے پاس خلوت میں گئے تو اس سے کہا: کیا یہ اس سے بہتر نہیں ہے جو تم چاہتی تھیں؟ تو اس نے جواب دیا: اے سراپا راستی! مجھے ملامت نہ کیجیے۔ کیونکہ میں خوبصورت اور نرم و نازک عورت تھی جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اور تمہارا صاحب عزیز مصر عورتوں سے بے تعلق تھا۔ جبکہ تم اللہ کے عطا کردہ حسن کے مالک تھے اس طرح میرا نفس مجھ پر غالب آ گیا۔ یوسف نے اس کو دوشیزہ پایا اور اس سے تعلق قائم کیا۔ جس کے نتیجے میں اس کے بطن سے ان کے دو بیٹے پیدا ہوئے: افرائیم بن یوسف اور منشا بن یوسف۔

وہب بن منبہ کا بیان ہے کہ زلیخا سے یوسف علیہ السلام کا نکاح اس وقت ہوا جب ان کے بھائی ان کے

پاس آئے اور زلیخا کا شوہر اس وقت وفات پا گیا تھا جب یوسف علیہ السلام ابھی قید میں تھے۔ اس کا مال ختم ہو گیا۔ یوسف علیہ السلام کی محبت میں روتے روتے اس کی بصارت چلی گئی اور وہ بھیک مانگنے لگی۔ کچھ لوگ اس پر ترس کھاتے اور کچھ نہیں۔ اور یوسف علیہ السلام کا جلوس ہر ہفتہ نکلتا جس میں ان کی قوم کے ایک لاکھ سردار حصہ لیتے۔ اس سے کہا گیا کہ اگر تو یوسف کے سامنے آ جائے تو ممکن ہے کہ وہ تیری مدد کریں۔ پھر اس سے یہ کہا گیا کہ نہیں تو ان سے تعرض مت کر۔ ممکن ہے کہ ان کو تیری حرکتیں یعنی ان کو تیر اور غلانہ اور اپنا قید ہو جانا یاد آ جائے اور تجھ سے برا برتاؤ کریں۔ تو اس نے جواب دیا: مجھے اپنے محبوب کے اخلاق کا تم سے زیادہ علم ہے۔ یہاں تک کہ جب یوسف علیہ السلام کا جلوس نکلا تو اس نے بلند آواز سے کہا: پاک ہے وہ ذات جس نے بادشاہوں کو ان کی معصیت کی پاداش میں غلام اور غلاموں کو ان کی اطاعت کے نتیجے میں بادشاہ بنا دیا۔ یہ سن کر یوسف علیہ السلام نے فرمایا: یہ کون ہے؟ تو لوگ اس کو ان کے پاس لائے۔ اس نے کہا: میں وہ ہوں جو اپنے پیروں پر تمہاری خدمت کرتی تھی اور تمہاری زلفیں اپنے ہاتھوں سے سنوارتی تھی۔ میرے گھر میں تمہاری تربیت ہوئی۔ میں نے تمہیں بہترین ٹھکانہ دیا لیکن میری جہالت اور سرکشی کی وجہ سے مجھ سے بعض حرکتوں کا صدور ہو گیا جس کی سزا بھگت رہی ہوں۔ میرے پیسے جاتے رہے، طاقت جاتی رہی اور میری ذلت و مسکنت طویل ہو گئی۔ آنکھیں چلی گئیں۔ ایک وقت تھا کہ لوگ میرے اوپر رشک کرتے تھے اور آج ان کے رحم و کرم کی محتاج ہوں۔ لوگوں سے بھیک مانگتی ہوں کوئی مجھ پر رحم کھاتا ہے کوئی نہیں کھاتا۔ یہ جزا ہے مفسدین کی۔ اس پر یوسف علیہ السلام رو پڑے اور فرمایا: کیا اب بھی تمہارے دل میں میری محبت ہے؟ اس نے جواب دیا: تمہارے انور امور پر ایک نظر ڈال لینا میرے لیے دنیا اور اس کے ساری متاع سے زیادہ محبوب ہے۔ تم مجھے اتنے کوڑے کا کنارا پکڑواؤ۔ یوسف علیہ السلام نے اس کو اپنے کوڑے کا کنارہ پکڑوایا تو اس نے اس کو اپنے سینے پر رکھ لیا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس کے دل کی تیز دھڑکن سے کوڑا ان کے ہاتھ میں لرز رہا ہے۔ یوسف علیہ السلام رونے لگے۔ پھر اپنے گھر چلے گئے اور اس کے پاس اپنا قاصد یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اگر تم بے شوہر ہو تو ہم تم سے شادی کر لیں گے۔ اور اگر تم شوہر دار ہو تو ہم تم کو دولت سے مالا مال کر دیں گے۔ اس نے قاصد سے کہا: اللہ کی پناہ مانگتی ہوں کہ بادشاہ مجھ سے مذاق کرے۔ بادشاہ نے اس وقت مجھ کو نہیں چاہا جب میں جوان تھی، غنی تھی، صاحب مال تھی، عزت دار تھی کیا وہ مجھے آج چاہتا ہے جبکہ میں بوڑھی ہوں، اندھی ہوں اور فقیر و محتاج ہوں۔ قاصد نے واپس جا کر یوسف علیہ السلام کو اس کی بات پہنچائی۔ پھر جب دوسرے ہفتے یوسف علیہ السلام کی سواری نکلی تو وہ ان کے

سامنے آئی۔ انہوں نے اس سے فرمایا: کیا قاصد نے تمہیں میرا پیغام نہیں پہنچایا؟ اس نے جواب دیا: میں نے آپ کو یہ بتا دیا کہ آپ کے رخ انور پر ایک نظر میرے نزدیک دنیا اور اس کی ساری دولت سے زیادہ محبوب ہے۔ یہ سن کر یوسف علیہ السلام کے حکم پر اس کے حالات درست کیے گئے۔ اس کو سنوارا گیا اور ان کے گھر اس کی رخصتی ہوئی۔ یوسف علیہ السلام نماز کے لیے کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے لگے۔ وہ بھی ان کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ یوسف علیہ السلام نے اللہ سے دعا مانگی کہ اس کی جوانی، خوبصورتی اور بصارت واپس کر دے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی جوانی، حسن و جمال اور بصارت لوٹا دی یہاں تک کہ وہ اس دن سے بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی جس دن اس نے یوسف علیہ السلام پر ڈورے ڈالے تھے۔ یہ سب کچھ اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے یوسف کے بچے رہنے کی وجہ سے، ان کی تکریم کے طور پر ہوا۔ اور جب انہوں نے اس کے ساتھ تعلق قائم کیا تو اس کو دوشیزہ پایا۔ اس طرح دونوں نے نہایت عیش و عشرت کی زندگی گزاری اور اس کے بطن سے یوسف علیہ السلام کے دو بیٹے افرائیم اور منشا پیدا ہوئے۔

اس جھوٹی اور من گھڑت روایت میں جس انسان کی تصویر پیش کی گئی ہے وہ ''فسانہ عجائب'' کا کوئی کردار تو ہو سکتا ہے لیکن کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے پردادا ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے شدید ابتلاء اور آزمائش میں ڈالا اور کامیاب ہونے پر ان کو دنیا کا امام بنا دیا۔

لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پرپوتا ایک ایک کر کے تمام آزمائشوں میں کامیاب رہا جس کی گواہی سورۂ یوسف کی آیتیں دے رہی ہیں تو اس کو ''داستانِ حسن و عشق'' کا ہیرو بنا دیا گیا۔ ایں چہ بوالعجبی است''!

صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اہل تصوف نے حضرت یوسف علیہ السلام جیسے معصوم اور اللہ کے برگزیدہ نبی...... اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ..... کی پاکیزہ سیرت کو نظر انداز کر کے ان کے بارے میں جھوٹی اور من گھڑت روایات کی بنیاد پر ''داستان یوسف و زلیخا'' تصنیف کر ڈالی۔ جس میں اللہ کے نبی کو ایک عاشق کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ عزیز مصر کی بیوی اور دوسری زنانِ معصیت کو دعوتِ گناہ اور ان کی بدکاریوں اور ایک معصوم انسان کو بدکاری میں مبتلا کرنے کے لیے ان کی مکاریوں اور فریب کاریوں کو ''عشق'' کی کارفرمائی قرار دے کر ان کو ولایت کے مقام پر فائز کر دیا گیا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی ''تلوین'' اور ''تمکین'' کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

صاحب تلوین صاحب حال ہے اور صاحب تمکین حقیقت شناس ہے۔ صاحب تلوین ابھی راہ میں ہے اور صاحب تمکین واصل ہو چکا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں زنان مصر صاحب تلوین تھیں اور

حضرت زلیخا صاحب تمکین۔[1]

اہل تصوف کے نزدیک تلوین وتمکین کی کتنی کچھ اہمیت ہے اس کو جاننے کے لیے مولانا کی کتاب ''تفسیر بیان القرآن'' میں سورۃ الفاتحہ کی آیت ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ'' کی تفسیر کا مطالعہ کیجیے۔ وہاں آپ کو توحید کا ایک نیا مفہوم ملے گا۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ہر طرح کی آزمائشوں میں ڈال کر پرکھ لیا اور وہ ہر آزمائش میں کامیاب نکلے تو ان کو مصر کی اس سرزمین میں مکمل اقتدار واختیار بخش دیا جس میں وہ ایک زر خرید غلام کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ یَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَآءُ نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴾ [یوسف:۵۶]

''اور اس طرح ہم نے یوسف کو زمین میں اقتدار بخش دیا کہ وہ اس میں جہاں چاہے تصرف کرے۔ ہم اپنے فضل سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں اور ہم نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے''

اس ''تمکین فی الارض'' کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے اس دینِ توحید کی نشر واشاعت کے لیے اپنا سارا وقت صرف کر دیا ہوگا جس کا آغاز انہوں نے قید میں ذرا سی فرصت ملنے پر اپنے قیدی ساتھیوں کے درمیان کر دیا تھا۔

اور جب سخت قحط اور مالی پریشانی کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے سامنے اپنی بے مائیگی کا اظہار کرتے ہوئے ان سے صدقہ وخیرات کی درخواست کی۔

﴿ یٰۤاَیُّهَا الْعَزِیْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَیْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَیْنَا اِنَّ اللّٰهَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ ﴾ [یوسف:۸۸]

''اے عزیز! ہم کو اور ہمارے اہل وعیال کو سخت تکلیف نے آ لیا ہے اور ہم معمولی سی پونجی لے کر آئے ہیں لہٰذا آپ ہمیں پورا غلہ دیجیے اور ہمیں صدقہ بھی عنایت فرمایئے بے شک اللہ صدقہ دینے کو بدلہ دیتا ہے''

یہ وہ مقام تھا جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے پورے وجود کو ہلا ڈالا۔ ان کے سامنے ان کے وہ سوتیلے بھائی کھڑے ان سے صدقہ وخیرات کی بھیک مانگ رہے تھے جنہوں نے ان کو گھر سے بہت دور

[1] شریعت و طریقت ص: ۳۵۲

لے جا کر نہایت بے دردی سے ایک اندھے کنویں میں پھینک دیا تھا۔ اس وقت یوسف علیہ السلام کی نگاہوں میں ان کے بوڑھے باپ کا منظر گھوم گیا ہوگا جن کی بے کسی اور فقر و محتاجی کی ان کے بیٹے نمائندگی کر رہے تھے۔ اب ان کے لیے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ اپنے اور اپنے بھائیوں کے درمیان حائل اجنبیت کے پردے کو مزید باقی رہنے دیں۔ چنانچہ آپ بول پڑے:

﴿ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ۝ ﴾ [یوسف:۸۹]

''کیا تمہیں علم ہے کہ تم نے اپنی نادانی کے زمانے میں یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کچھ کیا تھا؟''

حضرت یوسف علیہ السلام کے اس سوال نے ان کو چونکا دیا اور وہ بول اٹھے:

﴿ قَالُوْٓا ءَ اِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَ هٰذَآ اَخِيْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۝ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ۝ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ۝ ﴾ [یوسف:۹۰، ۹۱، ۹۲]

''انہوں نے کہا: کیا آپ واقعی یوسف ہیں؟ اس نے کہا: میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر فضل فرمایا ہے۔ بے شک جو تقویٰ اختیار کرتے اور صبر کرتے ہیں تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا: اللہ کی قسم اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت بخشی اور واقعی ہم خطا کار تھے۔ اس نے کہا: آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے''

کس قدر اثر انگیز ہے وہ منظر جو ان آیتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف وہ مجرم بھائی کھڑے ہیں اور دوسری طرف وہ برگزیدہ نبی ہے جو بلا شرکت غیرے ایک بہت بڑی سلطنت کا فرماں روا ہے۔ وہ ان کے کالے کرتوتوں اور ان کے ہاتھوں اپنے اوپر ہونے والے ہر ہر ظلم کی نہایت عبرتناک سزا دے سکتا تھا۔ لیکن اس کی عظیم زبان نے ان کے جرائم کا ذکر تک گوارا نہ کیا بلکہ فرمایا تو یہ:

''آج تم پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ اللہ تمہیں معاف کرے۔ وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے''

اور نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ نے جو یہ فرمایا تھا:

''خود باعزت، باعزت کا بیٹا، باعزت کا پوتا اور باعزت کا پڑپوتا...... یوسف بن یعقوب بن

اسحاق بن ابراہیم تھے، علیہم الصلوٰۃ والسلام اجمعین

تو اس ارشاد نبوی میں حضرت یوسف علیہ السلام کی جو صفت "کریم ابن کریم" بیان کی گئی ہے اس نے ان کی عظیم شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ یعنی باعزت، درگزر کرنے والا، وسیع الظرف، عالی ہمت اور برگزیدہ انسان۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے کردار کی عظمت اس وقت اور نمایاں ہو گئی جب ان کے والدین ان کے پاس پہنچ گئے۔

﴿ وَ رَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا ؕ وَ قَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ اِخْوَتِیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ۝ ﴾ [یوسف:۱۰۰]

"اور یوسف نے اپنے والدین کو اٹھا کر تخت پر بٹھا لیا اور سب اس کے آگے سجدے[1] میں گر گئے۔ یوسف نے کہا: ابا جان! یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ میرے رب نے اسے حقیقت بنا دیا۔ اس نے اس وقت میرے اوپر بڑا فضل فرمایا جب اس نے مجھے قید خانے سے نکالا اور آپ لوگوں کو بادیہ سے یہاں لایا بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان رنجش پیدا کر دی تھی۔ بے شک میرا رب جو کچھ چاہتا ہے اس کے لیے نہایت باریک بین ہے۔ بے شک وہ علیم و حکیم ہے۔"

کس قدر تواضع اور انکسار ہے حضرت یوسف علیہ السلام کے الفاظ میں۔ وہ دنیوی عروج و ترقی کی آخری بلندی پر ہیں۔ جبکہ ان کے مجرم اور حاسد بھائی ان کے سامنے سرنگوں کھڑے ہیں۔ مگر ان کی زبان مبارک سے اپنے بھائیوں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں نکلتا۔ بلکہ انہوں نے ان کے خلاف جن جرائم کا ارتکاب کیا ہے ان پر ان کی ملامت کرنے یا ان سے کوئی شکایت کرنے کے بجائے یہ کہہ کر ان کی صفائی پیش کر دی کہ "دراصل میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان رنجش اور فساد کے بیج شیطان نے بوئے تھے"

برادران یوسف موحد تھے:

اہل کتاب، خصوصیت کے ساتھ یہودیوں کے اس دعویٰ کی اللہ تعالیٰ نے تردید فرمائی ہے کہ ان کے آباء و اجداد یہودی تھے۔ ان کے جد امجد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس وصیت کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے ان کے خود ساختہ دین یہودیت کی جڑ کاٹ دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

[1] اس سجدے کی حقیقت فرشتوں کے سجدۂ آدم کے ذیلی عنوان کے تحت دلائل کے ساتھ واضح کی جا چکی ہے۔

﴿ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ٥ ﴾ [البقرۃ:۱۳۳]

''کیا تم اس وقت حاضر تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا تھا؟ جب اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا: تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا: ہم تیرے معبود اور تیرے آباء واجداد: ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق (علیہم السلام) کے معبود کی عبادت کریں گے جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے مسلم وفرماں بردار ہیں''

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ یہودیوں کو حضرت یعقوب علیہ السلام کی آخری وصیت اس لیے یاد دلائی گئی ہے کیونکہ وہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد و بنو اسرائیل ہیں۔ تاکہ ان پر یہ حجت قائم کی جاسکے کہ اگر انہوں نے دین توحید اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کر رکھا ہے تو وہ مردود ہے۔ اس لیے کہ جن عظیم بزرگوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب (۲۸) سے نسبت کا ان کو دعویٰ ہے ان کا دین تو اسلام ہی تھا۔ یعقوب علیہ السلام کی اولاد نے اپنے باپ کے سامنے یہ اقرار کیا تھا کہ وہ صرف اللہ واحد کی عبادت کریں گے اور صرف اسی کی اطاعت و فرماں برداری کریں گے۔ اس دینِ توحید کا آخری نسخہ نبی آخر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس دنیا میں دوبارہ بھیجا گیا ہے جس پر ان کا ایمان لانا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نبی اور رسول ماننا فرض تھا۔

لیکن جب خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو یہودیوں نے آپ کو نبی ماننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے یہودی اس نبی کا نہایت شدت سے انتظار کر رہے تھے جن کی بعثت کی پیشین گوئیاں ان کے انبیاء نے کی تھیں اور وہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ وہ نبی جلد آئے اور کفار کا غلبہ مٹے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ٥ ﴾

[البقرۃ:۸۹]

''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آگئی جو اس کتاب کی تصدیق کر رہی تھی جو ان کے پاس تھی اور اس کی آمد سے پہلے وہ ان لوگوں پر فتح ونصرت کی دعا مانگا کرتے تھے جنہوں نے کفر کی روش اختیار کر رکھی تھی۔ اور جب وہ رسول آگیا جسے انہوں نے پہچان لیا تو

انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ پس اللہ کی لعنت ہو منکرین حق پر"

یہودیوں کی حق دشمنی کی مثالیں:

اوپر نقل کردہ آیت مبارکہ میں رسول اکرم ﷺ کی دعوت حق کے بارے میں یہودیوں کے جس معاندانہ موقف کو بیان کیا گیا ہے اس کی وضاحت اس واقعہ سے ہوتی ہے جسے ابن اسحاق نے حسن سند سے بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں:

مجھ سے صالح بن ابراہیم بن عبدالرحمن بن عوف نے محمود بن لبید سے اور انہوں نے حضرت سلمہ بن سلامہ بن وقش رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا: ہمارا ایک یہودی پڑوسی تھا۔ ایک دن وہ اپنے گھر سے نکلا اور بنو عبدالاشہل کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت میں کمسن تھا۔ اس نے قیامت، حساب و کتاب، میزان اور جنت و جہنم کا ذکر شروع کر دیا۔ یہ باتیں اس نے جن لوگوں کے سامنے کہیں وہ بت پرست تھے اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے اس سے کہا: برا ہو تمہارا، کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ ایسا ہوگا اور لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ لوگوں نے پوچھا: تمہاری اس بات کی دلیل کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: اس ملک سے ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے۔ اس نے مکہ اور یمن کی جانب اشارہ کیا۔ لوگوں نے دریافت کیا: ہم اس نبی کو کب دیکھیں گے؟ اس نے میری طرف دیکھا درآنحالیکہ میں کمسن تھا اور کہا: اگر یہ لڑکا اپنی آخری عمر کو پہنچے گا تو اس نبی کو پالے گا۔

حضرت سلمہ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم رات اور دن کی گردش جاری رہی یہاں تک کہ اللہ نے محمد بن عبداللہ ﷺ کو مبعوث فرما دیا اور وہ یہودی ہمارے درمیان زندہ رہا۔ ہم نبی مکرم ﷺ پر ایمان لائے جبکہ اس نے سرکشی اور حسد کی بنا پر آپ کی نبوت کا انکار کر دیا۔ ہم نے اس سے کہا:

اے فلاں! تم پر افسوس! کیا تم وہ نہیں جس نے نبی مکرم ﷺ سے متعلق یہ اور یہ باتیں کہی تھیں؟ اس نے کہا: کیوں نہیں؟ لیکن محمد ﷺ وہ نہیں ہیں۔ [1]

ابن اسحاق نے دوسرا واقعہ منقطع سند کے ساتھ نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

بنو قریظہ کے بھائی، بنو ہدل کے یہودیوں سے تعلق رکھنے والے ثعلبہ بن سعید، اسید بن سعید اور اسد بن عبید کے اسلام لانے کا سبب یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت سے چند سال قبل شام کا ایک یہودی

[1] سیرة ابن هشام: ص ٢١٢، ج١۔ سیر أعلام النبلاء: ص ٦٨۔٦٩، ج١

مدینہ آیا تھا جس کا نام ''ابن الھیبان'' تھا۔ اس نے ان کو یہ بتایا تھا کہ شام سے اس کے مدینہ آنے کا سبب یہ ہے کہ اس کو ایک نبی کی بعثت کی امید ہے اور وہ ان کی اتباع کی غرض سے شام سے ہجرت کر کے مدینہ آیا ہے۔ اس نے مدینہ کے یہودیوں کو یہ دعوت دی کہ اگر وہ اس نبی کا زمانہ پائیں تو اس کی اتباع کریں۔ اور اس فضیلت میں کسی کو اپنے سے سبقت نہ لے جانے دیں۔ اس نے نبی منتظر کی بعض صفات بھی بتائی تھیں۔ چنانچہ جس وقت نبی کریم محمد رسول اللہ ﷺ نے خیبر میں بنونضیر کا محاصرہ کیا اس وقت ثعلبہ بن سعید، اسید بن سعید اور اسد بن عبید نوجوان تھے۔ انہوں نے ابن الھیبان کی بیان کردہ صفات سے نبی کریم ﷺ کو پہچان لیا اور انہوں نے بنونضیر سے کہا:

''اللہ کی قسم یہ وہی نبی ہیں جن پر ایمان لانے کا عہد تم سے ابن الھیبان نے لیا تھا'' لیکن بنو نضیر نے ان کو جواب دیا کہ ''یہ وہ نہیں ہیں''۔ بنونضیر کا یہ جواب سن کر وہ تینوں قلعہ سے اترے اور نبی مکرم ﷺ پر ایمان لے آئے۔ اس طرح اپنی جان و مال اور اہل خانہ کو بچالیا''۔[1]

اس واقعہ کی اصل صحیحین میں ہے البتہ ابن اسحاق کی بیان کردہ تفصیلات ان میں نہیں ہیں۔[2]

قرآنی آیات، صحیح احادیث اور حلقہ بگوش اسلام ہونے والے یہودیوں کے اعترافات اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یہودیوں نے نبی اکرم ﷺ کی نبوت کا انکار نادانی اور جہالت کے نتیجے میں نہیں کیا تھا بلکہ یہ یقین و اذعان حاصل ہو جانے کے بعد کیا تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے وہی نبی اور رسول ہیں جن کے اوصاف ان کی کتابوں میں بیان ہوئے ہیں۔

یہودیوں کے انکار حق کے اسباب:

آغاز امر میں بنو اسرائیل دین توحید ہی پر کاربند تھے اور ان کے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام نے، جن کا لقب اسرائیل...... اللہ کا بندہ...... تھا اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے بیٹوں سے یہی عہد لیا تھا کہ وہ اپنے آباء واجداد کے عقیدہ توحید کے حامل اور ان کے طریقہ عبادت پر عمل پیرا رہیں گے جس کی ہدایت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو کی تھی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ وَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا

[1] سیرۃ ابن ہشام: ص ۲۱۳، ۲۱۴، ج ۱۔ سیر أعلام النبلا: ص ۶۹، ج ۱
[2] دیکھئے: صحیح بخاری: ح ۴۰۲۸۔ صحیح مسلم: ح ۱۷۶۶

تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ [البقرہ: ۱۳۲، ۱۳۳]

''اس کی...... یعنی اسلام کی...... ہدایت ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے اپنے بیٹوں کو کی تھی کہ اے میرے بیٹو! درحقیقت اللہ نے تمہارے لیے دین اسلام کو چن لیا ہے۔ لہٰذا تم لوگ مرتے دم تک مسلمان رہنا۔ کیا تم اس وقت حاضر تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا۔ جس وقت اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا تھا کہ ہم آپ کے معبود، آپ کے باپ دادا: ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبود واحد کی عبادت کریں گے اور ہم اسی کے مطیع و فرمانبردار ہیں''

بنو اسرائیل نے اپنے باپ سے جو عہد کیا تھا اس عہد پر وہ ایک عرصہ تک قائم رہے اور اپنے گرد و پیش کی مشرک اور گمراہ قوموں کے درمیان تنہا وہی اپنے عقیدۂ و عمل سے توحید کی نمائندگی کرتے رہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے انعام و اکرام کی بارش کی۔ دوسری قوموں پر ان کو فضیلت بخشی اور ان کو دنیا کا امام بنائے رکھا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [المائدہ: ۲۰]

''یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تمہیں عطا کی تھی۔ اس نے تم میں نبی پیدا کیے اور تم کو فرماں روا بنایا۔ اور تم کو وہ کچھ دیا جو اس نے دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا''

اس آیت مبارکہ میں بنو اسرائیل کی اس عظمت کی طرف اشارہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کسی زمانے میں ان کو حاصل تھی۔ ایک طرف ان میں حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام جیسے جلیل القدر نبی پیدا ہوئے اور دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں اور ان کے بعد مصر میں ان کو بڑا اقتدار نصیب ہوا۔ مدت دراز تک یہی اس زمانے کے مہذب اور دنیا کے سب سے بڑے فرماں روا تھے۔

درحقیقت بنو اسرائیل مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنی عظمت و سربلندی کے اسباب سے دور ہوتے چلے گئے اور ان اعمال کی بجائے جو ان کے رب کی رضا اور خوشنودی کے موجب تھے ایسے اعمال کا

ارتکاب کرنے لگے جو اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کی ناراضگی کے موجب تھے۔ انہوں نے اس دینی میراث کو بھلا دیا جو ان کو اپنے انبیاء اور رسولوں سے ملی تھی۔ اپنے اوپر ہونے والے انعام واکرام نے ان کے اندر شکر و امتنان کے جذبات پیدا کرنے کی بجائے غرور نفس پیدا کر دیا اور وہ اس خود فریبی میں مبتلا ہو گئے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں سے بلند و برتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا پر جو فضیلت بخشی تھی وہ ان کا ذاتی استحقاق تھی اس لیے کہ وہ اللہ کے چہتے ہیں:

﴿ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ﴾ [المائدہ:۱۸]

''اور یہود و نصاریٰ کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں''

اور یہ محض یہودی عوام کا جاہلانہ خیال نہ تھا بلکہ ان کے بڑے بڑے علماء اور مذہبی پیشوا بھی یہی خیال رکھتے تھے۔ تمام غیر یہودیوں اور غیر اسرائیلیوں سے اپنے آپ کو برتر تصور کرتے تھے اور معاملات میں ان کے ساتھ ظلم اور زیادتی کو روا رکھتے تھے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ۝ ﴾ [آل عمران:۷۵]

''اور اہل کتاب میں ایسا بھی ہے کہ اگر تم اس کے پاس ڈھیروں مال امانت رکھ دو تو وہ اسے تم کو ادا کر دے گا۔ اور ان میں ایسا بھی ہے کہ اگر تم اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو وہ اسے تم کو ادا نہ کرے گا الا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ان کا یہ دعویٰ ہے: امیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ جبکہ وہ اللہ پر جانتے بوجھتے جھوٹ گھڑتے ہیں''

جس زمانے میں یہ آیت نازل ہوئی اس زمانے میں مدینے کے یہودیوں کی اکثریت اس اخلاقی پستی میں گر چکی تھی اور ان میں حق پسندوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان میں سے صرف بعض یہودیوں کو امانت میں خیانت کرنے والا قرار دیا ہے۔

یہودیوں کے جھوٹے پندار اور بنو اسماعیل...... یعنی عربوں پر ان کے احساس برتری نے ان کو نبی عربی ﷺ پر ایمان لانے سے باز رکھا۔ حالانکہ ان کو پورے یقینِ قلب کے ساتھ یہ معلوم تھا کہ محمد

عربی ﷺ اللہ کے وہی رسول ہیں جن کا ذکر ان کی کتابوں میں آیا ہے۔ اور جن کی بعثت کا وہ انتظار کر رہے تھے اور جن پر ایمان لانے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ وہ ان کو اپنی رحمتوں سے نوازے گا۔

چنانچہ کوہ سینا پر حاضری کے موقع پر جب بنو اسرائیل کی گاؤ پرستی کے نتیجے میں ان کو ایک شدید زلزلے نے آلیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے جو عاجزانہ دعا کی اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا کہ وہ اپنی رحمت ان لوگوں کے حق میں لکھے گا جو اس کا تقویٰ اختیار کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور اس کی آیتوں پر ایمان لائیں گے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس کی اس رحمت کے مستحق نبی امی کی اتباع کرنے والے بھی ہوں گے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ ﴾ [الاعراف:۱۵۷]

”(یہ رحمت ان لوگوں کے حصے میں بھی آئے گی) جو رسول، نبی امی کی اتباع کریں گے جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں“

مطلب یہ ہے کہ نبی امی ﷺ کا ذکر یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں مثبت ہے۔ محض سنی سنائی باتوں کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس نبی کو پانے والوں کی فلاح و کامیابی اس نبی پر صدق دل سے ایمان اور اس کی پیروی پر موقوف ہے۔

قرآن یہ بھی صراحت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کے ذریعہ ان کی امتوں سے یہ عہد لیتا رہا ہے کہ ان کے پیروؤں میں سے جس کو بھی کسی اور نبی کا زمانہ ملے گا تو اس کو اپنے نبی کے ساتھ ساتھ اس نبی پر بھی ایمان لانا ہوگا۔ اور جو کوئی بعد میں آنے والے نبی پر ایمان نہ لائے گا وہ اس نبی کا بھی انکاری مانا جائے گا جس کی امت سے وہ نسبت رکھتا ہوگا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ۝ ﴾ [آل عمران:۸۱]

”یاد کرو اس وقت کو جب اللہ نے نبیوں سے یہ عہد لیا تھا کہ میں نے تمہیں جو کتاب و حکمت

دی ہے اس کے بعد اگر پھر کوئی رسول اس کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو تمہارے پاس موجود ہے تو یقیناً تم اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ اللہ نے فرمایا: ''کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: اچھا تو تم گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں''

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جو کوئی اس عہد و میثاق کی خلاف ورزی کرے گا وہ ایمان سے خارج ہو جائے گا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ [آل عمران:۸۲]

''جو کوئی اس کے بعد اس عہد سے پھر جائے گا تو ایسے لوگ فاسق ہیں''

یعنی ایمان سے خارج ہیں۔

اس حقیقت کو نبی ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں یوں واضح فرمایا ہے:

((وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ لَوْ بَدَا لَكُمْ مُوْسٰی فَاتَّبَعْتُمُوْهُ وَتَرَكْتُمُوْنِیْ لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِیْلِ وَلَوْ كَانَ حَیًّا وَاَدْرَكَ نُبُوَّتِیْ لَاتَّبَعَنِیْ))[1]

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اگر تمہارے سامنے موسیٰ ظاہر ہو جائیں اور تم ان کے پیرو بن جاؤ اور مجھے چھوڑ دو تو تم سیدھی راہ سے بھٹک جاؤ گے اور اگر موسیٰ زندہ ہوتے اور ان کو میری نبوت کا زمانہ ملتا تو وہ میری پیروی کرتے''

اوپر کی وضاحتوں سے معلوم ہوا کہ اللہ کے بھیجے ہوئے تمام انبیاء اور رسولوں پر ایمان لانا اور ان کو اللہ کا رسول ماننا اسلامی عقیدہ ہے۔ کسی ایک بھی رسول کی رسالت کا انکار تمام رسولوں کا انکار ہے جو منافی ایمان ہے۔

اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی نبی کی بعثت کے بعد اس پر ایمان لانا اور اس کی پیروی کرنا جس طرح ان لوگوں پر فرض رہا ہے جو کسی نبی کے پیرو نہیں تھے، اسی طرح ان لوگوں پر اس کو رسول ماننا اور اس کی پیروی کرنا بھی فرض تھا جو اس سے پہلے آنے والے کسی نبی کے پیرو تھے۔

جس طرح یہ قرآنی عقیدہ ہے ٹھیک اسی طرح یہ اہل کتاب کا بھی عقیدہ رہا ہے اور یہود و نصاریٰ نے اگرچہ اپنے انبیاء کی لائی ہوئی بیشتر تعلیمات بھلا دی ہیں مگر یہ عقیدہ ان کی کتابوں میں باقی رہ گیا

---

[1] سنن دارمی: ح ۴۳۹

جس کا ثبوت درج ذیل واقعہ ہے:

صیہونی تحریک کا بانی ہرتزل Hertzel اپنی اس تحریک کی تائید حمایت حاصل کرنے کے لیے جب عیسائی پوپ دہم PIUS کے پاس گیا تو پوپ نے اس کی باتوں کو نہایت سرد مہری سے سنا اور یہودیوں کو ''بے دین'' قرار دے کر ان کی حمایت اور مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے ہرتزل سے کہا:

درحقیقت یہودیت ہی ہمارے دین کی اساس اور اصل ہے لیکن مسیحیت نے اپنی آمد کے بعد یہودیت کی جگہ لے لی ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ ہم یہودیوں کی جو مدد کر چکے ہیں اس میں مزید اضافہ کریں۔ یہودیوں سے جس بات کی توقع تھی وہ یہ کہ مسیح کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہتے، مگر انہوں نے آج تک ایسا نہیں کیا۔[1]

انہوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت کا انکار کر دیا بلکہ ان کا مذاق اڑایا۔ ان پر اور ان کی پاکباز ماں پر نہایت گھناؤنے الزامات لگائے۔ آخر میں ان کو شہید کرنے کی ناپاک کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بچا لیا۔

جب نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی تو انہوں نے اپنی اسی گندی ذہنیت کا مظاہرہ کیا جس کا مظاہرہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں کر چکے تھے۔ حالانکہ آپ کی بعثت سے قبل وہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جب وہ آخری نبی آئے گا تو وہ اس پر ایمان لا کر اہل شرک کی جڑ کاٹ دیں گے۔

دعوت اسلامی کے مکی دور میں نازل ہونے والی بہت سی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے دین کی راہ میں بنو اسرائیل کی قربانیوں اور ان کے صبر و تحمل کی تعریف کی ہے۔ اس دور میں نبی اکرم ﷺ کی دعوت کے مخاطب بنیادی طور پر مشرکین مکہ ہی تھے اور ان کا ذکر اولاً تو ضمناً آیا ہے۔ ثانیاً جا بجا ان کی تعریف کی گئی ہے اور ایک مؤمن جماعت کی حیثیت سے ان کو پیش کیا گیا ہے۔ مگر اس احسان فراموش قوم نے اسلامی دعوت پر کان دھرنے کی بجائے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ حالانکہ ان کو پورے یقین قلب سے یہ معلوم تھا کہ اسلام وہی دین ہے جس کی دعوت ان کے انبیاء دیتے آئے تھے۔ توحید سے لے کر عبادات اور معاملات تک میں قرآن کی تعلیمات میں وہی روح کارفرما ہے جو روح تورات کی تعلیمات میں کارفرما تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے اسلامی دعوت کے بارے میں معاندانہ موقف ہی اختیار کیا۔

ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ یہودی علماء اور مذہبی پیشوا اس ہٹ دھرمی پر اتر آئے کہ مشرکین

---

[1] الیہود المتعدون ص ۱۵۶

مکہ کو نبی اکرم ﷺ کے پیروِ اہل توحید سے زیادہ ہدایت یافتہ قرار دے دیا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴾ [النساء:٥١]

''(اے نبی!) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا وہ جبت اور طاغوت پر ایمان لاتے ہیں۔ اور کفر کرنے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ لوگ ایمان لانے والوں سے زیادہ ہدایت پر ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ اور جس پر اللہ لعنت کرے تو تم اس کا کوئی مددگار نہیں پا سکتے''

دراصل بنواسماعیل سے بغض و نفرت، ان سے افضل اور برتر ہونے کے احساس اور دنیوی فوائد کی خاطر یہودیوں نے رسول اکرم ﷺ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا اور اپنی ساری ذہنی اور مادی توانائی اس دعوت کو ناکام بنانے کے لیے وقف کر دی۔ اس طرح وہ اللہ کی لعنت کے مستحق قرار پائے اور اس روحانی امامت سے محروم کر دیے گئے جس پر وہ مسلسل کئی صدیوں سے فائز چلے آ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو مسلسل چھوٹ دیتا آ رہا تھا۔ بالآخر انہوں نے سلسلہ نبوت و رسالت کی آخری کڑی حضرت محمد ﷺ پر ایمان نہ لا کر دنیا اور آخرت دونوں کی ناکامی اور خسران کو اختیار کر لیا۔

اسراء و معراج کا پیغام:

قرآن پاک کی سورۃ الاسراء...... بنی اسرائیل...... کی پہلی آیت میں رسول عربی و امی محمد رسول اللہ ﷺ کو مسجد حرام سے راتوں رات مسجد اقصیٰ تک پہنچانے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ [الاسراء:١]

''پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے گرد و پیش کو ہم نے برکت دے رکھی ہے تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ درحقیقت وہی سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد مبارک کا آغاز ''سبحان'' سے کیا ہے جو اس کی ذات کے ہر نقص اور عیب سے پاک ہونے اور اس کی غیر محدود اور مطلق قدرت پر دلالت کرتا ہے۔ اس لفظ سے اس امر کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس کے آخری اور محبوب نبی کا یہ سفر ایک ایسا خارق عادت اور معجزاتی سفر

ہے جس سے اس نے اپنے کسی بندے کو نہیں نوازا تھا۔

قرآن پاک میں اس سفر اسراء کی مزید کوئی تفصیل بیان نہیں ہوئی۔ لیکن صحیح احادیث میں متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اس واقعہ کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے بیت المقدس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء اور رسولوں کی نماز میں امامت فرمائی جن کی مقدس روحوں کو ''ممثل'' کر کے وہاں جمع کیا گیا تھا۔

نماز تمام عبادتوں کی معراج ہے اور انبیائے بنی اسرائیل کے مرکز بیت المقدس میں رسول عربی وامی محمد رسول اللہ ﷺ کو نماز میں تمام انبیاء اور رسولوں کی امامت پر سرفراز کرنا یہ مفہوم رکھتا ہے کہ آج سے تمام دنیا کی امامت آپ کے حصے میں آ رہی ہے۔ آپ کے بعد اس منصب پر آپ کی امت کے صالح افراد فائز ہوں گے۔ رہے بنو اسرائیل تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی مسلسل نافرمانیوں اور آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا انکار کر کے اپنے آپ کو اس عظیم منصب کے لیے ''نااہل'' ثابت کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ''لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ'' کا مصداق بنا لیا ہے۔

سورۃ الاسراء سے سابقہ سورت ''النحل'' کی آخری آیت سے پہلے کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی کو راہ حق میں صبر کی تلقین فرمائی ہے اور دشمنان حق کی دسیسہ کاریوں اور مکر وفریب پر کبیدہ خاطر اور رنجیدہ ہونے سے منع فرمایا ہے۔ سورت کا اختتام اس تاکید کے ساتھ کیا ہے کہ اللہ کی معیت اور اس کی حمایت ونصرت ہمیشہ ان خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہے جو تقویٰ اور احسان پر فائز ہوتے ہیں۔ چونکہ رسول اکرم ﷺ امام المتقین اور امام المحسنین تھے اس لیے اللہ تعالیٰ کی حمایت ونصرت آپ سے اور آپ کے مخلص اور جاں نثار ساتھیوں اور پیروکاروں سے کسی حال میں جدا نہیں ہوسکتی۔ بنو اسرائیل جنہوں نے آپ کی مخالفت اور مشرکین کی تائید وحمایت کا راستہ اختیار کر لیا اللہ تعالیٰ کی اس معیت اور حمایت ونصرت سے محروم کر دیے گئے۔

سورۃ الاسراء کی دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرمایا ہے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب تورات دی وہ بنو اسرائیل کے لیے ہدایت نامہ تھی اور اس میں ان کو اللہ کے سوا کسی اور کو وکیل اور کارساز بنانے سے منع فرمایا گیا تھا لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تعمیل نہیں کی۔

پھر تیسری آیت میں اہل ایمان کو ان لوگوں کی ''ذریت'' کہہ کر جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے جلیل القدر رسول حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ طوفان سے نجات دی یہ تلقین فرمائی ہے کہ وہ اللہ کے شکر گزار

بندے بنیں کیونکہ اسی صفت سے حضرت نوح علیہ السلام موصوف تھے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک حتمی اور اٹل فیصلے کا ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ قَضَيْنَاۤ اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا۝ ﴾ [الاسراء:٤]

''اور ہم نے ''الکتاب'' میں بنواسرائیل کو اپنے اس حتمی فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا کہ یقیناً تم زمین میں دو بار فساد مچاؤ گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے''

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں تقریباً تمام ہی مفسرین اور مؤرخین اس طرف گئے ہیں کہ اس میں بنواسرائیل کے زمین میں دو بار فساد پھیلانے کا جو ذکر آیا ہے وہ اسلام کی آمد سے قبل وقوع پذیر ہو چکا ہے اور ان کو اس کی سزا بھی مل چکی ہے۔ لیکن یہ رائے اس آیت مبارکہ کے سیاق وسباق اور امر واقعہ کے بالکل خلاف ہے اور اس کے پیچھے کوئی نقلی دلیل بھی نہیں ہے۔

بخت نصر کا افسانہ:

عام طور پر مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بنواسرائیل کے پہلے فساد کے موقع پر ان پر جالوت کو مسلط کیا گیا اور دوسرے فساد کے موقعے پر بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور یہودیوں کا قتل عام کر کے ان کا نام ونشان مٹا دیا۔

تفسیر کی بعض کتابوں میں آیات ۵ اور ۷ کی تفسیر کے ضمن میں بعض روایات بھی نقل کی گئی ہیں جن میں سے کوئی بھی روایت صحیح نہیں ہے۔ بلکہ سب من گھڑت اور نبی مکرم ﷺ کے نام پر جھوٹ ہیں۔ ذیل میں ایک طویل روایت کا ترجمہ درج کر رہا ہوں۔

(۲۳۹)...... جب بنواسرائیل نے جارحانہ روش اختیار کی، سرکشی کر کے اور انبیاء کو قتل کیا تو اللہ نے ان پر شاہ فارس بخت نصر کو مسلط کر دیا۔ اللہ نے اس کو سات سو سال تک اقتدار بخشا تھا۔ بخت نصر نے بنواسرائیل کا رخ کیا یہاں تک کہ وہ بیت المقدس میں داخل ہو گیا، اس کی ناکہ بندی کی اور اس کو فتح کر لیا۔ اور حضرت زکریا علیہ السلام کے خون کے بدلے اس نے ستر ہزار یہودیوں کو قتل کیا۔ ان کے اہل خانہ اور انبیاء کی اولاد کو گرفتار کر لیا۔ اس نے بیت المقدس کے زیورات لوٹ لیے اور اس کے خزانوں سے ایک لاکھ ستر ہزار زیورات نکال کر ان کو بابل منتقل کیا۔

حضرت حذیفہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا بیت المقدس اللہ کے نزدیک بڑا

درجہ رکھتا تھا؟ فرمایا:

ہاں، سلیمان بن داؤد نے بیت المقدس کی تعمیر سونے، موتیوں، یاقوت اور زبرجد سے کی تھی۔ اس کا فرش سونے اور چاندی سے بنایا گیا تھا اور اس کے ستون بھی سونے کے تھے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کیا تھا۔ شیاطین کو ان کے تابع کر دیا تھا جو پلک جھپکتے ان کے پاس یہ چیزیں حاضر کر دیتے تھے۔ یہ تمام چیزیں بخت نصر لے کر بابل چلا گیا اور بنواسرائیل نے سو سال تک اس کی غلامی کی۔ جنہیں مجوسی اور ان کی اولاد تقعد یب رہتی رہی۔ ان میں انبیاء اور ان کی اولاد بھی تھی۔ اس کے بعد اللہ نے ان پر رحم فرمایا اور فارس کے ایک بادشاہ کو جس کا نام "کورش" تھا اور جو مؤمن تھا یہ وحی کی کہ تم بنواسرائیل میں سے زندہ بچ جانے والوں کے پاس جاؤ اور ان کو بچاؤ۔ یہ حکم پا کر کورش بنواسرائیل کو لے کر بیت المقدس گیا اور اس کے زیورات بھی وہاں واپس پہنچائے۔ اس کے بعد بنواسرائیل سو سال تک اللہ کے مطیع و فرماں بردار رہے۔ لیکن اس کے بعد دوبارہ معاصی میں مبتلا ہو گئے۔ اس کی پاداش میں اللہ نے ان پر "ربطیان حوس" کو مسلط کر دیا جس نے بخت نصر کے ساتھ مل کر ان پر لشکر کشی کی۔ بیت المقدس میں ان کے پاس گیا اور ان کو اور ان کے اہل خانہ کو قیدی بنایا۔ بیت المقدس کو نذر آتش کر دیا اور بنواسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اے بنواسرائیل! جب تم معاصی کا ارتکاب کرو گے تب تب ہم تم کو قیدی بناتے رہیں گے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ معاصی کا ارتکاب کرنے لگے۔ اس بار اللہ نے روم کے بادشاہ قاقس بن رسپایوس کو ان پر مسلط کیا جس نے سمندر اور خشکی سے ان پر لشکر کشی کی۔ بنواسرائیل کو قیدی بنایا، بیت المقدس کے زیورات لوٹے اور بیت المقدس میں آگ لگا دی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بیت المقدس کے یہ زیورات مہدی وہاں واپس لوٹائیں گے جو ایک ہزار سات سو کشتیوں سے عبارت ہوں گے۔ ان کو "یافا" کی بندرگاہ پر لنگر انداز کیا جائے گا اور یہاں سے زیورات کو بیت المقدس منتقل کیا جائے گا۔ جہاں اللہ اگلوں اور پچھلوں کو جمع کرے گا۔

یہ روایت بھی موضوع ہے۔ محدث محمد ناصر الدین البانی تحریر فرماتے ہیں:

اس کی تخریج امام طبری نے کی ہے اور اس کی صحت وسقم کے بارے میں سکوت فرمایا ہے۔ لیکن حافظ ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کرنے کی وجہ سے ان کی نکیر کی ہے اور لکھا ہے کہ بلاشبہ یہ روایت موضوع ہے۔ جس کو علم حدیث کی معمولی معرفت حاصل ہوگی وہ اس کے موضوع اور من گھڑت ہونے میں شک نہیں

کرے گا۔ تعجب ہے کہ امام طبری کی جلالت شان اور امامت کے باوجود ان کے نزدیک یہ کیونکر رواج پا گئی۔ ہمارے شیخ حافظ علامہ ابوالحجاج مزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو موضوع اور جھوٹ قرار دیا ہے۔[1]

اس طرح کی نہ جانے کتنی جھوٹی روایتیں تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔

اولاً: اگر سورۃ الاسراء کی آیت نمبر ۴ کے فقرہ: لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ ''یقیناً تم زمین میں دو مرتبہ فساد برپا کرو گے'' کو قبل از اسلام کا واقعہ قرار دیا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ بنو اسرائیل نے اسلام کی آمد سے قبل صرف دو بار زمین میں فساد برپا کیا اور یہ خلاف واقعہ اور خود قرآن پاک کی تصریحات کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن پاک میں ان کی جو سرگزشت بیان ہوئی ہے اس کے تتبع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے متعدد بار زمین میں فساد برپا کیے اور متعدد بار ان کو سزائیں دی گئیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں متعدد انبیاء کو قتل کیا، اللہ کی کتاب میں مسلسل تحریفات کیں، حضرت عیسیٰ اور ان کی پاکباز والدہ حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان لگایا، دوسرے بہت سے رسولوں اور نبیوں کی کردار کشی کی، رشوت خوری اور سودی کاروبار کی ترویج کی، جادوگری سیکھنے اور سکھانے کا ارتکاب کیا، سبت کا قانون توڑا، اللہ تعالیٰ پر بخل کا الزام لگایا، حضرت جبریل علیہ السلام کو اپنا دشمن قرار دیا اور فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کلی طور پر کنارہ کش ہو گئے۔ ان تمام برائیوں کا ارتکاب صرف ان کے عوام نے نہ کیا بلکہ خود قرآن پاک کی تصریحات کے مطابق ان کے علما اور مذہبی پیشوا ان برائیوں میں ملوث ہوئے۔ ایسی صورت میں قبل از اسلام ان کے صرف دو بار فساد برپا کرنے کی بات خلاف واقعہ نہیں تو اور کیا ہے؟!

دوم: اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کے دوسری بار فساد برپا کرنے کے لیے ''الآخرۃ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ ﴾

''اور جب آخری وعدے کا وقت آئے گا''

اس کا ترجمہ عام طور پر مترجمین نے ''دوسرے وعدے کا وقت'' کیا ہے جو صحیح نہیں۔ الآخرۃ الاخری سے مختلف چیز ہے جو نا قابل تکرار ہے۔ اسی وجہ سے اس دنیا کے بعد دوبارہ پیدا کیے جانے کے دن کا نام ''الآخرۃ'' یوم آخرت ہے۔ جس کے بعد کوئی اور دن نہیں ہے۔ اس وضاحت کی روشنی میں اگر

[1] سلسلة الاحاديث الضعيفه: ص ۱۲۳۔۱۲۴، ج۱٤، ح ٦٥٥١

بنو اسرائیل کو ان کے دوسرے فساد کی سزا قبل از اسلام مل چکی ہے تو پھر اس دنیا میں ان کو کوئی اور سزا نہیں ملنی چاہیے۔ جبکہ صحیح متواتر احادیث یہ صراحت کرتی ہیں کہ ان کی شرانگیزیوں اور ان کے فتنہ وفساد کی آخری سزا ان کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ان کے اور مسلمانوں کے ہاتھوں ملنے والی ہے۔

سوم: پہلی بار بنو اسرائیل کے فتنہ وفساد پھیلانے اور سرکشی کرنے کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر جن لوگوں کو مسلط فرمایا ان کے لیے اس نے "عِبَادًا لَّنَا" کی تعبیر اختیار فرمائی ہے:

﴿ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُولَىٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِى بَأْسٍ شَدِيدٍ ﴾ [الاسراء:٥]

"پس جب ان میں سے پہلے فساد کا وقت موعود آئے گا تو ہم تمہارے خلاف اپنے ایسے بندے اٹھائیں گے جو بڑے زور آور ہوں گے"

اور قرآن پاک میں دو مقامات کے سوا بقیہ تمام جگہوں پر عبد یا عباد کے الفاظ سے اللہ تعالیٰ کے مومن بندوں کو مراد لیا گیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے عبد، یا عباد کی اپنی طرف اضافت فرمائی ہے وہاں ان سے اس کے مومن بندے ہی مراد ہیں۔ چاہے وہ اس کے رسول ہوں یا عام مومن بندے۔ البتہ "عبید" کا لفظ عام ہے جس میں مومن اور کافر دونوں شامل ہیں۔ جبکہ مفسرین کے مطابق جن لوگوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کو دونوں بار سزا دی اور ان کی بیخ کنی وہ کافر ومشرک لوگ تھے۔ چنانچہ شیخ عبدالرحمٰن آل سعدی لکھتے ہیں:

"اصحاب تفسیر کا بنو اسرائیل پر مسلط کی جانے والی قوم کے تعین کے بارے میں اختلاف ہے البتہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ کافر قوم تھی" [1]

اور جن دو مقامات پر "عباد" کا اطلاق کافروں پر کیا گیا ہے، ان میں سے پہلا مقام وہ ہے جب قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ان لوگوں کے حق میں جنہوں نے ان کو اور ان کی والدہ کو معبود قرار دے ڈالا ہے عرض کریں گے:

﴿ إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ﴾ [المائدہ:١١٨]

"اگر آپ ان کو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں"

اور دوسرا مقام وہ ہے جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے سوا دوسرے بنائے جانے والے معبودوں سے پوچھے گا:

---

[1] تیسیر الرحمن فی تفسیر کلام المنان: ص ٥٢٨

﴿ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَ اَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴾ [الفرقان:۲۵]

''کیا تم لوگوں نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا یہ خود ہی صحیح راہ سے بھٹک گئے تھے؟''

اور ان دونوں مقامات کا تعلق دنیا سے نہیں بلکہ یوم آخرت سے ہے جہاں تمام کفار ایمان لے آئیں گے مگر ان کے ایمان کا اعتبار نہ ہوگا۔

چہارم: بنو اسرائیل کے پہلے فساد اور سرکشی کے ذکر کے موقع پر دور یا قریب کہیں سے بھی بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ صرف ''الدیار'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو ''الدار'' کی جمع ہے۔ اس کا اطلاق گھر، آبادی اور شہر پر ہوتا ہے۔ معلوم نہیں مفسرین نے اس لفظ ''الدیار'' سے بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کا مفہوم کہاں سے نکال لیا؟!

اوپر کی وضاحتوں کے تناظر میں بنو اسرائیل کے دو بار فساد مچانے اور سرکشی کرنے اور ان کی سزا پانے کے جن واقعات کا ذکر سورۃ الاسراء کی آیات ۴، ۵ اور ۷ میں آیا ہے ان کا تعلق اسلام کی آمد کے بعد کے زمانے سے ہے۔ جن میں سے ایک وعدہ پورا ہو چکا ہے اور دوسرا باقی ہے۔ تفصیلات درج ذیل ہیں:

(۱)...... جب نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی تو کفار مکہ سے پہلے یہودیوں پر یہ فرض تھا کہ وہ بڑھ کر آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی رسالت کی تصدیق کریں۔ کیونکہ اولاً تو وہ آخری نبی کی بعثت کے منتظر تھے۔ ثانیاً ان کی کتاب میں ان کو بصراحت یہ حکم دیا گیا تھا کہ اگر ان کو نبی ﷺ کا زمانہ ملے تو وہ آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی تائید وحمایت کریں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کو اس کا حکم دے کر ان پر اتمام حجت بھی کر دی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴾ [البقرۃ:٤١]

''اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے تمہارے پاس پہلے سے موجود کتاب کی تائید میں نازل فرمائی ہے اور تم ہی اس کے پہلے منکر نہ بنو اور نہ معمولی قیمت پر میری آیات کو بیچو اور صرف مجھ سے ڈرو''

لیکن بنو اسرائیل نے قرآن پاک کی اس دعوت اور اپنے انبیاء کی دعوتوں کو ٹھکرا دیا اور تمام لوگوں سے پہلے رسول اکرم ﷺ کی رسالت کے منکر بن گئے۔ حقیر دنیوی فوائد کی خاطر اور بنو اسماعیل پر

برتری کے احساس سے مغلوب ہو کر اسلام اور رسول اسلام کے دشمن بن گئے۔
دعوت اسلامی کے مکی دور میں اگر چہ وہ اولین اور براہ راست مخاطب نہ تھے پھر بھی انہوں نے مسلمانوں کے خلاف دور ہی سے سخی معاندانہ موقف ہی اختیار کیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے مشرکین مکہ کو مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ اور راست رو قرار دے کر حق دشمنی کی نہایت گندی مثال پیش کی۔
چونکہ یہودی مدینہ میں آباد تھے اس لیے نبی مکرم ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد سب سے پہلے وہاں کے دونوں خاندانوں اوس وخزرج اور مہاجرین کو ملا کر ایک براداری بنائی۔ مدینہ کے شہری ہونے کی بنیاد پر یہودیوں کے ساتھ پر امن بقائے باہم کی غرض سے ایک معاہدہ کیا۔ جس میں اس امر کی ضمانت کی گئی تھی کہ کسی کے حقوق پر دست درازی نہیں کی جائے گی اور بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں سب مل کر مدینہ کا دفاع کریں گے۔ لیکن اس معاہدے کی شرائط قبول کرنے کے باوجود یہودیوں نے اس پر عمل نہیں کیا بلکہ درپردہ وہ رسول اکرم ﷺ، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ روش پر ہی قائم رہے۔
ہجرت مدینہ کے دوسرے ہی سال غزوۂ بدر برپا ہوا۔ مسلمان مادی اعتبار سے نہایت مفلوک الحال تھے۔ ان کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہ تھی۔ تن ڈھانکنے کو کپڑے نہ تھے اور جنگی ساز وسامان بھی نہ تھا۔ ان حالات میں یہ غزوہ پیش آیا جو مسلمانوں کے ایمان کے لیے نہایت صبر آزما امتحان تھا۔ جبکہ مدمقابل فوج اپنی تعداد اور فوجی ساز وسامان سے لیس اور نہایت مضبوط تھی، چونکہ یہ معرکہ اللہ کے لیے تھا، اس لیے اللہ نے اپنے محبوب نبی کی فریادیں سن لیں اور مسلمانوں کو فتح عظیم سے نوازا۔
مسلمانوں کی اس فتح سے کفار مکہ سے زیادہ یہودیوں کو دکھ ہوا جو مسلمانوں کے پڑوسی، معاہدۂ امن میں ان کے شریک اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نسبت کے دعویٰ کی رو سے ان کے دینی بھائی تھے۔ ان آستین کے سانپوں میں سے ایک سانپ کعب بن اشرف مدینہ منورہ سے سفر کر کے مکہ پہنچا اور وہاں نہایت دردانگیز طریقے سے قریش کے مقتولوں کے مرثیے کہہ کہہ کر ان کو جوشِ انتقال دلایا۔
جوں جوں دن گزرتے گئے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کا عناد بڑھتا گیا اور نتیجے کے طور پر قریش مکہ اور یہودیوں کے مابین اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ قریش مکہ ان کو غداری پر اکساتے رہے اور بسا اوقات ان کو دھمکیاں بھی دیں کہ اگر وہ مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار نہ رہے تو وہ ان پر چڑھائی کر دیں گے۔
ماہ صفر ۴ ہجری میں پیش آنے والے رجیع اور بئر معونہ کے سانحوں کے بعد حضرت عمرو بن امیہ

ضمری رضی اللہ عنہ نے غلطی سے بنو کلاب کے دو مردوں کو قتل کر دیا تھا جن سے رسول اللہ ﷺ کا معاہدہ تھا۔ جس کے موجب رسول اکرم ﷺ کو ان کا خون بہا ادا کرنا تھا۔ چونکہ یہود بنو نضیر مدینہ کے معاہد تھے اس لیے ان پر بھی دیت اور خوبہا میں حصہ لینا واجب تھا۔ جب رسول اکرم ﷺ اپنے چند اصحاب کے ہمراہ ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے بنو کلاب کے دونوں مقتولین کے خون بہا میں اعانت کے مسئلے پر بات چیت کی تو وہ رضا مند ہو گئے اور کہا آپ یہاں تشریف رکھیے ہم ابھی مطلوبہ رقم لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ نبی مکرم ﷺ ان کے ایک گھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ وہ آستین کے سانپ وہاں سے جانے کے بعد آپس میں کہنے لگے کہ ایسا موقع پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا جو کرنا ہے ابھی کر لو۔ ان میں سے ایک بدبخت عمرو بن حجاش اس بات پر تیار ہو گیا کہ وہ اس گھر کے اوپر جائے اور وہاں سے آپ پر ایک بھاری پتھر گرا کر آپ کو شہید کر دے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے اس ناپاک ارادے پر عمل کرتا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس سے مطلع کر دیا اور آپ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔[1]

اسی زمانے میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ یہودیوں نے رسول اکرم ﷺ کو کہلا بھیجا کہ آپ اپنے تیس آدمی لے کر آیئے اور ہمارے بھی تیس عالم نکلیں گے۔ ایک درمیانی مقام پر ان سے آپ کی بحث ہو گی۔ اگر آپ ان پر اپنے دین کی حقانیت ثابت کر دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ جب وہ درمیانی مقام کے قریب پہنچے تو انہوں نے یہ تجویز رکھی کہ آپ اپنے تین صحابیوں کے ہمراہ ان کے تین عالموں سے ملیں درآنحالیکہ یہ تینوں یہودی اپنے ساتھ خنجر لیے ہوئے تھے۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ ملاقات عمل میں آتی خود بنو نضیر کی ایک عورت نے اپنے مسلمان بھائی کو یہ اطلاع دے دی کہ یہودی خنجر لے کر آرہے ہیں اور تمہارے نبی کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد نبی کریم ﷺ نے اپنا ارادہ بدل دیا۔[2]

ان دو واقعات سے یہودیوں کی گندی ذہنیت اور ان کی غدار طبیعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اہل حق خصوصاً انبیائے کرام علیہم السلام کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے وہ کیسی ناپاک حرکتیں کرتے رہے ہیں۔

رسول اکرم ﷺ ایک طرف اللہ کے نبی اور رسول تھے تو دوسری طرف آپ ایک اسلامی ریاست

---

[1] سیرت ابن ہشام: ص ۱۹۰، ج۲۔ فتح الباری: ص ۱۷۸٦، ۱۷۸۷، ج۲، شرح حدیث البخاری: ٤٠٢٨

[2] مصنف عبد الرزاق: ص ۳٥۹۔۳٦۰۔ سنن ابوداؤد: ح ۳۰۰٤

کے سربراہ تھے۔ جس کا تقاضا یہ تھا کہ آپ ان تمام لوگوں کو سزائے موت دے دینے کے احکام جاری کر دیتے۔ لیکن آپ نے ان مجرمین کو یہ الٹی میٹم دینے پر اکتفا فرمایا:

"تم نے میرے ساتھ غدر کیا ہے لہٰذا تم یا تو خود دس دن کے اندر مدینہ سے نکل جاؤ ورنہ مجھے تم سے جنگ کرنی پڑے گی"

رسول اللہ ﷺ کا یہ الٹی میٹم ملتے ہی بنونضیر مدینہ سے نکل جانے پر تیار ہو گئے لیکن منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی نے انہیں کہلا بھیجا کہ تم ہرگز نہ نکلنا ہم تمہاری مدد کریں گے۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی کے اکسانے پر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ جواب دیا:

((إِنَّا لَا نَخْرُجُ فَاصْنَعْ مَا بَدَالَكَ)) [1]

"ہم نہیں نکلیں گے تمہارا جو جی چاہے کرو"

ان کے اس جواب کے بعد رسول اکرم ﷺ کے سامنے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں رہ گیا تھا، کہ آپ ان سے جنگ کریں۔ لہٰذا آپ نے اور آپ کے اصحاب نے اللہ اکبر کہا اور ان سے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ نے ان کو یہ پیغام بھیجا:

((إِنَّكُمْ وَاللّٰهِ لَا تَأْمَنُوْنَ عِنْدِي إِلَّا بِعَهْدٍ تُعَاهِدُوْنِي عَلَيْهِ)) [2]

"اللہ کی قسم! تم لوگ میرے نزدیک قابل اعتماد نہیں ہو۔ الا یہ کہ تم مجھ سے عہد و پیمان کرو"

لیکن ان بدبختوں نے نبی مکرم ﷺ سے کوئی عہد و پیمان کرنے سے انکار کر دیا جس کے باعث آپ کو ان سے جنگ کرنی پڑی۔

اسی اثناء میں آپ نے بنوقریظہ کا بھی رخ کیا اور ان سے معاہدہ کرنے کے لیے کہا تو وہ تیار ہو گئے۔ اس لیے آپ نے ان سے صرف نظر فرمایا۔ لیکن بنونضیر کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے نے چھ دن میں ان کے حوصلے پست کرا دیے اور وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو کے مدینہ سے جلا وطن ہونے پر راضی ہو گئے۔ رسول اکرم ﷺ نے ان کی درخواست پر یہ بات منظور فرمائی کہ وہ اسلحے کے سوا باقی جتنا ساز و سامان چاہیں اونٹوں پر لاد کر بال بچوں سمیت چلے جائیں۔

اس طرح بنونضیر کے بیشتر افراد اور ان کے سردار حیی بن اخطب اور سلام بن ابی الحقیق نے خیبر کا

---

[1] فتح الباری: ص ۱۷۸۷، ج ۲ [2] سنن ابو داؤد: ح ۳۰۰٤

رخ کیا اور ان کے کچھ افراد شام چلے گئے لیکن ان کے دو آدمیوں یامین بن عمرو اور ابوسعید بن وہب رضی اللہ عنہما نے اسلام قبول کرلیا۔

غزوۂ خندق:

غزوۂ بنی نضیر اور مدینہ سے ان کی جلاوطنی پر ابھی صرف ایک سال کا عرصہ گزرا تھا کہ انہوں نے دوبارہ اپنی ریشہ دوانیاں شروع کردیں۔ مسلمانوں کا امن و سکون ان کے لیے سوہان روح بن گیا۔ انہوں نے اپنے دل کی آگ بجھانے اور مسلمانوں پر آخری کاری ضرب لگانے کے لیے قریش مکہ کے ساتھ سلسلہ جنبانیاں شروع کردیں۔

خیبر میں سکونت پذیر ہونے کے بعد یہود بنونضیر کے سرداروں نے قریش مکہ اور دوسرے عرب قبیلوں سے رابطے شروع کردیے اور ان کو مسلمانوں سے انتقام لینے کی خاطر مدینہ پر لشکر کشی کرنے پر ورغلانے لگے۔ اس غرض کے لیے بنونضیر کا ایک وفد مکہ گیا۔ اس وفد میں سلام بن ابی الحقیق، حی بن اخطب، کنانہ بن ابی الحقیق، ھوذہ بن قیس اور ابوعمار نیز دوسرے بڑے بڑے زعماء شامل تھے۔ اس وفد نے قریش کے سرداروں سے ملاقاتیں کرکے ان کو رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف جنگ بھڑکانے پر اکسایا اور ان کو اپنی طرف سے بھرپور مدد کا یقین دلایا۔ نیز ان سے یہ بھی کہا کہ وہ محمد ﷺ اور مسلمانوں سے بہتر اور ان سے زیادہ راست رو ہیں۔ چونکہ قریش مکہ خود مسلمانوں کے خلاف جنگ کا شعلہ بھڑکانے اور ان کے وجود کو ختم کردینے کے آرزومند تھے اس لیے انہوں نے بنونضیر کے سرداروں کی پیش کش فوراً قبول کرلی۔

یہودیوں کا یہ وفد قریش مکہ سے ساز باز کرنے کے بعد بنوغطفان کے پاس گیا اور ان کو بھی خوب پٹی پڑھائی۔ ان سے یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ قریش کے ساتھ متحد ہو کر مدینہ پر حملہ کردیں تو ادھر سے تمام یہودی ان کے ساتھ مل جائیں گے۔

بنوغطفان کو راضی کرکے یہودیوں کا یہ وفد دوسرے عرب قبائل کے پاس بھی گیا اور ان کو جنگ کی ترغیب دی۔ اس طرح انہوں نے اپنی دسیسہ کاریوں اور مکر و فریب کے ذریعہ اہل شرک کے بڑے بڑے قبیلوں اور جتھوں کو نبی معظم ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف جنگ پر تیار کرلیا۔

اس کے بعد طے شدہ منصوبے کے تحت مختلف عرب قبیلوں کے کوئی دس ہزار افراد فوجی ساز و سامان اور ہتھیاروں سے لیس ہو کر جانب مدینہ روانہ ہوگئے۔ ادھر نبی مکرم ﷺ کو سراغ رسانوں، اسلامی

دعوت سے متاثر اور اس سے ہمدردی رکھنے والوں نے ان کے ارادوں سے آپ کو مطلع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ آپ خندق کھدوا کر اہل مدینہ کو حملہ آوروں سے محفوظ کر لیں [1] چنانچہ آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مدینہ کے شمال مغربی رخ پر ایک خندق کھودنے کا حکم دے دیا۔ یہ خندق چھ دن کی قلیل مدت میں کھود کر تیار کر لی گئی۔ جس کی کھدائی میں تمام مسلمانوں کے ساتھ خود رسول اکرم ﷺ نے بھی حصہ لیا۔

اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ مدینہ میں مقیم یہودیوں کے تیسرے قبیلے بنو قریظہ نے مسلمانوں کے خلاف اب تک کوئی بدعہدی نہیں کی تھی اور وہ ان کے ساتھ اپنے حلیفانہ معاہدے پر قائم تھا۔ جس کی رو سے مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مدافعت کرنے کا پابند تھا۔ بنو نضیر نے مدینہ پر حملہ آور عرب قبیلوں کی مدد کا جو وعدہ کیا تھا اس سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ قبیلہ مدینہ کے جنوب مشرقی علاقے میں آباد تھا۔ اس لیے مسلمان اس کی طرف سے بے فکر تھے اور اپنے بال بچوں کو ان گڑھیوں میں بھجوا دیا جو اس جانب تھیں اور ادھر سے دفاع کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ صورتحال کے اس نازک پہلو سے فائدہ اٹھانے کے لیے بنو نضیر کا سردار حی بن اخطب بنو قریظہ کے پاس گیا اور ان کے سردار کعب بن اسد قرظی کو مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے معاہدے کو توڑ کر ان کے خلاف جنگ میں شریک ہونے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ ابتداء میں تو کعب نے اس کی بات سننے سے انکار کر دیا مگر جب حی بن اخطب نے اس کو بتایا کہ میں اس وقت مسلمانوں پر عرب کی متحدہ طاقت چڑھا لایا ہوں اور یہ ان کے وجود کو ختم کر دینے کا نادر موقع ہے تو یہودی ذہن کی اسلام دشمنی اخلاق کے پاس و لحاظ پر غالب آ گئی اور بنو قریظہ عہد توڑنے پر راضی ہو گئے۔

کفار مکہ اور دوسرے عرب قبیلوں نے مدینہ پر چڑھائی کا منصوبہ بناتے وقت یہ سوچا بھی نہ تھا کہ ان کا سامنا مدینہ سے باہر کسی خندق سے ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنی تاریخ میں اس طریق دفاع سے بالکل نا آشنا تھے۔ لہٰذا مدینہ پر حملہ کرنے کی بجائے ان کو اس کا محاصرہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور اگر کوئی خندق کے قریب آتا تا کہ اسے پار کرے تو مسلمانوں کی طرف سے اس پر تیروں کی بارش ہو جاتی۔

یہ صبر آزما مگر لا حاصل محاصرہ اگرچہ ۲۵ دن سے زیادہ طویل رہا لیکن نا قابل برداشت سردی نے اہل کفر کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ ادھر رحمت الٰہی جوش میں آئی اور اس نے اپنی غیبی فوج کے ذریعہ

---

[1] سیرت کی کتابوں میں جو یہ بات مشہور ہے کہ خندق کھودنے کا مشورہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دیا تھا اس کی کوئی قابل اعتماد بنیاد نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اس کتاب کی جلد اول ص ۳۳۵۔۳۳۸

اپنے اور اپنے رسول کے دشمنوں کو خائب و خاسر راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

یہ حملہ کتنا سخت اور حوصلہ شکن تھا؟ اس کا اندازہ ان آیات مبارکہ سے ہوتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے اس کی منظر کشی فرمائی ہے اور پھر اپنی مدد کا ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا۝ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۝ ﴾

[الاحزاب:٩، ١٠، ١١]

”اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو یاد کرو اللہ کی اس نعمت کو جو اس نے تم پر کی ہے۔ جب لشکر تم پر چڑھ آئے تھے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی اور ایسی فوجیں بھیج دیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں۔ اور اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم کر رہے تھے۔ جب وہ اوپر سے اور تمہارے نیچے سے تم پر چڑھ آئے تھے۔ جب خوف سے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آ گئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے۔“

بالآخر اہل کفر نے راہ فرار اختیار کی اور راتوں رات بھاگ کھڑے ہوئے۔ صبح جب مسلمان اٹھے تو میدان خالی تھا۔ اس وقت نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَلْآنَ نَغْزُوْهُمْ وَلَا يَغْزُوْنَنَا))[1]

”اب ہم ان پر چڑھائی کریں گے اور وہ ہم پر چڑھائی نہ کر سکیں گے۔“

ام المومنین حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے۔ فرمایا:

((لَمَّا رَجَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْخَنْدَقِ وَوَضَعَ السِّلَاحَ وَاغْتَسَلَ أَتَاهُ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ، فَقَالَ: قَدْ وَضَعْتَ السِّلَاحَ وَاللّٰهِ مَا وَضَعْنَاهُ فَاخْرُجْ إِلَيْهِمْ، قَالَ: فَإِلَى أَيْنَ؟ قَالَ: هَاهُنَا وَأَشَارَ إِلَى بَنِي قُرَيْظَةَ، فَخَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِمْ))[2]

---

[1] صحيح بخاري: ح ٤١٠٩، ٤١١٠

[2] صحيح بخاري: ح ٤٦٣، ٤١١٧۔ صحيح مسلم: ح ١٧٦٩

"جب نبی مکرم ﷺ خندق سے واپس پہنچے، ہتھیار رکھ دیے اور غسل فرمایا تو حضرت جبریل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: آپ نے ہتھیار رکھ دیے، لیکن اللہ کی قسم ہم نے ابھی ہتھیار نہیں رکھے ہیں لہٰذا ان کی طرف نکلیے۔ نبی معظم ﷺ نے پوچھا: کدھر؟ جبریل علیہ السلام نے کہا: یہاں اور بنوقریظہ کی طرف اشارہ کیا۔ اس طرح نبی کریم ﷺ بنوقریظہ کی طرف روانہ ہوئے۔"

اس حکم الٰہی پر عمل کرتے ہوئے رسول اکرم ﷺ صحابہ کرام کی ایک فوج لے کر بنوقریظہ کی بستی میں پہنچ گئے اور اس کا محاصرہ کرلیا جو ۲۵ دن جاری رہا۔ انہوں نے اس شرط پر اپنے آپ کو نبی مکرم ﷺ کے حوالہ کردیا کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان کے حق میں جو فیصلہ بھی کردیں اسے وہ مان لیں گے۔ چنانچہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عین بیرونی حملے کے موقع پر ان کی بدعہدی کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کردیا کہ ان کے تمام مرد قتل کردیے جائیں، عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے اور ان کی تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کردی جائے...... یہ سن کر نبی مکرم ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کے بارے میں فرمایا:

((قَضَيْتَ بِحُكْمِ اللّٰهِ))[1]

"تم نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔"

واضح رہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے بنوقریظہ کے بارے میں جو فیصلہ کیا تھا موجودہ دور کی حکومتیں بھی ان خائنوں کے حق میں یہی فیصلہ کرتی ہیں جو ان کے دشمنوں سے مل جائیں۔

خیبر کے یہودیوں کی بیخ کنی:

اوپر غزوۂ خندق کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں ان سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ غزوۂ خندق میں مشرکین کو مدینہ پر چڑھائی کرنے کی ترغیب درحقیقت مدینہ کے یہودیوں کی سازش تھی اور انہوں نے ہی مدینہ میں مقیم بنوقریظہ کو غداری پر آمادہ کیا تھا۔ لہٰذا ان مفسدین اور سرکشوں کا صفایا ضروری تھا تاکہ جزیرۂ عرب کو یہودیوں کی شرانگیزیوں سے پاک کردیا جائے۔ یہاں یہ واضح کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خیبر کے یہودیوں نے اس وقت تک مسلمانوں کے خلاف کھل کر معاندانہ موقف اختیار نہیں کیا تھا جب تک بنونضیر کے سردار سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق اور حیی بن اخطب مدینہ سے جلاوطن

[1] صحیح بخاری: ح ٤١٢١۔ صحیح مسلم: ح ١٧٦٨

کیے جانے کے بعد وہاں جا کر آباد نہیں ہو گئے۔

صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں اور عربوں کے مابین کسی بڑی معرکہ آرائی کا خطرہ تقریباً ٹل گیا تھا لہٰذا اب رسول اکرم ﷺ اور آپ کے وہ جاں نثار جنہوں نے بیعت رضوان میں حصہ لیا تھا خیبر میں موجود یہودی مفسدین کو آخری سبق سکھانے کی طرف متوجہ ہوئے جو دراصل صلح حدیبیہ کا ثمرہ تھا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًاۙ٥ وَّمَغَانِمَ كَثِیْرَةً یَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا٥ ﴾ [الفتح:۱۸، ۱۹]

''اللہ اس وقت مومنین سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے۔ اس کو ان کے دلوں کا حال معلوم تھا۔ اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی، ان کو انعام کے طور پر قریبی فتح بخشی اور بہت سا مال غنیمت انہیں عطا کر دیا جسے وہ حاصل کریں گے۔ اور اللہ زبردست قوت والا اور صاحب حکمت والا ہے۔''

اس زمانے میں مسلمانوں نے خیبر کو فتح کر لیا جہاں یہودیوں نے نہایت مضبوط قلعے بنا رکھے تھے اور ان یہودی سرداروں کو قتل کر دیا جو عربوں کو مسلمانوں کے خلاف شہ دلانے اور اکسانے میں پیش پیش تھے۔ جیسے حیی بن اخطب جو اس غزوہ سے پہلے ہی قتل کیا جا چکا تھا اور اسلام بن ابی الحقیق اور اسیر بن زارم وغیرہ۔ فتح خیبر کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فدک، وادی القریٰ، تیما اور تبوک کی یہودی بستیاں زیر نگیں کر لیں۔

اوپر کے صفحات میں نبی کریم ﷺ کی بعثت سے لے کر غزوۂ خیبر تک یہودیوں کی شر انگیزیوں، دسیسہ کاریوں اور فتنہ و فساد کا جو سرسری جائزہ پیش کیا گیا ہے اس سے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی کہ انہوں نے بعثت کے بعد سے غزوۂ خیبر تک دعوت اسلامی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے، حق کی آواز دبانے مسلمانوں کی بیخ کنی کرنے کے لیے عربوں کو مسلسل اکساتے رہنے اور رسول رحمت فداہ ابی وامی ﷺ کو شہید کرنے کی کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی۔ اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے ان میں سے صرف انہی لوگوں کو موت کی سزا دی جو صرف شریعت اسلامی ہی نہیں بلکہ شریعت موسوی کے مطابق بھی اس کے مستحق تھے۔ ورنہ اکثر کو مدینہ سے جلاوطن کرنے پر اکتفا کیا اور اسلحوں کے سوا تمام ساز و سامان ساتھ لے جانے کی بھی آزادی دی۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب:

لیکن فتح خیبر کے بعد آغاز امر میں رسول اکرم ﷺ سے یہودی کی صلح اس شرط پر ہوئی تھی کہ آپ ان کی جان بخشی فرمائیں گے اور وہ اس علاقے کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے۔ لیکن صلح ہونے کے بعد جب زمین کے باقاعدہ بندوبست کا موقع آیا تو اہل خیبر نے آپ سے درخواست کی کہ:

آپ ہمیں یہیں رہنے دیں اور ہم سے معاملہ کر لیں۔ کیونکہ ہم زراعت اور نخلستان کے کام سے اچھی طرح واقف ہیں۔

نبی مکرم ﷺ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمالی۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں خیبر کے ان یہودیوں کو بھی نکال دیا تو کیا یہ ان کے ساتھ ہونے والے معاہدے کی خلاف ورزی نہیں تھی؟

جواب: نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام نبی مکرم ﷺ کے فیصلے یا معاملے کے خلاف نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔

دراصل نبی کریم ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کے وہاں رہنے اور بٹائی پر ان کو وہاں کی زرعی زمینیں دینے کی جو منظوری دی تھی وہ اس بات سے مشروط تھی کہ جب تک اللہ ان کو وہاں باقی رکھنا چاہے گا وہ باقی رکھے جائیں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انہوں نے کوئی ایسی حرکت کی یا کسی ایسے جرم کا ارتکاب کیا جو وہاں سے ان کے اخراج کا موجب ہوگا تو وہاں سے ان کو نکال دیا جائے گا۔ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا ظَهَرَ عَلَى خَيْبَرَ، أَرَادَ إِخْرَاجَ الْيَهُوْدِ مِنْهَا وَكَانَتِ الْأَرْضُ حِيْنَ ظَهَرَ عَلَيْهَا لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلِلْمُسْلِمِيْنَ وَأَرَادَ إِخْرَاجَ الْيَهُوْدِ مِنْهَا، فَسَأَلَتِ الْيَهُوْدُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُقِرَّهُمْ بِهَا أَنْ يَكْفُوْا عَمَلَهَا وَلَهُمْ نِصْفُ الثَّمَرِ، فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: نُقِرُّكُمْ بِهَا عَلَى ذٰلِكَ مَا شِئْنَا))[1]

"...... جب رسول اللہ ﷺ کو خیبر پر فتح ہوئی تو آپ نے وہاں سے یہودیوں کو نکال دینا چاہا اور جب آپ کو اس پر فتح ہوئی تو اس کی زمین اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کی

[1] صحیح بخاری: ح ۲۳۳۸، ۳۱۵۲۔ صحیح مسلم: ح ۱۵۵۱، (۳۹۶۵۔۳۹۶۷)

ملکیت ہوگئی۔ آپ نے یہ ارادہ فرمایا کہ یہودیوں کو وہاں سے نکال دیں، اس پر یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ان کو اس شرط پر برقرار رہنے دیں کہ زراعت کا کام وہ کریں گے اور آدھی پیداوار ان کی ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ہم جب تک چاہیں گے وہاں تم کو برقرار رکھیں گے"

بعض روایتوں میں ہے:

((أُقِرُّكُمْ مَا أَقَرَّكُمُ اللّٰهُ))

"اللہ جب تک تم کو برقرار رکھنا چاہے گا میں تم کو برقرار رکھوں گا۔"

یہود خیبر کی شر انگیزیاں:

فتح خیبر پر ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ اہل خیبر کی ایک عورت نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک زہر آلود بکری بھیجی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: "جب خیبر فتح ہوا تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک بھنی ہوئی بکری کا تحفہ بھیجا گیا جو زہر آلود تھی۔"[1]

ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ یہ بکری زینب بنت حارث نے بھیجی تھی جو سلام بن مشکم کی بیوی تھی۔ اس نے پہلے یہ دریافت کر لیا تھا کہ نبی کریم ﷺ کو بکری کا کون سا حصہ زیادہ پسند ہے۔ اور جب اس کو بتایا گیا کہ آپ کو دستی زیادہ پسند ہے تو اس نے اس میں زہر زیادہ ملا دیا۔ اور جب آپ نے اس کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھ کر چبایا تو نگلنے کی بجائے اسے تھوک دیا اور فرمایا: یہ ہڈی مجھے بتا رہی ہے کہ وہ زہر آلود ہے[2]۔ اور صرف منہ میں رکھ کر اسے چبانے سے اس کا جو زہر آپ کے جسم مبارک میں پھیل گیا تھا اس کا اثر آپ اپنی زندگی کی آخری سانس تک محسوس کرتے رہے۔[3]

خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں وہ علانیہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو سوتے میں پکڑ کر کوٹھے سے نیچے پھینک دیا جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((لَمَّا فَدَعَ أَهْلُ خَيْبَرَ عَبْدَاللّٰهِ ابْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، قَامَ عُمَرُ

---

1. صحیح بخاری: ح ۳۱۶۹، ۴۲۴۹، ۵۷۷۷
2. سیرت ابن ہشام: ص ۳۳۷، ۳۳۸، ج ۲
3. صحیح بخاری: ح ۴۴۲۸

خَطِيبًا، فَقَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ عَامَلَ يَهُودَ خَيْبَرَ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَقَالَ: نُقِرُّكُمْ مَا أَقَرَّكُمُ اللّٰهُ وَإِنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ خَرَجَ إِلَى مَالِهِ هُنَاكَ، فَعُدِيَ عَلَيْهِ مِنَ اللَّيْلِ، فَفُدِعَتْ يَدَاهُ وَرِجْلَاهُ، وَلَيْسَ لَنَا هُنَاكَ عَدُوٌّ غَيْرَهُمْ هُمْ، عَدُوُّنَا وَتُهْمَتُنَا، وَقَدْ رَأَيْتُ إِجْلَاءَهُمْ ...... فَأَجْلَاهُمْ عُمَرُ وَأَعْطَاهُمْ قِيمَةَ مَا كَانَ لَهُمْ مِنَ الثَّمَرِ، مَالًا وَإِبِلًا وَعُرُوضًا مِنْ أَقْتَابٍ وَحِبَالٍ وَغَيْرِ ذٰلِكَ))[1]

"جب اہل خیبر نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر کے ساتھ ان کے اموال پر معاملہ کیا تھا اور فرمایا تھا: جب تک اللہ تم لوگوں کو برقرار رکھے گا ہم تمہیں برقرار رکھیں گے۔ عبداللہ بن عمر وہاں اپنی جائداد کی دیکھ بھال کے لیے گئے تو رات میں ان پر حملہ کر کے ان کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے گئے۔ درآنحالیکہ وہاں ان کے علاوہ ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے۔ وہی ہمارے دشمن ہیں اور انہیں پر ہم الزام لگا سکتے ہیں۔ لہٰذا میری رائے ہے کہ ان کو جلا وطن کر دیا جائے...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو جلا وطن کر دیا اور ان کی زرعی پیداوار کی قیمت، مال، اونٹ دیے گئے اور رہٹ کا معاوضہ اور رسیاں وغیرہ دی گئیں"

اس حدیث سے وہ سبب بالکل واضح ہو گیا جس کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خیبر کے یہودیوں کو وہاں سے جلا وطن کیا تھا۔ دراصل ان کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد عدل ہے کہ انہوں نے کبھی کسی عہد کا پاس نہیں کیا۔ جو بھی ہاتھ ان کی جانب خیر و بھلائی کے ساتھ بڑھا اسی کو انہوں نے پہلے کاٹا یا کاٹنے کی کوشش کی۔

اب آیئے ان وضاحتوں کی روشنی میں سورۃ الاسراء کی پانچویں آیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہود کا پہلا فساد:

﴿ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُولٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ﴾ [الاسراء:۵]

[1] صحیح بخاری: ح ۲۷۳۰

''پس جب ان میں سے پہلے فساد اور سرکشی کا وقت موعود آئے گا تو ہم تمہارے خلاف اپنے ایسے بندے اٹھائیں گے جو نہایت زور آور ہوں گے اور تمہارے گھروں اور شہروں میں پھیل جائیں گے۔ یہ ایسا وعدہ ہے جسے پورا ہو کر رہنا ہے''

اس آیت مبارکہ کی واقعاتی تفسیر یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد غیر مسلم برادری کے طور پر یہودیوں کے ساتھ جو امن معاہدہ کیا تھا اور جس کے بموجب ان کو تمام شہری حقوق دیے تھے انہوں نے اس معاہدے کو توڑ دیا۔ اس معاہدے کو توڑنے میں ان کے جس قبیلے نے پہل کی وہ بنو قینقاع تھا جو مدینہ کے اندر ایک محلے میں آباد تھا۔ یہ قبیلہ لوہاری، سوناری اور ظروف سازی کا کام کرتا تھا۔ یہ یہودی اس قدر دلیر اور جری ہو گئے تھے کہ اپنے بازار میں آنے والے مسلمان پر دست درازی کرتے اور مسلم خواتین کو چھیڑتے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دن انہوں نے ایک مسلمان عورت کو سر عام برہنہ کر دیا۔ جس پر ان کے اور مسلمانوں کے مابین سخت جھگڑا ہو گیا۔ جس میں ایک مسلمان اور ایک یہودی قتل ہو گیا[۱]۔ ۲ ہجری میں ہونے والے غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی فتح کے بعد انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے گستاخیاں شروع کر دیں اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ قریش لڑنا نہیں جانتے تھے اس لیے تم ان پر غالب آ گئے۔ اگر ہم سے سابقہ پیش آئے گا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔[۲] گویا اس طرح انہوں نے اعلان جنگ کر دیا۔ لہٰذا رسول اکرم ﷺ نے ان کو مدینہ سے جلا وطن کر دیا۔[۳]

رہے بنو نضیر تو اوپر گزر چکا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا ان کو بھی مدینہ منورہ سے نکال دیا گیا۔

رہے بنو قریظہ تو غزوۂ خندق تک انہوں نے نبی مکرم ﷺ کے معاہدہ کا پاس کیا لیکن عین اس وقت جب مشرکین کا لشکر جرار مدینہ پر حملہ آور ہوا تو وہ یہ معاہدہ توڑ کر حملہ آور دشمن سے مل گئے۔ لہٰذا اس غزوہ کے اختتام پر ان غداروں کو یہ سزا دی گئی کہ ان کے مردوں کو قتل کر دیا گیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا گیا۔

رہے اہل خیبر تو صلح حدیبیہ کے بعد ان سرداروں کو قتل کر دیا گیا جو وہاں بیٹھ کر مسلمانوں کے خلاف منصوبے بناتے تھے۔ انہوں نے ہی قریش مکہ اور دوسرے عرب قبائل کو مدینہ پر چڑھائی کے لیے اکسایا تھا۔

---

[۱] سیرت ابن ہشام: ص ٤٧، ج٢ [۲] سنن ابو داؤد: ح ٣٠٠١

[۳] صحیح بخاری: ح ٤٠٢٨۔ صحیح مسلم: ح ١٧٦٦

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہ جاتا کہ مذکورہ آیت مبارکہ میں یہودیوں کے پہلے فساد فی الارض اور سرکشی سے مراد ان کی مذکورہ بدعہدیاں، دسیسہ کاریاں، غداریاں اور خیانتیں ہیں۔

اور آیت مبارکہ "عبادا لنا" سے مراد نبی مکرم ﷺ اور مسلمان ہیں جو مدینہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل وتوفیق سے زورآور ہو چکے تھے۔ ان کو اللہ کے دشمنوں پر غلبہ واقتدار حاصل ہو چکا تھا۔

اور "عِبَادًا لَّنَا" کی اس قرآنی تعبیر میں اللہ تعالیٰ اور اس کے صالح بندوں کے درمیان پائے جانے والے جس تعلق اور جس اپنائیت کا اظہار ہوتا ہے اس کو اہل زبان محسوس کر سکتے ہیں۔ "لام اضافت...... "لنا" کے اظہار نے اس تعلق اور اپنائیت کو مزید واضح کر کے اللہ تعالیٰ کے لیے ان کی صفت "عبدیت" کو نمایاں کر دیا ہے۔

اس وضاحت کے تناظر میں بخت نصر اور اس کی مفسد فوج پر "عِبَادًا لَّنَا" کا اطلاق کس قدر خلاف واقعہ ہے؟

فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ سے نبی اکرم ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہ کے ان اعمال کی کملی عکاسی ہوتی ہے جو انھوں نے مدینہ کے صالح اور پرامن معاشرے کو یہودی مفسدین، تخریب کاروں اور غداروں سے پاک کرنے کے لیے انجام دیے۔

جَاسَ يَجُوْسُ جَوْسًا کے معنی ہیں: ادھر ادھر پھیل جانا، تتبع کرنا، ٹوہ لگانا اور لوگوں میں گھس جانا۔

آیت مبارکہ کے مذکورہ فقرے کا مطلب ہے: اللہ کے بندے گھروں، محلوں اور شہروں میں گھس گھس کر یہودیوں کا تتبع اور تعاقب کر کے ان میں سے کچھ کو قتل، کچھ کو قید اور کچھ کو جلاء وطن کریں گے۔

یہ فقرہ بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا...... پر عطف ہے جو "فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا" کا دوسرا جواب ہے۔ اور "اذا" جب فعل ماضی پر داخل ہوتا ہے تو اس کو مستقبل کے معنی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس طرح: جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اس وقت یہ ایک وعدہ تھا جو دعوت اسلامی کے مدنی عہد میں پورا ہوا۔ اور جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے کہ اس آیت مبارکہ میں قریب یا دور سے بھی رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد میں یہ صراحت نہیں ملتی ہے کہ "الدیار" سے مراد بیت المقدس ہے۔

اسی طرح مذکورہ آیت میں "مسجد اقصیٰ" میں "اللہ کے بندوں" کے داخلے کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ مفسرین نے آیت نمبر 7 کے فقرے "كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ" سے زبردستی یہ مفہوم نکالنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے "مسجد اقصیٰ" میں اپنے بندوں کے آخری داخلے کو پہلے داخلے سے تشبیہ دی ہے

اور پہلا داخلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوا۔ جو اپنی اسلامی فوج کے ساتھ وہاں داخل ہوئے۔ یہ داخلہ فاتحانہ تو ضرور تھا مگر مفسدانہ اور تخریب کارانہ نہ تھا۔ بلکہ مسلمانوں نے اپنی طویل فتوحات کے دور میں کسی بھی آبادی اور شہر میں فساد نہیں مچایا اور نہ کوئی تخریب کاری کی۔ جس کے معترف غیر مسلم مؤرخین بھی ہیں۔

جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس میں داخل ہوئے اس وقت اس پر یہود کا نہیں عیسائیوں کا قبضہ تھا۔ یہودیوں نے بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ پر ۵ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں قبضہ کیا ہے اور اس وقت سے اب تک یہ انہی کے قبضے میں ہیں۔ جب ''اللہ کے بندے'' آخری بار بیت المقدس میں داخل ہوں گے تو اس وقت بھی وہ یہودیوں کے قبضے میں ہی ہوگا اور مسلمانوں کے ہاتھوں ہی ان کا وہاں سے خاتمہ ہوگا۔

آخری بار ''اللہ کے بندوں'' کے بیت المقدس میں داخل ہونے سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے اور پھر داخل ہوں گے۔ کیونکہ کسی جگہ دوبارہ داخل ہونا اس جگہ سے نکلنے کا متقاضی ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ آیات نمبر ۵ اور ۷ میں فَجَاسُوْا، لِيَسُوْءٗا، لِيَدْخُلُوْا، دَخَلُوْا..... اور لِيُتَبِّرُوْا کی فاعل ضمیروں کا مرجع ''عِبَادًا لَّنَا'' ہی ہے جس پر سیاق دلالت کرتا ہے۔ چھٹی آیت:

﴿ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا۝ ﴾ [الاسراء:۶]

''پھر ہم تمہاری باری ان پر لوٹا دیں گے اور مال و اولاد سے تمہاری مدد کریں گے اور تمہیں زیادہ تعداد والے بنا دیں گے۔''

کے مخاطب یہود ہیں اور جن پر ان کی باری لوٹا دینے کا وعدہ فرمایا گیا ہے وہ ''عِبَادًا لَّنَا'' ہیں۔ جن کا ذکر پانچویں آیت میں آیا ہے اور باری لوٹا دینے سے مراد غلبہ دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں کو ان پر غلبہ اور برتری حاصل ہو جائے گی۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ ''عبادا لنا'' سے مراد مخصوص صفات سے متصف لوگ ہیں نہ کہ ہر حملہ کرنے والا۔ اور یہ صفات سورۃ الفرقان کی آیات ۶۳ تا ۷۴ میں تفصیل سے بیان ہوئی ہیں جن کو اگر کسی ایک صفت میں جمع کیا جا سکتا ہے تو وہ صفت ایمان ہے۔ جس سے متصف بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے غلبہ اور سربلندی کا وعدہ فرمایا ہے:

﴿ وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ ﴾ [آل عمران:۱۳۹]

''اور نہ تم دل شکستہ ہو اور نہ غم کرو۔ تم ہی غالب رہو گے اگر تم مؤمن ہو''

مطلب یہ ہے کہ جب تک تم صفت ایمان سے متصف رہو گے اس وقت تک غلبہ اور سر بلندی سے بہرہ مند رہو گے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جس وقت یہودیوں کو مسلمانوں پر غلبہ حاصل ہوگا اس وقت ان کے اندر ایمان کی روح مطلوبہ شکل میں باقی نہ ہوگی۔ اس بات کو رسول اکرم ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں پوری طرح واضح فرما دیا ہے۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يُوْشِكُ الْأُمَمُ أَنْ تَدَاعَى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْأَكَلَةُ إِلَى قَصْعَتِهَا، فَقَالَ قَائِلٌ: وَمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: بَلْ أَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ، وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ، وَلَيَنْزِعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ وَلَيَقْذِفَنَّ اللّٰهُ فِي قُلُوْبِكُمُ الْوَهْنَ۔ فَقَالَ قَائِلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْوَهْنُ؟ قَالَ: حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ))[1]

''جس طرح کھانے والے ایک دوسرے کو اپنے دستر خواں کی طرف دعوت دیتے ہیں اسی طرح عنقریب ایسا ہوگا کہ قومیں تم پر ہلہ بول دیں گی۔ ایک شخص نے سوال کیا: کیا ایسا ہماری قلت تعداد کی وجہ سے ہوگا؟ فرمایا: نہیں۔ بلکہ تم اس وقت تعداد میں بہت زیادہ ہو گے، لیکن تم سیلاب کے جھاگ کی مانند جھاگ ہو گے اور اللہ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت اور رعب نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں ''وہن'' (کمزوری اور بزدلی) ڈال دے گا۔ سوال کرنے والے نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہن کیا ہے؟ فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے نفرت۔''

یہ حدیث پاک ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اس ذلت و پستی اور ضعف و شکست خوردگی کو دیکھا جا سکتا ہے جس سے مسلمان تقریباً پچھلی ایک صدی سے دوچار ہیں۔ اور غیر مسلموں میں ان کی کوئی وقعت اور کوئی اعتبار نہیں رہا ہے۔ حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تمام دنیوی نعمتوں سے بہرہ ور ہیں۔ اسی طرح یہ حدیث مسلمانوں کے دشمنوں کی بھی حقیقی تصویر پیش کر رہی ہے جو اپنے تمام مذہبی اور نسلی اختلافات کو بھلا کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف متفق ہو چکے ہیں اور مسلمانوں کو اپنے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح نچا رہے ہیں۔

---

[1] سنن ابو داؤد: ح ٤٢٩٧

حدیث پاک میں دنیا کی جس محبت کو مسلمانوں کی کمزوری اور بزدلی کا سبب قرار دیا گیا ہے وہ دنیا پرستی ہے۔ اس سے دنیا اور دنیاوی اسباب سے استفادہ کرنا مراد نہیں ہے۔ اسلام نے اس دنیا سے متعلق مومن کو جو تعلیمات دی ہیں وہ یہ کہ اس دنیا کو آخرت کے لیے ایک گزر گاہ سمجھے۔ اس میں غرق ہونے کے بجائے دنیوی متاع کو اس طرح استعمال کرے جس طرح ایک مسافر کسی شہر اور ملک سے گزرتے ہوئے وہاں کی چیزوں کو استعمال کرتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ))[1]

"دنیا میں ایک اجنبی یا مسافر کی طرح رہو"

جب تک مسلمان اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا، ایمان اور عمل صالح سے متصف، اتحاد و اتفاق پر قائم، اور دنیا میں غلبہ و اقتدار کے اسباب پر عمل کرتے رہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے دشمنوں پر غالب رکھا۔ کیونکہ اس کا یہ وعدہ ہے۔ فرمایا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ ﴾ [النور:٥٥]

"اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور جو نیک عمل کریں یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو خلیفہ بنا چکا ہے۔ ان کے لیے ان کے اس دین کو غلبہ عطا کرے گا جسے اس نے ان کے حق میں پسند فرما لیا ہے اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ لہٰذا وہ صرف میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو وہی لوگ فاسق ہیں"

یہ آیت اپنے مفہوم میں اس قدر واضح اور مسلمانوں کے روشن ماضی سے اس کی اس طرح تائید ہوتی ہے کہ مزید کسی توضیح کی محتاج نہیں ہے۔

بنو اسرائیل کا دوسرا اور آخری فساد:

دعوت اسلامی کو ناکام بنانے اور اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لیے یہودیوں نے

[1] صحيح بخاري: ح ٦٤١٦

اسی وقت اپنی کوشش شروع کر دی تھیں جب ابھی اس کا آغاز ہوا تھا۔ مگر یہ دعوت برگ و بار لاتی گئی یہاں تک کہ اس کی آواز مدینہ تک پہنچ گئی۔ اور جب رسول اکرم ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تو مدینہ کے تینوں یہودی قبیلے رسول اکرم ﷺ اور مسلمانوں کو نیچا دکھانے اور مدینہ کی اسلامی ریاست کو ختم کر دینے کے لیے متحد ہو گئے۔ مگر اپنی سازش کا نتیجہ انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کا ایک قبیلہ بنو قینقاع تو بالکل تباہ ہو گیا اور دو قبیلوں کو جلا وطن ہونا پڑا۔ پھر وہ سازشیں کر کے عرب کے بہت سے قبیلوں کو مدینے پر چڑھا لائے۔ لیکن ان کو اور عربوں کو عبرتناک شکست ہوئی تھی ایسی شکست کہ جس کے بعد کفار کو پھر مدینہ پر لشکر کشی کی جرأت نہ ہوئی۔

غزوۂ احزاب کے بعد رسول اکرم ﷺ اور مسلمانوں نے بنو قریظہ کو ان کی بدعہدی اور غداری کا سبق سکھایا اور ان کا خاتمہ کر دیا۔ اب صرف خیبر میں یہودی رہ گئے تھے جو دراصل مدینہ سے نکالے جانے کے بعد وہاں جمع ہو گئے تھے۔ صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نے ان کے اس آخری گڑھ پر حملہ کر کے ان کے شر پسند عناصر کا خاتمہ کر دیا اور جو یہودی بچ گئے وہ مسلمانوں کے کاشت کاروں کی حیثیت سے وہاں رہنے پر راضی ہو گئے۔ خیبر کی فتح کے بعد وادی القری، فدک، تیما اور تبوک وغیرہ میں جو یہودی آباد تھے انہوں نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح عرب کے وہ تمام یہودی اس اسلام کی رعایا بن کر رہ گئے جس کے وجود کو برداشت کرنا تو درکنار جس کا نام تک سننا ان کو گوارا نہ تھا۔

اس کے بعد مسلمانوں کی طویل تاریخ میں یہودیوں نے سر نہیں اٹھایا بلکہ مسلمانوں کی رعایا بن کر زندگی گزارتے رہے۔ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ پر پھیلا ہوا یہ زمانہ یہودیوں کے لیے سب سے پر امن زمانہ مانا جاتا ہے جس میں ان کی جان و مال کو وہ تحفظ حاصل رہا جو ان کی تاریخ میں ان کو کبھی بھی حاصل نہ رہا تھا مسلمانوں کے زیر سایہ وہ خوب پھولے پھلے۔ مشہور یہودی مؤرخ اور صحافی یوری افنیری لکھتا ہے:

......اسلامی عہد میں یہودیوں پر دین محمد ﷺ کو تھوپنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اسپین میں مسلمانوں کے زیر اقتدار یہودیوں نے جو عروج حاصل کیا یہودیوں کی زندگی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ حتیٰ کہ ہمارے اس زمانے میں بھی ان کو وہ عروج حاصل نہیں ہے۔ ''یہودا حلیلی'' جیسے شعراء عربی زبان میں شعر کہتے تھے۔ اسی طرح حاخام موشیہ بن میمون بھی عربی میں لکھتا تھا۔ مسلم ملک اندلس میں یہودی وزیروں، شاعروں اور عالموں کی کثرت تھی۔ ہر صاحب ''استقامت'' یہودی جو اپنی قوم کی تاریخ کا علم رکھتا ہو وہ اسلام کے فضل و احسان کا انکار نہیں کر سکتا۔ جس اسلام نے ۵۰ نسلوں تک یہودیوں کو تحفظ

فراہم کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائی دنیا یہودیوں کا تعاقب کر رہی تھی اوران کو تلوار کی دھار پر اپنا مذہب بدلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اور جب کیتھولک عیسائیوں نے اسپین پر قبضہ کرلیا تو وہاں انہوں نے مذہبی دہشت گردی کا جال پھیلا دیا۔ یہودی اور مسلمان دونوں کے سامنے دو راستوں کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا: یا تو عیسائی مذہب قبول کرلیں یا مرنے یا ملک سے فرار ہونے پر تیار ہوجائیں۔ اور جن لاکھوں یہودیوں نے اپنا مذہب بدلنے سے انکار کردیا وہ کہاں گئے؟ ان سب کو ایک ایک کرکے مسلم ملکوں میں پناہ دی گئی۔ اندلس سے بھاگنے والے یہ یہودی مغرب عربی، عراق، ترکوں کے زیر حکم بلغاریا اور سوڈان میں آباد ہوئے۔ ان ملکوں میں مذہب کی بنیاد پر ان کا تعاقب نہیں کیا گیا۔ ان کے ساتھ کوئی نسلی امتیاز نہیں برتا گیا۔ جبکہ بیشتر عیسائی ملکوں میں مقدس یسوع مسیح کے نام سے ان کو ذبح کیا جاتا رہا۔[1]

لیکن یہودی دراصل ایک ایسی احسان فراموش قوم ہے کہ اس نے اسی ہاتھ کو کاٹا جو اس کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور انہی لوگوں سے غداری کی اور انہی کے درپہ آزار ہوئی جنہوں نے اس کے ساتھ حسن سلوک کیا۔ پچھلی تیرہ چودہ صدیوں میں یہودیوں کو اگر کہیں امن نصیب ہوا تو صرف مسلمان ملکوں میں ہوا۔ اور جو یہودی عیسائی ملکوں میں رہے ان کو وہاں ہمیشہ ظلم وستم کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ مگر ایک وقت ایسا آیا کہ انہی عیسائیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرکے انہوں نے فلسطین میں اپنی مذہبی حکومت ''اسرائیل'' قائم کی جہاں ہزاروں سال سے عرب آباد تھے۔ ۱۹۱۷ء میں رسوائے زمانہ اعلان بالفور کے بعد سے فلسطین میں دنیا کے گوشے گوشے سے یہودیوں کو لاکر بسایا جانے لگا۔ اور اس کے اصل باشندوں کو وہاں سے مختلف حیلے بہانوں سے نکالنے اور بے دخل کرنے کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد جاری کرکے فلسطین کو یہودیوں اور عربوں میں تقسیم کردیا۔ اس ظالمانہ بندر بانٹ کے ذریعہ فلسطین کا ۵۵ فیصد رقبہ یہودیوں کو اور ۴۵ فیصد رقبہ وہاں کے اصل باشندوں، عربوں کو دے دیا گیا۔ مگر یہودی اس ظالمانہ تقسیم پر بھی راضی نہ ہوئے۔ بلکہ عربوں کو مار دھاڑ اور قتل وغارت گری کے ذریعہ وہاں سے نکالنا، ان کی زمینوں اور گھروں پر قبضہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

اس کے علاوہ فلسطین میں یہودیوں نے معصوم انسانوں کے خون کی جو ہولی کھیلی اور ان کا جس طرح قتل عام کیا وہ ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں پر کیے جانے والے مظالم سے زیادہ روح فرسا تھے۔ دیریاسین، بحرالبقر، رام اللہ اور غزہ میں فلسطینیوں کا قتل عام کیا گیا۔ جس کا سلسلہ یورپی ملکوں، خاص طور

---

[1] سعودی روزنامہ ''الوطن'' ۲۹ رمضان ۱۴۲۷ھ مطابق ۲۱/ اکتوبر ۲۰۰۶ء

پر امریکہ کے اشاروں اور اس کے آشیر داد سے جاری ہے۔

۵ جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل نے مکمل بیت المقدس، مسجد اقصیٰ، اردن کے اہم حصوں، شام کے پہاڑی علاقے جولان اور مصر کے صحرائے سینا پر قبضہ کرلیا۔

اوپر کی وضاحتوں کی روشنی میں سورۃ الاسراء کی ساتویں آیت پر غور کیجیے جس میں بنو اسرائیل کے دوسرے اور آخری فساد اور اس کے انجام کی خبر دی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَ لِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا۝ ﴾ [الاسراء:۷]

''اگر تم بھلائی کرو گے تو اپنے لیے اور اگر برائی کرو گے تو وہ بھی اپنے لیے۔ پس جب آخری فساد کا وقت موعود آئے گا (تو ہم تمہارے خلاف اپنے بندوں کو اٹھائیں گے) تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد میں اسی طرح...... فاتحانہ...... داخل ہوں جس طرح پہلی بار داخل ہوئے تھے۔ اور ان (یہود) کی سرکشی کے مظاہر کو تباہ و برباد کر دیں''

ساتویں آیت کی تشریح:

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ کے...... بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ..... محذوف ہے۔ جس پر سیاق و سباق دلالت کرتا ہے۔

''مَا عَلَوْا'' کی ضمیر مرفوع کا مرجع ''بنو اسرائیل'' ہے۔ کیونکہ چوتھی آیت میں ان کے افساد فی الارض اور سرکشی دو چیزوں کا ذکر ہے۔ لیکن خطاب ''عَلَوْتُمْ'' کی بجائے غائب ''عَلَوْا'' کا اسلوب اس لیے اختیار کیا گیا ہے کیونکہ ان کی بڑائی، تکبر اور سرکشی کے مظاہر خود ان کے ہاتھوں وجود میں نہیں آئے ہیں۔ بلکہ ان کے آقاؤں اور حامیوں کے تعاون سے وجود میں آئے ہیں۔ ان کی قبل از اسلام کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ وہ کبھی اپنے بل بوتے پر سر بلند نہیں ہوئے۔ اور اگر ان کو کبھی امن و سکون حاصل رہا تو یا تو اللہ کے ذمہ میں۔ یعنی یا تو مسلمانوں نے اللہ کے نام پر ان کو امان دی یا دوسروں کی حمایت میں رہے۔ (آل عمران:۱۱۲)

تَبَّرَ يُتَبِّرُ کے معنی ہیں ''تباہ و برباد کر دینا، مٹا دینا۔'' مطلب ہے کہ یہودی فلسطین میں اپنے آقاؤں کی مدد سے اپنی سرکشی اور سربلندی کے جو مظاہر قائم کریں گے وہ اللہ کے بندوں کے ہاتھوں تباہ و

برباد کردیے جائیں گے۔

بنو اسرائیل کے پہلے فساد کی پاداش میں ان کی جو تباہی ہوئی اس کو صرف ایک فقرے ''فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ''..... وہ گھروں اور شہروں میں پھیل جائیں گے، میں بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ کیونکہ پہلی بار انہوں نے ابھی سر اٹھایا ہی تھا کہ پیس ڈالے گئے۔

لیکن اپنے آخری فساد کے موقع پر چونکہ ان کو بڑا عروج حاصل ہو جائے گا۔ سیاسی، اقتصادی اور فوجی اعتبار سے وہ اپنے ہمسایہ ملکوں پر بے پناہ برتری حاصل کرلیں گے اس لیے ان کی تباہی اور بربادی اسی کے شایان شان ہوگی۔

اس آیت کو سمجھنے کے لیے اسی سورت کی آیت نمبر ۱۰۴ کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًاؕ ﴾ [الاسراء:١٠٤]

''اور کہا ہم نے اس کے بعد بنو اسرائیل سے کہ بس جاؤ زمین میں پس جب آئے گا آخری فساد کا وقت موعود تو لائیں گے ہم تم کو اکٹھا کر کے''

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنو اسرائیل سے یہ بات فرمائی۔

عام طور پر مفسرین نے یہاں ''الارض'' سے بیت المقدس کو مراد لیا ہے۔ حالانکہ اس کے ساتھ کوئی ایسی صفت نہیں آئی ہے جو بیت المقدس پر دلالت کرتی ہو۔ جبکہ قرآن کریم میں اس طرح کے مواقع پر جب کسی خاص خطہ زمین کو مراد لیا گیا ہے تو اس کے ساتھ اس کی صفت بھی لائی گئی ہے۔ جیسے ''الارض المقدسۃ'' لیکن یہاں مطلق ''الارض'' کا ذکر آیا ہے۔ لہٰذا کوئی خاص خطہ زمین مراد لینے کی کوئی وجہ نہیں۔

اسی طرح مفسرین نے ''وَعْدُ الْاٰخِرَةِ'' سے آخرت کا وعدہ مراد لیا ہے۔ یعنی اس دنیا کے بعد آنے والی زندگی جو دو وجوں سے صحیح نہیں ہے۔

(۱) ...... وَعْدُ الْاٰخِرَةِ کی تعبیر قرآن پاک میں صرف دو بار آئی ہے اور دونوں بار اس کا تعلق صرف بنو اسرائیل سے ہے۔ پہلی بار ان کے آخری فساد کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے یہ تعبیر آئی ہے۔

اور دوسری بار یہاں یہ بیان کرنے کے لیے یہ تعبیر استعمال کی گئی ہے کہ جب ان کے آخری ''افساد فی الارض اور سرکشی'' کا وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ ان کو زمین کے ہر حصے سے سمیٹ کر یہاں ارض فلسطین میں لے آئے گا۔ اور واقعتاً ایسا ہو بھی رہا ہے کہ دنیا کے ہر حصے سے یہودیوں کو لا لا کر یہاں بسایا جا رہا ہے۔

(۲) وَعْدُ الْآخِرَةِ..... کی تعبیر قرآن پاک میں "یوم آخرت" کے لیے کہیں بھی استعمال نہیں ہوئی ہے۔ مزید یہ کہ اس موقع ومحل میں بنواسرائیل کو یوم آخرت میں اکٹھا کرنے کی بات بالکل غیر منطقی سی ہے۔ اور پھر ان کے لیے اس تخصیص کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے کیونکہ آخرت کے روز تو تمام بنی نوع انسان کو ان کی قبروں سے نکال کر میدان حشر میں جمع کیا جائے گا۔

مزید یہ کہ دور فتن سے متعلقہ متواتر صحیح احادیث سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان آخری اور فیصلہ کن معرکہ ارض فلسطین میں ہوگا۔ جس مسیح موعود کے انتظار میں انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا ہے اور اپنے زعم باطل میں انہوں نے ان کو سولی دے دی ہے وہی حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں نازل ہو کر ان کے جھوٹے مسیح، مسیح دجال...... سے اس سرزمین کو پاک کریں گے۔

قول فیصل:

قرآن پاک میں جس نبی کا سب سے زیادہ ذکر آیا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور جس قوم کے فکری وعقائدی انحراف اور بدعملی کا سب سے زیادہ تذکرہ کیا گیا ہے وہ یہود ہیں۔ قرآن پاک میں یہود کو من حیث القوم "نمونہ شر" کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے معدودے چند افراد کے سوا پوری قوم تاریخ کے ہر دور میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی مرتکب رہی ہے۔

سورۃ الفاتحہ میں، جو درحقیقت ایک دعا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے مؤمن اور صالح بندوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اس سے سیدھے راستے کی طلب کرتے رہیں جو اس کے ان بندوں کا راستہ رہا ہے۔ جن پر اس نے ان کے صحیح عقیدہ وعمل کی وجہ سے ہمیشہ انعام فرمایا ہے۔ اور ان لوگوں کی راہ سے دور رہنے کے لیے اس سے توفیق اور مدد کی درخواست کرتے رہیں جن پر اس کا غضب ٹوٹا ہے یا جنہوں نے ہدایت کی بجائے گمراہی اختیار کی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ۝ ﴾ [البقرة:٥، ٦، ٧]

"ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا ہے۔ ان کا راستہ نہیں جن پر تیرا غضب ٹوٹا ہے اور جو گمراہ ہیں"

اس آیت مبارکہ میں "اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" سے مراد یہود ہیں۔ جس کی قرآن پاک کی دوسری

آیتوں میں صراحت ہے۔ سورۃ المائدہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَیْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِیْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ۝ ﴾ [المائدہ:٦٠]

''اے نبی کہہ دو، کیا میں تمہیں اللہ کے ہاں ان سے زیادہ برے انجام والوں کی خبر دوں، وہ جن پر اللہ نے لعنت کی، جن پر وہ غضب ناک ہوا اور جن میں سے اس نے کچھ کو بندر اور سور بنا دیا اور جنہوں نے طاغوت کی بندگی کی۔ یہ اپنے درجے کے اعتبار سے زیادہ برے اور سیدھی راہ سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں''

بنو اسرائیل یا یہود کی صفت ''مغضوب علیہم'' اس لیے قرار دی گئی ہے کیونکہ انہوں نے اپنی تاریخ کے ہر دور میں حق کو، حق جانتے ہوئے ٹھکرایا اور اللہ کے رسولوں کو یہ جانتے ہوئے قتل کیا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں...... سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اللہ تعالیٰ کو بری صفات سے موصوف کیا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَیْدِیْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ یُنْفِقُ كَیْفَ یَشَآءُ ؕ۝ ﴾ [المائدہ:٦٤]

''یہودیوں نے کہا: اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ باندھے گئے ان کے ہاتھ۔ اور اپنی بیہودہ گوئی کے باعث وہ ملعون قرار دیے گئے۔ بلکہ اللہ کے ہاتھ تو کھلے ہوئے ہیں وہ جس طرح چاہتا، خرچ کرتا ہے''

سورۃ البقرہ میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے ''اللہ کی راہ میں'' انفاق کو ''قرض حسن'' سے تعبیر فرمایا اور اس کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۝ ﴾ [البقرۃ:٢٤٥]

''کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تا کہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس کرے۔ اللہ ہی گھٹاتا اور بڑھاتا ہے۔ اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے''

اس ارشاد الٰہی کا مذاق اڑاتے ہوئے یہودیوں نے کہا: نعوذ باللہ، اللہ فقیر محتاج...... ہے اور ہم غنی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾ [آل عمران:۱۸۱]

''درحقیقت اللہ نے ان لوگوں کا قول سنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ ان کی یہ بات ہم لکھ لیں گے اور اس سے پہلے جو وہ نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامہ اعمال میں ثبت ہے اور فیصلہ کے دن ہم ان سے کہیں گے: چکھو عذاب جہنم کا مزا''

اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ گندی بات وہ لوگ کہتے تھے جن کا دعویٰ ہے کہ وہ نبیوں کی اولاد ہونے کی وجہ سے اللہ کے چہیتے ہیں۔

ایک بڑی عجیب بات ہے کہ ان کے بارے میں قرآن پاک کی یہ آیتیں نازل ہوتی تھیں اور وہ مسلمانوں سے ان کو سنتے تھے لیکن اس کا انکار نہیں کرتے تھے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلوب بالکل مسخ ہو چکے تھے اور ان کے عقائد مشرکین سے بھی زیادہ خراب ہو چکے تھے۔

قرآن پاک میں جن سابق قوموں کا ذکر آیا ہے ان میں ہمیشہ عقائدی اور عملی بگاڑ ان کے انبیاء اور رسولوں کی وفات کے بہت بعد میں پیدا ہوا سوائے بنو اسرائیل کے۔ وہ اپنے جن نبیوں اور رسولوں پر ایمان لاتے ان کی زندگی ہی میں معاصی کا ارتکاب کرتے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں نہایت گندے اور نازیبا کلمات کہتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فرعون کی غلامی سے نجات دی اور ان کے سامنے فرعون اور اس کے تمام لاؤ لشکر کو غرق کر دیا۔ لیکن جب انہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو ارض مقدس، فلسطین میں داخل ہونے کا حکم دیا اور ان سے فرمایا کہ یہ سرزمین اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ: وہاں تو بڑے زور آور لوگ ہیں۔ جب تک وہ وہاں سے نہیں نکلیں گے ہم اس میں ہرگز داخل نہ ہوں گے۔ چنانچہ کہنے لگے:

﴿ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴾ [المائدہ:۲٤]

''تم اور تمہارا رب دونوں جاؤ اور لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے''

قرآن پاک یہ صراحت کرتا ہے کہ اس موقع پر ان میں سے صرف دو آدمیوں نے ان کے اس بزدلانہ موقف کی نکیر کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ان لوگوں میں شمار کیا ہے جو اس سے ڈرتے تھے اور جن کو اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا۔ مگر انہوں نے اللہ کے ان صالح بندوں کی نصیحت بھی نہیں مانی جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پکار اٹھے:

﴿ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ۝ ﴾

[المائدہ:۲۵]

''موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! میں تو صرف اپنی ذات اور اپنے بھائی پر اختیار رکھتا ہوں پس تو ہمارے اور ان فاسقوں کے درمیان تفریق کردے''

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا قبول فرمائی اور اس ارض مقدس کو چالیس سال تک کے لیے ان پر حرام کر دیا۔ ان کو زمین میں ایسا کر دیا کہ وہ مارے مارے اور سرگرداں حالت میں پھرتے رہیں۔

وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول جانتے ہوئے اذیتیں دیتے تھے اور یہ نہیں سوچتے تھے کہ ان کے اس عظیم محسن نے ان کے ساتھ کیا کیا احسانات کیے ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چیخ اٹھے:

﴿ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ۝ ﴾ [الصف:۵]

''اے میری قوم کے لوگو! تم لوگ کیوں مجھے اذیت دیتے ہو حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں''

اپنے عظیم اور محسن رسول کے ساتھ یہودیوں کے اس اذیت ناک موقف کا ذکر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ درس دینے کے لیے کیا ہے کہ وہ اپنے نبی کے ساتھ ایسی روش نہ اختیار کریں جو یہودیوں نے اپنے نبی کے ساتھ اختیار کی تھی۔ ورنہ ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو یہودیوں کا ہو چکا ہے۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہودیوں کی روش اختیار کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے سے بصراحت منع فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِیْهًا۝ ﴾ [الاحزاب:٦٩]

''اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ان لوگوں کی طرح مت بنو جنہوں نے موسیٰ کو اذیت دی تھی، پس اللہ نے ان کے الزامات سے اس کو بری فرمایا اور وہ اللہ کے نزدیک بڑا عالی مرتبت تھا''

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غنیمت کا مال تقسیم فرمایا۔ ایک انصاری نے کہا: اللہ کی قسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر اس تقسیم سے اللہ کی خوشنودی نہیں ہے۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اس بات سے مطلع کر دیا۔ جسے سن کر آپ کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا

اور فرمایا:

((رَحِمَ اللّٰهُ مُوْسٰی ، فَقَدْ أُوْذِيَ بِأَكْثَرَ مِنْ هٰذَا فَصَبَرَ))[1]

"اللہ موسیٰ پر رحم فرمائے انہیں اس سے بھی زیادہ اذیتیں دی گئیں مگر انہوں نے صبر کیا"

اسلام میں قتل ناحق بہت بڑا جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم میں پہلے قتل ناحق کے بعد بنو اسرائیل پر جو شریعت فرض قرار دی، اس میں کسی انسان کے ناحق جان لینے کو پوری انسانیت کا قتل اور کسی بے قصور انسان کے خون کی حفاظت کو پوری انسانیت کی جان بچانا قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ﴾ [المائدۃ:۳۲]

"اسی وجہ سے ہم نے بنو اسرائیل پر یہ فرض کر دیا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور سبب کی بنا پر قتل کیا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے کسی کی جان بچائی تو اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی"

مطلب یہ ہے کہ جو شخص ناحق کسی کی جان لیتا ہے تو وہ اپنے اس عمل سے تمام انسانوں کے قتل کی راہ کھول دیتا ہے۔ اور یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اس کے دل میں بنی نوع انسان کے کسی بھی فرد کے لیے ہمدردی کا جذبہ نہیں ہے۔ اس طرح وہ پوری انسانیت کا دشمن قرار پاتا ہے۔ اس کے برعکس جو کسی بے قصور انسان کی جان بچاتا ہے تو گویا وہ پوری انسانیت کی بقا کا جذبہ رکھتا ہے۔

آدم علیہ السلام کے جس بیٹے نے اپنے بھائی کی ناحق جان لی تھی اس کا زمانہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے بہت پہلے تھا جن کے بیٹوں کو بنو اسرائیل کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی جان کے تحفظ کا یہ قانون بنو اسرائیل پر کیوں فرض کیا گیا؟ تو اس اشکال یا سوال کا جواب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے جس مجرم بیٹے نے اپنے بے قصور بھائی کی جان لی تھی اس کے اس جرم کا محرک یہ تھا کہ اس کا بھائی اللہ کو محبوب کیوں ہے؟ یعنی بجائے اس کے کہ وہ اپنے اندر ایسی صفات پیدا کرتا جن کی وجہ سے اللہ کے نزدیک وہ بھی محبوب ہو جاتا۔ اس نے اپنے صالح اور متقی بھائی کی جان لے لی۔ چونکہ یہی ذہنیت اور نفسیات بنو اسرائیل کی بھی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قانون کو خصوصیت کے ساتھ بنو اسرائیل پر فرض کیا۔ اور عملاً ہوا بھی کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جس غلط کار بیٹے نے اپنے صالح بھائی کا خون ناحق بہا

[1] صحیح بخاری ح: ۳۱۵۰، ۶۰۶۹، صحیح مسلم ح ۱۰۶۲

کہ جس مجرمانہ فعل کا ارتکاب کیا تھا اس کا اعادہ بنو اسرائیل ...... اولاد یعقوب ...... نے اپنے معصوم بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں کرنا چاہا:

﴿ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ۝ ﴾ [یوسف:۹]

''یوسف کو قتل کر دو یا اسے کسی سرزمین میں پھینک دو تا کہ تمہارے باپ کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو جائے اس کے بعد نیک بن جانا''۔

غور کا مقام ہے کہ جو ذہنیت قابیل کے اندر کار فرما تھی ٹھیک وہی ذہنیت برادران یوسف کے اندر بھی کار فرما تھی۔ قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کی جان اسی وجہ سے لی کہ وہ صالح اور متقی کیوں ہے؟ ٹھیک اسی طرح یوسف علیہ السلام کے دسوں بھائیوں نے ان کو اپنے درمیان سے اس وجہ سے ہٹا دینے کا فیصلہ کر ڈالا کہ وہ اپنے باپ کو محبوب کیوں ہیں؟ یعنی بجائے اس کے کہ اپنے اندر محبوبیت کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتے انہوں نے باپ کے محبوب کو قتل کر ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس خود فریبی میں بھی مبتلا رہے کہ اپنے اس مجرمانہ اقدام کے بعد اپنے باپ کی نظروں میں محبوب بن جائیں گے۔ ان کا مجرمانہ ذہن ان کو یہ طفل تسلی بھی دیتا رہا کہ ''اس جرم کا ارتکاب کر لینے کے بعد نیک اور صالح بن جانے کے لیے پوری عمر پڑی ہے''۔ اس کے بعد بنو اسرائیل اللہ کے اس صریح حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ''خون ناحق بہاتے رہے اور قرآن پاک میں جن انبیاء اور رسولوں کا ذکر آیا ہے ان کی قوموں میں صرف بنو اسرائیل ہی ایسی قوم ہیں جنہوں نے اپنے نبیوں کو نبی جانتے ہوئے قتل کیا۔ اور سینہ ٹھونک کر اعلان کرتے رہے کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے۔

﴿ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ط ﴾ [النساء:۱۵۷]

''ہم نے اللہ کے رسول مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر ڈالا ہے۔ حالانکہ انہوں نے نہ تو اس کو قتل کیا ہے اور نہ سولی دی ہے۔ بلکہ وہ ان کے مشتبہ کر دیا گیا''

انبیاء علیہم السلام، اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ لوگوں میں اس پاکیزہ مقصد کے لیے بھیجتا رہا ہے کہ وہ ان کو معبود برحق اللہ تعالیٰ کی عبادت کی دعوت دیں اور ان کو تمام معبودان باطل کی پرستش سے آزاد کریں۔ ان کو حق و صداقت کی تعلیم دیں۔ برائیوں اور منکرات سے ان کی زندگیوں کو پاک کریں۔ دوسری قوموں نے تو اللہ تعالیٰ کے ان نبیوں کی تکذیب پر اکتفا کیا یا زیادہ سے ان کو اذیتیں

دین لیکن بنو اسرائیل نے ان کی تکذیب کے ساتھ ساتھ ان میں سے بہتوں کا خون بھی بہایا۔

﴿ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ۝ ﴾ [البقرة:٨٧]

"کیا ایسا نہ ہوا کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشات نفس کے خلاف کوئی تعلیم لے کر تمہارے پاس آیا تو تم نے استکبار کیا اور کسی جماعت کو جھٹلایا اور کسی دوسری جماعت کو قتل کرتے رہے"

اوپر بنو اسرائیل یا یہودیوں کے جن جرائم کا ذکر کیا گیا ہے صرف وہی ان کے جرائم نہیں ہیں بلکہ ان کے جرائم میں ان کی مسلسل بدعہدیاں بھی ہیں۔ چاہے وہ انسانوں کے ساتھ ہوں یا اللہ تعالیٰ سے۔

﴿ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝ ﴾ [البقرة:١٠٠]

"کیا ایسا نہیں ہوتا رہا ہے کہ جب بھی انہوں نے کوئی عہد کیا تو ان کی ایک جماعت نے اس کو توڑ ڈالا۔ بلکہ ان میں سے اکثر ایمان سے عاری ہیں"

وہ گناہ کے کاموں اور ظلم و زیادتی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں اور حرام مال کھانا ان کا روز کا معمول رہا ہے۔

﴿ وَ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ ﴾ [المائدة:٦٢]

"تم ان میں سے اکثر کو دیکھتے ہو کہ وہ گناہوں کے ارتکاب اور زیادتی کے کاموں اور حرام مال کھانے میں بڑی تیزی دکھاتے ہیں بے شک وہ نہایت برے کام کرتے رہے ہیں۔"

یہودیوں کے انہی جرائم: اللہ تعالیٰ کی مسلسل نافرمانیوں، بدعہدیوں، قتل انبیاء اور حرام خوریوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ حکم دیا ہے کہ: اہل کتاب اور اہل کفر دونوں کو دوست نہ بنائیں:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ ﴾ [المائدة:٥٧]

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تمہارے پیش رو اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنا لیا ہے انہیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو"

مومن کی سب سے قیمتی متاع اس کا دین ہے۔ اللہ اور رسول سے محبت اس کا سرمایہ حیات ہوتا

ہے۔ چونکہ اللہ کے دین کا مذاق اڑانے والوں، اللہ اور رسول سے بغض رکھنے والوں میں یہود و نصاریٰ اور اہل کفر سب شامل ہیں اس لیے ان تینوں کو دوست بنانے سے منع فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ کے دین اور اس کے شعائر کا مذاق اڑانے والوں اور ان کو کھیل تماشہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ دینی غیرت وحمیت مر چکی ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو اللہ سے ڈرو۔ یعنی اگر تم صحیح معنوں میں مومن ہو تو دینی غیرت و حمیت کا اظہار کر کے اللہ کے غضب سے بچو۔ یہ آیت مبارکہ اپنے نزول کے بعد سے آج تک اور آج سے قیامت تک کے لیے اسلام سے نسبت رکھنے والوں کے ایمان کو جانچنے کے لیے ایک کسوٹی ہے۔

دوستی اور محبت ہمیشہ دو طرفہ ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی بھی انسان کسی ایسے انسان سے دوستی اور محبت نہیں رکھتا جو اس کا دشمن ہو۔ اس کے دین کا دشمن ہو اور اس کے درپہ آزار ہو۔ لہٰذا ایک مومن ایسے لوگوں کو کیونکر دوست بنا سکتا ہے جو اس کے دشمن ہیں، اس کے دین کے دشمن ہیں اور اس کے دینی شعائر کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان ایسے لوگوں کو اپنا دوست سمجھتا ہے، ان کو اسلام اور مسلمانوں کا بہی خواہ تصور کرتا ہے تو خود اس کا ایمان محل نظر ہے۔ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ اہل کتاب آپس میں ایک دوسرے سے شدید اختلاف اور عداوت رکھنے کے باوجود مسلمانوں کے خلاف آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۝ ﴾ [المائدۃ:۵۷]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ یہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا دوست بناتا ہے تو اس کا شمار بھی انہی میں ہوگا۔ یقیناً اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا''

اگر یہود و نصاریٰ کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے معاملات کا جائزہ لیا جائے تو بڑی آسانی سے اس حکم الٰہی کو سمجھا جاسکتا ہے۔

یہ آیت مبارکہ اہل کتاب اور اہل کفر کے ساتھ معاملات اور باہمی مفادات کی بنیاد پر معاہدے اور سمجھوتے کرنے سے اس شرط کے ساتھ نہیں روکتی کہ اہل ایمان کے جذبات ان کے حق میں وہی ہوں جو ان کے حق میں اُن کے ہیں تاکہ کبھی ان کے مکر و فریب میں نہ آئیں۔

عصر حاضر میں عیسائیوں کے حوالہ سے مسلمان جن تجربات سے گزر رہے ہیں، ان سے قرآن پاک کے اس اعلان بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ کی تائید ہوتی ہے۔ اس کی واضح مثال عیسائی دنیا کی جانب سے

نسل پرست اور دہشت گرد حکومت: اسرائیل کی مکمل اور لامحدود تائید وحمایت ہے۔ قیامِ اسرائیل سے لے کر اب تک فلسطین کے اصل باشندوں کی نسل کشی اور قتل عام ہو رہا ہے۔ مگر یورپ و امریکہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی بجائے اسرائیل کی بھرپور سیاسی، اقتصادی اور فوجی مدد کر رہے ہیں۔ جب فلسطینی اپنے اوپر ہونے والے ظلم و جارحیت کا جواب دیتے ہیں اور اپنے مسلمہ قانونی حقوق کا دفاع کرتے ہیں تو ان کو امن دشمن اور دہشت گرد کہا جاتا ہے۔

لہٰذا اپنی عظمت رفتہ کو بازیاب کرنے کے لیے عربوں کے سامنے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی مادی اور فوجی طاقت بنانے کی طرف توجہ دیں۔ دوسروں کا دست نگر بنے رہنے کی بجائے خود ایسی طاقت بننے کی کوشش کریں کہ دشمن کو ان کا اعتبار ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ﴾ [الانفال:٦٠]

”اور تم لوگ جہاں تک بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار، بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے تیار رکھو تا کہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے دشمنوں کو خوف زدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔“

اور رسول اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

((اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَاَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ))[1]

”طاقت ور مومن زیادہ بہتر اور اللہ کو کمزور مومن سے زیادہ محبوب ہے“

اور ایک عربی مثل ہے:

((رَهَبُوْتٌ خَيْرٌ مِنْ رَحَمُوْتٍ: لَأَنْ تُرْهَبَ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تُرْحَمَ))[2]

”درحقیقت تم سے خوف زدہ رہنا، تم پر رحم کیے جانے سے بہتر ہے“

---

[1] صحيح مسلم: ح ٦٧٧٤ (٢٦٦٤) [2] القاموس المحيط: مادة رَهَبَ

باب سوم

حج اور زیارتِ مدینہ

احادیث میں شہر رسول اللہ ﷺ: مدینہ منورہ کے بڑے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے وہاں ہجرت کرنے سے قبل اس کا نام "یثرب" تھا۔ سورۃ الاحزاب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ اِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ﴾ [الاحزاب: ۱۳]

"یاد کرو اس وقت کو جب (منافقین کے) ایک گروہ نے کہا: اے یثرب کے لوگو! تمہارے لیے ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، لہٰذا پلٹ چلو۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أُمِرْتُ بِقَرْيَةٍ تَأْكُلُ الْقُرَى يَقُوْلُوْنَ، يَثْرِبَ، وَهِيَ الْمَدِيْنَةُ، تَنْفِي النَّاسَ كَمَا يَنْفِي الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ))[1]

"مجھے ایک ایسے گاؤں کا حکم دیا گیا ہے جو دوسرے شہروں پر غالب آ جائے گا۔ لوگ اسے یثرب کہتے ہیں۔ یہی مدینہ ہے جو اپنے اندر سے برے لوگوں کو اس طرح نکال باہر کرے گا جس طرح بھٹی لوہے کے میل کو نکال باہر کر دیتی ہے۔"

رسول اللہ ﷺ کے مکہ سے مدینہ ہجرت سے پہلے یہ شہر وبائی امراض کا مرکز تھا۔ اسی وجہ سے جب رسول اللہ ﷺ نے اس کو اپنے قدوم سے شرف بخشا اور ابوبکر و بلال رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہجرت کر کے وہاں پہنچے تو ابوبکر و بلال رضی اللہ عنہما بیمار پڑ گئے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِيْنَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَفِي مُدِّنَا وَ صَحِّحْهَا لَنَا وَانْقُلْ حُمَّاهَا إِلَى الْجُحْفَةِ))[2]

"اے اللہ! تو ہمارے لیے مدینہ کو اسی طرح محبوب بنا دے جس طرح مکہ ہمیں محبوب ہے یا اس سے زیادہ۔ اے اللہ! ہمارے لیے صاع اور مد میں برکت دے اور ہمارے لیے مدینہ کو

---

[1] صحیح بخاری ح: ۱۸۷۱۔ صحیح مسلم: ح ۱۳۸۲۔
[2] صحیح بخاری: ح: ۱۸۸۹۔ صحیح مسلم: ح: ۱۳۷۶۔

صحت افزاء بنا اور اس کے بخار کو جحفہ منتقل فرما دے۔"

مدینہ میں بدعت کا ارتکاب اور بدعتی کو پناہ دینا اللہ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت کا موجب ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

((مَا عِنْدَنَا شَيْءٌ إِلَّا كِتَابُ اللّٰهِ وَهٰذِهِ الصَّحِيْفَةُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ : الْمَدِيْنَةُ حَرَمٌ مَا بَيْنَ عَائِرٍ إِلَى كَذَا...... ثَوْرٍ...... مَنْ أَحْدَثَ فِيْهَا حَدَثًا أَوْ آوَى مُحْدِثًا، فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ، لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ وَ قَالَ: ذِمَّةُ الْمُسْلِمِيْنَ وَاحِدَةٌ، فَمَنْ أَخْفَرَ مُسْلِمًا، فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ، لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ وَمَنْ تَوَلَّى قَوْمًا بِغَيْرِ إِذْنِ مَوَالِيْهِ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ، لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ))[1]

"ہمارے پاس اللہ کی کتاب اور اس صحیفہ کے سوا کوئی چیز نہیں ہے جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہے۔ مدینہ عائر سے وہاں...... ثور...... تک حرم ہے۔ جس نے اس میں کوئی نئی بات پیدا کی یا نئی بات نکالنے والے کو پناہ دی تو اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ نہ اس کی فرض عبادت قبول کی جائے گی اور نہ نفل۔ اور آپ نے فرمایا: مسلمانوں کا عہد و امان ایک ہے۔ تو جس نے کسی مسلمان کے عہد کو توڑا اس پر اللہ تعالیٰ، تمام فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ نہ تو اس کی فرض عبادت قبول کی جائے گی اور نہ نفل۔ اور جس نے کسی قوم کو اپنے مالکوں کے اذن کے بغیر دوست بنایا تو اس پر اللہ تعالیٰ، تمام فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ نہ اس کی فرض عبادت قبول کی جائے گی اور نہ نفل۔

دجال مکہ اور مدینہ میں داخل نہ ہو سکے گا:

حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

((لَيْسَ مِنْ بَلَدٍ إِلَّا سَيَطَؤُهُ الدَّجَّالُ إِلَّا مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةَ، لَيْسَ لَهُ مِنْ نِقَابِهَا نَقْبٌ إِلَّا عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ صَافِّيْنَ يَحْرُسُوْنَهَا، ثُمَّ تَرْجُفُ الْمَدِيْنَةُ

[1] صحيح بخاري ح: ١٨٧٠۔ صحيح مسلم ح: ١٣٧٠۔

ثَلَاثَ رَجَفَاتٍ ، فَيُخْرِجُ اللّٰهُ كُلَّ كَافِرٍ وَ مُنَافِقٍ))[1]

''کوئی ایسا شہر نہ ہوگا جس میں دجال داخل نہ ہو سوائے مکہ اور مدینہ کے۔ ان میں سے ہر ایک کے داخلے کے راستوں میں سے ہر راستے میں فرشتے صف بستہ ہوں گے جو ان کی حفاظت کریں گے۔ پھر مدینہ تین بار ہلا مارا جائے گا۔ اور اللہ ہر کافر اور منافق کو نکال باہر کر دے گا۔''

حدیث کی کتابوں میں مدینہ منورہ کے فضائل میں اور بہت سی صحیح احادیث مروی ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں اس مقدس شہر کی بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کے محبوب اور آخری معزز و مکرم نبی ﷺ کا شہر ہے۔ آپ کا اور مسلمانوں کا دارالہجرت ہے۔ اسلامی ریاست کا دارالحکومت ہے۔ اس میں نبی کریم ﷺ کی مسجد ہے اور اس مقدس شہر میں رسول اکرم فداہ ابی و امی ﷺ مدفون ہیں۔

لیکن مدینہ منورہ کے ان تمام فضائل کے باوجود نہ تو کسی حدیث میں اس کی زیارت کی ترغیب دی گئی ہے اور نہ اس کی زیارت کو اعمال حج میں شمار کیا گیا ہے۔

حج اسلام کے ارکان خمسہ کا پانچواں اور آخری رکن ہے۔ قرآن پاک میں بیت اللہ کعبہ مشرفہ کے قصد کو حج کہا گیا ہے۔

﴿ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا ﴾ [آل عمران: ٩٧]

''اللہ کے لیے ان لوگوں پر بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے جو وہاں تک جانے کی طاقت رکھتے ہوں۔''

حَجَّ يَحُجُّ کے اصل معنی ارادہ کرنے اور کسی کے پاس جانے کے ہیں۔ ''حج البیت'' سے مراد عبادت کی نیت سے اللہ کے گھر کی زیارت کرنا اور اس سے متعلقہ تمام ارکان کو ادا کرنا ہے۔ جن ارکان میں مدینہ منورہ کی زیارت شامل نہیں ہے۔

حج کی منادی ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ مشرفہ کی تعمیر کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے کی تھی اور اس وقت شہر مدینہ کا کوئی وجود نہیں تھا۔

مسجد نبوی:

اپنے مقام و مرتبے اور فضیلت کے اعتبار سے مسجد نبوی شریف مسجد حرام کے بعد دوسرے درجہ پر

[1] صحيح بخاري ح: ١٨٨١ ـ صحيح مسلم ح: ٢٩٤٣ ـ

ہے جس میں ایک نماز دوسری مسجدوں میں ادا کی جانے والی ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے۔ اس میں ادا کی جانے والی ایک نماز مسجد نبوی میں ادا کی جانے والی سو (۱۰۰) نمازوں اور دوسری مسجدوں میں ادا کی جانے والے ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي هٰذَا خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ))[1]

''میری اس مسجد میں ایک نماز مسجد حرام کے سوا دوسری مسجدوں میں ادا کی جانے والی ایک ہزار نمازوں سے بہتر ہے۔''

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ ، وَ صَلَاةٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَفْضَلُ مِنْ مِئَةِ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ))[2]

''میری مسجد میں ایک نماز اس کے علاوہ دوسری مسجدوں کی ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے۔ اور مسجد حرام میں ایک نماز اس کے علاوہ دوسری مسجدوں کی ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔''

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں حافظ بزار اور طبرانی کے حوالہ سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث نقل کی ہے جس کے الفاظ ہیں:

((اَلصَّلَاةُ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ بِمِائَةِ أَلْفِ صَلَاةٍ وَالصَّلَاةُ فِي مَسْجِدِي بِأَلْفِ صَلَاةٍ وَالصَّلَاةُ فِي بَيْتِ الْمَقْدِسِ بِخَمْسِمِائَةِ صَلَاةٍ))[3]

''مسجد حرام میں ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر، میری مسجد میں ایک نماز ایک ہزار نمازوں کے برابر اور بیت المقدس میں ایک نماز پانچ سو نمازوں کے برابر ہے۔''

جس طرح کسی صحیح حدیث میں زیارت مدینہ کو اعمال حج میں نہیں شمار کیا گیا ہے، اسی طرح ایسی بھی

---

[1] صحیح بخاری ح: ۱۱۹۰۔ صحیح مسلم ح: ۱۳۹٤۔

[2] ابن ماجہ: ح ۱٤۲۷ (۱۱٦۳)۔ مسند احمد ح: ۱۵۳٤٤۔

[3] فتح الباری ص ۸۲ ج ۱..... حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ حافظ بزار نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔

کوئی صحیح حدیث کتب حدیث میں منقول نہیں ہے جس میں مسجد نبوی کی زیارت اور اس میں نماز ادا کرنے کو اعمال حج میں شمار کیا گیا ہو۔ البتہ نبی اکرم ﷺ سے ایسی حدیث مروی ہے جس میں مسجد نبوی کو ان تین مسجدوں میں شمار کیا گیا ہے جن میں نماز ادا کرنے کی نیت سے سفر کرنا جائز ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

((لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ مَسْجِدِ الرَّسُوْلِ ﷺ وَمَسْجِدِ الْأَقْصٰى))[1]

''تین مسجدوں کے سوا کسی اور مسجد کی طرف سفر کرنے کے لیے کجاوے نہ کسے جائیں: مسجد حرام، مسجد رسول ﷺ اور مسجد اقصیٰ۔''

کجاوا کسنے سے مراد سفر کرنا ہے۔ حدیث کا مطلب ہے کہ مذکورہ تینوں مسجدوں کے سوا کسی اور مسجد میں نماز ادا کرنے کی غرض سے سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ ان تین مسجدوں کے سوا دنیا کی تمام مساجد عام مساجد ہیں اور ان میں نماز ادا کرنا اپنے اجر وثواب کے اعتبار سے یکساں ہے۔

اس حدیث سے یہ ثبوت تو ملتا ہے کہ مسجد نبوی کی زیارت اور اس میں نماز ادا کرنے کی نیت سے سفر کرنا مشروع ہے مگر اس کا حج سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہر وقت کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ حج و زیارت کی کتابوں میں مسجد نبوی میں چالیس نمازوں کے فضائل سے متعلق جو حدیث ملتی ہے اور بغرض حج سعودی عرب آنے والے جس پر عمل ضروری تصور کرتے ہیں اور معلمین کی جانب سے جن چالیس نمازوں کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے وہ حدیث صحیح نہیں ہے۔[2]

اوپر مسجد نبوی کے جو فضائل بیان کیے گئے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں ہیں کہ رسول اکرم ﷺ اس میں مدفون ہیں۔ بلکہ:

اولاً: تو نبی کریم ﷺ نے اپنی مسجد کے یہ فضائل اپنی حیات پاک میں بیان فرمائے ہیں۔

ثانیاً: جب نبی معظم ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ کو مسجد نہیں بلکہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں دفن کیا گیا تھا۔

ثالثاً: حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے عہد میں جب مسجد نبوی میں توسیع ہوئی تو جنوبی سمت

---

[1] صحیح بخاری ۱۱۸۹، صحیح مسلم ح: ۱۲۹۷، مسند احمد ح: ۷۱۹۱۔

[2] ملاحظہ ہو اس کتاب کی پہلی جلد ص ۱۶۲، ح: ۳۶۴۔

سے ہوئی اس طرح نبی مکرم ﷺ کی قبر مبارک مسجد سے باہر ہی رہی۔

رابعاً: ولید بن عبدالملک کے عہد میں جب مسجد نبوی کی توسیع ہوئی اور قبر مبارک کے مسجد میں داخل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو مدینہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی زندہ نہیں تھا۔ پھر بھی اس وقت بعض تابعین نے اس کی مخالفت کی تھی جن میں سرفہرست جلیل القدر تابعی حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ تھے۔ اس توسیع کے بعد بھی قبر مبارک مسجد سے الگ ایک مستقل حجرے میں رہی جس کو تین طرف سے دیواروں سے محفوظ کر دیا گیا تھا تاکہ نماز ادا کرتے ہوئے کسی کا رخ اس کی طرف نہ ہو۔

اس وضاحت سے ان لوگوں کے دعوے کی جڑ کٹ جاتی ہے جو مسجد نبوی سے مسجدوں میں قبروں کے وجود پر استدلال کرتے ہیں اور اس کی فضیلت کو اس کے اندر نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کے وجود سے جوڑتے ہیں۔

مسجد نبوی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہے:

جس طرح ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر اور اس کی متعین کردہ جگہ پر بیت اللہ کی تعمیر کی تھی ٹھیک اسی طرح خاتم الانبیاء اور افضل الرسول محمد ﷺ نے اللہ کی متعین کردہ جگہ پر اپنے مقدس ہاتھوں سے مسجد نبوی کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کی تعمیر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ خود بھی شریک تھے۔ یہ مسجد پہلے روز ہی سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی ارشاد الٰہی ہے:

﴿ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ ﴾ [التوبہ:۱۰۸]

''جو مسجد پہلے روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی ہے اس کی بات زیادہ حق دار ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ (عبادت کرتے) ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں۔ اور اللہ پاک لوگوں کو پسند کرتا ہے۔''

اس آیت سے پہلے کی آیت میں ''مسجد ضرار'' اور اس کی تعمیر کرنے والوں کی گندی ذہنیت اور ان کے گندے مقاصد کو بیان کرنے کے بعد اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسجد نبوی کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ یہ تقویٰ یعنی صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت، اس کے دین کی اقامت اور شعائر اللہ کی تعظیم کی غرض سے قائم کی گئی ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس وقت مدینہ میں دو مسجدیں تھیں: مسجد قبا اور مسجد نبوی۔ نبی

کریم ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کرتے ہوئے قبا میں ۱۴ راتیں یا ۲۴ راتیں قیام فرمایا تھا۔ آپ نے یہاں ایک مسجد تعمیر فرمائی تھی جو اسلام کی پہلی مسجد ہے۔ قبا سے مدینہ پہنچنے کے بعد نبی کریم ﷺ نے جو پہلا کام کیا وہ مسجد نبوی کی تعمیر تھا۔

یہ دونوں مسجدیں اگرچہ تقویٰ پر قائم کی گئی تھیں لیکن قرآن پاک کی مذکورہ آیت میں ''تقوی پر قائم کی جانے والی مسجد'' کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ میری یہ مسجد ہے۔ چنانچہ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں:

میرے پاس سے عبدالرحمٰن بن ابی سعید خدری رضی اللہ عنہما کا گزر ہوا، تو میں نے ان سے کہا: تم نے اس مسجد کے بارے میں اپنے والد سے کیا سنا ہے جو تقویٰ پر قائم کی گئی ہے؟ انہوں نے کہا: میرے والد نے فرمایا ہے:

((دَخَلْتُ عَلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِي بَيْتِ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ، فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَيُّ الْمَسْجِدَيْنِ الَّذِي أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَى؟ قَالَ: فَأَخَذَ كَفًّا مِنْ حَصْبَاءَ فَضَرَبَ بِهِ الْأَرْضَ، ثُمَّ قَالَ: هُوَ مَسْجِدُكُمْ هٰذَا...... لِمَسْجِدِ الْمَدِيْنَةِ...... قَالَ: فَقُلْتُ: أَشْهَدُ أَنِّي سَمِعْتُ أَبَاكَ هٰكَذَا يَذْكُرُهُ))[1]

''میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آپ کی بعض ازواج کے گھر میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! دونوں مسجدوں میں سے کون سی مسجد تقویٰ پر قائم کی گئی ہے؟ کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے مٹھی بھر سنگریزے لیے اور انہیں زمین پر مارتے ہوئے فرمایا: وہ تم لوگوں کی یہ مسجد ہے۔ مدینہ کی مسجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں: میں نے کہا: میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ میں نے تمہارے والد کو اسی طرح ذکر کرتے ہوئے سنا ہے۔''

سنن ترمذی میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنی خدرہ کے ایک آدمی اور بنی عمرو بن عوف کے ایک آدمی کے درمیان اس مسجد کے تعین میں بحث چھڑ گئی جو تقوی پر قائم کی گئی ہے۔ خدری نے کہا: وہ رسول اللہ ﷺ کی مسجد ہے اور دوسرے نے دعویٰ کیا وہ مسجد قبا ہے۔ پھر وہ دونوں اس مسئلے کے تصفیہ کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

[1] صحیح مسلم ح:۱۳۹۸ (۳۳۸۷)۔

((هُوَ مَسْجِدِي هٰذَا))[1]

"وہ میری یہ مسجد ہے۔"

رہیں وہ احادیث جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت میں پاک رہنے والوں سے مراد اہل قبا ہیں تو ان حدیثوں اور مسجد نبوی کو "تقویٰ پر قائم کی جانے والی" مسجد قرار دینے والی حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ اگرچہ دونوں مسجدیں تقویٰ پر قائم کی گئی ہیں لیکن مسجد نبوی میں یہ صفت مسجد قباء کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے نہایت واضح الفاظ میں یہ فرمادیا کہ "جو مسجد تقوی پر قائم کی گئی ہے وہ میری یہ مسجد ہے۔"

زیارت قبور:

بت پرستی کی جڑ اور بنیاد دراصل قبر پرستی ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کو قبروں کی زیارت سے منع فرما دیا تھا، تاکہ ان کی ذہنی اور قلبی تربیت ایسی فضا میں ہو جو شرک کی ہر آلائش سے پاک ہو۔ دین توحید میں داخل ہونے والوں کا بت پرستی سے کسی طرح کا کوئی تعلق باقی نہ رہ جائے۔ شرک کے جراثیم سے ان کے عقائد بالکل پاک ہو جائیں اور جب آپ نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں عقیدہ توحید بالکل راسخ ہو گیا ہے اور ان کے دلوں کو ایمان کی لذت حاصل ہو گئی ہے تو آپ نے ایک دوسرے مقصد کی خاطر قبروں کی زیارت کی اجازت دے دی تاکہ ان کے ذہنوں میں یہ بات تازہ ہوتی رہے کہ دنیا کی یہ زندگی ختم ہونے والی ہے اور اس عالم کے بعد ایک اور جہان شروع ہونے والا ہے۔ چنانچہ سلیمان بن بریدہ اپنے والد حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ، فَزُوْرُوْهَا))[2]

"میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے منع کر دیا تھا تو اب قبروں کی زیارت کر لیا کرو۔"

اس حدیث سے قبروں کی زیارت کا جواز ثابت ہوتا ہے جس میں اگرچہ امر کا صیغہ آیا ہے لیکن عربی قاعدے سے: اگر کوئی قرینہ نہ ہو تو نہی کے بعد امر، اباحت اور جواز پر دلالت کرتا ہے وجوب پر نہیں۔

ایک دوسری حدیث سے جو علقمہ بن مرثد نے، سلیمان بن بریدہ سے اور انہوں نے اپنے والد حضرت

[1] سنن ترمذی ح: ۳۲۳، ۳۰۹۹۔ [2] صحیح مسلم ح: ۹۷۷۔ نسائی ح: ۲۰۳۱۔

بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ اس سے زیارت قبور کے جواز ہی کا مفہوم نکلتا ہے وجوب کا نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((قَدْ كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ ، فَقَدْ أُذِنَ لِمُحَمَّدٍ فِي زِيَارَةِ قَبْرِ أُمِّهِ ، فَزُورُوهَا ، فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الْآخِرَةَ))[1]

"درحقیقت میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے منع کر رکھا تھا۔ لیکن محمد کو اپنی ماں کی قبر کی زیارت کی اجازت دے دی گئی ہے۔ تو قبروں کی زیارت کرلیا کرو۔ کیونکہ وہ آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔"

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کے جس اذن کا ذکر فرمایا ہے یہ آپ کی طلب پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا تھا۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

نبی کریم ﷺ نے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کی تو خود روئے اور اپنے پاس کے لوگوں کو بھی رلایا۔ پھر فرمایا:

((اسْتَأْذَنْتُ رَبِّي فِي أَنْ أَسْتَغْفِرَ لَهَا فَلَمْ يُؤْذَنْ لِي ، وَاسْتَأْذَنْتُهُ فِي أَنْ أَزُورَ قَبْرَهَا ، فَأَذِنَ لِي ، فَزُورُوا الْقُبُورَ ، فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الْمَوْتَ))[2]

"میں نے اپنے رب سے اس مسئلے میں اجازت طلب کی کہ میں ان کے لیے استغفار کروں۔ مگر مجھے اجازت نہیں دی گئی اور میں نے ان سے اس مسئلے میں اجازت طلب کی کہ ان کی قبر کی زیارت کرلوں! تو اس نے مجھے اجازت دے دی، لہٰذا قبروں کی زیارت کرلیا کرو۔ کیونکہ وہ موت کو یاد دلاتی ہیں۔"[2]

ان احادیث سے جو احکام نکلتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

(۱)...... قبروں کی زیارت جائز اور مباح ہے واجب یا مستحب نہیں۔

(۲)...... قبروں کی زیارت کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ قبریں موت اور آخرت کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ لہٰذا موت اور آخرت کی یاد تازہ کرنے کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے قبروں کی زیارت ممنوع ہے۔

(۳)...... موت اور آخرت کی یاد تازہ کرنے کے لیے مسلمانوں اور مشرکین کی قبروں کی زیارت یکساں حکم رکھتی ہے۔

---

[1] سنن ترمذی ح: ۱۰۵۴۔

[2] صحیح مسلم: ح ۹۷۶۔ سنن ابو داؤد ح: ۳۲۳۴۔ سنن نسائی ح: ۲۰۳۴۔ سنن ابن ماجہ ح: ۱۵۷۲۔

(۴)...... احادیث میں بزرگان دین اور صلحائے امت کی قبروں کی زیارت کا کوئی ذکر نہیں آیا ہے۔ لہٰذا ان کی قبروں کو زیارت کے لیے خاص کرنا لوگوں کے اپنے ذہنوں کی پیداوار ہے اور اس مقصد کے منافی ہے جس کے پیش نظر قبروں کی زیارت کی اجازت دی گئی ہے۔ کیونکہ بزرگان دین کی قبروں کی زیارت سے مشرکانہ اعتقاد کے زندہ ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ جس کا ثبوت ان مشرکانہ اعمال سے ملتا ہے جن کا ارتکاب بزرگان دین اور صلحائے امت کی قبروں کی زیارت کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ اس تناظر میں عام لوگوں کی قبروں کی زیارت اسلام کے توحیدی مزاج سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

(۵)...... احادیث میں قبروں میں مدفون لوگوں کے لیے دعا و استغفار کا کوئی ذکر نہیں ہے یا دوسرے لفظوں میں ایسی کوئی حدیث نہیں ملتی جس میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہو کہ وہ مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کے موقع پر ان کے اصحاب کے لیے دعا و استغفار کریں۔ دعا و استغفار کا حکم جن احادیث میں دیا گیا ہے وہ مردوں کو دفن کرنے کے بعد کے وقت کے لیے خاص ہیں۔[۱]

(۶)...... اگر مسلمانوں کا گزر مسلمانوں کی قبروں سے ہو یا وہ مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کریں تو یہ دعا پڑھیں:

((اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَلَاحِقُوْنَ أَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ))[۲]

''اے مومنو! اور مسلمانو کی بستی کے رہنے والو! تم پر سلامتی ہو۔ ہم بھی انشاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں۔ میں اللہ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے عافیت کا سوال کرتا ہوں۔''

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث ہے جس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے جب یہ سوال کیا کہ زیارت قبور کے موقع پر وہ کیا کہیں؟ تو آپ نے فرمایا:

((قُوْلِي: اَلسَّلَامُ عَلَى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَيَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِيْنَ وَإِنَّا شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ))[۳]

''کہو: مومنوں اور مسلمانوں کی بستی والوں پر سلامتی ہو۔ اور اللہ ان لوگوں پر رحم فرمائے جو آگے جا چکے اور جو بعد میں جانے والے ہیں۔ ان شاء اللہ ہم تم سے ملنے والے ہیں۔

[۱] سنن ابو داؤد ح: ۳۲۲۱۔ [۲] صحیح مسلم ح: ۹۷۵۔
[۳] صحیح مسلم: ح: ۹۷٤ (۱۰۲)۔

ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے زیارت قبور کے موقع پر گندی اور غلط بات زبان سے نکالنے سے منع فرمایا ہے: ارشاد نبوی ہے:

((نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ، فَمَنْ أَرَادَ أَنْ يَزُوْرَ، فَلْيَزُرْ، وَلَا تَقُوْلُوْا هُجْرًا))[1]

"میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے روک دیا تھا۔ تو (اب) جو زیارت کرنا چاہے وہ زیارت کر لے اور کوئی بری بات مت کہو۔"

مطلب یہ ہے کہ میں نے پہلے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے منع کر دیا تھا اب اس کی اجازت دیتا ہوں۔ لہٰذا جو زیارت کرنا چاہے وہ زیارت کرے اور جو نہ چاہے نہ کرے۔ دونوں طرح سے جائز ہے۔ البتہ تم لوگ جب قبروں کی زیارت کرو تو اس موقع پر زبان سے کوئی غلط اور گندی بات مت نکالو۔ "ھجر" گندی، غلط اور خلاف شرع بات کو کہتے ہیں۔ زیارت قبور کے موقع پر جو بات بے ہودہ اور گندی ہو سکتی ہے وہ مشرکانہ بات کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اقوام سابقہ میں گمراہی پیدا ہونے کے بعد یہی ہوا تھا کہ انہوں نے قبروں میں مدفون بزرگوں اور صالحین کو پکارنا اور ان سے مرادیں مانگنا شروع کر دیا تھا۔ اب مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ یا ان کی بہت بڑی تعداد بزرگان دین اور صلحائے امت کی قبروں کو مزاروں اور عبادات گاہوں میں تبدیل کر چکی ہے۔ جہاں اہل قبور سے دعائیں مانگی جاتی ہیں، ان سے فریادیں کی جاتی ہیں، ان سے مدد مانگی جاتی ہے، ان سے اولاد طلب کی جاتی ہے اور رزق میں کشادگی، مصائب اور مشکلات سے نجات اور بیماریوں سے شفا طلب کی جاتی ہے۔ ان تمام باتوں سے نبی مکرم ﷺ نے صرف ایک لفظ "ھجر" کہہ کر منع فرما دیا اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک ان لوگوں پر لعنت فرماتے رہے جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیا۔ چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِي مَرَضِهِ الَّذِي لَمْ يَقُمْ مِنْهُ: لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى، اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ لَوْ لَا ذٰلِكَ أُبْرِزَ قَبْرُهُ غَيْرَ أَنَّهُ خَشِيَ أَوْ خُشِيَ أَنْ يُتَّخَذَ مَسْجِدًا))[2]

"رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس بیماری میں جس سے آپ جانبر نہ ہو سکے، فرمایا: یہود و

[1] سنن نسائی ح: ۲۰۳۲۔

[2] صحیح بخاری ح: ۱۲۳۰، ۱۳۹۰، صحیح مسلم ح: ۵۲۹۔

نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنالیا۔ اگر یہ خوف نہ ہوتا تو آپ کی قبر نمایاں کر دی جاتی۔ لیکن آپ کو اندیشہ ہوا یا اندیشہ محسوس کیا گیا کہ اس کو سجدہ گاہ بنالیا جائے گا۔"

ام المومنین کے اس قول: اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ کہیں نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کو سجدہ گاہ نہ بنالیا جائے تو آپ کی قبر مبارک نمایاں اور کھلی جگہ بنائی جاتی۔" سے نبی معظم ﷺ کو حجرے میں دفن کرنے کی حکمت سمجھی جا سکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت:

حدیث کی کتابوں میں ایسی کوئی صحیح حدیث منقول نہیں ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی قبر مبارک کی زیارت کا حکم دیا ہو۔ یا اس کی زیارت کی ترغیب دی ہو اور اس کا کوئی اجر و ثواب بیان کیا ہو۔ لہٰذا عام قبروں کی زیارت کا جو حکم ہے وہی حکم نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کا بھی ہے۔ بشرطیکہ وہاں کسی خلاف شرع عمل کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ جیسے نبی مکرم ﷺ سے دعا کرنا، آپ سے شفاعت کی درخواست کرنا، آپ کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرنا اور نبی کریم ﷺ سے اپنی پریشانیوں کے ازالہ، رزق میں کشادگی یا کسی بیماری سے شفاء کی درخواست کرنا وغیرہ۔ یا قبر مبارک کی جالیوں پر ہاتھ پھیرنا اور ان کو چومنا وغیرہ تو یہ حرام ہے۔ اس غرض کے لیے قبر مبارک کی زیارت بھی حرام ہے اور ویسا کرنے والے اسی لعنت کے مستحق ہیں جس لعنت کے مستحق نبی کریم ﷺ کے ارشادات کے مطابق یہود و نصاریٰ اور ان کے نقش قدم کی پیروی کرنے والے۔

جن علماء نے مسجد نبوی کی زیارت کرنے والوں کے لیے رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت اور اس کی طرف رخ کر کے درود و سلام پڑھنے کو مستحب قرار دیا ہے تو ان کی یہ بات اپنے پیچھے کوئی شرعی دلیل نہیں رکھتی۔ "مستحب" ایک شرعی اصلاح ہے جس سے مراد ایسا عمل ہے جس کے کرنے پر ثواب اور نہ کرنے پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ کسی عمل کو مستحب قرار دینے کا مجاز اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ بات صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر درود و سلام پڑھنے کے لیے آپ کی قبر مبارک کے پاس حاضری ضروری نہیں ہے۔ بلکہ جو مسلمان جہاں کہیں بھی ہو وہاں سے آپ پر درود و سلام پڑھ سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ مسجد نبوی میں حاضری دینے والے کے لیے قبر مبارک کی زیارت صرف جائز ہے مستحب نہیں ہے۔ اور یہ بھی اس صورت میں کہ جب یہ بار بار نہ کی جائے۔

اگر قبر مبارک کی زیارت مستحب ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اعمال سے اس کا متواتر ثبوت ملتا جو بہت بڑی تعداد میں مسجد نبوی سے پنج وقتہ نمازیں ادا کرتے تھے۔ جب کہ صرف عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے عمل سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ جب آپ باہر سے مدینہ منورہ میں آتے اور مسجد نبوی میں تشریف لے جاتے تو قبر مبارک کے پاس آ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجتے۔ پھر اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَبَابَكْرٍ اور اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يا ابتاه...... کہہ کر وہاں سے چلے جاتے۔

اوپر کی وضاحتوں سے معلوم ہوا کہ مدینہ منورہ، مسجد نبوی اور قبر مبارک کی زیارت کا نہ تو حج سے کوئی تعلق ہے اور نہ ان کی عام زیارت کا کسی حدیث میں حکم دیا گیا ہے۔ حالانکہ مدینہ منورہ کے فضائل بکثرت حدیثوں میں بیان ہوئے ہیں اور مسجد نبوی میں ایک نماز کو، مسجد حرام کے سوا دوسری مسجدوں میں ادا کی جانے والی ایک ہزار نمازوں سے افضل قرار دیا گیا ہے۔

رہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک تو وہ بلاشبہ سرور عالم، سید البشر، افضل الانبیاء اور اللہ تعالیٰ کے محبوب نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک ہے۔ لیکن نہ کسی حدیث میں اس کی کوئی فضیلت بیان ہوئی ہے اور نہ اس کی زیارت کی ترغیب دی گئی ہے۔ بلکہ اس کے برعکس بکثرت احادیث میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اپنی قبر مبارک کو عید گاہ، جشن گاہ اور سجدہ گاہ بنانے سے منع فرمایا ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

مگر ان تمام وضاحتوں کے باوجود بعض نادانوں اور دین کے دشمنوں نے لوگوں میں ایسی من گھڑت اور جھوٹی روایتیں پھیلا دی ہیں جن میں حج اور قبر مبارک کی زیارت کو آپس میں جوڑ دیا گیا ہے۔ انہیں میں سے ایک روایت درج ذیل الفاظ میں ملتی ہے:

(٢٤٠)......مَنْ حَجَّ، وَلَمْ يَزُرْنِي ، فَقَدْ جَفَانِي۔

"جس نے حج کیا اور میری (قبر کی) زیارت نہ کی تو اس نے مجھ سے بے رخی برتی۔"

یہ روایت من گھڑت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جھوٹ ہے۔ اس کے جھوٹ ہونے پر خود اس کا مضمون دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے رخی برتنے والا اور آپ پر ظلم کرنے والا علمائے اسلام کے اتفاق سے "خارج از اسلام" ہے۔ قرآن پاک میں تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر آواز بلند کرنے والے کے اعمال کے اکارت جانے کا حکم لگایا گیا ہے۔ (الحجرات:٢)

تو پھر آپ سے بے رخی برتنے والا اور آپ پر ظلم کرنے والا کس طرح مومن باقی رہ سکتا ہے۔ اس تناظر میں ایسی روایت کیونکر صحیح ہو سکتی ہے جس میں ایک ایسا عمل نہ کرنے کی یہ سزا بیان کی گئی ہے جو

سرے سے مطلوب ہی نہیں ہے۔تمام ائمہ اسلام کے نزدیک مسجد نبوی اور قبر مبارک کی زیارت حج سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

اس روایت کی تخریج ابن عدی نے الکامل [1] میں، ابن حبان نے الضعفاء [2] میں اور ابن الجوزی نے الموضوعات [3] میں کی ہے۔

اس روایت کی مصیبت محمد بن محمد بن نعمان بن شبلی ہے یا اس کا دادا ہے۔

امام ابن حبان نے لکھا ہے: نعمان بن شبلی ثقہ راویوں کے نام سے مصائب آمیز روایتیں بیان کیا کرتا تھا۔ جب کہ امام دار قطنی کا قول ہے کہ اس موضوع روایت کا اصل ملزم محمد بن محمد ہے نعمان نہیں ہے۔

امام شوکانی نے بھی الفوائد المجموعہ [4] میں اس کو موضوع قرار دیا ہے۔

بعض لوگوں نے اس روایت کو صرف ضعیف کہا ہے۔ یہ سند کے اعتبار سے صرف ضعیف تو ہوسکتی ہے لیکن متن کے اعتبار سے بہرحال جھوٹ ہے۔

(۲٤۱)......مَنْ حَجَّ ، فَزَارَ قَبْرِي بَعْدَ مَوْتِي ، كَانَ كَمَنْ زَارَنِي فِي حَيَاتِي۔

''جس نے حج کیا پھر میری موت کے بعد میری قبر کی زیارت کی تو وہ اس شخص کی مانند ہے، جن نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔''

اس باطل اور جھوٹی روایت کی سند سے قبل اس کا متن باطل ہے اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ کیونکہ جس خوش نصیب انسان کو نبی اکرم ﷺ سے آپ کی زندگی میں بحالت ایمان ملاقات اور آپ کی رفاقت حاصل تھی وہ رسول اللہ ﷺ کا صحابی تھا۔ اور صحابہ کا گروہ انبیاء علیہم السلام کے بعد امت کا سب سے مقدس گروہ ہے جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي ، فَلَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيفَهُ)) [5]

''تم لوگ میرے اصحاب کو برا مت کہو۔ اس لیے کہ اگر تم میں سے کسی نے احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کیا تو اس کا ثواب صحابہ کے خرچ کیے ہوئے ایک مد یا آدھے مد کے برابر بھی نہیں ہوسکتا۔''

---

[1] الکامل: ص ۲۲۸ ج ۷۔　[2] الضعفاء: ص ۷۳ ج ۳۔

[3] الموضوعات: ص ۵۹۷، ۵۹۸ ج ۲، ح:۱۱۶۸۔　[4] الفوائد المجموعة: ۱۱۸۔

[5] صحیح بخاری ح:۳۶۷۳۔ صحیح مسلم: ۲۵٤۱۔

اور اگر کوئی ایسے اعمال کے ذریعہ صحابہ کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا جن کا حکم دیا گیا ہے اور جو فرض ہیں، جیسے: پنج وقتہ نمازیں، حج، زکوٰۃ اور روزہ و جہاد تو پھر ان کے درجے تک ایسے عمل کے ذریعہ کیونکر پہنچ سکتا ہے جو فرض، واجب، سنت اور مستحب کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ اس عمل کے لیے سفر ہی مشروع ہے۔ البتہ نبی کریم ﷺ کی مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے سفر کرنا مستحب ہے۔ کیونکہ مسجد نبوی میں ایک نماز مسجد حرام کے علاوہ دوسری مسجدوں میں ادا کی جانے والی ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے۔ یعنی آپ کی قبر مبارک کی زیارت تو مسجد نبوی کی زیارت کرنے والوں اور اس میں نماز ادا کرنے والوں کے لیے صرف جائز ہے۔ احادیث میں اس زیارت کا کوئی اجر و ثواب بھی نہیں بیان کیا گیا ہے اور نہ اس زیارت کا حج سے کوئی دور کا تعلق ہی ہے۔ ایسی صورت میں نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کرنے والا حاجی صحابی کا درجہ کیسے حاصل کر سکتا ہے؟

رہی اس روایت کی سند تو اس کے راویوں میں ضعیف اور نا قابل اعتبار راویوں سے لے کر جھوٹے اور حدیثیں وضع کرنے والے راوی شامل ہیں۔

اس روایت کی تخریج جن ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں کی ہے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:
طبرانی نے المعجم الکبیر [1] اور الاوسط [2] میں، ابن عدی نے الکامل [3] میں دار قطنی نے سنن [4] میں اور بیہقی نے سنن [5] میں۔

اس روایت کا بنیادی راوی ابو عمر حفص بن سلیمان ہے جس نے اس کی روایت اللیث بن ابی سلیم سے کی ہے۔ اس نے مجاہد سے، مجاہد نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

حفص بن سلیمان بے حد ضعیف راوی ہے اور لیث بن ابی سلیم بھی ضعف ہے۔ حفص کو حافظ ابن حجر نے التقریب [6] میں متروک الحدیث اور یحیٰ بن معین نے اس کو جھوٹا قرار دیا ہے جیسا کہ الکامل میں ہے اور عبدالرحمٰن بن یوسف بن خراش [7] نے اس کو کذاب، متروک اور حدیثیں وضع کرنے والا قرار دیا ہے۔ [8]

---

[1] المعجم الکبیر: ص ۲۰۳ ج ۳۔
[2] المعجم الأوسط: ص ۲۲۲ ج ٤ ح ۳٤۰۰۔
[3] الکامل: ص ۷۸۸۔ ۷۹۱ ج ۲
[4] سنن دار قطنی: ص ۲۷۹۔
[5] سنن بیهقی: ص ۲٤٦ ج ٥۔
[6] التقریب: ص ۱۱۱ ترجمہ۔ ۱٤۰٥
[7] الصارم المنکی: ص ٦۲۔
[8] الضعیفه: ص ۱۲۰، ۱۲۲ ج ۱۔

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ مذکورہ روایت اپنی سند اور متن دونوں اعتبار سے باطل ہے۔

(۲٤۲)......مَنْ زَارَنِي بَعْدَ مَوْتِي ، فَكَأَنَّمَا زَارَنِي فِي حَيَاتِي))

''جس نے میری موت کے بعد میری زیارت کی تو گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔''

یہ روایت بھی باطل اور جھوٹ ہے۔ اس کا متن سابقہ روایت سے مشابہ ہے۔ صرف پہلا فقرہ: مَنْ حَجَّ نہیں ہے۔ اس متن کے خلاف شرع ہونے پر سابقہ روایت کے ضمن میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

اس زیر بحث روایت کو امام دار قطنی نے اپنی سنن [1] میں اس سند سے روایت کیا ہے:

ہارون ابی قزعہ سے روایت ہے، وہ آل حاطب کے ایک آدمی سے روایت کرتے ہیں اور حضرت حاطب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا......

محدث محمد ناصر الدین البانی تحریر فرماتے ہیں:

یہ سند ضعیف ہے جس کی دو علتیں ہیں:

(۱)......سند میں جس راوی کے نام کی صراحت نہیں ہے وہ مجہول ہے۔

(۲)...... ہارون ابی قزعہ ضعیف ہے جس کو یعقوب بن شیبہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ عقیلی، ساجی اور ابن جارود نے بھی اس کو ''ضعفاء'' میں شمار کیا ہے۔ امام بخاری کا اس کے بارے میں قول ہے کہ: اس کا متابع نہیں ہے۔''

اور اس سند کی تیسری علت یہ ہے کہ اس میں اضطراب اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کی سند متصل اور بعض نے مرسل بیان کی ہے۔ اسی طرح اس کے متن میں اور ہارون ابی قزعہ کے نام میں بھی اختلاف ہے۔ [2]

حافظ علامہ محمد بن احمد بن عبد الباری رحمہ اللہ نے مذکورہ روایت کے آخر میں اس فقرے کا اضافہ کیا ہے:

((وَمَنْ مَاتَ بِأَحَدِ الْحَرَمَيْنِ بُعِثَ مِنَ الْآمِنِيْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

''اور جو کوئی دونوں حرموں میں سے کسی ایک میں مرے گا تو ان لوگوں کے زمرے میں اپنی قبر سے اٹھایا جائے گا جو قیامت کے دن اس کی ہولناکی سے محفوظ ہوں گے۔''

ابن عبد الباری نے لکھا ہے کہ یہ حدیث بعینہٖ وہی حدیث ہے جو تقی الدین سبکی نے اپنی کتاب ''شفاء

---

[1] دار قطنی: ۲۷۹، ۲۸۰۔ [2] الضعیفہ: ص ۸۹، ۹۱ ج ۳، ح: ۱۰۲۱۔

السقام فی زیارۃ خیر الانام" میں چھٹی اور ساتویں حدیث کے نام سے نقل کی ہے۔ جس کی سند ضعیف اور مختلف فیہ ہے۔ ان تینوں روایتوں کا مدار ہارون ابی قزعہ پر ہے جس کو بعض راویوں نے 'ابن قزعہ' کہا ہے۔ اسی طرح کسی نے سند میں اس کا ذکر کیا ہے تو کسی نے اس کو ساقط کر دیا ہے۔ رہا اس کا شیخ: آل حاطب کا ایک آدمی' تو وہ کوئی مبہم شخص ہے۔ جس کا بعض نے ذکر کیا ہے اور بعض نے نہیں کیا۔

اسی طرح جس نے یہ حدیث "ہارون ابی قزعہ" سے روایت کی ہے تو اس کو بعض نے "سوار بن میمون"، کہا ہے اور بعض نے میمون بن سوار۔ کچھ لوگوں نے تو اس کا نام "اسود بن میمون" قرار دیا ہے۔

لہٰذا جس شخص کو علم حدیث کی معمولی بھی معرفت ہوگی اس کو اس امر میں کوئی شک نہ ہوگا کہ جس حدیث کے متن اور سند میں اس قدر اختلاف اور اضطراب ہو وہ بلاشبہ ناقابل اعتبار اور ساقط ہوتی ہے۔

(۲۴۳)......مَنْ زَارَ قَبْرِي وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِي۔

"جس نے میری قبر کی زیارت کی تو اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔"

حافظ ابن عبدالہادی نے "الصارم المنکی" [1] میں لکھا ہے: اس کی روایت دارقطنی اور بیہقی وغیرہ نے کی ہے۔

حافظ محمد عبدالرحمٰن سخاوی نے "المقاصد الحسنہ" [2] میں لکھا ہے۔ یہ حدیث صحیح ابن خزیمہ [3] میں ہے اور انہوں نے اس کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ حدیث ابوالشیخ عبداللہ بن محمد اصبہانی، طبرانی، ابن عدی، دارقطنی اور بیہقی کی کتابوں میں بھی ہے لیکن حسب ذیل الفاظ میں:

((مَنْ زَارَ قَبْرِي كَانَ كَمَنْ زَارَنِي فِي حَيَاتِي))

"جس نے میری قبر کی زیارت کی تو وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔"

جن دوسری کتابوں میں یہ من گھڑت اور باطل روایت نقل ہوئی ہے ان کے نام ہیں:

(۱) کشف [4] الخفاء (۲) قاعدۃ جلیلہ [5] من التوسل والوسیلۃ (۳) ضعیف [6] الجامع (۴) الفوائد المجموعہ [7]۔ علامہ حافظ ابن عبدالہادی تحریر فرماتے ہیں۔

---

[1] الصارم المنکی: ص ۳۰۔
[2] المقاصد الحسنۃ: ص ۴۸۳ ح ۱۱۴۵۔
[3] مجھے صحیح ابن خزیمہ میں یہ حدیث نہیں ملی۔
[4] کشف الخفاء: ص ۲۵۰ ج ۲۔
[5] قاعدہ جلیلہ من التوسل والوسیلہ: ص ۸۱۔
[6] ضعیف الجامع: ح ۵۶۰۷۔
[7] الفوائد المجموعۃ: ۱۱۷۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے رد میں ''شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام'' کے مؤلف[1] نے اپنی کتاب میں یہ پہلی حدیث نقل کی ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح یا حسن ہے۔ حالانکہ یہ حدیث نہ تو صحیح ہے اور نہ ثابت۔ بلکہ علم حدیث کے ائمہ کے نزدیک یہ حدیث منکر ہے اور اس کی سند ضعیف ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسئلے...... نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت...... کے بارے میں معترض نے جتنی حدیثیں نقل کی ہیں، جن کی تعداد دس (۱۰) سے زیادہ ہے ان میں سے ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے بلکہ سب کی سب ضعیف اور نا قابل اعتبار ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض موضوع ہیں۔[2]

آگے لکھتے ہیں:

امام بیہقی نے شعب الایمان میں اس روایت کی سند اور متن ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ہمیں ابوسعید مالینی نے خبر دی، کہا: ہمیں ابو احمد عبداللہ بن عدی حافظ نے خبر دی، کہا: ہم سے محمد بن موسیٰ حلوانی نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن اسماعیل بن سمرہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے موسیٰ بن ہلال نے، عبداللہ عمری سے، انہوں نے نافع سے، اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((مَنْ زَارَ قَبْرِی وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِی))

''جس نے میری قبر کی زیارت کی تو اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو گئی۔''

امام بیہقی اس روایت کی دوسری سند بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

یہ روایت: عن موسیٰ بن ہلال عبدی، عن عبیداللہ بن عمر کی سند سے بھی بیان کی جاتی ہے۔ ہم کو ابوعبداللہ حافظ نے خبر دی، کہا: ہم کو ابوالفضل محمد بن ابراہیم نے خبر دی، کہا: ہم سے محمد بن زنجویہ قشیری نے بیان کیا، کہا: ہم سے عُبید بن محمد بن قاسم بن ابی مریم وراق نے بیان کیا جو اصل میں نیساپور کے تھے اور بغداد میں آباد ہو گئے تھے، کہا: ہم سے موسیٰ بن ہلال عبدی نے بیان کیا......۔

امام بیہقی فرماتے ہیں: موسیٰ بن ہلال نے چاہے عبیداللہ کہا ہو یا عبداللہ، وہ ''عن نافع عن ابن عمر'' سے اپنی روایت میں ''منکر''[3] ہے۔ اس روایت کو اس کے سوا کسی اور نے نہیں بیان کیا ہے۔

---

[1] تقی الدین سبکی۔ [2] الصارم المنکی: ص ۲۲۔

[3] منکر ایسے ضعیف راوی کو کہتے ہیں جو عدالت اور ضبط حدیث کی صفت سے متصف نہ ہو۔ یا جو بکثرت غلطیاں کرے یا غفلت اور بھول چوک کا مریض ہو۔ یا اس سے فسق و فجور کا ظہور ہوتا ہو اور اپنی روایت میں ثقہ راوی کی مخالفت کرے۔

امام بیہقی کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے حافظ ابن عبدالہادی فرماتے ہیں:

صحیح یہ ہے کہ "یہ روایت موسیٰ بن ہلال نے عبداللہ عمری بکر سے کی ہے۔ جب کہ امام ابواحمد عبداللہ بن عدی وغیرہ نے تصریح کی ہے۔"

"اور امام بیہقی نے اس حدیث پر منکر ہونے کا جو حکم لگایا ہے وہ صحیح اور واضح حکم ہے۔ جس میں اس فن سے ادنیٰ تعلق رکھنے والے کو بھی شک نہیں ہوگا۔ اس کا انکار اس علم سے ناواقف ہی کرے گا۔ کیونکہ موسیٰ بن ہلال عبدی جیسے مجہول الحال اور غیر معروف راوی کی، عبداللہ بن عمر عمری جیسے برے حافظے اور شدید بھول چوک سے متصف راوی سے اپنی روایت میں منفرد ہونا اس روایت کے عدم قبول اور اس کے رد کر دینے کا موجب ہے۔ اس لیے کہ وہ نافع سے حدیثیں روایت کرنے والے تمام حفاظ اور ثقہ راویوں ، جیسے یحییٰ بن سعید انصاری، ایوب سختیانی، عبداللہ بن عون، صالح بن کیسان، اسماعیل بن امیہ قرشی، ابن جریج، اوزاعی، موسیٰ بن عقبہ، ابن ابی ذئب، مالک بن انس اور لیث بن سعد وغیرھم میں منفرد ہے۔ اگر اس روایت کی کوئی اصل ہوتی تو ان ائمہ حدیث میں سے بھی کسی نے نافع سے اس کی روایت کی ہوتی۔ لہٰذا یہ روایت بے بنیاد اور قابل رد و انکار ٹھہری۔"[1]

اس کے بعد اس مایہ ناز محدث: محمد بن احمد بن عبدالہادی نے اس باطل اور خلاف شرع روایت کا ۱۲ صفحات میں مکمل پوسٹ مارٹم کر کے اس کو سنداً اور متناً باطل ثابت کیا ہے۔ چونکہ یہ تفصیلات اردو قارئین کے لیے کچھ زیادہ مفید نہیں ہے اس لیے ان سے صرف نظر کرتا ہوں۔

(۲۴۴)...... مَنْ زَارَ قَبْرِي حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِي۔

"جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کو میری شفاعت حاصل ہوگئی یعنی وہ اس کا مستحق ہوگیا"

حافظ ابن عبدالہادی فرماتے ہیں:

شیخ تقی الدین سبکی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

اس کی تخریج حافظ ابوبکر احمد بن عمرو بن عبدالخالق بزار نے اپنی مسند میں اس سند سے کی ہے:

ہم سے قتیبہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبداللہ بن ابراہیم نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالرحمٰن بن یزید نے اپنے باپ سے، انہوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے نبی ﷺ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا ہے:

---

[1] الصارم المنکی: ص ۲۲۔

((مَنْ زَارَ قَبْرِي حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِي))

''یہ بعینہٖ پہلی حدیث ہے جس میں "وَجَبَتْ" کی جگہ "حَلَّتْ" ہے۔ اس لیے اس کا علیحدہ ذکر کر رہا ہوں۔''

شیخ تقی الدین سبکی کی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد ابن عبدالہادی لکھتے ہیں:

''یہ حدیث جس کا ذکر ''معترض'' نے اپنی کتاب میں کیا ہے ضعیف اور منکر ہے۔ اس کی سند ساقط الاعتبار ہے اور اس جیسی سند سے روایت کی جانے والی حدیث کسی بھی امام اور حافظ حدیث کے نزدیک قابل قبول اور قابل استدلال نہیں ہے: قتیبہ بزار کا شیخ ہے جو ''ابن المرزبان'' ہے۔ بزار نے اس سے اس کے علاوہ بھی حدیثیں روایت کی ہیں۔

رہا قتیبہ کا شیخ عبداللہ بن ابراہیم تو وہ ابن عمرو غفاری ہے جس کی کنیت ابو محمد اور لقب مدنی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھا۔ وہ بے حد ضعیف اور منکر الحدیث تھا۔ بلکہ بعض ائمہ حدیث نے اس پر کذب بیانی اور وضع حدیث کا الزام لگایا ہے۔

امام ابوداؤد کا قول ہے: عبداللہ بن ابراہیم منکر الحدیث تھا۔ امام دارقطنی فرماتے ہیں: اس کی روایت کردہ حدیثیں منکر ہیں۔ امام ابوعبداللہ حاکم نے لکھا ہے کہ وہ ثقہ راویوں کے نام سے موضوع اور جھوٹی روایتیں بیان کیا کرتا تھا جو اس کے علاوہ کسی اور نے نہیں روایت کی ہیں۔ خود بزار نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: عبداللہ بن ابراہیم نے ایسی حدیثیں روایت کی ہیں جن میں اس کا کوئی متابع نہیں ہے۔[1]

حافظ ابن حجر نے عبداللہ بن ابراہیم کو متروک الحدیث لکھا[2] ہے۔ امام ابن عدی فرماتے ہیں: اس کی روایت کردہ حدیثوں میں کوئی ثقہ راوی اس کا متابع نہیں ہے۔

یہ تو عبداللہ بن ابراہیم ابن ابی عمرو غفاری کا حال تھا۔ رہا اس کا شیخ: عبدالرحمٰن بن زید تو تمام ائمہ حدیث نے اس کو ضعیف اور نا قابل اعتبار راوی قرار دیا ہے: حافظ عمرو بن علی فلاس فرماتے ہیں: میں نے امام عبدالرحمٰن بن مہدی کو اس سے حدیث بیان کرتے ہوئے نہیں سنا۔ امام احمد نے بھی اس کو ضعیف قرار

---

[1] مطلب یہ ہے کہ وہ ان روایتوں میں منفرد ہے۔ ایک تو وہ خود ضعیف، منکر اور جھوٹا ہے اور اس پر یہ کہ اپنی روایتوں میں منفرد بھی ہے۔ سبکی نے حافظ بزار کا یہ قول نقل نہیں کیا۔ کیونکہ یہ ان کے مفاد میں نہیں تھا۔

[2] کذب بیانی کی وجہ سے جس کی حدیثوں کو نظر انداز کر دیا جائے وہ متروک الحدیث ہوتا ہے۔

دیا ہے۔ یحییٰ بن معین نے اس کی روایت کردہ حدیثوں کو دو کوڑی کے برابر بھی نہیں قرار دیا ہے۔ امام بخاری اور امام ابو حاتم فرماتے ہیں: امام علی بن مدینی نے اس کو حد درجہ ضعیف قرار دیا ہے۔ امام ابن عدی نے اس کی روایت کردہ جھوٹی حدیثوں کی مثال میں وہ حدیث پیش کی ہے جو اس سے عبداللہ بن ابراہیم نے اور اس نے سعید بن ابی سعید سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

((عُرِجَ بِي إِلَى السَّمَاءِ فَمَا مَرَرْتُ بِسَمَاءٍ إِلَّا وَجَدْتُ فِيهَا إِسْمِي مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ أَبُوْبَكْرٍ خَلْفِي))[1]

"مجھے آسمان کی بلندیوں پر لے جایا گیا تو میں کسی بھی آسمان سے نہیں گزرا مگر اس میں اپنا نام محمد رسول اللہ اور اپنے پیچھے ابوبکر کا نام پایا۔"

حافظ ابن عبدالہادی کی ان محدثانہ وضاحتوں سے یہ بات برہن ہو گئی کہ:

((مَنْ زَارَ قَبْرِي حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِي))

"جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کو میری شفاعت حاصل ہو گئی۔"

اپنے سے سابقہ روایت کی طرح حسب ذیل روایت:

((مَنْ زَارَ قَبْرِي وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِي))

"جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو گئی۔"

بھی رسول اکرم ﷺ سے منسوب جھوٹ ہے۔

اور شیخ تقی الدین سبکی جیسے مدعی علم حدیث کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔

(۲۴۵)......مَنْ جَاءَنِي زَائِرًا لَا تَعْمَلُهُ حَاجَةٌ إِلَّا زِيَارَتِي كَانَ حَقًّا عَلَى أَنْ أَكُوْنَ لَهُ شَفِيْعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

"جو میری زیارت کی غرض سے میرے پاس آئے گا میری زیارت کے سوا اس کی کوئی اور غرض نہ ہو گی تو میرے اوپر یہ واجب ہو جائے گا کہ قیامت کے روز میں اس کا شفیع اور شفاعتی بنوں۔"

یہ روایت بھی سند اور متن کے اعتبار سے ضعیف اور منکر ہے۔ اس کا ذکر نہ تو صحیحین میں، نہ سنن

[1] الصارم المنکی: ص ۴۱، ۴۲۔

اربعہ میں اور نہ مسند احمد میں آیا ہے۔ نہ ان ائمہ حدیث میں سے کسی نے اس کی روایت کی ہے جن کی روایتوں کا اعتبار ہے۔ نہ کسی ایسے امام حدیث نے اس کو صحیح قرار دیا ہے جس کی تصحیح معتبر اور معتمد علیہ ہے۔ اس کی روایت میں ایک ایسا راوی منفرد ہے جس کی شہرت اس زیر بحث روایت سے ہے یا ایک دوسری موضوع روایت سے جس کا ذکر حافظ طبرانی نے المعجم الکبیر[1] اور المعجم الاوسط[2] میں کیا ہے اور دونوں کی سند ایک ہے اور اس کے الفاظ ہیں:

((اَلْحِجَامَةُ فِي الرَّأْسِ أَمَانٌ مِنَ الْجُنُوْنِ وَالْجُذَامِ وَالْبَرَصِ وَالنُّعَاسِ وَالضِّرْسِ))

"سر میں پچھنا لگوانا جنون، جذام برص اونگھ اور داڑھ کے درد سے محفوظ رکھتا ہے۔"

علامہ حافظ محمد بن احمد بن عبدالہادی نے الصارم[3] المنکی میں زیر بحث روایت کی جو سند نقل کی ہے وہ درج ذیل ہے:

عبداللہ بن محمد عبادی سے روایت ہے۔ وہ مسلمہ بن سالم جہنی سے روایت کرتے ہیں۔ وہ عبیداللہ بن عمر سے وہ نافع سے، وہ سالم سے اور وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا......

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی روایت میں ایک ایسا شیخ منفرد ہے جس کو علم حدیث کی روایت اور تحمل کے میدان میں کوئی شہرت حاصل نہیں ہے اور نہ اس کا حال ہی معلوم و معروف ہے۔ اس کا نام مسلمہ بن سالم جہنی بصری ہے۔ اس سے اس حدیث کی روایت کرنے والا عبداللہ بن محمد عبادی ہے جس کا شماران رواۃ حدیث میں ہوتا ہے جن کی منفرد روایتیں ائمہ حدیث کے نزدیک نا قابل استدلال ہیں۔

محدث محمد ناصر الدین البانی نے بھی اس سند کو بے حد ضعیف قرار دیا ہے اور راوی کا نام مسلمہ کے بجائے "مسلم" لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ محدثین کے حلقوں میں وہ دونوں ناموں: مسلم اور مسلمہ سے معروف[4] تھا۔ البانی لکھتے ہیں:

مسلم بن سالم جہنی کو امام ابوداؤد نے غیر ثقہ قرار دیا ہے اور حافظ ہیثمی نے مذکورہ سند کے ضعیف ہونے کی یہی علت قرار دی ہے۔

---

[1] المعجم الکبیر: ص ۲۹۲ ج ۱۲ ح: ۱۳۱۵۰۔

[2] المعجم الاوسط: ص ۲۷۶ ج ۵ ح ٤٥٤٤۔

[3] الصارم: ص ٤٩۔ [4] تقریب التهذیب: ص ٤٦٢ ترجمه ٦٦٣٨۔

رہا عبداللہ بن محمد عبادی تو صرف حافظ ابوبکر محمد بن ابی مظفر سمعانی نے اس کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس کی جرح وتعدیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ لہٰذا وہ مجہول الحال [1] ہے۔

زیر بحث روایت:

((مَنْ جَاءَنِي زَائِرًا لَا تَعْمَلُهُ حَاجَةٌ إِلَّا زِيَارَتِي كَانَ حَقًّا عَلَيَّ أَنْ أَكُونَ لَهُ شَفِيعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

"جو میری زیارت کی غرض سے میرے پاس آئے گا، میری زیارت کے سوا اس کی کوئی اور غرض نہ ہوگی تو میرے اوپر یہ واجب ہو جائے گا کہ قیامت کے روز اس کا شفیع اور سفارشی بنوں۔"

کے ناقابل قبول اور ناقابل استدلال ہونے کے لیے اوپر کی وضاحتیں کافی ہیں۔ البتہ اس کی جانب اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت میں نبی کریم ﷺ کی قبر کی زیارت یا آپ کی وفات کے بعد آپ کی زیارت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا یہ روایت ان لوگوں کے دعویٰ کی دلیل بننے کے قابل بھی نہیں ہے جو نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر کو مشروع قرار دیتے ہیں۔

(۲۴۶)......مَنْ زَارَ قَبْرِي بَعْدَ مَوْتِي فَكَأَنَّمَا زَارَنِي فِي حَيَاتِي وَمَنْ حَجَّ وَلَمْ يَزُرْ قَبْرِي فَقَدْ جَفَانِي))

"جس نے میری موت کے بعد میری قبر کی زیارت کی تو گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔ اور جس نے حج کیا اور میری قبر کی زیارت نہیں کی تو اس نے مجھ سے بے رخی برتی۔"

یہ روایت بھی من گھڑت اور جھوٹ ہے جو دو روایتوں کو جوڑ کر ایک روایت کی شکل میں بنالی گئی ہے۔

علامہ حافظ ابن عبدالہادی نے فرماتے ہیں:

یہ روایت حد درجہ منکر ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ بلکہ من گھڑت اور موضوع ہے جس سے استدلال کرنا اور اس پر اعتقاد کرنا جائز نہیں ہے۔ جس کے درج ذیل اسباب ہیں:

(۱)...... یہ نعمان بن شبل کی روایت کردہ ہے جس پر امام حافظ موسیٰ بن ہارون حمال نے وضع

[1] الضعیفہ ص ۱۵، ۱۶، ج ۸، ص ۵۲۰، ۵۲۳ ج ۱۲۔

حدیث کا الزام لگایا ہے۔[1] امام ابو حاتم بن حبان بستی کا قول ہے: وہ ثقہ راویوں کے نام سے نہایت مصائب آمیز روایتیں نقل کرتا تھا یا ان کو الٹ پلٹ کر روایت کیا کرتا تھا۔[2]

(۲)......اس کی سند میں محمد بن فضل بن عطیہ شامل ہے جو بہت بڑا جھوٹا تھا۔[3] امام یحییٰ بن معین نے بھی اس کو کذاب قرار دیا ہے۔ امام احمد کا قول ہے وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کی روایت کردہ حدیثیں اہل کذب کی حدیثوں کی مانند ہیں۔ جوزجانی، فلاس اور ابو حاتم رازی نے بھی اس کو جھوٹا قرار دیا ہے۔[4] غرض یہ کہ تمام ائمہ حدیث نے اس کی تکذیب کی ہے۔[5]

(۳)......اس سند میں جابر جعفی بن شامل ہے جس کے بارے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے: میں نے جابر جعفی سے بڑا جھوٹا نہیں دیکھا ہے۔[6] امام نسائی نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔[7] بلکہ تمام ہی محدثین اور فقہاء نے اس کو کذاب قرار دیا ہے۔[8] وہ عقیدتاً رافضی تھا۔[9]

اس نہایت تاریک اور ناقابل استدلال سند کے بعد جس میں جھوٹے اور حدیثیں وضع کرنے والے راوی جمع ہو گئے ہیں، یہ روایت کس طرح قابل اعتماد ہو سکتی ہے اور "اس سے وہی شخص استدلال کر سکتا ہے جو علم حدیث سے کورا اور احکام شرع سے نابلد ہو۔"[10]

(٢٤٧)......مَنْ زَارَ قَبْرِي أَوْ مَنْ زَارَنِي كُنْتُ لَهُ شَفِيعًا أَوْ شَهِيدًا))

"جو میری قبر کی زیارت کرے گا یا میری زیارت کرے گا میں اس کے لیے شفاعت کرنے والا یا اس کے لیے گواہی دینے والا ہوں گا۔"

یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اپنی سند میں انقطاع راویوں کے غیر معروف ہونے اور راویوں

---

[1] معجم اسامی الرواۃ: ص ٢٧٩ ج ٤۔
[2] المجروحین: ص ٧٣ ج ٣۔
[3] المجروحین: ٢٧٨ ج ٢۔ الضعیفہ: ص ١٨٦، ١٩٢، ج ٢۔
[4] احوال الرجال ص ٢٠٢ ترجمہ: ٣٧٤۔ الجرح والتعدیل ص ٥٦ ج ٨۔
[5] التقریب ص ٤٣٦ ترجمہ: ٦٢٢٥۔ [6] الضعفاء ص ١٩٦ ج ٢۔
[7] الضعفاء والمتروکین ص ٧١ ترجمہ ١٠٠۔
[8] معجم اسامی الرواۃ ص ٣٤٩، ٣٣٢، ج ١۔
[9] التقریب ص ٧٦ ترجمہ ٨٧٨۔ [10] الصارم المنکی ص ٧٥۔

میں اضطراب اور اختلاف کی وجہ سے ساقط الاعتبار ہے۔ یہ روایت حقیقت میں ایک ہی ہے لیکن سند اور متن میں اضطراب اور اختلاف کی وجہ سے علم حدیث سے نابلد لوگوں نے اس کو تین روایتوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس فحش غلطی کرنے والوں میں شیخ تقی الدین سبکی بھی شامل ہیں جن کو علم حدیث کی وسیع معرفت حاصل تھی مگر عقیدے کی خرابی، حق دشمنی اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے شدید بغض وعناد نے ان کو اندھا بنا دیا تھا جس کی وجہ سے اپنی کتاب ''شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام'' میں منکر اور موضوع روایتیں بھر دی ہیں۔

اس زیر بحث روایت کو امام بیہقی نے اپنی کتاب ''السنن الکبری''[1] میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

یہ سند مجہول ہے۔ اس روایت کو حافظ ابوداؤد سلیمان بن داؤد بن جارود طیالسی بصری نے اپنی مسند میں اس سند سے نقل کیا ہے: ہم سے سوار بن میمون ابو جراح عبدی نے بیان کیا کہ: مجھ سے آل عمر کے ایک آدمی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((مَنْ زَارَ قَبْرِي ، أَوْ قَالَ: مَنْ زَارَنِي كُنْتُ لَهُ شَفِيعًا أَوْ شَهِيدًا ، وَمَنْ مَاتَ فِيْ أَحَدِا لْحَرَمَيْنِ بَعَثَهُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ مِنَ الْآمِنِيْنَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ))

''جو میری قبر کی زیارت کرے گا، یا فرمایا جو میری زیارت کرے گا میں اس کے لیے شفاعت کرنے والا یا اس کے لیے گواہ بنوں گا۔ اور جو دونوں حرموں میں سے کسی ایک میں مرے گا اللہ عزوجل اس کو اس حال میں اٹھائے گا کہ وہ قیامت کے دن اس کی ہولناکی سے محفوظ لوگوں میں شامل ہوگا۔''

حافظ ابن عبد الہادی لکھتے ہیں:

''دوسرے لوگوں نے ابوداؤد طیالسی سے اس روایت کی سند اور عبارت میں اختلاف کیا ہے اور ان کے شیخ: سوار بن میمون کو بعض راویوں نے الٹ دیا ہے اور میمون بن سوار کر دیا ہے۔ یہ میمون بن سوار مجہول ہے جس کی عدالت اور ضبط کا حال غیر معروف ہے۔ اس کو روایت حدیث اور تحمل کے میدان میں کوئی شہرت نہیں حاصل ہے۔ ابوداؤد کی روایت میں ''سوار'' کا شیخ مبہم او غیر معروف شخص ہے۔ جو مجہول

[1] السنن الکبریٰ للبیهقی: ص ۲۴۵ ج ۵۔

سے بری صفت ہے۔ بعض راویوں نے اس کا ذکر "عن رجل من آل عمر" سے کیا ہے۔ جیسا کہ اس روایت میں ہے۔ جب کہ دوسروں نے "عن رجل من ولد حاطب" کہا ہے اور کچھ نے تو "عن رجل من آل الخطاب" روایت کیا ہے۔[1]

سند کے دو راویوں کے مجہول اور مبہم ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں مذکورہ اضطراب اور اختلاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتماد ہے۔ اس روایت کے باطل ہونے کے جو مزید دلائل حافظ ابن عبدالہادی نے دیئے ہیں اور میمون بن سوار یا سوار بن میمون کے بارے میں امام بخاری اور حافظ عقیلی کے جو اقوال نقل کیے ہیں وہ تفصیل مزید کا درجہ رکھتے ہیں۔ جن کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔

البتہ عقیلی نے اپنی کتاب "الضعفاء"[2] میں اس روایت کی جو دوسری سند اور دوسرا متن نقل کیا ہے ان کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ رسول اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کو شرعی رنگ دینے کے لیے بیمار ذہنیت کے مالک لوگوں نے کیا کیا کوششیں صرف کی ہیں۔

حافظ عقیلی فرماتے ہیں:

ہم سے محمد بن موسیٰ نے بیان کیا۔ کہا: ہم سے احمد بن حسن ترمذی نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالملک بن ابراہیم عدی نے بیان کیا، کہا: ہم سے شعبہ نے، سوار بن میمون سے، انہوں نے ہارون بن قزعہ سے، انہوں نے آل خطاب کے ایک آدمی سے اور اس نے نبی مکرم ﷺ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَنْ زَارَنِي مُتَعَمِّدًا كَانَ فِي جِوَارِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ مَاتَ فِي أَحَدِ الْحَرَمَيْنِ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِي الْآمِنِيْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

"جو میری زیارت قصداً کرے گا وہ قیامت کے دن میرے جوار میں ہوگا اور جو کوئی حرمین میں سے کسی ایک میں مرے گا اس کو اللہ ان لوگوں کے زمرے میں اٹھائے گا جو قیامت کے دن محفوظ ہوں گے۔"

حافظ عقیلی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: یہ روایت کمزور ہے۔

یہاں یہ بات نگاہ میں رہے کہ اس زیر بحث روایت کے پہلے سفر میں نبی مکرم و معظم ﷺ کی قبر

[1] الصارم المنکی: ص ۹۶، ۹۷۔ [2] الضعفاء: ص ۳٦۱ ج ٤۔

مبارک یا آپ کی وفات کے بعد آپ کی زیارت مذکور نہیں ہے۔ اس لیے یہ روایت قبوریوں کے حق میں نافع نہیں ہے۔ حافظ ابن عبدالہادی لکھتے ہیں۔

حافظ عقیلی کی روایت میں اسی طرح "عن رجل من آل الخطاب" آل خطاب کے ایک آدمی سے روایت ہے، آیا ہے جو ابوداؤد طیالسی کی روایت: "عن رجل من آل عمر" آل عمر کے ایک آدمی سے روایت ہے" کے مطابق ہے۔ یہ گویا "من حاطب" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ امام بخاری کی تاریخ میں "عن رجل من ولد حاطب" اولاد حاطب کے ایک آدمی سے روایت ہے" مذکور ہے، جب کہ عقیلی کی روایت میں "عمر" کا ذکر نہیں ہے اور طیالسی کی روایت میں ہے۔ اسی طرح امام بخاری نے وکیع کی جو روایت نقل کی ہے اس میں بھی "عمر" کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ابوداؤد طیالسی کی روایت میں "عمر" کا ذکر "وہم" ہے۔ اسی طرح ان کی روایت کا تمام تر "مدار" ہارون پر ہے جو ایک مجہول اور غیر معروف شیخ ہے۔ جس کا ذکر صرف اسی حدیث میں آیا ہے اور حافظ ابوالفتح ازدی نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ہارون متروک الحدیث اور نا قابل استدلال ہے۔"

حافظ ابن عبدالہادی آگے لکھتے ہیں:

اوپر کی بحث سے یہ واضح ہوا کہ اس زیر بحث روایت کا تمام تر "مدار" ہارون ابن قزعہ" پر ہے جو صرف اسی حدیث کی روایت سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی ایسا "حال" معلوم نہیں جس کے بنیاد پر اس کی "خبر" قبول کرنے کے قابل ہو۔ اس کا ذکر نہ تو ابن ابی حاتم نے "الجرح والتعدیل" میں کیا ہے۔ نہ امام ابواحمد حاکم نے "کتاب الکنیٰ" میں اور نہ ہی امام نسائی نے کتاب الکنیٰ میں اس سے تعرض کیا ہے۔ وہ خود مجہول ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے مبہم اور غیر متعین شخص سے اپنی روایت میں منفرد بھی ہے جس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم کہ وہ کون ہے اور کس کا بیٹا ہے؟ لہٰذا اس طرح کے دو مجہول اور غیر معروف راویوں کی روایت کردہ حدیث کو ایسا کوئی بھی شخص حجت تسلیم نہیں کر سکتا جس کو حدیث کا وزن معلوم ہوگا۔ یا وہ اس علم سے کچھ بھی واقف ہوگا۔ مزید یہ کہ ہارون ابی قزعہ سے اس حدیث کا راوی: میمون بن سوار عبدی ایک ایسا شخص ہے جس کا نام مختلف فیہ ہے۔ کسی بھی امام حدیث نے اس کی توثیق نہیں کی ہے۔ بلکہ سب نے اس کو مطعون کیا ہے اور اس کی روایت کو رد کر دیا ہے۔[1]

(۲۴۸)......مَنْ حَجَّ حِجَّةَ الْإِسْلَامِ وَزَارَ قَبْرِي وَغَزَا غَزْوَةً وَصَلَّى

[1] الصارم المنکی: ص ۹۷، ۹۸۔

عَلَيَّ فِي بَيْتِ الْمَقْدِسِ لَمْ يَسْأَلْهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فِيمَا افْتَرَضَ عَلَيْهِ))

''جس نے اسلامی حج کیا، میری قبر کی زیارت کی، اور کسی غزوہ میں حصہ لیا، بیت المقدس میں میرے اوپر درود بھیجا تو اللہ عزوجل ان اعمال کے بارے میں اس سے سوال نہیں کریں گے جو اس نے اس پر فرض کیے ہیں۔''

یہ روایت موضوع اور رسول اللہ ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے۔ امام شوکانی نے الفوائد المجموعہ[1] میں، ابوالحسن علی بن عراق نے تنزیہ الشریعہ[2] میں، حافظ سیوطی نے ذیل الاحادیث الموضوع میں، محدث البانی نے الضعیفہ[3] میں اور حافظ ابن عبدالہادی نے الصارم المنکی[4] میں اس کو موضوع اور باطل قرار دیا ہے۔ اگر حافظ سیوطی کسی حدیث کو خاص طور پر جو فضائل سے متعلق ہو باطل اور موضوع قرار دے دیں تو پھر اس کے بارے میں کسی اور کی رائے جاننے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ وہ اس طرح کی حدیثوں کو موضوع کہنے کے لیے بڑی مشکل سے تیار ہوتے ہیں۔

اس زیر بحث حدیث کو کسی بھی محدث یا علم حدیث سے تعلق رکھنے والے نے صحیح نہیں کہا ہے۔ حتیٰ کہ اس حدیث سے استدلال کرنے والے شیخ تقی الدین سبکی نے بھی بصراحت اس کو صحیح نہیں کہا ہے البتہ اس کے بارے میں بعض ائمہ حدیث کی غیر مستند آراء کا حوالہ دے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کی غرض سے سفر مشروع ہے اور اس بات کی مطلقاً پروا نہیں کی کہ یہ روایت تو تمام فرائض کو کالعدم کر دینے اور ان کے نا قابل مواخذہ ہونے پر مبنی ہے۔

حافظ ابن عبدالہادی نے تقی الدین سبکی کا جواب دیتے ہوئے پورے وثوق سے کہا ہے کہ اس کی روایت عبدالرحمٰن بن مسعود، علقمہ، ابراہیم، منصور اور سفیان ثوری میں سے کسی نے نہیں کی ہے۔

اس جھوٹی روایت کی اصل آفت بدر بن عبداللہ ابوسہل مصیصی ہے جو وضاع حدیث تھا۔[6] رہے ابوالفتح محمد بن حسین ازدی تو ان کا دامن اس باطل روایت کو گھڑنے سے پاک ہے۔[7]

(۲۴۹)......((مَنْ زَارَنِي بَعْدَ مَوْتِي فَكَأَنَّمَا زَارَنِي وَأَنَا حَيٌّ))

''جس نے میری وفات کے بعد میری زیارت کی تو گویا اس نے میری زندگی میں میری

---

[1] الفوائد: ص ۱۰۹، ح ۱۸۔ [2] تنزیہ الشریعہ: ص ۱۷۵، ح۲۲۔

[3] الأحادیث الموضوعہ: ص ۱۲۲ ح ۵۷۱۔

[4] الضعیفہ: ص ۳۶۹، ۳۷۱ ح ۲۰۴۔ [5] الصارم المنکی: ص ۱۶۹ ح۹۔

[6] تنزیہ الشریعہ ص ۴۱ ج ۱۔ معجم أسامی الرواۃ: ص ۴۸۳ ج ۱۔

[7] الضعیفہ: ص ۳۷۰ ج۱۔

زیارت کی۔"

یہ روایت بھی اپنی سند اور متن کے اعتبار سے باطل اور جھوٹ ہے۔ کیونکہ یہ اس فاسد عقیدہ پر مبنی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو دنیوی زندگی حاصل ہے۔ حالانکہ آپ کو قبر میں جو زندگی حاصل ہے وہ برزخی زندگی ہے۔ جس طرح شہداء کو برزخی زندگی حاصل ہے۔ مگر اس دنیا سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہی تمام محدثین اور فقہاء کا عقیدہ ہے۔

اس بے بنیاد اور منکر روایت کی سند نہایت تاریک ہے۔ جس کو بنانے اور گھڑنے والا عبداللہ عمری ہے۔ اس کی سند میں شامل دوسرے دو راوی: حسن بن محمد سوی اور احمد بن سہل بن ایوب اھوازی ہیں جو منکر روایتیں روایت کیا کرتے تھے۔ لہٰذا ان کی دی ہوئی خبر یقیناً تصدیق واعتماد ہے اور اس کا چوتھا راوی خالد بن یزید عمری مکی متروک الحدیث تھا جس پر کذب بیانی کا الزام تھا۔

امام ابن ابی حاتم فرماتے ہیں:

خالد بن یزید عمری نے سفیان ثوری، اسحاق بن یحییٰ بن طلحہ، عبداللہ عمری اور ابوالعصر ثابت بن قیس سے روایت کی ہے۔ میں نے اپنے والد کو ایسا کہتے ہوئے سنا ہے اور اس سے علی بن حرب موصل نے روایت کی ہے۔ ابوزرعہ نے کچھ دنوں اس سے سن کر حدیثیں لکھیں پھر اس سے روایت کرنا چھوڑ دیا۔ میں نے یحییٰ بن معین کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ خالد بن یزید عمری کذاب ہے۔ میرے والد سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: جھوٹا ہے۔ میں مکہ میں اس کے پاس گیا تھا مگر اس کی مرویات نہیں لکھیں۔ کیونکہ اس کی روایت کردہ حدیثیں ناقابل اعتماد تھیں۔[1]

امام ابوحاتم بن حبان کا قول ہے۔

خالد بن یزید عمری ابوالولید مکہ میں مقیم تھا۔ مسلک اہل حدیث کا قائل تھا مگر سفیان ثوری کے نام سے حد درجہ منکر اور جھوٹی حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔[2]

(۲۵۰)......مَنْ زَارَنِي مُحْتَسِبًا إِلَى الْمَدِينَةِ كَانَ فِي جِوَارِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَفِي رِوَايَةٍ: مَنْ زَارَنِي بِالْمَدِينَةِ مُحْتَسِبًا كُنْتُ لَهُ شَفِيعًا وَشَهِيدًا۔

"جس نے مدینہ جا کر اجر وثواب کی نیت سے میری زیارت کی تو قیامت کے روز وہ میرا

---

[1] الجرح والتعدیل ص ۳۶۰ ج ۳۔ الصارم المنکی ۱۷۲۔ معجم اسامی الرواۃ: ص ۶۲۴، ۶۲۵۔
[2] المجروحین: ص ۲۸۴ ج ۱۔

ہمسایہ ہوگا۔ ایک دوسری روایت میں ہے: جس نے اجر وثواب کی نیت سے مدینہ میں میری زیارت کی تو میں اس کے لیے شفاعت کرنے والا اور گواہی دینے والا ہوں گا۔''

یہ روایت موضوع تو نہیں ہے لیکن ضعف اور نا قابل اعتبار ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

تاریخ جرجان میں یہ روایت اس سند سے بیان ہوئی ہے:

ہم سے ابوبکر صرامی نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابوعوانہ موسیٰ بن یوسف قطان نے بیان کیا، کہا: ہم سے عباد بن موسیٰ ختلی نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابن ابی فدیک نے سلیمان بن یزید تغلبی سے، انہوں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی ﷺ ...... اس کے بعد البانی تحریر فرماتے ہیں:

یہ سند ضعیف ہے۔ کیونکہ اس سلیمان بن یزید کو امام ابوحاتم نے منکر الحدیث بتایا ہے اور ابن حبان کا قول ہے: اس کی روایت کردہ حدیثوں سے استدلال کرنا جائز نہیں ہے۔ سند کے دوسرے راوی: موسیٰ بن یوسف قطان کے حالات کسی نے نہیں لکھے ہیں۔ رہا ابوبکر صرامی جس کا نام محمد بن احمد بن اسماعیل ہے تو تاریخ جرجان کے مصنف نے اس کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ اس کی وفات ۳۵۸ھ میں ہوئی اور اس کی جرح وتعدیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔[1]

حافظ ابن عبدالہادی لکھتے ہیں:

یہ حدیث صحیح اور ثابت نہیں ہے بلکہ ضعیف ہے۔ اس کی سند منقطع ہے۔ اگر یہ ثابت بھی ہوتی تو اس میں زیر بحث مسئلے: ''نبی اکرم ﷺ کی قبر کی زیارت'' کی کوئی دلیل نہیں ہے۔[2]

(۲۵۱)...... مَا مِنْ اَحَدٍ مِنْ اُمَّتِی لَهُ سَعَةٌ ثُمَّ لَمْ یَزُرْنِی فَلَیْسَ لَهُ عُذْرٌ۔

''میری امت کا کوئی بھی فرد جسے طاقت وفرصت حاصل ہو پھر بھی وہ میری زیارت نہ کرے تو اس کے لیے بھی عذر نہیں ہے۔''

یہ روایت بھی جھوٹ اور من گھڑت ہے۔ شیخ تقی الدین سبکی نے اس کی درج ذیل سند نقل کی ہے:

حافظ ابوعبداللہ محمد بن محمود بن نجار اپنی کتاب ''الدرة الثمینه فی فضائل المدینة'' میں لکھتے ہیں: ہمیں ابومحمد بن علی نے خبر دی کہا: ہمیں ابویعلی ازدی نے خبر دی: ہمیں ابواسحاق بجلی نے خبر دی، کہا: ہمیں سعید بن ابی سعید نیساپوری نے خبر دی، کہا: ہمیں ابراہیم بن محمد مودب نے خبر دی کہا: ہمیں

[1] الضعیفہ: ص ۱۱۲ ج ۱۰۔ [2] الصارم المنکی: ص ۱۷۵۔

ابراہیم بن محمد نے خبر دی، کہا: ہم سے محمد بن محمد نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن مقاتل نے بیان کیا، کہا: ہم سے جعفر بن ہارون نے بیان کیا، کہا: ہم سے سمعان بن مہدی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَنْ زَارَنِي مَيِّتًا فَكَأَنَّمَا زَارَنِي حَيًّا، وَمَنْ زَارَ قَبْرِي وَ جَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ: وَ مَا مِنْ أَحَدٍ مِنْ أُمَّتِي لَهُ سَعَةٌ ثُمَّ لَمْ يَزُرْنِي فَلَيْسَ لَهُ عُذْرٌ))

"جس نے میری زیارت مردہ حالت میں کی تو گویا اس نے میری زیارت زندہ حالت میں کی۔ اور جس نے میری قبر کی زیارت کی تو قیامت کے دن اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔ میری امت کا کوئی بھی فرد جسے طاقت وفرصت حاصل ہو پھر بھی وہ میری زیارت نہ کرے تو اس کے لیے کوئی عذر نہیں ہے۔"

حافظ ابن عبدالہادی لکھتے ہیں:

"معترض نے اس حدیث کا ذکر اسی طرح کیا ہے اور اس کی صحت وسقم کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے۔ حالانکہ یہ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ ہے اور سمعان مہدی کے سر منڈھ دی گئی ہے۔ اللہ اسے گھڑنے والے کا منہ کالا کرے! سمعان مہدی تک اس کی سند تاریکی پر تاریکی ہے۔ رہا سمعان مہدی تو وہ ایسے حیوانوں میں سے ہے جن کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ آیا ان کا کوئی وجود ہے یا نہیں؟!

رہے تقی الدین سبکی تو اگر ان کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ یہ روایت موضوع ہے تو وہ لوگوں میں اس علم سے سب سے زیادہ بے بہرہ تھے۔ اگر ان کو یہ بات معلوم تھی کہ یہ روایت جھوٹ ہے پھر بھی اس کی صحت وسقم بیان کیے بغیر اس کو بطور دلیل نقل کر دیا تو وہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کے مصداق ہیں:

((مَنْ حَدَّثَ عَنِّي بِحَدِيثٍ وَهُوَ يُرَى أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ))[1][2]

"جو میری نسبت سے ایسی حدیث بیان کرے جس کے بارے میں اس کا خیال ہو کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ دو جھوٹوں میں سے ایک ہے۔"

(۲۵۲)......مَنْ زَارَنِي حَتَّى يَنْتَهِيَ إِلَى قَبْرِي كُنْتُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَهِيدًا أَوْ شَفِيعًا۔

---

[1] مقدمہ صحیح مسلم: ج ۳۰ بحوالہ منۃ المنعم: ج ۱ ، [2] الصارم المنکی: ص ۱۷۷۔

''جو میری زیارت کرے یہاں تک کہ میری قبر تک پہنچ جائے تو میں قیامت کے دن اس کے لیے گواہ یا شفاعت کرنے والا ہوں گا۔''

یہ روایت بھی بے حد منکر ہے، صحیح حدیث نہیں ہے۔

شیخ تقی الدین سبکی لکھتے ہیں:

حافظ ابو جعفر عقیلی نے اپنی کتاب ''الضعفاء'' میں فضالہ بن سعید بن زمیل مازنی کے حالات...... ترجمہ...... کے ضمن میں اس حدیث کا ذکر درج ذیل سند سے کیا ہے۔

ہم سے سعید بن محمد حضرمی نے بیان کیا، کہا: ہم سے فضالہ بن سعید بن زمیل مازلی نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن یحییٰ مازنی نے ابن جریج سے، انہوں نے عطاء سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((مَنْ زَارَنِي فِي مَمَاتِي كَانَ كَمَنْ زَارَنِي فِي حَيَاتِي، وَمَنْ زَارَنِي حَتَّى يَنْتَهِيَ إِلَى قَبْرِي كُنْتُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَهِيْدًا أَوْ قَالَ: شَفِيْعًا))

''جس نے میری وفات کے بعد کی حالت میں میری زیارت کی تو وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے میری بندگی میں میری زیارت کی۔ اور جس نے میری زیات اس طرح کی کہ وہ میری قبر تک پہنچ گیا تو قیامت کے دن میں اس کے لیے گواہ ہوں گا۔ یا فرمایا: شفاعت کرنے والا۔''

سبکی نے آگے لکھا ہے:

حافظ ابن عساکر نے بھی اس کا ذکر اپنی کتاب میں اپنی سند سے کیا ہے جو حافظ ابو جعفر محمد بن عمرو عقیلی کے بعد سابقہ سند کی طرح ہے البتہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

((مَنْ زَارَنِي فِي الْمَنَامِ كَانَ كَمَنْ زَارَنِي فِي حَيَاتِي))

''جس نے نیند میں میری زیارت کی تو وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔''

حافظ ابن عبدالہادی لکھتے ہیں۔

یہ حدیث بھی بے حد منکر ہے، صحیح اور ثابت نہیں ہے جو حافظ عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج کے نام پر گھڑی گئی ہے۔ اس کی سند اور متن دونوں میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔

حافظ عقیلی کی کتاب "الضعفاء" کے ابن عساکر کے نسخے میں "من زارنی" جس نے میری زیارت کی" نہیں، بلکہ "مَن رآنی" جس نے مجھے دیکھا" آیا ہے۔ اس طرح حدیث معنیً صحیح ہوگی۔ کیونکہ صحیح حدیث کے الفاظ ہیں:

((مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي لِأَنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ بِي))[1]

"جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو اس نے مجھے ہی دیکھا ہے۔ اس لیے کہ شیطان میری شبیہ اختیار نہیں کر سکتا۔"

اور ایک دوسری روایت میں ہے:

((مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَسَيَرَانِي فِي الْيَقْظَةِ وَلَا يَتَمَثَّلُ الشَّيْطَانُ بِي))[2]

"جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ مجھے بیداری میں دیکھے گا اور شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا۔"

سند میں یہ تبدیلی کی گئی ہے کہ شعیب بن محمد کی جگہ "سعید بن محمد حضرمی" ذکر کیا گیا ہے جب کہ ماخذ ایک ہے۔

بہرحال یہ روایت ثابت نہیں ہے۔ کیونکہ فضالہ بن سعید بن زمیل مازنی مجہول ہے اور صرف اسی روایت کے ضمن میں آیا ہے۔

رہا محمد بن یحییٰ مازنی تو وہ مجہول نہیں بلکہ معروف ہے۔ لیکن اس کی عدالت "مختلف فیہ" ہے۔ امام ابن عدی نے کتاب الضعفاء میں اس کو منکر الحدیث لکھا ہے۔[3]

حافظ عقیلی نے زیر بحث حدیث کے بارے میں لکھا ہے: فضالہ کی حدیث غیر محفوظ ہے اور وہ صرف اس حدیث سے معروف ہے۔[4]

امام ذھبی نے اس کی رایت کردہ اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔[5]

(۲۵۳)......مَنْ لَمْ يُمْكِنْهُ زِيَارَتِي، فَلْيَزُرْ قَبْرَ إِبْرَاهِيمَ الْخَلِيلِ))

---

[1] صحیح بخاری: ح:٦١٩٧۔ صحیح مسلم: ح ٢١٣٤۔
[2] صحیح بخاری: ح٦٩٩٣۔ صحیح مسلم ٤٢٦٦۔
[3] الصارم المنکی: ص ١٨٠۔ الضعفاء ص ٢٢٣٨ ج ٦۔
[4] الارواء: ص ٣٣٥ ج: ٤
[5] معجم اسامی الرواۃ: ص ٣٩٩، ج ٣

''جس کے لیے میری زیارت ممکن نہ ہو اس کو چاہیے کہ وہ ابراہیم خلیل کی قبر کی زیارت کرے۔''

یہ روایت رسول اکرم ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے اور اس کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مستند کتب حدیث میں اس کا ذکر تو درکنار ان کتابوں میں بھی اس کو جگہ نہیں ملی ہے جو جھوٹی اور من گھڑت روایتوں کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ شیخ تقی الدین سبکی کے ترکش کا آخری تیر تھا جس سے انہوں نے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ پر ناکام وار کیا ہے۔

رسول اکرم فداہ ابی وامی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت سے متعلق کتابوں میں مذکور اور لوگوں میں زبان زد جھوٹی اور بے بنیاد روایات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان بد عقیدگیوں کا بھی تفصیلی جائزہ لیا جائے جو دین توحید ''اسلام'' سے نسبت رکھنے یا نسبت کا دعویٰ کرنے والے نام نہاد علماء، بزرگان دین، صلحاء اور عوام میں پھیلی ہوئی ہیں۔ عالم اسلام میں عمومی طور پر اور برصغیر کے ملکوں میں خصوصی طور پر بزرگان دین کی قبروں اور مزاروں پر جن مشرکانہ اعمال اور منکرات کا ارتکاب ہوتا ہے وہ نہ تو عربوں کے صنم کدوں میں دیکھے گئے اور نہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں میں۔

صلحائے امت کی قبروں کی زیارت:

اوپر ''زیارت قبور'' کے عنوان کے تحت رسول اکرم ﷺ کے جو ارشادات نقل کیے گئے ہیں، اولاً تو ان میں عام قبروں کی زیارت کی رخصت دی گئی ہے۔ ثانیاً ان میں اس زیارت کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے موت اور اس فانی دنیا کے بعد آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اس طرح ان ارشادات نبویہ سے ضمناً یہ حکم بھی نکلتا ہے کہ اگر قبروں کی زیارت سے موت و آخرت کی یاد تازہ کا مقصد پیش نظر نہ ہو بلکہ کوئی اور ''مقصد'' ہو تو زیارت قبور کا سابقہ حکم برقرار ہے یعنی یہ زیارت ممنوع ہے۔

احادیث میں زیارت کے لیے مخصوص لوگوں کی قبروں کی عدم تخصیص کا سبب بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ موت اور آخرت کی یاد تازہ کرنے کا مقصد ہر طرح کی قبروں کی زیارت سے حاصل ہوتا ہے۔ چاہے وہ عوام کی قبریں ہوں یا خواص کی، مسلمانوں کی قبریں ہوں یا غیر مسلموں کی، البتہ مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کے موقع پر، چاہے وہ عام مسلمانوں کی قبریں ہوں یا مخصوص مسلمانوں کی، ان کو سلام کرنے اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور عذاب سے نجات و عافیت طلب کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ رہے

کفار تو ان کے لیے استغفار کرنا حرام ہے۔

چونکہ سابقہ قوموں میں شرک کی بیماری انبیاء اور صلحاء کی عقیدت میں غلو کی راہ سے داخل ہوئی ہے جیسا کہ قرآن پاک اور احادیث میں صراحت ہے۔ اس لیے عام لوگوں کی قبروں کی زیارت، مخصوص لوگوں کی قبروں کی زیارت سے موت اور آخرت کی یاد تازہ کرانے میں زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ اسلام سے قبل اور اسلام کے بعد عام لوگوں سے کوئی خاص عقیدت وابستہ کی گئی ہو۔ ان کو اللہ اور بندوں کے درمیان واسطہ اور وسیلہ قرار دے کر ان سے ایسی چیزیں طلب کی گئی ہوں جنہیں دینے پر صرف اللہ تعالیٰ قدرت رکھتا ہے۔ لیکن اولیاء اللہ اور صلحاء کے حق میں ایسا اعتقاد سابقہ قوموں میں بھی رواج پا گیا تھا اور اس امت میں بھی ایسا اعتقاد عام ہے۔

اسی اندیشے کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول فداہ ابی وامی ﷺ نے متعدد مواقع پر قبروں کو سجدہ گاہیں اور عبادت گاہیں بنانے سے منع فرمایا ہے اور ایسا کرنے والوں پر لعنت فرمائی ہے، چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِي مَرَضِهِ الَّذِي لَمْ يَقُمْ مِنْهُ : لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ" لَوْلَا ذٰلِكَ أُبْرِزَ قَبْرُهُ، غَيْرَ أَنَّهُ خَشِيَ أَوْ خُشِيَ أَنْ يُتَّخَذَ مَسْجِدًا))[1]

"رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس بیماری میں جس سے آپ جاں بر نہ ہو سکے فرمایا: یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنالیا۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اگر یہ خوف نہ ہوتا تو آپ کی قبر نمایاں کر دی جاتی۔ لیکن آپ کو اندیشہ ہوا یا اندیشہ محسوس کیا گیا کہ اس کو سجدہ گاہ بنا لیا جائے گا۔"

حافظ ابن حجر فتح الباری میں تحریر فرماتے ہیں:

"أُبْرِزَ قَبْرُهُ" کا مطلب ہے کہ نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کو کھول دیا جاتا اور اس کو دیواروں کے درمیان بند نہ رکھا جاتا۔ ام المومنین کی مراد ہے: آپ کو گھر سے باہر دفن کیا جاتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات مسجد نبوی میں توسیع سے پہلے فرمائی تھی۔ اسی وجہ سے جب مسجد میں توسیع ہوئی تو ان کے حجرے کو مثلث شکل میں دیواروں سے گھیر دیا گیا تا کہ کسی کے لیے یہ ممکن نہ رہے کہ وہ استقبال قبلہ کے

[1] صحیح بخاری: ح ۱۳۹۰۔ صحیح مسلم: ح ۵۲۹۔

موقع پر اپنا چہرہ قبر کی طرف کر کے نماز پڑھے۔"[1]

حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات سے پانچ دن قبل آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((إِنِّي أَبْرَأُ إِلَى اللّٰهِ أَنْ يَكُوْنَ لِي مِنْكُمْ خَلِيْلٌ، فَإِنَّ اللّٰهَ قَدِ اتَّخَذَنِي خَلِيْلًا كَمَا اتَّخَذَ إِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا، وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا مِنْ أُمَّتِي خَلِيْلًا لَا تَّخَذْتُ أَبَابَكْرٍ خَلِيْلًا، أَلَا وَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدَ، أَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ، فَإِنِّي أَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ))[2]

"میں اللہ تعالیٰ سے اس بات سے اظہار برأت کرتا ہوں کہ تم میں سے کوئی میرا خلیل ہو۔ کیونکہ اللہ نے مجھے اپنا خلیل بنا لیا ہے جب کہ اس نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا تھا۔ اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو خلیل بناتا۔ آگاہ رہو! تم سے پہلے لوگ اپنے نبیوں اور صالح لوگوں کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیا کرتے تھے۔ خبردار! تم لوگ قبروں کو سجدہ گاہیں مت بنانا۔ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں۔"

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: فرماتی ہیں:

ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ سے ایک گرجا کا ذکر کیا جسے انھوں نے حبشہ میں دیکھا تھا جس میں تصویریں تھیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ أُولٰئِكَ إِذَا كَانَ فِيْهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ فَمَاتَ، بَنَوْا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِدًا، وَصَوَّرُوا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ، فَأُولٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))[3]

"درحقیقت ان میں اگر کوئی صالح اور نیک آدمی ہوتا اور وہ مرجاتا تو اس کی قبر پر مسجد، عبادت گاہ، بنا لیتے اور اس میں یہ تصویریں بنا دیتے۔ قیامت کے دن یہ لوگ اللہ کے نزدیک بدترین لوگ ہوں گے۔"

---

[1] فتح الباری: ص ۸۳۶ ج ۱۔ [2] صحیح مسلم: ح ۵۳۷-۱۱۱۸

[3] صحیح بخاری: ح ۴۲۷۔ صحیح مسلم: ح ۵۴۸

رسول اکرم ﷺ نے قبروں کو پختہ بنانے، ان پر بیٹھنے اور ان پر عمارتیں بنانے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُجَصَّصَ الْقَبْرُ، وَأَنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ وَأَنْ يُبْنَى عَلَيْهِ))[1]

''رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ قبر پختہ کی جائے اور یہ کہ اس پر بیٹھا جائے۔ اور اس پر عمارت بنائی جائے''

رسول اللہ ﷺ زیادہ اونچی قبروں کو زمین کے برابر کروا دیتے تھے، مشہور تابعی ثمامہ بن شفی بیان کرتے ہیں:

ہم حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کے ساتھ روم میں تھے جہاں ہمارے ایک ساتھی کی وفات ہوگئی۔ فضالہ نے ہمیں حکم دیا ان کی قبر کو زمین کے برابر بنائیں۔ پھر فرمایا:

((سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَأْمُرُ بِتَسْوِيَتِهَا))[2]

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو قبروں کو برابر کر دینے کا حکم دیتے ہوئے سنا ہے''

قبر کو زمین کے برابر کر دینے کا مطلب ہے کہ اس کو صرف اتنی اونچی رکھا جائے کہ معلوم ہو یہ قبر ہے اور لوگ اس کا احترام کریں۔ چنانچہ ابوالہیاج اسدی سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا:

((أَلَا أَبْعَثُكَ عَلَى مَا بَعَثَنِي عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ لَا تَدَعَ تِمْثَالًا إِلَّا طَمَسْتَهُ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا إِلَّا سَوَّيْتَهُ))۔[3]

''کیا میں تم کو اس مہم پر نہ بھیجوں جس پر مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا تھا؟ یہ کہ تم کسی تمثال اور مجسمہ کو مٹائے بغیر اور کسی اونچی قبر کی برابر کیے بغیر مت چھوڑنا۔''

اوپر قبروں، قبروں کی زیارت اور انبیاء علیہم السلام اور صلحاء کی قبروں کو عبادت گاہیں بنانے والوں پر اللہ کی لعنت سے متعلق رسول اللہ ﷺ کے صریح اور واضح ارشادات نقل کیے گئے ہیں جن کو اللہ کی اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور رسولوں کے بعد مقدس ترین لوگوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حرز جان بنائے

---

[1] صحیح مسلم: ح ۹۷۰، ۲۲۴۵۔
[2] صحیح مسلم: ح ۹۲۸، ۲۲۴۲۔
[3] صحیح مسلم: ح ۹۶۹، ۲۲۴۳۔

رکھا۔ ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے زمانوں میں بھی ان پر عمل جاری رہا۔ وسیع وعریض اسلامی دنیا میں لاکھوں کی تعداد میں ادھر ادھر پھیلی ہوئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبروں کو "مرجع خلائق مزارات" میں تبدیل نہیں کیا گیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں اسلام کے متوازی ایک نیا دین پیدا ہو گیا جو "طریق ولایت، طریقت، الہامی نظام اور تصوف وغیرہ کے ناموں سے معروف ہے۔ اس وقت اس نئے دین سے متعلق بحث کرنا میرا مقصد نہیں ہے بلکہ میں صرف قبر پرستی کے حوالہ سے اس سے تعرض کرنا چاہتا ہوں اور یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس نئے دین کے ظہور پذیر ہونے سے قبل مسلمانوں میں قبر پرستی کی بیماری نہیں تھی۔ اس مسئلے کی وضاحت کے لیے تصوف میں تصور شیخ یا ولایت کے مفہوم کو واضح کرنا ضروری ہے۔

اسلام میں ولی اور شیخ کا وہ تصور نہیں ملتا جو تصور تصوف نے دیا ہے۔ قرآن پاک کے مطابق ہر وہ شخص ولی ہے جو اللہ پر ایمان لائے، اس کا تقویٰ اختیار کرے، اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کا حکم دیا ہے ان کو بجا لائے اور جن چیزوں سے منع فرمایا ہے ان سے باز رہے:

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ ﴾ [یونس: ٦٢، ٦٣]

"آگاہ رہو! اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کسی خوف کا مقام ہے اور جو نہ رنجیدہ ہوں گے۔ اللہ کے دوست وہ ہیں جو ایمان لائے اور جو تقویٰ شعار ہیں۔

رہا تصور شیخ تو اس کا اس معنی میں کوئی وجود نہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان کوئی واسطہ اور وسیلہ ہے۔ یا کائنات میں اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے پائے جاتے ہیں جو صاحب تصرف ہیں۔ اسلامی عقائد کی رو سے کسی مخلوق کے بارے میں چاہے وہ انسان ہو، فرشتہ ہو یا جن اور نبی ہو یا ولی، یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ کائنات میں تصرف کی قدرت رکھتا ہے، وہ لوگوں کی مشکلات کو ختم کر سکتا ہے، ان کی مصیبتوں اور بلاؤں کو دور کر سکتا ہے ان کو بیماریوں سے شفاء دے سکتا ہے یا ان کو اولاد دے سکتا ہے، شرک اکبر ہے۔ یہ عقیدہ رکھنے والا مومن نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝ ﴾ [یونس: ٣١، ٣٢]

''اے نبی! کہو کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کون ہے جس کے اختیار میں سماعت اور بینائی ہے؟ کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ اور کون عالم کے امور کی تدبیر کرتا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے! پھر اللہ۔ تم کہو! پھر تم کیوں تقویٰ نہیں اختیار کرتے یہی اللہ تو تمہارا حقیقی رب ہے۔ اور حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے! آخرت تم لوگ کدھر پھرائے جارہے ہو۔

لیکن اس کے باوجود صوفیا کا یہ عقیدہ ہے کہ ''اولیاء اللہ'' کائنات میں تصوف رکھتے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی اس طرح کے مسائل میں بہت محتاط الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ پھر بھی فرماتے ہیں:

''اور جاننا چاہیے کہ بعض اولیاء اللہ سے بعد انتقال کے بھی تصرفات وخوارق سرزد ہوتے ہیں اور یہ امر معنیٰ حد تواتر تک پہنچ گیا ہے۔''[1]

اسی وجوہ سے ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اولیاء اللہ سے اس اعتقاد کے تحت استمداد یا استعانت کی جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قدرت سے پکارنے والے کی مدد کرنے پر قادر ہیں تو ان سے استمداد اور استعانت جائز ہے۔ اس بات کو انہوں نے اپنے خاص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

''جو استعانت واستمداد باعتقاد علم وقدرت مستقل ہو وہ شرک ہے۔ اور جو باعتقاد علم وقدرت غیر مستقل ہو اور وہ علم وقدرت کسی دلیل سے ثابت ہو جائے تو جائز ہے۔ خواہ مستمد منہ حی ہو یا میت۔''[2]

مولانا کو یہ معلوم ہے کہ قرآن پاک اور صحیح احادیث میں مسئلہ اسباب وعلل سے ماوراء امور میں غیر اللہ سے استمداد و استعانت حرام ہے۔ مگر ''کسی دلیل سے ثابت ہو جائے'' کہہ کر اس کو جائز بنا دیا۔

اسلام میں اذکار واوراد سراسر عبادت ہیں اور عبادت عنداللہ وہی مقبول ہوتی ہے جو کتاب وسنت سے ثابت ہو۔ لیکن ایک تو صوفیا نے بے شمار اذکار اوراد اپنے ذوق سے گھڑ لیے ہیں۔ دوم وہ ان کا ورد اکابر صوفیا کے توسط اور وسیلے سے کرتے ہیں۔ مولانا شاہ اسماعیل رحمہ اللہ برصغیر میں توحید خالص کے داعی کے طور پر مشہور ہیں۔ ان کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کتاب وسنت سے ماخوذ عقیدہ توحید کے موضوع پر ایک شاہکار تصنیف ہے۔ مگر خانوادہ تصوف سے تعلق رکھنے اور ''تحریک جہاد'' کے امیر سید احمد بن سید

---

[1] شریعت و طریقت ص ۳۲۷۔
[2] امداد الفتاویٰ: ص ۹۹ ج ٤ بحوالہ دین تصوف و طریقت ص ۱۰۲۔

عرفان کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کی وجہ سے ان کے قلم سے بھی ایسی باتیں نکل گئی ہیں جو ان کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کے مضامین کے منافی ہیں۔ چنانچہ وہ ''صراط مستقیم'' میں ''طریقہ چشتیہ'' کے مطابق ذکر کا طریقہ واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

طالب کو چاہیے کہ پہلے باوضو دوزانو بطور نماز بیٹھ کر اس طریقے کے بزرگوں: حضرت معین الدین سنجری اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی وغیرہ حضرات کے نام کا فاتحہ پڑھ کر بارگاہ خداوندی میں ان بزرگوں کے توسط اور وسیلہ سے التجا کرے۔ نیاز اور بے انداز اور زاری بے شماری کے ساتھ اپنے کام کے فتح یاب کے لیے دعا کر کے ذکر دوضربی شروع کرے۔''[1]

مولانا کی اس عبارت نے ''تقویۃ الایمان'' میں ان کے توحیدی مباحث پر پانی پھیر دیا۔ اس عبارت میں انہوں نے ''شرک'' کی جو دعوت ہے اس کی توجیہہ یہ کہہ کر نہیں کی جا سکتی کہ ''صراط مستقیم'' ان کی تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو ان کے امیر اور پیر و مرشد سید احمد کے ملفوظات سے عبارت ہے، جن کو انہوں نے قلم بند کیا ہے۔ اگر انہوں نے یہ عبارت لکھنے کے بعد اس سے اپنی براءت کا اظہار کر دیا ہوتا تو بلاشبہ وہ بری الذمہ ہو جاتے مگر احترام شیخ نے ان کو ایسا کرنے سے باز رکھا۔

ان دو مثالوں سے دنیا میں بزرگوں اور صلحائے امت کے مزارات کی کثرت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ دراصل بزرگوں کی قبروں کو مزارات میں تبدیل کرنے والوں اور ان میں مدفون مردوں سے فریادیں اور التجائیں کرنے والوں کو اس سے کیا غرض کہ رسول اکرم فداہ ابی و امی ﷺ نے قبروں کو پختہ بنانے، ان کو عبادت گاہیں اور سجدہ گاہیں بنانے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

((أَلَا وَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِهِمْ وَصَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدَ، أَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ، إِنِّيْ أَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ))[2]

''سن لو! درحقیقت جو لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں وہ اپنے نبیوں اور نیک لوگوں کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیا کرتے تھے۔ خبردار قبروں کو سجدہ گاہیں مت بنانا۔ میں تم لوگوں کو اس سے منع کرتا ہوں۔''

مگر مسلمانوں میں اس غلط عقیدے کے پھیل جانے کی وجہ سے کہ اولیاء اللہ اور بزرگان دین اللہ کے مقرب بندے ہیں۔ ان کے توسط سے گناہ بخشوائے جا سکتے ہیں۔ مصائب و آفات سے محفوظ رہا جا

[1] صراط مستقیم: ص ۲۱۵۔ [2] صحیح مسلم: ح ۵۳۲

سکتا ہے اور مرادیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ بالآخر ان کی قبروں کو عبادت گاہوں اور بت کدوں میں تبدیل کر کے زبان حال سے اعلان کر دیا گیا:

﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ط اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ o ﴾ [الزمر: ۳]

''ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرادیں گے۔ یقیناً اللہ ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ بیشک اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکرِ حق ہو۔''

آیت مبارکہ کا یہ ٹکڑا اس اعلان کے بعد آیا ہے: ''اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ'' خبردار! دین خالص، صرف اللہ کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خالص اور بے آمیز اطاعت اور بندگی اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اور اللہ کے سوا کوئی دوسرا ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ اس کی بھی پرستش کی جائے۔ اللہ کے لیے خالص بندگی اور عبادت میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی واسطہ اور وسیلہ نہیں ہے ''وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ'' اور ہم انسانوں کی رگ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔'' اور...... وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ط اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔

''اور اے نبی! میرے بندے اگر تم سے میرے بارے میں پوچھیں تو میں ان سے بالکل قریب ہوں کہ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔''

درود وسلام پڑھنے کے لیے نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت:

یہ بات بار بار واضح کی جاتی رہی ہے اور واضح کی جاتی رہنی چاہیے کہ اسلام نام ہے قال اللہ اور قال الرسول کا۔ جس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور پرستش کے جو طریقے کتاب وسنت میں بتا دیے گئے ہیں صرف وہی صحیح، قابل عمل اور عند اللہ مقبول ہیں۔ بقیہ دوسرے طریقے جو انسانوں نے خود گھڑ لیے ہیں وہ کارِ معصیت اور مردود ہیں۔

چنانچہ اوپر کے صفحات میں بڑی تفصیل سے یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے کسی بھی حدیث میں اپنے صحابہ اور ان کے بعد آنے والوں کو اپنی قبر مبارک کی زیارت کا نہ کوئی حکم دیا ہے، نہ اس کی ترغیب دی ہے اور نہ اس کی کوئی فضیلت بیان کی ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں درود وسلام

پڑھنے کی غرض سے مدینۃ الرسول ﷺ کا سفر اور مسجد نبوی میں حاضری ایک غیر شرعی عمل ہے۔ البتہ اگر کوئی مسلمان مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی غرض سے مدینہ طیبہ کا سفر کرے تو یہ ایک پسندیدہ عمل ہے۔ کیونکہ جہاں مسجد نبوی ان تین مساجد میں سے ایک ہے کہ جن کی زیارت اور ان میں نماز ادا کرنے کی غرض سے سفر کرنا جائز ہے۔ وہیں مسجد نبوی میں ادا کی جانے والی ایک نماز ''مسجد حرام'' کے سوا دوسری مسجدوں میں ادا کی جانے والی ایک ہزار نماز سے بہتر ہے۔

لہٰذا جس خوش نصیب کو مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی نیت سے مدینہ طیبہ جانے کا موقع ملے تو اس کے لیے علمائے اسلام نے یہ مستحب قرار دیا ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ اور صاحبین حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی قبروں کی طرف رخ کرکے ان کو سلام کرے اور وہاں سے رخصت ہو جائے۔ اس کی دلیل وہ حدیثیں ہیں جن میں مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کرنے والوں یا ان قبروں کے پاس سے گزرنے والوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان کو سلام کریں اور ان کے لیے دعا کریں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ امام اسماعیل بن اسحاق قاضی اپنی کتاب "فضل الصلاۃ علی النبی ﷺ" میں روایت کرتے ہیں:

''ہم سے علی نے بیان کیا، کہا: ہم سے سفیان نے بیان کیا: کہا: مجھ سے عبداللہ بن دینار نے بیان کیا، کہا: میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا ہے کہ وہ جب سفر سے واپس آتے تو مسجد میں داخل ہوتے اور کہتے:

((اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلٰى اَبِیْ بَكْرٍ، اَلسَّلَامُ عَلٰى اَبِیْ))

اور دو رکعتیں سنت ادا فرماتے۔[1]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے علاوہ کسی اور صحابی سے یہ منقول نہیں ہے کہ وہ ایسا کرتے رہے ہوں۔ چنانچہ خانوادہ عمری سے تعلق رکھنے والے جلیل القدر امام وحافظ ابو عثمان عبیداللہ بن عمر بن حفص بن عاصم بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں:

ہمیں نبی کریم ﷺ کے اصحاب میں سوائے عبداللہ بن عمر کے، کسی کے بارے میں یہ علم نہیں ہے کہ وہ ایسا کرتے تھے۔''[2]

---

[1] فضل الصلاۃ علی النبیؐ: ص ۱۹۲، ح ۹۹ [2] بحوالہ الصارم المنکی: ص ۲۴۳

لیکن موجودہ وقت میں جو لوگ مدینہ منورہ کا سفر کرتے ہیں ان میں شاذ و نادر ایسے لوگ ملیں گے جن کی زبانوں سے یہ سنا جاتا ہو کہ "ہم مسجد نبوی" میں نماز ادا کرنے کی غرض سے مدینہ منورہ جا رہے ہیں یا گئے تھے۔ اکثریت یہی کہتی ہے کہ "ہم روضہ نبوی پر سلام پڑھنے گئے تھے۔"

یہ دراصل ان جھوٹی روایات کا اثر ہے جن کا پچھلے صفحات میں بڑی تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ان جھوٹی روایات نے لوگوں کے عقائد بدل دیے۔ ان کے انداز فکر کو بدل دیا ہے۔ مطلوب کو غیر مطلوب اور غیر مطلوب کو مطلوب بنا دیا ہے۔ ان جھوٹی روایات کو گھڑنے والے اور پھیلانے والے ارباب تصوف ہی ہیں اور انہی کی کتابوں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

ایک جھوٹا واقعہ:

فتح بیت المقدس کے موقع پر جب خلیفہ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیت المقدس تشریف لے گئے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ان سے یہ درخواست کی کہ وہ ان کو شام میں برقرار رہنے دیں۔ حضرت عمر نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور ان کو وہاں رہنے کی اجازت دے دی۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ایک رات میں نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ان سے فرما رہے تھے:

بلال! مجھ سے یہ بے رخی کیوں؟ کیا تمہارے لیے میری زیارت کا وقت نہیں آیا؟ جو خواب دیکھنے پر وہ نہایت غمگین حالت میں بیدار ہوئے اور سواری پر بیٹھ کر جانب مدینہ روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچتے ہی نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس روتے ہوئے حاضر ہوئے اور اپنے چہرے کو قبر مبارک سے رگڑنے لگے۔ اتنے میں وہاں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما آ گئے۔ حضرت بلال نے ان کو سینہ سے لگا کر ان کو چومنا شروع کر دیا۔ انہوں نے کہا: ہم آپ سے اذان سننا چاہتے ہیں۔ حضرت بلال تیار ہو گئے اور مسجد کی چھت پر گئے اور کھڑے ہو کر اذان دینا شروع کیا۔ انہوں نے جب اللہ اکبر کہا: تو مدینہ منورہ ہل گیا اور لرز اٹھا۔ اور جب اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، کہا تو اس کی لرزش میں اضافہ ہو گیا۔ اور جب اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہا تو پردہ دار جوان لڑکیاں پردے سے باہر آ گئیں۔ لوگ پکار اٹھے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد اس دن سے زیادہ کبھی رونے والے اور رونے والیاں نہیں دیکھی گئیں۔

امام شمس الدین محمد بن احمد ذہبی فرماتے ہیں: اس روایت کی سند کمزور اور متن منکر ہے۔"[1]

حافظ علامہ محمد بن احمد بن عبدالہادی تحریر فرماتے ہیں:

اس اثر کا ذکر امام الحاکم ابو احمد محمد بن احمد نیشاپوری نے اپنے فوائد کے پانچویں حصہ میں کیا ہے اور انہی کی سند سے حافظ ابوالقاسم علی بن حسن ابن عساکر نے اپنی کتاب تاریخ دمشق میں کیا ہے۔ یہ اثر غریب اور منکر ہے۔ اس کی سند میں مجہول راوی شامل ہے اور اس کی سند متصل بھی نہیں ہے۔ بلکہ منقطع ہے۔ اس کی روایت محمد بن فیض غسانی نے ابراہیم بن محمد بن سلیمان بن بلال سے، اس نے اپنے باپ: محمد سے اور اس نے اس کے دادا سلیمان سے کی ہے۔ اس سند میں محمد بن فیض غسانی منفرد ہے اور اس کا شیخ: ابراہیم بن محمد ثقاہت، امانت اور ضبط میں کوئی درجہ[2] نہیں رکھتا۔ ابوزرعہ، ابو حاتم، محمد بن مسلم بن وارہ اور یعقوب بن سفیان فسوی جیسے حفاظ حدیث دمشق گئے جہاں وہ موجود تھا۔ لیکن ان میں سے کسی نے اس سے یہ قصہ یا کوئی اور حدیث روایت نہیں کی ہے۔ اگر وہ اہل الحدیث سے تعلق رکھتا ہوتا تو اس سے ضرور روایت کرتے۔ خاص طور پر ابو حاتم رازی جو شیوخ حدیث سے ملاقات کرنے کے بے حد حریص تھے۔

اور ابراہیم کا باپ محمد بن سلیمان ایسا شخص ہے جس سے بہت کم حدیثیں مروی اور اس کے حالات کی تفصیلات نہیں ملتیں جن کی روشنی میں اس کی مرویات قبول کی جاسکیں۔ امام بخاری نے اس کی صرف ایک حدیث نقل کی ہے اور اس کی ثقاہت کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ نیز اس کو کسی بھی امام حدیث نے ثقہ نہیں قرار دیا ہے۔[3] اس طرح اس جھوٹے واقعہ کی سند کے تین راوی محمد بن فیض غسانی، ابراہیم بن محمد اور محمد بن سلیمان غیر معروف ہیں جن کو کسی بھی امام حدیث نے ثقہ نہیں قرار دیا ہے۔[4]

اس واقعہ کے من گھڑت اور جھوٹے ہونے کی سب سے بڑی دلیل اس کا متن ہے۔ اس میں مستعمل لفظ، الجفوۃ، جفا" کا مصدر ہے جو اس جھوٹی روایت میں آیا ہے جس پر تفصیل بحث اوپر گزر چکی

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ص ۲۱۳ ج ۳۔

[2] امام ذہبی نے ابراہیم کو مجہول لکھا ہے اور حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں اس قصہ کو موضوع لکھا ہے۔ معجم اسامی الرواۃ: ص ۶۳،۶۴ ج ۱۔

[3] التاریخ الکبیر: ص ۹۸ ج ۱۔

[4] الصارم المنکی: ص ۲۳۷، ۲۴۱ اختصار اور تصرف کے ساتھ۔

ہے۔ جس کے الفاظ ہیں:

((مَنْ حَجَّ ، وَلَمْ يَزُرْنِي فَقَدْ جَفَانِي))۔

''جس نے حج کیا اور میری زیارت نہیں کی تو اس نے مجھ سے بے رخی برتی۔''

سوال یہ ہے کہ جس عمل کا رسول اللہ ﷺ نے کبھی حکم نہیں دیا، اس کی ترغیب نہیں دلائی اور اس کا کوئی معمولی سا اجر وثواب نہیں بتایا اس کا تارک آپ سے بے رخی برتنے والا اور آپ پر سختی کرنے والا کیونکر قرار پا سکتا ہے جو اسلام کی نگاہ میں کفر کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر رسول اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت دین میں اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے تو قرآن پاک میں اس کو بیان ہونا چاہیے تھا اور نبی اکرم ﷺ کو اپنی زبان مبارک سے اس کو واضح کرنا چاہیے تھا۔ جس طرح آپ نے مختلف مواقع پر اپنی محبت کی اہمیت واضح فرمائی ہے اور اس کو ایمان کے لیے صحت کی شرط قرار دی ہے:

((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ))[1]

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے باپ، بچوں اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''

اور ایک بار جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

اے اللہ کے رسول! یقیناً آپ مجھے اپنی ذات کے سوا بقیہ تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا ، وَالَّذِيْ نَفْسِي بِيَدِهِ ، حَتَّى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ))[2]

''نہیں، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، یہاں تک کہ میں تیرے نزدیک تیری جان سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''

اس کے برعکس آپ نے اپنی قبر مبارک کی زیارت کا حکم دینا تو دور کی بات ہے اپنی قبر کے پاس میلا لگانے سے منع فرما دیا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

((لَا تَجْعَلُوا قَبْرِي عِيدًا، وَلَا تَجْعَلُوا بُيُوْتَكُمْ قُبُوْرًا، وَصَلُّوْا عَلَيَّ وَسَلِّمُوْا حَيْثُمَا كُنْتُمْ ، فَسَيَبْلُغُنِي سَلَامُكُمْ وَصَلَاتُكُمْ))

---

[1] صحيح بخاری: ح ١٥۔ صحيح مسلم: ح ٤٤۔ [2] صحيح بخاری: ح ٦٦٣٢۔

''میری قبر کو جشن گاہ مت بنانا اور اپنے گھروں کو قبر مت بنانا۔ میرے اوپر جہاں بھی تم ہو، درود وسلام بھیجتے رہنا، کیونکہ مجھ تک تمہارا اسلام اور تمہارا درود پہنچ جائے گا۔''[1]

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے:

((لا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قُبُوْرًا، وَلَا تَجْعَلُوا قَبْرِي عِيْدًا وَ صَلُّوْا عَلَيَّ فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ تَبْلُغُنِي حَيْثُمَا كُنْتُمْ))[2]

''اپنے گھروں کو قبر اور میری قبر کو جشن گاہ مت بنانا اور میرے اوپر درود بھیجتے رہنا کیونکہ تمہارا درود مجھ تک پہنچ جائے گا جہاں کہیں بھی تم ہو گے۔''

ان ارشادات سے تین باتیں معلوم ہوئیں:

(۱)...... میری قبر کے پاس درود وسلام کی غرض سے جم گھٹا نہ کرنا۔ جیسا جم گھٹا عید اور خوشی کے موقع پر کیا جاتا ہے۔

(۲)...... جہاں کہیں سے بھی نبی کریم ﷺ پر درود وسلام بھیجا جائے گا وہ آپ تک پہنچ جائے گا جس کے لیے فرشتے مقرر ہیں۔[3] درود وسلام کی غرض سے قبر مبارک کی زیارت ضروری نہیں ہے۔

(۳)...... قبروں کی مانند گھروں کو شہر خموشاں نہ بنایا جائے۔ بلکہ ان کو نمازوں اور تلاوت قرآن کے ذریعہ آباد رکھا جائے۔ معلوم ہوا کہ قبریں نماز اور تلاوت کی جگہ نہیں ہیں۔

قرآن پاک کی ایک آیت سے غلط استدلال:

نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کی ترغیب دلانے والے اور اس کے خود ساختہ اجر وثواب کی ترویج کرنے والے، رسول اکرم ﷺ کو بندے اور اللہ کے درمیان واسطہ اور وسیلہ قرار دینے والے سورۃ النساء کی درج ذیل آیت سے غلط استدلال کرتے ہیں:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ○ ﴾

[النساء: ٦٤]

---

[1] فضل الصلاۃ علی النبی ﷺ: ح ٢٠۔

[2] ابوداؤد: ح ٢٠٤٢۔ مسند امام احمد: ح ٨٧٩٠۔

[3] فضل الصلاۃ: ح ٢١۔

''جب وہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے اگر تمہارے پاس آ جاتے اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول ان کے لیے استغفار کرتا تو یقیناً اللہ کو بہت زیادہ توبہ قبول فرمانے والا اور نہایت مہربان پاتے۔

مذکورہ گروہ کے لوگ کہتے ہیں کہ ''یہ آیت عام ہے اور اس میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب بھی وہ کسی بڑے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھیں تو رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ اپنے گناہ، پر پشیمانی کا اظہار کریں، خود استغفار کریں اور رسول اللہ ﷺ ان کے لیے استغفار کریں تو اللہ تعالیٰ ان سے گناہ کو معاف فرما دے گا۔

جب نبی کریم ﷺ باحیات تھے تو اعتراف گناہ کے لیے آپ کی خدمت میں حاضری مطلوب تھی۔ اور اب جب کہ آپ کا ''وصال'' ہو چکا ہے تو اس غرض کے لیے آپ کی قبر مبارک کے پاس حاضر ہو کر خود استغفار کرنا چاہیے اور رسول اللہ ﷺ سے دعا اور استغفار کی درخواست کرنی چاہیے۔

لیکن یہ توجیہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں جو طرز بیان اختیار فرمایا ہے وہ مذکورہ غلط اور روح توحید کی منافی تفسیر میں زبردست مانع ہے اور اس کو ماضی سے خاص کر دیتا ہے۔

آیت مبارکہ میں ''ظَلَمُوْا'' سے پہلے جو ''اِذْ'' آیا ہے، یہ اسم ظرف زمان ہے جو کسی فعل سے پہلے آتا ہے اور اس کو ماضی کے لیے خاص کر دیتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس کے بعد آنے والا فعل ماضی ہے یا مضارع۔ برخلاف ''اِذَا'' کے۔ جو فعل ماضی سے پہلے جب آتا ہے تو اس کو فعل مضارع میں بدل دیتا ہے۔

زیر بحث آیت کا تعلق منافقین سے ہے جو اوپری زبان سے تو اللہ اور رسول پر ایمان کا دعویٰ کرتے تھے مگر معاملہ پیش آنے پر وہ رسول اللہ ﷺ سے رجوع کرنے کی بجائے طاغوت سے رجوع کرتے تھے۔ پہلے تو ان کے دعوائے ایمان کو چیلنج کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ رسول پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا اس کی اطاعت ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے رسول مبعوث فرمائے ہیں ان کو ان کی قوموں کے لیے مطاع بنایا ہے۔ لہٰذا رسول کی اطاعت سے گریز دعوائے ایمانی کے منافی ہے۔ پھر فرمایا اگر یہ لوگ اپنے ایمان میں سچے تھے اور ان سے نبی کی نافرمانی ہوگئی تھی تو ان کو چاہیے تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کا اعتراف کرتے، اپنی اس نافرمانی پر اللہ سے معافی کے طلب گار ہوتے اور رسول اللہ ﷺ بھی ان کے لیے استغفار کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان

پاتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہ کر کے اپنی دشمن اور بیمار ذہنیت کا ثبوت دیا۔

اس آیت کا تعلق اس لیے بس ماضی سے ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ذات اطہر سے رجوع ہو کر اعتراف گناہ کرنا اور آپ سے دعا و استغفار کی درخواست کرنا صرف آپ کی حیات پاک ہی میں ممکن تھا۔ آپ کی رحلت کے بعد یہ ممکن نہیں ہے۔ بلکہ ایک مومن کے لیے اب دینی مرجع کتاب وسنت ہے۔ اب نبی مکرم ﷺ نہ تو کسی کی درخواست سن سکتے ہیں، نہ اس کی رہنمائی کر سکتے ہیں اور نہ اس کے لیے دعا و استغفار ہی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ اعمال زندوں کے ساتھ مخصوص ہیں:

((إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ إِنْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنَ ثَلَاثٍ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهُ))[1]

''جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے۔ صدقہ جاریہ، ایسا علم جس سے استفادہ کیا جاتا رہے اور ایسی صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔''

چونکہ یہ تین چیزیں انسان کے اپنے اعمال اور اس کے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے اس دنیا سے جانے کے بعد بھی اس کو ان کا ثواب پہنچتا رہے گا۔ گویا ان تین چیزوں کی صورت میں اس کا عمل جاری ہے۔

لہٰذا مذکورہ آیت سے استدلال کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت اور آپ سے دعا و استغفار کی درخواست کو جائز بلکہ مستحب بتانا آیت میں تحریف کرنا ہے۔ اس سلسلے میں جن روایتوں کا سہارا لیا جاتا ہے ان میں سے کوئی بھی روایت صحیح اور قابل استدلال نہیں ہے۔ ان کے بارے میں تفصیلی گفتگو ان شاء اللہ آگے آرہی ہے۔ مگر پہلے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ زیر بحث آیت کی مماثل آیت دوسری جگہ آئی ہے۔ اس میں متقیوں کی صفات بیان ہوئی ہیں اور یہ آیت جس طرح نبی کریم ﷺ کے زمانے سے متعلق تھی اس طرح آج کے حالات سے بھی تعلق رکھتی ہے اور قیامت تک قابل عمل رہے گی۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾

[آل عمران: ۱۳۵]

---

[1] صحیح مسلم: ح ۱۶۳۱، ۴۲۲۳۔

”(اور متقی وہ ہیں) جو بہت برا کام اگر کوئی کر بیٹھتے ہیں یا ان سے اپنے آپ پر ظلم سرزد ہو جاتا ہے تو انہیں اللہ یاد آ جاتا ہے اور وہ اللہ سے معافی کے طلب گار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو معاف کر سکتا۔ اور وہ لوگ جانتے بوجھتے برے اعمال پر اصرار نہیں کرتے۔

غور فرمایئے لفظ ”اِذْ“ نے سورۂ النساء کی آیت کو ماضی کے ساتھ خاص کر دیا۔ جب کہ آل عمران کی اس آیت میں ”اِذَا“ کے استعمال نے اس کو ماضی، حال اور مستقبل کے لیے عام کر دیا۔ ان دونوں آیتوں کے ترجمہ میں اذ اور اذا کے فرق کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ دونوں جگہ ماضی کے افعال استعمال کیے گئے ہیں۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارَ

سورۃ النساء کی آیت نمبر ۶۴ سے رسول اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے استحباب، نبی ﷺ کو اللہ اور بندوں کے درمیان واسطہ اور وسیلہ بنانے اور آپ سے دعا و استغفار کی درخواست کرنے کو مشروع قرار دینے والے اپنے اس خیال اور عقیدے کی تائید میں بعض ایسی روایتوں کا سہارا لیتے ہیں جو نا قابل اعتماد ہیں۔

اس سلسلے میں سرفہرست ایک نامعلوم اعرابی کا قصہ ہے جس کا ذکر بعض مفسرین اور ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔

مذکور اعرابی کا قصہ جن لوگوں نے بیان کیا ہے، ان میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اس واقعہ کو نقل کرنے والے ابو صادق عبداللہ بن ناجز، محمد بن عبداللہ بن عمرو بن معاویہ بن عمرو بن عتبہ بن ابی سفیان متوفی ۲۲۸ھ اور محمد بن حرب ہلالی ہیں۔

سارے راوی اس بات پر متفق ہیں کہ یہ واقعہ رسول اکرم ﷺ کی وفات پر تین دن کے بعد پیش آیا اور ان راویوں میں سے ہر ایک اس کا عینی شاہد تھا۔ جب کہ عتبی اور محمد بن حرب ہلالی اس واقعہ سے ۲۰۰ دو سو سال بعد پیدا ہوئے تھے۔

قصہ کے الفاظ ہیں:

(۲۵۴)......قَدِمَ عَلَيْنَا اَعْرَابِيٌّ بَعْدَ مَا دَفَنَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بِثَلَاثَةِ اَيَّامٍ فَرَمٰى بِنَفْسِهٖ اِلٰى قَبْرِ النَّبِيِّ ﷺ وَ حَثٰى عَلٰى رَاْسِهٖ مِنْ تُرَابِهٖ وَقَالَ: يَا

رَسُوْلَ اللّٰهِ قُلْتَ فَسَمِعْنَا قَوْلَكَ وَعَيْنَا عَنِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَمَا وَعَيْنَا عَنْكَ وَكَانَ فِيْمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ عَلَيْكَ، ﴿ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴾ وَقَدْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَجِئْتُكَ تَسْتَغْفِرُلِيْ، فَنُوْدِيَ مِنَ الْقَبْرِ: أَنَّهُ قَدْ غُفِرَلَكَ))

"جب ہم نے رسول اللہ ﷺ کی تدفین کر دی اس کے تین دن بعد ایک اعرابی ہمارے پاس آیا اور اپنے آپ کو نبی ﷺ کی قبر کے پہلو میں ڈال دیا اور اپنے سر پر قبر کی مٹی ڈالی اور بولا: اے اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا اور ہم نے آپ کا ارشاد سنا۔ ہم نے اللہ عزوجل کے ارشاد کو سمجھ کر اپنے سینے میں محفوظ کر لیا، لیکن آپ کے ارشاد کو محفوظ نہ کیا۔ اللہ عزوجل نے آپ پر جو کچھ نازل فرمایا اس میں یہ بھی ہے: جب وہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے اگر وہ تمہارے پاس آ جاتے اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول ان کے لیے استغفار کرتا تو یقیناً اللہ کو بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور نہایت مہربان پاتے۔ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے" اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ میرے لیے استغفار فرمائیں"۔ تو قبر سے ندا آئی: بیشک تمہاری مغفرت ہوگئی۔"

عبرت کا مقام ہے کہ ابھی رسول اکرم فداہ ابی وامی ﷺ کی وفات پر صرف تین دن گزرے ہیں۔ آپ کا ایک صحابی قبر پر حاضری دیتا ہے اور سر پر قبر کی مٹی ڈالتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ دیکھ رہے ہیں کچھ نہیں کہتے۔ پھر آپ کو پکارتا ہے۔ آپ سے استغفار کی درخواست کرتا ہے۔ جس کے فوراً بعد قبر سے ندا آتی ہے کہ تیری بخشش ہوگئی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ [1] اور قرطبی [2] اس واقعہ کو مختصراً بلا کسی سند کے نقل کر کے آگے بڑھ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس کی روایت کرنے والے ابوصادق عبداللہ بن ناجذ ہیں جو ثقاہت کے سب سے نچلے درجے پر تھے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا تھا۔ اس لیے ان کی روایت متصل نہیں مرسل ہے۔ [3]

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ص ۴۱۰، ج ۱۔ [2] تفسیر قرطبی: ص ۱۸٤ ج ۳۔

[3] تقریب التهذیب ص ۵۷۱، ترجمه: ۸۱۶۷۔

حافظ ابن عبدالہادی نے اس کی جو سند لکھی ہے وہ درج ذیل ہے:

ابوالحسن علی بن ابراہیم بن عبداللہ بن عبداللہ کرخی، علی بن محمد بن علی سے روایت کرتے ہیں، کہا: ہم سے احمد بن محمد بن ہیثم طائی نے بیان کیا، کہا: مجھ سے میرے والد نے اپنے والد سے، انہوں نے سلمہ بن کہیل سے، انہوں نے ابو صادق سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ انہوں نے فرمایا......

یہ سند اور واقعہ نقل کرنے کے بعد ابن عبدالہادی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

یہ واقعہ موضوع، منکر اور من گھڑت ہے جس پر کسی حال میں بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اس کی سند تاریکی پر تاریکی ہے۔ احمد بن ہیثم کا دادا: ہیثم اگر ابن عدی طائی ہے تو وہ متروک اور کذاب ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا ہے تو مجہول ہے۔ حافظ ابوالفضل عباس بن محمد دوری کہتے ہیں: میں نے یحییٰ بن معین کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ہیثم بن عدی کوفی ثقہ نہیں تھا وہ کذب بیانی کرتا تھا[1]۔ حافظ ابوالحسن احمد بن عبداللہ صالح عجلی اور ابوداؤد فرماتے ہیں: وہ کذاب تھا[2]۔ نسائی نے بھی اس کو متروک لکھا ہے۔[3] امام بخاری نے لکھا ہے: محدثین نے اس کو ترک[4] کر دیا[5] تھا۔

رہے عتبی تو ان سے یہ واقعہ کسی قابل اعتماد سند سے ثابت نہیں ہے۔ ان کے بارے میں بھی یہی منقول ہے کہ وہ مسجد نبوی میں موجود تھے کہ ایک اعرابی آیا...... اور محمد بن حرب ہلالی کی سند سے بھی یہی مذکور ہے کہ "میں مدینہ گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کی اور اس کے بالمقابل بیٹھ گیا۔ یہاں تک کہ ایک اعرابی آیا......

ان تینوں زمانوں میں سینکڑوں سال کا فاصلہ ہے اور ہر زمانے میں اسی اعرابی کے واقعہ کا پیش آنا کیا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ بے بنیاد اور من گھڑت واقعہ ہے۔

---

[1] التاریخ لابن معین ترجمہ: ١٧٦٧۔ [2] المیزان: ص ٣٢٤ ج ٤۔

[3] الضعفاء والمتروکین: ص ٢٤١ ترجمہ: ٦٣٧۔

[4] التاریخ الکبیر: ص ٢١٨ ج ٨ والصغیر ص ١١٧۔ [5] الصارم المنکی: ص ٣٢١۔

(۲۵۵)......((أَصَابَ النَّاسَ قَحْطٌ فِي زَمَانِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، فَجَاءَ رَجُلٌ إِلَى قَبْرِ النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ إِسْتَسْقِ اللّٰهَ لِأُمَّتِكَ فَإِنَّهُمْ قَدْ هَلَكُوْا فَأَتَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِي الْمَنَامِ فَقَالَ: إِئْتِ عُمَرَ فَأَقْرِئْهُ مِنِّي السَّلَامَ وَأَخْبِرْهُ أَنَّكُمْ مُسْقَوْنَ وَقُلْ لَهُ: عَلَيْكَ الْكَيْسَ الْكَيْسَ))۔

''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں لوگ قحط سے دوچار ہوئے تو ایک شخص نبی ﷺ کی قبر مبارک کے پاس آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول: اپنی امت کے لیے اللہ سے بارش طلب فرمایئے۔ کیونکہ لوگ ہلاکت کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ اس کے خواب میں تشریف لائے اور فرمایا: عمر کے پاس جاؤ ان کو میرا اسلام کہو اور ان کو بتاؤ کہ تم لوگ بارش سے سیراب ہوگے اور ان سے کہو ''عقلمندی اور ذہانت سے کام لو۔'' وہ شخص حضرت عمر [illegible]

((يَا رَبِّ مَا آلُو إِلَّا مَا عَجَزْتُ عَنْهُ))

''اے میرے رب! میں صرف اسی کام میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہوں جسے انجام دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔''

یہ روایت حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں درج ذیل سند کے ساتھ نقل کی ہے:

حافظ ابوبکر بیہقی کہتے ہیں: ہم کو ابونصر بن قتادہ اور ابوبکر فارسی نے خبر دی، دونوں نے کہا: ہم سے ابوعمرو بن مطر نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابراہیم بن علی ذہلی نے بیان کیا، کہا: ہم سے یحییٰ بن یحییٰ نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابومعاویہ نے اعمش سے، انہوں نے ابوصالح سے اور انہوں نے مالک سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا...... حافظ ابن کثیر نے یہ روایت اور سند نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''یہ سند صحیح ہے۔''[1]

یہی روایت حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ کے حوالہ سے نقل کی ہے اور لکھا ہے:

''مالک الدار سے، جو حضرت عمر کا خازن تھا ابوصالح سمان کی یہ روایت صحیح ہے'' اور اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ:

سیف بن عمر نے ''الفتوح'' میں یہ روایت کی ہے کہ جس نے یہ خواب دیکھا تھا وہ ایک صحابی: بلال

---

[1] البدایہ والنہایہ: ص ۳۱۸، ج۵

بن حارث مزنی تھے۔[1]

حافظ ابن کثیر اور حافظ ابن حجر نے یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ: اس روایت کی سند صحیح ہے یا روایت صحیح الاسناد ہے۔ لیکن انہوں نے اس کے متن پر صحت وسقم کا کوئی حکم نہیں لگایا۔ فعلاً یہ سند ابو صالح سمان، ذکوان، تک صحیح ہے۔ لیکن جب کوئی امام حدیث کسی روایت کے بارے میں یہ کہے کہ یہ روایت صحیح الاسناد ہے یا اس کی سند صحیح ہے تو اس سے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس سند کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ مگر کسی روایت کے صحیح ہونے کے لیے صرف اس کی سند کا صحیح ہونا یا اس کے راویوں کا ثقہ ہونا کافی نہیں ہوتا بلکہ اس روایت کے صحیح ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ روایت "شذوذ" اور "علت" سے پاک ہو۔

کسی حدیث کے شاذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ: اس کا راوی اس کی روایت میں منفرد بھی ہو اور ثقاہت کے اس درجے پر بھی نہ ہو کہ تنہا اس کی روایت کردہ حدیث قابل قبول ہو۔ چنانچہ حافظ ابن صلاح اپنے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

اگر راوی کسی حدیث کی روایت میں منفرد ہو تو اس کے بارے میں غور وفکر سے کام لیا جائے گا۔ اگر وہ اُس کی منفرد روایت میں اس حدیث کا مخالف پایا جائے گا جس کا راوی حفظ وضبط حدیث میں اس سے اونچا مقام رکھتا ہے تو اس کی یہ منفرد روایت شاذ کہہ کر رد کر دی جائے گی۔

لیکن اگر وہ اپنی اس روایت میں کسی دوسرے راوی کا مخالف نہیں ہوگا بلکہ تنہا اس کا راوی ہوگا، کسی اور نے اس حدیث کی روایت نہ کی ہوگی تو پھر اس کی حالت کا مطالعہ کیا جائے گا۔ اگر وہ عادل، حافظ اور فن روایت میں ماہر اور ضبط حدیث میں قابل اعتماد ہے تو اس کی وہ منفرد روایت قبول کر لی جائے گی۔ لیکن اگر وہ حفظ ومہارت فن میں بھروسے کے قابل ثابت نہ ہو تو پھر اس کی یہ انفرادیت اس کی روایت کردہ حدیث کو "صحیح" کے دائرے سے خارج کر دے گی۔[2]

علم حدیث کے متفق علیہ امام حافظ ابن صلاح کی مذکورہ وضاحت کی روشنی میں جب ہم اس زیر بحث روایت کے راوی "مالک الدار" کے حالات پر غور کرتے ہیں تو اس کو ایک مجہول الحال اور غیر معروف راوی پاتے ہیں۔ جس کی ثقاہت یا عدالت وضبط حدیث کے بارے میں "علمائے رجال" میں سے کسی نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ علم الرجال یا فن جرح وتعدیل کے متفق علیہ امام ابو حاتم محمد بن ادریس بن

[1] فتح الباری: ص ۷۱٦، ج۱ [2] مقدمہ ابن صلاح: ص ۵٦۔

منذر تمیمی حنظلی رازی کے مایہ ناز فرزند امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم نے اپنی مشہور کتاب ''الجرح والتعدیل''[1] میں اس ''مالک الدار'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''اس سے ابوصالح سمان کے سوا کسی نے کوئی حدیث روایت نہیں کی ہے۔ فن رجال پر گہری اور وسیع نظر رکھنے کے باوجود اس کی ثقاہت کے بارے میں کسی بھی امام کا قول نقل نہیں کیا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ ان کے نزدیک بھی وہ غیر معروف شخص تھا۔

یہی بات حافظ منذری نے "الترغیب والترغیب"[2] میں مالک الدار سے ابوصالح سمان کی روایت کردہ ایک دوسری حدیث یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک دوسرے واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

''اس واقعہ کو حافظ طبرانی نے المعجم الکبیر میں نقل کیا ہے جس کے راوی ''مالک الدار'' تک ثقہ ہیں۔ رہا مالک الدار تو میں اس کو نہیں جانتا۔''

اوپر کی وضاحتوں سے معلوم ہوا کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں مذکورہ واقعہ کے بارے میں جو یہ لکھا ہے کہ ''یہ واقعہ ابن ابی شیبہ نے مالک الدار سے ابوصالح سمان کی روایت سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔'' تو اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اس واقعہ کی سند ابوصالح سمان تک صحیح ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے واقعہ کی پوری سند حذف کر کے "راویة ابی صالح عن مالك الدار" کہنے پر اکتفا کیا ہے۔ اگر ان کے نزدیک پوری سند صحیح ہوتی تو وہ یوں کہتے: یہ روایت ''مالک الدار'' سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیثوں کے ذکر کے موقع پر وہ اور دوسرے محدثین حدیث کی پوری سند حذف کر کے اوپر کے آخری راوی کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''فلاں سے صحیح سند کے ساتھ روایت ہے۔''

اس طرح یہ واقعہ ''مالک الدار'' کے مجہول اور غیر معروف ہونے کی وجہ سے سند کے اعتبار سے صرف ''شاذ'' ہی نہیں رہا بلکہ باطل اور مردود ہو گیا۔

اب رہی اس روایت کی علت تو اس میں نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک پر جا کر آپ سے دعا کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔ جب کہ قرآن وحدیث میں نبی اکرم ﷺ کی وفات کی صراحت آ چکی ہے اور تمام ائمہ حدیث وفقہ کے اتفاق سے آپ اس فانی دنیا سے رحلت فرما چکے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ سے دعا کی درخواست صحیح نہیں رہی۔ کیونکہ دعا کرنا ایک عمل ہے اور عمل کا سلسلہ وفات پا جانے کے بعد منقطع ہو جاتا ہے۔ اس طرح اپنے متن میں اس علت اور سبب کی وجہ سے بھی یہ روایت باطل اور مردود ہے۔

---

[1] الجرح والتعدیل: ص ۲۱۳ ج ۴۔ [2] الترغیب والترھیب: ص ۵۵۱ ج ۱۔

اس روایت کے مردود اور ناقابل قبول ہونے کی ایک دوسری علت یہ ہے کہ اس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے اپنی قبر مبارک کی زیارت کرنے والے کے خواب میں آ کر اس کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے یہ کہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ اپنے معاملات میں ''دانش مندی اور سوجھ بوجھ'' سے کام لیں۔ یہ دعویٰ نبی کریم ﷺ کے ان ارشادات کے خلاف ہے جن میں آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فراست و دانائی اور حق کی راہ میں ان کی استقامت و ثابت قدمی اور باطل کے خلاف ان کی شدت کی تعریف فرما چکے ہیں۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں سیف بن عمر کی کتاب ''الفتوح الکبیر'' کے حوالہ سے جو یہ لکھا ہے کہ خواب دیکھنے والے ایک صحابی: حضرت بلال بن حارث مزنی تھے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے تو سیف بن عمر کا یہ دعویٰ مردود ہے۔ کیونکہ وہ باتفاق جمیع محدثین روایت میں ضعیف اور ناقابل اعتبار[1] تھا۔ مزید یہ کہ امام ابو حاتم نے اس کو متروک لکھا ہے۔ امام ابن حبان نے اس کو بد دین...... زندیق...... قرار دیا ہے اور اس پر ثقہ راویوں کے نام سے موضوع اور جھوٹی روایتیں بیان کرنے کا الزام لگایا ہے۔ امام ابوداؤد کا قول ہے کہ روایت حدیث میں وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ یعنی ناقابل اعتبار اور ناقابل اعتماد تھا۔[2]

لہٰذا مذکورہ واقعہ اپنی سند اور متن دونوں اعتبار سے مردود اور ناقابل اعتبار ہے۔ خلیفہ دوم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عمل کے خلاف ہونے کی وجہ سے منکر اور باطل ہے۔ کیونکہ یہ ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں ''قحط'' پڑنے کی حالت میں نماز استسقاء ادا فرمائی تھی اور رسول اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے بارش کے لیے دعا کروائی تھی،[3] رسول اکرم کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر آپ سے دعا کی درخواست نہیں کی تھی۔

اہل قبور اور غیر اللہ کو وسیلہ اور ذریعہ بنانے والوں کو قرآن پاک کی واضح اور صریح آیات اور وہ صحیح احادیث نظر نہیں آتیں جن میں غیر اللہ کو پکارنے، قبروں میں مدفون بزرگان دین، صالحین اور اولیاء سے مدد کی درخواست کرنے اور قبروں پر عرس منانے اور میلہ لگانے سے منع کیا گیا اور ایسا کرنے والوں پر لعنت کی گئی ہے۔ لیکن ان کو وہ بے بنیاد، ناقابل اعتماد اور ضعیف روایتیں ضرور نظر آ جاتی ہیں، جن سے ان کے فاسد عقائد کی تائید ہوتی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس طرح کی روایتوں کو گھڑنے والے اور ان

[1] التقریب: ص ۲۰۲ ترجمہ: ۴۷۲۳۔
[2] الضعفاء والمتروکین: ص ۱۴۹، ترجمہ ۲۸۳۔ میزان الاعتدال ص ۲۵۵ ج ۲، ترجمہ: ۳۶۲۷۔
[3] صحیح بخاری: ح ۱۰۱۰۔

کو لوگوں میں پھیلانے والے یہی لوگ ہیں۔

رہی وہ روایت جس میں آیا ہے کہ امت کے اعمال رسول اکرم ﷺ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں تو یہ روایت مرسل ہے جو نا قابل استدلال ہے۔ چنانچہ بکر بن عبداللہ مزنی سے روایت ہے: کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

(۲۵٦)......حَيَاتِي خَيْرٌ لَكُمْ تُحَدِّثُونَ وَ يُحَدَّثُ لَكُمْ ، فَإِذَا أَنَا مِتُّ كَانَتْ وَفَاتِي خَيْرًا لَكُم، تُعْرَضُ عَلَيَّ أَعْمَالُكُمْ ، فَإِنْ رَأَيْتُ خَيْرًا حَمِدْتُ اللهَ وَإِنْ رَأَيْتُ غَيْرَ ذٰلِكَ اسْتَغْفَرْتُ اللهَ لَكُمْ))

''میری زندگی تمہارے لیے بہتر ہے تم بات کرتے ہو اور تم سے بات کی جاتی ہے۔ پس جب میں وفات پا جاؤں گا تو میری وفات بھی تمہارے لیے بہتر ہوگی۔ تمہارے اعمال میرے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ اگر میں ان کو بہتر دیکھوں گا تو اللہ کی حمد بیان کروں گا اور اگر اس کے برعکس دیکھوں گا تو تمہارے لیے اللہ سے استغفار کروں گا۔''

یہ روایت مرسل[1] ہے۔ اس طرح کے غیبی اور عقائدی امور میں مرسل روایت قابل استدلال نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ کی موجودہ زندگی برزخی زندگی ہے جس کی کنہ اور حقیقت کا ادراک ہم نہیں رکھتے۔ لہٰذا اس برزخی زندگی کے احوال کے بارے میں ایک مرسل روایت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے راوی بکر بن عبداللہ مزنی ہیں جو تابعین کے طبقہ وسطی سے تعلق رکھتے تھے۔

بکر بن عبداللہ مزنی سے یہ روایت ایک دوسری سند سے بھی مروی ہے لیکن وہ بھی مرسل ہے اور مرسل روایت کسی دوسری مرسل روایت کو تقویت نہیں دیتی۔[2]

رسول اکرم ﷺ کی طرف زائرین کے ذریعے سلام بھیجنا

عام طور پر مسلمانوں میں یہ رواج ہے کہ جب کوئی کسی کو مدینہ کے سفر پر روانہ ہوتے دیکھتا ہے یا دوست احباب میں کسی کے بارے میں مدینہ منورہ جانے کی خبر ملتی ہے تو ان سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ جب آپ مسجد نبوی میں حاضر ہوں اور نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کریں تو میری طرف سے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔

---

[1] اگر سند رسول اللہ ﷺ تک متصل نہ ہو بلکہ تابعی اور رسول اکرم ﷺ کے درمیان کی کڑی، صحابی غائب ہو اور تابعی آپ سے روایت کرے تو یہ مرسل ہوتی ہے۔ کیونکہ تابعی نے وہ حدیث نبی کریم ﷺ سے نہیں سنی ہوتی۔

[2] فضل الصلاۃ علی النبی ﷺ: ح ۲۵، ۲٦۔

تو کیا یہ عمل شروع ہے اور اس کی کوئی حقیقت ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ عمل غیر مشروع ہے اور اس کے حق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور ائمہ حدیث وفقہ رحمہم اللہ کے عمل سے کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔ مزید یہ کہ نبی کریم ﷺ پر درود وسلام بھیجنے کے لیے قبر مبارک کی زیارت یا اس کا قرب کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیونکہ ائمہ اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو قریب سے یا دور سے جہاں سے بھی سلام کیا جائے آپ اس کو خود نہیں سنتے۔ کیونکہ اس دنیا سے آپ کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے۔ بلکہ ہمارا درود وسلام فرشتوں کے ذریعہ آپ تک پہنچایا جاتا ہے۔ قبر مبارک کے قریب سے درود وسلام سننے سے متعلق لوگوں میں جو حدیث زبان زد ہے وہ جھوٹ اور من گھڑت ہے۔[1]

برصغیر کے ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت حنفی مسلک کی پیرو ہے اور صوفیاء کی اکثریت بھی حنفی ہے۔ تصوف سے متعلق جو بات مسلم ہے وہ یہ کہ تصوف کی کتابوں میں عقائد سے لے کر اعمال تک اور عبادات سے لے کر تزکیہ نفس کے طریقوں تک بیشتر باتیں کتاب وسنت سے ماخوذ نہیں ہیں۔ بلکہ صوفیاء کے ذوق کی پیداوار ہیں۔ حتیٰ کہ "توحید خالص" جو اسلام کی روح ہے اور جس کو اولاد آدم میں زندہ رکھنے کے لیے انبیاء اور رسولوں کو بھیجا جاتا رہا ہے وہ بھی صوفیاء کے نزدیک وہ نہیں ہے جس کی دعوت کتاب وسنت میں دی گئی ہے۔ بلکہ صوفیاء کی اپنی خاص توحید ہے جو ان کے ذوق کی پیداوار ہے۔ اسے معلوم کرنے کے لیے تصوف کی کسی بھی مستند کتاب سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ اپنی قبر مبارک میں رسول اللہ ﷺ کے اسی طرح زندہ رہنے جس طرح آپ پہلے زندہ تھے اور اس طرح لوگوں کی باتوں، دعاؤں اور عرض ومعروض سننے کا عقیدہ، جس طرح آپ پہلے سنتے تھے، صوفیاء کا پھیلایا ہوا ہے۔ اس مسئلے کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ "بشریت رسول" کے عنوان کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ عقیدہ کہ: نبی اکرم ﷺ کو قبر مبارک میں دنیوی زندگی حاصل ہے۔ نہ ائمہ احناف کا ہے، نہ کسی بھی فقہی مسلک کے امام کا اور نہ محدثین میں سے کسی کا۔ بلکہ یہ صوفیاء کے ذہن کی پیداوار ہے۔ سابقہ تفصیلات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس مسئلے میں صوفیاء کا عقیدہ محدثین اور فقہاء میں سے کسی کا بھی نہیں ہے۔

اس سلسلے میں مردوں کے "عدم سماع" کے موضوع پر عراق کے مایہ ناز عالم اور محقق علامہ نعمان بن محمود آلوسی رحمہ اللہ کی کتاب: "الآیات البینات فی عدم سماع الاموت عند الحنفیة

[1] ملاحظہ ہو اس کتاب کی جلد اول ص ۲۱۹، ۲۲۰۔

السادات" ایک نہایت منفرد کتاب ہے جو کتاب وسنت کے واضح دلائل سے مزین ہے۔ علامہ نعمان مشہور عراقی مفسر قرآن علامہ محمود آلوسی کے لائق فرزند تھے۔

جو اصحاب علم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کو برزخی زندگی نہیں بلکہ دنیوی زندگی حاصل ہے اور آپ زائرین کے درود وسلام کو بذات خود سنتے ہیں، ان کے سلام کا جواب دیتے ہیں اور زائرین کی درخواست پر ان کے لیے دعا واستغفار کرتے ہیں۔ ان سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے اس صحیح العقیدہ عالم کی کتاب دل ودماغ کو تعصب سے پاک کر کے ضرور پڑھیں اور اپنی ان تحریروں سے اظہار برأت کر دیں جو قبر پرستی کی وباء کو عام کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ جو اس میدان میں بڑا کردار ادا کر رہی ہیں اور لوگوں کی گمراہی کا سبب بن رہی ہے۔

قبر مبارک کی زیارت کی دعا

سوال: بعض کتابوں میں نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے موقع پر کی جانی والی دعاؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک دعا ان الفاظ میں بیان کی جاتی ہے:

(٢٥٧)...... ((اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُحَمَّدَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ، وَ أَشْهَدُ إِنَّكَ بَلَّغْتَ رِسَالَةَ رَبِّكَ وَنَصَحْتَ لِأُمَّتِكَ وَجَاهَدْتَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ عَبَدْتَ اللّٰهَ حَتّٰى أَتَاكَ الْيَقِيْنُ ، فَجَزَاكَ اللّٰهُ أَفْضَلَ مَاجَزٰى نَبِيًّا عَنْ أُمَّتِهِ وَرَفَعَ دَرَجَتَكَ الْعُلْيَا، وَ تَقَبَّلَ شَفَاعَتَكَ الْكُبْرٰى وَأَعْطَاكَ سُؤْلَكَ فِي الْآخِرَةِ وَالْأُوْلٰى كَمَا تَقَبَّلَ مِنْ إِبْرَاهِيْمَ، اَللّٰهُمَّ أَحْشُرْنَا فِي زُمْرَتِهِ وَتَوَفَّنَا عَلٰى سُنَّتِهِ وَأَوْرِدْنَا حَوْضَهُ وَاسْقِنَا بِكَأْسِهِ مَشْرَبًا رَوِيًّا لَا نَظْمَأُ بَعْدَهُ أَبَدًا۔))

"اے اللہ کے رسول آپ پر اللہ کی سلامتی، اس کی رحمت اور برکتیں نازل ہوں۔ اے محمد بن عبداللہ آپ پر اللہ کی سلامتی۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے اور گواہی دیتا ہوں کہ بلاشبہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا، اپنی امت کو خیر وبھلائی کی نصیحت کر دی، اللہ کی راہ میں حکمت اور

بہترین نصیحت و موعظت کے ساتھ جہاد کیا۔ اور اللہ کی عبادت کرتے رہے یہاں تک کہ آپ کے پاس یقین، موت، آ گیا۔ اللہ آپ کو اس سے بہتر جزا دے جو اس نے کسی نبی کو ان کی امت کی طرف سے دی ہے۔ آپ کے اعلیٰ درجات کو مزید بلند کرے۔ آپ کی شفاعت کبریٰ کو قبولیت سے نوازے۔ دنیا و آخرت میں آپ کی درخواست اور طلب آپ کو عطا کرے۔ جس طرح اس نے ابراہیم کی دعا قبول فرمائی۔ اے اللہ! تو ہمیں ان کے زمرے میں اٹھا، ان کی سنت پر وفات دے، ان کے حوض پر لے جا اور ان کے ہاتھ سے ایسی سیر کر دینے والی شراب پلا جس کے بعد ہم کبھی پیاسے نہ ہوں۔"

تو کیا یہ دعا صحیح ہے اور رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے وقت یہ دعا کرنی چاہیے؟

جواب: اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ احادیث میں مخصوص طور پر اور نام لے کر نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کا کوئی ذکر نہیں آیا ہے۔ یعنی نہ تو اس کا حکم دیا گیا ہے اور نہ اس کی ترغیب دی گئی ہے لہٰذا یہ زیارت بھی باقی قبروں کی زیارت کے حکم میں داخل ہے اور اس کی اگر کوئی شرعی دلیل ہے تو وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل ہے۔ عمل صحابہ کے بارے میں یہ اصول ہے کہ کسی صحابی کا وہ عمل جو نصوص سے ثابت کسی حکم کے خلاف نہ ہو اور دوسرے صحابہ اس کے مخالف نہ رہے ہوں تو اس کے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بلکہ امید ہے کہ اس پر اجر بھی ملے گا۔

رہی مذکورہ دعا تو اس کا لفظ لفظ اس کے من گھڑت ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے اس کی پابندی نہ کرنا بہتر ہے۔ اور کوئی بھی دعا قبر مبارک کی طرف چہرہ کر کے مانگنی بالاتفاق جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے عمل سے ثابت ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق اور جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو سلام کر کے وہاں سے رخصت ہو جاتے تھے۔ ائمہ اسلام میں تنہا حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ایسے ہیں جن کے نزدیک قبر کی طرف رخ کر کے سلام کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ بلکہ سلام اور دوسری دعائیں قبلہ رخ ہو کر کرنی چاہئیں۔

دعاؤں کے سلسلے میں ہمیشہ ماثور دعاؤں کو اختیار کرنا چاہیے۔ لوگ خود اپنی زبانوں میں بھی دعائیں مانگ سکتے ہیں۔ یہ بات ہرگز ذہن سے اوجھل نہیں ہونے دینی چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے آپ سے دعا کرنا شرک اکبر ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ اس بات کا سزاوار ہے کہ اس سے دعائیں مانگی جائیں۔ اسی طرح شفاعت کبریٰ کی درخواست بھی آپ سے کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ رسول اللہ

ﷺ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے یہ شفاعت فرمائیں گے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرنی چاہیے اور اسی سے التجا کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں اس شفاعت کا مستحق بنائے۔ اس شفاعت کے مستحق وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے نبی مکرم ﷺ کے لائے ہوئے دین میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہوگی۔

نبی کریم ﷺ سے محبت اور آپ کی تعظیم کا مطلب ہے کہ آپ کی اطاعت اور اتباع کی جائے۔ جن جن چیزوں کو آپ نے پسند فرمایا یا ان کو پسند کیا جائے، جن باتوں کا حکم دیا ان پر عمل کیا جائے۔ جن باتوں کو ناپسند فرمایا اور جن کاموں سے منع فرمایا ان سے باز رہا جائے۔ لیکن آپ کی محبت، تعظیم اور محبت کے نام پر ایسے کام کرنا جن کا آپ نے حکم نہیں دیا ہے یا جن سے آپ نے منع فرمایا ہے، آپ سے عداوت ہے آپ کی تعظیم اور آپ سے محبت ہرگز نہیں ہے۔

اس تناظر میں نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کو واجب یا مستحب قرار دینے اور اس غرض کے لیے سفر کرنے پر غور کیا جا سکتا ہے کہ اگر ایسا کرنا واجب یا کم از کم مستحب اور پسندیدہ عمل ہوتا تو کم از کم ایک بار بھی رسول اکرم ﷺ نے اس کا حکم دیا ہوتا یا اس کی طرف اشارہ فرمایا ہوتا۔

روضہ شریفہ میں نماز:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَا بَيْنَ بَيْتِي وَ مِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ وَمِنْبَرِي عَلَى حَوْضِي))[1]

''میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے۔''

رَوْضَةٌ کے معنی سرسبز و شاداب قطعہ زمین کے ہیں۔ خوبصورت باغ کو بھی روضہ کہتے ہیں۔ اس کی جمع ریاض آتی ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے اپنے کسی ارشاد میں یہ واضح نہیں فرمایا ہے کہ آپ نے اپنے گھر اور منبر کے درمیانی مقام کو کس اعتبار سے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ قرار دیا ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ ''المنہاج فی شرح مسلم'' میں تحریر فرماتے ہیں:

علماء سے روضۃ من ریاض الجنۃ کے بارے میں دو اقوال منقول ہیں:

[1] صحیح بخاری: ح ۱۱۹۶، ۱۸۸۸۔ صحیح مسلم: ح ۱۳۹۰، ۳۳۶۸، ۳۳۷۰۔

(۱) یہ جگہ بعینہٖ جنت میں منتقل کر دی جائے گی۔

(۲) اس جگہ عبادت جنت میں جانے کی باعث ہوگی۔[1]

حافظ ابن حجر فتح الباری میں تحریر فرماتے ہیں:

روضۃ من ریاض الجنۃ کا مطلب ہے کہ یہ جگہ...... وہاں ذکر کے حلقات کے نتیجے میں خاص طور پر نبی کریم ﷺ کے عہد میں رحمتوں کے نزول اور سعادت کے حصول کے اعتبار سے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔[2] لیکن ان دونوں اقوال میں سے اس قول: اس جگہ عبادت جنت میں جانے کی باعث ہوگی یا اس جگہ ذکر و اذکار کے حلقات منعقد کرنے کی وجہ سے وہاں رحمتوں کے نزول اور حصول سعادت کی وجہ سے اس کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ قرار دیا گیا ہے۔'' کو قبول کرنے میں جو چیز مانع ہے وہ یہ کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی مسجد میں ایک نماز کو مسجد حرام کے سوا دوسری مساجد میں ادا کی جانے والی ایک ہزار نمازوں سے افضل قرار دیا ہے۔ اگر ''روضۃ'' میں نماز یا دوسری کسی عبادت کی کوئی خاص فضیلت ہوتی تو آپ نے اسے واضح فرما دیا ہوتا۔ مگر آپ نے ایسا نہیں فرمایا۔

لہٰذا رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مبارک ایک خوبصورت تمثیل ہے اور اس کا مطلب ہے کہ وہ جگہ جس کو زبان نبوت نے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ قرار دیا ہے وہ دوسری زندگی میں حقیقتاً جنت کا ایک حصہ ہوگی۔ اس کی تائید حدیث کے آخری فقرے: ((وَ مِنْبَرِیْ عَلٰی حَوْضِیْ))...... ''میرا منبر میرے حوض پر ہے......'' سے ہوتی ہے۔ واللہ اعلم الصواب۔

سوال یہ ہے کہ: کیا رسول اکرم ﷺ کے گھر اور منبر کے درمیان پائے جانے والے مذکورہ حصہ کی فضیلت اس امر کی بھی مستلزم ہے کہ اس جگہ نماز پڑھنا مسجد نبوی کے دوسرے حصوں میں نماز پڑھنے سے زیادہ افضل ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں: کیا ''روضۃ'' میں دو رکعتیں ادا کرنا مشروع ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی خاص جگہ کی قدسیت یا فضیلت اس جگہ نماز ادا کرنے یا کوئی اور عبادت کرنے کی مستلزم قطعاً نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی خاص جگہ نماز ادا کرنے یا کسی بھی عبادت کے مشروع ہونے کے لیے کتاب و سنت سے صریح نص درکار ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ میں ''مقام ابراہیم'' کو جائے نماز بنانے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

[1] شرح نووی: ص ۸۶۲۔
[2] شرح نووی: ص ۱۰۵۰ ج ۱۔

﴿ وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی ؕ ﴾

[البقرہ: ۱۲۵]

"یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے بار بار آنے کی جگہ اور جائے امن بنا دیا۔ تم لوگ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز ادا کرنے کی جگہ بنا لو۔"

یوں تو پورا حرم جائے نماز ہے اور اس میں ادا کی جانے والی ایک نماز مسجد نبوی کے سوا دنیا کی دوسری مسجدوں میں ادا کی جانے والی ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔ لیکن پورے حرم کی اس افضلیت کے ساتھ ساتھ "مقام ابراہیم" کو یہ خصوصیت حاصل ہے۔ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ: تین باتوں میں میری بات اللہ تعالیٰ کے ارشادات کے مطابق رہی۔ جس میں سے پہلی بات یہ تھی کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

((یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! لَوِ اتَّخَذْتَ مَقَامَ إِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى))

"اے اللہ کے رسول! کاش آپ مقام ابراہیم کو جائے نماز بنالیں۔"

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

ابونعیم نے "دلائل النبوۃ" میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی جو حدیث نقل کی ہے اس میں آیا ہے کہ: نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کا ہاتھ پکڑا اور ان کو لے کر مقام ابراہیم سے گزرے اور فرمایا: یہ مقام ابراہیم ہے۔ اس پر انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! آپ اس کو نماز کی جگہ کیوں نہیں بنا لیتے۔"

امام ابن الجوزی فرماتے ہیں: درحقیقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ درخواست کی تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر عمل کیا جائے۔ کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے پیش نظر یہ درخواست کی تھی:

((اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا))[1]

"میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔"

واضح رہے کہ طواف کعبہ کے بعد مقام ابراہیم میں کسی جگہ دو رکعتیں ادا کرنا سنت ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے بارے میں جو طویل حدیث مروی ہے اس میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے البیت الحرام کا سات بار طواف کیا، مقام ابراہیم پر آئے اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

((وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى))[2]

---

[1] ص ۱۹۳۸ ج ۲۔ [2] صحیح مسلم: ح ۱۲۱۸ ۲۹۵۰۔

"کی تلاوت فرمائی اور دو رکعتیں ادا کیں۔"

اس طویل وضاحت کا مقصد یہ بتانا تھا کہ کسی بھی جگہ نماز ادا کرنے یا کوئی بھی عبادت کرنے کی مشروعیت کتاب وسنت کی صریح نص سے ثابت ہوتی ہے۔ جب کہ "روضہ شریفہ" میں نماز ادا کرنے یا کوئی بھی عبادت کرنے کا ذکر نبی کریم ﷺ کی کسی بھی حدیث میں نہیں آیا ہے۔تو پھر وہاں دو رکعتیں ادا کرنے کے لیے لوگوں میں مزاحمت کیوں ہوتی ہے؟

مسجد قبا میں ایک نماز عمرہ کے برابر ہے

مسجد قباء اسلام کی پہلی مسجد ہے۔ مسجد نبوی کی طرح یہ بھی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے۔ اس کی تعمیر مسجد نبوی سے پہلے ہوئی تھی لیکن اس کا درجہ مسجد نبوی سے کم ہے۔ اس میں ایک نماز عمرہ کے برابر ہے۔ رسول اللہ ﷺ ہر ہفتہ والے دن مسجد قباء سواری پر یا پیدل تشریف لے جاتے اور اس میں دو رکعتیں ادا فرماتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔

((إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَأْتِي قُبَاءَ مَاشِيًا وَرَاكِبًا، فَيُصَلِّي فِيهِ رَكْعَتَيْنِ))[1]

"نبی کریم ﷺ کبھی پیدل اور کبھی سوار قبا تشریف لے جاتے اور اس میں دو رکعتیں نماز ادا فرماتے تھے۔"

حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ تَطَهَّرَ فِي بَيْتِهِ ثُمَّ أَتَى مَسْجِدَ قُبَاءَ، فَصَلَّى فِيهِ صَلَاةً كَانَ لَهُ كَأَجْرِ عُمْرَةٍ))[2]

"جو اپنے گھر میں طہارت حاصل کرے، پھر مسجد قبا آئے اور اس میں نماز ادا کرے تو اس کا اجر عمرہ کے اجر کے برابر ہے۔"

مسجد قباء میں نماز پڑھنے کی یہ فضیلت ان لوگوں کے لیے ہے جو یا تو وہاں مسجد قباء کے گردونواح میں مقیم ہوں یا مدینہ میں مقیم ہوں، یا مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی نیت سے باہر سے مدینہ گئے ہوں۔ لیکن مسجد قباء میں نماز ادا کرنے کی نیت سے وہاں کا سفر جائز نہیں ہے۔ کیونکہ صرف تین مسجدوں میں نماز ادا کرنے کی نیت سے سفر کرنا جائز ہے۔ اسی طرح مسجد نبوی میں زیارت کی نیت سے مدینہ منورہ کا سفر کرنے والوں کے لیے بقیع کے قبرستان کی زیارت کرنا بھی مشروع ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ بقیع

---

[1] صحیح بخاری: ۱۱۹۱، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۷۳۲۶۔ صحیح مسلم: ح ۱۲۹۹، ۳۳۹۰۔

[2] صحیح الجامع: ح ٦١٥٤۔ سنن ابن ماجه: ح ١٤٢٢۔ سنن نسائی: ح ٦٩٨۔

کی زیارت فرماتے تھے اور وہاں مدفون مسلمانوں کے لیے یہ دعا فرماتے تھے۔

((يَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَ الْمُسْتَأْخِرِيْنَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِأَهْلِ بَقِيْعِ الْغَرْقَدِ))[1]

''اللہ ہم میں سے آگے جانے والوں اور پیچھے رہ جانے والوں، بعد میں جانے والوں، پر رحم فرمائے اللہ! تو اہل بقیع غرقد کی مغفرت فرما۔''

شہدائے احد اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی قبروں کی زیارت بھی مشروع ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فعلی سنت ہے۔ کیونکہ آپ ان کی زیارت فرمایا کرتے تھے۔

لیکن ان قبروں کی زیارت اگر ان سے دعا مانگنے، ان سے مشکلات کے حل، بیماری سے شفاء، دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے یا اس طرح کے دوسرے امور کی درخواست کی غرض سے کی جائے تو یہ حرام ہے۔

مدینہ میں وفات پا جانے والا مسلمان شفاعت کا مستحق ہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((مَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ يَمُوْتَ بِالْمَدِيْنَةِ، فَلْيَمُتْ بِهَا، فَإِنِّي أَشْفَعُ لِمَنْ يَمُوْتُ بِهَا))[2]

''جو مدینہ میں مرنے پر قدرت رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ وہاں ہی مرے۔ کیونکہ میں وہاں مرنے والے کی شفاعت کروں گا۔''

کوئی بھی انسان کسی جگہ اپنی خواہش سے مرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی مدینہ میں تادم واپسیں قیام کی استطاعت رکھتا ہو تو وہ ایسا کرنے سے دریغ نہ کرے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مانند ہے۔

﴿ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ ﴾ [البقرہ: ۱۳۲]

''پس ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔''

مطلب یہ ہے کہ تم مرتے دم تک مسلمان ہی رہنا۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى رَسُوْلِنَا وَحَبِيْبِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى وَآلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَسَلَّمَ

---

[1] صحیح مسلم: ح ۹۷٤، ۹۷۵۔ [2] سنن ترمذی: ح ۳۹۱۷

بابِ چہارم

معاشرت

اسلام میں عورت کا مقام و درجہ

انسانوں کے خالق و رب اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ۝ ﴾ [الاحزاب:۳۵]

’’درحقیقت مسلم مرد اور مسلم عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں، راست باز مرد اور راست باز عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، اللہ کے آگے جھکنے والے مرد اور جھکنے والی عورتیں، صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔‘‘

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی تمام بنیادی قدریں جمع کر دی ہیں اور ان میں مردوں اور عورتوں کو مساوی درجات عطا فرمائے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقام و مرتبے، فرائض و واجبات اور اعمال کے اجر و ثواب کے اعتبار سے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر ان میں کوئی فرق ہے تو صرف دائرہ کار میں۔

اسی طرح اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ کہ رسول اکرم فداہ ابی وامی ﷺ نے جب دین توحید کی دعوت دی تو اس کو مردوں اور عورتوں نے یکساں طریقے سے اور یکساں جذبے اور آمادگی کے ساتھ قبول کیا۔ ایمان کی راہ میں پیش آنے والی آزمائشوں اور ابتلاؤں میں دونوں

نے یکساں صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا۔ اپنی جسمانی ساخت میں کمزور ہونے کے باوجود عورتیں اس میدان میں مردوں سے پیچھے نہ رہیں۔ بلکہ ان سے آگے نکل گئیں جس کی واضح ترین مثال ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کی ذات گرامی ہے۔ جنہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے غار حرا میں حضرت جبریل علیہ السلام کی آمد اور قرآن پاک کی پہلی آیات کے نزول کا واقعہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر مبارک ۵۵ برس تھی۔ اپنے عظیم شوہر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے وہ واقعہ اس حال میں سنا تھا کہ آپ لرزاں وترساں تھے اور فرما رہے تھے:

((أَيْ خَدِيْجَةُ! لَقَدْ خَشِيْتُ عَلَى نَفْسِيْ))[1]

"اے خدیجہ! مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے۔"

پھر یہ واقعہ جس انداز میں پیش آیا تھا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تصور میں نہ تھا۔ خود حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے وہم وگمان میں بھی کبھی یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس طرح کا واقعہ بھی پیش آ سکتا ہے۔ فرشتے کی اچانک آمد، اس کی زبردست ہستی، اس کا بزور آپ کو بھینچنا اور پھر نہایت پاکیزہ اور اچھوتا کلام سنانا۔ یہ ساری باتیں آپ کو خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھیں۔[2] آپ سے زیادہ اُمّ المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو خوف زدہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ صنف نازک تھیں اور سن رسیدہ بھی۔ مگر نہیں، ان کی نگاہوں کے سامنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تمام اعلیٰ صفات اور آپ کے عظیم اخلاق آ گئے۔ وہ پورے یقینِ قلب کے ساتھ گویا ہوئیں: "کَلّا" ہرگز نہیں۔ یعنی آپ کی جان کو کوئی بھی خطرہ لاحق نہیں ہے۔

((أَبْشِرْ، فَوَاللّٰهِ، لَا يُخْزِيكَ اللّٰهُ أَبَدًا، فَوَاللّٰهِ إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَصْدُقُ الْحَدِيثَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ......))

"آپ خوش ہو جائیے، اللہ کی قسم! اللہ آپ کو ہرگز رسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرتے ہیں۔ سچ بولتے ہیں، لوگوں کا بار اٹھاتے ہیں، نادار اور محروم کو کما کر دیتے

---

[1] صحیح بخاری: ح ۳، ۴۹۵۲، ۴۹۵۵، ۴۹۵۷، ۶۹۸۲۔ صحیح مسلم: ح ۱۶۰

[2] انبیاء علیہم السلام اسی طرح اچانک منصب نبوت سے سرفراز کیے جاتے رہے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جاہل معاشرے اور اس کے مشرکانہ ماحول سے سخت بیزار تھے۔ مگر یہ بات آپ کے ذہن ودماغ میں نہیں تھی کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ آپ کو ایمان کی تفصیلات اور کتاب کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ (شوریٰ: ۵۲)

ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی راہ میں پیش آنے والے مصائب میں مدد دیتے ہیں۔''[1]

غور کا مقام ہے کہ ام المومنین نے نبی اکرم ﷺ کے جو اوصاف ومحاسن بیان فرمائے وہ ایک انسان کامل کے اوصاف ومحاسن ہیں اور جو عظیم انسان ان اوصاف حمیدہ سے موصوف ہو وہ ایک غیر معمولی انسان ہے جس کے خوف زدہ ہونے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ ان اوصاف سے، بیوی سے زیادہ کوئی اور واقف نہیں ہو سکتا۔ ام المومنین نے آپ کا حوصلہ بڑھانے اور آپ کو ڈھارس دینے کے لیے نبی کریم ﷺ کی کوئی ظاہری اور جسمانی صفت بیان نہیں فرمائی۔ حالانکہ آپ جسمانی حسن و جمال اور جسمانی طاقت وتوانائی میں بھی بے مثال تھے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ سن کر ان کو یہ یقین کامل ہو گیا تھا کہ نبی مکرم ﷺ ایک غیر معمولی انسان ہیں اور آپ کے پاس آنے والی عظیم ہستی جنوں اور شیطانوں کے قبیل سے نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ وہ جس مشرکانہ معاشرے میں زندگی گزار رہی تھیں اس میں جبریل علیہ السلام اور دوسرے فرشتوں کے بارے میں کسی خاص تصور کا امکان نہیں تھا جو ہر طرح کے شر سے پاک نورانی وجود ہیں۔

اس کے بعد نبوت کے باقاعدہ اعلان اور دعوت حق کے آغاز سے لے کر اپنی زندگی کی آخری سانس تک ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم فداہ ابی وامی ﷺ کا جس طرح ساتھ دیا اور جس طرح آپ کی معنوی اور مادی حمایت کی وہ ایثار وقربانی اور محبت وفدائیت کی ایک ایسی روشن داستان ہے جو انسانی تاریخ میں شاذ ونادر ہی دہرائی جاتی ہے۔ ام المومنین کا یہی وہ عظیم کردار تھا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کی تمام عورتوں کی سردار کے منصب پر سرفراز فرمایا اور اس منصب میں ان کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کو بھی شامل فرمایا۔[2]

یہی نہیں بلکہ مردوں اور عورتوں میں صرف ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کے ذریعہ اپنا سلام بھیجا۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((أَتَى جِبْرِيلُ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: يَارَسُولَ اللّٰهِ! هٰذِهِ خَدِيجَةُ قَدْ أَتَتْ، مَعَهَا إِنَاءٌ فِيهِ إِدَامٌ أَوْ طَعَامٌ أَوْ شَرَابٌ، فَإِذَا هِيَ أَتَتْكَ فَاقْرَأْ عَلَيْهَا السَّلَامَ مِنْ رَبِّهَا وَمِنِّي، وَبَشِّرْهَا بِبَيْتٍ فِي الْجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ لَا صَخَبَ

---

[1] صحيح بخاري: ح ٣، ٤٩٥٣۔ صحيح مسلم: ح ١٦٠۔ ٤٠٣

[2] صحيح بخاري: ح ٣٤٣٢، ٣٨١٥۔ صحيح مسلم: ح ٢٤٣٠، ٦٢٧١

فِيهِ وَلَا نَصَبَ)) [1]

"حضرت جبریل علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ خدیجہ آرہی ہیں۔ ان کے پاس ایک برتن ہے جس میں سالن یا کھانا یا مشروب ہے۔ (راوی کو شک ہے)۔ جب وہ آپ کے پاس پہنچ جائیں تو ان کو ان کے رب کا اور میرا سلام سنا دیجیے۔ اور ان کو جنت میں ایک ایسے گھر کی خوشخبری دے دیجیے جو کھوکھلے موتیوں سے بنا ہوگا اور اس میں شور و شغب اور تھکن نام کی کوئی چیز نہ ہوگی۔"

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں حافظ طبرانی، امام نسائی اور حافظ ابن السنی کے حوالہ سے اس ربانی سلام پر ام المومنین رضی اللہ عنہا کا جو جواب نقل کیا ہے وہ ان کے علم و فہم اور دانائی کی گہرائی اور وسعت پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّلَامُ وَعَلَى جِبْرِيلَ السَّلَامُ وَعَلَيْكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ، وَعَلَى مَنْ سَمِعَ السَّلَامَ إِلَّا الشَّيْطَانَ)) [2]

"بیشک اللہ ہی سلام ہے۔ جبریل پر سلام اور اے اللہ کے رسول آپ پر سلام اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں۔ اس پر بھی سلام جس نے سلام سنا سوائے شیطان کے۔"

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی انہی خصوصیات اور انہی اعلیٰ صفات کی وجہ سے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی وفات کے بعد پوری زندگی ان کی یاد کو اپنے دل سے نہ نکال سکے۔ ہمیشہ ان کی تعریف اور ان کا ذکر خیر کرتے رہے۔

اسی طرح دعوت حق کی راہ میں جو پہلا خون بہا وہ بھی ایک خاتون حضرت سمیہ بنت خیاط رضی اللہ عنہا کا پاک اور مقدس خون تھا۔ جنہوں نے راہ حق میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے خواتین اسلام کا سر بلند کر دیا۔ وہ نہایت ضعف اور پیری میں حلقہ بگوش اسلام ہوئی تھیں۔ باندی تھیں اس لیے ابلیس کے بندوں نے ان کو دل کھول کر ستایا۔ ان پر نہایت روح فرسا مظالم ڈھائے۔ مگر ابلیس اور اس کے اہل کار اس عظیم اور اللہ تعالیٰ کی محبوب بندی کے پایۂ استقامت میں معمولی لغزش پیدا نہ کر سکے۔ اور انہوں نے اللہ کی راہ میں جان دے کر حیات جاوداں حاصل کر لی۔ ارشاد الٰہی ہے:

[1] صحیح بخاری: ح ۳۸۲۰، ۷۴۹۷۔ صحیح مسلم: ح ۲۴۳۲

[2] ص ۱۷۰ ج ۲

﴿ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ ﴾

[البقرہ: ۱۵٤]

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انہیں مردہ مت کہو۔ وہ تو زندہ ہیں لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں اہل ایمان کی بعض صفات اور پھر ان کی بعض دعاؤں کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے:

﴿ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ ﴾ [آل عمران:۱۹۵]

''اللہ نے ان کی دعا کا جواب دیتے ہوئے ان سے فرمایا: بیشک میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔ لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے گھر بار چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے۔ میرے لیے لڑے اور مارے گئے، ان سب کے قصور کالعدم کردوں گا اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں۔ اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے۔''

یہ آیت مبارکہ واضح کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ مکافات اور اس کا نظام جزا و سزا اعمال کا بدلہ دینے میں مردوں اور عورتوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرے گا۔

اسلام کی آمد سے قبل آسمانی مذاہب کے ماننے والوں اور خود ساختہ طریق ہائے حیات پر چلنے والوں کا یہ نظریہ اور خیال تھا کہ عورت ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ چنانچہ یہودیوں اور عیسائیوں کا یہ عقیدہ تھا اور اب بھی ہے کہ جنت سے حضرت آدم علیہ السلام کے نکالے جانے اصل سبب اور محرک عورت تھی۔ مشرکانہ مذاہب میں بھی عورت کو پاپ اور گناہوں کا ''سوتا'' قرار دیا جاتا تھا۔ عرب جاہلیت میں تو لڑکیوں کی پیدائش کو باعث عار و شرم تصور کیا جاتا تھا۔ اس عار اور شرم سے چھٹکارا پانے کا ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں تھا کہ لڑکیوں کو ان کی پیدائش کے فوراً بعد ان کو زندہ دفن کر دیا جائے۔ اس گندی اور

ظالمانہ ذہنیت کا نقشہ قرآن پاک میں نہایت مؤثر انداز میں کھینچا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ ﴾ [النحل: ۵۸، ۵۹]

''جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ نہایت دکھی ہو جاتا ہے۔ اس بُری خبر کی وجہ سے لوگوں سے چھپا پھرتا ہے۔ سوچتا ہے کہ اس کو ذلت کے ساتھ لیے رہے یا مٹی دبا دے۔ افسوس کیا ہی برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔''

قیامت میں ایسے مجرموں کے ساتھ جو معاملہ کیا جائے گا اس کا تصور بھی دل ہلا دینے والا ہے۔

﴿ وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ ﴾ [التکویر: ۸۔۹]

''اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ میں ماری گئی۔''

مطلب یہ کہ قیامت میں تو ہر طرح کے مجرمین اور خطا کاروں سے ان کے اعمال کے بارے میں سوال ہوگا۔ لیکن لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے والے اللہ کے نزدیک اس قدر مغضوب ہوں گے کہ روئے سخن ان کی طرف ہوگا ہی نہیں۔ بلکہ زندہ دفن کی جانے والی لڑکیوں سے سوال کیا جائے گا کہ ان کو کس گناہ اور کس قصور میں اس بھیانک طریقے سے قتل کیا گیا تھا؟ تب وہ اپنے رب سے اپنے اوپر ہونے والے اس ظلم کی داستان بیان کریں گے۔

ایسے تاریک، گندے اور غیر انسانی معاشرے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے محمد رسول اللہ ﷺ کو چار بیٹیاں اور دو بیٹے عطا کیے۔ تین بیٹیاں: زینب رضی اللہ عنہا، رقیہ رضی اللہ عنہا اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا تو بعثت سے قبل اور چوتھی: حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا منصب نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد پیدا ہوئیں۔ رہے بیٹے تو حضرت قاسم رضی اللہ عنہ قبل از بعثت پیدا ہوئے اور کمسنی ہی میں انتقال کر گئے۔ جبکہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا لقب طیب و طاہر تھا اور وہ بعثت کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ وہ بھی انتقال کر گئے۔

نبی رحمت فداہ ابی وامی ﷺ نے اپنی ان چاروں بیٹیوں اور ان کی عظیم ماں، ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو جو شفقت ومحبت دی اس کا تصور تک اس وقت مفقود تھا۔

یوں تو رسول اکرم ﷺ پوری دنیا کے لیے رحمت تھے، جس لقب سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو سرفراز

فرمایا ہے۔ لیکن عورتوں کے ساتھ آپ کی محبت وشفقت اور رحمت آپ کی تمام صفات عالیہ میں نمایاں تھی۔

نبی کریم ﷺ کے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتَّى تَبْلُغَا ، جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَهُوَ وَضَمَّ أَصَابِعَهُ))[1]

''جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں۔ تو وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ میں اور وہ اس طرح قریب ہوں گے''۔ آپ نے اپنی انگلیاں ملا کر اس قرب کو واضح فرمایا۔''

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میرے پاس ایک عورت آئی جس کے ساتھ اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ اس نے مجھ سے کچھ مانگا مگر میرے پاس ایک کھجور کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے وہ کھجور اسے دے دی، تو اس نے اس کے دو ٹکڑے کر کے ایک ایک ٹکڑا ان بچیوں کو دے دیا۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ سے عراک بن مالک کی روایت میں ہے کہ ''میں نے اس کو تین کھجوریں دیں۔ جن میں سے ایک ایک کھجور اپنی لڑکیوں کو دے دی اور تیسری کھجور خود کھانی چاہی۔ جونہی وہ اس کو اپنے منہ تک لے گئی ان لڑکیوں نے اسے مانگ لیا۔ اس نے اس کے دو ٹکڑے کر کے ان کو دے دیے اور خود کچھ نہ کھایا۔ ام المومنین فرماتی ہیں: مجھے اس کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ پھر وہ عورت اٹھی اور چلی گئی۔ نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو میں نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپ نے فرمایا:

((مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هَذِهِ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ فَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ ، كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ))[2]

''جو شخص ان لڑکیوں سے متعلق آزمائش میں ڈالا جائے، پھر وہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرے تو وہ اس کے اور جہنم کے درمیان رکاوٹ بن جائیں گی۔''

جس طرح نبی اکرم ﷺ ایک عظیم باپ تھے اسی طرح ایک عظیم شوہر بھی تھے۔ جس کا ثبوت آپ کے ارشادات سے ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ فرمایا:

((خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي))[3]

---

[1] صحیح مسلم: ح ۲۶۲۹

[2] صحیح بخاری: ح ۱۴۱۸ ۔ ۵۹۹۵ ۔ صحیح مسلم: ۲۶۲۹

[3] جامع ترمذی: ح ۳۸۹۵ ۔ سنن ابن ماجہ: ح ۲۰۰۸ ۔ ۱۶۲۲

''تم میں بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی کے لیے بہتر ہو اور تم میں اپنی بیویوں کے لیے سب سے بہتر میں ہوں۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أَكْمَلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِيْمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا، وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ)) [1]

''مومنوں میں کامل ترین ایمان والا وہ ہے جو ان میں سب سے زیادہ بااخلاق ہو اور تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے بہتر ہو۔''

ایک اشکال اور اس کا جواب

اگر اسلام میں عورت کا یہی بلند مقام اور درجہ ہے تو پھر مردوں کے ''قوام'' ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اور حدیث میں عورتوں کے ''ناقصات عقل و دین'' ہونے سے کیا مراد ہے؟

اس اشکال کا جواب ہے کہ جہاں تک مرد کی ''قوامیت'' کا مسئلہ ہے کہ جس کا ذکر سورۃ النساء کی آیت نمبر ۳۴ میں آیا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ مرد عورت کا محافظ، نگہبان اور سرپرست ہے۔ کیونکہ ''قوّام'' ''قَامَ يَقُوْمُ عَلَى'' سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اور ''قام يقوم على'' کے معنی ہیں: سرپرستی کرنا، حفاظت کرنا، نگہبانی کرنا، نظام اور معاملات کو چلانا۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کے اندر ایسی ذہنی اور جسمانی خصوصیات رکھ دی ہیں کہ وہ عورت کے مقابلے میں مذکورہ ذمہ داریاں زیادہ حسن و خوبی کے ساتھ ادا کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس کو ''قوام'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ مرد شرف اور کرامت میں عورت سے برتر ہے۔ یا عورت کا درجہ معاشرے میں پست اور کمتر ہے۔ جس کی بناء پر اس کو معمولی حیثیت دی جائے یا سامان متاع کہا جائے۔ فرض کر لیجیے کہ ایک خاندان صرف ایک مرد، اس کی ماں، بہنوں اور بیٹیوں پر مشتمل ہے۔ مرد ان کا قوام اور سرپرست ہے تو کیا اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ یہ مرد ''قوام'' ہونے کی وجہ سے اپنی ماں سے افضل و برتر ہو گیا؟ اگر نہیں تو قوام کا مطلب ہے سرپرستی اور حفاظت کرنے والا۔ اور عورتوں کے ''ناقصات عقل و دین'' سے متعلق نبی کریم ﷺ کے ارشاد مبارک میں ان کی اس حالت کی ترجمانی کی گئی ہے جو ان کو مختلف اوقات میں لاحق ہوتی ہے۔ حدیث میں ان کی مستقل صفت کے طور پر نہیں بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ حدیث میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ [2]

---

[1] جامع ترمذی: ح ۱۱٦٤ [2] صحيح بخاری: ح ۳۰٤، ۱٤۲٦۷۔ صحیح مسلم: ح ۸۰

نقصان عقل کی مثال میں رسول اللہ ﷺ نے دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا ہے۔ جو سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۲۸۲ سے ماخوذ ہے۔ اور گواہی کا تعلق عقل سے اتنا نہیں ہے جتنا اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے سے ہے جس میں گواہی مطلوب ہوتی ہے۔ عورت اپنا دائرہ کار کے مختلف ہونے اور مالیات وغیرہ جیسے مسائل سے دور رہنے کی وجہ سے اس طرح کے امور سے مکمل واقفیت نہیں رکھتی ہے۔ زیر بحث مسئلے کے بعض پہلو اس کے احاطہ علم میں ہو سکتے ہیں اور بعض نہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے "نسیان کی جگہ" "ضلال" کا فعل اختیار کیا ہے:

﴿ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ﴾

"اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔"

"ضلال" کا لفظ نہایت وسیع مفاہیم رکھتا ہے۔ مثلاً: گمراہی، ناواقفیت، حد سے تجاوز وغیرہ۔

نقصان دین کی مثال میں نبی مکرم ﷺ نے مخصوص ایام میں عورت کے نماز ترک کر دینے کی حالت بیان فرمائی ہے۔ یعنی اللہ کے فرائض میں سے کسی فرض کو ترک کرنا عورت کی صفت نہیں ہے بلکہ حالت اور مجبوری ہے۔

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد میں عورت کی توہین اور تذلیل کا پہلو نہیں بلکہ تنبیہ کا پہلو ہے۔ جس طرح سورۃ الاحزاب میں تمام انسانوں کو "ظَلُومًا جَهُولًا" کہا گیا ہے۔ جبکہ انسانوں میں رسولوں، نبیوں اور مومنین صادقین کی بھی بہت بڑی تعداد شامل ہے۔ تو وہاں بھی تنبیہ مراد ہے۔

مزید یہ کہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات، آپ کے سلوک اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل اور رویہ کا ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس سے عورتوں کی تذلیل و توہین اور تحقیر کا ثبوت ملتا ہو۔ یہ ذہنیت تو بعد میں مسلمانوں میں پیدا ہوئی کہ عورت ساری برائیوں کی جڑ، فحاشی و بدکاری کا سبب ہے۔ سوجھ بوجھ سے عاری، نیز عقل سے کوری ہوتی ہے۔ اس کی حیثیت سامان متاع اور ایک ایسی لونڈی کی ہے جس کو کوئی بھی امتیاز حاصل نہیں۔

ذیل میں ایسی موضوع اور منکر روایات پیش کی جارہی ہیں جن سے ہمارے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کی کمتری کا نظریہ کتاب وسنت سے ماخوذ نہیں بلکہ من گھڑت ہے۔

عورتوں سے صلاح و مشورہ؟

(۲۵۸)......شَاوِرُوْهُنَّ يَعْنِيْ النِّسَاءَ وَخَالِفُوْهُنَّ۔))

''عورتوں سے مشورہ کرو اور عمل ان کے مشورے کے خلاف کرو۔''

یہ روایت باطل ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔[1] اس سے ملتی جلتی ایک اور روایت ہے جس کو حافظ ابو الحسن بن سعید عسکری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب کیا ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

((خَالِفُوا النِّسَاءَ فَإِنَّ فِيْ خِلَافِهِنَّ بَرَكَةٌ))

''عورتوں کی مخالفت کرو، کیونکہ ان کی مخالفت میں برکت ہے۔''

اس روایت کی نسبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح نہیں ہے۔ اس باطل روایت کی سند درج ذیل ہے:

علی بن جعد جوہری کہتے ہیں: ابو عقیل سے روایت ہے۔ وہ حفظ بن عثمان سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا......

یہ سند دو علتوں کی بناء پر نا قابل اعتبار ہے:

۱۔ حفص بن عثمان بن عبیداللہ مجہول ہے۔ امام ابن ابی حاتم نے اس کا ذکر ابو عقیل کی اسی روایت کے ضمن میں کیا ہے اور اس کی جرح و تعدیل کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا۔[2]

۲۔ اس سند کی دوسری علت اس کا بنیادی راوی ابو عقیل ہے۔ جس کے متعلق حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب[3] میں اس کو ضعیف لکھا ہے اور امام احمد فرماتے ہیں: ابو عقیل نے ایسے لوگوں سے حدیث روایت کی ہے جن کو میں نہیں جانتا۔''[4]

یہ تو اس کی سند کا حال تھا۔ رہا اس کا متن تو وہ منکر ہے اور اس صحیح حدیث کے خلاف ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کا ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ کرنے اور اس مشورے پر عمل کرنے کا ذکر آیا ہے۔ جبکہ آپ اللہ کے رسول تھے۔ واقعہ یوں ہے کہ حدیبیہ میں مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان صلح کا معاہدہ ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا:

((قُوْمُوْا فَانْحَرُوْا، ثُمَّ احْلِقُوْا))

''اٹھو قربانی کرو، پھر بال منڈاؤ۔''

---

[1] المقاصد: ح ۵۸۵۔ الفوائد المجموعه: ص ۱۳۰۔
[2] الجرح والتعدیل: ص ۱۸۲ ج ۲
[3] تقریب التهذیب: ترجمه: ۷۶۳۳
[4] الضعیفه: ص ۶۲۰ ج ۱، ح ۴۲۰

لیکن آپ کا یہ حکم سن کر کوئی بھی صحابی نہ اٹھا۔ آپ نے تین بار اس کا حکم دیا اور جب ان میں سے کوئی نہ اٹھا تو رسول اکرم ﷺ اپنے خیمے میں تشریف لے گئے اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے، صحابہ کرام سے ظاہر ہونے والی اس سرد مہری کا تذکرہ فرمایا۔ اس پر ام المومنین رضی اللہ عنہا نے عرض کیا:

اے اللہ کے رسول! کیا آپ ایسا چاہتے ہیں؟ آپ تشریف لے جائیے، اپنا اونٹ ذبح فرمایئے اور حجام کو بلا کر اپنا سر منڈوا لیجیے۔ یہ سن کر رسول اکرم ﷺ خیمہ سے باہر نکلے، کسی سے کوئی بات نہیں کی، اپنا اونٹ ذبح کیا، اپنے حجام کو بلا کر اس سے بال منڈوائے۔ جب صحابہ نے یہ دیکھا تو وہ بھی اٹھے، قربانیاں کیں اور ان میں سے ایک نے دوسرے کے بال مونڈے۔[1] غور فرمایئے کہ اس نازک موقع پر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا مشورہ کس قدر صائب اور درست تھا۔

(۲۵۹)......طَاعَةُ الْمَرْأَةِ نَدَامَةٌ

''عورت کی اطاعت باعث ندامت اور پشیمانی ہے۔''

اس روایت کو امام شوکانی[2] محدث البانی[3] اور حافظ سخاوی[4] نے باطل اور موضوع قرار دیا ہے۔

حافظ سخاوی نے المقاصد میں لکھا ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ کیا تھا۔ اس سے صاحب فضل عورت سے صلاح و مشورہ کرنے کے جواز کا ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ وہ صاحب فضل اور صاحب عقل تھیں۔ امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک جوینی فرماتے ہیں:

ہم سوائے ام سلمہ کے کسی عورت کو نہیں جانتے جس نے کوئی درست رائے دی ہو۔[5]

امام الحرمین جیسے عالم دین کی عورت کے بارے میں یہ رائے اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ عورت کی بے عقلی ایک نظریہ اور عقیدہ بن چکی ہے۔ اس کی ناسمجھی کے بارے میں جھوٹی روایات نے کافی اثرات چھوڑے ہیں۔

(۲۶۰)......لَا يَفْعَلَنَّ أَحَدُكُمْ أَمْرًا حَتّٰى يَسْتَشِيْرَ، فَإِنْ لَّمْ يَجِدْ مَنْ يَسْتَشِيْرُهُ فَلْيَسْتَشِرِ امْرَأَتَهُ۔ ثُمَّ لِيُخَالِفْهَا فَإِنَّ فِيْ خِلَافِهِنَّ الْبَرَكَةَ۔

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کوئی کام نہ کرے جب تک کہ اس کے بارے میں

---

[1] صحیح بخاری: ح ۲۷۳۱-۲۷۳۲ [2] الفوائد المجموعہ: ص ۱۲۹،
[3] الضعیفہ: ص ۶۲۳ ج ۱ [4] المقاصد الحسنہ: ص ۲۹۷
[5] المقاصد: ص ۲۹۸

مشورہ نہ کرلے اور اگر اس کو کوئی ایسا نہ ملے جس سے وہ مشورہ کرے تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی سے مشورہ کرے۔ پھر اس پر واجب ہے کہ وہ اس کے خلاف عمل کرے۔ کیونکہ عورتوں کی مخالفت میں برکت ہے۔"

یہ روایت بھی باطل ہے اور مذکورہ بالا جھوٹی روایتوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کیونکہ پہلی اور اس روایت کی سندوں میں، عنبسہ بن عبدالرحمٰن، عثمان بن عبدالرحمٰن طرائفی، محمد بن سلیمان بن ابی کریمہ اور عیس بن ابراہیم ہاشمی جیسے جھوٹے، ناقابل اعتماد اور ضعیف راوی شامل ہیں۔[1]

(۲٦۱)...... هَلَكَتِ الرِّجَالُ حِيْنَ أَطَاعَتِ النِّسَاءَ۔

"مرد اس وقت برباد ہو گئے جب انہوں نے عورتوں کی بات مان لی۔"

یہ روایت سند کے اعتبار سے تو موضوع نہیں ہے لیکن اپنے متن اور مضمون کے اعتبار سے انہی جھوٹی روایتوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جو اوپر گزری ہیں۔ جن کا مقصد لوگوں میں یہ خیال عام کرنا ہے کہ عورتیں عقل وفہم سے عاری مخلوق ہیں اور ان کی باتوں یا ان کے مشوروں پر عمل کرنا تباہی و بربادی کا سبب ہے۔ اسی وجہ سے عمل کی دنیا میں ان کا کوئی اعتبار باقی نہیں رہا ہے۔

آج مرد حضرات بیٹیوں کی شادی کے مسئلے میں ان کی ماؤں سے مشورہ کرنا اپنی کسر شان اور بیٹیوں کی رضامندی معلوم کرنا اپنی جھوٹی قوامیت کے لیے توہین تصور کرتے ہیں۔ بیٹیوں کو ان کی مرضی معلوم کیے بغیر جن کے ساتھ چاہتے ہیں باندھ دیتے ہیں۔ جبکہ اسلام کی نظر میں ایسا کرنا حرام ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰى تُسْتَأْذَنَ))[2]

"کنواری لڑکی کا نکاح اس سے اجازت لیے بغیر یا اس کی مرضی معلوم کیے بغیر کیا جائے۔"

ایک دوسری حدیث کے الفاظ ہیں:

((الْبِكْرُ يَسْتَأْذِنُهَا أَبُوْهَا))[3]

"کنواری لڑکی کا باپ اس کی مرضی معلوم کرے۔"

---

[1] الفوائد المجموعة: ص ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ المقاصد الحسنة ص ۲۹۷

[2] صحیح بخاری ح ۵۱۳٦، صحیح مسلم ح ۱۳۱۹ [3] صحیح مسلم ح ۱٤۲۱۔

معلوم ہوا کہ کسی شخص کا اپنی بیٹی کو ایسے شخص کے ساتھ نکاح پر مجبور کرنا جسے وہ ناپسند کرتی ہو یا اس کی مرضی معلوم کیے بغیر اس کا کسی کے ساتھ نکاح کر دینا حرام ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ دوسری لفظوں میں ایسا نکاح ہوتا ہی نہیں اور دنیا جن کو میاں بیوی تصور کر رہی ہوتی ہے وہ فی الواقع میاں بیوی نہیں ہوتے اور ان کے اس گناہ کا ذمہ دار لڑکی کا باپ ہوتا ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی [1] اور حافظ سخاوی [2] نے اس زیر بحث روایت کے بارے میں لکھا ہے:

اس کی روایت امام ابن عدی نے الکامل میں [3] حافظ ابونعیم نے اخبار اصفہان [4] میں، ابن ماسی نے جزء الانصاری [5] میں اور حاکم نے المستدرک [6] میں اس سند سے کی ہے:

بکار بن عبدالعزیز بن ابی بکرہ نے اپنے باپ عبدالعزیز سے اور انہوں نے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے کہا:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک خوش خبری دینے والا آیا اور آپ کو مسلمانوں کے لشکر کی فتح کی نوید سنائی۔ اس وقت آپ کا سر مبارک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں تھا۔ یہ سن کر آپ کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے لیے سجدے میں گر گئے۔ فارغ ہونے کے بعد قاصد سے سوال کرنے لگے: اس نے جنگ کے واقعات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ دشمن کے بارے میں یہ بھی بتایا کہ ''ان کی والی ایک عورت ہے۔ امام احمد کی روایت میں ہے: وَلِيَ اَمْرَهُمْ اِمْرَاَةٌ..... ان کے معاملات کی باگ ڈور ایک عورت کے ہاتھ میں ہے۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا:

((هَلَكَتِ الرِّجَالُ حِيْنَ أَطَاعَتِ النِّسَاءَ))

''مرد اس وقت برباد ہو گئے جب انہوں نے عورتوں کی بات مانی۔''

امام حاکم نے اس روایت کو صحیح الاسناد بتایا ہے اور امام ذہبی نے ان کی اس بات کی توثیق کی ہے۔

لیکن محدث محمد ناصر الدین البانی تحریر فرماتے ہیں:

یہ حاکم اور ذہبی کی بھول ہے: ذہبی میزان الاعتدال میں بکار بن عبدالعزیز کے حالات۔ ترجمہ۔ بیان کرتے ہوئے امام یحییٰ بن معین کے حوالہ سے یہ لکھ چکے ہیں کہ ''اِنَّهُ لَيْسَ بِشَيْءٍ'' درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یعنی بالکل ہی واہیات اور ناقابل اعتبار راوی ہے۔ اور امام عبداللہ بن عدی کا قول

---

[1] الضعیفۃ: ص ٦٢٥۔ ٦٢٦ ج ١
[2] المقاصد الحسنۃ: ص ٥٣٤ ح ١٢٧٧
[3] الکامل: ص ٣٨ ج ١
[4] اخبار اصفہان: ٣٤ ج ٢
[5] جزء الانصاری: ص ١١ ج ١
[6] المستدرک: ح ٧٨٥٩

ہے کہ اس کا شمار ان ضعیف راویوں میں ہوتا ہے جن کی ''مرویات'' صرف لکھی جانے کے قابل ہیں''

البانی اس کے بعد لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں اس روایت کی اصل دوسرے الفاظ میں وہ ہے جو امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

((لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمْ إِمْرَأَةً)) [1]

''وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پا سکتی جس نے کسی عورت کو اپنا حاکم بنا دیا ہے۔''

اور ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے پوتے بکار نے اس کو ان الفاظ میں روایت کر دیا ہے۔ [2]

(٢٦٢)......مَنْ أَطَاعَ امْرَأَتَهُ كَبَّهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فِي النَّارِ عَلَى وَجْهِهِ

''جو اپنی بیوی کی بات مانے گا اللہ عزوجل اس کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دے گا۔''

یہ روایت حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج حافظ سیوطی نے ''ذیل الاحادیث الموضوعہ'' [3] میں دیلمی کی اس سند سے کی ہے جو انہوں نے عبدالمطلب بن شعیب بن حیان ازدی سے کی ہے۔

ہم سے عبداللہ بن صالح نے بیان کیا، کہا: ہم سے عمرو بن ہاشم نے، ابن ابی کریمہ سے، انہوں نے جعفر بن محمد سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے جابر سے، انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا...... حافظ سیوطی نے یہ روایت نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اس کی صحت وسقم کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اسی وجہ سے حافظ ابن عراق نے اس پر تعقیب کرتے ہوئے لکھا ہے:

حافظ سیوطی نے حدیث کی صحت وسقم کے بارے میں بیاض چھوڑ دی ہے۔ گویا وہ اس کی علت بیان کرنا چاہتے تھے لیکن اس کا ان کو موقع نہیں ملا۔ میں بھی یہ کہتا ہوں کہ مجھے بھی اس کی علت معلوم نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ اس کی سند میں شامل محمد بن عبدالرحمٰن صائغ، مظفر بن حسین، علی بن محمد بن عمر نہاوندی، محمد بن حسن بن قتیبہ اور مطلب بن شعیب بن حیان ازدی کے حالات مجھے معلوم نہیں ہوئے۔ [4] مطلب یہ ہے کہ یہ سب مجہول ہیں۔

محدث محمد ناصر الدین البانی تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح بخاري: ح ٤٤٢٥، ٧٠٩٩ [2] الضعيفه: ص٦٢٥۔ ٦٢٦ ج١

[3] ذيل الاحاديث الموضوعة: ص ١٣٢ ح ٦٢٣ [4] تنزيه الشريعه: ص ٢١٥ ج٢ ح٥٣

اگر ان کو مذکورہ راویوں کے ترجمے نہیں ملے تھے تو ان کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ ان کے اوپر کے بعض راویوں کے بارے میں خاموشی اختیار کریں۔ اس طرح ان سے نیچے کے راویوں کی ثقاہت و عدم ثقاہت معلوم کرنے کی انہوں نے کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ حالانکہ انہوں نے جن راویوں کی جانب اشارہ کیا ہے ان میں سے بعض ضعیف ہیں اور ایک مجہول ہے۔ رہا عمرو بن ہاشم بیروتی تو اس کا ترجمہ تہذیب التہذیب وغیرہ میں موجود ہے۔ امام ذہبی نے "المغنی" میں لکھا ہے:

اس کو ثقہ قرار دیا گیا ہے۔ حافظ محمد بن مسلم بن دارہ نے اس کو ضعیف بتایا ہے اور حافظ نے التقریب[1] میں لکھا ہے "سچا تھا مگر غلطیاں کرتا تھا۔"

عبداللہ بن صالح معروف ہے جو ضعیف تھا۔ مطلب بن شعیب بن حیان ازدی کی اگرچہ توثیق کی گئی ہے اور ابن عراق اس کو معلوم نہ کر سکے۔ مگر اس کا تعلق ائمہ حدیث سے نہیں تھا۔ بلکہ اس کا شمار طبرانی کے شیوخ میں ہوتا تھا۔ شیخ حماد انصاری کی کتاب میں اس کا ترجمہ بھی موجود ہے۔ البانی آگے لکھتے ہیں:

ابن عراق نے حافظ سیوطی کے سکوت کی جو علت بیان کی ہے وہ معقولیت پر مبنی نہیں ہے۔ کیونکہ اس حدیث کے راویوں کا ضعف ایسا ہے جو سیوطی جیسے حافظ پر مخفی نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت حافظ سیوطی نے اس کے بارے میں جو سکوت اختیار کیا ہے وہ اس روایت کے موضوع اور باطل ہونے کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ ہم آہنگی رکھتے تھے اور ان کی جو باتیں شریعت کے خلاف نہیں ہوتی تھیں ان کو مانتے بھی تھے۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حجۃ الوداع میں ماہواری آجانے کی وجہ سے حج سے پہلے عمرہ نہیں کر سکی تھیں تو آپ نے ان کی خواہش پر حج کے بعد ان کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دیا کہ وہ ان کو تنعیم لے جائیں تاکہ وہ وہاں سے احرام باندھ کر عمرہ کریں۔ حالانکہ لوگ مدینہ کی طرف واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔[2]

محدث البانی رحمہ اللہ کی اس محدثانہ وضاحت کے بعد اس جھوٹی روایت کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی حاجت باقی نہیں رہی۔

(٢٦٣)...... إِنَّ النِّسَآءَ سُفَهَآءُ، إِلَّا الَّتِيْ أَطَاعَتْ زَوْجَهَا

"درحقیقت تمام عورتیں نادان اور بیوقوف ہیں سوائے اس عورت کے جو اپنے شوہر کی

---

[1] ص ٣٦٢ ترجمہ ٥١١٧

[2] الضعیفہ: ص ٩٣٩۔ ٩٤١ ج ١٤ ح ٦٩٠٤

اطاعت کرے۔"

یہ روایت ان الفاظ میں بھی ملتی ہے:

((إِنَّ النِّسَآءَ هُمُ السُّفَهَآءُ: إِلَّا الَّتِي أَطَاعَتْ قَيِّمَهَا))

"بیشک عورتیں ہی نادان اور احمق ہیں سوائے اس کے جو اپنے سرپرست کی اطاعت کرے۔"

دونوں طرح کے الفاظ میں یہ روایت صحیح نہیں بلکہ منکر ہے۔ جس کو حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ کے حوالہ سے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۶ میں لفظ "اَلسُّفَهَاءَ" کی تفسیر میں نقل کیا ہے اور اس پر صحت وسقم کا حکم لگانے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ گویا یہ مسلمہ امر ہے کہ عورتیں احمق اور نادان ہوتی ہیں سوائے ان کے جو شوہروں کی مطیع و فرماں بردار ہوں۔ رہیں وہ عورتیں جو شوہر والی نہ ہوں اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مطیع ہوں، ان کے بارے میں منکر روایتیں پھیلانے والے کیا رائے رکھتے ہیں؟

محدث محمد ناصر الدین البانی تحریر فرماتے ہیں:

یہ منکر روایت اس سند سے مروی ہے:

عثمان بن ابی عاتکہ سے روایت ہے وہ علی بن یزید سے روایت کرتے ہیں، وہ قاسم سے اور وہ ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں

تو یہ سند ضعیف ہے۔ امام ذہبی نے "الکاشف" میں علی بن یزید آلہانی کو ضعیف لکھا ہے، لیکن متروک نہیں قرار دیا۔ البتہ المغنی میں لکھا ہے کہ محدثین نے اس کی تضعیف کی ہے اور امام دارقطنی نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔ [1]

البانی نے آخر میں لکھا ہے: اصل میں یہ روایت موقوف ہے جس کو کسی راوی نے مرفوع بنا دیا ہے۔ [2]، [3]

---

[1] الضعفاء والمتروکین ص ۱۹۳ ترجمہ ۴۰۸۔ میزان الاعتدال ترجمہ ٥٩٦٦ میں آیا ہے کہ امام بخاری نے اس کو منکر الحدیث لکھا ہے۔ امام نسائی کا قول ہے: وہ ثقہ نہیں تھا۔ ابوزرعہ کہتے ہیں: وہ قوی نہیں تھا۔

[2] جس حدیث کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہو وہ مرفوع ہوتی ہے اور جس کی نسبت صحابہ کی طرف ہو وہ موقوف ہوتی ہے۔

[3] الضعیفہ: ص ١٣٦ ج ١٣، ص ١٠٥٩۔ ١٠٦٠ ج ١٢

کیا عورت کا وجود عبادت میں مانع ہے؟

ارباب تصوف نے جس طرح نئی نئی عبادتیں، تزکیہ نفس اور وصول الی اللہ کے نت نئے طریقے گھڑ لیے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے تجرد کی زندگی کو عند اللہ محبوب قرار دینے کے لیے ایسی روایتیں گھڑ کر رسول اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دی ہیں کہ جن میں عورتوں کی مذمت کی گئی ہے اور ان کے وجود کو اللہ کی عبادت میں مانع اور رکاوٹ قرار دیا گیا ہے۔ ان صحیح حدیثوں کی من مانی تاویلیں کی گئی ہیں جن سے تجرد کی زندگی کو غیر اسلامی قرار دیا گیا ہے۔ نکاح سے اعراض کرنے والوں کو طریقہ نبوی سے خارج بتایا گیا ہے:

(٢٦٤)......لَوْلَا النِّسَآءُ لَعُبِدَ اللّٰهُ حَقًّا حَقًّا۔

''اگر عورتیں نہ ہوتیں تو اللہ کی صحیح اور حقیقی عبادت کی جاتی۔''

یہ روایت نبی کریم ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ: ''چونکہ عورتوں کا وجود ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی صحیح اور حقیقی عبادت نہیں ہو رہی ہے۔''

اس طرح یہ روایت اپنی سند سے پہلے اپنے متن کے اعتبار سے جھوٹ ہے۔ کیونکہ اولاد آدم کے سردار، تمام انبیاء اور رسولوں کے سرتاج محمد رسول اللہ ﷺ آغاز آفرینش سے لے کر تا قیامت پیدا ہونے والے تمام انس و جن میں اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ عبادت گزار بندے تھے اور آپ بیوی بچے رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ آپ کا تعلق بے پناہ محبت و شفقت اور حسن سلوک کا ترجمان اور مظہر تھا۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ إِلَى بُيُوتِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ يَسْأَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ ﷺ فَلَمَّا أُخْبِرُوْا كَأَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا، فَقَالُوْا: وَأَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ؟ قَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ، قَالَ أَحَدُهُمْ: أَمَّا أَنَا فَأُصَلِّي اللَّيْلَ أَبَدًا وَقَالَ آخَرُ: أَنَا أَصُوْمُ الدَّهْرَ وَلَا أُفْطِرُ، وَقَالَ آخَرُ: أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبَدًا، فَجَاءَ إِلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: أَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ أَمَا وَاللّٰهِ إِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ، لٰكِنِّيْ أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ،

وَأُصَلِّيْ وَارْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ)) [1]

''تین افراد نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے گھروں میں، رسول اللہ ﷺ کی عبادت کا حال معلوم کرنے کی غرض سے حاضر ہوئے۔ اور جب ان کو آپ کی عبادت کی خبر دی گئی تو انہوں نے اس کو اپنے خیال میں کم محسوس کیا اور بولے: نبی کریم ﷺ کے مقابلے میں ہم کہاں؟ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہوں کو اللہ نے بخش دیا ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا: میں نے تو ہمیشہ رات بھر نمازیں پڑھتا رہوں گا۔ دوسرا بولا: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔ کسی دن روزہ ترک نہ کروں گا۔ اور تیسرے نے کہا: میں تو عورتوں سے بالکل الگ تھلگ رہوں گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور فرمایا: کیا تمہیں لوگوں نے ایسی اور ایسی باتیں کہی ہیں؟ رہا میں تو اللہ کی قسم! تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تم سب سے زیادہ اس کا متقی و پرہیزگار بندہ ہوں۔ مگر میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ نمازیں بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ تو جو کوئی میری اس سنت سے اعراض کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

یہ حدیث پاک اسلام کے اعتدال پسندانہ مزاج کو بیان کرنے میں اس قدر واضح ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اس حدیث نے جہاں یہ واضح کر دیا ہے کہ اسلام میں کس طرح کی عبادت مطلوب ہے وہیں یہ بھی بتا دیا کہ عورت سے تعلق اللہ تعالیٰ کی خشیت اور تقویٰ پر اثر انداز نہیں ہوتا اور آخر میں یہ واضح فرما دیا گیا کہ اس حدیث میں بیان کردہ طریقۂ نبوی سے روگردانی کرنے والا کسی اور شریعت سے تعلق رکھتا ہو تو رکھتا ہو لیکن شریعت محمدی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

رات کے وقت نبی اکرم ﷺ کی عبادتوں اور نمازوں کی مکمل تفصیلات صحیح احادیث میں بیان کر دی گئی ہیں۔ یہ عبادتیں پیارے نبی ﷺ امہات المومنین سے الگ تھلگ ہو کر ادا نہیں فرماتے تھے بلکہ ان میں سے کسی نہ کسی کے حجرے میں اور ان کی موجودگی میں ادا فرماتے تھے۔ احادیث میں رات کے وقت آپ کی نمازوں کی زیادہ تر تفصیلات ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہیں۔ بارہا ایسا ہوتا کہ رحمۃ للعالمین فداہ ابی و امی ﷺ نماز ادا فرماتے اور ام المومنین رضی اللہ عنہا آپ کے سامنے لیٹی ہوتیں۔ ان کے پاؤں رسول اللہ ﷺ اور قبلہ کے درمیان ہوتے۔ جب آپ سجدے میں جاتے تو وہ اپنے

[1] صحیح بخاری: ح ۵۰۶۳۔ صحیح مسلم: ح ۱۴۰۱

پاؤں سمیٹ لیتیں۔[1]

اسی طرح ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ تہجد کی نماز ادا فرماتے اور وہ آپ کے بالمقابل لیٹی ہوتیں۔ ایسا بھی ہوتا کہ وہ حالت حیض میں ہوتیں اور ان کے کپڑے اس وقت آپ کے جسم مبارک سے لگتے جب آپ سجدے میں جاتے۔[2]

نبی کریم ﷺ کے قیام اللیل سے متعلق احادیث میں جو چیز قابل غور ہے وہ یہ کہ نبی معظم ﷺ ازواج مطہرات کو اپنے ساتھ نماز تہجد کے لیے بیدار نہیں کرتے تھے بلکہ جب آپ اپنی طویل نماز سے فارغ ہو جاتے اور فجر کی اذان میں کچھ وقت باقی ہوتا تو ان کو جگاتے اور فرماتے وتر پڑھ لو۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے احادیث میں اس کا بہت ذکر ملتا ہے کہ جب آپ کے وتر کا وقت آتا تو فرماتے: ''قُوْمِیْ فَاَوْتِرِیْ یَا عَائِشَةُ!..... عائشہ! اٹھو اور وتر پڑھ لو۔[3]

نبی اکرم ﷺ کی سیرت پاک کا ایک نہایت تابناک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ اپنی ازواج مطہرات کے احساسات کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ آپ نے ان سے رات میں عبادت کے لیے اجازت لی۔ حالانکہ آپ عام انسان یا عام شوہر نہیں تھے بلکہ رسول رب العالمین تھے اور مطاع مطلق تھے۔ آپ کی یہ حیثیت سب کے لیے تھی۔ چنانچہ مشہور تابعی حضرت عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا: رسول اللہ ﷺ کے تعلق سے آپ نے جس عجیب شیء کا مشاہدہ کیا ہو اسے بیان فرمایئے۔ یہ سن کر وہ خاموش رہیں۔ پھر فرمایا:

میری راتوں میں سے جب ایک رات آئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((یَا عَائِشَةُ! ذَرِیْنِیْ اَتَعَبَّدِ اللَّیْلَةَ لِرَبِّیْ))

''اے عائشہ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس رات اپنے رب کی عبادت کروں۔''

میں نے عرض کیا: اللہ کی قسم مجھے آپ کا قرب پسند ہے اور جو چیز آپ کے لیے باعث مسرت ہے وہ مجھے بھی عزیز ہے۔[4]

---

[1] دیکھیے: صحیح بخاری ح ۳۸۲، ۳۸۳، ۵۱۵، صحیح مسلم ح ۵۱۲۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱٤۵۔

[2] صحیح بخاری: ۳۳۳، ۳۷۹، ۵۱۷۔ صحیح مسلم ح۵۱۳۔ ۱۱۲٦۔

[3] صحیح مسلم: ح ۷٤٤۔ ۱۷۳٤

[4] الترغیب الترهیب: ص ۱۸۵۔ ۱۸٦۔ ج۲ ح۱٤٦۸

ازواج مطہرات کے ساتھ رسول اکرم ﷺ کے برتاؤ اور حسن سلوک کی جو تفصیلات اوپر بیان ہوئی ہیں یہ زیبِ داستان کے لیے نہیں ہیں بلکہ ان تمام لوگوں کے لیے نمونہ عمل ہیں جو آپ کو اپنا رسول مانتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی سیرت پاک کو مسلمانوں کے لیے قابل تقلید نمونہ عمل بنایا ہے۔

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴾ [الاحزاب: ۲۱]

"درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔"

اس آیت پاک میں جو چیز قابل غور ہے وہ یہ کہ نبی مکرم ﷺ کی سیرت پاک صرف ان لوگوں کے لیے نمونہ عمل ہے جو اللہ سے خیر اور بھلائی کی امید رکھتے ہوں۔ آخرت پر جن کا ایمان ہو اور اللہ کی یاد سے ان کے دل اور زبانیں معمور رہتی ہوں۔

رہے وہ لوگ جنہوں نے اپنے لیے شریعت محمدی کے سوا کوئی اور طریقہ یا شریعت اختیار کر لیا ہو ان کے لیے رسول پاک ﷺ کی سیرت پاک میں کوئی نمونہ عمل نہیں ہے۔

اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں دنیا کو نفع بخش اور قابل استفادہ شیء قرار دیا ہے اور اس دنیا کی بہترین متاع عورت کو قرار دیا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

((اَلدُّنْيَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ))[1]

"دنیا ایک متاع ہے اور دنیا کی بہترین متاع صالح بیوی ہے۔"

اوپر کی وضاحتوں کے بعد زیر بحث روایت:

((لَوْلَا النِّسَاءُ لَعُبِدَ اللّٰهُ حَقًّا حَقًّا))

کی سند کے باطل ہونے کی وضاحت ضروری نہیں رہ جاتی۔ لیکن اہل علم کے لیے اس کی سند پر بھی روشنی ڈال دیتا ہوں۔

علامہ ابو الحسن علی بن محمد بن عمران لکھتے ہیں:

اس حدیث کی سند میں بشر بن حسین جیسا جھوٹا اور حدیثیں گھڑنے والا راوی شامل ہے۔ اس لیے یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے۔[2]

---

[1] صحیح مسلم: ح ۱۲۶۸۔ ۳۶۴۸۔ [2] تنزیهه الشریعة: ص ۲۰۲ ج ۲

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

یہ موضوع حدیث دو طریقوں سے مروی ہے۔ پہلے طریق کا راوی محمد بن عمران ہمدانی ہے۔ کہتا ہے: ہمیں عیسیٰ بن زیاد دورقی نے خبر دی، انہوں نے کہا: ہم سے عبدالرحیم بن زید عمی نے اپنے باپ سے، اس نے سعید بن مسیب سے اور انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

امام ابن عدی نے اس کی تخریج کے بعد لکھا ہے: یہ ایک منکر حدیث ہے جس کو میں صرف اسی طریق سے جانتا ہوں۔ عبدالرحیم بن زید عمی کی مرویات میں اس کا کوئی ثقہ متابع نہیں ہے۔ امام بخاری نے اس کو متروک قرار دیا ہے اور امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم کا قول ہے کہ: عبدالرحیم کی روایت کردہ حدیثیں ترک کر دینے کے قابل ہیں۔ کیونکہ وہ سب منکر ہیں۔

امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں: وہ جھوٹا اور خبیث تھا۔

یہ زیر بحث روایت دوسری سند سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس کے الفاظ ہیں:

(٢٦٥)......لَوْلَا النِّسَاءُ دَخَلَ الرِّجَالُ الْجَنَّةَ۔

اگر عورتیں نہ ہوتیں تو مرد جنت میں داخل ہوتے (چونکہ عورتیں ہیں اس لیے مرد جنت میں داخل نہیں ہوں گے)

تو اس کا راوی بشر بن حسین متروک اور کذاب تھا۔[1]

تعلیم نسواں:

مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جو عورتوں کو تمام برائیوں کی جڑ سمجھتا ہے۔ اس کا نعرہ یہ ہے کہ عورتوں کو ذہنی اور فکری ترقی کرنے اور ان کو لکھنے پڑھنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ یہ نعرہ درج ذیل الفاظ میں ملتا ہے:

(٢٦٦)......لَا تُسْكِنُوْهُنَّ الْغُرَفَ وَلَا تُعَلِّمُوْهُنَّ الْكِتَابَةَ، وَعَلِّمُوْهُنَّ الْمِغْزَلَ وَسُوْرَةَ النُّوْرِ

عورتوں کو بالا خانوں میں نہ رکھو، ان کو لکھنے کی تعلیم نہ دو، ان کو سوت کاتنے اور سورۃ النور کی تعلیم دو۔

---

[1] الضعیفہ: ص١٣٩۔١٤٠ ج١۔ الفوائد المجموعہ: ص١١٩

یہ روایت حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج امام ابن حبان نے الضعفاء [1] میں حافظ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں [2] امام بیہقی نے شعب الایمان [3] میں اور امام ابن الجوزی نے الموضوعات [4] میں اس سند سے کی ہے:

محمد بن ابراہیم ابو عبداللہ شامی سے روایت ہے، کہا: ہم سے شعیب بن اسحاق دمشقی نے، ہشام بن عروہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے......

امام بیہقی نے لکھا ہے کہ یہ سند منکر ہے۔

امام ابن الجوزی فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اس کا ذکر امام حاکم نے اپنی مستدرک میں کیا ہے۔ تعجب ہے کہ اس کا موضوع ہونا ان پر کس طرح مخفی رہ گیا۔" امام ابن حبان نے لکھا ہے کہ محمد بن ابراہیم شامی، شامیوں کے نام سے حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔ اس سے حدیث کی روایت صرف "اعتبار" کے لیے جائز ہے۔ اس نے ایسی حدیثیں روایت کی ہیں جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے۔ [5]

محدث محمد ناصر الدین البانی نے اس کو موضوع قرار دیا ہے۔ کیونکہ امام دارقطنی نے محمد بن ابراہیم شامی کو کذاب لکھا ہے۔ ابن عدی کا قول ہے کہ اس کی بیشتر مرویات غیر محفوظ یعنی شاذ ہیں۔ [6]

علامہ ابو عبدالرحمٰن شرف الحق عظیم آبادی نے "عون المعبود" میں مختلف ائمہ حدیث کے حوالہ سے اس زیر بحث روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔ [7]

امام شوکانی نے نیل الاوطار میں سنن ابوداؤد کی حدیث...... أَلَا تُعَلِّمِيْنَ هٰذِهِ رُقْيَةَ النَّمِلَةِ...... تم اس کو "نملہ" کی جھاڑ پھونک کیوں نہیں سکھا دیتیں......" کی شرح کرتے ہوئے اس زیر بحث روایت کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

"اس حدیث میں لکھنے کی تعلیم سے نہی اس عورت سے متعلق ہے جس کو لکھنے کی تعلیم دینے سے فساد کا اندیشہ ہو۔ [8] مطلب یہ ہے کہ اگر فساد کا اندیشہ نہ ہو تو اس کو تعلیم دی جا سکتی ہے۔ اس پر محدث البانی نے

---

[1] الضعفاء: ص ٣٠٢ ج ٢
[2] تاریخ بغداد: ص ٢٢٤ ج ١٤
[3] شعب الإيمان ص ٤٧٧-٤٧٨ ح ٢٤٥٤
[4] الموضوعات: ص ٦٣ ج ٣ ح ١٢٧٤
[5] الموضوعات: ص ٦٤-٦٥ ج ٣
[6] الضعيفة: ص ٣٠ ج ٥
[7] عون المعبود: ص ١٦٦١
[8] نيل الاوطار: ص ١٨٤٤ ج ٢

ان کی سخت گرفت کی ہے۔ فرماتے ہیں:

لکھنے کی تعلیم سے جو اندیشہ ہے وہ عورتوں کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ کیونکہ کتنے ایسے مرد ہیں جن کے لیے کتابت وتحریر کا علم ان کے دین واخلاق کے حق میں باعث ضرر ونقصان ہے۔ تو کیا اس اندیشے میں مردوں کو بھی لکھنے کی تعلیم سے روک دیا جائے گا؟

آگے لکھتے ہیں:

کسی عبارت کی تاویل دراصل اس کی تصحیح کا ایک حصہ ہے۔ بایں معنی کہ جب ہم کسی نص کی تاویل کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہم اس کو صحیح مان رہے ہیں۔ گویا شوکانی کو یہ وہم تھا کہ زیر بحث روایت "لَا تُعَلِّمُوْهُنَّ الْكِتَابَةَ" صحیح ہے۔ جبکہ امر واقعہ اس کے خلاف ہے۔ پھر اس تاویل کی کیا ضرورت تھی؟!

علامہ عظیم آبادی رسول اکرم ﷺ کے ارشاد:

((أَلَا تُعَلِّمِيْنَ هَذِهِ رُقْيَةَ النَّمِلَةِ كَمَا عَلَّمْتِيْهَا الْكِتَابَةَ)) [1]

"تم اس کو نملہ کی جھاڑ پھونک کیوں نہیں سکھا دیتیں جس طرح تم اس کو لکھنا سکھا چکی ہو۔"

کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اس حدیث میں خطاب حضرت شفاء بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا سے ہے اور جن کو تعلیم دینے کا حکم ہے وہ حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا ہیں۔

اور "النملة" پہلو میں نکلنے والی سوزش دار پھنسیوں کو کہتے ہیں۔

علامہ عظیم آبادی نے امام ابن تیمیہ اور ابن القیم رحمہم اللہ کے حوالہ سے عورتوں کے لیے کتابت کی تعلیم حاصل کرنے کو جائز قرار دیا ہے اور ملا علی قاری کے اس قول کی سخت گرفت کی ہے کہ سلف میں عورتوں کو لکھنے کی تعلیم دینا جائز رہا ہوگا مگر خلف میں عورتوں کے اندر فساد پھیل جانے کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

عظیم آبادی نے اس قول کی نکیر کی ہے اور امام بخاری رحمہما اللہ کی کتاب "الادب المفرد" کی ایک حدیث سے صحابیات میں لکھائی پڑھائی کے وجود کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد ابن خلکان کی "وفیات" کے حوالہ سے چند مشہور محدثات اور عالمات کا تذکرہ کیا ہے جن میں سے ایک مشہور محدثہ اور کاتبہ فخر النساء شہدہ بنت ابی نصیر اور دوسری عائشہ بنت احمد قرطبیہ تھیں۔

یہ تو بڑے لوگوں کی بڑی باتیں تھیں جنہوں نے عورتوں کے لیے لکھنے کی تعلیم حاصل کرنے کو جائز

---

[1] ابو داؤد: ح ۳۸۸۷

قرار دے کر ان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مگر آج کے دور میں تو پڑھنا اور لکھنا دوسرے لفظوں میں تمام دینی اور دنیاوی تعلیم حاصل کرنا مردوں اور عورتوں دونوں پر فرض ہے۔ اگر ماضی میں دینی علوم کا حصول مردوں پر فرض تھا تو عورتوں پر بھی فرض تھا۔ جن لوگوں نے ان کو اس سے مستثنیٰ کر دیا تھا، ان کے اس عمل کے پیچھے کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں تھی۔ بلکہ انہوں نے اپنے خاص ذوق اور اپنی پسند سے یا اپنی جاہلانہ روایات سے مغلوب ہو کر ایسا کیا تھا۔ اگر فرائض وواجبات میں مرد وعورت دونوں شریک ہیں، اللہ اور رسول کے احکام کے دونوں مخاطب ہیں تو پھر مردوں پر تعلیم کو فرض قرار دینا اور عورتوں پر حرام کر دینا کہاں کی عقلمندی اور کہاں کی دینداری ہے؟ جو لوگ عورتوں میں فساد اور بگاڑ کی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو مردوں میں پھیلے ہوئے فساد اور بگاڑ سے ناواقف ہیں یا ان کے لیے اس فساد اور بگاڑ کو جائز اور عورتوں کے لیے حرام سمجھتے ہیں۔ جبکہ اللہ اور رسول نے اولاد آدم میں اس طرح کی کوئی تفریق نہیں کی ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے مسلمانوں پر طلب علم کو فرض قرار دیا ہے۔ علم میں پڑھنا اور لکھنا دونوں شامل ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ)) [1]

"ہر مسلمان پر علم طلب کرنا فرض ہے۔"

اس حدیث میں "مسلمۃ" مسلمان عورت...... نہیں ہے، اس کے باوجود اس حدیث میں جس علم کا حصول فرض قرار دیا گیا ہے اس کی مخاطب اسی طرح مسلمان عورت بھی ہے جس طرح مسلمان مرد۔ اس لیے کہ دونوں کے فرائض وواجبات ایک ہیں۔ اسی وجہ سے "مسلمہ" کا لفظ نہیں لایا گیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس حدیث کی رو سے ان تمام علوم کا حصول مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں پر فرض ہے جن کا ان کے دینی اور دنیوی صلاح سے تعلق ہے کیونکہ آج زندگی کا دائرہ کافی وسیع ہو چکا ہے۔ انسانی ضروریات بہت وسیع ہو چکی ہیں۔ غیر مسلم قومیں ہر میدان میں نہایت تیزی سے ترقی کر رہی ہیں۔ ایسے حالات میں مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنے وجود کی بقاء اپنی عزت نفس اور اپنے وقار کے تحفظ کے لیے موجودہ دور کے تمام علوم وفنون میں غیر مسلموں سے اگر آگے نہ ہوں تو کم از کم ان کے برابر ضرور ہوں۔ آج ایک محدث، مفسر اور فقیہ کی جتنی ضرورت ہے اس سے کچھ کم ایک پختہ عقیدہ وایمان والے صالح سائنس دان، ڈاکٹر اور انجینئر کی بھی ضرورت ہے تاکہ مسلمان کسی بھی میدان میں دوسروں کے دست نگر اور محتاج نہ ہوں۔

[1] سنن ابن ماجه: المقدمه/ باب فضل العلماء والحث على طلب العلم/ حديث ٢٢٤، صححه الألباني رحمه الله/ في نسخة مكتبة المعارف للنشر والتوازيع با لرياض

(٢٦٧)......لَا تُعَلِّمُوْا نِسَائَكُمْ الْكِتَابَةَ وَلَا تُسْكِنُوْهُنَّ الْعَلَالِيَ، وَقَالَ: خَيْرُ لَهْوِ الْمُؤْمِنِ السِّبَاحَةُ وَخَيْرُ لَهْوِ الْمَرْأَةِ الْمِغْزَلُ۔[1]

''اپنی عورتوں کو لکھنا مت سکھاؤ اور ان کو عالیشان گھروں میں مت آباد کرو۔ اور کہا: مومن کی بہترین تفریح تیراکی ہے اور عورت کی بہترین تفریح سوت کاتنا ہے۔''

یہ روایت پہلی روایت کی ہم شکل ہے اور جھوٹ ہے۔

امام ابن الجوزی فرماتے ہیں:

یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس کی سند میں جوز بن نصر شامل ہے جس کے بارے میں امام ابن حبان کا قول ہے کہ وہ ثقہ راویوں کے نام سے ایسی روایتیں بیان کرتا تھا جن کی روایت انہوں نے نہیں کی ہے۔ امام ابن عدی فرماتے ہیں کہ اس نے ثقہ راویوں کے نام سے باطل روایتیں بیان کی ہیں اور ان سے منسوب کر کے حدیثیں گھڑی بھی ہیں۔[2]

(٢٦٨)......اِتَّقُوْا الدُّنْيَا وَاتَّقُوْا النِّسَاءَ، فَإِنَّ إِبْلِيْسَ طَلَّاعٌ وَرَصَّادٌ وَصَيَّادٌ وَمَا هُوَ بِشَيْءٍ مِنْ فُخُوْخِهِ بِأَوْثَقَ لِصَيْدِهِ فِي الْأَتْقِيَاءِ مِنْ ذُخُوْخِهِ فِي النِّسَاءِ۔

دنیا اور عورتوں سے بچو کیونکہ ابلیس بڑا مہم جو لوگوں کی گھات میں رہنے والا اور ماہر شکاری ہے۔ خدا ترسوں کو اپنا شکار بنانے کے لیے اس نے اپنے جو جال بچھا رکھے ہیں ان میں سب سے مضبوط عورتوں کا جال ہے۔''

یہ ایک موضوع اور من گھڑت عبارت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔

اس کی تخریج حافظ سیوطی نے الجامع الصغیر[3] میں امام شیرویہ بن شہردار دیلمی نے مسند الفردوس[4] میں اور علاؤ الدین علی متقی نے کنز العمال[5] میں اس سند سے کی ہے:

سعید بن سنان سے روایت ہے، وہ ابی الزاہریہ سے روایت کرتے ہیں وہ کثیر بن مرہ سے وہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے اور رسول اللہ ﷺ سے......

---

[1] سنن ابن ماجه: ح٢٢٣-١٨٢ [2] الموضوعات: ص٦٢ج٣ ح:١٢٧٤
[3] الجامع الصغير: ح: ١١٦ [4] مسند الفردوس: ص٤٥ج١
[5] كنز العمال: ح٤٤٤٨١

اس موضوع روایت کے راویوں سعید بن سنان کے بارے میں حافظ ابن حجر تقریب التہذیب[1] میں لکھتے ہیں: وہ متروک تھا اور امام دارقطنی نے اس کو "ھالك" ہلاک ہونے والا قرار دیا ہے[2] کیونکہ وہ جھوٹی روایتیں بیان کرتا تھا۔

رہا اس جھوٹی روایت کا متن تو وہ کسی تبصرے کا محتاج نہیں ہے۔ ابلیس کے اہل کار عورتوں سے کم مکار نہیں ہیں۔ دنیا میں شیطان کے ایجنٹ، بے حیائی اور فحاشی کے اڈے چلانے والے مرد ہیں عورتیں نہیں۔

(۲۶۹)...... أَيُّمَا امْرَأَةٍ خَرَجَتْ مِنْ غَيْرِ أَمْرِ زَوْجِهَا كَانَتْ فِي سَخَطِ اللّٰهِ حَتّٰى تَرْجِعَ إِلَى بَيْتِهَا أَوْ يَرْضَى عَنْهَا

"جو عورت بھی اپنے شوہر کے حکم کے بغیر گھر سے باہر نکلے تو وہ اللہ کے غضب میں رہتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنے گھر واپس آ جائے یا اس کا شوہر اس سے راضی ہو جائے۔"

یہ عبارت حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی روایت حافظ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت[3] نے جو خطیب بغدادی کے لقب سے معروف ہیں، حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ اصفہانی کی سند سے کی ہے۔

ابراہیم بن ہدبہ سے روایت ہے، کہا: ہم سے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے......

حافظ ابونعیم نے ابراہیم بن ہدیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے باطل روایتیں بیان کی ہیں۔ اور مثال میں یہی روایت پیش کی ہے۔ اس کے بارے میں امام یحییٰ بن معین کا یہ قول نقل کیا ہے: ابراہیم کذاب اور خبیث تھا۔ دوسرے تمام ائمہ حدیث نے بھی اس کو جھوٹا اور اس کی مرویات کو باطل قرار دیا ہے۔[4]

(۲۷۰)...... إِنَّ الْمَرْأَةَ إِذَا خَرَجَتْ مِنْ بَيْتِهَا وَزَوْجُهَا كَارِهٌ لِذَٰلِكَ، لَعَنَهَا كُلُّ مَلَكٍ فِي السَّمَاءِ، وَكُلُّ شَيْءٍ مَرَّتْ عَلَيْهِ، غَيْرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ، حَتّٰى تَرْجِعَ۔

"عورت جب اس حالت میں اپنے گھر سے نکلتی ہے کہ اس کے شوہر کو اس کا یہ نکلنا ناپسند ہو تو

---

1. تقریب التھذیب: ص۱۷۷ ترجمہ ۲۳۳۳
2. الضعفاء والمتروکین: ص۱٤٥ ترجمہ ۲۷۰
3. تاریخ بغداد: ص۴۰۰-۲۰۱ ج۶
4. الضعیفہ: ص۸۸-۸۹ ج۳

آسمان میں ہر فرشتہ، اور جنوں اور انسانوں کے سوا جن چیزوں سے اس کا گزر ہوتا ہے اس پر لعنت بھیجتے ہیں جس کا سلسلہ اس کی گھر واپسی تک جاری رہتا ہے۔"

یہ روایت موضوع تو نہیں ہے البتہ بے حد ضعیف اور نا قابل اعتبار ہے۔ اس کی تخریج حافظ طبرانی نے المعجم الاوسط[1] میں سوید بن عبدالعزیز کے طریق سے کی ہے:

سوید بن عبدالعزیز نے محمد بن زید سے روایت کی، انہوں نے عمر بن دینار سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے، انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے......

حافظ طبرانی نے لکھا ہے: عمرو بن دینار سے اس کی روایت صرف محمد بن زید نے کی ہے جن کی روایت میں سوید بن عبدالعزیز منفرد ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی کہتے ہیں:

سوید بن عبدالعزیز بے حد ضعیف ہے۔ امام احمد نے ان کو متروک الحدیث قرار دیا ہے اور امام یحییٰ بن معین اور نسائی کا قول ہے: وہ ثقہ نہیں تھا۔

اس حدیث کو حافظ نور الدین علی بن ابی بکر ہیثمی نے مجمع الزوائد[2] ومنبع الفوائد میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

اس کی روایت طبرانی نے المعجم الاوسط میں کی ہے اور اس کی سند میں سوید بن عبدالعزیز ہے جو متروک تھا۔[3]

واضح رہے کہ واعظین اور خطباء عورتوں کے فرائض اور واجبات بیان کرتے ہوئے ایک اور حدیث کا ذکر کرتے رہتے ہیں جس میں یہ فقرہ آیا ہے:

((وَأَلَّا تَخْرُجَ مِنْ بَيْتِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ، فَإِنْ فَعَلَتْ لَعَنَهَا اللّٰهُ وَمَلَائِكَةُ الْغَضَبِ حَتّٰى تَتُوْبَ أَوْ تُرَاجِعَ وَإِنْ كَانَ ظَالِمًا))

"بیوی پر شوہر کا یہ حق ہے کہ وہ اس کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر نہ نکلے اور اگر وہ ایسا کرے گی تو اس پر اللہ اور غضب کے فرشتوں کی لعنت برستی رہے گی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اس عمل سے توبہ کرلے یا شوہر کو راضی کرنے کے لیے اس سے مراجعت کرے۔ اگرچہ شوہر

---

[1] المعجم الأوسط: ص ٣١٢ ج١ ح ٥١٧
[2] مجمع الزوائد: ص ٣١٣ ج٤
[3] الضعيفة: ص ٥٥٤-٥٥٦ ج١١

ظالم ہی کیوں نہ ہو۔"

تو یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ اس کو حافظ سلیمان بن داؤد طیالسی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور حافظ سیوطی نے اسے الجامع الصغیر میں نقل کیا ہے۔

خطباء اور واعظین کا یہ فرض ہے کہ عورتوں کے فرائض و واجبات بیان کرتے ہوئے انہی احادیث سے استدلال کریں جن کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ہو اور یہ بھی واضح کریں کہ اسلام کی نظر میں مرد کی جنس برتر اور عورت کی جنس کمتر نہیں ہے۔ بلکہ اگر ان کے درمیان فرق مراتب ہے اور ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہے تو ایمان، عمل صالح اور تقوی کی بنیاد پر ہے جنس کی بنیاد پر نہیں۔

(۲۷۱)......إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَا يُعَذِّبُ حِسَانَ الْوَجُوْهِ سُوْدَ الْحِدَقِ۔

"اللہ تعالیٰ حسین چہروں اور سرمگیں آنکھوں والیوں کو عذاب نہیں دے گا۔"

یہ حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اسلام حسن پرستی کی نہیں عبادت الٰہی کی تعلیم دیتا ہے۔ آخرت کی کامیابی ایمان اور حسن عمل پر موقوف ہے حسن صورت پر نہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ وَلَا إِلَى صُوَرِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوْبِكُمْ وَأَشَارَ بِأَصَابِعِهِ إِلَى صَدْرِهِ)) [1]

"بیشک اللہ تمہارے جسموں اور تمہاری شکلوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔ آپ نے اپنی انگلیوں سے اپنے سینے کی طرف اشارہ فرمایا۔"

سورۃ المنافقون میں اللہ اور رسول کے سب سے بڑے (دشمنوں) یعنی منافقین کا وصف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

﴿ وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ط وَإِنْ يَقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ط كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ط يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ط هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ط قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴾ [المنافقون:٤]

"اور جب تم انہیں دیکھو گے تو ان کی جسامت تمہیں بھلی لگے گی اور اگر وہ بولیں گے تو تم ان کی بات سنو گے...... مگر یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں جو دیوار سے لگا دیے گئے ہیں۔ ہر زور

[1] صحیح مسلم: ٢٥٦٤۔ ٦٥٤٢

دار آواز کو اپنے خلاف سمجھتے ہیں، یہ دشمن ہیں اس لیے ان سے ہوشیار رہو ان پر اللہ کی مار، یہ کدھر بہکے، پھرے جاتے ہیں۔"

معلوم ہوا کہ جزا وسزا کے اسباب میں حسن صورت کا کوئی شمار نہیں ہے۔

اس کی تخریج امام دیلمی نے مسند الفردوس میں اس سند سے کی ہے:

ہمیں بجیر بن منصور نے جعفر بن محمد بن حسین ابزی سے، انہوں نے علی بن احمد حروری سے، انہوں نے جعفر بن احمد دقاق سے، انہوں نے عبدالملک بن محمد رقاشی سے، انہوں نے عمرو بن مرزوق سے، انہوں نے شعبہ سے، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے، اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہوئے خبر دی......

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

اس موضوع روایت کے باطل ہونے کی علت محمد رقاشی اور اس سے نیچے کے تمام راوی ہیں جو سب کے سب مجہول ہیں۔ میں نے راویوں کی جرح وتعدیل سے بحث کرنے والی کتابوں میں ان کا کوئی ذکر نہیں پایا۔ صرف رقاشی کا ذکر ملا ہے جو ابن ماجہ کے رجال میں سے ہے اور تہذیب التہذیب[1] میں اس کا مفصل حال مذکور ہے۔ تاریخ بغداد[2] میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ ان کتابوں میں اس کے جو احوال بیان ہوئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ فی نفسہ سچا تھا، لیکن بغداد آمد کے بعد اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی مرویات کی سندوں اور متنوں میں بے تحاشا غلطیاں کرنے لگا تھا۔ یہ روایت شاید اس کے اس دور کی روایت کردہ ہے۔

ابن عراق نے تنزیہ الشریعۃ[3] میں لکھا ہے:

"میرے خیال میں اس حدیث کی مصیبت جعفر بن احمد دقاق ہے۔"

محدث البانی آگے لکھتے ہیں:

مجھے اس حدیث کے باطل ہونے میں ادنیٰ سا شک بھی نہیں ہے کیونکہ یہ اسلامی شریعت کے احکام اور تعلیمات کے خلاف ہے۔[4]

(۲۷۲)......عَلَيْكُمْ بِالْوُجُوهِ الْمِلَاحِ وَالْحَدَقِ السُّوْدِ، فَإِنَّ اللّٰهَ يَسْتَحِيْ أَنْ يُعَذِّبَ وَجْهًا مَلِيْحًا بِالنَّارِ۔

---

[1] تهذيب التهذيب: ص٤١٩- ٤٢١ ج٦
[2] تاريخ بغداد: ص٤٢٥-٤٢٧
[3] تنزيه الشريعة: ص ١٧٤ج١
[4] الضعيفة: ص٢٥٥- ٢٥٦ ج١

"ملیح چہروں اور سرمگیں آنکھوں والیوں کو اختیار کرو۔ کیونکہ اللہ ملیح چہرے کو آگ کا عذاب دینے سے شرمائے گا۔"

یہ روایت بھی جھوٹ ہے اور سابقہ روایت کی بہن ہے۔ حسن پرست صوفیا کی گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

شیخ ابن عراق لکھتے ہیں:

اس کی سند میں حسن بن علی عدوی شامل ہے جس کے بارے میں حافظ سیوطی کا قول ہے کہ اس کا متابع اسی جیسا کذاب لاحق بن حسین ہے۔[1]

ملا علی قاری نے لکھا ہے: اس کو گھڑنے والے خبیث پر اللہ کی لعنت ہو۔[2]

(۲۷۳)......يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ! اتَّقِينَ اللّٰهَ، وَالْتَمِسُوا مَرْضَاةَ أَزْوَاجِكُنَّ، فَإِنَّ الْمَرْأَةَ لَوْ تَعْلَمُ مَا حَقُّ زَوْجِهَا، لَمْ تَزَلْ قَائِمَةً مَا حَضَرَ غَدَاؤُهُ وَعَشَاؤُهُ۔

"اے عورتوں کی جماعت اللہ سے ڈرو اور اپنے شوہروں کی رضا تلاش کرو۔ کیونکہ اگر عورت کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے شوہر کا حق کیا ہے تو اس کے دوپہر اور رات کے کھانوں کے وقت وہ کھڑی رہے گی۔"

یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ اس کی تخریج حافظ بزار نے اپنی مسند البحر الزخار[3] میں اور انہی کی سند سے حافظ ابونعیم نے تاریخ اصفہان[4] میں حکم بن یعلی بن عطاء محاربی کی سند سے کی ہے:

کہا: ہمیں عبدالغفار بن قاسم نے عمرو بن مرہ سے، انہوں نے عبداللہ بن مسلمہ سے، انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے خبر دی......

حافظ بزار نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

"یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صرف اسی سند سے مروی ہے۔"

محدث محمد ناصر الدین البانی کہتے ہیں:

یہ موضوع ہے اور اس کی مصیبت یہی عبدالغفار ہے جس کے بارے میں امام علی بن مدینی اور امام

---

[1] تنزیهه الشریعة: ص ۱۷٤ ج ۱ [2] الضعیفه: ص ۲۵٦ ج ۱

[3] البحر الزخار: ص ۲۹۰۔ ۲۹۱ ج ۲ [4] تاریخ اصفهان: ص ٤۷ ج ۲

ابوداؤد کا قول ہے: وہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔"

اور حکم بن یعلی متروک ہے۔ لیکن اس روایت کے دوسرے فقرے کی شاہد وہ حدیث ہے جو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

((لَوْ تَعْلَمُ الْمَرْأَةُ حَقَّ الزَّوْجِ مَا قَعَدَتْ مَا حَضَرَ غَدَاؤُهُ وَعَشَاؤُهُ حَتَّى يَفْرُغَ فِيهِ))

"اگر عورت کو معلوم ہو جائے کہ شوہر کا کیا حق ہے تو وہ اس کے دوپہر اور رات کے کھانے کی اثناء میں اس کے فارغ ہو جانے کے وقت تک نہیں بیٹھے گی۔"

یہ حدیث بزار اور طبرانی نے فضیلت بن سلیمان نمیری کے طریق سے کی ہے:

فضیل بن سلیمان نمیری نے کہا: ہم سے موسیٰ بن عقبہ نے عبید اللہ بن سلیمان اغر سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......

محدث البانی لکھتے ہیں:

فضیل بن سلیمان نمیری اگرچہ شیخین کے رجال میں سے ہے لیکن جمہور آئمہ حدیث کے نزدیک ضعیف ہے۔ صرف ابن حبان نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے۔ اس وجہ سے امام ذہبی نے الضعفاء [1] میں لکھا ہے: "اس کے اندر کمزوری ہے۔ ابو حاتم وغیرہ کا قول ہے کہ وہ قوی نہیں ہے۔ ابو زرعہ کہتے ہیں کہ ضعیف ہے اور ابن معین کے نزدیک قوی نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر نے التقریب [2] میں لکھا ہے: سچا تھا مگر بڑی غلطیاں کرتا تھا۔

تو اس طرح کے راوی کی روایت کردہ حدیث کسی موضوع حدیث کے لیے قابل استدلال شاہد نہیں بن سکتی۔ [3]

(۲۷٤)......يُسَلِّمُ الرِّجَالُ عَلَى النِّسَاءِ وَلَا يُسَلِّمُ النِّسَاءُ عَلَى الرِّجَالِ۔

"مرد عورتوں کو سلام کریں مگر عورتیں مردوں کو سلام نہ کریں۔"

---

[1] الضعفاء: ص ۵۱۵ ترجمہ ٤٩٥٨ [2] التقریب: ص ۳۸٤، ترجمہ ۵٤۲۷

[3] الضعیفہ: ص ٤٦۔٤٧ ج ۱۳

یہ بھی موضوع ہے اور رسول اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ اس کی تخریج امام ابوبکر احمد بن محمد ابن سنی نے عمل الیوم واللیلۃ [1] میں اور امام ابن حبان نے الضعفاء [2] میں بشر بن عون کے طریق سے کی ہے:

کہا: ہم سے بکار بن تمیم نے مکحول سے اور انہوں نے واثلہ بن اسقع سے مرفوعا روایت کرتے ہوئے بیان کیا......

امام ابن حبان نے یہ حدیث بشر بن عون کے ترجمہ کے ضمن میں نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ بشر کا ایک مجموعۂ حدیث ہے جس میں سو ۱۰۰ حدیثیں شامل ہیں اور سب کی سب موضوع ہیں لہٰذا اس سے استدلال کرنا کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے۔

اسی طرح امام ابن الجوزی نے یہ روایت "العلل المتناهیه" میں نقل کی ہے اور لکھا ہے: یہ صحیح نہیں ہے۔ [3]

حافظ ابن حجر نے فتح الباری [4] میں اس روایت کو ابونعیم سے منسوب کیا ہے۔ ان کی بھی ایک کتاب کا نام "عمل یوم ولیلة" ہے۔ پھر لکھا ہے: اس کی سند بے حد کمزور۔ واہی۔ ہے۔ اسی طرح کی ایک روایت عمرو بن حدیث سے بھی مروی ہے جو موقوف ہے اور اس کی سند عمدہ ہے۔"

حافظ ابن حجر نے یہ بات صحیح بخاری کے باب: تسلیم الرجال علی النساء والنساء علی الرجال۔ مردوں کے عورتوں کو سلام کرنے اور عورتوں کے مردوں کو سلام کرنے کا باب"...... کے تحت لکھی ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ: امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب اس روایت کیا رد میں قائم کیا ہے جس کی تخریج عبدالرزاق نے معمر سے اور انہوں نے یحییٰ بن کثیر سے کی ہے۔ جس کے الفاظ ہیں:

((بَلَغَنِیْ اَنَّهُ یُکْرَهُ اَنْ یُسَلِّمَ الرِّجَالُ عَلَی النِّسَاءِ وَالنِّسَاءُ عَلَی الرِّجَالِ))

"مجھے خبر ملی ہے کہ مردوں کا عورتوں کو سلام کرنا اور عورتوں کا مردوں کو سلام کرنا مکروہ ہے۔"

مگر حافظ ابن حجر نے اس روایت کو مقطوع اور معضل قرار دیا ہے۔ مزید یہ بھی لکھا ہے کہ ایک حدیث حضرت اسماء بنت یزید سے بھی مروی ہے جس کو امام ترمذی نے حسن قرار دیا ہے۔ جس کے الفاظ ہیں: مَرَّ عَلَیْنَا النَّبِیُّ ﷺ فَسَلَّمَ عَلَیْنَا...... نبی کریم ﷺ ہمارے پاس سے گزرے اور ہم کو سلام کیا" [5]

---

[1] عمل الیوم واللیلۃ: ص ۲۴۲
[2] الضعفاء: ص ۱۹۰ ج ۱
[3] العلل المتناهیة: ص ۲۳۴ ج ۲
[4] فتح الباری: ص ۲۷۳۱ ج ۳
[5] جامع ترمذی: ح ۲۶۹۷

لیکن یہ حدیث چونکہ امام بخاری کی شرط پر پوری نہیں اترتی اس لیے انہوں نے اپنی صحیح میں اس کو نقل نہیں کیا۔ اسی پر اکتفاء کیا جو ان کی شرط کے مطابق تھی۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے آگے لکھا ہے کہ اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو مردوں کا عورتوں کو سلام کرنا اور عورتوں کا مردوں کو سلام کرنا جائز ہے اور دلیل میں صحیح مسلم کی وہ حدیث پیش کی ہے جس میں حضرت ام ھانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں عام الفتح کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ کو غسل کرتے ہوئے پایا اور میں نے آپ کو سلام کہا۔[1]

اور امام بخاری نے "الادب المفرد"[2] میں حسن بصری سے صحیح سند کے ساتھ یہ حدیث روایت کی ہے کہ "عورتیں مردوں کو سلام کرتی تھیں۔"

ان تمام حدیثوں سے زیر بحث روایت کے متن کی نکارت واضح ہو رہی ہے:

(۲۷۵)...... إِذَا قَالَتِ الْمَرْأَةُ لِزَوْجِهَا: وَاللّٰهِ مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ، فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهَا

"جب عورت اپنے شوہر سے یہ کہے: اللہ کی قسم میں نے تمہاری جانب سے کبھی کوئی خیر و بھلائی نہیں دیکھی تو اس کے اعمال اکارت چلے جاتے ہیں۔"

یہ روایت بھی صحیح نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج امام ابن عدی نے الکامل[3] میں سلام بن رزین کی سند سے کی ہے۔

اس نے کہا: عمرو بن سلیمان سے روایت ہے، وہ یوسف بن ابراہیم تمیمی سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

امام عبداللہ بن عدی نے یہ حدیث یوسف بن ابراہیم کے ترجمہ کے ضمن میں نقل کی ہے اور اس کے بارے میں امام بخاری کا یہ قول نقل کیا ہے: صاحب عجائب...... تھا

امام بخاری کی یہ جرح بہت شدید ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی کہتے ہیں:

---

[1] صحیح مسلم: ح۱٦٦۹ — [2] الادب المفرد: ح۱۰۷۸

[3] الکامل: ص۱٦۷ ج۷

۔ عمرو بن سلیمان کے بارے میں "میزان الاعتدال" میں ہے: "لَمْ اَعْرِفْهُ" مجھے اس کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں ہے۔ پھر ذہبی نے اس کی روایت کردہ جو حدیثیں نقل کی ہیں ان میں سے ایک یہی زیر بحث روایت بھی ہے جس کو انہوں نے منکر بتایا ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ نام محرف۔ بدلا ہوا۔ نہ ہو اور صحیح نام: عمر بن سلیم ہو جس کا لقب "باہلی" ہے۔ کیونکہ ائمہ حدیث نے یوسف بن ابراہیم سے روایت کرنے والوں کے ضمن میں عمر بن سلیم باہلی کا نام ہی لکھا ہے جو سچا تو تھا، مگر صاحب اوہام تھا۔ جب کہ التقریب میں ہے:[1] اور سلام بن رزین کے بارے میں امام ذہبی نے لکھا ہے: غیر معروف تھا اور اس کی روایت کردہ حدیث باطل ہے۔[2]

(٢٧٦)......إِنَّ الْفُسَّاقَ هُمْ أَهْلُ النَّارِ، قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللهِ وَمَا الْفُسَّاقُ؟ قَالَ: النِّسَاءُ، قَالَ رَجُلٌ: يَارَسُوْلَ اللهِ أَلَيْسَ أُمَّهَاتُنَا وَأَخَوَاتُنَا وَأَزْوَاجُنَا، قَالَ: بَلٰى، وَلٰكِنْ إِذَا أُعْطِيْنَ لَمْ يَشْكُرْنَ وَإِذَا ابْتُلِيْنَ لَمْ يَصْبِرْنَ۔

"بیشک فساق ہی جہنمی ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اور فساق کون ہیں؟ فرمایا عورتیں۔ ایک صحابی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا عورتیں ہماری مائیں، بہنیں اور بیویاں نہیں ہیں؟ فرمایا: کیوں نہیں۔ لیکن جب ان کو عطا کیا جاتا ہے تو شکر نہیں کرتیں اور جب آزمائی جاتی ہیں تو صبر نہیں کرتیں۔"

یہ روایت صحیح نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج امام حاکم نے اس سند سے کی ہے:

ہم کو ابراہیم بن عصمۃ عدل نے خبر دی، کہا: ہم سے سری بن خزیمہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے مسلم بن ابراہیم نے بیان کیا کہا: ہم سے ہشام نے یحییٰ بن ابی کثیر سے، انہوں نے ابو راشد حبرانی سے، اور انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن شبل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔[3]

اس سند میں سری بن خزیمہ ایک نامعلوم شخص ہے جس کا کتب رجال میں کوئی ذکر نہیں[4] اور یحییٰ بن

---

[1] التقریب: ص۳۵۱ ترجمہ ۴۹۱۱
[2] الضعیفہ: ص۲۷۱ ج۲
[3] المستدرک: ص۱۹۰ ج ۸۸۲۳

ابی کثیر مدلس [1] تھے۔ انہوں نے اس کی روایت ''عن'' سے کی ہے اور مدلس کا عنعنہ مردود ہے۔

رہا اس روایت کا متن تو وہ حد درجہ منکر ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے عورتوں کے لیے ''فساق'' کا لفظ کیسے نکل سکتا ہے، نعوذ باللہ۔ آپ ان سب کو جہنمی کیونکر قرار دے سکتے ہیں جبکہ صحابیات رضوان اللہ علیہن نے آغاز دعوت سے لے کر آپ کی وفات تک قدم قدم پر آپ کا ساتھ دیا اور ان کے حق میں یہ بات ''جب ان کو دیا جاتا ہے اور عطا کیا جاتا ہے تو شکر نہیں کرتیں اور جب آزمائی جاتی ہیں تو صبر نہیں کرتیں۔'' کس قدر خلاف واقعہ ہے۔ اسلام کی راہ میں فقر و محتاجی کا سامنا جس طرح صحابہ نے کیا بالکل اسی طرح صحابیات نے بھی کیا تھا۔ جو کچھ اللہ کی نعمتیں ان پر نازل ہوتی رہیں ان پر شاکر و قانع رہیں۔ جس طرح ابتلاء و آزمائش میں صحابہ کرام ثابت قدم رہے ٹھیک اسی طرح صحابیات بھی ثابت قدم رہیں۔ ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ کسی صحابیہ نے اسلام کی راہ میں شدید تعذیب سے تنگ آکر اپنی زبان سے کلمہ کفر نکال دیا ہو یا اسلام سے پھر گئی ہو۔

اوپر عورتوں سے متعلق جو جھوٹی روایات نقل کی گئی ہیں ان سے عورتوں کے بارے میں جو عمومی تصور پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ عورت بحیثیت جنس کے فتنہ و فساد کی جڑ، ناقابل اعتماد بد دین، بد اخلاق، بے عقل اور بے صبر مخلوق کا نام ہے۔ کتاب و سنت میں دونوں کے دائرہ کار اور میدان عمل کے الگ الگ ہونے کے سوا ان کے درمیان کوئی تفریق نہ کیے جانے کے باوجود ان کے درمیان وہی امتیازی ذہنیت کارفرما ہے جو ذہنیت غیر مسلموں میں کارفرما تھی اور آج بھی کارفرما ہے۔

اولاً تو اسلام میں شرف و فضیلت کے میدان میں وجہ برتری...... ایمان اور عمل صالح کو قرار دیا گیا ہے۔ چاہے اس سے مرد موصوف ہو یا عورت۔

دوم حقوق و واجبات کے حوالہ سے ماں کو جو عورت ہے باپ پر جو مرد ہے فضیلت دی گئی ہے۔ صحیح احادیث میں تو بصراحت ماں کو باپ کے مقابلے میں تین گناہ زیادہ حسن سلوک کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ [2] جس سے مرد پر عورت کی فضیلت کا ثبوت ملتا ہے۔

اور قرآن پاک میں متعدد مقامات پر والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ [3] عجیب

---

[1] التقریب ص٥٢٥ ترجمہ ٧٦٣٢۔ الضعیفہ ص٥٣ ج١٤

[2] صحیح بخاری ح٥٩٧١ ۔ صحیح مسلم ح٢٥٤٨۔ ٦٥٠١۔

[3] الاسراء ٢٣۔٢٤: العنکبوت: ٨ لقمان: ١٢۔ الاحقاف: ١٥۔

بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قربانیوں کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں تو باپ کو نظر انداز کر دیا ہے[1] جو اس بات کی دلیل ہے کہ ماں کی قربانیوں کے مقابلے میں باپ کی قربانیاں ہیچ ہیں۔

رہی عورت بمعنی بیوی تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الروم میں بیوی کی تخلیق کو اپنی ربوبیت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے۔[2] یوں تو کائنات کی ہر شیء اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر دلالت کرتی ہے اور اس کی عظیم قدرت، اس کی حاکمیت، اس کے تصرف و تدبیر کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ خود کسی چیز کو اپنی نشانی قرار دے تو اس سے اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۝ ﴾ [الروم:۲۱]

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو۔ اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ درحقیقت اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے ''تخلیق ازواج'' کا پہلا مقصد یہ بتایا ہے کہ مرد اپنی بیویوں کے پاس سکون و اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ کاروبار حیات میں مصروف رہنے کے بعد جب گھر آتے ہیں تو بیوی کے پہلو میں ان کو سکون، اطمینان اور راحت ملتی ہے۔

آگے فرمایا: ''وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً'' اس نے تمہارے درمیان مودت پیدا کر دی۔ مودت ایسی محبت کو کہتے ہیں جو دو طرفہ اور متبادل ہو۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہوں۔ ''وَرَحْمَةً'' اور اس نے تمہارے درمیان رحمت پیدا کر دی۔ یعنی شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے لیے رحیم و شفیق اور ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔

اس آیت مبارکہ کو سامنے رکھیے اور پھر ان ''تصورات'' پر غور کیجیے جو مردوں نے عورتوں سے متعلق عمومی طور پر اور بیویوں سے متعلق خصوصی طور پر اپنے ذہنوں میں قائم کر رکھے ہیں کہ وہ ہر فساد کی جڑ ہیں۔ کیا ان تصورات کے ہوتے ہوئے مردوں کو اپنی بیویوں کے پہلو میں سکون و اطمینان قلب مل سکتا ہے۔ جس ''مخلوق'' کے بارے میں یہ عقیدہ اور خیال ہو کہ وہ نا قابل اعتماد ہے، سراپا شر ہے، امین و راز دار بنائے جانے کے قابل نہیں ہے۔ کیا وہ سکون دے سکتی ہے؟ اس سے محبت کی توقع کی جا سکتی ہے؟ اور

---

[1] دیکھئے سورہ: لقمان: ۱٤۔ الاحقاف: ۱۵ [2] سورۃ الروم: ۲۱

یہ گمان ہو سکتا ہے کہ وہ مہربان اور شفیق ہو سکتی ہے۔

قرآن پاک کی اس آیت مبارکہ کو سامنے رکھیے اور پھر رسول اکرم فداہ ابی وامی ﷺ کی خدمت میں پہلی بار حضرت جبریل امین کی آمد اور قرآن پاک کی پہلی آیات کے نزول، آپ کی لرزاں وترساں گھر واپسی اور ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے یہ فرمانا: خدیجہ! مجھے اپنی زندگی کا ڈر ہے۔ ان تمام واقعات پر ترتیب وار غور کیجیے اور ام المومنین رضی اللہ عنہا کے جواب: "کَلَّا" ہرگز نہیں۔ آپ کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں لاحق ہے...... پر ٹھہر کر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات پاک کا یہ حیرت ناک اور غیر متوقع واقعہ اور ام المومنین کا عظیم موقف مذکورہ آیت مبارکہ کی بہترین تفسیر ہے۔ اس کے بعد رسول رحمت ﷺ نے دوسری ازواج مطہرات کے ساتھ اپنے روز وشب گزارے اور ان کے ساتھ آپ کا جو عظیم برتاؤ رہا اور انہوں نے بھی آپ ﷺ کے ساتھ جس مودت ورحمت کا اظہار کیا اور دین کی راہ میں جس مکمل تعاون کا مظاہرہ کیا وہ سب اللہ تعالیٰ کے مذکورہ قول کی عملی تفسیر تھا۔

اللہ تعالیٰ نے صرف بیوی کے اوصاف بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ آپ نے مسلمان شوہروں کو اپنی بیویوں کے ساتھ رہنے کے آداب بھی سکھائے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا۟ ٱلنِّسَآءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا۟ بِبَعْضِ مَآ ءَاتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّآ أَن يَأْتِينَ بِفَـٰحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ ۚ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا۟ شَيْـًٔا وَيَجْعَلَ ٱللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝ ﴾ [النساء: ١٩]

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو۔ اور نہ یہ حلال ہے کہ انہیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انہیں دے چکے ہو۔ الا یہ کہ وہ کسی صریح بے چلنی کی مرتکب ہوں۔ اور ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ پس اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز جو تمہیں ناپسند ہو مگر اللہ تعالیٰ اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔"

اس آیت میں صرف بعض معاشرتی احکام اور آداب نہیں بیان کیے گئے بلکہ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں مسلمان مرد اپنے کردار کو دیکھ سکتے ہیں۔

کفاءت کا مسئلہ

(۲۷۷)......اَلْاَحْرَارُ مِنْ اَهْلِ التَّوْحِيْدِ كُلُّهُمْ أَكْفَاءُ إِلَّا أَرْبَعَةً: اَلْمَوْلَى وَالْحَجَّامُ وَالنَّسَّاجُ، وَالْبَقَّالُ

''اہل توحید کے سب آزاد لوگ ایک دوسرے کے کفو ہیں، سوائے چار کے: غلام، نائی، پارچہ باف اور سبزی فروش۔''

یہ حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج ربیع بن حبیب ازدی بصری نے اپنی مسند[1] یا الجامع الصحیح میں کی ہے۔

ربیع بن حبیب ازدی بصری کا تعلق خوارج کے اباضیہ فرقے سے تھا۔ اس فرقے کا نام اباضیہ عبداللہ بن اباض کی طرف نسبت سے پڑا ہے جس نے آخری اموی خلیفہ: مروان بن محمد کے زمانے میں خروج کیا تھا۔

اباضیہ فرقے کا عقیدہ ہے کہ ''اہل قبلہ'' سے تعلق رکھنے والے اس کے مخالفین کافر تو ہیں، مگر مشرک نہیں ہیں، ان کے ساتھ شادی بیاہ جائز ہے۔ ان کی وراثت کا مال بھی حلال ہے اور ان کے ساتھ جنگ کی صورت میں ان سے حاصل ہونے والا مال غنیمت حلال ہے۔ خفیہ طور پر ان کو قتل کرنا یا ان کو غلام اور لونڈی بنانا حرام ہے۔ ایسا صرف حالت جنگ اور حجت قائم ہو جانے کے بعد حلال ہے۔ اسی طرح اباضیہ اپنے مخالف مسلمانوں کے علاقوں اور شہروں کو ''دار التوحید'' مانتا ہے۔ سوائے سلطان کے کیمپ کے جو دار بغی و عدوان ہے۔[2]

ربیع بن حبیب ازدی خود غیر معروف ہے۔ اس کے احوال نہ تو اہل سنت کی کتابوں میں ملتے ہیں اور نہ اباضیوں کی کتابوں میں۔ اس کا ذکر صرف اس کی کتاب مسند یا الجامع الصحیح کے شارح عبداللہ بن حمید سالمی عمانی اباضی نے کیا ہے اور اس کو ان القاب سے نوازا ہے: الامام الکامل والہمام الفاضل الشہیر بین الاواخر والاوائل۔ اور چونکہ اس روایت کی کوئی سند بیان نہیں ہوئی ہے اس لیے محض اس وجہ سے قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ اپنی کتاب میں اس کو نقل کرنے والا مذکورہ القاب کا حامل تھا۔ کوئی بھی انسان جس کو جو لقب دینا چاہے دے سکتا ہے۔ اعتبار تو اس کا ہے کہ آیا وہ اس لقب کا مستحق بھی ہے یا نہیں؟ مزید یہ کہ کسی بڑے سے عالم فاضل یا امام کی کوئی بات اس وجہ سے قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ اس کا کہنے

[1] مسند ربیع بن حبیب: ص۱۳۸ ح۵۱۳ [2] الملل والنحل: ص۱۰۷

والا علم و معرفت کے بڑے اعلیٰ درجے پر فائز تھا۔ بلکہ ہر کسی کی بات دلیل کی بنیاد پر قابل قبول ہوتی ہے۔ رہی حدیث...... تو وہ اس وقت قابل ہو گی جب اس کی نسبت رسول اکرم ﷺ سے صحیح سند سے ثابت ہو۔ اس کا متن اللہ کی کتاب اور کسی صحیح حدیث کے خلاف نہ ہو۔ مذکورہ روایت کی جہاں کوئی سند نہیں ہے وہیں کتاب اللہ اور صحیح احادیث کے خلاف بھی ہے۔

شادی بیاہ کے مسئلہ میں جس کفاءت کو فقہاء نے شرط قرار دیا ہے، کتاب و سنت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

نسب میں برابری اور کفاءت کے مسئلے میں کوئی بھی حدیث ثابت نہیں ہے۔ رہی وہ حدیث جس کی تخریج حافظ بزار نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی سند سے کی ہے، اور جس کے الفاظ ہیں:

((الْعَرَبُ بَعْضُهُمْ أَكْفَاءُ بَعْضٍ وَالْمَوَالِي بَعْضُهُمْ أَكْفَاءُ بَعْضٍ)) [1]

''عرب ایک دوسرے کے مساوی اور کفو ہیں اور غیر عرب ایک دوسرے کے مساوی اور کفو ہیں۔'' وہ حدیث ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔

اس کے برعکس ایسی متعدد صحیح احادیث کتب حدیث میں مروی ہیں جن سے صرف دین اور اخلاق میں کفاءت اور مساوات کا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَجَمَالِهَا وَلِدِينِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّينِ تَرِبَتْ يَدَاكَ)) [2]

''عورت سے نکاح چار چیزوں کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے: اس کا مال، اس کا خاندانی شرف، اس کا حسن و جمال اور اس کا دین دیکھ کر۔ تو دین والی کو پا کر سرخرو ہو جا۔ تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔''

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے لوگوں کی عادات کا ذکر فرمایا ہے اور ان چیزوں کا ذکر فرمایا ہے جن کا عام طور پر لڑکیوں سے نکاح کے موقع پر اعتبار کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ لڑکی کا انتخاب اس کے مال کو

---

[1] نیل الاوطار: ص۱۳۱۸ ج۲

[2] صحیح البخاری: ح۵۰۹۰۔ صحیح مسلم: ح۱۴۶۶۔ جامع ترمذی: ح۱۰۸۶

دیکھ کر کرتے ہیں، دوسرے اس کے حسب نسب اور خاندانی شرف کو دیکھتے ہیں۔ کچھ لوگ کسی لڑکی یا عورت سے اس کی خوبصورتی اور حسن کی بنیاد پر شادی کرتے ہیں۔ جبکہ بعض لوگوں کے پیش نظر لڑکی اور عورت کی دینداری ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے کسی لڑکی یا عورت میں اس چوتھی اور آخری صفت کو نکاح کے لیے وجہ ترجیح قرار دیا ہے۔

حضرت ابو حاتم مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا أَتَاكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِينَهُ وَخُلُقَهُ فَانْكِحُوهُ، إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ)) [1]

''جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص آئے جس کے دین و اخلاق سے تم راضی ہو تو اس سے نکاح کرو۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں بہت بڑا فتنہ برپا ہو جائے گا۔''

اس حدیث میں رسول اکرم ﷺ نے لڑکیوں کے لیے دیندار اور بااخلاق مردوں کے انتخاب کی ترغیب دی ہے۔ اس طرح یہ واضح فرما دیا ہے کہ نکاح میں جس کفاءت کا اعتبار ہے وہ حسب نسب اور مال کی کثرت اور حسن و جمال میں مساوات اور برابری نہیں بلکہ دین و اخلاق میں کفاءت و برابری ہے۔ اگر حسب و نسب، مال اور حسن و جمال کی شرطوں کے مفقود ہونے کی وجہ سے لڑکوں کو رشتہ دینے سے انکار کیا جاتا ہے تو لڑکیاں نکاح کے بغیر بیٹھی رہ جائیں گی اور معاشرے میں فتنہ و فساد برپا ہوگا۔ بے حیائی اور بدکاری کو ہوا ملے گی۔

یہ تو رسول اکرم ﷺ کے ارشادات تھے۔ عملی طور پر رسول اکرم ﷺ نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے کر دیا تھا، جس کا ذکر سورۃ الاحزاب میں آیا ہے۔ حالانکہ دونوں کے حسب نسب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کہاں ایک غلام اور کہاں ایک سرداروں کی بیٹی قریش زادی اور رسول اکرم ﷺ کی حقیقی پھوپھی زاد بہن۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی شادی حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے کر دی تھی جو قریش زادی تھیں۔ [2]

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ نے جو قرشی

---

[1] جامع ترمذی: ح ۱۰۸۴، ۱۰۸۵ [2] صحیح مسلم: ح ۱۴۸۰۔ ۳۷۱۳، ۳۷۱۴

تھے اور غزوہ بدر میں شرکت کا شرف حاصل کر چکے تھے، اپنے آزاد کردہ غلام حضرت سالم رضی اللہ عنہ کا نکاح اپنی بھتیجی حضرت ہند بنت ولید بن عتبہ رضی اللہ عنہا سے کر دیا تھا۔[1]

تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان قولی اور فعلی حدیثوں کے بعد نکاح کے لیے حسب نسب اور خاندانی شرافت میں برابری اور کفاءت کو شرط قرار دینا، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے؟

اگر فقہاء یہ کہتے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو رشتۂ ازدواج میں باندھنے سے قبل ان کے درمیان مزاج میں ہم آہنگی، اجتماعی اور مالی امور میں توافق وغیرہ کی رعایت کی جائے تاکہ شادی کامیاب ہو اور ان امور کو بھی نکاح کے صحیح ہونے کی شرط نہ قرار دی جائے تو یہ بات کسی حد تک قابل قبول ہو سکتی تھی۔

مگر یہ ایک منکر اور اسلامی روح کے خلاف بات ہے کہ مسلمان لڑکے اور لڑکی میں نکاح کے صحیح ہونے کی شرط حسب نسب، خاندانی شرافت اور مال و دولت میں برابری کو قرار دیا جائے۔ جس شرط کا اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں کوئی ذکر نہیں ہے۔

قرآن پاک میں تو یہاں تک صراحت ہے:

﴿ وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ ۚ إِن يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴾ [النور:٣٢]

"اور تم لوگ اپنے میں سے مجرد لوگوں کا اور اپنے میں سے صالح غلاموں اور لونڈیوں کا نکاح کر دو۔ اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو خوشحال کر دے گا۔ اور اللہ بڑی وسعت والا اور بڑے علم والا ہے۔"

اس آیت مبارکہ میں غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کا نکاح کر دینے کی تلقین کی گئی ہے اور نکاح کی راہ میں غربت حائل ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ غربت کو خوشحالی میں بدل دے گا۔ لہٰذا غربت اور تنگ دستی کو نکاح نہ کرنے کا بہانہ بنانے سے گریز کیا جائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((ثَلَاثَةٌ حَقٌّ عَلَى اللّٰهِ عَوْنُهُمْ: اَلْمُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُكَاتَبُ الَّذِيْ يُرِيْدُ الْأَدَاءَ وَالنَّاكِحُ الَّذِيْ يُرِيْدُ الْعَفَافَ))

---

[1] صحیح بخاری: ج۸۸۰۵

"تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن کی مدد اللہ نے اپنے ذمہ لے لی ہے: اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا، وہ غلام جس نے اپنی آزادی کی قیمت ادا کرنے کے لیے اپنے مالک سے معاہدہ کر رکھا ہو اور وہ نکاح کرنے والا جو پاکدامن رہنا چاہتا ہے۔"[1]

اسلام کی نگاہ میں ذات پات کا تصور:

بات صرف شادی بیاہ میں کفاءت اور برابری تک محدود نہیں ہے بلکہ مسلمانوں میں ذات پات کے تصور نے نہایت سنگین اور گھناونی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ بیماری صرف عوام کے اندر نہیں ہے بلکہ اس میں علماء اور پیشوایان امت بھی مبتلا ہیں۔ حالانکہ ذات و برادری اور قبیلہ و خاندان کا تعصب، کسی قبیلے، خاندان، کسی نسل اور قوم کی کسی دوسرے قبیلے، خاندان، نسل اور قوم پر برتری اور تفوق کا تصور اسلامی عقیدہ نہیں بلکہ جاہلی تصور اور عقیدہ ہے جو اسلامی روح اور مزاج کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَفَخْرَهَا بِالْآبَاءِ، مُؤْمِنٌ تَقِيٌّ وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ، أَنْتُمْ بَنُوْ آدَمَ وَآدَمُ مِنَ التُّرَابِ، لَيَدَعَنَّ رِجَالٌ فَخْرَهُمْ بِأَقْوَامٍ، إِنَّمَا هُمْ فَحْمٌ مِنْ فَحْمِ جَهَنَّمَ أَوْ لَيَكُوْنَنَّ أَهْوَنَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الْجِعْلَانِ الَّتِيْ تَدْفَعُ بِأَنْفِهَا النَّتْنَ))[2]

"درحقیقت اللہ نے تم سے جاہلیت کے غرور و نخوت اور آباء و اجداد پر اس کے تکبر کو دور کر دیا ہے۔ لوگوں کی صرف دو ہی قسمیں ہیں: خدا ترس مومن یا فاجر و بدبخت۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔ لوگ ان قوموں پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو جہنم کا ایندھن بن چکے ہیں۔ یا پھر وہ اللہ کے نزدیک اس کیڑے سے زیادہ ذلیل ہوں جو اپنی ناک سے گندگی کو دفع کرتا ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن لوگوں میں خطبہ دیا اور فرمایا:

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَاظُمَهَا بِآبَائِهَا، فَالنَّاسُ رَجُلَانِ، رَجُلٌ بَرٌّ تَقِيٌّ كَرِيْمٌ عَلَى اللّٰهِ، وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ هَيِّنٌ عَلَى اللّٰهِ، وَالنَّاسُ بَنُوْ آدَمَ وَخَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ مِنَ التُّرَابِ، قَالَ

[1] جامع ترمذی: ح ۱۶۵۵۔ سنن ابن ماجہ: ح ۲۵۱۸ [2] سنن ابوداؤد: ح ۵۱۱۶

اللّٰهُ: ﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴾)) [1]

''اے لوگو! بیشک اللہ نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور آباو اجداد پر اس کے فخر کو دور کر دیا ہے۔ لوگ دو طرح کے ہیں، ایک نیک، خداترس اور اللہ کے نزدیک باعزت انسان۔ دوسرا بدکار نامراد اور اللہ کے نزدیک ذلیل۔ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔ اللہ کا ارشاد ہے: اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے باعزت وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو۔''

حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے وسط میں رسول اکرم ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، إِلَّا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى أَعْجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ، وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ وَلَا أَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوَى، أَبَلَّغْتُ؟ قَالُوا بَلَّغَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ......)) [2]

''لوگو! خبر رہو، تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی برتری نہیں حاصل ہے مگر صرف تقویٰ کی بنیاد پر۔ کیا میں نے تم کو پیغام پہنچا دیا؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ نے پیغام پہنچا دیا۔''

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مومن کو کسی مومن پر کوئی برتری اور فضیلت حاصل ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ عربی ہے یا غیر عربی۔ گورا ہے یا کالا، کسی اعلیٰ برادری یا ذات سے اس کا تعلق ہے یا کسی نچلی اور پست برادری سے بلکہ لوگوں میں فضیلت اور برتری کا معیار صرف یہ ہے کہ کون ایمان، عمل صالح اور تقویٰ میں بڑھا ہوا ہے۔

اسی حجۃ الوداع میں رسول اکرم ﷺ نے طبقاتی اونچ نیچ پر ایک نہایت کاری ضرب یہ لگائی کہ عرفات سے مزدلفہ جاتے ہوئے اپنے ساتھ اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید کے بیٹے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ

[1] جامع ترمذی: ح ۳۲۷۰ [2] مسند امام احمد: ح ۲۳۸۸۵

کو اپنی اونٹنی پر سوار فرمایا اور مزدلفہ سے منیٰ جاتے ہوئے اپنے چچا زاد بھائی حضرت فضل بن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہما کو اپنے ساتھ سوار فرمایا۔[1]

ذی الحجہ ۱۰ ہجری کے آخری ایام میں رسول اکرم ﷺ حجۃ الوداع سے مدینہ منورہ واپس ہوئے۔ صفر ۱۱ ہجری کے آخری ایام میں بلقاء اور فلسطین میں رومیوں پر لشکر کشی کی غرض سے ایک فوج تشکیل دی جس میں مہاجرین اور انصار کے نہایت سر برآوردہ صحابہ شامل تھے۔ اس فوج کا قائد اور سپہ سالار حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو بنایا جن کی عمر اس وقت صرف ۱۸ برس کی تھی۔ اس وقت جب بعض لوگوں نے ان کی امارت پر اعتراض کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اگر تم اس کی امارت اور قیادت پر معترض ہو تو اس سے قبل تم لوگ اس کے باپ کی امارت پر بھی طعنہ زن کر چکے ہو۔ حالانکہ اللہ کی قسم وہ امارت کے مستحق تھے اور میرے نزدیک محبوب ترین لوگوں میں شامل تھے۔ یہ اسامہ ان کے بعد لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔[2]

اسی صحیح بخاری میں خود حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مجھے اور حسن ابن علی رضی اللہ عنہم کو ایک ساتھ پکڑ کر فرماتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّھُمَا فَاَحِبَّھُمَا))[3]

"اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما۔"

غرضیکہ اسلام میں طبقاتی اونچ نیچ، قبائلی، نسلی اور خاندانی بنیادوں پر لوگوں میں تفریق کرنا نہایت مبغوض اور ناپسندیدہ عمل ہے جو اس کی روح اور تعلیمات کے منافی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی قرار دیا ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ [الحجرات: ۱۰]

"مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔"

﴿ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ﴾ [التوبہ: ۷۱]

"اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔"

اولیاء ولی کی جمع ہے اور ولی حقیقی اور قلبی دوست کو کہتے ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم: ح ۱۲۱۸۔ ۲۹۵۰۔ البدایہ والنہایہ ص ۲۶۰ ج ۴۔ سیر اعلام النبلاء: ص ۱۰۸ ج ۴

[2] صحیح بخاری: ح ۴۴۶۹ [3] صحیح بخاری: ح ۳۷۳۵

قرآن و حدیث کی مذکورہ وضاحتوں کی روشنی میں پورے یقین قلب کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ذات پات، قبیلہ، خاندان اور نسل وقوم، اسی طرح زبان اور رنگ کی بنیاد پر لوگوں میں تفریق کرنا اور ایک کو دوسرے سے برتر یا کمتر قرار دینا اسلام کی روح اور مزاج کے منافی ہے۔ لہٰذا مناقب وفضائل کی کتابوں میں متداول وہ روایات جن میں مذکورہ بنیادوں پر باہمی فخر و مباہات کی دعوت دی گئی ہے، یا اس کی تائید کی گئی ہے سب جھوٹ ہیں۔ رسول اکرم ﷺ سے ان کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا اپنے عربی ہونے پر فخر کرنا اور لوگوں کو یہ دعوت دینا کہ وہ آپ کے عربی ہونے کی وجہ سے محبت کریں قرآنی تعلیمات اور آپ کی سیرت پاک اور آپ کی عالمی دعوت کے منافی ہے۔

(۲۷۸) إِنَّ قُرَيْشًا أُعْطِيَتْ مَا لَمْ يُعْطَ النَّاسُ ، أُعْطُوْا مَا مَطَرَتِ السَّمَاءُ وَمَا جَرَتْ بِهِ الْأَنْهَارُ وَمَا سَالَتْ بِهِ السُّيُوْلُ

''بیشک قریش کو وہ کچھ عطا کیا گیا ہے جو دوسرے لوگوں کو عطا نہیں کیا گیا۔ ان کو وہ چیز دی گئی ہے جس کی وجہ سے آسمان پانی برساتا ہے، جس سے نہریں جاری ہیں اور سیلاب کا پانی رواں دواں رہتا ہے۔''

یہ حدیث صحیح نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج حافظ ابونعیم نے معرفۃ الصحابہ[1] میں حسن بن سفیان کی سند سے کی ہے:

حسن بن سفیان سے روایت ہے، کہا: ہم سے شباب عصفری نے بیان کیا، کہا: ہم سے یحییٰ بن عبدالرحمٰن نے، محمد بن حرب خولانی سے، انہوں نے سعید بن سنان سے، انہوں نے ابوزاھریہ سے، انہوں نے ح لیس رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......

تو یہ سند موضوع ہے جس کی مصیبت سعید بن سنان۔ اس کی کنیت ابومہدی اور لقب حمصی تھا۔ حافظ ابن حجر نے التقریب[2] میں اس کو متروک لکھا ہے۔ امام دارقطنی نے اس پر حدیثیں گھڑنے کا الزام[3] لگایا ہے۔[4]

(۲۷۹)......إِذَا ذَلَّتِ الْعَرَبُ ذَلَّ الْإِسْلَامُ

[1] معرفة الصحابة: ص ۹۰۲ ج ۲ ح ۲۳۲۶ [2] ص ۱۷۷ ترجمہ: ۲۳۳۳
[3] الضعفاء والمتروكين: ص ۱٤٥ ترجمہ: ۲۷۰
[4] تنزيه الشريعة: ص ٦٣ ج ۱، ترجمہ: ۱٤۔ الضعيفة: ص ۱۱۲۳۔۱۱۲٤ ج ۱۲

''جب عرب ذلیل ہوں گے تو اسلام بے وقعت ہو جائے گا۔''

یہ روایت جھوٹ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ اسلام اللہ کا بنایا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔ اللہ کا دین اور اس کی روشنی ہے۔ اسلام کبھی ذلیل اور بے وقعت نہیں ہو گا۔ اسلام کی آمد اور رسول اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل عرب کسی شمار میں نہیں تھے۔ لیکن اسلام قبول کر کے اور اللہ کے رسول ﷺ کی دعوت پر لبیک کہہ کر اور اسلام کی متعین کردہ راہ پر چل کر اونٹ اور بکریوں کے چرواہوں سے دنیا کے حکمران بن گئے۔ جب اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرنے کی بجائے دوبارہ اپنے عرب ہونے پر فخر کرنے لگے تو دنیا کی نظروں سے گر گئے لیکن اسلام باقی رہا۔ اسلام کی عزت عربوں کی عزت پر کبھی بھی موقوف نہیں تھی۔ بلکہ ان کی عزت اس پر عمل کرنے پر موقوف تھی، ہے اور رہے گی۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے غلط عمل سے غیر مسلمانوں کی نگاہوں میں اسلام کی غلط تصویر بنتی ہے۔ اس کی طرف ان کے میلان میں کمی ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اس کو سمجھ جاتے ہیں تو اس کی توقیر کرنے لگتے ہیں۔

اسلام کی بدولت عثمانیوں یا ترکوں نے دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر آٹھ صدیوں تک حکومت کی۔ ان کے ذریعہ اسلام کی روشنی وسط یورپ تک پہنچ گئی۔ لیکن جب عربوں کی طرح وہ بھی اپنے عمل سے اسلام کی غلط ترجمانی کرنے لگے تو ان کی عظمت و شوکت قصۂ پارینہ بن گئی۔ مگر اس کے باوجود اسلام باقی ہے اور باقی رہے گا۔ (ان شاء اللہ)

آج پوری دنیا اسلام کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے اس کے خلاف اپنی ساری توانائیاں وقف کیے ہوئے اس کو پھیلنے سے روکنے کے لیے یورپ و امریکہ اپنی ساری مادی، فوجی، فکری اور عملی صلاحیتیں لگائے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کی روشنی گل کرنے میں ناکام ہیں۔ خود امریکی اور یورپی قوموں کے اندر سے اسلام کے نام لیوا اور اس کی متعین کردہ راہ پر چلنے والے پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔

یہ روایت جس طرح اپنے معنی اور مضمون کے اعتبار سے باطل ہے اسی طرح اپنی سند کے اعتبار سے بھی من گھڑت ہے۔ رسول اکرم ﷺ سے اس کی نسبت صحیح نہیں ہے۔

اس کی تخریج حافظ ابو نعیم نے ''اخبار اصفہان''[1] میں اور حافظ ابو یعلی نے اپنی مسند[2] میں اس سند سے کی ہے: ہم سے منصور بن ابی مزاحم نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن خطاب بصری نے، علی بن زید

---

[1] اخبار اصفہان: ص ۳۴۰ ج ۲

[2] مسند ابو یعلی: ص ۴۰۲ ج ۳ ح ۱۸۸۱

سے، انہوں نے محمد بن منکدر سے، انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہوئے بیان......

امام ابن ابی حاتم فرماتے ہیں:

''میں نے اپنے والد سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا جس کی روایت منصور بن ابی مزاحم نے محمد بن خطاب سے، انہوں نے علی بن زید سے، انہوں نے محمد بن منکدر سے اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کہ جب عرب ذلیل ہو جائیں گے تو اسلام ذلیل و بے وقعت ہو جائے گا۔'' تو میرے والد نے جواب دیا:

''یہ حدیث باطل ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔''[1]

(۲۸۰)......سَأَلْتُ رَبِّیْ عَزَّوَجَلَّ أَنْ لَا یُدْخِلَ أَحَدًا مِنْ أَھْلِ بَیْتِی النَّارَ فَأَعْطَانِیْھَا

''میں نے اپنے رب عزوجل سے درخواست کی کہ وہ میرے اہل بیت میں سے کسی کو جہنم میں داخل نہ کرے۔ تو اس نے مجھے یہ عطا فرما دیا۔ یعنی میرے اہل بیت میں سے کسی کو جہنم میں داخل نہیں کرے گا۔''

یہ حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اسلام میں جہنم سے نجات کے لیے نبی اکرم ﷺ کے اہل بیت سے ہونا شرط نہیں ہے۔ بلکہ ایمان اور عمل صالح سے متصف ہونا شرط ہے۔ یہ تو یہودیوں کا دعویٰ اور عقیدہ ہے کہ ہم نبیوں کی اولاد ہیں۔ اس لیے اولاً تو ہم جہنم میں نہیں جائیں گے ثانیاً اگر گئے بھی تو صرف چند دنوں کے لیے۔ لیکن اسلام میں قانون جزا وسزا قرآن پاک کی زبان میں یہ ہے:

﴿ إِنَّهُ مَنْ يَأْتِ رَبَّهُ مُجْرِمًا فَإِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ ط لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ○ وَمَنْ يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَىٰ ○ ﴾ [طه:۷۴۔۷۵]

''جو مجرم بن کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوگا اس کے لیے جہنم ہے جس میں وہ نہ جیے گا نہ مرے گا۔ اور جو اس کے حضور مومن بن کر حاضر ہوگا اور اس نے نیک عمل کیے ہوں گے تو ایسے لوگوں کے لیے بلند درجات ہیں۔''

مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نبی کی اولاد میں صرف اس کا شمار ہوتا ہے جو اس کے طریقے پر عمل

[1] علل الحدیث ص۲۱۴ ج۲ ح۲۶۴۲

پیرا ہو اور جو اس کے طریقے پر عمل پیرا نہ ہو وہ نبی کے اہل میں شمار نہیں ہوتا۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿ وَ نَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ○ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ﴾ [ھود ٤٥-٤٦]

''نوح نے اپنے رب کو پکارا: اے میرے رب، میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بڑا بہتر حاکم ہے۔ فرمایا اے نوح درحقیقت وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے۔''

جب رسول اکرم ﷺ پر قرآن پاک کی درج ذیل آیت نازل ہوئی:

﴿ وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ ﴾ [الشعراء: ٢١٤]

''اے محمد! اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ۔''

تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے رشتہ داروں کو جمع کیا اور فرمایا:

((یَا مَعْشَرَ قُرَیْشٍ اِشْتَرُوْا اَنْفُسَكُمْ، لَا أُغْنِیْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا، یَا بَنِیْ عَبْدَ مَنَافٍ لَا أُغْنِیْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا، یَا عَبَّاسَ بْنَ عَبْدِالْمُطَّلِبِ لَا أُغْنِیْ عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا، وَیَا صَفِیَّةَ عَمَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَا أُغْنِیْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا، وَیَا فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَلِیْنِیْ مَا شِئْتِ مِنْ مَالِیْ، لَا أُغْنِیْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا)) [1]

''اے معشر قریش! اپنے آپ کو خرید لو۔ یعنی اپنے آپ کو جہنم سے بچالو۔ میں تم لوگوں کو اللہ کی پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔ اے بنی عبد مناف! میں تم کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔ اے عباس بن عبدالمطلب! میں تم کو اللہ کی پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔ اے صفیہ رسول اللہ کی پھوپھی، میں تمہیں اللہ کی پکڑ سے نہیں بچا سکتا اور اے فاطمہ محمد کی بیٹی تو میرے مال میں سے جو چاہے مانگ لے، میں تجھے اللہ کی پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔''

جو لوگ رسول اللہ ﷺ سے فریادیں کرتے ہیں، آپ کا وسیلہ پکڑتے ہیں، آپ کی قبر مبارک کی زیارت کے موقع پر رو رو کر دعائیں مانگتے ہیں، قبر مبارک کی جالیاں چومتے ہیں یا پیروں فقیروں کی

[1] صحیح بخاری: ح ٤٧٧١۔ صحیح مسلم: ح ٢٠٦

قبروں کے سامنے کھڑے ہو کر دعائیں کرتے ہیں، ان میں مدفون مردوں سے مرادیں مانگتے ہیں۔ یا جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پیروں اور ولیوں سے دعائیں مانگنا اور ان سے مدد مانگنا اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگنا ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہیں اور قیامت کے دن یہ ان کو اللہ تعالیٰ سے بخشوا لیں گے ایسے خود فریبوں کو چاہیے کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے مذکورہ ارشاد اور اس سے قبل ذکر کردہ آیات قرآنی پر غور کریں اور اپنے ان اعمال کو ان کی روشنی میں رکھ کر دیکھیں: آیا وہ کتاب وسنت کے احکام کے مطابق ہیں یا شیطان نے ان کو ان کی آنکھیں میں خوشنما بنا دیا ہے۔

﴿ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [النحل:٦٣]

"اللہ کی قسم! تم سے پہلے بہت سی قوموں میں ہم رسول بھیج چکے ہیں۔ پس شیطان نے ان کے برے کرتوت انہیں خوشنما بنا کر دکھائے۔ وہی آج ان کا سرپرست ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

اوپر جس موضوع اور جھوٹی روایت کا ذکر کیا گیا ہے اور جس کے مضمون اور متن کے باطل ہونے کے دلائل کے ضمن میں یہ وضاحتیں کی جا رہی ہیں، اس روایت کی تخریج حافظ ابن بشران نے اپنی کتاب "الامالی"[1] میں کی ہے۔

ہم کو ابو سہل احمد بن محمد بن عبداللہ بن زیاد قطان نے خبر دی، کہا: ہم سے محمد بن یونس نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابو علی حنفی نے بیان کیا، کہا: ہم سے اسرائیل نے ابو حمزہ ثمالی سے، انہوں نے ابو رجاء سے، انہوں نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

یہ سند موضوع ہے۔ ابو حمزہ ثمالی جس کا نام ثابت بن ابی صفیہ ہے، ثقہ نہیں تھا۔ جیسا کہ امام نسائی وغیرہ نے صراحت کی ہے اور محمد یونس کریمی مشہور حدیثیں وضع کرنے والا ہے۔[2]

اہل بیت سے محبت

اوپر کی وضاحتوں سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ اہل بیت سے محبت مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ ان

[1] الأمالي: ص٥٦ ج١ [2] الضعيفه: ص٤٩٤ ج١

وضاحتوں سے یہ بتانا مقصود تھا کہ ذات پات اور قبیلہ وخاندان پر فخر کرنا اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ جہاں تک رسول اکرم فداہ ابی وامی ﷺ کے اہل بیت سے محبت کا تعلق ہے تو یہ ایمان کی پہچان ہے۔ بلکہ اس اعتبار سے عربوں، خصوصاً بنو ہاشم سے محبت اور قلبی لگاؤ ایک سچے اور مخلص مومن کے دل کی آواز ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ انہی بنو ہاشم سے تعلق رکھتے تھے۔ رہے آپ کے اہل بیت تو جو دل ان کی محبت سے خالی ہو وہ کسی مومن کا دل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ہمیں تو اس پاک سرزمین سے بھی محبت ہے۔ اس لیے کہ اس پر رسول اکرم ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہ رضوان اللہ علیہم کے نقوش پا ثبت ہیں۔ اس سرزمین پر حرمین شریفین اور مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ جزیرۂ عرب کی فضاؤں میں رسول اللہ ﷺ، آپ کے اہل بیت اور صحابہ کرام کی سانسوں کی خوشبو بسی ہے۔

عربی زبان سے محبت

عربی زبان اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن پاک کی، نبی اکرم ﷺ کی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زبان ہے۔ اس زبان سے ہماری محبت اور قلبی تعلق فطری ہے۔ لیکن قرآن پاک اور صحیح احادیث میں اس زبان کی نہ کوئی فضیلت بیان ہوئی ہے اور نہ کہیں یہ صراحت ہے کہ اہل جنت کی زبان عربی ہوگی۔ آخرت اور جنت وجہنم کے احوال کا تعلق غیبیات سے ہے جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کے بتانے سے بعض احوال کا علم رسول اللہ ﷺ کو حاصل تھا۔ مگر آپ نے اپنے کسی ارشاد میں یہ نہیں بتایا ہے کہ اہل جنت عربی بولیں گے۔ لہٰذا:

(۲۸۱)......أَحِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ: لِأَنِّي عَرَبِيٌّ وَالْقُرْآنُ عَرَبِيٌّ وَكَلَامُ أَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ.

''تین باتوں کی وجہ سے عربوں سے محبت کرو۔ اس وجہ سے کہ میں عربی ہوں۔ قرآن عربی ہے، اور اہل جنت کی بات چیت عربی میں ہوگی۔''

یہ ایک موضوع روایت ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی نہیں ہے۔[1]

(۲۷۲)......وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ وَحْيٍ قَطُّ عَلٰى نَبِيٍّ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهٗ إِلَّا بِالْعَرَبِيَّةِ ثُمَّ يَكُوْنُ هُوَ بَعْدُ يُبَلِّغُهٗ بِلِسَانِهِمْ.

---

[1] اس موضوع روایت کے بارے میں تفصیلی بحث اس کتاب کی پہلی جلد کے ص ۲۹۴ پر گزر چکی ہے۔

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اللہ نے کبھی بھی کوئی وحی اپنے کسی نبی پر، اپنے اور اس کے درمیان نازل نہیں فرمائی مگر عربی زبان میں۔ پھر وہ نبی اس وحی کو اپنی قوم تک اس کی اپنی زبان میں پہنچاتا رہا ہے۔''

یہ روایت جھوٹ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی نہیں ہے۔ قرآن پاک اور صحیح احادیث کے بھی خلاف ہے۔

اس روایت کی تخریج امام ابن الجوزی [1] نے امام ابن عدی [2] کے طریق سے کی ہے:

ابن عدی کہتے ہیں: ہم سے ابراہیم بن علی عمری نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالغفار بن عبداللہ بن زبیر نے بیان کیا۔ کہا: ہم سے عباس بن فضل انصاری نے، سلیمان سے، انہوں نے زہری سے، انہوں نے سعید بن مسیب سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے......

یہ روایت نقل کرنے کے بعد امام ابن الجوزی فرماتے ہیں:

یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ سلیمان ارقم کے بارے میں امام احمد کا قول ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس سے حدیث روایت نہیں کی جاتی۔ امام یحییٰ فرماتے ہیں وہ ایک پیسہ کے برابر بھی نہیں تھا۔ عمرو بن علی کا قول ہے: وہ ثقہ نہیں تھا۔ امام نسائی، ابوداؤد اور دارقطنی نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔ امام ابن حبان نے اس پر یہ الزام لگایا ہے: وہ ثقہ راویوں کے نام سے من گھڑت اور موضوع روایات بیان کیا کرتا تھا۔

رہا عباس بن فضل تو اس کے بارے میں امام یحییٰ بن معین کا قول ہے: وہ کچھ بھی نہیں اور امام نسائی نے اس کو ''متروک'' کہا ہے۔ [3]

یہ تو اس روایت کی سند کا حال تھا، رہا اس کا متن تو وہ قرآن پاک اور صحیح حدیثوں کے خلاف ہے۔ سورۃ ابراہیم میں ارشاد ربانی ہے۔

﴿ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ﴾

---

[1] الموضوعات: ص۱۵۹۔ ۱۶۰ ج۱ ح۲٤۱

[2] الکامل: ص۱۱۰۰۔۱۱۰۵ ج۳ [3] الضعفاء والمتروکین: ص۷٤

''ہم نے جو رسول بھی بھیجا اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تا کہ وہ انہیں کھول کھول کر سمجھا سکے۔''

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جتنے رسول بھی مبعوث فرمائے ہیں ان کی اپنی قوموں کی زبانوں میں اور ان پر جو کتابیں بھی نازل فرمائی ہیں وہ بھی ان کی زبانوں میں تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام ان کے سامنے خوب کھول کھول کر واضح کریں۔

مسند امام احمد میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَمْ يَبْعَثِ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا بِلُغَةِ قَوْمِهِ))[1]

''اللہ نے جو نبی بھی مبعوث فرمایا ہے اس کی قوم کی زبان کے ساتھ مبعوث فرمایا۔''

شیخ احمد بن عبدالرحمٰن البنا ساعاتی الفتح الربانی فی ترتیب مسند[2] الامام احمد الشیبانی میں تحریر فرماتے ہیں:

یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے ارشاد...... وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ کے عین مطابق ہے۔

حافظ سیوطی صوفی المشرب ہونے کی وجہ سے فضائل ومناقب کے باب میں کسی موضوع روایت کو موضوع ماننے پر مشکل سے تیار ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس زیر بحث روایت:

((وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ وَحْيٍ قَطُّ عَلَى نَبِيٍّ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ إِلَّا بِالْعَرَبِيَّةِ ثُمَّ يَكُوْنُ هُوَ بَعْدُ يُبَلِّغُهُ بِلِسَانِهِمْ))

کو بھی صرف ضعیف ماننے اکتفا کیا ہے اور لکھا ہے: سلیمان بن ارقم اگرچہ متروک تھا مگر اس پر کذب بیانی کا الزام نہیں تھا۔ پھر اس موضوع اور باطل روایت کی شاہد کے طور پر ایک دوسری روایت نقل کی ہے جو خود موضوع ہے۔ جس کے الفاظ ہیں:

(۲۸۳)......كَانَ جِبْرِيْلُ يُوْحَى إِلَيْهِ بِالْعَرَبِيَّةِ وَيَنْزِلُ هُوَ إِلَى كُلِّ نَبِيٍّ بِلِسَانِ قَوْمِهِ))[3]

''جبریل علیہ السلام کی طرف عربی زبان میں وحی کی جاتی تھی اور وہ ہر نبی کے پاس اس کی قوم کی

---

[1] مسند الامام أحمد: ص ۱۸۵ ج ۵ [2] الفتح الربانی: ص ۳۶ ج ۲۰

[3] اللآلی المصنوعة: ص ۱۸ ج ۱

زبان میں اس کو لے کر نازل ہوتے تھے۔"

حافظ سیوطی کو دوسروں سے پہلے یہ بات معلوم تھی کہ کوئی موضوع روایت کسی موضوع روایت کی شاہد نہیں ہو سکتی۔ یہ جانتے ہوئے بھی انہوں نے یہ زیر بحث روایت شاہد کے طور پر پیش کر دی اور اس کی سند بھی بیان کر دی:

"ابن مردویہ محمد بن سائب کلبی سے روایت کرتے ہیں، وہ ابو صالح سے اور وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے......

جبکہ الاتقان[1] میں وہ خود یہ لکھ چکے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جو تفسیری روایات منقول ہیں ان میں سب سے کمزور اور ناقابل اعتبار روایات وہ ہیں جو کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس کی سند سے مروی ہیں۔ لیکن اس موضوع روایت سے استدلال کرتے وقت شاید ان کو اپنی بات یاد نہیں رہی۔

واضح رہے کہ محمد بن سائب کلبی نے امام سفیان ثوری سے خود یہ اعتراف کیا ہے کہ اس نے ابو صالح میزان بصری سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جتنی حدیثیں روایت کی ہیں وہ سب جھوٹ ہیں۔[2]

حافظ ابن حجر نے التقریب[3] میں اس کے بارے میں لکھا ہے: کلبی پر کذب بیانی اور رافضی ہونے کا الزام تھا۔

(۲۸۴)......إِنَّ أَبْغَضَ الْكَلَامِ إِلَى اللّٰهِ الْفَارِسِيَّةُ، فَكَلَامُ الشَّيْطَانِ الْخُوزِيَّةُ وَكَلَامُ أَهْلِ النَّارِ الْبُخَارِيَّةِ، وَكَلَامُ أَهْلِ الْجَنَّةِ الْعَرَبِيَّةُ۔

"اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ زبان فارسی ہے اور شیطان کی زبان خوزی ہے۔ اہل جہنم کی زبان بخاری ہے اور اہل جنت کی زبان عربی ہے۔"

یہ روایت موضوع ہے جس کے متن سے اس کے موضوع ہونے کی بو آ رہی ہے۔ امام ابن الجوزی نے یہ روایت گھڑنے کا الزام اسماعیل بن زیاد پر عائد کیا ہے جو کذاب تھا۔[4]

حرفت اور پیشہ

جس طرح ذات و برادری اور قبیلہ اور خاندان کی بنیاد پر لوگوں کے مراتب متعین کیے گئے ہیں، اسی

---

[1] الاتقان: ص ٤٧١ ج ٢ — [2] معجم اسامی الرواۃ: ص ٦١٨۔ ٦٢٠ ج ٣

[3] التقریب: ص ٤١٥ ترجمہ: ٥٩٠١ — [4] الموضوعات: ص ١٥٨۔ ١٥٩ ج ١

طرح صنعت، حرفت اور پیشہ کے اعتبار سے بھی لوگوں کے درجات متعین کیے گئے ہیں۔ یہ ذہنیت صرف عوام الناس نہیں رکھتے، بلکہ اس میں علماء اور اکابر امت بھی مبتلا ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مشہور بزرگ کا فتویٰ ہے:

''سید، شیخ، مغل اور پٹھان وغیرہ شریف اقوام، نجیب الطرفین ہیں جبکہ بقیہ برادریاں مثلاً جولاہا، تیلی وغیرہ چھوٹی اور رذیل اقوام ہیں...... جولاہوں اور نائیوں کو مسلمان گھرانوں میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔''

فقہ کی مشہور کتاب ''الہدایہ'' میں کتاب النکاح فصل فی الکفاءۃ کے تحت آیا ہے:

قریش ایک دوسرے کے کفوٴ اور عرب ایک دوسرے کے کفوٴ ہیں۔ اس کی بنیاد نبی کریم ﷺ کا قول مبارک ہے:

((قُرَيْشٌ بَعْضُهُمْ أَكْفَاءٌ لِبَعْضٍ، بَطْنٌ بِبَطْنٍ وَالْعَرَبُ بَعْضُهُمْ أَكْفَاءٌ لِبَعْضٍ، قَبِيلَةٌ بِقَبِيلَةٍ، وَالْمَوَالِي بَعْضُهُمْ أَكْفَاءٌ لِبَعْضٍ، رَجُلٌ بِرَجُلٍ))

''قریش کے لوگ ایک دوسرے کے کفوٴ ہیں، ایک خاندان دوسرے خاندان کا۔ عرب ایک دوسرے کے برابر ہیں، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے۔ غیر عرب ایک دوسرے کے برابر ہیں، ایک مرد دوسرے مرد کے۔''

حافظ جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف زیلعی نے ''نصب الرایہ'' میں امام حاکم کی ''المستدرک'' کے حوالہ سے اس حدیث کو درج ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے:

((الْعَرَبُ بَعْضُهُمْ أَكْفَاءٌ لِبَعْضٍ: قَبِيلَةٌ بِقَبِيلَةٍ وَرَجُلٌ بِرَجُلٍ، وَالْمَوَالِي بَعْضُهُمْ أَكْفَاءٌ لِبَعْضٍ، قَبِيلَةٌ بِقَبِيلَةٍ، وَرَجُلٌ بِرَجُلٍ، إِلَّا حَائِكٌ أَوْ حَجَّامٌ))

''عرب ایک دوسرے کے برابر ہیں، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے۔ ایک مرد دوسرے مرد کے۔ اور غیر عرب۔ عجم۔ ایک دوسرے کے برابر ہیں، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے۔ اور ایک مرد دوسرے مرد کے، سوائے جولاہے اور نائی ہے۔''

حافظ زیلعی نے اس حدیث کی جو سند نقل کی ہے وہ درج ذیل ہے:

ہم سے اصم نے بیان کیا، کہا: ہم سے صغانی نے بیان کیا، کہا: ہم سے شجاع بن ولید نے بیان کیا، کہا: ہم سے ہمارے بعض بھائیوں نے ابن جریج سے، انہوں نے عبداللہ بن ابی ملیکہ سے، اور انہوں

نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

حافظ زیلعی نے صاحب "التنقیح" کے حوالہ سے اس سند کو منقطع بتایا ہے۔ کیونکہ شجاع بن ولید نے اپنے بعض شیوخ کا نام نہیں لیا ہے۔"

زیلعی نے سند میں انقطاع کا ذکر تو کر دیا مگر یہ نہیں بتایا کہ عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج نے عبداللہ بن ابی ملیکہ سے یہ روایت بذریعہ "عن" کی ہے۔ جبکہ وہ بہت بڑے "مدلس" تھے اور مدلس کا "عنعنہ" مردود ہے۔

زیلعی نے اس کے بعد لکھا ہے کہ ایک دوسری سند سے حافظ ابو یعلی نے اس کو اپنی "مسند" میں نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ حافظ ابن عبدالبر نے اس کو منکر اور موضوع قرار دیا ہے "ابن جریج عن ابن ابی ملیکہ" کی سند سے بھی اس کی صحت کی نفی کی ہے۔[1]

درحقیقت یہ روایت جتنے "طرق" سے بھی مروی ہے ان سب میں ایسی کوئی نہ کوئی علت ضرور موجود ہے جو اس کو ناقابل اعتبار بنا دیتی ہے۔

یہ تو اس روایت کی سند کا حال تھا۔ رہا اس کا متن تو اس کا صدور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ناممکن ہے۔ کیونکہ اولاً تو صحابہ کرام میں بھی لوہار، حجام، پارچہ باف وغیرہ موجود تھے۔ دوم اسلام کی نگاہ میں حلال روزی کمانے کے لیے خاص پیشوں کا تعین نہیں کیا گیا ہے اور نہ کسی خاص پیشہ یا حرفت کی ترغیب دی گئی ہے۔ نہ کسی پیشہ یا حرفت کی مذمت کی گئی ہے۔ دراصل پیشوں اور حرفتوں کی بنیاد پر لوگوں میں فرق مراتب کرنا اسلامی نہیں بلکہ ہندوانہ ذہنیت اور عقیدہ ہے۔

(۲۸۵)...... أَكْذَبُ النَّاسِ الصَّبَّاغُوْنَ وَالصَّوَّاغُوْنَ۔

"لوگوں میں سب سے زیادہ جھوٹے رنگریز اور سنار ہیں۔"

یہ حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند[2] میں اس سند سے کی ہے:

ہم سے ہمام نے فرقد سبخی سے، اس نے یزید بن عبداللہ شخیر سے، اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے......

اس سند میں فرقد سبخی کے علاوہ تمام راوی ثقہ ہیں۔ فرقد بصرہ کا ایک زاہد تھا جس کو امام ابو حاتم نے غیر ثقہ قرار دیا ہے۔ اس کے بارے میں یہی رائے امام نسائی نے بھی ظاہر کی ہے۔ امام بخاری کا قول

[1] الهدايه مع نصب الراية: ص ۲۲۹ ج ۳ [2] مسند طيالسي: ص ۲۶۲ ج ۱

ہے کہ اس کی مرویات میں "منکرات" کی بھرمار ہے جس کی ایک مثال اس کی روایت کردہ یہ حدیث بھی ہے۔ امام ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ جتنی سندوں سے بھی مروی ہے ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی حد درجہ ضعیف یا منکر اور کذاب موجود ہے۔

امام ابن القیم نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ "حس" اس کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ کیونکہ کپڑا رنگنا اور زیور بنانا ایک پیشہ اور حرفت ہے۔ اس کی بنیاد پر کسی کو جھوٹا قرار دینا کیونکہ صحیح ہو سکتا ہے۔ اگر صحیح معنوں میں کسی کو جھوٹا کہا جا سکتا ہے تو وہ ایسے لوگ ہیں جن کے عقائد باطل ہوں۔ جیسے رافضی، کاہن اور نجومی وغیرہ۔ بعض لوگوں نے "صباغ" کی یہ تاویل کی ہے کہ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو حدیث میں ایسے الفاظ کا اضافہ کرے جو اس کے حسن کو بڑھا دیں اور صواغ وہ ہے جو ایسی حدیثیں گھڑے جن کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں۔ لیکن یہ سراسر تکلف ہے اور جب اس کی کوئی قابل اعتماد سند ہی نہیں ہے تو پھر اس تکلف کی کیا ضرورت؟[1]

(۲۸۶)......شِرَارُ أُمَّتِيْ الصَّائِغُوْنَ وَالصَّبَّاغُوْنَ

"میری امت کے بدترین لوگ سنار اور رنگ ریز ہیں۔"

یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ حافظ سیوطی کی کتاب "الجامع الصغیر"[2] میں حافظ دیلمی کی کتاب مسند الفردوس کا حوالہ دیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ ضعیف ہے۔

یہی حدیث علامہ علاؤ الدین علی متقی نے کنز العمال[3] میں بھی مسند الفردوس کے حوالہ کے ساتھ نقل کی ہے۔

(۲۸۷)......لَا تَسْتَشِيْرُوْا الْحَاكَةَ وَالْمُعَلِّمِيْنَ۔

"پارچہ بافوں اور معلموں سے مشورہ مت لو۔"

یہ روایت جھوٹ ہے نبی ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ اس کی تخریج حافظ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں کی ہے اور وہیں سے حافظ ابو الحسن علی بن احمد بن عراق کنانی نے تنزیہ الشریعۃ[4] المرفوعہ میں نقل کی ہے اور لکھا ہے:

یہ روایت غلام خلیل کے طریق سے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور عبید اللہ بن زحر کے

---

[1] الضعيفة: ص۲۷۵-۲۷۶ ج۱
[2] الجامع الصغير: حديث نمبر ۳۳۸۲
[3] كنز العمال: حديث نمبر ۴۹۱۳
[4] تنزيه الشريعة: ص ۲۵۴ ج۱

طریق سے اس میں یہ اضافہ ہے:

((فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى سَلَبَهُمْ عُقُولَهُمْ وَنَزَعَ الْبَرَكَةَ مِنْ إِكْتِسَابِهِمْ))

"کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کی عقلیں سلب کر لی ہیں اور ان کی کمائی سے برکت اٹھالی ہے۔"

ابن عراق آگے لکھتے ہیں:

اس جھوٹی روایت کی آفت عبید اللہ بن زحر ہے۔ جس کے بارے میں امام ابن حبان نے لکھا ہے کہ وہ ثقہ راویوں کے نام سے موضوع روایات بیان کیا کرتے تھا۔

ابن عراق مزید لکھتے ہیں:

یہ روایت صلصال بن دھمس کی سند سے بھی مروی ہے۔ جو اس کے پوتے محمد بن ضوء بن صلصال نے کی ہے اور اس کے الفاظ ہیں:

(۲۸۸)......((لَا تُشَاوِرُوا الْحَاكَةَ وَلَا الْحَجَّامِيْنَ وَلَا الْمُعَلِّمِيْنَ ، فَإِنَّ اللّٰهَ سَلَبَهُمْ عُقُولَهُمْ وَمَحَقَ أَكْسَابَهُمْ))

"پارچہ بافوں۔ جولاہوں۔ پچھنا لگانے والوں اور معلموں سے مشورہ مت کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کی عقلیں چھین لی ہیں اور ان کی کمائی برباد کر دی ہے۔"

یہ روایت نقل کرنے کے بعد ابن عراق نے لکھا ہے:

"محمد بن ضوء بہت بڑا جھوٹا تھا اور علانیہ فسق و فجور کا ارتکاب کرتا تھا۔ حافظ سیوطی نے یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کی ہے۔ جس کی تخریج حافظ ابو عبد اللہ محمد بن محمود بن نجار نے اپنی تاریخ میں کی ہے پھر لکھا ہے: یہ منکر ہے۔"

(۲۸۹)......لَا تُشَاوِرُوا الْحَجَّامِيْنَ وَلَا الْحَاكَةَ وَلَا تُسَلِّمُوْا عَلَيْهِمْ۔

"پچھنا لگانے والوں اور جولاہوں سے مشورہ مت لو اور نہ ان کو سلام کرو۔"

ابن عراق لکھتے ہیں:

حافظ دیلمی نے یہ روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کی ہے۔ اس کی سند میں عبد الرزاق کا بھانجا احمد بن عبد اللہ بن داؤد شامل ہے۔ جس کو امام دار قطنی نے جھوٹا قرار دیا ہے۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

(۲۹۰)......((عَمَلُ الْاَبْرَارُ مِنْ رِجَالِ اُمَّتِی الْخِیَاطَةُ وَعَمَلُ الْاَبْرَارِ مِنَ النِّسَاءِ الْمِغْزَلُ))

''میری امت کے صالح مردوں کا عمل سلائی ہے اور میری امت کی صالح عورتوں کا عمل سوت کاتنا ہے۔''

یہ حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج امام ابن الجوزی نے الموضوعات [1] میں حافظ خطیب بغدادی کے طریق سے کی ہے۔ جنہوں نے اس کو سلیمان بن ارقم کے ترجمہ کے ضمن میں نقل کیا اور لکھا ہے کہ: اس کی سند میں شامل ابوداؤد سلیمان بن عمرو نخعی بہت بڑا جھوٹا تھا۔ امام ابن المدینی نے اس پر حدیثیں گھڑنے کا بھی الزام لگایا ہے۔

امام ابو احمد عبداللہ بن عدی نے ''الکامل'' [2] میں سلیمان بن عمرو کے ترجمہ کے ضمن میں یہ روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے اس کو وضع کرنے والا یہی ہے۔

(۲۹۱)......شِرَارُ النَّاسِ التُّجَّارُ وَالزُّرَّاعُ

''لوگوں میں سب سے زیادہ بُرے تاجر اور کاشتکار ہیں۔''

یہ روایت بھی جھوٹ ہے۔ اس کی روایت حافظ ابو عبداللہ حسین بن ابراہیم جوزقانی نے الاباطیل [3] والمناکیر میں کی ہے اور اس کو باطل بتایا ہے۔

حافظ سیوطی نے حافظ جوزقانی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی سند میں ایک سے زیادہ مجہول الحال اور نامعلوم راوی شامل ہیں۔ [4] اس طرح ابن عراق نے بھی تنزیہہ [5] الشریعۃ میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ اس کی سند میں ایک سے زیادہ مجہول راوی شامل ہیں اور یہ تحقیق نہیں کی کہ اس کی شاہد وہ حدیث ہے جس کی تخریج حافظ ابونعیم نے کی ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

((یَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ! اِنَّ التُّجَّارَ یُبْعَثُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقَی اللّٰهَ وَبَرَّ وَصَدَقَ))

''اے تاجروں کے گروہ قیامت کے روز تاجر بدکاروں کی صورت میں اٹھائے جائیں گے

---

[1] الموضوعات: ص ۳۳ ج ۳ ح ۱۲۴۲
[2] الکامل: ص ۱۰۹۷۔۱۰۹۸ ج ۳
[3] الاباطیل والمناکیر: ح ۵۱۵
[4] اللآلی المصنوعة: ص ۱۲۰ ج ۲
[5] تنزیه الشریعة: ص ۱۹۱ ج ۲

سوائے اس کے جو اللہ سے ڈرتا ہے، نیک ہے اور صدق گوئی سے کام لیتا ہے۔“[1]

تو ابن عراق کا اعتراض برمحل نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث ضعیف ہے۔

(۲۹۲)......عَلَيْكُمْ بِالتِّجَارَةِ فَإِنَّ فِيهَا تِسْعَةُ أَعْشَارِ الرِّزْقِ

تم لوگ تجارت کو لازم پکڑو۔ کیونکہ اس میں رزق کے دس حصوں میں سے نو حصے موجود ہیں۔

یہ روایت مرسل ہے اور مرسل روایت کا شمار ضعیف حدیثوں میں ہوتا ہے۔ اس کا ذکر امام غزالی نے ”احیاء العلوم“[2] میں کیا ہے۔ حافظ زین الدین عراقی نے احیاء العلوم کے حاشیہ پر مطبوع اپنی کتاب: المغنی عن حمل الاسفار[3] میں لکھا ہے کہ ”اس کی روایت ابراہیم حربی نے نعیم بن عبدالرحمٰن کی روایت کردہ ضعیف حدیثوں کے ضمن میں کی ہے۔ اس کے راوی تو ثقہ ہیں مگر نعیم بن عبدالرحمٰن تابعی ہیں۔ لہٰذا یہ روایت مرسل ٹھہری اور مرسل روایت کا شمار ضعیف حدیثوں میں ہوتا ہے۔ شیخ تاج الدین سبکی نے اس روایت کو اپنی کتاب: الاحادیث[4] التی لا اصل لها“ میں بے اصل قرار دیا ہے۔

اسلام میں کسب حلال کی بہت اہمیت ہے جس ذریعہ سے بھی حاصل ہو۔ جو تجارت دھوکا دہی، فریب، خیانت اور مال تجارت میں ملاوٹ سے پاک ہو ایسی تجارت سے حاصل ہونے والی آمدنی حلال کمائی میں شمار ہوتی ہے۔ حضرت رافع بن خدیج سے روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! کونسی کمائی عمدہ ہے؟ فرمایا:

((عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُوْرٍ))

”آدمی کا اپنے ہاتھ کا عمل اور گناہ سے پاک تجارت۔“[5]

مطلب یہ ہے کہ انسان جو کمائی اپنی محنت اور صاف ستھری تجارت سے حاصل کرتا ہے وہ حلال اور عمدہ کمائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے محنت کر کے روزی کمانے کی ترغیب دی ہے، حضرت مقداد بن معدی کرب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ من عَمَلِ يَدَيْهِ وَإِنَّ نَبِيَّ

---

[1] جامع ترمذی: ح ۱۲۱۰۔ ابن ماجہ ح ۴۲۱۶
[2] احیاء العلوم: ص ۸۹ ج ۲۔
[3] مغنی عن حمل الأسفار: ص ۸۹ ج ۲
[4] الاحادیث التی لأاصل لها: ح ۳۱۱
[5] مسند احمد: ح ۱۷۳۹۷

اللّٰہِ دَاوٗدَ علیہ السلام کَانَ یَأْکُلُ مِنْ عَمَلِ یَدَیْہِ)) .
کبھی کسی نے اپنے ہاتھ کی محنت سے حاصل ہونے والی روزی سے بہتر کوئی کھانا نہیں کھایا۔ اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی محنت سے کمائی ہوئی روزی کھاتے تھے۔''[1]

اللہ تعالیٰ اس بات کو بھی پسند کرتا ہے کہ جو کام بھی کیا جائے عمدہ طریقے سے کیا جائے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ إِذَا عَمِلَ أَحَدُکُمْ عَمَلًا أَنْ یُتْقِنَہُ))[2]

''بیشک اللہ یہ پسند کرتا ہے کہ تم میں سے کوئی بھی شخص جب کوئی کام کرے تو اسے نہایت عمدہ طریقے سے کرے۔''

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ انسان کا ہر اچھا حلال کام اور اپنے ہاتھوں کی محنت سے اس کا روزی کمانا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایک مستحسن صفت ہے۔ اس صفت سے جو شخص موصوف ہو، معاشرے میں اس کا درجہ بلند ہوتا ہے پست نہیں۔

تجارت، صنعت وحرفت اور زراعت وغیرہ ایسے اعمال ہیں، جن میں انسان اپنی جسمانی توانائی، ہاتھوں کی طاقت اور ذہنی صلاحیت سب کچھ استعمال کرتا ہے تاکہ اس کی محنت بارآور اور نتیجہ خیز ہو۔ وہ اس دنیا کی ضرورتیں پوری کر سکے۔ ایسے اعمال اگر صحیح دائرہ کار میں رہ کر انجام دیے جائیں بایں معنی کہ کسی کی حق تلفی نہ کی جائے، کسی کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ قانون اور ضابطے کی خلاف ورزی نہ کی جائے تو ایسے اعمال معاشرے میں کسی انسان کی پستی کا سبب کس طرح ہو سکتے ہیں۔ ان کو انجام دینے والا حقیر اور رذیل کیسے ہو سکتا ہے۔

درحقیقت اسلام کے سوا دوسرے مذاہب خاص طور پر ہندو مذہب میں انسان پیدائشی طور پر شریف اور رذیل ہوتا ہے۔ برصغیر کے مسلمان بھی اس ہندوانہ ذہنیت سے متاثر ہیں۔ اسلامی فتوحات کے زمانے میں جب دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے لوگ مسلمان ہوئے تو وہ اسلام کے نظریۂ مساوات کو ہضم نہ کر سکے۔ وہ جس طبقاتی اونچ نیچ کا عقیدہ اسلام لانے سے قبل رکھتے تھے، اس سے اپنے دل ودماغ کو پاک نہ کر سکے۔ بعد میں چل کر ان کا یہی عقیدہ اسی روایات گھڑنے اور لوگوں میں ان کو عام کرنے

[1] صحیح بخاری: ح ۲۰۷۲
[2] صحیح الجامع ح ۱۸۸۰، الصحیحہ ح ۱۱۱۳، کنز العمال ۹۱۲۷

کا محرک بنا جن سے انسانوں کو پیدائشی طور پر مختلف طبقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جن میں سے کچھ شریف اور کچھ رذیل ہیں۔ چونکہ برصغیر کے ملکوں اور ان کے ہمسایہ ملکوں کے علماء بھی اس عقیدہ میں مبتلا رہے ہیں اور ابھی تک ہیں۔ اس لیے مسلمانوں یا اسلام سے نسبت کا دعویٰ کرنے والوں کی اکثریت ذات اور برادری کے اعتبار سے فرق مراتب کا عقیدہ رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک بعض ذاتیں اور برادریاں شریف ہیں اور بعض رذیل وحقیر۔ جیسا کہ اوپر نقل کردہ ایک مشہور بزرگ کے فتویٰ میں دعویٰ کیا گیا ہے۔

ہندوؤں نے دوسرا کام یہ کیا کہ اپنے من گھڑت مختلف طبقوں کے لیے کچھ اعمال اور پیشے مخصوص کر دیے جو بعد میں شرافت اور رذالت کی علامت اور پہچان بن گئے۔ کی تقالید اور روایات سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے بھی انہی اعمال اور پیشوں کی بنیاد پر لوگوں کے درجات متعین کر دیے۔ اس طرح برصغیر کے مسلمانوں میں مختلف ذاتیں بن گئیں۔ ایک اللہ، ایک رسول اور ایک کتاب پر ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود ان کے درمیان کئی ایک پکی دیواریں حائل ہیں۔

جبکہ اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ تمام انسان ایک مرد اور ایک عورت کی اولاد ہیں۔ ان کے درمیان فرق ذات پات اور صنعت وحرفت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایمان وعمل کی بنیاد پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو دین توحید۔ فطرت۔ پر پیدا کیا ہے۔ ان میں سے جو اپنے ایمان اور عمل سے اس فطرت کی ترجمانی کریں گے وہ اللہ کے محبوب اور برگزیدہ بندے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے کن طبقوں سے ان کا تعلق ہے اور جو اس دین فطرت سے انحراف کرے گا تو وہ اللہ کے نزدیک مبغوض اور ملعون ہے۔ چاہے وہ انسانوں کے متعین کردہ نہایت اعلیٰ ذات اور بلند طبقہ میں سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہو۔

کتاب کی اس جلد میں عقائد، اعمال، قصص الانبیاء، مناقب وزیارت قبور اور معاشرے کے جس مسئلے سے بھی تعرض کیا گیا ہو اس سے متعلق جھوٹی اور باطل روایات پیش کرنے اور ان کا پوسٹ مارٹم کرنے سے پہلے اس مسئلے کو قرآن پاک اور صحیح احادیث کی روشنی میں اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے۔ تاکہ ان اثرات بد کو سمجھنے میں آسانی ہو جو جھوٹی روایات نے امت مسلمہ میں چھوڑے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے ملتجی ہوں کہ میری اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے۔ اس کو لوگوں کی عقائدی اور فکری

ہدایت کا ذریعہ بنائے اور میری نادانستہ غلطیوں کے اثرات سے ان کو محفوظ رکھے۔

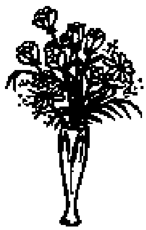
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

سید سعید احسن عابدی

(جدہ مملکت سعودیہ)

یکم ربیع الاول ۱۴۲۸ھ



مآخذ

تفسیر وعلوم القرآن

نام کتاب	مصنف	ناشر
(۱) ابن کثیر	حافظ عماد الدین اسماعیل بن کثیر	دار القرآن بیروت
(۲) الاتقان فی علوم القرآن	حافظ جلال الدین سیوطی	دار الکتاب العربی بیروت
(۳) احسن البیان	مولانا محمد جونا گڑھی / حافظ صلاح الدین یوسف	دار السلام۔ ریاض
(٤) احکام القرآن	قاضی محمد بن عبداللہ ابن العربی	المکتبہ العصریہ۔ بیروت
(٥) البرهان فی علوم القرآن	علامہ بدر الدین محمد بن عبداللہ زرکشی	المکتبہ العصریہ۔ بیروت
(٦) بیان القرآن	مولانا اشرف علی تھانوی	تاج پبلشرز۔ دہلی
(۷) تفهيم القرآن	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	ترجمان القرآن۔ لاہور
(۸) تدبر قرآن	مولانا امین احسن اصلاحی	فاران فاؤنڈیشن۔ لاہور
(۹) تیسیر الکریم الرحمن فی تفسیر کلام المنان	علامہ عبدالرحمٰن آل سعدی	دار احیاء التراث العربی۔ بیروت
(۱۰) الجامع لأحكام القرآن	امام محمد بن احمد انصاری قرطبی	دار الفکر۔ بیروت
(۱۱) فتح القدير	امام محمد بن علی بن محمد شوکانی	المکتبہ العصریہ۔ بیروت
(۱۲) الکشاف	علامہ جار اللہ محمود بن عمر زمخشری	مکتبہ العبیکان۔ ریاض
(۱۳) المحرر الوجيز	امام عبدالحق بن عطیہ اندلسی	دار ابن حزم۔ بیروت

(١٤) معالم التنزيل	امام حسین بن مسعود بغوی	دار ابن حزم۔ بیروت

حدیث و شروح حدیث

(١) صحیح بخاری مع فتح الباری	امام محمد بن اسماعیل بخاری/ حافظ ابن حجر رحمہما اللہ	بیت الافکار الدولیہ۔ بیروت و مملکت سعودیہ
(٢) صحیح مسلم مع المنہاج	امام مسلم بن حجاج/ امام محی الدین نووی	بیت الافکار الدولیہ۔ بیروت
(٣) سنن ابو داؤد	امام سلیمان بن اشعث سجستانی	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(٤) سنن ترمذی	امام محمد بن عیسیٰ ترمذی	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(٥) سنن نسائی	امام احمد بن شعیب نسائی	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(٦) سنن ابن ماجه	امام محمد بن یزید قزوینی	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(٧) صحیح ابن خزیمه	امام محمد بن اسحاق بن خزیمہ	المکتبہ الاسلامی۔ بیروت
(٨) صحیح ابن حبان	امام محمد بن حبان خراسانی	دار المعرفۃ۔ بیروت
(٩) کتاب السنة	امام عمرو بن ابی عاصم شیبانی	المکتبہ الاسلامی۔ بیروت
(١٠) الموطا	امام مالک بن انس	الیمامہ۔ بیروت
(١١) المعجم الاوسط	امام سلیمان بن احمد طبرانی	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(١٢) الترغیب والترهیب	امام عبد العظیم بن عبد القوی منذری	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(١٣) الجامع الصغیر	حافظ جلال الدین سیوطی	المکتبہ الاسلامی۔ بیروت
(١٤) سنن دارمی	امام عبد اللہ بن احمد بن عبد الرحمٰن دارمی	دار المعرفہ، بیروت
(١٥) کنز العمال	علامہ علاء الدین علی متقی	بیت الافکار الدولیہ۔ بیروت
(١٦) المستدرك	امام محمد بن عبد اللہ الحاکم	دار احیاء التراث العربی۔ بیروت
(١٧) تحفة الاحوذی	علامہ محمد بن عبد الرحمٰن مبارکپوری	بیت الافکار۔ الدولیہ۔ بیروت
(١٨) التعلیق الممجد	علامہ ابو الحسنات عبد الحی لکھنوی	دار القلم۔ دمشق
(١٩) عون المعبود	علامہ شرف الحق عظیم آبادی	بیت الافکار الدولیہ۔ بیروت

(۲۰) منة المنعم	مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری	دارالسلام۔ ریاض

ضعیف، منکر اور موضوع روایات

(۱) الاباطیل والمناکیر	حافظ حسین بن ابراہیم جورقانی	الجامعہ السلفیہ۔ بنارس
(۲) الاسرار المعرفوعة	علامہ نورالدین علی بن محمد ملا علی قاری	المکتب الاسلامی۔ بیروت
(۳) احادیث القصاص	امام ابن تیمیہ	المکتب الاسلامی۔ بیروت
(٤) تنزیه الشریعة	علی بن محمد بن عراق	دارالکتب العلمیہ۔ بیروت
(٥) الدرر البهیه	یوسف خطار	دمشق۔ شام
(٦) الدرر المنتثرة	حافظ جلال الدین سیوطی	مکتبہ الوراق۔ ریاض
(۷) سلسلة الاحادیث الضعیفه	محدث محمد ناصر الدین البانی	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(۸) الصارم المنکی	حافظ محمد بن احمد بن عبدالہادی	موسسۃ الریات۔ بیروت
(۹) الفوائد المجموعه	امام محمد بن علی شوکانی	دارالکتب العلمیہ۔ بیروت
(۱۰) الفوائد الموضوعه	مرعی بن یوسف مقدسی	دارالوراق۔ ریاض
(۱۱) کشف الخفاء	اسماعیل بن محمد عجلونی	دارالکتب العلمیہ۔ بیروت
(۱۲) اللآلی المصنوعه	حافظ جلال الدین سیوطی	دارالکتب العلمیہ۔ بیروت
(۱۳) اللآلی المنثورة	محمد بن عبداللہ زرکشی	المکتب الاسلامی۔ بیروت
(١٤) معرفة التذکرة	محمد بن طاہر مقدسی	موسسۃ الکتب الثقافیہ۔ بیروت
(١٥) المقاصد الحسنة	حافظ محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی	دارالکتاب العربی۔ بیروت
(١٦) موسوعة الاحادیث الضعیفه	علی حسن علی الحلبی	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(۱۷) الموضوعات الکبری	امام ابوالفرج ابن الجوزی	مکتبہ اضواء السلف۔ ریاض
(۱۸) نصب الرایه	حافظ جمال الدین عبداللہ زیلعی	دارالکتب العلمیہ۔ بیروت

علم الحدیث والرجال

(۱) الباعث الحثیث	علامہ احمد محمد شاکر	دارالفیحاء۔ دمشق

(۲) تقریب التهذیب	حافظ ابن حجر عسقلانی	مؤسسۃ الرسالۃ ۔ بیروت
(۳) تیسیر مصطلح الحدیث	ڈاکٹر محمود طحان	مکتبہ المعارف ۔ ریاض
(٤) طبقات علماء الحدیث	حافظ محمد بن احمد بن عبد الهادی	مؤسسۃ الرسالہ ۔ بیروت
(٥) علل الحدیث	امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم	دار ابن حزم ۔ بیروت
(٦) معجم اسامی الرواۃ	محدث محمد ناصر الدین البانی	دار ابن حزم ۔ بیروت
(۷) مقدمه ابن صلاح	امام عثمان بن عبدالرحمٰن ابن صلاح	مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ ۔ بیروت
(۸) الوسیط	ڈاکٹر محمد بن محمد ابوشہبہ	عالم المعرفۃ ۔ جدہ

سیرت و تاریخ

(۱) البدایه والنهایه	حافظ ابن کثیر	المکتبۃ العصریہ ۔ بیروت
(۲) الرحیق المختوم	مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری	دار ابن کثیر ۔ بیروت
(۳) السیرة النبویه فی ضوء المصادر الاصلیه	ڈاکٹر مہدی رزق اللہ	مرکز الملک فیصل ۔ ریاض
(٤) السیرة النبویه الصحیحه	ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری	مکتبۃ العبیکان ۔ ریاض
(٥) السیرة النبویه	عبدالملک بن ہشام	دار المعرفۃ ۔ بیروت
(٦) السیرة النبویه	امام محمد بن احمد ذہبی	دار الکتاب العربی ۔ بیروت
(۷) سرور عالم ﷺ	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	ترجمان القرآن ۔ لاہور
(۸) سیر أعلام النبلاء	امام ذہبی	المکتبۃ التوفیقیہ ۔ قاہرہ
(۹) الشفاء بتعریف المصطفیٰ	قاضی عیاض بن موسیٰ یحصبی	دار الارقم ۔ بیروت
(۱۰) فقه السیرة	شیخ محمد غزالی	دار القلم ۔ دمشق
(۱۱) فقه السیرة	ڈاکٹر محمد سعید رمضان	دار الفکر ۔ بیروت
(۱۲) الکامل	حافظ علی بن محمد ابن الاثیر	بیت الافکار الدولیہ بیروت والریاض
(۱۳) محمد رسول الله ﷺ	شیخ محمد صادق عرجون	دار القلم ۔ دمشق

توحید و عقائد

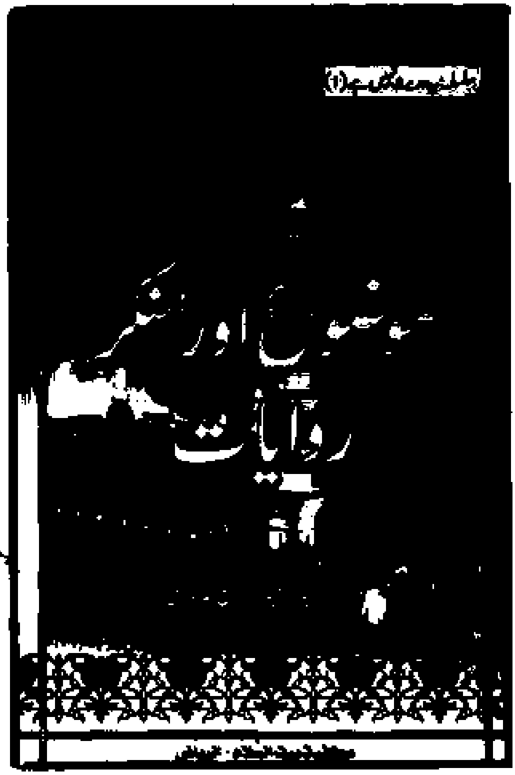
(۱) الآيات البينات في عدم سماع الأموات	علامہ نعمان بن محمود آلوسی	المکتب الاسلامی۔ بیروت
(۲) الاسماء والصفات	امام احمد بن حسین بیہقی	مکتبہ السوادی۔ جدہ
(۳) اسماء الله وصفاته	ڈاکٹر عمر سلیمان عبداللہ اشقر	دار النفائس۔ بیروت
(٤) اقتضاء الصراط المستقيم	امام ابن تیمیہ	دار الکتاب العربی۔ بیروت
(٥) تحذير الساجد من اتخاذ القبور مساجد	محدث محمد ناصر الدین البانی	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(٦) شرح العقيدة الطحاويه	علامہ ابن ابی العز	المکتب الاسلامی۔ بیروت
(٧) العقيدة الطحاويه	امام احمد بن محمد طحاوی	دار الافتاء۔ ریاض
(٨) عقيدة المسلم	شیخ عبدالعزیز بن باز	دار الداعی۔ ریاض
(٩) قاعدة جليله في التوسل والوسيلة	امام ابن تیمیہ	المکتبۃ العصریہ۔ بیروت
(١٠) القواعد المثلى في صفات الله	شیخ محمد بن صالح عثیمین	مکتبہ اضواء السلف۔ ریاض
(١١) كتاب الايمان	امام عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ	مکتبۃ المعارف۔ ریاض
(١٢) كتاب التوحيد	امام ابن خزیمہ	دار الحدیث۔ قاہرہ
(١٣) كتاب التوحيد	شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب	دار الداعی۔ ریاض
(١٤) محبة الرسول ﷺ	عبدالرؤف محمد عثمان	دار التربیہ والتراث۔ بیروت

تصوف و سلوک

(۱) تصوف کیا ہے؟	مولانا محمد منظور نعمانی	الفرقان بک ڈپو۔ لکھنو
(۲) تصوف اور شریعت	ڈاکٹر عبدالحق انصاری	مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی

(٣) تلبیس ابلیس	امام ابن الجوزی	مکتبہ دار البیان۔ بیروت
(٤) التنسك الاسلامی	ڈاکٹر محمد غلاب	المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ۔ قاہرہ
(٥) دین تصوف وطریقت	مولانا سید محمد علی حسین	الاوراق پبلشر۔ حیدر آباد، ہند
(٦) الرسالة القشيريه	شیخ ابو القاسم عبد الکریم القشیری	المکتبۃ العصریہ۔ بیروت
(٧) شریعت وطریقت	مولانا اشرف علی تھانوی	مرکزی ادارۂ تبلیغ۔ دہلی
(٨) فضائل اعمال	مولانا محمد زکریا کاندھلوی	ادارہ بیت القرآن۔ دہلی
(٩) فقه التصوف	امام ابن تیمیہ	دار الفکر العربی۔ بیروت
(١٠) مدارج السالکین	امام ابن القیم	المکتبۃ العصریہ۔ بیروت

سلسلہ: یہ حدیث نہیں ہے





ناشر و تقسیم کار

مکتبہ بیت السلام

پوسٹ بکس: 16737- الریاض: 11474- سعودی عرب

فون: 4460129- فیکس: 4462919

موبائل: 0505440147 - 0542666646

ISBN: 978-603-00-0947-3

سلسلہ: یہ حدیث نہیں ہے ۱



موضوع اور منکر روایات

تالیف | ڈاکٹر سید سعید احسن عابدی



مکتبہ قدوسیہ

مکتبہ بیت السلام لاہور ریاض

موضوع اور منکر روایات

سلسلہ: یہ حدیث نہیں ہے (۱)

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"مَنْ يَّقُلْ عَلَيَّ مَا لَمْ اَقُلْ فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ"

"جس نے میری طرف وہ بات منسوب کی جو میں نے نہیں کہی ہے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے" [بخاری:۱۰۹]

موضوع اور منکر روایات

حصہ اول

ڈاکٹر سید سعید احسن عابدی

ناشر

مکتبة بيت السلام - الرياض

طبع

١٤٣٤ھ ـــــــــــ ٢٠١٣ء

مکتبہ بیت السلام
فون نمبر 4381122-4381155 فیکس 4385991
موبائل نمبر 0505440147 - 0542666646 - 0532666640
bait-us-salam@hotmail.com
الریاض 11474 سعودی عرب

بسم الله الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱	مقدمہ	۲۳
	باب اوّل......وضع حدیث کے اسباب و مقاصد	
۲	اسلام کے بنیادی مآخذ: کتاب و سنت	۳۹
۳	ہدایت کے لیے قرآن و حدیث سے بیک وقت رجوع کرنا ضروری ہے	۳۹
۴	نبی ﷺ کے فرائض منصبی	۳۹
۵	سورۃ الحشر کی آیت ۷ کی تشریح	۴۲
۶	قرآن کی محاکات محال ہے لیکن حدیث کی محاکات ممکن ہے	۴۱
۷	احادیث میں وضع حدیث کی پیشین گوئی	۴۵
۸	وضع حدیث کے فتنہ سے عہدِ صحابہ پاک تھا	۴۳
۹	وضاعین حدیث	۴۴
۱۰	زنادقہ اور ملحدین	۴۴
۱۱	اہل بدع	۴۴
۱۲	ارباب زہد و تصوف	۴۵
۱۳	قصہ گو واعظین	۴۹
۱۴	شہرت کے متمنی دنیا دار	۴۹
۱۵	سادہ لوح مسلمان	۵۰

۱۶	موضوع حدیث کی پہچان	۵۰
۱۷	وضاعین کا اعتراف	۵۱
۱۸	راوی کی تاریخ پیدائش میں غلط بیانی	۵۱
۱۹	راوی کا جھوٹا ہونا	۵۲
۲۰	حدیث کی زبان کا مبتذل اور گھٹیا پن	۵۳
۲۱	حدیث کا عقل، مشاہدہ، کتاب اللہ اور متواتر حدیث کے خلاف ہونا	۵۴
۲۲	راوی کا کسی گمراہ فرقے سے تعلق	۵۴
۲۳	موضوع اور منکر روایات کو پھیلانے میں صوفیا کا کردار	۵۴
۲۴	موضوع، منکر اور ضعیف حدیثوں کے بیان میں محدث البانی کی خدمات	۵۸

باب دوم .... اصطلاحاتِ حدیث

۲۵	حدیث کی تعریف	۶۳
۲۶	سند کی تعریف اور اس کی مثال	۶۳
۲۷	اسناد کی تعریف	۶۴
۲۸	حدیث مسند	۶۴
۲۹	متن کی تعریف اور مثال	۶۴
۳۰	حدیث مرفوع	۶۵
۳۱	حدیث موقوف	۶۵
۳۲	حدیث مقطوع	۶۶
۳۳	حدیث صحیح کی تعریف	۶۶
۳۴	عدالت	۶۶
۳۵	شذوذ	۶۷
۳۶	علت	۶۷
۳۷	حدیث صحیح کی مثال	۶۷

۳۸	حدیث حسن کی تعریف	۶۸
۳۹	حدیث حسن کی مثال	۶۸
۴۰	حدیث صحیح لذاتہ کی تعریف	۶۹
۴۱	حدیث حسن لذاتہ کی تعریف	۶۹
۴۲	حدیث صحیح لغیرہ کی تعریف	۶۹
۴۳	حدیث صحیح لغیرہ کی مثال	۶۹
۴۴	حدیث حسن لغیرہ کی تعریف اور مثال	۷۰
۴۵	ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ	۷۱
۴۶	علم جرح و تعدیل	۷۲
۴۷	تعدیل کی تعریف	۷۲
۴۸	جرح کی تعریف	۷۲
۴۹	ثقاہت کے مراتب اور درجات	۷۲
۵۰	ضعیف حدیثوں کی قسمیں	۷۷
۵۱	عدالت کو مجروح کر دینے والے اسباب	۷۷
۵۲	ضبط و حفظ کو مجروح کر دینے والے اسباب	۷۷
۵۳	حدیث شاذ کی تعریف	۷۷
۵۴	حدیث شاذ کی مثال	۷۸
۵۵	حدیث منکر کی تعریف	۷۹
۵۶	حدیث منکر کی مثال	۸۰
۵۷	حدیث متروک کی تعریف	۸۱
۵۸	حدیث متروک کی مثال	۸۱
۵۹	موضوع کی تعریف	۸۲
۶۰	موضوع روایات کی مثالیں	۸۳
۶۱	حدیث معلق کی تعریف	۸۵

۶۲	حدیث معلق کی پہلی مثال	۸۵
۶۳	حدیث معلق کی دوسری مثال	۸۵
۶۴	حدیث مرسل کی تعریف	۸۶
۶۵	حدیث مرسل کی مثال	۸۶
۶۶	حدیث منقطع کی تعریف	۸۷
۶۷	حدیث منقطع کی مثالیں	۸۷
۶۸	پہلی مثال	۸۷
۶۹	دوسری مثال	۸۸
۷۰	حدیث معضل کی تعریف	۸۹
۷۱	حدیث معضل کی مثال	۸۹
۷۲	مدلس کی تعریف	۹۱
۷۳	تدلیس کی قسمیں: سند میں تدلیس، شیوخ میں تدلیس	۹۱
۷۴	سند میں تدلیس کی مثال	۹۱
۷۵	شیوخ میں تدلیس کی مثال	۹۲
۷۶	غریب کی تعریف	۹۵
۷۷	غریب کی قسمیں: غریب مطلق، غریب نسبتی	۹۵
۷۸	غریب کی مثال	۹۵
۷۹	غریب نسبتی کی مثال	۹۶
۸۰	اعتبار کی تعریف	۹۷
۸۱	متابع کی تعریف	۹۷
۸۲	شاہد کی تعریف	۹۷
۸۳	متابع کی مثال	۹۸
۸۴	شاہد کی مثال	۹۹

باب سوم..........عقائد و ایمانیات

۸۵ اسلام میں عقائد کا درجہ ۱۰۱
۸۶ اللہ اپنی ذات اور صفات میں یکتا اور بے مثل ہے ۱۰۱
۸۷ وسیلہ اور اس کے جائز طریقے ۱۰۱
۸۸ غیر اللہ کو وسیلہ بنانا جائز نہیں ہے ۱۰۴
۸۹ نبی ﷺ کی ذات اور مرتبہ کو وسیلہ بنانا ناجائز ہے ۱۰۶
۹۰ حلول اور وحدۃ الوجود کا عقیدہ مشرکانہ ہے ۱۰۷
۹۱ معرفت الٰہی کی حقیقت ۱۰۸
۹۲ صفات الٰہی سے موصوف ہونے کا عقیدہ مشرکانہ ہے ۱۰۹
۹۳ ایمان میں زیادتی اور نقصان ۱۰۹
۹۴ پتھر سے نفع کی اُمید کرنا شرک ہے ۱۱۲
۹۵ تصورِ شیخ ۱۱۲
۹۶ حدیث کی صحت کے لیے مطابق حق ہونے کی شرط باطل ہے ۱۱۴
۹۷ اہل قبور سے استعانت شرک ہے ۱۱۷
۹۸ وطن سے محبت کا تعلق ایمان سے نہیں ۱۲۱
۹۹ عقل کے فضائل کے بارے میں کوئی حدیث صحیح نہیں ۱۲۳
۱۰۰ اُمید و خوف سے دل کو پاک کر کے عبادت کا نظریہ صوفیانہ ہے ۱۲۴
۱۰۱ اسلام میں ابدال اور اقطاب کا نظریہ صوفیا کی ایجاد ہے ۱۲۷
۱۰۲ نبی ﷺ کے والدین زندہ کیے جانے اور ایمان لانے کا واقعہ جھوٹ ہے ۱۳۱

باب چہارم..........عبادات

۱۰۳ صفائی اور طہارت ۲۰۳
۱۰۴ اذان کی فضیلت ۲۱۳

۱۰۵ اذان سُننے کے بعد درود اور دعائے وسیلہ پڑھنے کا حکم ۲۱۷
۱۰۶ اذان میں "أشهد أن محمد رسول الله" سُننے پر انگشت شہادت چوم کر آنکھوں میں لگانے کا حکم ۲۱۸
۱۰۷ اسلام میں نماز کا مقام ۲۱۹
۱۰۸ نماز اسلام کا عملی مظہر ہے
۱۰۹ درود وسلام کی فضیلت ۱۸۸
۱۱۰ جمعہ کے دن درود وسلام کی فضیلت ۱۹۰
۱۱۱ صحیح عقیدۂ توحید کے بغیر درود وسلام بیکار ہے
۱۱۲ فضائل قرآن ۱۵۵
۱۱۳ تفسیر اور فضائل اعمال کی کتابوں میں مذکور بیشتر روایات باطل ہیں ۱۷۷
۱۱۴ قرآن پاک اور سورتوں کے فضائل میں صحیح احادیث پر عمل کافی ہے ۱۸۲
۱۱۵ اذکار واوراد ۱۳۵
۱۱۶ ذکر کے فضائل ۱۴۱
۱۱۷ وہی ذکر صحیح اور کارثواب ہے جو کتاب وسنت سے ثابت ہے
۱۱۸ ذکر کے باب میں موضوع حدیثیں پھیلانے والے ۱۵۴
۱۱۹ ذکر عبادت ہے اور عبادت وہی مقبول ہے جو منصوص ہو
۱۲۰ ذکر مفرد کی کوئی شرعی بنیاد نہیں ۱۵۵

باب پنجم .... سیرت پاک اور شمائل مطہرہ

۱۲۱ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵ میں "نور" سے کیا مُراد ہے ۲۷۱
۱۲۲ نورِ نبی کی روایت باطل ہے ۲۷۳
۱۲۳ نور نبی کی روایت پھیلانے والے بشریت رسول کے منکر ہیں ۲۷۵

۱۲۴ بشریت رسول کا عقیدہ رسالت کے عقیدے کا لازمی حصہ ہے ۲۷۶
۱۲۵ کوئی مادۂ تخلیق فضیلت نہیں رکھتا ۲۷۷
۱۲۶ نبی ﷺ کا تخلیقِ کائنات کا سبب ہونا باطل اور قرآن کے خلاف ہے ۲۷۷
۱۲۷ جن و انس کی تخلیق کا سبب عبادت ہے ۲۷۹
۱۲۸ نبی ﷺ کے آدم علیہ السلام سے پہلے پیدا ہونے کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے ۲۷۹
۱۲۹ قوموں کی ایک دوسری پر فضیلت کی بنیاد تقویٰ ہے، زبان، رنگ اور نسل نہیں ۲۸۴
۱۳۰ انقطاع وحی پر نبی ﷺ کا غم زدہ ہو کر خودکشی کا ارادہ کرنے کا واقعہ صحیح نہیں ہے ۳۰۱
۱۳۱ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۲۳ میں "المودۃ فی القربیٰ" سے کیا مُراد ہے؟ ۳۰۵
۱۳۲ "الغرانیق" کا قصہ باطل اور رسول اللہ ﷺ کی عصمت کے منافی ہے ۳۱۵
۱۳۳ سورۃ الحج کی آیت ۵۲ میں لفظ "تمنیٰ" کی صحیح تفسیر ۳۱۹
۱۳۴ معراج میں نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو نہیں بلکہ جبرائیل علیہ السلام کو دوسری بار ان کی اصلی شکل میں دیکھا تھا ۳۳۴

باب ششم.........فضائل ومناقب

۱۳۵ حضرت خضر علیہ السلام ۳۴۷
۱۳۶ نبی ﷺ سے خضر علیہ السلام کی ملاقات ثابت نہیں ۳۵۱
۱۳۷ نبی ﷺ کی وفات کے بعد خضر علیہ السلام کا صحابہ کی تعزیت کرنا ثابت نہیں ۳۵۷
۱۳۸ صحابۂ کرام سے خضر علیہ السلام کی ملاقات کا کوئی بھی واقعہ صحیح نہیں ہے ۳۶۲
۱۳۹ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے خضر علیہ السلام کا علم شریعت حاصل کرنے کا واقعہ من گھڑت اور خلاف عقل ہے ۳۶۹
۱۴۰ حضرت خضر علیہ السلام کی موت یا زندگی سے متعلق کوئی بھی روایت صحیح نہیں ہے ۳۷۲
۱۴۱ خضر علیہ السلام کی نبوت وولایت کا مسئلہ؟ ۳۸۰
۱۴۲ قرآن پاک میں خضر علیہ السلام کا قصہ بیان کرنے کا مقصد نہیں ۳۸۳
۱۴۳ خلفائے راشدین کے فضائل و مناقب ۳۸۶
۱۴۴ عظیم شخصیتوں کی عقیدت میں غلو شرک کا دروازہ کھولتا ہے ۳۸۶
۱۴۵ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا حضرت ابوبکر کے لیے تجلی فرمانا باطل ہے ۳۸۷

۱۴۶	حضرت عمر کے فضائل	۳۹۵
۱۴۷	جنت کا، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے لیے بننا سنورنا من گھڑت ہے	۳۹۷
۱۴۸	حضرت عُمر کے فکر و خیال اور زبان پر حق غالب تھا	۳۹۸
۱۴۹	حضرت عثمان کے فضائل	۴۰۰
۱۵۰	صحابہ کرام کی اعانت میں حضرت عثمان کے عظیم کارنامے	۴۰۰
۱۵۱	حضرت عثمان شرم و حیا کے پیکر تھے	۴۰۱
۱۵۲	حضرت عثمان کا وتر کی ایک رکعت میں پورا قرآن ختم کرنے کا واقعہ نقلاً اور عملاً باطل ہے	۴۰۴
۱۵۳	حضرت علی کے فضائل	۴۰۴
۱۵۴	حضرت علی کے بارے میں افراط وتفریط کا سبب	۴۰۵
۱۵۵	حضرت علی سے محبت کرنے والا مومن اور بغض رکھنے والا منافق ہے	۴۱۴
۱۵۶	نبی ﷺ نے حضرت علی کی عیب جوئی سے منع فرمایا ہے	۴۱۶

فہرست موضوع اور منکر روایات

نمبر	روایات کا ابتدائی فقرہ	صفحہ
۲۰	الأبدال في هذه الأمة ثلاثون	۱۲۷
۱۵۱	أتاني أخ لي من الشام	۳۵۳
۷۲	أتاني جبريل عليه السلام	۲۶۵
۱۶۱	أتاني جبريل أنفا	۳۹۶
۱۴۵	اتخذ الله ابراهيم خليلاً	۳۲۹
۱۵۲	أحب الأعمال الى الله	۳۵۶
۱۶۵	أحبوا العرب لثلاث	۳۸۳
۱۷۴	أخذت من لحية رسول الله ﷺ	۳۰۹
۱۳۸	أدبني ربي فأحسن تأديبي	۳۱۱
۳۳	أدفنو الأظفار والدم	۲۱۲
۳۲	أدفنو دمائكم وأشعاركم	۲۱۱
۶۴	إذا أخذ المؤذن في أذانه	۲۱۳
۴۲	إذا أعيتكم الأمور	۱۱۷
۴۱	إذا حدثتم عني بحديث	۱۱۴
۶۶	إذا سمعت النداء فأجب	۲۱۶
۶۷	إذا سمعتم المؤذن أذن	۲۱۷
۷۸	إذا صعد الخطيب المنبر	۲۳۲
۲۷	إذا كان في الثوب قدر الدرهم من الدم	۲۰۴
۷۱	إذا كانت ليلة النصف من شعبان	۲۶۴

۷۷	إذا كانو ثلاثة فليؤمهم	۲۳۰
۱۱۴	إذا وقعت في ورطة	۱۴۸
۱۴۰	أسست السموٰت والأرضون	۱۷۷
ـ	اصحابي كالنجوم	
۱۱۳	أكثروا من الصلاة عليَّ يوم الجمعة	۱۹۹
۷۳	أكنت تخافين أن يحيف الله عليكِ ورسولُه	۲۶۲
۱۳۵	اللهم إنك اخرجتني	۳۰۹
ـ	اللهم إني أسألك الثبات في الأمر	
۱۳۹	أنا ابن الذبيحين	۲۹۹
۱۶۴	أنا عربي والقرآن عربي	۲۸۲
۱۷۰	انا مدينة العلم وعلي بابها	۳۱۰
۱۸۳	إنا كنا بفارس إذا حوصرنا خندقنا علينا	۳۲۵
۱۶۹	أنت أول من آمن بي	۳۰۹
۱۸۸	أن رسول الله ﷺ كان في المسجد	۳۳۷
۱۶۳	أن رسول الله ﷺ أتى بجنازة	۳۰۲
۱۴۷	إن الله أعطى موسى الكلام	۳۳۳
۱۴۴	إن الله اتخذني خليلاً	۳۲۷
۱۳۷	إن الله تعالىٰ فضل المرسلين	۳۱۰
۱۴۵	إن الله تعالىٰ قرأ طٰه	۱۸۴
۱۵۸	إن الله تعالىٰ لما خلق الأرواح	۳۹۰
۶۵	إن الله ليس بتاركِ أحداً	۲۵۴
۱۶۴	إن الله سيفا مغموداً في غِمده	۳۰۳
۱۱۰	إن الله عمودا تحت العرش	۱۴۳
۱۲۹	إن لكل شئ قلباً	۱۶۲
۱۶۸	أن النبي ﷺ صلى الظهر بالصهباء	۳۰۷

۱۴۱ إن النبی ﷺ کان بمکة فقرأ سورة النجم ۳۱۵

۲۲ إن الأبدال بالشام یکونون ۱۲۹

۸۴ إن فاتحة الکتاب وآیة الکرسی ۱۵۸

۸۳ ان القوم لیبعث الله علیهم ۱۵۷

۸۶ ان من صلی المغرب أول لیلة من رجب ۲۶۱

۳۶ إن المؤذنین والملبین ۲۱۴

- إن ولیتموها أبا بکر فقوی أمین ....

۸۵ أنزل الله آیتین من کنوز الجنة ۱۵۹

۱۲۷ انطلق النبی ﷺ و أبوبکر ۲۸۹

- ایاکم ، خضراء الدمن ....

۷ الایمان مثبت فی القلب ۱۰۹

۱۹ بکی شعیب النبی ﷺ ۱۲۴

۱۵۵ بینا أنا أطوف بالبیت ۳۶۴

۱۵۴ بینما عمر بن الخطاب یصلی علی جنازة ۳۶۳

۶ تخلقوا بأخلاق الله ۱۰۹

۲۶ تنظفوا بکل ماستطعتم ۲۰۳

۱۶۲ تفاخرت الجنة والنار ۳۹۷

۲ توسلوا بجاهی فان جاهی عند الله عظیم ۱۰۶

- توفی رسول الله ﷺ وهو ابن خمس وخمسین سنة ....

۹۲ حامل القرآن حامل رایة الإسلام ۱۶۹

۴۴ حب الوطن من الإیمان ۱۲۱

۲۴ حج بنا رسول الله ﷺ ۱۳۱

۱۷ حسنات الأبرار سیئات المقربین ۱۲۲

۱۴۶ حضرت النبی ﷺ ذات مرة ۳۳۰

۱۳۱	حملة القرآن أولياء الله	۱۶۸
۱۲۸	خرج ابو طالب الى الشام	۲۹۴
۱۶۲	خُلقت أنا وعلى من نور	۳۰۷
۲۳	خيار اُمتي في كل قرن خمسمائة	۱۳۰
۲۸	الدم مقدار الدرهم	۲۰۵
۱۸	الدين هو العقل	۱۲۳
۷۰	رأيت رسول الله ﷺ ليلة النصف من شعبان رجعنا من الجهاد الأصغر الى الجهاد الأكبر	۲۶۳
۵۱	ركعتان بعمامة	۲۳۶
۱۱	الشيخ في بيته كالنبي في قومه	۱۱۲
۱۲	الشيخ في جماعته كالنبي في قومه	۱۱۳
۵۲	الصلاة في العمامة	۲۳۷
۵۰	صلاة بعمامة تعدل	۲۳۴
۶۱	صلاة الرجل في بيته	۲۵۰
۶۲	الصلاة في المسجد الحرام	۲۵۱
۱۵۷	صلى بنا رسول الله ﷺ	۳۸۸
۱۶۶	عبدت الله عزوجل مع رسول الله ﷺ	۳۰۵
۱۱۲	عند كل ختمة للقرآن دعوة مستجابة	۱۴۵
۹۳	فضل حملة القرآن	۱۷۰
۱۱۵	فكر ساعة خير من عبادة ستين سنة	۱۴۹
۵۴	كان إذا قضىٰ صلاته	۲۴۰
۵۵	كان إذا قضى صلاته	۲۴۱
۱۳۲	كان إذا نظر الى البيت قال	۳۰۸
۱۳۳	كان إذا وطئ اثر قدمه	۳۰۹
۳۴	كان يأمر بدفن الشعر والأظفار	۲۱۲
۱۴۲	كان يرى في الظلمة كما يرى في الضوء	۳۲۲

۵۳ كان الناس في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ۲۳۸
ـ كلو البلح بالتمر ......
۴ كنت كنزا مخفياً لا أعرف ۱۰۸
۱۲۳ كنت أول النبين في الخلق و آخرهم في البعث ۲۸۱
۱۲۱ كنت نبياً، وآدم بين الماء والطين ۲۷۹
۱۲۲ كنت بنياد ولا آدم ولا ماء ولا طين ۲۷۹
۱۳۶ كنت في صلبه ۳۰۹
۲۱ لا يزال في أُمتي ثلاثون ۱۲۸
۱ لما اقترف آدم الخطيئة ۱۰۴
۱۵۶ لما حزج رسول الله صلى الله عليه وسلم من الغار ۳۸۷
۱۵۲ لما قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم ۳۵۶
۱۵۳ لما مرض رسول الله صلى الله عليه وسلم ۳۵۸
۱۳۰ لما نزل عليه الوحي بحراء ۳۰۱
۱۳۱ لما نزلت : قل لا اسألكم عليه من أجر ۳۰۵
۱۵۹ لما ولد ابو بكر ۳۹۲
۱۵ لكل شيء أسٌّ ۱۲۰
۱۰ لو اعتقد احدكم بحجر لنفعه ۱۱۲
۱۲۰ لولاك لما خلقت الأفلاك ۲۷۷
۱۲۶ ليلة الغار أمر الله عزوجل شجرةً ۲۸۶
۴۷ ليؤمكم احسنكم وجها ۲۲۸
۷۷ ما من دعوة لا يصلى على النبي صلى الله عليه وسلم قبلها ۱۹۵
ـ ما من عبد يصلي عليَّ إلا صلت عليه الملائكة ۱۷۰
۹۴ ما من ميت يموت ۱۷۰
۳ ما وسعني سمائي ولا أرضي ۱۰۷
۳۹ مسح العينين بباطن أنملتي السبابتين ۲۱۸

۳۱	مسح الرقبة أمان من الغل	۲۰۸
۵۷	من السنة أن لا يصلى الرجل بالتيمم	۲۴۲
۱۱۲	من أوى الى فراشه ، فقال	۱۵۰
۸	من بلغه عن الله شئ فيه فضيلة	۱۱۱
۹	من بلغه عن الله فضلٌ	۱۱۱
۶۲	من اغتسل يوم الجمعة كفرت ذنوبه	۲۵۵
۳۱	من توضأ ومسح عنقه	۲۰۸
۹۵	من دخل المقابر ، فقرأ سورة يس	۱۷۱
-	من رفع يديه فى الركوع	
۴۵	من رفع يديه فى الصلاة	۲۲۵
۴۶	من رفع يديه فى الصلاة	۲۲۶
۱۴۱	من زارنى بعد موتى فكأنما زار نبى فى حياتى	۳۱۲
۴۲	من صلى بين المغرب والعشاء	۲۲۳
۴۲	من صلى ركعتين لا يراه الا الله عزوجل	۲۴۲
۴۳	من صلى ست ركعاتٍ بعد المغرب	۲۲۴
۶۳	من صلى عشرين ركعة بين العشاء والمغرب	۲۵۳
۶۴	من صلى يوم الجمعة ما بين الظهر والعصر	۲۵۴
۶۷	من صلى يوم عاشوراء ما بين الظهر والعصر	۲۵۷
۷۴	من صلى عليَّ يوم الجمعة ثمانين مرة	۱۹۱
۷۵	من صلى عليَّ فى كل يوم جمعة أربعين مرة	۱۹۲
۷۶	من صلى عليَّ فى يوم الجمعة ألف مرة	۱۹۳
۷۸	من صلى عليَّ عند قبرى سمعته	۱۹۶
۸۰	من صلى عليَّ فى كتابٍ	۲۰۰
۴۴	من صلى فى مسجدى أربعين صلاة	۲۲۴
۵	من عرف نفسه فقد عرف ربه	۱۰۸

۔	من عشق معف فمات	
۱۰۹	من قال احدی عشرة مرة	۱۴۱
۱۱۱	من قال لا إله إلا الله قبل كل شئ	۱۴۴
۵۹	من قرأ خلف الإمام مُلي فوه ناراً	۲۴۶
۶۰	من قرأ خلف الإمام فلاصلاة له	۲۴۷
۶۹	من قرأ ليلة النصف من شعبان	۲۶۳
۸۲	من قرأ القرآن واستظهره	۱۵۶
۸۸	من قرأ آية الكرسي	۱۶۴
۸۶	من قرأ سورة آل عمران	۱۶۲
۹۰	من قرأ السورة التي يذكر فيها آل عمران	۱۶۷
۹۹	من قرأ سورة يٰس	۱۷۷
۱۰۴	من قرأ اثر و ضوئه	۱۴۳
۱۰۷	من قرأ حٰم الدخان	۱۸۵
۱۰۸	من قرأ حٰم الدخان	۱۸۶
۸۲	من قرأ رُبع القرآن	۱۶۳
۱۰۱	من قرأ قُل هو الله احد	۱۷۸
۱۰۲	من قرأ قل هو الله احد	۱۸۰
۱۰۳	من قرأ قل هو الله احد	۱۸۰
۶۹	من قرأ ليلة النصف من شعبان ، قل هو الله احد	۲۶۴
۹۷	من قرأ يٰس	۱۷۳
۹۸	من كتب يٰس	۱۷۵
۔	من كذب عليَّ متعمداً ليضل به الناس	
۴۰	من لم تنهه صلاته	۲۲۰
۴۱	من لم تنهه صلاته	۲۲۰
۹۶	من مرَّ على المقابر	۱۷۲

۱۱۸	نزل علی جبریل فقال	۱۵۲
۲۵	هبط جبریل علیّ	۱۳۳
۱٦۵	وصف لنا رسول الله صلی الله علیه وسلم	۴۰۳
۲۹	الوضوء من کل دم سائل	۲۰۵
۱۳۹	ولدت فی زمن الملك العادل	۳۱۲
۱۵۰	یجتمع کل یوم عرفة بعرفه	۳۵۱
۱۰٦	یس لما قرئت له	۱۸٦
۱۴۹	یلتقی الخضر والیاس علیهما السلام	۳۵۰
۸۱	یا ابا کاهل! من صلی علیَّ کل یوم ثلاث مرات	۲۰۱
۵۸	یا أهل مکة لا تقصروا الصلاة	۲۴۵
۱۱۹	یا جابر! ان الله خلق قبل الاشیاء نور نبیك	۲۷۳

مقدمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن پاک انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ آخری ہدایت نامہ ہے جو لفظاً اور معناً اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے:

﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [الحجر : ۹]

''ہم ہی نے الذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

قرآن کریم نزول کے وقت سے لے کر قیامت تک ہر طرح کے ردو بدل اور آمیزش سے پاک اور محفوظ ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَ هُمْ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴾ [فصلت : ٤١]

''بے شک جن لوگوں نے الذکر کا جب وہ اُن کے پاس آیا انکار کیا (ان کو اس کی سزا مل کر رہے گی) بے شک یہ کتاب غالب رہنے والی ہے، باطل نہ تو اس پر سامنے سے اثر انداز ہوسکتا ہے اور نہ پیچھے سے۔ یہ تو صاحبِ حکمت اور قابلِ ستائش ہستی کی نازل کردہ ہے۔''

دنیا کا بڑے سے بڑا ادیب اور زبان داں اس جیسا کلام نہیں پیش کرسکتا۔ بلکہ اگر دنیا بھر کے اہل زبان اور فصحاء و بلغاء ایک ساتھ مل کر اس جیسا کلام تخلیق کرنے کی کوشش کریں تو ان کو منہ کی کھانی پڑے گی:

﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَنْ يَّأْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴾ [الاسراء : ۸۸]

''اے نبی! کہہ دو اگر انسان اور جن اس قرآن جیسا کوئی کلام لانے کے لیے اکٹھے ہو جائیں تو وہ اس جیسا کلام نہیں لاسکیں گے۔ چاہے وہ ایک دوسرے کے پشتیبان ہی کیوں نہ ہوں۔''

قرآن لفظاً اور معناً اعجازی شان رکھتا ہے۔ وہ منزل من اللہ ہے، توحید کے اقرار کے بعد عملی ارکان کے سب سے اہم اور بنیادی رکن نماز میں اس کی تلاوت لازمی ہے جس کے بغیر نماز صحیح نہیں ہوتی ہے۔

قرآن پاک جس طرح نبی ﷺ پر نازل ہوا تھا اور آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے جس طرح اسے مرتب فرمایا تھا، وہ پوری دنیا میں اسی ترتیب اور انہی الفاظ کے ساتھ محفوظ ہے۔ جو لوگ اسے سمجھتے اور جو نہیں سمجھتے دونوں اس کی تلاوت ایک ہی طرح سے کرتے ہیں۔ اس کے اعجاز اور اس کے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جس کی کتابت اہل زبان اور غیر اہل زبان یکساں طریقے سے کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح اس کی کتابت اہل زبان کرتے ہیں ٹھیک اسی طرح وہ لاکھوں لوگ بھی کرتے ہیں جو اس کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھتے۔ مگر دونوں کی کتابتوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ سینکڑوں برس قبل قرآن پاک کے لکھے ہوئے نسخوں کو موجودہ دور میں لکھے ہوئے نسخوں سے مقابلہ کر کے دیکھیے تو دونوں میں ایک حرف اور ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ملے گا۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا ہے اسی طرح اس کی لفظی اور عملی تشریح نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ اور سنت مبارکہ کو بھی محفوظ کر دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری دین ہے جس کے بعد کوئی اور دین نہیں اور قرآن اس کا آخری ہدایت نامہ ہے جس کے بعد کوئی دوسرا ہدایت نامہ نہیں ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے دنیا میں جتنے انبیاء اور رسول مبعوث فرمائے ان سب میں صرف محمد ﷺ کی ذاتِ گرامی ہی ایسی ہے جن کی سیرت پاک اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اور آپ کی قولی اور فعلی سنت اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ محفوظ ہے اور ابتدائے آفرینش سے اب تک پیدا ہونے والی قوموں میں تنہا ''اُمت مسلمہ'' کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے ہادی و رہنما محمد ﷺ کی حیاتِ پاک کے صحیح واقعات اور آپ کی قولی اور فعلی حدیث کی صحت معلوم کرنے کے لیے ''علم حدیث'' کی اصطلاح ایجاد کی اور محدثین کا گروہ وہ پاکیزہ گروہ ہے جس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار روایات کی صحت و عدم صحت کو جانچنے کے لیے علمی بنیادیں اور اصول بنائے۔ کھرے کو کھوٹے سے ممتاز کرنے کے لیے قواعد وضوابط بنائے اور حدیث رسول ﷺ کے راویوں کے معتبر ہونے نہ ہونے کو پرکھنے کے لیے ''علم جرح و تعدیل'' ایجاد کیا اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں راویوں کے حالاتِ زندگی، ان کی عدالت و امانت داری اور روایت حدیث میں ان کی صداقت و عدم صداقت اور قوت حافظہ وغیرہ کو بے لاگ طریقے سے بیان کر دیا اور کسی حدیث پر صحت یا عدم صحت کا حکم لگانے سے پہلے اس کی سند کی صحت و عدم صحت کی تحقیق کے ساتھ ساتھ اس کے متن کو درایت کی کسوٹی پر رکھ کر دیکھا کہ آیا یہ قول نبی کریم ﷺ

کی زبانِ مبارک سے ادا ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس طرح انہوں نے عقائد و ایمانیات سے لے کر دین کے تمام شعبوں سے متعلق احادیث کا ایک نہایت معتبر اور مستند ذخیرہ دنیا کے سامنے رکھ دیا جس سے زیادہ قابل اعتماد اور مستند ذخیرہ کتاب الٰہی کے بعد کوئی اور نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

لیکن رسول اکرم ﷺ بہر حال بشر تھے اور آپ ؐ کا کلام ایک بشر کا کلام ہے اور حدیث کی وہ قسم جو آپ کے ارشادات پر مشتمل ہے ان کے معانی تو بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں:

﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ﴿٣﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ﴿٤﴾ ﴾ [النجم: ۳، ۴]

''(نبی) اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا یہ تو صرف ایک وحی ہے جو اس کو کیجاتی ہے۔''

مگر تعبیر اور ترجمانی آپ کی اپنی ہے، رہے آپ کے افعال اور دوسروں کے اعمال پر آپ کی خاموشی (تقریر) تو ان کے راوی اور ناقل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جو جمہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک حد درجہ سچے، امانت دار اور قابل بھروسہ تھے۔ ((اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ)) لیکن نبی اکرم ﷺ کے ارشادات اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کی روایات اعجازی شان نہیں رکھتی تھیں کہ ان کی ''محاکاۃ'' نہ کی جا سکے۔ یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ افصح العرب تھے اور فصاحت و بلاغت کی سب سے بلند چوٹی پر فائز تھے اور جس طرح آپ کی شخصیت ایک امتیازی اور انفرادی شان رکھتی تھی اسی طرح آپ کی ایک خاص زبان اور آپ کا ایک خاص انداز بیان تھا جو دوسروں سے بالکل منفرد اور ممتاز تھا مگر اس کی پرکھ اور تمیز وہی لوگ کر سکتے ہیں جو عربی زبان و ادب میں غیر معمولی مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ برسہا برس حدیث نبوی کے درس و مطالعہ میں مشغول رہے اور وہ دین کے مزاج شناس ہونے کے ساتھ ساتھ نبی ﷺ کی زبان اور اسلوب بیان کے بھی شناسا بن چکے ہوں اور ان کے اندر حدیث نبوی سے پھوٹنے والی خوشبو کو سونگھ لینے اور اس سے نکلنے والی روشنی کو دیکھ لینے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہو، ہر کس و ناکس نہ پہلے یہ صلاحیت رکھتا تھا اور نہ اب رکھتا ہے۔ اس تناظر میں یہ اندیشہ موجود تھا کہ اسلام دشمن عناصر مسلمانوں کے عقائد کو بگاڑنے کے لیے جھوٹی جھوٹی باتیں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے لوگوں میں پھیلائیں گے۔ اسی اندیشے کے پیش نظر نبی ﷺ حدیثیں گھڑنے سے مسلسل منع فرماتے رہے اور اس سنگین معصیت کے بُرے انجام سے لوگوں کو برابر خبردار کرتے رہے۔ اس طرح نبی ﷺ کی حیات پاک اور آپ کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت میں ''وضع حدیث'' کا فتنہ نہ پیدا ہوا اور نہ پیدا ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ اولاً تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی نبی ﷺ کے ان ارشادات کے راوی ہیں جن میں نبی ﷺ نے جھوٹی حدیثیں گھڑنے

سے منع فرمایا ہے اور عقلاً یہ بات محال کے درجے میں ہے کہ وہی سب سے پہلے ان ارشادات کی خلاف ورزی کرتے اور تجربہ بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ صحابہ کرام کا دامن اس معصیت سے کلی طور پر پاک ہے۔ دوم نبی ﷺ کا ہر ارشاد وحی الٰہی پر مبنی ہے اور ''شرع'' ہے۔ اور آپ کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو آپ نے نہ فرمائی ہو شرع میں غیر شرع کا اضافہ کرنا ہے جو حرام ہے اور صحابہ کرام سے اس حرام کے ارتکاب کی توقع کرنا ایک ایسا گناہ ہے جس کا مرتکب وہی شخص ہو سکتا ہے جس کا دل نور ایمان سے خالی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کے حوالے سے ایک بھی صحیح واقعہ ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ کسی صحابی نے کسی بھی غرض کے لیے نبی ﷺ کے نام پر کوئی جھوٹی حدیث گھڑی ہو حتیٰ کہ فتنے کے دور میں بھی کسی فریق نے فریقِ مخالف کے خلاف کوئی حدیث گھڑ کر استعمال نہیں کی بلکہ اس کے برعکس صحابہ کرام صحیح احادیث بیان کرنے میں بھی بے حد محتاط رہتے تھے۔

اوپر کی وضاحتوں کے بعد اس واقعہ کے ذکر اور اس کی نکارت بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں رہ جاتی جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''فتنہ وضع حدیث'' عہد نبوی میں پیدا ہو گیا تھا۔ اور بعض لوگ اس واقعہ کو نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد مبارک: ''جس نے جان بوجھ کر میرے نام پر کوئی جھوٹی بات گھڑی تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے'' کی ''شان نزول'' بھی قرار دیتے ہیں۔ اس لیے جملہ معترضہ کے طور پر اس کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

امام عبداللہ بن عدی نے (الکامل ص: ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ج:۴) میں امام ابن الجوزی نے (الموضوعات ص: ۵۰، ۵۱، ج:۱) میں اور امام الطحاوی نے (مشکل الآثار ص: ۱۶۵، ج:۱) میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ:

''مدینہ سے دو میل کی دوری پر ایک قبیلہ ''بنولیث'' کے نام سے آباد تھا اور بعثت سے قبل ایک شخص اس قبیلے کی ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر قبیلے والے اس کو وہ لڑکی دینے پر راضی نہیں تھے۔ نبی اکرم ﷺ کے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد وہی شخص ایک نہایت عمدہ پوشاک زیب تن کر کے مذکورہ قبیلے میں گیا اور کہا کہ یہ پوشاک مجھے رسول اللہ ﷺ نے پہنائی ہے اور مجھے تمہارے اموال اور خون کے معاملے میں حاکم بنا کر بھیجا ہے۔ یہ سن کر قبیلہ والوں نے نبی ﷺ کی خدمت میں اپنا ایک قاصد بھیج کر آپ ﷺ کو اس کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا: ((کذبَ عدو اللّٰہِ)) ''اللہ کے دشمن نے جھوٹ کہا ہے'' پھر نبی ﷺ نے ایک آدمی کو یہ حکم دے کر روانہ فرمایا کہ اگر وہ تمہیں زندہ ملے تو اسے قتل کر دینا اور اگر مردہ ملے تو اس کی لاش جلا ڈالنا۔ چنانچہ جب وہ صاحب وہاں گئے تو دیکھا کہ اس کو سانپ نے ڈس لیا ہے اور وہ مر چکا ہے۔

لہٰذا نبی ﷺ کے فرمان کی تعمیل کرتے ہوئے اُنہوں نے اس کی لاش جلا ڈالی۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ))

یہ قصہ منکر ہے اور جتنی سندوں سے مروی ہے ان میں سے کوئی بھی سند مطعون، منکر اور نا قابل اعتبار راویوں سے خالی نہیں ہے اسی وجہ سے امام ذہبی نے (میزان الاعتدال، ص: ۲۹۲، ج: ۲) میں لکھا ہے کہ: ''یہ روایت کسی بھی سند سے صحیح نہیں ہے۔''

اوپر کے جملۂ معترضہ کے بعد سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے عرض ہے کہ نبی ﷺ نے جہاں وضع حدیث سے منع فرمایا ہے وہیں آپ نے یہ پیشین گوئی فرمائی ہے کہ ایسے ناعاقبت اندیش اور دروغ گو پیدا ہوں گے جو حدیث گھڑ کر لوگوں کو گمراہ کرنے اور ان کو فتنوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کریں گے۔ نبی ﷺ نے ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنے کی ہدایت بھی کی ہے:

((حَدَّثَنِي حَرْمَلَةُ بْنُ يَحيىٰ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ حَرْمَلَةَ بْنِ عِمْرَانَ التُّجِيْبِيُّ ، قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ ، قَالَ : حَدَّثَنِيْ أبو شُرَيْحٍ ، أَنَّهُ سَمِعَ شَرَاحِيْلَ بْنَ يَزِيْدَ يَقُوْلُ : أَخْبَرَنِيْ مُسْلِمُ بْنُ يَسَارٍ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُوْلُ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : يَكُوْنُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ يَأْتُوْنَكُمْ مِنَ الْأَحَادِيْثِ بِمَا لَمْ تَسْمَعُوْا أَنْتُمْ وَلَا آبَاؤُكُمْ فَإِيَّاكُمْ وَإِيَّاهُمْ لَا يُضِلُّوْنَكُمْ وَلَا يَفْتِنُوْنَكُمْ)) ❶

''مجھ سے حرملہ بن یحییٰ بن عبداللہ بن حرملہ بن عمران التجیبی نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابن وہب نے بیان کیا، کہا: مجھ سے ابوشریح نے بیان کیا، کہا: انہوں نے شراحیل بن یزید کو کہتے ہوئے سُنا: مجھے مسلم بن یسار نے خبر دی کہ انہوں نے ابوہریرہ کو کہتے ہوئے سُنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آخری زمانے میں ایسے دجال اور جھوٹے پیدا ہوں گے جو تمہارے پاس ایسی حدیثیں لے کر آئیں گے جو نہ تم نے سُنی ہوں گی اور نہ تمہارے باپ دادا نے تو ایسے لوگوں سے اپنے آپ کو دور رکھنا تا کہ وہ تمہیں گمراہ نہ کرنے پائیں اور نہ تمہیں فتنے میں ڈالیں۔

((حَدَّثَنِيْ أبو سَعِيْدٍ الْأَشَجُّ : حَدَّثَنَا وَكِيْعٌ : حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ ، عَنِ

❶ مقدمه صحيح مسلم، ح: ١٦

الْمُسَيَّبِ بْنِ رَافِعٍ ، عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدَةَ ، قَالَ : قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ ، إِنَّ الشَّيْطَانَ لَيَتَمَثَّلُ فِيْ صُوْرَةِ الرَّجُلِ ، فَيَأْتِي الْقَوْمَ ، فَيُحَدِّثُهُمْ بِالْحَدِيْثِ مِنَ الْكَذِبِ ، فَيَتَفَرَّقُوْنَ ، فَيَقُوْلُ الرَّجُلُ مِنْهُمْ : سَمِعْتُ رَجُلًا أَعْرِفُ وَجْهَهُ وَلَا أَدْرِيْ مَا اسْمُهُ ، يُحَدِّثُ)) ❷

''مجھ سے ابوسعید الاشج نے بیان کیا، کہا: ہم سے وکیع نے بیان کیا، کہا: ہم سے الاعمش نے المسیب بن رافع سے اور انہوں نے عامر بن عبدۃ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا: انہوں نے کہا: عبداللہ (بن مسعودؓ) نے فرمایا ہے: شیطان آدمی کی شکل اختیار کر کے لوگوں کے پاس آئے گا اور ان سے جھوٹی حدیث بیان کرے گا اور جب لوگ منتشر ہو جائیں گے تو ان میں سے ایک آدمی کہے گا: میں نے ایک آدمی کو حدیث بیان کرتے ہوئے سُنا ہے جس کا چہرہ تو پہچانتا ہوں، مگر اس کا نام نہیں جانتا۔''

یہ دونوں حدیثیں جہاں وضع حدیث کی سنگینی پر دلالت کرتی ہیں وہیں اس بات پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا دامن اس عظیم معصیت سے پاک تھا، عام زندگی میں بھی ان نفوس قدسیہ کے بارے میں جھوٹ بولنے کا تصور گناہ ہے جبکہ نبی ﷺ کے نام سے جھوٹ منسوب کرنا تو بہت بڑی بات ہے۔ اس سے تو سارا عمل ہی برباد ہو جاتا ہے اور اصحاب رسول ﷺ تو وہ ہیں جن کی تربیت نبی اکرم ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی تھی اور جن کا سرمایۂ حیات اسوۂ رسول کی پیروی تھا۔ خود ائمہ حدیث روایت حدیث میں جس امانت داری اور صدق گوئی سے متصف تھے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے جس کو حافظ ابن عساکر نے ''تاریخ دمشق'' میں امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے امام محمد بن مسلم بن شہاب الزہری سے سورۃ النور کی گیارہویں آیت کے اس فقرے: ﴿ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ ''اوران میں سے جو واقعۂ افک کا سب سے بڑا ذمہ دار تھا اس کے لیے بہت بڑا عذاب مقدر ہے۔'' کے بارے میں پوچھا کہ اس سے کون مراد ہے؟ تو امام الزہری نے جواب دیا: ''عبداللہ بن اُبی بن سلول'' اس پر ہشام نے کہا: تم جھوٹ کہتے ہو، بلکہ وہ تو علی بن ابی طالب ہیں۔ یہ سننا تھا کہ امام الزہری غضبناک ہو گئے اور برجستہ فرمایا:

((أَنَا أَكْذِبُ؟ لَا أَبَالَكَ! فَوَاللّٰهِ لَوْنَادَانِيْ مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ إِنَّ اللّٰهَ أَحَلَّ

❷ مقدمه صحیح مسلم : ۱۷

الکذبَ مَا کَذِبْتُ)) ❶

''میں جھوٹ کہتا ہوں؟ تمہارا باپ مرے۔ اللہ کی قسم! اگر پکارنے والا آسمان سے مجھے پکار کر کہے کہ بے شک اللہ نے جھوٹ کو حلال کر دیا ہے تب بھی جھوٹ نہ بولوں۔''

لیکن تابعین اور ان کے بعد کے ادوار میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جن میں روایت حدیث میں وہ صدق گوئی، احتیاط پسندی اور امانت داری باقی نہ رہی جو عصر صحابہ کا طرۂ امتیاز تھی۔ ائمہ حدیث تو اب بھی صحابہ کرام کے نقش قدم کی پیروی کر رہے تھے اور نبی کریم ﷺ کی نسبت سے کوئی روایت اس وقت تک قبول نہ کرتے اور نہ اس کی روایت ہی کرتے جب تک یہ یقین نہ کر لیتے کہ اس کی نسبت نبی ﷺ سے صحیح ہے۔ مگر جہاں سیاسی اختلافات نے اُمت سے نسبت رکھنے والے ضمیر فروشوں کو سیاسی فریقوں کی تائید و حمایت کی غرض سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جھوٹی حدیثیں گھڑنے پر آمادہ کر دیا وہیں مفتوحہ ممالک میں جو لوگ اسلام میں داخل ہو رہے تھے اگر ان کی اکثریت مخلصانہ طور پر حلقۂ بگوش اسلام ہو رہی تھی تو ان میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو بظاہر تو مسلمان ہو رہے تھے لیکن ان کے دلوں میں اسلام دشمنی کا زہر بھی بھرا ہوا تھا۔ وہ میدانِ جنگ میں تو مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہ گئے تھے اس لیے انہوں نے مسلمان بن کر مسلمانوں کے ذہنوں کو مسموم بنانے کا فیصلہ کیا اور اس غرض کے لیے وضع حدیث کا سہارا لیا۔

رہے وہ لوگ جو اسلام لانے میں اگرچہ مخلص تھے مگر ان کو بھی اسلام اور اس کے عقائد کو سمجھنے کا موقع بہت کم ملتا تھا اور جن مذاہب کو ترک کر کے وہ اسلام میں داخل ہوتے تھے ان کے دل و دماغ ان مذاہب کے افکار و عقائد سے کلی طور پاک نہیں ہوتے تھے۔ لہٰذا اگر پہلے گروہ نے حدیثیں وضع کر کے مسلمانوں میں الحاد و زندقہ پھیلانے کی کوشش کی تو دوسرے گروہ نے ترک دنیا، رہبانیت اور تجرد کو مسلمانوں میں عام کرنے کی کوشش کی اس لیے کہ وہ جن معاشروں سے نکل کر آئے تھے ان میں ان چیزوں کو قرب الٰہی کا بہت بڑا ذریعہ تصور کیا جاتا تھا مزید یہ کہ تزکیۂ نفس کی غرض سے انہوں نے عبادات و اذکار کے نئے نئے طریقے بھی ایجاد کر لیے اور اسلام میں ان کو ''مطلوب'' بنانے کی خاطر کثرت سے حدیثیں وضع کیں اور چونکہ یہ گروہ اسلام کے نام پر کام کر رہا تھا اور اس نے زہد و تقویٰ کا دیدہ زیب لباس بھی زیب تن کر رکھا تھا اس لیے مسلم معاشرے میں اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا اور پہلے گروہ کے مقابلے میں اس کو زیادہ مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اہل الحاد و زندقہ اور امت سے نسبت رکھنے والے گمراہ فرقوں نے جو حدیثیں گھڑ کر معاشرے میں پھیلائیں ایک عرصہ کے بعد وہ طاق نسیاں کے حوالے ہو گئیں اور

ان فرقوں کے ناپید ہو جانے کے بعد ان کے عقائد و افکار کی حامل روایتوں کو بھی لوگ بھول گئے۔ مگر مسلمانوں میں جو طبقہ ''صلحائے اُمت'' کے نام سے معروف رہا اور اس نے عقائد و ایمانیات سے لے کر دین کے تمام شعبوں میں موضوع، منکر اور باطل روایات پھیلائیں ان کے بُرے اثرات سے اُمت آج تک چھٹکارا نہیں پاسکی ہے بلکہ صحیح احادیث کے مقابلے میں یہی جھوٹی روایات مسلمانوں میں زیادہ مشہور ہیں۔

مصر کے مشہور محدث اور محقق علامہ احمد محمد شاکر رحمہ اللہ ''الباعث الحثیث شرح اختصار علوم الحدیث'' میں لکھتے ہیں:

''حدیثیں گھڑنے والوں میں بدترین لوگ اور مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے وہ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو زہد و تصوف سے وابستہ کر رکھا ہے، یہ لوگ ''ترغیب و ترہیب'' کے باب میں حدیثیں وضع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے، بلکہ اس خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ اپنے اس عمل کے ذریعہ وہ عند اللہ ماجور ہوں گے۔ ان لوگوں نے اپنے زعم باطل میں مسلمانوں کو خیر پر آمادہ کرنے اور معاصی سے دور رکھنے کے لیے حدیثیں وضع کیں اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر دیا۔ انہوں نے اپنے اس بُرے عمل کے ذریعہ فساد پھیلایا ہے اور پھیلا رہے ہیں۔ اصلاح نہیں کر رہے ہیں۔'' [ص:۹۰]

دروغ گوئی تو عام حالات میں بھی نہایت قابل نفرت اور مذموم صفت ہے جو عام مسلمانوں کو بھی زیب نہیں دیتی۔ ایک متفق علیہ حدیث ہے:

((إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِيْ إِلَى الْجَنَّةِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ صِدِّيْقًا وَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِيْ إِلَى الْفُجُوْرِ وَإِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِيْ إِلَى النَّارِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ كَذَّابًا)) ❷

''بے شک سچائی نیکی کی راہ دکھاتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور ایک آدمی صدق بیانی کو شعار بنالیتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے یہاں سراپا سچا لکھ لیا جاتا ہے۔ اور جھوٹ برائی کی طرف لیجاتا ہے اور برائی جہنم کے راستے پر ڈال دیتی ہے اور ایک آدمی جھوٹ کا عادی ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے یہاں بہت بڑا جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔''

❶ السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي ص: ٢٤١

❷ بخاری: ٦٠٩٤، مسلم: ٦٦٣٧

اور اگر یہ مذموم صفت جھوٹی حدیثیں وضع کرنے میں تبدیل ہو جائے تو پھر حبط عمل یعنی اعمال صالحہ برباد ہو جانے کی موجب بن جاتی ہے۔ بلکہ بعض محدثین کے نزدیک تو ''وضع حدیث'' موجب کفر ہے۔ مگر اسی کیساتھ یہ تلخ حقیقت بھی ہے کہ مسلمانوں میں ''صلحائے اُمت'' کے نام سے معروف طبقہ اللہ کے رسول ﷺ کے نام پر حدیثیں وضع کرنے یا کم از کم جان بوجھ کر جھوٹی روایات کو لوگوں میں رواج دیتا رہا ہے اور اب تک یہ گندا کام وہی لوگ زیادہ کر رہے ہیں جو معاشرے میں عابد و زاہد اور پرہیز گار ہونے کی شہرت رکھتے ہیں۔ مشہور محدث اور علم الرجال کے ماہر امام یحییٰ بن سعید القطان متوفی ۱۹۸ھ فرماتے ہیں:

((لَمْ نَرَ الصَّالِحِيْنَ فِيْ شَيْءٍ أَكْذَبَ مِنْهُمْ فِي الْحَدِيْثِ)) ❶

''ہم نے صالحین کو حدیث سے زیادہ کسی اور چیز میں جھوٹا نہیں دیکھا۔''

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:

((يَجرِيْ الْكَذِبُ عَلَى لِسَانِهِمْ وَلَا يَتَعَمَّدُونَ الْكَذِبَ)) ❷

''جھوٹ ان کی زبانوں پر جاری رہتا ہے حالانکہ وہ جھوٹ کا قصد نہیں کرتے۔''

امام یحییٰ بن سعید القطان کا شمار ''علم الرجال'' کے اکابر میں ہوتا ہے اور انہوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ان کے طویل تجربات کا آئینہ دار ہے۔ چنانچہ وضع حدیث کی تاریخ کے مطالعہ سے ان کے اس قول کی تائید ہوتی ہے۔

عباد بن کثیر بڑا صالح و زاہد شخص گزرا ہے۔ زہد و ورع اور اعمال خیر میں اس کو بڑی شہرت حاصل تھی لیکن روایت حدیث میں غیر محتاط تھا بلکہ جھوٹا تھا۔ امام مسلم نے صحیح مسلم کے مقدمے میں وضاعین، متروکین، منکر الحدیث اور ساقط الاعتبار راویوں کی جو فہرست دی ہے اس میں اس کا نام بھی شامل ہے۔ مکہ مکرمہ میں جب اس کا انتقال ہوا تو اس وقت امام سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) مکہ ہی میں موجود تھے، لیکن وہ عباد کے جنازے میں شریک نہیں ہوئے۔ [منة المنعم فی شرح صحیح مسلم، ص: ۳۸، ج: ۱]

یہ صحیح ہے کہ ارباب زہد و تصوف سب کے سب وضاع حدیث نہیں تھے، لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اپنے خاص افکار و نظریات اور عبادات کے خاص طریقوں کو رواج دینے کے لیے انہوں نے اپنی کتابوں کو موضوع منکر اور بے بنیاد روایتوں سے بھر دیا ہے۔ اور فضائل اعمال اور ترغیب و ترہیب کے باب میں اپنی خود ساختہ ریاضتوں، اذکار و اوراد اور ان کے مبالغہ آمیز اجر و ثواب کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اپنی

❶ مقدمہ صحیح مسلم: ۳۸ ❷ نفس مآخذ ص: ۳۹

تصنیفات میں ''نبی ﷺ نے فرمایا ہے۔'' ''حدیث میں آتا ہے'' ''روایت ہے'' ''رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے'' وغیرہ کہہ کہہ کر موضوع اور منکر روایتوں کا انبار لگا دیا ہے اور وہ تمام غیر مستند روایتیں آنکھیں بند کر کے نقل کر دی ہیں جن سے ان کے افکار وخیالات کی تائید ہوتی ہے۔

صوفیا کی جماعت میں بہت سے ایسے لوگوں کا بھی نام ملتا ہے جو علم حدیث میں ایک خاص مقام رکھتے تھے اور ان کو یہ معلوم تھا کہ وہ اپنی کتابوں میں مختلف ابواب کے تحت نبی ﷺ سے منسوب جو روایات نقل کر رہے ہیں وہ روایت ودرایت کے اصول سے نا قابل اعتبار، جھوٹ اور باطل ہیں لیکن چونکہ ان سے ان کے عقائد کی تائید ہوتی تھی اس لیے انہوں نے نہ صرف یہ کہ ان کو بے دھڑک بیان کر دیا ہے بلکہ اُن سے اپنے غیر اسلامی عقائد وخیالات کو صحت پر استدلال بھی کیا ہے۔ اس تناظر میں ان کا شمار بھی ان جھوٹوں میں ہوتا ہے جن کا ذکر اس ارشادِ نبوی ﷺ میں موجود ہے:

((مَنْ حَدَّثَ عَنِّيْ بِحَدِيْثٍ يُرَى أَنَّهُ كَذِبٌ ، فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ)) ❶

''جو میری نسبت سے ایسی حدیث بیان کرے جس کے بارے میں اس کا خیال ہو کہ وہ جھوٹ ہے۔ وہ دو جھوٹوں میں سے ایک ہے۔ (یا کئی جھوٹوں میں سے ایک ہے)''

یعنی ایک جھوٹا تو وہ ہے جس نے نبی اکرم ﷺ کے نام پر وہ حدیث گھڑی ہے (یا جن لوگوں نے وہ حدیث گھڑی ہے) اور دوسرا جھوٹا وہ ہے جو اس کو جھوٹ جانتے ہوئے بھی اس کو لوگوں میں بیان کرتا پھر رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ محدثین کی قبروں کو نور سے بھر دے کہ انہوں نے ''فتنہ وضع حدیث'' کو پہلے دن ہی بھانپ لیا۔ پھر انہوں نے جہاں نبی کریم ﷺ کے صحیح ارشادات کو جمع کرنے اور لوگوں میں ان کو پھیلانے کے لیے شب وروز محنت کی اور اس مقدس کام کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا وہیں انہوں نے اس فتنہ کا سدِ باب کرنے اور وضع حدیث کا ارتکاب کرنے والوں، روایت حدیث میں کذب بیانی سے کام لینے والوں اور ساقط الاعتبار راویوں کو بے نقاب کرنے میں بھی کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی۔ اس طرح انہوں نے جہاں ایک نہیں بلکہ دسیوں کتابوں میں موضوع، منکر اور ضعیف حدیثوں کو جمع کر دیا، وہیں اُنہوں نے اُن تمام راویوں کی فہرستیں بھی تیار کر دیں جن پر وضع حدیث، روایت حدیث میں کذب بیانی اور تدلیس اور حفظ و ضبط حدیث میں غفلت وغیرہ کا الزام تھا۔ اس طرح اُمت کی اس مقدس جماعت کی کوششوں کی بدولت

❶ صحیح مسلم: ١

جہاں ثقہ اور قابل اعتماد راویوں سے واقفیت آسان ہوگئی وہیں اُن بے شمار ناقلین یا رواۃِ حدیث کے حالات زندگی اور کوائف کو معلوم کرنا ممکن ہوگیا جن کی روایت کردہ حدیثیں مردود و نا قابل اعتبار ہیں۔

اس کے ساتھ محدثین اور حفاظ حدیث نے ایک نہایت گراں قدر کام یہ بھی کیا کہ انہوں نے تفسیر، سیرت، تاریخ، فقہ، فضائل و مناقب، قصص الانبیاء اور ترغیب و ترہیب وغیرہ کی متداول کتابوں میں منقول حدیثوں کی علمی تخریج کر کے روایت و درایت کی روشنی میں ان کے درجات بیان کر دیے اور یہ کام تا ہنوز جاری ہے۔

مگر چونکہ اس طرح کی کتابیں عربی میں اور محدثانہ اسلوب میں ہیں اس لیے ان سے صرف وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ عربی زبان میں مہارت رکھتے ہوں بلکہ علم حدیث کی اصطلاحوں سے بھی واقف ہوں۔ ہر کس و ناکس صرف عربی زبان کے زور پر بھی ان سے بھرپور استفادہ نہیں کر سکتا۔

برصغیر میں بڑی تعداد میں محدثین پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے حدیث کے موضوع پر نہایت گراں قدر کتابیں تصنیف کی ہیں۔ لیکن اولاً تو یہ کتابیں بھی عربی میں ہیں اور وہ بھی قدیم اسلوب میں، دوم یہ کہ ان پر ''مسلکی چھاپ'' اس قدر گہری ہے کہ جس مسلک کے عالم نے کوئی کتاب لکھدی تو صرف اسی مسلک سے وابستہ افراد اسے پڑھتے رہے اور انہی کے درمیان وہ گردش کرتی رہی، دوسرے مسلک والے عام طور پر اس سے دور بھاگتے رہے اس طرح اس کی افادیت محدود ہو کر رہ گئی۔

اس کے علاوہ میری اپنی معلومات کے مطابق برصغیر کے علماء میں علامہ ابوالحسنات ابوعبدالحی لکھنوی (متوفی ۱۳۰۴ھ) کے علاوہ کسی نے موضوع، منکر اور ضعیف حدیثوں پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی بلکہ حیرت ناک بات تو یہ ہے کہ خود ان علماء کی تصنیفات، چاہے وہ تفسیر و فقہ کے موضوع پر ہوں یا حدیث کے موضوع پر ہوں، موضوع، منکر اور ضعیف حدیثوں کی بھرمار ہے۔

لیکن برصغیر کی معروف و مقبول زبان اُردو میں دین کے دوسرے تمام موضوعات پر تو کتابیں لکھی گئیں لیکن خاص طور پر موضوع، منکر اور ضعیف احادیث سے متعلق اس میں کتابیں شاذ و نادر ہی ہیں۔ جبکہ مشاہدہ اور مطالعہ بتاتا ہے کہ برصغیر میں صدیوں سے تصوف کا بڑا زور رہا ہے اور اہل تصوف یا صوفیانہ افکار و نظریات سے متاثر علماء نے قرآنی موضوعات، تفسیر، سیرت، سیر صحابہ، فقہ اور فضائل اعمال وغیرہ پر جو کتابیں لکھی ہیں اور جن کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان میں ہر طرح کی روایات بھر دی ہیں۔ چاہے انہوں نے ایسا دانستہ کیا ہو یا نا دانستہ بہر حال کتابوں نے مسلمانوں میں غیر مستند روایات کو پھیلانے میں زبردست

کردار ادا کیا ہے۔

اُردو میں تصوف کی بہت سی کتابوں کے عربی سے ترجمے بھی ہوئے ہیں اور خاص و عام میں بے حد مقبول ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ امام غزالی کی مشہور کتاب ''احیاء العلوم'' کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ امام غزالی کو عقلی علوم میں بڑی مہارت حاصل تھی بلکہ یہ علوم ان کی حقیقی جولان گاہ تھے۔ بعد میں انہوں نے فقہ کا بھی وسیع مطالعہ کیا اور فقہ شافعی میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ لیکن فقہ کے دوسرے بنیادی مآخذ ''حدیث'' کا علم وہ نہ حاصل کر سکے، آخری عمر میں جب ان کے منہج فکر میں انقلاب آیا اور کلی طور پر تصوف کی طرف مائل ہو گئے تو انہوں نے دین کے تمام شعبوں کا ایک صوفی کی حیثیت سے مطالعہ کیا۔ ''احیاء العلوم'' ان کی یہی تصویر پیش کرتی ہے انہوں نے اس کتاب میں دین کے مختلف شعبوں سے مفصل بحث کی ہے اور اپنے جو افکار و خیالات پیش کیے ہیں وہ تمام تر صوفیانہ افکار و خیالات ہیں۔ اور کتاب کے ہر باب اور فصل میں انہوں نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے ان میں صحیح احادیث بہت کم اور ضعیف، بے اصل، اور موضوع احادیث زیادہ ہیں۔ اس کا اندازہ حافظ زین العابدین العراقی (متوفی ۸۰۶ھ) کی کتاب ''المغني عن محل الأسفار في تخريج ما في الاحياء من الأخبار'' کے مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے احیاء العلام کی حدیثوں کی تخریج کر کے ان کے درجات بیان کر دیے ہیں۔

احیاء العلوم نے برصغیر کے اُن مسلمانوں کو بے حد متاثر کیا ہے جو صوفیانہ خیالات رکھتے ہیں اور ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں احیاء العلوم کے مباحث کو سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا حالات اور وجوہات کے پیش نظر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اُردو داں طبقہ کے لیے ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں مسلمانوں کے اندر گردش کرنے والی اُن بے بنیاد اور من گھڑت روایتوں کو بیان کر دیا جائے جنہوں نے اسلام کے عقائد و ایمانیات سے لے کر اس کے تمام شعبوں کو متاثر کیا ہے اور ان کی وجہ سے عوام سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں تک میں ایک ایسا دینی تصوف پیدا ہو گیا ہے جو کتاب وسنت کی تعلیمات پر مبنی تصور سے بہت مختلف ہے۔ زیر نظر کتاب اسی ضرورت کے تحت ترتیب دی گئی ہے اور اس میں جہاں موضوع اور منکر روایات کا ذکر کیا گیا ہے وہیں حتی الامکان یہ کوشش کی گئی ہے کہ جس مسئلے سے متعلق موضوع اور منکر روایتوں کا ذکر کیا جائے اس مسئلے کو قرآن پاک اور نبی اکرم ﷺ کے صحیح ارشادات کی روشنی میں واضح کر کے اس کے بارے میں اسلام کا صحیح حکم بھی بیان کر دیا جائے۔

موضوع اور منکر روایتوں پر ''وضع'' اور ''نکارت'' کا حکم ائمہ حدیث اور علم جرح وتعدیل میں سند کا درجہ رکھنے والے ماہر علماء کے اقوال کی بنیاد پر لگایا گیا ہے۔ پہلے سے کوئی رائے ذہن میں قائم کر لینے اور پھر اس کی بنیاد پر کسی حدیث کو موضوع یا منکر کہنے سے گریز کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں بنیادی طور پر تو وہی کتابیں سامنے رکھی گئی ہیں جو موضوع، منکر اور ضعیف حدیثوں کے موضوع پر لکھی گئی ہیں، مگر اس کے ساتھ تفسیر، سیرت اور فقہ کی وہ کتابیں بھی پیش نظر رہی ہیں جن میں اس طرح کی حدیثوں کی بھرمار ہے، نیز عربی اور اُردو کی وہ کتابیں بھی سامنے رہی ہیں جو ترغیب و ترہیب، فضائل اعمال اور تصوف کے موضوع پر ہیں۔

جن کتابوں سے میں نے براہِ راست استفادہ کیا ہے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

ابن الجوزی کی "الموضوعات" السخاوی کی "المقاصد الحسنة" ابن عراقی کی "تنزیه الشریعه" العجلونی کی "کشف الخفاء" ملاعلی القاری کی "الاسرار المرفوعه" السیوطی کی "اللآلی المصنوعة" اور "الدرر المنتشره" ابن تیمیہ کی "احادیث القصاص" الکرمی المقدسی کی "الفوائد الموضوعه" اور القسطلانی کی "مختصر المقاصد الحسنه"

لیکن اس کتاب کا اہم ماخذ محدث عصر علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کا مشہور سلسلہ "سلسلة الأحادیث الضعیفه والموضوعه واثرها السیئ فی الامة" ہے یہ چودہ جلدوں میں ہے جس کی گیارہ جلدیں چھپ چکی ہیں اس سلسلے میں سات ہزار ضعیف، موضوع، منکر اور باطل روایات سے بحث کی گئی ہے۔

تفسیر کی کتابوں میں سے جو کتابیں صحیح احادیث کے ساتھ ساتھ ضعیف اور ناقابل اعتبار روایات پر بھی مشتمل ہیں، ان میں سے الزمخشری کی ''الکشاف'' ''تفسیر ابن کثیر'' اور الشوکانی کی ''فتح القدیر'' میرے مطالعہ میں برابر رہتی ہیں اور یہی کتابیں زیادہ متداول بھی ہیں۔

سیرت رسول ﷺ کے موضوع پر سیرت ابن ہشام، امام ذہبی کی "السیرة النبویه" اور "البدایه والنهایه" سے براہِ راست استفادہ کیا گیا ہے، اور بعض متاخرین علماء کی کتابیں بھی پیش نظر رہی ہیں۔

اس موضوع سے جزوی تعلق رکھنے والی جن کتابوں سے میں برابر رجوع کرتا رہا ہوں وہ یہ ہیں:

احیاء العلوم، المغنی عن محل الاسفار، القول البدیع اور فضل الصلاة علی الرسول صلی الله علیه وسلم

کتاب میں صحیح احادیث عام طور پر صحیحین سے لی گئی ہیں اگرچہ سنن اربعہ بھی پیش نظر رہی ہیں، ہر

حدیث کا نمبر درج کر دیا گیا ہے تاکہ رجوع کرنے میں آسانی رہے۔

کتاب کی ترتیب فقہی کتابوں کے طریقے پر نہیں ہے بلکہ موضوعات کی اہمیت کی بنیاد پر ہے۔

کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے:

۱ وضع حدیث کی تاریخ	۲ اصطلاحات حدیث
۳ عقائد و ایمانیات	۴ عبادات
۵ سیرت و شمائل	۶ فضائل و مناقب

اصطلاحات حدیث میں سے صرف انہی اصطلاحوں کی تعریف کی گئی ہے جن سے اس کتاب سے استفادہ کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ہر اصطلاح کی ایسی تعریف کی جائے جس کو معمولی اُردو داں حضرات بھی سمجھ سکیں اور ہر اصطلاح کو مثال سے واضح کر دیا گیا ہے۔

حدیث کی اصطلاحوں کی تعریف میں میرا بنیادی ماخذ ''مقدمہ ابن الصلاح'' رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ میں نے حافظ ابن کثیر کی ''اختصار علوم الحدیث'' اور علامہ احمد شاکر کی "الباعث الحثیث" سے بھی بھر پور استفادہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں معروف محدث علامہ البانی رحمہ اللہ کے افادات، جو ان کی تصنیفات میں ادھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں، تو وہ برابر سامنے رہتے ہیں، یہ افادات ان کے طویل، وسیع اور گہرے مطالعہ کا نچوڑ ہیں اور علم حدیث پر کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

باب اوّل

وضع حدیث کے اسباب اور مقاصد

اسلام کے بنیادی مأخذ صرف دو ہیں؛ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت۔ سنت سے مراد نبی ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریر یں ہیں۔ اقوال اور افعال کے معنی تو واضح ہیں۔ رہی تقریر تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے سامنے کوئی کام ہوتے دیکھا یا کسی فعل یا قول کی خبر آپؐ کو ملی تو آپؐ نے یا تو اس کی توثیق فرما دی یا خاموش رہے اور اس کی کوئی نکیر نہیں فرمائی۔

اور کتاب وسنت کے اسلام کے بنیادی ماخذ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل قبول عمل کے لیے احکام اور ہدایات انہی دونوں ماخذوں سے حاصل کرے ان کے علاوہ دین کے جو دوسرے شرعی ماخذ ہیں وہ کتاب وسنت کے تابع ہیں ان کی حیثیت بنیاد اور اساس کی نہیں ہے۔

اسی طرح کتاب وسنت کے شرعی ماخذ ہونے کا مطلب یہ بھی ہے کہ صحیح اسلامی زندگی گزارنے کے لیے اور دینی احکام معلوم کرنے کے لیے ان دونوں سے ایک ساتھ رجوع کیا جائے ایسا نہیں ہے کہ اگر ہمیں کسی مسئلے میں قرآن سے کوئی حکم نہ ملے اس وقت ہم حدیث رسول کی طرف متوجہ ہوں اور اس سے رجوع کریں اور یہ اس لیے کہ خود قرآن پاک میں نبی ﷺ کے جو فرائضِ منصبی بیان کیے گئے ہیں وہ تین ہیں:

[۱]...... تبلیغ کتاب [۲]...... تفسیر کتاب [۳]...... تشریع

اور یہ تینوں مناصب سورۃ البقرۃ کی اس آیتِ کریمہ میں جمع کر دیے گئے ہیں:

﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ [سورة البقرہ: ۱۲۹]

''اے ہمارے رب! تو ان لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں آیتیں سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے بیشک تو بڑا با عزت اور حکمت والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں نبی ﷺ کے جو فرائضِ منصبی بیان کیے ہیں ان کی تشریح یوں کی

جا سکتی ہے:

۱ اللہ تعالیٰ کی کتاب، قرآن پاک کو ٹھیک ٹھیک انہی الفاظ میں سنا دینا جن الفاظ میں وہ آپؐ پر نازل ہوئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ﴾ [المائدہ: ٦٧]

"اے رسول! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی "رسالت" نہیں پہنچائی اور اللہ تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔"

اس تبلیغ کتاب یا تلاوتِ کتاب میں نبی ﷺ مطاع ہیں۔ یعنی امت کے تمام افراد پر یہ فرض ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو قرآن کی شکل میں اللہ تعالیٰ کی جو کتاب دی ہے، اس کی بے چون و چرا اطاعت کریں اور اس بات پر ایمان رکھیں کہ شیطان کو یہ قدرت حاصل نہیں تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے ادا ہونے والی تلاوت میں اپنی طرف سے کوئی بات ملا دے یا سہواً آپ کی زبانِ مبارک سے تلاوتِ قرآن کے اثنا کوئی ایسا لفظ نکل جائے جو قرآن سے نہ ہو یا نعوذ باللہ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ایسی کوئی عبارت دورانِ تلاوت پڑھ دیں، جو اللہ نے آپ پر نازل نہیں کی تھی، ان تمام باتوں سے آپ کو مکمل تحفظ "عصمت" حاصل تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنَاتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۵﴾﴾

[یونس: ١٥]

"جب انہیں ہماری آیات صاف صاف سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں: اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کوئی تبدیلی کر دو۔ اے نبی! ان سے کہہ دو میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تبدیلی کر دوں، میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔"

یعنی میرا فرضِ منصبی تو صرف یہ ہے کہ جس شکل میں قرآن بذریعہ وحی میرے اوپر نازل کیا جاتا ہے

اس کی پیروی کروں اور اس کو بے کم و کاست تم کو سنا تا جاؤں میں اس کا مجاز قطعاً نہیں ہوں کہ تمہاری خواہش پر اس میں کوئی تبدیلی کروں۔

۲۔ تبلیغ کتاب اور تلاوتِ کلام میں جس طرح نبی ﷺ کی اطاعت فرض ہے، ٹھیک اسی طرح قرآن پاک کی شرح میں بھی آپ کی اطاعت فرض ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿59﴾ ﴾ [النساء: ۵۹]

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں صاحب امر ہیں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو یہی صحیح طریقہ ہے اور نتیجے کے اعتبار سے بہتر ہے۔''

اس آیتِ مبارکہ میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ امرِ اطاعت تو دو ہیں، مگر مطاع تین ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم پر جس طرح اللہ کی اطاعت فرض ہے، ٹھیک اس طرح رسول اللہ ﷺ کی اطاعت بھی فرض ہے۔ رہے تمہارے حکام اور اولیاء الامور تو تم پر ان کی اطاعت اسی وقت تک فرض ہے، جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کے مطیع رہیں وہ مستقل بالذات مطاع نہیں ہیں اور اگر تمہارے اور اولیاء الامور کے مابین کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو ''حَكَم'' صرف اللہ اور رسول ہے۔

ایک جگہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو عین اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴾

[النساء: ۸۰]

''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی اور جس نے روگردانی کی تو ہم نے تمہیں لوگوں پر پاسبان بنا کر نہیں بھیجا ہے۔''

یعنی جو تمہاری اطاعت سے روگردانی کرتا ہے وہ خود اپنی تباہی کا سامان کر رہا ہے۔ ہم نے تم کو صرف داعی بنا کر بھیجا ہے، تمہاری ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کو زبردستی اپنا مطیع بناؤ یا اپنی اطاعت پر مجبور کرو۔

۳۔ مبلغ کتاب اور مفسر کتاب کی طرح رسول اللہ ﷺ کی ایک تیسری حیثیت یہ ہے کہ آپ ''مشرع''

بھی ہیں اور آپ کی یہ تشریعی حیثیت بالکل اسی طرح واجب الاطاعت ہے جس طرح مبلغ کتاب اور مفسر کتاب کی حیثیت میں آپ کی اطاعت فرض ہے۔

﴿ وَمَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ﴾ [الحشر: ۷]

''اور رسول جو کچھ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے تمہیں روکے اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے اور اس سے خوف کھانے کا تقاضا یہ ہے کہ تم رسول اللہ ﷺ کے امر و نہی کی اطاعت کرو، اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو پھر تم متقی نہیں ہو گے۔

اس آیت کریمہ میں تعبیر کا ایک نہایت ''باریک نکتہ'' مضمر ہے جس کی طرف اشارہ کر دینا یا اسے کھول کر بیان کر دینا ضروری ہے۔

آیت میں ﴿ وَمَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ ﴾ کے بالمقابل ﴿ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ ﴾ کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔ جبکہ قیاس یہ کہتا ہے کہ ﴿ وَمَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ ﴾ کے بالمقابل ﴿ وَمَا مَنَعَكُمْ ﴾ ہونا چاہیے تھا یا جب آخر میں ﴿ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ ﴾ فرمایا گیا ہے تو شروع میں ﴿ وَمَا اَمَرَكُمْ بِهِ الرَّسُوْلُ ﴾ فرمایا جاتا۔ چنانچہ اس تعبیر قرآنی کی آڑ میں منکرین حدیث قدیم زمانے سے اپنا ناپاک کھیل کھیل رہے ہیں اور یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ تبلیغ کتاب یا تلاوتِ قرآن کے بعد رسول اللہ ﷺ کا دور ختم ہو گیا اور ہدایت کے لیے صرف قرآن کافی ہے، حدیث کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لیکن یہ دشمنان اسلام تعبیر قرآنی میں مضمر اس باریک نکتہ کو سمجھ نہیں سکے یا سمجھ گئے، مگر ظاہری الفاظ کا سہارا لے کر انہوں نے عوام کو گمراہ کرنا شروع کر دیا اس لیے کہ عوام اس طرح کے باریک نکتوں کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ منکرین حدیث کے زعم باطل پر سب سے زیادہ دلالت یہی تعبیر قرآنی کر رہی ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

﴿ وَمَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ ﴾ میں جو جامعیت ہے وہ ﴿ وَمَا اَمَرَكُمْ بِهِ الرَّسُوْلُ ﴾ کی تعبیر میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ ''امر'' صرف قولی ہوتا ہے یا دوسرے لفظوں میں ''امر'' کا تعلق صرف قول سے ہوتا ہے۔ جبکہ یہ حقیقت پوری وضاحت سے معلوم ہو چکی ہے کہ نبی ﷺ اپنے قول و فعل دونوں میں مطاع تھے۔ لہٰذا اگر یہ فرمایا گیا ہوتا ﴿ وَمَا اَمَرَكُمْ بِهِ الرَّسُوْلُ ﴾ تو یہ صرف رسول اللہ ﷺ کے اقوال ہی کو شامل ہوتا اس میں

آپ کے افعال داخل نہ ہوتے اس لیے ایسی جامع اور مانع تعبیر ﴿ وَمَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ ﴾ استعمال کی گئی جس نے اپنے اندر رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریر سب کو سمیٹ لیا۔

اور یہ بات کہ نبی ﷺ اپنے اقوال کی طرح اپنے افعال میں بھی واجب الاطاعت ہیں خود قرآن پاک سے ثابت ہے۔ سورۃ الاحزاب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿21﴾ ﴾

''درحقیقت اللہ کے رسول کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخرت کا امیدوار ہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتا ہو۔''

اور ''اسوۃ'' اسی لیے ہوتا ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات پاک اپنے اقوال وافعال سمیت ان لوگوں کے لیے نمونہ عمل واتباع ہے جو اللہ اور آخری دن پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح کے امیدوار ہیں اور ان کے دل اللہ کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوتے، اب رہے وہ جو اس صفت سے متصف نہیں ہیں تو ان کے لیے رسول اللہ ﷺ کی حیات پاک میں کوئی نمونہ عمل نہیں ہے اور پھر اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ صرف آپ کے اقوال کو واجب الاطاعت قرار دے رہے ہیں، آپ کے افعال کو نہیں ان کو درحقیقت اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح مطلوب نہیں ہے۔

اور چونکہ ''نواھی'' کا تعلق صرف قول سے ہوتا ہے، ان کا کوئی عملی نمونہ نہیں پیش کیا جا سکتا، اس لیے فرمایا گیا: ﴿ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ ''اور رسول جس چیز سے تمہیں روکے اس سے باز رہو۔''

اوپر کی وضاحتوں سے معلوم ہوا کہ شرعی احکام اور تعلیمات کا مأخذ جس طرح قرآن ہے ٹھیک اسی طرح حدیث بھی ہے، لیکن چونکہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کلام اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور جس طرح وہ ہر طرح کی تبدیلی اور تحریف سے محفوظ ہے ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ ''بے شک ہم نے ہی ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔'' [الحجر: ۹] اسی طرح اس کے ہم مثل کلام لانا بھی کسی بشر کی طاقت اور قدرت سے باہر ہے لہٰذا نزول قرآن کے وقت سے اب تک اور اس وقت سے لے کر قیامت تک نہ اس بات کا کوئی اندیشہ تھا اور نہ آئندہ ہوگا کہ کوئی شخص بقید ہوش وحواس اس کی ''محاکات'' نقل کر کے جیتے جی اپنی رسوائی کا سامان کرے گا، بلکہ اس جیسی کتاب پیش کرنا تو بہت دور کی بات ہے کوئی بڑے سے بڑا ادیب اور زبان دان اس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی ترتیب ہی بدل کر دیکھ

لے یا درمیان میں اپنی طرف سے کسی فقرے کا اضافہ ہی کر کے دیکھ لے یقیناً اس کو اپنی اس حماقت پر شرمندگی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن پاک میں کسی ایک جگہ بھی اشارۃً یا صراحۃً اس کی نظیر تخلیق کرنے سے منع نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے برعکس اس میں تو اس کے منجانب اللہ ہونے میں شک کرنے والوں کو بار بار یہ چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ محمد ﷺ نے اسے خود گھڑ کر تمہارے سامنے پیش کر دیا ہے، تو تم بھی اس طرح کی کوشش کر کے دیکھ لو، آخر تم بھی تو زبان دان ہو اور اپنی زبان دانی پر تم کو ناز بھی ہے اور پورا قرآن نہ سہی کوئی ایک چھوٹی سی سورت ہی بنا کر پیش کر دو۔ مگر قرآن پاک کے بار بار کے چیلنجوں کا جواب انہوں نے ہمیشہ خاموشی سے دیا۔ جو ان کے عجز و درماندگی کی دلیل ہے۔

لیکن ''حدیث رسول'' کا معاملہ اس کے برعکس تھا، اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ رسول اکرم ﷺ کا اسلوب بیان ایک منفرد شان رکھتا ہے۔ آپ فصاحت و بلاغت کی جس بلند چوٹی پر فائز تھے، اس کی نظیر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی کے کلام میں نہیں ملتی اور نہ مل سکتی تھی۔ آپ کے حسن بیان کی مٹھاس کو صحیح احادیث میں محسوس کیا جا سکتا ہے، مگر پھر بھی آپ بشر تھے اور آپ کا کلام بشر کا کلام ہے، جس کو ''اعجازی شان'' نہ حاصل ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی۔ اس لیے یہ اندیشہ تھا کہ آپ کے بعد دین میں ''نیا رنگ'' بھرنے کے لیے اس طرح کی ناپاک کوششیں کی جا سکتی ہیں اسی اندیشے کے پیش نظر آپ نے اس ناپاک عمل اور اس کے رنجابد سے لوگوں کو خبردار کر دیا اور ان کو صاف اور صریح الفاظ میں یہ وعید سنادی کہ جو نادان اس معصیت کا ارتکاب کرے گا، اس کے سارے اعمال اکارت چلے جائیں گے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور یہ نہیں دیکھا جائے گا اس کے اس عمل کے پیچھے کونسا جذبہ کارفرما تھا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: لَا تَكْذِبُوا عَلَيَّ، فَإِنَّهُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَلِجِ النَّارَ)) ❶

''نبی ﷺ نے فرمایا ہے: میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب نہ کرنا، کیونکہ جو میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کرے گا، وہ ضرور آگ میں داخل ہوگا۔''

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: مَنْ يَقُلْ عَلَيَّ مَالَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)) ❷

❶ بخاری / ح: ۱۰۶، مسلم / ح: ۱، الفاظ صحیح بخاری کے ہیں۔ ❷ بخاری، حدیث نمبر: ۹

''میں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جس نے میری طرف ایسی بات منسوب کی جو میں نے نہیں کہی ہے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔''

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: إِنَّ كَذِبًا عَلَيَّ لَيْسَ كَكَذِبٍ عَلَى أَحَدٍ، مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)) ❶

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کرنا کسی اور کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنے کی طرح نہیں ہے جس نے جان بوجھ کر میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کی تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔''

نبی ﷺ نے جھوٹی حدیثیں وضع کرنے والوں کو جہنم کی وعید سنانے پر ہی اکتفا نہیں فرمایا ہے بلکہ آپ نے یہ پیشن گوئی بھی فرمادی ہے کہ ایسے ناعاقبت اندیش اور دروغ گو پیدا ہوں گے جو اس عظیم معصیت کا ارتکاب کر کے لوگوں کو گمراہ کرنے اور ان کو فتنے میں مبتلا کرنے کی کوشش کریں گے لہٰذا ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: يَكُونُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ دَجَّالُونَ كَذَّابُونَ يَأْتُونَكُمْ مِنَ الأَحَادِيثِ بِمَا لَمْ تَسْمَعُوا أَنْتُمْ وَلَا آبَاؤُكُمْ ، فَإِيَّاكُمْ وَإِيَّاهُمْ لَا يُضِلُّونَكُمْ وَلَا يَفْتِنُونَكُمْ)) ❷

''آخری زمانے میں ایسے دجال اور جھوٹے ہوں گے جو تمہارے پاس ایسی حدیثیں لے کر آئیں گے جو نہ تم نے سنی ہوں گی اور نہ تمہارے باپ دادا نے تو ایسے معصیت کاروں سے دور رہنا تا کہ وہ نہ تو تمہیں گمراہ کریں اور نہ تمہیں فتنے میں ڈالیں۔''

چنانچہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد مبارک میں اور ان کے درمیان حدیثیں وضع کرنے کا فتنہ نہ تو پیدا ہوا اور نہ پیدا ہونے کا امکان تھا، کیونکہ نبی اکرم ﷺ کی تربیت یافتہ اس مقدس جماعت نے رسول اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے بار بار یہ سن رکھا تھا کہ آپ پر افترا اور آپ کی جانب کوئی جھوٹی بات منسوب کرنا نہایت سنگین اور ناقابل معافی گناہ ہے، جس کی سزا جہنم کی ابدی زندگی ہے اور خود

❶ بخاری / حدیث : ۱۲۹۱، مسلم/ حدیث : ٤ ❷ مقدمه صحیح مسلم ، حدیث : ۷

وہی اس طرح کی حدیثوں کے اصل راوی تھے جن کی تعداد ٦١ ہے۔[معرفة التذكره فى الاحاديث الموضوعة ،ص : ٢٥]

لیکن تابعین اور ان کے بعد کے ادوار میں یہ صورت حال باقی نہیں رہی جس کا سبب جہاں یہ تھا کہ سیاسی اختلافات اور اقتدار کے لیے باہمی رسا کشی نے امت کے ضمیر فروشوں کو سیاسی فریقوں کی تائید و حمایت کی غرض سے حدیثیں وضع کرنے پر آمادہ کیا وہیں مفتوحہ ممالک میں جو لوگ اسلام میں داخل ہو رہے تھے اگر ان کی اکثریت مخلصانہ طور پر حلقہ بگوش اسلام ہو رہی تھی تو ان میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو بظاہر تو مسلمان ہو رہے تھے، مگر ان کے دلوں میں اسلام دشمنی کا زہر بھی بھرا ہوا تھا۔ وہ میدانِ جنگ میں تو مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہ گئے تھے، اس لیے انہوں نے اس ارادے سے اسلام کا لباس زیب تن کر لیا تھا کہ وہ مسلمانوں بن کر مسلمانوں کے ذہنوں کو مسموم بنائیں گے۔ رہے وہ لوگ جو مخلصانہ طور پر حلقہ بگوشِ اسلام ہو رہے ان کی اکثریت کو بھی اسلامی روح کو سمجھنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور جن مذاہب کو ترک کر کے وہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے، ان کے دل و دماغ ان مذاہب کے افکار و عقائد سے کلی طور پر پاک نہیں ہوئے تھے، لہٰذا اگر پہلے گروہ نے حدیثیں وضع کر کے مسلمانوں میں کفر و الحاد اور زندقہ پھیلانے کی کوشش کی تو دوسرے گروہ نے ترک دنیا ''رھبانیت'' تزکیہ نفس و تطہیر باطن اور عبادات و اذکار کے نئے نئے طریقوں کو اسلامی رنگ دینے یا ان کو اسلام میں ''مطلوب'' بنانے کی خاطر کثرت سے حدیثیں وضع کر کے لوگوں میں پھیلائیں چونکہ آخر الذکر گروہ اسلام کے نام پر کام کر رہا تھا اور اس نے زہد و تقویٰ کا دیدہ زیب لباس بھی زیب تن کر رکھا تھا، اس لیے معاشرے میں اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور پہلے گروہ کے مقابلے اس گروہ کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ مزید یہ کہ حکمراں طبقوں کے تعیش، فلاسفہ اور متکلمین کی خشک عقلی بحثوں اور فقہی مسائل و احکام کے بیان میں حد سے بڑھی ہوئی ظاہر پسندی نے زہد و ورع، ترکِ دنیا اور صلاح و تقویٰ کے داعیوں کو کام کرنے کے خوب خوب مواقع فراہم کیے اور انہوں نے اسلام کے نام پر پوری آزادی سے حدیثیں وضع کر کے لوگوں میں پھیلائیں۔ یہ گروہ عقائد و ایمانیات، عبادات و اذکار، اخلاق و آداب، لباس و عادات، مناقب و محامد اور سیرت و معازی، ہر باب سے اسلام میں داخل ہوا اور مسلمانوں میں موضوع اور منکر روایتوں کو پھیلا کر بدعات اور منکرات کو رواج دیا۔

ان دونوں گروہوں کے علاوہ بھی ایسے بے شمار لوگوں کا نام ملتا ہے، جن پر وضع حدیث کا الزام تو نہیں ہے، البتہ وہ اپنے زہد و ورع اور صلاح و تقویٰ کے باوجود روایتِ حدیث میں ناقابل اعتبار تھے چنانچہ امام

ابوالحسین مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیری النیسابوریؒ (المتوفی ۲۶۱ھ) صحیح مسلم کے مقدمہ میں مشہور محدث اور فقیہہ عبداللہ بن ذکوان القرشی المعروف بأبی الزناد (المتوفی ۱۳۰ھ) کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

((أَدْرَكْتُ بِالْمَدِيْنَةِ مِائَةً كُلُّهُمْ مَأْمُوْنٌ ، مَا يُؤْخَذُ عَنْهُمُ الْحَدِيْثُ ، يُقَالُ : لَيْسَ مِنْ أَهْلِهِ)) [ص:۳۶]

''مجھے مدینہ میں ایسے سو (۱۰۰) افراد ملے جو دینی امور میں تو معتبر تھے، مگر ان سے حدیث روایت نہیں کی جاتی تھی، ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان میں سے کوئی روایتِ حدیث کا اہل نہیں ہے۔''

امام مسلم نے حدیث وضع کرنے والوں اور منکر حدیثیں پھیلانے والوں کے ناموں کی جو مختصر فہرست دی ہے ان میں ایسے نام بھی شامل ہیں جن کے زہد وورع کی قسم کھائی جاسکتی ہے، مگر وہ روایت حدیث کے معاملے میں حد درجہ ناقابل اعتبار تھے، بلکہ ان پر جھوٹی حدیثیں روایت کرنے کا الزام تھا اور امام یحییٰ بن سعید القطان نے تو یہاں تک صراحت کردی ہے:

((لَمْ نَرَ الصَّالِحِيْنَ فِيْ شَيْءٍ أَكْذَبَ مِنْهُمْ فِيْ الْحَدِيْثِ)) [1]

''ہم نے صلاح وتقویٰ میں مشہور لوگوں کو حدیث سے زیادہ کسی اور چیز میں جھوٹا نہیں دیکھا۔''

ان وضاحتوں سے معلوم ہوا کہ وضع حدیث اور جھوٹی حدیثوں کو روایت کرنے اور پھیلانے کا فتنہ تابعین اور تابعین کے دور میں نہ صرف پیدا ہوگیا تھا بلکہ اس فتنے کو رواج دینے اور فروغ دینے میں ان بزرگوں کا زیادہ ہاتھ تھا، جو لوگوں میں زہد وورع اور صلاح وتقویٰ میں زیادہ شہرت رکھتے تھے اور جو بعد میں چل کر ''صوفیا'' کے نام سے مشہور ہوئے۔ اور اس وقت سے لے کر آج تک دین کے نام پر یا ''فضائل اعمال'' کے نام پر اس معصیت کو پھیلانے اور عام کرنے میں صوفیا اور ترکِ دنیا کے داعیوں نے سب سے زیادہ حصہ لیا ہے اور اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے مفسرین، علمائے حدیث، سیرت نگاروں اور فضائل اعمال کے مصنفین نے اپنی کتابوں میں صحیح احادیث کے مقابلے میں ضعیف، منکر اور موضوع حدیثوں کا ذکر زیادہ کیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ فضائل اعمال اور تصوف کے مسائل پر جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں چونکہ ان میں ایسے اعمال بیان کیے گئے ہیں اور اوراد واذکار کے ایسے اجر وثواب کا ذکر کیا گیا ہے جن کا ثبوت کتاب اللہ اور نبی ﷺ کے صحیح ارشادات میں نہیں ملتا، اس لیے اس دعوے کے تحت کہ ''فضائل اعمال کے باب

[1] مقدمہ صحیح مسلم، ص: ۳۸

میں ضعیف حدیثوں پر عمل جائز ہے'' موضوع، منکر اور باطل روایتوں سے خوب خوب استدلال کیا گیا ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہیں عین حقیقت ہے کہ عقائد و ایمانیات سے لے کر اخلاق و آداب اور تزکیۂ نفس تک دین کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہے جو بے بنیاد اور باطل روایتوں سے پاک ہو حتی کہ رسول اکرم ﷺ کا وہ ارشاد مبارک جس میں آپ نے جھوٹی حدیثیں گھڑنے سے منع فرمایا ہے اور جس کو آپ سے کوئی ۶۱ صحابیوں نے نقل کیا ہے اس کو بھی ''وضاعین حدیث'' نے نہیں بخشا اور اس کے اندر اپنی طرف سے ایک ایسا فقرہ داخل کر دیا جس سے ان کے برے مقصد کی خدمت ہوتی ہے اور وہ فقرہ ہے: ((لِيُضِلَّ بِهِ النَّاسَ))

اس موضوع فقرہ کے بعد نبی اکرم ﷺ کا وہ متواتر ارشاد مبارک یوں ہو گیا:

((مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا لِيُضِلَّ بِهِ النَّاسَ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ))

''جس نے جان بوجھ کر میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کی تا کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کرے، تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔''

غور کیجئے! صحیح اور متواتر حدیث میں اس ''منکر'' فقرے کے اضافے ...... اندراج ...... نے اس کے مفہوم کو بدل کر کچھ سے کچھ کر دیا اور نبی ﷺ کی طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کرنا فی نفسہ معیوب نہیں رہا۔ الا یہ کہ اس جھوٹ سے لوگوں کو گمراہ کرنا مقصود ہو۔ وضاعین حدیث کی اس جسارت کو ''معصیت مرکب'' کا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ ان جاہلوں نے اس کے ذریعہ ''معصیت'' کو مشروع بنا دیا، لیکن یہ ان کا فریب نفس ہے، حافظ ابن حجر صحیح بخاری میں مروی حدیث: ((لَا تَكْذِبُوا عَلَيَّ فَإِنَّهُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَلِجِ النَّارَ)) ''میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب مت کرو، کیونکہ جس نے میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کی وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔'' کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" لَا تَكْذِبُوا عَلَيَّ "ہر جھوٹ کے بارے میں عام ہے اور اس میں ہر جھوٹ داخل ہے اور اس کے معنی ہیں: ''میری طرف جھوٹی بات منسوب نہ کرو۔'' اس میں حرف جر ''علی'' کے الگ سے کوئی معنی نہیں ہیں، کیونکہ یہ بات بعید از صحت ہے کہ کوئی جھوٹ آپ ﷺ کی خاطر بھی بولا جا سکتا ہے اس لیے کہ آپ نے مطلق جھوٹ سے منع فرمایا ہے لہٰذا وہ جاہل لوگ خود فریبی میں مبتلا ہیں جنہوں نے ''ترغیب وترہیب'' کے باب میں وضع حدیث کا ارتکاب کیا ہے اور دعویٰ یہ کر رہے ہیں کہ ہم نے ''نبی ﷺ کے خلاف جھوٹ بولنے کا ارتکاب نہیں کیا ہے بلکہ

آپ کی شریعت کی تائید کی غرض سے یہ کام کیا ہے۔'' ان جاہلوں کو یہ نہیں معلوم کہ نبی اکرم ﷺ کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو آپ نے نہیں فرمائی ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کا متقاضی ہے کیونکہ اس موضوع اور جھوٹی حدیث سے کسی شرعی حکم کا اثبات لازم آتا ہے چاہے وہ واجب ہو یا مستحب اور حرام ہو یا مکروہ اور ''فرقہ کرامیہ' میں سے جو لوگ اس اصول کے خلاف ہیں، ان کا کوئی اعتبار نہیں .... اور اس حدیث کی بعض سندوں میں جو اضافہ ہے وہ ثابت نہیں ہے اور اس کی تخریج البزار نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں کی ہے: ((لِيُضِلَّ بِهِ النَّاسَ)) تو اس کے مرسل اور موصول ہونے میں اختلاف ہے، الدارقطنی اور الحاکم نے اس کو مرسل قرار دیا ہے اور الدارمی نے یعلی بن مرہ سے اس کی روایت ضعیف سند سے کی ہے۔[فتح الباری ۱/ ۲۴۱]

صحیح حدیث میں یہ اضافہ مرسل اور ضعیف نہیں بلکہ ''منکر'' ہے جس پر مکمل بحث اس کے صحیح مقام پر آئے گی، یہاں تو ضمناً اس موضوع کا ذکر آ گیا ہے۔ حافظ ابو الحسن علی بن محمد بن عراق الکنانی (المتوفی: ۹۶۳ھ) نے اپنی مشہور تصنیف ''تنزيه الشريعة المرفوعة عن الأخبار الشنيعة الموضوعة'' میں وضع حدیث کے اسباب اور وضاعین کے گروہوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور ایسے لوگوں کی طویل فہرست دی ہے جو اس معصیت بلکہ جرم کے مرتکب ہوئے ہیں ذیل میں ہم اس بحث کا خلاصہ پیش کر دینا چاہتے ہیں تاکہ جہاں وضع حدیث کی سنگینی کا اندازہ لگایا جا سکے وہیں ائمہ حدیث اور علمائے جرح و تعدیل کے ان کارہائے نمایاں اور ان مخلصانہ کوششوں کی قدر و قیمت کو بھی سمجھا جا سکے جو انہوں نے اسلام کے اس دوسرے بنیادی شرعی مأخذ کو آلائشوں سے پاک کرنے اور ان دشمنانِ اسلام کو بے نقاب کرنے میں صرف کی ہیں۔

۱۔ نبی ﷺ کے نام پر ''وضع حدیث'' کا ارتکاب سب سے پہلے اُن بدعقیدہ لوگوں اور ملحدوں نے کیا جو ...... مذاہب کی تاریخ میں ...... ''زنادقہ'' کے نام سے معروف ہیں، انہوں نے مسلمانوں کے دلوں میں دینی تعلیمات کو بے وزن بنانے، ان کو گمراہ کرنے اور ان کے عقیدے کو متزلزل کرنے کی غرض سے یہ ناپاک عمل شروع کیا تھا۔ عبدالکریم بن ابی العوجاء، محمد بن سعید المصلوب، الحارث الکذاب اور المغیرہ بن سعید الکوفی وغیرہ کا تعلق انہی زنادقہ سے تھا۔ حافظ ابو جعفر محمد بن عمرو العُقیلی نے مشہور

محدث حماد بن زید سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ''زنادقہ نے نبی اکرم ﷺ کے نام پر ۱۴ ہزار حدیثیں وضع کی ہیں۔'' اور امام عبداللہ بن عدی فرماتے ہیں: جب ابن ابی العوجاء کو...... زندقہ کے الزام میں...... گرفتار کرکے...... بصرہ کے گورنر...... محمد بن سلیمان بن علی کے پاس لایا گیا تاکہ اس کی گردن ماری جائے تو اس نے کہا: ''میں نے تم لوگوں میں ۴ ہزار حدیثیں گھڑ کر پھیلائی ہیں، جن میں میں نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا ہے۔''

۲۔ نفس پرستوں اور اہل بدعات نے اپنے مذاہب اور افکار کی حمایت اور اپنے مخالفین کی مذمت میں حدیثیں وضع کیں۔ امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم نے اپنی مشہور کتاب ''الجرح والتعدیل'' کے مقدمہ میں ''خوارج'' کے ایک شیخ سے اس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ''اس بات کو نگاہ میں رکھو کہ تم اپنا دین کن لوگوں سے اخذ کرتے ہو، ہمارا یہ حال رہا ہے کہ جب ہمیں کوئی چیز پسند ہوتی تو اس کے لیے حدیث گھڑ لیا کرتے تھے۔'' یہ خارجی شیخ وضع حدیث سے تائب ہو گیا تھا۔

امام ابوعبداللہ الحاکم فرماتے ہیں: ''محمد بن القاسم الطالقانی کا شمار'' المرجئہ'' فرقے کے رؤساء میں ہوتا تھا اور وہ اس فرقے کے عقیدے کی تائید میں حدیثیں وضع کرتا تھا۔ اور صاحب المفہم ابوالعباس القرطبی کا قول ہے: بعض اہل رائے فقہاء اس بات کو جائز سمجھتے تھے کہ جو شرعی حکم قیاس سے نکلتا ہو اس کو نبی ﷺ کی طرف قولی حدیث کہہ کر منسوب کریں۔ اور یہ کہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے ایسا اور ایسا فرمایا ہے۔ اسی وجہ سے اس طرح کے فقہاء کی کتابیں ایسی احادیث سے بھری پڑی ہیں جن کی عبارتیں یہ گواہی دے رہی ہیں کہ وہ موضوع ہیں اس لیے کہ وہ فقہاء کے فتووں سے مشابہ ہیں اور اس لیے بھی کہ ان فقہاء نے ان کی کوئی سند نہیں بیان کی ہے۔''

۳۔ ''وضاعین'' میں اس گروہ کا بھی شمار ہوتا ہے جس نے ''وضع حدیث'' کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا اور وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بغاوت میں اس قدر بے باک اور جری ہو گیا تھا کہ ''وضع حدیث'' میں شب بیداری کیا کرتا تھا۔ اسی فرقے اور گروہ سے ابوالبختری وہب بن وہب القاضی، سلیمان بن عمرو النخعی، الحسین بن علوان اور اسحاق بن نجیح الملطی کا تعلق تھا جیسا کہ امام ابوحاتم ابن حبان نے الضعفاء والمجروحین کے مقدمے میں لکھا ہے۔

۴۔ ''زہد'' سے منسوب لوگوں کا شمار بھی ''وضاعین'' میں ہوتا ہے، جن کے جہل پر مبنی تدین نے ان کو ''ترغیب وترہیب'' کے باب میں ''وضع حدیث'' پر آمادہ کر دیا تھا، تاکہ وہ اپنے زعم باطل میں لوگوں کو

خیر و بھلائی کی ترغیب دیں اور برائی سے ان کو باز رکھیں۔ کرامیہ فرقے کے لوگ اس عمل کو جائز تصور کرتے ہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر نے صراحت کی ہے اور حجۃ الاسلام الغزالی نے کرامیہ کے اس کردار کی مذمت ان الفاظ میں کی ہے: ''یہ شیطانی فریب کاری ہے، سچ کو اختیار کرنے کے بعد ہم جھوٹ کے محتاج نہیں رہ جاتے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات کے بعد پند و نصائح کے لیے ہمیں جھوٹی حدیثوں کی کوئی ضرورت نہیں۔''

اور شیخ الاسلام امام نوویؒ نے ان نام نہاد زاہدوں کی ان الفاظ میں مذمت کی ہے: ''ان لوگوں کا یہ دعویٰ مسلمانوں کے اس عقیدے کے خلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے نام پر جھوٹی حدیثیں گھڑنا حرام ہے اور اس کا شمار ''کبائر'' میں ہوتا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ فرما چکے ہیں:

((مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ))

''جو میری طرف جان بوجھ کر کوئی جھوٹی بات منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔''

بلکہ ابو محمد الجوینی نے تو اس طرح کے لوگوں پر کفر کا حکم لگایا ہے۔

۵۔ دنیا پرست واعظوں، قصے کہانیاں بیان کرنے والوں اور امراء اور اہل دربار کا قرب حاصل کرنے کی غرض سے ان کی خوشامد کرنے والوں نے بھی ''وضع حدیث'' کا ارتکاب کیا ہے، جن کا ذکر موضوع اور ضعیف حدیثوں سے تعلق رکھنے والی کتابوں میں ملتا ہے۔

۶۔ شہرت پسندی اور لوگوں میں نمایاں ہونے کی خواہش اور بسا اوقات غرابت پیدا کرنے کا جذبہ بھی لوگوں کو حدیثیں وضع کرنے پر آمادہ کرتا رہا ہے، اس قماش کے لوگ ایسا کرتے تھے کہ ایک ضعیف حدیث کی سند کو حذف کر کے اس کی جگہ صحیح سند رکھ دیتے تھے، یا اس حدیث کی جو سند مشہور ہے اس کو بدل کر اس کے ساتھ کوئی غیر مشہور سند جوڑ دیتے تھے، جس سے ان کا مقصد غرابت پیدا کرنا ہوتا تھا۔

امام ابو عبداللہ الحاکم نے اس طرح کے لوگوں میں ابراہیم بن الیسع کو شمار کیا ہے یہ ابن ابی حیہ کے نام سے بھی معروف ہے، یہ شخص جعفر الصادق اور ہشام بن عروہ سے حدیثیں روایت کرتے وقت جعفر الصادق کی سند کو ہشام بن عروہ کی سند کی جگہ پر اور ہشام بن عروہ کی سند کو جعفر الصادق کی سند کی جگہ رکھ دیتا تھا تاکہ ان حدیثوں میں غرابت پیدا ہو جائے۔ الحاکم کہتے ہیں انہی لوگوں میں سے حماد بن عمرو النصیبی، بہلول بن عبید اور اصرم بن حوشب بھی ہیں۔ حافظ ابن حجر نے اس طرح کی حدیثوں کو ''مقلوب'' کا نام دیا ہے اور القاضی تاج الدین السبکی نے طبقات الشافعیہ الکبریٰ سب اس جرم کا

ارتکاب کرنے والے کو ''دجال اور کذاب'' قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ایسے شخص کی تمام حدیثیں ناقابلِ اعتبار ہیں۔

۷۔ بعض ایسے لوگوں سے بھی ''وضع حدیث'' کا صدور ہو گیا ہے جو درحقیقت ''وضاع'' نہیں تھے اور نہ انہوں نے قصداً کوئی حدیث وضع ہی کی ہے، لیکن نادانستگی میں بعض صحابہ کے اقوال کو نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر بیٹھے یا ان کو ایسے برے لوگوں کی صحبت مل گئی، جنہوں نے ان کی لکھی ہوئی اور مدون حدیثوں میں اپنی طرف سے جھوٹی حدیثیں لکھ کر شامل کر دیں اور وہ اپنی لکھی ہوئی حدیثوں کے ساتھ ان جھوٹی حدیثوں کو بھی روایت کرنے لگے، جیسا کہ حماد بن سلمہ کے ساتھ ان کے سوتیلے بیٹے عبدالکریم بن ابی العوجاء نے اور سفیان بن وکیع کے ساتھ ان کے کاتب اور خوش نویس قرطمہ نے کیا، یا جس شخص کا حافظہ کمزور ہو گیا یا اس کی بینائی چلی گئی اور وہ اپنی صحیح حدیثوں کے ساتھ بے بنیاد حدیثیں بھی روایت کرنے لگا۔ محدث ابن الصلاح نے اس طبقہ میں ارباب زہد و ورع کو بھی شامل کیا ہے اور ان کو مذکورہ تمام لوگوں سے زیادہ ضرر رساں بتایا ہے، کیونکہ ان زاہدوں اور دنیا سے بیزار لوگوں پر عوام کو زیادہ اعتماد ہوتا ہے اور ان کی بیان کردہ حدیثوں کو آنکھیں بند کر کے بلاکسی تردد کے قبول کر لیتے ہیں۔'' حافظ ابن حجر کا قول ہے کہ اس سادہ لوح طبقہ میں ان نام نہاد فقہاء کا بھی شمار ہوتا ہے، جنہوں نے قیاسی احکام کو نبی ﷺ کی طرف منسوب کرنے کو مباح قرار دے دیا۔ حافظ ابن حجر کے بقول وضاعین حدیث کی یہ آخری قسم اگرچہ بظاہر سب سے کم ضرر رساں نظر آتی ہے، کیونکہ اس نے جان بوجھ کر وضع حدیث کا ارتکاب نہیں کیا ہے، لیکن ان کے ذریعہ امت کو لاحق ہونے والا نقصان سابقہ تمام قسموں کے نقصان سے زیادہ سنگین ہے، کیونکہ ان کی روایت کردہ جھوٹی اور باطل حدیثوں کو پرکھنا اور صحیح حدیثوں سے ان کو چھانٹنا صرف ماہر ائمہ اور نقاد حدیث کے لیے ممکن ہے، رہے بقیہ وضاعین تو ان کی روایت کردہ موضوع حدیثوں کا پرکھنا بہت آسان ہے اور ان کا جھوٹ ہونا صرف نہار نابلد لوگوں پر مخفی رہ سکتا ہے۔'' [۱۶/۱]

مصر کے مشہور عالم حدیث، محقق اور ادیب علامہ احمد محمد شاکر نے حافظ ابن کثیر کی کتاب '' اختصار علوم الحدیث '' کی شرح '' الباعث الحثیث '' میں '' وضعِ حدیث '' کے موضوع پر جو قیمتی بحث لکھی ہے اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

''موضوع خبر وہ من گھڑت اور خود ساختہ خبر ہے جس کو کذابوں اور افترا پردازوں نے رسول

اللہ ﷺ کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ یہ روایت کی نہایت بدترین قسم ہے اور جس شخص کو کسی حدیث کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ موضوع ہے تو پھر اس کے لیے اس حدیث کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے روایت کرنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ آخر میں یہ وضاحت کر دے کہ یہ خبر موضوع ہے، کیونکہ حضرت سمرہ بن جندب اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَنْ حَدَّثَ عَنِّیْ بِحَدِیْثٍ یُرَی أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبَیْنِ))

''جس نے میری طرف سے کوئی ایسی حدیث بیان کی جس کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ وہ جھوٹ ہے، تو وہ دو جھوٹوں میں سے ایک ہے۔''

آگے لکھتے ہیں:

''موضوع حدیثوں کو معلوم کرنے کے متعدد طریقے ہیں، جن سے ائمہ حدیث کے گروہ سے تعلق رکھنے والے ماہر نقاد حدیث واقف ہیں، ان میں سے چند طریقے درج ذیل ہیں:

۱۔ وضعِ حدیث کا مرتکب خود یہ اقرار کرے کہ اس نے فلاں اور فلاں حدیثیں خود گھڑ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دی ہیں، جیسا کہ امام بخاری نے "التاریخ الاوسط" میں عمر بن صبح بن عمران التمیمی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اس نے نبی ﷺ کا خطبہ وضع کیا ہے، اسی طرح میسرہ بن عبدربہ نے یہ اقرار کیا ہے کہ اس نے فضائل قرآن کے بارے میں حدیثیں وضع کی ہیں، یہی حال ابوعصمت نوح بن ابی مریم کا بھی تھا، جو اپنے علم و معرفت کی وجہ سے ''نوح الجامع'' کے لقب سے معروف تھا، اس کے باوجود اس نے بقول خود قرآن پاک کی ایک ایک سورت کے فضائل میں حدیثیں وضع کر کے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منسوب کر دیں۔

۲۔ موضوع حدیث کو معلوم کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کوئی راوی کسی ایسے شخص سے حدیث روایت کرے جو صرف اس کے نزدیک معروف ہو اور جب اس سے اس شخص کی تاریخ پیدائش کے بارے میں سوال کیا جائے تو وہ کوئی بھی متعین تاریخ بتا دے، پھر جب اس راوی کی تاریخ پیدائش اور مروی عنہ کی تاریخِ وفات کے درمیان موازنہ کر کے دیکھا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہو کہ یہ راوی تو مروی عنہ کی وفات کے بعد پیدا ہوا ہے یا اس کی وفات کے وقت ایک کمسن بچہ تھا اور روایتِ حدیث کی

اهلیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کی مثال میں ماموں بن احمد الہروی کا واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے جو ہشام بن عمار سے ''سماعِ حدیث'' کا دعویٰ کرتا تھا۔ اور جب حافظ ابن حبان نے اس سے پوچھا:

''تم شام کب گئے تھے؟''

تو اس نے جواب دیا:

''۲۵۰ھ میں۔''

اس پر ابن حبان نے اس سے کہا:

''جس ہشام سے تو حدیث روایت کر رہا ہے وہ تو ۲۴۵ھ میں وفات پا چکے ہیں۔''

اس پر زچ ہو کر اس نے کہا:

''وہ کوئی دوسرا ہشام بن عمار ہوگا۔''

۳۔ کسی حدیث کا موضوع ہونا راوی اور مروی عنہ یا ان میں سے کسی کے جھوٹے ہونے کے قرائن سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کی مثال وہ واقعہ ہے جو امام ابوعبداللہ الحاکم نے سیف بن عمر التمیمی کے بارے میں خود اسی کے واسطہ سے بیان کیا ہے۔ سیف بن عمر التمیمی کہتا ہے:

''میں سعد بن طریف کے پاس موجود تھا کہ اس کا بیٹا مکتب سے روتا ہوا اس کے پاس آیا۔ سعد نے اس سے رونے کا سبب دریافت کیا تو اس نے کہا: ''معلم نے مجھے مارا ہے۔'' اس پر سعد بولا: ''آج میں معلمین کو رسوا کر کے چھوڑوں گا۔''

((حَدَّثَنِیْ عِکْرَمَةُ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَرْفُوْعًا: مُعَلِّمُوا صِبْیَانِکُمْ شِرَارُکُمْ ، أَقَلُّهُمْ رَحْمَةً لِلْیَتِیْمِ وَأَغْلَظُهُمْ عَلَی الْمِسْکِیْنِ))

''مجھ سے عکرمہ نے ابن عباس سے مرفوعاً روایت کر کے بیان کیا: تمہارے بچوں کے معلمین تم میں بدترین لوگ ہیں وہ یتیموں پر بہت کم رحم کرنے والے اور مسکینوں پر نہایت سخت ہیں۔''

یہ سعد بن طریف وہ ہے جس کے بارے میں امام یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ اس سے حدیث روایت کرنا کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔

امام ابن حبان اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

''وہ حدیثیں وضع کرتا تھا۔''

رہا اس واقعہ کا راوی سیف بن عمر التمیمی تو اس کے بارے میں امام الحاکم کا قول ہے:

''سیف بن عمر پر زندقہ یعنی الحاد و بے دینی کا الزام تھا اور روایت حدیث میں نا قابل اعتبار۔''

اسی قبیل سے وہ واقعہ بھی ہے جو امام الحاکم نے محمد بن عکاشہ الکرمانی الکذاب کے بارے میں نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں:

''مجھے خبر ملی ہے کہ اس کا شمار بھی حدیثیں وضع کرنے والوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک بار اس سے کہا گیا کہ لوگ نماز میں رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت ''رفع یدین'' کرتے ہیں، تو اس نے اسی وقت برجستہ یہ جھوٹی حدیث بیان کر دی:

((حَدَّثَنَا الْمُسَيَّبُ بْنُ وَاضِحٍ : حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الْمُبَارَكِ ، عَنْ يُوْنُسَ بْنِ يَزِيدَ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ اَبِيْهِ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : مَنْ رَفَعَ يَدَيْهِ فِي الرُّكُوعِ فَلَا صَلَاةَ لَهُ))

''ہم سے المسیب بن واضح نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبداللہ بن المبارک نے یونس بن یزید سے، انہوں نے الزہری سے، انہوں نے سالم بن عبداللہ بن عمر سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جس نے رکوع میں رفع یدین کیا تو اس کی نماز نہیں ہوئی۔''

یہ موضوع روایت بدترین جھوٹ کی مثال ہے، کیونکہ اسی سند سے امام الزہری سے مروی جو حدیث مستند کتب حدیث میں موجود ہے اس سے قطعیت کے ساتھ رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے کھڑے ہوتے وقت رفع یدین ثابت ہے۔

۴۔ کسی روایت کے موضوع ہونے کی علامتوں میں سے ایک علامت اس کے طرز بیان اور اسلوب کا رکیک اور گھٹیا ہونا بھی ہے، جس کا صدور نبی ﷺ سے بعید از عقل ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: رکاکت کا مدار اس کے مضمون کی رکاکت پر ہے۔ اور جو روایت بھی اس سے متصف ہوگی یقیناً وہ موضوع ہوگی، کیونکہ دین اسلام پورے کا پورا محاسن سے عبارت ہے۔ رہا اسلوب اور الفاظ کا رکیک ہونا تو اس سے حدیث کے موضوع ہونے کا پتہ نہیں چل سکتا، اس لیے کہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ حدیث کی روایت لفظاً نہیں بلکہ معنًا کی گئی ہو اور راوی نے اصل الفاظ کی جگہ غیر فصیح الفاظ استعمال کیے ہوں، البتہ اگر راوی رکیک الفاظ کو نبی ﷺ کی طرف منسوب کرے تو وہ جھوٹا ہے۔

۵ حدیث کے موضوع ہونے کی علامتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ خلاف عقل ہو بایں طور کہ اس کی کوئی تاویل نہ کی جا سکے، یا حس اور مشاہدے کے خلاف ہو، یا کتاب اللہ، سنت متواترہ اور اجماع کے خلاف ہو یا کسی ایسے اہم اور سنگین معاملے سے متعلق ہو جس کی روایت متعدد راویوں سے ہونی چاہیے، مگر اس کا راوی صرف ایک ہو۔

۶ کسی حدیث کے موضوع ہونے کی ایک علامت یہ ہے کہ راوی رافضی ہو اور اس کی روایت کردہ حدیث میں اہل بیت کے فضائل بیان کیے گئے ہوں۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

''رہے وضع حدیث کے اسباب تو وہ بہت زیادہ ہیں جن میں سے ایک بے دینی اور الحاد بھی ہے، جس کا اصطلاحی نام ''زندقہ'' ہے، چنانچہ زنادقہ اور بدعقیدہ لوگوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس اس طرح نکال لی کہ بظاہر مسلمان بن کر اور مسلمانوں میں گھس کر ان میں ایسی جھوٹی حدیثیں گھڑ کر پھیلائیں جو اسلامی عقائد کے منافی تھیں انہیں زندیقوں میں سے ایک عبدالکریم بن ابی العوجاء بھی تھا، جس کو عباسی خلیفہ المہدی کے عہد میں بصرہ کے گورنر محمد بن سلیمان العباسی نے ۱۶۰ھ میں قتل کیا۔

کبیان بن سمعان النہدی کا شمار بھی زندیقوں میں ہوتا تھا، جو ۱۰۰ھ کے بعد عراق میں ظاہر ہوا، اس ملعون نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کا دعویٰ کیا تھا، اس کو خالد بن عبداللہ القسری نے قتل کرا کے جلوا دیا تھا۔

محمد بن سعید بن حسان الأسدی الشامی المصلوب بھی زندیق تھا۔ اس کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ابوجعفر المنصور نے اس کو ''زندقہ'' کے جرم میں قتل کرا دیا تھا، اس کی روایت کردہ تمام حدیثیں موضوع ہیں۔

احمد بن صالح المصری کا تعلق بھی زنادقہ سے تھا۔ اس نے چار ہزار حدیثیں وضع کر کے لوگوں میں پھیلائیں۔ زندقہ کے جرم میں اس کی بھی گردن ماری گئی۔

مگر ''وضاعین'' میں بدترین اور مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے لوگ وہ تھے، جنہوں نے اپنے آپ کو زہد اور تصوف سے منسوب کر رکھا تھا۔ یہ لوگ ترغیب و ترہیب کے

باب میں حدیثیں وضع کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس خود فریبی میں مبتلا تھے کہ اپنے اس عمل کے ذریعہ وہ عنداللہ ماٌجور ہوں گے۔ ان لوگوں نے اپنے زعم باطل میں مسلمانوں کو خیر و بھلائی پر آمادہ کرنے اور برائی اور معصیت سے دور رکھنے کے لیے حدیثیں وضع کر کے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیں۔ اپنے اس برے عمل کے ذریعہ ان لوگوں نے دراصل فساد پھیلایا تھا اصلاح نہیں کی تھی۔

''ان زاہدوں اور صوفیا سے عام مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا اور اب تک پہنچ رہا ہے، کیونکہ وہ ان کو سچا سمجھتے ہیں، ان پر اعتماد کرتے ہیں اور ان کے ظاہری زہد و صلاح سے مسلسل دھوکہ کھا رہے ہیں۔''

اور اگر اللہ کے وہ بندے نہ ہوتے جو اللہ کے بارے میں سچے اور مخلص تھے، جنہوں نے اپنے دین کے دفاع کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا، جنہوں نے صحیح حدیثوں کو جھوٹی حدیثوں اور موضوع روایات سے الگ کرنے میں اپنی عمریں کھپا دیں۔ اگر یہ ائمہ سنت اور ائمہ رشد و ہدایت نہ ہوتے تو آج دین کا معاملہ علماء اور جہلاء دونوں پر خلط ملط ہو کر رہ جاتا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر سے اعتماد اٹھ جاتا، لیکن ائمۂ حدیث نے نقدِ حدیث کے قواعد وضوابط بنائے، علم جرح و تعدیل وضع کیا اور علوم حدیث کی اصطلاح ایجاد کی جو تاریخی تحقیق اور صحیح کو غلط سے الگ کرنے اور چھانٹنے کے میدان میں سب سے زیادہ دقیق علم ہے۔''

[الباعث الحثیث، ص: ۸۵۔۹۰۔ بالتصرف]

عہد تابعین میں تصوف نے ایک نظریہ اور مسلک حیات کی شکل تو نہیں اختیار کی تھی، البتہ ایسے لوگ بکثرت پیدا ہو گئے تھے، جو زہد و توکل، صلاح و تقوی اور عبادت و ریاضتِ نفس میں غلو سے کام لینے لگے تھے اور بدعات نے بھی سر نکالنا شروع کر دیا تھا اور چونکہ ان چیزوں کو دین میں ''مطلوب'' بنانے کی ضرورت تھی، جبکہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی صحیح سنت میں ان اعمال کا اس شکل میں کوئی ذکر نہیں تھا، جس شکل میں وہ انجام دیئے جا رہے تھے، اس لیے ان کو دین میں مطلوب بنانے کی خاطر لوگوں نے حدیثیں وضع کرنی شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ امام سفیان الثوری (متوفی ۱۶۰ھ)، امام عبداللہ بن المبارک (متوفی ۱۸۱ھ) اور امام یحییٰ بن سعید القطان (متوفی ۱۹۳ھ) وغیرہ نے اس طرح کے زاہدوں سے حدیثوں کی

روایت ترک کر دی تھی اور اپنے شاگردوں اور اپنے معاصر علماء کو ان سے دور رہنے کی تلقین کرنے لگے تھے، جبکہ امام مسلم نے صحیح مسلم کے مقدمے میں صراحت کی ہے اور امام مسلم نے موضوع اور منکر حدیثوں کی روایت کرنے والوں کی جو مختصر فہرست دی ہے ان میں ایک دو کو چھوڑ کر بقیہ تمام لوگ اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، جو اہل صلاح وتقویٰ اور اہل زہد وتوکل کا طبقہ کہلاتا تھا، مگر رسول اللہ ﷺ کے نام پر یا تو خود جھوٹی حدیثیں وضع کرتا تھا یا جھوٹی اور موضوع حدیثوں کی ترویج کا مرتکب ہو رہا تھا۔ ائمہ حدیث کی نگاہوں میں نام نہاد وزاہدوں اور صالحین کا یہ گروہ اس قدر مبغوض تھا کہ جب مشہور زاہد وعابد عباد بن کثیر کا مکہ میں انتقال ہوا تو اس وقت امام سفیان الثوری رحمہ اللہ مکہ میں موجود تھے، مگر وہ اس کے جنازے میں شریک نہیں ہوئے اور امام شعبہ بن الحجاج (متوفی ۱۶۰ھ) اس کے لیے استغفار نہیں کرتے تھے۔ اور یہ صرف اس وجہ سے کہ عباد بن کثیر روایت حدیث میں محتاط نہیں تھا، دین کے بقیہ امور میں اس کی زندگی بے داغ تھی۔

اہل زہد وتوکل اور اہل صلاح وتقویٰ کے نام سے معروف اس طبقہ کی نمایاں صفت ''کذب بیانی'' تھی خصوصیت کے ساتھ روایت حدیث میں جیسا کہ اوپر امام یحییٰ بن سعید القطان کا قول گزر چکا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہ جرح وتعدیل نے ''ثقاہت'' کا معیار کثرت عبادت، کثرت ذکر وفکر، زہد وتوکل، اور صلاح وتقویٰ کو نہیں قرار دیا ہے اور نہ ان صفات سے متصف کسی شخص کو اس کی عدالت کو پرکھے بغیر ثقہ مان لیا ہے، اس لیے کہ ان کے گرد وپیش ان صفات کے حامل جو لوگ تھے، زیادہ تر وہی لوگ روایت حدیث میں غیر معتبر تھے اور اگر ان کی اکثریت وضع حدیث کی مرتکب نہیں تھی تو موضوع اور منکر حدیثوں کی ترویج میں ان کا نمایاں ہاتھ ضرور تھا، خاص طور پر اگر ان موضوع اور منکر حدیثوں کا تعلق ترغیب وترہیب یا فضائل اعمال سے رہا ہو۔ اور آج بھی اس طرح کی حدیثیں انہی کتابوں میں زیادہ ملتی ہیں جو ترغیب وترہیب اور فضائل اعمال کے موضوع پر ہیں، رہیں تفسیر اور سیرت وغیرہ کی وہ کتابیں جن میں موضوع، منکر اور بیحد ضعیف حدیثیں ملتی ہیں تو ان کے مصنفین یا تو ''صوفی المشرب'' تھے یا علم حدیث سے نابلد تھے۔

حافظ ابوالحسن علی بن محمد بن عراق الکنانی نے ''تنزيه الشريعه'' کی جلد اول میں وضاعین، روایت حدیث میں کذب بیانی سے کام لینے والوں اور غیر محتاط راویوں کی جو فہرست دی ہے، اس میں صرف ''وضاعین'' کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے۔ یہ نام انہوں نے مستند ''کتب الرجال'' سے لیے ہیں۔ وضاعین کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر آدمی جہاں دہشت زدہ رہ جاتا ہے وہیں بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ محدثین نے حدیثوں کے ذخیروں کو ان کی پھیلائی ہوئی موضوع اور جھوٹی حدیثوں سے کس طرح پاک

کیا ہوگا؟ تو اس طرح کا سوال امام ربانی عبداللہ بن المبارک سے بھی کیا گیا تھا تو انہوں نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا تھا:

تَعِيشُ لَهَا الْجَهَابِذَةُ ﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴾

ان موضوع روایات کا صفایا کرنے کے لیے ماہر نقادِ حدیث جئیں: ''بیشک ہم نے ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

امام ابن المبارک کا مطلب ہے کہ فن حدیث کے ماہرین ایک ایک موضوع، باطل اور منکر حدیث کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال لیں گے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ذکر...... قرآن...... کو نازل کیا ہے اور وہی اس کی حفاظت کرنے والا ہے تو لامحالہ وہ اس قرآن کے شارح اور اس کو بیان کرنے والے الصادق المصدوق ﷺ کی حدیثوں کی بھی حفاظت فرمائے گا اور موتیوں کے ڈھیر سے خزف ریزوں کو چن چن کر نکالنے والے جوہری بھی پیدا فرمادے گا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ پورا فرمایا اور ایسے دسیوں ائمہ فن پیدا کردیئے جنہوں نے جرح وتعدیل پر کتابیں لکھیں۔ ضعفاء اور متروکین پر کتابیں لکھیں۔ اور ایسی دسیوں کتابیں تصنیف کیں جو موضوع، منکر اور ضعیف حدیثوں پر مشتمل ہیں۔ ذیل میں ہم قدماء اور متاخرین کی چند کتابوں کے نام دے رہے ہیں، جن پر ایک نظر ڈال لینے سے ائمہ حدیث کی ان خدمات کی عظمت اور قدر وقیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے حدیث رسول اللہ ﷺ کو آلائشوں سے پاک کرنے کے لیے انجام دی ہیں۔

١ ''کتاب معرفة التذکرة فی الأحادیث الموضوعه'' تصنیف ابو الفضل محمد بن طاهر مقدسی، متوفی ٥٠٢ھ

٢ ''کتاب الموضوعات مِنَ الأحادیث المرفوعات'' تصنیف ابو عبدالله الحسین بن ابراهیم همذانی جوزقی، متوفی ٥٤٣ھ

٣ ''الموضوعات الکبریٰ'' تصنیف ابو الفرج عبدالرحمٰن بن جوزی، متوفی ٦٧ھ

٤ ''الدر الملتقط فی تبیین الغلط و نفی اللغط'' تصنیف حسن بن محمد الصاغانی، متوفی ٦٥٠ھ

٥ ''المقاصد الحسنة فی بیان کثیر من الاحادیث المشتهرة علی الألسنة'' تصنیف شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی، متوفی ٩٠٢ھ

٦ ''اللآلی المصنوعه فی الأحادیث الموضوعه'' تصنیف جلال اللین عبدالرحمٰن سیوطی،

متوفی ۹۱۱ھ

۷- " تنزيه الشريعة المرفوعة عن الأخبار الشنيعه الموضوعة " تصنيف ابو الحسن علی بن محمد بن عراق كنانی ، متوفی ۹٦۳ھ

۸- " الاسرار المرفوعة في الأخبار الموضوعة " تصنيف علی بن سلطان قاری ، متوفی ١٠١٤ھ

۹- " كشف الخفاء ومزيل الالباس عما اشتهر من الاحاديث على السنة الناس " تصنيف اسماعيل بن محمد عجلونی ، متوفی ١١٦٣ھ

۱۰- " الآثار المرفوعة فی الأحاديث الموضوعه " تصنيف ابو الحسنات عبدالحی لكهنوی ، متوفی ١٣٠٤ھ

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ دسیوں اور کتابیں اس موضوع پر ملتی ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علمائے حدیث ضعیف، موضوع اور منکر حدیثوں کو بے نقاب کرنا اپنا فرض تصور کرتے رہے ہیں، اسی وجہ سے ہر دور میں انہوں نے یہ ذمہ داری بڑے اہتمام اور دلچسپی سے ادا کی ہے۔

لیکن اس فرض اور ذمہ داری کو عصر حاضر کے عظیم محدث علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے جس خوبی، بالغ نظری، دیانت داری اور وسعت کے ساتھ ادا کیا وہ ایک منفرد شان رکھتا ہے۔ صدیوں سے علم حدیث اور علم فقہ پر جمود طاری تھا اور ان دونوں میدانوں میں اگر کوئی بڑے سے بڑا عالم اور محقق پیدا ہو رہا تھا تو وہ بھی قدماء کا جامد مقلد ہوتا تھا اور اس کا تمام تر تحقیقی کام شروح حواشی سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔

لیکن عرب فضا سے بہت دور البانیہ میں پیدا ہونے والے ایک نہایت گمنام اور غریب خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک نحیف ونزار نوجوان نے اپنے قلم، فکر، طریقۂ بحث واستدلال سے اس جمود کو توڑ دیا اور علمی اور عملی دونوں طریقوں سے یہ ثابت کر دیا کہ علم میں نہ تو جمود ہے اور نہ حرف آخر۔

آج سے کوئی ستر سال قبل عالمہ البانی نے دمشق کے ایک رسالے " التمدن الاسلامیه " میں " سلسلة الأحاديث الضعيفه والموضوعة واثرها السيئ فی الأمة " کے عنوان سے سلسلہ وار مضمون کا آغاز کیا جس نے علمی دنیا میں ایک ہلچل مچا دی، جمود وتقلید کے شکار علماء کو چونکا دیا۔ اہل بدعات کے امن وسکون کو غارت کر دیا اور نام نہاد علماء نے تصوف کے نام سے عبادت وریاضتِ نفس کے جو نت نئے طریقے ایجاد کر لیے تھے اور جن کی مشقیں وہ اپنے مریدوں سے کرا رہے تھے، ان میں سے ہر طریقے کی انہوں نے خبر لی اور دلائل وبراہین سے یہ ثابت کر دیا کہ یہ طریقے اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اور ان کا جو بھی ماخذ ہو بہر

حال ان کا مأخذ کتاب وسنت اور عمل صحابہ نہیں ہے۔

البانی نے امت کے علماء اور طلباء کو نئے اور عصری اسلوب کے ذریعہ مخاطب کیا انہوں نے اپنے اس سلسلے وار مضمون کو بعد میں کتابی شکل دے دی اور اسی عنوان سے اس کی پہلی جلد ۱۳۷۴ھ بمطابق ۱۹۵۴ء میں شائع کی، جس میں ہر ضعیف، موضوع اور منکر حدیث کا نہایت علمی انداز میں ''پوسٹ مارٹم'' کیا۔ اگر کوئی حدیث متعدد طرق اور سندوں سے مروی ہے تو ہر ہر سند اور طریقے کے راویوں کی جرح وتعدیل اس فن کے ائمہ کے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں کر کے اس کا حسن وقبح اور صحت وسقم بیان کیا۔

علامہ البانی کی یہ شاہکار کتاب ۱۴ ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی۔ جن میں سے ۱۱ جلدیں طبع ہو چکی ہیں، اس کتاب میں انہوں نے سات ہزار ضعیف، موضوع اور منکر حدیثوں کی خبر لی ہے۔

" السلسلة الضعيفه " کے علاوہ انہوں نے علماء میں متداول حدیث کے تمام مجموعوں کا ایک ناقد کی حیثیت سے مطالعہ کیا۔ اور پھر ہر مجموعے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ایک حصہ میں صحیح حدیثیں جمع کر دیں اور دوسرے میں ضعیف اور موضوع اس طرح انہوں نے سنن اربعہ کو درج ذیل شکل میں شائع کیا۔

۱ صحیح سنن ابی داؤد	ضعیف سنن ابی داؤد
۲ صحیح سنن ترمذی	ضعیف سنن ترمذی
۳ صحیح سنن نسائی	ضعیف سنن نسائی
۴ صحیح سنن ابن ماجہ	ضعیف سنن ابن ماجہ

اسی طرح انہوں نے حافظ المنذری کی مشہور کتاب ''الترغیب والترھیب'' کو بھی دو حصوں ''صحیح الترھیب والترغیب'' اور ''ضعیف الترغیب والترھیب'' اور حافظ السیوطی کی کتاب الجامع الصغیر کو صحیح الجامع الصغیر اور ضعیف الجامع الصغیر کے نام سے شائع کیا اور ہر کتاب کی جدید طرز کی فہرست بنائی۔ ہر کتاب کے آخر میں حروف تہجی کے اعتبار سے حدیثوں کی فہرست شامل کر دی، جس کے ذریعہ کسی بھی حدیث کو معلوم کرنا آسان ہو گیا۔

''مشکوٰۃ المصابیح'' صدیوں سے عربی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے اور علماء اور باحثین اپنے علمی کاموں میں اس سے رجوع کرتے ہیں، انہوں نے اس کتاب کی علمی تحقیق کر کے اور جدید عصری طریقے سے اس کو تین جلدوں میں شائع کیا۔ اور حاشیہ میں صحیحین کے علاوہ دوسری کتابوں سے منقول حدیثوں کے درجات متعین کر دیئے اور اگر اصل کتاب میں منقول کسی حدیث کے مأخذ کے تعین میں سہو ہوا ہے تو اس کو

واضح کر دیا اس طرح صدیوں سے متداول یہ کتاب پہلے سے کہیں زیادہ گراں قدر ہوگئی۔

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کی خدمات حدیث اور ان کے علمی کاموں کا جائزہ لینے کے لیے ایک ضخیم کتاب بھی کافی نہیں ہے۔ انہوں نے پہلے تصنیف، تحقیق اور تخریج احادیث کے عنوانات کے تحت جو کتابیں چھوڑی ہیں، ان کی تعداد ۱۱۸ ہے۔ جن میں سے متعدد کتابیں کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔

علامہ البانی کا اصل کارنامہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے بڑی تعداد میں کتابیں لکھی ہیں بلکہ ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے علماء میں زندگی کی روح پھونک دی۔ انہوں نے تاریخ اسلامی کے عصر زریں کے ائمہ کی یاد تازہ کر دی۔ امام ربانی محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے فرمایا تھا کہ: ''ہم پہلے لوگوں سے کسی حدیث کی سند نہیں پوچھتے تھے، مگر مسلمانوں میں ''فتنہ'' پیدا ہو جانے کے بعد اب ہم ہر شخص سے یہ پوچھنے لگے ہیں کہ جو حدیث تم بیان کر رہے ہو اس کی سند کیا ہے؟'' اسی طرح علامہ البانی نے بھی لوگوں میں ایک نیا شعور و احساس پیدا کر دیا اور امت کے علماء، طلباء اور باحثین کو اس امر پر مجبور کر دیا کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کسی حدیث کو اس وقت تک قبول نہ کریں جب تک یہ تاکید نہ کر لیں کہ الصادق والمصدوق فداہ ابی وامی ﷺ سے اس کی نسبت صحیح ہے یا نہیں؟

علامہ البانی نے اپنی زندگی ہی میں علماء اور باحثین کی ایک جماعت ایسی پیدا کر دی تھی، جس نے ان کے علمی منہج پر چلتے ہوئے، اپنی تصنیفات میں صرف احادیث سے استدلال کرنے کا التزام رکھا اور ان کی وفات کے بعد بھی اس علمی منہج پر عمل جاری ہے۔ گزشتہ ستر سال کے عرصہ میں تفسیر، حدیث، سیرت اور فقہ کے موضوع پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں سے اکثر کتابوں میں جہاں صحیح احادیث سے استدلال کا التزام کیا گیا ہے وہیں ہر حدیث کا مأخذ بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ اب لوگ ایسی کتابوں پر اعتماد نہیں کرتے، جن میں حدیثوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا جاتا ہے: ''نبی ﷺ نے فرمایا ہے۔'' ''حدیث میں آیا ہے۔'' ''روایت ہے۔'' وغیرہ۔

علامہ البانی نے شخصیت پرستی کی روایت کو بھی ختم کر دیا اور یہ شعور بیدار کر دیا کہ نبی ﷺ کے علاوہ کسی بھی شخص کی بات دلیل کے بغیر نہ...... انہوں نے اپنے قول اور عمل کے ذریعہ یہ نمونہ بھی پیش کر دیا کہ ہماری دوستی یا دشمنی صرف ''حق'' کی خاطر ہو۔

انہوں نے کسی کی مدح و ستائش اور اس کے افکار و آراء پر تنقید کی راہ میں مسلکی تعصب کو حجاب نہیں بننے دیا ان کی تصنیفات میں ہندوستان کے مشہور حنفی محدث اور فقیہ علامہ ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ کی بڑی

تعریف ملتی ہے، انہوں نے ان کے طرز استدلال، ان کی وسعت معلومات، ان کی حق دوستی اور محدثین کی حمایت اور تائید کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور جب بھی ان کا ذکر کیا ہے ''العلامہ'' کے لقب سے کیا ہے۔

اسی طرح برصغیر کے عظیم مفکر، داعی اسلام اور عالم دین سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ سے ''پردہ'' کے معاملے میں ان کا قلمی معرکہ ہو چکا ہے۔ مودودی صاحب نے اپنی مشہور کتاب ''پردہ'' میں جس سخت موقف کا اظہار کیا ہے، علامہ البانی رحمہ اللہ اس کو صحیح نہیں سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک کتاب اللہ اور صحیح احادیث سے چہرے اور ہتھیلیوں کا پردہ ثابت نہیں ہے۔ اسی طرح ''الجہاد فی الاسلام'' میں مودودی صاحب نے ذمی کے مسلم قاتل کے قصاص کے مسئلے میں جو حکم بیان کیا ہے وہ صحیح حدیث کے خلاف ہے اور البانی نے اس کی نکیر کی ہے اس کے باوجود وہ مودودی صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے، ان کے علم اور اخلاص فی الدین کے مداح تھے اور ان کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے اور ان کا ذکر ''الاستاذ المجاہد'' کے لقب سے کرتے تھے۔

اس کے برعکس وہ سلفی العقیدہ ہونے کے باوجود سلفیوں کی غلطیوں پر ان کا مؤاخذہ کرنے سے بھی باز نہیں رہتے تھے۔

محدث البانی رحمہ اللہ درحقیقت ''عالم ربانی'' تھے، انہوں نے حدیث نبوی کی جو عظیم خدمت انجام دی ہے، وہ شاید پوری ایک اکیڈیمی بھی انجام نہ دے سکے۔ انہوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، آداب و اخلاق اور تصوف و فضائل و اعمال کی قدیم و جدید کتابوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور جرح و تعدیل اور روایت و درایت کی چھلنی سے چھان چھان کر صحیح کو ضعیف سے الگ کیا اور دونوں کو ہمارے ہاتھ میں دے دیا، اگر کسی حدیث کو صحیح قرار دیا تو دسیوں علمی دلائل کے ذریعہ اس کو صحیح قرار دیا اور اگر کسی حدیث کو ضعیف، موضوع اور منکر کیا تو جذبات اور پسند یا ناپسند کا معیار استعمال کرنے کے بجائے ان ٹھوس علمی اصولوں کو استعمال کیا جو محدثین نے اپنی طویل محنت اور سینکڑوں سالوں پر پھیلے ہوئے تجربوں اور بحث و تحقیق کے نتیجے میں وضع کیے تھے۔

وہ عالم باعمل تھے، جس چیز کو حق مانتے تھے، اس کو حق کہنے اور اس پر عمل کرنے سے دنیا کی کوئی طاقت ان کو باز نہ رکھ سکی۔ حق کی حمایت میں وہ دوستوں سے دوستی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور دشمن سے خوف زدہ نہیں ہوتے، حق کی خاطر ان کو جیل میں ڈالا گیا۔ ان کی ساری جائیداد اور ہزاروں قیمتی اور نادر کتابوں پر مشتمل ان کے کتب خانہ پر قبضہ کر کے ''تن'' پر موجود کپڑوں کے ساتھ ان کو وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور

کیا گیا، مگر حق کی راہ میں وہ اسی سودے پر راضی رہے کہ سینہ کا علم اور زبان و قلم کی طاقت تو محفوظ ہے۔ اور آج یہ حال ہے کہ عالم عرب و اسلام کے کونے کونے میں سینکڑوں نہیں، ہزاروں زبانوں سے، چاہے وہ خطبا ہوں، اساتذہ ہوں یا مصنفین کسی حدیث کے ذکر کے بعد جب یہ سننے کو ملتا ہے۔ ''صححه الالبانی'' (البانی نے اس حدیث کو صحیح بتایا ہے۔) '' ضعفه الالبانی'' (البانی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔) تو دل میں ایک عجیب سا سرور ایک عجیب سی ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ گواہی دینے لگتا ہے کہ وہ اللہ کا غریب الدیار بندہ جو آج سے کوئی ۹۰ سال قبل اپنے باپ کی انگلی پکڑے ہوئے دمشق میں داخل ہوا تھا اور گردشِ ایام اور فقر و محتاجی نے اس کو ابتدائی ...... مکتب ...... سے زیادہ تعلیم جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی تھی اور جو کسب معاش کی خاطر ''گھڑی سازی'' کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ یقیناً وہ فطرت سلیم اور قلب سلیم کا مالک تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ بلند درجہ عطا کیا اور یقیناً وہ ''عالم ربانی'' تھا۔

رحمه الله رحمةً وَاسِعَةً

باب دوم

اصطلاحاتِ حدیث

۱ حدیث:

رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کو حدیث کہتے ہیں۔

قول اور فعل کا مفہوم تو واضح ہے۔ تقریر کا مطلب ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کوئی دینی عمل انجام دیا گیا۔ دین سے متعلق کسی صحابی نے کوئی بات کہی، یا نبی ﷺ کو کسی صحابی کے کسی دینی فعل یا قول کی خبر ملی تو آپ نے یا تو بصراحت اس کو منظور فرما لیا یا خاموش رہے اور اس کی کوئی نکیر نہیں فرمائی۔

۲ سند:

حدیث کے راویوں کے سلسلے کو سند کہتے ہیں۔

مثال:............

((حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الزُّبَيْرِ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدِ الْأَنْصَارِيُّ قَالَ: أَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ اِبْرَاهِيمَ التَّيْمِيُّ: أَنَّهُ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاصٍ اللَّيْثِيَّ يَقُولُ: سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَلَى الْمِنْبَرِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ:))

''(امام بخاری کہتے ہیں:) ہم سے الحمیدی عبداللہ بن الزبیر نے بیان کیا۔ کہا: ہم سے سفیان نے بیان کیا۔ کہا: ہم سے یحییٰ بن سعید الانصاری نے بیان کیا کہا: مجھ کو محمد بن ابراہیم التیمی نے خبر دی کہ انہوں نے علقمہ بن وقاص اللیثی کو کہتے ہوئے سنا کہ انہوں نے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو منبر پر یہ کہتے ہوئے سنا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔''

تو یہ عبارت حدیث کی سند ہے جس میں امام بخاری، الحمیدی عبداللہ بن الزبیر، سفیان، یحییٰ بن سعید الانصاری، محمد بن ابراہیم التیمی، علقمہ بن وقاص اللیثی، عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اس سند کی کڑیاں (سلسلہ) ہیں۔

توضیح:

یہ صحیح بخاری کی پہلی حدیث کی سند ہے۔ راوی امام بخاری ہیں جن کا نام محمد بن اسماعیل بن ابراہیم ہے۔ امام بخاری کے شیخ کا نام عبداللہ بن الزبیر الحمیدی ہے جو امام الشافعی کے ہم عصر اور طلب حدیث میں ان کے ساتھی تھے۔

الحمیدی کے شیخ سفیان بن عیینہ ہیں، جو امام مالک کے ہم عصر اور ان کے ہم درس تھے۔ انہوں نے ستر تابعین سے سے حدیثیں سنیں ہیں۔

سفیان بن عیینہ کے شیخ یحییٰ بن سعید الانصاری ہیں، جن کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔

یحییٰ بن سعید الانصاری کے شیخ محمد بن ابراہیم التیمی بھی تابعی تھے۔

یحییٰ بن سعید کے شیخ علقمہ بن وقاص اللیثی بھی تابعی تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں صحابی تھے۔

علقمہ بن وقاص اللیثی نے یہ حدیث حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے سنی، جو جلیل القدر صحابی اور دوسرے خلیفۂ راشد تھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنی۔

اِسناد:

ا……حدیث کی سند بیان کرنا۔

ب……سند کا مترادف۔

مسند:

وہ حدیث جس کی سند بیان کی گئی ہو۔

متن:

حدیث کی عبارت اور نص۔

متن کی مثال:…………

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ، وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى ، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلٰى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ إِلٰى امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا ، فَهِجْرَتُهُ اِلٰى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ)) [1]

[1] بخاری حدیث نمبر : ١

''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر انسان کے لیے بس وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی ہے تو جس کی ہجرت دنیا کی طرف ہے کہ وہ اسے حاصل ہو جائے یا کسی عورت کی طرف ہے کہ اس سے شادی کر لے تو اس کی ہجرت اسی چیز کی طرف مانی جائے گی، جس کی طرف اس نے ہجرت کی نیت کی ہوگی۔''

یہ حدیث اسی حدیث کا متن ہے، جس کی سند، سند کی مثال میں پیش کی جا چکی ہے۔

حدیث مرفوع:

وہ حدیث جس کی نسبت نبی ﷺ کی طرف ہو۔ اوپر بیان کردہ حدیث، حدیث مرفوع ہے۔

موقوف:

صحابی کے قول یا فعل کو موقوف کہتے ہیں۔ اس کو اثر بھی کہتے ہیں۔

مثال:............

((حَدَّثَنَا عَارِمُ بْنُ الْفَضْلِ ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الْمُبَارَكِ ، قَالَ: حَدَّثَنَا زَكَرِيَّا عَنْ وَهْبِ بْنِ الْأَجْدَعِ ، قَالَ: سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ يَقُولُ: إِذَا قَدِمْتُمْ فَطُوفُوا بِالْبَيْتِ ، وَصَلُّوا عِنْدَ الْمَقَامِ رَكْعَتَيْنِ ، ثُمَّ أْتُوا الصَّفَا ، فَقُومُوا عَلَيْهِ مِنْ حَيْثُ تَرَوْنَ الْبَيْتَ ، فَكَبِّرُوا سَبْعَ تَكْبِيرَاتٍ ، بَيْنَ كُلِّ تَكْبِيرَتَيْنِ حَمْدٌ لِلّٰهِ ، وَثَنَاءٌ عَلَيْهِ ، وَصَلَاةٌ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ وَمَسْأَلَةٌ لِنَفْسِكَ ، وَعَلَى الْمَرْوَةِ مِثْلُ ذَالِكَ)) ❶

''ہم سے عارم بن الفضل نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبداللہ بن المبارک نے بیان کیا، کہا: ہم سے زکریا نے الشعبی سے اور انہوں نے وھب بن الاجدع سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ وھب بن الاجدع نے کہا: میں نے عمر بن الخطاب کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جب تم باہر سے آؤ تو بیت اللہ کا سات بار طواف کرو اور مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نماز پڑھو، پھر الصفا پر آؤ اور اس پر اس جگہ کھڑے ہو، جہاں سے تم بیت اللہ کو دیکھ سکو اور سات تکبیریں کہو اور ہر دو تکبیروں کے درمیان اللہ کی حمد وثنا بیان کرو۔ نبی ﷺ پر درود بھیجو اور اپنے لیے دعا کرو اور

❶ فضل الصَّلَاةِ على النبي صلى الله عليه وسلم ، حديث نمبر : ٨١

مردہ پر بھی اس طرح کرو۔"

مقطوع:

تابعی یا تبع تابعی کے قول یا فعل کو کہتے ہیں۔

مثال:............

((عَنْ سَعِيدِ بْن مَنْصورٍ ، عن ابْنِ الْمُبَارَكِ ، عَن هِشَامِ بْنِ حَسَّانٍ أَنَّ الْحَسَنَ سُئِلَ عَنِ الصَّلَاةِ خَلْفَ صَاحِبِ الْبِدْعَةِ، فَقَالَ الْحَسَنُ: صَلِّ خَلْفَهُ وَعَلَيْهِ بِدْعَتُهُ)) ❶

"سعید بن منصور سے روایت ہے، انہوں نے عبداللہ بن المبارک سے روایت کیا اور انہوں نے ہشام بن حسان سے کہ الحسن البصری سے بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے کے بارے میں سوال کیا گیا تو کہا: تم اس کے پیچھے نماز پڑھ لو، اس کی بدعت کا وبال اس کے اوپر ہے۔"

یہ حدیث مقطوع ہے، کیونکہ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے، جو تابعی تھے۔

حدیث صحیح:

وہ مسند حدیث جس کی سند کی تمام کڑیاں باہم متصل ہوں، نیچے سے اوپر تک ہر راوی "عدالت" سے موصوف ہو، نہایت قوی اور قابلِ اعتماد حافظہ کا مالک ہو اور حدیث نہ "شاذ" ہو اور نہ اس میں کوئی علت ہی ہو۔

مُسند:

اس کی تعریف اوپر گزر چکی، یعنی جس کی سند بیان کی گئی ہو۔

عدالت:

عدالت سے مراد یہ ہے کہ راوی عاقل اور بالغ مسلمان ہو۔ فسق اور بے حیائی کے عیب سے پاک ہو، سیرت وکردار میں قابلِ بھروسہ ہو اور ثقاہت سے گری ہوئی حرکتوں کا مرتکب نہ ہوتا ہو۔

عدالت سے موصوف آدمی کی صفت " عَدْلٌ " ہے جو عَدَلَ يَعْدُلُ کا مصدر ہے اور اسم فاعل "عادل" کے معنی میں ہے، جس میں "مبالغہ" کا مفہوم مضمر ہے۔ یعنی سراپا عدالت اور استقامت علی الدین۔

❶ فتح الباري: ۱/ ۵۹۲

حافظہ کا قوی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز یاد کرلی اور حافظہ کی گرفت میں آ گئی وہ اس میں محفوظ ہوگئی اور اگر کوئی چیز لکھ لی تو ہر طرح کے تغیر و تبدل سے محفوظ رہی اور اس کو دل و جان کی طرح عزیز رکھا اور کسی ناقابل اعتماد آدمی کے ہاتھ میں نہیں دیا۔

شاذ:

شاذ نہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ زیادہ صحیح اور قوی حدیث کے خلاف نہ ہو۔ اس کی تفصیل تعریف ضعیف حدیثوں کے ضمن میں آئے گی۔

علت:

علت سے مراد حدیث کے متن یا سند میں پوشیدہ ایسا نقص اور عیب ہے جو نگاہ تحقیق کی گرفت میں بمشکل آ سکے اور جس سے حدیث پاک کا ہونا ضروری ہے۔

صحیح حدیث کی مثال:..........

((حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوسُفَ ، قَالَ: اَخْبَرَنَا مَالِكٌ ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَرَأَ فِي الْمَغْرِبِ بِالطُّورِ)) [1]

''ہم سے عبداللہ بن یوسف نے بیان کیا، کہا: ہم کو مالک نے ابن شہاب سے، انہوں نے محمد بن جبیر بن مطعم سے اور انہوں نے اپنے باپ......جبیر بن مطعم ......سے روایت کرتے ہوئے خبر دی کہ جبیر بن مطعم نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ آپؐ نے مغرب میں سورۃ الطّور کی تلاوت فرمائی۔''

یہ حدیث صحیح ہے اس لیے کہ:

ا......اس حدیث کی سند متصل ہے، کیونکہ یہ حدیث ہر راوی نے اپنے شیخ سے براہِ راست سنی ہے اور مالک، ابن شہاب اور محمد بن جبیر کا '' عنعنه '' بھی اتصال کے حکم میں ہے اس لیے کہ ان تینوں راویوں میں سے کوئی ''مدلس'' نہیں ہے۔

ب......سند کے تمام راوی عدول اور حافظہ کے قوی ہیں۔

۱ عبداللہ بن یوسف:......ثقہ اور ماہر راوی حدیث ہیں۔

[1] بخاری، حدیث: ٦٥، مسلم/ حدیث: ٤٦٣

۲۔ مالک بن انس:...... حدیث کے امام اور حافظ ہیں۔ حدیث کی مشہور کتاب الموطا آپ ہی کی تصنیف ہے۔

۳۔ محمد بن مسلم بن شہاب الزہری:...... فقیہ اور حافظ ہیں۔ ان کی امامت فی الحدیث پر ائمہ حدیث کا اتفاق ہے۔

۴۔ محمد بن جبیر:...... ثقہ تابعی ہیں۔

۵۔ جبیر بن مطعم:...... صحابی ہیں۔

ج...... یہ حدیث شاذ نہیں ہے، اس لیے کہ اس سے قوی تر کوئی حدیث اس کے خلاف نہیں ہے۔

د...... اس حدیث کی سند یا متن میں کوئی علت اور نقص بھی نہیں ہے۔

حدیث حسن:

وہ حدیث جس کی سند متصل ہو، اس کے راوی عدول ہوں، وہ شذوذ اور علت سے بھی پاک ہو، مگر اس کے راویوں یا کسی ایک راوی کا حافظہ بہت اعلیٰ درجے کا نہ ہو، بلکہ اعلیٰ درجے سے کچھ کم ہو۔

مثال:............

((حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ : حَدَّثَنَا ابو الأحوصِ ، عَنْ سِمَاكِ بْنِ حَرْبٍ ، عَنْ قَبِيصَةَ بْنِ هُلْبٍ ، عَنْ أَبِيهِ ، قَالَ: كَانَ رَسولُ اللهِ ﷺ يَؤُمُّنَا ، فَيَنْصَرِفُ عَلَى جَانِبَيْهِ جَمِيْعًا : على يَمِينِهِ وَعَلَى شِمَالِهِ)) [1]

''ہم سے قتیبہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابوالاحوص نے سماک بن حرب سے، انہوں نے قبیصہ بن ھلب سے اور انہوں نے اپنے باپ سے، کہا: رسول اللہ ﷺ ہماری امامت فرماتے تھے، پس دونوں جانب یعنی داھنی طرف یا بائیں طرف گھوم جاتے تھے۔''

یہ حدیث حسن ہے، اس لیے کہ:

۱۔ قتیبہ:...... ثقہ ہیں۔

۲۔ ابوالاحوص:...... ثقہ ہیں۔

۳۔ سماک بن حرب:...... سچے ہیں۔

۴۔ قبیصہ:...... مقبول ہیں۔

---

[1] الترمذی ، حدیث : ۳۰۱

۵ ھلب :......صحابی ہیں۔

اس طرح دو راوی: سماک بن حرب اور قبیصہ صحیح حدیث کے راویوں سے کمتر درجے کے ہیں۔ اس لیے یہ حدیث صحیح کے درجے سے اتر کر ''حسن'' کے درجے پر پہنچ گئی۔ اسی وجہ سے امام ترمذی نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

'' حدیث هُلب حدیث حسن '' ھلب کی حدیث حسن ہے۔

صحیح لذاتہ:

اس حدیث کو کہتے ہیں، جس کی سند ابتدا سے انتہا تک جڑی ہوئی اور متصل ہو، ہر راوی عدل...... عادل...... ہو، نہایت اعلیٰ درجے کے حافظہ کا مالک ہو اور حدیث شذوذ اور علت سے پاک ہو۔

اوپر صحیح حدیث کی جو مثال دی گئی ہے، وہی اس کی مثال ہے۔

حسن لذاتہ:

اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں صحیح حدیث کی تمام شرطیں پائی جاتی ہوں۔ البتہ بعض راویوں کا حافظہ اور ضبط تحریر اعلیٰ درجے کا نہ ہو، بلکہ صحیح حدیث کے راویوں کے حافظے اور ضبط سے ہلکا ہو۔

حسن حدیث کی جو مثال اوپر دی گئی ہے، وہی اس کی مثال ہے۔

صحیح لغیرہ:

وہ حسن لذاتہ حدیث ہے جس کو اس کے مانند یا اس سے قوی تر حدیث کی تائید حاصل ہو تو وہ حسن لذاتہ کے درجے سے نکل کر صحیح لغیرہ کا درجہ حاصل کر لیتی ہے اور اس کو صحیح لغیرہ کا نام اس لیے دیا گیا ہے، کیونکہ اس کی یہ صحت اس کی اپنی سند کا نتیجہ نہیں بلکہ دوسری حدیث کے اس کے ساتھ مل جانے کا نتیجہ ہے۔

حافظ ابن الصلاح نے اپنے مقدمہ (ص:۳۲) میں اس ''صحیح لغیرہ'' کی جو مثال دی ہے وہ درج ذیل حدیث ہے:

((عن مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرٍو عَنْ أَبِي سَلَمَةَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَوْ لَا أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ))

''محمد بن عمرو سے روایت ہے، انہوں نے ابوسلمہ سے روایت کیا اور انہوں نے ابوہریرہ سے

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر مجھے اپنی امت پر مشقت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دے دیتا۔''

حافظ ابن الصلاح تحریر فرماتے ہیں:

''محمد بن عمرو بن علقمہ سچ گوئی اور حفاظت میں مشہور لوگوں میں سے ہیں، لیکن ان کا شمار فن روایت کے ماہرین میں نہیں ہوتا تھا کیونکہ بعض لوگوں نے ان کے برے حافظہ کی وجہ سے ان کو ضعیف قرار دیا ہے اور کچھ لوگوں نے ان کے صدق اور جلالتِ شان کی بنیاد پر ان کو ثقہ کہا ہے۔ اس طرح ان کی روایت کردہ یہ حدیث حسن ہے، لیکن جب اس حدیث کے ساتھ یہ بات شامل ہوگئی کہ یہ دوسری سندوں سے بھی مروی ہے، تو ان کے برے حافظہ کی وجہ سے اس حدیث کے بارے میں جو خوف تھا وہ دور ہوگیا اور دوسری سندوں سے مروی حدیث کی وجہ سے اس کا نقص زائل ہوگیا اور اس کو صحیح کا درجہ حاصل ہوگیا۔''

حسن لغیرہ:

وہ ضعیف حدیث ہے، جو متعدد طرق اور سندوں سے مروی ہو اور اس کے ضعیف ہونے کا سبب راوی کا فسق اور کذب بیانی نہ ہو۔

توضیح:

ا......اگر کوئی ضعیف حدیث مزید کسی دوسری سند یا زیادہ سندوں سے مروی ہو بشرطیکہ دوسرے طرق یا تو اس کے مانند ہوں یا اس سے قوی تر ہوں۔

ب......حدیث کے ضعیف ہونے کا سبب یا تو راوی کا کمزور اور برا حافظہ ہو، یا سند کا منقطع ہونا ہو یا کسی راوی کا مجہول ہونا ہو تو کثرت طرق سے وہ حسن لغیرہ کا درجہ حاصل کرلے گی۔

مثال:............

((حَدَّثَنَا عَاصِمُ بْنُ عَلِيٍّ ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ بْنُ الْحَجَّاجِ ، عَنْ عَاصِمِ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ ، قَالَ: سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنِ عَامِرِ بْنَ رَبِيْعَةَ عَنْ أَبِيْهِ ، قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: مَا مِنْ عَبْدٍ يُصَلِّي عَلَيَّ اِلَّا صَلَّتْ عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ مَا صَلَّى عَلَيَّ فَلْيُقِلَّ مِنْ ذٰلِكَ اَوْ لِيُكْثِرْ)) [1]

[1] فضل الصلاة ، حديث: ٦

''ہم سے عاصم بن علی نے بیان کیا، کہا: ہم سے شعبہ بن الحجاج نے عاصم بن عبیداللہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، کہا: میں نے عبداللہ بن عامر بن ربیعہ کو اپنے باپ سے روایت کرتے ہوئے سنا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''جو بندہ بھی میرے اوپر درود بھیجے گا، تو جب تک وہ میرے اوپر درود بھیجتا رہے گا تو فرشتے اس پر درود بھیجتے رہیں گے لہٰذا وہ چاہے تو درود کم پڑھے یا زیادہ۔''

تو یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کے ایک راوی عاصم بن عبیداللہ بن عاصم بن عمر بن الخطاب القرشی ضعیف ہیں۔ رہے دوسرے راوی تو وہ ثقہ ہیں، لیکن یہ حدیث متعدد دوسرے طرق اور سندوں سے مروی ہونے کی وجہ سے ''حسن لغیرہ'' ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:............

کیا ہر وہ ضعیف حدیث جو متعدد طرق اور سندوں سے مروی ہو حسن لغیرہ کا درجہ حاصل کر لیتی ہے؟ حافظ ابن الصلاح اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایسا نہیں ہے کہ حدیث میں موجود ہر ضعف، حدیث کے دوسرے طرق سے مروی ہونے کی وجہ سے دور ہو جاتا ہے؛ بلکہ اس ضعف کے درجات ہیں: حدیث میں ضعف ایسا بھی ہوتا ہے جو راوی کے حافظہ کی کمزوری کا نتیجہ ہوتا ہے، جبکہ اس کا شمار اہل صدق و دیانت میں ہوتا ہے تو ایسے راوی کی روایت کردہ حدیث کو جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کسی دوسری سند سے بھی مروی ہے تو ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنی روایت کردہ حدیث کو یاد رکھا تھا اور اس کے ضبط حدیث میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا تھا۔

اسی طرح اگر حدیث ''مرسل'' ہونے کی وجہ سے ضعیف ہو اور ''ارسال'' کرنے والا کوئی امام یا حافظ ہو تو یہ بہت معمولی ضعف ہے جو اس کے دوسری سند سے مروی ہونے سے دور ہو جاتا ہے۔ لیکن حدیث میں ضعف ایسا بھی ہوتا ہے جو اتنا قوی ہوتا ہے کہ اس کی دوسری سند اس کو دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ مثال کے طور پر حدیث میں وہ ضعف جو راوی کے جھوٹا ہونے یا حدیث کے شاذ ہونے کا نتیجہ ہو تو یہ ضعف محض اس وجہ سے دور نہیں ہو سکتا کہ وہ متعدد طرق اور سندوں سے مروی ہے۔'' [مقدمہ/ص: ۳۱،۳۲]

بلکہ علامہ احمد محمد شاکر کے بقول:

''اگر حدیث اس وجہ سے ضعیف ہو کہ اس کا راوی فاسق ہے یا اس پر کذب بیانی کا الزام ہے تو اگر یہ حدیث اس طرح کے متعدد طرق سے مروی ہو، پھر بھی اس کا یہ عیب باقی رہے گا بلکہ کثرت طرق سے اس کا ضعف بڑھ جائے گا۔ اس لیے کہ جن لوگوں پر جھوٹ کا الزام ہو یا جن کی عدالت داغدار ہو ان کا کسی حدیث کی روایت میں منفرد ہونا اس حدیث کے اعتبار کو ختم کر دیتا ہے۔'' [الباعث الحثیث ص: ۵۰]

جرح وتعدیل:

اس علم کو کہتے ہیں جس میں راوی کی ثقاہت اور عدمِ ثقاہت سے بحث کی جاتی ہے۔

تعدیل:

عَدَّلَ يُعَدِّلُ کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو درست کرنا، ٹھیک کرنا، برابر کرنا۔ ''تعدیل الراوی'' کے معنی ہیں راوی کو معتبر قرار دینا۔

اور علم حدیث کی اصطلاح میں تعدیل کے معنی ہیں: راوی کو ایسی صفات سے موصوف کرنا یا اس کی ایسی صفات بیان کرنا جو اس کی روایت کو قابل قبول بنا دیتی ہیں۔

جرح:

جَرَحَ يَجْرَحُ کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں: کسی شخص کو زخمی کرنا، اس کی توہین کرنا، اس کے عیوب بیان کرنا۔

اور علم حدیث کی اصطلاح میں ''جرح الراوی'' کے معنی ہیں: راوی کے وہ اوصاف بیان کرنا جو اس کی روایت کو ناقابلِ قبول بنا دیتے ہیں۔

محدثین کے نزدیک راوی کی تعدیل علی الاطلاق معتبر ہے، مگر ''جرح'' صرف وہی مقبول ہے جو ''مُفَسَّر'' ہو یعنی جس کا سبب بیان کیا گیا ہو، کسی شخص کو صرف ضعیف کہہ دینا کافی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ وہ ضعیف اور ناقابلِ اعتبار کیوں ہے؟

ثقاہت کے مراتب اور درجات:

حافظ ابن الصلاح تحریر فرماتے ہیں:

''جمہور ائمہ حدیث وفقہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ کسی شخص کے اپنی روایت میں حجت ہونے کی یہ شرط ہے کہ وہ عدل ہو اور جو حدیث روایت کر رہا ہے اس کا حافظ اور ضابط ہو، جس کی تفصیل یہ ہے:

راوی مسلمان ہو، بالغ ہو، عاقل ہو، فسق و فجور کے اسباب اور سیرت و کردار اور انسانیت سے گری ہوئی حرکتوں سے پاک ہو، حاضر دماغ اور بیدار مغز ہو، غفلت اور بھول چوک کا شکار نہ ہو۔ اگر اپنے حافظہ سے حدیث روایت کر رہا ہے تو اس کا حافظ ہو اور اگر اپنی کتاب سے روایت کر رہا ہو تو اس کا ضابط ہو۔ یعنی اس کو اس بات کا یقینِ کامل ہو کہ جس طرح اس نے اپنے شیخ سے حدیث سنی ہے، اسی طرح اس کو ضبط تحریر میں لے آیا ہے اور پھر اس میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہوا ہے۔

اور راوی کی عدالت یا تو علمائے جرح و تعدیل کی تصریح سے ثابت ہوتی ہے یا شہرت سے۔ لہٰذا جو لوگ اہل نقل و اہل علم کے درمیان ''عُدول'' معروف ہیں اور ان کی ثقاہت و امانت داری کی تعریف و توصیف زبان زد ہے تو پھر وہ اپنی عدالت کے ثبوت کے لیے کسی دلیل و برہان کے محتاج نہیں ہیں۔

اور اہل الحدیث میں جو اس مقام پر فائز رہے ہیں، ان میں ابو بکر الخطیب الحافظ، مالک، شعبہ، سفیان الثوری، سفیان بن عیینہ، الاوزاعی، اللیث بن سعد، عبداللہ بن المبارک، وکیع، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی اور ان کے ہم مرتبہ محدثین کا شمار ہوتا ہے۔

اور یہ جاننے کے لیے کہ راوی ضبط...... حدیث...... کی صفت سے متصف ہے، ہم اس کی روایتوں کو ضبط و اتقان میں معروف ثقہ راویوں کی روایات سے جانچتے ہیں اور جب اس کی روایتوں کو ان کی روایات کے عین مطابق پاتے ہیں، چاہے یہ مطابقت...... لفظاً نہ سہی...... معناً ہی ہو۔ یا بیشتر پہلوؤں سے ان کے مطابق ہوں۔ اور شاذ و نادر ہی ان سے اختلاف رکھتی ہوں تو ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ضبط سے بہرہ ور اور حجت ہے، لیکن جب اس کی روایتوں کو ثقہ راویوں کی روایات سے بہت زیادہ مختلف پاتے ہیں تو ایسی صورت میں ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ضبط میں کمزور اور ناقص ہے اور اس کی روایتوں کو دلیل و حجت نہیں مانتے۔

[ص: ۷۱، ۷۲]

''اگر ایک ہی شخص میں جرح وتعدیل جمع ہو جائیں تو جرح کو ترجیح دی جائے گی، کیونکہ تعدیل کرنے والا راوی کی ظاہری حالت کو دیکھ کر حکم لگاتا ہے، جبکہ جرح کرنے والا راوی کی ایسی پوشیدہ صفت کی خبر دیتا ہے جو تعدیل کرنے والے سے مخفی ہوتی ہے۔''

[ص: ٧٤]

تعدیل کے درجات بیان کرتے ہوئے حافظ ابن الصلاح لکھتے ہیں:

''ابو محمد عبدالرحمن بن ابی حاتم الرازی نے اپنی کتاب ''الجرح والتعدیل'' میں تعدیل پر دلالت کرنے والے الفاظ بڑی عمدگی اور خوبصورتی سے مرتب کر دیئے ہیں:

۱۔ اگر کسی کے بارے میں کہا جائے: وہ ثقہ اور متقن ہے..... ثقاہت سے متصف اور فن روایت میں ماہر..... تو اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جن کی روایت کردہ حدیثیں حجت ہیں۔

میں ان الفاظ کا بھی اضافہ کرتا ہوں: ثبت یا حجت..... نہایت قابل اعتماد اور سراپا حجت..... اسی طرح اگر کسی کو یہ کہا جائے کہ وہ حافظ اور ضابط ہے تو اس کا بھی وہی درجہ ہے جو ثقہ اور متقن کا ہے۔

۲۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں: اگر کسی کے بارے میں یہ کہا جائے: وہ صدوق ...... بہت سچا...... یا اس کا مقام، مقامِ صدق ہے، یا اس میں کوئی حرج نہیں، تو ایسے شخص کی حدیثیں لکھی جائیں گی۔ اور ان کی صحت پر غور کیا جائے گا۔

میرے نزدیک ان کی بات صحیح ہے، اس لیے کہ مذکورہ بالا الفاظ اس امر کی صراحت نہیں کرتے کہ وہ ضبط کی شرط پر بھی پورا اترتا ہے لہٰذا اس کی روایت کردہ حدیثوں پر غور کیا جائے گا اور ان کو جانچ کر معلوم کیا جائے گا کہ وہ ضبط سے متصف ہیں یا نہیں۔

۳۔ اگر کسی کی تعدیل ''شیخ'' کے لفظ سے کی جائے تو اس کی حدیث لکھی جائے گی اور اس پر غور کیا جائے گا۔ یہ دوسرے درجے سے کمتر درجہ ہے۔

۴۔ اور اگر کسی کو ''صالح الحدیث'' (روایت حدیث کے قابل ہے) کہا جائے تو اس کی روایت کردہ حدیث صرف ''اعتبار'' کے لیے لکھی جائے گی۔ [ص: ٨١، ٨٢]

''اعتبار'' علم حدیث کی ایک اصطلاح ہے، جس کی تعریف آگے آ رہی ہے۔

''اگر کسی ایسے راوی کی ''مجمل جرح'' کی گئی ہو یا کی جائے، جس کی مشاہیر ائمہ حدیث میں سے کوئی توثیق کر چکا ہو تو یہ ''جرح'' ناقابل قبول ہے، قطع نظر اس کے کہ جرح کرنے والا کون

ہے، یعنی صرف وہی جرح قبول کی جائے گی جو مفسر ہو کیونکہ کسی امام حدیث کی توثیق سے اس راوی کو جو ثقاہت حاصل ہو چکی ہے اس کا ازالہ صرف واضح اور مفصل جرح کے ذریعہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اساطین علم حدیث نے صرف انہی لوگوں کو ثقہ قرار دیا ہے جو ان کی نگاہوں میں دینی حیثیت سے بھی اور فن روایت کے اعتبار سے بھی قابل اعتبار تھے اور انہوں نے ان کو خوب جانچ اور پرکھ کر ان پر یہ حکم لگایا ہے لہٰذا ان کے اس حکم کو نہایت واضح اور صریح الفاظ سے ہی توڑا یا منسوخ کیا جا سکتا ہے اور الذھبی جو نقد رجال میں مکمل تتبع اور تحقیق کے اصحاب میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ فرما چکے ہیں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ علمائے جرح و تعدیل میں سے دو عالم کسی ضعیف کو ثقہ اور کسی ثقہ کو ضعیف قرار دینے پر متفق ہوئے ہوں۔''

[الباعث الحثيث، ص: ۹٦، ۹۷]

جرح کے درجات:

۱۔ لَيِّنُ الْحَدِيث روایتِ حدیث میں نرم۔ یہ لَانَ يَلِين کا اسم فاعل ہے، لَانَ يَلِينُ کے معنی ہیں نرم ہونا، نرم خو ہونا۔ '' لَيِّنُ الْحَدِيث ''جرح کا سب سے ہلکا لفظ ہے۔ امام ابن ابی حاتم فرماتے ہیں: اگر کسی راوی کے بارے میں کہا جائے '' لَيِّنُ الحَدِيث ''تو اس کی حدیث لکھی جائے گی اور ''اعتبار'' کے لیے اس کے بارے میں غور کیا جائے گا۔ [مقدمه ابن الصلاح، ص: ۸۲]

۲۔ ابن ابی حاتم فرماتے ہیں: جب ائمہ جرح و تعدیل کسی کے بارے میں کہتے ہیں ''لیس بقوی'' قوی نہیں ہے تو یہ پہلے ......لَيِّنُ الْحَدِيث...... کے درجے پر ہے، اس کی روایت کردہ حدیث لکھی جائے گی، مگر وہ اس سے کمتر ہے۔ [ص: ۸۲]

۳۔ اگر وہ کسی کے بارے میں کہیں: ''ضعیف الحدیث'' حدیث میں کمزور اور ضعیف ہے'' تو یہ دوسرے سے کمتر ہے، اس کی حدیث ترک نہیں کی جائے گی، بلکہ اس کا اعتبار کیا جائے گا۔

[مذکوره مأخذ، ص: ۸۳]

''اعتبار کیا جائے گا'' سے مراد ہے کہ تتبع کر کے دیکھا جائے گا کہ اس حدیث کی روایت میں کوئی دوسرا اس کا شریک ہے یا نہیں۔

۴۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں: اور جب ائمہ جرح و تعدیل کسی کو یہ کہتے ہیں: متروك الحدیث...... اس کی

حدیث ترک کردی گئی...... یا ذاهب الحدیث...... اس کی حدیث ناپائیدار اور غیر مستحکم ہے...... یا کذاب...... جھوٹا ہے......تو ایسا شخص ساقط الحدیث...... روایت حدیث میں بے وزن اور نا قابلِ اعتماد...... ہے۔ [مذکورہ مأخذ، ص: ۸۳]

حافظ ابن الصلاح نے "جرح" کے درجات بیان کرنے میں بڑے اختصار سے کام لیا ہے، ان کے بعد جو ائمہ پیدا ہوئے انہوں نے یہ مراتب اور درجات زیادہ تفصیل سے بیان کیے ہیں، جن کو ڈاکٹر محمود الطحان نے " تیسیر مصطلح الحدیث " میں " تقریب التهذیب "اور دوسری مستند کتابوں سے لے کر جمع کر دیا ہے۔ ذیل میں ان کو ترتیب وار درج کیا جا رہا ہے:

ا...... حدیث میں نرمی اور کمزوری پر دلالت کرنے والے الفاظ: " لَيِّنُ الحديث "اور " فلان فيه مقالٌ "......فلاں کے بارے میں گفتگو ہے...... ہیں۔

ب...... دوسرا درجہ ہے:" فلان لا يحتج به ، او ضعيف ، او له مناكير "فلاں حجت کے قابل نہیں، فلاں، نا قابل استدلال ہے۔ یا ضعیف ہے، یا اس کی روایت کردہ حدیثیں منکر ہیں۔

مذکورہ ان دونوں درجات کے حامل راویوں کی روایت کردہ حدیثیں نا قابل استدلال ہیں، لیکن ان کو ''اعتبار'' کی غرض سے لکھا جائے گا۔ اور ان میں سے دوسرا درجہ پہلے درجے سے کمتر ہے۔

ج...... " فلان لا يُكتَبُ حديثه ، او لا تحل الرواية عنه ،اورضعيفٌ جدا أو وَاهٍ بمرة......فلان کی حدیث درج کرنے کے قابل نہیں ہے، یا اس سے حدیث کی روایت جائز نہیں، یا بے حد ضعیف ہے یا بہت کمزور ہے۔''

د...... " فلانٌ مُتهمٌ بالكذب او متهمٌ بالوضع ، أو يسرق الحديث ، أو ساقطٌ أو متروكٌ أو ليس بثقة...... فلاں پر کذب بیانی کا الزام ہے، فلاں پر وضع حدیث کا الزام ہے، فلاں حدیث کا سرقہ کرتا ہے، فلاں ساقط اور گرا ہوا اور بے وزن ہے، فلاں متروک ہے، فلاں ثقہ نہیں ہے۔''

ھ......" فلانٌ كذابٌ ، أوْ دجالٌ ، أوْ وضاعٌ أو يكذب أو يضعُ......فلاں بڑا جھوٹا ہے، فلاں دجال ہے، فلاں حدیثیں وضع کرنے والا ہے، فلاں کذب بیانی کرتا ہے، فلاں حدیث وضع کرتا ہے۔

و...... " فلانٌ أكذب الناس، فلانٌ إليه المنتهى في الكَذِب أوْ هو ركن الكَذِب......فلاں لوگوں میں سب سے زیادہ جھوٹا ہے، فلاں پر کذب بیانی ختم ہے، فلاں کذب بیانی کا سرغنہ ہے۔''

تو ان چاروں درجات کے حامل راویوں کی روایت کردہ حدیثوں کو نہ تو لکھنا جائز ہے نہ ان سے

استدلال ہی صحیح ہے۔ اور نہ ان کا اعتبار ہی روا ہے۔ [ص، ۱۵۳، ۱۵٤]

ان کا اعتبار اس وجہ سے صحیح نہیں کہ اگر اس طرح کی روایتیں متعدد سندوں سے مروی ہوں، تو ان کی نکارت ہی میں اضافہ ہوگا۔

ضعیف حدیثوں کی قسمیں:

جو حدیث ''حسن'' سے کمتر درجے کی ہو اس کو ''ضعیف'' کہتے ہیں۔

ضعیف حدیث کی متعدد قسمیں ہیں؛ اور ضعیف کی یہ تقسیم دو اعتبار سے کی گئی ہے:

ا...... راوی کے اندر نقص اور عیب کی وجہ سے حدیث کا ضعیف ہونا۔

ب...... سند کی کسی کڑی کے غائب ہونے یا ساقط ہونے کی وجہ سے حدیث کا ضعیف ہونا۔

راوی کے ناقابل اعتماد ہونے، مجروح ہونے اور قابل تنقید ہونے کے دس ۱۰ اسباب ہیں؛ پانچ کا تعلق اس کی عدالت سے ہے اور پانچ کا ضبط سے۔

عدالت کو مجروح کر دینے والے اسباب:

۱ کذب بیانی
۲ کذب بیانی کا الزام
۳ فسق
۴ بدعت
۵ راوی کا مجہول ہونا

حدیث کے ضبط و حفظ کو مجروح کر دینے والے اسباب:

۱ روایتِ حدیث میں بہت زیادہ غلطی کرنا
۲ حافظہ کی خرابی
۳ بے خبری اور حاضر دماغی کا فقدان
۴ کثرت وہم وخیال
۵ ثقہ راویوں کی مخالفت

شاذ:

شَذَّ یَشُذُّ کا اسم فاعل ہے۔ شَذَّ یَشُذُّ کے معنی ہیں الگ تھلگ ہونا، مخالف ہونا، غیر معروف اور قاعدے کے خلاف بات کہنا، منفرد ہونا وغیرہ۔

شاذ اس حدیث کو کہتے ہیں جس کا راوی ثقہ اور مقبول تو ہو لیکن اس کی یہ روایت اس سے زیادہ ثقہ

راوی کی روایت کردہ حدیث کے خلاف ہو۔

شاذ کا شمار ضعیف حدیثوں میں ہوتا ہے، حافظ ابن الصلاح کہتے ہیں:

''اگر راوی کسی حدیث کی روایت میں منفرد ہوتو اس کے بارے میں غور وفکر سے کام لیا جائے گا اور اگر وہ اپنی اس منفرد روایت میں اس حدیث کا مخالف پایا جائے گا جس کا راوی حفظ وضبط میں اس سے اونچا مقام رکھتا ہے، تو اس کی یہ منفرد روایت ''شاذ'' کہہ کر رد کردی جائے گی۔ لیکن اگر وہ اپنی اس روایت میں کسی دوسرے کا مخالف نہیں ہوگا، بلکہ تنہا وہی اس کا راوی ہوگا، کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہوگی تو پھر اس کی حالت کا مطالعہ کیا جائے گا اور اگر وہ عدل، حافظ اور فن روایت میں ماہر اور ضبط میں قابل اعتماد ہوگا تو اس کی منفرد روایت قبول کر لی جائے گی، لیکن اگر وہ حفظ ومہارتِ فن میں بھروسے کے قابل ثابت نہ ہوگا، تو پھر اس کی یہ انفرادیت اس کی روایت کو ''صحیح'' کے دائرے سے خارج کردے گی۔'' [مقدمہ، ص: ٥٦]

معلوم ہوا کہ کسی حدیث کے ''شاذ'' ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ لامحالہ کسی زیادہ ثقہ کی روایت کردہ حدیث کے خلاف ہو، بلکہ ایک حدیث اس کے بغیر بھی شاذ اور مردود ہوسکتی ہے، خصوصیت کے ساتھ اگر اس کا متن قرآن کے کسی حکم کے خلاف ہو یا اس کا مضمون کسی مستند اور ثابت شدہ واقعہ سے متعارض ہو۔ امام عبدالرحمٰن ابن ابی حاتم "الجرح والتعدیل" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''کسی حدیث کی صحت اس کے راویوں کی عدالت اور اس بات سے جانچی جائے گی کہ وہ کلام نبوت ہوسکتی ہے یا نہیں۔'' [ص: ٣٥١]

اور کوئی حدیث اپنی سند میں ''شذوذ'' کی وجہ سے بھی شاذ ہوتی ہے اور متن میں ''شذوذ'' کی وجہ سے بھی۔

حدیث شاذ کی مثال:............

((حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنِيعٍ ، وَيَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ الدَّوْرَقِيُّ ، قَالَا: أَخْبَرَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ عُلَيَّةَ ، عَنْ خَالِدٍ الْحَذَّاءِ ، قَالَ: حَدَّثَنِي عَمَّارٌ...... مَولَى بَنِي هَاشِمٍ...... قَالَ: سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ يَقُولُ: تُوُفِّيَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ؛ وَهُوَ ابْنُ خَمْسٍ وَسِتِّينَ)) ❶

---

❶ سنن ترمذی، حدیث: ٣٦٥٠

''ہم سے احمد بن منیع اور یعقوب بن ابراہیم الدورقی نے بیان کیا، ان دونوں نے کہا: ہم کو اسماعیل بن علیہ نے خالد الحذّاء سے روایت کرتے ہوئے خبر دی کہ انہوں نے کہا: مجھ سے عمار...... بنو ہاشم کے آزاد کردہ غلام...... نے بیان کیا، کہا: میں نے ابن عباس کو فرماتے ہوئے سنا ہے: رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ ۶۵...... سال...... کے تھے۔''

تو یہ حدیث شاذ ہے کیونکہ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جو حدیث مروی ہے اس میں وفات کے وقت نبی اکرم ﷺ کی عمر مبارک ۶۳ تریسٹھ سال بتائی گئی ہے۔

حدیث کے الفاظ ہیں:

((حَدَّثَنِي مَطَرُ بْنُ الفَضْلِ: حَدَّثَنَا رَوحُ بْنُ عُبَادَةَ: حَدَّثَنَا زَكَرِيَّا بْنُ إِسْحَاقَ: حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ دِينَارٍ ، عَنِ ابْنِ عَبّاسٍ ، قَالَ: مَكَثَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بِمَكَّةَ ثَلَاثَ عَشْرَةَ ، وَتُوُفِّيَ وَهُوَ ابْنُ ثَلَاثٍ وَسِتِّينَ)) ❶

''مجھ سے مطر بن الفضل نے بیان کیا، کہا: ہم سے روح بن عبادہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے زکریا بن اسحاق نے بیان کیا، کہا: ہم سے عمرو بن دینار نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں تیرہ سال قیام فرمایا اور آپ کی وفات تریسٹھ (۶۳) سال کی عمر میں ہوئی۔''

یہ حدیث عمرو بن دینار نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے۔ جو مذکورہ بالا حدیث کی روایت کرنے والے عمار بن ابی عمار سے زیادہ ثقہ اور حفظ وضبط میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔ اس طرح عمار بن ابی عمار کی حدیث ''شاذ'' اور عمرو بن دینار کی حدیث ''محفوظ'' ہے۔ شاذ کی ضد محفوظ کہلاتی ہے۔

منکر:

أنكَرَ يُنكِرُ کا اسم مفعول ہے۔ اَنکَرَ یُنکِرُ کے معنی ہیں ناپسند کرنا، نہ ماننا، تسلیم نہ کرنا۔ یہ اَقَرَّ یُقِرُّ کی ضد ہے۔ اَقَرَّ یُقِرُّ کے معنی ہیں تسلیم کرنا، توثیق کرنا، اقرار کرنا، مان لینا وغیرہ۔

''منکر'' اس حدیث کو کہا جاتا ہے جس کی روایت میں ایسا شخص منفرد ہو جو ''عدالت'' اور ''ضبط حدیث'' کی صفت سے متصف نہ ہو اور جس کی روایت کردہ حدیث ثقہ راوی کی حدیث کے خلاف ہو۔

حافظ ابن حجر نے نخبة الفکر میں اس کی دو تعریفیں کی ہیں:

❶ بخاری/ ح: ۳۹۰۳، مسلم/ ح: ۶۰۹۶

۱ منکر وہ حدیث ہے جس کی سند میں کوئی ایسا راوی شامل ہو جو بکثرت غلطیاں کرے، یا غفلت اور بھول چوک کا مریض ہو یا اس سے فسق و فجور کا ظہور ہوتا ہو۔

حافظ ابن حجر نے یہ تعریف دوسروں کی طرف منسوب کی ہے۔

۲ ''منکر'' وہ حدیث ہے جس کا راوی ضعیف ہو اور وہ کسی ثقہ راوی کی روایت کردہ حدیث کے خلاف ہو۔ یہ تعریف حافظ ابن حجر نے کی ہے۔ [بحواله تيسير مصطلح الحديث ، ص : ٩٦]

ان دونوں تعریفوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے، بلکہ منکر میں یہ دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں، کبھی ایک ساتھ اور کبھی علیحدہ علیحدہ اسی وجہ سے حافظ ابن کثیر نے نہایت مختصر الفاظ میں اس کی ایسی تعریف کر دی ہے جس نے دونوں پہلوؤں کو سمیٹ لیا ہے:

''منکر شاذ کی طرح ہے؛ اگر اس کا راوی ثقہ راوی کی حدیث کے خلاف روایت کرے تو بھی مردود اور اگر عدالت اور ضبط سے موصوف نہ ہو تو بھی اس کی حدیث مردود اگرچہ کوئی ثقہ راوی اپنی حدیث میں اس کا مخالف نہ ہو۔'' [اختصار علوم الحديث ، ص : ٦٧]

منکر حدیث کی مثال:..........

((عَنْ أَبِيْ زُكَيْرٍ يَحْيَى بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ قَيْسٍ ، عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ ، عَنْ أَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ كُلُوا الْبَلَحَ بِالتَّمْرِ ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ إِذَا رَأَى ذٰلِكَ غَاظَهُ وَيَقُوْلُ: عَاشَ ابْنُ آدَمَ حَتّٰى أَكَلَ الْجَدِيْدَ بِالْخَلَقِ))

''ابوزکیر یحییٰ بن محمد بن قیس سے روایت ہے، انہوں نے ہشام بن عروہ سے روایت کیا، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کچی کھجور پکی ہوئی پرانی کھجور کے ساتھ کھاؤ، کیونکہ شیطان جب یہ دیکھتا ہے تو غصے سے جل بھن جاتا ہے اور کہتا ہے: ابن آدم اس عمر تک جیا کہ اس نے نئی کو پرانی کے ساتھ کھایا۔''

یہ حدیث منکر ہے جس کی روایت میں ابوزکیر منفرد ہے وہ صالح بزرگ ہیں ان سے مسلم نے اپنی کتاب میں حدیث روایت کی ہے لیکن وہ ......ضبط و مہارت میں...... اس درجے پر نہیں تھے کہ ان کی انفرادیت قابل قبول ہو۔ [مقدمه ابن الصلاح ، ص : ٥٨]

''منکر'' کی ضد ''معروف'' ہے۔

متروک:

تَرَكَ يَتْرُكُ کا اسم مفعول ہے۔ تَرَكَ يَتْرُكُ کے معنی ہیں نظر انداز کر دینا، چھوڑ دینا، درخور اعتنا نہ سمجھنا وغیرہ۔

متروک اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راوی پر کذب بیانی کا الزام ہو یعنی اپنی عام زندگی میں جھوٹا ہو اگر چہ حدیث میں اس کی کذب بیانی ظاہر نہ ہوئی ہو۔

حافظ ابن الصلاح اور امام النووی نے اپنی کتابوں میں ''متروک'' کا ذکر نہیں کیا ہے۔ حافظ ابن حجر پہلے محدث ہیں، جنہوں نے " نخبة الفكر " میں ایک مستقل قسم کے طور پر اس کا ذکر کیا ہے، بہت ممکن ہے کہ قدیم محدثین ''متروک'' کو ''موضوع'' حدیثوں میں شمار کرتے رہے ہوں اس لیے کہ ''متروک'' ''موضوع'' سے قریب تر ہے۔

جس راوی پر دروغ گوئی اور کذب بیانی کا الزام ہو اس کو ''متروک الحدیث'' اور اس کی روایت کردہ حدیث کو متروک کہتے ہیں۔

متروک کی مثال:.........

((قَالَ الْوَاقِدِيُّ: أَخْبَرَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيْدِ بْنِ دِيْنَارٍ ، عَنْ أَبِي وَجِيْزَةَ يَزِيْدَ بْنِ عُبَيْدٍ ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَزِيْدَ اللَّيْثِيِّ عَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: إِيَّاكُمْ وَخَضْرَاءَ الدِّمَنِ ، فَقِيْلَ: وَمَا خَضْرَاءُ الدِّمَنِ؟ قَالَ: الْمَرْأَةُ الْحَسْنَاءُ فِي الْمَنْبَتِ السُّوْءِ))

''الواقدی نے کہا: ہم کو یحییٰ بن سعید بن دینار نے ابو وجیزہ یزید بن عبید سے، انہوں نے عطاء بن یزید اللیثی سے اور انہوں نے ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے خبر دی کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اپنے آپ کو غلاظت کی شادابی سے بچا، عرض کیا گیا: غلاظت کی شادابی کیا ہے؟ فرمایا: بری جگہ پرورش پانے والی حسینہ۔''

تو یہ حدیث بے حد ضعیف ہے، اس لیے کہ اس کا راوی الواقدی، جس کا نام محمد بن عمر بن واقد الاسلمی الواقدی تھا، متروک الحدیث ہے۔ امام احمد، النسائی اور ابن المدینی وغیرہ نے اس کو جھوٹا قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے " تقريب التهذيب "[ص : ۴۳۳ ، ترجمه : ۶۱۷۵] میں لکھا ہے:

''وہ اپنی وسعتِ علمی کے باوجود متروک تھا۔''

موضوع:

وَضَعَ یَضَعُ کا اسم مفعول ہے۔ وَضَعَ یَضَعُ کے معنی ہیں: گھڑنا، ایجاد کرنا، اسی طرح اس کے معنی ہیں: پست کرنا، درجہ گھٹا دینا، بلندی سے پستی میں گرا دینا وغیرہ

''موضوع'' سے مراد وہ روایت ہے جس کو گھڑ کر نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو اس جھوٹی روایت پر ''حدیث'' کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ حدیث نبی اکرم ﷺ کے قول، فعل یا تقریر کو کہتے ہیں، لیکن ''مشاکلہ'' کے طور پر اس موضوع روایت کا ذکر ضعیف احادیث کے ضمن میں کیا جاتا ہے اور مقصد اس ذکر سے اس کی مذمت کرنا، اس کی نکارت بیان کرنا اور اس کے جھوٹ کا پردہ چاک کرنا ہوتا ہے تاکہ ناعاقبت اندیش جاہلوں، عوام الناس اور خود فریبی میں مبتلا لوگوں کو ''موضوع'' روایات کی ترویج کے انجام بد سے ہوشیار کر دیا جائے۔

باب اوّل میں موضوع احادیث وضع کرنے والوں اور اس گندے عمل سے ان کے اغراض و مقاصد کو بڑی تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں موقع کی مناسبت سے مختصراً ان طریقوں کو بیان کر دینا چاہتا ہوں جن کو ''وضاعین'' استعمال کرتے رہے ہیں:

1. وضاعین خود کوئی عبارت بنا لیتے اور پھر اس کی ایک من گھڑت سند وضع کر لیتے اور اس کو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے طور پر لوگوں میں پھیلا دیتے تھے۔
2. اگر فلسفہ اور حکمت کی کتابوں میں ان کو کوئی قول پسند آ جاتا تو اس کی کوئی سند وضع کر کے اس کو لوگوں میں حدیث کے نام سے بیان کرنے لگتے تھے۔
3. بعض حدیثوں کی سندوں کا سرقہ کر کے ان کو عبادات اور اخلاق و آداب کے فضائل اور اجر و ثواب پر مشتمل اپنے وضع کردہ اقوال سے جوڑ دیتے۔
4. مذکورہ بالا طریقوں کے علاوہ انہوں نے بعض صوفیا اور زاہدوں کے ان ''رائج الوقت'' اقوال کو بھی بلا کسی سند کے لوگوں میں ''حدیث'' کے نام سے پھیلا دیا جو آج تک امت کے ایک طبقہ میں گردش کر رہے ہیں اور جن سے اس طبقہ کے نظریہ اور عقیدے کی ترجمانی ہوتی ہے۔

مثالیں:

۱ ((قَالَ سَلَّامُ بْنُ سُلَيْمٍ: حَدَّثَنَا الحَارِثُ بْنُ غُصَيْنٍ ، عَنِ الْأَعْمَشِ عَنْ أَبِي سُفْيَانَ ، عَنْ جَابِرٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ ، بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ ، اهْتَدَيْتُمْ)) ❶

''سلام بن سلیم نے کہا: ہم سے الحارث بن غصین نے الاعمش سے، انہوں نے ابوسفیان سے اور انہوں نے جابر سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: میرے اصحاب ستاروں کے مانند ہیں، تم ان میں سے جس کی بھی اقتدا کرو ہدایت یاب ہوگے۔''

تو یہ روایت موضوع ہے ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ یہ سند دلیل و حجت نہیں ہے۔ ابن حزم کہتے ہیں یہ روایت ساقط الاعتبار ہے۔ ابوسفیان ضعیف ہے اور الحارث بن غصین کی کنیت اور لقب ابو وہب الثقفی ہے اور سلام بن سلیمان ...... سلیم ...... موضوع حدیثیں روایت کرتا تھا، جن میں سے بلا شک ایک یہی ہے۔

''ابن خراش نے اس کو کذاب لکھا ہے اور ابن حبان نے یہ صراحت کی ہے کہ اس نے موضوع احادیث روایت کی ہیں۔'' [السلسلة الضعيفه ١/ ١٤٤، ١٤٥]

اس روایت کا متن بھی موضوع ہے کیونکہ یہ بات بعید از تصور ہے کہ نبی ﷺ نے اس کی اجازت دی ہوگی کہ ہم جس صحابی کی چاہیں اقتدا کریں؟

۲ ((رَوَى سُوَيْدُ بْنُ سَعِيدٍ ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ مِسْهَرٍ ، عَنْ أَبِي يَحْيَى الْقَتَّاتِ ، عَنْ مُجَاهِدٍ ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ وَرَوَاهُ عَنْ أَبِي مِسْهَرٍ أَيْضًا ، عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ ، عَنْ أَبِيهِ ، عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ ، وَرَوَاهُ الزُّبَيْرُ بْنُ بَكَّارٍ ، عَنْ عَبْدِ المَلِكِ بْنِ عَبْدِ العَزِيزِ بْنِ المَاجِشُونِ ، عَنْ عَبْدِ العَزِيزِ بْنِ أَبِي حَازِمٍ ، عَنْ أَبِي نَجِيحٍ ، عَنْ مُجَاهِدٍ ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: مَنْ عَشِقَ ، فَعَفَّ ، فَمَاتَ فَهُوَ شَهِيدٌ وَفِي رِوَايَةٍ: مَنْ عَشِقَ وَكَتَمَ وَعَفَّ وَصَبَرَ ، غَفَرَ اللَّهُ لَهُ وَأَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ)) ❷

''سوید بن سعید نے علی بن مسہر سے، انہوں نے ابی یحیٰ القتات سے، انہوں نے مجاہد سے اور

❶ جامع بيان العلم ٢/ ٩١
❷ زاد المعاد: ٤/ ٢٥٢، ٢٥٣

انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا اور سوید نے ابی مسہر سے بھی روایت کیا ہے، انہوں نے ہشام بن عروہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اس کی روایت الزبیر بن بکار نے عبدالملک بن عبدالعزیز بن ماجشون سے، انہوں نے عبدالعزیز بن ابی حازم سے، انہوں نے ابن ابی نجیح سے، انہوں نے مجاہد سے، انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپؐ نے فرمایا: جس نے عشق کیا اور پاک دامن رہا اور وہ مرگیا تو وہ شہید ہے۔ اور ایک روایت میں ہے: جس نے عشق کیا، اور ظاہر نہیں کیا اور پاک دامن رہا اور صبر کیا تو اللہ اس کی بخشش فرمادے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا۔''

علامہ ابن القیم لکھتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نسبت صحیح نہیں ہے اور وہ آپ کا کلام نہیں ہو سکتی، کیونکہ اللہ کے نزدیک شہادت کا درجہ بہت بلند ہے۔ جو ''صدیقیت'' کے درجے سے ملا ہوا ہے اور اس کے حصول کے لیے جن اعمال کا انجام دینا شرط ہے ان میں عشق داخل نہیں ہے۔''

علامہ ابن القیم نے اس روایت کے موضوع ہونے پر جو دلائل دیے ہیں وہ بڑے قیمتی ہیں، جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے۔

اس روایت کے جھوٹ اور باطل ہونے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ عشق ایک نفسانی جذبہ ہے، اسی وجہ سے محبت کے مترادف کے طور پر کتاب وسنت میں اس کا ذکر نہیں آیا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی نبی کی زبان پر اس لفظ کو جاری نہیں ہونے دیا اور ''عشق'' اس محبت کا مترادف قطعاً نہیں ہے، جو ایک مومن سے مطلوب ہے۔

درحقیقت ''عشق'' کا لفظ سب سے پہلے صوفیا کی زبانوں پر جاری ہوا ہے اور انہی کتابوں میں اس کا سب سے زیادہ ذکر بھی ملتا ہے کیونکہ یہ صوفیا کی خاص کیفیتوں کا ترجمان ہے، جن سے ہر وہ شخص واقف ہوگا، جس نے تصوف کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا۔

۳ ((رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ))

''ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف واپس آگئے۔''

یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب جھوٹا قول ہے آپ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ اس عبارت میں

جہاد اصغر سے مراد اللہ کی راہ میں قتال اور جہاد اکبر سے مراد خواہشات نفس پر کنٹرول یا نفس کی ریاضت ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ نے الفتاویٰ (۱۱/۱۹۲) میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

''اس کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے اور نبی اکرم ﷺ کے ارشادات اور آپ کے افعال کی معرفت سے بہرہ ور کسی شخص نے اس کی روایت نہیں کی ہے۔ اور کفار سے جہاد کا شمار تو افضل اور اعظم ترین اعمال میں ہوتا ہے۔''

معلق:

عَلَّقَ يُعَلِّقُ کا اسم مفعول ہے۔ اور عَلَّقَ يُعَلِّقُ کے معنی ہیں کسی چیز کو کسی چیز کے ساتھ باندھ کر لٹکا دینا اور ٹانگ دینا۔ معلق حدیث کی دو صورتیں ہیں:

ا..... حدیث کی پوری سند حذف کر کے کہا جائے: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔''

ب..... صحابی کے سوا سند کے تمام راویوں کو حذف کر دیا جائے یا صحابی اور تابعی کو باقی رکھ کر بقیہ تمام راوی ساقط کر دیئے جائیں۔

مثال نمبر ۱:.............

((باب قول النبي ﷺ: رُبَّ مُبَلَّغٍ أوعى مِنْ سَامِعٍ)) ❶

''بہت سے وہ لوگ جن کو میری حدیث پہنچتی یا پہنچائی جاتی ہے، مجھ سے وہ حدیث سننے والوں سے زیادہ اس کو سمجھنے والے ہوتے ہیں۔''

یہ حدیث معلق ہے کیونکہ امام بخاری نے اس کی پوری سند حذف کر دی ہے اور نبی ﷺ کا ارشاد کہہ کر حدیث کا ''متن'' نقل کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔ ایسا وہ تراجم ابواب (عناوین ابواب) میں تکرار سے بچنے کے لیے کرتے ہیں ورنہ اس طرح کی معلقات یا تو خود صحیح بخاری میں یا دوسری جگہ پوری سند کے ساتھ منقول ہوتی ہیں۔

مثال نمبر ۲:.............

((وَقَالَ أبو موسى: غَطَّى النَّبِيُّ ﷺ رُكْبَتَيْهِ حِيْنَ دَخَلَ عُثْمَانُ)) ❷

''ابوموسیٰ نے کہا: نبی ﷺ نے عثمان کے آنے پر اپنے دونوں گھٹنے ڈھانک لیے۔''

❶ بخاری / کتاب العلم، باب ۹ ❷ بخاری / کتاب الصلاۃ،

یہ حدیث بھی معلق ہے جس میں صحابی کے سوا سند کے تمام راویوں کو حذف کر دیا گیا ہے۔

معلق حدیث کا شمار ضعیف حدیثوں میں ہوتا ہے، کیونکہ اس میں حدیث کے قابل قبول ہونے کی اہم شرط مفقود ہوتی ہے، یعنی سند کی تمام کڑیوں کا مذکور اور باہم متصل ہونا، اس لیے معلق حدیث مردود ہوتی ہے۔

البتہ صحیح بخاری کی معلقات اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ امام بخاری نے اس میں جو معلق حدیثیں یقینی صیغوں (معروف) میں نقل کی ہیں جیسے: قال، رَوٰی اور ذَکَرَ وغیرہ وہ سب صحیح ہیں۔ رہیں وہ حدیثیں جو انہوں نے "صیغۂ تمریض" (مجہول) میں ذکر کی ہیں جیسے: قِیْلَ، رُوِیَ اور ذُکِرَ وغیرہ تو ان میں صحیح بھی ہیں اور ضعیف بھی۔ لیکن ان کے شیوخ سے ان کی نسبت بھی صحیح ہے۔

مرسل:

أرسَلَ یُرسِلُ کا اسم مفعول ہے۔ اور ارسَلَ یُرسِلُ کے معنی ہیں چھوڑ دینا، نظر انداز کر دینا، غیر مقید رکھنا وغیرہ۔

مرسل اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند سے تابعی کے بعد کڑی (صحابی) غائب ہو۔ اور تابعی یہ کہے: "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔"

مثال:............

((حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ ، قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ ، عَنْ يَعْقُوبَ بْنِ زَيْدِ بْنِ طَلْحَةَ التَّيْمِيّ ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: اَتَانِي آتٍ مِنْ رَّبِّيْ ، فَقَالَ: مَا مِنْ عَبْدٍ يُصَلِّيْ عَلَيْكَ صَلَاةً إِلَّا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ بِهَا عَشْرًا)) [1]

"ہم سے علی بن عبداللہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے سفیان نے یعقوب بن زید بن طلحہ التیمی سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس میرے رب کے پاس سے آنے والا آیا اور کہا: جو بندہ بھی تجھ پر ایک بار درود بھیجے گا تو اللہ اس کے بدلے اس پر دس (۱۰) بار درود بھیجے گا۔"

یہ حدیث مرسل ہے، کیونکہ یعقوب بن زید بن طلحہ التیمی کا شمار چھوٹے تابعین میں ہوتا ہے، لیکن انہوں نے یہ حدیث براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے اور جس صحابی سے انہوں نے یہ

[1] فضل الصلاة على النبي ﷺ، ح: ۱۳

حدیث سنی ہے اس کا ذکر نہیں کیا۔

واضح رہے کہ یعقوب کا تعلق تابعین کے پانچویں طبقہ سے تھا، جس نے صرف ایک یا دو صحابیوں کو دیکھا ہے اور ان میں سے اکثریت کا کسی صحابی سے ''سماع'' ثابت نہیں ہے۔

مرسل حدیث کا شمار بھی ضعیف احادیث میں ہوتا اس لیے کہ تابعی نے اپنے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان جس راوی کا ذکر ساقط کر دیا ہے وہ بھی اسی کی طرح تابعی ہو سکتا ہے صحابہ تو سب ''عدول'' ہیں، مگر تابعین اپنی ثقاہت کے لیے ''تعدیل'' کے محتاج ہیں۔ لہٰذا تابعی کے بعد غیر مذکور راوی کے ''مجہول'' ہونے کی وجہ سے مرسل روایت کی صحت مشکوک ہوگئی اور وہ نا قابل اعتبار ہوگئی۔

امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں لکھا ہے:

''مرسل روایات ہمارے اور علم حدیث سے بہرہ ور علماء کے صحیح قول کے مطابق حجت نہیں ہیں۔'' [ص: ۵۱]

اور حافظ ابن الصلاح نے ''مرسل'' کے قبول اور عدم قبول ہونے کے بارے میں فقہاء اور محدثین کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''ہم نے مرسل کے نا قابل استدلال ہونے اور اس کے ضعیف ہونے کا جو حکم لگایا ہے، اسی پر حفاظِ حدیث اور ناقدینِ اثر کی آرا کا اجماع ہے اور اپنی تصنیفات میں وہ اسی طریقے اور اصل پر عمل پیرا ہیں۔'' [مقدمه، ص: ۴۳]

منقطع:

اِنْقَطَعَ يَنْقَطِعُ کا اسم فاعل ہے۔ اور اِنْقَطَعَ يَنْقَطِعُ کے معنی ہیں، کسی سلسلہ کا ٹوٹ جانا، کٹ جانا اور منقطع ہو جانا وغیرہ۔ منقطع اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند متصل اور جڑی ہوئی نہ ہو، بلکہ شروع میں یا درمیان میں تابعی سے پہلے کوئی راوی ساقط ہو اور ایک جگہ سے ایک سے زیادہ راوی غائب نہ ہو مختلف جگہوں سے ہو سکتا ہے۔

مثال نمبر ۱:............

حافظ ابن الصلاح نے سند میں دو جگہ انقطاع کی مثال میں یہ حدیث پیش کی ہے:

((رَوَى عَبْدُ الرَّزَّاقِ عَنِ الثَّوْرِيِّ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنْ زَيْدِ بْنِ يُثَيْعٍ ، عَنْ

حُذَيْفَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: إِنَّ وَلَّيْتُمُوهَا أَبَابَكْرٍ ، فَقَوِيٌّ أَمِيْنٌ))

''عبدالرزاق نے الثوری سے، انہوں نے ابواسحاق سے، انہوں نے زید بن یثیع سے اور انہوں نے حذیفہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم لوگ خلافت کی ذمہ داریاں ابوبکر کے سپرد کردو گے تو وہ قوی اور امانت دار ثابت ہوں گے۔''

تو اس کی سند میں دو جگہ انقطاع ہے:

''عبدالرزاق نے یہ حدیث سفیان الثوری سے نہیں سنی ہے، بلکہ النعمان بن ابی شیبہ الجندی سے سنی ہے اور الثوری سے۔ اس طرح سفیان الثوری نے یہ حدیث ابواسحاق سے نہیں بلکہ شریک سے سنی ہے اور شریک نے ابواسحاق سے۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ عبدالرزاق اور سفیان الثوری کے درمیان ایک راوی النعمان بن ابی شیبہ غائب ہے اور سفیان الثوری اور ابواسحاق کے درمیان شریک نام کا راوی ساقط ہے۔ اس طرح اس سند میں دو جگہ انقطاع ہے۔

منقطع کی ایک دوسری شکل یہ ہے کہ اس کی سند میں کسی راوی کا ذکر مبہم الفاظ میں کیا گیا ہو جیسے: رَجُلٌ...... ایک آدمی یا شخص...... ایک شیخ وغیرہ۔

اس کی مثال وہ حدیث ہے جو امام الترمذی نے سنن (۳۴۰۷) میں اس سند سے کی ہے:

مثال نمبر ۲:............

((حَدَّثَنَا مَحْمُودُ بْنُ غَيْلَانَ : حَدَّثَنَا أَبُوأَحْمَدَ الزُّبَيْرِيُّ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ ، عَنِ الْجُرَيْرِيِّ ، عَنْ أَبِي الْعَلَاءِ بْنِ الشِّخِّيرِ ، عَنْ رَجُلٍ مِنْ بَنِي حَنْظَلَةَ ، قَالَ: صَحِبْتُ شَدَّادَ بْنَ أَوْسٍ رضي الله عنه فِي سَفَرٍ ، فَقَالَ: أَلَا أُعَلِّمُكُمْ مَا كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُعَلِّمُنَا أَنْ نَقُولَ؟ اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الثَّبَاتَ فِي الْأَمْرِ ، وَأَسْأَلُكَ عَزِيْمَةَ الرُّشْدِ ، وَأَسْأَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ ، وَحُسْنَ عِبَادَتِكَ ، وَأَسْأَلُكَ لِسَانًا صَادِقًا وَقَلْبًا سَلِيْمًا ، وَأَعُوذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ ، وَأَسْتَغْفِرُكَ مِمَّا تَعْلَمُ وَأَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ، إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ))

''ہم سے محمود بن غیلان نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابواحمد الزبیری نے بیان کیا، کہا: ہم سے سفیان نے الجریری سے، انہوں نے ابوالعلاء بن الشخیر سے اور انہوں نے بنی حنظلہ کے ایک

آدمی سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، اس آدمی نے کہا: میں ایک سفر میں شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھا، تو انہوں نے فرمایا: کیا میں تجھے وہ دعا نہ سکھا دوں جو رسول اللہ ﷺ ہمیں سکھاتے تھے کہ ہم کہیں؟ اے اللہ! میں تجھ سے دین کے معاملے میں ثابت قدمی کا سوال کرتا ہوں، ہدایت میں مضبوط ارادے کا طالب ہوں اور تجھ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ مجھے اپنی نعمت پر شکر ادا کرنے کی توفیق دے۔ بہترین طریقے سے اپنی عبادت کی توفیق سے نواز اور میں تجھ سے سچ بولنے والی زبان اور قلب سلیم کا سوال کرتا ہوں۔ جو برائی تیرے علم میں ہے اس سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور جو خیر تیرے علم میں ہے اس کا طالب ہوں۔ اور میرا جو گناہ تیرے علم میں ہے اس کی تجھ سے مغفرت چاہتا ہوں۔ بیشک تو تمام غیبی امور کا علم رکھتا ہے۔''

منقطع حدیث کے ضعیف اور نا قابل اعتبار ہونے پر علمائے حدیث کا اتفاق ہے، اس لیے کہ سند سے ساقط راوی، یا اس میں مذکور مبہم راوی کی عدالت مجہول اور غیر معلوم ہے، جس کی وجہ سے سند کا اعتبار نہیں رہا اور حدیث ضعیف ہوگئی۔

مُعضل:

اَعْضَلَ يُعْضِلُ کا اسم مفعول ہے اور اَعْضَلَ يُعْضِلُ کے معنی ہیں: عاجز بنا دینا، بگاڑ دینا، لاعلاج کر دینا، مشکل بنا دینا وغیرہ۔ اور معضل اس حدیث کو کہا جاتا ہے جس کی سند سے مسلسل دو یا دو سے زیادہ راوی غائب ہوں۔

مثلاً اگر تبع تابعی یوں روایت کرے: " قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ " یا تبع تابعی سے نیچے کا راوی کہے: " عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ " یا " عَنْ أَبِي بَكْرٍ وَ عُمَرَ " تو اس کی روایت معضل ہوگی۔

مثال:............

حافظ ابن الصلاح نے معضل کی مثال میں وہ حدیث پیش کی ہے جو سلیمان بن مہران الأعمش نے عامر بن شراحیل الشعبی سے روایت کی ہے کہ:

((وَيُقَالُ لِلرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: عَمِلْتَ كَذَا وَ كَذَا؟ فَيَقُولُ : لَا فَيُخْتَمُ عَلَى فِيهِ ......))

'' قیامت کے روز ایک آدمی سے کہا جائے گا: کیا تو نے ایسا اور ایسا عمل کیا ہے؟ تو وہ جواب

دے گا: نہیں، اس پر اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی......"

تو الاعمش نے یہ سند معضل کر دی ہے، جبکہ الشعبی نے اسے انس سے اور انہوں نے نبی ﷺ سے "متصل" روایت کی تھی، لیکن الاعمش نے انس اور نبی ﷺ کو سند سے حذف کر دیا اس طرح یہ روایت **معضل** ہوگئی۔ [اختصار علوم الحديث، ص: ٦٠، ٦١]

صحیح مسلم میں یہ حدیث مسنداً اور مرفوعاً ان الفاظ میں مروی ہے:

((حَدَّثَنَا أَبُوبَكْرِ بْنُ النَّضرِ بْنِ أَبِي النَّضرِ : حَدَّثَنِي أَبُو النَّضرِ هَاشِمُ بْنُ الْقَاسِمِ : حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ الأَشْجَعِيُّ عَنْ سُفْيَانَ الثَّوْرِيّ ، عَنْ عُبَيْدِ الْمُكْتِبِ ، عَنْ فُضَيْلٍ ، عَنِ الشَّعْبِيّ ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ ، قَالَ: كُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَضَحِكَ ، فَقَالَ: هَلْ تَدْرُونَ مِمَّا أَضْحَكُ؟ قَالَ: قُلْنَا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ ، قَالَ: مِنْ مُخَاطَبَةِ الْعَبْدِ رَبَّهُ ، يَقُوْلُ: يَا رَبِّ! أَلَمْ تُجِرْنِيْ مِنَ الظُّلْمِ؟ قَالَ: يَقُولُ: بَلىٰ ، قَالَ فَيَقُوْلُ: فَإِنِّيْ لَا أُجِيْزُ عَلَى نَفْسِيْ إِلَّا شَاهِدًا مِنِّيْ ، قَالَ: فَيَقُولُ: كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ (عَلَيْكَ) شَهِيْدًا ، وَبِالْكِرَامِ الْكَاتِبِيْنَ شُهُوْدًا۔ قَالَ: فَيُخْتَمُ عَلَى فِيْهِ ، فَيُقَالُ: لِأَرْكَانِهِ : اِنْطِقِيْ ، قَالَ: فَتَنْطِقُ بِأَعْمَالِهِ ، قَالَ: ثُمَّ يُخَلّٰى بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْكَلَامِ ، قَالَ: فَيَقُوْلُ: بُعْدًا لَكُنَّ وَسُحْقًا ، فَعَنْكُنَّ كُنْتُ أُنَاضِلُ)) [1]

"ہم سے ابوبکر بن النضر بن ابی النضر نے بیان کیا، کہا: مجھ سے ابوالنضر ھاشم بن القاسم نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبیداللہ الاشجعی نے سفیان الثوری سے اور عبید المکتب سے، انہوں نے فضیل سے، انہوں نے الشعبی سے اور انہوں نے انس بن مالک سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں موجود تھے کہ آپ ہنسے اور فرمایا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں کس بات پر ہنس رہا ہوں؟ ہم نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا: بندے کے اپنے رب کو مخاطب بنانے پر۔ وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! کیا تو نے مجھے اس بات سے امان نہیں دیا ہے کہ تو میرے اوپر ظلم نہیں فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیوں نہیں! آپ نے فرمایا: بندہ عرض کرے گا: آج میں اپنے نفس کو اپنے اوپر

---

[1] ص: ١٦٩

ضرور گواہ بننے کی اجازت دوں گا۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرمائے گا: آج تمہارے خلاف تمہارا نفس اور کاتبین کرام گواہ ہیں۔ آپ نے فرمایا: پھر اس کے منہ پر مہر کر دی جائے گی اور اس کے ہاتھوں اور پیروں وغیرہ کو حکم دیا جائے گا کہ تم بولو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو اس کے ہاتھ پاؤں اس کے اعمال کے بارے میں بولیں گے۔ آپ نے فرمایا: پھر اس کو بات کرنے کی آزادی دے دی جائے گی۔ آپ نے فرمایا: تو وہ کہے گا: تمہارے لیے بربادی اور ہلاکت ہو! میں تو تمہارا دفاع کیا کرتا تھا۔''

حافظ ابن الصلاح نے فقہائے کے اس قول کو: "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ کَذَا وَکَذَا "معضل کے قبیل سے قرار دیا ہے۔ [مقدمہ، ص: ٤٦]

معضل حدیث ضعیف ہوتی ہے اور اپنے ضعف اور نا قابلِ اعتبار ہونے میں اس کا درجہ مرسل اور منقطع سے کمتر ہے۔ اس کے ضعیف ہونے پر تمام ائمہ حدیث کا اتفاق ہے، کیونکہ حدیث کی صحت راویوں کی عدالت وثقاہت اور سند کے اتصال پر موقوف ہوتی ہے جبکہ معضل حدیث کی سند سے بیک وقت دو یا دو سے زیادہ راویوں کے سقوط کی وجہ سے نہ تو سند میں اتصال باقی رہ جاتا ہے اور نہ محذوف راویوں کی عدالت ہی معلوم ہوتی ہے۔

مُدَلَّس:

لام پر ''زبر'' کے ساتھ دَلَّسَ یُدَلِّسُ کا اسم مفعول ہے۔ اور دَلَّسَ یُدَلِّسُ کے معنی ہیں: عیب کو چھپانا، دھوکہ دینا وغیرہ۔ یہ لفظ دراصل سامان تجارت میں موجود عیب کو چھپانے کے لیے وضع کیا گیا ہے، لیکن پھر ہر طرح کے عیوب کو چھپانے اور فریب دینے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔

مُدَلَّس اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی روایت میں ''تدلیس'' سے کام لیا گیا ہو۔ اور مُدَلِّس (لام پر زیر کے ساتھ) اس راوی کو کہتے ہیں جو تدلیس کرتا ہے۔

علم حدیث کی اصطلاح میں ''تدلیس'' سے مراد سند کے عیب کو چھپا کر اس کو مستحسن اور قابل قبول بنا دینا ہے۔

''تدلیس'' کی دو قسمیں یا دو صورتیں ہوتی ہیں:

۱...... ''تدلیس الاسناد...... سند میں تدلیس...... اس سے مراد یہ ہے کہ راوی کسی ایسے شخص سے حدیث

روایت کرے جس سے اس کی ملاقات کو تو ثابت ہو لیکن اس سے وہ حدیث نہ سنی ہو، جس کی اس سے روایت کرے اور تاثر یہ دے کہ اس نے اس سے وہ حدیث سنی ہے۔''

''یا راوی کسی ایسے شخص سے حدیث روایت کرے جو اس کا ہم عصر رہا ہو، لیکن اس سے اس کی ملاقات نہ ہوئی ہو اور تاثر یہ دے کہ اس سے مل چکا ہے اور وہ حدیث اس سے سن چکا ہے۔'' [مقدمہ ابن الصلاح، ص: ۲۵۳]

تدلیس الاسناد کی دوسری تعریف:..........

''راوی کسی ایسے شخص سے، جس سے اس نے حدیثیں سنی ہوں، ایسی حدیث روایت کرے جو اس سے نہیں سنی ہے اور یہ صراحت نہ کرے کہ اس نے اس سے وہ حدیث سنی ہے۔''

[البزار اور ابن القطان بحوالہ: تیسیر مصطلح الحدیث، ص: ۷۹، ۸۰]

مذکورہ بالا دونوں تعریفوں کی روشنی میں ''تدلیس الاسناد'' یہ ہے کہ راوی کسی شیخ سے، جس سے اس نے بعض حدیثیں سنی ہوں، ایسی حدیث روایت کرے جو اس نے اس سے خود نہ سنی ہو، بلکہ کسی دوسرے شیخ کے واسطہ سے سنی ہو اور اس دوسرے شیخ کا سند میں ذکر نہ کرے اور الفاظ ایسے استعمال کرے، جن سے سماع اور عدم سماع دونوں کا مفہوم نکلتا ہو۔ مثلاً: '' قَالَ فُلَانٌ..... فلاں نے کہا..... عَن فُلَانٍ ..... فلاں سے روایت ہے....'' تاکہ دوسرے کو یہ تاثر دے کہ اس نے وہ حدیث اس سے سنی ہے، مگر اس سماع کی صراحت نہ کرے، مثلاً یہ نہ کہے: '' سَمِعْتُ فُلَانًا يَقُولُ..... میں نے فلاں کو کہتے ہوئے سنا ہے....'' یا '' حَدَّثَنِي فُلَانٌ..... فلاں نے مجھ سے بیان کیا.....''

مثال:..........

تدلیس الاسناد کی مثال میں حافظ ابن الصلاح نے وہ واقعہ پیش کیا ہے جو علی بن خشرم سے مروی ہے، کہتے ہیں:

((كُنَّا عِنْدَ ابْنِ عُيَيْنَةَ ، فَقَالَ: قَالَ الزُّهْرِيُّ ، فَقِيلَ لَهُ: أَحَدَّثَكَ الزُّهْرِيُّ؟ فَسَكَتَ ، ثُمَّ قَالَ: قَالَ الزُّهْرِيُّ ، فَقِيلَ لَهُ:" أَسَمِعْتَهُ مِنَ الزُّهْرِيِّ؟ " فَقَالَ: لَا ـ لَم أَسْمَعْهُ مِنَ الزُّهْرِيِّ ، وَلَا مِمَّنْ سَمِعَهُ مِنَ الزُّهْرِيِّ ، حَدَّثَنِي عَبْدُ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ))

''ہم ابن عیینہ کے پاس موجود تھے کہ انہوں نے کہا: زہری نے کہا ہے۔ تو ان سے پوچھا گیا:

کیا آپ سے زہری نے بیان کیا ہے؟ تو چپ رہے، پھر کہا: زہری نے کہا ہے: تو ان سے دریافت کیا گیا: کیا آپ نے یہ زہری سے سنا ہے تو کہا: نہیں۔ نہ میں نے یہ زہری سے سنا ہے اور نہ تو اس سے جس نے یہ زہری سے سنا ہے، مجھ سے عبدالرزاق نے معمر سے اور انہوں نے زہری سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

ب...... تدلیس الشیوخ: سے مراد یہ ہے کہ راوی کسی شیخ سے کوئی ایسی حدیث روایت کرے جو اس سے سنی ہو، لیکن اس شیخ کا ذکر ایسے نام یا کنیت یا ایسے نسب یا ایسے لقب سے کرے، جس سے وہ لوگوں میں معروف نہ ہو۔ اور اس کے ایسا کرنے کا مقصد یہ ہو کہ لوگ اس کو پہچان نہ سکیں۔

مثال:............

تدلیس الشیوخ کی مثال وہ روایت ہے جو ابوبکر بن مجاہد المقری سے مروی ہے کہ انہوں نے ابوبکر عبداللہ بن ابی داؤد السجستانی سے روایت کرتے ہوئے کہا:

((حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أَبِي عَبْدِ اللّٰهِ))

''ہم سے عبداللہ بن ابی عبداللہ نے بیان کیا۔''

حافظ ابن الصلاح ''تدلیس'' کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رہی پہلی صورت ...... تدلیس الاسناد...... تو یہ بے حد مکروہ اور ناپسندیدہ ہے اور بیشتر علمائے حدیث نے اس کی مذمت کی ہے اور امام شافعی سے تو منقول ہے کہ انہوں نے تدلیس کو جھوٹ کا ہم مثل قرار دیا ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ مدلس نے جو روایت ایسے لفظ سے کی ہو جس سے دو طرح کا مفہوم اور سماع اور اتصال کی صراحت نہ کی ہو تو اس کا حکم مرسل اور اس کی قسموں کے حکم کی طرح ہے اور اگر روایت ایسے کسی لفظ سے کی ہے جو اتصال پر دلالت کرتا ہو جیسے:'' حَدَّثَنَا ، اَخبَرَنَا ، سَمِعتُ ''تو اس کی روایت قابل قبول ہے۔''

حافظ ابن الصلاح کے اس قول میں تھوڑا سا ابہام ہے جس کو واضح کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ مدلس اگر عدالت کی صفت سے موصوف ہو اور اتصال اور سماع پر بصراحت دلالت کرنے والے الفاظ میں حدیث روایت کرے تو اس کی روایت ''حسن'' کے درجے پر ہے اور قابل قبول ہے۔

رہی دوسری صورت ...... تدلیس الشیوخ...... تو اس کا حکم اس کے محرک اور مقصد کے اعتبار سے مختلف ہے۔

مثلاً اگر راوی ایسا اس لیے کرے کہ ''مروی عنہ'' اس سے کم عمر ہے یا اس سے حدیثیں سننے والے اس سے کمتر درجے کے ہیں یا اس نے اس سے بکثرت حدیثیں روایت کی ہیں اور بار بار ایک ہی نام، کنیت یا لقب کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تو ایسی حالت میں اس کا ایسا کرنا صرف مکروہ اور ناپسندیدہ فعل ہے۔

لیکن اگر ''مروی عنہ'' غیر ثقہ ہے اور وہ اس کے اس عیب کو چھپانے کے لیے اس کا ذکر ایسے نام، کنیت اور لقب سے کرے جس کو لوگ نہ جانتے ہوں تو یہ حرام ہے۔

حافظ ابن الصلاح اور حافظ ابن کثیر نے ''تدلیس'' کی یہی دو صورتیں بیان کی ہیں، حالانکہ اس کی اور بھی صورتیں اور قسمیں ہیں۔ جن میں بدترین قسم ''تدلیس التسویۃ'' ہے، جس سے مراد ہے کہ:

''راوی سند سے، اپنے شیخ کے سوا دوسرے راوی کو اس کے ضعیف یا کم عمر ہونے کی وجہ سے حذف کر دے تاکہ سند ''ثقہ عن ثقہ'' ہو جائے اور اس کو ''صحیح'' قرار دے دیا جائے۔ اس طرح کی تدلیس میں شہرت رکھنے والوں میں بقیہ بن الولید اور الولید بن مسلم کا شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ الولید بن مسلم امام اوزاعی سے حدیثیں روایت کرتے ہوئے سند سے ان کے ضعیف شیوخ کو حذف کر دیا کرتا تھا تاکہ سند میں صرف ثقہ راوی باقی رہ جائیں۔ اور جب اس کو اس پر ٹوکا گیا تو اس نے کہا: میں اوزاعی کے مقام اور درجے کو اس بات سے بلند کرنے کے لیے ایسا کرتا ہوں کہ وہ اس طرح کے ضعیف لوگوں سے حدیثیں روایت کرتے تھے اور جب اس سے کہا گیا کہ اگر اوزاعی نے ان ضعیف راویوں سے مذکورہ حدیثیں روایت کی ہوں اور تو نے ان کو سند سے حذف کر کے اوزاعی کی روایت کو ''ثقات'' سے مروی بنا دیا تو اس طرح اوزاعی خود ضعیف ہو گئے تو اس نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔'' [الباعث الحثیث، ص: ٤]

حافظ سیوطی نے '' تدریب الراوی '' میں امام الحاکم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''اہل حجاز، حرمین، مصر، عوالی، خراسان، اصبہانی، فارس، خوزستان اور ماوراء النہر میں کسی ایسے امام حدیث سے واقف نہیں ہوں جس نے ''تدلیس'' سے کام لیا ہو۔ سب سے زیادہ تدلیس کرنے والے محدثین اہل کوفہ سے تعلق رکھتے تھے اور اہل بصرہ میں بھی مدلسین قلیل تعداد میں ملتے ہیں۔ رہے اہل بغداد تو ان میں مدلس کی حیثیت سے صرف ابوبکر محمد بن محمد بن سلیمان الباغندی الواسطی کا نام ملتا ہے۔ اور یہ پہلا شخص ہے جس نے روایتِ حدیث میں ''تدلیس سے کام لیا۔'' [الباعث الحثیث، ص: ٦٣، ٦٤]

اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ ''وضع حدیث'' کا فتنہ بھی کوفہ ہی میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا اور پھر وہاں

سے دوسری جگہوں میں پھیلا اور عام ہوا۔

غریب:

غَرُبَ یَغْرُبُ سے ''صفتِ مشبہہ'' ہے اور '' غَرُبَ یَغْرُبُ ''کے معنی ہیں: تنہا ہونا، الگ تھلگ ہونا اور اجنبی ہونا اور '' غَرِیب ''وہ شخص ہے جو تنہا ہو، اکیلا ہو، اجنبی اور عزیز واقاریب سے دور ہو۔

اور غریب اس حدیث کو کہتے ہیں جو صرف کسی ایک فرد سے مروی ہو، چاہے یہ سند کے تمام طبقات میں ہو یا صرف کسی ایک طبقہ میں۔ اس کا دوسرا نام ''فرد'' بھی ہے۔

اور غریب یا فرد کی دو قسمیں ہیں۔

ا...... غریب مطلق یا فرد مطلق:

غریب مطلق یا فرد مطلق وہ حدیث ہے جس کو نبی ﷺ سے صرف کسی ایک صحابی نے روایت کیا ہو۔ قطع نظر اس کے کہ صحابی کے بعد نیچے کے تمام طبقوں میں اس کی روایت کرنے والا منفرد ہو یا کسی طبقہ میں اس کے منفرد راوی سے روایت کرنے والوں کی کثرت ہو جائے۔

''غریب حدیث'' کے راوی اگر ہر طبقہ میں ''ثقاہت'' کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوں تو وہ صحیح اور حجت ہے اور راویوں کی انفرادیت اس کی صحت میں ''قادح'' نہیں ہے۔

مثال:............

حدیث: ((إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) کی روایت صحابہ میں صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے کی ہے اور حضرت عمر سے علقمہ نے، علقمہ سے محمد بن ابراہیم نے اور محمد بن ابراہیم سے یحییٰ بن سعید الانصاری نے، لیکن یحییٰ بن سعید الانصاری سے دوسو ۲۰۰ سے زیادہ راویوں نے اس کی روایت کی ہے، جن میں امام مالک، سفیان الثوری، الاوزاعی، عبداللہ بن المبارک، اللیث بن سعد، حماد بن زید، شعبہ بن الحجاج اور سفیان بن عیینہ جیسے ائمہ حدیث شامل ہیں۔ اور تمام علمائے حدیث اور فقہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کا تعلق اصول دین سے ہے۔ حالانکہ یہ حدیث غریب اور فرد ہے۔

لیکن اگر کسی حدیث کا منفرد راوی عدل اور حافظ نہ ہو اور ضبط حدیث میں بھی معتبر نہ ہو تو اس کی روایت رد کر دی جائے گی۔

ب......غریب نسبتی یا اعتباری:

غریب نسبتی یا غریب اعتباری وہ حدیث ہے، جس کے راوی ابتدا میں یعنی اصل سند میں ایک سے زیادہ ہوں، مگر بعد میں کسی طبقہ میں اس کا ایک ہی راوی رہ گیا ہو، تو یہ حدیث اس ایک راوی کی نسبت یا اعتبار سے غریب نسبتی یا غریب اعتباری کہلاتی ہے۔

مثال:..........

((حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ قَزَعَةَ: حَدَّثَنَا مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم دَخَلَ مَكَّةَ يَوْمَ الْفَتْحِ وَعَلَى رَأْسِهِ الْمِغْفَرُ)) ❶

''ہم سے یحییٰ بن قزعہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے مالک نے، ابن شہاب سے اور انہوں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر، مکہ میں اس حالت میں داخل ہوئے کہ آپ کے سر پر ''خود'' تھا۔''

تو امام مالک ابن شہاب زہری سے اس حدیث کی روایت میں منفرد ہیں۔

اعتبار.........متابع..............شاہد

محدثین کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب ان کو کوئی حدیث معلوم ہوتی یا ملتی تو وہ یہ جاننے کے لیے بحث وتتبع شروع کر دیتے کہ آیا اس حدیث کا راوی اس کی روایت میں اکیلا ہے یا نہیں؟ اگر وہ کسی شخص کو کسی حدیث کی روایت میں اکیلا اور منفرد پاتے تو اس کی روایت کردہ حدیث کو غریب یا فرد کا نام دے دیتے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی۔

پھر وہ اس منفرد یا غریب حدیث کے تمام طرق کا تتبع کر کے یہ جاننے کوشش کرتے کہ آیا کوئی اور حدیث کسی اور طریق اور سند سے ایسی مروی ہے جو اپنے الفاظ اور معنی میں یا صرف معنی میں اس ''غریب یا منفرد'' حدیث کے مطابق ہے۔ اور اگر ان کو ایسی کوئی حدیث مل جاتی جو اسی صحابی سے مروی ہوتی، جس سے غریب یا منفرد حدیث مروی ہے اور لفظاً ومعناً یا صرف معناً وہ اس کے مطابق بھی ہوتی تو وہ اس کو ''منفرد حدیث کے'' ''متابع'' کا نام دے دیتے، لیکن اگر دوسری حدیث پہلی حدیث سے اس کے الفاظ اور معنی میں یا صرف معنی میں موافق تو ہوتی مگر اس کا راوی یعنی صحابی مختلف ہوتا تو اس کو وہ ''شاہد'' کہتے۔

❶ بخاري / ح: ٤٢٨٦ ، مسلم / ح: ٣٣٠٨

اس طرح: ......

اعتبار:

تتبع اور تلاش کے اس عمل کا نام ہے جو ایک ''عالم حدیث'' کسی ایسی حدیث کے طرق اور سندوں کو معلوم کرنے کے لیے انجام دیتا ہے جس کا راوی منفرد ہو۔

اور: ......

متابع:

اس حدیث کو کہتے ہیں جو اپنے الفاظ اور معنی میں یا صرف معنی میں کسی ایسی حدیث کے مطابق ہو جس کی روایت میں کوئی منفرد یا اکیلا ہو، لیکن دونوں حدیثیں ایک ہی صحابی سے مروی ہوں۔

اور: ......

شاہد:

وہ حدیث ہے جو اپنے الفاظ اور معنی میں یا صرف معنی میں کسی ایسی حدیث سے موافق ہو جس کی روایت میں کوئی منفرد اور اکیلا ہو اور دونوں حدیثیں دو مختلف صحابیوں سے مروی ہوں۔

متابع اور شاہد حدیثیں ایک سے زیادہ بھی ہوتی ہیں اور ہو سکتی ہیں۔

گویا: ......

متابع اور شاہد میں اس کے علاوہ کوئی فرق نہیں ہوتا کہ متابع حدیثوں کا راوی ایک ہی صحابی ہوتا ہے، جبکہ شاہد حدیثیں مختلف صحابیوں سے مروی ہوتی ہیں۔

اور: ......

دو یا دو سے زیادہ حدیثوں میں ''متابعت'' ......موافقت...... مکمل بھی ہوتی ہے اور ناقص ......قاصر...... بھی۔

مکمل متابعت کی مثال:

ایک حدیث کی سند ہے:

((رَوَى حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ عَنْ أَيُّوبَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيرِينَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ حَدِيثًا))

''حماد بن سلمہ نے ایوب سے، انہوں نے محمد بن سیرین سے، انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی ﷺ سے ایک حدیث روایت کی۔''

اب اگر یہی حدیث، اسی سند سے اس طرح مروی ہو کہ اس میں ''ایوب'' سے روایت کرنے والا ''حماد بن سلمہ'' کے علاوہ کوئی اور ہو تو یہ مکمل اور پوری ''متابعت'' ہوئی۔

لیکن اگر یہی حدیث اس طرح مروی ہو کہ اس میں ''محمد بن سیرین'' سے روایت کرنے والا ''ایوب'' کے علاوہ کوئی اور ہو یا ''ابو ہریرہ'' سے ''محمد بن سیرین'' کے علاوہ کوئی اور ہو تو یہ ''ناقص'' یا ''قاصر متابعت'' ہوئی۔

اور اگر یہی حدیث اسی سند سے اس طرح مروی ہو کہ اس میں نبی ﷺ سے اس کی روایت کرنے والا ابو ہریرہ کے علاوہ کوئی اور صحابی ہو تو اس کا نام ''استشہاد'' یا ''شہادت'' ہے۔

متابع کی مثال:

امام شافعی نے کتاب '' الأم '' میں اپنی سند سے ایک حدیث روایت کی ہے جس کے الفاظ یوں ہیں:

((عَنْ مَالِكٍ ، عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: الشَّهْرُ تِسْعٌ وَعِشْرُونَ ، فَلَا تَصُومُوا حَتَّى تَرَوُا الْهِلَالَ ، وَلَا تُفْطِرُوا حَتَّى تَرَوْهُ ، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِينَ))

'' مالک سے روایت ہے، انہوں نے عبداللہ بن دینار سے روایت کیا اور انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مہینہ ۲۹ دن کا ہوتا ہے، لہٰذا جب تک چاند دیکھ نہ لو روزہ رکھنا شروع نہ کرو اور روزہ رکھنا بند نہ کرو، یہاں تک کہ اس کو دیکھ نہ لو۔ اور اگر ابر کی وجہ سے چاند تم پر مخفی ہو جائے تو تیس ۳۰ کی تعداد پوری کر لو۔''

اس حدیث کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال تھا کہ امام شافعی اس کی روایت میں منفرد ہیں اور یہ ان کے ''غرائب'' میں سے ایک ہے، لیکن تتبع کرنے پر معلوم ہوا کہ اس حدیث کی روایت میں ان کا متابع بھی ہے اور شاہد بھی۔ چنانچہ صحیح بخاری میں یہ حدیث امام شافعی کے علاوہ عبداللہ بن مسلمہ نے بھی امام مالک سے

روایت کی ہے جس کے الفاظ یوں ہیں:

((حَدَّثَنَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ مَسْلَمَةَ: حَدَّثَنَا مَالِكٌ ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ ، عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما : أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَلشَّهْرُ تِسْعٌ وَعِشْرُوْنَ لَيْلَةً ، فَلَا تَصُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوْهُ ، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِيْنَ))

[حديث : ۱۹۰۷]

یہ متابعت کامل ہے۔ اسی طرح اس کی قاصر...... ناقص...... متابعت بھی موجود ہے جو امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں عاصم بن محمد کی سند سے نقل کی ہے:

((عَنْ عَاصِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ ، عَنْ أَبِيْهِ مُحَمَّدِ بْنِ زَيْدٍ ، عَنْ جَدِّهِ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ:...... فَكَمِّلُوْا ثَلَاثِيْنَ))

تو یہ متابعت قاصر...... ناقص...... ہے، کیونکہ اس کی سند کے تمام راوی امام شافعی کی روایت کردہ حدیث کی سند کے راویوں سے مختلف ہیں۔ صرف صحابی یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک ہیں۔ نیز متن حدیث میں "فَأَكْمِلُوْا" کی جگہ "فَكَمِّلُوْا" ہے۔

اور امام شافعی کی روایت کی شاہد وہ حدیث ہے جو امام النسائی نے سنن میں نقل کی ہے:

شاہد کی مثال:............

((عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ حُنَيْنٍ ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهِ ، وَأَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهِ ، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِيْنَ))

[حديث : ۲۱۲۳]

''محمد بن حنین سے روایت ہے، انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا اور انہوں نے نبی ﷺ سے کہ آپ نے فرمایا: چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ رکھنا بند کرو اور اگر ابر کی وجہ سے تم سے چاند اوجھل ہو جائے تو تیس ۳۰ کی تعداد پوری کر لو۔''

تو یہ حدیث شاہد ہے، کیونکہ نبی ﷺ سے اس کی روایت کرنے والے ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں جبکہ پہلی حدیث کے راوی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔

اگر کوئی محدث کسی حدیث کے بارے میں یہ کہے: ((تَفَرَّدَ بِهِ فُلَانٌ أَوْ تَفَرَّدَ بِهِ عَنْ فُلَانٍ)) اس کی روایت میں فلاں منفرد ہے یا فلاں سے اس کی روایت میں منفرد اور تنہا ہے تو اس قول سے اس کی مراد یہ

ہوتی ہے کہ یہ حدیث ''فرد مطلق'' ہے اور اس کا کوئی متابع نہیں۔ اب اگر اس حدیث کے منفرد راوی ہر طبقہ میں عدالت اور ضبط سے بہرور تھے تو ان کی یہ منفرد روایت حجت ہے۔

لیکن اگر وہ عدالت اور ضبط میں قابلِ بھروسہ نہیں تھے، یا کسی ایک ہی طبقہ کا کوئی منفرد راوی عدالت اور ضبط میں قابل اعتبار نہ رہا ہو تو پھر ان کی روایت کردہ منفرد حدیث ''مردود'' ہے۔

حافظ ابن الصلاح نے ''متابعت'' اور ''استشہاد'' کے باب میں ایک اہم نکتہ کا اضافہ کیا ہے:

''تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ بعض ایسے راویوں کی تنہا روایت متابع اور شاہد کے طور پر قبول کر لی جاتی ہے جن کا شمار ضعیفوں میں ہوتا ہے اور ان کی منفرد حدیث حجت نہیں مانی جاتی۔ اس طرح کے ضعیف راویوں کی مرویات صحیحین میں موجود ہیں، جو امام بخاری اور امام مسلم متابع اور شاہد کے طور پر لائے ہیں۔ لیکن ہر ضعیف راوی اس قابل نہیں ہوتا کہ اس کی منفرد حدیث متابع اور شاہد بن سکے۔ یہی مراد ہے امام الدارقطنی کے اس قول کا جس کا ذکر انہوں نے ضعیف راویوں کے ذکر کے ضمن میں کیا ہے کہ: ((فَلَانٌ يَعْتَبِرُ بِهِ)) فلاں قابل اعتبار ہے۔ ((وَفُلَانٌ لَا يَعْتَبِرُ بِهِ)) اور فلاں نا قابل اعتبار ہے۔''

[مقدمہ ابن الصلاح، ص: ۵۹]

باب سوم

عقائد اور ایمانیات

اسلام میں عقائد اور ایمانیات کو روح اور جان کی حیثیت حاصل ہے، اگر عقائد درست نہ ہوں تو اعمال بیکار محض ہیں اور ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذات وصفات میں یکتا اور بے مثل ہے۔

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ﴾ [الشوریٰ: ١١]

''کوئی بھی چیز اس کے مشابہہ اور مانند نہیں ہے۔''

اسلام کے اس بنیادی اور لازمی عقیدے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بندہ اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان غیر اللہ کو واسطہ اور ذریعہ نہ بنائے اور دنیا کے بادشاہوں اور حکمرانوں پر قیاس کر کے اس کا قرب حاصل کرنے، اس سے کچھ طلب کرنے یا اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کسی نبی، ولی، فرشتہ اور جن کو وسیلہ اور ذریعہ نہ بنائے، بلکہ جو کچھ اس سے مانگے براہِ راست مانگے اس سے دعا کرنی ہو تو براہِ راست کرے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ﴾

''اے نبی! اگر میرے بندے تم سے میرے بارے میں سوال کریں تو بیشک میں قریب ہوں؛ جب پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔''

اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے، اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے اور آفات ومصائب سے نجات حاصل کرنے کے جو وسائل وذرائع کتاب وسنت کی روشنی میں جائز اور مقرر ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

① اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کو وسیلہ بنا کر اور ان کے ذریعہ دعا مانگی جائے۔

﴿ وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا ﴾ [الأعراف: ١٨٠]

''اور اللہ ہی کے لیے ہیں اچھے نام، لہٰذا انہی کے ذریعہ اس کو پکارو۔''

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث ہے:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ عَبْدُكَ ، وَابْنُ عَبْدِكَ ، وَابْنُ اَمَتِكَ ، نَاصِيَتِیْ بِيَدِكَ ، مَاضٍ فِیَّ حُكْمُكَ ، عَدْلٌ فِیَّ قَضَاؤُكَ ، أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَلَكَ سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ أَوْ اَنْزَلْتَهُ فِیْ كِتَابِكَ ، أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ ، أَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهِ فِیْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ ، أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِيعَ قَلْبِیْ ، وَنُورَ صَدْرِیْ وَجَلَاءَ حُزْنِیْ ، وَذَهَابَ هَمِّیْ)) ❶

''اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں، تیرے بندے کا بیٹا ہوں اور تیری باندی کا بیٹا ہوں، میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے، میرے اندر تیرا ہی حکم جاری ہے، میرے بارے میں تیرا فیصلہ منصفانہ ہے، میں تیرے ہر اس نام سے تجھ سے سوال کرتا ہوں جو تیرا ہے، جس سے تو نے اپنی ذات کو موسوم فرمایا ہے، یا اس کو اپنی کتاب میں نازل کیا ہے، یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے یا اپنے پاس علم غیب میں اس کو محفوظ کر رکھا ہے، تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے رنج کے دور ہونے اور میرے غم کے زائل ہونے کا ذریعہ بنا دے۔''

۲۔ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے کسی نام کے ذریعہ اُس سے دعا مانگی جائے۔ جیسے: '' يَا غَفُورُ إِغْفِرْلِیْ ، يَا رَحِيْمُ إِرْحَمْنِیْ '' وغیرہ۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے افعال میں سے کسی فعل کو وسیلہ بنا کر اس سے دعا کی جائے جیسا کہ ہم درود شریف میں کہتے ہیں:

((اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ ط))

''اے اللہ! تو محمد اور آل محمد پر اپنی رحمت نازل فرما جس طرح تو نے ابراہیم اور آل ابراہیم پر رحمت نازل فرمائی۔''

۴۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان کو وسیلہ اور ذریعہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے۔ مثلاً یوں کہا جائے:

((اَللّٰهُمَّ بِإِيْمَانِیْ بِكَ وَبِرَسُولِكَ اَسْأَلُكَ))

''اے اللہ! میں تیرے اوپر اور تیرے رسول پر اپنے ایمان کے ذریعہ تجھ سے سوال کرتا ہوں۔''

❶ صحيح الترغيب والترهيب ، حديث : ۱۸۲۲

۵ اپنی حالت اور اپنے فقر ومحتاجی کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی جائے۔ جب کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا مانگی تھی:

﴿ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝ ﴾ [مریم: ۴]

''زکریا نے عرض کیا: اے میرے رب! میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں اور سر کے سارے بال سفید ہو گئے ہیں اور میں تجھ سے دعا مانگ کر کبھی نامراد نہیں رہا۔''

حضرت زکریا علیہ السلام کے انداز دعا پر غور کیجئے اپنی حالت اور ضعف و پیری کا ذکر تو کر دیا مگر کچھ مانگا نہیں کہ وہ ''علام الغیوب'' تو سب کچھ جانتا ہے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے الفاظ سورۃ القصص میں اس طرح آئے ہیں:

﴿ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰۤى اِلَى الظِّلِّ ، فَقَالَ : رَبِّ اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ط ﴾

''اس نے دونوں لڑکیوں کی بکریوں کو پانی پلایا، پھر سایہ کی طرف متوجہ ہوا اور عرض کیا: اے میرے رب! جو خیر بھی تو نے مجھ پر نازل فرمائی ہے، میں اس کا محتاج ہوں۔''

تکان سے برا حال ہے، بھوک اور پیاس سے حالت غیر ہے مگر زبان پر مطلوبہ شئی کا ذکر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ خیر و بھلائی کا ذکر کر دینے پر اکتفا کر دیا کہ وہ سراپا رحمت و مہربانی تو ساری حالت سے واقف ہے ہی۔

۶ کسی نیک اور صالح بندے کی دعا کو وسیلہ بنانا بشرطیکہ وہ بقید حیات ہو، جیسا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دعائیں کراتے تھے، اور آپ کی رحلت کے بعد جس کو افضل تصور کرتے یا مستجاب الدعا سمجھتے تھے اس سے دعائیں کراتے تھے، جیسا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے استسقا کی دعا کرائی۔

۷ اپنے کسی نیک اور خالص لوجہ اللہ عمل کا ذکر کر کے اللہ سے دعا کی جائے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت طلب کی جائے، جیسا کہ صحیحین اور دوسری کتب حدیث میں ان تین آدمیوں کے قصہ میں مذکور ہے، جن کے اوپر کسی غار کا دہانہ بند ہوگیا تھا اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے خالص لوجہ اللہ عمل کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ وہ ان کو اس مصیبت سے نجات دے۔ اور اللہ تعالیٰ نے غار کا دہانہ کھول دیا اور

وہ غار سے سلامت نکل گئے۔

توسل یا وسیلہ بنانے کی یہ سات صورتیں اتنی تفصیل سے اس لیے بیان کر دی ہیں تا کہ اس باب میں لوگوں میں زبان زد موضوع اور بے بنیاد روایات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

۱ ...... ((لَمَّا اقْتَرَفَ آدَمُ الْخَطِيْئَةَ ، قَالَ : يَا رَبِّ! أَسْأَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ لَمَّا غَفَرْتَ لِيْ، فَقَالَ اللّٰهُ : يَا آدَمُ! وَكَيْفَ عَرَفْتَ مُحَمَّدًا ، وَلَمْ أَخْلُقْهُ؟ قَالَ: يَارَبِّ! لَمَّا خَلَقْتَنِيْ بِيَدِكَ وَنَفَخْتَ فِيَّ مِنْ رُوْحِكَ ، رَفَعْتُ رَأْسِيْ ، فَرَأَيْتُ عَلَى قَوَائِمِ الْعَرْشِ مَكْتُوْبًا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ ، فَعَلِمْتُ أَنَّكَ لَمْ تُضِيْفْ إِلَى إِسْمِكَ إِلَّا أَحَبَّ الْخَلْقِ إِلَيْكَ۔ فَقَالَ اللّٰهُ : صَدَقْتَ يَا آدَمُ! إِنَّهُ لَأَحَبُّ الْخَلْقِ إِلَيَّ ، أُدْعُنِيْ بِحَقِّهِ ، فَقَدْ غَفَرْتُ لَكَ وَلَوْلَا مُحَمَّدٌ مَا خَلَقْتُكَ))

''جب آدم سے گناہ سرزد ہو گیا تو کہا: اے میرے رب! میں محمد کے حق کا واسطہ دے کر تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے معاف کر دے۔ اللہ نے فرمایا: اے آدم! تو نے محمد کو کس طرح جانا، میں نے تو اسے پیدا نہیں کیا ہے؟ عرض کیا: اے میرے رب! جب تو نے اپنے ہاتھ سے مجھے بنایا اور میرے اندر اپنی روح پھونکی تو میں نے اپنا سر اٹھایا، میں نے عرش کے پایوں پر لکھا ہوا دیکھا: ((لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ)) تو مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ تو نے اپنے نام کے ساتھ اپنے محبوب ترین مخلوق کا اضافہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آدم! تو نے سچ کہا۔ بیشک وہ میری مخلوق میں مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ تو مجھے اس کے حق کا واسطہ دیکر پکار، بیشک میں نے تجھے معاف کر دیا اور اگر محمدؐ نہ ہوتا تو میں تجھے پیدا ہی نہ کرتا۔''

یہ ایک موضوع اور من گھڑت روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک نہیں ہے۔ اس روایت کی سند اور متن دونوں موضوع ہیں۔

اس کی تخریج امام ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم نے '' **المستدرك** ، ص: ۶۱۵ ، ج: ۲ '' میں، حافظ ابوالقاسم علی بن الحسن ابن عساکر نے '' **تاریخ دمشق** ، ص: ۳۲۳ ، ج: ۲ '' اور ابو بکر احمد بن الحسین البیہقی نے '' **دلائل النبوۃ** ، ص: ۴۸۸ ، ج: ۵ '' میں ابوالحارث عبداللہ بن مسلم الفہری کی سند سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ مَسْلَمَةَ: نَبَّأُ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ أَبِيهِ ، عَنْ جَدِّهِ ، عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ مَرْفُوعًا))

''ہم سے اسماعیل بن مسلمہ نے بیان کیا، کہا: عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے اپنے باپ سے انہوں نے ان کے دادا سے اور انہوں نے حضرت عمر بن الخطاب سے مرفوعًا روایت کرتے ہوئے خبر دی۔''

امام الذہبی امام الحاکم کی تعقیب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ روایت موضوع ہے اور عبدالرحمٰن بے حد ضعیف ہے اور عبداللہ بن مسلم الفہری کو میں نہیں جانتا کہ کون ہے؟''

امام البیہقی کا قول ہے:

''اس حدیث کی روایت میں عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم منفرد ہے اور وہ ضعیف ہے۔''

''حافظ کثیر نے '' البداية والنهاهة ،ص: ۳۲۳ ، ج:۲ '' اور حافظ ابن حجر نے '' لسان المیزان '' میں البیہقی کی تائید کی ہے۔'' [الضعیفہ ، ص: ۸۹ ، ج: ۱]

حافظ ابن عبدالہادی الصارم المنکی '' ص: ۳۲ '' میں لکھتے ہیں:

''یہ حدیث حد درجہ ضعیف ہے، بلکہ بعض ائمہ حدیث نے اس کو موضوع بتایا ہے۔ اور اس کی سند حاکم سے عبدالرحمٰن بن زید تک صحیح نہیں بلکہ من گھڑت ہے۔'' [التوسل ، ص: ۱۱۰]

یہ تو اس روایت کی سند کا حال تھا، رہا اس کا متن تو وہ سند سے بھی زیادہ نکارت لیے ہوئے ہے۔ اس بے بنیاد روایت میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے بذاتِ خود اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا مانگی، جبکہ قرآن یہ صراحت کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دعا کے کلمات سکھائے تھے۔'' سورۃ البقرہ ،آیت :۳۷ '' اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے جو دعا مانگی تھی وہ'' سورۃ الأعراف '' میں ان الفاظ میں مذکور ہے:

﴿ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿23﴾ ﴾

''(آدم اور حوا نے) کہا: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کر ڈالا اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو یقینًا ہم نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہو جائیں گے۔''

ایک عجیب بات یہ ہے کہ یہ من گھڑت روایت یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ آدم علیہ السلام پڑھنا جانتے تھے اور انہوں نے اپنے جسم میں روح پھونکے جانے کے بعد جب اپنی آنکھیں کھولیں تو ،عرش کے ستونوں پر لکھا ہوا

''کلمۂ طیبہ'' پڑھ لیا؟

اس جھوٹی روایت کے آخرت میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا سبب محمد ﷺ کا وجود بتایا گیا ہے، جبکہ قرآن پاک یہ صراحت کرتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ابو البشر ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق زمین میں ''اپنے خلیفہ'' کی حیثیت سے کی ہے۔ [سورۃ البقرۃ: ۳۰]

۲ ...... ((تَوَسَّلُوا بِجَاهِيْ ، فَإِنَّ جَاهِيْ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ))

''میری جاہ و منزلت کو وسیلہ بناؤ، کیونکہ اللہ کے نزدیک میری جاہ و منزلت بڑی عظیم ہے۔''

یہ بھی ایک جھوٹی اور بے اصل روایت ہے۔ یہ ان الفاظ میں بھی کتابوں میں ملتی ہے:

((إِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهُ فَاسْأَلُوْهُ بِجَاهِيْ؛ فَإِنَّ جَاهِي عِنْدَاللّٰهِ عَظِيْمٌ))

''جب تم اللہ سے سوال کرو تو میری جاہ کو وسیلہ بنا کر سوال کرو اس لیے کہ اللہ کے نزدیک میری جاہ و منزلت عظیم ہے۔''

حدیث کی کتابوں میں ان دونوں روایتوں کا ذکر نہیں ملتا، سوائے صوفیا کی کتابوں کے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ '' القاعدة الجليلة '' میں لکھتے ہیں:

''اگرچہ نبی ﷺ کا مقام و مرتبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سارے انبیاء اور رسولوں کے مرتبے اور مقام سے زیادہ عظیم اور بلند ہے، لیکن مخلوق کا درجہ اور مرتبہ خالق کے نزدیک ویسا نہیں ہے جیسا کہ مخلوق کا درجہ اور مرتبہ مخلوق کے نزدیک ہوتا ہے، کیونکہ خالق کے نزدیک کوئی اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش نہیں کر سکتا، جبکہ مخلوق مخلوق کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکتی ہے، کیونکہ حصول مقصود میں دونوں کی ایک ہی حیثیت ہے اور سفارش کرنے والا حصول مقصود میں اس کا شریک ہے، جس سے وہ سفارش کر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کوئی بھی شریک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿22﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهٗ ﴾ [سبا: ۲۲، ۲۳]

''اے نبی! ان سے کہو پکارو ان معبودوں کو جنہیں تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھ بیٹھے ہو وہ آسمانوں میں کسی ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں نہ زمین میں وہ آسمان و زمین کی ملکیت میں شریک بھی نہیں

ہیں اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہی ہے۔ اور اللہ کے حضور کوئی شفاعت بھی کسی کے لیے نافع نہیں ہوسکتی بجز اس شخص کے جس کے لیے اللہ نے سفارش کی اجازت دی ہو۔''

[ص: ۱۳۲۔۱۵۰]

۳...... ((مَا وَسِعَنِی سَمَائِی وَلَا اَرْضِی ، بَلْ وَسِعَنِی قَلْبُ عَبْدِیَ الْمُؤْمِنِ))

''مجھے نہ میرا آسمان سموسکا نہ میری زمین بلکہ میرے مؤمن بندے کے دل نے مجھے سمولیا۔''

یہ ایک بے بنیاد اور من گھڑت روایت ہے، جس کا ذکر امام غزالی نے '' اِحیاء علوم الدین : ۳/۱۴'' میں کیا ہے اور اس میں '' اَللَّیِّن الوَادِع '' کا اضافہ کردیا ہے۔ اللین کے معنی ''نرم خو'' اور الوادع کے معنی صاحب الاستقرار کے ہیں۔ اس بے اصل روایت کا ایک ترجمہ یہ بھی کیا جاسکتا ہے: ''میرا احاطہ نہ میرا آسمان کرسکا اور نہ میری زمین بلکہ میرے نرم خو اور صاحب استقرار بندے کے دل نے میرا احاطہ کرلیا۔''

حافظ ابوالفضل زید الدین العراقی نے '' المغنی عن الأسفار '' میں جو احیاء العلوم کے حاشیہ پر شائع کی گئی ہے۔ اس کو بے اصل بتایا ہے۔

دوسری جن کتابوں میں ''حدیث قدسی'' کے نام سے اس بے بنیاد روایت کو ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں: '' أحادیث القصاص '' تصنیف شیخ الاسلام ابن تیمیہ ''حدیث نمبر: ۱.'' ''المقاصد الحسنة '' تصنیف حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی '' ص: ۳۷۳ '' ''مختصر المقاصد الحسنة '' تصنیف امام محمد بن عبدالباقی الزرقانی ''حدیث نمبر: ۹۱۶'' اور ملا علی القاری کی کتاب '' الاسرار المرفوعة ، ص: ۳۱۰ ''

اس بے بنیاد روایت کے الفاظ اس بات پر بصراحت دلالت کرتے ہیں کہ یہ ان صوفیا کا قول ہے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات سمیت (نعوذ باللہ) اپنی مخلوق میں حلول کرگیا ہے۔''

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ نے اس کو اسرائیلیات سے ماخوذ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اس روایت کی نسبت نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے اور جس کا عقیدہ ہو کہ اللہ کی ذات لوگوں کے دلوں میں حلول کرگئی ہے وہ ان نصاریٰ سے بھی بڑا کافر ہے جو مسیح علیہ السلام کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔

یہاں یہ واضح رہے کہ نتائج کے اعتبار سے حلول اور وحدۃ الوجود میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ اصطلاحی اعتبار سے دونوں میں فرق ہے۔

حلول کا مطلب ہے کہ وجود کی دو قسمیں ہیں ایک لاہوت (غیر مادی) اور دوسری ناسوت (مادی) اور نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ نے اجسام مادی میں حلول کر لیا ہے۔

رہا " وحدة الوجود " کا نظریہ تو یہ دو وجود کا قائل ہی نہیں ہے۔ اس کا دعویٰ ہے: " لا موجود إلا الله " موجود تو صرف اللہ ہے۔

٤ ...... ((كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًا لَا أُعْرَفُ ، فَأَحْبَبْتُ أَنْ أُعْرَفَ فَخَلَقْتُ خَلْقًا ، فَعَرَّفْتُهُمْ بِيْ ، فَبِيْ عَرَفُوْنِيْ))

"میں ایک غیر معروف پوشیدہ خزانہ تھا، پس میں نے چاہا کہ جانا جاؤں اس لیے میں نے مخلوق کو پیدا کیا جن کو اپنی معرفت بخشی اور انہوں نے میرے ذریعہ مجھے پہچانا۔"

یہ ایک موضوع عبارت ہے نبی ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ اس عبارت کی کوئی ضعیف سند بھی نہیں ہے جیسا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے۔ [احاديث القصاص ، حديث نمبر : ٣]

اس موضوع عبارت کو حافظ سخاوی نے " المقاصد الحسنة: ٣٢٧ " میں امام زرقانی نے "مختصر المقاصد الحسنة " میں " حديث نمبر: ٧٧٧ " ملا علی القاریؒ نے " الاسرار المرفوعة: ٢٧٣ " میں اور حافظ سیوطی نے " الدر المنتثرة حديث نمبر: ٣٣٠ " میں نقل کیا ہے۔

٥ ...... ((مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ))

"جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔"

یہ حدیث نہیں ہے۔ حافظ سخاوی "المقاصد الحسنة، ص: ١٩٨ " میں لکھتے ہیں:

" محدث ابو المظفر السمعانی نے فرمایا ہے کہ یہ عبارت نبی ﷺ کی حدیث کی حیثیت سے معروف نہیں ہے، بلکہ یہ یحییٰ بن معاذ الرازی کے قول کی حیثیت سے بیان کی جاتی ہے۔ اسی طرح امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ عبارت بطور حدیث کے ثابت نہیں ہے۔"

حافظ سیوطی نے " ذيل الموضوعات ، ص: ٢٠٣ " میں اس عبارت کے بارے میں امام نووی کا قول نقل کرنے کے بعد اس کی توثیق کی ہے۔ اور " القول الأشبه ، ٣٥١/٢ " میں خود یہ صراحت کی ہے: ((هٰذَا الحَدِيث ليس بصحيح)) یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اس قول سے ان کی مراد یہ ہے کہ: " یہ حدیث نہیں ہے۔" اور ملا علی القاری نے " الأسرار المرفوعة ، ص: ٨٣ " میں اس روایت کے بارے میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: " یہ موضوع ہے۔"

اور صاحب " القاموس المحیط " علامہ فیروز آبادی " الرد علی المعترضین علی الشیخ ابن عربی: ۲/ ۳۷ " میں لکھتے ہیں: ((مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ)) نبی ﷺ کا ارشادِ مبارک نہیں ہے اگرچہ بہت سے لوگ حدیث کے طور پر اس کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ دراصل ''اسرائیلیات'' سے ماخوذ ہے۔ اور اس اسرائیلی قول سے مشابہ ہے:

((یَا إِنْسَانُ! اِعْرِفْ نَفْسَكَ تَعْرِفْ رَبَّكَ))

''اے انسان! اپنے آپ کو پہچان اپنے رب کو پہچان لے گا۔''

یہاں پر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا ادراک حسی اور طبعی طور پر نہیں کر سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی معرفت عقلی اور وجدانی ہے بایں معنی کہ انفس و آفاق میں بکھری ہوئی بے شمار آیات اور علامتیں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن تصوف کی کتابوں میں عرفان باللہ یا معرفت الٰہی وغیرہ الفاظ سے مراد اللہ تعالیٰ کی حسی معرفت ہے جو روحانی ریاضتوں کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ یہ معرفت اس دنیا میں محال ہے، لہٰذا اس طرح کے الفاظ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔

٦...... ((تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ))

''اپنے اندر اللہ کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرو۔''

یہ ایک بے اصل اور باطل قول ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا قول مبارک نہیں ہے۔ اس کا ذکر حافظ سیوطی نے اپنی کتاب " تأیید الحقیقة العلیة: ۱/ ۸۹ " میں کیا ہے، لیکن اس کا کوئی مصدر نہیں بتایا ہے۔ صوفیا نے اس قول کی یہ تاویل کر کے اس کو رواج دینے کی کوشش کی ہے:

((اِتَّصِفُوا بِالصِّفَاتِ الْمَحْمُوْدَةِ وَتَنَزَّهُوا عَنِ الصِّفَاتِ الْمَذْمُوْمَةِ))

''عمدہ صفات سے متصف ہونے کی کوشش کرو اور بری صفات سے دور رہو۔''

لیکن مذکورہ عبارت کی یہ تاویل مردود ہے، کیونکہ نبی ﷺ سے اس کی نسبت ہی صحیح نہیں ہے، تو پھر اس تاویل کی ضرورت ہی کیوں؟ اور یہ بات بداهةً معلوم ہے اور کتاب و سنت کے نصوص اس کے شاہد بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں بے مثل اور یکتا ہے۔

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ﴾ [الشوریٰ: ۱۱]

''اس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔''

۷...... ((اَلْاِيْمَانُ مُثْبَتٌ فِي الْقَلْبِ كَالْجِبَالِ الرَّوَاسِيْ ، وَزِيَادَتُهُ وَنَقْصُهُ كُفْرٌ))

''ایمان دل میں مضبوط پہاڑوں کی طرح ثابت ہے اور اس میں زیادتی اور کمی کفر ہے۔''

یہ ایک موضوع اور من گھڑت روایت ہے، جو کتاب وسنت کے صریح نصوص کے خلاف ہے۔ یہ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ مبارک نہیں ہے۔

اس کی تخریج امام ابو حاتم محمد بن حبان البُستی نے '' کتاب الضعفاء :۲/۱۰۳ '' میں عثمان بن عبداللہ بن عمرو الأموی کے ترجمہ میں کی ہے۔ عثمان بن عبداللہ نے اس کی روایت حماد بن سلمہ سے اور اس نے ابوالمہزم سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ:

''جب ثقیف کا ایک وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ہم آپ کی خدمت میں یہ دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں کہ: ''کیا ایمان بڑھتا ہے یا گھٹتا ہے؟'' تو اس موقع پر آپ نے یہ بات فرمائی: امام ابن حبان اور امام ذھبی فرماتے ہیں کہ ''یہ روایت دراصل ابو مطیع البلخی نے حماد بن سلمہ کے نام سے گھڑی ہے جس کا سرقہ کر کے عثمان بن عبداللہ بن عمرو الأموی نے حماد بن سلمہ سے خود بیان کرنا شروع کر دیا۔ یہ شخص جب خراسان گیا تو وہاں اس نے امام مالک اور امام لیث بن سعد کے نام سے حدیثیں وضع کر کے لوگوں میں پھیلائیں۔ اس کی مرویات کا لکھنا صرف ''اعتبار'' کے لیے جائز ہے۔''

[سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة للألباني، ص: ۱/ ۶۲۸]

امام ابوالفرج ابن الجوزی نے '' الموضوعات: ۱/ ۱۳۱'' میں اس کو ابو مطیع البلخی کے طریقے سے امام الحاکم کی روایت سے نقل کیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ یہ ''موضوع'' ہے ابو مطیع الحکم بن عبداللہ کذاب تھا اور یہی حال ابو مُهزّم اب کا بھی تھا اور ان سے یہ روایت سرقہ کرنے والا عثمان بن عبداللہ بھی کذاب اور حدیثیں وضع کرنے والا تھا۔

اس روایت کے موضوع ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ کتاب وسنت سے ایمان میں کمی بیشی ثابت ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ ﴾ [الأنفال: ۲]

''درحقیقت سچے اہل ایمان وہ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کو سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔''

۸...... ((مَنْ بَلَغَهُ عَنِ اللّٰهِ شَيْءٌ فِيْهِ فَضِيْلَةٌ ، فَاَخَذَ بِهِ إِيْمَانًا بِهِ وَرَجَاءَ ثَوَابِهِ اَعْطَاهُ اللّٰهُ ذَلِكَ وإِنْ لَمْ يَكُنْ كَذَلِكَ)) [الضعيفه لِلألبانی ، حديث نمبر : ٤٥١]

''اگر کسی کو اللہ کی طرف سے ایسی چیز ملے جس میں فضیلت ہو اور وہ اس پر یقین کر کے اس کو اختیار کر لے اور اس سے ثواب کی امید رکھے تو اللہ اس کو وہ ثواب عطا فرمائے گا اگرچہ وہ چیز حقیقت میں اس کے خیال جیسی نہ ہو۔''

یہ ایک موضوع روایت ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ اس کی تخریج ابن الآباد نے اپنی'' معجم ، ص: ۲۸۱ '' میں ابو محمد الخلال نے '' فضل رجب :۱۵/ ۲۰۱'' میں، حافظ الخطیب البغدادی نے '' تاریخ بغداد :۸/ ۲۹۶'' میں اور محمد بن طولون نے '' الاربعین :۱۵/ ۲ '' میں فرات بن سلمان اور عیسیٰ بن کثیر سے کی ہے۔ اور ان دونوں نے اس کی روایت ابو رجاء سے انہوں نے یحییٰ بن ابی کثیر سے انہوں نے ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن سے اور انہوں نے جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً کی ہے۔

امام ابو الفرج ابن الجوزی نے یہ روایت اسی سند سے '' الموضوعات :۱/ ۲۵۸'' میں نقل کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ: '' یہ صحیح نہیں ہے، ابو رجاء کذاب تھا۔'' حافظ سیوطی نے '' اللآلی المصنوعة :۱/ ۲۱۴ '' میں اس روایت کی عدم صحت کے بارے میں امام ابن الجوزی سے اتفاق کیا ہے، اور لکھا ہے کہ: '' میں اس ابو رجاء کو نہیں جانتا۔'' حافظ سخاوی نے بھی '' المقاصد الحسنة ،ص:۱۹۱'' میں یہ صراحت کی ہے کہ: '' وہ اس کو نہیں جانتے۔'' یہی بات انہوں نے '' القول البدیع ، ص:۱۹۷ '' میں بھی کہی ہے۔

مختصر یہ کہ یہ روایت دوسری جن سندوں سے بھی مروی ہے ان سب میں جھوٹے اور حدیثیں وضع کرنے والے راوی شامل ہیں۔

اس من گھڑت اور خود ساختہ روایت کو بنیاد بنا کر بعض بزرگوں نے ایسے اعمال کو جائز قرار دے دیا ہے، جن کی کتاب وسنت میں کوئی بنیاد اور اصل نہیں ہے اور لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اگر ثواب کی نیت سے اس طرح کے غیر ثابت شدہ اعمال انجام دیئے جائیں تو وہ عنداللہ مقبول ہوں گے، حالانکہ ان بزرگوں کو بھی یہ بات معلوم ہوگی کہ کسی بھی عمل کے عبادت اور عنداللہ مقبول ہونے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ کتاب وسنت سے ثابت ہو۔

۹...... ((مَنْ بَلَغَهُ عَنِ اللّٰهِ فَضْلٌ ، فَاَخَذَ بِذَلِكَ الْفَضْلِ الَّذِیْ بَلَغَهُ اَعْطَاهُ اللّٰهُ مَا

بَلَغَهُ وَإِنْ كَانَ الَّذِي حَدَّثَهُ كَاذِبًا))

''جس شخص کو اللہ کی جناب سے کوئی فضل ملے اور وہ اس کو اپنا لے تو اللہ اس کو فضل عطا کرے گا اگر چہ اس کا بیان کرنے والا جھوٹا ہو۔''

یہ موضوع روایت ہے جس کو حدیثیں گھڑنے والے کسی جھوٹے راوی نے وضع کر کے لوگوں میں پھیلا دیا ہے، اس کا ذکر امام البغوی نے '' **حديث كامل بن طلحه : ۱/۴** '' میں، حافظ ابن عبدالبر نے '' **جامع بيان العلم : ۱/۲۲** '' میں، ابواسماعیل السمرقندی نے '' **ماقرب سنده : ۱/۲** '' میں اور حافظ ابن عساکر نے '' **التحبر : ۲.۱/۴** '' میں عباد بن عبدالصمد عن انس مرفوعاً کے طریقے سے کیا ہے۔

عباد بن عبدالصمد پر کذب بیانی اور وضع حدیث کا الزام تھا۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں: امام ابن حبان نے اس کو ''واہیات'' بتایا ہے۔ اور لکھا ہے کہ عباد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث کا ایسا مجموعہ بیان کیا ہے جو پورے کا پورا موضوع ہے۔

اس موضوع روایت کی نکارت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس میں روایت حدیث میں کذب بیانی کو جائز قرار دیا گیا ہے جبکہ متواتر احادیث میں حدیثیں وضع کرنے والوں کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔

۱۰ ...... ((لَوِ اعْتَقَدَ أَحَدُكُمْ بِحَجَرٍ لَنَفَعَهُ))

''اگر تم میں سے کوئی پتھر کے بارے میں بھی اعتقاد رکھے تو وہ اس کو نفع دے گا۔''

یہ ایک موضوع روایت ہے۔ جبکہ امام ابن تیمیہ نے صراحت کی ہے۔ ملا علی القاریؒ '' **الأسرار المرفوعة في الأخبار الموضوعة** '' میں لکھتے ہیں: علامہ ابن القیم نے اس روایت کے بارے میں لکھا ہے کہ: ''یہ عبارت بت پرستوں کی گھڑی ہوئی ہے جو پتھروں کے بارے میں حسنِ ظن رکھتے ہیں۔'' اور حافظ ابن حجر کا قول ہے کہ: ''یہ روایت بے بنیاد ہے۔'' [ص: ٦٦ بحواله سلسلة الأحاديث الضعيفه والموضوعة للألباني : ١/٦٤٧]

۱۱ ...... ((اَلشَّيْخُ فِي بَيْتِهِ كَالنَّبِيِّ فِي قَوْمِهِ))

''شیخ اپنے گھر میں وہی مقام رکھتا ہے جو مقام نبی اپنی قوم میں رکھتا ہے۔''

امام ابوالفرج عبدالرحمٰن بن الجوزی نے '' **الموضوعات : ۱/۱۸۳** '' میں اس موضوع روایت کو انہی الفاظ میں نقل کیا ہے، لیکن امام ابن تیمیہ نے '' **أحاديث القصاص ، ص: ٦٨** '' میں اس کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

((الشَّيۡخُ فِيۡ قَوۡمِهٖ كَالنَّبِيِّ فِيۡ اُمَّتِهٖ))

''شیخ کو اپنی قوم میں وہی مقام حاصل ہے جو مقام نبی کو اپنی امت میں حاصل تھا۔''

دوسری جن کتابوں میں اس موضوع حدیث کا ذکر آیا ہے، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: " میزان الاعتدال: ۶۳۲/۳ ، اللآلي الموضوعة : ۱۵۳/۱ ، ۱۵۴ ، الاسرار المرفوعة :۲۴۹ ، ضعیف الجامع الصغیر ، حدیث نمبر: ۳۴۵۳ اور الضعیفة للألبانی ، حدیث نمبر : ۳۷۶۲"

امام ابن تیمیہ نے " احادیث القصاص "میں لکھا ہے کہ: ''یہ نبی ﷺ کا قول مبارک نہیں ہے، بلکہ عام لوگوں میں سے کسی شخص کا قول ہے۔''

اور اس کا مضمون اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ یہ کسی ''صوفی'' کا گھڑا ہوا قول ہے جس کو اس نے نبی ﷺ کی طرف منسوب کر دیا ہے، کیونکہ اولیاء اللہ کے بارے میں اس طرح کا عقیدہ صرف صوفیا رکھتے ہیں، ان کے نزدیک ''اولیاء'' نہ صرف یہ کہ انبیاء کے مقام پر فائز ہوتے ہیں بلکہ وہ کائنات میں ''صاحب تصرف'' بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ سید احمد شہید کے ملفوظات پر مشتمل کتاب ''صراطِ مستقیم'' میں اولیاء اللہ کے بارے میں جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔

''عنایت غیبیہ اس کو چن کر اپنا خاص چیلہ بنا لیتی ہے، جس طرح با اقتدار بادشاہ اپنے بعض فرمانبرداروں کو تمام رعایا سے ممتاز کر کے اپنے لیے چن لیتے ہیں اور اس کو چیلۂ خاص کے لقب سے ملقب کرتے ہیں پس جس طرح چیلۂ خاص کو اپنے آقا کے سامان میں تصرف کی مطلق اجازت ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنے آقا کی سلطنت کو اپنی سلطنت کہہ دیتا ہے، اس طرح یہ بلند مراتب و مناصب والے مجاز مطلق ہوتے ہیں۔ عالم مثال و شہادت میں تصرف کرنے کے لیے'' صراطِ مستقیم بحوالہ عہدِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح پر ایک نظر۔'' [ص: ۱۰۵]

اگر اولیاء اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ سید احمد شہید کا تھا تو پھر عام صوفیا کا عقیدہ کیا ہوگا اس کا اندازہ کر لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔

اسی مضمون کی ایک دوسری موضوع حدیث ان الفاظ میں بھی ملتی ہے۔

۲ ...... ((الشيخُ في جَمَاعَتِهِ كَالنَّبِيِّ فِيۡ قَوۡمِهٖ ، يَتَعَلَّمُوۡنَ مِنۡ عِلۡمِهٖ وَيَتَأَدَّبُوۡنَ مِنۡ أَدَبِه))

''شیخ اپنی جماعت میں وہی درجہ رکھتا ہے جو نبی اپنی قوم میں رکھتا ہے۔ لوگ اس کے علم سے علم

حاصل کرتے ہیں اور اس کے ادب سے ادب پاتے ہیں۔''

امام محمد بن عبدالباقی الزرقانی نے " مختصر المقاصد الحسنة " میں اس روایت کو باطل قرار دیا ہے۔ "ص :۱۴۳ ، حدیث نمبر : ۵٦۸ " اور ملا علی القاریؒ نے " الاسرار المرفوعة : ۲۵۳ " میں اس کو موضوع بتایا ہے۔

صوفیا کا دعویٰ ہے کہ ان کا ''تصور شیخ'' اس حدیث سے ماخوذ ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

((اَلْمَرْءُ عَلَى دِيْنِ خَلِيْلِهِ فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ مَنْ يُخَالِلُ)) [1]

''انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، پس تم میں سے کوئی اس شخص کو خوب پرکھ لے جس کو وہ دوست بنانا چاہے۔''

تو اس حدیث سے تصور شیخ کا وہ مفہوم نہیں نکلتا جو صوفیا کے یہاں پایا جاتا ہے۔ اس حدیث سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ ہر شخص اپنے ہم مذہب اور ہم مشرب سے دوستی کرتا ہے اس لیے جو کوئی کسی کو دوست بنانا چاہے وہ پہلے یہ دیکھ لے کہ اس کا مذہب اور عقیدہ کیا ہے؟

۲...... ((إِذَا حُدِّثْتُمْ عَنِّيْ بِحَدِيْثٍ يُوَافِقُ الْحَقَّ ، فَصَدِّقُوْهُ وَخُذُوا بِهِ حَدَّثْتُ بِهِ أَوْلَمْ أُحَدِّثْ))

''اگر میری نسبت سے تم سے کوئی حدیث بیان کی جائے جو حق کے مطابق ہو تو اس کو صحیح سمجھو اور اس کو لے لو، چاہے میں نے اس کو بیان کیا ہو یا بیان نہ کیا ہو۔''

یہ ایک موضوع اور من گھڑت روایت ہے جس کا ذکر حافظ سخاوی نے " المقاصد الحسنة ، ص:۳٦ " میں، امام الزرقانی نے " مختصر المقاصد الحسنة ،حديث نمبر : ۵۳ " میں، حافظ سیوطی نے " اللآلی المصنوعة : ۱/۲۱۳ " میں اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے " احاديث القصاص حديث نمبر : ۵۱ " میں ان الفاظ میں کیا ہے:

((إِذَا سَمِعْتُمْ عَنِّيْ حَدِيْثًا فَاعْرِضُوْهُ عَلَى الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ ، فَإِنْ وَافَقَ فَارْوُوْهُ عَنِّيْ وَإِنْ لَمْ يُوَافِقْ فَلَا تَرْوُوْهُ عَنِّيْ))

''جب تم میری نسبت سے کوئی حدیث سنو، تو اس کو کتاب وسنت پر پیش کرو، پس اگر وہ ان کے

[1] مشكوة المصابيح ،ح: ۵۰۱۹

مطابق ہو تو اس کو میرے نام سے روایت کرو اور اگر مطابق نہ ہو تو میرے نام سے اس کی روایت مت کرو۔''

اور امام شافعی رحمہ اللہ نے '' **الرسالۃ ، ص: ۱۷۰، فقرہ نمبر: ۵۳** '' میں یہ حدیث ان الفاظ میں روایت کی ہے:

((مَا جَاءَكُمْ عَنِّيْ فَاعْرِضُوْهُ عَلَى كِتَابِ اللّٰهِ ، فَمَا وَافَقَهُ فَاَنَا قُلْتُهُ وَمَا خَالَفَهُ فَلَمْ اَقُلْهُ))

''جو بات میری نسبت سے تمہارے پاس آئے تو اس کو اللہ کی کتاب پر پیش کرو پس جو بات کتاب اللہ کے مطابق ہو وہ تو میں نے کہی ہے اور جو بات کتاب اللہ کے خلاف ہو وہ میں نے نہیں کہی ہے۔''

ان تمام الفاظ میں یہ روایت موضوع ہے جس کے موضوع ہونے یا کم از کم منکر ہونے پر تقریباً ائمہ حدیث کا اتفاق ہے۔

اس حدیث کی سند اور متن دونوں ناقابل اعتبار ہیں، کیونکہ اس میں کسی حدیث کی صحت معلوم کرنے کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری نہیں ہے کہ نبی ﷺ سے اس کی نسبت صحیح ہے بلکہ یہ دیکھ لینا کافی ہے کہ اس کا مضمون ''حق'' یا اللہ کی کتاب کے مطابق ہے یا نہیں اگر وہ کتاب اللہ یا ''حق'' کے مطابق ہے تو پھر وہ حدیث رسول اللہ ﷺ ہے ورنہ نہیں۔ چنانچہ اس موضوع اور من گھڑت روایت کی بنیاد پر ایسی بے شمار روایتوں کو یہ کہہ کر قبول کر لیا گیا ہے کہ ان کا مضمون صحیح ہے۔ یا وہ اللہ کی کتاب کے مطابق ہیں۔ یا وہ اسلامی روح اور مزاج کے خلاف نہیں ہیں وغیرہ۔

سوال یہ ہے کہ حق کیا ہے؟ کیا حق اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات کے علاوہ کچھ اور ہے؟ آج مسلمانوں کے اندر ایسے کتنے اعمال عبادات اور تزکیۂ نفس کے نام سے رواج پا چکے ہیں جن کی کوئی سند اور اصل کتاب وسنت میں موجود نہیں ہے۔ مگر ان کو یہ کہہ کر رواج دیا جا رہا ہے کہ تجربے سے یہ مفید ثابت ہوئے ہیں۔ یا ان سے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے یا وہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔

حافظ ابن عبد البر نے '' **جامع العلم وفضلہ : ۱۹۱/۲** '' میں بڑی دلچسپ بات لکھی ہے، فرماتے ہیں: ''اہل علم نے اس حدیث کی یہ کہہ کر مخالفت کی ہے، ہم سب سے پہلے اس کو اللہ کی کتاب پر پیش کرتے ہیں اور اس کے فیصلے پر اعتماد کرتے ہیں، چنانچہ جب ہم نے اس کو اللہ کی کتاب پر پیش کیا تو اس

کو کتاب اللہ کے خلاف پایا اور وہ اس طرح کہ اللہ کی کتاب میں ہمیں کہیں بھی ایسا کوئی حکم نہیں ملا کہ رسول اللہ ﷺ کی صرف وہی حدیث یا صرف وہی ارشاد قبول کیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق ہو بلکہ اس کے برعکس کتاب اللہ میں تو ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چلیں، آپ کو اپنے لیے نمونہ بنائیں اور آپ کی مطلق اطاعت کریں۔ اسی طرح قرآن ہمیں کسی بھی حال میں آپ کی مخالفت سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے۔''

اور امام ابن حزم '' الإحكام في اصول الأحكام: ۲/۷۹ '' میں لکھتے ہیں: جب ہم نے اس حدیث کو قرآن پر پیش کیا تو قرآن کو اس کے خلاف پایا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے:

﴿ وَمَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ط ﴾ [الحشر: ۷]

''اور رسول جو کچھ تمہیں دے اسے لے لو اور جس چیز سے تمہیں روکیں اس سے رک جاؤ۔''

اسی طرح ہم قرآن میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی پاتے ہیں:

﴿ مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ط ﴾ [النساء: ۸۰]

''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔''

اور قرآن ہی میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کا یہ فرض منصبی بیان فرمایا ہے کہ آپ قرآن کے شارح اور مفسر ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ط ﴾ [النحل: ٤٤]

''ہم نے تمہارے پاس ذکر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے لیے اس تعلیم کو بیان کردو جو ان کے پاس اتاری گئی ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن رسول اللہ ﷺ پر اس لیے نازل فرمایا ہے تاکہ آپ اپنے قول وفعل سے اس میں موجود شرعی احکام کو لوگوں کے سامنے واضح کردیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ تفسیر وتشریح ہمیشہ اصل سے زائد ہوتی ہے جس کو اس موضوع روایت کی بنیاد پر یہ کہہ کر رد کیا جاسکتا ہے کہ نبی ﷺ کی فلاں اور فلاں تفسیر قرآن کے خلاف ہے۔ اور یہ کوئی مفروضہ نہیں ہے بلکہ فعلاً ایسا کیا بھی گیا ہے اور بہت سے لوگوں نے بہت سی ایسی صحیح احادیث کا اس لیے انکار کردیا ہے کہ وہ ان کے ''زعم باطل'' میں قرآن کے خلاف ہیں۔ اور دلیل میں انہی موضوع روایات کو پیش کیا ہے، اس طرح اہل بدعت نے ان موضوع روایات کا سہارا لے کر دین میں نئی نئی عبادتوں کا اضافہ کردیا اور منکرین حدیث نے جس حدیث کا جامعایہ

کہہ کر رد کر دیا کہ یہ قرآن کیخلاف ہے۔اس گمراہی کا پردہ امام شافعی رحمہ اللہ نے ''الرسالہ'' میں ایک ایک کر کے چاک کیا ہے اور دلائل و براہین کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ حدیثِ رسول ﷺ کے بغیر نہ تو فہمِ قرآن ممکن ہے اور نہ اس کی تعلیمات اور احکام پر عمل ہی ممکن ہے۔

۱۴ ...... ((إِذَا أَعْيَتْكُمُ الْأُمُوْرُ فَعَلَيْكُمْ بِأَهْلِ الْقُبُوْرِ ، أَوْ فَاسْتَغِيْثُوْا بِأَهْلِ الْقُبُوْرِ))

''جب تمہارے معاملات تمہیں عاجز و درماندہ بنا دیں تو اہل قبور کا سہارا لو، یا اہل قبور سے فریاد کرو۔''

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس حدیث کو جھوٹ اور رسول اللہ ﷺ پر افترا قرار دیا ہے۔اور لکھا ہے کہ ائمہ حدیث کا اس کے موضوع ہونے پر اتفاق ہے۔'' الفتاویٰ: ۱۱/ ۲۹۳ '' اور ائمہ حدیث میں سے کسی بھی امام نے اپنی کتاب میں اس کی روایت نہیں کی ہے اور نہ مستند کتبِ حدیث میں اس کا ذکر ہے۔

اس کے باوجود صوفیا اور قبر پرستی کے داعی مصنفین کی کتابوں میں اس کا بڑا ذکر ملتا ہے اور اس کی بنیاد پر لوگوں کو قبروں کی زیارت کرنے اور اہل قبور سے مرادیں مانگنے کی دعوت دی جاتی ہے۔واضح رہے کہ یہ موضوع حدیث بعض کتابوں میں ان الفاظ میں بھی ملتی ہے:

((إِذَا تَحَيَّرْتُمْ فِيْ الْأُمُوْرِ فَاسْتَعِيْنُوْا بِأَهْلِ الْقُبُوْرِ))

''اگر تمہیں اپنے معاملات میں حیرانی لاحق ہو جائے تو اہل قبور سے مدد طلب کرو۔''

یہ بھی موضوع اور نبی ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے، جبکہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے '' **اقتضاء الصراط المستقیم** ، ص: ۳۷۲ '' میں صراحت کی ہے، اس کی روایت ابن کمال باشا نے ''**الاربعین** ''میں کی ہے۔ [بحواله كشف الخفاء و مزيل الإلباس : ۱/ ۸۸]

یہ دونوں موضوع روایتیں اپنے مضمون کے اعتبار سے اسلام کے عقیدۂ توحید کے سراسر خلاف ہیں۔ جس عقیدہ کا اقرار ہر مسلمان اپنی نمازوں میں ﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ ''اے اللہ! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد کے طالب ہیں۔'' کہہ کر کرتا ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو کوئی مشکل مسئلہ پیش آجاتا تھا تو آپ نماز کا سہارا لیتے تھے۔

((عَنْ حُذَيْفَةَ ، قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ صَلَّى)) [1]

---

[1] ابو داؤد ، ح: ۱۳۱۹

''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہا: جب نبی ﷺ کو کوئی اہم مسئلہ پیش آ جاتا تھا تو آپ نماز پڑھتے تھے۔''

اسلام میں زیارت قبر کی اجازت صرف اس غرض کے لیے دی گئی ہے کہ اس سے موت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اور ایک دوسری روایت کے مطابق آخرت یاد آتی ہے۔

((عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ ، قَالَ : زَارَ النَّبِیُّ ﷺ قَبْرَ أُمِّهِ فَبَكَى وَأَبْكَى مَنْ حَوْلَهُ فَقَالَ ﷺ : اِسْتَأْذَنْتُ رَبِّی فِی أَن اَسْتَغْفِرَلَهَا فَلَمْ یُؤْذَنْ لِی ، وَاسْتَأْذَنْتُهُ فِی أَنْ أَزُوْرَ قَبْرَهَا فَأَذِنَ لِی ، فَزُوْرُوا الْقُبُورَ ، فَإِنَّهَا تُذَكِّرُكُمُ الْمَوتُ)) ❶

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہا: نبی ﷺ نے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کی تو خود روئے اور اپنے پاس کے لوگوں کو رلایا اور آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے ان کے لیے استغفار کی اجازت مانگی تو مجھے اجازت نہیں دی گئی اور میں نے ان کی قبر کی زیارت کی اجازت چاہی تو میرے رب نے مجھے اس کی اجازت دے دی، پس قبروں کی زیارت کرو، کیونکہ یہ تمہیں موت کی یاد دلاتی ہیں۔''

اور ایک دوسری حدیث میں ہے:

((كُنْتُ نَهَیْتُكُمْ عَنْ زِیَارَةِ الْقُبُورِ ، فَزُوْرُوهَا ، فَإِنَّهَا تُذَكِّرُكُمُ الآخِرَةَ ، فَمَنْ أَرَادَ أَن یَزُورَ فَلْیَزُرْ ، وَلَا تَقُولُوا هُجْرًا)) ❷

''میں نے تم کو قبروں کی زیارت کرنے سے روک دیا تھا، پس قبروں کی زیارت کرو، اس لیے کہ وہ آخرت کی یاد دلاتی ہیں، پس جو زیارت کرنا چاہے زیارت کرے اور بری بات مت کہو۔''

باطل اور مشرکانہ باتوں کو '' هُجر '' کہتے ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ '' المجموع: ۵/۳۱۰ '' میں لکھتے ہیں:

''الهُجرُ غلط اور باطل بات کو کہتے ہیں، عہد جاہلیت سے قریب زمانے میں مسلمانوں کو قبروں کی زیارت سے روک دیا گیا تھا، کیونکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ اس موقع پر شاید زمانۂ جاہلیت کی مشرکانہ باتیں زبان سے نکالیں، لیکن جب اسلامی اصول مستحکم ہو گئے، اس کے احکام کا سمجھنا آسان ہو گیا اور اسلام کی پہچان عام ہو گئی، تو ان کو قبروں کی زیارت کی اجازت دے دی گئی۔

❶ صحیح مسلم ح : ۲۲۵۹ ❷ صحیح مسلم : ۲۲۶۰ ،مسند أحمد: ۳۵۰/۵ ، النسائی ، ح: ۲۰۳۲

اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس ارشادِ مبارک سے احتیاط برتنے کی بھی تلقین فرما دی: ((وَلَا تَقُوْلُوْا هُجْرًا)) یعنی ''قبروں کی زیارت چاہو تو کرو، مگر وہاں زبان سے بری باتیں مت نکالنا۔''

اور قبروں پر جا جا کر اہل قبور سے فریادیں کرنے اور ان سے مدد طلب کرنے سے زیادہ بری بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس طرح کی باتیں تو ''شرک اکبر'' ہیں۔

اسی وجہ سے نبی ﷺ نے اپنی حیات پاک کے آخری لمحات میں اہل کتاب پر لعنت بھیجی کیونکہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ چنانچہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

((قَالَ النَّبِيُّ ﷺ فِيْ مَرَضِهِ الَّذِيْ لَمْ يَقُمْ مِنْهُ: " لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ ، إِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِ هِمْ مَسَاجِدَ " قَالَتْ عَائِشَةُ: لَوْلَا ذَالِكَ لَأُبْرِزَ قَبْرُهُ ، خَشِيَ أَنْ يُتَّخَذَ مَسْجِدًا ، وَفِيْ رَوَايَةٍ: لَعَنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى إِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدًا)) [1]

''نبی ﷺ نے اپنے اس مرض میں جس سے آپ جانبر نہ ہو سکے، فرمایا: ''یہودیوں پر اللہ کی لعنت ہو کہ انہوں نے اپنا انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ کی قبر نمایاں کر دی جاتی، آپ کو یہ اندیشہ ہوا کہ اس کو سجدہ گاہ بنا لیا جائے گا۔ ایک دوسری روایت میں ہے: یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''

قبر پرستی اور غیر اللہ کو وسیلہ بنانے کی بیماری میں چونکہ سب سے زیادہ احناف مبتلا ہیں، خاص طور پر برصغیر میں اس لیے میں اس مسئلے میں مختصراً ائمہ احناف کے اقوال نقل کر دینا چاہتا ہوں تا کہ قارئین کرام کو یہ معلوم ہو جائے کہ برصغیر کے احناف چاہے وہ علماء ہوں یا عوام جن مشرکانہ اعمال کا ارتکاب کرتے ہیں اور ان کو صحیح تصور کرتے ہیں، ان کے ائمہ ان سے بری ہیں۔

علامہ محمد بن علی بن محمد الحصنی المعروف بعلاء الدین الحصکفی اپنی مشہور کتاب '' الدر المختار : ۲/ ۶۳۰ '' میں لکھتے ہیں:

''امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے منقول ہے: کسی کے لیے بھی یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اللہ سے اس کے

[1] متفقه علیه ، صحیح بخاری ح: ٤٤٤١ ـ ٤٤٤٣، صحیح مسلم : ٥٣١

سوا کسی اور ذریعہ سے دعا کرے اور دعا کے جس طریقے کی اجازت دی گئی ہے اور جس کا حکم دیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے مستفاد ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ط ﴾ [الأعراف: ۱۸۰]

''اللہ ہی کے لیے ہیں اچھے نام، لہٰذا انہی ناموں سے اس کو پکارو۔''

اور فقہ حنفی کی مشہور اور مستند کتاب " فتاویٰ عالمگیری: ۵/۲۸۰ " میں ہے:

'' القدوری (ابو الحسن احمد بن محمد بن جعفر بن حمدان الفقیہ) نے اپنی عظیم کتاب " شرح الکرخی ، باب الکراھة " میں لکھا ہے: ''بشر بن الولید نے کہا: ہم کو ابو یوسف نے خبر دی کہ ابوحنیفہ نے کہا: کسی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اللہ کو اس کے سوا کسی اور کے ذریعہ سے پکارے اور میں دعا کرنے والے کے لیے یہ بات ناپسند کرتا ہوں کہ وہ کہے: تیرے عرش کے مقام عزت کے ذریعہ یا تیری مخلوق کے واسطہ سے تجھ سے سوال کرتا ہوں، یہ ابو یوسف کا قول ہے۔ ابو یوسف کہتے ہیں: ((مَعقد العز من عرشِه هو الله)) اس کے عرش کا مقامِ عزت ہی اللہ ہے۔ اس لیے اس کو وسیلہ اور واسطہ بنانے کو میں مکروہ نہیں سمجھتا۔ البتہ اس بات کو مکروہ سمجھتا ہوں کہ کوئی یہ کہے: فلاں کے حق، یا تیرے انبیاء اور رسولوں کے حق، یا البیت الحرام کے حق اور المشعر الحرام کے حق کے ذریعہ یا واسطہ سے تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ القدوری فرماتے ہیں: اللہ کی مخلوق کے ذریعہ سے اللہ سے سوال کرنا (المسألة بِخلقه) جائز نہیں ہے کیونکہ خالق پر مخلوق کا کوئی حق نہیں ہے۔''

اس ضمنی بحث میں اتنی تفصیل کافی ہے ورنہ یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ تمام جلیل القدر ائمہ فقہ رحمہم اللہ غیر اللہ کو وسیلہ بنانے کو حرام اور ناجائز مانتے تھے اور اس مسئلے میں ان کا عقیدہ وہی تھا جو ائمہ حدیث کا عقیدہ تھا اور تا ہنوز ہے۔ [بحواله التوسل ، انواعه وأحكامُهُ للمحدّث الالبانیؒ ، ص: ۴۷،۴۶]

۱۵ ...... ((لِكُلِّ شَيْءٍ أُسٌّ ، وَأُسُّ الإِيْمَانِ الْوَرَعُ ، وَلِكُلِّ شَيْءٍ فَرْعٌ وَفَرْعُ الإِيْمَانِ الصَّبْرُ وَلِكُلِّ شَيْءٍ سِنَامٌ وَسِنَامُ هٰذِهِ الأُمَّةِ عَمِّي الْعَبَّاسُ وَلِكُلِّ شَيْءٍ سِبْطٌ وَسِبْطُ هٰذِهِ الأُمَّةِ حَبِيْبَايَ الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ ، وَلِكُلِّ شَيْءٍ جَنَاحٌ وَجَنَاحُ هٰذِهِ الأُمَّةِ أَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ وَلِكُلِّ شَيْءٍ مِجَنٌّ وَمِجَنُّ هٰذِهِ الأُمَّةِ عَلِيُّ ابْنُ أَبِي طَالِبٍ))

''ہر چیز کی ایک بنیاد ہوتی ہے اور ایمان کی بنیاد پرہیز گاری ہے۔ اور ہر چیز کی ایک شاخ ہوتی ہے اور ایمان کی شاخ صبر ہے، اور ہر چیز کی ایک چوٹی اور بلندی ہوتی ہے اور اس امت کی چوٹی میرے چچا عباس ہیں اور ہر چیز کے نواسے ہوتے ہیں اور اس امت کے نواسے میرے دونوں پیارے حسن اور حسین ہیں اور ہر چیز کا باز د ہوتا ہے اور اس امت کا باز ابوبکر اور عمر ہیں اور ہر چیز کے لیے ایک ڈھال ہوتی ہے اور اس امت کی ڈھال علی بن ابی طالب ہیں۔''

یہ موضوع روایت ہے نبی ﷺ کا ارشادِ مبارک نہیں ہے۔ اس کی تخریج حافظ ابوالقاسم علی بن حسن بن عساکر نے'' تاریخ دمشق : ۸/ ۱۷۴ '' میں، حافظ ابوبکر الخطیب البغدادی کے طریقے سے اور الخطیب البغدادی نے'' تاریخ بعداد ''میں اس کو اس سے سند سے نقل کیا ہے:

''ابراہیم بن الحکم بن ظهیر اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، وہ عطاء بن ابی رباح سے اور وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔''

الخطب البغدادی نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''الحکم بن ظہیر نا قابل اعتبار ہے۔''

حافظ صالح جزرہ اس کے بارے میں کہتے ہیں:

''الحکم بن ظہیر حدیثیں وضع کرتا تھا۔''

امام بخاری نے ابن ظہیر کو متروک قرار دیا ہے۔

یحییٰ بن معین فرماتے ہیں:

''الحکم بن ظہیر کذاب تھا۔''

محدث عصر علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''الحکم بن ظہیر کا بیٹا ابراہیم اپنے باپ سے بہتر نہیں تھا، امام ابوحاتم نے اس کو کذاب قرار دیا ہے۔''

حافظ سیوطی نے یہ موضوع حدیث'' ذیل الموضوعات ، ص: ۵۳ '' میں نقل کی ہے اور ابن عراق نے ''تنزیه الشریعة: ۲/ ۱۲۲ '' میں۔

[بحواله سلسلة الأحاديث الضعيفه : ٤/ ٣٨٥ ، ٣٨٦]

١٦ ...... ((حب الوَطَنِ مِنَ الإِيْمَانِ))

''وطن کی محبت ایمان کا ایک حصہ ہے۔''

موضوع ہے۔رسول اکرم ﷺ کا ارشادِ مبارک نہیں ہے۔

محدّث علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''شرعی حیثیت سے اس موضوع حدیث کا مفہوم صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ وطن کی محبت اپنے آپ سے محبت کرنے یا مال کی محبت کے قبیل سے ہے، جس کا تعلق انسان کی طبیعت سے ہے اور اس طرح کی چیزوں سے محبت کی بنیاد پر انسان مدح وستائش کا مستحق نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ یہ لوازم ایمان سے تعلق نہیں رکھتی، بلکہ اس محبت میں مومن وکافر برابر ہیں۔''

[الضعيفة: ١/ ١١٠]

١٧ ...... ((حَسَنَاتُ الأبْرَارِ سَيِّئَاتِ المقربِينَ))

''نیکوکاروں کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں۔''

یہ ایک باطل اور بے بنیاد قول ہے جس کی کوئی موضوع سند بھی نہیں ہے۔امام غزالی نے '' اِحیاء العلوم: ۴/ ۴۴ '' میں اس کو ((قَالَ القَائِل الصّادق)) ''ایک سچ کہنے والے نے کہا ہے'' کے تحت نقل کیا ہے۔

علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ '' الضعيفة: ١/ ٢١٦ '' میں فرماتے ہیں:

''لگتا ہے کہ امام غزالی نے یہ قول حدیث کے طور پر نقل نہیں کیا ہے اسی وجہ سے حافظ زین الدین عراقی نے اس کی تخریج بھی نہیں کی ہے، بلکہ اس کو ابوسعید الخراز الصوفی کے قول کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔اور امام ابوالفرج ابن الجوزی نے انہی ابوسعید الخراز الصوفی کے حوالہ سے '' صفوة الصفوة: ٢/ ١٣٠ '' میں اور حافظ ابن عساکر نے '' تاریخ دمشق '' میں ابو سعید الخراز الصوفی کے ''ترجمہ'' کے ضمن میں اسے نقل کیا ہے، جیسا کہ '' کشف الخفاء و مزيل الالباس: ١/ ٣٥٢ '' میں صراحت ہے۔'' حافظ ابن عساکر نے یہ عبارت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

((وَعَدَّهُ بَعْضُهُمْ حَدِيثًا وَلَيْسَ كَذٰلِكَ))

''بعض علماء نے اس کو حدیث شمار کیا ہے لیکن یہ حدیث نہیں ہے۔''

علامہ ناصر الدین البانی آگے لکھتے ہیں:

''یہ قول اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ جو نیکی ہے وہ کبھی برائی نہیں بن سکتی قطع نظر اس کے کہ اس کا کرنے والا کون ہے۔ اعمال کے درجات تو مسلم ہیں، مگر کسی کی نیکی دوسرے کے لیے برائی بن جائے ایک غیر معقول چیز ہے۔''

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے '' مجموع الفتاوی: ۸/ ۳۸۳ '' میں اس قول کے بارے میں لکھا ہے:

''یہ کسی ایسے شخص سے منقول نہیں ہے جس کا قول دلیل ہو؛ نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور نہ امت کے اسلاف اور ائمہ سے بلکہ یہ کسی عام آدمی کا قول ہے جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے اور اس کو فاسد معنی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔''

۱۸ ...... ((الدِّيْنُ هُوَ الْعَقْلُ ، وَمَنْ لَا دِيْنَ لَهُ ، لَا عَقْلَ لَهُ))

''دین ہی عقل ہے، اور جس کا کوئی دین نہیں ہے اس کو عقل بھی نہیں ہے۔''

یہ ایک باطل اور بے اصل روایت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک نہیں ہے۔

اس کی تخریج امام ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائی نے '' الکنی '' میں اور انہی کے واسطہ سے حافظ ابو بشر محمد بن احمد الدولابی نے '' الکنی والاسماء: ۲/ ۱۰۴ '' میں اس سند سے کی ہے:

''ابو مالک بشر بن غالب بن بشر بن غالب سے روایت ہے انہوں نے زہری سے روایت کی، انہوں نے مجمع بن جاریہ سے اور انہوں نے اپنے چچا سے مرفوعاً روایت کی۔''

الدولابی کی سند میں پہلا جملہ ((الدین ھو العقل)) نہیں ہے۔ امام نسائی نے لکھا ہے:

((هٰذَا حَدِيْثٌ بَاطِلٌ مُنْكَرٌ)) ''یہ باطل اور منکر حدیث ہے۔''

محدّث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں '' الضعیفة : ۱/ ۵۳ '' اس حدیث کی آفت بشر ہے، کیونکہ وہ مجہول الحال ہے جیسا کہ حافظ ابو الفتح محمد ابن الحسین الازدی نے صراحت کی ہے اور امام ابو عبداللہ محمد بن احمد الذہبی نے ''میزان الاعتدال '' میں اور حافظ ابن حجر العسقلانی نے ''لسان المیزان '' میں ان کی اس بات کی توثیق کی ہے۔

اور امام حارث بن ابی اُسامہ نے اپنی '' مسند ،ق ، ص: ۱۱۰ '' میں اور ''زوائد المسند : ۱/ ۱۰۴ '' میں داؤد بن المُحَبّر کی سند سے عقل کی فضیلت میں تیس ۳۰ سے زیادہ حدیثیں نقل کی ہیں، جن کو حافظ ابن حجر نے ''موضوع'' قرار دیا ہے، انہی میں سے ایک یہ زیر بحث باطل حدیث بھی ہے، جیسا کہ حافظ سیوطی نے '' ذیل اللآلی المصنوعة فی الأحادیث الموضوعة ، ص: ۱۰۴ '' میں صراحت کی

ہے۔ اور انہی کے حوالہ سے علامہ محمد طاہر الفتنی الہندی نے " تذکرة الموضوعات ، ص: ۲۹، ۳۰ " میں اسے نقل کیا ہے۔

یاد رہے کہ عقل کے فضائل سے متعلق کوئی بھی حدیث صحیح نہیں ہے ، جیسا کہ علاوہ ابن القیم نے "المنار: ۲۵" میں لکھا ہے:

۱۹ ...... ((بَكَى شُعَيْبٌ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ حُبِّ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ حَتّٰى عَمِيَ ، فَرَدَّ اللّٰهُ اِلَيْهِ بَصَرَهُ وَأَوْحَى اِلَيْهِ : يَا شُعَيْبُ! مَاهٰذَا الْبُكَاءُ؟ أَشَوْقًا اِلَى الْجَنَّةِ أم خَوْفًا مِنَ النَّارِ؟ قَالَ: إِلٰهِيْ وَسَيِّدِيْ! اَنْتَ تَعْلَمُ مَا اَبْكِيْ شَوْقًا اِلَى جَنَّتِكَ وَلَا خَوْفًا مِنَ النَّارِ وَلٰكِنْ اِعْتَقَدْتُ حُبَّكَ بِقَلْبِيْ ، فَاِذَا نَظَرْتُ اِلَيْكَ فَمَا اُبَالِيْ مَا الَّذِيْ صُنِعَ بِيْ ، فَاَوْحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلَيْهِ: يَا شُعَيْبُ! اِنْ يَكُ ذٰلِكَ حَقًّافَهَنِيْئًا لَكَ يَا شُعَيْبُ وَلِذَالِكَ اَخْدَمْتُكَ مُوْسَى بْنَ عِمْرَانَ كَلِيْمِيْ))

" نبی شعیب علیہ السلام اللہ عز وجل کی محبت میں اس قدر روئے کہ اندھے ہو گئے ، پس اللہ نے انہیں ان کی بینائی واپس کر دی اور ان کو بذریعہ وحی مخاطب بنا کر فرمایا: اے شعیب! یہ گریہ وزاری کیا ہے؟ آیا جنت کے شوق میں یا جہنم کے خوف سے؟ عرض کیا: اے میرے معبود اور میرے آقا! آپ کو تو یہ معلوم ہے کہ میں آپ کی جنت کے شوق اور جہنم کے خوف سے نہیں رو رہا ہوں ، بلکہ میں نے آپ کی محبت کو اپنے دل میں مضبوطی سے بسالیا ہے اور جب میں آپ کی طرف نظر کرتا ہوں تو پھر مجھے اس کوئی پروا نہیں ہوتی کہ میرے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے گا۔ اس پر اللہ عز وجل نے ان کو وحی کی اور فرمایا: اے شعیب! اگر یہ سچ ہے تو پھر تمہیں میری ملاقات مبارک ہو۔ اے شعیب! تمہاری اسی محبت کی وجہ سے میں نے اپنے ہم کلام موسیٰ بن عمران سے تمہاری خدمت کرائی۔"

سند کے اعتبار سے یہ بیحد ضعیف اور کمزور اور متن کے اعتبار سے منکر روایت ہے۔

اس کی تخریج حافظ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت المعروف بالخطیب البغدادی نے " تاریخ بغداد: ۳۱۵/۶ " میں اس سند سے کی ہے:

" ہم کو ابوسعد نے اپنے حافظہ سے خبر دی ، کہا: مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا ، کہا: ہم سے ابو عبداللہ محمد بن اسحاق الرملی نے بیان کیا ، کہا: ہم سے ابوالولید ہشام بن عمار نے بیان کیا ، کہا: ہم

سے اسماعیل بن عیاش نے بجیر بن سعید کے واسطہ سے انہوں نے خالد بن معدان سے اور انہوں شداد بن اوس سے روایت کرتے ہوئے مرفوعاً بیان کیا۔''

حافظ الخطیب البغدادی نے یہ حدیث ابوسعد مذکور کے ترجمے کے ضمن میں نقل کی ہے اور اس کا نام اسماعیل بن علی بن الحسن بن بندار الواعظ الأستراباذی لکھا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے:

''وہ ہمارے پاس بغداد میں، حج پر جاتے ہوئے آیا، جہاں میں نے اس سے ایک ایسی منسد حدیث سنی جو منکر تھی۔ وہ روایت حدیث میں قابل اعتماد نہیں تھا۔ الخطیب البغدادی نے ابوسعد کی عدم ثقاہت کی دلیل کے طور پر یہ زیر بحث حدیث پیش کی۔''

یہی حدیث حافظ ابوالقاسم علی بن الحسن ابن عساکر نے ''تاریخ دمشق'' میں الخطیب البغدادی کے طریقے سے روایت کی ہے، اس کے بعد لکھا ہے:

''اس کی روایت الواحدی نے ابوالفتح محمد بن علی الکوفی سے، انہوں نے علی بن الحسن بن بندار سے کی ہے، جس طرح اس کی روایت ان کے بیٹے اسماعیل نے ان سے کی ہے، لہٰذا اسماعیل اس جھوٹی روایت کی ذمہ داری سے بری الذمہ ہوگیا۔

حافظ ابن عساکر کی اس وضاحت کے بعد اس حدیث کی روایت کا ملزم تنہا اسماعیل کا باپ علی بن الحسن قرار پاتا ہے جس کو امام ذہبی کے بقول امام حافظ محمد بن محمود بن النجار نے ضعیف لکھا ہے۔

اور ابومحمد عبدالعزیز بن محمد النخشبی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

''اس نے جارود سے جو یونس بن عبدالاعلی اور ان کے طبقہ کے لوگوں سے روایت کیا کرتا تھا، روایت کی ہے پھر علی بن الحسن نے اس کی روایت ''عن الجارود عن هشام بن عمار'' سے کردی ہے، اس طرح اس نے اس کے نام سے وہ جھوٹی روایت کردی جس کے ارتکاب کی اس کو جرأت نہیں تھی۔ لہٰذا علی بن الحسن سے حدیث کی روایت صرف اظہار تعجب کی غرض سے جائز ہے۔''

رہا سند کا دوسرا راوی، محمد بن اسحاق الرملی تو وہ غیر معروف ہے اور صرف اسی سند میں اس کا ذکر آیا ہے اور حافظ ابن عساکر نے اس کے ''ترجمہ: ۱۵/۳۵'' میں ایک دوسری حدیث ہشام بن عمار کے واسطہ سے نقل کی ہے، لیکن اس کی جرح و تعدیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے، لہٰذا وہ مجہول الحال ہے۔

اب رہا اس حدیث کا متن خاص طور پر اس کا یہ فقرہ ((مَا أبكي شَوقًا إلَى جَنَّتِكَ وَلَا خَوفًا

مِنَ النَّارِ)) تو اس پر من گھڑت ''صوفیانہ عشقِ الٰہی'' کی گہری چھاپ نظر آتی ہے، جو مشہور صوفی خاتون ''رابعہ عدویہ'' کی طرف منسوب ہے۔ چنانچہ تصوف کی کتابوں میں ان کی مناجات کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے:

((رَبِّ! مَا عَبَدْتُكَ طَمَعًا فِيْ جَنَّتِكَ وَلَا خَوْفًا مِنْ نَارِكَ))

''میرے پروردگار! میں نے تیری عبادت تیری جنت کی خواہش اور تیری جہنم کے خوف سے نہیں کی ہے۔''

حالانکہ اس طرح کا کلام اس شخص کی زبان سے جاری ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت سے محروم ہے اور اس کی عظمت و جلال کا احساس نہیں رکھتا اور نہ اس کی بخشش و کرم کا اس کو یقین ہے ورنہ وہ اس کی عبادت، اس کے پاس دائمی نعمتوں کی طمع اور خواہش میں کرتا، کیونکہ کتاب و سنت میں اللہ کے صالح بندوں کی جو صفات بیان ہوئی ہیں، ان میں بے شمار موقعوں پر جنت کی طلب اور جہنم سے نجات کی التجاؤں کا تذکرہ ملتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی کتاب عزیز میں اہل ایمان کو حصول جنت کے لیے کوشش کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَسَارِعُوْا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿132﴾ ﴾ [آل عمران: ۱۳۳]

''اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کے حصول کے لیے دوڑو جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اور جو اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ''سورۃ الفرقان'' میں اپنے مؤمن اور صالح بندوں کی جو صفات بیان فرمائی ہیں ان میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان کو جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ○ ﴾

''اور وہ لوگ جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھ بیشک اس کا عذاب چمٹ جانے والا ہے۔''

اور صحیح احادیث میں بھی یہ مضمون بڑی کثرت سے بیان ہوا ہے اور بعض ماثور دعاؤں میں جہنم سے پناہ مانگنے کا خصوصیت سے ذکر ہے۔

اس ناقابل اعتبار حدیث کے متن کی ایک نکارت یہ بھی ہے کہ اس میں مدین کے ان صالح بزرگ کو حضرت شعیب علیہ السلام قرار دیا گیا ہے جن کے یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اترے تھے اور ان کی بیٹی سے عقد نکاح کے بدلے ان کی آٹھ سال خدمت کی تھی، جبکہ قرآن پاک یا صحیح احادیث میں ان بزرگ کے نام کی صراحت نہیں کی گئی ہے اور فی الواقع وہ حضرت شعیب علیہ السلام ہو بھی نہیں سکتے، اگرچہ بعض مفسرین نے ان کو حضرت شعیب علیہ السلام ہی لکھا ہے، جس کی دلیل ان کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کا تعلق مدین سے تھا، ورنہ ایسے متعدد اسباب ہیں جو ان کے حضرت شعیب علیہ السلام ہونے سے انکار کرتے ہیں، جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہ صرف یہ کہ مطلوب ہے بلکہ ایمان کی جان ہے، مگر یہ محبت صوفیا کے عشق الٰہی سے قطعاً مختلف ہے۔ اسلام میں اللہ اور رسول سے جو محبت مطلوب ہے وہ عقائدی، ایمانی اور عقلی محبت ہے، جبکہ عشق الٰہی خیالی اور جذباتی محبت ہے، جس کا ماً خذ اسلام نہیں بلکہ ہندوازم، بدھ ازم اور عیسائیت ہے۔ اور تصوف کا نظریاتی ڈھانچہ اور عملی طریقہ بڑی حد تک انہی تینوں مذاہب کی تعلیمات پر مبنی ہے۔

۲۰ ...... ((الأَبْدَالُ فِي هٰذِهِ الأُمَّةِ ثَلَاثُوْنَ ، مِثْلُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيْلِ الرَّحْمٰنِ عَزَّوَجَلَّ كُلَّمَا مَاتَ رَجُلٌ أَبْدَلَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى مَكَانَهُ رَجُلًا))

''اس امت میں ابدال تیس ۳۰ ہیں، جو ابراہیم خلیل الرحمٰن عزوجل کے مانند ہیں جب جب ان میں سے کوئی آدمی مرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی پیدا کر دیتا ہے۔''

یہ ایک منکر حدیث ہے، جس کی روایت امام احمد نے '' مسند : ۵/ ۳۲۲ '' میں الہیثم بن کلیب نے اپنی '' مسند : ۱/ ۱۵۹ '' میں، حافظ ابو محمد الحسن بن محمد الخلال نے '' کرامات الاولیاء ، ق: ۱/ ۲ '' میں، حافظ ابو نعیم احمد بن عبداللہ الصوفی نے '' اخبار اَصبهان : ۱/ ۱۸۰ '' میں اور انہی کے واسطہ سے حافظ ابوالقاسم علی بن الحسن بن هبة اللہ ابن عساکر نے '' تاریخ دمشق : ۱/ ٦٧ '' میں اس سند سے کی ہے:

''الحسن بن ذکوان سے روایت ہے، وہ عبدالواحد بن قیس سے روایت کرتے ہیں اور انہوں نے حضرت عبادہ بن الصامت سے مرفوعاً روایت کی ہے۔''

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد امام احمد نے لکھا ہے:

((هُوَ حَدِيْثٌ مُنْكَرٌ))

''یہ ایک منکر حدیث ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی '' السلسلة الضعيفة: ۲/ ۳۴۰ '' میں لکھتے ہیں۔

اس حدیث کی نکارت کی دو علتیں ہیں:

① عبدالواحد بن قیس کی ''عدالت'' مختلف فیہ ہے؛ ایک روایت میں ابن معین اور ابوزرعہ نے اس کی توثیق کی ہے۔ مگر ایک دوسری روایت میں انہی ابن معین نے یہ صراحت کی ہے کہ وہ ثقہ نہیں تھا، بلکہ ثقاہت کے قریب بھی نہیں تھا، امام ابوحاتم نے اس کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''وہ قوی نہیں تھا'' اس رائے کا اظہار صالح بن محمد البغدادی نے بھی کیا ہے اور اس پر اتنا اضافہ بھی کر دیا ہے: ''اس نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔'' حالانکہ اس نے ان سے حدیثیں نہیں سنی ہیں۔

امام ذہبی فرماتے ہیں:

''عبدالواحد بن قیس کی ابوہریرہ سے ملاقات ثابت نہیں ہے، اس لیے ان سے اس کی روایت مرسل ہے، البتہ اس نے عروہ اور نافع کا زمانہ پایا ہے۔''

یہ تفصیلات بیان کرنے کے بعد محدث البانی فرماتے ہیں:

''اس طرح حضرت عبادہ بن الصامت سے بھی اس کی ملاقات ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ سند ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ منقطع بھی ہے۔''

② اس منکر حدیث کی سند کا دوسرا راوی، الحسن بن ذکوان بھی اپنی ''عدالت'' اور ''ثقاہت'' میں مختلف فیہ ہے؛ جمہور محدثین نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

امام احمد نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

''اس کی روایت کردہ حدیثیں باطل ہیں۔''

امام ابن معین فرماتے ہیں:

''وہ صاحب مصائب تھا۔''

حافظ ابن حجر نے '' تقريب التهذيب '' میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

''سچا تھا، لیکن غلطیاں کرتا تھا اور مدلس تھا۔''

مذکورہ حدیث حضرت عبادہ بن الصامت سے ان الفاظ میں بھی مروی ہے:

۲۱ ...... ((لَا يَزَالُ فِي أُمَّتِي ثَلَاثُونَ ، بِهِمْ تَقُوْمُ الْأَرْضُ وَبِهِمْ تُمطَرُوْنَ وَبِهِمْ

تَنْصَرُوْنَ))

’’میری امت میں ہمیشہ تیس افراد ایسے رہیں گے جن کے ذریعہ زمین قائم رہے گی انہی کے ذریعہ تم پر بارش ہوگی اور انہی کی بدولت تم کو فتح و نصرت حاصل ہوگی۔‘‘

یہ بھی ضعیف اور نا قابل اعتبار ہے۔

حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الھیثمی نے ’’مجمع الزوائد: ۱۰/ ۶۳‘‘ میں لکھا ہے:

’’اس کی روایت الطبرانی نے ’’عمرو البزار عن عَنبَسة الخواص‘‘ کی سند سے کی ہے۔ میں ان دونوں راویوں کو نہیں جانتا، بقیہ راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں۔‘‘

یہی حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں بھی مروی ہے:

۲۲ ...... ((إِنَّ الْأَبْدَالَ بِالشَّامِ یَکُوْنُوْنَ ، وَهُمْ أَرْبَعُوْنَ رَجُلًا ، بِهِمْ تُسْقَوْنَ الْغَیْثَ وَبِهِمْ تُنْصَرُوْنَ عَلَى أَعْدَائِكُمْ ، وَیُصْرَفُ عَنْ أَهْلِ الْأَرْضِ الْبَلَاءُ وَالْغَرَقُ))

’’بیشک ابدال شام میں ہوں گے، وہ چالیس مرد ہیں۔ انہی کے ذریعہ تمہیں بارش سے سیراب کیا جاتا ہے، انہی کے ذریعہ تم کو تمہارے دشمنوں پر فتح حاصل ہوتی ہے اور انہی کی وجہ سے اہل زمین سے مصائب اور غرقابی کے حوادث دور کیے جاتے ہیں۔‘‘

اس کی تخریج حافظ ابن عساکر نے ’’تاریخ دمشق: ۱/ ۶۲‘‘ میں کی ہے اور لکھا ہے:

’’اس کی سند شریح بن عبید الحضرمی اور حضرت علی کے درمیان منقطع ہے، کیونکہ شریح کی حضرت

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ان الفاظ میں بھی ملتی ہے:

((الأَبْدَالُ یَکُوْنُوْنَ بِالشَّامِ وَهُمْ أَرْبَعُوْنَ رَجُلًا ، کَلَّمَا مَاتَ رَجُلٌ أَبْدَلَ اللّٰهُ مَکَانَهُ رَجُلًا یُسْقَى بِهِمُ الْغَیْثُ وَیُنْتَصَرُ بِهِمْ عَلَى الْأَعْدَاءِ ، وَیُصْرَفُ عَنْ أَهْلِ الشَّامِ بِهِمُ الْعَذَابُ)) [1]

’’ابدال شام میں ہوں گے، وہ چالیس مرد ہیں، جب بھی ان میں سے کوئی مرد مرے گا تو اللہ اس کی جگہ دوسرا مرد پیدا کر دے گا، انہی کے ذریعہ مینہ برستا ہے، انہی کے ذریعہ دشمنوں پر فتح حاصل ہوتی ہے اور انہی کے ذریعہ اہل شام سے عذاب دور کیا جاتا ہے۔

[1] مشکوٰۃ المصابیح، ح: ٦٢٧٧.

۲۳...... ((خِيَارُ أُمَّتِي فِي كُلِّ قَرْنٍ خَمْسَمِائَةٍ ، وَالأَبْدَالُ أَرْبَعُونَ ، فَلَا الْخَمْسَمِائَةَ يَنْقُصُونَ وَلَا الْأَرْبَعُونَ ، كُلَّمَامَاتَ رَجُلٌ أَبْدَلَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ مِنَ الْخَمْسَ مِائَةِ مَكَانَهُ وَأُدْخِلَ مِنَ الْأَرْبَعِينَ مَكَانَهُ ، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ! دُلَّنَا عَلَى أَعْمَالِهِمْ ، قَالَ: يَعْفُونَ عَمَّنْ ظَلَمَهُمْ ، وَيُحْسِنُونَ إِلَى مَنْ أَسَا إِلَيْهِمْ ، وَيَتَوَاسَوْنَ فِيمَا آتَاهُمُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ))

''میری امت میں، بہترین لوگوں کی تعداد ہر صدی میں پانچ سو رہے گی، جن میں سے چالیس ابدال ہوں گے، نہ تو پانچ سو میں کمی ہوگی اور نہ چالیس میں، جب بھی ان میں سے کوئی آدمی مرے گا تو اللہ عزوجل پانچ سو میں سے اس کی جگہ دوسرا آدمی پیدا کردے گا اور چالیس میں سے بھی۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہمیں ان کے اعمال کے بارے میں بتادیجئے۔ فرمایا: وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والوں کو معاف کردیں گے، اپنے ساتھ برا برتاؤ کرنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کریں گے اور اللہ عزوجل ان کو جو رزق عطا فرمائے گا اس میں وہ لوگوں کی غم خواری کریں گے۔''

یہ حدیث موضوع ہے، جس کی تخریج حافظ ابونعیم نے '' **حلیة الأولیاء: ۱/۸** '' میں الطبرانی کے طریقے سے کی ہے اور ان کے حوالہ سے امام ابوالفرج ابن الجوزی نے اسے '' **الموضوعات : ۱۵۱/۳** '' میں، سعید بن ابی زیدون کی روایت سے نقل کیا ہے:

''ہم سے عبداللہ بن ہارون الصوری نے بیان کیا، کہا: ہم سے اوزاعی نے الزہری کے واسطہ سے، انہوں نے نافع سے اور انہوں نے ابن عمر سے مرفوعاً بیان کیا۔''

یہ سند تاریک ہے؛ سعید بن ابی زیدون اور عبداللہ بن ہارون غیر معروف ہیں۔ عبداللہ بن ہارون کا ذکر امام ذہبی نے '' **میزان الاعتدال** '' میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''اوزاعی سے روایت کے باب میں وہ غیر معروف ہے، اور ابدال کے اخلاق کے بارے میں یہ حدیث جھوٹ ہے۔''

حافظ ابن حجر نے '' **لسان المیزان** '' میں امام ذہبی کی توثیق کی ہے۔

ابدال کے موضوع پر، اولیاء اللہ کے فضائل و مناقب کے بیان میں اور بہت سی روایات کتابوں میں ملتی ہیں۔ اور صوفیا کے حلقوں میں زبان زد ہیں، جن میں سے کوئی بھی حدیث صحیح نہیں ہے، بلکہ سب کی سب

یا تو موضوع ہیں یا منکر یا بیحد ضعیف اور اپنے متن اور مضمون کے اعتبار سے اسلام کے عقیدۂ توحید سے متعارض ہیں۔ کیونکہ ان کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ یہ کائنات میں صاحب ''تصرف'' ہیں اور عالم کے انتظام وانصرام میں ان کا عمل دخل بھی ہے۔ اس لیے ان کو وسیلہ بنائے، ان کو پکارنے اور ان سے استعانت کو مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ ابدال عالم کے انتظام وانصرام کی غرض سے مختلف جگہوں پر متعین کردیے گئے ہیں۔ جس کی بنیاد وہ موضوع حدیث ہے جس کے الفاظ ہیں:

((الْبُدَلَاءُ اَرْبَعُوْنَ ، اِثْنَانِ وَعِشْرُوْنَ بِالشَّامِ ، وَثَمَانِيَةَ عَشَرَ بِالعِدَانِ ، كُلَّمَامَاتَ وَاحِدٌ مِنْهُمْ ، بَدَّلَ اللّٰهُ مَكَانَهُ آخَرَ ، فَإِذَا جَاءَ الْأَمْرُ قُبِضُوْا كُلُّهُمْ))

''بدلاء چالیس ہیں، ۲۲ شام میں اور ۱۸ عراق میں جب بھی ان میں سے کوئی مرجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے دوسرا پیدا کردیتا ہے، جب قیامت آئے گی تو ان سب کی روحیں قبض کرلی جائیں گی۔''

یہ مشہور وضاع حدیث اور کذاب ''العلاء بن زیدک'' کی پھیلائی ہوئی ہے۔ موضوع روایت ہے نبی ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ تصوف کی کتابوں میں ''اولیاء اللہ کی قسموں'' کے تحت ابدال، ابرار، اخیار، اقطاب، امامین، اوتاد، عمد، غوث، معفرداں، مکتوماں، نجباء اور نقباء کے جو نام ملتے ہیں۔ ان کا ماخذ کتاب وسنت نہیں ہے، بلکہ یہ نام خود صوفیا کے گھڑے ہوئے ہیں۔ اور اگر ان کی کوئی بنیاد ہے تو وہ شیعہ کا ''نظریہ نقباء'' ہے۔ چنانچہ صوفیا کے خود ساختہ اور من گھڑت ''اولیاء اللہ'' کی تعداد بھی ۱۲ ہے اور شیعوں کے ''نقباء'' کی تعداد بھی ۱۲ اور ان کے بارے میں دونوں کا یہ عقیدہ ہے کہ نعوذ باللہ ان کو ''ملکوت اللہ'' میں کچھ اختیارات حاصل ہیں اور کائنات کے انتظام وانصرام میں وہ بھی کچھ عمل دخل رکھتے ہیں۔ البتہ صوفیا اور شیعہ کے عقیدے میں یہ فرق ہے کہ ''نقباء'' کا تعلق اہل بیت سے ہے، جبکہ صوفیا کے ابدال، اقطاب اور اغواث وغیرہ کا اہل بیت سے ہونا ضروری نہیں ہے۔

۲۴...... ((عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: حَجَّ بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَجَّةَ الْوَدَاعِ فَمَرَّ بِيْ عَقَبَةَ الْحَجُوْنِ وَهُوَ بَاكٍ حَزِيْنٌ مُغْتَمٌّ ، فَبَكَيْتُ لِبُكَاءِ رَسُوْلِ ﷺ ، ثُمَّ إِنَّهُ نَزَلَ ، فَقَالَ : يَا حُمَيْرَاءُ! إِسْتَمْسِكِيْ ، فَاسْتَنَدْتُ إِلَى جَنْبِ الْبَعِيْرِ ، فَمَكَثَ عَنِّيْ طَوِيْلًا ، ثُمَّ إِنَّهُ عَادَ إِلَيَّ وَهُوَ فَرِحٌ مُبْتَسِمٌ ، فَقُلْتُ بِأَبِيْ وَأُمِّيْ يَا رَسُوْلَ

اللّٰهِ! نَزَلْتَ مِنْ عِنْدِي وَأَنْتَ بَاكٍ حَزِينٌ مُغْتَمٌّ ، فَبَكَيْتُ لِبُكَائِكَ ، ثُمَّ إِنَّكَ عُدْتَ إِلَيَّ وَأَنْتَ فَرِحٌ مُبْتَسِمٌ فَمِمَّ ذَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ذَهَبْتُ لِقَبْرِ أُمِّي ، فَسَأَلْتُ اللّٰهَ أَنْ يُحْيِيَهَا لِي ، فَأَحْيَاهَا فَآمَنَتْ بِي وَرَدَّهَا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ))

[اللآلي المصنوعة في الأحاديث الموضوعة: ١/ ٢٤٤، ٢٤٥]

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ حج وداع کیا اور وہ مجھے لے کر الحجون کی گھاٹی سے گذرے اس حالت میں کہ آپ پر گریہ طاری تھا اور آپ رنجیدہ اور غم زدہ تھے۔ پس آپ کے رونے کی وجہ سے میں بھی رو پڑی۔ پھر آپ سواری سے اتر گئے۔ اور فرمایا: حمیراء! رکو۔ چنانچہ میں اونٹ کے پہلو سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کافی دیر تک مجھ سے غائب رہے، پھر میرے پاس اس حال میں واپس تشریف لائے کہ آپ شاداں و فرحاں مسکرا رہے تھے۔ میں نے آپ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ میرے پاس سے روتے ہوئے، رنجیدہ اور غم زدہ حالت میں تشریف لے گئے تھے اور آپ کے رونے کی وجہ سے میں بھی رو پڑی تھی، پھر آپ میرے پاس شاداں و فرحاں اور مسکراتے ہوئے واپس تشریف لائے ہیں۔ اے اللہ کے رسول! اس کا سبب کیا ہے؟ فرمایا: میں اپنی ماں کی قبر پر گیا تھا، میں نے اللہ سے سوال کیا کہ وہ میری خاطر میری ماں کو زندہ کر دے پس اس نے ان کو زندہ کر دیا اور وہ مجھ پر ایمان لائیں۔ اور اللہ نے ان کو دوبارہ موت کی حالت میں واپس کر دیا۔“

یہ ایک موضوع اور من گھڑت واقعہ ہے اور جن طریقوں اور سندوں سے بھی مروی ہے سب میں مجہول الحال، حدیثیں وضع کرنے والے اور ناقابل اعتماد راوی شامل ہیں۔ حافظ سیوطی کے علاوہ اس کی تخریج مرعی بن یوسف الکرمی نے الخطیب البغدادی اور محدث عراق ابو حفص عمر بن احمد ابن شاہین کے حوالہ سے ”الفوائد الموضوعة في الأحاديث الموضوعة، ص: ۳۲۲“ میں کی ہے۔

حافظ ابو الفضل بن ناصر نے اس کو موضوع قرار دیا ہے۔ اس کی سند میں بیک وقت تین راوی: محمد بن زیاد، احمد بن یحییٰ اور محمد بن یحییٰ ناقابل اعتبار ہیں۔ امام دارقطنی نے محمد بن یحییٰ الزہری کو جس کی کنیت ابو غزیہ تھی، حدیثیں وضع کرنے والا لکھا ہے ” الضعفاء والمتروکین، ترجمہ: ۴۸۳، ص: ۲۲۱

”امام ابن حبان نے اس کے بارے میں لکھا ہے: وہ حدیثیں چرا کر ان کو اپنی طرف سے روایت کرتا تھا۔

"الضعفاء: ۲/ ۲۸۹ "، اور اس کا استاذ اور شیخ کثیر ابن عبداللہ المزنی اس سے بھی زیادہ جھوٹا اور دروغ گو تھا۔[الضعیفة للألبانی: ۵/ ۴۹۰]

حافظ سیوطی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ حدیث موضوع نہیں، بلکہ صرف ضعیف ہے۔ لیکن چونکہ وہ تضعیف حدیث میں سہل انگاری سے کام لینے میں مشہور ہیں اور ''صوفی المشرب'' ہیں اس لیے ائمہ حدیث کے اقوال کے مقابلے میں ان کے قول کا کوئی اعتبار نہیں۔

پھر اس حدیث یا واقعہ کا متن بھی باطل ہے؛ صحیح احادیث میں یہ صراحت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی والدہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنے کی اجازت چاہی تو آپ کو اس کی اجازت نہیں دی گئی، البتہ ان کی قبر کی زیارت کی اجازت دی گئی۔

((عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ ، قَالَ : قَالَ النَّبِیُّ ﷺ : اِسْتَأْذَنْتُ رَبِّیْ فِیْ اَنِ اسْتَغْفِرَلَهَا ، فَلَمْ یُؤْذَنْ لِیْ ، وَاسْتَأْذَنْتُهُ فِیْ اَنْ اَزُوْرَ قَبْرَهَا فَاَذِنَ لِیْ ، فَزُوْرُوا الْقُبُوْرَ ، فَاِنَّهَا تُذَکِّرُکُمُ الْمَوْتَ)) [1]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہا: نبی ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے اجازت مانگی کہ ان کے لیے (ماں) استغفار کروں تو مجھے اجازت نہیں دی گئی، اور میں نے اس سے ان کی قبر کی زیارت کی اجازت مانگی تو مجھے اجازت دے دی۔ لہٰذا قبروں کی زیارت کرو، اس لیے کہ وہ تمہیں موت کی یاد دلاتی ہیں۔''

اور جب نبی ﷺ کو اپنی والدہ ماجدہ کے لیے استغفار کی اجازت نہیں دی گئی، تو آپ اللہ تعالیٰ سے خلاف فطرت سوال کس طرح کرتے۔ قرآن پاک میں بکثرت مقامات پر یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ مرنے کے بعد ایمان لانے یا مزید نیکیاں کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی کو دوبارہ زندگی نہیں عطا کرتا۔

۲۵ ...... ((عَنْ عَلِیٍّ: هَبَطَ جِبْرِیْلُ عَلَیَّ ، فَقَالَ: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالَی یَقْرَؤُكَ السَّلَامَ وَیَقُوْلُ: اِنِّیْ حَرَّمْتُ النَّارَ عَلَی صُلْبٍ اَنْزَلَكَ وَبَطْنٍ حَمَلَكَ وَحَجَرٍ كَفَّلَكَ، اَمَّا الصُّلْبُ فَعَبْدُ اللّٰهِ وَاَمَّا الْبَطْنُ فَآمِنَةُ بِنْتَ وَهْبٍ وَاَمَّا الْحَجَرُ فَعَبْدٌ یَعْنِی عَبْدُ الْمُطَّلِبِ وَفَاطِمَةُ بِنْتَ اَسَدٍ)) [اللآلی: ۱/ ۲٤٤]

''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جبریل میرے اوپر اترے اور

---

[1] صحیح مسلم، ح: ۲۲۵۹

کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتا ہے اور فرما رہا ہے: میں نے اس پیٹھ پر جس نے آپ کو اتارا، اس پیٹ پر جس نے آپ کو اٹھایا اور اس پتھر پر جس نے آپ کی کفالت کی، آگ کو حرام کر دیا ہے۔ رہی پیٹھ تو اس سے مراد عبداللہ ہیں اور پیٹ سے مراد آمنہ بنت وہب ہیں اور حجر سے مراد ''عبد'' یعنی عبدالمطلب اور فاطمہ بنت اسد ہیں۔''

حافظ سیوطی کہتے ہیں یہ روایت موضوع ہے، اس کی سند میں ایک سے زیادہ مجہول راوی ہیں۔ اور اس کا بنیادی راوی ابوالحسین یحییٰ بن الحسین العلوی غالی رافضی تھا۔

باب چھارم

عبادات

اذکار و اَوراد:

اللہ تعالیٰ کے ذکر کی کتاب وسنت میں بڑی تاکید آئی ہے۔ ذکر اسلامی زندگی کی جان اور مومن کی پہچان ہے یوں تو اسلام میں جتنی عبادتیں ہیں اُن کا اصل مقصد اللہ کی یاد ہی ہے مگر ان عبادتوں کے بعد بھی مؤمن کے دل کو اللہ کے ذکر سے معمور اور اس کی زبان کو اللہ کی یاد سے تر رہنا چاہیے۔ ذکر سے مومن کا ایمان تازہ ہوتا رہتا ہے اور اس کے دل میں یہ یقین گہرا اور پختہ ہوتا رہتا ہے کہ اللہ ہی اس کا خالق و مالک، روزی رساں اور مربی ہے۔ اسی کے ہاتھ میں اس کی نکیل ہے، اس پوری کائنات میں صرف اسی کا حکم چلتا ہے، وہی مارتا اور جلاتا ہے، اس کے حکم کے بغیر دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اللہ کی اس یاد سے مومن کے دل کو اطمینان وسکون حاصل ہوتا ہے وہ خوشی اور غم دونوں حالتوں میں شاکر وصابر رہتا ہے، کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی مؤمن بے صبر انہیں ہوتا اور نہ دولت وثروت پا کر اتراتا ہے اس لیے کہ اس کو اس بات پر ایمان ہے کہ اس کے پاس جو دولت وثروت ہے اللہ کی عطا کردہ ہے اور اس کے حصول میں نہ تو اس کا کوئی ہاتھ ہے اور نہ وہ اس کا استحاق ہی رکھتا ہے اسی طرح جب مومن پر برا وقت آتا ہے تو وہ ہوش وحواس نہیں کھوتا بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان وآزمائش سمجھ کر خندہ پیشانی سے رنگیز کر لیتا ہے۔

کتاب وسنت میں جہاں ذکرِ الٰہی کی بار بار تاکید کی گئی ہے وہیں معدودے چند اذکار کے علاوہ ذکر کی خاص تعداد، اس کی خاص شکل اور ہیئت اور اس کے لیے مخصوص اوقات کا تعین نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس معاملے کو مؤمن پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اور جتنی تعداد میں چاہے اپنے خالق و مالک کو یاد کرے لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول وفعل کے ذریعہ جن اذکار واوراد اور ان کے اوقات اور ان کی تعداد متعین فرمادی ہے ان کی پابندی تو ضروری ہے مگر ان میں کوئی کمی بیشی کرنا، یا کتاب وسنت میں مذکور اذکار واَوراد کے علاوہ کچھ اور اذکار واوراد متعین کرنا کسی بھی انسان کے لیے روا نہیں ہے بلکہ اس کا شمار بدعت میں ہوگا اور بدعت گمراہی ہے، اس لیے کہ ذکر بھی عبادت ہے اور دوسری اسلامی عبادتوں کی طرح وہ

بھی غیر قیاسی اور غیر اجتہادی امر ہے۔

اسلام کے دوسرے اُمور کی طرح ذکر الٰہی کے باب میں بھی کثرت سے حدیثیں گھڑ کر مسلمانوں میں پھیلائی گئیں اور ان موضوع اور من گھڑت حدیثوں کو اُمت کے اُس طبقے میں خوب پذیرائی ہوئی جنھوں نے تزکیۂ نفس اور تطہیر قلب کے خوبصورت عنوان کے تحت ایسے اذکار واوراد گھڑ لیے جن کا کتاب وسنت میں کوئی ذکر نہیں ہے یا منصوص اذکار واوراد کے ایسے اوقات، ایسی تعداد اور ایسی شکل وہیئت متعین کر دی جس کا نبی اکرم ﷺ کے قول وفعل سے کوئی ثبوت نہیں ملتا اور اپنے متبعین اور پیروؤں کو یہ کہہ کر گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی اور مسلسل کی جا رہی ہے کہ عہدِ نبوی کے بعد اور دوری جہاں نئے اذکار واوراد کی طالب ہے وہیں منصوص اذکار واوراد کی تعداد میں اضافے اور ان کے ''ورد'' کے نئے نئے طریقوں اور شکلوں کی بھی طالب ہے کیونکہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نبی اکرم ﷺ کی صحبت حاصل ہونے اور تابعین وتبع تابعین کو عہدِ نبوی سے قرب کی وجہ سے ان نئے اذکار کی ضرورت تھی نہ ان کے ''ورد'' کے نئے طریقوں کی مگر یہ بات بے حد سنگین اور انتہائی تباہ کُن ہے جس سے بڑھ کر سنگین اور تباہ کُن شاید ہی کوئی بات ہو اس بات کو اگر کھول دیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ دین اگر مکمل تھا تو صرف عہدِ صحابہ تک یا زیادہ سے زیادہ تابعین اور تبع تابعین تک اور رسول اللہ ﷺ کتاب وسنت کی شکل میں ہمیں جو دو ہدایت نامے دے کر اس دنیا سے رُخصت ہوئے ہیں ان کی تعلیمات میں رہ رہ کر کچھ اضافے بھی کرتے رہنے کی ضرورت ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یہ اعلان کر چکا ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾
[المائدہ: ۳]

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے بطور دین کے اسلام کو پسند کر لیا۔''

اور نبی ﷺ نے بھی دوٹوک طریقے سے یہ اعلان فرما دیا:

((تَرَكْتُ فِيكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا مَسَكْتُمْ ۔ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا : كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّه)) ❶

''میں تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اگر تم ان کو مضبوطی سے تھامے رہے تو ہر گز

❶ موطا امام مالک، کتاب القدر، حدیث: ۳

گمراہ نہ ہو گے۔''

اس طرح رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی اعلان فرما دیا:

((مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ۔)) ❶

''جس نے ہمارے اس دین میں وہ بات پیدا کی جو اس میں سے نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔''

ہم یہ بات مسلسل واضح کرتے آ رہے ہیں کہ اسلام میں عبادات اپنی پوری جزوی تفصیلات کے ساتھ مکمل ہیں اور ان میں کوئی بھی کمی یا زیادتی بدعت ہے اور بدعت صریح معصیت سے بھی زیادہ تباہ کن اور مہلک ہے کیونکہ عاصی کو اس بات کا احساس رہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر رہا ہے لہٰذا توقع ہے کہ وہ کسی دن اس سے باز آ جائے گا مگر بدعت کا مرتکب اس عقیدے سے اس کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے کہ وہ عین دینی عمل انجام دے رہا ہے اور اس کو ایک لمحہ کے لیے یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اس عمل سے اللہ کے رسول ﷺ پر یہ الزام لگا رہا ہے کہ آپ نے (نعوذ باللہ) تبلیغ دین میں خیانت کی ہے اور یہ چیز موجب کفر ہے۔

ذیل میں ''ذکر'' سے متعلق قرآن پاک کی کچھ آیات اور پھر چند صحیح احادیث نقل کی جا رہی ہیں جن کی روشنی میں اُن موضوع اور منکر حدیثوں کی نکارت کا اندازہ ہو سکے گا جو اس باب میں فضائل کی کتابوں میں ملتی ہیں اور لوگوں کے اندر زبان زد ہیں:

﴿ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغَافِلِيْنَ ﴿205﴾ ﴾ [الاعراف: ۲۰۵]

''اے نبی! اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے ہلکی آواز میں اور تم اُن لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو میری یاد سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿45﴾ ﴾ [الانفال: ٤٥]

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو اُمید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔''

اور اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی صفات بیان فرماتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [آل عمران: ۱۹۱]

''عقل مند، اہل ایمان، وہ ہیں جو اُٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور وفکر کرتے ہیں۔''

نماز اللہ تعالیٰ کی یاد کا بہترین مظہر ہے اور اقامتِ نماز سے اللہ کی یاد دلوں میں تازہ رہتی ہے۔ فرمایا گیا ہے:

﴿ إِنَّنِيْ اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾ [طه: ۱٤]

''میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔''

اور فضائل ذکر کے بارے میں چند صحیح احادیث ذیل میں نقل کر رہا ہوں جن سے ذکر کی اہمیت کو سمجھا جا سکتا ہے:

((حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ حَفْصٍ : حَدَّثَنَا أَبِيْ : حَدَّثَنَا الْاَعْمَشُ : سَمِعْتُ أَبَا صَالِحٍ ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ ، قَالَ : قَالَ النَّبِيُّ ﷺ : يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ ، وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِيْ ، فَإِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِيْ نَفْسِيْ وَإِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ مَلَاءٍ ذَكَرْتُهُ فِيْ مَلَاءٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ ، وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ بِشِبْرٍ تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعًا ، وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ بَاعًا ، وَإِنْ أَتَانِيْ يَمْشِيْ أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً)) ❶

''ہم سے عمر بن حفص نے بیان کیا، کہا: ہم سے میرے باپ نے بیان کیا، کہا: ہم سے الأعمش نے بیان کیا، کہا: میں نے ابوصالح کو ابوہریرہ سے روایت کرتے ہوئے سُنا، کہا: نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں اپنے بارے میں اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوتا ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے، پس اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے کسی جماعت میں یاد کرتا ہے تو میں اس سے افضل جماعت میں اس کو یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے بالشت بھر قریب ہوتا ہے تو میں اس سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے تو میں اس سے دو ہاتھ

❶ البخاري، ح: ۷۴۰۵، مسلم، ح: ٦٨٠٥

قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ میرے پاس چل کر آتا ہے تو میں اس کے پاس دوڑ کر آتا ہوں۔"

اس عظیم حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کے لیے نفس، تقرب اور آنے وغیرہ کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ بطور تمثیل کے استعمال ہوئے ہیں اور ان کا ظاہری مفہوم نہیں مراد ہے مثال کے طور پر بندے کا اللہ تعالیٰ سے قریب ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس کا مطیع و فرمانبردار ہو، اس کی عبادت کرے اس کی بخشش کا خواہش مند اور اس کے عذاب سے خائف ہو، اور اللہ تعالیٰ کا بندے سے قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بندے پر رحم فرماتا ہے، اس کے گناہوں سے درگذر فرماتا ہے، اس کے صالح اعمال کو قبول فرماتا ہے اور اس کے درجات کو بلند فرماتا ہے۔ مختصر یہ کہ قرآن پاک اور احادیث میں جب بھی اس طرح کی تعبیرات ملیں تو ان کو اس آیت مبارکہ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴾ [الشوریٰ: ۱۱]

"(مخلوقات میں) کوئی بھی چیز اس کی مانند نہیں ہے اور وہ سُننے والا دیکھنے والا ہے۔"

یعنی وہ سنتا ہے لیکن ہماری طرح نہیں، وہ دیکھتا ہے لیکن ہماری طرح نہیں، غرضیکہ اس کا کوئی بھی فعل اور کوئی بھی صفت مخلوق کے فعل اور صفت کی طرح نہیں ہے اس طرح ہم اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے افعال کی اُن غلط تاویلات سے محفوظ رہیں گے جن کا ارتکاب متکلمین نے کیا ہے۔

((حَدَّثَنَا صَدَقَةُ بْنُ الْفَضْلِ : حَدَّثَنَا الْوَلِيْدُ عَنِ الْأَوْزَاعِيِّ قَالَ : حَدَّثَنِيْ عُمَيْرُ ابْنُ هَانِئٍ قَالَ : حَدَّثَنِيْ جُنَادَةُ بْنُ أَبِيْ أُمَيَّةَ ، عَنْ عُبَادَةَ رضي الله عنه ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ شَهِدَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ ، وَأَنَّ عِيْسَى عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِنْهُ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ ، أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلَى مَا كَانَ مِنَ الْعَمَلِ)) [1]

"ہم سے صدقہ بن الفضل نے بیان کیا، کہا: ہم سے الولید نے الاوزاعی سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، کہا: مجھ سے عُمیر بن ہانی نے بیان کیا، کہا: مجھ سے جُنادہ بن ابی امیہ نے عبادہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی ﷺ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس نے اس بات کی گواہی دی کہ اللہ وحدہ لاشریک کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے اور محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور عیسیٰ اللہ کے بندے اور رسول اور اللہ کا وہ حکم ہیں جو اس نے مریم

[1] البخاری، ح: ۳۴۳۵، مسلم، ح: ۱۴۰، ۱۴۱

کی طرف ڈالا اور اس کی روح ہیں اور یہ گواہی دی کہ جنت حق ہے اور جہنم حق ہے تو اللہ اس کو ہر عمل کے باوجود جنت میں داخل کرے گا۔"

مطلب یہ ہے کہ اگر وہ توحید کا اقرار کرنے والا ہوگا تو چاہے اچھا عمل کر کے اللہ کے جناب میں حاضر ہوگا یا بُرے عمل کے ساتھ بالآخر جنت میں داخل ہوگا۔ حدیث کے اس آخری فقرے کا ایک اور مطلب بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اہل جنت اپنے اعمال کے مطابق درجات پائیں گے۔ ❶

((حَدَّثَنَا عَبدُ اللّٰهِ بنُ مَسلَمَةَ ، عَنْ مَالِكٍ ، عَنْ سُمَيٍّ ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه : أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ : مَنْ قَالَ : سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ، فِي يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ حُطَّتْ خَطَايَاهُ وَإِنْ كَانَتْ مِثْلَ زُبَدِ الْبَحْرِ)) ❷

"ہم سے عبداللہ بن مسلمہ نے، مالک سے، انہوں نے سُمَی سے، انہوں نے ابو صالح سے اور انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے سبحان الله وبحمده ایک دن میں سو بار کہا تو اس کی ساری خطائیں کالعدم کر دی جائیں گی اگرچہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر کیوں نہ ہوں۔"

یہی حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ان الفاظ میں بھی مروی ہے جس میں مذکورہ اجر کا ذکر نہیں ہے اور دعاء کے الفاظ زیادہ ہیں:

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : كَلِمَتَانِ خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ، ثَقِيلَتَانِ فِي الْمِيزَانِ ، حَبِيبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ : سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيمِ ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ)) ❸

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: دو بول ہیں جو زبان پر ہلکے میزان میں بھاری اور رحمٰن کو بڑے محبوب ہیں: سبحان الله العظيم، سبحان الله وبحمده"

یہی حدیث ایک دوسری سند میں اس طرح مروی ہے کہ "سبحان اللہ وبحمدہ" پہلے اور "سبحان اللہ العظیم" بعد میں ہے۔ ❹

---

❶ فتح الباري: ۲/۱۵۸۳
❷ البخاري: ٦٤٠٥، مسلم: ٦٨٤٢
❸ البخاري، ح: ٦٤٠٦، مسلم، ح: ٦٨٤٦
❹ البخاري، ح: ٦٦٨٢، مسلم، ح: ٦٨٤٦

دعا کے کلمات میں اس کی بیشی یا ان کی ترتیب میں اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ اس کو جس طرح ادا کیا جائے صحیح ہے، اور ان شاء اللہ عنداللہ مقبول ہے۔ اور جہاں صرف ''سبحان اللہ وبحمدہ'' فرمایا گیا ہے وہاں مراد ہے کہ صرف یہی فقرہ دن میں سو (۱۰۰) بار پڑھ لینے سے ساری خطائیں معاف ہو جائیں گی:

((عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ : أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : مَنْ قَالَ : لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِیْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ فِیْ یَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ ، كَانَتْ لَهُ عَدْلَ عَشْرِ رِقَابٍ وَكُتِبَتْ لَهُ مِائَةُ حَسَنَةٍ ، وَمُحِیَتْ عَنْهُ مِائَةُ سَیِّئَةٍ ، وَكَانَتْ لَهُ حِرْزًا مِنَ الشَّیْطَانِ یَوْمَهُ ذٰلِكَ حَتّٰی یُمْسِیَ وَلَمْ یَأْتِ اَحَدٌ بِأَفْضَلَ مِمَّا جَاءَ اِلَّا رَجُلٌ عَمِلَ أَكْثَرَ مِنْهُ)) [1]

''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے **لا الٰه الا الله وحده لا شریك له ، له الملك وله الحمد ، وھو علی کل شیء قدیر** ، دن میں سو بار کہا تو یہ دس (۱۰) گردنوں کے برابر (دس گردنوں کو آزاد کرنا) ہے۔ اس کے لیے سو نیکیاں لکھی جائیں گی، اس سے سو (۱۰۰) برائیاں مٹا دی جائیں گی اور اس دن یہ حکم اس کے لیے شیطان سے محفوظ رہنے کا ذریعہ ہوگا اور یہ تحفظ شام تک جاری رہے گا اور کسی دوسرے آدمی کا عمل اس کے اس عمل سے بہتر نہ ہوگا الا یہ کہ ایسا آدمی جو اس سے زیادہ یہ کلمات کہے۔''

دعا و اذکار کے فضائل اور ان کے اجر و ثواب سے متعلق صحیح احادیث دسیوں نہیں بلکہ سیکڑوں سے متجاوز ہیں اور حدیث کی مستند کتابوں میں موجود ہیں اور یہ کہنا مبالغہ نہیں بلکہ عین حقیقت ہے کہ زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے اور دن ورات کا کوئی ایسا وقت نہیں ہے کہ اس کے لیے خاص اور متعین دعائیں نہ ملتی ہوں اور اس میں ذکر الٰہی کی ترغیب نہ دلائی گئی ہو، اس کے باوجود فضائل ذکر اور دعا و اذکار کے عنوانوں سے ایسی بے شمار حدیثیں ملتی ہیں جن کی یا تو کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے یا وہ اپنی سند اور متن کے اعتبار سے منکر ہیں اور صحیح حدیثوں کے مقابلے میں انہی بے بنیاد حدیثوں کو شہرت اور رواج حاصل ہے کیونکہ اُمت کا ایک بہت بڑا طبقہ طہارت قلب اور تزکیہ نفس کے نام پر ایسے اعمال کو انجام دے رہا ہے اور لوگوں کو ان کی دعوت دے رہا ہے جن کا منصوص عبادتوں کے ضمن میں کوئی ذکر نہیں ملتا اور جن کو شرعی حیثیت دینے کے لیے ہی حدیثیں گھڑی گئی ہیں۔

۱۰۹ ...... ((مَنْ قَالَ إِحْدٰی عَشْرَةَ مَرَّةً : لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِیْكَ لَهُ اَحَدًا

صَمَدًا ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ، وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ اَلْفَى اَلْفَ حَسَنَةٍ ، وَمَنْ زَادَ زَادَهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ))

[]

''جس نے گیارہ مرتبہ **لا اله الّا الله وحده لا شريك له ، احدا صمدا ، لم يلد ولم يولد ، ولم يكن له كفواً احد** کہا۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے بیس (۲۰) لاکھ نیکیاں لکھے گا اور اگر اس نے اس کی تعداد میں اضافہ کیا تو اللہ عزوجل نیکیوں میں اضافہ فرمائے گا۔''

یہ حدیث موضوع ہے، اس کی تخریج عبد بن حمید نے ''المسند'' (قلمی نسخہ: ۱/۷۶) میں، حافظ الحسین بن اسماعیل المحاملی نے ''الامالی'' (۴۴۰، ۵۲۳) میں اور ابن البنا نے ''فضل التهليل'' (قلمی نسخہ: ۱/۱۹۸) میں اس سند سے کی ہے:

((عَنْ أَبِيْ الْوَرْقَاءِ ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِيْ أَوْفَى مَرْفُوْعًا))

''ابوالورقاء سے روایت ہے، وہ عبداللہ بن ابی اوفی سے مرفوعاً روایت کرتا ہے۔''

امام عبداللہ بن عدی نے ''الکامل'' (قلمی نسخہ: ۲/۲۶۴) میں اس طرح اس کی تخریج کی ہے لیکن انہوں نے اس سند میں ابوالورقاء اور ابن ابی اوفی کے درمیان ابن المنکدر کا اضافہ کیا ہے، اور لکھا ہے:

''ابوالورقاء کی مروی حدیثیں، اس کے ضعیف ہونے کے باوجود لکھی جانے کے قابل ہیں۔''

ابن عدی نے اس طرح کہا ہے حالانکہ ابوالورقاء اس سے زیادہ بُرا ہے چنانچہ امام احمد وغیرہ نے اس کو بے حد ضعیف قرار دیا ہے اور امام ابن ابی حاتم نے ''العلل'' (۲/۲/۳، ۸۲) میں اپنے والد سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ابن ابی اوفی سے ابوالورقاء کی روایت کردہ حدیثیں باطل ہیں، جن کی تقریباً کوئی اصل نہیں ہے، گویا کہ وہ ابن ابی اوفی کی مرویات سے کوئی مشابہت نہیں رکھتیں، اور اگر کوئی یہ قسم کھائے کہ ابوالورقاء کی روایت کردہ بیشتر حدیثیں جھوٹ ہیں تو حانث (جھوٹا) نہیں شمار ہوگا۔''

اسی وجہ سے حافظ ابن حجر نے ''تقریب التهذيب، ص: ۳۸۰، ترجمه: ۵۳۷۳'' میں لکھا ہے:

''ابوالورقاء العطار، فائد بن عبدالرحمٰن الکوفی: متروک ہے اور محدثین نے اس پر وضع حدیث کا الزام لگایا ہے۔''

اس حدیث کو حافظ نورالدین علی بن ابوبکر الہیثمی نے ''مجمع البحرين بزوائد المعجمين: ۱۰/۸۵'' میں الطبرانی کی روایت سے نقل کیا ہے، مگر اس میں ''إحدى عشرة مرةً'' اور ''ومن زاذ زاده الله

عزوجل " نہیں ہے اور لکھا ہے:

''اس کی سند میں فائد ابوالورقاء ہے جو متروک ہے۔''

حافظ المنذری نے بھی یہ حدیث ''الترغیب والترہیب، حدیث:۲۹۳۶'' میں روایت کی ہے کہ اور اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔[الضعیفہ : ۷۰۲/۱۱، ۲۰۸]

۱۱۰...... ((إِنَّ لِلّٰهِ تَعَالَى عَمُودًا تَحْتَ الْعَرْشِ ، فَإِذَا قَالَ الْعَبْدُ : لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ اِهْتَزَّ ذٰلِكَ الْعَمُودُ ، فَيَقُولُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ : اُسْكُنْ ، فَيَقُولُ: يَا رَبِّ ! وَكَيْفَ أَسْكُنُ وَلَمْ تَغْفِرْ لِقَائِلِهَا؟ قال : فَيَقُولُ : فَإِنِّي قَدْ غَفَرْتُ لَهُ ، قَالَ ، فَيَسْكُنُ عِنْدَ ذَاكَ))

''اللہ کے لیے عرش کے نیچے ایک ستون ہے، پاس جب بندہ "لا اله الا الله " کہتا ہے تو وہ ستون ہلنے لگتا ہے، اس پر اللہ عزوجل فرماتا ہے: ٹھہر جا، تو وہ عرض کرتا ہے: اے میرے رب! میں کیسے ٹھہر جاؤں حالانکہ تو نے یہ کلمہ کہنے والے کی بخشش کی ہی نہیں، کہا: اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: بے شک میں نے اس کو بخش دیا، کہا: اس وقت وہ ستون ٹھہر جائے گا۔''

یہ حدیث موضوع ہے، اس کی تخریج حافظ احمد بن عمرو بن عبدالخالق البزار نے ''المسند، ص:۲۹۶'' میں، حافظ عمر بن احمد بن عثمان بن شاہین نے ''الترغیب والترہیب'' (قلمی نسخہ:۲۵۸/۲) میں، ابن النبا نے ''فضل التہلیل'' (قلمی نسخہ:۲۰۲/۲) میں، حافظ علی بن الحسن بن عساکر نے ''تاریخ دمشق'' (۱۲۲/۲) میں اور حافظ محمد بن عبدالواحد الضیاء المقدسی نے "المنتقی من مسموعاته بمرو" (قلمی نسخه: ۱۰/۱) میں، عبداللہ بن ابراہیم بن أبی عمرو الغفاری کی سند سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ مَرْفُوعاً))

''ہم سے عبداللہ بن ابی بکر نے صفوان بن سلیم سے، انہوں نے سلیمان بن یسار سے اور انہوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

یہ سند موضوع ہے جس کی مصیبت عبداللہ بن ابراہیم الغفاری ہے۔ الہیثمی نے "مجمع البحرین بزوائد المعجمین، ۸۲/۱۰" میں اس کو ''متروک لکھا ہے اور امام ابن حبان نے اس کو ''وضع حدیث'' سے منسوب کیا ہے۔ الہیثمی نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''اس کی روایت البزار نے کی ہے اور اس کی سند میں عبداللہ بن ابراہیم بن ابی عمرو ہے جو بے حد ضعیف ہے۔''

اور امام الذہبی نے اس کی روایت کردہ چند ایسی حدیثیں نقل کی ہیں جو منکر ہیں ان میں سے ایک یہی ہے اور ان میں سے دو حدیثوں کو انہوں نے باطل قرار دیا ہے۔ اور ان میں سے آخری حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ: ''یہ صحیح نہیں ہے۔''

اس حدیث کی تخریج "ابن شاهين عمر بن صبيح عن مقاتل بن حبان عن الضحاك بن مزاحم عن ابن عباس مرفوعاً" کی سند سے کی ہے اور اس میں اتنا اضافہ ہے:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((أَكْثِرُوا مِنْ هَزِّ ذَلِكَ الْعَمُودِ)) ''اس ستون کو زیادہ سے زیادہ ہلاؤ۔''

اور یہ ٹکڑا بھی موضوع ہے جس کی مصیبت عمر بن صُبیح ہے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:

''عمر بن صُبیح، متروک ہے، امام اسحاق بن راہویہ نے اس کو جھوٹا قرار دیا ہے۔''

[الضعيفه: ۱۱/۲۱۱، ۲۱۲]

واضح رہے کہ اس حدیث کا ابتدائی فقرہ اس طرح بھی لوگوں میں زبانِ زد ہے:

((إِنَّ لِلّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى عَمُودًا مِنْ نُورٍ بَيْنَ يَدَيِ الْعَرْشِ))

اور ان الفاظ میں بھی یہ موضوع ہے نبی ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔

۱۱۱ ......((مَنْ قَالَ : لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ قَبْلَ كُلِّ شَيْءٍ ، وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ بَعْدَ كُلِّ شَيْءٍ ، وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ يُبْقِي وَيُفْنِي كُلَّ شَيْءٍ ، عُوفِيَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ))

''جو ہر چیز سے پہلے اور ہر چیز کے بعد لا الہ الا اللہ کہے گا اور یہ کہے گا کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے جو ہر چیز کو باقی رکھتا ہے اور ہر چیز کو فنا کرتا ہے تو وہ رنج وغم سے عافیت میں رہے گا۔''

یہ حدیث موضوع ہے، اس کی تخریج حافظ الطبرانی نے "المعجم الكبير: ۳/۹۳، قلمی نسخه" میں العباس بن بکار الضبی کی روایت سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا أبو هِلَالٍ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ سَعِيدِ بن الْمُسَيَّبِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَرْفُوعًا))

''ہم سے ابو ہلال نے قتادہ سے، انہوں نے سعید بن المسیب سے اور انہوں نے ابن عباس

رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

یہ سند موضوع ہے۔ امام الدارقطنی نے العباس بن بکار الضبی کو ''کذاب'' لکھا ہے۔
[الضعفاء والمتروكين، ترجمة ٤٢٥، ص: ١١٩]

امام الذھبی نے اس کی دو حدیثیں نقل کی ہیں اور لکھا ہے:

''یہ دونوں باطل ہیں۔'' [ميزان الاعتدال: ٣٨٢/٢، ترجمه: ٤١٦، الضعيفه: ٦١٢/١]

۱۱۲ ......((عِنْدَ كُلِّ خَتْمَةٍ لِلْقُرْآنِ دَعوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ))

''قرآن کے ہر ختم کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی روایت ابو الفرج الاسفرائینی نے **''جزء احادیث یغنم بن سالم : ۱/۲۷''** میں یحییٰ بن ہاشم سے کی ہے۔:

((قَالَ : حَدَّثَنَا مِسْعَرُ بْنُ كُدَامٍ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ مَرْفُوْعًا))

''یحییٰ بن ہاشم نے کہا! ہم سے مسعر بن کدام نے قتادہ سے اور انہوں نے انس سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

اسی سند سے ابن عساکر نے ''تاریخ دمشق'' میں (۴۹/۵) روایت کی ہے۔ اور حافظ ابونعیم نے لکھا ہے:

''میرے علم میں اس حدیث کی روایت مسعر سے یحییٰ بن ہاشم کے سوا کسی اور نے نہیں کی ہے۔

میں کہتا ہوں: یحییٰ بن ہشام جھوٹا تھا اور حدیثیں وضع کرتا تھا۔ حافظ الذہبی نے ''میزان الاعتدال'' میں اس کی چند حدیثیں نقل کی ہیں جن میں سے ایک یہی ہے اور لکھا ہے:

''یہ موضوع حدیث اس کے مصائب میں سے ایک ہے۔'' [الضعيفه: ٣٦٩/٣]

۱۱۳ ......((أَكْثِرُوْا ذِكْرَ اللّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ ، فَإِنَّهُ لَيْسَ عَمَلٌ أَحَبَّ إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى وَ لَا أُنْجٰى لِعَبْدٍ مِنْ كُلِّ سَيِّئَةٍ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى))

''ہر حال میں اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو، کیونکہ کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کو نہ تو ذکر اللہ سے زیادہ محبوب ہے اور نہ تو دنیا اور آخرت میں بندے کو ہر برائی سے بچانے والا ہے۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔

اس کی تخریج الضیاء المقدسی نے "المختارۃ:۷/۱۱۲" میں اس سند سے کی ہے:

((عَنْ بَكْرِ ابْنِ خُنَيْسٍ عَنْ أَبِيْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ عُبَادَةَ بْنِ نَسِيٍّ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ غَنَمٍ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ ، قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :))

"بکر بن خنیس سے روایت ہے، انہوں نے ابو عبدالرحمٰن سے روایت کیا، انہوں نے عبادہ بن نسی سے، انہوں نے عبدالرحمٰن بن غنم سے اور انہوں نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"

اس موضوع حدیث کی بقیہ عبارت یوں ہے:

((فَقَالَ قَائِلٌ : وَلَا الْقِتَالُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ : "لَوْ لَا ذِكْرُ اللّٰهِ تَعَالٰى لَمْ نُؤْمَرْ بِالْقِتَالِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، وَلَوِ اجْتَمَعَ النَّاسُ عَلٰى شَيْءٍ مِمَّا أُمِرُوْا بِهِ مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ مَا كَتَبَ اللّٰهُ الْقِتَالَ عَلٰى عِبَادِهٖ وَإِنَّ ذِكْرَ اللّٰهِ تَعَالٰى لَا يَمْنَعُكُمْ مِنَ الْقِتَالِ فِيْ سَبِيْلِهٖ ، بَلْ هُوَ عَوْنٌ لَكُمْ عَلٰى ذٰلِكَ ، فَقُوْلُوْا : لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ ، وَقُوْلُوْا : سُبْحَانَ اللّٰهِ ، وَقُوْلُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ ، وَقُوْلُوْا : تَبَارَكَ اللّٰهُ ، فَإِنَّهُنَّ خَمْسٌ لَا يَعْدِلُهُنَّ شَيْءٌ ، عَلَيْهِنَّ فَطَرَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ مَلَائِكَتَهُ ، وَمِنْ أَجْلِهِنَّ رَفَعَ سَمَاءَهُ وَدَحَا أَرْضَهُ وَلَهُنَّ جَبَلَ إِنْسَهُ وَجِنَّهُ وَفَرَضَ عَلَيْهِنَّ فَرَائِضَهُ وَلَا يَقْبَلُ اللّٰهُ "ذِكْرَهُ إِلَّا مِمَّنِ اتَّقٰى وَطَهَّرَ قَلْبَهُ ، وَأَكْرِمُوا اللّٰهَ أَنْ يَرٰى مَا نَهَاكُمْ عَنْهُ))

"کہنے والے نے کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ کی راہ میں جنگ بھی نہیں؟ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا:

"اگر اللہ تعالیٰ کا ذکر مقصود نہ ہوتا تو ہمیں اللہ کی راہ میں لڑائی کا حکم ہی نہ دیا جاتا۔ اور اگر لوگ اُس ذکر پر اکٹھا ہوتے جس کا انہیں حکم دیا گیا ہے۔ تو اللہ اپنے بندوں پر لڑائی فرض ہی نہ کرتا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر تم کو اس کی راہ میں لڑائی سے روکتا نہیں ہے بلکہ وہ تو لڑائی پر تمہارا معاون اور مددگار ہے۔ پس کہو: لا الہ اللہ واللہ اکبر، اور کہو: سبحان اللہ! اور کہو: الحمد للہ، اور کہو: تبارک اللہ، یہ پانچ بول ایسے ہیں جن کے برابر کوئی چیز نہیں ہے۔ انہی کلمات پر اللہ عزوجل نے اپنے فرشتوں کو پیدا کیا ہے، انہی کی خاطر اس نے اپنے آسمان کو بلند کیا ہے، انہی کے لیے اس نے

اپنے انس و جن کو تخلیق بخشی ہے اور ان پر فرائض متعین فرمائے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنا ذکر اس شخص سے قبول فرماتا ہے جو اس کی معصیت سے بچے اور جس کا دل پاک ہو اور اللہ کو اس بات سے پاک رکھو کہ تم سے ایسے اعمال دیکھے جن سے اس نے منع فرمایا ہے۔''

((فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ! فَإِنَّ ذِكْرَ اللّٰهِ لَا يَكْفِينَا مِنَ الْجِهَادِ؟ فقال : وَلَا الْجِهَادُ يَكْفِيْ مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَلَا يَصْلُحُ الْجِهَادُ اِلَّا بِذِكْرِ اللّٰهِ......))

''صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ! کیا ذکر اللہ جہاد سے ہماری کفایت نہیں کرتا؟ فرمایا: نہ تو جہاد اللہ کے ذکر سے کفایت کرتا ہے اور نہ تو جہاد ذکر اللہ کے بغیر قابل قبول ہے۔''

یہ پوری عبارت من گھڑت ہے اور اس کو پھیلانے یا وضع کرنے والا ابوعبدالرحمٰن ہے جس کا لقب الشامی ہے۔ حافظ محمد بن الحسین الازدی نے اس کو ''الضعفاء'' میں ''کذاب'' لکھا ہے۔ امام الذہبی نے ''میزان الاعتدال'' میں ان کی اس جرح پر اعتماد کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''شاید وہ مصلوب ہو۔''

حافظ ابن حجر نے امام الذہبی کے اس قول سے ''لسان المیزان میں اتفاق کیا ہے۔''

اس حدیث کی تخریج امام البیہقی نے ''شعب الایمان: ۱/۳۱۸'' میں کی ہے جس کی سند یہ ہے:

محمد بن عبدالملک بن زرارہ الانصاری نے ابوعبدالرحمٰن الشامی سے روایت کیا اور اس نے عبدالرحمٰن بن غنم سے، اس سند میں ''عبادہ بن نسی کا ذکر نہیں کیا ہے۔

اس طرح امام البیہقی نے یہی حدیث ''شعب الایمان: ۱/۳۱۹'' میں مروان بن سالم کی سند سے کی ہے۔

((عَنِ الْاَحوص بن حكيم عن خالد بن مِعدان عن عبدالرحمن بن غنم عن معاذ بن جبل مختصراً))

''الاحوص بن حکیم سے روایت ہے، انہوں نے خالد بن معدان سے، انہوں نے عبدالرحمٰن بن غنم سے انہوں نے معاذ بن جبل سے مختصراً روایت کیا۔''

اور یہ سند نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ''اس کی روایت میں مروان بن سالم منفرد ہے۔''

اور حافظ ابن حجر نے ''تقریب التہذیب ، ص: ۴۵۸، ترجمہ: ۶۵۷۰'' میں لکھا ہے:

مروان بن سالم الغفاری ، ابوعبداللہ الجزری، متروک ہے، اور الساجی (ابو یحییٰ، زکریا بن یحییٰ الساجی) وغیرہ نے اس پر وضع حدیث کا الزام لگایا ہے۔[الضعيفه : ٦ / ١٢٤، ١٢٥]

۱۱٤ ......((إِذَا وَقَعْتَ فِيْ وَرْطَةٍ ، فَقُلْ ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ، فَإِنَّ اللّٰهَ يَصْرِفُ بِهَا مَا شَاءَ مِنَ الْبَلَايَا))

''اگر تم کسی دشواری اور مشکل سے دوچار ہو جاؤ تو کہو: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم'' تو اللہ اس کے ذریعہ جو مصیبت اور آزمائش چاہے گا دور فرما دے گا۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔اس کی تخریج احمد بن محمد بن السنی نے '' عمل اليوم والليلة، ص: ۳۳۱ '' میں اور عبدالکریم الرافعی نے '' تاريخ قزوين: ۱/ ۳۲۰ '' میں اس سند سے کی ہے:

((عَنْ عَمْرِو بْنِ شِمْرٍ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ : سَمِعْتُ يَزِيْدَ ابْنَ مُرَّةَ يقول : سَمِعْتُ سُوَيْدَ بْنَ غَفْلَةَ يَقُوْلُ : سَمِعْتُ عَلِيًّا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ يَقُوْلُ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ " يَا عَلِيُّ : أَلَا أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ إِذَا وَقَعْتَ فِيْ وَرْطَةٍ قُلْتَهَا "))

عمرو بن شمر سے روایت ہے اس نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا: میں نے یزید بن مرہ کو کہتے ہوئے سُنا ہے: میں نے سوید بن غفلہ کو کہتے ہوئے سُنا، میں نے علی رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سُنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے علی! کیا میں تم کو ایسے کلمات نہ سکھا دوں کہ جب تم کسی دشواری اور مشکل میں پڑو تو انہیں پڑھو'' میں نے عرض کیا: کیوں نہیں۔ اللہ مجھے آپ پر فدا کرے کتنے خیر کے کلمات آپ مجھے سکھا چکے ہیں۔''

یہ سند موضوع ہے جس کا مرتکب یہ عمرو بن شمر ہے۔امام ابن حبان نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

''وہ ثقہ راویوں کے نام سے موضوع حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔''

اور امام بخاری نے اس کو ''منکر الحدیث'' قرار دیا ہے۔[الضعيفه : ٦ / ٢٤٧]

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مصائب میں مبتلا ہونے والوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہتے ہیں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿155﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿156﴾ ﴾ [البقره: ١٥٥، ١٥٦]

''بلاشبہ ہم تم لوگوں کو خوف، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں

مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے اور تم اُن صبر کرنے والوں کو خوشخبری دیدو جن کو جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو کہتے ہیں: ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہم کو پلٹ کر اللہ ہی کی طرف جانا ہے۔"

اور صحیح مسلم میں اُمّ المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سُنا ہے:

((مَا مِنْ مُسْلِمٍ تُصِيبُهُ مُصِيبَةٌ فَيَقُولُ مَا اَمَرَهُ اللّٰهُ : إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ ، اَللّٰهُمَّ ! أجِرْنِيْ فِيْ مُصِيبَتِيْ وَأَخْلِفْ لِيْ خَيْرًا مِنْهَا ، إِلَّا أَخْلَفَ اللّٰهُ لَهُ خَيْرًا مِنْهَا)) ❶

"جس مسلمان کو بھی کوئی مصیبت پڑے پس وہ، وہ بات کہے جس کا اللہ نے اس کو حکم دیا ہے: إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ " اے اللہ! اس مصیبت میں مجھے اجر عطا کر اور جس چیز کو میں نے کھو دیا ہے اس کے بدلے مجھے اس سے بہتر چیز عطا کر۔ تو اللہ اس کو اس سے بہتر چیز عطا کرے گا۔"

۱۱۵ ......((فِكْرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِنْ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةً))

"ایک گھنٹے کا غور و فکر ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔"

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج ابو الشیخ (حافظ ابو محمد، عبداللہ بن محمد الاصبہانی) نے "العظمہ: ۲۹۲/۱" میں اور انہی سے امام ابن الجوزی نے " الموضوعات: ۱۴۴/۳ " میں عثمان بن عبداللہ القرشی کے طریقے سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا اِسْحَاقُ بْنُ نَجِيحٍ المَلْطِيُّ : حَدَّثَنَا عَطَاءُ الْخُرَاسَانِيُّ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ مَرْفُوعًا))

"ہم سے اسحاق بن نجیح الملطی نے بیان کیا، کہا: ہم سے عطاء الخراسانی نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔"

ابو الشیخ نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

"عثمان اور اس کے شیخ دونوں کذاب اور جھوٹے ہیں۔"

حافظ السیوطی نے " اللآلی المصنوعه: ۲۲۷/۲ " میں ابو الشیخ کی تعقیب کرتے ہوئے لکھا ہے:

❶ حديث: ٢١٢٦

''میں کہتا ہوں کہ العراقی نے '' تخریج الاحیاء '' میں اس حدیث کو صرف ضعیف کہنے پر اکتفا کیا ہے، اور اس حدیث کی شاہد بھی ہے۔''

اس کے بعد الدیلمی کی روایت سے (جوان کی مسند: ۲/۴۶ میں موجود ہے) اس حدیث کی شاہد، سعید بن میسرہ کی سند سے نقل کی ہے:

((عَنْ سَعِيدِ بْنِ مَيْسرة ، سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُوْلُ:
تَفَكُّرُ سَاعَةٍ فِي اخْتِلافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ خَيْرٌ مِنْ عِبَادَةِ أَلْفِ سَنَةٍ))

''سعید بن میسرہ سے روایت ہے، میں نے انس بن مالک کو کہتے ہوئے سُنا ہے:
رات و دن کی گردش میں ایک گھڑی کا غور و فکر ایک ہزار سال کی عبادت سے بہتر ہے۔''

یہ حدیث مذکورہ حدیث کی شاہد نہیں بن سکتی کیونکہ یہ موقوف ہے اور مذکورہ حدیث سے مختلف ہونے کے علاوہ موضوع بھی ہے۔ سعید بن میسرہ کے بارے میں امام الذہبی کا قول ہے:

''اس کا معاملہ بڑا مبہم اور تاریک ہے، ابن حبان نے اس پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ موضوع احادیث روایت کیا کرتا تھا اور امام الحاکم نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے انس رضی اللہ عنہ سے موضوع حدیثیں روایت کی ہیں اور یحییٰ القطان نے اس کو جھوٹا قرار دیا ہے۔''

لہٰذا اس طرح کی بے بنیاد اور موضوع حدیث کو دوسری موضوع حدیث کی شاہد نہیں قرار دیا جا سکتا۔

[الضعیفه : ۱ / ۲۲۲]

اس موضوع اور جھوٹی روایت کی بنیاد پر صوفیا، اولیاء اللہ اور صلحائے اُمت کی قبروں پر کے پاس جا جا کر مراقبے کرتے ہیں اور پھر ان مراقبوں کے نتیجے میں ہونے والے کشف و کرامت کا اپنے مُریدوں میں تذکرہ کر کے ان کو خوب خوب گمراہ کرتے ہیں۔ اعاذ نا الله منهم

۱۱۶ ...... ((قَالَ الحَاكِمُ : حَدَّثَنَا احْمَدُ بْنُ يَعْقُوبَ الثَّقَفِيُّ : أَنْبَانَا مَحْمُوْدُ بْنُ مُحَمَّدِ المَرْزِيُّ حَدَّثَنَا سَهْلُ بْنُ العَبَّاسِ التِرمِذِى : حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ الوَزِيرِ الكُوفِى عَنْ أَبِي حَيَّانَ الكَلْبِيُّ عَنْ كَنَانَةَ العَدَوِىُّ عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ مَرْفُوْعًا :

مَنْ آوَى إِلَى فِرَاشِهِ ، فَقَالَ : الحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِى عَلَا فَقَهَرَ وَبَطَنَ فَخَبَّرَ وَمَلَكَ فَقَدَرَ ، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِى يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ خَرَجَ مِنْ

ذُنُوبِهِ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ))

''الحاکم نے کہا: ہم سے احمد بن یعقوب بن الثقفی نے بیان کیا، کہا: ہم کو محمود بن محمد المروزی نے خبر دی، کہا: ہم سے سہل بن العباس الترمذی نے بیان کیا، کہا: ہم سے اسحاق بن الوزیر الکوفی نے ابوحیان الکوفی سے، اس نے کنانہ العدوی سے اور انہوں نے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا:

''جو اپنے بستر کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: حمد وستائش صرف اس اللہ کے لیے سزاوار ہے جو بلند ہوا، پس غالب ہوا، اور چھپا تو حیرانی میں ڈال دیا اور مالک ہوا تو ہر چیز پر قادر ہوا، اور حمد وثنا صرف اس اللہ کے لیے ہے جو زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے اور ہر وہ چیز پر قادر ہے۔ تو وہ اپنے گناہوں سے اس طرح پاک وصاف ہو جاتا ہے جس طرح اس دن تھا جب اس کی ماں نے اس کو جنم دیا تھا۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کے راوی مجہول ہیں اور سہل بن العباس اور ابوحیان الکلبی دونوں متروک ہیں۔

[اللآلي المصنوعة: ۲/ ۲۹۱، تنزيه الشريعة: ۲/ ۳۲۳ اورالترغيب والترهيب، ح: ۳۵۰]

۱۱۷ ...... ((أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللّٰهِ ذِكْرُ اللّٰهِ قُلْنَا : وَمِنَ الْغَزْوِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ قَالَ : نَعَمْ ، وَلَوْ ضَرَبَ بِسَيْفِهِ الْكُفَّارَ حَتَّى يَخْتَضِبَ دَمًا ، لَكَانَ ذَاكِرُ اللّٰهِ أَفْضَلَهُمْ دَرَجَةً))

''اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل ''اللہ کا ذکر'' ہے، ہم نے عرض کیا: کیا اللہ کی راہ میں لشکر کشی سے بھی زیادہ؟ فرمایا: ہاں اور اگر وہ کفار کو اپنی تلوار سے مارے یہاں تک کہ خون میں لت پت ہو جائے، تو بھی اللہ کا ذکر کرنے والا مجاہدین سے درجہ میں افضل ہے۔''

یہ روایت باطل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ اس کی تخریج ابونعیم نے ''اخبار اصبہان: ۱/ ۱۷۸'' میں ابراہیم بن ناصح بن حماد الاصبہانی کے طریقے سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا النَّضْرُ بْنُ شُمَيْلٍ : حَدَّثَنَا مِسْعَرُ بْنُ كِدَامٍ عَنْ عَطِيَّةَ الْعُوفِيِّ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ : قُلْنَا : يَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَيُّ الْأَعْمَالِ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ؟ قَالَ : ذِكْرُ اللّٰهِ......))

''ہم سے النضر بن شمیل نے بیان کیا، کہا: ہم سے مسعر بن کدام نے عطیہ العوفی سے اور انہوں

نے ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، کہا: ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کونسا عمل اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ کا ذکر......''

یہ سند بے حد ضعیف ہے۔ عطیہ العوفی اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس باطل حدیث کی روایت کا ملزم ابراہیم بن ناصح ہے، جو ''متروک الحدیث'' ہے اور جس نے باطل اور بے بنیاد حدیثیں روایت کر کے لوگوں میں پھیلائی ہیں۔

اس حدیث کے باطل ہونے پر وہ صحیح حدیث دلالت کرتی ہے جو امام بخاری نے صحیح بخاری میں (حدیث: ۹۶۹) روایت کی ہے:

((" مَاالعَمَلُ فِي اَيَّامٍ اَفْضَلَ مِنهَا فِيْ هٰذِهِ "قَالُوا : وَلَا الْجِهَادُ ؟ قَالَ : وَلَاالجِهَادُ، إلَّا رَجُلٌ خَرَجَ يُخَاطِرُ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ ، فَلَمْ يَرْجِعُ بِشَيْءٍ......))

''دنوں میں کوئی بھی عمل ان دنوں میں (ذی الحجہ کے ابتدائی دس (۱۰) دن) انجام دیے جانے والے اعمال سے افضل نہیں ہے۔ صحابہ نے عرض کیا: جہاد بھی نہیں؟ فرمایا: جہاد بھی نہیں سوائے اس کے کہ ایک آدمی جہاد کے لیے نکلے اور اپنی جان اور مال کو خطرے میں ڈالے اور کچھ بھی لے کر واپس نہ لوٹے (یعنی شہید ہو جائے۔)''

اس صحیح حدیث میں صراحت ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جانے والے کو ذی الحجہ کے ان مبارک ایام میں اللہ کا ذکر کرنے والے پر فضیلت حاصل ہے تو دوسرے ایام میں ذکر کرنے والوں پر بدرجہ اولیٰ فضیلت حاصل ہوگی۔

[الضعيفه: ۳۱۸،۳۱۷/۷]

امت کے جن افراد نے شرعی اعمال کو لے جا کر خانقاہوں میں بند کر دیا اور ذکر وفکر کے نئے طریقے ایجاد کر لیے۔ انہوں نے مسلمانوں کے دلوں سے روحِ جہاد کو نکالنے کی سب سے زیادہ کوششیں کی ہیں اور اب تک کر رہے ہیں۔ انہوں نے جہاں جہاد اکبر اور جہاد اصغر کی نئی اصطلاحیں گھڑ کر اُمت کے افراد کو جہاد سے بیگانہ کرنے کی کوشش کی، وہیں اُنہوں نے فضائل ذکر کے ضمن میں مختلف طریقوں سے جہاد کو اپنا نشانہ بنایا ہے اور دین میں اس کی اہمیت اور عنداللہ اس کا حسنِ قبول پر پردہ ڈالنے کی مسلسل کوششیں کی ہیں اور کر رہے ہیں۔ حالانکہ زبان نبوت سے اس کو اسلام کی سب سے بلند چوٹی ہونے کا لقب مل چکا ہے اور صرف صحیحین میں مروی حدیثوں پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینے ہی سے اسلام میں جہاد کی اہمیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۱۸...... ((نَزَلَ عَلَيَّ جِبْرِيْلُ فَقَالَ : إِنَّ خَيْرَ الدُّعَاءِ أَنْ تَقُوْلَ فِيْ صَلَاتِكَ اللّٰهُمَّ

! لَكَ الْحَمْدُ كُلُّهُ وَلَكَ الْمُلْكُ كُلُّهُ ، وَلَكَ الْخَلْقُ كُلُّهُ ، وَإِلَيْكَ يَرْجِعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ ، أَسْأَلُكَ الْخَيْرَ كُلَّهُ ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّرِّ كُلِّهِ))

''میرے پاس جبرائیل اُترے اور کہا: بہترین دعا یہ ہے کہ تم اپنی نماز میں کہو: اے اللہ! ساری حمد وثنا تیرے ہی لیے ہے، سارا ملک واقتدار تیرے لیے ہے، ساری مخلوق تیری ملک ہے، سارے معاملات تیری ہی طرف پلٹتے ہیں، میں تجھ سے ساری بھلائیوں کا سوال کرتا ہوں اور ہر برائی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج امام البیہقی نے " شعب الایمان : ۹۷/۴، ح: ۳۰۰۰ " میں اور ابوبکر الکلاباذی نے "مفتاح المعانی : ۲/۷، ح: ۷ " میں خالد بن یزید العمری کے طریقے سے کی ہے:

((عَنِ ابْنِ أَبِي ذِئْبٍ عَنْ زَيْدِ ابْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ:

أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ : يَا رَسُولَ اللهِ ! أَيُّ الدُّعَاءِ خَيْرٌ أَدْعُوبِهِ فِي صَلَاتِي؟ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ......))

''ابن ابی ذئب سے روایت ہے، انہوں نے زید بن اسلم سے روایت کیا، انہوں نے عطاء بن یسار سے اور انہوں نے ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے کہ:

ایک شخص نے نبی ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! وہ کونسی دعا بہترین ہے جو میں اپنی نماز میں مانگوں؟ تو نبی ﷺ نے فرمایا:''

امام البیہقی نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''اس کی روایت میں خالد العمری منفرد ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں: یہ موضوع ہے اور اس کی مصیبت خالد العمری ہے جس کی امام ابوحاتم نے تکذیب کی ہے اور امام ابن حبان نے لکھا ہے:

''وہ ثقہ راویوں سے موضوع احادیث روایت کرتا تھا۔''

حافظ المنذری نے اس کو "الترغیب والترھیب: ۴۷۸/۱، ح: ۹۶۴ " میں البیہقی سے منسوب کیا ہے۔

[الضعيفه : ۲۳٤/۱۱]

اس حدیث کی عبارت اور اس کے الفاظ اس کے موضوع ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی زبان اور آپ کا طرزِ تعبیر بڑا بلیغ ہوتا تھا، پرتکلف اور مسجع عبارتوں کے نمونے صحیح احادیث میں نہیں ملتے جس شخص نے یہ روایت گھڑی ہے اس نے قصداً ایسا کیا ہے تاکہ عبارت میں یہ نغمگی لوگوں کو اپنی جانب مائل کر سکے۔ چنانچہ مسجدوں کے وہ خطباء جو رٹی رٹائی تقریریں کرتے ہیں ان کی زبانوں سے یہ دعا بکثرت سُنی جاتی ہے جس کو وہ خاص ترنم سے پڑھتے ہیں۔

گزشتہ صفحات میں اذکار و اوراد کے ضمن میں جن موضوع حدیثوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ''قلیل من کثیر'' کی نمائندگی کرتی ہیں ورنہ فضائل ذکر کے ذیل میں اس طرح کی دسیوں نہیں سیکڑوں حدیثیں فضائل اعمال اور تصوف کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

اس کے علاوہ ذکر کے کچھ خاص طریقے بھی لوگوں نے بنا لیے ہیں، ان کے کچھ اوقات بھی متعین کر لیے ہیں جن میں وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر ''ذکر'' کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک ذکر ''ذکر مفرد'' کے نام سے مشہور ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ صرف ''اللہ اللہ'' کا ورد کیا جائے اور وہ بھی خاص انداز سے۔ اس ''ذکر مفرد'' کی خاص مشق کرائی جاتی ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ ''ذاکر'' پہلے اس کو اپنے دل سے ادا کرے، پھر اللہ اللہ کو اپنی زبان سے اس طرح ادا کرے کہ وہ حلق اور ناک، سے ملی جلی آواز میں ادا ہو اور آہستہ آہستہ اس کی اتنی مشق کر لے کہ صرف دل سے یہ ذکر ہو اور زبان خاموش رہے اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ خاصان خاص کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ ''اللہ'' کا نام بھی نہ لیں بلکہ ''اسم مضمر'' (یا ھُوْ) کا ورد کرنے پر اکتفا کریں۔ امام ابن تیمیہ ''العبودیہ'' میں لکھتے ہیں:

''جن کا یہ دعویٰ ہے کہ " لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ " عوام کا ذکر ہے اور خواص کا ذکر اسم مفرد ''اللہ'' ہے اور خاصانِ خاص کا ذکر صرف اسم مضمر (هُوَ) ہے وہ گمراہ اور غلط کار لوگ ہیں اور اپنے اس دعویٰ پر اُن کا قرآن پاک کی درج ذیل آیت سے استدلال واضح غلطی ہے:

﴿ قُلْ : اللّٰهُ ، ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿٩١﴾ ﴾ [الانعام: ۹۱]

''اے نبی کہہ دو! اللہ، پوری اُن کی دلیل بازیوں پر اُن کو کھیلنے کے لیے چھوڑ دو۔''

کیونکہ اس آیت میں (اسم مفرد) اللہ کا نام استفہام کے جواب میں آیا ہے۔ استفہام یہ تھا:

﴿ قُلْ : مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِيْ جَاءَ بِهِ مُوْسَى نُوْرًا وَهُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ [الایہ]

''اے نبی! ان سے پوچھو وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جسے موسیٰ لایا تھا اور جو لوگوں کے لیے

روشنی اور ہدایت ہے۔"

اور جواب میں فرمایا گیا:

﴿ قُلْ: اللّٰهُ ﴾ "اے نبی! کہو اللہ!" یعنی اللہ نے وہ کتاب نازل فرمائی ہے۔ یہاں صرف مبتدا، اللہ کا ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے اور خبر "وہ کتاب نازل فرمائی ہے" حذف کر دی گئی ہے کیونکہ سوال اس پر دلالت کر رہا ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے: "مَنْ جَاءَ کون آیا؟" کے جواب میں کہا جائے: "زَیْدٌ" زید۔ یعنی "زید آیا" تو اس جملے میں صرف مبتدا "زید" کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے کیونکہ خبر پر سوال خود دلالت کر رہا ہے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔

اب رہا "ذکر" میں اسم مفرد یا اسم مضمر کا ورد تو وہ مکمل عبارت یا مفید جملہ نہیں ہے جس سے ایمان یا کفر کا تعلق ہو اور نہ ہی وہ امر اور نہی ہے۔ اور اسلاف اُمت میں سے کسی سے بھی اس طرح کا ذکر منقول نہیں ہے اور نہ تو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کے ذکر کو جائز قرار دیا ہے۔ اور اس طرح کا ذکر کرنے والوں میں سے بعض لوگ "الحاد" میں مبتلا ہو گئے یا "وحدت وجود" کے قائل ہو گئے۔ (ص: ۹۶، ۹۷)

امر واقعہ یہی ہے کہ جن لوگوں نے اپنے ذوق اور پسند سے ذکر کے خاص طریقے ایجاد کر لیے ہیں اور کتاب وسنت میں منصوص اذکار و اوراد سے مختلف اذکار و اوراد اختیار کر لیے ہیں وہ صحیح راہ سے بہت دور چلے گئے ہیں اور جس گمراہی کی جانب امام ابن تیمیہ نے اشارہ کیا ہے اس میں صوفیا کی اکثریت مبتلا ہو گئی ہے جس کو معلوم کرنے کے لیے تصوف کی کسی ایک کتاب پر طائرانہ نظر ڈال لینا کافی ہے۔

فضائلِ قرآن:

قرآن پاک کی تلاوت افضل ترین عبادتوں میں شمار ہوتی ہے لیکن اس تلاوت کے انہی فضائل کا اعتبار ہے جو صحیح احادیث میں نبی اکرم ﷺ نے بیان فرما دیے ہیں، اسی طرح جن سورتوں کے فضائل احادیث میں بیان ہوئے ہیں صرف وہی معتبر ہیں ان کے علاوہ ان سورتوں کے دوسرے فضائل بیان کرنا یا جن سورتوں کے فضائل نبی ﷺ سے صحیح احادیث میں منقول نہیں ہیں اپنی طرف سے ان کے فضائل بیان کرنا، یا کسی مقصد یا غرض کے لیے ان کی تلاوت کرنا یا لوگوں کو اس کی ترغیب دینا اُمت کے کسی بھی شخص کے لیے جائز نہیں ہے۔ قطع نظر اس کے کہ علم و معرفت اور صلاح و تقویٰ میں اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے یہ اس لیے کہ قرآن کی تلاوت، اس کی کسی آیت یا سورت کی فضیلت، کسی خاص دن، وقت اور غرض کے لیے اس کی

فضیلت یہ سب کچھ ''تعبدی امور'' ہیں جن کا تعین کرنے کے مجاز صرف رسول اللہ ﷺ تھے۔ اس امر پر تمام محدثین اور فقہاء کا اتفاق ہے۔

لیکن اس کے باوجود تفسیر کی کتابوں اور فضائلِ اعمال کی کتابوں میں جہاں تلاوتِ قرآن کے وہ فضائل بیان ہوئے ہیں جن کا کوئی ثبوت صحیح احادیث سے نہیں ملتا، وہیں قرآن پاک کی تقریباً سبھی سورتوں کے فضائل بیان ہوئے ہیں جبکہ معدودے چند سورتوں کے علاوہ صحیح احادیث میں اور سورتوں کے فضائل نہیں ملتے اور وضاعین حدیث نے اس باب میں ہزاروں کی تعداد میں حدیثیں وضع کر کے پھیلائی ہیں جن کو تفسیر اور فضائل اعمال کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے:

۸۲......((حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ حُجْرٍ : أَخْبَرَنَا حَفْصُ بْنُ سُلَيْمَانَ ، عَنْ كَثِيرِ بْنِ زَاذَانَ : عَنْ عَاصِمِ بْنِ ضَمْرَةَ ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ ، قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ :

مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَاسْتَظْهَرَهُ ، فَأَحَلَّ حَلَالَهُ وَحَرَّمَ حَرَامَهُ؟ أَدْخَلَهُ اللّٰهُ بِهِ الْجَنَّةَ وَشَفَّعَهُ فِي عَشَرَةٍ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهِ ، كُلُّهُمْ قَدْ وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ......))

''ہم سے علی بن حجر نے بیان کیا، کہا: ہم کو حفص بن سلیمان نے کثیر بن زاذان سے انہوں نے عاصم بن ضمرۃ سے اور انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کرتے ہوئے خبر دی، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

جس نے قرآن پڑھا اور اس کو حفظ کر لیا، اور اس کے حلال کو حلال جانا اور اس کے حرام کو حرام، تو اللہ اس کے بدلے اس کو جنت میں داخل کرے گا، اور اس کے اہل بیت میں سے ایسے دس (۱۰) آدمیوں کے لیے اس کی شفاعت قبول فرمائے گا جن میں سے ہر ایک کے لیے جہنم واجب ہو چکی ہو گی۔'' [سنن الترمذی، ح: ۲۹۰۵، ابن ماجه، ح: ۲۱۶، ضعیف الترغیب والترهیب، ح: ۸۶۸]

یہ نہایت ضعیف اور نا قابل اعتبار حدیث ہے، امام ترمذی نے یہ حدیث روایت کرنے کے بعد لکھا ہے:

''یہ حدیث ضعیف ہے جس کو ہم صرف اسی سند سے جانتے ہیں، اس کی سند صحیح نہیں ہے، حفص بن سلیمان روایتِ حدیث میں ضعیف ہے۔

حافظ ابن حجر نے حفص بن سلیمان کو ''متروک'' اور کثیر بن زاذان کو مجہول لکھا ہے۔''

[تقریب التهذيب ترجمه: ١٤٠٥، ٥٦٠٩]

۸۳...... ((عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ الْيَمَانِ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ : إِنَّ الْقَوْمَ لَيَبْعَثُ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْعَذَابَ حَتْمًا مَقْضِيًّا ، فَيَقْرَأُ صَبِيٌّ مِنْ صِبْيَانِهِمْ فِي الْكِتَابِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ، فَيَسْمَعُهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فَيَرْفَعُ عَنْهُمْ بِذَالِكَ الْعَذَابَ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً)) ❶

''حضرت حذیفہ بن الیمان سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: اللہ ایک قوم پر طے شدہ اور نافذ ہو جانے والا عذاب بھیجے گا، اس وقت اس قوم کے بچوں میں سے ایک بچہ کتاب میں ''الحمد للہ رب العالمین'' پڑھے گا جس کو سن کر اللہ تعالیٰ اس قوم سے اس کی وجہ سے چالیس سال کے لیے عذاب اُٹھا دے گا۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج ابو زید عبدالرحمٰن الثعلبی نے " **الجواهر الحسان في تفسير القرآن** " میں کی ہے اور وہیں سے الزمخشری نے اپنی تفسیر ''الکشاف'' میں اس کو نقل کیا ہے۔

حافظ جمال الدین الزیلعی ''**تخريج احاديث الكشاف**'' میں لکھتے ہیں:

''اس کی روایت الثعلبی نے اپنی تفسیر میں ابو معاویہ الضریر کے واسطہ سے کی ہے۔''

((عَنْ أَبِيْ مَالِكٍ الْأَشْجَعِيِّ ، عَنْ رَبْعِي بْنِ حِرَاشٍ ، عَنْ حذيفة عن النبى ﷺ :))

''ابو معاویہ الضریر نے ابو مالک الاشجعی سے انہوں نے ربعی بن حراش سے اور انہوں نے حذیفہ سے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:............''

حافظ ابن حجر'' **تخريج احاديث الكشاف** '' میں لکھتے ہیں:

''اس حدیث کی سند میں ابو معاویہ سے نیچے کا راوی نا قابل اعتبار ہے۔ اس موضوع حدیث کی شاہد وہ حدیث ہے جو ''مسند الداری'' میں ثابت بن عجلان سے مروی ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

((كَانَ يُقَالُ : إِنَّ اللّٰهَ لَيُرِيْدُ الْعَذَابَ بِأَهْلِ الْأَرْضِ ، فَإِذَا سَمِعَ تَعْلِيْمَ

❶ تفسير الكشاف ، تفسير سورة الفاتحه : ١٢٢/١

الصِّبْيَانِ بِالْحِكْمَةِ صَرَفَ ذٰلِكَ عَنْهُمْ " يَعْنِي بِالْحِكْمَةِ : القُرآن))

''بیان کیا جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اہل زمین کو عذاب دینے کا ارادہ کریں گے پس جب وہ بچوں سے حکمت کی تعلیم سُنیں گے تو ان سے یہ عذاب اُٹھالیں گے، حکمت سے مراد قرآن ہے۔''

اس طرح یہ حدیث حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ''فضائل القرآن سورۃ سورۃ'' میں بھی مروی ہے۔ مگر یہ سب ساقط اور نا قابلِ اعتبار ہیں۔ ابن مردویہ نے بھی اس کی روایت دو طریقوں سے کی ہے، اور الواحدی نے بھی الوسیط میں اسے نقل کیا ہے، حافظ الخطیب البغدادی اور حافظ ابن الصلاح نے یہ حدیث وضع کرنے والے سے یہ نقل کیا ہے کہ اس نے اس کو وضع کیا ہے اور ابوعصمہ نوح بن ابی مریم سے مروی ہے کہ اس نے اس کو وضع کیا ہے۔'' (۳۰/۱)

۸٤......((قال الحافظ ابو بكر أحمد بن محمد بن اسحاق المعروف بابن السُّنّي

فِيْ عَمَلِ الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ " حَدَّثَنَا أبو جعفر بْنُ مُحَمَّدٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ ، قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :

إِنَّ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَآيَةَ الْكُرْسِيِّ وَالآيَتَيْنِ مِنْ آلِ عِمْرَانَ ، شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَقُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ إِلَى وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ مُعَلَّقَاتٌ بِالْعَرْشِ مَا بَيْنَهُنَّ وَبَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ ، قُلْنَ : تَهْبِطُنَا إِلَى أَرْضِكَ وَإِلَى مَنْ يَعْصِيكَ؟ فَقَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ أحلِفُ : لَا يَقْرَؤُ كُنَّ أَحَدٌ مِنْ عِبَادِيْ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ إِلَّا جَعَلْتُ الْجَنَّةَ مَثْوَاهُ عَلَىٰ مَا كَانَ مِنْهُ وَإِلَّا أَسْكَنْتُهُ حَظِيْرَةَ الْقُدْسِ وَإِلَّا نَظَرْتُ إِلَيْهِ بِعَيْنِى الْمَكْنُوْنَةِ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ نَظْرَةً وَإِلَّا قَضَيْتُ لَهُ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ حَاجَةً أَوْنَا هَا الْمَغْفِرَةُ وَلَا عِنْدُهُ مِنْ كُلِّ عَدُوٍّ وَنَصَرْتُهُ مِنْهُ))

''حافظ ابوبکر احمد بن محمد بن اسحاق المعروف بابن السنی اپنی کتاب ''عمل الیوم واللیلة'' میں کہتے ہیں: ہم سے ابوجعفر بن محمد نے اپنے باپ سے انہوں نے ان کے دادا سے اور انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بے شک فاتحۃ الکتاب، آیۃ الکرسی اور آل عمران کی دو آیتیں: **شهد الله انه لا اله الا هو** اور **قل اللهم مالك الملك**، **و ترزق من تشاء بغير حساب** تک عرش پر معلق ہیں اور ان کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں، انہوں نے عرض کیا: تو ہمیں اپنی زمین پر اُتار رہا ہے اور اُن لوگوں کے پاس جو تیری معصیت کے مرتکب ہو رہے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں قسم کھاتا ہوں کہ میرے بندوں میں سے جو کوئی ہر نماز کے بعد تمہیں پڑھے گا تو میں اس کے اس عمل کے بدلے جنت کو اس کا ٹھکانہ بناؤں گا اور حظیرۃ القدس ''جنت'' میں اس کو آباد کروں گا اور اپنی پوشیدہ آنکھ سے ہر روز اس کو ستر بار دیکھوں گا اور ہر دن اس کی ستر ضرورتیں پوری کروں گا جن میں سے کمتر ضرورت مغفرت ہے، اور اس کو ہر دشمن سے محفوظ رکھوں گا اور اس پر اس کو فتح دوں گا۔''

حافظ جلال الدین السیوطی لکھتے ہیں:

''یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی روایت میں الحارث بن عُمیر منفرد ہے جو ثقہ راویوں سے موضوع حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔ یہ بات ابن حبان نے لکھی ہے۔''

[اللآلی المصنوعة: ۱/۲۰۸، ۲۰۹]

۸۵ ...... ((أَنْزَلَ اللّٰهُ آيَتَيْنِ مِنْ كُنُوزِ الْجَنَّةِ كَتَبَهُمَا الرَّحْمٰنُ بِيَدِهِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ الْخَلْقَ بِأَلْفَي سَنَةٍ مَنْ قَرَأَهُمَا بَعْدَ الْعِشَاءِ الآخِرَةِ اَجْزَاتَاهُ عَنْ قِيَامِ اللَّيْلِ))

[الكشاف، تفسير سورة البقره: ۱/ ۵۲۳]

''نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

اللہ نے سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتیں جنت کے خزانوں میں سے نازل فرمائی ہیں اور اُن کو اپنے ہاتھ سے، مخلوق کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے لکھا ہے جو ان کو آخری عشاء کے بعد پڑھے گا وہ قیام اللیل سے اس کی کفایت کریں گی۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج امام عبداللہ بن عدی نے "الکامل: ۷/ ۲۵۴۸" اور ابو القاسم حمزہ بن یوسف السہمی نے "تاریخ جرجان، ۲۶۸" میں کی ہے۔

اور حافظ الزیلعی نے اس کو "تخریج الکشاف: ۱/ ۱۶۹" میں نقل کر کے ابن عدی اور السہمی سے منسوب کیا ہے۔

اور حافظ ابن حجر نے لکھا ہے: اس کی تخریج ابن عدی نے عبداللہ بن مسعود کی حدیث سے کی ہے۔ اس کی سند میں الولید بن عباد شامل ہے جو مجہول ہے اور اس نے ابان بن ابی عیاش سے روایت کیا ہے جو متروک ہے۔[حاشیه علی الکشاف بقلم الاستاذین : عادل احمد عبدالموجود و علی محمد معوض : ۵۲۳/۱]

تلاوت قرآن پاک اور سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرہ کے فضائل صحیح احادیث میں بیان ہوئے ہیں لہٰذا موضوع حدیثوں میں بیان کردہ فضائل اور اجر و ثواب کا اعتقاد رکھ کر ان کی تلاوت کرنے کے بجائے اُن فضائل کے اعتبار کے ساتھ اُن کی تلاوت کرنی چاہیے جو صحیح احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابوسعید المعلیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں:

''میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے پکارا، لیکن میں نے آپ کو جواب نہیں دیا، میں نے بعد میں عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نماز پڑھ رہا تھا، اس پر آپ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے:

﴿ إِسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ﴾ [الانفال: ۲۴]

''اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو جب رسول تمہیں اس چیز کے لیے پکارے جو تمہیں زندگی دینے والی ہے۔''

پھر آپ نے فرمایا: میں تم کو ایک ایسی سورت سکھاؤں گا جو قرآن کی عظیم ترین سورت ہے، آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور جب آپ نے باہر نکلنے کا ارادہ فرمایا تو میں نے عرض کیا:

اے اللہ کے رسول! کیا آپ یہ نہیں فرما چکے ہیں:

''میں تم کو ایک ایسی سورت سکھاؤں گا جو قرآن کی سب سے عظیم سورت ہے؟''

اس پر آپ نے فرمایا:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾ "هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ الَّذِي أُوتِيتُهُ)) [حدیث نمبر: ۴۴۷۴]

''**الحمد للہ رب العالمین**، یہی السبع المثانی اور قرآن العظیم ہے جو مجھے عطا کی گئی ہے۔''

اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((بَيْنَا جِبْرِيلُ قَاعِدٌ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ : سَمِعَ نَقِيضًا مِنْ فَوْقِهِ فَرَفَعَ رَأْسَهُ ،

فَقَالَ : هَذَا بَابٌ مِنَ السَّمَاءِ فُتِحَ الْيَوْمَ ، لَمْ يُفْتَحْ قَطُّ إِلَّا الْيَوْمَ فَنَزَلَ مِنْهُ مَلَكٌ ، فَقَالَ : هذا مَلَكٌ نَزَلَ إِلَى الأَرْضِ ، لَمْ يَنْزِلْ قَطُّ إِلَّا اليَوْمَ فَسَلَّمَ وَقَالَ : أَبْشِرْ بِنُورَيْنِ أُوتِيتَهُمَا لَمْ يُؤْتَهُمَا نَبِيٌّ قَبْلَكَ ، فَاتِحَةُ الْكِتَابِ وَخَوَاتِيمُ سُورَةِ الْبَقَرَةِ ، لَنْ تَقْرَأَ بِحَرْفٍ مِنْهُمَا إِلَّا أُعْطِيتَهُ)) ❶

''جس وقت جبرائیل نبی ﷺ کی خدمت میں تشریف فرما تھے، اپنے اوپر شدید آواز سُنی، پس اپنا سر اوپر اُٹھایا اور کہا: یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج کھولا گیا ہے، اس سے قبل کبھی نہیں کھولا گیا تھا، بعد میں اس سے ایک فرشتہ اترا تو کہا: یہ ایک فرشتہ جو زمین پر اُترا ہے، آج سے پہلے کبھی نہیں اُترا تھا اور اس فرشتے نے سلام کیا اور کہا:

ایسی دو روشنیوں پر خوش ہو جایئے جو آپ کو عطا کی گئی ہیں، آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں عطا کی گئی تھیں، فاتحۃ الکتاب اور سورۃ البقرہ کی آخری آیات، آپ ان میں سے جو حرف بھی پڑھیں گے، وہ آپ کو عطا کیا جائے گا۔''

مطلب یہ ہے کہ سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتوں میں جن امور اور مسائل کا ذکر ہے اُن میں سے جس مسئلے پر مشتمل جملہ آپ پڑھیں گے اور آپ کی اتباع میں آپ کی اُمت کا کوئی فرد پڑھے گا اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی اُمت کے اس فرد کو وہ مسئلہ عطا فرمائے گا۔''

((عَنْ زَيْدٍ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا سَلَّام يَقُولُ : حَدَّثَنِي أَبُو أُمَامَةَ البَاهِلِيُّ ، قَالَ : سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ:

إِقْرَءُوا الْقُرْآنَ ، فَإِنَّهُ يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَفِيعًا لِأَصْحَابِهِ، إِقْرَءُوا الزَّهْرَاوَيْنِ ، الْبَقَرَةَ وَسُورَةَ آلِ عِمْرَانَ ، فَإِنَّهُمَا يَأْتِيَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَأَنَّهُمَا غَمَامَتَانِ أَو كَأَنَّهُمَا غَيَايَتَانِ أَوْ كَأَنَّهُمَا فِرْقَانِ مِنْ طَيْرٍ صَوَافَّ ، تُحَاجَّانِ عَنْ أَصْحَابِهِمَا إِقْرَءُوا سُورَةَ البَقَرَةِ ، فَإِنَّ أَخْذَهَا بَرَكَةٌ وَتَرْكَهَا حَسْرَةٌ وَلَا يَسْتَطِيعُهَا الْبَطَلَةُ)) ❷

''زید سے روایت ہے کہ انہوں نے ابو سلام کو کہتے ہوئے سُنا کہ مجھ سے حضرت ابو امامہ الباہلی نے بیان کیا، کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سُنا ہے: قرآن پڑھتے رہا کرو

❶ حدیث نمبر : ١٨٧٧
❷ حدیث : ١٨٧٤

، کیونکہ وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لیے شفیع اور سفارشی بن کر آئے گا۔ دو چمک دار اور روشن سورتوں، سورۃ البقرہ اور آل عمران کو پڑھتے رہا کرو، اس لیے کہ یہ دونوں قیامت کے دن اس طرح نمودار ہوں گی گویا یہ دو بدلیاں ہوں، یا دو سائباں ہوں، یا پر پھیلائے ہوئے پرندوں کی دو جماعتیں ہوں۔ یہ دونوں سورتیں اپنی تلاوت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑیں گی، سورۃ البقرہ کی تلاوت کرتے رہا کرو کیونکہ اس کی تلاوت اور اس میں موجود احکام پر عمل کرنے میں برکت ہے، اس کو چھوڑے رہنے میں پچھتاوا اور پشیمانی ہے اور کسلمند لوگ اس کی تلاوت پر قدرت نہیں رکھتے۔''

زبان نبوت سے نکلے ہوئے ان ارشادات کے مضمون پر غور کیجئے اور پھر ان سے اُن موضوع اور بے بنیاد روایتوں کے موازنہ کیجئے تو دونوں میں آپ کو زمین و آسمان کا فرق محسوس ہوگا اور یہ اندازہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ کونسی بات نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی ہے اور کونسی آپ سے غلط منسوب ہے۔

۸۶......((مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ آلِ عِمْرَان أُعْطِيَ بِكُلِّ آيَةٍ مِنْهَا أَمَانًا عَلَى جِسْرِ جَهَنَّمَ))

''جو سورۃ آل عمران پڑھے گا اسے اس کی ہر آیت کے بدلے جہنم کے پل پر سے گزرنے کے لیے امان نامہ عطا کر دیا جائے گا۔'' [تفسير الكشاف، تفسير سورة آل عمران : ۱/ ۶۸۴]

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج امام ابو الفرج عبدالرحمٰن بن الجوزی نے ''الموضوعات : ۱/ ۲۳۹، ۲۴۰'' میں ابوبکر بن ابوداؤد السجستانی کی سند سے کی ہے۔

((حدثنا محمد بن عاصم ، حدثنا شبابة بن سوار، حدثنا مَخْلَدُ بن عبدالواحد عن علي بن زيد بن جدعان و عطاء بن أبي ميمونة عن زِر بن حُبَيْشٍ عن أبي بن كعبٍ مرفوعاً في فضائل القرآن سورة سورة))

''ہم سے محمد بن عاصم نے بیان کیا، کہا: ہم سے شبابۃ بن سوار نے بیان کیا، کہا: ہم سے مخلد بن عبدالواحد نے علی بن زید بن جدعان اور عطاء بن ابی میمونہ سے، اور ان دونوں نے زر بن حُبیش سے اور انہوں نے ابی بن کعب سے قرآن پر ہر ہر سورت کے فضائل کے بارے میں مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

امام ابن الجوزی یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ابو اسحاق الثعلبی نے اس حدیث کو اپنی تفسیر قرآن میں ہر سورت کی تفسیر کے موقع پر بیان کیا ہے اور انہی کی پیروی ابوالحسن الواحدی نے اپنی تفسیر میں کی ہے، ان دونوں کا ایسا کرنا باعث تعجب نہیں ہے اس لیے کہ ان کا تعلق علمائے حدیث سے نہیں تھا۔ مگر تعجب ہے تو ابوبکر بن ابوداؤد پر کہ انہوں نے بھی فضائل قرآن کے بارے میں اپنی کتاب میں اس موضوع حدیث کو ہر سورت کے موقع پر نقل کیا ہے۔ حالانکہ ان کو معلوم ہے کہ اس کا حدیث ہونا محال ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ حَدَّثَ عَنِّيْ حَدِيْثًا يَرَى أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبَيْنِ))

''جس نے مجھ سے ایسی حدیث بیان کی جس کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ دو جھوٹوں میں سے ایک ہے۔''

امام ابن الجوزی آگے چل کر لکھتے ہیں:

''مخلد بن عبدالواحد درجہ منکر الحدیث ہے، جیسا کہ امام ابن حبان نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایسی منکر حدیثوں کی روایت میں منفرد ہے۔ جو ثقہ راویوں کی روایت کردہ حدیثوں سے مماثلت نہیں رکھتیں۔ امام احمد اور امام یحییٰ بن معین نے اس حدیث کے دوسرے راوی علی بن زید کے بارے میں کہا ہے کہ اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے، ائمہ حدیث کی ان وضاحتوں سے قطع نظر یہ حدیث خود اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہ موضوع ہے۔''

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ حدیث جتنے طریقوں سے مروی ہے ان میں سے کوئی بھی ''متروک'' وضاع اور جھوٹے راویوں سے پاک نہیں ہے۔

۸۲...... ((مَنْ قَرَأَ رُبْعَ الْقُرْآنِ فَقَدْ أُوتِيَ رُبْعَ النُّبُوَّةِ ، وَمَنْ قَرَأَ ثُلُثَ الْقُرْآنِ فَقَدْ أُوتِيَ ثُلُثَ النُّبُوَّةِ ، وَمَنْ قَرَأَ ثُلُثَيِ الْقُرْآنِ فَقَدْ أُوتِيَ ثُلُثَيِ النُّبُوَّةِ وَمَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فَقَدْ أُوتِيَ النُّبُوَّةَ))

''جس نے ایک چوتھائی قرآن کی تلاوت کی اس کو ایک چوتھائی نبوت مل گئی۔ اور جس نے ایک تہائی قرآن کی تلاوت کی اس کو ایک تہائی نبوت دیدی گئی۔ اور جس نے دو تہائی قرآن پڑھا اس کو دو تہائی نبوت مل گئی اور جس نے پورا قرآن پڑھا اس کو پوری نبوت عطا کر دی گئی۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ جس کے متن سے ''وضع'' کی بو آ رہی ہے۔ اس کی روایت ابوبکر الآجری نے ''آداب حملة القرآن (قلمي نسخه ، مكتبه ظاهريه) میں کی ہے اور اس کی سند یہ ہے:

((عَنْ مَسْلَمَةَ بْنِ عَلِيٍّ عَنْ زَيْدِ بْنِ وَاقِدٍ عَنْ مَكْحُولٍ عَنْ أَبِي اُمَامَةَ الْبَاهِلِي مَرْفُوعاً))

''مسلمہ بن علی سے روایت ہے، انہوں نے زید بن واقد سے روایت کیا، انہوں نے مکحول سے اور انہوں نے حضرت ابوامامہ الباہلی سے مرفوعاً روایت کیا۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی کہتے ہیں:

''مسلمہ بن علی پر کذب بیانی کا الزام ہے۔ اس حدیث کو امام ابن الجوزی نے "الموضوعات : ۱/ ۲۵۲" میں نقل کیا ہے جس میں ''الربع'' والا جملہ نہیں ہے۔ اور لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ یعنی موضوع ہے۔ بشر بن نمیر متروک ہے جس کو امام یحیٰ بن سعید نے ''کذاب'' بتایا ہے۔ اور حافظ السیوطی نے "اللآلی المصنوعه : ۱/ ۲۲۱" میں حسب عادت یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ حدیث صرف ضعیف ہے موضوع نہیں ہے اور اپنے اس حکم کے جو دلائل دیے ہیں ان میں کوئی وزن نہیں ہے۔ اور اس حدیث کے جو ''شواہد'' پیش کیے ہیں ان میں سے کسی بھی حدیث کی سند ''کذابوں'' سے خالی نہیں ہے۔''

[الضعيفة : ١/ ٦٨٨، ٦٩٠]

۸۸......((مَنْ قَرَأَ آيَةَ الْكُرْسِي لَمْ يَتَوَلَّ قَبْضَ نَفْسِهِ إِلَّا اللّٰهُ تَعَالَى......))

''جو آیۃ الکرسی پڑھا کرے تو اس کی روح صرف اللہ تعالیٰ ہی قبض کریں گے۔''

یہ موضوع ہے اور اس کا موضوع ہونا خود اس کے متن سے ظاہر ہے۔ اس کی تخریج حافظ الخطیب البغدادی نے "تاریخ بغداد : ۶/ ۱۷۴" میں محمد بن کثیر بن مروان الفہری کے طریقے سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ لَهِيْعَةَ عَنْ أَبِي قُبَيْلٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمْرٍو وَ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :))

''ہم سے عبداللہ بن لہیعہ نے ابوقبیل سے، انہوں نے عبداللہ بن عمرو سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

''یہ سند بے حد کمزور بلکہ موضوع ہے۔ جس کی علت محمد بن کثیر ہے جو متروک ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے " تقریب التهذیب ترجمه:٦٢٥٥ " میں صراحت کی ہے۔ امام ابن عدی

نے اس کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس سے باطل اور مصائب آمیز احادیث مروی ہیں۔ اور محمد بن کثیر کے شیخ عبداللہ بن لہیعہ خود کمزور حافظہ کی وجہ سے ضعیف ہیں۔ مگر ان سے اس موضوع پر حدیث کی روایت کا ذمہ داران کا شاگرد محمد بن کثیر ہے۔''

[الضعیفہ: ۵/ ۲۷]

اس موضوع حدیث کے متن سے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے نام سے جھوٹی حدیثیں گھڑنے والوں کے ذہن و دماغ کی ''جولان گاہیں'' کس قدر وسیع تھیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے اور ان کے عقائد کو خراب کرنے کے لیے وہ کس طرح کے عجیب وغریب مضامین بیان کرتے تھے۔

آیۃ الکرسی کی فضیلت مسلم ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((يَا أَبَا الْمُنْذِرِ! (كنية أبى بن كعب) أَتَدْرِیْ أَیُّ آيَةٍ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ مَعَكَ أَعْظَمُ؟ قَالَ : قُلْتُ : اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ۔ قَالَ : يَا أَبَا الْمُنْذِرِ! أَتَدْرِیْ أَیُّ آيَةٍ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ اَعْظَمُ؟ قَالَ : قُلْتُ: (اَللّٰهُ لَا إِلٰـهَ إِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَيُّوْمُ قَالَ : فَضَرَبَ فِیْ صَدْرِیْ وَقَالَ : وَاللّٰهِ لِيَهْنِكَ الْعِلْمُ أَبَا الْمُنْذِرِ!)) ❶

''اے ابوالمنذر! (ابی بن کعب کی کنیت) کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ کی کتاب جو تمہارے ساتھ ہے اس کی سب سے عظیم آیت کونسی ہے؟ کہا: میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ آپ نے فرمایا: اے ابوالمنذر! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ کی کتاب جو تمہارے ساتھ ہے اس کی سب سے عظیم آیت کونسی ہے؟ میں نے عرض کیا: ﴿ اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَيُّوْمُ ﴾ کہا: اس پر رسول اللہ ﷺ نے میرے سینے پر مارا اور فرمایا: اللہ کی قسم! اے ابوالمنذر! علم تم کو مبارک ہو۔''

نبی ﷺ جب کسی اہم بات کو ذہن نشین کرنا چاہتے یا اس کی اہمیت کو واضح کرنا چاہتے تو ایک سے زیادہ بار اس کو دہراتے جیسا کہ اس حدیث میں آپ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ایک ہی سوال دوبار کیا۔

امام النووی نے آیۃ الکرسی کے قرآن کی عظیم ترین آیت ہونے کا سبب یہ بیان کیا ہے:

❶ حدیث: ۱۸۸۵

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے اہم اسمائے ذات وصفات جمع کر دیے گئے ہیں، الوہیت، وحدانیت، حیاۃ، علم، ملک وفرمانروائی، قدرت اور ارادہ یہ اسمائے ذات وصفات کے سات اصول ہیں۔" [بحوالہ "منة المنعم فی شرح صحیح مسلم : ۵۰۸/۱]

۸۹......((إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ قَلْبًا ، وَقَلْبُ الْقُرْآنِ (يٰس) وَمَنْ قَرَأَ (يٰس) كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ بِقِرَاءَتِهَا قِرَاءَةَ الْقُرْآنِ عَشْرَ مَرَّاتٍ))

[الترمذی: ۲۸۸۷، الترغیب والترهیب: ۸۸۵، الدارمی: ۴۵۶/۲]

"ہر چیز کا دل ہے اور قرآن کا دل "یٰسین" ہے جو "یٰسین" پڑھے گا اللہ اس کے لیے اس کی اس قرأت کے بدلے دس (۱۰) بار قرآن کی قرأت کا ثواب لکھے گا۔"

یہ حدیث موضوع ہے۔ امام الترمذی نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

"یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس کو ہم صرف حمید بن عبدالرحمٰن کی روایت کردہ حدیث کے طور پر جانتے ہیں اور بصرہ میں قتادہ کی حدیث کو لوگ صرف اس طریقے سے جانتے ہیں اور ہارون ابو محمد مجہول الحال شیخ ہے۔ یٰسین کے فضائل کے باب میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی حدیث مروی ہے مگر اس کی سند ضعیف ہے۔ اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی حدیث ہے۔"

اور کتاب " **العلل: ۵۵/۲، ۵۶** " میں امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم لکھتے ہیں:

"میں نے اپنے والد امام ابو حاتم محمد بن ادریس الرازی، سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: اس حدیث کا راوی مقاتل، مقاتل بن سلیمان ہے۔ میں نے اس حدیث کو مقاتل بن سلیمان کی وضع کردہ پہلی کتاب میں دیکھا ہے۔ یہ حدیث باطل ہے جس کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے۔"

محدث محمد ناصر الدین البانی نے اس موضوع حدیث کی جو سند [الضعیفہ: ۳۱۲/۱] بیان کی ہے وہ یہ ہے:

((حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ وَسُفْيَانُ بْنُ وَكِيعٍ ، قَالَا ، حَدَّثَنَا حُمَيْدُ بْنُ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الرَّوَّاسِيُّ عَنِ الْحَسَنِ بْنِ صَالِحٍ ، عَنْ هَارُوْنَ أَبِي مُحَمَّدٍ عَنْ مُقَاتِلِ بْنِ حَيَّانَ ، عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ ، قَالَ : قَالَ النَّبِيُّ ﷺ :))

[ضعیف سنن الترمذی، ص: ۲۹۸]

امام ابو حاتم نے اس حدیث کا راوی مقاتل بن سلیمان کو قرار دیا ہے جبکہ الترمذی اور الدارمی میں ''مقاتل بن حیان'' ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ وہ مقاتل بن سلیمان ہے جو کذاب ہے، نہ کہ مقاتل بن حیان جیسا کہ بعض لوگوں کو التباس ہو گیا ہے کیونکہ امام ابو حاتم اس علم میں حجت کا درجہ رکھتے ہیں، اور امام الذھبی نے بھی حدیث کا راوی مقاتل بن سلیمان ہی لکھا ہے اور امام وکیع نے جس مقاتل کی تکذیب کی ہے وہ مقاتل بن سلیمان ہے نہ کہ مقاتل بن حیان کیونکہ ابن حیان سچا اور روایت حدیث میں قوی تھا اور یہ چیز امام وکیع جیسے ماہر محدث کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ لہٰذا لامحالہ یہ حدیث موضوع ہے۔

۹۰......((مَنْ قَرَأَ السُّوْرَةَ الَّتِي يُذْكَرُ فِيهَا آلِ عِمْرَانَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَمَلَائِكَتُهُ حَتَّى تَحْجِبَ الشَّمْسُ))

''جو جمعہ کے دن وہ سورت پڑھے جس میں آل عمران کا ذکر آیا ہے تو اللہ اور اس کے فرشتے سورج غروب ہونے تک اس پر درود بھیجتے رہیں گے۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج حافظ ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی نے '' **المعجم الکبیر** :۳/۱۰۵'' اور '' **المعجم الاوسط** : ۲/۸۰، ح:۶۲۹۳ '' میں احمد بن ماہان بن ابو حنیفہ کے طریقے سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا أَبِي عَنْ طَلْحَةَ بْنِ زَيْدٍ عَنْ يَزِيْدَ بْنِ سِنَانَ عَنْ يَزِيْدَ بْنِ جَابِرٍ الدِّمَشْقِيِّ عَنْ طَاوُسٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَرْفُوْعًا))

''ہم سے میرے والد نے طلحہ بن زید سے، انہوں نے یزید بن سنان سے، انہوں نے یزید بن جابر الدمشقی سے، انہوں نے طاؤس سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

حافظ الطبرانی نے یہ سند بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

''محمد بن ماہان اسمیں منفرد ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

''یہ سند موضوع ہے، احمد بن ماہان دراصل احمد بن محمد بن ماہان ہے، جس کے والد کی کنیت ابو حنیفہ ہے۔ ابن ابی حاتم نے ''**العلل** : ۱/۷۳'' میں اس کا ذکر جرح وتعدیل کے بغیر کیا ہے اور اپنے والد محمد بن ادریس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ''وہ مجہول ہے'' اس سند کے دوسرے راوی

طلحہ بن زید پر ''وضع حدیث'' کا الزام ہے، اور یزید بن سنان جس کی کنیت ابوفروہ اور لقب الرھاوی ہے ضعیف ہے۔ حافظ ابن حجر نے ''تقریب التہذیب ترجمہ: ۳۰۲۰'' میں طلحہ بن زید کو ''متروک'' لکھا ہے۔ اور امام احمد اور امام ابوداؤد نے اس سے ''وضع حدیث'' کو منسوب کیا ہے۔''

[الضعیفہ: ۱/ ۵۹۹، ۶۰۰]

۹۱......((حَمَلَةُ الْقُرْآنِ أَوْلِيَاءُ اللّٰهِ ، فَمَنْ عَادَا هُمْ ، فَقَدْ عَادَى اللّٰهَ وَمَنْ وَالَا هُمْ ، فَقَدْ وَالَى اللّٰهَ))

''حاملین قرآن اللہ کے دوست ہیں، پس جس نے ان سے دشمنی کی تو اس نے اللہ سے دشمنی کی اور جس نے ان سے دوستی کی اس نے اللہ سے دوستی کی۔''

یہ حدیث موضوع ہے اس کی تخریج امام شیرویہ الدیلمی نے "مسند الفردوس: ۲/ ۹۰" میں حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ الاصبہانی کے طریقے سے ''معلقا'' کی ہے۔ اس کی سند ہے:

((عَنِ الْحَسَنِ بْنِ إدريس العسكری : حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَهْلٍ : حَدَّثَنَا دَاوُد بْنُ الْمُحَبَّرِ عَنْ صَخْرِ بْنِ جُوَيْرِيَّةَ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ به))

''الحسن بن ادریس العسکری سے روایت ہے، کہا: ہم سے ابراہیم بن سہل نے بیان کیا، کہا: ہم سے داؤد بن المحبر نے صخر بن جویریہ سے، انہوں نے نافع سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

حافظ السیوطی نے اس موضوع حدیث کو " الجامع الصغیر : ۳۷۴۳ " میں نقل کیا ہے۔ العلامہ عبدالرؤف المناوی نے "فیض القدیر شرح الجامع الصغیر " میں حافظ السیوطی کی تعقیب ان الفاظ میں کی ہے:

''اس کی سند میں داؤد بن المحبر راوی ہے جس کا تذکرہ امام الذہبی نے ''الضعفاء'' میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ امام ابوحاتم محمد بن حبان البستی نے اس کے بارے میں یہ صراحت کی ہے کہ وہ ثقہ راویوں کے نام سے جھوٹی حدیثیں وضع کیا کرتا تھا اور حافظ ابونعیم نے "حلیۃ الأولیاء" میں اس کی روایت کی ہے اور انہی کے طریقے سے الدیلمی نے مسند الفردوس میں اس کے ''وضاع حدیث'' ہونے کی صراحت کرتے ہوئے اس حدیث کو نقل کیا ہے لہٰذا اگر السیوطی اس کا ذکر ابونعیم کے حوالہ سے کرتے تو بہتر تھا۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

''بلکہ بہتر تو یہ تھا کہ حافظ السیوطی ''الجامع الصغیر'' میں اس حدیث کونقل ہی نہ کرتے ، کیونکہ ''ذیل الاحادیث الموضوعة ، ص:۳۲، حدیث نمبر۱۵۵ '' میں ''تاریخ اصبہان '' میں ابونعیم کے حوالہ سے وہ اس کونقل کر چکے ہیں اور یہ بھی لکھ چکے ہیں: ''حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں اس حدیث کو''منکر خبر'' قرار دیا ہے۔ ابونعیم نے اس کا ذکر الحسن بن ادریس کے ترجمہ میں کیا ہے لیکن اس کی آفت اور مصیبت دراصل داؤد بن المحبر ہے۔''

البانی سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :یہ حدیث اصل میں ''اخبار اصبہان : ۱/ ۲۶۴'' میں ہے۔ ''حلیہ الاولیاء'' میں نہیں جیسا کہ المناوی گمان کر بیٹھے۔''الحسن بن ادریس کا شمار(حافظ ابومحمد، عبداللہ بن محمد بن جعفر المعروف بأبی الشیخ کے شیوخ میں ہوتا ہے جیسا کہ انہوں نے خود اپنے طبقات (۳۸۹، ۵۳۱)میں اس کا تذکرہ کیا ہے، لیکن اس کی جرح وتعدیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔

اور الخطیب البغدادی نے'' تاریخ بغداد:۲/ ۲۴۸''میں لکھا ہے:

''مجھ سے محمد بن یوسف القطان نے بیان کیا کہ الحسن بن ادریس غیر ثقہ تھا اور''صوفیا'' کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔''

[الضعیفه: ۱/ ۳۹۲، ۳۹۳]

۹۲......((حَامِلُ الْقُرْآنِ حَامِلُ رَايَةِ الإِسْلَامِ ، مَنْ أَكْرَمَهُ ، فَقَدْ أَكْرَمَ اللّٰهَ وَمَنْ أَهَانَهُ، فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ))

''حاملِ قرآن پرچم اسلام بلند رکھنے والے کے مانند ہے جس نے اس کی تعظیم کی تو اس نے اللہ کی تعظیم کی اور جس نے اس کی اہانت کی تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔اس کی روایت امام الدیلمی نے ''مسند الفردوس: ۲/ ۸۸ '' میں محمد بن یوسف الکدیمی تک اپنی سند سے اور الکدیمی نے حضرت ابوامامہ الباہلی تک اپنی سند سے مرفوعاً روایت کی ہے۔

اس موضوع حدیث کو حافظ السیوطی نے'' ذیل الاحادیث الموضوعہ،ص:۲۳، ح:۱۱۶''میں نقل کیا ہے اور حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''الکدیمی پر وضع حدیث کا الزام ہے۔''

اس اعتراف کے باوجود انہوں نے اس موضوع حدیث کو''الجامع الصغیر:۲۶۷۵''میں درج کر دیا

ہے۔ اسی وجہ سے علامہ المناوی نے یہ کہہ کر ان کی تعقیب کی ہے کہ ''الکدیمی وضاع ہے۔''

۹۳......((فَضْلُ حَمَلَةِ الْقُرْآنِ عَلَى الَّذِیْ لَمْ یَحْمِلْهُ كَفَضْلِ الْخَالِقِ عَلَى الْمَخْلُوْقِ))

''حاملینِ قرآن کو اس پر جو حامل قرآن نہیں ہے وہی فضیلت حاصل ہے جو فضیلت خالق کو مخلوق پر حاصل ہے۔''

یہ نبی اکرم ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے جس کی نکارت اس کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اس کی تخریج بھی الدیلمی نے ''مسند الفردوس: ۱۷۸/۲'' میں محمد بن تمیم الفریابی کی سند سے کی ہے۔

((حَدَّثَنَا حَفْصُ بْنُ عُمَرَ : حَدَّثَنَا الْحَكَمُ بْنُ أَبَّانَ عَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ ابْنِ عباس رَفَعَهُ))

''ہم سے حفص بن عمر نے بیان کیا، کہا: ہم سے الحکم بن ابان نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا اور حضرت ابن عباس نے اس کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا۔''

حافظ السیوطی نے ذیل الاحادیث الموضوعہ، ص: ۳۲'' میں یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''حافظ ابن حجر نے '' زهر الفردوس '' میں لکھا ہے کہ یہ جھوٹ ہے اور میں کہتا ہوں کہ اس کی آفت محمد بن تمیم ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

''اس اعتراف کے باوجود حافظ السیوطی نے اس جھوٹی روایت کو اپنی کتاب ''الجامع الصغیر: ۳۹۷۴'' میں درج کر دیا ہے۔ محمد بن تمیم کو حافظ الخطیب البغدادی نے ''کذاب، حدیث وضع کرنے والا'' لکھا ہے۔ امام الحاکم نے لکھا ہے: ''وہ خبیث کذاب تھا۔'' اور حافظ ابونعیم نے بھی اس کو ''کذاب اور وضاع حدیث'' بتایا ہے۔ [الضعیفه : ۵۷۱/۱، ۵۷۲]

۹۴......((مَا مِنْ مَیِّتٍ یَمُوْتُ ، فَیُقْرَأُ عِنْدَهُ سُوْرَةُ (یسین) إِلَّا هَوَّنَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ))

جو بھی مرنے والا مر رہا ہو اور اس کے پاس سورۂ یٰسین پڑھی جائے تو اللہ عزّ وجل اس پر موت کی سختی کم کر دے گا۔''

''یہ حدیث موضوع ہے اس کی تخریج امام الدیلمی نے ''مسند الفردوس: ۱۷/۴'' میں ابونعیم سے معلقاً

روایت کرتے ہوئے کی ہے۔ اور یہ حدیث اصل میں ''اخبار اصبہان: ۱/۱۸۸'' میں مروی ہے۔ اس کی سند ہے:

((عَنْ عَبْدِ الْمَجِيْدِ بْنِ أَبِيْ داؤد عَنْ مَرْوَانَ بْنِ سَالِمٍ عَنْ صَفْوَانَ ابْنِ عَمْرو عَنْ شُرَيْحٍ عَنْ أبي الدرداء وابي ذر مرفوعاً))

''عبدالمجید بن ابوداؤد سے روایت ہے، انہوں نے مروان بن سالم سے روایت کیا، انہوں نے صفوان بن عمرو سے، انہوں نے شُریح سے اور انہوں نے ابوالدرداء اور ابوذر سے مرفوعاً روایت کیا۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

''یہ حدیث موضوع ہے جس کی آفت مروان بن سالم ہے۔ شیخان اور امام ابوحاتم نے اس کو ''منکر الحدیث'' بتایا ہے۔'' امام ابوتمرو یہ الحسین بن محمد الحرانی نے اس کے بارے میں لکھا ہے: ''وہ حدیث وضع کرتا تھا۔'' اور امام ابویحییٰ زکر بن یحییٰ الساجی نے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے: ((كذاب يضع الحديث)) ''جھوٹا ہے اور حدیث وضع کرتا ہے۔'' یہ حدیث اصلا مقطوع ہے۔ اس لیے کہ صفوان کی تمام روایتیں تابعین سے ہیں۔ اور اس خبیث اور کذاب مروان بن سالم نے اس کو مرفوع کر دیا اور اس کی سند کو متصل بنا دیا۔

[الضعيفه : ۱۱/۳۶۳،۳٦٤]

۹۵...... ((مَنْ دَخَلَ الْمَقَابِرَ ، فَقَرَأَ سُوْرَةَ (يسين) خَفَّفَ عَنْهُمْ يَوْمَئِذٍ ، وَلَهُ بِعَدَدِ مَنْ فِيْهَا حَسَنَاتٍ))

''جو کوئی قبرستانوں میں داخل ہو، اور سورۂ یسین پڑھے تو اس دن اللہ وہاں کر مُردوں کے عذاب میں تخفیف کر دے گا اور سورۂ یٰسین پڑھنے والے کے لیے وہاں کے مُردوں کی تعداد کے مطابق نیکیاں لکھی جائیں گی۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج الثعلبی نے اپنی تفسیر میں (۳/۱۶۱) محمد بن احمد الریاحی کے طریقے سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا أَبِيْ : حَدَّثَنَا أَيُّوْبُ بْنُ مُدْرِكٍ عَنْ أَبِيْ عُبَيْدَةَ عَنِ الْحَسَنِ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ مَرْفُوْعًا))

''ہم سے میرے والد نے بیان کیا، کہا ہم سے ایوب بن مدرک نے ابوعبیدہ سے، انہوں نے الحسن سے اور انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

یہ سند تاریک اور ہلاک کر دینے والی اور متعدد علتوں سے پُر ہے:

۱۔ ابوعبیدہ کو امام یحییٰ بن معین نے ''مجہول'' قرار دیا ہے۔

۲۔ ایوب بن مدرک کے ضعیف اور متروک ہونے پر ائمہ حدیث کا اتفاق ہے۔ بلکہ امام یحییٰ بن معین نے اس کو بصراحت کذاب بتایا ہے۔ اور امام ابن حبان نے لکھا ہے کہ اس نے مکحول سے موضوع حدیثوں کا ایک مجموعہ روایت کیا ہے۔ حالانکہ اس نے مکحول کو نہیں دیکھا ہے اور یہی اس حدیث کی مصیبت ہے۔

۳۔ احمد الریاحی، جس کا نام ابوالعوام احمد بن یزید بن دینار ہے، اس کو امام البیہقی نے مجہول لکھا ہے جیسا کہ ''لسان المیزان'' میں صراحت ہے۔[الضعیفه : ۳/ ۳۹۷، ۳۹۸]

۹۶......((مَنْ مَرَّ عَلَى الْمَقَابِرِ فَقَرَأَ فِيهَا إِحْدَى عَشْرَةَ مَرَّةً ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ ثُمَّ وَهَبَ أَجْرَهُ لِلْأَمْوَاتِ ؛ أُعْطِيَ مِنَ الْأَجْرِ بِعَدَدِ الْأَمْوَاتِ))

''جو شخص قبرستان پر سے گزرے اور ان میں گیارہ بار قل هو الله احد پڑھے، پھر اس کا ثواب مردوں کو بخش دے تو اس کو مُردوں کی تعداد کے برابر اجر و ثواب ملے گا۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج عبدالکریم الرافعی نے ''تاریخ قزوین : ۲/ ۲۹۷'' میں داؤد بن سلیمان الغازی کی سند سے کی ہے:

((أَنْبَأَنَا عَلِيُّ بْنُ مُوسَى الرِّضَا : حَدَّثَنِيْ أَبِيْ مُوسَى بْنُ جعفرٍ عَنْ اَبِيْهِ الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ....))

''ہم کو علی بن موسیٰ الرضا نے خبر دی، کہا: مجھے میرے والد موسیٰ بن جعفر نے اپنے باپ الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بتایا، کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''

یہ سند موضوع ہے اور اس کی مصیبت یہی ''الغازی'' ہے، امام الذہبی نے ''میزان الاعتدال'' میں لکھا ہے:

''یحییٰ بن معین نے اس کی تکذیب کی ہے اور امام ابو حاتم اس سے واقف نہیں تھے۔ بہر حال وہ ایک جھوٹا شیخ تھا۔ علی بن الرضا سے اس نے جھوٹی حدیثوں کا ایک نسخہ راویت کیا ہے، اس

راویت میں اس کا ایک متابع ہے مگر وہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہے۔''

یہاں یہ واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حالتِ نزع میں، موت کے بعد، کفن دفن کے بعد اور بعد میں قبروں کی زیارت کے موقع پر قرآن پاک یا اس کی کسی سورت کی تلاوت کا کوئی ثبوت کتاب وسنّت سے نہیں ملتا۔ چاہے وہ سورۂ یٰسین ہو یا سورۂ اخلاص یا کوئی اور سورت۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں یا لوگوں کو اس کی دعوت دیتے ہیں ان کا یہ فعل کتاب وسنّت کی کسی نص پُر مبنی نہیں ہے بلکہ مبنی بر قیاس ہے جبکہ یہ مسئلہ علمائے اسلام کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ تلاوت قرآن عبادت ہے اور عبادت تمام کی تمام توقیفی ہیں۔ اور وہی عبادت معتبر اور عنداللہ مقبول ہے جو منصوص ہو، عبادات قیاسی اُمور نہیں ہیں لہٰذا قرآن پاک کی تلاوت اور اس کے ثواب کو مُردوں کے لیے بخشنے کے عمل کو عمومی دعا، حج وعمرہ، صدقہ اور قرضہ ادا کرنے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح حالتِ نزع میں اور میت کو دفن کرنے کے بعد انفرادی یا اجتماعی شکل میں سورۂ یٰسین کی تلاوت بھی غیر مشروع ہے اور اس کی دلیل وہ حدیث نہیں بن سکتی جو ان الفاظ میں مروی ہے:

((إِقْرَءُ وا سُورَةَ (يس) عَلَى مَوتَاكُمْ))

''اپنے مُردوں پر سورۂ یٰسین پڑھ کرو......''

یہ حدیث امام احمد نے اپنی مسند میں ضعیف سند سے روایت کی ہے۔ اس کی سند میں ابو عثمان اور اس کا باپ دونوں مجہول ہیں۔ مزید یہ کہ یہ حدیث موقوف ہے اور اس کے متن میں اضطراب ہے۔ لہٰذا اس ناقابلِ اعتماد حدیث سے اس عمل کو جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔

۹۷......((مَنْ قَرَأَ (يس) يُرِيدُ بِهَا اللّٰهَ ، غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ ، وَأُعْطِيَ مِنَ الْأَجْرِ كَأَنَّمَا قَرَأَ الْقُرْآنَ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ مَرَّةً ، وَأَيُّمَا مَرِيضٍ ، قُرِئَ عِنْدَهُ سُورَةُ (يس) نَزَلَ عَلَيْهِ بِعَدَدِ كُلِّ حَرْفٍ عَشَرَةُ أَمْلَاكٍ ، يَقُومُونَ بَيْنَ يَدَيْهِ صُفُوفًا ، فَيُصَلُّونَ وَيَسْتَغْفِرُونَ وَيَشْهَدُونَ قَبْضَهُ وَغَسْلَهُ وَيَتْبَعُونَ جَنَازَتَهُ وَيُصَلُّونَ عَلَيْهِ وَيَشْهَدُونَ دَفْنَهُ ، وَأَيُّمَا مَرِيضٍ قَرَأَ سُورَةَ (يس) وَهُوَ فِي سَكَرَاتِ الْمَوْتِ؟ لَمْ يَقْبِضْ مَلَكُ الْمَوْتِ رُوحَهُ حَتَّى يَجِيئَهُ رِضْوَانُ خَازِنُ الْجِنَانِ بِشُرْبَةٍ مِنَ الْجَنَّةِ ، فَيَشْرَبُهَا وَهُوَ عَلَى فِرَاشِهِ ، فَيَمُوتُ وَهُوَ رَيَّانُ وَلَا يَحْتَاجُ إِلَى حَوْضٍ مِنْ حِيَاضِ الْأَنْبِيَاءِ ، حَتَّى يَدْخُلَ الْجَنَّةَ وَهُوَ رَيَّانُ))

''جو شخص اللہ کی خوشنودی کے لیے سورۂ یٰسین پڑھے گا، اللہ اس کی مغفرت فرمائے گا۔ اور اس کو

اتنا اجر عطا فرمائے گا جیسے اس نے پورے قرآن کو بارہ مرتبہ پڑھا ہو اور جس مریض کے پاس سورۂ یٰسین پڑھی جائے تو اس پر اس کے ہر حرف کے بدلے دس (۱۰) فرشتے نازل ہوں گے جو اس کے سامنے صف باندھے کھڑے رہیں گے، نمازیں پڑھیں گے، اس کے لیے استغفار کریں گے، اس کی روح قبض ہوتے اور اس کے غسل کو دیکھیں گے، اس کے جنازے کے پیچھے جائیں گے، اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے، اس کے دفن کا مشاہدہ کریں گے اور جس مریض کے پاس سکرات الموت کی حالت میں سورۂ یٰسین پڑھی جائے، اس کی روح ملک الموت اس وقت تک قبض نہیں کرے گا جب تک کہ جنت کا محافظ ''رضوان'' جنت کی شراب نہیں لے آئے گا جس کو وہ اپنے بستر ہی پر پیے گا اور اس حال میں مرے گا کہ شکم سیر ہو گا اور انبیاء کے حوضوں میں سے کسی حوض کا محتاج نہیں ہو گا اور جنت میں شکم سیر داخل ہو گا۔''

یہ روایت موضوع اور من گھڑت ہے۔ اس کی تخریج ابو زید عبدالرحمٰن الثعلبی اپنی تفسیر ''الجواهر الحسان: ۱۶۱/۳'' میں اسماعیل بن ابراہیم سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا يُوسُفُ بْنُ عَطِيَّةَ عَنْ هَارُوْنَ بْنِ كَثِيْرٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ أَبِيْ اَمَامَةَ عَنْ أُبِيِّ بْنِ كَعْبٍ مَرْفُوْعًا))

''ہم سے یوسف بن عطیہ نے ہارون بن کثیر سے، انہوں نے زید بن اسلم سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے ابو امامہ سے اور انہوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

اس حدیث کی سند اور متن دونوں سے اس کا موضوع اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جھوٹ ہونا واضح ہے۔ اس کی مصیبت یوسف بن عطیہ الباہلی ہے جس پر کذب بیانی اور وضع حدیث کا الزام ہے۔ حافظ عمرو بن علی الفلاس فرماتے ہیں:

''یوسف بن عطیہ الکوفی یوسف بن عطیہ البصری سے بڑا جھوٹا تھا۔''

امام الدارقطنیؒ کا قول ہے:

''دونوں متروک ہیں۔''

اور ہارون بن کثیر جس سے یوسف بن عطیہ نے یہ حدیث روایت کی ہے مجہول ہے۔ اور وضع حدیث میں اپنے شاگرد کی طرح ہے۔ امام ابن ابی حاتم ''العلل: ۶۷/۲'' میں لکھتے ہیں:

''میں نے اپنے والد سے اس حدیث کے بارے میں سوال کیا جس کی روایت سوید ابو حاتم نے سلیمان التیمی سے، انہوں نے ابو عثمان سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کی ہے:

۱ ......((مَنْ قَرَأَ (یسن) مَرَّةً فَكَأَنَّمَا قَرَأَ الْقُرْآنَ عَشْرَ مِرَارٍ))

''جس نے ''یسین'' ایک بار پڑھی تو گویا اس نے قران دس (۱۰) بار پڑھا۔''

اور ابو سعید نے کہا:

۲ ......((مَنْ قَرَأَ (یسن) مَرَّةً فَكَأَنَّمَا قَرَأَ الْقُرْآنَ مَرَّتَيْنِ))

''جس نے ''یسین'' ایک بار پڑھی تو گویا اس نے قرآن دو بار پڑھا۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو سعید سے کہا:

''تم وہ بیان کرو جو تم نے سُنا ہے اور میں وہ بیان کروں جو میں نے سُنا ہے۔''

تو میرے والد نے فرمایا: ((هٰذَا حَدِيثٌ مُنْكَرٌ)) ''یہ حدیث منکر ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث باطل ہے جس کا بطلان بالکل واضح ہے، کیونکہ یہ بات کس طرح معقول ہو سکتی ہے کہ کسی شے کا جزء کل کے برابر یا اس سے دگنی فضیلت رکھتا ہو، دس (۱۰) بار افضل ہونا تو دور کی بات ہے۔ لہٰذا جس نے پورا قرآن دو بار پڑھا تو اس نے ''یٰسین'' بھی دو بار پڑھی ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا ایک بار پڑھنا، قرآن کو دو بار پڑھنے کے ساتھ، اس کو دو بار پڑھنے سے افضل ہو؟'' [الضعیفہ : ۱۰/۱۵۷، ۱۵۸]

۹۸ ......((مَنْ كَتَبَ (يٰس) ثُمَّ شَرِبَهَا ، دَخَلَ جَوْفَهُ أَلْفُ نُورٍ ، وَأَلْفُ رَحْمَةٍ وَأَلْفُ بَرَكَةٍ ، وَأَلْفُ دَوَاءٍ ، أَوْ خَرَجَ مِنْهُ أَلْفُ دَاءٍ))

''جس نے ''یسین'' لکھا، پھر اس کو پی گیا تو اس کے پیٹ میں ایک ہزار نور، ایک ہزار رحمت، ایک ہزار برکت اور ایک ہزار دوا داخل ہو گئی۔ یا اس کے اندر سے ایک ہزار بیماریاں نکل گئیں۔''

یہ روایت موضوع ہے۔ اس کی تخریج عبدالکریم الرافعی نے " تاریخ قزوین : ۳/۹۶ " میں اس تاریک سند سے کی ہے:

((عَنِ الْأَحْوَصِ بْنِ حَكِيمٍ عَنْ أَبِي عَوْنٍ عَنْ إِسْمَاعِيلَ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ

عَنِ الْحَارِثِ عَنْ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ :))

''الأ حوص بن حکیم سے روایت ہے، انہوں نے ابوعون سے، انہوں نے اسماعیل سے، انہوں نے ابواسحاق سے، انہوں نے الحارث سے، انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ نے فرمایا..........''

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

''یہ متن باطل ہے جس کا باطل اور موضوع ہونا بالکل واضح ہے اور ممکن ہے کہ اس کا وضع کرنے والا ''الأ حوص'' سے نیچے کا کوئی ہو، کیونکہ الأ حوص ضعیف تو ہے مگر اس پر ''وضع حدیث'' کا الزام نہیں ہے اگرچہ ابن حبان نے " الضعفاء : ١/١٧٥ " میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

''مشاہیر محدثین سے وہ منکر احادیث روایت کیا کرتا تھا اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی تنقیص کیا کرتا تھا اور یحییٰ القطان وغیرہ نے اس کو ترک کر دیا تھا۔''

اس بات کا بھی امکان ہے کہ اس حدیث کو وضع کرنے کا صدور الأ حوص سے اوپر کے کسی راوی سے ہوا ہو:

١...... یا تو اس کے شیخ ابوعون سے جو غیر معروف تھا، الدولابی نے "الکنی : ٢/٤٨ " میں اس کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

''ابوعون الانصاری: الاحوص بن حکیم اس سے حدیث روایت کرتا تھا۔''

حافظ ابن حجر نے "لسان المیزان " کے باب "الکنی " میں اس کا نام عمرو بن عمرو لکھا ہے اور ''باب الاسماء " میں لکھا ہے:

''عمرو بن عمرو بن عون بن تمیم ابوعون الانصاری، اس سے سعید بن عُفیر نے حدیث روایت کی ہے، ''مجہول'' ہے۔''

ب ..... یا اس حدیث کو وضع کرنے کا فعل الحارث الاعور سے صادر ہوا ہو، کیونکہ بعض لوگوں نے اس پر جھوٹ اور کذب بیانی کا الزام لگایا ہے۔

رہا ابو اسحاق جس کا لقب ''السبیعی'' ہے تو اس باطل حدیث کی نسبت اس کی طرف بعید از امکان ہے اگرچہ ان کا ذہنی اور عقلی توازن بگڑ گیا تھا لہٰذا اس جرم کا ارتکاب یا تو اس کے شیخ نے

کیا ہے یا اس سے نیچے کے کسی راوی نے۔" [الضعیفه : ۲۹۵/۷، ۲۹۶]

۹۹......((مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ (يس) فِيْ لَيْلَةِ الْجُمُعَةِ ، غُفِرَ لَهُ))

"جو شخص جمعہ کی رات میں سورۂ یسین پڑھے تو اس کی مغفرت کردی جائے گی۔"

یہ حدیث موضوع تو نہیں ہے البتہ اس کی سند بے حد ضعف ہے۔ اور اس کی "آفت" الأغلب بن تمیم ہے جس کے بارے میں امام ابن حبان " کتاب الضعفاء : ۱۶۶/۱ " میں لکھتے ہیں:

"الأغلب بن تمیم منکر الحدیث ہے۔ وہ ثقہ راویوں سے ایسی حدیثیں روایت کرتا تھا جو اُن سے مروی نہیں ہیں جس کی وجہ سے اور بکثرت غلطیوں کے ارتکاب کی وجہ سے وہ دلیل بنانے کے قابل نہیں رہا۔"

دوسرے ائمہ حدیث نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے اس کی سند کے دوسرے راوی، زید بن الحریش، کے بارے میں امام ابن حبان نے کتاب "الثقات " میں لکھا ہے:

((ربما اخطأ)) "بسا اوقات اس نے غلطیاں کی ہیں۔"

اور یحییٰ ابن القطان کا قول ہے:

"زید بن الحریش، مجہول الحال ہے۔"

اسی سند سے ابن السنی نے اس حدیث کی تخریج "عمل اليوم والليلة ، حديث : ٦٦٨ " میں اور امام ابن عدی نے " الكامل : ۲۱۶/۱ " میں کی ہے۔ لیکن " في ليلة الجمعة " کا ذکر نہیں ہے بلکہ ان کی روایت میں: "في يوم و ليلةابتغاء وجه الله غفرله " کی عبارت ہے۔" [الضعيفه : ۱۹۱/۱۱]

درحقیقت سورۂ یسین کی فضیلت میں کوئی بھی صحیح حدیث رسول اللہ ﷺ سے مروی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں جتنی حدیثیں تفسیر کی کتابوں یا فضائل اعمال کی کتابوں میں ملتی ہیں یا لوگوں میں زبان زد ہیں وہ سب کی سب موضوع ہیں۔ سوائے دو حدیثوں کے جو ضعیف ہیں مگر موضوع سے قریب تر ہیں۔ یہ تمام حدیثیں سند کے ساتھ ساتھ اپنے متن اور مضمون کے اعتبار سے بھی اسلام کے اعتدال پسند مزاج کے خلاف ہیں جن کو بادیٔ نظر سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

۱۰۰......((أُسِّسَتِ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْأَرَضُوْنَ السَّبْعُ عَلَى ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾))

"ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو " قل هو الله احد " پر قائم کیا گیا ہے۔"

حافظ جمال الدین عبداللہ الزیلعی " تخريج احاديث الكشاف : ۳۳۱/۴ " میں لکھتے ہیں:

''ان الفاظ میں یہ حدیث غریب یعنی بے اصل ہے، اور حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ مجھے یہ حدیث ''مرفوعا'' نہیں ملی۔''

ان دو جلیل القدر حفاظِ حدیث کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ یہ عبارت نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ حافظ الزیلعی جب یہ فرماتے ہیں:"غريب بهذا اللفظ "ان الفاظ میں غریب ہے تو اس سے ان کی مُراد یہ ہوتی ہے کہ''اس حدیث کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔'' غریب کہہ کر'' بے بنیاد'' مراد لینا ان کی خاص اصطلاح ہے جبکہ امام الترمذی''غریب'' سے ضعیف مراد لیتے ہیں جیسا کہ اہل فن جانتے ہیں۔

حافظ الزیلعی اس موضوع حدیث کی سند بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابن ابی شیبہ نے یہ حدیث فضائل القرآن کے موضوع پر اپنی منفرد کتاب میں بیان کی ہے اور اسکی سند ہے:

((حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ مُوسَى ، حَدَّثَنَا أَبُو هِلَالٍ ، عَنْ قَتَادَةَ ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ غَيْلَانَ الثَّقَفِي أَنَّهُ كَانَ أَمِيرًا عَلَى الْبَصْرَةِ ، فَقَالَ : حَدَّثَنِي هٰذَا الرَّجُلُ الصَّالِحُ كَعْبُ الْأَحْبَار : إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى أَسَّسَ الْأَرضِيْنَ عَلَى ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ﴾))

''ہم سے الحسن بن موسیٰ نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابو ھلال نے قتادہ سے، اور انہوں نے عبداللہ بن غیلان الثقفی سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ وہ بصرہ کے امیر تھے اور کہا: مجھ سے اس صالح آدمی کعب الاحبار نے بیان کیا: بے شک اللہ تعالیٰ نے زمینوں کو"قل هو الله احمد " پر قائم کیا ہے۔''

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کو کعب الاحبار پر موقوف قرار دیا ہے۔[بحواله حاشيه الكشاف بقلم الشيخ عادل احمد عبدالموجود والشيخ على محمد معوض : ٤٦٣/٦ تفسير سورة الاخلاص]

۱۰۱ ...... ((مَنْ قَرَأَ ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ﴾ مِئَتَى مَرَّةٍ ، كَتَبَ اللّٰهُ أَلْفًا وَخَمْسَ مِئَةِ حَسَنَةٍ إِلَّا أَنْ يَكُونَ عَلَيْهِ دَيْنٌ))

''جو شخص"قل هو الله احد' دوسو(۲۰۰) بار پڑھے تو اللہ اس کے لیے پندرہ سو(۱۵۰۰)

نیکیاں لکھے گا الاّ یہ کہ اس پر قرض ہو۔ (تو وہ معاف نہیں ہوگا)''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج امام ابن عدی نے "الکامل : ۱/۲۴۸، ۸۴۹" میں، انہی سے امام البیہقی نے "شعب الایمان : ۱/۲/۳۵" میں اور حافظ الخطیب البغدادی نے "تاریخ بغداد : ۶/۲۰۴" میں ابوالربیع الزہرانی کی سند سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا حَاتِمُ بْنُ مَيْمُوْنٍ ، عَنْ ثَابِتٍ عَنْ اَنَسٍ مَرْفُوعًا))

''ہم سے حاتم بن میمون نے ثابت سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعا روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

محمد ناصرالدین البانی کہتے ہیں:

''یہ سند بے حد ضعیف ہے۔ اس حاتم بن میمون کے بارے میں ابن حبان نے "الضعفاء : ۱/ ۲۷۰" میں لکھا ہے:

وہ اپنی مرویات کی قلت کے باوجود منکر الحدیث ہے، وہ ثابت سے ایسی حدیثیں روایت کرتا تھا جو ان کی روایت کردہ حدیثوں کی طرح نہیں ہوتی تھیں۔''

امام بخاری فرماتے ہیں:

''اس نے منکر احادیث روایت کی ہیں، ائمہ حدیث اس طرح کے مشائخ سے دامن بچاتے تھے۔''

امام ابن الجوزی نے یہ حدیث "الموضوعات : ۲/۲۴۴" میں الخطیب کے حوالے سے درج کی ہے اور لکھا ہے:

''یہ حدیث موضوع ہے، حاتم کسی بھی حال میں حجت نہیں ہے۔''

حافظ السیوطی نے "اللآلی المصنوعة : ۲/۲۱۸" میں امام ابن الجوزی کی ان الفاظ میں تعقیب کی ہے:

''الترمذی اور محمد بن نصر نے اس کی تخریج دوسرے الفاظ میں کی ہے۔''

لیکن حافظ السیوطی کی اس تعقیب میں کوئی وزن نہیں ہے۔ انہوں نے حدیث کے جن دوسرے الفاظ کی جانب اشارہ کیا ہے وہ یہ ہیں:

((مَنْ قَرَأَ كُلَّ يَوْمٍ مِئَتَى مَرَّةٍ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ مُحِىَ عَنْهُ ذُنُوْبُ خَمْسِيْنَ سَنَةً اِلَّا أَنْ يَكُوْنَ عَلَيْهِ دَيْنٌ))

''جو ہر دن دوسو (۲۰۰) بار ''قل هو الله احد '' پڑھے گا اس کے پچاس سال کے گناہ مٹا دیے جائیں گے۔ الّا یہ کہ اس پر قرض ہو۔ (جو معاف نہیں ہوگا)''

اس کی تخریج الترمذی نے اور ابن نصر نے ''قيام الليل ، ص: ٦٦ '' میں محمد بن مرزوق کی سند سے کی ہے۔

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد امام الترمذی نے لکھا ہے: ((هذا حديثٌ غريبٌ)) یہ حدیث ضعیف ہے اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (۵۶۸/۴) میں لکھا ہے:

''اس کی سند ضعیف ہے۔''

خلاصۂ کلام یہ کہ حاتم بن میمون، نا قابل استدلال ہے'' [الضعيفه : ٤٧١/١، ٤٧٢]

۱۰۲ ......((مَنْ قَرَأَ ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ فِيْ مَرَضِهِ الَّذِيْ يَمُوْتُ فِيْهِ ، لَمْ يُفْتَنْ فِيْ قَبْرِهِ ، وَاَمِنَ مِنْ ضَغْطَةِ الْقَبْرِ ، وَحَمَلَتْهُ الْمَلَائِكَةُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِأَكُفِّهَا حَتّٰى تُجِيْزَهُ مِنَ الصِّرَاطِ اِلَى الْجَنَّةِ))

''جو شخص اپنی اس بیماری میں ''قل هو الله احد '' پڑھے گا جس میں اس کی موت ہو جائے تو وہ اپنی قبر میں فتنے سے دو چار نہیں ہوگا اور قبر کے بھینچنے سے محفوظ رہے گا اور فرشتے اس کو اپنی ہتھیلیوں پر اُٹھا کر پل صراط سے پار کرا دیں گے اور جنت تک پہنچا دیں گے۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج حافظ الطبرانی نے '' المعجم الاوسط :۲/۵۴ ، حديث : ۵۹۱۳ '' اور حافظ ابونعیم نے '' حلية الاولياء :۲/۲۱۳ '' میں ابو الحارث نصر بن حماد البلخی کی سند سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا مَالِكُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ الأَزْدِيُّ ، قال : حَدَّثَنَا يَزِيْدُ ابْنُ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ الشُّخَيْرِ العنبري عَنْ أَبِيْهِ مَرْفُوْعًا))

''ہم سے مالک بن عبداللہ الازدی نے بیان کیا، کہا: ہم سے یزید بن عبداللہ بن الشخیر العنبری نے اپنے باپ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

یہ سند موضوع ہے اور اس کو وضع کرنے کا الزام نصر بن حماد پر ہے جو اس روایت میں منفرد ہے۔ جیسا کہ الطبرانی نے صراحت کی ہے، اور امام یحییٰ بن معین نے اس کو ''کذاب'' لکھا ہے۔

اور اس کا شیخ مالک بن عبداللہ الازدی غیر معروف ہے۔ [الضعيفه : ٤٧٣/١]

۱۰۳ ......((مَنْ قَرَأَ ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ مِئَتَىْ مَرَّةٍ ، غُفِرَتْ لَهُ ذُنُوْبُ مِئَتَىْ سَنَةٍ))

''جو شخص "قل هو الله احد" دوسو (۲۰۰) بار پڑھے، اس کے دوسو (۲۰۰) سال کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔''

یہ حدیث منکر ہے۔ اس کی روایت حافظ ابو عبداللہ محمد بن ایوب بن الضریس نے "فضائل القرآن: ۱۱۳/۳ " میں، حافظ الخطیب البغدادی نے " تاریخ بغداد: ۱۸۷/٦ " میں اور ابن شیران نے "ج۱۲/ ق ۶۲" اور امام البیہقی نے "شعب الایمان: ۲۱/۳۵/۲/۱ " میں الحسن بن أبی جعفر الجعفری کی سند سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا ثَابِتُ الْبَنَانِيُ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ مَرْفُوعًا))

''ہم سے ثابت البنانی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

یہ سند بے حد ضعیف ہے۔

الحسن بن جعفر الجعفری کے بارے میں امام الذہبی فرماتے ہیں:

''احمد اور نسائی نے اس کی تضعیف کی ہے اور بخاری اور الفلاس نے اس کو ''منکر الحدیث'' کہا ہے۔ اور اس کے مصائب میں سے ایک یہی حدیث ہے۔'' [الضعیفه : ١/ ٤٦٤_٤٦٥]

صحیح احادیث میں سورۃ الاخلاص کے بلا شبہ بڑے فضائل بیان ہوئے ہیں اور نبی اکرم ﷺ نے اپنے ارشادات میں اس سورت کی عظمت اور اہمیت کو مختلف موقعوں پر اُجاگر فرمایا ہے۔ مگر صحیح احادیث میں بیان کردہ اس سورت کے فضائل اور موضوع اور منکر روایتوں میں بیان کردہ فضائل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ذیل میں چند صحیح احادیث درج کی جارہی ہیں ان کی روشنی میں، گزشتہ صفحات میں نقل کردہ ان موضوع اور منکر روایتوں کی نکارت پر غور کیجیے:

((عَنْ عَائِشَةَ : أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ رَجُلًا عَلَى سَرِيَّةٍ وَكَانَ يَقْرَأُ لِأَصْحَابِهِ فِي صَلَاتِهِمْ فَيَخْتِمُ ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ فَلَمَّا رَجَعُوا ذَكَرُوا ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ ، فَقَالَ : سَلُوهُ لِأَيِّ شَيْءٍ يَصْنَعُ ذٰلِكَ ، فَسَأَلُوهُ فَقَالَ : لِأَنَّهَا صِفَةُ الرَّحْمٰنِ وَأَنَا أُحِبُّ أَنْ أَقْرَأَ بِهَا فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ : أَخْبِرُوهُ أَنَّ اللّٰهَ يُحِبُّهُ)) ❶

❶ البخاری، ح: ۷۳۷۵، مسلم، ح: ۱۸۹۰

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک صحابی کو کسی فوجی مہم پر سردار بنا کر بھیجا اور اس سفر کے دوران میں اُن کا معمول یہ رہا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو جو نماز پڑھاتے اس میں ہر قراءت کو ''قل ھو اللہ احد'' پر ختم کرتے۔ واپسی پر صحابہ نے نبی ﷺ سے اس کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: اُن سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے؟ صحابہ کرام نے اُن سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: اس میں رحمٰن کی صفت بیان ہوئی ہے اس لیے مجھے اس کا پڑھنا محبوب ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اُن کو خبر دے دو کہ اللہ ان کو پسند کرتا ہے۔''

کس قدر پاکیزہ محرک تھا اُن صحابی کے سورۃ الاخلاص پڑھنے کا: ''یہ سورت رحمٰن کی صفت ہے اس لیے مجھے اس کا پڑھنا محبوب ہے۔'' اور نبی ﷺ کا یہ جامع اور بلاغت سے پر جواب: ''اُن کو بتا دو کہ اللہ اُن کو پسند کرتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے سورۃ الاخلاص کو ایک تہائی قرآن کے مساوی قرار دیا ہے:

((عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : أَيَعْجِزُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَقْرَأَ فِي لَيْلَةٍ ثُلُثَ الْقُرْآنِ؟ قَالُوْا : وَكَيْفَ يَقْرَأُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ؟ قَالَ : ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ﴾ تَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ)) [1]

''حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''کیا تم میں سے کوئی ایک رات میں ایک تہائی قرآن نہیں پڑھ سکتا؟ صحابہ نے عرض کیا: وہ ایک تہائی قرآن کس طرح پڑھ سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ'' ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔''

سورۃ الاخلاص کے فضائل میں نبی اکرم ﷺ سے اور بھی صحیح احادیث مروی ہیں جن کو احادیث کی مستند کتابوں میں خصوصیت کے ساتھ صحیحین اور سنن اربعہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

من گھڑت اور غیر منصوص فضائل اعمال کے قائلین کا دعویٰ ہے کہ ''ترغیب و ترہیب'' کے باب میں ضعیف حدیثوں پر عمل کرنا جائز ہے۔ اُن کے اس دعویٰ کی کوئی شرعی بنیاد نہیں ہے، کیونکہ ترغیب و ترہیب یا دوسرے لفظوں میں فضائل اعمال بھی اس طرح دینی اُمور ہیں جس طرح فرائض و واجبات اور تاکیدی سنن

[1] صحیح مسلم، حدیث: ۱۸۸٦

اور ہر دینی اور شرعی معاملہ چاہے وہ فرض ہو یا سنت یا مستحب یا حرام ہو یا مکروہ۔ اپنے ثبوت کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے صریح بیان اور ارشاد کا محتاج ہے اور ضعیف حدیث کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے یا تو صحیح نہیں ہے، یا مشکوک ہے۔ یا محض ظن وگمان، اس لیے کہ ''ضعیف'' ایک مبہم لفظ ہے اس کی متعدد قسمیں ہیں اور اس کے نام پر بعض لوگ جن اعمال کو دینی اعمال کہہ کر رواج دے رہے ہیں وہ اُن کے اپنے اعمال ہیں جن میں سے بیشتر ''دین میں اضافہ'' یعنی بدعت میں شمار ہوتے ہیں۔ اس لیے اس مبہم اور غیر واضح دعویٰ ''فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز ہے۔'' سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ اس بات کو مقدمہ میں تفصیل سے واضح کیا جاچکا ہے۔

۱۰۴ ...... ((مَنْ قَرأَ فِيْ إِثْرِ وُضُوئِهِ ﴿ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ﴾ مَرَّةً وَاحِدَةً كَانَ مِنَ الصِّدِّيْقِيْنَ ، وَمَنْ قَرأَهَا مَرَّتَيْنِ كُتِبَ فِيْ دِيْوَانِ الشُّهَدَاءِ ، وَمَنْ قَرأَهَا ثَلَاثًا حَشَرَهُ اللّٰهُ مَحْشَرَ الْأَنْبِيَاءِ))

''جس نے وضوء کے بعد ''إِنَّا أَنْزَلْنَا فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ'' ایک بار پڑھا تو اس کا شمار صدیقین میں ہوگا اور جس نے اس کو دوبار پڑھا تو اس کا نام شہداء کے دفتر میں درج کیا جائے گا اور جس نے اس کو تین بار پڑھا تو اللہ اس کو قیامت کے دن انبیاء کی طرح اُٹھائے گا۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی روایت الدیلمی نے ''مسند الفردوس'' میں اس سند سے کی ہے:

((عَنْ أَبِيْ عُبَيْدَةَ ، عَنِ الْحَسَنِ ، عَنْ أَنَسٍ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ......))

''ابوعبیدہ سے روایت ہے، انہوں نے الحسن سے روایت کیا اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا..........''

ابوعبیدہ مجہول ہے جیسا کہ حافظ السیوطی نے " الحاوی للفتاوی : ۲/۱۱ " میں صراحت کی ہے اور دوسری علت "الحسن البصری" کا "عنعنه" ہے۔ اور الحسن البصری "مدلس" تھے۔

یہ تو سند کا حال ہے۔ رہا اس کا ''متن'' تو اس سے اس کا موضوع ہونا ظاہر ہے۔ میرا گمان ہے کہ یہ اسی مجہول راوی ''ابوعبیدہ'' کی کارستانی ہے یا اس سے نیچے کے کسی راوی کی گھڑی ہوئی ہے۔

حافظ السخاوی نے اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے:

''اس کو میں نے امام ابوالليث الحنفی سے منسوب مقدمہ میں دیکھا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ کسی اور

نے اس کو اس میں شامل کر دیا ہے۔ یہ بے اصل حدیث سنّت کو فوت کرنے والی ہے۔"

حافظ سخاوی کی مراد "سنت کو فوت کرنے والی ہے" یہ ہے کہ وضوء کے بعد سنت یہ ہے کہ یہ دعا پڑھی جائے:

((اَشْهَدُ أن لَّا اِلٰهَ الَّا اللّٰهُ وَحْدَه' لَا شَرِيْكَ لَه' ، وَأَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ ، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ)) ❶

۱۰۵ ......((إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى قَرَأَ(طه) وَ (يس) قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ آدَمَ بِأَلْفَي عَامٍ ، فَلَمَّا سَمِعَتِ الْمَلَائِكَةُ الْقُرآنَ ، قَالُوا : طُوبَى لِأُمَّةٍ يَنزِلُ هٰذَا عَلَيْهِمْ وَطُوبَى لِأَنُسَنٍ تَتَكَلَّمُ بِهَذَا ، وَطُوبَى لِأَجْوافٍ تَحْمِلُ هٰذَا))

"بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے "طٰہٰ" اور "یٰسین" آدم کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال قبل پڑھا اور جب فرشتوں نے قرآن کو سُنا تو کہا: سعادت و بھلائی ہو اس اُمت کے لیے جس پر قرآن نازل ہوگا، خوش خبری ہے اُن زبانوں کے لیے جو اسے پڑھیں گی، اور خیر وسعادت ہو اُن دلوں کو جو اُٹھائیں گے۔"

یہ حدیث منکر ہے۔ اس کی روایت امام عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی نے " السنن :۴۵۶/۲ " میں، امام ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ نے " کتاب التوحید :۱۰۹ " میں، امام ابن حبان نے " الضعفاء :۱۰۸/۱ " میں، ابوالحسن علی بن احمد الواحدی نے "الوسیط :۱۶/۳ " میں اور حافظ ابن عساکر نے " تاریخ دمشق : ۳۰۸/۵ " میں، ابراہیم بن المهاجر بن مسمار سے کی ہے۔

((حَدَّثَنَا عُمَرُ ابْنُ حَفْصِ بْنِ ذَكْوَانَ عَنْ مَوْلَى الْحُرَقَةِ (قَالَ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَهُوَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يَعْقُوبَ بْنِ الْعَلَاءِ ابْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ ، قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم ......))

"ہم سے عمر بن حفص بن ذکوان نے الحرقہ کے مولی (ابن خزیمہ کہتے ہیں اس کا نام عبداللہ بن یعقوب بن العلاء بن عبدالرحمٰن ہے) سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے............"

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

❶ صحیح مسلم، حدیث:۵۵۳، ۵۵٤ـ الترمذی ، حدیث :۵۵ـ ابن ماجه ، حدیث: ٤٧٠ـ الضعیفه : ١/١٦٦ـ٣/٦٤٦، ٦٤٧ـ مختصر المقاصد الحسنة : ٢٢٢، حدیث: ١٠٦٣

''یہ متن موضوع ہے، جیسا کہ ابن حبان نے صراحت کی ہے اور اس کی سند بے حد ضعیف ہے، جس کی دو علتیں ہیں:

۱۔ پہلی علت ابراہیم ہے جس کے بارے میں امام الذہبی نے ''میزان الاعتدال'' میں لکھا ہے کہ امام بخاری نے اس کو ''منکر الحدیث'' بتایا ہے، امام نسائی نے اس کی تضعیف کی ہے اور عثمان بن سعید نے اس کے بارے میں امام یحییٰ بن معین کا یہ قول نقل کیا ہے: ''اس میں کوئی حرج نہیں۔'' یعنی وہ مقبول ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ اس حدیث کی روایت میں منفرد ہے۔

۲۔ اس حدیث کے منکر ہونے کی دوسری علت، ابراہیم کا شیخ عمر بن حفص بن ذکوان ہے۔ جس کا ذکر امام ابن ابی حاتم نے ''کتاب العلل: ۱۰۲/۳'' میں جرح و تعدیل کے بغیر کیا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے: ''عمر بن حفص، ابو حفص الازدی البصری: میں نے اپنے والد کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''وہ منکر الحدیث ہے۔''

حافظ الذہبی لکھتے ہیں: ''وہ عمر بن حفص بن ذکوان ہے۔'' امام احمد نے اس کے بارے میں لکھا ہے: ''ہم نے اس کی روایت کردہ حدیثوں کو چھوڑ دیا اور جلا دیا اور امام النسائی نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔''

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (۱۴۱/۳) میں اس حدیث کو ابن خزیمہ سے منسوب کرنے کے بعد لکھا ہے: ''یہ حدیث ضعیف ہے۔ اور اس کے متن میں نکارت ہے اور ابراہیم بن مہاجر اور اس کے شیخ کے بارے میں ''کلام'' ہے۔'' اس منکر حدیث کی سند کی تیسری علت یہ ہے کہ عبداللہ بن یعقوب بن العلا بن عبدالرحمٰن غیر معروف ہے جس کا ذکر سند میں ''مولی الحرقه'' کے نام سے آیا ہے۔''

[الضعيفه : ۴۰۲/۳، ۴۰۳]

١٠٦ ......((يٰس لِمَا قُرِئَتْ لَهُ......)) ''سورۃ یٰس اس چیز کے لیے کافی ہے جس کے لیے پڑھی جائے۔ یعنی جس مقصد کے لیے اس کی تلاوت کی جائے وہ پورا ہوگا۔''

اس حدیث کو حافظ سخاوی نے ''المقاصد الحسنة : ۴۷۷'' میں، امام زرقانی نے ''مختصر المقاصد، حدیث: ۱۲۳۱'' میں، عبدالرحمٰن بن علی الربیع نے ''تمیز الطیب : ۱۹۵'' میں اور ملا علی القاری نے ''الاسرار المرفوعه : ٦١٩'' میں موضوع قرار دیا ہے۔

١٠٧ ......((عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : مَنْ قَرَأَ (حٰمٓ الدُّخَانَ)

فِيْ لَيْلَةٍ ، أَصْبَحَ يَسْتَغْفِرُ لَهُ سَبْعُوْنَ أَلْفَ مَلَكٍ))

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جس نے کسی رات میں ایک بار ''حم الدخان'' پڑھا، تو صبح تک اس کے لیے ستر ہزار فرشتے استغفار کریں گے۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔[ضعيف الجامع الصغير ، حديث : ٥٧٦٦]

امام الترمذی نے ''سنن ، حديث : ٢٨٨٨ '' میں یہ حدیث اس سند سے روایت کی ہے:

((حَدَّثَنَا سُفْيَانُ بْنُ وَكِيعٍ : حَدَّثَنَا زَيْدُ بْنُ حُبَابٍ ، عَنْ عُمَرَ بْنِ أَبِيْ خَثْعَمٍ عَنْ يَحْيىٰ بْنِ أَبِيْ كَثِيْرٍ ، عَنْ أَبِيْ سَلَمَةَ ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ ، قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ....))

''ہم سے سفیان بن وکیع نے بیان کیا، کہا: ہم سے زید بن حباب نے عمر بن ابی خثعم سے، انہوں نے یحییٰ بن ابی کثیر سے، انہوں نے ابوسلمہ سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا............''

یہ حدیث روایت کرنے کے بعد امام الترمذی نے لکھا ہے:

''یہ حدیث ضعیف ہے۔ ہم اس کو صرف اسی سند سے جانتے ہیں، اور عمر بن ابی خثعم محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ محمد، امام بخاری کا قول ہے کہ ''وہ منکر الحدیث ہے۔''

امام بخاری راویوں کی جرح میں بہت ہلکے الفاظ استعمال کرتے تھے اور ان سے یہ منقول کہ: ''اگر میں کسی کو منکر الحدیث کہوں تو اس کی روایت کردہ حدیث کی روایت جائز نہیں ہے۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے سورۃ الدخان کی فضیلت میں ایک دسری حدیث ان الفاظ میں مروی ہے:

١٠٨ ...... ((مَنْ قَرَأَ (حٰمٓ الدُّخَان) فِيْ لَيْلَةِ الْجُمُعَةِ ، غُفِرَلَهُ))

''جو جمعہ کی رات حم الدخان کی تلاوت کرے تو اس کی مغفرت کر دی جائے گی۔''

یہ حدیث بے حد ضعیف اور نا قابل اعتبار ہے اس کی روایت الواحدی نے اپنی تفسیر: ۴/۶۶ میں سلام بن سُلیم سے کی ہے:

((أَخْبَرَنَا هَارُوْنُ بْنُ كَثِيْرٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ عَنْ أُبَيِّ

بْنِ كَعْبٍ مَرْفُوعًا ......))

''ہم کو ہارون بن کثیر نے، زید بن اسلم سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے ابوامامہ سے اور انہوں نے اُبی بن کعب سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے خبر دی..........''

محدث محمد ناصر الدین البانی کہتے ہیں:

''یہ سند موضوع ہے اور اس کی مصیبت سلّام بن سلیم ہے وہ الطّویل المدائن کے لقب سے مشہور ہے۔ وہ ''متروک'' ہے اور امام الحاکم نے اس پر وضع حدیث کا الزام لگایا ہے اور ہارون بن کثیر کو امام الذہبی نے ''مجہول'' لکھا ہے۔ اور یہی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً مروی ہے اور وہ بھی بے حد ضعیف ہے۔'' [الضعیفه : ۱۰/ ۱۵۰، ۱۵۱]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث امام الترمذی نے "السنن :۲۸۸۹ " میں اس سند سے روایت کی ہے:

((حَدَّثَنَا نَصْرُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الكوفِیُ : حَدَّثَنَا زَیْدُ بْنُ حُبَابٍ ، عَنْ هِشَامٍ أَبِی المِقْدَامِ ، عَنِ الْحَسَنِ ، عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ قال : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ......))

''ہم سے نصر بن عبدالرحمٰن الکوفی نے بیان کیا، کہا: ہم سے زید بن حباب نے ہشام ابی المقدام سے انہوں نے الحسن سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے..........''

امام الترمذی یہ حدیث روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''اس کو ہم صرف اسی سند سے جانتے ہیں اور ہشام ابوالمقدام ضعیف ہے۔ اور الحسن نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نہیں سُنی ہے۔''

اسی طرح ایوب، یونس بن عُبید اور علی بن زید نے کہا ہے:

''اس سند میں ''الحسن'' سے مراد حضرت الحسن البصری ہیں جن کا سماع حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے جیسا کہ امام الترمذی نے تین محدثین کے حوالہ سے صراحت کی ہے۔ لہٰذا یہ سند منقطع بھی ہے، مزید یہ کہ الحسن البصری ''مدلس'' تھے اور انہوں نے یہ حدیث ''عنعنہ'' کے ذریعہ روایت کی ہے۔''

درُود و سلام:

نبی اکرم ﷺ پر درُود و سلام افضل ترین عبادت ہے۔ یہ اُمت پر آپ کے عظیم احسانات کا اعتراف، دلوں میں آپ کی بے پایاں محبت وعقیدت کا اظہار اور اللہ کے نزدیک آپ کی رفعتِ شان اور بلندیٔ درجات کا اقرار ہے۔ درُود و سلام کی اہمیت، اس کے فضائل و برکات اور اس کے اجر وثواب کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے آپ پر درُود بھیجتے ہیں، اور اہل ایمان کو بھی اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ آپ پر درُود و سلام بھیجیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿56﴾ ﴾ [الاحزاب: ٥٦]

’’بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درُود بھیجتے ہیں، اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اُن پر درُود اور سلام بھیجو۔‘‘

نبی ﷺ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کو نماز میں سلام کا طریقہ بتا چکے تھے، اور جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے آپ سے عرض کیا:

((يَا رَسُولَ اللّٰهِ ! أَمَّا السَّلَامُ عَلَيْكَ فَقَدْ عَرَفْنَاهُ ، فَكَيْفَ الصَّلَاةُ؟ قَالَ : قُولُوا : اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ ـ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ)) ❶

’’اے اللہ کے رسول! رہا آپ پر سلام تو یہ تو ہم کو معلوم ہو گیا ہے، لیکن آپ پر درُود بھیجنے کا طریقہ کیا ہے؟ فرمایا: کہو!

اے اللہ! تو محمد اور آل محمد پر اسی طرح درُود بھیج جس طرح تو آل ابراہیم پر درُود بھیج چکا ہے۔ بے شک تو قابلِ تعریف اور بزرگ ہے۔ اے اللہ! تو محمد اور آل محمد پر اسی طرح برکت نازل فرما جس طرح تو آلِ ابراہیم پر برکت نازل فرما چکا ہے۔ بے شک تو سزاوار حمد وستائش اور بلند و برتر ہے۔‘‘

گویا اس طرح رسول اللہ ﷺ نے جہاں یہ واضح فرما دیا کہ تم لوگ مجھ پر درُود کا حق نہیں ادا کر سکتے

❶ صحیح بخاری، حدیث: ٤٧٩٧ـ صحیح مسلم، حدیث: ٩٠٨

اس لیے اللہ تعالیٰ سے درخواست کرو کہ وہی مجھ پر درُود بھیجے۔

وہیں آپ نے یہ بھی بتا دیا کہ میرے اُوپر درُود وسلام کا وہی طریقہ افضل ترین اور عنداللہ مقبول ہے جو میں تم کو بتاؤں، اسی وجہ سے متعدد صحابۂ کرام نے مختلف اوقات اور مواقع پر آپ سے پوچھ پوچھ کر درُود وسلام کے مختلف طریقے سیکھ لیے جو صحیح احادیث میں مذکور ہیں اور جو درُودِ ابراہیمی کے نام سے معروف ہیں۔

اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے متعدد مواقع پر درُود وسلام کے فضائل، ان کے اوقات، ان کے اجر وثواب کو بھی واضح فرمادیا جو پوری تفصیل سے احادیث میں مذکور ہیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سُنا ہے:

((إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ ، ثُمَّ صَلُّوا عَلَيَّ، فَإِنَّهُ مَنْ صَلَّى عَلَيَّ صَلَاةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ بِهَا عَشْرًا ، ثُمَّ سَلُوا اللّٰهَ لِيَ الْوَسِيلَةَ فَإِنَّهَا مَنْزِلَةٌ فِي الْجَنَّةِ لَا تَنْبَغِي إِلَّا لِعَبْدٍ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ ، وَأَرْجُو أَنْ أَكُونَ أَنَا هُوَ ، فَمَنْ سَأَلَ لِيَ الْوَسِيلَةَ حَلَّتْ عَلَيْهِ الشَّفَاعَةُ)) [1]

جب تم لوگ مؤذن کو اذان دیتے ہوئے سُنو تو تم بھی وہی کہو جو وہ کہتا ہے، پھر میرے اوپر درُود بھیجو، کیونکہ جو شخص میرے اوپر ایک بار درُود بھیجے گا اللہ اس پر اس کے بدلے دس (۱۰) بار درُود بھیجے گا، پھر اللہ سے میرے لیے ''الوسیلہ'' کی درخواست کرو، جو جنت میں ایک درجہ ہے جو اللہ کے بندوں میں سے صرف ایک بندے کے لیے مناسب ہے اور مجھے اُمید ہے کہ وہ بندہ میں ہی ہوں، پس جس نے میرے ''الوسیلہ'' طلب کیا وہ لازماً میری شفاعت سے سرفراز ہو گا۔''

رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں مذکور ''الوسیلہ'' طلب کرنے کا طریقہ بھی بتایا دیا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَنْ قَالَ حِينَ يَسْمَعُ النِّدَاءَ : اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ ، آتِ مُحَمَّدًا الْوَسِيلَةَ وَالْفَضِيلَةَ ، وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَحْمُودًا الَّذِي وَعَدْتَهُ ، حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) [2]

---

[1] صحيح مسلم، حديث: ٨٤٩
[2] حديث: ٦١٤، ٤٧١٩

''جو شخص اذان سُن کر یہ کہے گا: ''اے اللہ! جو اس مکمل دعا اور اس قائم و دائم نماز کا رب ہے، محمد کو جنت کا اعلیٰ درجہ اور اپنی تمام مخلوق پر خصوصی فضیلت عطا کر اور اُن کو اُس قابل تعریف مقام پر سرفراز فرما جس کا تو نے اُن سے وعدہ کیا ہے۔ تو اس کے لیے قیامت کے دن میری شفاعت واجب ہو جائے گی۔''

اس کے علاوہ صحیح احادیث میں دُرود شریف کے بکثرت فضائل بیان کیے گئے ہیں جن کی روشنی میں دن ورات کے تمام اوقات میں رسول اللہ ﷺ پر دُرود بھیجنا مشروع ہے، درود مؤمن کے بلندیٔ درجات کا ضامن ہے، اس سے حسنات اور نیکیوں کے اجر وثواب میں اضافہ ہوتا ہے وہ گناہوں کا کفارہ اور برائیوں کو مٹانے کا ذریعہ ہے۔ دُرود شریف کے ورد سے دنیا و آخرت کے غم و آلام پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

جمعہ جو سید الأیام ہے اس دن دُرود وسلام کی بڑی فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ اس بابرکت دن میں ہمارے دُرود وسلام کو اپنے فرشتوں کے ذریعہ اپنے محبوب نبی ﷺ پر پیش کرتا ہے اور نبی ﷺ اور آپ سے پہلے مبعوث ہونے والے تمام انبیاء ورسول کے جسم ان کی قبروں میں محفوظ ہیں اور ان کو ایک خاص طرح کی زندگی حاصل ہے جس کو ''برزخی'' زندگی کہتے ہیں، یہ دنیا اور آخرت کی زندگیوں سے ایک بالکل مختلف زندگی ہے جس کی حقیقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ اور دوسرے انبیاء کا کوئی رشتہ اس دنیا سے باقی نہیں رہا ہے۔

کسی بھی عمل کے عنداللہ مقبول ہونے کی بنیادی اور لازمی شرط عقیدہ کی صحت ہے، یعنی صحت عقیدہ کے بغیر دُرود وسلام کیا کوئی بھی عمل مقبول ہونا تو درکنار قابلِ التفات بھی نہیں ہے۔ دوم یہ کہ دُرود وسلام اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود کسی بھی شرعی عمل کا بدل نہیں ہے۔ لہٰذا جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں یا جن کا یہ عقیدہ ہے کہ بے آمیز اور خالص توحید کا عقیدہ رکھنے بغیر اور اللہ ورسول کے دوسرے احکام کی بجا آوری کے بغیر تن تنہا دُرود وسلام نجات کے لیے کافی ہے اور اپنے اس عقیدے کو تحریر وتقریر کے ذریعہ لوگوں میں پھیلا رہے ہیں، وہ یا تو بہت بڑی خود فریبی میں مبتلا ہیں یا جان بوجھ کر لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں، کیونکہ اُن کا یہ عقیدہ کتاب و سنّت کی صریح تعلیمات کے خلاف ہے۔

کتاب وسنّت کی صریح تعلیمات اور سلف صالحین کے طرزِ عمل پر مبنی اُن وضاحتوں کی روشنی میں اُن موضوع اور منکر روایات کی نکارت کو بڑی آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے جو فضائل اعمال اور تصوف کی کتابوں میں بھری پڑی ہیں، اسی طرح اُن خیالی قصوں اور کہانیوں کے اصل مقصد کو بھی سمجھنا بے حد آسان ہے جو

مذکورہ کتابوں میں دُرود شریف کے اجر وثواب کے ضمن میں موجود ہیں یعنی مختصر لفظوں میں ان قصوں اور کہانیوں کا مقصد دین داری کے پردے میں گمراہی میں مبتلا کرنا ہے، یہ محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے جو ذیل کی موضوع حدیث سے بالکل واضح ہے:

٧٤.....((مَنْ صَلَّى عَلَيَّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ثَمَانِيْنَ مَرَّةً؛ غَفَرَاللّٰهُ لَهُ ذُنُوْبَ ثَمَانِيْنَ سَنَةً ، فَقِيْلَ لَهُ : وَكَيْفَ الصَّلَاةُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ : تَقُوْلُ : اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَنَبِيِّكَ وَرَسُوْلِكَ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ وَتَعْقُدُ وَاحِدًا))

''جو جمعہ کے دن میرے اوپر اسی (۸۰) بار دُرود بھیجے گا اللہ اس کے اسی (۸۰) سالوں کے گناہوں کو بخش دے گا۔ عرض کیا گیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ پر دُرود بھیجنے کا طریقہ کیا ہے؟ فرمایا: کہو! اے اللہ! تو اپنے بندے اور نبی اور رسول اور نبی اُمی محمد پر دُرود بھیج، اور اس کو ایک شمار کرو۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج حافظ الخطیب البغدادی نے "تاریخ بغداد : ۱۳/۴۸۹" میں وہب بن داؤد بن سلیمان الضریر کے طریقے سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا اِسْمَاعِيْلُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ : حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ صُهَيْبٍ عَنْ اَنَسٍ مَرْفُوْعًا))

''ہم سے اسماعیل بن ابراہیم نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالعزیز بن صہیب نے حضرت انس سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا..........''

الخطیب البغدادی نے یہ موضوع حدیث وہب بن داؤد بن سلیمان الضریر کے ترجمہ کے ضمن میں نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ: ''وہ ثقہ نہیں تھا۔'' اور حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی نے " القول البدیع ، ص: ۱۹۷ " میں لکھا ہے کہ: ''ابن الجوزی نے اس کا ذکر " الاحادیث الواھیه " (بے بنیاد حدیثیں) میں کیا ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

''اس حدیث کو ابن الجوزی کو اپنی آخری کتاب " الموضوعات " میں شامل کرنا چاہیے تھا، کیونکہ اس پر ''وضع'' کی علامتیں بالکل ظاہر ہیں۔'' [الضعیفه : ۱/ ۳۸۲]

پچھلے صفحات میں صحیح مسلم میں مروی اُس صحیح حدیث کا ذکر آچکا ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَنْ صَلَّى عَلَيَّ مَرَّةً وَاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ بِهَا عَشْرًا))

''جو میرے اوپر ایک بار درُود بھیجے گا اللہ اس کے بدلے اس پر دس (۱۰) بار درُود بھیجے گا۔''

جبکہ یہ موضوع اور بے بنیاد حدیث یہ کہہ رہی ہے کہ: ''جو شخص جمعہ کے دن میرے اوپر اسی (۸۰) بار درُود بھیجے گا تو اللہ اس کے (۸۰) سالوں کے گناہوں کو بخش دے گا۔''

پھر اس حدیث میں ایک نکارت یہ بھی ہے کہ اس میں نبی ﷺ نے اپنے اوپر درُود بھیجنے کا جو طریقہ بتایا ہے وہ اُن صحیح احادیث میں بتائے گئے طریقوں کے خلاف ہے جو مختلف الفاظ میں کوئی سات صحابہ سے مروی ہیں اور جو صحیحین اور سنن اربعہ اور حدیث کی دوسری کتابوں میں مذکور ہیں۔

اس موضوع حدیث کی تیسری نکارت یہ ہے کہ انہی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے جو صحیح حدیث مروی ہے اس میں اس زیرِ بحث موضوع حدیث کی مبالغہ آرائی کا کوئی شائبہ تک نہیں حدیث کے الفاظ ہیں:

((مَنْ صَلَّى عَلَيَّ صَلَاةً وَاحِدَةً ؛ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ عَشْرَ صَلَوَاتٍ وَحُطَّتْ عَنْهُ عَشْرُ خَطِيئَاتٍ وَرُفِعَتْ لَهُ عَشْرُ دَرَجَاتٍ)) [1]

''جو میرے اوپر ایک بار درُود بھیجے گا، اللہ اس پر دس (۱۰) بار درُود بھیجے گا، اس کی دس (۱۰) خطائیں معاف کر دی جائیں گی اور اس کے دس (۱۰) درجات بلند کیے جائیں گے۔''

حافظ سخاوی نے " باب الصلاة عليه في يوم الجمعة وليلتها " کے تحت متعدد حدیثیں نقل کی ہیں جو تقریباً سب کی سب موضوع، منکر اور بے حد ضعیف اور صحیح احادیث کے خلاف ہیں۔ چنانچہ انہی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں:

۲۵ ......((مَنْ صَلَّى عَلَيَّ فِي كُلِّ يَوْمِ جُمُعَةٍ أَرْبَعِينَ مَرَّةً مَحَا اللّٰهُ عَنْهُ ذُنُوبَ أَرْبَعِينَ سَنَةً وَمَنْ صَلَّى عَلَيَّ مَرَّةً وَاحِدَةً ، فَتُقُبِّلَتْ مِنْهُ مَحَا اللّٰهُ عَنْهُ ذُنُوبَ ثَمَانِينَ سَنَةً))

''جو میرے اوپر ہر جمعہ کے دن چالیس (۴۰) بار درُود بھیجے گا تو اللہ اس سے چالیس (۴۰) سالوں کے گناہوں کو مٹا دے گا اور جو میرے اوپر ایک بار درُود بھیجے گا اور وہ اس سے قبول کر لیا جائے گا تو اللہ اس سے اسی (۸۰) سالوں کے گناہوں کو دھو دے گا۔''

حافظ سخاوی لکھتے ہیں:

[1] النسائي ،حديث : ١٢٩٦

''اس کی تخریج النمیمی نے اپنی ''ترغیب'' میں ابوالشیخ ابن حبان نے اپنے بعض ''اجزاء'' میں اور الدیلمی نے اپنی ''مسند'' میں کی ہے۔ مگر اس کی سند ضعیف ہے اور انہی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری حدیث ان الفاظ میں بھی مروی ہے:

((مَنْ صَلَّى عَلَيَّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ مِائَةَ صَلَاةٍ غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ خَطِيئَةَ ثَمَانِيْنَ عَامًا))

''جو کوئی میرے اوپر جمعہ کے دن سو (۱۰۰) بار درود بھیجے گا تو اللہ اس کی اسی (۸۰) سالوں کی خطائیں بخش دے گا۔''

حافظ سخاوی کہتے ہیں:

''اس حدیث کی ''اصل'' سے میں واقف نہیں ہوں۔'' [القول البدیع، ص: ۱۹۲]

فضائل درود شریف کے موضوع پر ''القول البدیع'' کے علاوہ دوسری کتابوں میں جمعہ کے دن درود شریف سے متعلق جتنی حدیثیں درود شریف کی تعداد کے ساتھ منقول ہیں ان میں سے کوئی بھی حدیث صحیح نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جن حدیثوں میں درود شریف کی تعداد کا ذکر آیا ہے اور اس تعداد کے اعتبار سے اس کے اجر وثواب کو بیان کیا گیا ہے، چاہے وہ کسی بھی موقع سے متعلق ہوں، ان میں سے کوئی بھی حدیث صحیح نہیں ہے اور ان حدیثوں میں ایک نمایاں چیز قدر مشترک کے طور پر یہ ملتی ہے کہ اس میں درود شریف کے اجر وثواب کے بیان میں جس مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے وہ اسلام کے ''اعتدال پسند'' مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ پھر ان بے بنیاد حدیثوں سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ ''درود شریف'' کا ورد ہی کل دین ہے اور بدعمل سے بدعمل انسان بھی اگر بکثرت درود شریف پڑھتا رہے تو اس کی بخشش یقینی ہے۔

((مَنْ صَلَّى عَلَيَّ فِيْ يَوْمِ (الْجُمُعَةِ) أَلْفَ مَرَّةٍ لم يَمُتْ حَتَّى يَرَى مَقْعَدَهُ مِنَ الْجَنَّةِ)) [الترغيب والترهيب: ۱۰۳۳ـ الضعيفه: ۵۱۱۰ـ القول البديع ، ص: ۱۹۷]

''جو شخص میرے اوپر جمعہ کے دن ایک ہزار بار درود پڑھے گا وہ مرنے سے پہلے جنت میں اپنی جگہ دیکھ لے گا۔''

یہ حدیث منکر ہے۔ اور سند کے اعتبار سے بے حد ضعیف ہے۔ اس کی روایت ابن سمعون نے ''الأمالي: ۱/۲/۱۷'' میں محمد بن عبدالعزیز الدینوری کی سند سے کی ہے:

((نَاقُرَّةُ بْنُ حَبِيْبٍ الْقُشَيْرِيُّ : نَا الْحَكَمُ بْنُ عَطِيَّةَ عَنْ ثَابِتٍ عَنْ أَنَسِ بْنِ

مَالِكٍ مَرْفُوعًا))

''ہم کو قرہ بن حبیب القشیری نے خبر دی، کہا: ہم کو الحکم بن عطیہ نے ثابت سے، اور انہوں نے انس بن مالک سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے خبر دی......''

اسی طریقے سے حافظ عمر بن احمد بن شاھین نے ''الترغیب والترھیب ''(قلمی نسخہ: ۲/۲۶۱) میں اس کی تخریج کی ہے اور انہی کی طرف حافظ المنذری نے ''الترغیب والترھیب : ۱/۵۱۳'' میں اس کی تضعیف کو منسوب کیا ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی (الضعیفہ : ۱۱/۱۸۹) فرماتے ہیں:

''اس کی علت الحکم بن عطیہ ہے جو ضعیف ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں لکھا ہے:

''اور محمد بن عبدالعزیز الدینوری اس سے بھی زیادہ بُرا ہے۔'' حافظ الذہبی نے اس کے بارے میں لکھا ہے: ''الدینوری ثقہ نہیں ہے، بلکہ اس نے مصائب آمیز حدیثیں روایت کی ہیں۔'' حافظ سخاوی ''القول البدیع ص:۹۵'' میں لکھتے ہیں: ''اس کی روایت ابن شاہین نے اپنی ترغیب وغیرہ میں اور انہی کے طریقے سے ابن بشکوال اور ابن سمعون نے اپنی ''امالی'' میں کی ہے۔ اور یہ الدیلمی کے یہاں ابوالشیخ الحافظ کی سند سے مروی ہے جس کی تخریج الضیاء المقدسی نے المختارہ میں کی ہے اور لکھا ہے: ''اس حدیث کو میں صرف الحکم بن عطیہ کی روایت کردہ حدیث کے اعتبار سے جانتا ہوں۔'' الدارقطنی کہتے ہیں: ''اس نے ثابت سے ایسی حدیثیں روایت کی ہیں جن کی روایت میں اس کا کوئی ''متابع'' نہیں ہے۔'' امام احمد نے اس کے بارے میں فرمایا ہے: ''اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن ابوداؤد والطیالسی نے اس سے منکر حدیثیں روایت کی ہیں۔''

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کی روایت ''الحکم'' کے علاوہ دوسرے نے بھی کی ہے، جس کی تخریج ابوالشیخ نے حاتم بن میمون کے طریقے سے کی ہے اور اس کے الفاظ ہیں:

((مَنْ صَلَّ عَلَيَّ فِيْ يَوْمٍ اَلْفَ مَرَّةٍ لَمْ يَمُتْ حَتَّى يُبَشَّرَ بِالْجَنَّةِ))

''جو کسی دن میرے اوپر ہزار بار درُود بھیجے گا اس کو مرنے سے پہلے جنت کی بشارت دے دی جائے گی۔''

خلاصۂ کلام یہ کہ یہ حدیث منکر ہے جیسا کہ ہمارے شیخ نے فرمایا ہے: (حافظ سخاوی نے اپنے شیخ سے حافظ ابن حجر کو مراد لیا ہے۔)

''ابوعبدالرحمٰن المقری سے روایت ہے کہ ''مجھے یہ خبر ملی ہے کہ خلاد بن کثیر حالتِ نزع میں تھے اور ان کے سر کے نیچے ایک ''پرزہ'' ملا جس میں تحریر تھا: ''یہ خلاد بن کثیر کے لیے جہنم سے برأت ہے۔'' اس پر لوگوں نے ان کے اہل خانہ سے پوچھا کہ خلاد کا عمل کیا تھا؟ تو انہوں نے بتایا کہ وہ ہر جمعہ کو نبی ﷺ پر ایک ہزار بار درُود بھیجتے تھے اور اس واقعہ کے ضمن میں بھی وہی ایک ہزار درُود والی حدیث روایت کی گئی ہے جس کا ذکر ابن النعمان وغیرہ نے کیا ہے، لیکن مجھے اس کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ملی۔'' [حافظ السخاوی : القول البدیع ، ص: ۱۹۹]

۷۷..... ((حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ : حَدَّثَنَا عَمْرُوبْنُ مُسَافِرٍ ، حَدَّثَنِي شَيْخٌ مِنْ أَهْلِيْ ، قَالَ : سَمِعْتُ سَعِيْدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ يَقُوْلُ : مَا مِنْ دَعْوَةٍ لَا يُصَلِّي عَلَى النَّبِيِّ ﷺ قَبْلَهَا ، إِلَّا كَانَتْ مُعَلَّقَةً بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ))

[فضل الصلاة على النبي ﷺ ، ح:۷٤]

''ہم سے سلیمان بن حرب نے بیان کیا، کہا: ہم سے عمرو بن مسافر نے بیان کیا، کہا: مجھ سے میرے گھر کے ایک شیخ نے بیان کیا، کہا: میں نے سعید بن المسیب کو فرماتے ہوئے سُنا ہے: جس دعا سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درُود نہ بھیجا جائے وہ آسمان وزمین کے درمیان معلق رہتی ہے۔''

اس کی سند مقطوع اور ضعیف ہے۔ امام عبداللہ بن عدی ''الکامل :۵/۱۷۱۷ '' میں عمرو بن مسافر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس نام کے بارے میں اختلاف ہے بعض لوگوں نے عمر بن مسافر لکھا ہے، اور کچھ نے عمر بن مساور، اس طرح بعض نے اس کا ذکر عمرو بن مسافر کے نام سے کیا ہے، جبکہ کچھ نے عمرو بن مساور نام لکھا ہے لیکن جیسا کہ میں نے اس کے ترجمہ میں لکھا ہے صحیح نام: عمر بن مساور ہے۔''

اور امام الذہبی نے ''میزان الاعتدال :ترجمہ نمبر :۶۴۴۸ '' میں عمرو بن مساور لکھا ہے۔ امام بخاری نے ''التاریخ الکبیر :۶/ترجمہ نمبر ۲۱۶۶ '' میں اس کو ''منکر الحدیث'' بتایا ہے۔ اور امام ابو حاتم نے ''الجرح والتعدیل :۶/ترجمہ نمبر ۷۳۱ '' میں اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ امام یحییٰ بن معین

فرماتے ہیں: ''اس کی حدیث کچھ بھی نہیں ہے۔'' [لسان المیزان : ٤ / ٣٣٠]

اور عمرو بن مسافر کے گھر کا شیخ غیر موسوم ہے۔

نوٹ:..........تابعی کے قول وفعل کو اصطلاحِ حدیث میں مقطوع کہا جاتا ہے۔

۷۸......((مَنْ صَلَّى عَلَيَّ عِنْدَ قَبْرِي سَمِعْتُهُ ، وَمَنْ صَلَّى عَلَيَّ نَائِيًا وُكِلَ بِهَا مَلَكٌ يُبَلِّغُنِيْ ، وَكُفِيَ بِهَا أَمْرَ دُنْيَاهُ وَآخِرَتِهِ وَكُنْتُ لَهُ شَهِيْدًا أَوْ شَفِيْعًا))

''جو میرے اوپر میری قبر کے پاس درُود پڑھے گا، میں اس کو سُنوں گا اور جو دُور سے میرے اوپر درُود پڑھے گا تو اس کو ایک فرشتے کے سپرد کر دیا جائے گا، جو مجھے وہ درُود پہنچا دے گا اور یہ درُود اس کی دنیا اور آخرت کے معاملات کے لیے کفایت کرے گا اور میں اس کے لیے گواہ یا شفیع ہوں گا۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔اس کی تخریج ابن سمعون نے ''الامالی :۲/۱۹۳'' میں، الخطیب البغدادی نے ''تاریخ بغداد:۳/۲۹۱، ۲۹۲'' میں اور ابن عساکر نے ''تاریخ دمشق :۱۶/۷۰'' میں اس سند سے کی ہے۔

''محمد بن مروان الأعمش سے روایت کرتا ہے وہ ابو صالح سے اور وہ حضرت ابو ہریرہ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے..........''

امام ابو جعفر محمد بن عمرو بن موسیٰ العقیلی ''کتاب الضعفاء :۴/۱۳۶، ۱۳۷'' میں یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''الاعمش کی حدیث سے اس کی کوئی اصل نہیں ہے، یہ حدیث نہ تو ''محفوظ'' ہے اور نہ اس کا کوئی متابع ہی ہے۔سوائے اس کے جو اسی سے بھی کمتر ہے۔یعنی محمد بن مروان۔''

الخطیب نے اس کی روایت عبداللہ بن قتیبہ سے کی ہے جن کا قول ہے کہ: میں نے امام عبداللہ بن نمیر سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: ''اس کو چھوڑ دو محمد بن مروان کچھ بھی نہیں ہے۔''

امام ابن الجوزی نے اس حدیث کو العقیلی کی روایت سے ''الموضوعات :۱/۳۰۳'' میں نقل کیا ہے، پھر لکھا ہے:

''یہ حدیث صحیح نہیں ہے، محمد بن مروان ہی السدی الصغیر ہے جو کذاب تھا، العقیلی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی کوئی بنیاد نہیں۔''

امام ابن تیمیہ نے "مجموع الفتاوی :۲۷/۲۴۱" میں لکھا ہے:

''یہ حدیث موضوع ہے۔الاعمش سے اس کی روایت کرنے والا محمد بن مروان ہے جو بالاتفاق کذاب تھا اور الاعمش سے اس کی روایت بالاتفاق موضوع ہے۔امام ابن تیمیہ آگے چل کر لکھتے ہیں؛اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو صرف اس قدر کہ نبی ﷺ کو اس شخص کا دُرود پہنچتا ہے جو دور سے آپ پر دُرود پڑھتا ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ اس دُرود کو بذاتِ خود سُنتے ہیں،اور اہل علم میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ نبی ﷺ دُرود پڑھنے والے کا دُرود سُنتے ہیں اور نہ کسی حدیث سے یہ ثابت ہی ہے بلکہ یہ تو متاخرین جہلاء کا قول ہے جو یہ کہتے ہیں:''یہ جمعہ کی رات ہے اور جمعہ کی رات میں نبی ﷺ اپنے کانوں سے اپنے اوپر دُرود پڑھنے والے کا دُرود سُنتے ہیں۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے جس رائے کا اظہار فرمایا ہے یہی رائے تمام ائمہ حدیث اور فقہائے اُمت کی بھی ہے اور کسی بھی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ نبی ﷺ دُرود پڑھنے والے کا دُرود اپنے کانوں سے سُنتے ہیں، چاہے دُرود پڑھنے والا آپ کی قبر مبارک سے قریب ہو یا دور اور چاہے یہ عمل جمعہ کے دن انجام دیا جائے یا کسی اور دن۔البتہ یہ بات صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ جمعہ کا دن ہفتہ کا افضل ترین دن ہے۔اس دن میں عبادتوں کا اجر وثواب میں اضافہ ہوتا ہے اور اس دن میں ایک خاص گھڑی ایسی بھی ہے جس میں دعا قبول ہوتی ہے۔نیز احادیث میں جمعہ کے دن نبی ﷺ پر بکثرت دُرود پڑھنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔مگر دُرود وسلام کی تعداد اس کے خاص اوقات،اجتماعی شکل میں دُرود وسلام پڑھنے اور جمعہ کے دن دُرود وسلام کے خاص اجر وثواب کا کوئی تعین صحیح احادیث میں نہیں کیا گیا ہے۔لہٰذا جمعہ کے دن مخصوص تعداد میں،مخصوص وقت میں اور مخصوص ومتعین اجر وثواب کی نیت سے انفرادی یا اجتماعی شکل میں دُرود وسلام پڑھنا اور دوسروں کو اس کی ترغیب دلانا صریح اور منکر بدعت ہے جو عنداللہ مردود ہے۔

جن صحیح احادیث میں جمعہ کے دن بکثرت دُرود وسلام پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے ان میں سے چند احادیث یہ ہیں:

((عَنْ أَوْسِ ابْنِ أَوْسٍ ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قال: إِنَّ مِنْ أَفْضَلِ أَيَّامِكُمْ يَوْمُ الْجُمُعَةِ فِيْهِ خُلِقَ آدَمُ ، وَفِيْهِ قُبِضَ ، وَفِيْهِ النَّفْخَةُ ، وَفِيْهِ الصَّعْقَةُ ، فَأَكْثِرُوْا عَلَيَّ مِنَ الصَّلَاةِ فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ مَعْرُوْضَةٌ عَلَيَّ ، قَالُوا : يَا رَسُوْلَ

اللّٰہ! کَیفَ تُعرَضُ عَلَیْكَ صَلَاتُنَا وَقَدْ أَرِمْتَ ، یَقُوْلُوْنَ : قَدْ بَلِیْتَ قَالَ : إِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْأَرْضِ أَنْ تَأْکُلَ أَجْسَادَ الْأَنْبِیَاءِ)) ❶

''حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: تمہارا بہترین دن جمعہ کا دن ہے، اس میں آدم کی تخلیق ہوئی اور اس میں ان کی روح قبض کی گئی، اسی میں نفخہ (صور پھونکنا) اور اسی میں الصعقہ (تمام جانداروں کی موت) ہے۔ لہٰذا اس دن میرے اوپر زیادہ سے زیادہ دُرود پڑھو، کیونکہ تمہارا دُرود میرے اوپر پیش کیا جائے گا۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ پر ہمارا دُرود کس طرح پیش کیا جائے گا؟ آپ تو بوسیدہ ہو چکے ہوں گے۔ کہتے ہیں بَلِیت یعنی گل سڑ گئے ہوں گے۔'' فرمایا: بے شک اللہ نے زمین پر یہ حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسموں کو کھائے۔''

یہ حدیث حسین بن علی الجعفی کے طریقے سے مروی ہے اور اس کی سند میں باریک سقم ہے جس کی طرف امام بخاری نے اشارہ کیا ہے۔ لیکن حافظ الشیخ ابراہیم الناجی الحلبی نے اپنی کتاب ''عجالة الإملاء المیسرة من التذنیب علی ماوقع للحافظ المنذری من الوھم'' ص: ۱۰۳، ۱۰۵'' میں لکھا ہے: یہ علت حدیث کی صحت میں قادح نہیں ہے اس لیے کہ اس کے متعدد شواہد ہیں۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی ''صحیح الترغیب والترھیب : ۱/۴۳۶'' کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

''حافظ الناجی رحمہ اللہ کی بات درست ہے، مذکورہ حدیث کی سند میں یہ علت اس کی صحت پر اثر انداز نہیں ہے کیونکہ محدثین نے یکے بعد دیگرے اس کی تصحیح کی ہے۔''

اس حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن اپنے اوپر بکثرت دُرود بھیجنے کا حکم دیا ہے کوئی تعداد متعین نہیں فرمائی ہے اور نہ ہی یہ فرمایا ہے کہ آپ دُرود سُنتے ہیں بلکہ یہ فرمایا ہے کہ دُرود پڑھنے والوں کا دُرود آپ پر پیش کیا جائے گا۔

اسی بات کو ایک دوسری روایت میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

((إِنَّ لِلّٰہِ فِی الْأَرْضِ مَلَائِکَةً سَیَّاحِیْنَ یُبَلِّغُوْنِی مِنْ أُمَّتِی السَّلَامَ)) ❷

''زمین میں اللہ کے کچھ فرشتے ہیں جو گھومتے پھرتے ہیں وہ میرے میری اُمت کا سلام پہنچاتے

---

❶ ابو داؤد: ۱۰۴۷، ۱۵۳۱ـ والنسائی : ۱۳۷۳، ابن ماجه ۱۰۸۵، ۱۶۳۶ـ ابن خزیمه: ۱۷۳۳، ۱۷۳٤

❷ السنن الکبریٰ للنسائی : ۹۲۰٤ـ الطبرانی : ۱۰۵۲۸ـ ابو نعیم: اخبار اصبھان: ۲/ ۲۰۵

رہیں گے۔"

اور ایک صحیح الاسناد مقطوع حدیث ان الفاظ میں مروی ہے:

((عَنْ أَيُّوبَ ، قَالَ : بَلَغَنِي ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ ، أَنَّ مَلَكًا مُوَ كَّلٌ بِكُلِّ مَنْ صَلَّى عَلَى النَّبِيِّ ﷺ حَتَّى يُبَلِّغَهُ النَّبِيُّ ﷺ))

"ایوب سے روایت ہے کہ، کہا: مجھے خبر ملی ہے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ایک فرشتہ ہر اُس شخص کے ساتھ لگا دیا گیا ہے جو نبی ﷺ پر درُود بھیجتا ہے یہاں تک کہ وہ یہ درُود نبی ﷺ کو پہنچاتا ہے۔"

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

"اس کی سند ایوب السختیانی تک صحیح ہے اور یہ اگرچہ مقطوع ہے مگر مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ اس طرح کی بات رائے سے نہیں کہی جا سکتی اور اس سے سابقہ حدیث اس کی شاہد بھی ہے۔"

[فضل الصلاة على الرسول ﷺ ، ص: ١١٩، حديث: ٢٤]

معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کا بذات خود درُود و سلام سُننے کا عقیدہ اپنے پیچھے کتاب و سنّت سے کوئی دلیل نہیں رکھتا بلکہ یہ اُمت کے ایک خاص طبقہ کے لوگوں کے ذہنوں کی پیداوار ہے ان لوگوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ نبی ﷺ نعوذ باللہ اسی طرح زندہ ہیں جس طرح یہ دنیوی زندگی ہے اور اپنے گرد و پیش ہونے والے تمام حالات سے واقف ہیں، بلکہ بعض لوگ تو اس بات کے بھی قائل ہیں کہ ہمارے اعمال ہر روز نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں اور آپ ہی ہر عمل کے انجام کا تعین فرما رہے ہیں، اور قیامت کے روز بھی ہماری پیشی نبی ﷺ کے سامنے ہی ہوگی۔ ﴿ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ﴾

۷۹......((أَكْثِرُوا مِنَ الصَّلَاةِ عَلَيَّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ، فَمَنْ كَانَ أَكْثَرَهُمْ عَلَيَّ صَلَاةً كَانَ أَقْرَبَهُمْ مِنِّي مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

"جمعہ کے دن میرے اوپر زیادہ سے زیادہ درُود بھیجو، کیونکہ ان میں جو شخص میرے اوپر کثرت درُود میں آگے ہوگا قیامت کے دن وہ ان میں مجھ سے درجے کے اعتبار سے زیادہ قریب ہو گا۔"

یہ ایک نہایت ہی ضعیف حدیث ہے اس کی روایت امام شیرویہ بن شہردار بن شیرویہ الدیلمی نے "مسند الفردوس: ۱/۲۹" میں اس سند سے کی ہے:

''الحسن بن سعید الموصلی سے روایت ہے، وہ ابراہیم بن حیان سے روایت کرتے ہیں، وہ حماد بن سلمہ سے، وہ برد بن سنان سے، وہ حضرت ابوامامہ الباہلی سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے.........''

حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں لکھا ہے: ''امام ابن عدی نے ابراہیم بن حیان کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی روایت کردہ حدیثیں موضوع ہیں۔''

برد بن سنان سچے تھے لیکن ابوامامہ الباہلی سے ان کا سماع ثابت نہیں ہے، ان کے اور ابوامامہ کے درمیان مکحول ہیں، حافظ المنذری نے بھی ''الترغیب والترھیب: ۲۸۱/۲ '' میں یہ حدیث روایت کی ہے مگر درمیان میں اس عبارت کا اضافہ ہے:

((فَإِنَّ صَلَاةَ أُمَّتِي تُعْرَضُ عَلَيَّ فِي كُلِّ يَوْمِ جُمُعَةٍ))

''میری اُمت کا درُود میرے اوپر ہر جمعہ کے دن پیش کیا جائے گا۔''

اور حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ''اس کی روایت البیہقی نے ''حسن سند'' سے کی ہے۔'' لیکن مکحول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ابوامامہ سے حدیث نہیں سُنی ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

''المنذری کے اس حدیث کو حسن کہنے سے کچھ ایسا احساس ہوتا ہے کہ شاید البیہقی کی روایت میں ابراہیم بن حیان نہیں ہے، لیکن جب ہم نے البیہقی کی ''سنن: ۲۴۹/۳'' سے رجوع کیا تو اس میں ابراہیم بن الحجاج کا نام ہے جو ثقہ تھے۔ اسی وجہ سے حافظ المنذری نے اس کو حسن کہا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس روایت میں تحریف کرکے ''حیان'' کی جگہ ''الحجاج'' لکھ دیا گیا ہے۔ کیونکہ امام ابن عدی نے اس براہیم بن حیان کی ایک دوسری حدیث مذکورہ سند کے ساتھ حماد بن سلمہ سے روایت کی ہے، اسی طرح یہ حدیث الدیلمی کی سند سے بھی مروی ہے یعنی ابراہیم بن حیان ہی نے حماد سے یہ حدیث روایت کی ہے اور اس سے الحسن بن سعید الموصلی اور ''المغنی'' میں یہ صراحت کہ ابراہیم بن حیان ساقط اور وضع حدیث کا ملزم ہے۔''

[الضعیفه: ٤٣٢/٦]

۸۰......((مَنْ صَلَّى عَلَيَّ فِي كِتَابٍ لَمْ تَزَلِ الْمَلَائِكَةُ يَسْتَغْفِرُونَ لَهُ مَادَامَ إِسْمِي فِي ذٰلِكَ الْكِتَابِ))

''جس نے میرے اوپر کسی کتاب میں درُود بھیجا ہے تو جب تک اُس کتاب میں میرا نام رہے گا فرشتے اس کے لیے مغفرت طلب کرتے رہیں گے۔''

یہ حدیث بھی بے حد ضعیف ہے۔ اس کی تخریج ابو القاسم الاصبہانی نے ''الترغیب: ۲/ ۶۹۳، ۱۶۷۰'' میں اور عبدالکریم الرافعی نے ''تاریخ قزوین'' میں جس سند سے کی ہے اس میں عبدالسلام بن محمد المصری سے روایت کرنے والا راوی غیر معروف ہے، اس روایت کی سند یہ ہے:

''عبدالسلام بن محمد المصری سے روایت ہے۔ راوی غیر معروف ہے، انہوں نے کہا: ہم سے سعید بن عُفیر نے بیان کیا، کہا: مجھ سے محمد بن ابراہیم بن اُمیہ القرشی نے عبدالرحمٰن بن عبداللہ الاعرج سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے............''

محدث محمد ناصر الدین البانی یہ حدیث اور اس کی سند بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''یہ سند بے حد کمزور ہے۔ اس میں عبدالسلام بن محمد المصری سے اس حدیث کی روایت کرنے والے کے ''مجہول الحال'' ہونے کے علاوہ سعید بن عُفیر سے اس حدیث کے راوی عبدالسلام بن محمد کے بارے میں امام الدارقطنی کا قول ہے: وہ بے حد کمزور اور منکر حدیث ہے۔''

اور حافظ الخطیب البغدادی نے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

((صاحب مناکبر)) وہ منکر حدیثوں کا راوی ہے۔''

اور محمد بن ابراہیم بن اُمیہ القرشی لگتا ہے کہ وہی محمد بن ابراہیم القرشی ہے جس کا ذکر ''میزان الاعتدال'' اور ''لسان المیزان'' میں آیا ہے اور جس کے بارے میں امام الذہبی نے لکھا ہے کہ اس نے حفظ قرآن کے بارے میں ایک موضوع حدیث روایت کی جس کو العقیلی نے بیان کیا ہے، اور حافظ ابن حجر نے العقیلی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انہوں نے محمد بن ابراہیم القرشی کو ''مجہول'' قرار دیا ہے۔''

[الضعیفہ: ۷/ ۳۲۰، ۳۲۲]

۸۱......((رُوِیَ عَنْ أَبِیْ کَاهِلٍ رضی اللہ عنہ ، قَالَ : قَالَ لِی رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم : یَا أَبَا کَاهِلٍ ! مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ کُلَّ یَوْمٍ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ، وَکُلَّ لَیْلَةٍ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ حُبًّا أَوْ شَوْقًا إِلَیَّ ، کَانَ حَقًّا عَلَی اللّٰہِ أَنْ یَغْفِرَ لَهُ ذُنُوبَهُ تِلْكَ اللَّیْلَةَ وَذٰلِكَ الْیَوْمَ......)) [ضعیف الترغیب والترھیب ، حدیث: ۱۰۳۴]

''حضرت ابو کاہل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''اے ابو کاہل! جو شخص میری محبت یا شوق میں، دن میں تین بار اور رات میں تین بار میرے اُوپر دُرود بھیجے تو اللہ پر یہ واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اس رات اور اس دن میں اس کے گناہوں کو بخش دے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی نے ''ضعیف الترغیب والترھیب کے حاشیہ (۱/ ۵۱۳) میں اس کو منکر بتایا ہے اور لکھا ہے کہ امام محمد بن عمرو العقیلی نے ''کتاب الضعفاء'' میں اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور حافظ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں حضرت ابو کاہل رضی اللہ عنہ کے ترجمہ میں اس کو ''منکر'' کہا ہے، اور عز الدین ابن الأثیر الجذری نے ''اسد الغابہ'' میں ان کی تائید کی ہے۔

دُرود وسلام کے باب میں اگر تمام موضوع، منکر اور بے حد ضعیف حدیثوں کو جمع کیا جائے تو پوری ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اس موضوع پر جس کثرت سے بے بنیاد اور جھوٹی حدیثیں فضائل اعمال کی کتابوں میں ملتی ہیں یا نام نہاد علماء اور عوام میں زبان زد ہیں ان کی تعداد بتانا بہت مشکل ہے۔ ان کی کثرت کا اندازہ کرنے کے لیے علامہ ابن القیم کی کتاب ''جلاء الافهام فی الصلاة والسلام علی خیر الأنام'' اور حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی کی کتاب ''القول البدیع فی الصلاة علی الحبیب الشفیع'' پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینا کافی ہے۔ صحیحین اور سنن اربعہ اور حدیث کی دوسری کتابوں کے بعد اس موضوع پر سب سے زیادہ قابل اعتماد کتاب امام اسماعیل بن اسحاق القاضی المتوفی ۲۸۲ھ کی کتاب ''فضل الصلاة علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' ہے۔ اس کتاب میں دُرود وسلام کے فضائل اور اجر و ثواب سے متعلق صحیح احادیث کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ لیکن برا ہو ذہنیتوں کے فتور اور دین میں نئی نئی باتوں کے اضافے کی خواہشات کا کہ صحیح اور قابل اعتماد حدیثوں پر عمل کرنے والے اور ان کو پھیلانے والے تو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر بے بنیاد جھوٹی اور من گھڑت روایات سے ہر خاص و عام واقف ہے نہ صرف واقف ہے بلکہ انہی روایات کی ترویج کو اصل دینی کام تصور کر رہا ہے اور ان جھوٹی روایات کا انکار کرنے والوں کو اُمت کا ایک بہت بڑا طبقہ منکرین حدیث اور مبتدعین کے نام سے پکارتا ہے۔ ﴿ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴾

صفائی اور طہارت:

٢٦ ......((تَنَظَّفُوا بِكُلِّ مَا اسْتَطَعْتُمْ ، فَإِنَّ اللّٰهَ بَنَى الْإِسْلَامَ عَلَى النَّظَافَةِ، وَلَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا كُلُّ نَظِيفٍ))

''اپنے مقدور بھر صاف ستھرے رہنے کی کوشش کرو، کیونکہ اللہ نے اسلام کی بنیاد صفائی پر رکھی ہے اور جنت میں صرف صاف ستھرا شخص ہی داخل ہوگا۔''

یہ موضوع حدیث ہے جس کی تخریج عبدالکریم الرافعی القزوینی نے "تاریخ قزوین : ١٧٦/١ " میں، ابو الصعالیک محمد بن عبید اللہ بن یزید الطرسوسی کی سند سے کی ہے:

''ہم سے ابو علی الحسن بن محمد نے بیان کیا، کہا: ہم سے اسحاق بن شاہین الواسطی نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن یعلیٰ الکوفی نے بیان کیا، کہا: ہم سے عمر بن صبح نے ابو سہل سے، انہوں نے الحسن سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے..........''

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

''یہ حدیث موضوع ہے جس کی آفت عمر بن صبح ہے۔'' [الضعیفة : ٧/ ٢٧٠، حدیث : ٣٢٦٤]

حافظ ابن حجر نے "تقریب التہذیب " میں لکھا ہے:

''عمر بن صبح بن عمران التمیمی العدوی، ابو نعیم الخراسانی: متروک ہے، امام اسحاق بن راہو یہ نے اس کو جھوٹا قرار دیا ہے۔''

اور سند کا دوسرا راوی، محمد بن یعلیٰ الکوفی ضعیف ہے۔ اور سند کا تیسرا راوی ابو علی الحسن بن محمد غیر معروف ہے۔

اس موضوع حدیث کا ذکر امام غزالی نے "احیاء العلوم : ١٣٨/١ " میں ان لفظوں میں کیا ہے:

((بُنِيَ الدِّيْنُ عَلَى النَّظَافَةِ))

''دین کی بنیاد نظافت پر رکھی گئی ہے۔''

حافظ ابو الفضل، زین الدین العراقی "المغنی عن حمل الاسفار : حاشیہ نمبر ١ " میں فرماتے ہیں:

''مجھے یہ حدیث ان لفظوں میں نہیں ملی ، اور امام ابن حبان کی کتاب ''الضعفاء'' میں حضرت

عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ان الفاظ میں موجود ہے:

((تَنَظَّفُوا فَإِنَّ الإِسْلَامَ نَظِيفٌ))

''صاف ستھرے رہو، کیونکہ اسلام صاف ستھرا ہے۔''

اور حافظ الطبرانی نے ''المعجم الأوسط '' میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نہایت کمزور سند کے ساتھ ان لفظوں میں روایت کی ہے:

((النَّظَافَةُ تَدْعُو إِلَى الإِيْمَانِ))

''صفائی ایمان کی دعوت دیتی ہے۔''

۲۷......((إِذَا كَانَ فِي الثَّوبِ قَدْرُ الدِّرْهَمِ مِنَ الدَّمِ؛ غُسِلَ الثَّوبُ وَأُعِيْدَتُ الصَّلَاةُ))

''اگر کپڑے پر درہم برابر خون ہو تو دھولیا جائے اور نماز دھرائی جائے۔''

موضوع ہے، اس کی تخریج امام ابن حبان نے ''الضعفاء: ۲۹۸/۱'' میں امام الدارقطنی نے ''السنن: ۱۵۴'' میں اور امام البیہقی نے ''السنن الکبریٰ: ۴۰۴/۲'' میں اس سند سے کی ہے:

''روح بن غطیف سے روایت ہے، وہ الزہری سے روایت کرتے ہیں، وہ ابوسلمہ سے اور وہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔''

امام ابن حبان نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''بلاشبہ یہ خبر موضوع ہے۔ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد نہیں فرمائی ہے، بلکہ اس کو اہل کوفہ نے گھڑا ہے اور روح بن غُطَیف ثقہ راویوں کے نام سے موضوع احادیث روایت کرتا تھا۔''

اور حافظ جمال الدین الزیلعی ''نصب الرایہ: ۲۷۸/۱'' میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''امام بخاری نے فرمایا ہے: ''یہ حدیث باطل ہے اور روح منکر الحدیث ہے۔'' اور ابن حبان نے لکھا ہے: ''بلاشک یہ موضوع حدیث ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک نہیں ہے، بلکہ اہل کوفہ کی گھڑی ہوئی ہے۔ روح بن غطیف ثقہ لوگوں کے نام سے موضوع حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔'' اور ابن الجوزی نے اس کا ذکر ''الموضوعات'' میں کیا ہے۔ انہوں نے اس کا ذکر نوح بن ابی مریم عن یزید الہاشمی عن الزہری عن ابی سلمہ عن ابی ہریرہ مرفوعاً کی سند

سے بھی کیا ہے۔ اور نوح بن ابی مریم کے بارے میں نہایت سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔"

حافظ الزیلعی نے مذکورہ حدیث کے بارے میں ائمہ حدیث کے اقوال نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ نہ تو خود کوئی رائے دی ہے اور نہ کسی امام حدیث کی اس کے بارے میں توثیق کا ذکر کیا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اس کے موضوع اور باطل ہونے پر وہ امام بخاری، امام ابن حبان اور امام ابن الجوزی سے متفق ہیں۔

اور مشہور وضاع حدیث اور کذاب نوح بن ابی مریم کے طریقے سے مروی حدیث کے الفاظ ہیں:

۲۸ ......((اَلدَّمُ مِقْدَارَ الدِّرْهَمِ ؛ يُغْسَلُ ، وَتُعَادُمِنْهُ الصَّلٰوةُ))

"درہم کے برابر خون دھولیا جائے اور اس کی وجہ سے نماز کا اعادہ کیا جائے۔"

یہ بھی موضوع ہے۔ اس کی تخریج الخطیب البغدادی نے "تاریخ بغداد :۹/۳۳۰" میں اور انہی کے حوالہ سے امام ابن الجوزی نے "الموضوعات :۲/۷۵" میں کی ہے اور اس کو موضوع قرار دیا ہے۔ اور حافظ الزیلعی نے "نصب الراية :۱/۲۷۸" میں ان سے اتفاق کیا ہے اور حافظ سیوطی نے بھی "اللآلی المصنوعة :۲/۴" میں اس کو موضوع بتایا ہے۔

لہٰذا درہم کے برابر خون کو "نجاست غلیظہ" کا معیار اور پیمانہ بنانا صحیح نہیں ہے کیونکہ کوئی باطل اور بے بنیاد روایت کسی شرعی حکم کا ماخذ نہیں بن سکتی۔

۲۹ ......((اَلْوُضُوْءُ مِنْ كُلِّ دَمٍ سَائِلٍ))

"ہر بہنے والے خون کی وجہ سے وضو ہے۔" (یعنی دم سائل ناقضِ وضو ہے۔)

یہ حدیث اگر چہ موضوع تو نہیں ہے لیکن بے حد ضعیف ہے۔ اس کی تخریج امام الدارقطنی نے "السنن، ص:۱۵۷" میں "**بقيه عن يزيد بن خالدعن يزيد بن محمد عن عمر بن عبدالعزيز** کی سند سے کی ہے۔

بقیہ یزید بن خالد سے روایت کرتا ہے، وہ یزید بن محمد سے اور وہ عمر بن عبدالعزیز سے، عمر بن عبدالعزیز کہتے ہیں: تمیم الداری نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے.........."

امام الدارقطنی نے اس سند کو یہ کہہ کر "معلول" بتایا ہے کہ:

"عمر بن عبدالعزیز کا تمیم الداری رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے اور نہ انہوں نے اُن کو دیکھا ہی ہے، اور یزید بن خالد اور یزید بن محمد دونوں مجہول ہیں۔"

اور حافظ الزیلعی نے "نصب الراية :۱/۸۳، ۸۴" میں اس سند کے ضعیف ہونے پر امام الدار

قطنی سے اتفاق کیا ہے اور لکھا ہے کہ: "یہ حدیث حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے جس کی تخریج امام ابن عدی نے "الکامل: ۱/۱۹۰" میں احمد بن الفرج کے ترجمہ کے ضمن میں کی ہے:

"بقیہ سے روایت ہے، کہا: ہم سے شعبہ نے محمد بن سلیمان بن عاصم بن عمر ابن الخطاب سے، انہوں نے عبدالرحمٰن بن ابان بن عثمان بن عفان سے اور انہوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا: زید بن ثابت نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے........"

((اَلْوُضُوْءُ مِنْ کُلِّ دَمٍ سَائِلٍ))

"ہر بہنے والے خون کی وجہ سے وضو ہے۔"

یہ سند نقل کرنے کے بعد حافظ الزیلعی فرماتے ہیں:

"امام ابن عدی کہتے ہیں: اس حدیث کو ہم صرف اس احمد کی روایت کردہ حدیث کی حیثیت سے جانتے ہیں جو اُن لوگوں میں سے ہے جن کی روایت کردہ حدیث حجت نہیں ہے، البتہ اس کو لکھنا جائز ہے کیونکہ ائمہ حدیث نے اس کے ضعیف ہونے کے باوجود اس کی حدیثوں کو برداشت کیا ہے، اور امام ابن ابی حاتم نے "کتاب العلل: ۱/۳۸" میں لکھا ہے: "احمد بن الفرج سے مروی حدیثیں ہم نے لکھی ہیں، ہمارے نزدیک اس کا مقام "صدق" ہے۔"

امام ابن ابی حاتم فرماتے ہیں:

"اگر کسی راوی کے بارے میں یہ کہا جائے: ((اِنه صدوق اومحله الصدق ، أولا بأس به)) وہ سچا ہے، اس کا مقام صدق ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، تو اس کی روایت کردہ حدیث لکھی جائے گی اور دیکھا جائے گا کہ وہ صحیح ہے یا نہیں، کیونکہ یہ قول کسی راوی کی تعدیل کا دوسرا درجہ ہے۔" [مقدمه ابن الصلاح، ص: ۸۱]

چنانچہ بیشتر ائمہ حدیث نے احمد بن الفرج کی تضعیف کی ہے۔ اس کے بارے میں امام ابن ابی حاتم کی رائے اوپر معلوم ہوگئی، حافظ محمد بن عوف نے اس کی تضعیف کی ہے اور اس پر کذب بیانی کا الزام لگایا ہے، اور لکھا ہے:

"احمد بن الفرج کذاب تھا، بقیہ سے اس کی روایت کردہ حدیث بے بنیاد ہے اس کے بارے میں وہ اللہ کی مخلوق میں جھوٹا ترین شخص تھا، بقیہ سے اس کی روایت کردہ حدیثوں کی حقیقت یہ

ہے کہ کسی صاحب حدیث شخص کی کتاب کے کاغذ کی پشت پر اس کو کچھ حدیثیں لکھی ہوئی مل گئیں جن کے شروع میں لکھا ہوا تھا: "حدثنا یزید ابن عبدربه" ہم سے یزید بن عبدربہ نے بیان کیا، اس کو احمد بن الفرج نے اس طرح روایت کرنا شروع کر دیا۔ ہم سے بقیہ نے حدیث بیان کی، (بقیہ کا پورا نام: بقیہ بن الولید بن صائد بن کعب الکلاعی ہے۔ وہ سچا تھا لیکن ضعیف راویوں کی بکثرت "تدلیس" سے کام لیتا تھا" تقریب التهذیب)"

حافظ محمد بن عوف حمصی تھے اور احمد بن الفرج کا تعلق بھی "حمص" سے تھا اس لیے دوسروں کے مقابلے میں وہ اس کے حالات سے زیادہ واقف تھے، انہوں نے اس پر شراب نوشی کا بھی لزام لگایا ہے جیسا کہ الخطیب البغدادی نے "تاریخ بغداد: ۴/ ۳۴۱" میں بیان کیا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ ایک ایسے شخص کی روایت کردہ حدیث جس کی عدالت ائمہ حدیث کے درمیان مختلف فیہ رہی ہو اور اس کو مجروح قرار دینے والوں کی تعداد زیادہ ہو، ایسے شخص کی روایت "دم سائل" کے ناقض وضو ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔ جبکہ اہل حجاز اور فقہائے سبعہ کا یہ متفقہ مسلک تھا کہ خون کا نکلنا ناقضِ وضو نہیں ہے اور بعض صحابہ کے واقعات سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ دم سائل یا خروج الدم کو ناقضِ وضو نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ صحیح سند سے یہ ثابت ہے کہ خلیفۂ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب زخمی کر دیا گیا تو آپ نے اپنی نماز پوری کی درحالانکہ آپ کے زخموں سے خون جاری تھا۔ ❶

اور صحیح بخاری میں ہے:

((وَعَصَرَ ابْنُ عُمَرَ بَثْرَةً فَخَرَجَ مِنْهَا الدَّمُ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ)) ❷

"ابن عمر نے پھنسی کو دبا کر پھوڑ دیا جس سے خون نکلا اور انہوں نے وضو نہیں کیا۔"

اور صحیح بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک معلق حدیث ہے جس کے بارے میں حافظ ابن حجر نے "فتح الباری: ۱/ ۳۷۷" میں لکھا ہے کہ سعید ابن منصور اور الدارقطنی نے اس کو متصل قرار دیا ہے اس حدیث کے الفاظ ہیں:

((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ فِي غَزْوَةِ ذَاتِ الرِّقَاعِ ، فَرُمِيَ رَجُلٌ بِسَهْمٍ فَنَزَفَهُ الدَّمُ ، فَرَكَعَ وَسَجَدَ وَمَضَى فِي صَلَاتِهِ))

"نبی ﷺ نے غزوۂ ذات الرقاع میں شرکت فرمائی جس میں ایک صحابی کو تیر لگا اور ان کے

❶ فتح الباری: ۱/ ۳۷۷ ❷ باب: ۳٤ـ ۱/ ۳۷۷

جسم سے خون جاری ہوگیا اور انہوں نے رکوع وسجدہ کیا اور اپنی نماز جاری رکھی۔''

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ مذکورہ غزوہ میں نبی ﷺ ایک گھاٹی میں اُترے اور فرمایا:

آج کی رات کون ہماری حراست کرے گا؟ اس پر ایک مہاجر صحابی اور ایک انصاری صحابی اس مہم کے لیے تیار ہوگئے اور انہوں نے اپنے درمیان رات اس طرح تقسیم کی کہ انصاری پہلے پہرہ دیں گے اور مہاجر سوئیں گے، چنانچہ مہاجر صحابی تو سو گئے اور انصاری صحابی نماز میں مشغول ہو گئے، گھات میں لگے دشمن کے ایک آدمی نے انکو نماز پڑھتے دیکھ لیا اور ان کو تیر مارا جو ان کو لگ گیا۔ مگر انصاری نے اپنے ہاتھ سے وہ تیر نکال دیا اور نماز جاری رکھی۔ دشمن نے ان کو دوسرا تیر مارا انہوں نے اس کو بھی نکال دیا اور نماز جاری رکھی اور دشمن نے ان کو تیسرا تیر مارا انہوں نے اس کو بھی نکالا اور رکوع کیا، پھر سجدے میں گئے اور نماز پوری کر لی ، اور اپنے ساتھی کو بیدار کیا اور جب اُن کے مہاجر ساتھی نے ان کی حالت دیکھی کہ خون میں شرابور ہیں، تو کہا: تم نے مجھے بیدار کیوں نہیں کیا؟ انصاری نے جواب دیا:

''میں نماز میں ایک ایسی سورت پڑھ رہا تھا جس کو چھوڑنا میں نے پسند نہیں کیا۔''

امام البیہقی نے ''دلائل النبوۃ'' میں انصاری کا نام عباد بن بشر اور مہاجر کا نام عمار بن یاسر لکھا ہے۔

۳۰...... ((مَسْحُ الرَّقَبَةِ أَمَانٌ مِنَ الْغِلِّ))

''گردن کا مسح کینہ وحسد سے محفوظ رکھتا ہے۔''

موضوع ہے، امام النووی "المجموع شرح المهذب : ۱/۴۶۵ " میں فرماتے ہیں:

''یہ موضوع ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔''

حافظ السیوطی نے امام نووی کی یہ بات "ذیل الاحادیث الموضوعة ، ص: ۲۰۳ " میں نقل کرنے کے بعد اس کی توثیق کی ہے۔

اور حافظ ابن حجر نے "التلخيص الحبير : ۱/۴۳۳ " میں لکھا ہے:

''ابو محمد الجوینی نے اس موضوع حدیث کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ائمہ حدیث نے اس کی سند کو قبول نہیں کیا ہے، اور غزالی نے اس کا ذکر ''الوسیط'' میں کیا ہے جس کی تعقیب ابن الصلاح نے ان الفاظ میں کی ہے: یہ حدیث النبی ﷺ سے معروف نہیں ہے، یہ سلف میں سے کسی کا قول ہے۔''

۳۱...... ((مَنْ تَوَضَّأَ وَمَسَحَ عُنُقَهُ لَمْ يُغَلَّ بِالْأَغْلَالِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

''جس نے وضو کیا اور اپنی گردن پر مسح کیا، اس کو قیامت کے دن بیڑیاں نہیں پہنائی جائیں گی۔''

موضوع ہے، اس کی روایت حافظ ابونعیم نے ''اخبار اصبہان: ۱۱۵/۲'' میں اس سند سے کی ہے:

''ہم سے محمد بن احمد بن محمد نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالرحمٰن بن داؤد نے بیان کیا، کہا: ہم سے عثمان بن خرزاذ نے بیان کیا، کہا: ہم سے عمرو بن محمد بن الحسن المکتب نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن عمرو بن عُبید الانصاری نے، انس بن سیرین کے واسطہ سے اور انہوں نے ابن عمر سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ ابن عمر جب وضو کرتے تو اپنی گردن پر مسح کرتے تھے۔''

حافظ ابونعیم نے اس حدیث کو عبدالرحمٰن بن داؤد کے ترجمہ کے ضمن میں نقل کیا ہے، اور لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن بن داؤد، جن کی کنیت ابومحمد الفارسی تھی، کا شمار کثیر الحدیث فقہاء میں ہوتا تھا'' حافظ ابونعیم نے ان کی جرح وتعدیل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اور ان کے علاوہ عبدالرحمٰن بن داؤد کا ذکر کسی اور کے یہاں نہیں ملتا۔

رہے حافظ ابونعیم کے شیخ: محمد بن احمد بن محمد، تو وہ یا تو ابوبکر المعدل ہیں جو ثقہ اور امانت دار تھے جیسا کہ ابونعیم نے ان کے بارے میں صراحت کی ہے، یا ابوعثمان بن ابوہریرہ تھے جن کی تعریف میں انہوں نے لکھا ہے: ''وہ عبادت گزاروں اور نیک لوگوں میں سے ایک تھے۔

لیکن علی بن محمد بن عراق نے ''تنزیه الشریعة المرفوعة عن الاخبار الشنیعة الموضوعة'' میں ابونعیم کے حوالہ سے یہی حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''اس کی سند میں ابونعیم کے شیخ ابوبکر المفید بھی شامل ہیں، جن کے بارے میں حافظ زین الدین العراقی نے یہ صراحت کی ہے کہ اس حدیث کی ''آفت'' وہی ہیں۔''

[ص: ۷۵، ج: ۲، حدیث: ۳۵]

اور ابوبکر المفید پر کذب بیانی کا الزام ہے جیسا کہ امام ذہبی نے ''میزان الاعتدال'' اور حافظ ابن حجر نے ''لسان المیزان'' میں لکھا ہے اور ابن عراق کے بقول حافظ العراقی نے یہ تعین کر دیا ہے کہ محمد بن احمد محمد ابوبکر المفید ہی ہیں جو ابوبکر المعدل کے علاوہ کوئی اور ہیں اور حافظ العراقی ''علم الرجال'' میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔

اور اس حدیث کی سند میں ایک اور راوی: محمد بن عمرو بن عُبید الانصاری البصری بھی ہیں جو بے حد

ضعیف ہیں، اُن کی کنیت ابو سہل ہے، اُن کے ضعیف ہونے پر ائمہ حدیث کا اتفاق ہے۔ (تقریب التہذیب)

اور اس حدیث کی سند میں ایک تیسری ''علت'' عمرو بن محمد بن الحسن ہے۔ الخطیب البغدادی نے ''تاریخ بغداد: ۱۲/۲۰۴'' میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

''وہ الزمن ہے جو الاعسم'' کے نام سے معروف تھا۔ وہ بصرہ کا رہنے والا تھا جو بغداد میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔'' پھر الخطیب نے اس کے بارے میں امام دارقطنی کا یہ قول نقل کیا ہے: ''وہ منکر الحدیث تھا۔'' اور ایک دوسری روایت میں ہے: ''وہ ضعیف اور کثیر الوھم تھا۔'' اور لسان المیزان میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''امام الحاکم نے لکھا ہے: وہ ساقط الاعتبار تھا، اس نے کچھ لوگوں کے نام سے ایسی موضوع حدیثیں روایت کی ہیں جن سے مروی حدیثوں میں ان کا کوئی ذکر نہیں، اس موضوع حدیث کی سند کے نا قابلِ اعتبار ہونے کے علاوہ اس کا متن بے حد منکر ہے۔ کیونکہ کتاب وسنّت میں وضو کے جو اعمال تفصیل سے بیان ہوئے ہیں ان میں گردن پر مسح کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور اعمال وضو میں سے کسی بھی عمل کے بارے میں چاہے وہ فرض ہو یا سنت وہ فضیلت نہیں ہوئی ہے جو اس بے بنیاد حدیث میں گردن پر مسح کے عمل کی بیان ہوئی ہے۔

آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ نبی ﷺ کے وضو کے بارے میں جو صحیح احادیث مروی ہیں ان میں سے کسی میں بھی گردن پر مسح کا ذکر نہیں ہے۔ سوائے ایک حدیث کے جو طلحہ بن مُصَرِّف نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اس کے دادا سے روایت کی ہے، اس کے الفاظ ہیں:

((رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَمْسَحُ رَأْسَهُ مَرَّةً وَاحِدَةً حَتّٰی بَلَغَ الْقَذَالَ وَهُوَ أَوَّلُ الْقَفَا ' وَفِیْ رِوَایَةٍ : "وَمَسَحَ رَاسَهُ مِنْ مُقَدَّمِهِ اِلٰی مُؤْخِرِهِ))

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ اپنے سر کا ایک ہی بار مسح فرماتے تھے یہاں تک کہ مسح کا یہ عمل قذال (گدی، سر کا پچھلا حصہ) تک پہنچتا تھا اور ''القذال'' گردن کے بالائی حصے کو کہتے ہیں (جو سر سے متصل ہوتا ہے، گدی) اور ایک دوسری روایت میں ہے: آپ نے اپنے سر کا، سامنے سے پچھلے حصے تک مسح فرمایا۔''

یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس کی تخریج امام ابوداؤد نے سنن میں کی ہے۔ (ضعیف سنن ابوداؤد حدیث

نمبر۱۳۲)اور اس کے بارے میں امام سفیان ابن عیینہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ اس کو''منکر'' کہتے تھے۔

واضح رہے کہ اس حدیث کی سند میں تین علتیں جمع ہیں جن میں سے ایک علت بھی اس کو ساقط کرنے کے لیے کافی ہے۔

ا۔راوی کا ضعف...........۲۔راوی کا مجہول ہونا..........۳۔مُصَرِّف کے والد عمرو بن کعب کے شرف صحابیت میں اختلاف۔ [الضعیفه لِلآلبانی : ۱۶۷/۱،حدیث : ۶۹،۱۶۷/۲،حدیث : ۷۴۴]

۳۲......((إِدْ فِنُوا دِمَاءَ كُمْ وَأَشْعَارَ كُمْ ، وَأَظفَارَ كُمْ ، لَا تَلْعَبُ بِهَا السَّحَرَةُ))

''اپنا خون اپنے بال اور اپنے ناخن کے تراشے دفن کر دیا کرو، تا کہ جادوگر اُن سے نہ کھیلیں۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی روایت امام شیرویہ بن شہردار الدیلمی نے ''مسند الفردوس : ۱۹/۱/۱'' میں الحسن بن الحسین بن دوما سے کی ہے:

''ہم سے ابوسعید بن رُمیح نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن عقیل نے بیان کیا، کہا: مجھ سے ابراہیم بن محمد بن الحسین نے بیان کیا، کہا: ہم سے میرے والد نے بیان کیا، کہا: ہم سے عیسیٰ بن موسیٰ نے الحسن بن دینار سے، انہوں نے مقاتل بن حیان سے انہوں نے ابوالزبیر سے اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا..........''

حافظ ابن حجر نے ''مختصر المسند'' میں اس موضوع حدیث کی سند اس طرح لکھی ہے:

''میں نے کہا: الحسن بن دینار، بیاض، ابن رُمیح، بیاض، ابن دوما، بیاض.....''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ ابن حجر کو ان راویوں کے بارے میں تحقیق کا موقع نہیں ملا اور اس اُمید میں ہر راوی کے آگے ''بیاض'' چھوڑ دی کہ ان کی جرح وتعدیل کے بارے میں تحقیق کر کے ہر ایک کا حال لکھیں گے، مگر موت نے ان کو مہلت نہیں دی اس طرح ان کے قلمی نسخے میں یہ ''خلا'' باقی رہا اور کسی نے اس کو پُر نہیں کیا۔

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

''یہ سند بے حد کمزور اور نا قابل اعتبار ہے، کیونکہ الحسن بن دینار کی امام احمد، یحییٰ بن معین اور ابو خیثمہ نے تکذیب کی ہے۔'' [الضعیفه : ۲۰۳/۵]

اور الحسن بن الحسین بن دوما پر حافظ الخطیب البغدادی نے ''تاریخ بغداد: ۳۰۰/۷'' میں یہ الزام لگایا ہے کہ وہ ائمہ حدیث سے حدیثیں سُننے کا جھوٹا دعویٰ کرتا تھا'' لکھتے ہیں:

''ہم نے اس سے حدیثیں لکھیں وہ کثرتِ سماع میں شہرت رکھتا تھا لیکن اس نے اپنی ثقاہت یوں مجروح کر لی کہ اپنے آپ سے ایسی حدیثیں سُننے کو منسوب کر لیا جو اس نے نہیں سُنیں۔''

اسی طرح اس کے شیخ ابن ربیح کا حال ''کتب الرجال'' میں نہیں ملتا۔ صرف الخطیب البغدادی نے اس کا شمار ابن دوما کے شیوخ میں کیا ہے۔

۳۳......((إِدْفِنُوا الأَظْفَارَ وَالدَّمَ وَالشَّعْرَ، فَإِنَّهُ مَيْتَةٌ))

''ناخن، خون اور بال کو دفن کر دیا کرو، اس لیے کہ وہ مردار ہیں۔''

موضوع ہے۔ امام ابو الفرج عبدالرحمٰن بن الجوزی نے اس کی راویت "التحقیق فی مسائل التعلیق : ۱/۷۱ " میں، ابن عدی کے طریقے سے کی ہے۔ امام ابن عدی نے "الکامل : ۱/۲۱۹ " میں عبداللہ بن عبدالعزیز بن ابی داؤد کی سند سے کی ہے، کہا:

''مجھ سے میرے والد نے نافع سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

ابن الجوزی فرماتے ہیں:

''ابن عدی نے لکھا ہے: عبداللہ بن عبدالعزیز کی روایت کردہ ایسی حدیثیں ملتی ہیں جن میں اس کا کوئی ''متابع'' نہیں ہے۔ امام ابو حاتم الرازی نے اس کے متعلق فرمایا ہے: اس کی روایت کردہ حدیثیں ''منکر'' ہیں۔ میرے نزدیک وہ سچا نہیں تھا۔''

اور حافظ علی بن الحسین بن الجُنید کہتے ہیں:

''عبداللہ بن عبدالعزیز ایک کوڑی کے برابر بھی نہیں تھا، وہ جھوٹی حدیثیں بیان کرتا پھرتا تھا۔''

[بحواله الضعيفه : ٥/ ٢٠٤]

۳٤......((كَانَ يَأْمُرُ بِدَفْنِ الشَّعْرِ وَالْأَظْفَارِ))

''نبی ﷺ بال اور ناخن کو دفن کر دینے کا حکم دیا کرتے تھے۔''

یہ حدیث اگرچہ موضوع تو نہیں ہے لیکن بے حد ضعیف ہے۔ اس کی تخریج حافظ ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی نے "المعجم الکبیر : ۲۲، ۳۲، ۷۳ " میں اور امام احمد بن الحسین البیہقی نے "شعب الایمان : ۲/۲۶۹ " میں محمد بن الحسین کی سند سے کی ہے:

''ہم سے میرے والد نے بیان کیا، کہا: ہم سے قیس بن الربیع نے عبدالجبار ابن وائل سے اور

انہوں نے اپنے والد سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا..........‘‘

یہ سند ضعیف ہے۔ اور یہ حدیث جتنے طریقوں سے بھی مروی ہے۔ سب ضعیف ہیں۔

اس پیش نظر سند میں تین علتیں جمع ہیں:

۱۔ الانقطاع:.......... کیونکہ عبدالجبار بن وائل کا اپنے والد وائل سے سماع ثابت نہیں ہے۔

۲۔ قیس بن الربیع حافظہ کی کمزوری کے باعث ضعیف تھے۔

۳۔ محمد بن الحسین، جو الزبیر الاسدی الکوفی کے بیٹے ہیں اور جن کا لقب ’’التل‘‘ تھا ان کے بارے میں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ’’وہ سچے تھے لیکن ان میں کمزوری اور ضعف تھا۔

[التقریب، ص: ۴۰۹، ترجمہ: ۵۸۱۶]

اس ضعیف حدیث کی بقیہ سندوں کی طرف امام البیہقی نے ”شعب الایمان :۲۳۲/۵، حدیث:۶۴۸۲“ میں، امام بخاری نے ”التاریخ الکبیر :۴/۵۰۲“ میں، اور انہی کی سند سے امام الدارقطنی نے ”المؤتلف والمختلف :۴/۲۰۹۴، ۲۰۹۵“ میں، امام ابن عدی نے ”الکامل :۶/۲۰۸“ میں اور الخلال نے ”الترجل، ص:۲۰“ میں اشارہ کیا ہے۔

اور امام البیہقی نے ان تمام سندوں کو نا قابل اعتماد اور ضعیف بتایا ہے اوسی وجہ سے امام احمد نے فرمایا ہے:

’’بال اور ناخن کو اگر چاہے دفن کر دیا جائے اور اگر دفن نہ کیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ان سے ان کے اس قول کی روایت امام حافظ ابو محمد الحسن بن محمد الخلال نے ”الترجل، ص:۱۹“ میں کی ہے۔

[الضعیفہ: ۵/۳۸۲]

اذان:

۳۵......((إِذَا أَخَذَ الْمُؤَذِّنُ فِيْ أَذَانِهِ ، وَضَعَ الرَّبُّ يَدَهُ فَوْقَ رَأْسِهِ ، فَلَا يَزَالُ كَذَلِكَ حَتَّى يَفْرُغَ مِنْ أَذَانِهِ ، وَإِنَّهُ لَيُغْفَرُلَهُ مَدَّ صَوْتِهِ ، فَإِذَا فَرَغَ قَالَ الرَّبُّ عَزَّوَجَلَّ : صَدَقْتَ عَبْدِيْ ، وَشَهِدْتَ بِشَهَادَةِ الْحَقِّ ، فَأَبْشِرْ))

’’جب مؤذن اذان دینا شروع کرتا ہے تو رب اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہے، اور جب تک وہ اپنی اذان سے فارغ نہیں ہو جاتا اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھے رہتا ہے اور اس کی آواز

جتنی مسافت تک جاتی ہے اتنی مسافت کے بمقدار اس کی بخشش کر دی جاتی ہے۔ پاس جب وہ اذان سے فارغ ہو جاتا ہے تو رب عزوجل فرماتا ہے: میرے بندے! تو نے سچ کہا اور تو نے حق کی گواہی دی، تیرے لیے خوش خبری ہے۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی روایت حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ الاصبہانی تاریخ اصبہان میں محمد بن یعلیٰ عن عمر بن صبح عن مقاتل بن حیان عن زید العمی عن انس بن مالک کی سند سے کی ہے۔

محمد بن یعلیٰ عمر بن صبح سے روایت کرتے ہیں، وہ مقاتل بن حیان سے، وہ زید العمی سے اور وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے، کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا..........''

حافظ جلال الدین السیوطی نے اس کا ذکر ''ذیل الاحادیث الموضوعة ، ص: ۱۰۳ '' میں کیا ہے۔ اور کہا ہے: ''عمر بن صبح حدیثیں وضع کرتا تھا اور یزید العمی ضعیف ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

''حافظ السیوطی نے یہ صراحت کرنے کے بعد کہ یہ حدیث موضوع ہے اس کو ''الجامع الصغیر ، ص: ۴۴، حدیث: ۳۰۶ '' میں درج کر دیا ہے حالانکہ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ اس میں کوئی ایسی حدیث نقل نہیں کریں گے جس کی روایت میں کوئی وضاع حدیث یا کذاب منفرد ہوگا۔'' [الضعیفه : ٥/ ٢٤٠]

واضح رہے کہ اس موضوع حدیث کا یہ فقرہ: ((وَاَنَّهُ لَيُغْفَرُ لَهُ مَدَّ صَوْتِهِ)) صحیح ہے۔ اور مشکوٰۃ (٦٦٧) اور صحیح الترغیب والترہیب (۲۳۴) میں ان الفاظ میں موجود ہے:

((المؤَذِّنُ يُغْفَرُ لَهُ مَدَى صَوْتِهِ))

اس موضوع حدیث کے درمیان صحیح حدیث کا ایک ٹکڑا یا ایک فقرہ ہونا باعثِ حیرانی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وضاعین یا غیر ثقہ لوگوں کا ایک طریقہ یہ بھی رہا ہے اور اب تک ہے کہ وہ کسی موضوع حدیث کے درمیان، یا اس کے شروع یا آخر میں کوئی صحیح حدیث یا اس کا کوئی ٹکڑا جوڑ دیتے ہیں، اس طرح کسی صحیح حدیث کے درمیان کوئی موضوع ٹکڑا درج کر دیتے ہیں یا شروع اور آخر میں بڑھا دیتے ہیں اس طرح وہ جس بات کی ترویج کرنا چاہتے ہیں وہ ہونے لگتی ہے۔

۳٦ ......((إِنَّ الْمُؤَذِّنِيْنَ وَالْمُلَبِّيْنَ يَخْرُجُونَ مِنْ قُبُورِهِمْ ، يُؤَذِّنُ الْمُؤَذِّنُ وَيُلَبِّي الْمُلَبِّيْ))

''مؤذنین اور تلبیہ پڑھنے والے اپنی قبروں سے اس حال میں نکلیں گے کہ مؤذن اذان دے رہا ہوگا اور مُلبی تلبیہ پڑھ رہا ہوگا۔''

یہ بے حد ضعیف اور کمزور حدیث ہے جس کی تخریج حافظ الطبرانی نے ''المعجم الأوسط : ۲۵/۱'' میں اس سند سے کی ہے:

''ہم سے خلف بن عبداللہ الضبی نے بیان کیا، کہا: ہم سے عمرو بن الرضی بن نصر ابن الرضی البصری نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبداللہ بن عبدالملک الذماری نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابو الولید الضبی نے ابوبکر الہذلی سے، انہوں نے ابوالزبیر سے اور انہوں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا..........''

حافظ الطبرانی یہ سند نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''حضرت جابر سے یہ حدیث صرف اسی سے راویت کی جاتی ہے، یہ سند بے حد کمزور ہے۔ ابو بکر الہذلی کو حافظ ابن حجر نے ''متروک'' لکھا ہے۔ اور ابوالزبیر ''مدلس'' تھا اور اس نے یہ حدیث ''عنعنہ'' کے ذریعہ روایت کی ہے۔ البانی آگے چل کر لکھتے ہیں:

''اس حدیث کے بارے میں حافظ نورالدین بن ابی بکر الہیثمی کا قول ہے کہ اس کی روایت الطبرانی نے المعجم الأوسط میں کی ہے اور اس کی سند میں ایسے مجہول الحال راوی ہیں جن کا کسی نے بھی ذکر نہیں کیا ہے۔''

اور امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم نے ''کتاب العلل : ۱۰۶/۱'' میں اپنے والد امام ابوحاتم محمد بن ادریس الرازی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ حدیث موضوع لگتی ہے۔ اور حافظ ابونعیم نے یہی حدیث ''تاریخ اصبھان : ۳۳۸/۱'' میں المعلی بن ہلال کی سند سے کی ہے:

''ہم سے ابوداؤد الدارمی نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

((إِنَّ الْمُؤَذِّنِيْنَ الْمُحْتَسِبِيْنَ يَخْرُجُوْنَ مِنْ قُبُورِهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَهُمْ يُؤَذِّنُوْنَ))

''ثواب کی نیت سے اذان دینے والے قیامت کے دن اپنی قبروں سے اذان دیتے ہوئے نکلیں گے۔''

المعلی بن ہلال جو ابن سوید ہے اس کے بارے میں حافظ ابن حجر کا قول ہے کہ ''نقاد حدیث'' نے

متفقہ طور پر اس کی تکذیب کی ہے۔'' [التقریب، ص: ٤٧٣، ترجمہ: ٦٨٠٧]

اور ابوداؤد الدارمی کا نام نُفَیع ہے جو کذاب تھا۔ [الضعیفه: ٥/ ٢٠٢، ٢٠٤]

۳۷......((إِذَا سَمِعْتَ النِّدَاءَ ، فَأَجِبْ وَعَلَيْكَ السكينةُ ، فَإِنْ أَصَبْتَ فُرْجَةً وَإِلَّا فَلَا تُضَيِّقْ على أَخِيْكَ ، وَاقْرَأْ بِمَا تُسْمِعُ أُذُنَيْكَ ، وَلَا تُؤْذِ جَارَكَ ، وَصَلِّ صلاةَ مُوَدِّعٍ))

''جب تم پکار سُنو تو اس کا جواب دو اور درانحالیکہ تم پر وقار کی کیفیت ہو اور اگر تم کو صف میں گنجائش ملے (تو داخل ہو جاؤ) ورنہ اپنے بھائی پر تنگی مت پیدا کرو اور اس طرح پڑھو کہ اپنے کانوں کو سنا سکو، اپنے پڑوسی کو اذیت نہ دو اور رخصت کرنے والے کی نماز پڑھو۔ (گویا کہ تم اس دنیا کو رخصت کر رہے ہو)''

یہ انتہائی کمزور اور ضعیف حدیث ہے۔ جس کی تخریج امام حافظ ابوسعید احمد بن محمد بن زیاد بن الاعرابی نے ''**المعجم**، ق: ۲/ ۱۸۳'' اس کا قلمی نسخہ دمشق کے الظاہریہ کتب خانہ میں ۲۸۰ نمبر کے تحت موجود ہے) میں، ابن درست العلاف نے ''**الأمالي** : ۱/ ۱۲۷'' میں، حافظ ابوعبداللہ محمد بن عبدالواحد الضیاء المقدسی نے ''**المختاره** : ۷/ ۱۱۳'' میں اور امام الدیلمی نے ''**مسند الفردوس** : ۱/ ۶۰'' میں اس سند سے کی ہے:

''سعید بن عبداللہ بن دینار سے روایت ہے وہ الربیع بن صبیح سے روایت کرتے ہیں وہ الحسن سے اور وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں............''

حافظ ابن حجر نے ''مختصر المسند'' میں اس سند کے بارے میں کچھ لکھنے کے بجائے ''بیاض'' چھوڑ دی ہے۔ البتہ تقریب التہذیب'' میں الربیع بن صبیح کے بارے میں لکھا ہے: ''**صدوق سيء الحفظ**'' وہ سچا تھا مگر حافظہ کا بُرا تھا۔

اور سعید بن عبداللہ بن دینار کا حال ''کتب الرجال'' میں مذکور نہیں ہے۔ لیکن امام ابن حبان نے ''**كتاب الثقات** : ۲/ ۱/ ۱'' میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

((يأتي بما لا اصل له عن الأثبات))

''سعید بن عبداللہ بن دینار ثقہ راویں کے نام سے بے اصل حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔''

[الضعيفه لِلألباني : ٦/ ٨٢]

۳۸...... ((إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ أَذَّنَ فَقُولُوا : اَللّٰهُمَّ افْتَحْ أَقْفَالَ قُلُوبِنَا لِذِكْرِكَ وَأَتْمِمْ عَلَيْنَا نِعْمَتَكَ وَفَضْلَكَ ، وَاجْعَلْنَا عَلَيْهَا مِنْ عِبَادِكَ الصَّالِحِيْنَ))

''جب تم مؤذن کو سنو کہ اس نے اذان دے لی تو کہو: اے اللہ! تو ہمارے دلوں کے قفل اور تالوں کو اپنے ذکر کے لیے کھول دے، ہم پر اپنی نعمت اور فضل تمام کر دے، اور ہمیں اس نعمت پر اپنے صالح بندوں میں سے بنا۔''

یہ بھی ضعیف ہے اور نا قابلِ اعتبار حدیث ہے۔ اس کی روایت امام ابن حبان نے ''الثقات : ۱۴۶/۱'' میں عمر بن خالد الوہبی کے ترجمہ کے ضمن میں کی ہے اور امام ابو بکر احمد بن محمد ابن السنی نے ''عمل الیوم واللیلة: ۹۸'' میں اور انہی کے حوالہ سے امام الدیلمی نے ''مسند الفردوس : ۵۹/۱/۱'' میں اس سند سے کی ہے:

ہم سے عبدالصمد بن سعید نے حمص میں بیان کیا، کہا: ہم سے الحسن بن حاتم الالہانی نے بیان کیا، کہا: ہم سے عمر بن خالد الوھبی نے بیان کیا، کہا: ہم سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً بیان کیا......''

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

''یہ سند ضعیف ہے اور مجہول ہے۔ میں نے کسی کو بھی نہیں دیکھا کہ اس نے عمر بن خالد کا ذکر کیا ہو، سوائے ابن حبان کے اور یہی حال الحسن بن حاتم الالہانی کا بھی ہے۔'' [الضعیفه : ۸۳/۶]

میرے خیال میں اس ضعیف حدیث کا متن منکر ہے، کیونکہ صحیح احادیث میں اذان کے بعد جو دعا مذکور ہے، یہ ضعیف حدیث اس کے خلاف ایک ایسی دعا پر مشتمل ہے جس سے تصوف کی بو آتی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابو سعید الخدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((إِذَا سَمِعْتُمُ النِّدَاءَ ، فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ الْمُؤَذِّنُ)) [1]

''جب تم اذان سنو تو وہی کہو جو مؤذن کہتا ہے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا ہے:

((إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ ، فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ ، ثم صَلُّوا عَلَيَّ ، فَإِنَّهُ مَنْ صَلَّى

[1] حدیث: ٦١١، اور صحیح مسلم، حدیث: ٨٤٨

عَلَيَّ صَلَاةً صَلَّى اللّٰهُ بِهَا عَشْرًا ، ثُم سَلُوا اللّٰهَ لِيَ الْوَسِيلَةَ ، فَانَّهَا مَنْزِلَةٌ فِي الْجَنَّةِ لَا تَنْبَغِيْ اِلَّا لِعَبْدٍ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ ، وَأَرْجُوْا أَنْ اَكُوْنَ أَنَاهُوَ ، فَمَنْ سَأَلَ لِي الْوَسِيلَةَ حَلَّتْ عَلَيْهِ الشَّفَاعَةُ)) ❶

''جب تم مؤذن کو (اذان دیتے ہوئے) سنو تو وہی کہو جو وہ کہتا ہے، پھر میرے اوپر درُود بھیجو، کیونکہ جو شخص میرے اوپر درُود بھیجے گا اللہ اس کے بدلے اس پر اپنی دس (۱۰) رحمتیں نازل فرمائے گا، پھر میرے لیے اللہ سے ''الوسیلہ'' مانگو، کیونکہ وہ جنت میں ایک درجہ ہے جو اللہ کے بندوں میں سے کسی ایک بندے کے لیے مناسب ہے اور مجھے اُمید ہے کہ وہ بندہ میں ہی ہوں گا، بس جس نے میرے لیے ''الوسیلہ'' مانگا اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔''

اور حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

((مَنْ قَالَ حِيْنَ يَسْمَعُ الْمُؤَذِنَ : أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ ، رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا غُفِرَ لَهُ ذَنْبُهُ)) ❷

''جس نے اذان سنتے وقت یہ کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جس کا کوئی شریک نہیں اور بے شک محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ میں رب کی حیثیت سے اللہ سے راضی ہوا، بحیثیت رسول کے محمد سے راضی ہوا اور بحیثیت دین کے اسلام سے راضی ہوا، تو جو ایسا کہے گا، اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔''

۳۹..... ((مَسْحُ الْعَيْنَيْنِ بِبَاطِنِ أُنْمِلَتَي السَّبَّابَتَيْنِ بَعْدَ تَقْبِيْلِهِمَا عِنْدَ قَوْلِ الْمُؤَذِّنِ ، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ، وَأَنَّ مَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ ؛ حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتُه......))

''مؤذن کے اشہدان محمد رسول اللہ کہتے وقت دونوں انگشت شہادت کے اندرونی حصوں کو چوم کر آنکھوں کو مسح کرنا، اور جو ایسا کرے گا رسول اللہ ﷺ کی شفاعت اس کے لیے واجب ہو جائے گی۔''

یہ حدیث موضوع اور باطل ہے۔ **المقاصد الحسنه(۳۸۴ ، تمیز الطیب (۱۵۰) ، کشف**

❶ حدیث نمبر: ۸۲۹ ❷ صحیح مسلم ، حدیث : ۸۵۱

الالتباس :۲/۲۰۶ ، الاسرار المرفوعه ، حدیث:۴۳۵ اور سلسلة الاحادیث الضعیفة: ۱/۴۳۷ " میں اس کو موضوع قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے جو لوگ ایسا کرتے ہیں اور لوگوں کو ایسا کرنے کی تلقین کرتے ہیں، ان کے اس عمل کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے بلکہ یہ ان کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے۔

نماز:

اسلام میں عقائد اور ایمانیات کے بعد عملی ارکان کا درجہ آتا ہے جن کے سرفہرست نماز ہے۔ طہارت اور اذان، جن کے بارے میں پچھلے صفحات میں متعدد موضوع اور منکر احادیث کا ذکر کیا گیا ہے نماز کے لوازمات میں شمار ہوتے ہیں۔

اسلام کے عقائدی اور عملی ارکان کو اُس مختصر اور جامع حدیث میں سمیٹ دیا گیا ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ : شَهَادَةِ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ ، وَإِقَامَةِ الصَّلَاةِ ، وَإِيْتَاءِ الزَّكَاةِ ، وَالْحَجِّ ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) [1]

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اسلام کی تعمیر پانچ چیزوں پر ہوئی ہے: اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کرنا، زکوۃ دینا ، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔''

نبی اکرم ﷺ کے اس ارشادِ مبارک سے معلوم ہوا کہ عملی ارکان میں سب سے پہلا مقام نماز کو حاصل ہے اور اگر ہم نماز کی ہیئت ، اس کی قراءتوں، تسبیحوں اور دعاؤں پر غور کریں تو اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک عجیب طرح کی عاجزی، سرنگندگی اور تسلیم و رضا کی کیفیت کا احساس ہوگا، اس طرح درحقیقت نماز ایمان کا پہلا عملی مظہر ہے۔ ایمان ایک طرح کا دعویٰ ہے اور کوئی بھی دعویٰ اُس وقت تک اپنا کوئی وزن نہیں رکھتا جب تک کہ اس کے ساتھ کوئی عملی ثبوت نہ ہو، اور نماز ایمانی دعوے کا عملی ثبوت ہے۔

نہ صرف یہ کہ نماز ایمان کا سب سے پہلا عملی مظہر ہے بلکہ نماز ایمان کا لازمی مظہر بھی ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں وہ ایمان غیر معتبر ہے جو نماز سے خالی ہو اور اگر ہم یہ کہیں کہ نماز ایمان ہی کا دوسرا نام ہے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ خود قرآن پاک میں یہ صراحت ہے کہ قیامت کے دن اہل جنت جب اہل جہنم سے

[1] صحیح بخاری ، حدیث : ۸۔ صحیح مسلم ، حدیث : ۱۶

پوچھیں گے کہ تمہیں جہنم میں کس چیز نے ڈالا؟ تو وہ جواب دیں گے: ہم نمازیوں میں سے نہ تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ﴿43﴾ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ﴾

[المدثر: ٤٢، ٤٣]

''تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟ وہ کہیں گے: ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے۔''

گویا نماز ایمان کی علامت ہے، لہٰذا جو شخص ایمان کے دعوے کے باوجود نماز نہ پڑھتا ہو تو وہ اپنے اس دعوے میں جھوٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ایک دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ایمان لا کر بھی آدمی دوزخ سے نہیں بچ سکتا اگر وہ تارک نماز ہو۔

نماز کی اسی اہمیت کی وجہ سے اس کے ارکان، اس کے سنن و مستحبات، اس کے اوقات اور اس کے فضائل و برکات غرضیکہ اس کی ہر چیز کو کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اور رسول اکرم ﷺ نے اس کا عملی نمونہ بھی پیش کر دیا ہے اور صحابۂ کرام اور اُن کے ذریعہ قیامت تک پیدا ہونے والے اہل ایمان کو یہ حکم دے دیا کہ وہ آپ کی اتباع کریں۔ ارشاد نبوی ہے:

((صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي)) ❶

''اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''

معلوم ہوا کہ وہی نماز معتبر اور عنداللہ مقبول ہے جو رسول اللہ ﷺ کی نماز سے مشابہ ہو، اور رسول اللہ ﷺ کی نماز اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ صحیح احادیث میں مذکور ہے جن کو اگر ہم ایک ساتھ ملا کر پڑھیں تو چشمِ تصور سے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ اور نماز کی وہ مختلف شکلیں جو مسلمانوں کی نمازوں میں ملتی ہیں اور جن کا مشاہدہ ہم مسجدوں میں کرتے ہیں ان میں سے بیشتر شکلیں اور ہیئتیں صحیح احادیث سے ثابت نہیں ہیں۔ سوائے اُن چند اختلافات کے جو ''توسع'' کے قبیل سے ہیں۔

اسی طرح نماز کے فضائل و برکات یا ترکِ نماز کے انجام بد یا ادائیگی نماز کے ساتھ ساتھ برائیوں کے ارتکاب کے نتائج سے متعلق بھی بے شمار ایسی باتیں لوگوں میں زبانِ زد اور فضائل اعمال کی کتابوں میں مذکور ہیں جو بے بنیاد ہیں۔ کتاب اللہ اور رسول اکرم ﷺ کی صحیح احادیث سے ان کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

((مَنْ لَّمْ تَنْهَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ، لَمْ يَزْدَدْ مِنَ اللّٰهِ اِلَّا بُعْدًا))

❶ صحيح بخاري حديث: ٦٣١ـ صحيح مسلم ، حديث: ٦٧٤

''جس شخص کی نماز اس کو بدکاری اور برائی سے نہ روکے، اللہ سے اس کی دوری بڑھتی جاتی ہے۔''

یہ باطل حدیث ہے، رسول اکرم ﷺ سے اس کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ یہ لوگوں میں زبانِ زد ہے۔ یہ اپنی سند اور متن دونوں اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔

اس کی تخریج حافظ الطبرانی نے ''المعجم الکبیر :۱۰۶/۳'' میں، امام ابوعبداللہ محمد بن سلامہ القضاعی نے ''مسند الشھاب :۴۳/۲'' میں اور امام ابن ابی حاتم نے (بحوالہ تفسیر ابن کثیر : ۴۱۴/۲، اور الکواکب الدراری :۸۳/۲'' لیث عن طاؤس عن ابن عباس کی سند سے کی ہے۔

یہ سند لیث کی وجہ سے ضعیف ہے۔ لیث کا پورا نام: لیث بن ابی سلیم ہے۔ حافظ ابن حجر نے ''تقریب التھذیب'' میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

((صدوق ، اختلط أخیرا ولم یتمیز حدیثه، فترك))

[ص: ٤٠٠، ترجمه: ٥٦٨٥]

''سچا تھا مگر آخری عمر میں عقلی عدم توازن اور خرابی میں مبتلا ہو گیا تھا اور اس کی روایت کردہ حدیثوں میں صحیح اور ضعیف میں عدم امتیاز کے باعث اس کو متروک قرار دے دیا گیا۔''

اس حدیث کی یہی علت امام ہیثمی نے بھی ''مجمع الزوائد : ۱۳۴/۱ '' میں بیان کی ہے۔ اور ان کے شیخ حافظ زین الدین العراقی نے ''المغنی عن حمل الأسفار : ۱۴۳/۱'' میں لکھا ہے: ''اس کی سند کمزور ہے۔''

یہ حدیث دوسرے طریقے سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی حیثیت سے بھی مروی ہے اور اس کی سند کا ایک راوی غیر معروف ہے۔

امام احمد نے ''کتاب الزھد، ص:۱۵۹'' میں اس کی روایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً کی ہے، جس کے الفاظ ہیں:

((مَنْ لَمْ تَأْمُرْهُ الصَّلَاةُ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَاهُ عَنِ الْمُنْكَرِ لَمْ يَزْدَدْ بِهَا اِلَّا بُعْدًا......))

''جس کی نماز اس کو نیکی کا حکم نہ دے اور اس کو برائی سے نہ روکے تو وہ اس کے ذریعہ مزید دور ہوتا جائے گا۔''

یہی حدیث ان الفاظ میں بھی مروی ہے:

((مَنْ لَمْ تَنْهَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ فَلَا صَلَاةَ لَه......))

''جس کی نماز اس کو بدکاری اور برائی سے نہ روکے اس کی نماز ہوتی ہی نہیں..........''

یہ منکر ہے۔اس کی روایت امام ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں کی ہے:

''ہم سے محمد بن ہارون المخرمی الفلاس نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالرحمٰن بن نافع ابوزیاد نے بیان کیا، کہا: ہم سے عمر بن ابی عثمان نے بیان کیا، کہا: ہم سے الحسن نے عمران بن حصین سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، کہا.........''نبی ﷺ سے اللہ تعالی کے اس ارشاد: ﴿ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ﴾ کا مطلب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا.........''

حافظ ابن کثیر نے اس کا ذکر اپنی تفسیر (۲/ ۴۲۴) میں اور ابن عروہ نے "الکواکب الدراری: ۱/ ۸۳" میں کیا ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی (الضعیفہ: ۲/ ۴۱۴) میں لکھتے ہیں:

''یہ ضعیف ہے۔جس کی دو علتیں ہیں:

١ الحسن البصری اور عمران بن حصین کے درمیان سند منقطع ہے۔کیونکہ عمران سے ان کا سماع مختلف فیہ اور اگر یہ سماع ثابت بھی ہو جائے تب بھی سقم دور نہیں ہوتا۔اس لیے کہ حسن بصری مدلس تھے اور انہوں نے اس کی روایت ''عن'' کے ذریعہ کی ہے۔

٢ عمر بن ابی عثمان مجہول ہے۔امام ابن ابی حاتم نے ''الجرح والتعدیل: ۳/ ۱۲۳'' میں اس کا تذکرہ صرف اس طرح کیا ہے:

''اس نے طاؤس کے اقوال سنے ہیں اور یحییٰ بن سعید نے اس سے روایت کی ہے۔سب سے زیادہ ''نکارت'' اس کے متن میں پائی جاتی ہے کیونکہ اس کے ظاہری الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جو شخص نماز اس کی تمام شرطوں اور ارکان سے ادا کرے اور اس کے ساتھ وہ بعض معاصی کا بھی مرتکب ہوتا رہے تو یہ نماز اس کو اللہ تعالیٰ سے مزید دور کرتی جائے گی، اور یہ بات اسلامی شریعت کی روح اور مزاج کے خلاف ہے اور اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جب معاصی کے ارتکاب کے ساتھ نماز کی ادائیگی اللہ تعالیٰ سے دوری کا سبب ہے۔تو پھر اس حالت میں نماز پڑھنا اور نہ پڑھنا دونوں برابر ہے، اس کے علاوہ ایک صحیح حدیث اس منکر

حدیث کے خلاف مروی ہے:

''نبی ﷺ سے عرض کیا گیا کہ ایک شخص پوری رات نمازیں پڑھتا ہے اور صبح کو چوری کرتا ہے، تو آپ نے فرمایا:

((سَيَنْهَاهُ مَا تَقُوْلُ اَوْ سَتَمْنَعُهُ صَلَاتُهُ))

''نماز اس کو اس کام سے روک دے گی جو تم بتا رہے ہو۔''

یعنی اس کا راتوں میں نمازیں پڑھنا اس کو چوری سے باز رکھے گا۔ یا آپ نے فرمایا: اس کی نماز اس کو سرقہ سے روک دے گی۔

اس حدیث کی روایت امام احمد نے مسند میں البزار نے المصنف میں امام طحاوی نے ''مشکل الآثار: ۲/ ۴۳۰'' میں اور امام البغوی نے ''حدیث علی ابن الجعد: ۹/ ۹۷'' میں اور ابوبکر الکلاباذی نے ''مفتاح معانی الآثار: ۱/ ۳۱'' میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کی ہے۔

امام ابن تیمیہ نے اس زیر بحث حدیث کے بارے میں فرمایا ہے:

''یہ نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے، اس لیے کہ نماز بدکاری اور برائی سے روکے گی جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے اور نماز کسی بھی حال میں نمازی کو اللہ تعالیٰ سے دور نہیں کر سکتی۔'' [فقہ حنبلی، قلمی نسخہ، کتب خانہ ظاہریہ دمشق، ص: ۳/ ۱۲]

٤٢ ...... ((مَنْ صَلَّى بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ عِشْرِيْنَ رَكْعَةً بَنَى اللّٰهُ لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ))

''جو مغرب اور عشاء کے درمیان بیس (۲۰) رکعتیں نماز ادا کرے گا اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لیے ایک گھر بنائے گا۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج امام ابن ماجہ نے ''سنن: ۱/ ۴۱۴'' میں اور امام عمر بن احمد بن عثمان بن شاہین نے ''الترغیب والترهیب: (قلمی نسخه: ۱/ ۲۷۱، ۲۷۷، ۲۷۸)'' میں یعقوب بن الولید المدینی عن ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہ مرفوعاً کے طریقے سے کی ہے، یعنی:

''یعقوب بن الولید المدینی ہشام بن عروہ سے روایت کرتے ہیں، وہ اپنے باپ عروہ سے اور وہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔''

امام احمد بن ابی بکر بن اسماعیل البوصیری ''الزوائد: (قلمی نسخه: ۱/ ۸۵)'' میں لکھتے ہیں:

''اس حدیث کی سند میں یعقوب بن الولید ہے، جس کے ضعیف ہونے پر محدثین کا اتفاق ہے، اور امام احمد نے اس کے بارے میں فرمایا ہے:

اس کا شمار بڑے جھوٹوں میں ہوتا تھا، وہ حدیثیں وضع کرتا تھا۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

''امام یحییٰ بن معین اور امام ابو حاتم نے بھی اس کی تکذیب کی ہے۔'' آگے لکھتے ہیں:

''مغرب اور عشاء کے درمیان متعینہ رکعتوں پر مشتمل نفل نمازوں کی ترغیب دلانے والی کوئی بھی حدیث صحیح نہیں ہے بلکہ اس وقت میں نبی ﷺ کے عمل سے رکعتوں کے تعین کے بغیر نفل نمازوں کا پڑھنا ثابت ہے۔'' [الضعیفه: ١/ ٦٨٠]

٤٣ ...... ((مَنْ صَلَّى سِتَّ رَكَعَاتٍ بَعْدَ الْمَغْرِبِ قَبْلَ أَنْ يَتَكَلَّمَ ، غُفِرَ لَهُ بِهَا ذُنُوبُ خَمْسِينَ سَنَةً))

''جس نے نمازِ مغرب کے بعد کچھ بولنے سے قبل چھ رکعتیں (نفل) کی پڑھیں تو ان کے بدلے اس کے پچاس سال کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔''

یہ حدیث اگرچہ موضوع تو نہیں ہے مگر بے حد کمزور اور ضعیف ہے۔ اس کی تخریج ابن نصر نے ''قیام اللیل میں (ص:۳۳) محمد بن غزوان الدمشقی کے طریقے سے کی ہے:

''ہم سے عمر بن محمد نے سالم بن عبداللہ اور انہوں نے اپنے باپ عبداللہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا.........''

امام ابن ابی حاتم نے ''کتاب العلل: ۱/ ۷۸'' میں اس سند سے اس کا ذکر کیا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ امام ابوزُرعہ نے کہا ہے کہ اس کو دیوار پر دے مارو کیونکہ یہ موضوع لگتی ہے۔ اور محمد بن غزوان الدمشقی منکر الحدیث تھا۔''

٤٤ ...... ((مَنْ صَلَّى فِي مَسْجِدِي أَرْبَعِينَ صَلَاةً لَا يَفُوتُهُ صَلَاةٌ ؛ كُتِبَتْ لَهُ بَرَاءَةٌ مِنَ النَّارِ وَ نَجَاةٌ مِنَ الْعَذَابِ وَبَرِئَ مِنَ النِّفَاقِ))

''جس نے میری مسجد میں چالیس نمازیں اس طرح پڑھیں کہ اس سے کوئی نماز فوت نہیں ہوئی تو اس کے لیے جہنم سے برأت اور عذاب سے نجات لکھدی جائے گی اور وہ نفاق کی بیماری سے شفایاب ہو جائے گا۔''

یہ حدیث منکر ہے۔ اس کی تخریج امام احمد نے ''مسند: ۱۵۵/۳'' میں، حافظ الطبرانی نے ''المعجم الأوسط: ۲/۳۲/۲، حدیث: ۵۵۷۶'' میں عبدالرحمٰن ابن ابی الرجال عن نبیط بن عمر عن انس بن مالک مرفوعا کی ہے:

''عبدالرحمٰن بن ابی الرجال نے نبیط بن عمر سے روایت کیا اور انہوں نے انس بن مالک سے مرفوعا روایت کیا۔''

الطبرانی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''حضرت انس سے اس کی روایت صرف نبیط نے کی ہے اور اس سے ابن ابی الرجال اس روایت میں منفرد ہے۔''

یہ سند ضعیف ہے کیونکہ نبیط بن عمر کا ذکر صرف اسی حدیث کی سند میں آیا ہے اور امام ابن حبان نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے۔ ''الثقات: ۴۸۳/۵'' ان کا قاعدہ ہے کہ وہ مجہول راویوں کو ثقہ قرار دیتے ہیں، اور امام الہیثمی نے اس اصول پر اعتماد کر کے لکھا ہے:

''اس کی روایت احمد اور الطبرانی نے کی ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔''

اس حدیث کی نکارت اور ضعف اس صحیح حدیث سے مزید واضح ہو جاتی ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اور موقوفاً مروی ہے اور اس کے یہ دونوں طریقے ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہیں، اور اس کے الفاظ ہیں:

((مَنْ صَلَّى لِلّٰهِ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا فِيْ جَمَاعَةٍ ، يُدْرِكُ التَّكْبِيْرَةَ الْاُوْلٰى : كُتِبَتْ لَهُ بَرَاءَتَانِ : بَرَاءَةٌ مِنَ النَّارِ وَبَرَاءَةٌ مِنَ النِّفَاقِ))

''جس نے اللہ کے لیے چالیس دن جماعت کے ساتھ اس طرح نمازیں پڑھیں کہ اس کو (ہر نماز میں) تکبیر اولیٰ ملی تو اس کے لیے دو چھٹکارے لکھ دیے گئے، ایک چھٹکارا جہنم سے اور دوسرا چھٹکارا نفاق سے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی نے ''الصحیحة: ۳۱۹/۶، حدیث: ۲۶۵۲'' میں اس کو ''حسن'' قرار دیا ہے۔

۴۵ ...... ((مَنْ رَفَعَ يَدَيْهِ فِي الصَّلَاةِ فَلَا صَلَاةَ لَهُ))

''جس نے نماز میں رفع یدین کیا تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوئی۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کا ذکر محمد طاہر بن علی الفتنی نے "تذکرة الموضوعات :۸۷" میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سند میں دجال مامون بن احمد الہروی ہے جو حدیث وضع کیا کرتا تھا۔'' اس کے بارے میں امام الذھبی نے کہا ہے:

''وہ مصائب اور رسوائیاں لایا ہے اور ثقہ راویوں کے نام سے حدیثیں گھڑ کر پھیلائی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔''

حافظ ابونعیم نے فرمایا ہے: ''وہ خبیث وضاع حدیث تھا، ثقات کے نام سے موضوع حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔''

نماز میں رفع یدین کے خلاف ایک دوسری موضوع حدیث بھی فقہ کی کتابوں میں بیان کی جاتی ہے، اور بعض نادان لوگ اس کو امام ابوحنیفہؒ سے مروی قرار دیتے ہیں، اس کے الفاظ ہیں:

٤٦ ...... ((مَنْ رَفَعَ يَدَيْهِ فِي الصَّلَاةِ فَسَدَتْ صَلَاتُهُ))

''جس نے نماز میں رفع یدین کیا اس کی نماز فاسد ہوگئی۔''

العلامہ شیخ ابوالحسنات عبدالحیؒ لکھنوی نے "الفوائد البهية في تراجم الحنيفية ، ص:۱۱٦، ۲۱٦، ۲۱۷ " میں امام ابوحنیفہؒ سے اس کی روایت کو باطل قرار دیا ہے اور ملا علی القاری نے اس کا ذکر "الاسرار المرفوعة ، ص: ۸۱ " میں کیا ہے اور لکھا ہے:

''اس حدیث کو محمد بن عکاشہ الکرمانی قبحہ اللہ نے وضع کیا ہے۔'' پھر اسی کتاب کے صفحہ ۱۲۹ پر علامہ ابن القیمؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''یہ موضوع ہے۔''

ان تفصیلات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آخری حدیث کا وضع کرنے والا مامون بن احمد الہروی نہیں بلکہ محمد بن عکاشہ الکرمانی ہے۔ یا اُن میں سے ایک نے دوسرے سے سرقہ کر کے اس کا بار اپنے سر لے لیا ہے۔

یہاں اس امر کی جانب اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رکوع کو جاتے ہوئے اور رکوع سے سر اُٹھاتے وقت رفع یدین کے بارے میں اس کثرت سے صحیح احادیث متعدد صحابۂ کرام سے مروی ہیں کہ ان کو تواتر کا درجہ حاصل ہے۔ جبکہ رفع یدین نہ کرنے کے بارے میں ایک بھی صحیح حدیث نہیں ملتی۔ سوائے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے عمل کے اور اس بات سے قطع نظر کہ صحیح قول احادیث کے مقابلے میں کسی صحابی کا عمل کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ علمائے احناف اور غیر احناف کے نزدیک یہ مسلم قاعدہ ہے کہ ''مثبت''،

''نافی'' پر مقدم ہے۔ لہٰذا اگر ایک ہی صحیح حدیث ایسی ہوتی جس سے نبی ﷺ کا رفع یدین کرنا ثابت ہوتا تو وہ رفع یدین نہ کرنے پر دلالت کرنے والی حدیث پر مقدم ہوتی چہ جائیکہ متواتر احادیث صحیحہ سے رسول اللہ ﷺ کا رفع یدین کرنا ثابت ہے جو متعدد صحابہ کرام سے مروی ہے، اور ان کے خلاف کوئی ایک بھی صحیح قولی حدیث نہیں ہے۔ سوائے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب فعلی حدیث کے، تو کیا ایک صحابی کے عمل کی بنیاد پر ان متواتر احادیث کو ترک کرنا اور نبی ﷺ سے یقینی طور پر ثابت رفع یدین کو ''مکروہ'' کہنا کسی مسلمان کے لیے جائز ہوسکتا ہے درانحالیکہ ہر مسلمان پر نبی ﷺ کی اطاعت فرض ہے۔ موقع کی مناسبت سے میں یہاں صرف ایک حدیث نقل کرنے پر اکتفا کروں گا جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

((حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُقَاتِلٍ قَالَ : أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰهِ قَالَ : أَخْبَرَنَا يُونُسُ ، عَنِ الزُّهْرِيِّ أَخْبَرَنِي سَالِمُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما ، قَالَ : رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ إِذَا قَامَ فِي الصَّلَاةِ رَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰى يَكُوْنَا حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ وَكَانَ يَفْعَلُ ذٰلِكَ حِيْنَ يُكَبِّرُ لِلرُّكُوْعِ ، وَيَفْعَلُ ذٰلِكَ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوْعِ ، وَيَقُوْلُ : سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ " وَلَا يَفْعَلُ ذٰلِكَ فِي السُّجُوْدِ)) ❶

''ہم سے محمد بن مقاتل نے بیان کیا، کہا: ہمیں عبداللہ نے خبر دی، کہا: ہمیں یونس نے زہری کے واسطہ سے خبر دی، انہوں نے کہا: مجھے سالم بن عبداللہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے خبر دی، انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ جب آپ نماز میں کھڑے ہوئے تو دونوں ہاتھ اتنے بلند کرتے کہ وہ دونوں کندھوں کے برابر ہو جاتے اور یہ فعل آپ رکوع میں جانے کے لیے تکبیر کہتے وقت بھی کرتے اور رکوع سے سر اُٹھاتے وقت بھی ، اور ''سمع اللہ لمن حمدہ'' کہتے۔ سجدے کی حالت میں آپ ایسا نہ کرتے۔''

رفع یدین کی حدیثیں روایت کرنے والے بعض دوسرے صحابیوں کے نام یہ ہیں:

١ مالک بن الحویرث ٢ علی بن ابی طالب ٣ وائل بن حجر
٤ ابو ہریرہ ٥ ابوحمید الساعدی

حضرت ابوحمید الساعدی سے مروی حدیث گیارہ حدیثوں کے برابر ہے، کیونکہ انہوں نے دس (١٠)

صحابہ کرام کی جماعت میں رفع یدین کی حدیث بیان کی اور دسوں صحابیوں نے بیک زبان ان کی تصدیق کی۔

رفع یدین کے مخالفین کا یہ دعویٰ ہے کہ رفع یدین کی حدیث کے اہم اور بنیادی راوی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اپنا عمل اس حدیث کے خلاف تھا، چنانچہ ابو بکر بن عیاش سے روایت ہے، وہ حصین سے روایت کرتے ہیں اور حصین مجاہد سے کہ مجاہد نے عبداللہ بن عمر کو صرف تکبیر اولیٰ کے موقع پر رفع یدین کرتے دیکھا ہے۔

امام یحییٰ بن معین اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''یہ مجاہد کا وہم ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے، یا ان کی بھول ہے، کیونکہ یہ بات قرین عقل نہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسا صحابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خود اپنی روایت کردہ حدیث کے خلاف عمل کرے، مزید یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمر سے مجاہد کی طرح طاؤس، سالم، نافع، محارب بن دثار اور ابوالزبیر نے بھی رفع یدین کی حدیث روایت کی ہے، اور ان پانچوں تابعین نے یہ صراحت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نماز میں رفع یدین کرتے تھے، لہٰذا اگر مجاہد کی روایت صحیح ہے، تو ان کے مقابلے میں ان پانچوں تابعین کی روایت صحیح تر ہے۔'' [نصب الرایه : ۱/ ٤٧٢]

٤٧ ...... ((لِيَؤُمَّكُمْ أَحْسَنُكُمْ وَجْهًا فَإِنَّهُ اَحْرَى أَنْ يَكُوْنَ اَحْسَنَكُمْ ، خُلُقًا وَقُوْا بِأَمْوَالِكُمْ عَنْ اَعْرَاضِكُمْ وَلْيُصَانِعْ اَحَدُكُمْ بِلِسَانِهٖ عَنْ دِيْنِهٖ))

''چاہیے کہ تم میں جو سب سے زیادہ خوبصورت ہو وہ تمہاری امامت کرے، کیونکہ یہی شخص تم میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق والا ہو سکتا ہے۔ اور اپنے اموال کے ذریعہ اپنی عزتوں کا تحفظ کرو اور تم میں ہر ایک اپنے دین کے بارے میں اپنی زبان کے ذریعہ نرمی اور حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرے۔''

یہ موضوع ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ اس کی روایت امام ابو احمد عبداللہ بن عدی الجرجانی نے ''الکامل : ۲/ ۹۷'' میں اور انہی سے حافظ ابوالقاسم علی بن الحسن بن عساکر الدمشقی نے ''تاریخ دمشق : ۵/ ۶۴'' میں حسین بن المبارک الطبرانی کے طریقے سے کی ہے:

''ہم سے اسماعیل بن عیاش نے ہشام بن عمروہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعا روایت کرتے ہوئے بیان کیا......''

امام ابن عدی نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''اس حسین نے اہل شام کے بارے میں منکر سندوں اور متون کے ساتھ حدیثیں بیان کی ہیں۔''

اور امام الذہبی نے ابن عدی کے حوالہ سے حسین کو ''وضع حدیث'' کا ملزم گردانا ہے اور علامہ عبدالرؤف المناوی نے بھی امام الذہبی کے اس قول کی تائید کی ہے۔

اس حدیث کو امام ابوالفرج عبدالرحمٰن بن الجوزی نے ''الموضوعات: ۱/۱۰۰'' میں الحضرمی کی سند نقل کیا ہے:

''ہم سے حسان بن یوسف التمیمی نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن مروان نے ہشام ابن عروہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا..........''

یہ سند نقل کرنے کے بعد امام ابن الجوزی نے لکھا ہے:

''یہ حدیث موضوع ہے۔ الحضرمی مجہول ہے اور محمد بن مروان السدی کذاب اور الحضرمی کی ''متابعت'' حسین بن المبارک نے اسماعیل بن عیاش عن ہشام کی سند سے کی ہے اور اس سند کی مصیبت حسین ہے جو منکر حدیثیں بیان کیا کرتا تھا۔''

اس حدیث کی روایت امام شیرویہ بن شہردار الدیلمی نے ''مسند الفردوس'' میں اس حسین کے طریقے سے کی ہے جیسا کہ حافظ جلال الدین السیوطی نے ''اللآلی المصنوعة :۲/ ۲۱'' میں صراحت کی ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

''تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ شریعت میں خوبصورتی اور حسن اخلاق میں کوئی ربط و تعلق نہیں پایا جاتا، ایک خوبصورت آدمی حسن اخلاق سے متصف بھی ہوسکتا ہے اور نہیں بھی۔ امام احمد نے اپنی مسند (۴۹۲/۳) میں روایت کی ہے کہ ابولہب لعنہ اللہ روشن چہرے والا اور خوبصورت ترین شخص تھا۔ بلکہ جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے کہا ہے، اس کا نام ابولہب رکھا ہی اس وجہ سے گیا تھا کہ اس کا چہرہ بے حد روشن تھا، اس کے باوجود وہ اللہ کی مخلوق میں بدترین اخلاق کا مالک تھا اور لوگوں میں سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کو ایذا دیتا تھا اور آپ کی تحقیر کرتا تھا۔ اور رسول اللہ ﷺ سے مروی صحیح حدیث کے الفاظ ہیں:

((إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَلَا إِلَىٰ أَجْسَامِكُمْ ، وَلَا إِلَى أَمْوَالِكُمْ ، وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ)) [1]

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: ٦٥٤٣

”درحقیقت اللہ تمہاری شکلوں، تمہارے جسموں اور تمہارے اموال کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔“

۴۸......((إِذَا كَانُوا ثَلَاثَةً ، فَلْيَؤُمُّهُمْ أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللهِ ، فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَآتِ سَوَاءً ، فَأَكْبَرُهُمْ ، سِنًّا ، فَإِنْ كَانُوا فِي السِّنِّ سَوَاءً فَأَحْسَنُهُمْ وَجْهًا))

”اگر تین افراد ہوں تو اُن کی امامت وہ کرے جو اُن میں کتاب اللہ کا سب سے زیادہ قاری ہو (کتاب اللہ کا علم رکھتا ہو) پس اگر وہ قرأت میں برابر ہوں تو اُن میں جو سب سے زیادہ سن رسیدہ ہو وہ امامت کرے اور اگر سب عمر میں برابر ہوں تو اُن میں جو سب سے زیادہ خوبصورت ہو وہ اُن کی امامت کرے۔“

یہ حدیث منکر ہے۔ جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اس کی تخریج امام ابو بکر احمد ابن الحسین البیہقی نے "السنن الکبریٰ: ۳/۱۲۱" میں عبدالعزیز بن معاویہ ابن عبدالعزیز ابی خالد القاضی کی سند سے کی ہے:

”ابو عاصم نے خبر دی، کہا: عزرہ بن ثابت نے علباء بن احمر سے، انہوں نے ابو زید الأنصاری (عمرو بن اخطب) سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے خبر دی.........“

امام البیہقی نے یہ کہہ کر (اگر یہ صحیح ہو) اس کے ضعیف ہونے کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اس کی علت یہی عبدالعزیز ہے جس کا ذکر امام ابن حبان نے ”الثقات“ میں کیا ہے۔ اور اس کی روایت کردہ اس حدیث کو یہ کہہ کر ناپسند کیا ہے:

”یہ حدیث منکر ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے، ممکن ہے کہ یہ اس کے نام پر حدیثوں میں شامل کر لی گئی ہو، اس کے علاوہ اس کی روایت کردہ حدیثیں ثقہ راویوں کی حدیثوں سے مشابہ ہیں۔“

حافظ ابن حجر نے ”تہذیب التہذیب“ میں عبدالعزیز کا ذکر کر کے ان کے بارے میں امام ابن حبان کی رائے کی توثیق کی ہے۔

علامہ عبدالرؤف المناوی کہتے ہیں:

”اس حدیث کی سند میں عبدالعزیز بن معاویہ شامل ہے۔ امام الحاکم نے اس حدیث کے ذریعہ اس کی جرح کی ہے اور لکھا ہے: ”یہ خبر منکر ہے۔“ اور ”المہذب“ میں اُن کے اس حکم کا رد موجود ہے کہ ”مسلم“ نے اسی سند سے حدیث روایت کی ہے۔ اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ“

مصنف کا اس کے ضعف کی جانب اشارہ صحیح اور درست نہیں اور ابن الجوزی کا اس پر موضوع ہونے کا حکم لگانا ظلم ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی نے علامہ عبدالرؤف المناوی کے اس قول کی گرفت ان الفاظ میں کی ہے:

''ابن حبان کے اس قول پر متعدد اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں:

۱۔ امام مسلم نے عبدالعزیز کی روایت کو صحیح مسلم میں نہیں بلکہ صرف مقدمہ میں لیا ہے۔

۲۔ حافظ السیوطی نے خود "اللآلی المصنوعۃ :۲/۲۱" میں حاکم کی جرح کی توثیق کی ہے۔

۳۔ ابن الجوزی نے اس حدیث کو پوری نقل نہیں کیا ہے بلکہ اس کے صرف آخری جملے کا ذکر کیا ہے اور وہ بھی دوسری سند سے جو الذہبی (صاحب المہذب) کے نزدیک بھی موضوع ہے جس کی المناوی خود گزشتہ حدیث میں توثیق کر چکے ہیں۔

۴۔ ابو احمد الحاکم اس حدیث کے انکار میں منفرد نہیں ہیں بلکہ ابن حبان نے بھی ان سے موافقت کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے ان کی توثیق کی ہے اور بیہقی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

۵۔ صحیح احادیث میں ''امامت'' کے حقدار کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں ان کو صحیح مسلم میں مروی حضرت ابو مسعود البدری کی اس مرفوع حدیث میں دیکھا جا سکتا ہے:

((يَؤُمُّ الْقَوْمَ أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ ، فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَ ةِ سَوَاءً ، فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ فَإِنْ كَانُوا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً ، فَأَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً ،فَإِنْ كَانُوا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً ، فَأَكْبَرُهُمْ سِنًّا)) ❶

''لوگوں کی امامت وہ کرے جو ان میں سب سے زیادہ کتاب اللہ کا قاری (عالم) ہو، اور اگر قرأت میں سب کا درجہ مساوی ہو تو ان میں سنت کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا، اور اگر سب سنت کے علم میں یکساں ہوں تو اُن میں سب سے پہلے ہجرت کرنے والا اور اگر ہجرت میں سب برابر ہوں تو ان میں سب سے سن رسیدہ ان کی امامت کرے۔''

اس صحیح حدیث میں امامت کے حقدار کی صفت کے طور پر ''خوبصورتی'' کا ذکر نہیں ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ بعض فقہی مذاہب میں امامت کے لیے ضروری شرائط میں برابری کی صورت میں خوبصورتی کو بھی بطور شرط کے اختیار کیا جاتا ہے اور اس کی بنیاد اور مأخذ اسی منکر حدیث کو قرار دیا جاتا ہے،

❶ حدیث: ۱۵۳۲

بلکہ بعض فقہی کتابوں میں تو یہاں تک مبالغہ آرائی کی گئی ہے:

''پھر وہ امامت کرے جس کی بیوی زیادہ خوبصورت ہو، کیونکہ اس طرح وہ عفت اور پاکیزگی میں دوسروں سے بڑھا ہوا ہوگا، پھر وہ جس کا سر بڑا ہو، پھر وہ جس کا ''عضو'' چھوٹا ہو۔''

[مراقي الفلاح، ص: ٥٥]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کے نزدیک شرعی مسائل میں صحیح احادیث بلکہ موضوع اور منکر روایات کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس انہوں نے اپنے ذوق اور اپنی ذاتی رائے ہی کو شرعی دلیل اور مأخذ قرار دے لیا ہے، پھر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ظاہری اوصاف تو نگاہوں سے معلوم کیے جاسکتے ہیں لیکن ان کے پاس پوشیدہ اعضاء کو معلوم کرنے کا کونسا طریقہ یا ذریعہ ہے؟

[الضعيفه : ٢/ ٧٥، ٧٧]

٤٩ ......((إِذَا صَعِدَ الْخَطِيْبُ الْمِنبَرَ فَلَا صَلَاةَ وَلَا كَلَامَ))

''جب خطیب منبر پر چڑھ جائے تو نماز جائز ہے نہ بات چیت۔''

یہ باطل اور بے اصل روایت ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ یہ روایت دوسرے الفاظ میں بھی کتابوں میں ملتی ہے چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب ''الهدايه'' میں ان الفاظ میں مذکور ہے:

((إِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ ، فَلَا صَلَاةَ وَلَا كَلَامَ))

''جب امام خطبہ دینے کے لیے نکل پڑے تو نہ نماز جائز ہے اور نہ بات چیت۔''

حافظ جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف الزیلعی نے ''انصب الراية تخريج أحاديث الهداية: ٢/ ٢١٠'' میں اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے:

''((غَرِيْبٌ مرفوعاً ، قال البيهقي : دفعه وهم فاحش إنما هو من كلام الزهري)) یہ حدیث مرفوعاً غریب ہے، البیہقی کا قول ہے: اس کو مرفوع کہنا کھلا وھم وخیال ہے، درحقیقت یہ زہری کا قول ہے۔''

یہاں ایک باریک نکتہ یاد رکھنے کا ہے اور وہ یہ کہ جب حافظ زیلعی نصب الرایۃ میں ''الہدایۃ'' کی کسی حدیث کو ''غریب'' کہتے ہیں تو اس سے اُن کی مراد ضعیف نہیں ہوتی جیسا کہ امام ترمذی غریب بول کر ضعیف مراد لیتے ہیں، بلکہ غریب سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں یہ حدیث نہیں ہے۔

چنانچہ اس حدیث کی اس کے سوا کوئی حقیقت نہیں ہے کہ وہ لوگوں میں مشہور اور زبان زد ہے ورنہ یہ بے اصل اور باطل ہے۔ اور حافظ الطبرانی نے اس کی روایت ''المعجم الکبیر'' میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے مرفوعاً ان الفاظ میں کی ہے:

((إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ ، وَالْإِمَامُ عَلَى الْمِنْبَرِ فَلَا صَلَاةَ وَلَا كَلَامَ حَتَّى يَفْرُغَ الْإِمَامُ))

''جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو درانحالیکہ امام منبر پر ہو تو اس وقت نہ کوئی نماز جائز ہے اور نہ بات چیت، یہاں تک کہ امام فارغ ہو جائے۔''

اس حدیث کی سند میں ایوب بن نہیک ہے جس کے بارے میں امام ابن ابی حاتم نے ''الجرح والتعدیل: ۱/۱/۲۵۹'' میں لکھا ہے:

''میں نے اپنے والد کو کہتے ہوئے سُنا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ میں نے ابوزرعہ کو کہتے ہوئے سُنا ہے: ایوب بن نہیک سے مروی حدیث نہیں بیان کرتا، اس کی روایت کردہ حدیث ہمیں نہیں سُنائی گئی، مزید کہا، وہ منکر الحدیث ہے۔''

اور امام الہیثمی نے ''مجمع الزوائد: ۲/۱۸۲'' میں لکھا ہے:

''ایوب بن نہیک متروک ہے۔ محدثین کی ایک جماعت نے اس کی تضعیف کی ہے، حافظ ابن حجر نے بھی ''فتح الباری: ۲/۳۲۷'' میں لکھا ہے کہ ''یہ حدیث ضعیف ہے۔''

اس حدیث کی نکارت اس سے ثابت ہوتی ہے کہ اس کا متن دو صحیح حدیثوں کے خلاف ہے۔

پہلی حدیث کے الفاظ ہیں:

((إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَقَدْ خَرَجَ الْإِمَامُ فَلْيُصَلِّ رَكْعَتَيْنِ)) ❶

''جب تم میں سے کوئی جمعہ کے دن اُس وقت آئے جب امام خطبہ کے لیے نکل پڑا ہو تو دو رکعت پڑھ لے۔'' بخاری کی ایک روایت میں: ((وَقَدْ خَرَجَ الْإِمَامُ)) کی بجائے ((وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ))

''اور امام خطبہ دے رہا ہو۔'' کے الفاظ ہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ حضرت سلیک الغطفانی ایسے وقت

❶ صحیح بخاری حدیث: ۱۱۶۶۔ صحیح مسلم، حدیث: ۲۰۲۲۔ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں

آئے جب رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے تو آپ نے ان سے فرمایا:

((یا سُلَیْكُ! قُمْ فَارْكَعْ رَكْعَتَیْنِ وَتَجَوَّزْ فِیهِمَا))

''سلیک! اُٹھو اور دو رکعتیں پڑھ لو اور ان میں اختصار سے کام لو۔''

پھر آپ نے یہ بھی فرمایا:

((إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمْ یَوْمَ الْجُمُعَةِ ، وَالْإِمَامُ یَخْطُبُ ، فَلْیَرْكَعْ رَكْعَتَیْنِ وَلْیَتَجَوَّزْ فِیهِمَا)) ❶

''جب تم میں سے کوئی جمعہ کے دن اس حالت میں آئے کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو دو رکعتیں پڑھ لے اور ان میں تخفیف سے کام لے۔''

دوسری حدیث کے الفاظ ہیں:

((إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ: أَنْصِتْ یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْإِمَامُ یَخْطُبُ ؛ فَقَدْ لَغَوْتَ)) ❷

''اگر تم نے جمعہ کے دن امام کے خطبہ دیتے وقت اپنے ساتھی سے کہا: چپ رہو، تو تم نے بیہودہ بات کہی۔''

پہلی حدیث یہ صراحت کر رہی ہے کہ امام کے خطبہ دینے کی حالت میں مسجد میں داخل ہونے والے پر بیٹھنے سے پہلے خفیف دو رکعتیں پڑھ لینا واجب ہے، جب کہ دوسری حدیث میں خطبہ کی حالت میں بات کرنے سے منع کیا گیا ہے اگر چہ وہ مفید ہی بات کیوں نہ ہو۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب تک امام خطبہ شروع نہ کرے اس وقت تک بات کرنا منع نہیں ہے۔ اس کی دلیل وہ روایت بھی ہے جو حضرت ثعلبہ بن مالک سے مروی ہے:

''صحابہ حضرت عمر کے منبر پر بیٹھنے تک اور مؤذن کے خاموش ہونے تک بات کرتے تھے اور جب حضرت عمر منبر پر کھڑے ہو جاتے تو کوئی بات نہ کرتا یہاں تک کہ وہ دونوں خطبوں سے فارغ نہ ہو جاتے۔'' ❸

۵۰...... ((صَلَاةٌ بِعَمَامَةٍ تَعْدِلُ خَمْسًا وَعِشْرِینَ) صَلَاةً بِغَیْرِ عَمَامَةٍ ، وَجُمُعَةٌ بِعَمَامَةٍ تَعْدِلُ سَبْعِینَ جُمُعَةً بِغَیْرِ عَمَامَةٍ ، إِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَیَشْهَدُونَ الْجُمُعَةَ

---

❶ صحیح مسلم، حدیث: ۲۰۲۴ ❷ بخاری: ۹۳۴۔ مسلم: ۸۵۱

❸ موطا: ۱/۱۲۶۔ مشکل الآثار للطحاوی: ۱/۲۱۷، والعلل لابن ابی حاتم: ۱/۲۰۱

مُعَمِّيِنَ وَلَا يَزَالُوْنَ يُصَلُّوْنَ عَلَى أَصْحَابِ الْعَمَائِمِ حَتَّى تَغْرِبَ الشمسُ))

''عمامہ کے ساتھ ایک نماز بغیر عمامہ کی پچیس نمازوں کے برابر ہے اور عمامہ کے ساتھ ایک جمعہ بغیر عمامہ کے ستر جمعوں کے برابر ہے۔ بے شک ملائکہ جمعہ میں عمامہ باندھ کر حاضری دیتے ہیں اور عمامہ والوں کو غروب شمس تک دعائیں دیتے ہیں۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج امام ابوعبداللہ محمد بن محمود بن الحسن ابن النجار نے محمد بن مہدی المروزی کی سند سے کی ہے:

''ہم کو ابو بشر بن سیار الرقی نے خبر دی، کہا: ہم سے العباس بن کثیر نے یزید ابن أبی حبیب سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، کہا: مجھ سے مہدی بن میمون نے کہا:

''میں سالم بن عبداللہ بن عمر کی خدمت میں اس حال میں حاضر ہوا کہ وہ عمامہ باندھ رہے تھے، انہوں نے مجھ سے فرمایا: یا ابا ایوب! کیا میں تم سے ایک ایسی حدیث نہ بیان کروں جو تمہیں پسند آئے گی، اور جس کو تم نقل کرو گے اور لوگوں سے اس کی روایت کرو گے؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں۔ فرمایا: میں عبداللہ بن عمر کی خدمت میں حاضر ہوا، درانحالیکہ وہ عمامہ باندھ رہے تھے، انہوں نے فرمایا: بیٹے! عمامہ کو محبوب رکھ۔ بیٹے! عمامہ باندھ کر تیرا رتبہ بلند ہوگا اور تیری عزت افزائی اور توقیر کی جائے گی اور اس حالت میں جب تجھے شیطان دیکھے گا تو تم سے دور بھاگے گا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سُنا ہے، اس کے بعد انہوں نے یہ حدیث سنائی۔'''

حافظ ابن حجر ''لسان المیزان: ۲۴۴/۴'' میں فرماتے ہیں:

''یہ حدیث موضوع ہے، میں نے ابن یونس کی کتاب ''الغرباء'' اور ابن الطحان کی کتاب ''ذیل الغرباء'' میں عباس بن کثیر کا کوئی ذکر نہیں دیکھا ہے۔ رہا ابو بشر بن سیار، تو ابو احمد الحاکم نے ''الکنی'' میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ مجھے محمد بن مہدی المروزی ہی معلوم ہے اور نہ سالم سے مروی مذکورہ حدیث کا راوی مہدی بن میمون ہی اور نہ وہ البصری ہی ہے جس کی مرویات کی تخریج صحیحین میں کی گئی ہے، معلوم نہیں اس ''آفت'' کا تعلق کن لوگوں سے تھا۔''

حافظ جلال الدین السیوطی نے اس موضوع حدیث کو ''ذیل الأحادیث الموضوعة، ص: ۱۱۰'' میں نقل کر کے اس کے موضوع ہونے کی توثیق کی ہے اور ابن عراق نے ''تنزیه الشریعة: ۱۵۹/۲''

میں حافظ السیوطی کی اس رائے کی پیروی کی ہے اور ملا علی القاری نے "الاسرار المرفوعة ، ص: ۵۱" میں حافظ علی بن محمد المصری الشاذلی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انہوں نے اس کو "باطل حدیث" قرار دیا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حافظ ابن حجر نے اس حدیث پر موضوع ہونے کا حکم اس اعتبار سے لگایا ہے کہ اس میں ایک ایسی چیز کی فضیلت کے بیان میں وہ مبالغہ آرائی کی گئی ہے جسے عقل سلیم قبول نہیں کرتی اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس حدیث کو "ضعیف" کہنے پر اکتفا کرتے۔

۵۱ ...... ((رَكْعَتَانِ بِعَمَامَةٍ خَيْرٌ مِنْ سَبْعِينَ رَكْعَةً بِلَا عَمَامَةٍ))

"عمامہ کے ساتھ دو رکعتیں بلا عمامہ کے ستر رکعتوں سے بہتر ہیں۔"

یہ بھی موضوع حدیث ہے جس کو حافظ السیوطی نے "الجامع الصغير ، حديث: ۳۱۲۹" میں نقل کیا ہے، جو "مسند الفردوس" میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حافظ الدیلمی کی روایت کے ساتھ درج کی ہے حالانکہ ان کو چاہیے تھا کہ اس کو "ذیل الأحاديث الموضوعة" میں نقل کرتے، کیونکہ اس میں عمامہ کی فضیلت میں سابقہ حدیث سے زیادہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، اور ان کے لیے مناسب یہی تھا کہ وہ اس کو موضوع قرار دیتے۔

علامہ عبدالرؤف المناوی نے "الجامع الصغير" کی شرح میں لکھا ہے:

"اس حدیث کی روایت حافظ ابونعیم نے حضرت جابر سے کی ہے اور انہی کی سند سے اس کو "الدیلمی" نے اخذ کر کے مسند الفردوس میں اسے درج کر دیا ہے لہٰذا اگر حافظ السیوطی نے اصل "مأخذ" کا حوالہ دیا ہوتا تو زیادہ بہتر تھا، اس کی سند میں طارق بن عبدالرحمٰن نامی راوی شامل ہے جس کو امام الذہبی نے "الضعفاء" میں شمار کیا ہے۔ امام نسائی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ محمد ابن عجلان سے روایت میں "قوی" نہیں ہے۔ امام بخاری نے اس کو "الضعفاء" میں شمار کیا ہے اور الحاکم نے کہا ہے کہ طارق بن عبدالرحمٰن بُرے اور کمزور حافظہ کا مالک تھا۔ اسی وجہ سے حافظ السخاوی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔"

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

"محمد بن عجلان ثقہ ہے، رہا طارق بن عبدالرحمٰن تو وہ دو ہیں:

۱۔ طارق بن عبدالرحمٰن البجلی الکوفی: انہوں نے سعید بن المسیب سے حدیثیں روایت کی ہیں، ان کا شمار شیخین: بخاری اور مسلم کے راویوں میں ہوتا ہے۔

۲ طارق بن عبدالرحمٰن القرشی الحجازی: انہوں نے العلاء بن عبدالرحمٰن وغیرہ سے احادیث روایت کی ہیں۔ امام الذہبی کا ان کے بارے میں قول ہے: ''وہ تقریباً غیر معروف ہیں۔'' اور امام نسائی کہتے ہیں: ''وہ غیر قوی ہے۔''

لگتا ہے کہ اس سند میں طارق بن عبدالرحمٰن سے مراد یہی آخر الذکر ہے، البانی آگے چل کر لکھتے ہیں:

''میں نے حافظ ابن رجب الحنبلی کی شرح ترمذی کے ایک حصہ میں ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت دیکھی ہے:

''ابوعبداللہ یعنی احمد بن حنبل سے ایک نصیبی شیخ کے بارے میں جس کا نام محمد بن نعیم ہے، پوچھا گیا اور کہا گیا کہ اس نے سہیل عن ابیہ عن ابی ہریرہ عن النبی ﷺ سے یہ حدیث روایت کی ہے:

((صَلَاةٌ بِعَمَامَةٍ أَفْضَلُ مِنْ سَبعِيْن صلاةً بِغَيْرِ عَمَامَةٍ))

تو فرمایا: ''محمد بن نعیم کذاب تھا، اور اس کی روایت کردہ یہ حدیث باطل ہے۔'' پھر جب میں نے ابونعیم کی روایت دیکھی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اس حدیث کی مصیبت کوئی طارق بن عبدالرحمٰن سے نیچے کا راوی ہے۔''

[الضعيفه: ۲۵۲/۱]

۵۲ ...... ((الصَّلَاةُ فِي الْعَمَامَةِ تَعْدِلُ بِعَشَرَةِ آلَافِ حَسَنَةٍ))

''عمامہ میں ادا کی جانے والی نماز دس (۱۰) ہزار نیکیوں کے برابر ہے۔''

یہ بھی موضوع ہے، اس کا ذکر السیوطی نے ''ذيل الأحاديث الموضوعة، ص: ۱۱۱'' میں الدیلمی کی روایت سے کیا ہے جو انہوں نے ''ابان عن انس مرفوعاً'' کی سند سے کی ہے، اور لکھا ہے کہ ''ابان پر وضع حدیث کا الزام ہے۔''

ابن عراق نے ''تنزيه الشريعه: ۲۵۷/۲'' میں ان سے اتفاق کیا ہے اور حافظ السخاوی نے ''المقاصد الحسنة، ص: ۱۲۴'' میں اپنے شیخ حافظ ابن حجر کی اتباع کرتے ہوئے اس کو موضوع بتایا ہے۔ اور التوفی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث باطل ہے۔ جیسا کہ ملا علی القاری کی ''الاسرار والمرفوعه، ص: ۵۱'' میں صراحت ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک اس حدیث اور اس سے پہلے کی دونوں حدیثوں کے باطل ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ کیونکہ ''الشارع الحکیم'' دینی اُمور کو صحیح میزان سے تولتا ہے۔لہٰذا یہ بات غیر معقول ہے کہ عمامہ پہن کر یا باندھ کر ادا کی جانے والی نماز کا اجر نماز با جماعت کے اجر کے مساوی یا اس سے کئی گنا زیادہ کر دیا جائے۔ جبکہ عمامہ میں نماز اور جماعت کے ساتھ نماز کے درمیان عظیم فرق ایک مسلمہ امر ہے اور عمامہ جس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ وہ مستحب ہے بلکہ راجح یہ ہے کہ عمامہ باندھنا رواج ہے سنت نہیں۔ رہی نماز با جماعت تو اس کا کم سے کم حکم یہ ہے کہ وہ سنت مؤکدہ ہے اور بعض لوگوں نے اس کو نماز کے ارکان میں شمار کیا ہے جس کے بغیر نماز صحیح نہیں ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ نماز با جماعت فرض ہے جس کے بغیر نماز تو صحیح ہے لیکن شدید گناہ کے ساتھ۔ اس تناظر میں ''الحکیم العلیم'' کے شایان شان یہ بات کیونکر تصور کی جاسکتی ہے کہ وہ نماز با جماعت کے ثواب کو عمامہ میں ادا کی جانے والی نماز کے اجر کے مساوی یا اس سے بہت کمتر قرار دے سکتا ہے اور شاید اسی وجہ سے حافظ ابن حجر نے اس حدیث پر موضوع ہونے کا حکم لگایا ہے۔'' [الضعیفه: ۱/ ۲۵٤]

۵۳...... ((كَانَ النَّاسُ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: إِذَا قَامَ الْمُصَلِّيْ يُصَلِّيْ ، لَمْ يَعْدُ بَصَرُ أَحَدِهِمْ مَوْضِعَ قَدَمَيْهِ ، فَلَمَّا تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : فَكَانَ النَّاسُ إِذَا قَامَ أَحَدُهُمْ يُصَلِّيْ لَمْ يَعْدُ بَصَرُ أَحَدِهِمْ مَوْضِعَ جَبِيْنِهِ ، فَتُوُفِّيَ أَبُوْبَكْرٍ وَكَانَ عُمَرُ ، فَكَانَ النَّاسُ إِذَا قَامَ أَحَدُهُمْ يُصَلِّيْ لَمْ يَعْدُ بَصَرُ أَحَدِهِمْ مَوْضِعَ الْقِبْلَةِ ، وَكَانَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ فَكَانَتِ الْفِتْنَةُ ، فَتَلَفَّتَ النَّاسُ يَمِيْنًا وَشِمَالًا))

''رسول اللہ ﷺ کے عہد میں لوگوں کا حال یہ تھا کہ جب کوئی نمازی نماز پڑھنے کھڑا ہوتا تو اس کی نگاہ اس کے پاؤں سے نہ ہٹتی، پس جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی تو لوگوں کا حال یہ ہوگیا کہ جب ان میں سے کوئی نماز پڑھنے کھڑا ہوتا تو اس کی نگاہ اس کی پیشانی سے نہ ہٹتی۔ پھر ابو بکر کی وفات ہوگئی اور عمر آ گئے اس وقت جب ان میں سے کوئی نماز پڑھنے کھڑا ہوتا تو اس کی نگاہ قبلہ کی جگہ سے تجاوز نہ کرتی اور عثمان بن عفان آ گئے اور فتنہ برپا ہوگیا اب لوگوں کا یہ حال ہوگیا کہ وہ دائیں بائیں متوجہ ہونے لگے۔''

یہ حدیث منکر ہے، اس کی تخریج امام ابن ماجہ القزوینی نے "سنن : ۱/۵۰۱، ۵۰۲" اور حافظ الطبرانی نے "المعجم الاوسط ، حدیث: ۹۳۵۸" میں محمد بن موسیٰ بن ابراہیم بن المطلب بن السائب بن ابی وداعۃ السہمی کی سند سے کی ہے:

"مجھ سے موسیٰ بن عبداللہ بن ابی امیہ المخزومی نے بیان کیا، کہا: مجھ سے مصعب بن عبداللہ نے نبی ﷺ کی زوجۂ محترمہ اُم المؤمنین حضرت اسلمہ بنت اُمیہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ انہوں نے فرمایا ہے.........."

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد حافظ الطبرانی نے لکھا ہے کہ "یہ حدیث حضرت ام سلمہ سے صرف اسی سند سے مروی ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

"یہ حدیث ضعیف ہے جس کی دو علتیں ہیں:

۱ موسیٰ بن عبداللہ بن ابی اُمیہ مجہول ہے جیسا کہ امام الذہبی نے اپنے اس قول سے اس کی جانب اشارہ کیا ہے:

موسیٰ بن عبداللہ سے اس حدیث کی روایت میں محمد بن موسیٰ بن ابراہیم منفرد ہے۔"

اور حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں اس کے مجہول ہونے کی صراحت کردی ہے۔ اور حافظ المنذری نے "الترغیب والترھیب ، حدیث: ۲۹۴" میں یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

"اس حدیث کو ابن ماجہ نے "حسن سند" سے روایت کیا ہے۔ لیکن موسیٰ ابن عبداللہ سے کتب ستہ کے مصنفین میں سے ابن ماجہ کے سوا کسی اور نے کوئی حدیث روایت نہیں کی ہے اور مجھے اس کی جرح وتعدیل کے بارے میں کسی امامِ حدیث کے قول کا علم نہیں ہے۔"

درحقیقت کسی نے بھی موسی بن عبداللہ کی توثیق نہیں کی ہے۔

۲ اس کی دوسری علت محمد بن ابراہیم کا مجہول ہونا ہے جس سے صرف دو راویوں نے احادیث روایت کی ہیں اور اس کی توثیق ابن حبان کے علاوہ کسی نے نہیں کی ہے، اسی وجہ سے حافظ ابن حجر نے اس کی توثیق کرنے سے احتراز کیا ہے اور صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ وہ "متابعت" کی صورت میں مقبول ہے ورنہ ضعیف ہے۔

یہ تو اس حدیث کی سند کا حال تھا۔ رہا اس کا متن تو وہ منکر ہے، کیونکہ اس میں پہلی بات تو یہ بیان کی گئی

ہے کہ سنت یہ ہے کہ نمازی نماز میں قیام کی حالت میں اپنی نگاہیں اپنے پیروں پر جمائے رکھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت سنت کے خلاف ہے، چنانچہ سنن البیہقی اور مستدرک الحاکم میں صحیح سند سے یہ حدیث مروی ہے۔

((كَانَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا صَلَّى طَأْطَأَ رَأْسَهُ وَرَمَى بِبَصَرِهِ نَحْوَ الْأَرْضِ وَلَمَّا دَخَلَ الْكَعْبَةَ مَا خَلَفَ بَصَرُهُ مَوْضِعَ سُجُوْدِهِ حَتّٰى خَرَجَ مِنْهَا............))

''رسول اللہ ﷺ جب نماز ادا فرماتے تو اپنا سر جھکا لیتے اور اپنی نگاہ زمین پر ڈال دیتے اور جب آپ کعبہ میں داخل ہوئے تو آپ کی نگاہ سجدوں کے مقام سے نہیں ہٹی یہاں تک کہ آپ کعبہ سے باہر تشریف لے آئے۔''

اور اس کے متن کی دوسری نکارت یہ ہے کہ اس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ آپ کی رحلت کے بعد صحابۂ کرام آپ کی سنت کے خلاف عمل کرنے لگے جو ناممکن اور محال ہے..... درحقیقت یہ منکر حدیث اُن لوگوں کی کارستانی معلوم ہوتی ہے جو لوگوں میں یہ تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اب بھی ان کے ہم مشرب لوگ اس کوشش میں ہیں کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد اختلافات میں مبتلا ہو گئے تھے۔

۵۴...... ((كَانَ إِذَا قَضَى صَلَاتَهُ مَسَحَ جَبْهَتَهُ بِكَفِّهِ الْيُمْنَى ثم أَمَرَّهَا عَلَى وَجْهِهِ حَتّٰى يَأْتِيَ بِهَا عَلَى لِحْيَتِهِ ، وَيَقُوْلُ : بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۔ اَللّٰهُمَّ ! أَذْهِبْ عَنِّي الْغَمَّ وَ الْحُزْنَ وَالْهَمَّ، اللّٰهُمَّ! بِحَمْدِكَ انْصَرَفْتُ وَبِذَنْبِي اعْتَرَفْتُ ، أَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا اقْتَرَفْتُ وَأَعُوْذُبِكَ مِنْ جَهْدِ بَلَاءِ الدُّنْيَا وَمِن عَذَابِ الْآخِرَةِ))

''رسول اللہ ﷺ جب نماز پوری فرما لیتے تو اپنی داہنی ہتھیلی سے اپنی پیشانی کا مسح فرماتے پھر اس کو اپنے چہرۂ مبارک سے لے کر اپنی داڑھی تک پھیرتے اور یہ دعا پڑھتے: اس اللہ کے نام سے جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے، وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے رحمٰن و رحیم ہے۔ الٰہی! تو مجھ سے غم، رنج اور پریشانی کو دور فرما دے، اے اللہ! میں تیری حمد کے ساتھ نماز سے واپس جاتا ہوں۔ اپنے گناہ کا معترف ہوں اور جس چیز کا میں نے ارتکاب کیا ہے اس کی برائی سے

تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اور مصائب دنیا کی مشقت اور عذابِ آخرت سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک نہیں ہے۔ اس کی روایت حافظ ابو نعیم نے "اخبار اصبھان: ۱۰۴/۳" میں داؤد ابن المحبر سے کی ہے:

''ہم سے العباس بن رزین السلمی نے خلاس بن عمر سے انہوں نے ثابت البنانی سے اور انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے مرفوعاً بیان کیا.........''

یہ سند موضوع ہے اور اس کو وضع کرنے والا یہی داؤد بن المحبر ہے۔ جو ''کتاب العقل'' کا مصنف ہے اس کتاب کو اس نے عقل کے فضائل کے بارے میں موضوع اور منکر روایتوں سے بھر دیا ہے۔

امام الذہبی نے ''الضعفاء'' میں لکھا ہے کہ ابن حبان اس کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ ثقہ راویوں کے نام سے جھوٹی حدیثیں گھڑتا تھا۔

اور اس موضوع روایت کی سند کا دوسرا راوی العباس بن رزین السلمی غیر معروف ہے۔

[الضعیفہ: ۱۷۲/۳]

۵۵......((كَانَ إِذَا قضى صَلَاتَهُ مَسَحَ جَبْهَتَهُ بِيَدِهِ اليُمنى ثم قال: أَشْهَدُ أَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيمُ ، اَللّٰهُمَّ ! اَذْهِبْ عَنِّي الهَمَّ وَالْحُزْنَ))

''رسول اللہ ﷺ جب نماز ختم فرما لیتے تو فرماتے: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو الرحمٰن الرحیم ہے، اے اللہ مجھ سے رنج و غم کو دور کر دے۔''

یہ بے حد کمزور اور ضعیف حدیث ہے جس کی تخریج حافظ ابو بکر احمد بن محمد بن السنی نے "عمل الیوم واللیلة، حدیث: ۱۱۰" میں کی ہے اور ابن سمعون نے "الامالی، قلمی نسخہ: ۱۷۶/۲" میں سلام المدائنی سے، انہوں نے زید العمی سے، انہوں نے معاویہ بن قرہ سے اور انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً کی ہے۔

یہ سند بھی موضوع ہے جس کو وضع کرنے کا الزام اسی سلام المدائنی الطّویل پر ہے جو کذاب تھا اور زید العمی ضعیف تھا۔

حضرت انس سے اس نا قابل اعتبار حدیث کے اور بھی ''طرق'' ہیں مثلاً جُبارۃ بن المغلس سے روایت ہے، ہم سے کُثیّر نے حضرت انس سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا کُثیّر اور جُبارۃ بن

المغلس دونوں ضعیف ہیں اس کی تخریج امام ابن عدی نے ''الکامل (قلمی نسخہ: ۱/۲۰۱۵) میں کُثیر کی متعدد حدیثوں کے ضمن میں کی ہے۔ اس کا پورا نام کُثیر بن سُلیم ہے، امام ابن عدی نے لکھا ہے:

''حضرت انس سے مروی یہ تمام احادیث غیر محفوظ ہیں۔''

جُبارہ بن المغلس پر بعض ائمہ حدیث نے کذب بیانی کا الزام بھی لگایا ہے۔ [الضعیفه: ۳/۱۷۱]

اور کُثیر بن سُلیم کو امام بخاری اور امام ابو حاتم نے منکر الحدیث اور امام نسائی اور امام ازدی نے متروک بتایا ہے۔ [الضعیفه: ۲/۱۱٤]

شاید انہی موضوع اور من گھڑت احادیث کی بنا پر بعض لوگ نماز ختم کرنے کے بعد اپنی پیشانیوں، چہروں اور داڑھیوں پر مسح کرتے ہیں اور بعض لوگ پیشانیوں کو پکڑ کر خاص انداز سے بڑھ کر کچھ پڑھتے ہیں۔

٥٦ ...... ((مَنْ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ لَا يَرَاهُ اِلَّا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ وَالْمَلَائِكَةُ كَانَتْ لَهُ بَرَاءَةً مِنَ النَّارِ))

''جو دو رکعتیں اس حال میں ادا کرے کہ اس کو اللہ عزوجل اور ملائکہ کے سوا کوئی اور نہ دیکھ رہا ہو تو یہ نماز جہنم سے اس کی نجات کا سبب ہوگی۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی روایت حافظ ابن عساکر نے ''تاریخ دمشق: ۱۲/۲۶۴'' میں اس سند سے کی ہے:

''محمد بن مروان سے روایت ہے، وہ داؤد بن ابی ہند سے روایت کرتے ہیں، وہ ابونضرہ سے اور وہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں..........''

یہ سند موضوع ہے۔ محمد بن مروان السدی الصغیر کے بارے میں امام الذھبی نے لکھا ہے:

''ائمہ حدیث نے اس کو متروک قرار دیا ہے اور بعض نے اس پر کذب بیانی کا الزام لگایا ہے۔''

حافظ ابن حجر نے ''تقریب التھذیب'' میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

''((مُتَّهَمٌ بِالْكَذِبِ)) ''اس پر کذب بیانی کا الزام ہے۔'' [الضعیفه: ۳/٤٨٤]

٥٧ ...... ((مِنَ السُّنَّةِ اَنْ لَّا يُصَلِّيَ الرَّجُلُ بِالتَّيَمُّمِ اِلَّا صَلَاةً وَاحِدَةً ، ثم يَتَيَمَّمُ لِلصَّلَاةِ الْاُخْرٰى))

''سنت یہ ہے کہ آدمی تیمم سے صرف ایک نماز پڑھے، پھر دوسری نماز کے لیے تیمم کرے۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔اس کی تخریج حافظ الطبرانی نے "المعجم الکبیر : ۱۰۷/۳ " میں اس سند سے کی ہے:

''الحسن بن عمارہ نے الحکم بن عُتیبہ سے روایت کیا، انہوں نے مجاہد سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے............''

اسی طرح امام الدارقطنی نے "السنن ، ص:۶۸ " میں اور انہی کے طریقے سے امام البیہقی نے "السنن الکبریٰ : ۳۳۱/۱، ۳۳۲ " میں اس کی تخریج کی ہے، اور یہ حدیث نقل کرنے کے بعد امام الدار قطنی نے لکھا ہے:

''الحسن بن عمارہ ضعیف ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

''الحسن بن عمارہ محض ضعیف ہونے سے کہیں زیادہ بُرا ہے۔ چنانچہ امام ابو بسطام شعبہ بن الحجاج الازدی نے اس کے بارے میں فرمایا ہے:

''((یَکْذِبُ)) وہ کذب بیانی سے کام لیتا تھا، اور امام حافظ ابوالحسن علی بن عبداللہ بن جعفر بن المدینی نے لکھا ہے: الحسن بن عمارہ حدیثیں وضع کرتا تھا، اور امام احمد کا قول ہے: ''اس کی روایت کردہ حدیثیں موضوع ہیں۔''

امام شعبہ فرماتے ہیں:

''الحسن بن عمارہ نے الحکم سے کچھ حدیثیں روایت کیں تو ہم نے الحکم سے ان حدیثوں کے بارے میں دریافت کیا؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں نے ان حدیثوں میں سے کوئی حدیث نہیں سُنی۔''

یہاں یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ اگر صحابی یہ کہے: ((من السنة کذا)) سنت اس طرح ہے تو علمائے حدیث کے نزدیک اس سے مراد قول صحابی نہیں بلکہ حدیث مرفوع ہے۔

یہی حدیث امام البیہقی نے "السنن الکبریٰ : ۲۲۲/۱ " میں حضرت عبداللہ بن عباس سے ان الفاظ میں بھی روایت کی ہے:

((لَا یُصَلِّیْ بِالتیمُّمِ اِلَّا صَلَاةً وَاحِدَةً))

''تیمّم سے صرف ایک ہی نماز پڑھی جائے۔''

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد امام البیہقی فرماتے ہیں:

''الحسن بن عمارہ حجت و دلیل بنانے کے قابل نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابن عمارہ کی روایت کردہ حدیث مستند نہیں ہے۔''

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عباس سے مرفوع اور موقوف کسی صورت میں صحیح نہیں ہے۔

اور اس موضوع حدیث میں تیمّم کا جو حکم بیان کیا گیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ تیمّم سے جتنی نمازیں چاہیں پڑھ سکتے ہیں چاہے وہ فرائض ہوں یا نوافل اور اس کا حکم وہی ہے جو حکم ''وضو'' کا ہے۔ وضو کی طرح تیمّم بھی حدث سے ٹوٹ جاتا ہے اور پانی مل جانے کے بعد بھی تیمّم باقی نہیں رہتا بشرطیکہ اس کے استعمال پر قدرت حاصل ہو۔ چنانچہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

((يَا أَبَا ذَرٍّ! إِنَّ الصَّعِيدَ الطَّيِّبَ طَهُورٌ ، وَإِنْ لَمْ تَجِدِ الْمَاءَ إِلَى عَشْرِ سِنِينَ ،فَإِذَا وَجَدْتَ الْمَاءَ فَأَمِسَّهُ جِلْدَكَ)) ❶

''اے ابوذر! بے شک پاک مٹی پاک کرنے والی ہے اگرچہ تم کو دس (۱۰) سال تک پانی نہ ملے اور جب تم کو پانی مل جائے تو اسے اپنی جلد کو پہنچاؤ۔''

اور حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((الصَّعِيدُ وَضُوءُ الْمُسْلِمِ وَإِنْ لَمْ يَجِدِ الْمَاءَ عَشْرَ سِنِينَ ، فَإِذَا وَجَدَ الْمَاءَ فَلْيَتَّقِ اللّٰهَ وَلْيُمِسَّهُ بَشَرَتَهُ ، فَإِنَّ ذَلِكَ خَيْرٌ)) ❷

''پاک مٹی مسلم کا وضو ہے۔ (پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ) اگرچہ اسے دس (۱۰) سال تک پانی نہ ملے، پس جب اسے پانی مل جائے تو چاہیے کہ اللہ سے ڈرے اور وہ پانی اپنے جسم کی ظاہری جلد کو پہنچائے، بے شک یہ بہتر ہے۔''

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ ایک ہی تیمّم سے متعدد نمازیں، چاہے وہ فرائض ہوں یا نوافل پڑھی جاسکتی ہیں جس طرح ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھی جاسکتی ہیں۔

❶ ابو داؤد، حديث : ۳۳۵۔ النسائی حديث : ۳۲۱۔ صحيح الجامع، حديث : ۳۸۶۰

❷ صحيح الجامع الصغير، حديث : ۳۸۶۱

۵۸ ...... ((يَا أَهْلَ مَكَّةَ لَا تَقْصُرُوا الصَّلَاةَ فِي أَدنَى مِنْ أَرْبَعَةِ بُرُدٍ مِنْ مَكَّةَ إِلَى عُسْفَانَ))

''اے اہل مکہ! چار برید (ایک خاص مسافت جس کے تعین میں اختلاف ہے) سے کم مسافت پر نماز قصر نہ کرو یعنی مکہ سے عسفان تک کے درمیان کی مسافت۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج الطبرانی نے ''المعجم الکبیر :۱۱۲/۳ '' میں امام دارقطنی نے ''السنن ، ص:۱۴۸'' میں اور انہی کے طریقے سے البیہقی نے ''السنن الکبریٰ، ص: ۱۳۸،۱۳۷/۳ '' میں اس سند سے کی ہے:

''اسمعیل بن عیاش نے عبدالوہاب بن مجاہد سے روایت کیا، انہوں نے اپنے باپ مجاہد اور عطاء سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا......''

یہ سند موضوع ہے جس کا سبب عبدالوہاب بن مجاہد ہے۔ امام سفیان الثوری نے اس کی تکذیب کی ہے اور الحاکم کا قول ہے:

((روى احاديث موضوعة)) ''اس نے موضوع احادیث روایت کی ہیں، اور امام ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ ائمہ حدیث کا اس کی روایت کردہ حدیثوں کو رد کر دینے پر اتفاق ہے۔''

رہا اسماعیل بن عیاش تو وہ اہل شام کے علاوہ دوسروں لوگوں سے اپنی روایت میں ضعیف ہے، جس میں سے ایک یہی روایت ہے کیونکہ ابن مجاہد حجازی ہے۔

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد البیہقی نے لکھا ہے:

''یہ حدیث ضعیف ہے۔ اسماعیل بن عیاش نا قابل استدلال ہے، اور عبدالوہاب بن مجاہد بے حد ضعیف ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ عبارت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔''

اس حدیث کے موضوع ہونے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نسبت کے جھوٹ ہونے پر امام ابن تیمیہ نے ''احکام السفر'' نامی رسالہ:۶/۲۔۷'' میں بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''یہ حدیث درحقیقت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور ابن خزیمہ وغیرہ کا اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی حیثیت سے روایت کرنا باطل ہے۔ جس کے باطل ہونے میں ائمہ حدیث کو کوئی شک نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد جو تھوڑا سا زمانہ گزارا وہ مدینہ میں گزارا، پھر آپ مخصوص طور پر اہل مکہ کو کس طرح مخاطب بنا کر سکتے تھے اور

اہل مدینہ کو چھوڑ کر اہل مکہ کے لیے (سفر) کی حد کس طرح متعین کر سکتے تھے۔ وہ خاص سبب کیا ہے جس کی وجہ سے دوسرے تمام مسلمانوں کو نظر انداز کر کے صرف اہل مکہ کے لیے سفر کی حد مقرر کی جاتی۔

مزید یہ کہ میلوں اور فرسخوں کے ذریعہ مسافت کا تعین کرنا زمین کے رقبے اور مساحت کی معرفت اور علم کا محتاج ہے جس سے کچھ خاص لوگ ہی بہرہ مند ہو سکتے ہیں رہے عام لوگ تو وہ دوسروں کی تقلید میں ایسی بات کہہ سکتے ہیں، اس کے قطعی اور یقینی علم و معرفت کی بنیاد پر نہیں، اور نبی ﷺ نے رقبہ یا پیمائش کے ذریعہ زمین کا کبھی تعین یا اندازہ کیا ہی نہیں تو ایسی صورت میں آپ اپنی اُمت کے لیے ایسی کوئی حد کیونکر متعین کر سکتے تھے جس کا ذکر آپ کے کلام میں کبھی آیا ہی نہیں۔ درانحالیکہ آپ کو تمام لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا تھا، لہٰذا یہ ضروری تھا کہ سفر کی مقدار ایسی ہو جو تمام لوگوں کو معلوم ہو۔''

مزید یہ کہ ایسی صحیح احادیث سے جن کی صحت پر علمائے حدیث کا اتفاق ہے، یہ ثابت ہے کہ نبی ﷺ حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات، مزدلفہ اور منیٰ میں نمازیں قصر فرماتے رہے اور اسی سنت پر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی عمل پیرا رہے اور جب نبی ﷺ مذکورہ مقامات پر قصر فرماتے رہے تو اہل مکہ بھی آپ کے پیچھے قصر کرتے تھے اور آپ ان کو نماز پوری کرنے کا حکم نہیں دیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مکہ سے مذکورہ مقامات تک کی مسافت سفر کے حکم میں ہے، درانحالیکہ مکہ اور عرفات کے درمیان ایک ''برید'' کا فاصلہ ہے جس کو اونٹ پر سوار ہو کر یا پیدل چل کر آدھے دن میں طے کیا جا سکتا ہے۔

درحقیقت لغت اور شریعت میں سفر کی کوئی متعینہ حد نہیں ہے اور اس کے تعین میں تمام تر اعتماد عرف اور مروجہ طریقے پر ہے لہٰذا جو فاصلہ ''عرف عام'' میں سفر کہلاتا ہے اسی کا اعتبار ہے۔''

[الضعیفہ: ۱/ ۶۳۲، ۶۳۳]

۵۹ ...... ((مَنْ قَرَأَ خَلْفَ الإِمَامِ مُلِئَ فُوهُ نَارًا))

''جس نے امام کے پیچھے قرأت کی اس کا منہ آگ سے بھر دیا جائے گا۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ اس کا ذکر محمد طاہر بن علی الہندی نے ''تذكرة الموضوعات، ص: ۹۳'' میں کیا ہے۔ اور اس کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کی سند میں مامون بن احمد الہروی دجال شامل ہے جو موضوع حدیثیں روایت کرتا تھا۔

اس حدیث کی روایت ابن حبان نے اسی مأمون بن احمد الہروی کے ترجمہ کے ضمن میں کی ہے۔اور امام الذہبی نے اس حدیث کو اس کے مصائب میں شمار کیا ہے۔

بعض احناف کو اس موضوع اور من گھڑت حدیث سے دھوکا ہو گیا اور انہوں نے اس کی بنیاد پر امام کے پیچھے قرأت کو مطلقاً حرام قرار دے دیا۔علامہ ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی نے "**التعلیق الممجد علی مؤطا محمد ، ص:۹۹**" میں لکھا ہے:

''اس حدیث کو صاحب ''النہایہ'' اور دوسرے لوگوں نے ''مرفوعاً'' ان الفاظ میں بھی ذکر کیا ہے۔((ففی فیه جمرةٌ)) یعنی جس نے امام کے پیچھے قرأت کی تو اس کے منہ میں آگ کا انگارہ ڈال دیا جائے گا۔'' مگر اس حدیث کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے۔''

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایسی کوئی صحیح مرفوع حدیث نہیں ہے جس میں امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ پڑھنے سے منع کیا گیا ہو،اس سلسلے میں لوگوں نے جن مرفوع احادیث کا ذکر کیا ہے یا تو ان کی کوئی اصل نہیں ہے یا وہ صحیح نہیں ہیں،اور اس کی مثال میں اسی حدیث کو دونوں الفاظ میں پیش کیا ہے۔

یہاں یہ ذکر فائدے سے خالی نہیں کہ قرأت خلف الامام کے مسئلے میں متقدمین اور متاخرین علماء کے تین اقوال ملتے ہیں:

۱۔ جہری اور سری دونوں نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔

۲۔ جہری اور سری دونوں نمازوں میں امام کے پیچھے خاموش رہنا واجب ہے۔

۳۔ سری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ پڑھی جائے اور جہری نمازوں میں خاموش رہا جائے۔

اور یہی آخر الذکر قول متعدل اور اقرب الی الصواب مانا گیا ہے۔کیونکہ سورۃ الفاتحہ کی قرأت سے متعلق یہ قول تمام دلیلوں کا جامع ہے اور اس پر عمل سے تمام دلیلوں پر عمل ہو جاتا ہے۔ائمہ حدیث وفقہ میں امام مالک اور امام احمد کا یہی مسلک تھا اور اس کو بعض احناف نے راجح قرار دیا ہے جن میں سے ایک علامہ ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی بھی ہیں۔ [الضعیفه: ۲/ ٤٢]

۶۱...... ((مَنْ قَرَأَ خَلْفَ الإِمَامِ فَلَا صَلَاةَ لَهُ))

''جس نے امام کے پیچھے قرأت کی تو اس کی نماز نہیں ہوئی۔''

یہ باطل روایت ہے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک نہیں ہے۔اس کی روایت ابن حبان نے "**کتاب المجروحین من المحدثین والضعفاء والمتروکین : ۱/۱۵۱،۱۵۲**" میں اور انہی سے

ابن الجوزی نے "العلل المتناهية" میں اس سند سے کی ہے:

''مجھ سے ابراہیم بن سعید القشیری نے احمد بن علی بن سلمان المروزی سے، انہوں نے سعید بن عبدالرحمٰن المخزومی سے، انہوں نے سُفیان بن عُیینہ سے، انہوں نے ابن طاؤس سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت زید بن ثابت سے اور انہوں نے نبی ﷺ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......''

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد ابن حبان نے لکھا ہے:

''اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے اور احمد بن سلمان کی روایت کردہ حدیثوں میں مصروف ہونا مناسب نہیں ہے۔''

حافظ زیلعی نے اس حدیث کو "نصب الرايه : ۲/۲۱ " میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ '' یہ حدیث مجھے ابن حبان کی کتاب " الضعفاء " میں نہیں ملی اور حافظ ابن حجر نے ''لسان المیزان'' میں اس کو نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے۔

حافظ الخطیب البغدادی نے بھی "تاريخ بغداد : ۴/۳۰۳ " میں ابن سلمان کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''میں نے الدارقطنی کی تحریر میں پڑھا ہے اور احمد بن محمد العتیقی نے ان سے روایت کرتے ہوئے مجھے بتایا بھی کہ ''احمد بن علی بن سلمان المروزی متروک ہے۔ حدیثیں وضع کرتا تھا۔''

محدث محمد ناصرالدین البانی لکھتے ہیں:

''یہ حدیث حضرت زید بن ثابت سے ''موقوفاً'' بھی مروی ہے جس کی سند اس ''مرفوع'' سے بہتر ہے۔ موقوف کی تخریج البیہقی نے "السنن الكبرىٰ :۲/۱۶۳ " میں اس سند سے کی ہے:

الحسین بن حفص نے سفیان سے روایت کیا، انہوں نے عمر بن محمد سے، انہوں نے موسیٰ بن سعد سے، انہوں نے ابن زید بن ثابت سے اور انہوں نے اپنے باپ زید بن ثابت سے......

اس سند کے راوی ثقہ ہیں سوائے ابن زید بن ثابت کے جس کو میں نہیں جانتا۔ لگتا ہے کہ موسیٰ کے والد سعد جو اس سند میں مذکور ہیں وہی موسیٰ بن سعد ابن زید بن ثابت ہیں۔ اور اگر وہی ہیں تو مجہول ہیں جن کا ''کتب رجال'' میں کوئی ذکر نہیں ملتا اور نہ تو ان کے والد سے روایت

کرنے والوں ہی کا کوئی ذکر ملتا ہے۔

امام البیہقی نے اس سند کے ضعیف ہونے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اگر یہ حدیث ان الفاظ میں صحیح ہے جو محل نظر ہے۔ تو اس سے مراد جہری قرأت ہوگی واللہ تعالیٰ اعلم۔ اور عبداللہ بن الولید العدنی نے اس سند کی مخالفت کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس حدیث کو سفیان سے، انہوں نے عمر بن محمد سے، انہوں نے موسیٰ بن سعد سے اور انہوں نے زید بن ثابت سے روایت کیا ہے۔'' اس سند میں عبداللہ بن الولید العدنی نے زید کے باپ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ ''اس سند سے ایک راوی کا دوسرے راوی سے سماع معلوم نہیں ہوتا اور اس طرح کی سند صحیح نہیں ہو سکتی۔''

محدث البانی مزید لکھتے ہیں:

''اس العدنی کے بارے میں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:

سچا تھا، کبھی کبھار غلطیاں کی ہیں، اس کا شمار دسویں طبقے کے بڑے راویوں میں ہوتا ہے۔

امام مسلم نے العدنی سے کوئی حدیث روایت نہیں کی ہے۔ برخلاف الحسین بن حفص کے کہ وہ سچا تھا اور مسلم نے اس سے حدیث روایت کی ہے۔ لہٰذا اس کی روایت راجح ہے۔ لیکن اس سند میں ایک راوی مجہول ہے اس لیے یہ حدیث مرفوع اور موقوف کسی شکل میں بھی صحیح نہیں ہے۔

ہاں! البیہقی نے اس کی تخریج عطاء بن یسار سے صحیح سند کے ساتھ کی ہے کہ انہوں نے حضرت زید بن ثابت سے امام کے ساتھ قرأت کرنے کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا:

میں امام کے ساتھ کچھ بھی نہیں پڑھتا۔

امام البیہقی یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اس کی تخریج مسلم نے کی ہے اور اس سے مراد امام کے ساتھ جہری قرأت ہے۔ واللہ اعلم۔

میں کہتا ہوں کہ اس کو امام کے ساتھ جہری قرأت پر محمول کرنا بعید از امکان ہے، بلکہ اس طرح کی روایت کو اثر اور مسلک کے درمیان تطبیق پر محمول کیا جاتا ہے، ورنہ امام کے پیچھے مقتدی کی جہری قرأت کا قائل تو کوئی بھی نہیں ہے کہ حضرت زید کو اس کی تردید کے لیے یہ فرمانے کی ضرورت پڑتی، اور صحیح مسلم کی طرف اس کو منسوب کرنا بھی محل نظر ہے کیونکہ یہ روایت مجھے اس میں نہیں ملی۔ واللہ اعلم''

[الضعيفه: ٢/ ٤٢٠، ٤٢١]

دراصل نماز میں سورۃ الفاتحہ کی قراءت کی فرضیت اور عدم فرضیت کے بارے میں فقہی مباحث نے فلسفیانہ رنگ اختیار کر لیا ہے اور وہ حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہوگئی جس کی وجہ سے متعدد احادیث میں نماز میں سورۃ الفاتحہ کی قراءت پر زور دیا گیا ہے اور بعض میں تو یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ سورۃ الفاتحہ سے خالی نماز، نماز ہی نہیں ہے۔ اگر اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ان احادیث کا مطالعہ کیا جاتا جو صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن اربعہ اور حدیث کی دوسری مستند کتابوں میں موجود ہیں تو فقہاء میں نہ یہ اختلافات پیدا ہوتے اور نہ اس کی فرضیت کا انکار کیا جاتا۔

پھر اس میدان میں عقلی گھوڑا دوڑانے والوں نے یہ کٹ حجتی بھی شروع کر دی کہ چونکہ آغاز اسلام میں چار رکعتوں والی نمازیں صرف دو دو رکعتیں فرض تھیں، بعد میں ''حضر'' میں مزید دو دو رکعتوں کا اضافہ کر دیا گیا اور ''سفر'' میں دو ہی رکعتیں باقی رکھی گئیں۔ لہٰذا شروع کی دو رکعتوں میں سورۃ الفاتحہ کی قراءت فرض ہے۔ مگر شرط نہیں کہ صحتِ نماز اس پر موقوف ہو...... اور بقیہ دو رکعتوں میں، سورۃ الفاتحہ کی قراءت صرف سنت ہے۔

مزید یہ کہ سورۃ الفاتحہ کی قراءت کی عدم شرطیت کو ثابت کرنے کے لیے یہ من گھڑت اصول بھی وضع کر لیا گیا کہ جو حکم قرآن سے ثابت ہو وہ تو قطعی اور فرض ''شرطی'' ہے اور جو حکم حدیث سے ثابت ہو وہ ظنی اور فرض غیر شرطی ہے۔ اور چونکہ نماز میں سورۃ الفاتحہ پڑھنے کا حکم احادیث میں دیا گیا ہے اس لیے اس کا پڑھنا فرض تو ہے مگر شرط نہیں کہ نہ پڑھنے سے نماز صحیح نہ ہو۔ حالانکہ اللہ کے ان بندوں کو یہ بات تو معلوم ہی ہوگی کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تین حیثیتیں متعین کی ہیں اور ان تینوں حیثیتوں میں مسلمانوں پر آپ کی اطاعت فرض قرار دی ہے:

[۱] مبلغ کتاب [۲] مفسر کتاب [۳] مشرع

ان تینوں حیثیتوں کو میں پہلے باب میں پوری تفصیل سے اور قرآنی دلائل کے ذریعہ واضح کر چکا ہوں، جس کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس مسئلے کو اگر کوئی شخص تفصیل کے ساتھ جاننا اور سمجھنا چاہے تو وہ ''ناصر السنہ'' امام شافعی رحمہ اللہ کی معرکۃ الآرا کتاب ''الرسالہ / باب فرض الله طاعة رسول الله مقرونة بطاعة الله ، ص: ۸۸، ۹۳'' کا مطالعہ کرے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس کو اطمینان قلب حاصل ہو جائے گا۔

۶۱...... ((صَلَاةُ الرَّجُلِ فِيْ بَيْتِهِ بِصَلَاةٍ ، وَصَلَاتُهُ فِيْ مَسْجِدِ الْقَبَائِلِ بِخَمْسٍ وَعِشْرِيْنَ صَلَاةً ، وَصَلَاةٌ فِي الْمَسْجِدِ الَّذِيْ ، يُجَمَّعُ فِيْهِ بِخَمْسَمِائَةِ صَلَاةٍ

، وَصَلَاةٌ فِي الْمَسْجِدِ الأَقْصَى بِخَمْسِيْنَ أَلْفَ صَلَاةٍ، وَصَلَاةٌ فِي مَسْجِدِيْ بِخَمْسِيْنَ أَلْفَ صَلَاةٍ وَصَلَاةٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ بِمِئَةِ أَلْفِ صَلَاةٍ))

[مشكوٰة المصابيح ، حديث: ۷۵۲، ضعيف الترغيب والترهيب ، حديث: ۷۵۶]

''آدمی کی اپنے گھر میں نماز ایک نماز کے برابر ہے، قبائل کی مسجد میں اس کی نماز پچیس نمازوں کے برابر ہے۔ اور جس مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی جاتی ہے اس میں ایک نماز پانچسو نمازوں کے برابر ہے۔ مسجد اقصیٰ میں ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ میری مسجد میں ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور مسجد حرام میں ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔''

یہ ایک منکر حدیث ہے جس کی روایت ابن ماجہ نے السنن میں کی ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی رزیق ابو عبداللہ الہانی ہے جس کی ثقاہت کے بارے میں ائمہ حدیث کا اختلاف ہے۔ اور اس سے یہ حدیث روایت کرنے والا ابو الخطاب الدمشقی ہے جو مجہول ہے۔ امام الذہبی نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد اس کو بے حد منکر بتایا ہے دراصل اس حدیث کا متن اس کی سند سے زیادہ منکر ہے کیونکہ یہ ان صحیح حدیثوں کے خلاف ہے جن میں مسجد حرام، مسجد رسول ﷺ اور مسجد اقصیٰ میں نمازوں کے فضائل بیان کیے گئے ہیں اور جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔

۶۲ ...... ((الصَّلَاةُ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ مِائَةُ أَلْفِ صَلَاةٍ وَالصَّلَاةُ فِي مَسْجِدِيْ عَشْرَةُ آلَافِ صَلَاةٍ وَالصَّلَاةُ فِي مَسْجِدِ الرِّبَاطَاتِ أَلْفُ صَلَاةٍ))

''مسجد حرام میں نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے اور میری مسجد میں ایک نماز دس (۱۰) ہزار نمازوں کے برابر ہے اور رباطوں میں ایک نماز ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی روایت حافظ ابو نعیم نے 'حلیۃ الاولیاء: ۴۶/۸'' میں عبدالرحیم بن حبیب سے کی ہے:

''ہم سے داؤد بن عجلان نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابراہیم بن ادھم نے مقاتل بن حیان سے، اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے......

ابو نعیم نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''ہم نے اس حدیث کو صرف عبدالرحیم عن داؤد کی سند سے لکھا ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

''عبدالرحیم بن حبیب اور داؤد بن عجلان دونوں ''متہم'' ہیں۔

داؤد کے بارے میں امام ابن حبان کا قول ہے کہ وہ عن ابی عقال عن انس کی سند سے منکر اور موضوع حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔

رہا عبدالرحیم بن حبیب تو اس کے بارے میں ابن حبان کہتے ہیں:

''شاید اس نے رسول اللہ ﷺ کے نام سے سو (۱۰۰) سے زیادہ حدیثیں وضع کی ہیں۔''

اور ابو نعیم نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

''اس نے سفیان بن عیینہ اور بقیہ بن الولید سے موضوع حدیثیں روایت کی ہیں۔

اس موضوع حدیث میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ مسجد رسول ﷺ میں ایک نماز دس (۱۰) ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ جبکہ متعدد صحیح احادیث سے یہ ثابت ہے کہ مسجد نبوی میں ایک نماز دوسری مسجدوں میں ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ [الضعیفه: ۱۸۷/۳]

چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((صَلَاةٌ فِیْ مَسْجِدِیْ هٰذَا خَیْرٌ مِنْ اَلْفِ صَلَاةٍ فِیْمَا سِوَاهُ اِلَّا الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ)) ❶

''میری اس مسجد میں ایک نماز اس کے علاوہ دوسری مسجدوں میں ایک ہزار نمازوں سے بہتر ہے سوائے مسجد حرام ہے۔''

اور امام احمد نے مسند میں، البیہقی نے السنن الکبریٰ میں اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((صَلَاةٌ فِی مَسْجِدِی هٰذَا أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِیْمَا سِوَاهُ مِنَ الْمَسَاجِدِ اِلَّا الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَصَلَاةٌ فِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَفْضَلُ مِنْ مائة صَلَاةٍ فِیْ مَسْجِدِیْ هٰذَا))

''میری اس مسجد میں ایک نماز اس کے علاوہ دوسری مسجدوں میں ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے۔ سوائے مسجد حرام کے کہ مسجد حرام میں ایک نماز میری اس مسجد میں سو (۱۰۰) نمازوں سے

❶ صحیح مسلم، حدیث: ۳۳۷۵

افضل ہے۔"

اور حافظ ابوبکر احمد بن عمرو البزار نے مسند میں اور حافظ ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی نے المعجم میں حضرت ابوالدرداء سے راویت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلصَّلَاةُ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ بِمِائَةِ اَلْفِ صَلَاةٍ وَالصَّلَاةُ فِي مَسْجِدِيْ بِأَلْفِ صَلَاةٍ وَالصَّلَاةُ فِيْ بَيْتِ الْمَقْدِسِ بِخَمْسِمِائَةِ صَلَاةٍ))

"مسجد حرام میں ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے اور میری مسجد میں ایک نماز ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے اور بیت المقدس میں ایک نماز پانچ سو نمازوں کے برابر ہے۔"

حافظ البزار نے اس حدیث کو "حسن" قرار دیا ہے۔" ❶

٦٣...... ((مَنْ صَلّٰى عِشْرِيْنَ رَكْعَةً بَيْنَ الْعِشَاءِ الْآخِرَةِ وَالْمَغْرِبِ ، يَقْرَأُ فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ، حَفِظَهُ اللّٰهُ فِيْ نَفْسِهِ وَوَلَدِهِ وَاَهْلِهِ وَمَالِهِ وَدُنْيَاهُ وَآخِرَتِهِ))

"جو آخری عشاء اور مغرب کے درمیان بیس (۲۰) رکعتیں اس طرح پڑھے کہ ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ اور قل ھو اللہ احد (سورۃ اخلاص) پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کی ذات، اس کی اولاد، اس کے اہل، اس کے مال اور اس کی دنیا اور آخرت میں اس کی حفاظت فرمائے گا۔"

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج عبدالکریم الرافعی نے "تاریخ قزوین : ۶۰/۴" میں اس سند سے کی ہے:

"ابو ھدبہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے، انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے......"

یہ سند موضوع ہے جس کو وضع کرنے والا ابراہیم بن ھدبہ ہے، جو نہایت کھلا ہوا جھوٹا تھا، ابن حبان نے "الضعفاء والمتروکین : ۱/۱۱۴، ۱۱۵" میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ دجالوں میں سے ایک دجال تھا، وہ بصرہ میں رقاص (ڈانسر) تھا جسے شادی کی تقریبات میں رقص کے لیے مدعو کیا جاتا تھا، پھر جب وہ سن رسیدہ ہوگیا تو حضرت انس سے جھوٹی اور موضوع حدیثیں روایت کرنے لگا۔

[الضعيفه: ٧/ ٣١١، ٣١٢]

❶ فتح الباري : ١/ ٧٨١

٦٤......((مَنْ صَلَّى يَوْمَ الْجُمُعَةِ مَا بَيْنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ رَكْعَتَيْنِ يَقْرَأُ فِي أَوَّلِ رَكْعَةٍ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَآيَةَ الْكُرْسِي مَرَّةً وَاحِدَةً وَخَمْسًا وَعِشْرِيْنَ مَرَّةً ، قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ، وَفِي الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ يَقْرَأُ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ خَمْسًا وَعِشْرِيْنَ مَرَّةً فَإِذَا سَلَّمَ قَالَ : لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ خَمْسِيْنَ مَرَّةً ، فَلَا يَخْرُجُ مِنَ الدُّنْيَا حَتّٰى يَرٰى رَبَّهُ عَزَّوَجَلَّ فِي الْمَنَامِ وَيَرٰى مَكَانَهُ فِي الْجَنَّةِ اَوْ تُرٰى لَهُ......))

''جو جمعہ کے دن ظہر اور عصر کے مابین دو رکعتیں اس طرح ادا کرے کہ پہلی رکعت میں سورۃ الفاتحہ اور آیۃ الکرسی ایک بار اور پچیس (۲۵) بار قل اعوذ برب الفلق پڑھے اور دوسری رکعت میں سورۃ الفاتحہ اور قل ھو اللہ احد اور قل اعوذ برب الناس پچیس (۲۵) بار پڑھے اور جب سلام پھیرے تو پچاس مرتبہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کہے تو دنیا سے رحلت کرنے سے قبل خواب میں اللہ عزوجل کو دیکھے گا اور جنت میں اپنی جگہ دیکھے گا یا اسے دکھائی جائے گی۔''

یہ حدیث موضوع ہے اور اس کی سند میں نامعلوم اور مجہول راوی شامل ہیں۔

[اللآلی المصنوعة فی الآحادیث الموضوعة: ٢/ ٤٥]

٦٥...... ((إِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِتَارِكٍ اَحَدًا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اِلَّا غَفَرَلَهُ))

''اللہ جمعہ کے دن مسلمانوں کے کسی بھی فرد کو اس کی بخشش کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔اس کی روایت الطبرانی نے ''**زوائد المعجم الاوسط** :۴۹.۴۸'' میں حافظ ابوسعید احمد بن محمد بن الاعرابی نے ''**المعجم** :(**قلمی نسخه** ، ص:۱۴۷'' میں اور ابن شبران نے ''**الامالی** ، ص:۲۴، ۲۹۰'' میں اس سند سے کی ہے:

''المفصل بن فضالہ سے روایت ہے، انہوں نے ابوعروہ البصری سے روایت کیا، انہوں نے زیاد ابوعمار سے، ابن الاعرابی نے کہا: زیاد بن میمون نے، انس بن مالک سے مرفوعاً روایت کیا............''

الطبرانی نے یہ موضوع حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''یہ حدیث صرف اسی سند سے روایت کی جاتی ہے اور ابوعروہ میرے نزدیک ''معمر'' ہے اور ابوعمار: زیاد النمیری''

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

''زیاد النمیری ابن عبداللہ البصری ہے، مجھے کوئی ایسا نہیں ملا جس نے اس کی کنیت ابوعمار لکھی ہو، البتہ زیاد بن میمون کی کنیت: ابوعمار لکھی ہے۔ امام یحییٰ بن معین نے زیاد النمیری کو ''ضعیف'' بتایا ہے۔ ایک دوسری جگہ اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے: ''لَيْسَ به بأس'' اس میں کوئی حرج نہیں۔' اور جب ان سے پوچھا گیا: کیا زیاد ابوعمار ہے، تو کہا: نہیں۔ ابوعمار کی حدیث کچھ بھی نہیں ہے۔''

امام الذہبی فرماتے ہیں:

''زیاد بن میمون کو کبھی زیاد ابوعمار البصری کہتے تھے اور کبھی زیاد بن ابی حسان، وہ اس کی یہ ''تدلیس'' اس لیے کرتے تھے کہ اس کا حال معلوم نہ ہو سکے۔ ابن معین کا اس کے بارے میں قول ہے، وہ کم اور زیادہ کچھ بھی نہیں تھا۔'' اور امام یزید بن ہارون نے اس کو ''کذاب'' لکھا ہے۔ اس کے بعد امام الذہبی نے مثال میں اس کی چند منکر حدیثیں نقل کی ہیں، جن میں سے ایک یہی حدیث ہے۔

اور ابوعروہ البصری ''معمر'' ہے جو عبدالرزاق کے شیخ ''راشد الثقہ'' کا بیٹا ہے جس کی کنیت اگرچہ ''ابوعروہ'' ہے، مگر اس سند میں مذکور ''ابوعروہ'' سے وہ مراد نہیں ہے۔ جس کی جانب امام الذہبی اور حافظ ابن حجر کے اقوال سے بھی اشارہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان دونوں نے ''میزان الاعتدال'' اور ''لسان المیزان'' میں لکھا ہے:

ابوعروہ عن زیاد بن فلان مجہول ہے۔ اسی طرح اس کا شیخ بھی۔''

اور میرے نزدیک اس کا شیخ زیاد بن میمون ہے، جو کذاب تھا اور ابوعروہ اس کی ''تدلیس'' کرتا تھا۔ کبھی اس کو ''زیادہ بن فلان'' کہتا تھا، جیسا کہ اس حدیث میں ہے اور کبھی زیاد ابوعمار تا کہ اس کا حال معلوم نہ ہو سکے...... اس طرح اس حدیث کا تمام تر ''مدار'' زیاد بن میمون پر ہے جو ''کذاب'' تھا۔''

[الضعيفه: ۱/ ٤٦٦، ٤٦٨]

٦٦ ...... ((مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ، كُفِّرَتْ عَنْهُ ذُنُوبُهُ وَخَطَايَاهُ ، فَإِذَا أَخَذَ فِي الْمَشْيِ ، كُتِبَ لَهُ بِكُلِّ خُطْوَةٍ عِشْرُونَ حَسَنَةً ، فَإِذَا انْصَرَفَ مِنَ الصَّلَاةِ ، أُجِيزَ بِعَمَلِ مِئَتَيْ سَنَةٍ))

''جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے تو اس کے سارے گناہ اور خطائیں کالعدم ہو جاتی ہیں اور جب وہ نماز کے لیے چل پڑتا ہے تو اس کے ہر قدم کے بدلے اس کے لیے بیس (۲۰) نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور جب وہ نماز سے واپس پلٹتا ہے تو اسے دوسو (۲۰۰) سال کے عمل کا اجر دیا جاتا ہے۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ ''الترغیب والترهيب، حدیث: ۴۲۳'' اس کی روایت الطبرانی نے ''المعجم الکبیر اور المعجم الاوسط میں کی ہے۔

جمعہ کے دن غسل کے وجوب، نمازِ جمعہ کی فضیلت اور اجابت دعا کے خاص وقت کے بارے میں صحیح احادیث مروی ہیں چند حدیثوں کو نقل کر رہا ہوں جن سے موضوع احادیث اور صحیح احادیث کا فرق روزِ روشن کی طرح واضح ہے:

((عَنْ سُلْمَانَ الْفَارِسِيّ ، قَالَ : قَالَ النَّبِيُّ ﷺ : لَا يَغْتَسِلُ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ، وَيَتَطَهَّرُ مَا اسْتَطَاعَ مِنْ طُهْرٍ وَيَدَّهِنُ مِنْ دُهْنِهِ أَوْ يَمَسُّ مِنْ طِيبِ بَيْتِهِ ثُمَّ يَخْرُجُ فَلَا يُفَرِّقُ بَيْنَ اثْنَيْنِ ، ثُمَّ يُصَلِّي مَا كُتِبَ لَهُ ، ثُمَّ يُنْصِتُ إِذَا تَكَلَّمَ الإِمَامُ ، إِلَّا غُفِرَلَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْأُخْرَى)) ❶

''جو مسلمان مرد جمعہ کے روز غسل کرے اور حتی الامکان زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو پاک کرے، تیل لگائے یا جو خوشبو گھر میں موجود ہو وہ لگائے، پھر مسجد جائے اور دو آدمیوں کے بیچ میں گھس کر ان میں تفریق نہ پیدا کرے، پھر جتنی کچھ توفیق ملے نمازیں پڑھے۔ پھر جب امام بولے (خطبہ دے) تو خاموش رہے تو اس کے گناہ اس جمعہ سے آنے والے جمعہ تک معاف کر دیے جاتے ہیں۔''

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((مَنِ اغْتَسَلَ ، ثُمَّ أَتَى الْجُمُعَةَ ،فَصَلَّى مَا قُدِرَ لَهُ ، ثُمَّ انْصَتَ حَتَّى يَفْرُغَ مِنْ خُطْبَتِهِ ، ثُمَّ يُصَلِّي مَعَهُ ، غُفِرَلَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الأُخرَى وَفَضْلُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ)) ❷

''جس نے غسل کیا پھر جمعہ کی نماز کے لیے مسجد گیا اور جتنی نمازیں اس لیے مقدر تھیں وہ ادا کی،

---

❶ بخاری حدیث : ۸۸۳

❷ حدیث نمبر : ۱۹۸۷

پھر خاموش رہا یہاں تک کہ امام اپنے خطبہ سے فارغ ہو گیا، پھر اس کے ساتھ نماز ادا کرے، تو اس کے اس جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے، مزید تین دن کے گناہ اور۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن کا ذکر فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا:

((فِيهِ سَاعَةٌ لَا يُوَافِقُهَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ ، وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّيْ ، يَسْأَلُ اللّٰهَ تَعَالَى شَيْئًا إِلَّا أَعْطَاهُ إِيَّاهُ، وَاَشَارَ بِيَدِهِ يُقَلِّلُهَا)) ❶

''جمعہ کے دن میں ایک ایسی گھڑی ہے جس کو اگر کوئی مسلمان بندہ نماز پڑھتے ہوئے پا لے اور اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کی درخواست کرے تو اللہ اس کو وہ چیز ضرور عطا کرے گا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اشارہ کر کے اس کی قلت بیان فرمائی، یعنی وہ گھڑی بڑی مختصر ہوتی ہے۔

٦٧ ......((أَنْبَأَنَا الْحَسَنُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ جَعْفَرٍ ، أَنْبَأَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُبَيْدَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ ابْنِ كَلَالَةَ ، حَدَّثَنَا أَبُو الْقَاسِمِ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ اَحْمَدَ، حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ نَصرِ ابْنِ عَلِيِّ الرَّازِيِّ ، حَدَّثَنَا أَبُو عَبْدِ اللّٰهِ مُحَمَّدُ بْنُ إِبْرَاهِيْمَ ، حَدَّثَنَا اَحْمَدُ ابْنُ مُحَمَّدٍ ، حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ النَّهْرَوَانِيُّ ، حَدَّثَنَا سَهْلُ بْنُ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيهِ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ مَرْفُوعًا : مَنْ صَلَّى يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ مَا بَيْنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ أَرْبَعِينَ رَكْعَةً يَقْرَأ فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ مَرَّةً وَآيَةَ الْكُرْسِيِّ عَشْرَ مَرَّاتٍ وَقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ إِحْدَى عَشْرَةَ مَرَّةً وَالْمُعَوِّذَتَيْنِ خَمْسَ مَرَّاتٍ ، فَإِذَا سَلَّمَ اسْتَغْفَرَ سَبْعِينَ مَرَّةً اَعْطَاهُ اللّٰهُ فِي الْفِرْدَوْسِ قُبَّةً بَيْضَاءَ فِيهَا بَيْتٌ مِنْ زُمُرَّدَةٍ خَضْرَاءَ سِعَةُ ذَلِكَ الْبَيْتِ مِثْلُ الدُّنْيَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَفِي ذَلِكَ الْبَيْتِ سَرِيْرٌ مِنْ نُورٍ ، قَوَائِمُ السَّرِيْرِ مِنَ الْعَنْبَرِ الْأَشْهَبِ عَلَى ذَلِكَ السَّرِيْرِ أَلْفَافِرَاشٍ مِنَ الزعفرَانِ))

''ہم کو الحسن بن علی بن جعفر نے خبر دی، کہا: ہم کو عبداللہ بن عُبیدہ بن عبید اللہ بن کلالہ نے خبر

---

❶ بخاری، حدیث: ۹۳۵۔ مسلم، حدیث: ۱۹٦۹

دی، کہا: ہم سے ابوالقاسم عبداللہ بن احمد نے بیان کیا، کہا: ہم سے احمد بن نصر بن علی الرازی نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم نے بیان کیا، کہا: ہم سے احمد بن محمد نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن عبداللہ النہروانی نے بیان کیا، کہا: ہم سے سہل بن محمد نے اپنے باپ سے اور اس نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''جس نے عاشوراء کے دن ظہر اور عصر کے درمیان چالیس رکعتیں اس طرح ادا کیں کہ ہر رکعت میں فاتحۃ الکتاب (سورۃ فاتحہ) ایک بار، آیۃ الکرسی دس (۱۰) بار قل ھواللہ احد گیارہ بار اور المعوذتین پانچ بار پڑھیں اور جب سلام پھیرا تو ستر مرتبہ استغفار کیا، تو اللہ تعالیٰ فردوس میں اس کو ایسا سفید قبہ عطا کرے گا جس میں سبز زمرد سے بنا ہوا ایک گھر ہوگا جس گھر کی وسعت دنیا کی تین گنا ہوگی اور اس گھر میں نور کی ایک چارپائی ہوگی جس کے پائے چمکدار عنبر کے ہوں گے اور اس چارپائی پر زعفران کے دو ہزار بستر بچھے ہوں گے۔''

یہ ایک موضوع حدیث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک نہیں ہے۔ اس کے تمام راوی غیر معروف اور مجہول ہیں۔ [اللآلی المصنوعة فی الاحدیث الموضوعة: ۲/۴۶]

عاشوراء سے مراد محرم کی دس (۱۰) تاریخ ہے اور اس دن روزہ رکھنا تو صحیح احادیث سے ثابت ہے مگر اس دن کوئی خاص نماز پڑھنے یا کوئی اور عبادت کرنے کا ذکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح ارشادات میں نہیں آیا ہے اور عبادت وہی مشروع اور معتبر ہے جو منصوص ہو اور غیر منصوص عبادت بدعت ہے جو اللہ و رسول کے احکام کی خلاف ورزی سے بھی بڑی معصیت ہے۔

یوم عاشوراء کا روزہ جن احادیث سے ثابت ہے ان میں سے دو حدیثیں ذیل میں درج کر رہا ہوں:

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَدِمَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم اَلْمَدِيْنَةَ فَرَأَى الْيَهُودَ تَصُوْمُ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ، فَقَالَ: مَا هَذَا؟ قَالُوْا: هٰذَا يَوْمٌ صَالِحٌ، هٰذَا يَوْمٌ نَجَّى اللّٰهُ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ مِنْ عَدُوِّهِمْ، فَصَامَهُ مُوْسٰى، قَالَ: فَأَنَا اَحَقُّ بِمُوْسٰى مِنْكُمْ.......... فَصَامَهُ وَأَمَرَ بِصِيَامِهِ)) ❶

''ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں کو یوم عاشورا

---

❶ بخاری، حدیث: ۲۰۰۴

میں روزہ رکھتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے دریافت فرمایا: یہ کیسا روزہ ہے؟ انہوں نے بتایا: یہ ایک اچھا دن ہے، یہ وہ دن ہے جس میں اللہ نے بنو اسرائیل کو اُن کے دشمنوں سے نجات دی تھی اس لیے موسیٰ اس دن روزہ رکھتے تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: میں تم سے زیادہ موسیٰ کا حق دار ہوں، پھر آپ نے اس دن روزہ رکھا اور یہ روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔''

یہی حدیث صحیح مسلم میں ان الفاظ میں مروی ہے:

((أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ ، فَوَجَدَ الْيَهُوْدَ صِيَامًا يَوْمَ عَاشُوْرَاء ، فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : مَا هٰذَا الْيَوْمُ الَّذِیْ تَصُوْمُوْنَهُ ، قَالُوْا هٰذا يَوْمٌ عَظِيْمٌ ، أَنْجَی اللّٰهُ فِيْهِ مُوْسَى وَقَوْمَهُ وَغَرَّقَ فِرْعَوْنَ وَقَوْمَهُ ، فَصَامَهُ مُوْسَى شُكْرًا ، فَنَحْنُ نَصُوْمُهُ ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : فَنَحْنُ اَحَقُّ بِمُوْسَى مِنْكُمْ " فَصَامَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَاَمَرَ بِصِيَامِهِ)) ❶

''رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو عاشورا کے دن یہودیوں کو روزہ دار پایا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: یہ کیسا دن ہے جس میں تم لوگ روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: یہ ایک عظیم دن ہے، اس دن اللہ نے موسیٰ اور ان کی قوم کو نجات دی تھی اور فرعون اور اس کی قوم کو ڈبو دیا تھا۔ لہٰذا موسیٰ نے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے اُس دن روزہ رکھا اور ہم بھی اس دن روزہ رکھتے ہیں۔ یہ سُن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہم تم سے زیادہ موسیٰ کے حق دار ہیں۔'' اور رسول اللہ ﷺ نے اس دن روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔''

متعدد صحیح احادیث میں یوم عاشوراء کے فضائل بیان ہوئے ہیں چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ ہیں:

((ثَلَاثٌ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ وَرَمَضَانُ إِلٰى رَمَضَانَ ، فَهٰذَا صِيَامُ الدَّهْرِ كُلِّهِ ، صِيَامُ يَوْمِ عَرَفَةَ ، أَحْتَسِبُ عَلَى اللّٰهِ أَنْ يُكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِیْ قَبْلَهُ وَالسَّنَةَ الَّتِیْ بَعْدَهُ ، وَصِيَامُ يَوْمِ عَاشُوْرَاءَ ، اَحْتَسِبُ عَلَى اللّٰهِ أَنْ يُكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِیْ بَعْدَهُ)) ❷

''ہر ماہ کے تین دنوں کے روزے اور رمضان تا رمضان کے روزے (ہر رمضان) پوری عمر (صوم الدھر) کے روزے ہیں، اور یوم عرفہ کا روزہ مجھے اللہ سے اُمید ہے، ایک سال پہلے اور

❶ حديث نمبر: ٢٦٥٨ ❷ حديث نمبر: ٢٧٤٦

آنے والے ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ اور یوم عاشوراء کا روزہ مجھے اللہ سے اُمید ہے پہلے کے ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہے۔''

اور ایک دوسری روایت میں جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((أَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ رَمَضَانَ شَهْرُ اللّٰهِ الْمُحَرَّمِ ، وَأَفْضَلُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الفَرِيْضَةِ ، صَلَاةُ اللَّيْلِ)) ❶

''رمضان کے بعد افضل ترین روزہ اللہ کے مہینے محرم کا روزہ ہے، اور فرض نمازوں کے بعد افضل ترین نماز تہجد ہے۔''

اس حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محرم کو ''اللہ کا مہینہ'' قرار دیا ہے۔ یہ واحد مہینہ ہے جس کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ اس لیے اس ماہ میں روزے رکھنا خصوصی فضیلت رکھتا ہے۔ اور ترمذی کی ایک حدیث میں اس کی صراحت بھی ہے مگر وہ حدیث ضعیف ہے۔

یوم عاشوراء کا روزہ مستحب ہے جیسا کہ رمضان کے علاوہ سال کے دوسرے روزے مستحب ہیں اور عاشوراء کا روزہ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے نو محرم کا روزہ رکھا جائے، پھر دس (۱۰) محرم کا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ارادہ فرمایا تھا مگر محرم کی آمد سے قبل ہی آپ کی وفات ہوگئی، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((صَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ عَاشُوْرَاءِ وَأَمَرَ بِصِيَامِهِ ، قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّهُ يَوْمٌ تُعَظِّمُهُ اليَهُوْدُ وَالنَّصَارَى ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : فَإِذَا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ ، إِنْ شَاءَ اللّٰهُ ، صُمْنَا الْيَوْمَ التَّاسِعَ ، قَالَ : فَلَمْ يَأْتِ الْعَامُ الْمُقْبِلُ ، حَتّٰى تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ)) ❷

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم عاشوراء کا روزہ رکھا اور اس کا روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ ایسا دن ہے جس کی یہود ونصاریٰ تعظیم کرتے ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان شاء اللہ جب آئندہ سال آئے گا تو ہم نویں محرم کا روزہ رکھیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں: آئندہ سال نہیں آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دس محرم سے پہلے نو محرم کو بھی روزہ رکھا جائے تا کہ یہودیوں کی مخالفت ہو

❶ مسلم، حدیث: ٢٧٥٥ ❷ صحیح مسلم، حدیث: ٢٦٦٦

جائے، کیونکہ وہ صرف دس (۱۰) محرم کو روزہ رکھتے تھے۔ لیکن اگر کوئی صرف دس (۱۰) محرم کو روزہ رکھے تو جائز ہے۔

٦٨...... ((قَالَ الْجُوز قَانِيُ (الْحُسَيْنُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ) : أَنْبَأَنَا أَبُوجَعْفَرٍ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ مُحَمَّدٍ الطَّائِي ، أَنْبَأَنَا عَبْدُ الْكَرِيمِ بْنِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ بْنِ الْحَسَنِ الْبُخَارِيُ ، حَدَّثَنَا أَبُو الطَّيِّبِ طَاهِرُ بْنُ الْحَسَنِ الْمُطَوِّعِي ، حَدَّثَنَا أَبُوْ زَرٍّ عَمَّارُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ مُخَلَّدٍ الْبَغْدَادِيُ ،حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْحَارِثِيُ ، حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُونُسَ السَّرَخَسِيُ ، حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْقَاسِمِ عَنْ عَلِيِّ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ حُمَيْدِ الطَّوِيْلِ عَنْ أَنَسٍ مَرْفُوْعًا ، أَنَّ مَنْ صَلَّى الْمَغْرِبَ أَوَّلَ لَيْلَةٍ مِنْ رَجَبَ ثُمَّ صَلَّى بَعْدَهُمْ عِشْرِيْنَ رَكْعَةً بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ مَرَّةً وَيُسَلِّمُ فِيهِنَّ عَشَرَ تَسْلِمَاتٍ ، أَتَدْرُوْنَ مَا ثَوَابُهُ؟ فَإِنَّ الرُّوْحَ الأَمِيْنَ جِبْرِيْلَ أَعْلَمِيْنَ بِذَلِكَ ، قُلْنَا : اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ ، قَالَ : حَفِظَهُ اللّٰهُ تَعَالَى فِيْ نَفْسِهِ وَمَالِهِ وَاَهْلِهِ وَوَلَدِهِ وَأُجِيْرَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَجَازَ عَلَى الصِّرَاطِ كَالْبَرْقِ بِغَيْرِ حِسَابٍ وَلَا عَذَابٍ))

''جوزقانی کہتے ہیں: ہم کو ابوجعفر محمد بن علی بن محمد الطائی نے خبر دی، کہا: ہم کو عبدالکریم بن ابو حنیفہ بن الحسن البخاری نے خبر دی، کہا: ہم سے ابوالطیب طاہر بن الحسن المطوعی نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابوذر عمار بن محم بن مخلد البغدادی نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبداللہ بن محمد الحارثی نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن یونس السرحس نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن القاسم نے علی بن محمد سے انہوں نے حُمید الطّویل سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

جس نے پہلی رجب کو مغرب کی نماز ادا کی، پھر اس کے بعد بیس (۲۰) رکعتیں سورۃ الفاتحہ اور قل ھو اللہ احد ایک بار پڑھ کر ادا کیں اور ان بیس (۲۰) رکعتوں میں دس (۱۰) بار سلام پھیرا تو کیا تم لوگ جانتے ہو کہ اس کا ثواب کیا ہے؟ بے شک الروح الامین جبرائیل نے مجھے اس کے ثواب سے مطلع کیا ہے، ہم نے عرض کیا: اللہ اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا: ایسا کرنے والے کی اللہ تعالیٰ اس کی ذات، اس کے مال، اس کے اہل اور اس کی اولاد سمیت

حفاظت فرمائے گا اور وہ عذابِ قبر محفوظ رہے گا اور پل صراط پر سے برق کی مانند بلا حساب اور بلا عذاب گزر جائے گا۔''

''یہ حدیث موضوع ہے، اس کے بیشتر راوی مجہول اور نامعلوم ہیں۔'' [اللآلی المصنوعة : ۲/ ۴۲ ـ تنزیهه الشریعة : ۲/ ۸۹ ـ الموضوعات : ۲/ ۱۲۳ ـ الفوائد المجموعة : ۴۷]

ماہ رجب میں کسی مخصوص عبادت کا کوئی ثبوت صحیح احادیث سے نہیں ملتا، چاہے وہ نماز ہو یا روزہ، اسی طرح اس اعتقاد کی بھی کوئی شرعی یا تاریخی بنیاد نہیں ہے کہ ماہ رجب کی ستائیسویں رات میں واقعۂ اسراء و معراج وقوع پذیر ہوا تھا اس لیے اس رات میں عبادت یا شب بیداری باعثِ ثواب ہے، رہا اس ماہ میں عمرہ تو اگرچہ اسلام کے اعمال سے اس کا ثبوت ملتا ہے مگر صحیح احادیث سے یہ بھی ثابت نہیں ہے اور صحیحین میں، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی جس روایت کا ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ رجب میں ایک عمرہ کیا تھا تو اسی روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابن عمر کے اس قول کو ان کا ''سہو'' قرار دیا ہے اور یہ صراحت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا ہے۔ تاکید کے لیے صحیح بخاری حدیث نمبر ۱۷۷۵ اور صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۲۵۵ دیکھی جا سکتی ہے۔ رہی ''صلاة الرغائب'' تو یہ اہل بدعت کے ذہنوں کی اختراع ہے۔

۶۹ ...... ((أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ نَاصِرٍ ، أَنْبَأَنَا أَبُو عَلِيِّ بْنِ الْبَنَّاءِ ، أَنْبَأَنَا أَبُو عَبْدِ اللّٰهِ الْحُسَيْنِ بْنُ عُمَرَ الْعَلَّافِ ، حَدَّثَنَا أَبُو الْقَاسِمِ الْفَامِيُّ ، حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ نَبْدَارٍ الْبُرْدَعِي، حَدَّثَنَا أَبُوا يُوسُفَ يَعْقُوبُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ، حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ ابْنُ عُبَيْدِاللّٰهِ ، سَمِعْتَ أَبِيْ يَقُوْلُ : حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَاصِمٍ عَنْ عَمْرٍ وبْنِ مِقْدَامٍ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ مَرَّةٍ فِيْ عَشْرِ رَكَعَاتٍ لَمْ يَمُتْ حَتّٰى يَبْعَثَ اللّٰهُ اِلَيْهِ مِائَةَ مَلَكٍ ، ثَلَاثُوْنَ يُبَشِّرُوْنَهُ بِالْجَنَّةِ وَثَلَاثُوْنَ يُؤْمِنُوْنَهُ مِنَ الْعَذَابِ وَثَلَاثُوْنَ يُقَوِّمُوْنَهُ أَنْ يُخْطِئَ وَعَشَرَةُ اَمْلَاكٍ يَكْتُبُوْنَ أَعْدَاءَهُ))

''ہم کو محمد بن ناصر نے خبر دی، کہا: ہم کو ابو علی بن البناء نے خبر دی، کہا: ہم کو ابو عبداللہ الحسین بن عمر العلاف نے خبر دی، کہا: ہم سے ابو القاسم الفامی نے بیان کیا، کہا: ہم سے علی ابن بندار البردعی نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابو یوسف یعقوب بن عبدالرحمٰن نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن عُبید اللہ نے بیان کیا، کہا: میں نے اپنے باپ کو کہتے ہوئے سُنا ہے: ہم سے علی بن عاصم نے

عمرو بن مقدام سے، انہوں نے جعفر بن محمد سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت بیان کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جس نے نصف شعبان کی رات میں قل ھو اللہ احد ایک ہزار مرتبہ دس رکعتوں میں پڑھا، تو اس کی موت سے پہلے اللہ اس کے پاس سو (۱۰۰) فرشتے بھیجے گا، ان میں سے تیس (۳۰) فرشتے اس کو جنت کی خوشخبری دیں گے، تیس (۳۰) اس کو عذاب سے محفوظ رکھیں گے، تیس (۳۰) اس کو غلطی کرنے سے بچائیں گے، اور دس (۱۰) اس کے دشمنوں کے نام لکھیں گے۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ حافظ السیوطی نے لکھا ہے کہ:

''یہ حدیث تین طریقوں سے مروی ہے اور ان میں سے ہر ایک میں یا تو مجہول یا غیر معروف راوی شامل ہیں۔ یا ایسے راوی جو ضعیف اور نا قابل اعتبار ہیں، اور اس کا رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہونا محال ہے۔''

[اللآلی المصنوعة : ۲/ ۵۰۔ الموضوعات: ۲/ ۱۲۹ ۔ تنزیہ الشریعة: ۲/ ۹۳]

۷۰ ...... ((قال الجُوزقَانِیُ : أَنْبَانَا أبو الحَسَنِ عَلِيُّ بْنُ أَبِیْ الحَسَنِ بْنِ مُحَمَّدٍ الكَرَخِیُ حَدَّثَنَا أبو عَبدِ اللّٰهِ الحُسَیْنُ بْنُ عَلِيّ بْنِ مُحَمَّدٍ الخَطِیْبِ ، أَنْبَانَا الْحَاکِمُ أبوالقَاسِمِ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ اَحْمَدَ الْحَسْكَانِیُ ، حَدَّثَنَا أَبُو القَاسِمِ عَبْدُ الْخَالِقِ بْنُ عَلِيّ الْمُوذِنِ ، حَدَّثَنَا جَعْفَرُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ بِسْطَامٍ لَامقَومِسِيّ ، حَدَّثَنَا أَبُو جَعْفَرٍ اَحمَدُ بْنُ مُحَمَّدِ ابْنِ جَابِرٍ ، حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ عَبْدِ الْكَرِيْمِ ، حَدَّثَنَا خَالِدًا الْحِمْصِیُ عَنْ عُثْمَانَ ابْنِ سَعِیْدِ بْنِ كَثِیْرٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُهَاجِرِ عَنِ الْحَكَمِ بْنِ عُیَیْنَةَ عَنْ إِبْرَاهِیْمَ ، قَالَ : قَالَ عَلِيُّ بْنُ أَبِیْ طَالِبٍ : رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَیْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ قَامَ فَصَلَّی اَرْبَعَ عَشْرَةَ رَكْعَةً ثُمَّ جَلَسَ بَعْدَ الْفَرَاغِ ، فَقَرَأَ بِاُمِّ الْقُرآنِ أَرْبَعَ عَشْرَةَ مَرَّةً وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ اَرْبَعَ عَشْرَةَ مَرَّةً وَآیَةَ الْكُرْسِی مَرَّةً ، وَلَقَدْ جَاءَ كُمْ رَسُوْلٌ الآیَة ، فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ صَلَاتِهِ سَأَلْتُهُ عَمَّا رَأَیْتُهُ مِنْ صَنِیْعِهِ ، فقال مَنْ صَنَعَ مِثْلَ الَّذِی رَأَیْتَ كَانَ لَهُ كَعِشْرِیْنَ حَجَّةً مَبْرُوْرَةً وَكَصِیَامِ عِشْرِیْنَ سَنَةً مَقْبُوْلَةً فَإِنْ أَصْبَحَ فِیْ ذٰلِكَ الْیَوْمِ صَائِمًا كَانَ لَهُ كَصِیَامِ سَنَتَیْنَ سَنَةٍ مَاضِیَةٍ وَسَنَةٍ مَقْبِلَةٍ))

''الجوزقانی نے کہا: ہم کو ابوالحسن علی بن ابی الحسن بن محمد الکرخی نے خبر دی، کہا: ہم سے ابو عبداللہ الحسین بن علی بن محمد الخطیب نے بیان کیا، کہا: ہم کو الحاکم ابوالقاسم عبداللہ بن احمد الحکانی نے خبر دی، کہا: ہم سے ابوالقاسم عبدالخالق بن علی المؤذن نے بیان یا، کہا: ہم سے جعفر بن محمد بطام القومس نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابوجعفر احمد بن محمد بن جابر نے بیان کیا، کہا: ہم سے احمد بن عبدالکریم نے بیان کیا، کہا: ہم سے خالد الحمص نے عثمان بن سعید بن کثیر سے انہوں نے محمد بن المہاجر سے، انہوں نے الحکم بن عیینہ سے اور انہوں نے ابراہیم سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، ابراہیم نے کہا: علی بن ابی طالب نے فرمایا ہے: میں نے رسول اللہ ﷺ کو نصف شعبان کی رات میں دیکھا کہ آپ اُٹھے اور چودہ رکعتیں پڑھیں، پھر نماز سے فارغ ہونے کے بعد بیٹھ گئے اور اُم القرآن (سورۃ الفاتحہ) چودہ بار پڑھی۔ **قل اعوذ برب الناس**، چودہ بار اور آیۃ الکرسی ایک بار پڑھی اور ''**وَلقد جاء کم رسول**'' پوری آیت بھی ایک بار پڑھی۔ پس جب آپ اپنی نماز سے فارغ ہو گئے تو میں نے آپ سے آپ کے اس عمل کے بارے میں پوچھا: تو آپ نے فرمایا: جس نے یہ عمل جو تو نے دیکھا انجام دیا تو یہ اس کے لیے بیس (۲۰) حج مبرور اور بیس (۲۰) سال کے مقبول روزوں کے برابر ہے۔ اور اگر وہ اس دن روزے سے رہا تو اس کا یہ روزہ دو سال، ایک سال پہلے کے اور ایک سال آنے والے کے روزوں کے برابر ہوگا۔''

''یہ حدیث موضوع ہے اور اس کی سند تاریک ہے اور محمد بن مہاجر حدیثیں وضع کرتا تھا۔ البیہقی نے اس کی تخریج ''شعب الایمان'' میں عبدالخالق کی سند سے کی ہے اور لکھا ہے: یہ حدیث موضوع لگتی ہے۔ اور یہ منکر ہے۔ اس روایت میں عثمان بن سعید سے پہلے کے راوی مجہول ہیں۔''

[اللآلی المصنوعة: ۲/ ۵۰۔ ۵۱۔ الموضوعات: ۲/ ۱۲۹۔ تنزیهه الشریعه: ۲/ ۹۳]

۷۱...... ((إِذَا كَانَتْ لَيْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ ، فَقُوْمُوْا لَيْلَهَا ، وَصُوْمُوْا نَهَارَهَا فَإِنَّ اللّٰهَ يَنْزِلُ فِيْهَا لِغُرُوْبِ الشمسِ إِلىٰ سَمَاءِ الدُّنْيَا فَيَقُوْلُ : أَلَامِنْ مُسْتَغْفِرٍ لِيْ فَأَغْفِرَلَهُ ، أَلَا مُسْتَرْزِقٌ فَأَرْزُقَهُ ، أَلَا مُبْتَلىً فَأُعَافِيَهِ أَلَا كَذَا أَلَا كَذَا؟ حَتَّى يَطْلَعَ الْفَجْرِ))

''جب نصف شعبان کی رات آئے تو اس کی رات میں قیام کرو (نمازیں پڑھو) اور اس کے دن میں روزہ رکھو، کیونکہ اللہ اس میں غروب شمس سے آسمانِ دُنیا پر نزول فرماتا ہے اور کہتا ہے:

کیا کوئی مجھ سے مغفرت کا طالب ہے کہ میں اس کی مغفرت کروں، کیا کوئی روز کا طالب ہے کہ میں اس کو روں، کیا ہے کوئی بیمار اور مصیبت زدہ کہ میں اس کو صحت و عافیت سے ہمکنار کروں، کیا کوئی ایسا ہے کوئی ایسا ہے؟ یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج امام ابن ماجہ نے اپنی ''سنن : ۱/۴۲۱ '' میں اور انہی کے طریقے سے امام ابن الجوزی نے ''العلل المتناهية: ۲/ ۵۶۱ '' میں اور امام البیہقی نے ''شعب الایمان : ۳/ ۳۷۸، ۳۷۹'' میں اور ''فضائل الاوقات ، ص : ۲۴ '' میں اس سند سے کی ہے:

''ابن ابی سبرہ ابراہیم بن محمد سے روایت کرتا ہے، وہ معاویہ بن عبداللہ ابن جعفر سے وہ اپنے باپ سے اور وہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے......''

اس سند کے ضعیف ہونے پر ائمہ حدیث کا اتفاق ہے۔ کیونکہ ائمہ حدیث نے ابن ابی سبرہ پر ''وضع حدیث'' کا الزام لگایا ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے ''تقریب التهذيب '' میں صراحت کی ہے اور البوصیری نے ''الزوائد '' میں لکھا ہے:

''اس کی سند ابن ابی سبرہ کے ضعیف ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے، اس کا نام ابوبکر بن عبداللہ بن محمد بن ابی سبرہ ہے۔ امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ حدیث وضع کیا کرتا تھا۔''

اور ابن رجب نے ''لطائف المعارف، ص: ۱۴۳'' میں لکھا ہے:

''اس کی سند ضعیف ہے۔'' حافظ المنذری نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔''

[الضعيفه : ٥/ ١٥٤]

۷۲...... ((رَوَى الْبَيْهَقِي مِنْ حَدِيْثِ عَائِشَةَ ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قال : أَتَانِيْ جِبْرَائِيْل عَلَيْهِ السَّلَام ، فَقَالَ: هٰذِهِ لَيْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شُعْبَانَ ، وَلِلّٰهِ فِيْهَا عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ بِعَدَدِ شُعُوْرِ غَنَمِ بَنِيْ كَلْبٍ ، لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ فِيْهَا إِلٰى مُشْرِكٍ وَلَا إِلٰى مُشَاحِنٍ ، وَلَا إِلٰى قَاطِعِ رَحِمٍ ، وَلَا إِلَى مُسْبِلٍ ، وَلَا إِلَى عَاقٍ لِوَالِدَيْهِ وَلَا إِلٰى مُدْمِنِ خَمْرٍ)) [الترغيب والترهيب: حديث: ٦٢٠]

''میرے پاس جبرائیل علیہ السلام آئے اور کہا: یہ نصف شعبان کی رات ہے اور اس میں اللہ کے ایسے بندے ہیں جو عذاب دوزخ سے آزادی حاصل کرنے والے ہیں اور جن کی تعداد قبیلہ

بنی کلب کی بکریوں کے بالوں کے برابر ہے، اس رات میں اللہ کسی مشرک، کسی بغض رکھنے والے، قطع رحمی کرنے والے، ٹخنے سے نیچے تک ازار بند لٹکانے والے (مغرور) والدین کی نافرمانی کرنے والے اور شراب نوشی کے عادی کی طرف نظر التفات نہیں فرماتا۔''

یہ بے حد ضعیف اور کمزور روایت ہے۔ اس کی سدن میں دو راوی: محمد بن عیسیٰ بن حیان المدائنی اور سلام بن سلیمان الطّویل متروک ہیں۔ [شعب الایمان للبیهقی : ۳/۳۸۳، ۳۸۵]

۷۳...... ((حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ مَنِيْعٍ ، حَدَّثَنَا يَزِيْدُ بْنُ هَارُوْنَ : أَخْبَرَنَا الْحَجَّاجُ بْنُ أَرْوَ عَنْ يَحْيىٰ بنِ أَبِيْ كَثِيْرٍ ، عَنْ عُرْوَةَ ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ:

فَقَدْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَيْلَةً ، فَخَرَجْتُ ، فَإِذَا هُوَ بِالْبَقِيْعِ ، فَقَالَ ، أَكُنْتِ تَخَافِيْنَ أَنْ يَحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْكِ وَرَسُوْلُهُ ، قُلْتُ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنِّيْ ظَنَنْتُ أَنَّكَ أَتَيْتَ بَعْضَ نِسَائِكَ ، فَقَالَ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَنْزِلُ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا ، فَيَغْفِرُ لِأَكْثَرَ مِنْ عَدَدِ شَعْرِ غَنَمِ كَلْبٍ))

[الترمذی، حدیث: ۷۳۹۔ ابن ماجه، حدیث: ۱۳۸۹]

''ہم سے احمد بن منیع نے بیان کیا، کہا: ہم سے یزید بن ہارون نے بیان کیا، کہا: ہم کو الحجاج بن ارطاء نے، یحییٰ بن اَبی کثیر سے، انہوں نے عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہوئے خبر دی، کہا:

ایک رات میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں پایا، اور میں نکل پڑی، تو دیکھا کہ آپ ''بقیع'' میں ہیں۔ آپ نے فرمایا: کیا تمہیں یہ اندیشہ تھا کہ اللہ اور اس کے رسول تم پر ظلم کریں گے؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے خیال ہوا کہ آپ اپنی بیویوں میں کسی کے پاس تشریف لے گئے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: بے شک اللہ عزوجل نصف شعبان کی رات آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے اور قبیلۂ کلب کی بکریوں کے بالوں سے زیادہ لوگوں کی بخشش فرماتا ہے۔''

یہ حدیث ضعیف ہے۔ امام ابوعیسیٰ ترمذی فرماتے ہیں:

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کو ہم صرف اسی سند سے، الحجاج بن ارطاۃ کی سند سے جانتے ہیں اور میں نے ''محمد'' (امام بخاری) کو اس حدیث کی تضعیف کرتے ہوئے سُنا ہے۔ انہوں نے کہا: یحییٰ بن ابی کثیر نے عروہ سے حدیث نہیں سُنی ہے اور الحجاج بن ارطاۃ کا سماع بھی

یحییٰ بن ابی کثیر سے ثابت نہیں ہے۔''

کیا اس کے بعد یہ کہنا صحیح ہے کہ اس حدیث میں معمولی سا ضعف ہے جیسا کہ ضعیف اور نا قابلِ اعتبار حدیثوں کی ترویج کرنے والے دعویٰ کرتے ہیں:

۷۴ ...... ((عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَتَدْرِيْنَ أَيَّ لَيْلَةٍ هٰذِهِ؟ قُلْتُ: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ، قَالَ:

هٰذِهِ لَيْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ، إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَطَّلِعُ عَلٰى عِبَادِهٖ فِيْ لَيْلَةِ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ، فَيَغْفِرُ لِمُسْتَغْفِرِيْنَ وَيَرْحَمُ الْمُسْتَرْحِمِيْنَ وَيُؤَخِّرُ اَهْلَ الْحِقْدِ كَما هُمْ)) [الترغيب والترهيب، حديث: ٦٢٢]

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ کونسی رات ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ معلوم ہے، فرمایا:
یہ نصف شعبان کی رات ہے۔ اللہ عزوجل نصف شعبان کی رات اپنے بندوں پر مطلع ہوتا ہے اور استغفار کرنے والوں کی مغفرت فرماتا ہے اور رحم کے طالبوں پر رحم فرماتا ہے اور کینہ وروں کو ان کے حال پر رہنے دیتا ہے۔''

حافظ المنذری کہتے ہیں:

''اس کی روایت البیہقی نے العلاء بن الحارث کی سند سے کی ہے اور لکھا ہے ''یہ جید مرسل'' ہے اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ العلاء نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث نہیں سُنی ہے۔''

حافظ المنذری نے یہی حدیث ''کتاب الادب / باب الترهيب من التهاجر '' میں اس سند سے روایت کی ہے:

((عن العلاء بن الحارث، أن عائشة رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قالت))

''العلاء بن الحارث سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے............''

جس کا مطلب یہ ہے کہ العلاء نے حضرت عائشہ سے ارسال کیا ہے۔

جبکہ ''باب الترغیب فی صوم شعبان'' میں ان کے الفاظ ((عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالت)) اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ جس راوی کے نام کی صراحت نہیں ہے اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث روایت کی ہے یعنی یہ مسند ہے مرسل نہیں ہے۔

دوم یہ کہ امام البیہقی کا یہ قول کہ ''یہ جید مرسل'' ہے صحیح نہیں ہے کیونکہ العلاء بن الحارث پر جہاں ''قدریت''

کا الزام تھا، وہیں ان کا ذہنی توازن بھی صحیح نہیں تھا جیسا کہ حافظ ابن حجر نے ''تقریب التہذیب'' میں لکھا ہے:

''قدریہ'' وہ فرقہ ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ بندہ اپنے ارادہ وقدرت میں آزاد اور اس کے فعل میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کا کوئی دخل نہیں ہے۔''

خلاصۂ کلام یہ کہ اس حدیث میں دو علتیں جمع ہوگئی ہیں:

۱. یہ مرسل ہے جو ضعیف کی ایک قسم ہے۔

۲. اس کا راوی العلاء بن الحارث ذہنی توازن کے فقدان کی وجہ سے نا قابلِ اعتبار ہے۔

متعدد صحیح احادیث میں جو صحیحین اور سنن میں مروی ہیں یہ صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ شعبان میں بکثرت روزہ رکھتے تھے بلکہ معدودے چند ایام کو چھوڑ کر بقیہ تمام ایام میں روزہ رکھتے تھے، لیکن کسی صحیح اور قابلِ اعتبار حدیث میں مخصوص طور پر ۱۵ شعبان کے دن میں روزہ رکھنے اور اس کی رات میں نمازیں پڑھنے یا کسی اور عبادت کی غرض سے شب بیداری کرنے کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور اگرچہ محدث علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے ۱۵ شعبان کی رات کی فضیلت سے متعلق درج ذیل حدیث کو اس کے متعدد طرق کی بنیاد پر صحیح قرار دیا ہے جس کے الفاظ ہیں:

((يَطَّلِعُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى إِلَى خَلْقِهِ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ ، فَيَغْفِرُ لِجَمِيعِ خَلْقِهِ ، إِلَّا لِمُشْرِكٍ أَوْ مُشَاحِنٍ)) [الصحيحة:١١٤٤]

''اللہ تبارک وتعالیٰ نصف شعبان کی رات میں اپنی مخلوق پر مطلع ہوتا ہے اور سوائے مشرک اور عداوت رکھنے والے کے، اپنی تمام مخلوق کو بخش دیتا ہے۔''

تو پہلی بات تو یہ ہے کہ اس حدیث میں کسی عبادت کا ذکر نہیں ہے اور عبادت ایک ایسا فعل ہے جس کی شکل، وقت اور ثواب کا تعین کرنے کے لیے نص صریح درکار ہے۔

دوم یہ کہ اس حدیث کی صحت ائمہ حدیث کے نزدیک مختلف فیہ ہے اس لیے کسی مخصوص عبادت کی مشروعیت کی دلیل نہیں بن سکتی۔

سوم یہ کہ اس مختلف فیہ حدیث کا متن ۱۵ شعبان کی رات کے فضائل سے متعلق موضوع اور منکر احادیث کے متن سے بھی زیادہ مبالغہ آمیز ہے۔

الشیخ علی محفوظ رحمہ اللہ اپنی مشہور کتاب "الابداع فی مضار الابتداع" میں لکھتے ہیں:

''۱۵ شعبان کی رات کے فضائل سے متعلق جتنی احادیث مروی ہیں ان میں سے کوئی بھی

حدیث صحیح نہیں ہے بلکہ وہ یا تو موضوع ہیں یا ضعیف۔ چنانچہ ابوشاد الشافعی نے قاضی ابوبکر بن العربی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''نصف شعبان کی رات کے بارے میں کوئی بھی حدیث قابل اعتماد نہیں ہے۔ چاہے اس رات کی فضیلت کے بارے میں یا اامر کے بارے میں کہ اس رات میں ہر انسان کی موت لکھی جاتی ہے، لہٰذا ان حدیثوں کی طرف کوئی توجہ نہ دو۔''

رہی اس رات میں مخصوص نماز جو بعض لوگ پڑھتے ہیں تو اس سے متعلق حدیث کا ذکر صرف ''احیاء العلام'' اور ''قوت القلوب'' میں آیا ہے اور حفاظ حدیث کی ایک جماعت اس کو موضوع قرار دے چکی ہے۔

حافظ شمس الدین محمد بن الجزری نے "الحصن الحصین" میں لکھا ہے:

''رجب کی پہلی جمعرات میں ''صلاۃ الرغائب'' نصف شعبان کی رات کی نماز اور رمضان کی لیلۃ القدر میں نماز سے متعلق احادیث صحیح نہیں ہیں، بلکہ ان کی سندیں مرفوع اور باطل ہیں۔''

حافظ زین الدین العراقی فرماتے ہیں:

''نصف شعبان کی رات میں نماز کی حدیث رسول اللہ ﷺ کے نام پر موضوع اور جھوٹ ہے۔''

امام نووی نے کتاب ''المجموع'' میں لکھا ہے:

''صلاۃ الرغائب'' کے نام سے معروف نماز جس کی ۱۲ رکعتیں ہیں اور جو ''رجب'' کے پہلے جمعہ کی رات میں مغرب اور عشاء کے درمیان ادا کی جاتی ہے اور نصف شعبان کی رات میں سو (۱۰۰) رکعتوں پر مشتمل جو نماز ادا کی جاتی ہے، یہ دونوں نمازیں منکر بدعتیں ہیں۔ ''قوت القلوب'' اور ''احیاء العلوم'' میں ان نمازوں کے ذکر اور ان کے بارے میں مروی حدیث سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے کیونکہ یہ سب باطل ہیں، اس طرح اُن بعض ائمہ حدیث کے قول سے بھی دھوکا نہیں کھانا چاہیے جن پر ان نمازوں کا معاملہ مشتبہ ہو گیا اور انہوں نے ان کے مستحب ہونے پر کتابچے لکھ ڈالے۔''

امام الطرطوشی نے نصف شعبان کی رات میں نماز کے آغاز کا واقعہ امام ابومحمد عبدالرحمٰن بن اسماعیل المقدسی سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے:

''ہمارے یہاں بیت المقدس میں ''صلاۃ الرغائب'' کے نام کی یہ نماز جو رجب میں پڑھی جاتی ہے، اسی طرح نصف شعبان کی رات کی نماز کا کوئی وجود نہیں تھا، اور نصف شعبان کی رات میں پڑھی جانے والی نماز ہمارے یہاں ۴۴۸ ہجری میں اس طرح شروع ہوئی کہ نابلس سے ہمارے یہاں

بیت المقدس میں ''ابن ابی الحمراء'' نام کا ایک شخص آیا۔ وہ شخص ''حسن تلاوت'' کا مالک تھا اور اس نے نصف شعبان کی رات مسجد اقصیٰ میں نماز شروع کر دی۔ پھر ایک اور آدمی تکبیر تحریمہ کر کے اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا، پھر تیسرا اور چوتھا اس طرح جب اس نے نماز ختم کی تو اس کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کی ایک اچھی خاصی جماعت بن چکی تھی، پھر وہی شخص آئندہ سال بھی بیت المقدس آیا اور اس کی امامت میں ایک بڑی خلقت نے یہ نماز ادا کی، اس طرح یہ نماز لوگوں میں مشہور ہو گئی اور وہ مسجد اقصیٰ اور دوسروں مسجدوں نیز گھروں میں ادا کی جانے لگی اور اس دن سے آج تک اس کا سلسلہ جاری ہے اور لوگ اس کو اس طرح ادا کر رہے ہیں گویا وہ کوئی سنت نماز ہو۔''

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس نماز کو مکروہ بتایا ہے اور لکھا ہے:

''یہ نماز نہ تو نبی ﷺ نے پڑھی ہے، نہ صحابہ کرام نے، نہ تابعین نے آئمہ المسلمین میں سے کسی امام نے اور نہ کسی نے اس کی ترغیب ہی دلائی ہے چاہے وہ نبی ﷺ ہوں یا سلف صالحین اور ائمہ المسلمین میں سے کوئی ہوں، اس نماز کی فضیلت بھی اسلاف میں سے کسی نے نہیں بیان کی ہے رہی اس کے بارے میں مروی حدیث تو وہ علم حدیث سے واقفیت رکھنے والوں کے نزدیک بالاتفاق جھوٹی اور موضوع ہے۔'' [ص: ۲۸۷، ۲۸۸]

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ ''صلاۃ الرغائب'' یا ۱۵ شعبان کی رات میں نماز یا کوئی اور عبادت کتاب وسنت سے کوئی قابلِ اعتماد دلیل نہیں رکھتی بلکہ ان کی بنیاد موضوع، منکر اور ضعیف حدیثیں ہیں جو کسی عبادت کی صحت کی دلیل نہیں بن سکتیں اور اس باب میں اُمت کے کسی فرد یا افراد کا عمل ہمارے لیے حجت نہیں ہے، اور جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ''جب اُمت کسی ضعیف حدیث کو قبول کر لیتی ہے تو صحیح قول کے مطابق اس ضعیف حدیث پر عمل کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ عملی ''متواتر'' کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اور اس سے قطعی حکم کو بھی منسوخ کیا جا سکتا ہے۔'' [فتح المغیث: ۱۲۰، بحوالہ ماہنامہ ''زندگی نو'' شمارہ نومبر ۲۰۰۰ء]

تو یہ دعویٰ بڑا سنگین اور دین کی بنیادیں منہدم کر دینے کی ناکام کوشش کے مترادف ہے اور اس کی بنیاد پر وہ تمام عبادات اور وہ تمام اعمال غیر مشروع قرار پاتے ہیں جو قطعی الثبوت مصوص سے ثابت ہیں اور ان کے بالمقابل وہ عبادتیں، وہ اذکار و اوراد اور وہ اعمال مشروع ہو جاتے ہیں جن کو اُمت کی ایک بہت بڑی تعداد نے موضوع، منکر اور ضعیف حدیثوں کی بنیاد پر اپنا رکھا ہے اور جن کے فضائل سے صوفیا کی کتابیں بھری پڑی ہیں؟؟

باب پنجم

سیرت پاک اور شمائل مطہرہ

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں متعدد مقامات پر "النور" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ مثلاً سورۃ المائدہ میں ارشاد ہے:

﴿ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۚ قَدْ جَاءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾

"اے اہل کتاب! ہمارے رسول تمہارے پاس آ گیا ہے جو اللہ کی کتاب کی بہت سی اُن باتوں کو تمہارے لیے بیان کر رہا ہے جن کو تم چھپاتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر کر جاتا ہے، تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن اور ایک بیان کرنے والی کتاب آ گئی ہے۔"

اس آیت مبارک میں مذکور لفظ "نور" کے بارے میں مفسرین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس سے مراد قرآن ہی ہے اور نور اور کتاب مبین، دونوں ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ اور عربی زبان میں حرف عطف "وَ" کے ذریعہ مترادفات کو جمع کرنے کا اسلوب عام ہے اور خود قرآن پاک میں اس کی مثالیں موجود ہیں مثلاً سورۂ یوسف میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ قَالَ اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿86﴾ ﴾

[الآیہ: ۸۶]

"(یعقوب نے) کہا: میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد صرف اللہ سے کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے مجھے جو علم حاصل ہے وہ تمہیں حاصل نہیں ہے۔"

اس آیت مبارکہ میں بَثّی اور حُزنی کو ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ایک دوسرے کے "مغایر" کے طور پر نہیں۔

اس کے علاوہ قرآن پاک ہی میں لفظ "نور" سے بصراحت قرآنِ پاک کو مراد لیا گیا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہے:

﴿ ..... فَالَّذِيْنَ آمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿157﴾ ﴾ [الآية: ١٥٧]

''پس جو لوگ اس پر ایمان لائے، اور اس کی حمایت و نصرت کی اور اُس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

اسی طرح سورۃ النساء میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿174﴾ ﴾ [الآية: ١٧٤]

''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل و برہان آ گئی ہے اور ہم نے تمہارے پاس کھول کھول کر بیان کر دینے والی روشنی نازل کر دی ہے۔''

اس ایت میں برہان اور نور مبین سے یقینی طور پر قرآن پاک مراد ہے۔ اس آیت کے مخاطب کفار ہیں۔ اور ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ نے تمہارے پاس توحید کے ثبوت کے لیے دلیل و برہان بھیج دی ہے اور اپنے نبی کے ساتھ ایسی کتاب نازل فرما دی ہے جو حق کو کھول کھول کر بیان کر دینے والی روشنی ہے۔

مذکورہ آیات کے علاوہ قرآن پاک میں مزید ایسی آیتیں ہیں جن میں قرآن پاک کو ''نور'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اور صرف قرآنِ پاک ہی نہیں، بلکہ سابقہ آسمانی کتابوں کو بھی ''نور'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب ''تورات'' کو ''نور'' کہا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾

[الآية: ٩١]

''اے نبی! ان سے پوچھو وہ کون ہے جس نے وہ کتاب نازل فرمائی ہے جسے موسیٰ لے کر آیا تھا، جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت ہے۔''

یہ تمام آیتیں اس امر پر دلالت کر رہی ہیں کہ سورۃ المائدہ آیت ۱۵ میں مذکور لفظ ''نور'' سے مراد قرآنِ پاک ہی ہے۔

اور مفسرین کے جس گروہ نے مذکورہ آیت میں لفظ ''نور'' سے نبی اکرم ﷺ کو مراد لیا ہے، ان کی

دلیل سورۃ الاحزاب کی وہ آیت ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کو ''روشن چراغ'' قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا ﴿45﴾ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ﴿46﴾ ﴾ [الاية: ٤٥، ٤٦]

''اے نبی! ہم نے تمہیں گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، اور اللہ کے اذن سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔''

تو مفسرین کے اس گروہ کی بات بھی اس اعتبار سے صحیح ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارک ایک ایسی روشنی تھی جس کے ذریعہ ''حق'' کو روزِ روشن کی طرح دیکھا جا سکتا تھا اور آپ نے اپنے پیچھے قول وعمل کے جو نمونے چھوڑے ہیں وہ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

لیکن اس نور سے وہ ''نور'' قطعاً مراد نہیں ہے جو ''بشریتِ رسول'' کے منکرین لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ رسالت کے منافی ہے۔ رسالت اور بشریت لازم وملزوم ہیں، اسی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر محمد ﷺ تک تمام انبیاء اور رسول بشر تھے۔ اور ان کا بشر ہونا ضروری بھی تھا۔ اس لیے کہ ان کی بعثت بشر کی ہدایت کے لیے ہوئی تھی، اس حقیقت کو قرآنِ پاک کی اس آیت میں نہایت واشگاف الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے:

﴿ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا ﴿95﴾ ﴾ [الاسراء: ٩٥]

''اے نبی! (اپنی بشریت پر اعتراض کرنے والوں سے) کہہ دو: اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو یقیناً ہم آسمان سے ان کے لیے کسی فرشتے ہی کو رسول بنا کر نازل کرتے۔''

قرآن وحدیث میں ''بشریت رسول'' کے دلائل اتنی کثرت سے دیئے گئے ہیں کہ اگر ان کو سامنے رکھ کر اس مسئلے پر بحث کی جائے تو پوری ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہماری اس کتاب کا موضوع یہ نہیں ہے۔ ہم نے تو یہ لمبی تمہید اس زبان زد، جھوٹی اور بے بنیاد روایت کی نکارت کو واضح کرنے کی غرض سے باندھی ہے، جو بعض کتابوں میں ان الفاظ میں ملتی ہے:

۱۱۹ ...... ((عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! بِأَبِي أَنْتَ

وَأُمِّيْ أَخْبِرْنِيْ عَنْ أَوَّلِ شَيْءٍ خَلَقَهُ اللّٰهُ تَعَالَى قَبْلَ الْأَشْيَاءِ ، قَالَ: يَا جَابِرُ! إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ قَبْلَ الْأَشْيَاءِ نُورَ نَبِيِّكَ مِنْ نُورِهِ ، فَجَعَلَ ذٰلِكَ النُّورَ يَدُورُ بِالْقُدْرَةِ حَيْثُ شَاءَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ فِيْ ذٰلِكَ الْوَقْتِ لَوْحٌ وَلَا قَلَمٌ وَلَا جَنَّةٌ وَلَا نَارٌ وَلَا مَلَكٌ وَلَا سَمَاءٌ وَلَا أَرْضٌ وَلَا شَمْسٌ وَلَا قَمَرٌ وَلَا جِنِّيٌّ وَلَا إِنْسِيٌّ))

''جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہا: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں: اس پہلی چیز کے بارے میں مجھے بتایئے جس کو اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے قبل پیدا کیا۔ فرمایا: اے جابر! بیشک اللہ نے تمام چیزوں سے پہلے تیرے نبی کے نور کو اپنے نور سے پیدا کیا۔ اور اس نور کو ایسا بنا دیا کہ وہ اپنی قدرت و طاقت سے جہاں اللہ چاہے چکر لگائے اور اس وقت نہ لوح محفوظ تھا، نہ قلم، نہ جنت تھی اور نہ جہنم، نہ فرشتہ تھا اور نہ آسمان اور نہ زمین اور نہ سورج تھا اور نہ چاند اور نہ جن تھا اور نہ انسان۔''

یہ ایک باطل اور بے بنیاد روایت ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ اگر چہ اس کو اتنی شہرت حاصل ہے کہ امت کے ایک بہت بڑے طبقہ میں اس باطل روایت کی بنیاد پر نور محمدی نے ایک عقیدے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ قدیم ائمہ حدیث اور متاخرین علمائے حدیث کی کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں۔ حتی کہ وہ کتابیں جو علمائے حدیث نے خاص موضوع اور منکر روایات کے موضوع پر لکھی ہیں، ان میں بھی یہ روایت نہیں ملتی، صرف علامہ ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی نے '' **الآثار المرفوعة في الاخبار الموضوعة** ..... '' میں اور شیخ اسماعیل بن محمد العجلونی نے '' **كشف الخفاء وَ مزيل الإلباس عما اشتهر من الأحاديث على السنة الناس ، ص: ٢٦٥، ج: ١، حديث: ٨٢٧** '' میں عبدالرزاق بن عمر الدمشقی کی سند سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اور حافظ ابن حجر نے اس عبدالرزاق کو '' **تقريب التهذيب، ص: ٢٩٦، ترجمه: ٤٠٦٢** '' میں متروک لکھا ہے۔

پھر اس باطل روایت کا متن منکر بھی ہے، کیونکہ یہ اس صحیح حدیث کے خلاف ہے جو یہ صراحت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز سب سے پہلے پیدا کی وہ قلم ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

((إِنَّ أَوَّلَ شَيْءٍ خَلَقَهُ اللّٰهُ تَعَالَى الْقَلَمَ وَأَمَرَهُ أَنْ يَكْتُبَ كُلَّ شَيْءٍ يَكُونُ))

''بیشک وہ پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ''قلم'' ہے اور اس کو حکم دیا کہ وہ ہر ہونے والی چیز کو لکھے۔''

اس کی روایت ابن ابی عاصم نے " السنة: ۱۰۸ " اور " الاوائل: ۳ " میں ابویعلی نے " المسند: ۱/۱۲۶ " میں اور البیھقی نے " السنن الکبریٰ: ۹/۳ " اور " الاسماء و الصفات، ص: ۲۷۱ " میں اس سند سے کی ہے:

((قَالَ احْمَدُ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الْمُبَارَكِ، قَالَ: حَدَّثَنَا رِبَاحُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ حَبِيْبٍ عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ اَبِيْ بَزَّةَ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَرْفُوْعًا))

''ہم سے عبداللہ بن المبارک نے بیان کیا، کہا: ہم سے رباح بن زید نے عمر بن حبیب سے، انہوں نے القاسم بن ابی بزہ سے، انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

یہ سند صحیح ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

اور ایک دوسری صحیح حدیث میں جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''نور'' سے فرشتوں کی تخلیق ہوتی ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

((حَدَّثَنِيْ مُحَمَّدُ بْنُ رَافِعٍ وَعَبْدُ بْنُ حُمَيْدٍ۔ قَالَ عَبْدٌ: اَخْبَرَنَا ، وَقَالَ ابْنُ رَافِعٍ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ: اَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ ، عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " خُلِقَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ نُوْرٍ ، وَخُلِقَ الْجَانُّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ ، وَخُلِقَ آدَمُ مِمَّا وُصِفَ لَكُمْ۔"))

''مجھ سے محمد بن رافع اور عبد بن حمید نے بیان کیا عبد نے کہا: ہم کو خبر دی اور ابن رافع نے کہا: ہم سے عبدالرزاق نے بیان کیا، کہا: ہم کو معمر نے الزہری سے، انہوں نے عروہ سے اور انہوں عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہوئے خبر دی کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''ملائکہ نور سے پیدا کئے گئے، اور جن آگ کی لپٹ سے اور آدم کی تخلیق اس مادے سے ہوئی جو تم سے بیان کیا جا چکا ہے۔''

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ''نورِ محمدی'' والی روایت باطل اور ان لوگوں کی پھیلائی ہوئی ہے جو'' بشریت رسول'' کے عقیدے کے منکر ہیں۔

اس سلسلۂ کلام کے ضمن میں اس حقیقت کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ کسی مخلوق کی فضیلت

اس کے مادۂ تخلیق میں مضمر نہیں ہے نہ ''مادہ'' کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے اور اس مخلوق کا بھی جو اس مادے سے پیدا کی گئی ہے۔ چاہے وہ انسان ہو، جن ہو یا فرشتہ۔ کوئی بھی مادۂ تخلیق فی نفسہ نہ تو اچھا ہے اور نہ برا، نہ افضل ہے اور نہ غیر افضل، انسان، جن اور فرشتہ ان تینوں مخلوقات میں فرق مراتب ان کی صفات اور ان کے کردار کی بنیاد پر ہے۔ فرشتے ''نور'' سے پیدا کیے گئے ہیں اس کے باوجود وہ انسانوں سے افضل نہیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض فرشتے بعض انسانوں سے افضل ہیں، لیکن عمومی طور پر اور علی الاطلاق آدم اور ان کی اولاد فرشتوں سے افضل ہیں۔ اس لیے کہ وہ اس زمین پر اللہ کے خلیفہ ہیں۔ وہ مجبور محض نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت نہ کر سکیں، بلکہ ان کو اس بات کی پوری آزادی بخشی گئی ہے کہ وہ چاہیں تو حق کی راہ پر چلیں اور چاہیں تو شر کی راہ پر، فرشتوں کو یہ آزادی حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار بندہ فرشتوں سے افضل ہے کہ دنیا کی تمام تر ترغیبات اور شیطان کے مسلسل بہکاوؤں کے باوجود راہِ حق پر گامزن رہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

نبی اکرم ﷺ کی ''بشریت'' کا عقیدہ آپ کی رسالت کے عقیدہ کا ایک حصہ ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

﴿ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿94﴾ ﴾ [الاسراء: ۹۴]

''اے نبی! کہہ دو: پاک ہے میرا رب، کیا میں ایک انسان رسول کے سوا اور بھی کچھ ہوں۔''

اور:

((إِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ ......)) [1]

''میں بشر ہی ہوں۔''

مگر آپ کی یہ بشریت آپ کی عظمت کی دلیل ہے کہ اس بشریت کے باوجود آپ اپنے اعلیٰ اخلاق، اپنے بے مثال کردار، اپنی سیرت کی بے نظیر پاکیزگی اور اپنی طہارت قلب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے سب سے محبوب بندے، افضل الخلائق اور سید البشر قرار پائے اور خود آپ کے خالق و رب نے آپ کو یہ سند عطا کر دی کہ:

﴿ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿4﴾ ﴾ [القلم: ٤]

''اے نبی! بیشک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر فائز ہو۔''

[1] مسلم: ٤٤٧٥

درحقیت کسی مادۂ تخلیق کا کسی دوسرے مادۂ تخلیق سے افضل ہونے کا فلسفہ یا عقیدہ ابلیسی فلسفہ یا عقیدہ ہے۔

﴿ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿12﴾ ﴾ [الاعراف: ۱۲]

''ابلیس نے کہا: میں اس بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو (آدم کو) مٹی سے پیدا کیا۔''

اور جو لوگ بشریت رسول کے انکار اور ''نور محمدی'' کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ دراصل اس ابلیسی عقیدہ کو زندہ کر رہے ہیں اور اپنے زعم باطل میں وہ نبی اکرم ﷺ سے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار کر رہے ہیں ان کو شاید یہ معلوم نہیں کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے اس عظیم مقام ومرتبے کو گھٹا رہے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا ہے۔ اسی طرح ''نور محمدی'' کا عقیدہ اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ اس کو ماننے والے اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور ربوبیت میں نبی اکرم ﷺ کو کسی نہ کسی شکل میں شریک تصور کرتے ہیں اسی مقصد کے لیے انہوں نے ''بشریت رسول'' سے انکار کیا ہے۔

۱۲۰ ...... ((لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ))

''اگر تم نہ ہوتے تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا۔''

یہ حدیث موضوع اور من گھڑت ہے جیسا کہ حسن بن محمد رضی الدین الصنعانی نے " الأحاديث الموضوعه ص: ۷ " میں صراحت کی ہے۔ رہا ملا علی القاریؒ کا قول " الاسرار المرفوعة، ص: ۶۷، ۶۸" کہ یہ حدیث معناً صحیح ہے۔ چنانچہ الدیلمی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے:

((اَتَانِيْ جِبْرِيْلُ فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ! لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْجَنَّةَ ، وَلَوْلَاكَ مَا خَلَقْتُ النَّارَ ، وَفِيْ رِوَايَةِ ابْنِ عَسَاكِرَ: لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الدُّنْيَا))

''میرے پاس جبریل آئے اور کہا: اے محمد! اگر تم نہ ہوتے تو میں جنت کو نہ پیدا کرتا اور اگر تم نہ ہوتے تو میں جہنم کو نہ پیدا کرتا۔ اور ابن عساکر کی روایت میں ہے: اگر تم نہ ہوتے تو میں دنیا کو نہ پیدا کرتا۔''

تو اس کے معنی کی صحت کا اعلان اس وقت تک صحیح نہیں ہے، جب تک کہ الدیلمی سے اس کی روایت ثابت نہ ہو جائے اور میں نے کسی بھی ایسے شخص کو نہیں دیکھا ہے جس نے اس کے بیان سے تعرض کیا ہو اور میں اگرچہ اس حدیث کی سند سے واقف نہیں تھا، پھر بھی مجھے اس کے ضعیف ہونے میں کوئی تردد نہیں ہوا،

جس کی دلیل کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اس کی روایت میں الدیلمی منفرد ہیں۔

پھر جب مجھے " مسند الفردوس: ۱/ ۱۴۱ " میں اس کی سند معلوم ہوگئی تو مجھے اس کے ضعیف ہونے بلکہ بیحد ضعیف اور نا قابل اعتبار ہونے کا یقین ہوگیا۔ اور اس موضوع حدیث کی سند یہ ہے:

((عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ مُوسَى الْقُرَشِي: حَدَّثَنَا الْفُضَيلُ بْنُ جَعْفَرِ بْنِ سُلَيْمَانَ عَنْ عَبْدِ الصَّمَدِ بْنِ عَلِي بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ عَنْ أَبِيهِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ بِهِ))

"عبیداللہ بن موسیٰ القرشی سے روایت ہے، کہا: ہم سے الفضیل بن جعفر بن سلیمان نے عبدالصمد بن علی بن عبداللہ بن عباس سے روایت کرتے ہوئے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔"

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کی آفت یہی عبدالصمد ہے، العقیلی نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ اس کی روایت کردہ احادیث "غیر محفوظ" ہیں اور اس کی شہرت صرف اسی حدیث کی روایت سے ہے۔

اور اس سے نیچے کے دونوں راوی میرے نزدیک غیر معروف ہیں۔

رہی ابن عساکر کی روایت تو اس کی تخریج ابن الجوزی نے " الموضوعات : ۱/ ۲۸۸، ۲۸۹" میں کی ہے اور لکھا ہے کہ: "یہ موضوع ہے" [الضعيفة: ١/ ٤٥٠، ٤٥١]

حافظ جلال الدین السیوطی جو تضعیف حدیث میں سہل انگاری سے کام لینے میں مشہور ہیں۔ اور "صوفی المشرب" ہونے کی وجہ سے سیرت اور مناقب وغیرہ سے متعلق موضوع احادیث کو بڑی مشکل سے "موضوع" تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی " اللآلي المصنوعة: ۱/ ۲۶۹ " میں اس زیر بحث حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ ملا علی القاریؒ جیسا فقیہہ اور محدث اس موضوع حدیث کو معناً کس طرح صحیح قرار دے بیٹھا جبکہ اس حدیث کا متن اس کی سند سے زیادہ نکارت آمیز ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں جن دو باتوں کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ دونوں غلط اور بے بنیاد ہیں۔

۱ پہلی جو بات اس موضوع حدیث سے متبادر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق تمام مخلوقات سے قبل ہو چکی تھی، جو صحیح نہیں ہے جیسا کہ "نور محمدی" والی حدیث کی بحث کے ضمن میں واضح کیا جا چکا ہے کہ *صحیح حدیث سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا ہے۔*

۲ اس موضوع حدیث میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ پوری کائنات اور جن وانس کو نبی اکرم

ﷺ کی خاطر پیدا کیا ہے، جبکہ قرآن یہ صراحت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ''جن وانس'' کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

﴿ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾ ﴾ [الذاریات: ٥٦]

''میں نے جن اور انس کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ وہ میری عبادت کریں۔''

اور قرآن میں جہاں بھی تخلیق آدم کا قصہ بیان ہوا ہے ہر جگہ اندازِ بیان ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے صاف یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وہی پہلے انسان ہیں اور سورۃ البقرہ آیت نمبر: ۳۰ میں فرشتوں کی طرف سے یہ استفہام:

﴿ أَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَاءَ ﴾ [البقرۃ: ۳۰]

''کیا آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کرنے والے ہیں جو فساد برپا کرے گی اور خون ریزی مچائے گی۔''

اس بات پر بصراحت دلالت کر رہا ہے کہ ابھی کسی بشر کی تخلیق نہیں ہوئی ہے، ورنہ فرشتے ایسا سوال نہ کرتے۔

۱۲۱ ...... ((كُنْتُ نَبِیًّا وَآدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ))

''میں اس وقت نبی تھا جب آدم ابھی پانی اور مٹی کے ''گارے'' کے درمیان تھے۔''

۱۲۲ ...... ((كُنْتُ نَبِیًّا وَلَا آدَمَ وَلَا مَاءَ وَلَا طِیْنَ))

''میں اس وقت نبی تھا جب نہ آدم تھے، نہ پانی تھا اور نہ گارا تھا۔''

یہ دونوں حدیثیں موضوع ہیں، ان کا ذکر حافظ السیوطی نے ''ذیل الاحادیث الموضوعه، ص: ۲۰۳'' میں امام ابن تیمیہ کے حوالہ سے کیا ہے اور ان کے موضوع ہونے کے بارے میں ان کی رائے کی توثیق کی ہے، اور امام ابن تیمیہ نے ''الرد علی البکری، ص: ۹'' میں لکھا ہے:

''اس حدیث کی نہ تو کوئی نقلی بنیاد اور اصل ہے اور نہ عقلی، اور نہ محدثین میں سے کسی نے ان میں سے کسی کا ذکر کیا ہے اور ''معناً'' بھی یہ باطل ہے کیونکہ آدم علیہ السلام کبھی بھی پانی اور مٹی کے درمیانی حالت میں نہیں تھے اور ''الطین'' گارا، پانی اور مٹی ہی کے مجموعے سے عبارت ہے بلکہ آدم علیہ السلام روح اور بدن کی درمیانی حالت میں تھے۔

پھر یہ گمراہ لوگ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ نبی ﷺ اُس وقت موجود تھے اور آپ کی ذات

مبارک تمام مخلوقات سے قبل تخلیق پا چکی تھی اور اپنے دعویٰ پر جھوٹی حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں مثلاً وہ حدیث جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ''عرش کے گرد ایک نور تھا'' اور آپ نے فرمایا: اے جبرائیل میں ہی وہ نور تھا۔'' اور ان گمراہ لوگوں میں سے بعض کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ آپ جبرائیل کے وحی لانے سے قبل ہی قرآن کے حافظ تھے۔''

امام ابن تیمیہ نے ((وَإِنَّمَا كَانَ بَيْنَ الرُّوحِ وَالجَسَدِ)) سے اس صحیح حدیث کی جانب اشارہ کیا ہے جو ان الفاظ میں مروی ہے:

((كُنتُ نَبِيًّا ، وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوحِ وَالْجَسَدِ)) [مسند احمد: ۵/ ۵۹]

''میں نبی تھا، حالانکہ آدم ابھی روح اور بدن کی درمیانی حالت میں تھے۔''

اس حدیث کی سند درج ذیل ہے:

((حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ مَهْدِيّ : حَدَّثَنَا مَنْصُوْرُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ بُدَيْلٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ شَقِيقٍ عَنْ مَيْسَرَةَ الْفَجْرِ ، قَالَ :

قُلْتُ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَتٰى كُنْتَ نَبِيًّا؟ قَالَ : وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ))

''ہم سے عبدالرحمٰن بن مہدی نے بیان کیا، کہا: ہم سے منصور بن سعد نے بدیل سے، انہوں نے عبداللہ بن شقیق سے اور انہوں نے میسرہ الفجر سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا:

میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کب نبی تھے؟ آپ نے فرمایا: ''جب آدم روح اور بدن کے درمیان تھے۔''

اس حدیث کی بہترین تفسیر وہ صحیح حدیث ہے جو امام الترمذی نے ''سنن'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے:

((حَدَّثَنَا أَبُوْ هَمَّامٍ الْوَلِيْدُ بْنُ شُجَاعِ بْنِ الْوَلِيْدِ الْبَغْدَادِي: حَدَّثَنَا الْوَلِيْدُ بْنُ مُسْلِمٍ ، عَنِ الْأَوْزَاعِيِّ ، عَنْ يَحْيَى بْنِ أَبِي كَثِيرٍ ، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ، قَالَ :قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! مَتٰى وَجَبَتْ لَكَ النُّبُوَّةُ؟ قَالَ : وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ)) [1]

---

[1] حدیث: ۳۶۰۹

''ہم سے ابو ہمام الولید بن شجاع بن الولید البغدادی نے بیان کیا، کہا: ہم سے الولید بن مسلم نے الاوزاعی سے، انہوں نے یحییٰ بن ابی کثیر سے، انہوں نے ابو سلمہ سے اور انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کے لیے نبوت کب ثابت ہو چکی تھی؟ فرمایا: جب ابھی آدم روح اور بدن کے درمیان تھے۔''

اسی مفہوم کی حامل ایک دوسری صحیح حدیث ''شرح السنة'' میں حضرت العرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

((إِنِّیْ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْتُوْبٌ : خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ ، وَإِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِیْ طِيْنَتِهِ)) [1]

''میں اس وقت اللہ کے نزدیک خاتم النبیین لکھا ہوا تھا جب ابھی آدم اپنے (مادۂ تخلیق) مٹی کے گارے میں پڑے ہوئے تھے۔''

اس حدیث کا مطلب ہے کہ میں آپے آپ سے خاتم النبیین کا دعویٰ نہیں کرنے لگا ہوں۔ بلکہ آدم کی تخلیق سے قبل ہی اللہ نے میری یہ حیثیت متعین فرما دی تھی۔

امام محمد بن عبدالباقی الزرقانی نے ''شرح المواهب اللدنيه : ۱/۳۳'' میں ان دونوں زیرِ بحث موضوع حدیثوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''حافظ السیوطی نے ''الدرر'' میں یہ تصریح کی ہے کہ ان کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے۔ ان میں سے دوسری حدیث عوام کا اضافہ ہے اور ان سے قبل حافظ ابن تیمیہ نے ان کو بے اصل قرار دے چکے ہیں اور یہ فتویٰ دے چکے ہیں کہ یہ دونوں الفاظ باطل اور جھوٹ ہیں۔''

[الضعيفه : ۱/ ٤٧٤]

۱۲۳ ...... ((كُنْتُ أَوَّلَ النَّبِيِّيْنَ فِی الْخَلْقِ وَآخِرَهُمْ فِی الْبَعْثِ))

''میں پیدائش کے اعتبار سے پہلا نبی ہوں اور بعثت کے اعتبار سے آخری۔''

یہ حدیث سند کے اعتبار سے اگرچہ موضوع نہیں لیکن بے حد ضعیف اور ناقابل اعتبار اور منکر ہے۔ اس کی سند میں بقیہ بن الولید شامل ہے۔ جس کے بارے میں عبداللہ بن المبارک فرماتے ہیں:

''سچا ہے، لیکن ہر آنے جانے والے سے حدیثیں لکھ لیتا ہے۔ امام ابو حاتم نے اس کے بارے

[1] المشكوٰة، حديث: ٥٧٥٩

میں لکھا ہے: ''وہ قابل استدلال اور قابل استشہاد نہیں ہے۔'' امام ابو مسہر...... عبدالاعلی بن مسہر الغسانی...... نے اس کی روایت کردہ حدیثوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:

((أَحادِيثُ بَقِيَّةَ لَيسَتُ نَقِيَّةً فَكُنُ مِنُهَا عَلَى تَقِيَّةٍ))

''بقیہ کی روایت کردہ حدیثیں ملاوٹ سے پاک نہیں ہیں لہٰذا ان سے ہوشیار رہو۔''

حافظ ابن حجر نے'' تقريب التهذيب: ٦٥ ، ترجمه: ۷۳۴ '' میں لکھا ہے:

'' سچا تھا، لیکن ضعیف راویوں سے بکثرت تدلیس سے کام لیتا تھا۔''میزا ن الاعتدال : ۱/ ۳۳۱ '' میں اس کی جرح وتعدیل پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سند کا دوسرا راوی سعید بن بشیر ہے، جس کو امام یحییٰ بن معین وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔

[میزان الاعتدال: ۲/ ۱۲۸ ، المقاصد الحسنة ، ص: ۳۲۷ ، الاسرار المرفوعه: ۳۵۲ اور کشف الخفاء: ۲/ ۱۲۹]

رہا اس حدیث کا متن تو اس کی نکارت بالکل واضح ہے اور اس موضوع سے متعلق گذشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ کافی ہے۔

١٢٤ ...... ((أَنَا عَرَبِيٌّ وَالُقُرآنُ عَرَبِيٌّ وَلِسَانُ أهلِ الُجَنَّةِ عَرَبِيٌّ))

''میں عربی ہوں، قرآن عربی ہے اور اہل جنت کی زبان عربی ہے۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ اس کی تخریج حافظ الطبرانی نے'' المعجم الاوسط: ۲/ ۲۸۵ ، ح: ۹۳۰۱ '' میں اس سند سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا مُسُعَدَةُ بُنُ سَعُدٍ: حَدَّثَنَا إِبُرَاهِيمُ بُنُ الُمُنُذِرِ: حَدَّثَنَا عَبُدُ الُعَزِيُزِ بُنُ عِمُرَانَ: حَدَّثَنَا شِبُلُ بُنُ الُعَلَاءِ عَنُ أَبِيهِ ، عَنُ جَدِّهِ عَنُ أَبِي هُرَيُرَةَ مَرُفُوعًا))

''ہم سے مسعدۃ بن سعد نے بیان کیا، ہم سے ابراہیم بن المنذر نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالعزیز بن عمران نے بیان کیا، کہا: ہم سے شبل بن العلاء نے اپنے باپ سے انہوں نے ان کے دادا سے اور انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

یہ سند نقل کرنے کے بعد حافظ الطبرانی نے لکھا ہے:

''اس حدیث کی روایت شبل سے عبدالعزیز بن عمران کے سوا کسی اور نے نہیں کی ہے۔''

حافظ السیوطی نے یہ حدیث " اللآلی المصنوعة: ۱/ ۲۴۲" میں نقل کرنے کے بعد اس کی تعقیب ان لفظوں میں کی ہے:

''الذہبی نے ''المغنی'' میں شبل بن العلاء کے بارے میں امام ابن عدی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس کے پاس منکر روایات ہیں۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

''حافظ الہیثمی نے " المجمع: ۱۰/ ۵۲، ۵۳ " میں اس حدیث کی علت شبل بن العلاء سے روایت کرنے والے کو قرار دیا ہے اور لکھا ہے: ''اس کی سند میں عبدالعزیز بن عمران ہے جو متروک ہے۔''

البانی اس پر تعقیب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امام یحییٰ بن معین نے عبدالعزیز بن عمران کا تذکرہ ان لفظوں میں کیا ہے: ((لَيْسَ بِثِقَة)) وہ ثقہ نہیں ہیں۔ لہٰذا اس حدیث کو وضع کرنے کی ذمہ داری اس پر محمول کرنا بہتر ہے۔ اسی وجہ سے حافظ زین الدین العراقی نے ''المحجۃ: ۱/ ۵۶'' میں تصریح کی ہے:

لیکن عبدالعزیز بن عمران الزہری متروک ہے، یہ بات نسائی وغیرہ نے اس کے بارے میں کہی ہے۔ اور امام بخاری نے فرمایا ہے: اس کی حدیثیں نہ لکھی جائیں۔ معلوم ہوا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔''

[الضعیفه: ۱/ ۲۹۸، ۲۹۹]

۱۲۵ ...... ((أَحِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ ، لِأَنِّي عَرَبِيٌّ ، وَالْقُرْآنَ عَرَبِيٌّ وَكَلَامُ أَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ))

''تین باتوں کی وجہ سے عربوں سے محبت کرو، اس لیے کہ میں عربی ہوں، قرآن عربی ہے اور اہل جنت عربی میں بات کریں گے۔''

یہ موضوع ہے۔ اس کی تخریج امام الحاکم نے " المستدرك: ۴/ ۸۷ " اور " معرفة علوم الحديث ، ص: ۱۶۱ ، ۱۶۲ " میں، حافظ العقیلی نے " الضعفاء ، ترجمه: ۳۲۷ " میں، الطبرانی نے " المعجم الكبير: ۳/ ۱۲۲" میں اور انہی کے واسطہ سے الضیاء المقدسی نے " صفة الجنة: ۳/ ۲۹ ، ح: ۱ " میں، امام البیہقی نے شعب الایمان میں، الواحدی نے اپنی تفسیر " ۱/ ۸۱ " میں اور حافظ ابن عساکر نے " تاريخ: ۶/ ۲۳۰ " میں العلاء بن عمرو الحنفی کی سند سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ يَزِيدَ الأَشْعَرِيُّ : أَنْبَأَ ابْنُ جُرَيْجٍ عَنْ عَطَاءٍ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ مَرْفُوْعًا))

''ہم سے یحییٰ بن یزید الاشعری نے بیان کیا، کہا: ابن جریج نے عطاء سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے خبر دی۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

''یہ سند موضوع ہے، جس کی تین علتیں ہیں:

۱۔ العلاء بن عمرو: الذہبی نے ''میزان الاعتدال'' میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

''متروک ہے، ابن حبان کہتے ہیں کہ کسی بھی حال میں بھی قابل استدلال نہیں ہے۔'' پھر العقیلی کے واسطہ سے مثال میں یہی حدیث پیش کی ہے اور لکھا ہے: ''یہ موضوع ہے۔ امام ابو حاتم نے اس کو جھوٹ قرار دیا ہے۔''

اور حافظ ابن حجر نے ''لسان المیزان'' میں اس کے تذکرے میں امام الازدی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ''اس کی حدیثیں لکھی جانے کے قابل نہیں ہیں۔''

۲۔ یحییٰ بن یزید: امام الذہبی نے یزید کو کاتب کی غلط قرار دیا ہے اور صحیح نام ''برید'' بتایا ہے۔

یحییٰ بن معین نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

ابن نمیر کا قول ہے: ''یحییٰ بن برید ایک کھجور کے دانے کے برابر بھی نہیں۔''

امام ابو زرعہ فرماتے ہیں: ''منکر الحدیث'' ہے۔ وہ اس یحییٰ کے باپ ''برید'' کے بارے میں کہتے ہیں: ''ضعیف ہے، متروک نہیں ہے۔ اس کی حدیثیں لکھی جا سکتی ہیں۔''

۳۔ اس سند کا تیسرا سقم ابن جریج کا عنعنہ ہے، جبکہ وہ ''مدلس'' تھے۔ امام احمد نے اس کی روایت کردہ حدیثوں کے بارے میں فرمایا ہے:

''ابن جریج جن حدیثوں کو ''مرسل'' روایت کرتا تھا، ان میں سے بعض موضوع ہیں۔ ابن جریج کو اس کی پروا نہیں ہوتی تھی کہ وہ کہاں سے حدیثیں اخذ کرتا ہے۔ ان کی مراد اس کے اس قول سے ہے: ((أُخْبِرْتُ وَحُدِّثْتُ عَنْ فُلَانٍ)) مجھے فلاں کے واسطہ سے خبر دی گئی، یا فلاں کے واسطہ سے حدیث بیان کی گئی۔'' [الضعیفہ: ۱/۲۹۳، ۲۹۸]

مذکورہ دونوں حدیثوں کی نکارت ان کی سند سے زیادہ ان کے مضمون اور متن میں مضمر ہے۔ کیونکہ اس

میں نبی اکرم ﷺ کی جانب عربیت پر فخر کرنے کو منسوب کیا گیا ہے۔ جو اسلام کی روح اور مزاج کے خلاف ہے۔ اسلام میں انسان کی فضیلت و برتری اور اس کی عظمت و بزرگی کا معیار ذات و برادری، رنگ و نسل اور زبان و وطن اور قومیت نہیں ہے، بلکہ اسلام میں انسان کی حقیقی عظمت اور بزرگی کا معیار ایمان اور عمل صالح کو قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ الحجرات میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿13﴾ ﴾

[الحجرات: ۱۳]

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہاری قومیں اور برادریاں بنادی ہیں۔ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو، یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور ہر چیز سے باخبر ہے۔''

اس حقیقت کو نبی ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ عَزَّوَجَلَّ وَاحِدٌ أَلَا وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ ، أَلَا لَا فَضْلَ لِأَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوَى ، أَلَا قَدْ بَلَّغْتُ؟ قَالُوْا: نَعَمْ۔ قَالَ: لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) [1]

''لوگو! خبردار رہو بیشک تمہارا رب عزوجل ایک ہے اور بیشک تمہارا باپ ایک ہے۔ خبردار رہو کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں حاصل ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل ہے۔ سوائے تقویٰ کے اعتبار سے، خوب غور سے سن کر جواب دو، کیا میں نے تمہیں اللہ کا پیغام پہنچا دیا؟ صحابہ کرام نے عرض کیا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: یہاں جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں کو ان باتوں سے آگاہ کردیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔''

یہی حدیث امام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی نے '' شعب الایمان: ۲/۸۸ '' میں اور ابونعیم نے ''حلیۃ الاولیاء: ۳/۱۰۰ '' میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں روایت کی ہے:

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ ، وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ ، عَلَى

[1] مسند احمد بحوالہ اقتضاء الصراط المستقیم ، ص: ۱۷۸ ، امام ابن تیمیہ نے اس کو صحیح الاسناد بتایا ہے۔

عَجَمِيٍّ ، وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ ، وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوَى ﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ ﴾ أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ قَالُوا: بَلَى يَا رَسُولَ اللّٰهِ! قَالَ: فَيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) ❶

''لوگو! خبردار رہو، تم سب کا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، مگر صرف تقویٰ کے اعتبار سے اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔ بتاؤ کیا میں نے تمہیں بات پہنچادی؟ صحابہ کرام نے عرض کیا: ہاں۔ اے اللہ کے رسول! فرمایا: اچھا جو موجود ہیں وہ اُن لوگوں تک یہ بات پہنچادیں جو موجود نہیں ہیں۔''

اس کے علاوہ حسب ونسب پر فخر کی مذمت میں متعدد صحابۂ کرام سے احادیث مروی ہیں۔ چنانچہ سنن ابوداود، سنن الترمذی اور الترغیب والترہیب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ أَذْهَبَ عَنكُمْ عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَفَخْرَهَا بِالآبَاءِ ، مُؤْمِنٌ تَقِيٌّ ، وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ ، أَنْتُمْ بَنُو آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ ، لَيَدَعَنَّ رِجَالٌ فَخْرَهُمْ بِأَقْوَامٍ ، إِنَّمَا هُمْ فَحمٌ مِنْ فَحمِ جَهَنَّمَ ، أَوْ لَيَكُونُنَّ أَهْوَنَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الْجِعْلَانِ الَّتِيْ تَدْفَعُ بِأَنفِهَا النَّتَنَ)) ❷

''بیشک اللہ عزوجل نے تم سے جاہلیت کے فخر ونخوت اور آباء واجداد پر افتخار کے عیب کو دور کردیا ہے۔ اب یا تو خداترس مومن ہے یا معصیت کار شقی، تم آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے، یا تو لوگ ان قوموں پر فخر کرنا ترک کردیں، جو جہنم کے کوئلے میں سے کوئلہ بن چکے ہیں، یا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس گندے کیڑے سے زیادہ ذلیل ہوں گے جو اپنی ناک پاک گندگی کو دور کرتا ہے۔''

۱۲۶ ...... ((لَيْلَةَ الْغَارِ أَمَرَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ شَجَرَةً فَخَرَجَتْ فِيْ وَجْهِ النَّبِيِّ ﷺ تَسْتُرُهُ ، وَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ بَعَثَ الْعَنْكَبُوتَ ، فَنَسَجَتْ مَا بَيْنَهُمَا ، فَسَتَرَتْ

---

❶ الصحیحۃ: ٦/٤٤٩، ح: ٢٧٠٠ ❷ ٥١١٦، ٣٩٥٥، ٢٩٦٥

وَجهَ النَّبِيِّ ﷺ وَاَمَرَ اللّٰهُ حَمَامَتَيْنِ وَحْشِيَّتَيْنِ ، فَاَقْبَلَتَا تَدِفَّانِ (وَفِي نُسْخَةٍ: تَرِفَّانِ) حَتّٰى وَقَعَا بَيْنَ الْعَنْكَبُوتِ وَبَيْنَ الشَّجَرَةِ ، فَاَقْبَلَ فِتْيَانُ قُرَيْشٍ مِنْ كُلِّ بَطْنٍ رَجُلٌ مَعَهُمْ عِصِيُّهُمْ وَقِسِيُّهُمْ وَهَرَا وَاتُهُمْ حَتّٰى إِذَا كَانُوا مِنَ النَّبِيِّ ﷺ عَلٰى قَدرِ مِائَتَي ذِرَاعٍ ، قَالَ الدَّلِيْلُ سُرَاقَةُ بْنُ مَالِكٍ الْمُدلِجِ: أُنْظُرُوا هٰذَا الْحَجَرَ ثُمَّ لَا اَدْرِي اَيْنَ وَضَعَ رِجْلَهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ، فَقَالَ الْفِتْيَانُ: إِنَّكَ لَمْ تُخْطِيُ مُنْذُ اللَّيْلَةِ اَثَرَهُ حَتّٰى إِذَا اَصْبَحْنَا قَالَ: أُنْظُرُوا فِي الْغَارِ! فَسَبَقَهُ الْقَوْمُ حَتّٰى إِذَا كَانُوا عَلٰى خَمْسِيْنَ ذِرَاعًا نَظَرَ اَوَّلُهُمْ فَإِذَا الْحَمَامَاتُ فَرَجَعَ ، قَالُوا: مَارَدَّكَ أَنْ تَنْظُرَ فِي الْغَارِ ، قَالَ: رَأَيْتُ حَمَامَتَيْنِ وَحْشِيَّتَيْنِ بِفَمِ الْغَارِ ، فَعَرَفْتُ أَنْ لَيْسَ فِيْهِ اَحَدٌ ، فَسَمِعَهَا النَّبِيُّ ﷺ فَعَرَفَ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ دَرَأَ عَنْهُمَا بِهِمَا ، فَسَمَّتَ عَلَيْهِمَا فَاَحْرَزَهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰى بِالْحَرَمِ فَاَفْرَخَا كُلَّ مَا تَرَوْنَ))

’’غار کی رات اللہ عزوجل نے ایک درخت کو حکم دیا، جو نبی ﷺ کے سامنے نکل کر آپ کو چھپانے لگا، اور اللہ تعالیٰ نے ایک مکڑی کو بھیجا جس نے نبی ﷺ اور درخت کے درمیان جال بن دیا، اس طرح اس نے نبی ﷺ کے چہرے کو چھپا دیا۔ اور اللہ تعالیٰ دو جنگلی کبوتروں کو حکم دیا جو آئے اور اپنے دونوں پر پھڑ پھڑانے لگے...... ایک دوسری روایت میں ترفان کا لفظ ہے اس کے بھی وہی معنی ہیں...... یہ دونوں کبوتر مکڑی اور درخت کے درمیان بیٹھ گئے۔ اسی وقت قریش کے نوجوان اس شکل میں ادھر متوجہ ہوئے کہ ہر قبیلہ سے ایک آدمی ان میں شامل ہوا، سب کے ساتھ لاٹھیاں، تلواریں اور ڈنڈے تھے۔ اور جب وہ نبی ﷺ سے دو سو ہاتھ کے فاصلے پر رہ گئے، تو راہنما سراقہ بن مالک المدلجی نے کہا: یہ پتھر دیکھو، پھر مجھے نہیں معلوم کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنا پاؤں کہاں رکھا۔ قریش کے جوانوں نے کہا: تم نے رات سے ان کے اثر کو جاننے میں غلطی نہیں کی ہے۔ پھر جب ہم نے صبح کی تو سراقہ نے کہا: غار میں جھانکو۔ اس پر لوگ اس سے آگے بڑھ گئے اور جب وہ غار سے پچاس ہاتھ کے فاصلے پر پہنچ گئے تو ان میں سے پہلے شخص نے نظر دوڑائی تو کبوتر دیکھا اور پلٹ پڑا۔ اس کے ساتھیوں نے کہا: تم کو غار میں جھانکنے سے کس چیز نے باز رکھا؟ اس نے جواب دیا: میں نے غار کے دہانے پر دو جنگلی کبوتر

دیکھے تو سمجھ گیا کہ اس میں کوئی نہیں ہے۔ ان کی یہ باتیں نبی ﷺ نے سنیں تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ اللہ عزوجل نے ان کبوتروں کے ذریعہ آپ سے اور حضرت ابو بکر سے خطرہ دور فرما دیا ہے۔ آپ نے ان کبوتروں پر اللہ کا نام لیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو حرم میں محفوظ کر دیا اور انہی دونوں نے ان کبوتروں کو جنم دیا ہے، جن کو تم لوگ دیکھ رہے ہو۔''

یہ حدیث منکر ہے، اس کی روایت محمد بن سعد نے ''الطبقات: ۱/ ۲۲۸، ۲۲۹'' میں، حافظ ابو بکر احمد بن عمرو البزار نے ''المسند: ۲/ ۲۲۹، ح: ۱۷۴۱'' میں، حافظ الطبرانی نے ''المعجم الکبیر: ۲۰/ ۴۴۳'' میں حافظ العقیلی نے ''الضعفاء، ترجمہ: ۱۳۴۶'' میں اور خیثمۃ الاطرابلسی نے ''فضائل الصدیق: ۱۶/ ۵/ ۲'' میں، ابو نعیم نے ''دلائل النبوۃ: ۲/ ۱۱۱'' میں اور امام البیہقی نے ''سنن: ۲/ ۸۱/ ۷، ۸۲/ ۷'' میں ''عون بن عمرو ابی عمرو القیسی الملقب به عوین'' سے کی ہے:

((قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو مُصْعَبٍ الْمَكِّيُّ ، قَالَ: أَدْرَكْتُ زَيْدَ بْنَ أَرْقَمَ وَالْمُغِيرَةَ بْنَ شُعْبَةَ وَأَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَذْكُرُونَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَيْلَةَ الْغَارِ......))

''عوف بن عمرو ابی عمرو القیسی سے روایت ہے، کہا: ہم سے ابو مصعب المکی نے بیان کیا، کہا: میں نے زید بن ارقم، المغیرۃ بن شعبہ اور انس بن مالک کو یہ ذکر کرتے ہوئے پایا کہ نبی ﷺ غار کی رات میں......''

الشریف ابو علی الہاشمی نے ''الفوائد المنتقاۃ: ۱/ ۱۰۸'' میں لکھا ہے:

''اس کی روایت میں انس اور جن کا ان کے ساتھ ذکر آیا ہے، منفرد ہیں اور اس کو ہم صرف ''مسلم بن ابراہیم عن عون بن عمرو القیسی عن ابی مصعب'' کی حدیث کے طور پر جانتے ہیں۔''

العقیلی نے لکھا ہے:

''اس حدیث کی روایت میں عون کا کوئی ''متابع'' نہیں ہے اور ابو مصعب ''مجہول آدمی'' ہے۔ اور البزار نے اس کے مجہول ہونے کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے: ''ہمیں نہیں معلوم کہ یہ حدیث عون بن عُمیر کے سوا کسی اور نے روایت کی ہے۔'' اور ابو مصعب کے بارے میں ہماری معلومات صرف اتنی ہے کہ اس سے عوین کے علاوہ کسی اور نے یہ حدیث نہیں روایت کی ہے۔''

امام یحیٰی بن معین نے ''عون'' کے بارے میں کہا ہے کہ: ''وہ کچھ بھی نہیں۔''

اور امام بخاری نے اس کو منکر الحدیث اور مجہول قرار دیا ہے۔

اور حافظ ابن کثیر "البدایہ والنہایۃ: ۳/۱۸۱" میں لکھتے ہیں:

''اس حدیث کو حافظ ابن عساکر نے یحییٰ بن محمد بن صاعد کی سند سے روایت کیا ہے:

((حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ عَلِيٍّ ، حَدَّثَنَا عَوْنُ بْنُ عَمْرٍو أَبُو عَمْرٍ والقَيسِيُّ ...... وَيُلَقَّبُ عُوَيْنٍ ...... حَدَّثَنِيُ أَبُو مُصْعَبٍ المَكِّي قَالَ ......))

''ہم سے عمرو بن علی نے بیان کیا، کہا: ہم سے عون بن عمرو ابوعمرو نے ...... جس کا لقب عوین تھا ...... بیان کیا، کہا: مجھ سے ابومصعب نے بیان کیا، کہا: ......''

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: ''اس سند سے یہ بیحد ہی ضعیف حدیث ہے۔''

[الضعیفه: ۳/۲۵۹ ، ۲۶۰ ، البداية والنهاية: ۳/۱۸۱ ، ۱۸۲]

۱۲۷ ...... ((إِنْطَلَقَ النَّبِيُّ ﷺ وَأَبُوبَكْرٍ إِلَى الغَارِ ، فَدَخَلاَ فِيهِ ، فَجَاءَ تِ العَنْكَبُوتُ فَنَسَجَتْ عَلَى بَابِ الغَارِ ، وَجَائَتْ قُرَيْشٌ يَطْلُبُونَ النَّبِيَّ ﷺ ، وَكَانُوا إِذَا رَأَوا عَلَى بَابِ الغَارِ نَسجَ الْعَنْكَبُوتِ ، قَالُوا : لَمْ يَدْخُلْهُ اَحَدٌ ، وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ قَائِمًا يُصَلِّيَ وَأَبُو بَكْرٍ يَرْتَقِبُ ، فَقَالَ أَبُوبَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ لِلنَّبِيِّ ﷺ : فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي هٰؤُلَاءِ قَوْمُكَ يَطْلُبُونَكَ! أَمَا وَاللّٰهِ مَا عَلَى نَفْسِي اَبْكِي وَلٰكِنْ مَخَافَةَ أَنْ أَرَى فِيْكَ مَا اَكْرَهُ ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ : لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا))

''نبی ﷺ اور ابوبکر غار کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے اندر داخل ہو گئے۔ پس مکڑی آئی اور اس نے غار کے دہانے پر جالا بن دیا اور قریش کے لوگ نبی ﷺ کو تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور جب غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا دیکھا تو بولے: اس میں کوئی بھی داخل نہیں ہوا ہے۔ اس وقت نبی ﷺ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ ہوشیاری سے نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے نبی ﷺ سے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں اپنے آپ پر نہیں رو رہا ہوں، بلکہ اس اندیشے سے غم زدہ ہوں کہ آپ کے حق میں کوئی ایسی بات دیکھوں جو مجھے ناپسند ہے۔ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا: ''غم نہ کرو بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس کی تخریج حافظ ابوبکر القاضی نے "مسند ابی بکر، قلمی نسخہ: ۹۱/ ۱۔۲ " میں کی ہے:

((حَدَّثَنَا بَشَّارُ الخَفَّافُ قَالَ: حَدَّثَنَا جَعْفَرُ بْنُ سُلَيْمَانَ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو عِمْرَانَ الجَوْنِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا المُعَلَّى بْنُ زِيَادٍ عَنِ الحَسَنِ قَالَ: فَذَكَرَهُ))

"ہم سے جعفر بن سلیمان نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابوعمران الجونی نے بیان کیا، کہا: ہم سے المعلی بن زیاد نے الحسن سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، کہا: پس اس حدیث کا ذکر کیا۔"

محمد ناصرالدین البانی لکھتے ہیں:

"یہ سند ضعیف ہے اور اس کی دو علتیں ہیں:

۱۔ یہ مرسل ہے۔ اور اس کے راوی الحسن البصری ہیں جو بکثرت مرسل روایت کرنے والے اور تدلیس سے کام لینے والے تابعی ہیں۔

۲۔ بشار الخفاف ضعیف ہے۔ اس کا پورا نام: بشار بن موسیٰ الخفاف ہے۔ حافظ الذہبی نے اس کا "الضعفاء" میں ذکر کیا ہے اور لکھا ہے: "ابوزرعہ نے اس کی تضعیف کی ہے۔ بخاری نے منکر الحدیث قرار دیا ہے۔ اور ابن عدی کا قول ہے: مجھے امید ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔"

اور حافظ ابن حجر نے "تقریب التہذیب: ۶۱، ترجمہ: ۶۷۴ " میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"ضعیف، کثیر الغلط، کثیر الحدیث، ضعیف، بہت غلطیاں کرنے والا اور کثرت سے حدیثیں روایت کرنا والا ہے۔"

اس بیحد ضعیف اور مرسل روایت کا آخری فقرہ صحیح ہے، کیونکہ وہ قرآن پاک کی اس آیتِ مبارکہ میں مذکور ہے:

﴿ إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا ﴾ [التوبة: ٤٠]

"اگر تم اس کی مدد نہ کرو گے..... تو کوئی پروا نہیں..... کیونکہ اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے، جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا اور وہ دو کا دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا، غم نہ کر بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے، تو اللہ نے اس پر اپنی سکینت

نازل فرمائی اور اس کی مدد اور حمایت ایسے لشکروں سے کی جن کو تم لوگوں نے نہیں دیکھا۔''

حافظ ابن کثیر نے'' البداية والنهاية: ۳/ ۱۸۰ ، ۱۸۱ '' میں الحسن سے مروی اس مرسل روایت کو اس کی شاہد حدیث کے ساتھ ''حسن'' قرار دیا ہے اور شاہد سے ان کی مراد وہ حدیث ہے جو امام احمد نے '' المسند ، ح: ۳۲۵۱ '' میں عبدالرزاق سے روایت کی ہے:

((قَالَ الْإِمَامُ اَحْمَدُ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ : أَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ أَخْبَرَنِيْ عُثْمَانُ الْجَزَرِيُّ أَنَّ مِقْسَمًا مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ اَخْبَرَهُ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِيْ قَوْلِهِ تَعَالَى : وَإِذْ يَمْكُرُبِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوكَ قَالَ: تَشَاوَرَتْ قُرَيْشٌ لَيْلَةً بِمَكَّةَ ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ إِذَا أَصْبَحَ فَأَثْبِتُوهُ بِالْوَثَاقِ يُرِيْدُونَ النَّبِيَّ ﷺ وَقَالَ بَعْضُهُمْ اُقْتُلُوْهُ ، وَقَالَ بَعْضُهُمْ : بَلْ اَخْرِجُوْهُ ، فَأَطْلَعَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ نَبِيَّهُ عَلَى ذٰلِكَ فَبَاتَ عَلِيٌّ عَلَى فِرَاشِ النَّبِيِّ ﷺ تِلْكَ اللَّيْلَةَ ، وَخَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ حَتّٰى لَحِقَ بِالْغَارِ ، وَبَاتَ الْمُشْرِكُوْنَ يَحْرُسُوْنَ عَلِيًّا يَحْسِبُوْنَهُ النَّبِيَّ ﷺ ، فَلَمَّا أَصْبَحُوا ثَارُوا اِلَيْهِ ، فَلَمَّا رَأَوا عَلِيًّا رَدَّ اللّٰهُ مَكْرَهُمْ ، فَقَالُوْا : اَيْنَ صَاحِبُكَ هٰذَا؟ قَالَ: لَا اَدْرِىْ ، فَاقْتَصُّوا اَثَرَهُ ، فَلَمَّا بَلَغُوا الْجَبَلَ خَلَطَ ...... اخْتَلَطَ ...... عَلَيْهِمْ ، فَصَعَدُوا الْجَبَلَ ، فَمَرُّوْا بِالْغَارِ ، فَرَأَوا عَلَى بَابِهِ نَسْجَ الْعَنْكَبُوتِ ، فَقَالُوا: لَوْ دَخَلَ هٰهُنَا لَمْ يَكُنْ نَسْجُ الْعَنْكَبُوتِ عَلَى بَابِهِ ، فَمَكَثَ فِيْهِ ثَلَاثَ لَيَالٍ))

''امام احمد نے کہا: ہم سے عبدالرزاق نے بیان کیا، کہا: ہم کو معمر نے خبر دی کہا: مجھ کو عثمان الجزری نے خبر دی کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام مقسم نے ان کو اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿ وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ ط ﴾ کے بارے میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کی خبر دی کہ انہوں نے فرمایا: قریش نے مکہ میں ایک رات آپس میں صلاح و مشورہ کیا، چنانچہ ان میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ جب صبح ہو تو اس کو بیڑیاں پہنا کر قید کر دو، ان کی مراد نبی ﷺ سے تھی، دوسرے کچھ لوگوں نے کہا: اس کو قتل کر دو۔ اور تیسرے فریق نے یہ رائے دی: بلکہ اس کو نکال دو۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ان کے درمیان ہونے والی اس گفتگو سے آگاہ فرما دیا۔ اس طرح علی رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے بستر پر سو گئے اور نبی ﷺ وہاں سے نکل کر غار پہنچ گئے اور مشرکین یہ سمجھ کر علی کی نگرانی کرتے رہے کہ وہ نبی ﷺ ہیں۔ اور جب صبح ہوئی تو وہ

ان پر ٹوٹ پڑے، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ تو علی ہیں تو اللہ نے ان کی مکاری کو خود انہی پر لوٹا دیا، انہوں نے علی سے پوچھا: یہ تمہارے صاحب کہاں ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: مجھے معلوم نہیں۔ اس پر وہ آپ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور جب وہ پہاڑ پر پہنچے تو آثار قدم گڈ مڈ ہو گئے۔ پھر وہ پہاڑ کے اوپر چڑھ گئے اور غار کے پاس سے گزرے تو اس کے دہانے پر مکڑی کا جالا دیکھا اس پر انہوں نے آپس میں کہا: اگر کوئی یہاں اندر گیا ہوتا، تو غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا نہ ہوتا اور آپ تین راتیں غار میں رہے۔''

حافظ ابن کثیر نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: ''یہ سند حسن ہے اور غار کے دہانے پر مکڑی کے جالے سے متعلق جتنے قصے بیان کیے جاتے ہیں ان میں یہ قصہ سب سے بہتر ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی کہتے ہیں:

''لیکن میری تنقید کی رو سے یہ روایت حسن نہیں ہے، کیونکہ اگر عثمان الجزری، عثمان بن عمرو بن ساج الجزری ہے تو اس کے بارے میں امام ابن ابی حاتم نے " **الجرح و تعدیل**: ۳/ ۱۶۲ " میں اپنے والد کے حوالہ سے لکھا ہے: وہ نا قابل استدلال ہے۔''

اور حافظ الذہبی نے اس کے بارے میں یہ کہہ کر اس کو " **الضعفاء** " میں شمار کیا ہے کہ محدثین نے اس کی ''ثقاہت'' پر کلام کیا ہے۔

اور اگر وہ عثمان بن ساج الجزری ہے، جن کے مابین ''عمرو'' نہیں ہے تو اس کے بارے میں حافظ ابن حجر نے " **التهذيب** " میں یہ عندیہ دیا ہے کہ یہ پہلا عثمان نہیں ہے (یعنی عثمان بن عمرو بن ساج الجزری اور عثمان بن ساج الجزری دو الگ الگ شخصیتیں ہیں) اور غیر معروف ہے، لیکن " **تقريب التهذيب** : ۳۲۶ ، **ترجمه**: ۴۵۰۶ " میں ان دونوں کے درمیان کوئی تفریق کیے بغیر اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

رہا عثمان بن عمرو تو ابن حبان کے علاوہ کسی اور نے اس کو ثقہ نہیں کہا ہے۔ اور توثیق کے باب میں ابن حبان کی سہل انگاری معروف ہے۔ اور اس کا ضعیف اور نا قابل استدلال ہونا اوپر معلوم ہو چکا ہے جیسا کہ ابن ابی حاتم نے اپنے والد سے نقل کیا ہے۔

اور الہیثمی نے " **المجمع**: ۷/ ۲۷ " میں لکھا ہے:

''اس حدیث کی روایت احمد اور الطبرانی نے کی ہے اور اس کی سند میں عثمان بن عمرو الجزری ہے، جس کی توثیق ابن حبان نے کی ہے اور دوسروں نے اس کی تضعیف کی ہے۔ بقیہ راوی صحیح

حدیث کے راوی ہیں۔"

اسی وجہ سے محقق احمد شاکر نے مسند احمد پر اپنی تعلیق میں کہا ہے کہ اس حدیث کی سند محل نظر ہے۔

رہا اس حدیث کا متن تو آیت مبارکہ کا یہ فقرہ ﴿ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا ﴾ "اور اللہ نے ان کی مدد اور حمایت ایسے لشکروں سے کی جن کو تم لوگوں نے نہیں دیکھا۔" اس کی تضعیف کر رہا ہے اور یہ فقرہ اس امر کی صراحت کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی حفاظت نظر نہ آنے والے لشکر سے کی ہے، جبکہ اس حدیث کا متن یہ ثابت کر رہا ہے کہ آپ کی نصرت وحمایت مکڑی کے ذریعہ کی گئی، جو ایک نظر آنے والی شے ہے۔ اور آیت میں جن لشکروں کا ذکر آیا ہے بلاشبہ وہ فرشتے ہیں نہ کہ مکڑی اور دو کبوتر ہیں۔ جیسا کہ سابقہ منکر حدیث میں مذکور ہے۔ اسی وجہ سے امام ابو محمد الحسین بن سعود البغوی نے اپنی تفسیر "معالم التنزیل: ۴/۱۷۴" میں مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے "جنود" کے بارے میں لکھا ہے:

"وہ فرشتے تھے جو اس لیے نازل ہوئے تھے تاکہ کفار کے چہروں اور نگاہوں کو نبی ﷺ کو دیکھنے سے باز رکھیں۔"

اس تفسیر کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابونعیم نے اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے:

((إِنَّ أَبَا بَكْرٍ رضي الله عنه رَأَى رَجُلًا مُوَاجِهَ الغَارِ ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّهُ لَرَائِينَا ، قَالَ: كَلَّا إِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَسْتُرُهُ الآنَ بِأَجْنِحَتِهَا ، فَلَمْ يَنْشَبِ الرَّجُلُ أَنْ قَعَدَ يَبُولُ مُسْتَقْبِلَهُمَا ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَا أَبَا بَكْرٍ لَوْكَانَ يَرَاكَ مَا فَعَلَ هٰذَا))

"ابوبکر رضی اللہ عنہ نے غار کے بالمقابل ایک آدمی کو دیکھا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا: ہرگز نہیں اس وقت فرشتے اپنے پروں سے اس پر پردہ کیے ہوئے ہیں، پھر کچھ دیر نہیں گزری کہ وہ آدمی ان دونوں کی طرف منہ کر کے بیٹھ کر پیشاب کرنے لگا۔

اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابوبکر اگر وہ تم کو دیکھ رہا ہوتا تو یہ حرکت نہ کرتا۔"

الطبرانی نے اس حدیث کی طویل شکل میں ہجرت کے ضمن میں تخریج کی ہے۔ اور الہیثمی نے "مجمع الزوائد: ۶/۵۴" میں یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

"اس کی روایت الطبرانی نے کی ہے، اس کی سند میں یعقوب بن حُمید بن کاسیب ہے، جس کی ابن حبان وغیرہ نے توثیق کی ہے اور ابوحاتم وغیرہ نے تضعیف کی ہے، سند کے بقیہ راوی "صحیح

"کے راوی ہیں۔"

محدث محمد ناصر الدین البانی کہتے ہیں:

""یعقوب اصول حدیث کے مقررہ قواعد کی رو سے "حسن الحدیث" ہے، حافظ ابن حجر نے "تقریب التهذیب :۷ـ۵۳۶ ، ترجمه: ۷۸۱۵ " میں لکھا ہے: وہ سچا تھا، کبھی کبھار شک و وہم میں مبتلا ہو جاتا تھا۔" اس طرح یہ حدیث مکڑی اور کبوتروں والی حدیثوں کی نکارت کی دلیل اور قرآن پاک کی مذکورہ آیت کے فقرہ: ﴿ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا ط ﴾ کی تفسیر بن سکتی ہے۔"

[الضعیفه: ۳/ ۲۶۰ ـ ۲۶٤]

۱۲۸ ...... ((حَدَّثَنَا الفَضْلُ بْنُ سَهْلٍ أَبُو العَبَّاسِ الأَعْرَجُ البَغْدَادِيُّ! حَدَّثَنَا عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ غَزْوَانَ أَبُو نُوحٍ: أَخْبَرَنَا يُونُسُ بْنُ أَبِيْ إِسْحَاقَ ، عَنْ أَبِيْ بَكْرِ بْنِ أَبِيْ مُوْسَى ، عَنْ اَبِيهِ ، قَالَ: خَرَجَ أَبُو طَالِبٍ إِلَى الشَّامِ ، وَخَرَجَ مَعَهُ النَّبِيُّ ﷺ فِيْ أَشْيَاخٍ مِنْ قُرَيْشٍ ، فَلَمَّا اَشْرَفُوا عَلَى الرَّاهِبِ ؛ هَبَطُوا فَحَلُّوا رِحَالَهُمْ ، فَخَرَجَ إِلَيْهِمُ الرَّاهِبُ ، وَكَانُوا قَبْلَ ذٰلِكَ يَمُرُّوْنَ بِهِ ، فَلَا يَخْرُجُ إِلَيْهِمْ وَلَا يَلْتَفِتُ ، قَالَ: فَهُمْ يَحُلُّوْنَ رِحَالَهُمْ ، فَجَعَلَ يَتَخَلَّلُهُمُ الرَّاهِبُ ، حَتّٰى جَاءَ فَاَخَذَ بِيَدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ ، قَالَ: هٰذَا سَيِّدُ العَالَمِيْنَ ، هٰذَا رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ؛ يَبْعَثُهُ اللّٰهُ رَحْمَةً لِلْعَالَمِيْنَ ، فَقَالَ لَهُ اَشْيَاخٌ مِنْ قُرَيْشٍ: مَا عِلْمُكَ؟ فَقَالَ: إِنَّكُمْ حِيْنَ اَشْرَفْتُمْ مِنَ الْعَقَبَةِ ؛ لَمْ يَبْقَ شَجَرٌ وَلَا حَجَرٌ إِلَّا خَرَّ سَاجِدًا وَلَا يَسْجُدَانِ إِلَّا لِنَبِيٍّ ، وَإِنِّيْ أَعْرِفُهُ بِخَاتَمِ النُّبُوَّةِ أَسْفَلَ مِنْ غُضْرُوفِ كَتِفِهِ مِثْلَ التُّفَّاحَةِ ، ثُمَّ رَجَعَ ، فَصَنَعَ لَهُمْ طَعَامًا فَلَمَّا اَتَاهُمْ بِهِ ...... وَكَانَ هُوَ فِيْ رِعْيَةِ الْاِبِلِ ...... قَالَ: أَرْسِلُوْا إِلَيْهِ ، فَأَقْبَلَ ؛ وَعَلَيْهِ غَمَامَةٌ تُظِلُّهُ ، فَلَمَّا دَنَا مِنَ الْقَوْمِ ؛ وَجَدَهُمْ قَدْ سَبَقُوهُ إِلَى فَيْءِ الشَّجَرَةِ ، فَلَمَّا جَلَسَ مَالَ فَيْءُ الشَّجَرَةِ عَلَيْهِ ، فَقَالَ: اُنْظُرُوا إِلَى فَيْءِ الشَّجَرَةِ مَالَ عَلَيْهِ قَالَ فَبَيْنَمَا هُوَ قَائِمٌ عَلَيْهِمْ ، وَهُوَيُنَاشِدُهُمْ اَنْ لَا يَذْهَبُوا بِهِ إِلَى الرُّومِ فَإِنَّ الرُّومَ إِذَا رَأَوْهُ ، عَرَفُوهُ بِالصِّفَةِ ، فَيَقْتُلُوْنَهُ ، فَالْتَفَتَ ؛ فَإِذَا بِسَبْعَةٍ قَدْ اَقْبَلُوا مِنَ الرُّومِ ، فَاسْتَقْبَلَهُمْ ، فَقَالَ: مَا جَاءَ بِكُمْ؟ قَالُوْا: جِئْنَا ؛ أَنَّ

هٰذَا النَّبِیَّ خَارِجٌ فِیْ هٰذَا الشَّهرِ ، فَلَمْ یَبْقَ طَرِیْقٌ إِلَّا بُعِثَ إِلَیْهِ بِأُنَاسٍ وَإِنَّا قَدْ أُخْبِرْنَا خَبَرَهُ ، بُعِثْنَا إِلٰی طَرِیْقِكَ هٰذَا ، فَقَالَ: هَلْ خَلَّفَکُمْ أَحَدٌ هُوَ خَیْرٌ مِنْکُمْ؟ قَالُوْا: إِنَّمَا أُخْبِرْنَا خَبَرَهُ بِطَرِیْقِكَ هٰذَا۔ قَالَ: أَفَرَأَیْتُمْ أَمْرًا أَرَادَ اللّٰهُ أَنْ یَقْضِیَهُ ، هَلْ یَسْتَطِیْعُ أَحَدٌ مِنَ النَّاسِ رَدَّهُ؟ قَالُوْا: لَا قَالَ: فَبَایَعُوْهُ وَأَقَامُوْا مَعَهُ ، قَالَ: أَنْشُدُکُمْ بِاللّٰهِ ؛ أَیُّکُمْ وَلِیُّهُ؟ قَالُوْا: أَبُوْطَالِبٍ ، فَلَمْ یَزَلْ یُنَاشِدُهُ حَتّٰی رَدَّهُ أَبُوْطَالِبٍ وَبَعَثَ مَعَهُ أَبُوْ بَکْرٍ بِلَالًا ، وَزَوَّدَهُ الرَّاهِبُ مِنَ الْکَعْكِ وَالزَّیْتِ)) [الترمذی ، ح: ۳٦۲۰]

''ہم سے الفضل بن سہل ابو العباس الاعرج البغدادی نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالرحمٰن بن غزوان ...... قُراد ...... ابونوح نے بیان کیا، کہا: ہم کو یونس بن ابی اسحاق نے ابوبکر بن ابی موسیٰ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کرتے ہوئے خبر دی، کہا: ابوطالب شام کے سفر پر نکلے تو ان کے ساتھ نبی ﷺ بھی نکلے، ان کے ساتھ اکابر قریش کی ایک جماعت تھی، جب یہ لوگ راہب ...... بحیرا ...... کے پاس پہنچے تو سواری سے اتر گئے۔ اور اپنا کجاوا کھول لیا۔ اور راہب ان کے پاس آیا۔ اس سے قبل جب یہ لوگ اس کے پاس سے گزرتے تھے، تو وہ نہ تو ان کی خاطر باہر نکلتا تھا اور نہ ان کی جانب کوئی توجہ دیتا تھا ...... راوی کہتا ہے ...... وہ لوگ اپنے کجاوے کھول رہے تھے اور وہ ان کے درمیان چل پھر رہا تھا، یہاں تک کہ اس نے آ کر رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: یہ سارے جہان کے سردار ہیں، یہ اللہ رب العالمین کے رسول ہیں، اللہ ان کو دنیا کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کرے گا۔ اکابر قریش نے اس سے کہا: تمہیں ان باتوں کا علم کیسے ہوا؟ تو اس نے جواب دیا: جب تم لوگ گھاٹی سے نمودار ہوئے تو کوئی درخت اور پتھر ایسا نہیں تھا جو سجدہ ریز نہ ہو گیا ہو اور یہ شجر و حجر صرف کسی نبی کو سجدہ کرتے ہیں۔ اور میں آپ کو آپ کے مہر نبوت کے ذریعہ پہچانتا ہوں جو سیب کے مانند آپ کے کندھے کی نرم ہڈی ...... کُرْی ...... کے نیچے ہے۔ پھر راہب واپس چلا گیا اور ان کے لیے کھانا تیار کیا اور جب وہ کھانا لے کر ان کے پاس آیا تو ...... نبی ﷺ اونٹوں کی نگہبانی پر مامور تھے ...... اس نے قریش کے لوگوں سے کہا: ان کو بلا بھیجو۔ اس پر آپ متوجہ ہوئے درانحالیکہ ایک بادل کا ٹکڑا آپ پر سایہ کیے ہوئے تھا۔ اور جب آپ قوم کے قریب آئے تو وہ لوگ درخت کے سایہ میں

جا چکے تھے۔ اور جب آپ درخت کے نیچے بیٹھے تو اس کا سایہ آپ کی طرف مائل ہو گیا۔ تو اس نے کہا: ذرا درخت کے سائے کو دیکھو وہ آپ پر جھک گیا ہے...... راوی کہتا ہے...... اور جبکہ راہب ان کی دیکھ بھال میں مشغول تھا اور ان سے یہ درخواست کر رہا تھا کہ وہ آپ کو لے کر رومیوں کے پاس نہ جائیں، کیونکہ اگر رومیوں نے آپ کو دیکھا تو آپ کے اوصاف کے ذریعہ آپ کو پہچان لیں گے اور آپ کو قتل کر دیں گے، ابھی وہ یہ درخواست کر ہی رہا تھا کہ مڑ کر دیکھا تو رومیوں کے سات آدمی وہاں پہنچ گئے، جن کا اس نے خیر مقدم کیا اور ان کے آنے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ: ''ہم اس لیے آئے ہیں کہ یہ نبی اسی ماہ نکلنے والا ہے اور کوئی بھی راستہ ایسا نہیں ہے جہاں لوگوں کو بھیج نہ دیا گیا ہو اور ہمیں اس کی خبر مل چکی ہے۔ اس لیے ہمیں تمہاری طرف آنے والے راستے پر بھیجا گیا ہے۔ راہب نے کہا: کیا تمہارے پیچھے کوئی ایسا رہ گیا ہے جو تم سے بہتر ہو؟ تو انہوں نے کہا: ہمیں تو تمہارے اس راستے کی خبر دی گئی ہے تو اس نے کہا: تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟ اگر اللہ نے کسی کام کا فیصلہ کر لیا ہو تو کیا تم اسے ٹال سکتے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا: نہیں...... راوی کہتا ہے...... اس پر ان ساتوں نے راہب کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اس کے ساتھ رہ گئے۔ اور راہب نے اکابر قریش سے کہا: میں تم لوگوں سے اللہ کے نام پر درخواست کرتا ہوں کہ ان کا ''ولی امر'' کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ابو طالب۔ تو وہ ان سے مسلسل درخواست کرتا رہا، یہاں تک کہ ابو طالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو واپس کر دیا اور آپ کے ساتھ ابو بکر نے بلال کو کر دیا اور راہب نے آپ کے ساتھ زادِ راہ کے طور پر کچھ کیک اور تیل کر دیا۔''

یہ عجیب و غریب روایت نقل کرنے کے بعد امام ترمذی نے لکھا ہے:

''یہ حدیث حسن غریب ہے اور اس کو میں صرف اسی سند سے جانتا ہوں۔''

اس روایت کے قبول اور عدم قبول کے بارے میں محدثین اور اہل سیر میں شدید اختلاف ہے۔ ایک فریق نے اس روایت کو جہاں یہ کہہ کر قبول کر لیا ہے کہ اس کی سند قابل اعتماد ہے تو دوسرے فریق نے اس روایت کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ اس کا متن منکر ہے۔

اس روایت کو صحیح کہہ کر قبول کرنے والوں میں امام الحاکم، حافظ ابن حجر اور البانی وغیرہ ہیں اور ان کے تائیدی موقف کا تمام تر مدار اس روایت کی سند پر ہے ان لوگوں نے اس کے متن اور مضمون سے کوئی بحث

نہیں کی ہے۔

رہا مخالف فریق جس میں سرفہرست امام الذہبی اور حافظ ابن کثیر ہیں، تو اس نے اس روایت کے متن میں نکارت اور غرابت کی وجہ سے اس کو رد کیا ہے اور امام الذہبی نے تو اس کو " المستدرك "کی تلخیص ۲/۶۱۵ " میں موضوع اور باطل کہہ دیا ہے۔ وہ اپنی کتاب " السیرۃ ، ص: ۵۷ " میں یہ روایت نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"یہ حدیث حد درجہ منکر ہے۔ اس وقت ابوبکر کہاں تھے، تو وہ دس سال کے رہے ہوں گے، کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ سے ڈھائی سال چھوٹے تھے۔ اور بلال کہاں تھے، ابوبکر نے تو ان کو بعثت کے بعد خرید کر آزاد کیا تھا، اس وقت تک تو شاید وہ پیدا بھی نہ ہوئے ہوں۔ اور اگر بادل نبی ﷺ پر سایہ کیے ہوئے تھا، تو پھر یہ تصور کرنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے کہ درخت کا سایہ آپ کی طرف مائل ہوگیا تھا، کیونکہ بادل کے سائے میں تو درخت کے سائے کو معدوم ہو جانا چاہیے تھا۔ پھر ہم نے نبی ﷺ کو ابوطالب سے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کبھی نہیں پایا اور نہ تو قریش ہی نے آپس میں ایک دوسرے سے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اور جو اکابر قریش ابوطالب کے ساتھ تھے، انہوں نے بھی کبھی اس واقعہ کو کسی سے بیان نہیں کیا، جبکہ اس کو ایک دوسرے سے بیان کرنے کے عوامل اور محرکات بہت تھے اور اگر یہ واقعہ پیش آیا ہوتا تو لوگوں میں اس کو خوب مشہور ہونا چاہیے تھا اور خود نبی ﷺ کو نبوت کے معاملے کا احساس ہوتا اور غار حراء میں پہلی وحی نازل ہونے کے موقع پر آپ کی وہ کیفیت نہ ہوتی جو ہوئی اور آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس حالت میں واپس نہ ہوتے کہ آپ کو اپنی عقل میں فتور کا اندیشہ ہوتا...... یا آپ کو اپنی جان کا خطرہ لاحق ہوتا...... اور اگر راہب کے کہنے پر ابوطالب اس قدر خوف زدہ ہوگئے تھے کہ راستے سے آپ کو واپس کر دیا، تو اُن کے دل نے ...... بعد میں ...... یہ کیسے گوارا کرلیا کہ آپ کو حضرت خدیجہ کا مال تجارت لے کر شام جانے کی اجازت دے دی۔"

امام الذہبی نے اس روایت کے بعض الفاظ کو بھی منکر کہا ہے۔ یوں تو انہوں نے اس روایت کے ناقابلِ قبول ہونے کے تقریبًا تمام اسباب بیان کر دیے ہیں۔ البتہ اس بات کا تذکرہ نہیں کیا ہے کہ خود قرآن سے بھی بصراحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کو نبوت کے منصب پر سرفراز کیے جانے سے قبل کبھی

ایک لمحہ کے لیے بھی آپ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں اور اگر ۱۲ سال کی عمر میں بعض روایات کے مطابق ۲۵ سال کی عمر میں بحیرا راہب کا واقعہ پیش آیا تھا اور اس نے اس قدر وثوق سے آپ کی نبوت کی پیشین گوئی کی تھی تو اس کا کوئی نہ کوئی اثر تو باقی رہنا چاہیے تھا اور جو لوگ اس واقعہ کے شاہد تھے، وہ اکابر قریش تھے، کم از کم ان کو آپ کی زبانِ مبارک سے اسلام کی دعوت سن کر یہ کہنا چاہیے تھا کہ یہ تو وہی بات ہے، جس کی پیشین گوئی بحیرا کر چکا ہے، مگر عجیب بات ہے کہ مشرکین مکہ میں سے کسی نے بھی آپ کی دعوت سن کر اس واقعہ کو یاد نہیں کیا اور جو لوگ ایمان لائے، انہوں نے بھی اُس اہم واقعہ کا کوئی حوالہ نہیں دیا اور نہ تو نبی ﷺ ہی نے نزول وحی کے بعد اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام کی دعوت دینے کا حکم ملنے پر قوم کو اس واقعہ کی یاد دلائی اور نہ دور مکی سے لے کر دور مدنی کے آخر تک کسی بھی صحابی کی زبان ہی سے وہ واقعہ سنا گیا۔ اس کے علاوہ جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ وہ اس بات کی بصراحت نفی کرتا ہے کہ آپ کو کتابِ الٰہی کے نزول کی کوئی امید تھی، جس سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی وحی نازل ہونے تک وحی وکتاب کا خیال بھی آپ کے دل میں نہیں پیدا ہوا تھا۔ سورۃ القصص میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَمَا كُنتَ تَرْجُوٓا۟ أَن يُلْقَىٰٓ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ﴿86﴾ ﴾

[الآية: ٨٦]

''تم اس بات کے امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی، یہ تو محض تمہارے رب کی مہربانی سے تم پر نازل ہوئی ہے۔''

امام محمد بن علی الشوکانی ''فتح القدیر: ۴/۲۳۳'' میں اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''تم یہ امید نہیں کر رہے تھے کہ ہم تم کو بندوں کی طرف رسول بنا کر بھیجیں گے اور تمہارے اوپر قرآن نازل کریں گے۔''

اس بات کو حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر ''۳/۲۷۲'' میں یوں کہتے ہیں:

''اے نبی! اپنے اوپر نزول وحی سے قبل تم کو یہ گمان تک نہیں تھا کہ تمہارے اوپر وحی نازل ہوگی۔ اور اللہ کی طرف سے تم پر جو وحی نازل ہوئی ہے وہ تو تمہارے اوپر اور تمہاری وجہ سے بندوں پر اللہ کی رحمت کے طور پر نازل ہوئی ہے۔''

اور سورۃ الشوریٰ کی آیت ۵۲ تو اس باب میں اور زیادہ صریح ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ ﴿52﴾ ﴾

[الآية: ۵۲]

''اے نبی! اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تمہاری طرف ایک روح وحی کی ہے تم کو کچھ بھی پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں، لیکن اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنادیا جس کے ذریعہ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں صحیح راہ دکھاتے ہیں۔''

ان وضاحتوں کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل صاف ہوگئی کہ بحیرا راہب کا قصہ بے بنیاد ہے اور امام الذہبی نے جو علم الاسناد کی طرح احادیث کے متن اور مضمون پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، بالکل سچ فرمایا ہے کہ یہ روایت بیحد منکر ہے۔

۱۲۹ ...... ((أَنَا بْنُ الذَّبِيْحَيْنِ))

''میں ذبیحین کا بیٹا ہوں۔''

یہ ایک بے بنیاد اور بے اصل حدیث ہے۔ اسی وجہ سے حافظ الزیلعی نے تخریج ''احادیث الکشاف: ۳/ ۱۷۷ '' میں اس کو ''غریب'' لکھا ہے۔ حافظ الزیلعی جب کسی حدیث کو ''غریب'' کہتے ہیں تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اور امام الترمذی جب کسی حدیث کو غریب کہتے ہیں تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ حدیث ضعیف ہے۔ حافظ ابن حجر نے بھی تخریج '' احادیث الکشاف: ۴/ ۱۴۱، ح: ۲۹۴ '' میں حافظ الزیلعی کی پیروی میں اس کو بے اصل قرار دیا ہے۔ اور حافظ السخاوی نے بھی '' مقاصد الحسنة ، ص: ۱۴ '' میں اپنے شیخ حافظ ابن حجر کی پیروی کی ہے۔

اس بے بنیاد حدیث سے متعلق اہل سیر وہ واقعہ بیان کرتے ہیں جو امام الطبری نے اپنی تفسیر '' ۲۳/ ۵۴ '' میں اور الحاکم نے '' المستدرك : ۲/ ۵۵۴ '' میں اس سند سے نقل کیا ہے:

((عَنْ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الرَّحِيْمِ الْخَطَابِيِّ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ مُحَمَّدٍ الْعُتْبِيِّ ...... مِنْ وَلَدِ عُتْبَةَ بْنِ أَبِيْ سُفْيَانَ ، عَنْ أَبِيْهِ : حَدَّثَنِيْ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَعِيْدٍ عَنِ الصُّنَابِحِيِّ قَالَ ......))

''عمر بن عبدالرحیم الخطابی سے روایت ہے، وہ عبداللہ بن محمد العتبی۔ عتبہ بن ابی سفیان کی اولاد سے تعلق رکھنے والے، سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے باپ سے کہا: مجھ سے عبداللہ بن

سعید نے الصنابحی ابوعبداللہ، سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا:

ہم لوگ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کی مجلس میں حاضر ہوئے، جہاں قوم نے ابراہیم علیہ السلام کے دونوں بیٹوں، اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام کا آپس میں ایک دوسرے سے ذکر کیا، ایک فریق نے کہا: ذبیح اسماعیل تھے اور دوسرے فریق کی رائے تھی کہ ذبیح اسحاق تھے۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: تم لوگ واقف کار اور خبیر کے پاس آئے ہو؟ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ کی خدمت میں ایک اعرابی آیا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں اپنے پیچھے صحرا کو خشک چھوڑ کر آیا ہوں اور پانی خشک ہو چکا ہے۔ اے ابن الذبیحین! مجھ پر اُن نعمتوں میں سے جن سے اللہ نے آپ کو نوازا ہے، کچھ فضل فرمائیے۔ یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا اور اس کی نکیر نہیں فرمائی۔ ہم لوگوں نے کہا: امیر المؤمنین! ذبیحین کون تھے؟ کہا:

جب عبدالمطلب نے ''بئر زم زم'' کھودنے کا حکم دیا تو انہوں نے اللہ کے لیے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ نے زمزم کھودنے کو آسان فرمایا تو وہ اپنے ایک بیٹے کو قربان کر دیں گے۔ پھر انہوں نے ان کے درمیان قرعہ ڈالا اور قرعہ میں عبداللہ کا نام نکلا۔ لہٰذا انہوں نے عبداللہ کو قربان کرنے کا ارادہ کیا لیکن بنو مخزوم کے ان ماموؤں نے ان کو ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا کہ اپنے رب کو راضی کرنے کے لیے اپنے بیٹے کے لیے فدیہ ادا کرو اس پر وہ راضی ہو گئے اور سو (۱۰۰) اونٹوں کا فدیہ دیا، اس طرح عبداللہ ذبیح قرار پائے اور دوسرے ذبیح اسماعیل علیہ السلام تھے۔''

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد امام الحاکم نے اسکی صحت وسقم کے بارے میں خاموشی سے کام لیا ہے، لیکن امام الذہبی نے المستدرک کی تلخیص میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

''اس کی سند بے حد کمزور ہے۔''

اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (۱۸/۴) میں یہ کہہ کر اس حدیث کو نا قابلِ اعتبار قرار دیا ہے:

''((هٰذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ جِدًّا)) ''یہ حدیث بے حد ضعیف ہے۔''

حافظ السیوطی نے ''الفتاوی: ۳۵/۲'' میں اس کی علت ان لفظوں میں بیان کی ہے:

''یہ حدیث ضعیف ہے اور اس کی سند میں ایسا راوی شامل ہے جو غیر معروف ہے۔''

[الضعیفه: ۱۷۲/٤، ۱۷۳]

۱۳۰ ...... ((لَمَّا نَزَلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ بِـ (حِرَاءٍ) مَكَثَ أَيَّامًا لَا يَرَى جِبْرِيْلَ وَحَزِنَ حُزْنًا شَدِيْدًا ، حَتَّى كَانَ يَغْدُوا إِلَى ثَبِيْرٍ مَرَّةً وَإِلَى حِرَاءٍ مَرَّةً ، يُرِيْدُ أَنْ يُلْقِيَ نَفْسَهُ مِنْهُ ، فَبَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كَذٰلِكَ عَامِدًا لِبَعْضِ تِلْكَ الْجِبَالِ ، إِلَى أَنْ سَمِعَ صَوْتًا ، فَوَقَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَعِقًا لِلصَّوْتِ ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ فَإِذَا جِبْرِيْلُ عَلَى كُرْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ مُتَرَبِّعًا عَلَيْهِ يَقُوْلُ : يَا مُحَمَّدُ! أَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَقًّا ، وَأَنَا جِبْرِيْلُ ، قَالَ : فَانْصَرَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ، وَقَدْ أَقَرَّ اللّٰهُ عَيْنَهُ وَرَبَطَ جَأْشَهُ ، ثُمَّ تَتَابَعَ الْوَحْيُ بَعْدُ وَحَمِيَ))

''جب حراء میں آپ پر وحی نازل ہوئی، تو کچھ دن آپ اس حالت میں رہے کہ جبریل کو نہیں دیکھتے تھے اس پر سخت رنجیدہ ہوئے یہاں تک کہ آپ کبھی ثبیر (ایک پہاڑ) کی طرف جاتے اور کبھی حراء کی طرف اس سے اپنے آپ کو گرا دیں اور ایسی حالت میں جبکہ رسول اللہ ﷺ اُن پہاڑوں کی طرف جا رہے تھے کہ آپ نے آسمان سے ایک آواز سُنی تو رسول اللہ ﷺ اس آواز پر حیران ہو کر ٹھہر گئے۔ پھر اپنا سر اوپر اٹھایا تو جبریل علیہ السلام آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر چہار زانو بیٹھے ہوئے تھے کہہ رہے تھے: اے محمد! آپ اللہ کے رسولِ (ﷺ) برحق ہیں۔ اور میں جبریل ہیں۔ یہ سُن کر رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لے گئے، اللہ نے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی کر دیں اور آپ کے دل کو قرار عطا کر دیا۔ پھر وحی پوری گرمی اور تسلسل سے نازل ہونے لگی۔''

اس حدیث کو محدث محمد ناصر الدین البانی نے ''سلسلة الاحاديث الضعيفه: ۱۶۰/۳ ، حدیث: ۱۰۵۲'' میں ضعیف قرار دیا تھا اور پھر مسلسل تحقیق و بحث کے بعد مذکورہ کتاب کی جلد ۱۰ص: ۴۵۰ اور حدیث نمبر: ۴۸۵۸ میں اس کو باطل قرار دیا ہے۔ ان کی تحقیق کا خلاصہ درج ذیل ہے:

''اس حدیث کی تخریج ابن سعد نے ''الطبقات: ۹۶/۱'' میں اس سند سے کی ہے:

((أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عُمَرَ ، قَالَ : حَدَّثَنِيْ إِبْرَاهِيْمُ بْنُ مُحَمَّدِ ابْنِ أَبِيْ مُوسَى عَنْ دَاوُدَ بْنِ الْحُصَيْنِ عَنْ أَبِيْ غَطْفَانَ بْنِ طُرَيْفٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ))

''ہم کو محمد بن عمر نے خبر دی، کہا: مجھ سے ابراہیم بن محمد بن ابی موسیٰ نے داؤد بن الحصین سے، انہوں نے ابوغطفان بن طریف سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے

بیان کیا......''

یہ سند موضوع ہے اور اس کی مصیبت یا تو محمد بن عمر الواقدی ہے جس پر وضع حدیث کا الزام ہے۔ حافظ ابن حجر نے ''التقریب التھذیب ، ص:۴۹۸، ترجمہ:۶۱۷۵ '' میں اس کے بارے میں لکھا ہے:''اپنی وسعت علم کے باوجود متروک ہے۔''

یا ابراہیم بن محمد بن ابوموسیٰ ہے۔ ابن ابی یحییٰ۔ اس کا نام سمعان الاسلمی ہے یہ بھی الواقدی کی طرح متروک ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ برا ہے۔'' حافظ ابن حجر نے ''تقریب التھذیب، ص:۴۳، ترجمہ:۲۴۱ '' میں اس کو متروک لکھا ہے۔ اور ''تھذیب التھذیب'' میں اس پر طعن کرنے والے ائمہ حدیث کے اقوال نقل کیے ہیں جو تقریباً سب کے سب اس کی تکذیب پر متفق ہیں۔ انہی اقوال میں سے ایک ''الحرابی'' کا یہ قول بھی ہے:

''محدثین نے اس کی روایت کردہ حدیثوں سے اعراض برتا ہے اور ''الواقدی'' نے اس سے ایسی حدیثیں روایت کی ہیں جو موضوع لگتی ہیں، لیکن الواقدی زیادہ برا، تالیف، ہے۔''

سند میں اس کا نام ''ابن ابی موسیٰ'' مذکور ہے جو ''ابن ابی یحییٰ کی تحریف شدہ شکل ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ ''الواقدی'' نے یہ ''تدلیس'' کی ہو، کیونکہ وہ اُس کے علاوہ دوسروں کے ناموں کے بارے میں بھی ''تدلیس'' کا ارتکاب کر چکا ہے۔ چنانچہ عبدالغنی بن سعید المصری نے اس کی ''تدلیس'' کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ ابراہیم بن محمد بن ابی عطاء ہے جس سے ابن جریج نے حدیث روایت کی ہے، وہ عبدالوہاب ہے جس سے مروان بن معاویہ حدیث روایت کیا کرتے تھے، اور وہ ''ابوالذئب'' ہے جس سے ابن جریج حدیث روایت کرتے تھے۔''

البانی آگے چل کر لکھتے ہیں:

''جان لو کہ یہ واقعہ باطل ہے جو ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اُس حدیث میں شامل ہو گیا ہے جس میں انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کے آغاز کی کیفیت بیان کی ہے اور اس حدیث کی تخریج کرنے والے بعض محدثین کی روایتوں میں اس کا اضافہ، مدرج، ہو گیا ہے اور صحیح بخاری میں امام الزہری سے جو حدیث (کتاب التعبیر ، باب اوّل ما بُدئَ به رسول الله صلى الله عليه وسلم من الوحی ، الرؤیا الصالحه) مروی ہے۔ اس میں بھی ان

کے ''بلاغات'' کے طور پر یہ واقعہ شامل ہے اور جو ''عقیل و معمر عن ابن شہاب الزہری عن عروۃ عن عائشہ'' کی سند سے مروی ہے، اور حدیث کا آخری فقرہ ان الفاظ میں ہے:

((وَفَتَرَ الْوَحْيُ فَتْرَةً حَتَّى حَزِنَ النَّبِيُّ ﷺ ، فِيمَا بَلَغَنَا ، حُزْنًا غَدَا مِنْهُ مِرَارًا كَيْ يَتَرَدَّى مِنْ رُؤُسِ شَوَاهِقِ الْجِبَالِ ، فَكُلَّمَا اَوْفَى بِذِرْوَةِ جَبَلٍ لِكَيْ يُلْقِيَ مِنْهُ نَفْسَهُ تَبَدَّى لَهُ جِبْرِيْلُ ، فَقَالَ : يَا مُحَمَّدُ! اِنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ حَقًّا ، فَيَسْكُنُ لِذٰلِكَ جَاشُهُ وَتَقِرُّ نَفْسُهُ ، فَيَرْجِعُ ، فَإِذَا طَالَتْ عَلَيْهِ فَتْرَةُ الْوَحيِ غَدَا لِمِثْلِ ذٰلِكَ فَإِذَا اَوْفَى بِذِرْوَةِ جَبَلٍ تَبَدَّى لَهُ جِبْرِيْلُ ، فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ))

''اور نزولِ وحی کا سلسلہ ایک عرصہ کے لیے رُک گیا یہاں تک کہ نبی ﷺ غمگین ہو گئے، اور اس واقعہ کے بارے میں ہمیں جو خبر ملی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کو اس قدر غم لاحق ہو گیا کہ اس کی وجہ سے آپ نے کئی بار یہ ارادہ کیا کہ پہاڑوں کی چوٹیوں سے اپنے آپ کو نیچے گرا دیں، اور جب بھی آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے تا کہ اس سے اپنے آپ کو گرا دیں تو جبریل نمودار ہو جاتے اور کہتے: یا محمد! آپ اللہ کے برحق رسول ہیں، اس طرح آپ کا اضطراب ختم ہو جاتا اور دل کو قرار آ جاتا اور آپ واپس چلے جاتے اور جب آپ پر نزولِ وحی کا وقفہ طول پکڑ لیتا تو آپ دوبارہ پہلے کی طرح نکل کھڑے ہوتے اور جب کسی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے تو جبریل دوبارہ نمودار ہو کر وہی کہتے جو پہلے کہہ چکے تھے۔''

''بخاری میں مروی حدیث کے سیاق سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ ''اضافہ'' (فِيمَا بَلَغَنَا " اور اس کے بعد کا حصہ) عُقیل اور معمر دونوں کی روایتوں میں ہے جبکہ حافظ ابن حجر کی تحقیق یہ ہے کہ یہ واقعہ صرف ''معمر'' کی روایت میں ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ امام بخاری نے یہ حدیث عقیل کی روایت سے صحیح بخاری کے شروع میں بیان کی ہے اور اس میں یہ اضافہ نہیں ہے۔'' [کتاب بدء الوحی / باب: ۳، حدیث: ۳]

اور اس سے زیادہ مضبوط دلیل تو یہ ہے کہ ابونعیم نے اپنی ''المستخرج'' میں عقیل کی سند سے اس حدیث کی تخریج شیخ البخاری، یحییٰ بن بکیر کے طریقے سے کی ہے اور اس میں یہ ''اضافہ'' نہیں ہے اور جب معمر کے اشتراک سے یہ حدیث عقیل سے روایت کی ہے تو یہ واضح کر دیا ہے کہ الفاظ معمر کے ہیں اسی طرح الاسماعیلی نے یہ تصریح کی ہے کہ یہ اضافہ صرف معمر کی روایت میں ہے۔

❶ ٦٩٨٢

اور اس حدیث کی تخریج امام احمد، امام مسلم، امام الاسماعیلی اور حافظ ابونعیم نے اصحاب اللیث کے متعدد لوگوں کے ''طرق'' سے کی ہے اور جن میں سے کسی میں بھی یہ ٹکڑا نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر ''فتح الباری: ۳/۱۴/۳۱۱'' میں لکھتے ہیں:

''پھر یہ کہ ((فِیما بَلَغَنَا)) کے قائل الزہری ہیں، اور ان کے اس قول کا مطلب ہے کہ اس قصہ سے متعلق نبی ﷺ کے بارے میں ہمیں جتنی خبریں ملی ہیں وہ الزہری کے ''بلاغات'' میں شمار ہوتی ہیں اور وہ ''موصول'' (اس حدیث کا حصہ) نہیں ہیں اور ابن مردویہ کی تفسیر میں ''محمد بن کثیر عن معمر'' کی سند سے جو روایت مذکور ہے اس میں ((فِیما بَلَغَنَا)) والا فقرہ نہیں ہے۔ اور اس روایت کے الفاظ ہیں: ((فَتْرَةٌ حَزِنَ النَّبِیُّ ﷺ مِنْهَا حُزْنًا غَدَامِنْهُ ......)) آخر تک اس طرح یہ پورا فقرہ ''عروۃ عن عائشۃ'' سے الزہری کی روایت پر اضافہ (مدرج) ہے اور اس فقرہ کے بغیر پہلی روایت ہی مستند ہے۔''

خلاصۂ کلام یہ کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف اور متن کے اعتبار سے منکر ہے اور ایمان سے معمور دل اُن ضعیف راویوں کی تصدیق پر مطمئن نہیں ہوسکتا جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی جانب پہاڑ سے گرا کر اپنے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ منسوب کر دیا ہے، جبکہ نبی ﷺ کے ارشادِ مبارک ہے:

((مَنْ تَرَدَّى مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ يَتَرَدَّى فِيْهِ خَالِدًا مُخَلَّداً فِيْهَا اَبَدًا وَمَنْ تَحَسَّى سُمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهُ ، فَسُمُّهُ فِيْ يَدِهِ يَتَحَسَّاهُ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِداً مُخَلَّدًا فِيْهَا اَبَدًا ،وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِحَدِيْدَةٍ فَحَدِيْدَ تُهُ فِيْ يَدِهِ يَجَأُبِهَا فِيْ بَطْنِهِ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّداً فِيْهَا اَبَداً)) [1]

''جس نے اپنے آپ کو کسی پہاڑ سے گرا کر ہلاک کر دیا تو وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ اپنے آپ کو گراتا رہے گا، اور جس نے زہر پی کر اپنے آپ کو مار ڈالا تو اس کا زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا اور جہنم کی آگ میں وہ ہمیشہ ہمیش وہ زہر گھونٹ گھونٹ پیتا رہے گا اور جس نے اپنے آپ کو کسی لوہے کے آلہ سے قتل کر ڈالا تو اس کا وہ آلہ اس کے ہاتھ میں ہوگا اور جہنم کی آگ میں وہ اس آلے سے ہمیشہ ہمیش اپنے پیٹ کو زخمی کرتا رہے گا۔''

اس متفق علیہ حدیث کی روشنی میں کیا اس بات کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ نبی معصوم ﷺ نے یہ ارادہ

[1] صحیح بخاری، حدیث: ۵۷۷۸۔ صحیح مسلم: ۳۰۰

فرمایا ہوگا کہ اپنے آپ کو کسی پہاڑ سے گرا کر جان دے دیں، حاشاء وکلا۔

۱۳۱ ...... ((لَمَّا نَزَلَتْ ﴿ قُلْ لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى ﴾ قَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ! وَمَنْ قَرَابَتُكَ هٰؤُلَاءِ الَّذِينَ وَجَبَتْ عَلَيْنَا مَوَدَّتُهُمْ؟ قَالَ : عَلِيٌّ وَفَاطِمَةُ وَأَبْنَاهُمَا))

''جب آیت: ﴿ قُلْ لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى ﴾ نازل ہوئی تو صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہ آپ کے کون قرابت دار ہیں جن سے محبت اور دوستی کرنا ہمارے اوپر فرض ہے؟ فرمایا: علی، فاطمہ اور ان کے دونوں بیٹے۔''

یہ حدیث باطل ہے۔ اس کی تخریج حافظ الطبرانی نے ''المعجم : ۱/ ۱۲۴'' میں اور القطیعی نے ''الزيادات على الفضائل: ۲/ ۶۶۹'' میں حرب بن حسن الطحان سے روایت کرتے ہوئے کی ہے:

((اَخْبَرَنَا حُسَيْنُ الْأَشْقَرُ عَنْ قَيْسِ بْنِ الرَّبِيعِ عَنِ الْأَعْمَشِ عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قال......))

''ہم کو حسین الاشقر نے قیس بن الربیع سے، انہوں نے الاعمش سے، انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے خبر دی کہ انہوں نے فرمایا......''

یہ سند تاریک اور متعدد علتوں سے پر ہے:

① قیس بن الربیع اپنے برے حافظہ کے باعث ضعیف ہے۔

② حسین الاشقر: اس کے بارے میں حافظ ابن حجر ''تقریب التہذیب: ۱۰۶، ترجمہ: ۱۳۱۸'' میں لکھتے ہیں:

((صُدُوقٌ يَهِمُ وَيَغْلُو فِي التَّشَيُّعِ)) سچا تھا مگر وہم کا مریض تھا اور تشیع میں غلو سے کام لیتا تھا۔''

③ حرب بن حسن الطحان: اس کے بارے میں امام الذہبی نے ''میزان الاعتدال'' میں امام الازدی کا یہ قول نقل کیا ہے: ''اس کی حدیثیں قوی نہیں ہیں۔''

رہے امام ابن حبان تو انہوں نے اس کو ''ثقات'' میں شمار کیا ہے جیسا کہ لسان المیزان میں مذکور ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی حدیث کی سند میں موجود یہ تینوں علتیں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ان تینوں راویوں میں سے کوئی ایک اس حدیث کی اصل علت ہے کیونکہ یہ حدیث اپنے متن

کے اعتبار سے منکر ہے جس کی نکارت واضح ہے۔ بلکہ دو وجہ سے باطل ہے:

۱۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں جو قول ثابت ہے وہ اس باطل حدیث کے خلاف ہے اور ان سے صحیح سند سے یہ مروی ہے کہ انھوں نے سعید بن جبیر سے ''المودۃ فی القربیٰ'' کی یہ تفسیر سننے پر کہ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کے ''قرابت دار'' ہیں۔'' ناپسند فرمایا تھا اور اس تفسیر سے انکار کیا تھا، چنانچہ امام شعبہ نے روایت کیا ہے:

''مجھ کو عبدالملک نے خبر دی، کہا: میں نے طاؤس کو کہتے ہوئے سنا ہے:

ایک آدمی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿ قُلْ لَّآ أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾ کی تفسیر دریافت کی تو سعید بن جبیر نے کہا: محمد ﷺ کے قرابت دار ''اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تم نے جلد بازی کر دی، درحقیقت قبیلۂ قریش کی کوئی بھی شاخ ایسی نہ تھی جس میں رسول اللہ ﷺ کی قرابت داری نہ رہی ہو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ:

''میں دعوتِ حق کے کام پر تم سے کوئی اجر تو نہیں چاہتا الا یہ کہ تم میرے اور اپنے درمیان قرابت داری اور رشتہ داری کا لحاظ کر کے ''صلۂ رحمی'' سے کام لو۔''

صحیح بخاری میں یہ واقعہ ان الفاظ میں مروی ہے:

((حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ : حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ : حَدَّثَنَا شُعْبَةُ : عَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ مَيْسَرَةَ قَالَ: سَمِعْتُ طَاوُسًا ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا : أَنَّهُ سُئِلَ عَنْ قَوْلِهِ : ﴿ إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾ فَقَالَ سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ : قُرْبَى آلِ مُحَمَّدٍ ﷺ "فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ : عَجِلْتَ ، إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمْ يَكُنْ بَطْنٌ مِنْ قُرَيْشٍ إِلَّا كَانَ لَهُ فِيهِمْ قَرَابَةٌ ، فَقَالَ : إِلَّا أَنْ تَصِلُوا مَا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ مِنَ الْقَرَابَةِ)) [1]

''ہم سے محمد بن بشار نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن جعفر نے بیان کیا، کہا: ہم سے شعبہ نے عبدالملک بن میسرہ روایت کرتے ہوئے بیان کیا، کہا: میں نے طاؤس کو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے سنا کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿ إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾

[1] حدیث: ٤٨١٨

کے بارے میں سوال کیا گیا تو سعید بن جبیر نے کہا: اس سے آلِ محمد ﷺ کے قرابت دار مراد ہیں۔" اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تم جلد بازی کر بیٹھے۔ دراصل قبیلۂ قریش کی کوئی ایسی شاخ نہیں تھی جس میں نبی ﷺ کی قرابت داری نہ رہی ہو تو فرمایا: الا یہ کہ تم لوگ میرے اور تمہارے درمیان جو رشتہ اور قرابت ہے اس کا لحاظ کرو۔"

۲ دوسری وجہ اس کے باطل ہونے کی یہ ہے کہ یہ آیت مکی ہے جیسا کہ ایک سے زیادہ حفاظ حدیث کا قول ہے، مثلاً حافظ ابن کثیر اور حافظ ابن حجر وغیرہ۔

تو اللہ تعالیٰ علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہما اور ان کی اولاد سے محبت کا حکم کیوں کر دے سکتا تھا جبکہ ابھی ان کی شادی تک نہیں ہوئی تھی، اسی وجہ سے حافظ ابن حجر نے "فتح الباری: ۲/۲۱۱۰" میں لکھا ہے:

"اس کی سند نہایت کمزور ہے اور اس میں ایک راوی ضعیف اور رافضی ہے جو اس صحیح حدیث کی مخالفت کی وجہ سے ساقط الاعتبار ہے...... اور پھر یہ کہ یہ سورت مکی ہے۔"

لہٰذا اس آیت کی وہی تفسیر صحیح ہے جو اس اُمت کے ترجمان القرآن سے صحیح بخاری کی مذکورہ حدیث میں مذکور ہے، بلاشبہ اہل بیت کے ساتھ حسن سلوک اور ان کا احترام و تعظیم مطلوب ہے کیونکہ ان کا تعلق نہایت پاکباز ذریت سے ہے اور ان کی نسبت اس زمین پر پائے جانے والے اشرف ترین گھرانے سے ہے۔" [الضعیفه: ۱۰/۷۲۳، ۷۲۶]

صحیح احادیث میں حضرت علی حضرت فاطمہ اور حضرت حسن و حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے فضائل و مناقب بیان ہوئے جن کا انکار وہی شخص کر سکتا ہے جس کا دل ایمان اور رسول اللہ ﷺ کی محبت سے خالی ہو، مگر اس کا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے آل بیت کے مناقب میں جھوٹی حدیثیں وضع کی جائیں یا موضوع اور منکر حدیثوں کو لوگوں میں پھیلایا جائے۔

دوم یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا کفار سے یہ مطالبہ کہ "دعوتِ حق کی راہ میں میری کوششوں کا یہ صلہ مجھے دو کہ میرے رشتہ داروں سے محبت کرو، عقل و نقل اور انبیاء علیہم السلام کی سیرت کے خلاف ہے اور نبی اکرم ﷺ تو سید المرسلین تھے، پھر آپ ان سے یہ مطالبہ کیونکر کر سکتے تھے؟

رہا نبی اکرم ﷺ کا کفار سے یہ مطالبہ کہ "اگر تم میری دعوت کو سُن اور قبول نہیں کر رہے ہو تو کم از کم یہ ستم تو نہ کرو کہ عربوں میں تم ہی میری عداوت اور دشمنی میں سب سے آگے نکل جاؤ، تم لوگوں سے میرا خونی رشتہ ہے، بعثت سے قبل تم میری تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے آخر میرے اندر وہ کونسی تبدیلی آ گئی ہے کہ تم

لوگ میری عداوت اور دشمنی پر تُل گئے ہو، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اور جس چیز کی تمہیں دعوت دے رہا ہوں اس میں تو تمہارے لیے خیر ہی خیر ہے، مزید یہ کہ میں یہ کام خالص لوجہ اللہ کر رہا ہوں، مجھے تمہارا کوئی صلہ نہیں چاہیے اس لیے کہ کم از کم میری قرابت کا اعتبار کرتے ہوئے میری دعوت سنو تو سہی'' تو آپ کا یہ مطالبہ عین قرین عقل ہے۔

۱۳۲ ...... ((كَانَ إِذَا نَظَرَ إِلَى الْبَيْتِ قَالَ : اَللّٰهُمَّ زِدْ بَيْتَكَ هٰذَا تَشْرِيفًا وَتَعْظِيمًا وَتَكْرِيمًا وَبِرًّا وَمَهَابَةً))

''جب نبی ﷺ بیت اللہ کو دیکھتے تھے تو فرماتے تھے: اے اللہ! تو اپنے اس گھر کی عزت، عظمت، احترام اور بزرگی اور ہیبت میں اضافہ کر۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی روایت طبرانی نے ''المعجم الکبیر : ۳۱۲/۱، ۳۱۳'' اور ''المعجم الاوسط: ۱۱۷/۱'' میں اور انہی سے عبدالغنی المقدسی نے ''السنن : ۳۱۴/۲'' میں عمر بن یحییٰ الایلی کے طریقے سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا عَاصِمُ بْنُ سُلَيْمَانَ الْكُوزِيُّ ، عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ ، عَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ أُسَيْدٍ مَرْفُوعًا))

''ہم سے عاصم بن سلیمان الکوزی نے، زید بن اسلم سے، انہوں نے ابوالطفیل اور انہوں نے حذیفہ بن اسید سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا......''

حافظ الطبرانی نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''یہ حدیث ابی سریحہ سے صرف اسی سند سے روایت کی جاتی ہے جس کی روایت میں عمر منفرد ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی کہتے ہیں:

''عمر بن یحییٰ الایلی کے بارے میں امام عبداللہ بن عدی کا قول ہے کہ وہ حدیثوں کا سرقہ کرتا تھا۔''

اور عاصم بن سلیمان الکوزی عمر بن یحییٰ سے بھی زیادہ برا تھا، وہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا جیسا کہ الفلاس، ابن عدی اور الساجی نے تصریح کی ہے اور الہیثمی نے اس حدیث کی یہی علت بیان کی ہے مگر عاصم کو ''مجمع الزوائد: ۲۳۸/۳'' میں متروک لکھا ہے۔'' [الضعیفہ: ۲۲۷/۹-۲۲۸]

۱۳۳ ...... ((كَانَ إِذَا وَطِئَ أَثَّرَ قَدَمُهُ فِي الْحَجَرِ وَإِذَا وَطِئَ فِي الرَّمْلِ لَمْ يَكُنْ يُؤَثِّرُ))

''جب نبی ﷺ پتھر کو روندتے تھے تو پتھر پر آپ کے قدم مبارک کا نشان پڑ جاتا تھا اور جب آپ ریت پر زور سے پاؤں رکھتے تھے تو اس پر کوئی نشان نہیں پڑتا تھا۔''

یہ روایت باطل ہے۔ امام ابن تیمیہ نے فرمایا ہے کہ: ''نبی ﷺ کی سیرت پاک سے واقف کسی عالم نے یہ روایت نقل نہیں کی ہے۔'' [الفوائد الموضوعه فی الاحادیث الموضوعه، ص: ۷۲، حدیث: ۲]

۱۳۴ ...... ((أَخَذْتُ مِنْ لِحْيَةِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ ، فَقَالَ لَايُصِيبُكَ الشَّرُّ))

''میں نے رسول اللہ ﷺ کی داڑھی سے چند بال لے لیے تو فرمایا: تمہیں کوئی مصیبت اور برائی لاحق نہیں ہوگی۔''

یہ موضوع ہے۔ اس کی سند میں ابوعمر الجلی ہے جو موضوع حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔

[معرفة التذكرة فی الاحادیث الموضوعه ، ص: ۸۷، حدیث: ۳۱]

۱۳۵ ...... ((قَالَ النَّبِيُّ ﷺ : اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ اَخْرَجْتَنِيْ مِنْ أَحَبِّ الْبِقَاعِ إِلَيَّ فَأَسْكِنِّي فِي أَحَبِّ الْبِقَاعِ إِلَيْكَ " فَأَسْكَنَهُ اللّٰهُ الْمَدِيْنَةَ))

''نبی ﷺ نے فرمایا ہے: اے اللہ! تو نے مجھے اس خطۂ زمین سے نکال دیا جو مجھے بے حد پسند تھا تو اب مجھے اس خطۂ زمین میں آباد کر دے جو تیرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو مدینہ میں آباد کر دیا۔''

امام ابن تیمیہ نے اس کو باطل قرار دیا ہے اور امام الذہبی کا قول ہے کہ یہ موضوع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین جگہ مکہ ہے۔'' [الفوائد الموضوعه، حدیث: ۱۳۶]

۱۳۶ ...... ((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ، قُلْتُ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ !أَيْنَ كُنْتَ وَآدَمُ فِي الْجَنَّةِ؟ قَالَ : كُنْتُ فِي صُلْبِهِ ،وَاُهْبِطَ إِلَى الْأَرْضِ وَأَنَا فِي صُلْبِهِ ، وَرَكِبْتُ السَّفِيْنَةَ فِي صُلْبِ أَبِيْ ، نُوحٍ ، وَقُذِفَ بِيْ فِي النَّارِ فِي صُلْبِ أَبِيْ : إِبْرَاهِيمَ ، لَمْ يَلْتَقِ لِي أَبَوَانِ قَطُّ عَلَى سِفَاحٍ ، لَمْ يَزَلْ يَنْقُلُنِيْ مِنَ الْأَصْلَابِ الطَّاهِرَةِ إِلَى الْأَرْحَامِ النَّقِيَّةِ مُهَذَّبًا ، لَا تَتَشَعَّبُ شُعْبَتَانِ إِلَّا كُنْتُ فِيْ خَيْرِهِمَا فَاَخَذَ اللّٰهُ لِي بِالنُّبُوَّةِ مِيْثَاقِيْ ، وَفِي التَّوْرَاةِ بَشَّرَ بِيْ ، وَفِي الْاِنْجِيلِ شَهَّرَ إِسْمِيْ تُشْرِقُ الْأَرْضُ لِوَجْهِي وَالسَّمَاءُ لِرُؤْيَتِي وَرُقِيَّ بِي فِي سَمَائِهِ وَشَقَّ لِي إِسْمًا مِنْ

إِسْمَائِهِ فَذُو الْعَرْشِ مَحْمُودٌ وَاَنَا مُحَمَّدٌ))

''ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ اس وقت کہاں تھے جب آدم جنت میں تھے؟ فرمایا: میں اُن کے صلب (ریڑھ کی ہڈی) میں تھا اور جب اُن کو زمین پر اُتارا گیا تو اس وقت بھی میں ان کے صلب میں تھا اور میں اپنے باپ نوح علیہ السلام کے صلب میں سفینۂ نوح میں سوار ہوا اور مجھے میرے باپ ابراہیم علیہ السلام کے صلب میں رکھ کر آگ میں پھینکا گیا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میرے والدین آپس میں بدکاری کی حالت میں ایک دوسرے سے ملے ہوں، اللہ تعالیٰ مجھے برابر پاک ریڑھ کی ہڈیوں (اصلاب) سے پاک رحموں میں منتقل کرتا رہا درانحالیکہ میں ہر وقت تہذیب یافتہ تھا اور جب بھی لوگوں کی دو شاخیں بنیں تو میں ان میں سے سب سے بہتر شاخ میں رہا۔ اللہ تعالیٰ نے میری نبوت کا لوگوں سے عہد لیا، تورات میں میری بشارت دی اور انجیل میں میرے نام کو شہرت سے نوازا۔ زمین میرے چہرے کی وجہ سے روشن ہے اور آسمان میرے دیدار کے باعث منور ہے اور مجھے اللہ کے آسمانوں کی بلندیوں میں لیجایا گیا اور اللہ نے اپنے نام سے میرا نام نکالا اس طرح عرش والا محمود اور میں محمد ہوں۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی سند میں شامل تین راوی ہناد النسفی اور علی بن محمد بن بکران اور ابو صالح خلف بن محمد بن اسماعیل ہیں:

- ۱ ہناد بن ابراہیم ابو المظفر النسفی موضوع روایات کا راوی تھا۔
- ۲ اس کا شیخ علی بن محمد بن بکران وضاع حدیث تھا۔
- ۳ اور علی بن محمد کا شیخ خلف بن محمد بن اسماعیل ابو صالح پر امام ابن الجوزی نے حدیثیں وضع کرنے کا الزام لگایا ہے۔''

[تنزیه الشریعة المرفوعة عن الأخبار الشنیعة الموضوعة: ۱/ ۳۲۱]

۱۳۷ ...... ((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ، قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى فَضَّلَ الْمُرسَلِيْنَ عَلَى الْمُقَرَّبِيْنَ ، لَمَّا بَلَغْتُ السَّمَاءَ السَّابِعَةَ لَقِيَنِيْ مَلَكٌ مِنْ نُورٍ عَلَى سَرِيْرٍ مِنْ نُورٍ ، فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ عَلَيَّ السَّلَامَ فَاَوحى اللّٰهُ إِلَيْهِ أَيُسَلِّمُ عَلَيْكَ صَفِيِّ وَنَبِيِّ فَلَمْ تَقُمْ لَهُ ، وَعِزَّتِيْ وَجَلَالِيْ لَتَقُوْمَنَّ فَلَا تَقْعُدُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ))

''ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

بے شک اللہ تعالیٰ نے مرسلین کو مقربین پر فضیلت دی ہے، جب میں ساتویں آسمان پر، معراج کی رات پہنچا تو مجھ سے نور کا ایک فرشتہ ملا جو نور کی ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا، میں نے اس کو سلام کیا تو اس نے مجھے سلام کا جواب دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو وحی کی کہ میرا صفی اور میرا نبی سلام کرے اور تو اس کے لیے کھڑا نہ ہو، میری عزت و جلال کی قسم تو ضرور کھڑا ہو گا اور تجھے قیامت تک بیٹھنا نصیب نہ ہو گا۔''

حافظ الخطیب البغدادی نے اس کی روایت کی ہے اور اس کو موضوع اور باطل قرار دیا ہے، اس کی سند کے راوی ثقہ ہیں سوائے محمد بن مسلمہ الواسطی کے، میں نے ہبۃ اللہ الطبری کو ''ابن مسلمہ'' کی تضعیف کرتے ہوئے دیکھا ہے، اس طرح میں نے ابو محمد الخلال کو کہتے ہوئے سُنا ہے کہ وہ بے حد ضعیف ہے۔ [تنزيه الشريعة: ١/ ٣٢٦]

١٣٨ ...... ((أَدَّبَنِيْ رَبِّيْ فَأَحْسَنَ تَأْدِيْبِيْ))

''میرے رب نے مجھے ادب سکھایا پس بہترین ادب سکھایا یا میرے رب نے مجھے ادب و اخلاق کی تعلیم دی پس بہترین تعلیم دی''

امام ابن تیمیہ نے '' احادیث القصاص: ۹۴، ح: ۷۸ '' میں اس کو معناً صحیح بتایا ہے، مگر سند کے اعتبار سے اس کو بے بنیاد قرار دیا ہے، یعنی یہ عبارت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک نہیں ہے۔

اور حافظ اسماعیل بن محمد العجلونی '' كشف الخفاء و مزيل الالباس: ۱/ ۷۰، ح: ۱۶۴'' میں لکھتے ہیں: ''اس کی روایت العسکری نے ...... علی بن سعید ...... علی رضی اللہ عنہ سے کی ہے، بنو نہد بن زید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ہم لوگ تہامہ کی لڑائیوں سے آپ کی خدمت میں آئے ہیں۔ کہا: اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے خطبہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا ذکر کیا ہے، پھر کہا: ''ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! ہم لوگ ایک باپ کے بیٹے ہیں اور ہماری نشو و نما بنی سعد بن بکر میں ہوئی ہے۔'' اس کی سند بیحد ضعیف ہے، اگرچہ ہمارے شیخ حافظ ابن حجر نے اپنے بعض فتووں میں اس پر صرف ''غریب'' ہونے کا حکم لگانے پر اکتفا کیا ہے۔''

حافظ العجلونی نے اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افصح العرب ہونے کے موضوع پر متعدد روایات کا ذکر کیا ہے، جن میں سے کسی کی سند بھی صحیح نہیں اور ساری روایتوں کی سند السدی عن علی پر گھومتی ہے۔

اور اس حدیث کو ابو الفضل بن ناصر کے علاوہ ائمہ حدیث میں سے کسی نے بھی ''صحیح الاسناد'' نہیں قرار دیا ہے۔ [الضعیفہ: ۱/۱۷۳، احادیث القصاص ، ح: ۷۸ ، المقاصد الحسنة : ۲۹ ، کشف الخفاء : ۱/ ۷۰ ، ح: ۱٦٤ ، تذکرة الموضوعات: ۸۷ اور الفوائد الموضوعة ، ح: ٤۹]

یہاں پر یہ واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا عربوں میں سب سے زیادہ فصیح و بلیغ ہونا ایک مسلمہ امر ہے اور آپ کی اس صفت کو ثابت کرنے کے لیے ہم بے بنیاد اور باطل روایات کے محتاج نہیں ہیں، بلکہ ہزاروں کی تعداد میں آپ کی زبانِ مبارک سے نکلی ہوئی صحیح احادیث اس کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔

۱۳۹ ...... ((وَلِدْتُ فِيْ زَمَنِ الْمَلِكِ الْعَادِلِ وَفِيْ رِوَايَةٍ : بُعِثْتُ فِيْ زَمَنِ الْمَلِكِ الْعَادِلِ))

''میں منصف بادشاہ کے زمانے میں پیدا ہوا۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے میں عادل بادشاہ کے زمانے میں مبعوث ہوا۔''

یہ حدیث موضوع، بے اصل اور نبی ﷺ کی طرف منسوب جھوٹ ہے۔ اس بے بنیاد روایت میں عادل بادشاہ سے مراد کسریٰ نوشروی کو لیا گیا ہے۔

حافظ العجلونی ''کشف الخفاء: ۲/۳۴۰، ۳۴۱'' میں لکھتے ہیں:

''الصنعانی نے اس روایت کو ''ملكٍ عادلٍ'' یعنی نکرہ نقل کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ یہ موضوع ہے۔ اور حافظ السخاوی نے ''المقاصد الحسنة ، ح: ۴۵۴'' میں اس کو بے اصل اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔ اور ابو سعید الحافظ السمعانی نے لکھا ہے کہ ابو بکر القاضی الجبری نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ صالحین میں سے ایک شیخ نے خواب میں نبی ﷺ کو دیکھا اور آپ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے خبر ملی ہے کہ آپ ایک عادل بادشاہ کے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور جب میں نے ابو عبداللہ الحافظ الحاکم سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ خبر جھوٹ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا ہے، اس پر نبی ﷺ نے فرمایا: ''ابو عبداللہ نے سچ کہا۔''

۱٤۰ ...... ((مَنْ زَارَنِيْ بَعْدَ مَوْتِيْ ، فَكَأَنَّمَا زَارَنِيْ فِيْ حَيَاتِيْ))

''جس نے میری موت کے بعد میری زیارت کی تو گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت

کی۔"

یہ حدیث باطل ہے، اس کی روایت الدارقطنی نے "السنن: ۲۷۹، ۲۸۰" میں اس سند سے کی ہے:

((عَنْ هَارُوْنَ أَبِيْ قَزَعَةَ عَنْ رَجُلٍ مِنْ آلِ حَاطِبٍ عَنْ حَاطِبٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :))

"ہارون ابوقزعہ سے روایت ہے، انہوں نے آل حاطب کے ایک آدمی سے روایت کیا۔ اور اس نے حاطب سے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:"

محدّث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

"یہ سند ضعیف ہے، جس میں دو علتیں ہیں:

① آل حاطب کا آدمی مجہول ہے، اس لیے کہ اس کا نام مذکور نہیں ہے۔"

② ہارون ابوقزعہ ضعیف ہے، یعقوب بن شیبہ نے اس کی تضعیف کی ہے اور العقیلی، الساجی اور ابن الجارود نے اس کو "الضعفاء" میں شمار کیا ہے۔ اور امام بخاری نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا کوئی متابع نہیں ہے اور مثال میں یہی حدیث پیش کی ہے، لیکن حاطب رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں کیا ہے، اس طرح یہ حدیث "مرسل" ہے۔ موصول نہیں ہے۔ اور اس کی طرف امام محمد بن الحسین الازدی نے اپنے اس قول سے اشارہ کیا ہے: "ہارون ابوقزعہ آلِ حاطب کے ایک آدمی سے "مرسل" احادیث روایت کرتا تھا۔"

گویا اس طرح اس حدیث میں تین علتیں جمع ہوگئیں۔ یعنی تیسری علت ہارون کی سند میں اختلاف اور اضطراب ہے، چنانچہ بعض لوگوں نے اس کی روایت "موصولا" کی ہے اور بعض نے "مرسلا"

یہی حدیث ایک دوسری سند سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جو اس سے زیادہ کمزور ہے۔ اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

((مَنْ حَجَّ ، فَزَارَ قَبْرِيْ بَعْدَ مَوْتِيْ ، كَانَ كَمَنْ زَارَنِيْ فِيْ حَيَاتِيْ))

"جس نے حج کیا، پس میری موت کے بعد میری قبر کی زیارت کی تو وہ اس شخص کی طرح ہوگیا، جس نے میری زندگی میں زیارت کی۔"

امام ابن عدی نے اپنی روایت میں یہ اضافہ بھی کیا ہے: ((وَصَحِبَنِيْ)) اور جس کو میری صحبت کا شرف حاصل رہا۔"

یہ حدیث موضوع ہے اور اس کی تخریج الطبرانی نے " **المعجم الکبیر: ۲۰۳/۳** " اور " **المعجم الأوسط: ۱۲۶/۱** " میں، ابن عدی نے " **الکامل** " میں۔ الدارقطنی نے " **السنن، ص: ۲۷۹** " میں، البیہقی نے " **السنن: ۲۴۶/۵** " اور السلفی نے " **الثانی عشر مِنَ المشیخۃ البغدادیہ: ۵۴/۲** " میں اس سند سے کی ہے:

((عَنْ حَفْصِ بْنِ سُلَيْمَانَ أَبِيْ عُمَرَ عَنِ اللَّيْثِ بْنِ أَبِيْ سُلَيْمٍ عَنْ مُجَاهِدٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ مَرْفُوْعًا بِهٖ))

'' حفص بن سلیمان ابی عمر سے روایت ہے، انہوں نے اللیث بن ابی سلیم سے روایت کیا، انہوں نے مجاہد سے اور انہوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا۔''

یہ سند بیحد ضعیف ہے، جس کی دو علتیں ہیں:

۱۔ اللیث بن ابی سلیم ذہنی توازن کھو بیٹھنے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

۲۔ حفص بن سلیمان: القاریٔ اس کو الغاضری بھی کہتے ہیں۔ بیحد ضعیف ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے " **تقریب التهذیب، ص: ۱۱۱، ترجمه: ۱۴۰۵** " میں لکھا ہے کہ: '' وہ متروک الحدیث ہے۔''

اور امام یحییٰ بن معین نے اس کو '' کذاب '' بتایا ہے جیسا کہ امام ابن عدی نے '' الکامل '' میں لکھا ہے۔ اور حافظ عبدالرحمٰن بن یوسف بن خراش نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: '' کذاب تھا اور حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔'' [تنزیہ الشریعۃ، ترجمہ: ۳۵]

حافظ العلامہ محمد بن عبدالہادی نے " **الصارم المنکی فی الرد علی السبکی، ص: ۶۳** " میں لکھا ہے کہ اس حدیث کی کوئی بھی سند قابل اعتماد نہیں۔

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ " **القاعدۃ الجلیلۃ، ص: ۵۷** " میں تحریر فرماتے ہیں:

'' نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت سے متعلق تمام احادیث ضعیف اور ناقابل اعتبار ہیں، اسی وجہ سے صحیحین اور سنن میں اس طرح کی حدیثیں مروی نہیں ہیں، بلکہ ان کی روایت اُن علمائے حدیث نے کی ہے، جو ضعیف احادیث روایت کیا کرتے تھے، جیسے الدارقطنی اور البزار وغیرہ۔''

اس کے بعد امام تیمیہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث کا جھوٹ ہونا بالکل واضح ہے، کیونکہ اس کا متن دین اسلام کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ جس شخص کو نبی ﷺ کی زیارت آپ کی زندگی میں نصیب ہوگئی اس کا شمار آپ کے اصحاب میں ہوتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ آپ کے پاس ہجرت کرنے والوں اور آپ کے ساتھ جہاد کرنے والوں کا اور نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِیْ ، فَلَوْ أَنَّ اَحَدَکُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ اَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيْفَهُ)) [1]

''میرے اصحاب کو برامت کہو، کیونکہ اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا...... اللہ کی راہ میں...... خرچ کرے تب بھی وہ اُن کے ایک ''مُد'' بلکہ آدھے ''مُد'' کے برابر بھی نہیں ہوسکتا۔''

اور صحابہ کے بعد ایک آدمی اُن اعمال کے ذریعہ بھی ان کے مثل نہیں ہوسکتا جو فرض ہیں، جیسے حج، جہاد اور پنج وقتہ نمازیں میں نیز آپ ﷺ پر دُرود، تو پھر ایک ایسے عمل کے ذریعہ ان کے برابر کس طرح ہوسکتا ہے، جو مسلمانوں کے اتفاق سے واجب نہیں ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی امام ابن تیمیہ کا یہ قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے ہم مسلک سلفی علماء نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت سے روکتے ہیں، تو ان کا یہ خیال کذب وافتراء ہے، جو پہلی بار ان پر نہیں لگایا گیا ہے کیونکہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتابوں کا جس نے مطالعہ کیا ہوگا اس کو یہ معلوم ہوگا کہ وہ نہ صرف یہ کہ نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کی مشروعیت کے قائل تھے بلکہ اس کو مستحب مانتے تھے، بشرطیکہ اس موقع پر شریعت کے خلاف کسی عمل یا بدعت کا ارتکاب نہ کیا جائے۔'' [الضعیفہ : ۱/ ۱۲۰، ۱۲۴ اور ۳/ ۸۹، ۹۱، تنزیہ الشریعة : ۱/ ۵۴]

۱۴۱ ...... ((حَدَّثَنَا يُوْسُفُ بْنُ حَمَّادٍ : حَدَّثَنَا أُمَيَّةُ بْنُ خَالِدٍ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ أَبِیْ بِشْرٍ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِيْمَا أَحْسِبُ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَانَ بِمَكَّةَ ، فَقَرَأَ سُوْرَةَ النَّجْمِ حَتّٰى انْتَهٰى إِلٰى قَوْلِهِ تَعَالٰى: ﴿ **اَفَرَأَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰى** ﴾ " فَجَرٰى عَلٰى لِسَانِهِ: تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى" الشَّفَاعَةُ مِنْهَا تُرْتَجٰى ، قَالَ : فَسَمِعَ ذٰلِكَ مُشْرِكُو

[1] البخاری، ح: ۳۶۷۳، مسلم، ح: ۲۵۴۱

مَكَّةَ فَسُرُّوا بِذٰلِكَ فَاشْتَدَّ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالَى : ﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَّلاَ نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنّٰى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيْ أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ آيَاتِهِ ﴾))

[رواه البزار في المسند ، ح: ۲۲۶۳]

''ہم سے یوسف بن حماد نے بیان کیا، کہا: ہم سے امیہ بن خالد نے بیان کیا، کہا: ہم سے شعبہ نے ابی بشر سے، انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ ابن عباس نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ نبی ﷺ مکہ میں تھے اور آپ نے سورۃ النجم کی تلاوت فرمائی اور جب آپ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿ أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰى ﴾ پر پہنچے تو آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوگئے: ((تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى)) اور ایک دوسری روایت میں ہے: ((الشفاعة منها تُرتجى)) ابن عباس فرماتے ہیں: مشرکین مکہ نے یہ عبارت سنی تو اُن کو بڑی خوشی ہوئی اور رسول اللہ ﷺ پر یہ بات بڑی شاق گزری، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَّلاَ نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنّٰى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيْ أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ آيَاتِهِ ﴾ ''

یہ قصہ اپنی سند اور متن کے اعتبار سے بے بنیاد ہے اس قصہ کو ابن جریر الطبری، الزمخشری اور الواحدی نے اپنی تفسیروں میں، موسیٰ بن عقبہ نے مغازی میں، ابن اسحاق نے الطبقات میں، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، بزار، ابن مردویہ اور الطبرانی نے اپنے احادیث کے مجموعوں میں نقل کیا ہے۔ اور ابن کثیر، البیہقی، قاضی عیاض، ابن خزیمہ، قاضی ابوبکر ابن العربی، امام رازی، القرطبی، بدرالدین العینی اور الشوکانی نے اس قصہ کو جھوٹ قرار دیا ہے۔

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر '' ۳/۲۳۹ '' میں لکھا ہے:

''بہت سے مفسرین نے ''الغرانیق'' کا قصہ بیان کا ہے اور جن سندوں سے بیان کیا ہے وہ سب ''مرسل'' ہیں اور ان میں سے کوئی بھی صحیح اور قابل اعتماد طریقے سے رسول اللہ ﷺ تک نہیں پہنچتی۔''

قاضی عیاض نے اس قصہ پر متعدد پہلوؤں سے گرفت کی ہے۔ کہتے ہیں:

''اس قصہ کے بے بنیاد ہونے کی پہلی دلیل یہ ہے کہ اس کو صحیح احادیث روایت کرنے والے ائمہ میں سے کسی نے بھی روایت نہیں کیا ہے اور نہ تو کسی ثقہ راوی ہی نے علتوں سے پاک اور متصل سند سے اس کو نقل کیا ہے۔ اور یہ قصہ اپنے ناقلین کے ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ، اپنی روایتوں میں اضطراب...... اختلاف...... سند میں انقطاع اور الفاظ میں اختلاف کے عیوب بھی لیے ہوئے ہے، دراصل اس کہانی کو نقل کرنے میں انہی مفسرین اور مؤرخین نے دلچسپی لی ہے، جو ہر انوکھی اور عجیب وغریب چیزوں کے دلدادہ ہوتے ہیں اور کتابوں سے ہر رطب و یابس اور صحیح اور غلط باتوں کو آنکھیں بند کر کے نقل کر لیتے ہیں۔'' [الشفاء: ۲/ ۷۵۰]

اور شیخ محمد ناصر الدین البانی نے شیخ غزالی کی کتاب ''فقه السيرة ، ص: ۱۱۳'' کے حاشیہ پر لکھا ہے:

''مشرکین نے خود یہ بے بنیاد اور جھوٹی کہانی گھڑ کر پھیلائی ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ یہ قصہ بعد میں گھڑا گیا ہو۔ انہوں نے اس قصہ کو باطل اور بے بنیاد ثابت کرنے کے لیے ''نصب المجانيق لنسف قصه الغرانيق'' کے نام سے ایک رسالہ بھی لکھا ہے۔''

اس من گھڑت قصہ سے نبی ﷺ کی عصمت پر براہِ راست زد پڑتی ہے۔ امام ابن ابی حاتم ''الجرح والتعديل'' کے مقدمہ '' ص: ۳۵۱'' میں لکھتے ہیں:

''کسی حدیث کی صحت اس کی روایت کرنے والوں کی عدالت سے معلوم کی جاتی ہے، نیز یہ کہ اس کا متن اور مضمون ایسا ہو، جو ''کلام نبوت'' ہونے کی صفت رکھتا ہو۔''

ان جلیل القدر علماء کے ان اقوال سے قطع نظر کیا کوئی معمولی ذہن و دماغ رکھنے والا بھی اس بات کو قبول کر سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو پوری زندگی ''توحید خالص'' کی دعوت دیتے رہے اور ''عقیدے'' کے معاملے میں کبھی ادنیٰ سی نرمی اور ''مداہنت'' (بددیانتی) سے کام نہیں لیا، اچانک آپ پر ایک ایسا وقت آ گیا کہ مشرکین کو خوش کرنے کے لیے نعوذ باللہ ان کے معبودان باطل کی بڑائی کرنے لگے اور اپنی اس بات اللہ کے کلام میں شامل کر دیا۔

اور اگر یہ بات آپ کی زبان مبارک سے سہواً نکل گئی تھی یا یہ کہ شیطان نے درمیان میں اپنی مشرکانہ عبارت شامل کر دی تو پھر ''عصمتِ رسول'' کے عقیدے کے کیا بنے گا؟

مزید یہ کہ مشرکین اہل زبان تھے۔ وہ سلسلۂ کلام کو سن رہے تھے ارشاد ہو رہا تھا: ''اے بت پرستو! کیا

تم نے لات اور عزیٰ پر غور کیا۔ اور تیسری دیوی منات پر۔'' یہاں پہنچ کر آپ کی زبان مبارک سے نعوذ باللہ یہ الفاظ جاری ہو گئے اور یہ بلند مرتبہ غرانیق بیشک ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے۔ پھر سابقہ سلسلۂ کلام بحال ہو گیا اور فرمایا: جانے لگا، ''کیا بیٹے تمہارے لیے ہیں اور بیٹیاں اللہ کے لیے یہ تو بڑی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ یہ تو صرف چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے تو ان کے لیے سند نازل نہیں فرمائی ہے، تم لوگ تو صرف گمان اور خواہشات نفس کی اتباع کر رہے ہو۔''

کیا اس تضاد بیانی کو وہ قبول کر سکتے تھے؟ خوش ہونا اور نبی ﷺ کے ساتھ سجدہ کرنا تو دور کی بات ہے۔

اور اگر اُن لوگوں کی بات مان لی جائے جن کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ کلمات رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے نہیں نکلے تھے بلکہ شیطان آپ کی تلاوت میں در اندازہ ہو گیا تھا اور آپ کی آواز میں آواز ملا کر اس نے یہ کلمات کہلائے تھے۔''

تو اس سے دو باتیں لازم آتی ہیں:

۱۔ پہلی بات یہ کہ ''وَمَنٰوة الثالثة الاخرى'' کہہ کر نبی ﷺ اتنی دیر خاموش رہے تھے کہ شیطان یہ کلمات اپنی زبان سے ادا کرے۔

۲۔ دوم یہ کہ شیطان کی آواز نبی اکرم ﷺ کی آواز سے اس قدر مشابہ تھی کہ مشرکین تمیز نہ کر سکے اور دھوکا کھا گئے۔

تو یہ دونوں باتیں باطل اور رسول اکرم ﷺ کی عصمت کے منافی ہیں۔ شیطان کو اگر یہ قدرت حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ کے محبوب بندوں کو گمراہ کر سکے تو وہ الصادق المصدوق ﷺ کی تلاوت میں در انداز کس طرح ہو سکتا تھا؟

رہا شیطان کا اپنی آواز کو نبی ﷺ کی آواز سے اس طرح مشابہ بنا لینا کہ جو لوگ بچپن سے آپ کی منفرد آواز سنتے آ رہے تھے، وہ دھوکا کھا گئے اور اس کی آواز کو نبی ﷺ کی آواز سمجھ بیٹھے تو شیطان کے لیے ایسا کرنا محال ہے کیونکہ اگر شیطان کو یہ قدرت حاصل نہیں تھی کہ وہ نبی ﷺ کی شکل کی مشابہت اور مماثلت اختیار کر سکے تو اس کو بدرجۂ اولیٰ یہ قدرت حاصل نہیں ہونی چاہیے کہ وہ آپ کی آواز میں اپنی آواز ملا دیے۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((وَمَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ ، فِي صُورَتِي)) [1]

''جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو اس نے مجھے ہی دیکھا، کیونکہ شیطان میری مماثلت یا مشابہت اختیار نہیں کر سکتا۔''

کاش لوگوں نے اسی پر اکتفا کیا ہوتا لیکن انہوں نے تو یہ ستم کر ڈالا کہ سورۃ الحج کی آیت :۵۲ کو اس افترا اور جھوٹے قصے سے جوڑ دیا اور آیت میں مذکور ''تَمَنّٰی کو قَرَأَ یاتَـلَا کے معنی میں کر دیا اس طرح اس آیت مبارکہ سے یہ دلیل اخذ کرنے کی ناکام کوشش کی گئی کہ ''اگر نبی ﷺ کی قرأت یا تلاوت میں شیطان اثر انداز ہو گیا تھا اور اس نے ''وحی الٰہی'' میں اپنی طرف سے کچھ باتیں شامل کر دی تھیں تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ شیطان تو ہر نبی اور رسول کے ساتھ ایسا کرتا آرہا ہے اور ان کی تلاوتوں میں اپنی طرف سے کفر و شرک کی باتیں ملاتا رہا ہے اور بعد میں اللہ تعالیٰ اپنی وحیوں یا رسولوں پر نازل کردہ اپنی کتابوں کو کفر و شرک کی باتوں سے پاک کر کے ان کو واضح و محکم کر دیتا تھا۔

اور عجیب تو یہ ہے کہ سورۃ الحج کی مذکورہ آیت جس میں لوگوں کے زعم باطل کے مطابق قرآن میں شیطانی ملاوٹ کی وجہ جواز بیان کی گئی ہے۔ ۱۰ ھجری میں نازل ہوئی اور سورۃ النجم جس میں شیطانی آمیزش کا دعویٰ کیا گیا ہے بعثت کے پانچویں سال نازل ہوئی گویا اس واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ ۷ یا ۸ سال خاموش رہا پھر یہ اعلان فرمایا کہ نبی ﷺ کی تلاوت میں یہ شیطانی ملاوٹ تو قدیم سنت ہے جس سے تمام رسول اور نبی دو چار ہوتے رہے ہیں؟

درحقیقت سورۃ الحج کی آیت نمبر :۵۲ میں فعل '' تمنّٰی '' کے یہ شاذ معنی: پڑھا اور تلاوت کی'' بیان ہی اس لیے کیے گئے ہیں تاکہ مذکورہ بے بنیاد اور باطل روایت صحیح ثابت کی جا سکے۔ ورنہ خود اس آیت کی اندرونی شہادت اس کے خلاف ہے، پوری آیت مبارکہ یہ ہے:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَّلَا نَبِيٍّ إِلَّآ إِذَا تَمَنّٰى أَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِي أُمْنِيَّتِهِ ﴾ [الحج : ٥٢]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول کے ساتھ نبی کا ذکر بھی فرمایا ہے جو یقیناً رسول کا مترادف اور ہم معنی نہیں ہے کیونکہ مترادفات کو اس طرح جمع نہیں کیا جاتا اور یہ بات معلوم و معروف ہے کہ رسول صاحب رسالت و شریعت کو کہتے ہیں جبکہ نبی سابق رسول اور اس کی شریعت کے تابع ہوتا ہے اس پر کوئی نئی شریعت

[1] بخاری ، حدیث: ٦١٩٧ - مسلم، حدیث: ٢١٣٤

نازل نہیں ہوتی اگر نبی رسول کے زمانے میں اس کے ساتھ ہی مبعوث ہوا ہے تو اس کی حیثیت مستقل بالذات کی نہیں بلکہ رسول کے تابع کی ہوتی ہے مثلاً جو نسبت حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حاصل تھی یا حضرت لوط علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے۔

رہا وہ نبی جو رسول کی وفات کے بعد آتا ہے تو وہ سابق رسول کی شریعت کا مبلغ ہوتا ہے اس کی حیثیت مستقل بالذات مشرع کی نہیں ہوتی جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو دراصل شریعت موسوی ہی کے داعی تھے کوئی نئی شریعت دے کر مبعوث نہیں ہوئے تھے۔

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ شریعت کی تکمیل تو رسول کے ذریعہ کر دی جاتی ہے اور اللہ کے نازل کردہ کتاب کی تبلیغ اور تلاوت کا مجاز وہی ہوتا ہے نبی اس کے تابع ہوتا ہے۔ اس تناظر میں " تمنی " کے معنی "قرأ" پڑھا، یا تلا، تلاوت کی۔ رسول پر تو صادق آتے ہیں مگر نبی پر صادق نہیں آتے کیونکہ یہ اس کے فرائض منصبی میں داخل نہیں جبکہ مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے "تمنی" فعل کی نسبت رسول اور نبی دونوں کی طرف کی ہے۔ لہٰذا اگر شیطان نے رسول کی تلاوت میں کوئی آمیزش کر دی تو بلاشبہ وہ مشکوک ہوگئی اور اس سے اس کو پاک کرنا ضروری ہے، رہا نبی تو اس کی تلاوت میں شیطانی ملاوٹ کوئی اثر نہیں ڈالے گی، کیونکہ وہ جس کتاب کی تلاوت کر رہا ہے وہ تو "محکم" ہو چکی ہے۔

اس طرح سورۃ الحج کی آیت: ۵۲ خود اس افترا اور من گھڑت قصے کے باطل ہونے کی شہادت دے رہی ہے۔ اس طرح اس آیت مبارکہ کے فعل "تمنی " کا ترجمہ "قرأ " یا "تلا " کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ مزید یہ کہ مذکورہ آیت سے پہلے اور بعد میں قرآن کا ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا اگر "تمنی" کے بجائے فعل صریح "قرأ" یا "تلا" آیا ہوتا تو قرآن کو اس کا مفعول بہ قرار دینا جائز اور عام عربی اسلوب کے مطابق تھا مگر ایک ایسے فعل کا اس کو مفعول بہ قرار دینا جو اس کا مفہوم صریح نہیں ہے بلکہ "پڑھنا اور تلاوت کرنا" اس کے شاذ معنی ہیں، کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

لہٰذا اس آیت مبارکہ کا صحیح ترجمہ اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے:

"اور نہیں بھیجا ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول اور نبی مگر جب اس نے تمنا کی تو شیطان اس کی تمنا ،اور خواہش میں خلل انداز ہو گیا۔"

مطلب یہ ہے کہ رسول اور نبی کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دعوت پھیلے اور لوگ اس پر ایمان لائیں مگر شیطان پوری کوشش کر کے اس خواہش کی تکمیل کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کرتا رہتا ہے، مگر

بالآخر اللہ تعالیٰ شیطان کی چال کو ناکام بنا دیتا ہے، اپنی آیات کو محکم بنا دیتا ہے اور حق کو فتح یاب کرتا ہے۔

وہ اصل واقعہ جس کی بنیاد پر شیطان نے اتنا بڑا جھوٹ تصنیف کر کے لوگوں میں پھیلا دیا اور بعض مفسرین، مؤرخین اور سیرت نگار اس کو لے اُڑے صرف اتنا تھا کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے حرم پاک میں سورۃ النجم کی تلاوت فرمائی اور سورت کے ختم کرنے کے بعد جب آپ نے سجدہ کیا تو حرم میں موجود مسلم اور مشرک سب سجدے میں گر گئے۔ قرآن پاک کے مؤثر اندازِ بیان اور رسول اللہ ﷺ کی پرسوز آواز سے سب لوگ مسحور ہو گئے اور مسلمانوں کے ساتھ اہل شرک بھی بے خودی میں سجدے میں گر گئے، صحیح حدیث میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

((حَدَّثَنَا نَصْرُ بْنُ عَلِيٍّ : أَخْبَرَنِي أبو مُحَمَّدٍ الزُّبَيْرِيُّ : حَدَّثَنَا إِسْرَائِيلُ ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ ، عَنِ الْأَسْوَدِ بْنِ يَزِيدَ ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللہ عنہ ، قَالَ : أَوَّلُ سُورَةٍ أُنْزِلَتْ فِيهَا سَجْدَةٌ (وَالنجم) فَسَجَدَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَسَجَدَ مَنْ خَلْفَهُ إِلَّا رَجُلًا رَأَيْتُهُ أَخَذَ كَفًّا مِنْ تُرَابٍ فَسَجَدَ عَلَيْهِ ،فَرَأَيْتُهُ بَعْدَ ذَلِكَ قُتِلَ كَافِرًا وَهُوَ أُمَيَّةُ بْنُ خَلَفٍ)) [1]

''ہم سے نصر بن علی نے بیان کیا، کہا: مجھ کو ابو محمد الزبیری نے خبر دی، کہا: ہم سے اسرائیل نے ابو اسحاق سے، انہوں نے الاسود بن یزید سے اور انہوں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، کہا: وہ پہلی سورت جو نازل ہوئی اور جس میں سجدہ ہے (والنجم) ہے، کہا: پس رسول اللہ ﷺ نے سجدہ کیا اور جو آپ کے پیچھے تھے انہوں نے بھی سجدہ کیا سوائے ایک آدمی کے، میں نے اس کو دیکھا اس نے ایک مٹھی مٹی لی اور اس پر سجدہ کیا، اور اس کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ حالتِ کفر میں قتل کیا گیا، اور وہ اُمیہ بن خلف ہے۔''

اور صحیح مسلم میں ہے کہ: نبی ﷺ نے ''والنجم'' پڑھی اور اس میں موجود آیت سجدہ پر سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ جو لوگ تھے انہوں نے بھی سجدہ کیا۔

اور صحیح بخاری میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں، مذکورہ حدیث کے بعد اتنا اضافہ بھی ہے کہ: نبی ﷺ کے ساتھ مسلمانوں، مشرکوں اور جن وانس سب نے سجدہ کیا۔

ممکن ہے کہ بعد میں جب مشرکین کو اپنے اس فعل پر پشیمانی ہوئی ہو تو انہوں نے وجہ جواز کے طور پر یہ

---

[1] بخاری، حدیث: ٤٨٦٣۔ مسلم، حدیث: ١٢٩٧

کہانی گھڑلی ہو کہ محمد ﷺ کی زبان سے اپنے بتوں کی تعریف سُن کر انہوں نے سجدہ کیا تھا، اور اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ عصرِ صحابہ کے بعد زنادقہ نے جب صحیح حدیث میں یہ واقعہ پڑھا ہو تو ان کے ابلیسی دماغ نے یہ جھوٹا قصہ گھڑ کر لوگوں میں پھیلا دیا ہو۔

۱٤۲ ...... ((كَانَ يَرَى فِي الظُّلْمَةِ كَمَا يَرَى فِي الضَّوْءِ))

''نبی ﷺ تاریکی میں بھی اسی طرح دیکھتے تھے جس طرح روشنی میں دیکھتے ہیں۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی روایت تمام بن محمد الدمشقی نے ''الفوائد: ۱.۲/۲۰۷ '' میں ابن عدی نے ''الکامل :۲/۲۲۱ '' میں، اور انہی سے البیہقی نے ''دلائل النبوۃ:۶/۷۵ '' میں، الخطیب البغدادی نے ''تاریخ بغداد:۴/۲۷۲ '' میں اور الضیاء المقدسی نے ''المنتقی من حدیث ابی علی الاوفی :۱/۲ '' میں اس سند سے کی ہے:

((عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْمُغِيْرَةِ عَنِ الْمُعَلَّى بْنِ هِلَالٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ مَرْفُوْعًا))

''عبداللہ بن المغیرہ سے روایت ہے، انہوں نے المعلی بن ہلال سے روایت کیا، انہوں نے ہشام بن عروہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت کیا......''

امام البیہقی نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''اس سند میں ضعیف راوی شامل ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی کہتے ہیں:

''بلکہ بے حد ضعیف راوی شامل ہے اور اس سند کی آفت یہی عبداللہ بن المغیرہ ہے، اس کو عبداللہ بن محمد بن المغیرہ کہا جاتا تھا، اس کے بارے میں العقیلی کا قول ہے کہ:

''وہ ایسی حدیثیں روایت کیا کرتا تھا جس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔''

حافظ احمد بن عبداللہ بن یونس کہتے ہیں:

''وہ منکر الحدیث تھا۔''

امام الذہبی نے اس کی جو بے بنیاد حدیثیں نقل کی ہیں، ان میں سے ایک یہی موضوع حدیث ہے، اور اس کی روایت کردہ حدیثوں کے بارے میں لکھا ہے:

''یہ سب موضوع ہیں۔''

البانی آگے چل کر لکھتے ہیں:

''ابن المغیرہ کے شیخ المعلی بن ھلال پر اس موضوع روایت کو محمول کرنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس کے کذاب ہونے پر نقادِ حدیث کا اتفاق ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے ''التقریب، ص: ۴۷۳، ترجمہ: ۶۸۰۷'' میں لکھا ہے:

یہ موضوع حدیث دوسرے ''طرق'' سے بھی مروی ہے، مگر ان میں سے کوئی قابلِ اعتبار نہیں ہے۔'' [الضعیفه: ۱/ ۵۱۵، ۵۱۶]

البتہ صحیح احادیث سے یہ ثابت ہے کہ نبی ﷺ نماز میں اپنے پیچھے کے لوگوں کو رکوع و سجود کرتے ہوئے دیکھتے تھے، یہ ایک معجزہ تھا جو حالتِ نماز کے لیے خاص تھا جیسا کہ احادیث کے اندازِ بیان سے ظاہر ہے:

((حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ : حَدَّثَنَا غُنْدَرٌ قَالَ : حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ سَمِعْتُ قَتَادَةَ ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ ،عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : أَتِيمُوا الرُّكُوعَ وَالسُّجُودَ ، فَوَ اللّٰهِ إِنِّي لَأَرَاكُمْ مِنْ بَعْدِي۔ وَرُبَّمَا قَالَ مِنْ بَعْدِ ظَهْرِي إِذَا رَكَعْتُمْ وَسَجَدْتُمْ)) ❶

''ہم سے محمد بن بشار نے بیان کیا، کہا: ہم سے غندر نے بیان کیا، کہا: ہم سے شعبہ نے بیان کیا، کہا: میں نے قتادہ کو انس بن مالک سے اور ان کو نبی ﷺ سے روایت کرتے ہوئے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''لوگو! رکوع اور سجود پورے کیا کرو کیونکہ اللہ کی قسم بے شک میں تم لوگوں کے اپنے پیچھے سے، اور ممکن ہے کہ آپ نے فرمایا: اپنی پیٹھ کے پیچھے سے، رکوع اور سجدہ کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔''

نبی ﷺ کا نمازیوں کو اپنے پیچھے سے دیکھنا ایک معجزہ تھا جو اسلام میں نماز کی اہمیت کے پیشِ نظر آپ کو عطا کیا گیا تھا تاکہ آپ صحابہ کے قیام وقعود اور رکوع و سجود سے مطلع رہیں اور کسی کوتاہی پر ان کی اصلاح کر سکیں جیسا کہ صحیح مسلم کی ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے:

((حَدَّثَنَا أَبُو كُرَيْبٍ مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ الْهَمْدَانِيُّ : حَدَّثَنَا أَبُو أُسَامَةَ عَنِ

❶ بخاری، حدیث: ۷۴۲۔ مسلم، حدیث: ۹۵۹

الْوَلِيدِ ، يَعْنِي ابْنَ كَثِيرٍ ، حَدَّثَنِي سَعِيدُ بْنُ أَبِي سَعِيدٍ الْمَقْبُرِيُّ عَنْ أَبِيهِ ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ : صَلَّى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمًا ثُمَّ انْصَرَفَ ، فَقَالَ : يَا فُلَانُ! أَلَا تُحْسِنُ صَلَاتَكَ؟ أَلَا يَنْظُرُ الْمُصَلِّي إِذَا صَلَّى كَيْفَ يُصَلِّي؟ فَإِنَّمَا يُصَلِّي لِنَفْسِهِ ، إِنِّي وَاللّٰهِ! لَأُبْصِرُ مِنْ وَرَائِي ، كَمَا أُبْصِرُ مِنْ بَيْنَ يَدَيَّ))

''ہم سے ابو کریب محمد بن العلاء الہمدانی نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابو اسامہ نے الولید، یعنی ابن کثیر، سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، کہا: مجھ سے سعید بن ابی سعید المقبری نے اپنے باپ سے روایت کرتے ہوئے اور انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا ، کہا: رسول اللہ ﷺ نے ایک دن نماز پڑھی اور اپنی جگہ سے ہٹ گئے اور فرمایا: یا فلان! تم اپنی نماز درست کیوں نہیں کرتے؟ نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو یہ کیوں نہیں دیکھتا کہ وہ کس طرح نماز پڑھتا ہے؟ درحقیقت وہ صرف اپنے لیے نماز پڑھتا ہے، بے شک میں اللہ کی قسم اپنے پیچھے اس طرح دیکھتا ہوں جس طرح اپنے سامنے دیکھتا ہوں۔''

نبی اکرم ﷺ کا یہ معجزہ فعلی اور حقیقی تھا اور بعض لوگوں کی یہ تاویل صحیح نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی گردن کے پچھلے حصے میں ''حاسۂ بصر'' پیدا کر دیا تھا جس سے آپ لوگوں کو اپنے پیچھے سے دیکھتے تھے، معجزات کو ہم اپنی عقلوں سے نہیں سمجھ سکتے ورنہ وہ معجزہ نہ ہوں گے اور نہ ان کی کوئی تاویل ہی کرنا صحیح ہے بلکہ آپ کا جو معجزہ جس شکل میں ثابت ہے اس پر ایمان لانا فرض ہے۔ مزید یہ کہ معجزہ متعدی نہیں ہوتا بایں معنی کہ جو معجزہ جس موقع ومحل اور جس شکل میں ثابت ہے وہ اس موقع ومحل اور اس شکل کے لیے خاص ہے لہٰذا نماز میں نبی اکرم ﷺ کا اپنے پیچھے نمازیوں کو دیکھنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ آپ عام حالات میں بھی لوگوں کو اپنے پیچھے سے دیکھتے تھے، ورنہ جس طرح حالتِ نماز میں صحابۂ کرام نے آپ کی یہ صفت بیان فرمائی ہے دوسری حالتوں میں بھی اس صفت کو بیان فرماتے اور حدیث کے الفاظ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کی یہ حالت خاص تھی۔

لہٰذا ان صحیح حدیثوں سے زیرِ بحث حدیث:((كَانَ يَرَى فِي الظُّلْمَةِ كَمَا يَرَى فِي الضَّوْءِ)) کے متن سے نکارت بھی واضح ہو جاتی ہے۔

اسلامی غزوات میں غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق کو اس اعتبار سے سب سے زیادہ سنگین اور تباہ کن قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس میں عربوں کے بہت سے قبیلے قریش مکہ کے ساتھ، مسلمانوں کا قلع قمع کر دینے پر متحد ہو

گئے تھے، دراصل ان عربوں کو مدینہ پر لشکر کشی کرنے پر جن لوگوں نے آمادہ کیا تھا، وہ ''یہود بنونضیر'' تھے۔ ان یہودیوں نے مکہ مکرمہ میں جا کر جہاں مسلمانوں کے خلاف قریش کو آمادۂ جنگ کیا تھا وہیں عربوں کے دوسرے بڑے بڑے قبیلوں میں جا جا کر اُن کو ورغلایا کہ وہ سب ایک ساتھ مل کر مدینہ پر چڑھائی کر دیں تاکہ مسلمانوں کا نام ونشان مٹ جائے، انہوں نے عرب قبیلوں سے یہ وعدے بھی کیے کہ وہ جنگ میں ان کا بھرپور ساتھ دیں گے، یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ بنونضیر اور بنوقینقاع خیبر اور وادی القری میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے، لیکن یہودیوں کا تیسرا قبیلہ ''بنوقریظہ'' مسلمانوں کے ساتھ مدینہ ہی میں سکونت پذیر تھا اور اس سے مسلمانوں کا باقاعدہ حلیفانہ معاہدہ تھا کہ اگر مدینہ پر کوئی بیرونی حملہ ہوا تو وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس کا دفاع کریں گے لیکن بنونضیر کے یہودی سردار حیی بن اخطب نے مسلسل کوشش کر کے اس کو مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے حلیفانہ معاہدہ کو توڑ کر، اُن کے خلاف جنگ میں شامل ہونے پر راضی کر لیا تھا۔ اس طرح قریش اور ان کے ساتھ دوسرے عرب قبائل دس (۱۰) ہزار کی جمعیت لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ نبی اکرم ﷺ کو جوں ہی اس کی اطلاع ملی تو آپ نے اہل مدینہ کو یہ حکم دیا کہ وہ مدینہ منورہ کے شمال مغربی رُخ پر ایک خندق کھود یں آپ نے خود ان کے ساتھ خندق کھودنے میں حصہ لیا اور نہایت مختصر مدت میں یعنی کوئی چھ روز میں مسلمانوں نے رات ودن کی مسلسل محنت سے یہ خندق مکمل کر لی۔

سیرت اور مغازی کی قدیم اور جدید کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ کو عرب قبائل کی چڑھائی کا علم ہوا تو آپ نے ایک مجلس حرب یا ''وارکونسل'' بلائی اور صحابۂ کرام سے یہ مشورہ طلب کیا کہ اس نازک موقع پر کیا کیا جائے؟ تو حضرت سلمان فارسی نے خندق کا مشورہ دیا۔ فتح الباری: ۲/۱۸۱۳ میں ہے:

۱۴۳ ...... ((وَكَانَ الَّذِي أَشَارَ بِذَلِكَ سَلْمَانُ فِيمَا ذَكَرَ أَصْحَابُ الْمَغَازِي مِنْهُمْ أَبُو مَعْشَر، قَالَ: قَالَ سَلْمَانُ لِلنَّبِيِّ ﷺ: إِنَّا كُنَّا بِفَارِسٍ إِذَا حُوصِرْنَا خَنْدَقْنَا عَلَيْنَا))

''اور جس نے خندق کھودنے کا مشورہ دیا تھا وہ سلمان تھے جیسا کہ اصحاب مغازی نے ذکر کیا ہے اور جن میں سے ایک ابومعشر ہیں، کہتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا: ہم لوگ فارس میں جب محصور ہو جاتے تھے تو اپنے گرد خندق کھود لیا کرتے تھے۔''

نبی اکرم ﷺ کا صحابۂ کرام سے مشورہ طلب کرنے اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے خندق کھودنے کا مشورہ دینے کا یہ واقعہ بالکل بے بنیاد ہے جس سے پہلے ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن السندی نے اپنی مغازی میں بیان کیا ہے، اور پھر وہیں سے ہر سیرت نگار نے یہ واقعہ لے کر اپنی کتاب میں نقل کر دیا ہے اور ابو معشر سمیت کسی نے بھی اس کی کوئی سند نہیں بیان کی ہے۔

سیرت کی مشہور کتاب ''ابن ہشام: ۳/۲۲۴'' میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

((قَالَ ابْنُ هَشَّامٍ : يُقَالُ : إِنَّ سَلْمَانَ الْفَارِسِيَّ اَشَارَبِهِ عَلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ))

''ابن ہشام کہتے ہیں: بیان کیا جاتا ہے کہ سلمان فارسی نے رسول اللہ ﷺ کو اس کا مشورہ دیا تھا۔''

ابو معشر السندی محدثین کے نزدیک بالاتفاق ضعیف تھے۔ یحییٰ بن سعید نے ان کو بے حد ضعیف بتایا ہے۔ اور امام بخاری نے ان کو ''منکر الحدیث'' قرار دیا ہے۔ یحییٰ بن معین کا قول ہے: قوی نہیں تھے، امام احمد فرماتے ہیں: سچے تھے لیکن بلا سند کے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔'' [طبقات علماء الحديث: ١/ ٣٤٦]

ائمہ حدیث کے ان اقوال کے بعد ان کے بیان کردہ اس واقعہ کو اور وہ بھی بلا کسی سند کے کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے، ایسا راوی تو اگر کوئی واقعہ سند کے ساتھ بیان کرے تب بھی قابل قبول نہیں ہے، پھر بلا سند کے کس طرح قابل قبول ہو سکتا ہے۔

دراصل خندق کھودنے کا فیصلہ خالص نبوی فیصلہ تھا جو وحی الٰہی پر مبنی تھا اور نبی اکرم ﷺ نے اس مسئلے میں نہ تو کوئی ''وار کونسل'' بلائی اور نہ صحابۂ کرام میں سے کسی سے کوئی مشورہ کیا ورنہ جس طرح غزوۂ بدر کے موقع پر مہاجرین اور انصار سے مشورہ کرنے، بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا کرنے اور غزوۂ اُحد کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر حملہ آور کفار کے لشکر کا مقابلہ کرنے یا شہر کے اندر رہ کر دفاع کرنے کے بارے میں آپ نے صحابۂ کرام سے مشورہ کیا اور جن کی تفصیلات صحیح روایات میں موجود ہیں اسی طرح خندق کھودنے کے بارے میں بھی صحابۂ کرام سے آپ کے مشورہ کرنے کی تفصیلات موجود ہوتیں۔

درحقیقت خندق کھودنے کے مشورے کو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی نسبت اتنی شہرت صرف اس وجہ سے حاصل ہو گئی کہ عربوں میں خندق کھود کر اور شہر بند ہو کر لڑنے کا کوئی رواج نہ تھا لہٰذا یہ فرض کر لیا گیا کہ لامحالہ نبی ﷺ نے یہ خیال کہیں باہر سے اخذ کیا ہو گا اور چونکہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فارسی النسل تھے

اس لیے لامحالہ انہی نے یہ مشورہ دیا ہوگا۔ حالانکہ اسلامی غزوات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہی یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایسے بہت سے جنگی طریقے اختیار کیے ہیں جن سے عرب واقف نہیں تھے۔ مثال کے طور پر آپ نے سب سے پہلے جنگی سراغ رسانی کا طریقہ ایجاد کیا اور غزوۂ بدر سے پہلے سریہ عبداللہ بن جحش اس کا زندہ ثبوت ہے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر آپ نے مسلمانوں کی پشت پر واقع ''درہ'' پر پچاس ماہر تیر اندازوں کا جو دستہ متعین فرمایا اور جس کو یہ تاکید فرمادی تھی کہ فتح وشکست کسی حال میں بھی وہ اپنے ''مورچہ'' سے نہ ہٹے اس سے جہاں نبی ﷺ کی جنگی عبقریت اور حکمت عملی کا پتہ چلتا ہے، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب اپنی تمام تر جنگی مہارت کے باوجود اس سے واقف نہ تھے نبی اکرم ﷺ کے فرمان کی خلاف ورزی کے نتیجے میں جیتی ہوئی جنگ کے شکست میں تبدیل ہو جانے سے اس ''حکمتِ عملی'' کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے اور اس طرح غزوۂ خندق کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے تنہا ایک شخص حضرت نعیم بن مسعود کے ذریعہ کفار کے لشکر میں پھوٹ ڈال کر ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ یہ تمام واقعات نبی ﷺ کی جنگی بصیرت پر دلالت کرتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی کو سرفراز فرمایا تھا۔

یہ تو تصویر کا ایک رُخ تھا، تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ اہل فارس محصور ہو جانے کی صورت میں خندقیں کھود کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے تھے۔ حضرت سلمان کی زبانی جو واقعات حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ''دہقانی'' باپ کے بیٹے ہیں اور عین جوانی ہی میں وہ فارس سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔

دوم یہ کہ قبل از اسلام ایران کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کبھی ایسا کوئی بیرونی حملہ ہوا ہی نہیں کہ اس کو شہر بند ہو کر اور خندق کھود کر اپنا دفاع کرنا پڑا ہو، بلکہ اس کے برعکس سورۃ الروم کی ابتدائی آیات یہ صراحت کرتی ہیں کہ اہل فارس نے رومیوں کو زبردست شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ سورۃ الروم کی شانِ نزول کے بارے میں اگرچہ مفسرین نے کوئی حتمی بات نہیں لکھی ہے لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت ہجرت حبشہ سے قریب ہی کسی وقت نازل ہوئی تھی اور یہ وہ وقت تھا کہ جب اہل فارس آندھی اور طوفان کی طرح رومیوں کے تمام علاقوں پر قبضہ کرتے جا رہے تھے اور سورۃ الروم میں ان کی جس مغلوبیت اور شکست کی پیشین گوئی کی گئی ہے اس سے وہ صلح حدیبیہ کے زمانے میں دوچار ہوئے۔

۱٤٤ ...... ((إِنَّ اللّٰهَ اتَّخَذَنِيْ خَلِيْلًا كَمَا اتَّخَذَ إِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا ، فَمَنْزِلِيْ وَمَنْزِلُ

إِبْرَاهِيمَ فِي الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُجَاهَيْنِ ، وَالْعَبَّاسُ بَيْنَنَا مُؤْمِنٌ بَيْنَ خَلِيلَيْنِ))

[سنن ابن ماجه ، حديث : ١٤٠]

''بے شک اللہ نے مجھے خلیل بنایا ہے جس طرح ابراہیم کو خلیل بنایا ہے اور قیامت کے دن جنت میں میری منزل اور ابراہیم کی منزل آمنے سامنے ہوگی اور ہمارے درمیان عباس دو دوستوں کے درمیان مؤمن کی حیثیت سے ہوں گے۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج امام ابن ماجہ نے اس سند سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ بْنُ الضَّحَّاكِ ، حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ عَيَّاشٍ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَمْرٍو عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ عَنْ كَثِيرِ بْنِ مُرَّةَ الْحَضْرَمِيِّ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو مَرْفُوعًا))

''ہم سے عبدالوہاب بن الضحاک نے بیان کیا، کہا: ہم سے اسماعیل بن عیاش نے صفوان بن عمرو سے، انہوں نے عبدالرحمٰن بن جبیر بن نضیر سے، انہوں نے کثیر بن مرہ الحضرمی سے اور انہوں نے عبداللہ بن عمرو سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

اسی سند سے الخطیب البغدادی نے بھی اس کی تخریج '' تاریخ بغداد : ۲۲۷/۵ '' میں کی ہے۔

یہ سند موضوع ہے، جس کی مصیبت عبدالوہاب بن الضحاک ہے، امام ابوحاتم نے اس کو ''کذاب'' بتایا ہے۔ الحاکم کا قول ہے: اس نے موضوع حدیثیں روایت کی ہیں۔

اس حدیث کی روایت امام شیرویہ بن شہردار الدیلمی نے '' مسند الفردوس : ۲۲۴/۱ '' میں اس سند سے کی ہے:

((عَنْ أَبِي مِعْقَلٍ يَزِيْدَ بْنِ مِعْقَلٍ عَنْ مُوْسٰى بْنِ عُقْبَةَ ، عَنْ سَالِمٍ عَنْ حُذَيْفَةَ مَرْفُوْعًا))

''ابومعقل یزید بن معقل سے روایت ہے، انہوں نے موسیٰ بن عقبہ سے روایت کیا، انہوں نے سالم سے اور انہوں نے حذیفہ سے مرفوعاً روایت کیا۔''

مگر اس روایت میں ''العباس'' کی جگہ ''علی'' ہے۔

اس سند کے راوی ابومعقل کے ذکر سے ''کتب رجال'' خالی ہیں۔

اس موضوع حدیث کا پہلا جملہ صحیح ہے، جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ان الفاظ میں مروی ہے:

((لَوْ كُنتَ مُتَّخِذًا خَلِيلًا لَاتَّخَذْتُ اَبَا بَكْرٍ خَلِيلًا ، وَلٰكِنَّهُ أَخِي وَصَاحِبِي ، وَقَدِ اتَّخَذَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ صَاحِبَكُمْ خَلِيلًا)) [مسلم ، ح: ٦١٧٢ ، ابن ماجه: ٩٢ ، الترمذی: ٣٦٥٦] [الضعيفه: ٧/ ٣٣ ، ٣٤]

''اگر میں کسی کو دوست ...... خلیل ...... بناتا تو ابو بکر کو دوست بناتا، لیکن وہ میرے بھائی اور ساتھی ہیں اور اللہ عزوجل نے تمہارے صاحب کو دوست ...... خلیل ...... بنایا ہے۔''

١٤٥ ...... ((أَنْبَأَنَا عَبْدُ الأَوَّلِ ، قَالَ: أَنْبَأَنَا أَبُو إِسْمَاعِيلَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْأَنْصَارِي ، قَالَ: حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ أَحْمَدَ الْأَزْهَرِي ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ إِسْحَاقَ السَّعْدِيُّ ، قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْجُنَيْدِ ، قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي مَرْيَمَ ، قَالَ: حَدَّثَنَا مَسْلَمَةُ ، قَالَ: حَدَّثَنَا زَيْدُ بْنُ وَاقِدٍ ، عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُخَيْمَرَةَ ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: إِتَّخَذَ اللّٰهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا ، وَمُوسٰى نَجِيًّا ، وَاتَّخَذَنِي حَبِيبًا ، ثُمَّ قَالَ: وَعِزَّتِي وَجَلَالِي لَأُوثِرَنَّ حَبِيبِي عَلَى خَلِيلِي وَنَجِيِّي))

''ہم کو عبدالاول نے خبر دی، کہا: ہم کو ابو اسماعیل عبداللہ بن محمد الانصاری نے خبر دی، کہا: ہم سے عمر بن ابراہیم نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن احمد الازہری نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن اسحاق السعدی نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابراہیم بن الجنید نے بیان کیا، کہا: معمر سے ابن ابی مریم نے بیان کیا کہا: ہم سے سلمہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے زید بن واقد نے القاسم بن مخیمرہ سے اور انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اللہ نے ابراہیم کو خلیل ...... دوست ...... اور موسیٰ کو نجی ...... ہم کلام ...... اور مجھ کو حبیب بنایا۔ پھر فرمایا: میری عزت و جلال کی قسم میں اپنے حبیب کو اپنے خلیل اور اپنے نجی پر فضیلت دوں گا۔''

امام ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن الجوزی فرماتے ہیں:

''یہ حدیث صحیح نہیں ہے، کیونکہ زید بن واقد سے اس کی روایت میں مسلمہ منفرد ہے۔ یحییٰ بن معین کا قول ہے: مسلمہ کچھ بھی نہیں۔ اور النسائی، الازدی اور الدارقطنی نے اس کو ''متروک'' قرار دیا ہے۔'' [الموضوعات: ٢/ ٢٠ ، ح: ٥٥٠]

محدث محمد ناصر الدین البانی نے بھی اس حدیث کو موضوع بتایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''القاسم بن الجنید...... نجید...... کا مجھے کوئی ترجمہ نہیں ملا اور مسلمہ جو ابن علی الخشنی ہے محدثین کے نزدیک بالاتفاق ضعیف ہے اور اس کو محدثین کی ایک جماعت متروک قرار دے چکی ہے۔

امام الحاکم نے اس کے بارے میں لکھا ہے: اس نے الاوزاعی اور الزبیدی سے منکر اور موضوع حدیثیں روایت کی ہیں۔''

لیکن ابوالحسن علی بن محمد بن عراق الکنانی نے لکھا ہے:

''مسلمہ بن علی الخشنی اگرچہ ضعیف ہے، مگر اس کو کذب بیانی سے موصوف نہیں کیا گیا ہے اور اس کا شمار ابن ماجہ کے راویوں میں ہوتا ہے۔'' [تنزيه الشريعة: ۱/ ۳۳۳، ح: ۱۷]

گویا ابن عراق کے نزدیک یہ حدیث صرف ضعیف ہے، موضوع نہیں ہے۔ لیکن ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمہ ضعیف ہے اور اس حدیث کی روایت میں وہ منفرد ہے اس طرح ان کے نزدیک بھی کم از کم یہ حدیث منکر ہے۔ اس لیے کہ اس کا متن اس صحیح حدیث کے خلاف ہے جو اوپر گزر چکی اور جس میں یہ صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنا ''خلیل'' بنایا ہے، جبکہ یہ روایت آپ کی اس صفت کی نفی کرتی ہے۔

۱۴۶...... ((أَنْبَأَنَا عَبْدُ الْوَهَابِ بْنُ الْمُبَارَكِ وَمُحَمَّدُ بْنُ نَاصِرِ الْحَافِظَانِ ، وَمَوْهُوبُ بْنُ أَحْمَدَ اللُّغَوِيُّ وَعُمَرُ بْنُ ظَفَرٍ الْمَغَازِلِي ، وَعَبْدُ الْخَالِقِ بْنُ أَحْمَدَ الْيُوسُفِي ، قَالُوا: أَنْبَأَنَا أَبُو بَكْرٍ أَحْمَدُ بْنُ الْمُظَفَّرِ بْنُ سُوسَنَ ، قَالَ: أَنْبَأَنَا أَبُو الْقَاسِمِ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عُبَيْدِاللّٰهِ الْحُرْفِيُّ ، قَالَ: أَنْبَأَنَا أَبُو أَحْمَدَ حَمْزَةُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ الْعَبَّاسِ الدِّهْقَانُ ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عِيسَى بْنِ حَيَّانَ الْمَدَائِنِي الْمَعْرُوفُ بِأَبِي السُّكَيْنِ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الصَّبَاحِ ، قَالَ: أَنْبَأَنَا عَلِيُّ بْنُ الْحَسَنِ الْكُوفِيُّ ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ بْنِ الْيَسَعِ ، عَنْ أَبِي الْعَبَّاسِ الضَّرِيرِ ، عَنِ الْخَلِيلِ بْنِ مُرَّةَ ، عَنْ يَحْيَى الْبَصْرِيِّ ،عَنْ زَاذَانَ ، عَنْ سَلْمَانَ ، قَالَ: حَضَرْتُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم ذَاتَ يَوْمٍ ، فَإِذَا بِأَعْرَابِيٍّ حَافٍ رَاجِلٍ بَدَوِيٍّ قَدْ وَقَفَ عَلَيْنَا ، فَسَلَّمَ فَرَدَدْنَا عَلَيْهِ ، فَقَالَ: يَا قَوْمُ! أَيُّكُمْ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم : أَنَا مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ ، فَقَالَ

الْأَعْرَابِيُّ: لَقَدْ آمَنْتُ بِكَ قَبْلَ أَنْ أَرَاكَ وَأَجَبْتُكَ قَبْلَ أَنْ أَلْقَاكَ وَصَدَّقْتُكَ قَبْلَ أَنْ أَرَى وَجهَكَ ، وَلَكِنِّي أُرِيْدُ أَنْ أَسْأَلَكَ عَنْ خِصَالٍ ، قَالَ: سَلْ عَمَّا بَدَالَكَ فَقَالَ: فِدَاكَ أَبِيْ وَأُمِّيْ أَلَيْسَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ كَلَّمَ مُوْسَى؟ قَالَ: بَلَى۔ قَالَ : وَخَلَقَ عِيْسَى مِنْ رُوْحِ الْقُدُسِ؟ قَالَ: بَلٰى۔ قَالَ وَاتَّخَذَ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا وَاصْطَفَى آدَمَ؟ قَالَ: بَلَى۔ قَالَ: بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي أَيَّ شَيْءٍ أُعْطِيْتَ مِنَ الْفَضْلِ؟ فَأَطْرَقَ النَّبِيُّ ﷺ۔ وَهَبَطَ عَلَيْهِ جِبْرِيْلُ ، فَقَالَ: اللّٰهُ يُقْرِئُكَ السَّلَامَ وَهُوَ يَسْأَلُكَ عَمَّا هُوَ أَعْلَمُ بِهِ مِنْكَ يَقُوْلُ: يَا حَبِيْبِي! لِمَ أَطْرَقْتَ؟ إِرْفَعْ رَأْسَكَ وَرُدَّ عَلَى الْأَعْرَابِيِّ جَوَابَهُ ، قَالَ: أَقُوْلُ مَاذَا يَا جِبْرِيْلُ؟ قَالَ: اللّٰهُ يَقُوْلُ: إِنْ كُنْتُ اِتَّخَذْتُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا فَقَدْ اتَّخَذْتُكَ مِنْ قَبْلُ حَبِيْبًا ، وَاِنْ كَلَّمْتُ مُوْسَى فِيْ الْأَرْضِ فَقَدْ كَلَّمْتُكَ وَأَنْتَ مَعِي فِي السَّمَاءِ ، وَالسَّمَاءَ اَفْضَلُ مِنَ الْاَرْضِ ، وَإِنْ كُنْتُ خَلَقْتُ عِيْسَى مِنْ رُوْحِ الْقُدُسِ ، فَقَدْ خَلَقْتُ إِسْمَكَ قَبْلَ أَنْ أَخْلُقَ الْخَلْقَ بِأَلْفَى سَنَةٍ ، وَلَقَدْ وَطِئْتَ فِيْ السَّمَاءِ مَوطِئًا لَمْ يَطَأْهُ اَحَدٌ قَبْلَكَ وَلَا يَطَأُوْهُ اَحَدٌ بَعْدَكَ وَاِنْ كُنْتُ قَدْ اصْطَفَيْتُ آدَمَ ، فَقَدْ خَتَمْتُ الْاَنْبِيَاءَ بِكَ وَلَقَدْ خَلَقْتُ مِائَةَ اَلفِ نَبِيٍّ وَأَرْبعةً وَعِشْرِيْنَ أَلْفَ نَبِيٍّ، مَاخَلَقْتُ خَلْقًا أَكْرَمَ عَلَيَّ مِنْكَ ، وَمَنْ يَكُوْنُ أَكْرَمَ عَلَيَّ مِنْكَ ، وَلَقَدْ أَعْطَيْتُكَ الْحَوْضَ وَالشَّفَاعَةَ ، وَالنَّاقَةَ ، وَالْقَضِيْبَ وَالْمِيْزَانَ ، وَالْوَجْهَ الأَقْمَرَ ، وَالْجَمَلَ الأَحْمَرَ ، وَالتَّاجَ ، وَالْهِرَاوَةَ ، وَالْحِجَّةَ ، وَالْعُمْرَةَ ، وَالْقُرْاٰنَ ، وَفَضْلَ شَهْرِ رَمْضَانَ ، وَالشَّفَاعَةُ كُلُّهَا لَكَ حَتَّى ظِلَّ عَرْشِيْ فِيْ الْقِيَامَةِ عَلَ رَأْسِكَ مَمْدُوْدٌ ، وَتَاجُ الْمُلْكِ عَلَى رَأسِكَ مَعْقُوْدٌ ، وَلَقَدْ قَرَنْتُ إِسْمَكَ مَعَ إِسْمِيْ ، وَلَا أُذْكَرُ فِيْ مَوْضِعٍ حَتّٰى تُذْكَرَ مَعِي ، وَلَقَدْ خَلَقْتُ الدُّنْيَا وَأَهْلَهَا لِأُعَرِّفَهُمْ كَرَامَتَكَ عَلَيَّ وَمَنْزِلَتَكَ عِنْدِيْ ، وَلَوْلَاكَ يَا مُحَمَّدُ مَا خَلَقْتُ الدُّنْيَا))

’’ہم کو عبدالوہاب بن المبارک اور محمد بن ناصر الحافظان ، اور موہوب بن احمد اللغوی ، اور عمر بن ظفر المغازلی اور عبدالخالق بن احمد الیوسفی نے خبر دی ، ان لوگوں نے کہا: ہم کو ابو بکر احمد بن

المظفر بن سوسن نے خبر دی، کہا: ہم کو ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن عبیداللہ الحرفی نے خبر دی، کہا: ہم کو ابواحمد حمزۃ بن محمد بن العباس الدھقان نے خبر دی، کہا: ہم سے محمد بن عیسیٰ بن حیان المدائنی المعروف بابی السکین نے بیان کیا، کہا: ہم کو علی بن الحسن الکوفی نے، ابراہیم بن الیسع سے انہوں نے ابوالعباس الضریر سے، انہوں نے الخلیل بن مرہ سے، انہوں نے یحییٰ البصری سے انہوں نے زاذان سے اور انہوں نے سلمان سے روایت کرتے ہوئے خبر دی، سلمان نے کہا: میں ایک دن نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اچانک ایک اعرابی ننگے پاؤں یا پیادہ بددی ہمارے پاس آ کر کھڑا ہوگیا اور سلام کیا اور ہم نے اس کے سلام کا جواب دیا، پھر اس نے پوچھا: اے قوم! تم میں محمد رسول اللہ ﷺ کون ہیں؟ نبی ﷺ نے فرمایا: میں محمد رسول اللہ ہوں۔ اس پر اعرابی نے عرض کیا: میں آپ کو دیکھنے سے پہلے آپ پر ایمان لایا، آپ سے شرف ملاقات حاصل کرنے سے قبل آپ کی دعوت قبول کی اور آپ کا وجہ مبارک دیکھنے سے پیشتر آپ کی تصدیق کی، لیکن میں آپ سے چند باتوں کے بارے میں سوال کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: جو جی میں آئے پوچھو۔ اس نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان، کیا اللہ عزوجل نے موسیٰ سے بات نہیں کی؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ اس نے کہا: اور کیا اس نے عیسیٰ کو روح القدس سے پیدا نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ اس نے کہا: اور ابراہیم کو خلیل...... دوست...... بنایا اور آدم کو منتخب فرمایا؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ اس نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ کو کونسی فضیلت عطا کی گئی؟ یہ سن کر نبی ﷺ نے اپنا سر جھکا لیا، اسی وقت جبریل آپ کے پاس آئے اور کہا: اللہ آپ کو سلام بھیجتا ہے اور وہ آپ سے اس بات کے بارے میں سوال کر رہا ہے جس کا علم اس کو آپ سے زیادہ ہے، وہ کہہ رہا ہے: اے میرے حبیب! تم نے اپنا سر کیوں جھکا لیا؟ تم اپنا سر اٹھاؤ اور اعرابی کے سوال کا جواب دو۔ آپ نے فرمایا: جبریل! میں کیا جواب دوں؟ جبریل نے کہا: اللہ کہہ رہا ہے: اگر میں نے ابراہیم کو خلیل بنایا تو اس سے پہلے تم کو اپنا حبیب بنایا۔ اور اگر میں نے موسیٰ کو زمین میں شرفِ کلام بخشا تو میں نے تم کو اس وقت اپنے کلام سے نوازا جب تم آسمان میں میرے ساتھ تھے اور آسمان زمین سے افضل ہے۔ اور اگر میں نے عیسیٰ کو روح القدس سے پیدا کیا تو تمہارے نام کو "تمام مخلوقات" کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال قبل پیدا کیا، اور تم نے آسمان

میں اس جگہ قدم رکھا جہاں تم سے پہلے کسی نے قدم نہیں رکھا اور نہ تمہارے بعد قدم رکھے گا۔ اور اگر میں نے آدم کو چن لیا، تو میں نے تمہارے ذریعہ انبیاء کے سلسلے کو ختم کیا۔ اور میں نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء پیدا کیے۔ لیکن اپنے نزدیک تم سے زیادہ معزز کسی کو نہیں پیدا کیا۔ اور تم سے زیادہ میرے نزدیک معزز کوئی ہو کیسے سکتا ہے؟ جبکہ میں نے تم کو حوض کوثر، ناقہ، درخت کی شاخ، میزان، خوبصورت چہرہ، سرخ اونٹ، تاج، بڑی لاٹھی، حج وعمرہ، قرآن اور ماہ رمضان کی فضیلت عطا کی اور شفاعت تو مکمل طور پر تمہارے حصے میں دے دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ قیامت میں میرا عرش تمہارے سر پر پھیلا دیا جائے گا اور ملک واقتدار کا تاج تمہارے سر پر رکھ دیا جائے گا۔ اور میں نے تمہارے نام کو اپنے نام سے جوڑ دیا ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ساتھ تمہارے ذکر بھی کیا جائے گا۔ میں نے درحقیقت دنیا اور اہل دنیا کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ ان کو اپنے نزدیک تمہاری بزرگی سے باخبر کروں اور ان کو یہ بتاؤں کہ میرے نزدیک تمہارا درجہ کتنا بلند ہے اور اے محمد! اگر تم نہ ہوتے تو میں دنیا کو پیدا ہی نہ کرتا۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ امام ابن الجوزی فرماتے ہیں اس کے موضوع ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، کیونکہ اس کی سند میں مجہول الحال اور ضعیف راوی جمع ہو گئے ہیں۔ ابو السکین اور ابراہیم بن الیسع ضعیف ہیں۔ الدارقطنی کہتے ہیں: ابو السکین ضعیف اور ابراہیم بن الیسع اور یحییٰ البصری متروک ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے لکھا ہے کہ میں نے یحییٰ البصری کی روایت کردہ حدیثیں پھاڑ کر پھینک دیں۔ اور الفلاس نے کہا ہے: یحییٰ جھوٹا تھا اور موضوع حدیثیں بیان کیا کرتا تھا اور امام الدارقطنی نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔

[الموضوعات: ۱/۱۸، ۱۹، ح: ۵۴۹]

اور حافظ جلال الدین السیوطی نے " اللآلی المصنوعه: ۱/۲۴۹ " میں اور ابن عراق نے ''تنزیة الشریعه: ۱/۳۲۴، ۳۲۵، ح: ٦ " میں امام ابن الجوزی سے اس کے موضوع ہونے پر اتفاق کیا ہے، اور اگر حافظ السیوطی کسی حدیث کو موضوع کہہ دیں تو پھر اس کے موضوع ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا، کیونکہ " صوفی المشرب "ہونے کی وجہ سے مناقب وفضائل کے باب میں وہ مشکل سے کسی حدیث کو موضوع مانتے ہیں۔

۱٤۷ ...... ((أَنْبَأَنَا عَبْدُ الأَوَّلِ ، قَالَ: أَنْبَأَنَا أَبُو إِسْمَاعِيلَ عَبْدُاللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ

الْأَنْصَارِيُّ ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ النَّيْسَابُورِيُّ ، قَالَ: أَنْبَأَنَا أَحْمَدُ بْنُ جَعْفَرٍ الْقَطِيْعِيُّ ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُونُسَ ، قَالَ: حَدَّثَنَا بِشْرُ بْنُ عُبَيْدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا مُوسَى ابْنُ سَعِيدٍ الرَّاسِبِيُّ ، عَنْ قَتَادَةَ ، عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ قَيْسٍ الْيَشْكُرِيِّ ، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ اللّٰهَ أَعْطَى مُوسَى الْكَلَامَ وَأَعْطَانِيَ الرُّؤْيَةَ ، وَفَضَّلَنِي بِالْمَقَامِ الْمَحْمُودِ وَالْحَوْضِ الْمَوْرُودِ))

’’ہم کو عبدالاول نے خبر دی، کہا: ہم کو ابو اسماعیل عبداللہ بن محمد الانصاری نے خبر دی، کہا: ہم سے محمد بن ابراہیم النیسابوری نے بیان کیا، کہا: ہم کو احمد بن جعفر القطیعی نے خبر دی، کہا: ہم سے محمد بن یونس نے بیان کیا، کہا: ہم سے بشر بن عُبید نے بیان کیا، کہا: ہم سے موسیٰ بن سعید الراسبی نے ،قتادہ سے، انہوں نے سلیمان بن قیس الیشکری اور انہوں نے جابر بن عبداللہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیشک اللہ نے موسیٰ کو ہم کلامی کا شرف بخشا اور مجھے اپنی رؤیت سے سرفراز فرمایا۔ اور مجھے مقام محمود اور اُس حوض سے فضیلت بخشی، جس پر اہل ایمان آئیں گے۔‘‘

یہ حدیث موضوع اور رسول اللہ ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے، اس کو وضع کرنے کا مجرم محمد بن یونس الکدیمی ہے، جو ’’وضاع حدیث‘‘ تھا۔ ابن حبان کا قول ہے کہ اس نے ایک ہزار سے زیادہ حدیثیں وضع کی ہیں۔ [الموضوعات: ۲/۲۱، ح: ۵۵۱]

امام ابن الجوزی نے صرف محمد بن یونس الکدیمی کو وضاع حدیث قرار دیا ہے، لیکن اس سند کے دوسرے راوی بشر بن عُبید پر بھی کذب بیانی اور وضع حدیث کا الزام ہے۔

اس حدیث کو حافظ السیوطی نے بھی " اللآلي المصنوعه : ۱/۲۵۰ " میں اور ابن عراق نے "تنزية الشريعة: ۱/۳۲۵ " میں نقل کیا ہے اور اس کو موضوع ہونے میں امام ابن الجوزی سے اتفاق کیا ہے۔

اس موضوع حدیث میں جس رؤیت کا دعویٰ کیا گیا ہے اس سے اللہ تعالیٰ کی وہ روایت مراد ہے جس سے بعض لوگوں کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کو معراج کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے سرفراز کیا تھا، لیکن یہ محض ایک دعویٰ ہی ہے جو اپنے پیچھے کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں رکھتا، بلکہ یہ قرآن پاک کی تصریحات اور صحیح احادیث کے خلاف ہے یہ صحیح ہے کہ صحابۂ کرام میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور محدثین میں متعدد

حضرات اس کے قائل تھے، لیکن ابن عباس سے اس سلسلے میں جو اقوال منقول ہیں اولاً تو ان میں سخت اضطراب پایا جاتا ہے۔ دوم یہ اقوال ان کی اپنی رائے پر مبنی ہیں ان میں سے کسی میں بھی انہوں نے نبی ﷺ کے کسی ارشاد کا حوالہ نہیں دیا ہے، مگر ان کے برعکس صحابۂ کرام میں حضرت عبداللہ بن مسعود، ام المؤمنین حضرت عائشہ، حضرت ابوذر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم نے خود نبی اکرم ﷺ کے ارشادات نقل کیے ہیں، جن میں آپ نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ آپ نے معراج میں اللہ تعالیٰ کو نہیں، بلکہ حضرت جبریل علیہ السلام کو اس اصل صورت میں، جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے، دیکھا تھا۔

چونکہ ''صوفی المشرب'' علماء قدیم زمانے سے نہ صرف یہ کہ اس بات کے قائل رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا، بلکہ وہ اس کے علاوہ اور بہت سی گمراہ کن باتوں کے قائل رہے ہیں اور اب تک ہیں، اس لیے کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلے کو قدرے تفصیل سے بیان کر دینے کی ضرورت ہے، اس سلسلے میں سب سے پہلے قرآن پاک سے رجوع کرتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ:

﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴾

[الانعام: ۱۰۳]

''نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے اور وہ نہایت باریک بیں اور ہر چیز سے باخبر ہے۔''

اوپر یہ فرمایا جارہا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی نے آسمانوں اور زمین کو وجود بخشا ہے بلکہ وہی ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا عبادت اور بندگی کا سزاوار تنہا اللہ ہی ہے اور پھر اس آیت مبارکہ میں اس کی ایک اور صفت بیان کی گئی ہے کہ نگاہیں نہ تو اس کو دیکھ سکتی ہیں اور نہ اس کی حقیقت کا احاطہ کرسکتی ہیں، مگر نگاہیں اس کے احاطۂ علم میں ہیں۔ اور آیت کا اختتام اس کی دو مزید صفتوں پر ہوا ہے: ''اللطیف اور الخبیر یعنی کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس کے احاطۂ علم سے باہر نہیں ہے اس لیے کہ وہ بڑا باریک بیں ہے اور ہر شئے کی خبر رکھتا ہے۔

اس آیت کی بہترین تفسیر سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۴۳ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَمَّا جَآءَ مُوسٰى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ ۙ قَالَ رَبِّ أَرِنِيٓ أَنظُرْ إِلَيْكَ ۚ قَالَ لَن تَرٰىنِي وَلٰكِنِ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرٰىنِي ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ أَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿143﴾ ﴾ [الاعراف: ۱۴۳]

''اور جب موسیٰ ہماری مقررہ مدت پر حاضر ہوا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا، تو اس نے درخواست کی کہ اے میرے رب! مجھے اپنے آپ کو دکھا تاکہ میں تیری طرف دیکھ سکوں اللہ نے فرمایا: تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا، لیکن پہاڑ کی طرف دیکھ اگر وہ اپنی جگہ ٹکا رہ گیا تو تو بھی مجھے دیکھ سکے گا، تو جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلی فرمائی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا، پھر جب اسے ہوش آیا تو بولا: پاک ہے تیری ذات میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں۔''

اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہونے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ خواہش ابھری کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اس کے دیدار کی درخواست کریں اور پھر انہوں نے نہایت ادب سے یہ درخواست کر ڈالی اللہ تعالیٰ نے ان پر اس درخواست کی وجہ سے کوئی عتاب تو نہ کیا، البتہ یہ فرمایا کہ تو اپنی ان دنیاوی آنکھوں سے مجھے نہیں دیکھ سکتا اور ان کے اطمینان کے لیے یہ بھی فرمایا کہ تم سامنے پہاڑ کی طرف دیکھو میں اپنی تجلی اس پر ڈالتا ہوں اگر وہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ جائے تو سمجھ لینا کہ تم بھی مجھے دیکھ سکتے ہو۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے اس پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو وہ ریزہ ریزہ ہو کر ڈھیر ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے اگر خود ان پر یہ تجلی ہوئی ہوتی تو نہ جانے ان کا کیا حال ہوا ہوتا۔ اس لیے ہوش میں آنے پر پکار اٹھے کہ اے میرے رب! تو اس سے بہت بلند و برتر اور پاک ہے کہ کوئی دنیاوی آنکھ تجھے دیکھ سکے اس لیے میں تجھے دیکھنے کی جس خواہش کے اظہار کی جسارت کر بیٹھا تھا، اس سے توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلے اس بات پر ایمان لاتا ہوں کہ تیری ذات ہماری ان دنیاوی آنکھوں کے مشاہدے سے بہت بلند و برتر ہے۔

یہ آیت مبارکہ اس امر میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہنے دیتی کہ اس دنیا میں کوئی بھی آنکھ اللہ تعالیٰ کی ذات کا مشاہدہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی اور اگر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رؤیت سے سرفراز فرمایا ہوتا تو وہ آپ کی ایسی عظیم اور غیر معمولی انفرادیت ہوتی جس کا ذکر وہ ضرور کرتا جس طرح اس نے یہ ذکر کر دیا ہے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو ہم کلامی کا شرف بخشا ہے اور یہ تصریح ضرور کرتا کہ موسیٰ تو میرا مشاہدہ نہیں کر سکے گا، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا مشاہدہ کرنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔

قرآن پاک کی ایک اور آیت سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ کسی بھی آنکھ کو اللہ تعالیٰ کی رؤیت اور مشاہدے کا شرف حاصل نہیں ہوا ہے۔ اور وہ سورۃ الشوریٰ کی آیت نمبر: ۵۱ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَآئِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ

رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ﴿51﴾ [الشوریٰ: ۵۱]

''اور کسی بشر کا یہ مقام نہیں رہا ہے کہ اللہ اس سے بات سے کرے، سوائے بذریعہ وحی یا پردے کے پیچھے سے یا پھر وہ کوئی فرشتہ بھیجتا رہا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا تھا وحی کرتا رہا ہے اور وہ بہت بلند اور صاحبِ حکمت ہے۔''

یہ آیت بصراحت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی فردِ بشر سے روبرو بات نہیں کی ہے اس نے یا تو وحی یعنی خفیہ اشارے کو ذریعہ بنایا ہے یا پردے کے پیچھے سے بات کی ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام سے کی تھی یا فرشتہ بھیج کر اپنے نبیوں اور رسولوں کو اپنا پیغام دیتا رہا ہے۔

قرآنِ پاک کی مذکورہ بالا آیتوں سے تو یہ بات روز روشن کی طرح صاف ہوگئی کہ کسی بھی آنکھ کو ابتدائے آفرینش سے اللہ تعالیٰ کی رؤیت کا شرف حاصل ہوا ہے اور نہ قیامت تک حاصل ہوگا، البتہ آخرت میں اہل ایمان اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی سعادت حاصل کریں گے، جس کا ذکر قرآن اور حدیث دونوں میں وارد ہے اور جو ہمارے عقیدے کا ایک حصہ ہے۔

بلاشبہ اسراء اور معراج کا معجزہ ایک ایسا منفرد اور عظیم معجزہ ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے سوا اپنے کسی اور رسول یا نبی کو سرفراز نہیں فرمایا۔ قرآنِ پاک میں اسراء اور معراج کی تفصیلات نہیں بیان ہوئی ہیں، بلکہ مجملاً اس کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے، چنانچہ سورۃ الاسرا کی صرف پہلی آیت میں اس واقعہ کا ذکر آیا ہے اور وہ بھی صرف ''اسراء'' کی حد تک اور سورۃ النجم کی آیات ۱۳ تا ۱۸ میں ''معراج'' سے تعرض کیا گیا ہے، مگر اجمال کے ساتھ البتہ صحیح احادیث میں اس معجزے کی پوری تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ اور جن صحابیوں نے نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے سن کر یہ واقعہ اور اس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ ان کی کم از کم تعداد ۱۷ ہے۔

سورۃ الاسراء کی پہلی آیت میں اس معجزے کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد ﷺ کو یہ سفر اس غرض سے کرایا تھا تا کہ وہ آپ کو اپنی بعض نشانیوں کا مشاہدہ کرائے اور سورۃ النجم کی آیات میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کی چند بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کیا۔ اور ظاہر سی بات ہے کہ اللہ کی آیات اور نشانیاں اس کی ذات کے علاوہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں نبی اکرم ﷺ نے اسراء اور معراج میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا مشاہدہ فرمایا تھا، اللہ تعالیٰ کا نہیں۔

اسراء اور معراج کی غیر معمولی عظمت اور انفرادیت کا اندازہ اس امر سے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے اس کا ذکر ''سبحان'' کے لفظ سے شروع کیا ہے جو ہر طرح کے عیوب، نقائص اور کمزوریوں سے اس کے پاک اور منزہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ آیَاتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝ ﴾

[اسراء: ۱]

''پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو ایک رات مسجد حرام سے دور کی اُس مسجد تک جس کے گرد وپیش میں ہم نے برکتیں پھیلا رکھی ہیں، تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائیں، بیشک وہی سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔''

سورۃ الاسراء میں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا گیا۔ رہی سورۃ النجم تو اس کی ابتدائی ۱۲ آیتوں میں کفار مکہ کو مخاطب کر کے نبی اکرم ﷺ کی صفات بیان کی گئی ہیں اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ نبی ﷺ بھٹکے ہوئے نہیں ہیں اور وہ جن باتوں کی دعوت دے رہے ہیں وہ آپ کے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ وحی الٰہی پر مبنی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی تعلیم کے لیے ایک نہایت زبردست طاقت رکھنے والے اور عاقل و دانا فرشتے کو مقرر کر رکھا ہے، جس کو آپ نے اپنی آنکھوں سے نہایت قریب سے دیکھا ہے اور آپ کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا دل نے اس کی تصدیق کی ہے، یعنی یہ آپ کے تخیلات کی کرشمہ سازی نہیں تھی، بلکہ عین حقیقت تھی۔

سورۃ النجم کی یہ ۱۲ آیتیں ایک نہایت مضبوط نظم میں جکڑی ہوئی ہیں۔ اوران کا باہمی ربط اس قدر محکم اوران کا مفہوم اس قدر واضح ہے کہ ان میں مذکور جس ذات کی رؤیت کا ذکر ہے، وہ حضرت جبریل علیہ السلام کے سوا کوئی اور ذات ہو ہی نہیں سکتی۔ ان وضاحتوں کو سامنے رکھیے اوران ۱۲ آیتوں پر غور کیجیے:

﴿ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی ۝1 مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی ۝2 وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝3 اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰی ۝4 عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰی ۝5 ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰی ۝6 وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ۝7 ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۝8 فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی ۝9 فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰی ۝10 مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ۝11 اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا يَرٰی ۝12 ﴾

''قسم ہے تارے کی جب وہ غرب ہوا......گرا......تمہارا ساتھی نہ بھٹکا ہے اور نہ بہکا ہے وہ اپنی

خواہش نفس سے نہیں بولتا یہ تو بس ایک وحی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔ اس کو زبردست قوت والے دانا نے تعلیم دی ہے۔ پس وہ کھڑا ہو گیا، جبکہ وہ بالائی افق پر تھا۔ پھر قریب آیا اور معلق ہو گیا، پس دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا، تب اس نے اللہ کے بندے کو وحی کی جو وحی کرنی تھی (تب اللہ نے اس کے ذریعہ اپنے بندے کو وحی کی جو وحی کرنی تھی) اس کی آنکھ نے جو دیکھا اس کے دل نے اس کو جھوٹ نہ جانا، تو کیا تم اس سے اُس چیز پر جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے۔''

ان آیتوں کا معراج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ بلا کسی ادنیٰ شک وشبہ کے اسلامی دعوت کے بالکل ابتدائی مرحلے سے تعلق رکھتی ہیں جو غار حراء میں پہلی وحی نازل ہونے کے بعد کا مرحلہ ہے اور جس میں جبریل علیہ السلام آسمان کے بالائی مشرقی افق پر نمودار ہوئے تھے، یہ افق بیحد واضح ہوئے تھے اسی وجہ سے سورۃ التکویر میں اس کو ﴿ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ﴾ سے تعبیر کیا گیا ہے اور ایک ہی چیز کو اس کی متعدد صفات کے لحاظ سے مختلف الفاظ سے تعبیر کرنا قرآن میں عام ہے۔

اور اگر ہم " القرآن یفسر بعضه بعضًا " کے اصول پر سورۃ التکویر کی آیات ۱۹ تا ۲۳ کو سورۃ النجم کی مذکورہ آیتوں کے بالمقابل رکھ کر ان پر غور کریں تو روز روشن کی طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں جس عظیم ہستی کا ذکر کیا گیا ہے اور جو عظیم ہستی رسول اللہ ﷺ تک ان کے رب کا پیغام پہنچانے کی مکلف بنائی گئی تھی وہ ہستی حضرت جبریل علیہ السلام کے سوا کوئی اور نہ تھی اور رسول اللہ ﷺ نے انہی کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿19﴾ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍ ﴿20﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ ﴿21﴾ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿22﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ﴿23﴾ ﴾

''بیشک یہ...... قرآن ...... ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے جو بڑا زور آور اور عرش والے کے نزدیک بلند مرتبہ ہے۔ وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے اور وہ بڑا با اعتماد ہے۔ اور تمہارا ساتھی کوئی خبطی نہیں ہے۔ اور اس نے اس کو روشن افق پر دیکھا ہے۔''

یہ آیات کسی تفسیر اور توضیح کی محتاج نہیں ہیں۔ سورۃ النجم میں جن حقائق کو تفصیل سے بیان کیا گیا تھا، سورۃ التکویر میں ان کو اختصار سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس طرح کا طرز بیان قرآنِ پاک میں عام ہے، جو موقع ومحل کی مناسبت سے اختیار کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد سورۃ النجم کی آیات ۱۳ تا ۱۸ کا تعلق معراج سے ہے۔ اور آیت ۱۳ اور ۱۴ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو دوسری بار (معراج کے موقع پر) ''سدرۃ المنتہیٰ'' کے پاس دیکھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَقَدْ رَءَاهُ نَزْلَةً أُخْرَى ﴿13﴾ عِندَ سِدْرَةِ الْمُنتَهَى ﴿14﴾ عِندَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَى ﴿15﴾ إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَى ﴿16﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى ﴿17﴾ لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى ﴿18﴾ ﴾

''اور اس نے ایک بار اور اس کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اترتے دیکھا۔ اسی کے پاس جنت الماویٰ ہے۔ اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا نہ اس کی نگاہ کج ہوئی اور نہ حد سے متجاوز اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔''

تو یہ آیتیں اپنے مفہوم میں اس قدر واضح ہیں کہ ان کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ آیت نمبر ۱۳ یہ صراحت کر رہی ہے کہ نبی ﷺ نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جس ہستی کو دیکھا تھا وہ حضرت جبریل علیہ السلام کی ذات تھی، کیونکہ اگر اس سے ذات باری تعالیٰ کو مراد لیا جائے گا تو یہ لازم آئے گا کہ آپ نے پہلی بار زمین پر بھی اللہ تعالیٰ ہی کو دیکھا تھا، کیونکہ ''دوسری بار'' کا فقرہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ''پہلی بار'' یہ واقعہ کہیں پیش آ چکا ہے۔

جبکہ دو رؤیتوں کے قائل تو وہ لوگ بھی نہیں ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کیا تھا، وہ صرف معراج میں اس رؤیت کے قائل ہیں۔ اس طرح قرآنی آیتوں کی ان صراحتوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین پر اور پھر عالم بالا میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ایک ہی ہستی کو دیکھا تھا اور وہ حضرت جبریل علیہ السلام کی ہستی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس نہیں تھی اور جبریل علیہ السلام ان دونوں جگہوں پر نبی اکرم ﷺ کے سامنے اپنی اُس اصل صورت میں ظاہر ہوئے تھے، جس پر اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔

رہی آیت نمبر ۱۸ تو وہ یہ صراحت کر رہی ہے کہ معراج میں نبی ﷺ نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ اس موقع پر آپ اگر باری تعالیٰ کی رؤیت سے سرفراز کیے گئے ہوتے تو اس کو خصوصیت کے ساتھ اور نمایاں شکل میں بیان کیا جاتا اور اتنے اہم اور عظیم واقعہ کو لوگوں کے استنباطات اور قیاس آرائیوں پر نہ چھوڑا جاتا اور نہ یہ کہہ کر سلسلۂ کلام کو ختم کر دیا جاتا کہ ''اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی

نشانیاں دیکھیں۔''

رہیں وہ احادیث جن میں اسراء اور معراج کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں اور جو سنداً اور متناً صحیح ہیں اور مرفوع ہیں تو ان میں بھی یہ صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معراج میں اللہ تعالیٰ کو نہیں، بلکہ حضرت جبریل علیہ السلام کو دیکھا تھا۔ چنانچہ صحیحین میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو حدیث مروی ہے اس کے راوی جلیل القدر تابعی حضرت مسروق بن الأجدع ہیں، کہتے ہیں:

((قُلْتُ لِعَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا: يَا اُمَّتَاهُ! هَلْ رَأَى مُحَمَّدٌ ﷺ رَبَّهُ؟ فَقَالَتْ: لَقَدْ قَفَّ شَعْرِيْ مِمَّا قُلْتَ، أَيْنَ أَنْتَ مِنْ ثَلَاثٍ، مَنْ حَدَّثَكَهُنَّ فَقَدْ كَذَبَ: مَنْ حَدَّثَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَأَى رَبَّهُ، فَقَدْ كَذَبَ ثُمَّ قَرَأَتْ: ﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ، وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ﴾

وَمَنْ حَدَّثَكَ أَنَّهُ يَعْلَمُ مَافِيْ غَدٍ فَقَدْ كَذَبَ، ثُمَّ قَرَأَتْ: ﴿ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّا ذَا تَكْسِبُ غَدًا ﴾ وَمَنْ حَدَّثَكَ أَنَّهُ كَتَمَ فَقَدْ كَذَبَ، ثُمَّ قَرَأَتْ: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط الآية ﴾ وَلٰكِنَّهُ رَأَى جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْ صُوْرَتِهِ مَرَّتَيْنِ)) ❶

''میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا: امی جان! کیا محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟ انہوں نے جواب دیا: تمہاری اس بات سے میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے، تم تین باتوں سے متعلق کہاں ہو، جن کو اگر کوئی بیان کرے تو وہ جھوٹا ہے؛ جو شخص تم سے یہ بیان کرے محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا تھا، وہ جھوٹ کہتا ہے، پھر انہوں نے یہ آیتیں پڑھیں: ﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ اور وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَاءُ ﴾ اور جس نے تم سے یہ بیان کیا کہ وہ یہ جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا تو جھوٹ کہتا ہے، پھر انہوں نے پڑھا: ﴿ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّا ذَا تَكْسِبُ غَدًا ﴾ ''کوئی نفس یہ نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائے گا؟'' اور جس نے تم سے یہ بیان کیا کہ محمد ﷺ نے کچھ باتیں چھپا دیں تو وہ جھوٹا ہے، پھر انہوں نے پڑھا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَه) ﴾ ''اے پیغمبر! جو کچھ تمہارے

❶ بخاري، ح: ٤٨٥٥

رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ (اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی رسالت کا حق ادا نہ کیا۔)''

لیکن نبی ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو دو مرتبہ ان کی اصلی صورت میں دیکھا تھا۔

اور ''صحیح بخاری کتاب بدء الخلق، ح: ۳۲۳۵ '' میں مسروق کہتے ہیں:

((قُلْتُ لِعَائِشَةَ رضی اللہ عنہا : فَأَيْنَ قَوْلُهُ: " ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى ، فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى " قَالَتْ ذَاكَ جِبْرِيْلُ ، كَانَ يَأْتِيهِ فِي صُوْرَةِ الرَّجُلِ ، وَإِنَّهُ أَتَى هٰذِهِ الْمَرَّةَ فِي صُوْرَتِهِ الَّتِي هِيَ صُورَتُهُ ، فَسَدَّ الأُفُقَ))

''میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ: اللہ تعالیٰ کے اس قول سے کیا مراد ہے؟: " ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى ، فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى " تو فرمایا کہ وہ تو جبریل تھے وہ ہمیشہ نبی ﷺ کی خدمت میں کسی آدمی کی شکل میں حاضر ہوا کرتے تھے، مگر اس بار وہ اپنی اُس شکل میں حاضر ہوئے جو ان کی اصلی شکل ہے اور سارا افق ان سے بھر گیا۔''

اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث کس قدر واضح اور تکلف سے پاک ہے اور ان کے لب و لہجہ میں کس قدر اعتماد ہے۔ یہ لب ولہجہ اور بیان میں یہ وضوح اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہنے والے کو اپنی بات کی سچائی کا یقین ہو۔ چنانچہ اُم المؤمنین نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ان کے ذہن کی پیداوار نہیں ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد پر مبنی ہے جیسا کہ انہوں نے تصریح کی ہے۔ صحیح مسلم میں ام المؤمنین سے مسروق کی روایت زیادہ مفصل ہے اور جب مسروق نے ان سے سوال کرتے ہوئے عرض کیا:

((أَلَمْ يَقُلِ اللّٰهُ تَعَالَى : وَلَقَدْ رَءَاهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِيْنِ " وَلَقَدْ رَءَاهُ نَزْلَةً أُخْرَى "؟ فَقَالَتْ : أَنَا أَوَّلُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ سَأَلَ عَنْ ذَلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ : إِنَّمَا هُوَ جِبْرِيْلُ عليه السلام لَمْ أَرَهُ عَلَى صُوْرَتِهِ الَّتِي خُلِقَ عَلَيْهَا غَيْرَهَا تَيْنِ الْمَرَّتَيْنِ ، رَأَيْتُهُ مُنْهَبِطًا مِنَ السَّمَاءِ ، سَادًّا عِظَمُ خَلْقِهِ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ)) ❶

''کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ رَءَاهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴾ اور ﴿ وَلَقَدْ رَءَاهُ نَزْلَةً أُخْرٰى ﴾ اس کے جواب میں اُم المؤمنین نے فرمایا: اس امت میں سب سے پہلے میں نے ہی رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں سوال کیا تھا تو آپ نے فرمایا تھا: وہ تو جبریل

❶ حدیث: ٤٣٩

،علیہ السلام، تھے میں نے ان کو اُن کی اُس اصلی صورت میں جس پر اللہ نے اُن کو پیدا کیا ان دو موقعوں کے سوا کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے ان کو اس حال میں آسمان سے اترتے دیکھا کہ ان کی عظیم ہستی زمین وآسمان کے درمیان ساری فضا پر چھائی ہوئی تھی۔''

کیا اس مفصل صحیح حدیث کے بعد بھی اس امر میں کوئی شک باقی رہ جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین پر اور عالم بالا میں سدرۃ المنتہی کے پاس جس کو دیکھا تھا وہ جبریل علیہ السلام تھے اور قرآن پاک کی آیتوں: ﴿ وَلَقَدْ رَءَاهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ ﴾ اور ﴿ وَلَقَدْرَءَاهُ نَزْلَةً أُخْرَى ﴾ میں ضمیر ''ہ'' کا مرجع بھی یقیناً جبریل علیہ السلام ہیں۔

اسی طرح صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے جو حدیث مروی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو اس صورت میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو تھے، حدیث کے الفاظ ہیں:

((حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ : حَدَّثَنَا أَبُوعَوَانَةَ : حَدَّثَنَا أَبُو اسْحاقَ الشَّيْبَانِيُّ ، قَالَ : سَأَلْتُ زِرَّ بْنَ حُبَيْشٍ عَنْ قَوْلِ اللهِ تَعَالَى : فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ اَدْنَى ، فَاَوْحَى اِلَى عَبْدِهِ مَا أَوْحىٰ " قَالَ : حَدَّثَنَا ابْنُ مَسْعُودٍ أَنَّهُ رَأَى جِبْرِيلَ لَهُ سِتُّ مِائَةِ جَنَاحٍ ")) [1]

''ہم سے قتیبہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابوعوانہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابواسحاق الشیبانی نے بیان کیا، کہا: میں نے زر بن حبیش سے اللہ تعالیٰ کے قول: ''فکان قاب قوسین او ادنی'' اور ''فأوحی إلی عبدہ ما أوحی'' کے بارے میں سوال کیا، تو انہوں نے کہا: ابن مسعود نے فرمایا ہے: نبی ﷺ نے جبریل کو اس صورت میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو تھے۔''

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ بات رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سن کر کہی ہے جیسا کہ ابونعیم نے ''المستخرج'' میں سلیمان بن داؤد الہاشمی کے طریق سے روایت کیا ہے:

((عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ دَاوٗدَ الهَاشِمِيِّ عَنْ عَبْدِ الْوَاحِدِ بْنِ زِيَاءٍ عَنِ الشَّيْبَانِيِّ، قَال : سَأَلْتُ ذِرَّ بْنَ حُبَيْشٍ عَنْ قَوْلِ اللهِ : فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنَى ، فَقَال: قَالَ عَبْدُ اللهِ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ......)) [فتح الباری :۲/ ۲۱۳۰]

[1] بخاری، حدیث: ۳۲۳۲۔ مسلم، حدیث: ۴۳۲

''سلیمان بن داؤد الہاشمی سے روایت ہے، انہوں نے عبدالواحد بن زیاد سے روایت کیا، اور انہوں نے الشیبانی سے، کہا: میں نے زر بن حبیش سے اللہ کے قول ''فکان قاب قوسین او ادنی '' کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: عبداللہ نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے......''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ مرفوع حدیث امام ابن جریر الطبری نے اپنی تفسیر (۴۹/۲۷) میں حماد بن سلمہ عن عاصم ابن بہدلہ عن زر عن ابن مسعود کی سند سے اور امام احمد نے مسند (۴۰۷/۱) میں حسین بن واقد، عن عاصم ابن بہدلہ، عن شقیق بن سلمہ، عن ابن مسعود کی سند سے روایت کی ہے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے جو حدیث مروی ہے اس کے الفاظ ہیں:

((حَدَّثَنَا أَبُوْ بَكْرِ بْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ حَدَّثَنَا وَكِيْعٌ عَنْ يَزِيْدَ بْنِ إِبْرَاهِيْمَ ، عَنْ قَتَادَةَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ شَقِيْقٍ ، عَنْ أَبِيْ ذَرٍّ ، قَالَ : سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ هَلْ رَأَيْتَ رَبَّكَ؟ قَالَ : نُوْرٌ أَنّٰى أَرَاهُ)) ❶

''ہم سے ابوبکر بن ابی شیبہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے وکیع نے یزید بن ابراہیم سے، انہوں نے قتادہ سے، انہوں نے عبداللہ بن شقیق سے اور انہوں نے ابوذر سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟ فرمایا: وہ تو نور ہے میں اس کو کس طرح دیکھ سکتا ہوں۔''

ایک دوسری روایت میں ہے: ((رأیتُ نُوْرًا)) میں نے ایک نور دیکھا۔ [حدیث : ٤٤٤] مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ اور اللہ کے درمیان نور کا ایک پردہ حائل تھا جو اللہ تعالیٰ کی رؤیت سے مانع تھا۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہم کی ان مرفوع حدیثوں کے بالمقابل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایتیں منسوب ہیں اولاً تو ان میں بڑا اضطراب ہے۔ دوم ان میں سے کوئی بھی روایت مرفوع نہیں ہے۔

چنانچہ کسی روایت میں تو انہوں نے یہ کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دوبار دیکھا، کسی میں انہوں نے یہ تصریح کی ہے کہ یہ رؤیت قلبی تھی، کسی میں ایک رؤیت کو عینی اور دوسری کو قلبی بتایا ہے اور کسی میں عین رؤیت کی صاف صاف نفی کر دی ہے۔

---

❶ حدیث: ٤٤٣

سنن ترمذی میں مروی حدیث کے الفاظ ہیں:

((عَنْ عِكْرَمَةَ ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ، قَالَ : رَأَى مُحَمَّدٌ رَبَّهُ ، قُلْتُ : أَلَيْسَ اللّٰهُ يَقُوْلُ : لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ "؟ قَالَ : وَيْحَكَ : ذَاكَ إِذَا تَجَلّٰى بِنُوْرِهِ الَّذِيْ هُوَ نُوْرُهُ ، وَقَالَ : أُرِيَهُ مَرَّتَيْنِ)) ❶

''عکرمہ سے روایت ہے، انہوں نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے'' میں نے عرض کیا: کیا اللہ یہ نہیں فرماتا ہے کہ: آنکھیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ آنکھوں کو پالیتا ہے۔'' تو فرمایا: تم پر افسوس! اس سے تو یہ مراد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے، جو اس کا نور ہے، تجلی فرمائی، اور کہا: ان کو اللہ کا دو بار مشاہدہ کرایا گیا۔''

یہ حدیث ضعیف ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: اس سند میں یہ حدیث حسن ضعیف ہے۔ اور اگر یہ صحیح بھی ہوتی تو بھی موقوف ہونے کی وجہ سے یہ صحیح اور مرفوع حدیث کے خلاف دلیل نہیں بن سکتی تھی۔

اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس سے ﴿ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى ، وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَى ﴾ کا مطلب پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کو دو مرتبہ اپنے دل سے دیکھا۔

حدیث کے الفاظ ہیں:

((حَدَّثَنَا أَبُوْ بَكْرِ بْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ وَأَبو سَعِيْدٍ الأَشَجُّ ، جَمِيْعًا عَنْ وَكِيْعٍ ، قَالَ الأَشَجُّ حَدَّثَنَا وَكِيْعٌ ، حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ عَنْ زِيَادِ بْنِ الْحُصَيْنِ أَبِيْ جَهْمَةَ ، عَنْ أَبِي الْعَالِيَةِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ، قَالَ : مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى ، وَلَقَدْ رَءَاهُ نَزْلَةً أُخْرَى، قَالَ : رَآهُ بِفُؤَادِهِ مَرَّتَيْنِ)) ❷

''ہم سے ابو بکر بن ابی شیبہ اور ابو سعید الاشج دونوں نے وکیع سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا ،الاشج نے کہا: ہم سے وکیع نے بیان کیا، کہا: ہم سے الاعمش نے زیاد بن الحصین ابی جھمہ سے، انہوں نے ابو العالیہ سے اور انہوں نے ابن عباس سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، کہا: اس نے جو کچھ دیکھا دل نے اس کو جھوٹ نہ جانا۔'' اور اس نے اس کو دوسری بار اترتے ہوئے

❶ حدیث: ۳۲۷۹ ❷ حدیث: ٤٣٧

دیکھا، ابن عباس نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے اللہ کو اپنے دل سے دو بار دیکھا۔''

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جتنی روایتیں تفسیر اور احادیث کی بعض کتابوں میں منقول ہیں اُن سب میں رؤیت عینی اور رؤیت قلبی میں یہ خلط ملط موجود ہے مزید یہ کہ کوئی بھی راویت مرفوع نہیں ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ تابعین اور ان کے بعد کے جن علماء نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے جب ان کو اپنے اس دعویٰ کی کوئی دلیل کتاب وسنت سے نہیں ملی تو اس مسئلے میں انہوں نے فلسفیانہ موشگافیاں شروع کر دیں اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ نبی ﷺ کا اپنے رب کو دیکھنا عقلاً محال نہیں تھا، حالانکہ قران پاک میں موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ ''لَنْ تَرَانِي''، تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے، اور پھر کوئی استثنا نہ کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دنیاوی آنکھوں سے دیکھنا محال ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں اپنے پیارے نبی کے جو فضائل ومناقب بیان فرمائے ہیں یا صحیح اور مرفوع احادیث میں آپ کے جو شمائل اور آپ کی سیرت کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں، ہمیں انہی پر اکتفا کرنا چاہیے کیونکہ نبی اکرم ﷺ کے مناقب اور شمائل کا باب ایسا ہے کہ اگر پیروان نبی کو اس میں آزاد چھوڑ دیا جائے اور ان کو یہ آزادی دے دی جائے کہ وہ اس باب میں اپنے ذہن ودماغ سے جو واقعہ چاہیں گھڑ کر سیرت پاک میں شامل کر دیں یا آپ کی جو فضیلت ومنقبت چاہیں بیان کریں تو پھر ان کا انجام اہل کتاب سے کچھ زیادہ بہتر نہ ہوگا۔ جو اپنے انبیاء کی عقیدت میں افراط وتفریط کے شکار ہو کر گمراہ ہو گئے۔ یہودیوں نے اپنے نبی کے مرتبے کو اتنا کو اتنا گھٹایا کہ وہ عام انسانوں کے درجے سے بھی نیچے اُتر گیا اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو الوہیت کے مقام پر پہنچا دیا۔ اور اُمت مسلمہ میں بھی علماء اور عوام کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہر ملک اور ہر دیار میں موجود چلی آ رہی ہے جو ایک طرف تو توحید کا دم بھرتی ہے مگر دوسری طرف نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے متعلق بعض ایسے اُمور کا عقیدہ رکھتی ہے جو سراسر مشرکانہ ہیں۔

باب ششم

فضائل ومناقب

حضرت خضر علیہ السلام:

حضرت خضر علیہ السلام کی شخصیت، ان کے نام، ان کے نسب، ان کی زندگی اور موت، ان کی نبوت و ولایت اور لوگوں سے ان کی ملاقاتوں کے بارے میں جو روایات ملتی ہیں، وہ سب من گھڑت، موضوع اور باطل ہیں۔ اسی طرح جن روایات میں نبی ﷺ اور آپ کے بعد صحابہ کرام سے ان کی ملاقاتوں کا ذکر ملتا ہے وہ سب جھوٹ اور ان لوگوں کے ذہنوں کی پیداوار ہیں جو اولیاء اللہ کے لیے غیر معمولی اور خارق العادۃ صفات اور صلاحیتوں کے قائل ہیں۔ قرآن پاک کی سورۃ الکہف میں ان کا ذکر مجملا آیا ہے اور صحیحین میں مروی احادیث میں ان کے بارے میں جو تفصیلات ملتی ہیں، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا لقب خضر تھا اور ان کو بعض غیبی یا تکوینی علم حاصل تھا۔ ان صحیح احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شرعی امور کا علم حاصل نہیں تھا، کیونکہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے بصراحت فرمایا کہ مجھے جو علم اللہ تعالیٰ نے سکھایا ہے وہ تم کو معلوم نہیں اور تم کو اس نے جو علم دیا ہے اس سے میں واقف نہیں، بلکہ انہوں نے یہاں تک فرما دیا ہے کہ جو علم تمہیں حاصل ہے اس کا جاننا میرے لیے مناسب نہیں اور جو علم مجھے حاصل ہے اس کا جاننا تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔

۱۴۸ ...... ((أَنْبَأَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الْمَالِكِ بْنِ خَيْرُوْنَ ، قَالَ: أَنْبَأَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ مَسْعَدَةَ ، قَالَ: أَنْبَأَنَا حَمْزَةُ بْنُ يُوسُفَ ، قَالَ: أَنْبَأَنَا أَبُوا أَحْمَدَ بْنُ عَدِيٍّ ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ بْنِ عَاصِمٍ ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ الْقُرَشِيُّ ، قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ نَافِعٍ ، عَنْ كَثِيرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ ، عَنْ أَبِيهِ ، عَنْ جَدِّهِ ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ فِي الْمَسْجِدِ فَسَمِعَ كَلَامًا مِنْ وَّرَائِهِ فَإِذَا هُوَ بِقَائِلٍ يَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلَى مَا يُنْجِيْنِي مِمَّا خَوَّفْتَنِي ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حِيْنَ سَمِعَ ذٰلِكَ: أَلَا تَضُمُّ إِلَيْهَا أُخْتَهَا؟ فَقَالَ الرَّجُلُ: اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي شَوْقَ الصَّالِحِيْنَ إِلَى مَا شَوَّقْتَهُمْ إِلَيْهِ ، فَقَالَ رَسُوْلُ

اللّٰہِ ﷺ لِأَنَسِ بْنِ مَالِكٍ: إِذْهَبْ يَا أَنَسُ إِلَيْهِ فَقُلْ لَهُ: يَقُولُ لَكَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ تَسْتَغْفِرْلِي ، فَجَاءَهُ أَنَسٌ ، فَبَلَّغَهُ ، فَقَالَ الرَّجُلُ: يَا أَنَسُ! أَنْتَ رَسُولُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ: قُلْ لَهُ نَعَمْ۔ فَقَالَ لَهُ: إِذْهَبْ فَقُلْ لَهُ: إِنَّ اللّٰهَ فَضَّلَكَ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ مِثْلَ مَا فَضَّلَ بِهِ رَمَضَانَ عَلَى الشُّهُورِ وَفَضَّلَ أُمَّتَكَ عَلَى الْأُمَمِ مِثْلَ مَا فَضَّلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ عَلَى سَائِرِ الْأَيَّامِ ، فَذَهَبُوا يَنْظُرُونَ فَإِذَا هُوَ الْخِضَرُ))

''ہم کو محمد بن عبدالملک بن خیرون نے خبر دی، کہا: ہم کو اسماعیل بن مسعدۃ نے خبر دی، کہ: ہم کو حمزہ بن یوسف نے خبر دی، کہا: ہم کو ابواحمد بن عدی نے خبر دی، کہا: ہم سے محمد بن یوسف بن عاصم نے بیان کیا، کہا: ہم سے احمد بن اسماعیل القرشی نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبداللہ بن نافع نے کثیر بن عبداللہ سے اس نے اس کے باپ سے اور اس نے اس کے دادا..... عمرو بن عوف المزنی...... سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ آپ نے اپنے پیچھے سے ایک بات سنی جس کو کہنے والا کہہ رہا تھا: ''اے اللہ! مجھے ایسے کام کی توفیق عطا فرما جو اس چیز سے مجھے نجات دے جس سے تو نے مجھے ڈرایا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے جب یہ سنا تو فرمایا: کیا اس میں اس کا ہم مثل کلام شامل نہیں کرو گے؟ تو اس آدمی نے کہا: ''اے اللہ! تو نے صالحین کو جس چیز کا شوق بخشا ہے، ان کا وہ شوق مجھے عطا کر۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے انس بن مالک سے فرمایا: ''اے انس! اس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو: رسول اللہ ﷺ تم سے فرمارہے ہیں میرے لیے استغفار کرو۔'' پس انس اس کے پاس گئے اور اس کو آپ کا پیغام پہنچایا۔ پیغام سن کر اس آدمی نے کہا: اے انس! کیا تم، جیسے کچھ ہو، میرے پاس رسول اللہ ﷺ کا قاصد بن کر آئے ہو؟ یہ سن کر انس رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں واپس گئے اور آپ سے اس کی توثیق چاہی، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس سے کہو: ''ہاں! میں رسول اللہ ﷺ کا قاصد ہوں۔'' تو اس آدمی نے انس سے کہا: رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جا کر ان سے یہ عرض کرو بے شک اللہ نے آپ کو تمام انبیاء پر اسی طرح کی فضیلت بخشی ہے جس طرح کی فضیلت رمضان کو تمام مہینوں پر بخشی ہے اور آپ کی امت کو دوسری اُمتوں پر وہی فضیلت بخشی ہے جو فضیلت جمعہ کے دن کو دوسرے تمام دنوں پر

بخشی ہے۔ اس کے بعد صحابہ وہاں گئے، تو دیکھا کہ وہ خضر ہیں۔"

امام ابن الجوزی "الموضوعات: ۱/۳۰۹" میں یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: یہ حدیث دوسرے طرق اور دوسرے الفاظ میں بھی مروی ہے اور پھر لکھا ہے:

"یہ حدیث باطل ہے، اس کے راوی عبداللہ بن نافع کے بارے میں یحییٰ بن معین کا قول ہے: وہ کچھ بھی نہیں ہے یعنی نا قابل اعتبار ہے۔ علی بن المدینی فرماتے ہیں: وہ منکر حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔ النسائی نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔ اور اس باطل حدیث کی سند میں ایک دوسرا راوی کثیر بن عبداللہ ہے، جس کا پورا نام: کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف المُزنی ہے۔ اس کے بارے میں امام احمد بن حنبل کا قول ہے: اس سے روایت حدیث صحیح نہیں ہے۔ ایک اور موقع پر فرمایا: کثیر بن عبداللہ دو کوڑی کے برابر بھی نہیں۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں: اس کی روایت کردہ حدیث کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ لکھی جانے کے قابل نہیں ہے۔ النسائی اور الدارقطنی نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں: وہ جھوٹ کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے۔ اور امام ابو حاتم بن حبان نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ کثیر بن عبداللہ نے " عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ " کی سند سے موضوع حدیثوں کا ایک نسخہ روایت کیا ہے، جس کا حدیث کی کتابوں کے ضمن میں ذکر کرنا جائز نہیں ہے اور نہ تو اس سے حدیثوں کی روایت ہی جائز ہے، الا یہ کہ بطور حیرت واستعجاب کے اس سے حدیثیں روایت کی جائیں۔"

تعجب ہے کہ حافظ السیوطی کو اس موضوع اور باطل حدیث کے راویوں کے بارے میں فن حدیث و رجال کے ان ائمہ کے اقوال نظر نہیں آئے۔ البتہ امام البیہقی کا وہ قول نظر آ گیا جو انہوں نے " دلائل النبوة " میں ذکر کیا ہے اور جس میں انہوں نے اس روایت کو ضعیف الاسناد کہنے پر اکتفا کیا ہے۔

[اللآلی: ۱/۱۵۳]

اسی طرح علی بن محمد بن عراق نے بھی " تنزیعه الشریعة: ۱/۲۳۳ " میں اس کو السیوطی کی تقلید میں صرف "ضعیف" لکھا ہے۔

اس باطل اور موضوع روایت کی سند کا تو حال معلوم ہوگیا۔ رہا اس کا متن تو اس میں جو نکارت ہے، وہ کسی ایسے شخص سے مخفی نہیں رہ سکتی جس کو نبی ﷺ کے مقام ومرتبے اور قدر ومنزلت کا ادنیٰ سا بھی احساس ہوگا۔ آخر وہ کون مسلمان ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق بخشی ہو کہ اس کو رسول اللہ ﷺ کا مقدس زمانہ

ملے اور وہ آپ سے چند قدم کے فاصلے پر ہو، پھر آپ کی خدمت میں حاضری دینے اور آپ کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت حاصل کرنے کی بجائے بالواسطہ آپ سے ہم کلام ہو۔ اس کے علاوہ اس باطل روایت کی زبان میں جو تکلف اور تصنع ہے وہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ کسی ''وضاع'' کی گھڑی ہوئی ہے۔ یہ اسلوب بیان دراصل صوفیا کا ہے۔ وہی اس طرح کے مبہم اور پر تکلف طرز بیان میں معروف ہیں۔

۱۴۹ ...... ((أَنْبَأَنَا هِبَةُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ الْحُصَيْنِ ، قَالَ: أَنْبَأَنَا أَبُو طَالِبِ بْنُ غَيْلَانَ ، قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ الْمُزَكِّيُّ ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ إِسْحَاقَ بْنِ خُزَيْمَةَ ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ أَحْمَدَ بْنِ زَيْدَاءَ ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ عَاصِمٍ ، عَنِ الْحَسَنِ بْنِ رَزِيْنٍ ، عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ ، عَنْ عَطَاءٍ ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ، قَالَ: وَلَا أَعْلَمُهُ إِلَّا مَرْفُوعًا إِلَى النَّبِيِّ ﷺ ، قَالَ: يَلْتَقِي الْخِضْرُ وَإِلْيَاسُ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ كُلَّ عَامٍ فَيَحْلِقُ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا رَأْسَ صَاحِبِهِ ، وَيَتَفَرَّقَانِ عَنْ هٰذِهِ الْكَلِمَاتِ: بِسْمِ اللّٰهِ ، مَاشَاءَ اللّٰهُ ، لَا يَسُوقُ الْخَيْرَ إِلَّا اللّٰهُ ، مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا يَصْرِفُ السُّوءَ إِلَّا اللّٰهُ ، مَا شَاءَ اللّٰهُ مَا يَكُونُ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ، مَاشَاءَ اللّٰهُ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ۔ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: مَنْ قَالَهَا حِيْنَ يُصْبِحُ وَحِيْنَ يُمْسِيْ كُلَّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ عُوْفِيَ مِنَ الْغَرَقِ وَالْحَرَقِ وَالشَّرَقِ ، وَأَحْسِبُهُ قَالَ: وَمِنَ الشَّيْطَانِ وَمِنَ الْحَيَّةِ وَالْعَقْرَبِ ، حَتّٰى يُصْبِحَ وَيُمْسِيَ))

''ہم کو هبۃ اللہ بن محمد بن الحصین نے خبر دی، کہا: ہم کو ابو طالب بن غیلان نے خبر دی، کہا! ہم سے ابراہیم المزکی نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن اسحاق بن خزیمہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن احمد بن زیداء نے بیان کیا، کہا: ہم سے عمرو بن عاصم نے الحسن بن رزین سے، انہوں نے ابن جریج سے اور انہوں نے ابن عباس سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا اور کہا کہ میں اس کو صرف نبی ﷺ سے مرفوع حدیث کے طور پر ہی جانتا ہوں، فرمایا: خضر اور الیاس علیہما السلام ہر سال ملاقات کرتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے سر کے بال مونڈتا ہے اور دونوں ان کلمات پر ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں: بسم اللہ، ماشاء اللہ، خیر و بھلائی صرف اللہ لاتا ہے۔ ماشاء اللہ، برائی کو صرف اللہ ہی دور کرتا ہے۔ ماشاء اللہ، جو نعمت بھی ہے

اللہ کی طرف سے ہے، ماشاء اللہ طاقت وقدرت صرف اللہ ہی کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں: جو شخص یہ کلمات ہر دن صبح وشام تین بار کہے گا، وہ ڈوبنے، جلنے اور حلق میں کسی چیز کے اٹک جانے سے محفوظ رہے گا اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے یہ بھی کہا: شیطان سے، سانپ سے اور بچھو سے صبح وشام عافیت میں رہے گا۔‘‘

امام ابن الجوزی فرماتے ہیں:’’ الموضوعات: ۱/ ۳۱۴ ‘‘ اس حدیث کی سند میں الحسن بن رزین ہے، جس کے بارے میں الدارقطنی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو ابن جریج سے اس کے علاوہ کسی اور نے روایت نہیں کیا ہے۔ حافظ العقیلی کہتے ہیں: مسند اور موقوف کسی بھی روایت میں الحسن بن رزین کا کوئی متابع نہیں ہے اور وہ نقلِ حدیث میں مجہول ہے اور اس کی حدیث ’’محفوظ‘‘ نہیں ہے (یعنی شاذ ہے) اور حافظ احمد بن جعفر بن المنادی کا قول ہے: یہ حدیث الحسن بن رزین کی وجہ سے بیحد ضعیف ہے اور الخضر اور الیاس دونوں گزر چکے ہیں۔ امام الذہبی نے ’’میزان الاعتدال: ۱/ ۴۹۰، ترجمہ: ۸۴۵ ‘‘ میں اس کو منکر قرار دیا ہے۔ اور حافظ سخاوی نے ’’ المقاصد الحسنة، ح: ۲۱ ‘‘ میں لکھا ہے کہ خضر اور الیاس کی ہر سال ملاقات کے بارے میں کوئی مرفوع اور غیر مرفوع حدیث ثابت نہیں ہے۔

۱۵۰...... ((أَنبَأَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبدِالمَلِكِ ، قَالَ: أَنبَأَنَا أحْمَدُ بْنُ عَلِيّ بْنِ ثَابِتٍ ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ عَبْدُ العزيز بن علي الأَزْجِيُّ ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيّ بْنِ عَطِيَّةَ الحَارِثِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الحُسَيْنِ الجَهْضَمِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا ضَمْرَةُ بْنُ حَبِيْبٍ المَقْدِسِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبِي، قَالَ: حَدَّثَنَا العَلَاءُ بْنُ زِيَادٍ القُشَيْرِيُّ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الحَسَنِ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ ، عَنْ عَلِيّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : يَجْتَمِعُ كُلَّ يَوْمِ عَرَفَةَ بِعَرَفَةَ جِبْرِيْلُ وَمِيْكَائِيلُ وَإِسْرَافِيْلُ وَالخِضْرُ ، فَيَقُوْلُ جِبْرِيْلُ: مَاشَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ، فَيَرُدُّ عَلَيْهِ مِيْكَائِيْلُ: مَاشَاءَ اللّٰهُ، كُلُّ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ فَيَرُدُّ عَلَيْهِ إِسْرَافِيْلُ: مَاشَاءَ اللّٰهُ ، الخَيْرُ كُلُّهُ بِيَدِاللّٰهِ، فَيَرُدُّ عَلَيْهِ الخِضْرُ مَاشَاءَ اللّٰهُ ، لَايَصْرِفُ السُّوْءَ إِلَّا اللّٰهُ ، ثُمَّ يَتَفَرَّقُوْنَ عَنْ هٰذِهِ الكَلِمَاتِ فَلَا يَجْتَمِعُوْنَ إِلَى قَابِلٍ فِيْ ذٰلِكَ اليَوْمِ ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَمَا مِنْ أَحَدٍ يَقُوْلُ هٰؤُلَاءِ الأَرْبَعَ

مَقَالَاتٍ حِيْنَ يَسْتَيْقِظُ مِنْ نَوْمِهِ إِلَّا وَكَّلَ اللّٰهُ بِهِ أَرْبَعَةً مِنَ الْمَلَائِكَةِ يُحَفِّظُوْنَهُ مَقَالَةَ جِبْرِيْلَ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمَقَالَةَ مِيْكَائِيْلَ عَنْ يَمِيْنِهِ وَمَقَالَةَ إِسْرَافِيْلَ عَنْ يَسَارِهِ ، وَمَقَالَةَ الْخِضْرِ مِنْ خَلْفِهِ إِلَى أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ، مِنْ كُلِّ آفَةٍ ، وَعَاهَةٍ وَعُدُوٍّ ، وَظَالِمٍ ، وَحَاسِدٍ۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : وَمَا مِنْ اَحَدٍ يَقُوْلُهَا فِيْ يَوْمِ عَرَفَةَ مِائَةَ مَرَّةً مِنْ قَبْلِ غُرُوْبِ الشَّمْسِ اِلَّا نَادَاهُ اللّٰهُ تَعَالٰى مِنْ فَوْقِ عَرْشِهِ أي عَبْدِي! قَدْ أَرْضَيْتَنِيْ وَقَدْ رَضِيْتُ عَنْكَ ، فَسَلْنِي مَاشِئْتَ ، فَبِعِزَّتِيْ حَلَفْتُ لَأُعْطِيَنَّكَ))

''ہم کو محمد بن عبدالملک نے خبر دی، کہا: ہم کو احمد بن علی بن ثابت نے خبر دی، کہا: مجھ کو عبدالعزیز بن علی الازجی نے خبر دی، کہا: ہم سے محمد بن علی بن عطیہ الحارثی نے بیان کیا، کہا: ہم سے علی بن الحسین الجهضمی نے بیان کیا، کہا: ہم سے ضمرہ بن حبیب المقدسی نے بیان کیا، کہا: ہم سے میرے باپ نے بیان کیا، کہا: ہم سے العلاء بن زیاد القشیری نے عبداللہ بن الحسن سے انہوں نے اُن کے باپ سے، انہوں نے ان کے دادا سے اور انہوں نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: عرفات میں ہر یوم عرفہ کے موقع پر جبریل میکائیل، اسرافیل اور الخضر اکٹھے ہوتے ہیں۔ پس جبریل کہتے ہیں جو اللہ چاہے طاقت اور قدرت صرف اللہ سے ملتی ہے۔ اس کا جواب میکائیل یہ کہہ کر دیتے ہیں: ماشاء اللہ ہر نعمت اللہ کی طرف سے ہے۔ اسرافیل اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں: ماشاء اللہ! ہر خیر اور بھلائی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے جواب میں الخضر کہتے ہیں: ما شاء اللہ، برائی کو دور کرنے والا صرف اللہ ہے۔ پھر انہی کلمات پر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور آئندہ سال تک اس دن میں اکٹھے نہیں ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کوئی بھی نیند سے بیدار ہونے کے بعد یہ چاروں کلمات کہے تو اللہ اس کے ذمہ چار فرشتوں کو لگا دے گا جو اس کو جبریل کا کلمہ سامنے سے، میکائیل کا کلمہ دائیں سے، اسرافیل کا کلمہ بائیں سے اور الخضر کا کلمہ اس کے پیچھے سے اس کو یاد کرائیں گے۔ اور سورج غروب ہونے تک اس کو ہر مصیبت، ہر جسمانی معذوری، ہر دشمن، ہر ظالم اور ہر حاسد سے محفوظ رکھیں گے۔ اور جو کوئی یہ کلمات عرفہ کے دن سورج غروب ہونے سے پہلے سو ۱۰۰ بار کہے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کو عرش پر

سے پکار کر کہے گا: اے میرے بندے! تو نے مجھے خوش کر دیا اور میں تجھ سے راضی اور خوش ہوگیا، پس جو چاہتا ہے مجھ سے مانگ، میں اپنی عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں میں تجھے ضرور عطا کروں گا۔‘‘

یہ حدیث باطل ہے۔ امام ابن الجوزی اس کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

’’جبریل کے ساتھ خضر کے اجتماع کی حدیث کی سند میں کئی مجہول راوی شامل ہیں جو غیر معروف ہیں۔‘‘ [الموضوعات: ۱/ ۳۱۴]

۱۵۱ ...... ((رُوِیَ عَنْ کُرْزِ بْنِ وَبَرَۃَ رَحِمَهُ اللّٰهُ، وَکَانَ مِنَ الْأَبْدَالِ، قَالَ: اَتَانِی اَخٌ لِیْ مِنَ اَهْلِ الشَّامِ فَاَهْدَی لِیْ هَدِیَّةً وَقَالَ: یَا کُرْزُ! إِقْبَلْ مِنِّیْ هٰذِهِ الْهَدِیَّةَ ، فَإِنَّهَا نِعْمَتِ الْهَدِیَّةُ۔ فَقُلْتُ: یَا أَخِی! وَمَنْ اَهْدَی لَكَ هٰذِهِ الْهَدِیَّةَ؟ قَالَ: أَعْطَانِیْهَا إِبْرَاهِیْمُ التَّیْمِیُّ۔ قُلْتُ: اَفَلَمْ تَسْأَلْ إِبْرَاهِیْمَ مَنْ أَعْطَاهُ إِیَّاهَا؟ قَالَ: کُنْتُ جَالِسًا فِیْ فَنَاءِ الْکَعْبَةِ وَأَنَا فِیْ التَّهْلِیْلِ وَالتَّسْبِیْحِ وَالتَّحْمِیْدِ وَالتَّمْجِیْدِ ، فَجَاءَ نِیْ رَجُلٌ ، فَسَلَّمَ عَلَیَّ وَجَلَسَ عَنْ یَمِیْنِی ، فَلَمْ أَرَفِیْ زَمَانِی أَحْسَنَ مِنْهُ وَجْهًا وَلَاأَحْسَنَ مِنْهُ ثِیَابًا وَلَا اَشَدَّ بَیَاضًا وَلَا اَطْیَبَ رِیْحًا مِنْهُ ، فَقُلْتُ: یَا عَبْدَ اللّٰهِ! مَنْ أَنْتَ وَمِنْ أَیْنَ جِئْتَ؟ فَقَالَ: أَنَا الْخِضْرُ ، فَقُلْتُ: فِیْ أَیِّ شَیْءٍ جِئْتَنِی؟ فَقَالَ: جِئْتُكَ لِلسَّلَامِ عَلَیْكَ وَحُبًّالَكَ فِی اللّٰهِ وَعِنْدِیْ هَدِیَّةٌ أُرِیْدُ أَنْ أُهْدِیَهَالَكَ۔ فَقُلْتُ: مَاهِیَ؟ قَالَ: أَن تَقُولَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمسِ وَقَبْلَ إِنْبِسَاطِهَا عَلَی الْأَرْضِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا: سُورَۃَ الْحَمْدِ ، وَقُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ، وَقُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ، وَقُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ ، وَقُلْ یٰٓأَیُّهَا الْکَافِرُوْنَ ، وَآیَةَ الْکُرسِیِّ ، وَکُلَّ وَاحِدَۃٍ سَبْعَ مَرَّاتٍ ، وَتَقُولُ: سُبْحَانَ اللّٰهِ ، وَالْحَمْدُلِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَکْبَرُ سَبْعًا ، وَتُصَلِّی عَلَی النَّبِیِّ ﷺ سَبْعًا وَتَسْتَغْفِرُ لِنَفْسِكَ وَلِوَالِدَیْكَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ سَبْعًا۔ وَتَقُولُ: اَللّٰهُمَّ! افْعَلْ بِیْ وَبِهِمْ عَاجِلًا وَاٰجِلًا فِی الدِّیْنِ وَالدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ مَا أَنْتَ لَهُ اَهْلٌ وَلَا تَفْعَلْ بِنَایَا مَوْلَانَا مَا نَحْنُ لَهُ أَهْلٌ إِنَّكَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ جَوَّادٌ کَرِیْمٌ رَؤُوفٌ رَحِیْمٌ سَبْعَ مَرَّاتٍ ، وَانْظُرْ أَنْ لَا تَدَعَ ذٰلِكَ غُدْوَۃً وَعَشِیَّةً۔ فَقُلْتُ:

أُحِبُّ أَنْ تُخْبِرَنِيْ مَنْ أَعْطَاكَ هٰذِهِ الْعَطِيَّةَ الْعَظِيْمَةَ؟ فَقَالَ: اَعْطَانِيهَا مُحَمَّدٌ ﷺ. فَقُلْتُ: أَخْبِرْنِيْ بِثَوَابِ ذٰلِكَ ، فَقَالَ: إِذَا لَقِيتَ مُحَمَّدًا ﷺ فَاسْأَلْهُ عَنْ ثَوَابِهِ فَإِنَّهُ يُخْبِرُ بِذٰلِكَ)) [احیاء العلوم: ۱/ ۴۷۱، ۴۷۲]

’’کرز بن وبرہ رحمہ اللہ سے روایت ہے جو ابدال میں شمار ہوتے تھے، کہا: میرے پاس اہل شام میں سے میرے ایک بھائی آئے اور مجھے ایک تحفہ دیا اور کہا: اے کرز! مجھ سے یہ تحفہ قبول کرو، کیونکہ یہ بڑا ہی اچھا تحفہ ہے۔ میں نے عرض کیا: میرے بھائی! یہ تحفہ آپ کو کس نے دیا؟ فرمایا: یہ تحفہ مجھے ابراہیم التیمی نے دیا ہے۔ میں نے کہا: کیا آپ نے ابراہیم سے یہ دریافت کیا کہ یہ اُن کو کس نے دیا؟ فرمایا: میں صحنِ کعبہ میں بیٹھا تحلیل وتسبیح اور حمد وثنا میں مشغول تھا کہ میرے پاس ایک صاحب آئے، مجھے سلام کیا اور میری دائیں جانب بیٹھ گئے، میں نے اپنے زمانے میں اُن سے زیادہ خوبصورت، اُن سے زیادہ خوش پوشاک، ان سے زیادہ گورا، اوران سے زیادہ خوشبودار کسی کو نہیں دیکھا ہے، میں نے عرض کیا: اے اللہ کے بندے! آپ کون ہیں اور کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ فرمایا: میں الخضر ہوں۔ میں نے عرض کیا: کس غرض سے میرے پاس تشریف لائے ہیں؟ فرمایا: تمھیں سلام کرنے اور اللہ کیے لیے تم سے محبت کرنے کے جذبے سے آیا ہوں۔ اور میرے پاس ایک تحفہ ہے، جو میں تمھیں دینا چاہتا ہوں۔ میں نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ کہا: وہ تحفہ یہ ہے کہ تم سورج طلوع ہونے، زمین میں اس کی روشنی پھیل جانے اور اس کے ڈوب جانے سے قبل، سورۃ الفاتحہ، سورۃ الناس، سورۃ الفلق، سورۃ الکافرون اور آیۃ الکرسی میں سے ہر ایک کا سات بار ورد کرو۔ اور سات بار سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر کہو۔ اور نبی ﷺ پر سات مرتبہ دُرود بھیجو۔ اور اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے، مومنوں کے لیے اور مومنات کے لیے سات مرتبہ استغفار کرو اور کہو: اے اللہ! تو میرے ساتھ اور ان کے ساتھ دین، دنیا اور آخرت میں جلد یا بدیر وہ معاملہ فرما جس کا تو اہل ہے اور اے ہمارے مولا! ہمارے ساتھ وہ معاملہ نہ کر جس کے ہم اہل ہیں۔ بیشک تو بڑا بخشش کرنے والا، درگزر کرنے والا، داتا، بزرگ، مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ یہ بھی سات بار پڑھو اور دیکھو اس ورد کو صبح وشام ترک مت کرنا۔ میں نے کہا: میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے یہ بتادیں کہ یہ عظیم عطیہ آپ کو کس نے عطا کیا ہے؟ کہا: یہ مجھے محمد ﷺ نے مرحمت فرمایا ہے۔

میں نے کہا: مجھے اس کے ثواب سے باخبر کر دیجئے۔ کہا: جب تمہیں محمد ﷺ سے شرف ملاقات حاصل ہوگا، اس وقت آپ سے اس کے ثواب کے بارے میں دریافت کر لینا۔ آپ ﷺ تم کو اس کے ثواب سے آگاہ فرما دیں گے۔''

حافظ ابوالفضل زین الدین العراقی احیاء العلوم کے حاشیہ پر مطبوع اپنی مشہور کتاب " **المغنی عن حمل الاسفار فی الاسفار فی تخریج مافی الإحیاء من الأخبار** " میں " **حاشیہ نمبر: ۱** " میں تحریر فرماتے ہیں:

" **عن رجل من اھل الشام عن ابراھیم التیمی** " کی سند سے کرز بن وبرہ کی روایت کردہ حدیث کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے۔ اور نبی ﷺ سے خضر کی ملاقات اور عدم ملاقات اور ان کی زندگی اور موت کے بارے میں کوئی بھی حدیث صحیح نہیں ہے۔''

یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ محدثین جب کسی مسئلے کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اس کے بارے میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس مسئلے میں کوئی بھی ایسی حدیث نہیں ہے، جس پر اعتماد کرنا صحیح ہو۔

اس باطل اور بے اصل حدیث کو نقل کرنے کے بعد امام غزالی نے حضرت خضر علیہ السلام سے منسوب دعا کے فوری ثواب کا جو واقعہ لکھا ہے، اس کا ذکر فائدے سے خالی نہیں، کیونکہ اس واقعہ سے اہل تصوف کی ذہنیت کو بڑی اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ابراہیم التیمی نے ذکر کیا ہے: ایک دن انہوں نے خواب میں دیکھا کہ گویا فرشتے ان کے پاس آئے اور ان کو اٹھا کر لے گئے اور ان کو جنت میں داخل کر دیا جس میں انہوں نے نہایت عظیم الشان اشیا کا مشاہدہ کیا، کہتے ہیں: میں نے فرشتوں سے دریافت کیا: یہ سب کس لیے ہے؟ انہوں نے جواب دیا: اس کے لیے جو تمہاری طرح عمل کرے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے جنت کے پھل کھائے اور فرشتوں نے ان کو جنت کی شراب بھی پلائی۔ آگے کہتے ہیں: پس نبی ﷺ میرے پاس تشریف لائے، آپ کے ساتھ ستر نبی تھے اور فرشتوں کی ستر صفیں جن میں سے ہر صف مشرق سے مغرب تک لمبی تھی، نبی ﷺ نے مجھے سلام کیا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! خضر نے مجھے خبر دی ہے کہ انہوں نے یہ حدیث آپ سے سنی ہے۔ فرمایا: خضر نے سچ کہا اور وہ جو کچھ بھی بیان کرتے ہیں وہ حق ہے وہ اہل زمین کے سب

سے بڑا علم اور ''ابدال'' کے سردار ہیں۔ وہ زمین میں اللہ کے سپاہیوں میں سے ایک سپاہی ہیں۔
میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جس نے یہی عمل انجام دیا، لیکن وہ چیزیں یا ان کی ہم مثل چیزیں نہیں دیکھیں جو میں نے خواب میں دیکھی ہیں تو کیا اس کو ان میں سے کچھ ملے گا جو مجھے عطا کیا گیا؟ فرمایا: ''اس ہستی کی قسم! جس نے مجھے نبی برحق بنا کر بھیجا ہے، اس پر عمل کرنے والے کو وہ سب کچھ عطا کیا جائے گا، اگرچہ اس نے نہ تو مجھے دیکھا ہو اور نہ جنت کو اور اس کے تمام کبائر گناہ بخش دیئے جائیں گے، جن کا اس نے ارتکاب کیا ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس سے اپنے غضب اور ناراضگی کو اٹھالے گا اور بائیں طرف کے فرشتے کو یہ حکم دے گا کہ ایک سال تک اس کی برائیوں اور خطاؤں کو نہ لکھے اور اس ذات کی قسم! جس نے مجھے نبی برحق بنا کر مبعوث کیا ہے، اس حدیث پر وہی عمل کرے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے نیک بخت پیدا کیا ہے اور اس پر عمل کرنا وہی ترک کرے گا، جس کو اللہ تعالیٰ نے بد بخت پیدا کیا ہے۔''

امام غزالی یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ابراہیم التیمی کا یہ حال تھا کہ وہ چار ماہ تک بلا کچھ کھائے پیئے رہ جاتے تھے اور شاید ان کا یہ حال اس خواب کے بعد ہو گیا تھا۔'' [۴۷۲/۱]

مبالغہ کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ کتاب و سنت میں بے شمار دعائیں منقول ہیں، مگر ان میں سے کسی بھی دعا کا وہ مبالغہ آمیز ثواب نہیں بتایا گیا ہے، جو اس بے اصل حدیث میں مذکور دعا کا بتایا گیا ہے، صرف یہی نہیں، بلکہ اس کو سعادت وشقاوت کا یقینی معیار بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

چار ماہ تک کسی شخص کا کچھ کھائے پیئے بغیر زندہ رہنا محال ہے۔ ایک تو جھوٹی روایت اور پھر اس روایت پر عمل کے یہ انتہائی مبالغہ آمیز اور خیالی ثمرات بیان کرنا کوئی اہل تصوف سے سیکھے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے قصے میں اس کا ذکر البتہ آیا ہے کہ وہ مسجد حرام میں ایک ماہ تک کچھ کھائے بغیر صرف زمزم کے پانی پر گذارا کرتے رہے۔ ❶

صحیح بخاری میں بھی یہ قصہ مذکور ہے، لیکن اس میں زمزم کے پانی پر گذارا کرنے کا تو ذکر ہے، مگر تیس ۳۰ دن کا تعین نہیں ہے۔

۱۵۲ ...... ((لَمَّا قُبِضَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَحْدَقَ بِهِ أَصْحَابُهُ ، فَبَكَوْا حَوْلَهُ

---

❶ مسلم، ح: ۲۴۷۳

وَاجْتَمَعُوا ، فَدَخَلَ رَجُلٌ أَصْهَبُ اللِّحْيَةِ ، جَسِيمٌ ، صَبِيحٌ ، فَتَخَطَّأَ رِقَابَهُم ، فَبَكَى ، ثُمَّ الْتَفَتَ إِلَى أَصْحَابِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: إِنَّ فِي اللّٰهِ عَزَاءً مِنْ كُلِّ مُصِيبَةٍ وَعِوَضًا مِنْ كُلِّ فَائِتٍ ، وَخَلَفًا مِنْ كُلِّ هَالِكٍ ، فَإِلَى اللّٰهِ فَأَنِيبُوا ، وَإِلَيْهِ فَارْغَبُوا ، وَنَظَرَةٌ إِلَيْكُمْ فِي الْبَلَاءِ ، فَانْظُرُوا فَإِنَّمَا الْمُصَابُ مَنْ لَمْ يُجْبَرْ- وَانْصَرَفَ ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ: أَتَعْرِفُونَ الرَّجُلَ؟ فَقَالَ أَبُوبَكْرٍ وَعَلِيٌّ: نَعَمْ- هٰذَا أَخُو رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ : الْخِضْرُ عَلَیْہِ السَّلَامُ))

''جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی تو آپ کے اصحاب نے آپ کو گھیر لیا اور آپ کے گردو پیش جمع ہوکر رونے لگے، پس ایک آدمی ان کے پاس آیا، جس کی داڑھی زرد، جسم بھاری اور چہرہ روشن اور خوبصورت تھا۔ وہ ان کی گردنیں پھاندتا ہوا ان کے درمیان آیا اور رونے لگا، پھر رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کی جانب متوجہ ہوا اور کہا: اللہ کی ذات میں ہر مصیبت سے ڈھارس، ہر ضائع ہوجانے والی چیز کا بدلہ اور ہر ہلاک ہونے والے کا جانشین موجود ہے۔ پس اللہ کی طرف رجوع کرو۔ اور اسی کی طرف توجہ کرو۔ اور مصیبت و آزمائش میں تمہاری طرف چشم عنایت اسی کی ذات میں ہے۔ لہٰذا اسی کی طرف دیکھو۔ کیونکہ مصیبت زدہ وہ ہے جس کی خاطر جمع نہ ہوسکے۔ (یہ کہہ کر) وہ چلا گیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: کیا تم لوگ اس آدمی کو جانتے ہو؟ تو ابوبکر اور علی نے جواب دیا: ہاں! یہ رسول اللہ ﷺ کے بھائی الخضر علیہ السلام تھے۔''

حافظ ابوالفداء عماد الدین اسماعیل بن کثیر نے '' البداية والنهاية: ۱/۳۳۱ '' میں امام احمد بن الحسین البیہقی کے حوالہ سے اس منکر حدیث کی جو سند نقل کی ہے وہ درج ذیل ہے:

((أَخْبَرَنَا أَبُو عَبْدِ اللّٰهِ الْحَافِظُ ، أَخْبَرَنَا أَبُوبَكْرِ بْنُ بَالَوَيْهِ ، حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بِشْرِ بْنِ مَطَرٍ ، حَدَّثَنَا كَامِلُ بْنُ طَلْحَةَ ، حَدَّثَنَا عَبَّادُ بْنُ عَبْدِ الصَّمَدِ ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ))

''ہم کو ابو عبداللہ الحافظ (الحاکم) نے خبر دی، کہا: ہم کو ابوبکر بن بالویہ نے خبر دی کہا: ہم سے محمد بن بشر بن مطر نے بیان کیا، کہا: ہم سے کامل بن طلحہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے عباد بن عبدالصمد نے انس بن مالک سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: البیہقی نے کہا ہے کہ عباد بن عبدالصمد ضعیف ہے اور یہ روایت بیحد منکر ہے۔

''میں کہتا ہوں کہ عباد بن عبدالصمد معمر البصری کا بیٹا ہے۔ اس نے حضرت انس سے حدیثوں کا ایک نسخہ روایت کیا ہے جس کے بارے میں ابن حبان اور العقیلی کا قول ہے کہ اس کی بیشتر روایات موضوع ہیں۔ امام بخاری نے اس کو ''منکر الحدیث'' کہا ہے۔ امام ابوحاتم نے اس کو حد درجہ ضعیف الحدیث اور منکر الحدیث قرار دیا ہے۔'' [۳۳۲/۱]

امام البیہقی کی اپنی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((أَنَّ الخِضْرَ وَقَفَ بَيْنَ الصَّحَابَةِ ، فَبَكَى وَعَزَّاهُمْ وَغَابَ بَعْدَ ذٰلِكَ ، وَأَنَّ عَلِيًّا رضي الله عنه قَالَ: إِنَّهُ أَخُو الرَّسُولِ ﷺ: الخِضْرُ عليه السلام))

''خضر علیہ السلام صحابہ کے درمیان آ کر کھڑے ہوگئے اور روئے اور ان کی تعزیت کی اس کے بعد غائب ہوگئے۔ اور علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ رسول اللہ ﷺ کے بھائی خضر علیہ السلام ہیں۔''

۱۵۳ ...... ((لَمَّا مَرِضَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ، جَاءَهُ جِبْرِيلُ عليه السلام فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ! أَرْسَلَنِي اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ إِلَيْكَ تَكْرِيمًا لَكَ وَتَشْرِيفًا لَكَ ، وَخَاصَّةً لَكَ ، أَسْأَلُكَ عَمَّا هُوَ أَعْلَمُ بِهِ مِنْكَ ، يَقُولُ: كَيْفَ تَجِدُكَ؟ قَالَ: اَجِدُنِي...... يَاجِبْرِيلُ!...... مَغْمُومًا، وَأَجِدُنِي...... يَا جِبْرِيلُ!...... مَكْرُوبًا۔ ثُمَّ جَاءَهُ الْيَوْمَ الثَّانِيَ ، فَقَالَ ذٰلِكَ لَهُ ، فَرَدَّ عَلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ كَمَا رَدَّ عَلَيْهِ أَوَّلَ يَوْمٍ۔ ثُمَّ جَاءَهُ الْيَوْمَ الثَّالِثَ ، فَقَالَ لَهُ كَمَا قَالَ أَوَّلَ يَوْمٍ ، وَرَدَّ عَلَيْهِ كَمَا رَدَّ۔ وَجَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ يُقَالُ لَهُ: إِسْمَاعِيلُ ، عَلَى مِائَةِ أَلْفِ مَلَكٍ ، كُلُّ مَلَكٍ مِنْهُمْ عَلَى مِائَةِ أَلْفِ مَلَكٍ ؛ فَاسْتَأْذَنَ فَسَأَلَ عَنْهُ ، ثُمَّ قَالَ جِبْرِيلُ: هٰذَا مَلَكُ الْمَوْتِ ، يَسْتَأْذِنُ عَلَيْكَ ، مَااسْتَأْذَنَ عَلَى آدَمِيٍّ قَبْلَكَ وَلَا يَسْتَأْذِنُ عَلَى آدَمِيٍّ بَعْدَكَ۔ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: إِئْذَنْ لَهُ ، فَأَذِنَ لَهُ ، فَسَلَّمَ عَلَيْهِ ، ثُمَّ قَالَ: يَا مُحَمَّدُ! إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ أَرْسَلَنِي إِلَيْكَ فَإِنْ أَمَرْتَنِي أَنْ أَقْبِضَ رُوحَكَ قَبَضْتُهُ ، وَإِنْ أَمَرْتَنِي أَنْ أَتْرُكَهُ تَرَكْتُهُ۔ قَالَ: أَوَ تَفْعَلُ يَا مَلَكَ الْمَوْتِ! قَالَ:

نَعَمْ۔ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ ، وَاُمِرْتُ اَنْ اُطِيْعَكَ! قَالَ: فَنَظَرَ النَّبِيُّ ﷺ اِلَى جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ جِبْرِيْلُ: يَا مُحَمَّدُ! إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ إِشْتَاقَ إِلَى لِقَاءِ كَ۔ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ۔ وَجَاءَتِ التَّعْزِيَةُ ، سَمِعُوا صَوْتًا مِنْ نَاحِيَةِ الْبَيْتِ: سَلَامٌ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ إِنَّ فِيْ اللّٰهِ عَزَاءً مِنْ كُلِّ مُصِيْبَةٍ ، وَخَلَفًا مِنْ كُلِّ هَالِكٍ وَدَرَكًا مِنْ كُلِّ مَا فَاتَ فَبِاللّٰهِ فَثِقُوا ، وَاِيَّاهُ فَارْجُوا ، فَإِنَّمَا الْمُصَابُ مَنْ حُرِمَ الثَّوَابَ! فَقَالَ عَلِيٌّ عَلَيْهِ السَّلَامُ : أَتَدْرُوْنَ مَنْ هٰذَا؟ هٰذَا الْخِضْرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ))

''جب رسول اللہ ﷺ بیمار ہوئے تو آپ کی خدمت میں جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے محمد! اللہ عزوجل نے مجھے آپ کے پاس آپ کی اعزاز واکرام اور خصوصیت کے پیش نظر بھیجا ہے، تاکہ میں آپ سے وہ بات معلوم کروں جس کے بارے میں اللہ کو آپ سے زیادہ علم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے: آپ اپنے آپ کو کس طرح پارہے ہیں؟ فرمایا: جبریل میں اپنے آپ کو مغموم اور کرب زدہ پارہا ہوں۔ پھر جبریل آپ کی خدمت میں دوسرے دن بھی حاضر ہوئے اور وہی بات آپ سے کہی اور نبی ﷺ نے ان کو وہی جواب دیا جو پہلے دن دیا تھا۔ پھر تیسرے دن بھی وہ آپ کے پاس آئے اور آپ سے وہی سوال کیا، جو پہلے دن کیا تھا اور آپ نے وہی جواب دیا جو پہلے دن دیا تھا۔ اس دن ان کے ساتھ ایک فرشتہ بھی آیا جس کا نام اسماعیل تھا اور جس کے ماتحت ایک لاکھ فرشتے تھے جن میں سے ہر ایک کے ماتحت ایک لاکھ فرشتے تھے۔ اس فرشتہ نے اذن باریابی چاہا تو آپ نے اس کے بارے میں دریافت فرمایا، تو جبریل نے کہا: یہ موت کا فرشتہ ہے اور آپ سے اذن باریابی کا طالب ہے، آپ سے قبل اس نے کسی بھی آدمی سے اجازت نہیں طلب کی ہے اور نہ آپ کے بعد وہ کسی سے اجازت طلب کرے گا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کو اجازت دے دو۔ تو جبریل نے اس کو اجازت دے دی تو اس نے آپ کو سلام کیا، پھر عرض گزار ہوا: اے محمد! اللہ عزوجل نے مجھے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، پس اگر آپ مجھے یہ حکم فرمائیں کہ میں آپ کی روح قبض کروں، تو میں اسے قبض کروں اور اگر آپ مجھے حکم دیں کہ اس کو چھوڑ دوں تو چھوڑ دوں۔ آپ نے فرمایا: اے موت کے فرشتے! کیا تم یہ کام کروگے؟ اس نے جواب دیا: ہاں،

مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے اور یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ میں آپ کی اطاعت کروں۔ کہا: اس وقت نبی ﷺ نے جبریل علیہ السلام کی طرف دیکھا، تو جبریل نے کہا: اے محمد! اللہ عزوجل آپ سے ملاقات کا مشتاق ہے۔ اس پر نبی ﷺ نے موت کے فرشتے سے فرمایا: تجھے جس کام کا حکم دیا گیا ہے، اسے کر گزر! تب اس نے آپ کی روح مبارک قبض کر لی اور جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی اور لوگ تعزیت کے لیے حاضر ہوئے تو انہوں نے گھر کے ایک کونے سے یہ آواز سُنی: اے اہل بیت تم پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں تم پر نازل ہوں۔ بے شک اللہ کی ذات میں ہر مصیبت سے ڈھارس، ہر ہلاک ہونے والے کا جانشین اور ہر گزری ہوئی چیز کی تلافی مضمر ہے، لہٰذا اللہ پر اعتماد کرو، اسی سے اُمید رکھو کیونکہ مصیبت زدہ تو وہ ہے جو ثواب سے محروم رہے۔ اس وقت علی علیہ السلام نے کہا: کیا تم کو یہ معلوم ہے کہ یہ کون ہے؟ یہ خضر علیہ السلام ہیں۔''

یہ روایت موضوع اور باطل ہے۔ اس کی تخریج امام شافعی نے اپنی مسند، ص: ۳۶۱'' میں اس سند سے کی ہے:

((عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ بْنِ حَفْصٍ عَنْ جعفرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ أَبِيهِ اَنَّ رِجَالًا مِنْ قُرَيْشٍ دَخَلُوا عَلَى أَبِيهِ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ ، فقال : أَلَا أُحَدِّثُكُم عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ : قَالُوْا : بَلَى ، فَحَدِّثْنَا عَنْ أَبِيْ الْقَاسِمِ ﷺ : قَالَ...... فَذَكَرَ))

''القاسم بن عبداللہ بن عمر بن حفص سے روایت ہے، انہوں نے جعفر بن محمد سے روایت کیا، انہوں نے اپنے باپ سے کہ قریش کے کچھ لوگ ان کے باپ علی بن الحسین کے پاس آئے تو انہوں نے کہا: کیا میں رسول اللہ ﷺ کی تم سے حدیث نہ بیان کروں؟ انہوں نے جواب دیا: کیوں نہیں؟ ہم سے ابوالقاسم ﷺ کی حدیث بیان کیجئے! راوی کہتا ہے...... اس وقت انہوں نے یہ حدیث بیان کی۔''

محدث عصر محمد ناصر الدین البانی کہتے ہیں:

''یہ سند مرسل ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد ضعیف ہے جس کی مصیبت یہ ابوالقاسم ہے جس کا لقب العُمیری المدنی ہے۔ اس کے بارے میں امام احمد فرماتے ہیں: ''وہ کچھ بھی نہیں، وہ جھوٹا تھا اور حدیثیں وضع کرتا تھا۔'' امام یحییٰ بن معین نے بھی اس کی تکذیب کی ہے اسی وجہ سے حافظ

ابن حجر نے "تقریب التهذیب، ص:۳۸۶ ، ترجمه:۵۴۶۸ " میں اس کو متروک قرار دیا ہے۔"

علامہ البانی مزید لکھتے ہیں:

''اس روایت میں القاسم بن عبداللہ کی ''متابعت'' جس نے کی ہے وہ بھی کذب بیانی میں اسی کی طرح ہے، چنانچہ الطبرانی نے "المعجم الكبير :۲۸۹۰ " میں اس کی تخریج عبدالجبار بن العلاء کے طریقے سے کی ہے:

((حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَيْمُوْنَ الْقَدَّاحِ : حَدَّثَنَا جَعْفَرُ بْنُ مُحَمَّدٍ بِهِ ؛ إِلَّا أَنَّهُ اَسْنَدَهُ فَقَالَ : عَنْ أَبِيهِ عَنْ عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنٍ ، قَالَ سَمِعْتُ أَبِي يَقُوْلُ :......))

''ہم سے عبداللہ بن میمون القداح نے بیان کیا، کہا: ہم سے جعفر بن محمد نے اس کو بیان کیا ،لیکن اس کی سند بیان کرتے ہوئے کہا: ان کے باپ سے روایت ہے، انہوں نے علی بن حسین سے روایت کیا، کہا: میں نے اپنے والد کو فرماتے ہوئے سنا ہے......''

میں کہتا ہوں کہ اس قداح کو امام ابوحاتم نے متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ امام بخاری کا قول ہے:

''وہ ذاہب الحدیث، روایت حدیث میں نا قابلِ اعتبار ہے۔''

ابن حبان کہتے ہیں: ''اس کو حجت بنانا جائز نہیں ہے۔''

اور حافظ ابن حجر نے "تقریب التهذیب ، ص:۲۶۸ ، ترجمه: ۳۶۵۳ " میں اس کو متروک اور منکر الحدیث لکھا ہے۔

پھر ایک دوسرے کذاب، ابوالولید المخزومی نے اس کا سرقہ کر لیا اور اس کی سند بدل دی، کہتا ہے:

((حَدَّثَنَا أَنَسُ بْنُ عَيَاضٍ ، عَنْ جُعفَرِبْنِ مُحَمَّدٍ ،عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: لَمَّا تُوَفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَزَّتْ هُمُ الْمَلَائِكَةُ؛ يَسْمَعُوْنَ الْحِسَّ وَلَا يَرَوْنَ الشَّخْصَ ،فَقَالَ : السَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ ، إِنَّ فِي اللّٰهِ عَزَاءً مِنْ كُلِّ مُصِيبَةٍ وَخَلَفًا مِنْ كُلِّ فَائِتٍ وَدَرَكًا مِنْ هَالِكٍ فَبِاللّٰهِ فَثِقُوْا وَإِيَّاهُ فَارْجُوا ، فَإِنَّمَا الْمَحْرُوْمُ مَنْ حُرِمَ الثَّوَابَ))

''ہم سے انس بن عیاض نے جعفر بن محمد اور انہوں نے جابر بن عبداللہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، کہا: جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی تو ملائکہ نے

صحابہ آواز تو سن رہے تھے لیکن کوئی جسم نہیں دیکھ رہے تھے، کہنے والے نے کہا: اہل بیت تم کو سلام، اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں تم پر نازل ہوں، اللہ کی ذات میں ہر مصیبت سے ڈھارس، ہر گزرنے والے کا جانشین اور ہر ہلاک ہونے کی تلافی موجود ہے تو اللہ ہی پر بھروسہ کرو اور اسی سے اُمید رکھو، کیونکہ محروم وہ ہے جو ثواب سے محروم ہو۔''

تو اس کا راوی ابو الولید المخزومی جس کا نام خالد بن اسماعیل ہے۔ اس کو ذہبی نے میزان الاعتدال کے باب ''الکنی'' میں کذاب لکھا ہے اور باب ''الأسماء'' میں اس کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

''ابن عدی کا قول ہے: وہ ثقہ راویوں کے نام سے حدیثیں وضع کرتا تھا۔ الدارقطنی نے اس کو متروک قرار دیا ہے، اور ابن حبان کہتے ہیں: کسی بھی حال میں اس سے استدلال کرنا جائز نہیں ہے۔'' [الضعیفہ: ۱۱/ ٦٤١-٦٤٤]

اوپر نبی اکرم ﷺ سے حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات اور آپ کی وفات کے موقع پر ان کے اہل بیت اور صحابۂ کرام کی تعزیت کرنے اور ان کو صبر وتحمل کی تلقین کرنے سے متعلق جتنی روایات نقل کی گئی ہیں وہ سب موضوع اور منکر ہیں۔ ان کے علاوہ نبی اکرم ﷺ کی وفات پر اُن کی حاضری اور اہل بیت اور صحابۂ کرام سے ان کی تعزیت سے متعلق جتنی اور روایات ملتی ہیں ان سب سے وضع اور نکارت کی بو آتی ہے اور ان میں سے کوئی بھی روایت ایسی نہیں ہے جس کی سند کذاب، حدیث وضع کرنے والے اور منکر الحدیث راوی سے پاک ہو اس سلسلے میں ''احیاء العلوم: ۱/ ۴۷۱، ۴۷۲، اور ۵/ ۷۲'' اور اس کے حاشیہ پر مطبوع ''المغنی عن حمل الاسفار'' فتح الباری: ۲/ ۱۵٦۵ اور ''البدایہ والنہایہ: ۱/ ۳۳۲، ۳۳۳ اور ۵/ ۲۷۷'' سے رجوع کر کے ان روایات اور ان کے راویوں کے بارے میں ائمہ حدیث کے اقوال دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ روایات دراصل ایک خاص ذہنیت کی ترجمان ہیں۔

صحابۂ کرام سے خضر علیہ السلام کی ملاقاتوں سے متعلق روایات:

نبی اکرم ﷺ سے خضر علیہ السلام کی ملاقاتوں کے بارے میں روایات کی حقیقت تو معلوم ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے موقع پر اہل بیت سے تعزیت کرنے کی غرض سے ان کی آمد کے بارے میں بھی جو روایات کتابوں میں ملتی ہیں ان میں سے کوئی روایت بھی صحیح اور قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

ذیل میں چند ایسی روایات نقل کی جا رہی ہیں جن میں صحابۂ کرام سے ان کی ملاقاتوں کا دعویٰ کیا گیا ہے:

١٥٤...... ((بَيْنَمَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يُصَلِّيْ عَلَى جَنَازَةٍ ، إِذَا بِهَاتِفٍ يَهْتِفُ مِنْ خَلْفِهِ: لَا تَسْبِقْنَا بِالصَّلَاةِ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ تَعَالَى ، فَانْتَظَرَهُ حَتَّى لَحِقَ بِالصَّفِّ الأَوَّلِ ، فَكَبَّرَ عُمَرُ وَكَبَّرَ النَّاسُ مَعَهُ ، فَقَالَ الْهَاتِفُ : إِنْ تُعَذِّبْهُ فَكَثِيْراً عَصَاكَ وَإِنْ تَغْفِرْلَهُ فَفَقِيْرٌ إِلَى رَحْمَتِكَ ، فَنَظَرَ عُمَرُ وَأَصْحَابُهُ إِلَى الرَّجُلِ ، فَلَمَّا دُفِنَ الْمَيِّتُ وَسُوِّيَ التُّرَابُ ، قَالَ طُوبَى لَكَ يَا صَاحِبَ الْقَبْرِ! إِنْ لَمْ تَكُنْ عِرِّيْفًا ، أَوْ جَابِيًا ، أَوْ خَازِنًا ، اَوْ كَاتِبًا أَوْ شُرْطِيًّا ، فَقَالَ عُمَرُ: خُذُوْا الرَّجُلَ نَسْأَلُهُ عَنْ صَلَاتِهِ وَكَلَامِهِ عَمَّنْ هُوَ؟ فَتَوَارَى عَنْهُمْ ، فَإِذَا أَثَرُ قَدَمِهِ ذِرَاعٌ ، فَقَالَ عُمَرُ : هٰذَا وَاللّٰهِ الَّذِيْ حَدَّثَنَا عَنْهُ النَّبِيُّ ﷺ أي : الْخِضْرُ))

''ایک دن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک جنازے کی نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے کہ ان کے پیچھے سے ایک غیبی آواز آئی جو کہہ رہی تھی: ہم سے نماز میں سبقت مت کیجیے! آپ پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ یہ سن کر عمر رضی اللہ عنہ اس کے انتظار میں رُک گئے یہاں تک کہ وہ آ کر پہلی صف میں شامل ہو گیا۔ پس عمر اور ان کے ساتھ لوگوں نے تکبیر کہی تو وہ آواز گویا ہوئی: اگر تو اس کو عذاب دے تو اس نے تیری بڑی نافرمانی کی ہے اور اگر تو اس کو بخش دے تو وہ تیری رحمت کا محتاج ہے۔ یہ سن کر عمر اور ان کے اصحاب نے اس آدمی کو غور سے دیکھا اور جب میت کو دفن کر دیا گیا اور اس کی مٹی برابر کر دی گئی، تو وہ بولا: اے صاحبِ قبر! خوش خبری ہو تمہارے لیے اگر تم کسی کام کے نگراں، تحصیل دار، خزانچی، منشی اور پولیس مین نہیں تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آدمی کو پکڑو ہم اس سے اس کی نماز کے بارے میں دریافت کریں اور اس سے یہ بھی پوچھیں کہ وہ کس کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ لیکن وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ اس کے پاؤں کا نشان نصف گز کے برابر ہے اس پر عمر نے فرمایا: یہ اللہ کی قسم وہی ہے جس کے بارے میں نبی ﷺ نے ہم سے بیان کیا ہے، یعنی خضر۔''

حافظ ابن کثیر ''البدایہ والنہایہ: ۱/ ۳۳۲'' میں لکھتے ہیں:

''اس کی روایت عبداللہ بن وہب نے اس شخص سے کی ہے جس نے اُن سے محمد بن عجلان اور

انہوں نے محمد بن المنکدر سے روایت کرتے ہوئے اسے بیان کیا ہے اور اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور سند منقطع بھی ہے۔ اس طرح کی روایت صحیح نہیں ہے۔"

امام ابن الجوزی فرماتے ہیں:

"اس کی سند میں ایک مجہول راوی شامل ہے اور محمد بن المنکدر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان سند منقطع بھی ہے۔" [الاصابة : ۱/ ٤٤٤، اور فتح الباری : ۲/ ١٥٦٥]

اور علامہ آلوسی "روح المعانی : ۱۵/ ۳۲۳" میں لکھتے ہیں:

"ہم اس کی صحت کو تسلیم نہیں کر سکتے۔"

۱۵۵ ...... ((رَوَى الحافظُ ابنُ عَسَاكِرٍ ، عَنِ الثَّورِيِّ ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُحَرَّرٍ ، عَنْ يَزِيْدَ بْنِ الأصَمِّ ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ رضي الله عنه ، قَالَ : بَيْنَا أَنَا أَطُوفُ بِالْبَيْتِ إِذَا رَجُلٌ مُتَعَلِّقٌ بِأَسْتَارِ الْكَعْبَةِ يَقُوْلُ : يَا مَنْ لَا يَشْغَلُهُ سَمْعٌ عَنْ سَمْعٍ ، وَيَامَنْ لَا تُغَلِّطُهُ الْمَسَائِلُ ، وَيَامَنْ لَا يَتَبَرَّمُ بِإِلْحَاحِ الْمُلِحِّيْنَ ، أَذِقْنِيْ بَرْدَ عَفْوِكَ وَحَلَاوَةَ رَحْمَتِكَ ، قُلْتُ : يَا عَبْدَ اللّٰهِ! أَعِدِ الْكَلَامَ ، قَالَ : أَسَمِعْتَهُ؟ قُلْتُ: نَعَمْ ، قَالَ : وَالَّذِيْ نَفْسُ الْخِضْرِ بِيَدِه...... وَكَانَ هُوَ الْخِضْرُ ، لَا يَقُوْلُهُنَّ عَبْدٌ دُبُرَ الصَّلَاةِ الْمَكْتُوْبَةِ إِلَّا غُفِرَتْ ذُنُوْبُهُ وَإِنْ كَانَتْ مِثْلَ رَمْلِ عَالِجٍ وَعَدَدِ الْمَطَرِ وَوَرَقِ الشَّجَرِ))

"حافظ ابن عساکر نے ثوری سے، انہوں نے عبداللہ بن محرر سے اور انہوں نے یزید بن الاصم سے اور انہوں نے علی بن طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ انہوں نے فرمایا: جس وقت میں بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی غلاف کعبہ سے چمٹا ہوا کہہ رہا ہے۔ اے وہ جس کو ایک سماعت دوسری سماعت سے غافل نہیں کرتی اے وہ جس کو کثرتِ سوال کسی غلطی میں مبتلا نہیں کرتی، اور اے وہ جو اصرار کرنے والوں کے اصرار سے کوئی تنگی محسوس نہیں کرتا، مجھے اپنے عفو و درگزر کی ٹھنڈک اور اپنی رحمت کی مٹھاس چکھا دے، میں نے کہا: اے اللہ کے بندے! ذرا یہ بات دوبارہ کہو! تو اس نے کہا: تم نے اس کو سنا؟ میں نے کہا: ہاں! اس پر اس نے کہا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں خضر کی جان ہے، اور وہ خضر ہی تھے۔ کوئی بھی بندہ یہ کلمات فرض نماز کے بعد کہے تو اس کے سارے گناہوں کی بخشش کر دی جائے گی چاہے

وہ ''عالج'' کی ریت، بارش کے قطروں اور درختوں کے پتوں کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔''

یہ روایت باطل اور جھوٹ ہے۔ حافظ ابن کثیر "البدایه والنهایه : ۱/ ۳۳۲" میں اس کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''یہ روایت صحیح نہیں ہے، کیونکہ عبداللہ بن محرر ''متروک'' ہے اور یزید بن الاصم کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ اور حافظ ابن حجر ''فتح الباری: ۲/ ۱۵۶۵'' میں لکھتے ہیں: حافظ ابن عساکر نے اس کو دو سندوں سے نقل کیا ہے اور دونوں ضعیف ہیں۔''

اور حافظ ابن کثیر نے "البدایه والنهایه : ۱/ ۳۳۴" میں اس روایت کو دوسری سندوں سے کچھ مختلف الفاظ میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ''ان میں سے کوئی سند بھی صحیح نہیں ہے، کسی سند میں انقطاع ہے تو کسی میں مجہول راوی شامل ہیں۔''

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خضر علیہ السلام کی ملاقات کے بارے میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے، اسی طرح صحابۂ کرام سے بھی ان کی ملاقاتوں سے متعلق کوئی روایت قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

اوپر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے خضر علیہ السلام کی ملاقاتوں کے بارے میں جو روایات نقل کی گئی ہیں، سند کے اعتبار سے ان کی نکارت اور پھر ان کے باطل ہونا واضح کیا جا چکا ہے۔ البتہ ان کے متن میں جو نکارت مضمر ہے اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی جبکہ ان کا یہ پہلو ان کی سند سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ بیشتر روایات میں حضرت خضر علیہ السلام کو اس شکل میں پیش کیا گیا ہے کہ ''لوگوں نے ان کی آواز تو سُنی مگر ان کی شخصیت کا مشاہدہ نہیں کیا۔'' یا ''وہ لوگوں کے درمیان اچانک نمودار ہوئے، ان کو چند نصیحتیں کیں اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔'' گویا ان کو جنوں یا فرشتوں کی طرح انسانی شکل اختیار کرنے اور پھر نگاہوں سے اوجھل اور غائب ہو جانے پر قدرت حاصل ہے۔ جبکہ ایک بشر ہونے کی وجہ سے ان کا ایسا کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے اور جو لوگ ان کو رسول یا نبی مانتے ہیں اور جن کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ رسول یا نبی نہیں ہیں بلکہ ''ولی'' تھے یا ہیں اُن دونوں کے نزدیک وہ بشر ہیں۔ اور کسی بشر سے اس طرح کے ''خارق العادۃ'' حالات کا ظہور صرف دو صورتوں میں ممکن ہے، اگر وہ رسول یا نبی ہے تو بطورِ معجزہ ایسا کرے اور اگر ''ولی'' ہے تو بطور ''کرامت''

تو جہاں تک معجزہ کا تعلق ہے تو یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی رسول یا نبی کا کوئی معجزہ دکھانا اس کا

اختیاری فعل نہیں ہے بلکہ وہ ایسا اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے حکم سے کرتا ہے۔ اس مسئلے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں نہایت واشگاف طریقے سے بیان کردیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُودَ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَايَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللّٰهُ ، جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوْا أَيْدِيَهُمْ فِيْٓ أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ أُرْسِلْتُمْ بِهِ وَإِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَا إِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿9﴾ قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَلَكُمْ مِنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى ، قَالُوْٓا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ أَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَآؤُنَا فَأْتُوْنَا بِسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ ﴿10﴾ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلَى مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ، وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَّأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿11﴾ ﴾ [سورۂ ابراھیم : ۹۔ ۱۱]

''کیا تمہیں اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، قوم نوح، عاد اور ثمود کی خبر اور ان کی خبر جو ان کے بعد آئے جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو انہوں نے اپنے منہ پر اپنے ہاتھ رکھ لیے اور بولے جو پیغام دے کر تم بھیجے گئے ہو ہم اس کا انکار کرتے ہیں اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دے رہے ہو ہم اس کے بارے میں سخت اُلجھن میں ڈال دینے والے شک میں ہیں، ان کے رسولوں نے کہا: کیا تمہیں آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے اللہ کے بارے میں شک ہے؟ وہ تو تمہیں اس لیے بلاتا ہے تاکہ تمہارے گناہوں کو بخش دے اور تمہیں ایک وقت معین تک مہلت دے، وہ بولے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو تم چاہتے ہو کہ ہم کو ان چیزوں کی عبادت سے روک دو جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں، اچھا لاؤ ہمارے پاس کوئی کھلا معجزہ۔ ان کے رسولوں نے ان سے کہا کہ ہم ہیں تو تمہارے ہی جیسے آدمی لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے اپنا فضل فرماتا ہے اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ ہم تمہارے پاس کوئی معجزہ لا دیں مگر صرف اللہ کے حکم سے اور ایمان لانے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔''

دیکھا آپ نے! کس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں کی زبانوں سے یہ اعلان کرادیا کہ ''یہ صحیح

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے ہم کو منصبِ رسالت پر سرفراز فرمایا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم تمہارے مطالبوں پر تمہیں معجزے دکھانے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ یہ تو سراسر اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور جب وہ چاہتا ہے تو ہمارے ہاتھوں معجزے ظاہر کر دیتا ہے۔

اور سورۃ الاسراء آیت نمبر ۹۰ سے ۹۳ تک میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے ان عجیب وغریب مطالبات کو بیان فرمایا ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ سے معجزات دکھانے سے متعلق کرتے تھے۔ پھر ان مطالبوں کا ذکر کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ ان کو یہ جواب دیجئے:

﴿ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴾

''اے نبی ان سے کہدو! پاک ہے میرا رب، کیا میں ایک ایسے رسول کے سوا کچھ اور ہوں جو انسان ہے۔''

اور عملی زندگی میں رسول اللہ ﷺ ''دعوتِ حق'' کی راہ میں قدم قدم پر ستائے گئے۔ طائف میں آپ کو پتھروں سے مارا گیا اور حرم پاک میں عین سجدے کی حالت میں آپ کی پیٹھ پر اونٹ کی اوجھڑی ڈال دی گئی اور آپ نے یہ سب کچھ برداشت کر لیا۔ ہجرت کے موقع پر آپ نے دشمنوں سے بچنے کے لیے وہ تمام احتیاطی تدابیر اختیار کیں جو اس طرح کے موقع پر اختیار کی جاتی ہیں۔ مگر نبی ﷺ کی سیرت پاک میں ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ لوگوں کے حملوں کے موقعوں پر ان کی نگاہوں سے غائب ہو گئے ہوں، کفار یا صحابۂ کرام سے گفتگو کرتے ہوئے لوگوں نے آپ کی آواز تو سُنی ہو لیکن آپ کی شخصیت اُن کی نگاہوں سے اوجھل رہی ہو۔ حالانکہ آپ سید المرسلین اور افضل الخلائق تھے اور خضر علیہ السلام کے مقابلے میں آپ سے اس طرح کے ''خارق العادۃ'' افعال کا صدور زیادہ ''قرین عقل'' تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ خضر علیہ السلام سے متعلق جتنی بھی روایات ملتی ہیں ان میں سے کوئی بھی روایت ''خارق العادۃ'' فعل سے خالی نہیں ہے۔

اور جو لوگ خضر علیہ السلام کو نبی نہیں بلکہ ''ولی'' مانتے ہیں اور ان کی طرف منسوب عجیب وغریب افعال کو ان کی کرامتوں کے قبیل سے مانتے ہیں تو یہ دعویٰ مردود ہے، کیونکہ کوئی بھی ولی کسی کرامت کے اظہار پر قادر نہیں ہے۔ کرامت دراصل اللہ تعالیٰ کی وہ ''تکریم'' ہے جس سے وہ اپنے صالح اور محبوب بندوں کو کبھی کبھی نوازتا رہتا ہے۔ یہ اولیاء اللہ کا ذاتی اور اختیاری فعل ہرگز نہیں ہے۔

معجزہ اور کرامت میں یہ فرق ہے کہ معجزہ نبی کی نبوت کی طرح ایک یقینی امر ہے جبکہ کسی ولی کی کرامت کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ عمومی طور پر اگرچہ اولیاء اللہ کا وجود ثابت ہے، لیکن کسی شخص کے لیے یہ جائز

نہیں کہ وہ کسی خاص شخص یا بزرگ کے ولی ہونے کا دعویٰ کرے۔ بلکہ خود ولی کو بھی یہ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ ولی ہے اور نہ اس کے لیے وہ اپنے ولی ہونے کا دعویٰ کرنا جائز ہے، اس کے برعکس نبی کی نبوت پر ایمان اور اس کی تصدیق جزو ایمان ہے بلکہ خود نبی پر دوسروں سے قبل اپنے نبی ہونے پر ایمان لانا واجب ہے۔

خضر علیہ السلام سے متعلق اب تک کی نقل کردہ موضوع اور منکر روایتوں کے ضمن میں یہ وضاحت ضروری تھی ، رہا ان کی نبوت اور ولایت کا مسئلہ تو اس پر مکمل بحث ان شاء اللہ اس باب کے آخر میں کی جائے گی۔

ائمہ سے خضر علیہ السلام کی ملاقاتوں سے متعلقہ روایات:

فضائل ومناقب کی کتابوں میں جن ائمہ اسلام سے خضر علیہ السلام کی ملاقاتوں کے واقعات بیان کیے گئے ہیں ان میں سرِ فہرست امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہیں اور ان سے خضر علیہ السلام کی ملاقاتوں کا واقعہ بڑا دلچسپ بھی ہے، مشہور حنفی عالمِ حدیث علامہ نور الدین ملا علی القاری نے یہ واقعہ اپنی کتاب ''المشرب الوردی فی مذہب المہدی'' میں نقل کیا ہے اور پھر اس کا رد کیا ہے۔ ذیل میں اس کا ترجمہ نقل کیا جا رہا ہے:

''جان لو کہ اللہ نے ابوحنیفہ کو شریعت اور کرامت سے خصوصی طور پر نوازا تھا۔ اور ان کی کرامتوں میں سے ایک کرامت یہ تھی کہ خضر علیہ السلام ہر روز صبح کے وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے شریعت کے احکام سیکھتے۔ یہ سلسلہ پانچ سال تک جاری رہا۔ اور جب ابوحنیفہ کی وفات ہوگئی تو خضر علیہ السلام نے اپنے رب سے مناجات کرتے ہوئے التجا کی: الٰہی! اگر تیرے نزدیک میرا کوئی درجہ اور مقام ہے تو ابوحنیفہ کو یہ اجازت دے کہ وہ مجھے قبر سے حسبِ معمول علم سکھاتے رہیں۔ تاکہ مجھے محمد ﷺ کی مکمل شریعت کی معرفت حاصل ہو جائے اور میں طریقت اور حقیقت سے واقف ہو جاؤں، اس مناجات کے بعد خضر علیہ السلام کے پاس یہ ندا آئی کہ ان کی قبر کے پاس جا کر ان سے جو کچھ چاہتے ہو سیکھو۔ اس طرح وہ ان کی قبر کے پاس حاضری دینے اور ان سے علم سیکھنے لگے، یہ سلسلہ پچیس سال تک جاری رہا یہاں تک کہ انہوں نے تمام دلائل اور اقوال کی تحصیل مکمل کر لی۔''

عقیدت میں غلو کے ترجمان اس جھوٹے واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ملا علی القاری لکھتے ہیں:

''یہ بات مخفی نہیں کہ یہ عبارت اپنے لچر پن اور ابتذال کے ساتھ کسی ایسے ملحد کا کلام ہے جو اس

ا......وہ خضر جن کے حق میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا ﴾ ''(موسیٰ اور اس کے خادم نے) ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اس کو اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا۔''
اور جن سے موسیٰ علیہ السلام نے علم حاصل کیا تھا، وہ ابوحنیفہ کے شاگردوں میں شامل ہو گئے؟!

۲......کس قدر عجیب بات ہے کہ خضرؑ کو نبی ﷺ کا مبارک زمانہ ملا مگر انہوں نے آپ ﷺ سے اسلام کی تعلیم حاصل نہیں کی، اور نہ علی بن ابی طالب، زید بن ثابت، اُبی بن کعب اور معاذ بن جبل جیسے صحابۂ کرام کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور نہ سعید بن المسیب، عطاء بن رباح، الحسن البصری اور مکحول جیسے تابعین عظام کی خدمت میں حاضری دی بلکہ ان سب کو چھوڑ کر کسی اور کے علم پر راضی ہو گئے۔ اس طرح اس واقعہ کا باطل ہونا کسی پر مخفی نہیں رہ سکتا حتی کہ کم عقلوں پر بھی نہیں۔''

''الاشاعه لأشراط الساعة'' کے مصنف الشریف محمد بن رسول الحسینی البرزنجی نے مذکورہ واقعہ اور اس پر ملا علی القاری کا تبصرہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''ا......خضر جو اپنے رب سے مخاطب ہوتے ہیں، اس سے مناجات کرتے ہیں اور ان کا رب ان کی مناجات کا ان کو جواب دیتا ہے اور ان کو پکارتا ہے، انہوں نے اپنے رب سے یہ سوال کیوں نہ کیا کہ وہ ان کو کسی واسطہ کے بغیر اسلام کی تعلیم دیدے، یہاں تک کہ ان کو ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی قبر پر جا کر علم شریعت حاصل کرنا پڑا۔

۲......خضر یا تو نبی ﷺ کی شریعت کا علم حاصل کرنے پر مامور تھے یا نہیں تھے۔ اگر مامور تھے تو پھر انہوں نے ابوحنیفہ کے زمانے تک اس کو چھوڑے کیوں رکھا؟ کیا اُن کا ایسا کرنا ترکِ فرض پر دلالت نہیں کرتا اور ایک معصوم کے لیے یہ کیونکر روا ہو سکتا ہے کہ وہ ۱۵۰ سال تک شریعت کی تعلیم کو پسِ پشت ڈالے رکھے؟

اور اگر خضر اس شریعت کا علم حاصل کرنے پر مامور نہیں تھے بلکہ انہوں نے محض حصول ''کمال'' کے جذبے سے ایسا کیا، تو پھر انہوں نے یہ علم شریعت نبی ﷺ سے ''تروتازہ'' کیوں نہ حاصل کیا؟

۳......امام ابوحنیفہ مجتہد تھے اور مجتہد خطأ وصواب دونوں سے متصف ہوتا ہے تو پھر خضر جو خطأ و صواب سے معصوم ہیں، انہوں نے ایک ایسے شخص کی تقلید کس طرح کی جو خطأ وصواب کی

صفت سے معصوم نہیں تھا؟

ملا علی قاری اور الشریف ابوزنجی نے امام ابوحنیفہ سے خصر علیہ السلام کے علم شریعت حاصل کرنے کے واقعہ کی جو تکذیب کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ خضر علیہ السلام کو نبی بھی مانتے تھے اور ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ وہ بقید حیات ہیں، ان کے اس عقیدے میں اُمت کا ایک بہت بڑا طبقہ ان کے ساتھ شریک ہے۔ مگر ان دونوں بزرگوں نے مذکورہ من گھڑت واقعہ کی تکذیب کرتے ہوئے دانستہ یا نادانستہ جس پر پہلو کو نظر انداز کر دیا وہ خضر علیہ السلام کا پچیس سال تک امام ابوحنیفہ کی قبر پر حاضری دینا اور ان سے احکامِ شریعت کا علم حاصل کرنا ہے۔ حالانکہ مذکورہ واقعہ کا یہ پہلو سب سے زیادہ گمراہ کن ہے کیونکہ یہ مسلمہ اسلامی عقیدہ ہے کہ مردے اپنی قبروں میں نہ تو باہر کی کوئی بات سُنتے ہیں اور نہ باہر کے لوگوں کو اپنی باتیں سُنا سکتے ہیں۔ اگر وہ ایسا کر سکتے تو پھر رسول اللہ ﷺ کو یہ فرمانے کی ضرورت نہ پڑتی:

((تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا مَسَكْتُمْ بِهِمَا : كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهِ))

[المؤطا / كتاب القدر، حديث: ۳]

''میں تمہارے اندر دو ایسی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، جب تک تم انہیں پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سُنت۔''

بلکہ اس کے برعکس آپ ﷺ یہ فرماتے کہ دیکھو میری وفات کے بعد جب بھی تمہیں دین کا کوئی حکم معلوم نہ ہو، یا تمہیں کسی شرعی مسئلے میں کوئی اشتباہ ہو جائے یا کسی معاملے میں آپس میں اختلاف کر بیٹھو تو میری قبر پر حاضر ہو کر اپنا اشکال بیان کر دینا میں تمہیں صحیح حکم بتا کر تمہاری اُلجھن دور کر دوں گا۔

درحقیقت یہ کہانی جس شخص نے گھڑی ہے اس سے اس کا مقصد اہل تصوف کے اس عقیدے کی ترویج ہے کہ اولیاء اللہ اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور اپنے فیوض و برکات سے اہل دنیا کو مستفید کر رہے ہیں، وہ صرف نظروں سے اوجھل ہیں ورنہ حقیقت میں ان کے تصرفات کائنات میں جاری وساری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام میں صوفیا اور اولیاء اللہ کے قبریں مرجع خلائق بنی رہتی ہیں۔ ان قبروں پر اُمت محمد سے نسبت کے جھوٹے دعویدار ہر اس مشرکانہ عمل کا ارتکاب کرتے ہیں جس کا ارتکاب مشرکین بتوں کے آگے کرتے تھے بلکہ توحید کا دم بھرنے والے ان سے بھی دو قدم آگے نکل گئے ہیں اور وہ اس طرح کہ مشرکین ''الوہیت'' میں تو شرک کا ارتکاب کرتے تھے مگر ربوبیت میں مؤحد تھے جبکہ نام نہاد مسلمان الوہیت اور ربوبیت دونوں میں شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

واضح رہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ للہ کی طرح دوسرے ائمہ حدیث و فقہ سے بھی خضر علیہ السلام کی ملاقاتوں کے تذکروں سے فضائل و مناقب کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی واقعہ ایسا نہیں ہے جو قابلِ اعتماد سند سے منقول ہو اور اس کا متن اسلامی روح کے منافی نہ ہو اور ان ائمہ اسلام کے علاوہ اُمت کے دوسرے علماء اور مشائخ بھی ان سے ملاقاتوں کے دعوے کرتے رہے ہیں اور آج تک اس کا سلسلہ جاری ہے بلکہ ان میں بکثرت ایسے لوگوں کے نام بھی ملتے ہیں جن کی ''خدمت عالیہ'' میں خضر علیہ السلام خود حاضر ہوتے ہیں اور بعض تو ایسے ''خدا رسیدہ'' بھی گزرے ہیں جن کی خدمت میں خضر علیہ السلام ''استفادہ'' کی غرض سے حاضر ہوئے لیکن انہوں نے ان کو ''اذن باریابی'' دینے سے انکار کر دیا کیونکہ اس سے ان کی عبادت و ریاضت اور خلوت مع اللہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ تھا۔

ظاہر ہے کہ خضر علیہ السلام سے لوگوں کی ملاقاتوں کے یہ سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں واقعات صحیح نہیں ہو سکتے کیونکہ اوّل تو یہ واقعات اپنے پیچھے کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں رکھتے، دوسری بات یہ کہ ان سے خضر علیہ السلام کی زندگی ثابت ہوتی ہے جو قرآن پاک اور صحیح احادیث کے خلاف ہے۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ سوم یہ کہ ان ملاقاتوں کا دعویٰ کرنے والے سو فیصد صوفیا یا صوفیانہ افکار و عقائد سے متاثر لوگ ہیں جو ہر دور میں بے بنیاد اور جھوٹے واقعات بیان کرنے میں شہرت رکھتے ہیں۔

خضر علیہ السلام کی زندگی اور موت اور نبوت وولایت تو ایک مختلف فیہ امر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو سید البشر اور خاتم الانبیاء ہیں اور جو قیامت سے پہلے اپنی قبر مبارک سے باہر تشریف نہیں لائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی متعدد صوفیا نے یہ دعوے کیے ہیں کہ انہوں نے آپ کو قبر مبارک سے باہر دیکھا ہے اور یہ خواب میں نہیں بلکہ حالتِ بیداری میں جبکہ یہ ناممکنات میں سے ہے، کیونکہ اگر یہ ممکن ہوتا تو اس شرف عظیم سے وہ محدثین عظام اور فقہائے اُمت نوازے جاتے جو اس دین کے پاسبان، عالم و فاضل، صالح، متقی اور عابد و زاہد تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، اس کے برعکس قبر سے باہر بیداری کی حالت میں ملاقات اور نبی برحق کے دیدار کے دعویدار ایسے لوگ ہیں جو ان کے عشر عشیر بھی نہیں تھے۔ ذیل میں بلا کسی تبصرے کے اس طرح کے چند واقعات نقل کر رہا ہوں۔

تاریخ دعوت وعزیمت، جلد پنجم، صفحہ: ۳۹۳ پر یہ عبارت درج ہے:

''سید شاہ ابوسعید رحمہ اللہ ایک باوقار، کریم النفس، کثیر الاحسان، مہمان نواز اور غریب پرور بزرگ تھے۔ رفقاء کے ساتھ اپنے حجاز کا سفر کیا اور ۲۸ ربیع الاوّل ۱۱۸۷ھ کو مکہ مکرمہ پہنچے اور

حج سے مشرف ہو کر مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور وہاں چھ ماہ مقیم رہے اور ''مصابیح'' کی شیخ ابو الحسن سندھی صغیر سے سماعت کی، ایک بار مرقد نبوی ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کو دیکھا کہ حجرۂ مبارکہ سے باہر جلوہ افروز ہیں، پہلے آپ کے دوش مبارک ظاہر ہوئے، پھر جسد مطہر ظاہر ہوا اور آنحضرت ﷺ سامنے تشریف فرما کر متبسم ہوئے، آپ کے مرید و مجاز شیخ امین بن حمید علوی کاکوروی اپنے رسالے میں لکھتے ہیں کہ:

''شیخ ابوسعید فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو مدینہ منورہ میں بچشم سر دیکھا ہے۔''

"فضائل اعمال، جلد اول، ص: ۷۹۰-۷۷" پر یہ عبارت درج ہے:

''سید احمد رفائی رحمہ اللہ مشہور بزرگ اکابر صوفیہ میں سے ہیں، ان کا قصہ مشہور ہے کہ جب ۵۵۵ھ میں وہ زیارت کے لیے حاضر ہوئے اور قبر اطہر کے قریب کھڑے ہو کر دو شعر پڑھے تو دستِ مبارک باہر نکلا اور انہوں نے اس کو چوما۔''؟!

فضائل اعمال کے مصنف نے یہ قصہ حافظ سیوطی کی کتاب ''الحاوی'' سے نقل کیا ہے۔ اور حافظ سیوطی نے خود یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو حالت بیداری اور نیند دونوں میں دیکھا جا سکتا ہے اور انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو ستر سے زیادہ بار حالتِ بیداری میں دیکھا ہے۔'' [مقدمة "الانفان" بقلم فواز احمد الزمولی، ص: ٢٤]

کیا حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں؟

''امام نووی فرماتے ہیں: خضر علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں اختلاف ہے، بیشتر علماء کا قول ہے کہ وہ زندہ ہیں اور ہمارے درمیان موجود ہیں، صوفیہ کے نزدیک یہ امر متفق علیہ ہے اور یہی رائے اہل صلاح و معرفت کی بھی ہے، ان کی رؤیت، ان سے ملنے، ان سے سوال و جواب، خیر و بھلائی کے مقامات پر ان کے وجود کے بارے میں لوگوں کی حکایتیں شمار سے باہر ہیں، جن پر پردہ ڈالنا مشکل ہے۔''

[تهذيب الاسماء واللغات: ١٧٧/١، ١٧٧۔ شرح صحيح مسلم: ١٣٥/١٥ ١٣٦]

امام نووی کی یہ تصریح اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ خضر علیہ السلام کی زندگی کے قائل یا تو صوفیا ہیں یا وہ جن پر تصوف کا رنگ غالب ہے۔ چنانچہ شیخ اسماعیل حقی لکھتے ہیں:

''لوگوں کی اکثریت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ خضر علیہ السلام ہمارے درمیان موجود ہیں۔ اور صوفیا

کے نزدیک یہ متفق علیہ امر ہے، کیونکہ مختلف مقامات پر ان کو دیکھنے اور ان سے بات کرنے کی حکایتیں، شمار سے باہر ہیں۔ اس بات کو اس بات کو شیخ اکبر...... محی الدین بن عربی...... نے ''الفتوحات المکیہ'' میں، ابوطالب المکی نے اپنی کتابوں میں اور حکیم ترمذی...... محمد بن علی بن الحسن...... نے النوادر میں نیز امت کے محققین نے نقل کیا ہے، جن کا جھوٹ اور افتراء پر اتفاق نا قابلِ تصور ہے۔ اس طرح ان کا وجود تو ثابت ہو گیا اور عدم وجود دلیل کا محتاج ہے اور ان کی موت پر کوئی دلیل، کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت نہیں ہے اور کسی نے بھی یہ خبر نہیں نقل کی ہے کہ وہ فلاں جگہ، فلاں وقت اور فلاں بادشاہ کے زمانے میں فوت ہوئے۔''

[روح البيان فى تفسير القرآن: ٢ /٤٩٨]

اسماعیل حقی نے خضر علیہ السلام کے وجود پر جن لوگوں کی کتابوں سے استدلال کیا ہے اور جن کو انہوں نے ''محققین امت'' کے القاب سے نوازا ہے وہ ان کے نزدیک اہل تحقیق اور ثقہ ہوں تو ہوں ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ ان کی کتابیں رطب ویابس اور حق و باطل کا مجموعہ ہیں اور انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ دین صحیح کی تشریح وتوضیح سے زیادہ کفر وزندقہ پھیلایا ہے۔

دوم یہ کہ اگر کسی رسول یا نبی کے عدم وجود کے لیے یہ ضروری ہے کہ کتاب وسنت اور اجماع سے اس کے بارے میں نص صریح ہو تو پھر اللہ کے بھیجے ہوئے بیشتر رسولوں اور نبیوں کو اس وقت دنیا میں موجود ہونا چاہیے کیونکہ صحیح نصوص میں ان کی وفات کے تذکرے نہیں ملتے۔

سوم یہ کہ قدیم زمانے کے کسی شخص کا بقید حیات رہنا دلیل کا محتاج ہے نہ کہ اس کی موت، کیونکہ موت تو ایک حتمی اور یقینی امر ہے۔ ﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ﴾ اب اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی اس سنت سے مستثنیٰ ہے اور زندہ ہے تو کتاب وسنت سے اس کے لیے دلیل درکار ہے۔

اہل تصوف نے حضرت خضر علیہ السلام کی بقاء اور وجود کے جو اسباب گنوائے ہیں ان میں سے دو درج ذیل ہیں:

۱ محمد بن اسحاق ''کتاب المبتدأ'' میں لکھتے ہیں: ہمارے اصحاب نے ہم سے بیان کیا ہے کہ جب آدم علیہ السلام کی وفات کا وقت آیا تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ اہل زمین پر عذاب نازل کرنے والا ہے۔ لہٰذا میری لاش غار میں تمہارے ساتھ رہنی چاہیے، یہاں تک کہ تم مجھے لے جا کر ارض شام میں دفن کر دینا، پس جب طوفانِ نوح آیا، تو انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ

آدم نے اللہ سے دعا کی تھی کہ وہ اس شخص کی عمر قیامت تک دراز کر دے، جو ان کو دفن کرے اور خضر ہی نے ان کو دفن کیا اور اللہ نے آدم سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کیا، اس طرح وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے، جب تک اللہ انہیں زندہ رکھنا چاہے گا۔

[الإصابه: ۱/ ۴۳۱، فتح الباری: ۲/ ۱۵۶۶]

یہ روایت نقل کرنے کے بعد حافظ ابن حجر نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے۔ اس کے راوی محمد بن اسحاق بن یسار ہیں، جو اگرچہ سچے تھے مگر ''مدلس'' تھے اور ان پر تشیع اور قدری ہونے کا الزام بھی تھا۔ " **تقریب التھذیب، ترجمہ: ۵۷۲۵** " انہوں نے یہ صراحت نہیں کی ہے کہ ان سے یہ واقعہ کس نے بیان کیا۔ اگر ابن اسحاق سے زیادہ ثقہ راوی نے اس طرح کی مبہم اور غیر مکمل سند سے اس طرح کے " **خارق العادۃ** " واقعہ کو بیان کیا ہوتا تب بھی وہ قابل قبول نہ ہوتا تو پھر ابن اسحاق کی روایت کیونکر قبول کی جا سکتی ہے۔

۳ خضر علیہ السلام نے آبِ حیات پی لیا تھا، اس لیے ان کو دنیا میں حیات جاوداں مل گئی۔ چنانچہ تفسیر النسفی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ''ذو القرنین'' کی سیاحت کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا: سیاحت شروع کرنے کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے کتابوں میں یہ پڑھا تھا کہ ''اولاد سام'' میں سے ایک شخص ''چشمۂ حیواں'' کا پانی پی کر ''حیاتِ دوام'' حاصل کرلے گا، اس لیے وہ اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، ان کے ساتھ خضر، ذوالقرنین کے وزیر اور خالہ زاد بھائی بھی تھے۔ تو خضر کو چشمۂ حیواں مل گیا اور انہوں نے اس کا پانی پی لیا، لیکن ''ذو القرنین'' کو نہیں ملا۔ اور حافظ ابن حجر نے ''فتح الباری: ۲/ ۱۵۶۶'' میں لکھا ہے کہ خیثمہ بن سلیمان نے جعفر صادق سے اور انہوں نے اپنے باپ محمد بن علی سے روایت کی ہے کہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ذوالقرنین کا دوست تھا جس سے انہوں نے یہ درخواست کی کہ وہ ان کو ایسی کوئی چیز بتا دے جس سے ان کی عمر دراز ہو جائے تو اس نے ان کو ''چشمۂ حیواں'' کے بارے میں بتایا جو تاریکی (ظلمت) میں ہے یہ سُن کر ذوالقرنین اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھ ایک فوج تھی جس کے ہراول دستہ کی قیادت خضر کر رہے تھے اس طرح وہ ان سے آگے نکل گئے اور ان کو ''چشمۂ حیواں'' مل گیا۔ لیکن ذوالقرنین کو نہ ملا۔

[۳/ ۱۴۴]

حافظ ابن حجر نے " **الاصابہ: ۱/ ۴۳۱، ۴۳۲** " میں اس واقعہ کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے اور

ذوالقرنین کے دوست فرشتے کا نام ''رفائیل'' لکھا ہے۔ اور شاید اسی من گھڑت کہانی کی بنیاد پر لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ ''آبِ حیات'' کا چشمہ بحرِ ظلمات میں پایا جاتا ہے، جس کو اگر کوئی پی لے تو اس کو دوام حاصل ہو جائے گا۔

لیکن اس قصہ کی نکارت اس قدر واضح ہے کہ اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔ کب سے فرشتے انسانوں سے اس طرح کی دوستی کرنے لگے؟ قرآن و حدیث کے صریح الفاظ کی روشنی میں تو فرشتے اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع ہیں اور اس کی مرضی کے بغیر جنبش نہیں کرتے، پھر اس من گھڑت قصہ سے خضر علیہ السلام کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ قرآنِ پاک اور صحیح احادیث میں مذکور ان کی تصویر سے مطابقت نہیں رکھتی کہاں وہ صالح و پاکباز اور صاحب علم لدنی جس سے علم حاصل کرنے کا موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر اور اولوالعزم رسول کو حکم دیا گیا اور کہاں ذوالقرنین کی فوج کا ایک سپاہی یا بروایت کعب الاحبار ذوالقرنین کا وزیر جو عمر کی درازی کے لیے آبِ حیات کا چشمہ تلاش کرتا پھر رہا تھا؟

خضر علیہ السلام کا ''چشمۂ حیات'' کو پانا اور پھر اس کا پانی پی کر ''حیاتِ جاوداں'' حاصل کر لینا اسرائیلیات یا عوامی کہانیوں کے قبیل سے ہے۔ صحیح احادیث سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

البتہ یہ درست ہے کہ امام بخاری نے تفسیر سورۃ الکہف میں جو حدیث روایت کی ہے اس کے ضمن میں انہوں نے سفیان بن عیینہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''عمرو بن دینار کے علاوہ اس حدیث کے دوسرے راوی کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ چٹان کے نیچے ایک چشمہ ہے جس کو چشمۂ حیات کہا جاتا ہے، اس کا پانی جس کو لگ جاتا ہے وہ زندہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ناشتہ کی جو مچھلی تھی اس کو اس چشمہ کا پانی لگ گیا، جس کے نتیجے میں وہ حرکت میں آئی اور ٹوکری سے نکل کر سمندر میں داخل ہو گئی۔ [1]

حافظ ابن حجر ''فتح الباری: ۲/۲۰۴۵'' میں لکھتے ہیں:

> ''وہ اضافہ جس کے بارے میں سفیان بن عیینہ کا بیان ہے کہ وہ عمرو بن دینار کے علاوہ دوسرے راوی کی روایت میں موجود ہے، اس کی تخریج ابن مردویہ نے ''ابراہیم بن یسار عن سفیان'' کی روایت سے کی ہے۔ اور وہ عمرو بن دینار کی حدیث میں ''مدرج'' ہے۔ اس کے الفاظ ہیں: یہاں تک کہ ہم چٹان کے پاس پہنچ گئے، جہاں موسیٰ علیہ السلام نے قیلولہ کیا اور اس چٹان کے پاس پانی کا ایک چشمہ تھا، جس کو ''چشمۂ حیات'' کہا جاتا ہے۔ جس مردے کو اس کا پانی

[1] حدیث: ٤٧٢٧

لگ جائے وہ زندہ ہو جاتا ہے اور اس چشمہ کے پانی کا ایک قطرہ مچھلی کو لگ گیا تو وہ زندہ ہوگئی اور ٹوکری سے نکل کر سمندر میں گر گئی۔ اور میرا خیال ہے کہ ابن عیینہ نے یہ اضافہ قتادہ سے اخذ کیا ہے۔ اس کے بعد ابن حجر نے ابن التین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ الداؤدی نے اس اضافہ کی صحت سے انکار کیا ہے اور خود بھی ((اِنْ ثَبت النقل فیھا))" اگر اس چشمہ کے بارے میں روایت ثابت ہے۔" کہہ کر اس کے ثبوت میں شک کا اظہار کیا ہے۔

اور اگر صحیح حدیث میں اس اضافہ کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ مذکورہ چشمہ کا پانی لگ جانے سے مردہ مچھلی زندہ ہوگئی۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ خضر علیہ السلام نے اس کا پانی پی لیا تھا، اس لیے، ان کو 'حیاتِ دوام' حاصل ہوگئی اور اس روایت میں اس کی یہ خاصیت بیان بھی نہیں ہوئی ہے۔"

اوپر حضرت خضر علیہ السلام کے خلود یا دنیا میں "حیاتِ دوام" کے جو اسباب بیان کیے گئے ہیں ان کی حقیقت تو معلوم ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگرچہ ان کی زندگی کا عقیدہ رکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، مگر ان کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے، جو خیالی گھوڑے زیادہ دوڑاتے ہیں اور اپنے ذوق و خیال سے بہت سی باتیں گھڑ لیتے ہیں اور پھر ان کو لوگوں میں "مسلمہ حقائق" کے طور پر پھیلانے لگتے ہیں۔ مثلاً یہ بھی کہا جاتا ہے کہ:

"خضر علیہ السلام کی زندگی قیامت تک کے لیے اس وجہ سے دراز کر دی گئی تاکہ وہ دجال کی تکذیب کریں۔[فتح الباری: ۲/ ۱۵۶۶] اور پھر اس دعوے کی بنیاد پر اس "مردِ مومن" کو خضر قرار دے دیا گیا، جو دجال کی تکذیب کرے گا اور جس کا ذکر صحیح مسلم میں مروی ایک حدیث "۷۳۷۵" میں آیا ہے، جبکہ اس حدیث میں اس بات کا ادنیٰ سا اشارہ نہیں ہے کہ دجال کی تکذیب کرنے والے صالح اور نیک بندے سے مراد خضر علیہ السلام ہیں، کیونکہ اگر اس مرد صالح سے مراد خضر علیہ السلام ہوتے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بیان فرما دیتے، جس طرح آپ نے ایک سے زیادہ موقع پر یہ واضح فرما دیا ہے کہ دجال کو قتل کرنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے۔

دراصل امام مسلم کے شاگرد اور ان سے صحیح مسلم کی روایت کرنے والے ابو اسحاق ابراہیم بن سفیان کا یہ قول ہے کہ مدینہ کے جو بزرگ اور صالح بندے دجال کی تکذیب کریں گے وہ خضر ہیں۔ اور اس کا ذکر انہوں نے "کہا جاتا ہے صیغۂ تمریض" سے کیا ہے اور اس قول کا کوئی مأخذ

نہیں بتایا ہے۔''

''مکحول سے روایت ہے اور وہ کعب الأحبار سے روایت کرتے ہیں کہ اہل زمین کی حفاظت کے لیے چار انبیاء زندہ ہیں۔ دو زمین میں، یعنی خضر اور الیاس علیہما السلام اور دو آسمان پر یعنی ادریس اور عیسیٰ علیہم السلام۔'' [فتح الباری: ۲/۱۰۶٦]

دراصل یہ روایت ان لوگوں کی گھڑی ہوئی لگتی ہے، جو صوفیا کے ''نظریہ ابدال'' کے قائل ہیں اور جن کے نزدیک ابدال، اقطاب، اغواث اور اوتاد وغیرہ کائنات کے انتظام وانصرام میں تصرف کے مالک ہیں۔ یہ نظریہ اسلام کے عقیدۂ توحید کے صریحًا منافی ہے۔ قرآنی آیات اور صحیح احادیث اس امر میں صریح ہیں کہ تنہا اللہ تعالیٰ کی ذات ہی صفت ربوبیت سے متصف ہے اور کائنات کے انتظام وانصرام میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

پھر عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ اور کونسا نبی ہے، جس کی زندگی کا کتاب وسنت سے ثبوت ملتا ہو اور عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی احادیث میں جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں، وہ صرف دجال اور اس کے قتل سے متعلق ہیں، کس حدیث میں یہ آیا ہے کہ وہ زمین پر اترتے ہیں، لوگوں سے ملاقاتیں کرتے ہیں، ان کی رہنمائی کرتے ہیں اور امور کائنات میں تصرف کرتے ہیں۔

''جو لوگ خضر علیہ السلام کے دیدار وملاقات کے دعوے کرتے ہیں وہ ان کی یہ پہچان بتاتے ہیں کہ ان کے داہنے ہاتھ کے انگوٹھے میں ہڈی نہیں ہے۔ اور ان کی آنکھوں کی پتلیاں پارے کی مانند حرکت کرتی رہتی ہیں۔'' [روح المعانی: ۱۵/۳۲۲]

اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ لوگوں نے ان علامتوں کے حامل کسی شخص کو دیکھا ہے تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ وہ خضر علیہ السلام ہیں؟ کیا کسی صحیح نص سے ان کی یہ علامتیں ثابت ہیں؟

''بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے کپڑے سبز اور ان کا عمامہ زرد رنگ کا ہے۔ اور ان کے کپڑے کبھی پرانے نہیں ہوتے، کیونکہ وہ نہ تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں اور نہ حرام کھاتے ہیں۔''

[جامع کرامات الاولیاء: ۱/۳۹۰، الطبقات الکبریٰ: ۱/۷۹]

یہاں بھی یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کسی دلیل سے یہ ثابت ہے کہ خضر علیہ السلام سبز رنگ کے کپڑے زیبِ تن کرتے ہیں اور زرد رنگ کا عمامہ باندھتے ہیں؟ رہی یہ بات کہ چونکہ وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے اور حرام نہیں کھاتے، اس لیے ان کے کپڑے کبھی پرانے نہیں ہوتے، تو اس کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ

سید الاولین والآخرین اور افضل الخلائق محمد ﷺ کے کپڑے تو پرانے ہوتے تھے اور پھٹتے تھے اور آپ ﷺ ان میں رفو کرتے اور ان کی مرمت کرتے تھے، حالانکہ آپ نے نہ کبھی اللہ کی نافرمانی کی اور نہ حرام کھایا، بلکہ آپ کے بارے میں اس طرح کا خیال بھی حرام اور ایمان کے منافی ہے۔

معلوم ہوا کہ خضر علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں کوئی ایک بھی دلیل ایسی نہیں ہے جو عقل ونقل کی کسوٹی پر پوری اترتی ہو۔

رہی خضر علیہ السلام کی وفات تو اس کی سب سے بڑی دلیل قرآنِ پاک ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ط اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿34﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ط وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً ط وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿35﴾ ﴾ [الانبیاء: ۳۴، ۳۵]

''اور ہم نے تم سے پہلے کسی انسان کو ہمیشہ کی زندگی نہیں بخشی ہے، تو کیا اگر تم مرجانے والے ہو تو یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ ہر جان کو موت کا مزا لازماً چکھنا ہے اور ہم اچھے اور برے حالات کے ذریعہ تم لوگوں کی آزمائش کررہے ہیں۔ اور آخر کار تم ہماری ہی طرف پلٹائے جاؤ گے۔''

یہ آیات مبارکہ صراحت کررہی ہیں کہ نبی اکرم سے پہلے کے تمام انسان چاہے وہ نبی ہوں یا غیر نبی وفات پاچکے ہیں اور نبی ﷺ بھی اس دنیا سے رحلت فرمائیں گے اور جو لوگ آپ کی رسالت کا انکار کررہے ہیں وہ بھی موت کی آغوش میں جائیں گے، کیونکہ موت ہر انسان کو لازماً آئے گی۔

اب اگر کوئی اس سنت الٰہی سے مستثنیٰ ہے تو اس کے ثبوت کے لیے اللہ کی کتاب یا رسول اللہ ﷺ کے صحیح ارشادات سے واضح اور صریح دلیل چاہیے۔ جبکہ خضر علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے اور اس باب میں جتنی بھی روایات کتابوں میں ملتی ہیں وہ سب جھوٹ اور لوگوں کی اپنی گھڑی ہوئی ہیں یا اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔

سورۃ الانبیاء کی مذکورہ آیات کے عموم میں لازماً خضر علیہ السلام بھی داخل ہیں۔ کیونکہ کسی بھی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حالانکہ اگر وہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں زندہ ہوتے تو ان پر یہ فرض ہوتا کہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر اعلانیہ آپ پر ایمان لائیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا أَخَذَ عَلَيْهِ الْمِيثَاقَ لَئِنْ بُعِثَ مُحَمَّدٌ وَهُوَ حَيٌّ لَيُؤْمِنَنَّ

بِهٖ وَلَيَنْصُرُنَّهُ))

''اللہ نے جو نبی بھی مبعوث فرمایا اس سے یہ عہد لیا کہ اگر اس کی زندگی میں محمد ﷺ کی بعثت ہوگئی تو وہ آپ پر ایمان لائے گا اور آپ کی مدد کرے گا۔''

جبکہ کسی بھی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے ساتھ کفار سے جنگ کی۔ اور بدر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے فرمایا تھا:

((اللّٰهُمَّ! إِنْ تَهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةُ لَا تُعبد فِي الْأَرْضِ)) ❶

''اے اللہ! اگر یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو زمین پر تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔ تو اگر خضر بقید حیات ہوتے تو اللہ کی عبادت کی یہ نفی صحیح نہ ہوتی۔''

اوپر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا جو قول نقل ہوا ہے وہ انہوں نے سورۂ آل عمران کی آیت نمبر:۸۱ کی تفسیر میں فرمایا ہے جس میں اس عہد کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ ہر نبی سے لیتا رہا ہے کہ اگر اس کی زندگی میں کوئی دوسرا نبی مبعوث ہوگیا تو اس کو اور اس کی قوم کو اس پر ایمان لانا اور باطل کے مقابلے میں اس کا ساتھ دینا ہوگا اور آخر خاتم الانبیاء ﷺ پر ایمان لانا سب کی مشترکہ ذمہ داری ہوگی۔ اسی بات کو نبی ﷺ نے اپنی اس حدیث میں واضح فرمایا ہے جو امام احمد نے مسند میں اور امام البیہقی نے شعب الایمان میں روایت کی ہے:

((عَنْ جَابِرٍ ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ حِيْنَ أَتَاهُ عُمَرُ ، فَقَالَ: إِنَّا نَسْمَعُ أَحَادِيْثَ مِنْ يَهُوْدَ تُعْجِبنَا ، أَفَتَرَى أَنْ نَكْتُبَ بَعْضَهَا؟ فَقَالَ: أَمُتَهَوِّكُونَ أَنْتُمْ كَمَا تَهَوَّكَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى؟ لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً ، وَلَوْكَانَ مُوسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِيْ))

''جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ نبی ﷺ سے اس وقت کی بات روایت کرتے ہیں، جب عمر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ہم یہودیوں سے ایسی باتیں سنتے ہیں جو ہمیں پسند آتی ہیں، آپ کا خیال ہے کہ ہم ان میں سے بعض باتیں لکھ لیں؟ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: کیا یہود و نصاریٰ کی طرح تم بھی اپنے دین کے معاملہ میں حیرت وتذبذب

❶ فتح الباری: ۱۵٦٦/۲

میں مبتلا ہو گئے ہو، حالانکہ میں یہ شریعت نہایت صاف و شفاف شکل میں تمہارے پاس لایا ہوں اور اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔'' ❶

ان وضاحتوں سے معلوم ہوا کہ خضر علیہ السلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہی وفات پا چکے ہیں اور ان کی زندگی کا دعویٰ محض دعویٰ ہے جو اپنے پیچھے کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں رکھتا۔

حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے یا ولی؟

حضرت خضر علیہ السلام کی زندگی اور موت کی طرح ان کی نبوت اور ولایت کا مسئلہ بھی علمائے اسلام کا پسندیدہ موضوع رہا ہے اور اب تک ہے اور جن لوگوں نے سب سے زیادہ اس موضوع میں دلچسپی لی ہے ان کی اکثریت صوفیا پر مشتمل ہے۔ ان میں سے جو لوگ ان کو نبی کہتے ہیں، اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ نبی نہیں بلکہ ولی تھے یا ہیں دونوں اپنے ان دعووں کے لیے کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں رکھتے، بلکہ ان کے پاس کسی صحابی تک کا کوئی ایسا قول نہیں مل سکتا، جو قابل اعتبار ہو اور جس سے ان دونوں گروہوں میں سے کسی گروہ کے دعوے کی تائید ہوتی ہو۔ اس سلسلے میں ان کے تمام تر اقوال بلکہ دعاوی ان کے ذہنوں کی اختراع یا قرآن پاک کے بعض الفاظ سے اُن کے دوراز کار ''استنباطات'' سے عبارت ہیں۔

خضر علیہ السلام کی نبوت اور ولایت کے قائلین کے دلائل کا جائزہ لینے سے قبل یہ واضح کر دینا بیحد ضروری ہے کہ اسلام میں نبوت کا معاملہ اس کے بنیادی عقائد میں داخل ہے جن کے ماننے پر آدمی کے ایمان اور کفر کا انحصار ہے۔ ایک شخص نبی ہو اور کوئی اس کو نبی نہ مانے تو کافر اور وہ نبی نہ ہو اور کوئی اس کو نبی مان لے تو کافر۔ جبکہ خضر علیہ السلام کا حال یہ ہے کہ قرآن میں ان کا نام تک نہیں لیا گیا ہے اور پورے قرآن میں صرف ایک بار ان کا ذکر آیا ہے اور ان کو اللہ کا ایک ایسا بندہ کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتِ خاص اور علم خاص سے نوازا تھا۔

رہیں احادیث تو ان میں اگرچہ ان کے نام کا ذکر آیا ہے، لیکن ان کی کوئی ایسی صفت نہیں بیان ہوئی ہے، جو ان کے نبی ہونے پر دلالت کرتی ہو، بلکہ اس کے برعکس خود ان کی زبان سے ایسے کلمات ادا ہوئے ہیں، جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جس علم سے نوازا تھا، وہ شرعی علم نہیں تھا، اگرچہ ان کو بعض شرعی علوم حاصل رہے ہوں۔ چنانچہ جب موسیٰ علیہ السلام نے ان سے یہ درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ نے جو ''علم ہدایت'' ان کو بخشا ہے اس میں سے کچھ ان کو بھی سکھا دیں تو انہوں نے ان کو جو جواب دیا وہ صحیح

❶ بحوالہ مشکوٰۃ، ج: ۱۷۷

احادیث میں معمولی سے لفظی اختلاف کے ساتھ ان الفاظ میں نقل ہوا ہے:

((يَا مُوسَى! إِنِّيْ عَلَى عِلْمٍ مِنْ عِلْمِ اللّٰهِ عَلَّمَنِيْهِ لَا تَعْلَمُهُ أَنْتَ وَأَنْتَ عَلَى عِلْمٍ عَلَّمَكَهُ لَا أَعْلَمُهُ)) ❶

''اے موسیٰ! مجھے اللہ کے علم میں سے ایسا علم حاصل ہے، جو اس نے مجھے سکھایا ہے جسے تم نہیں جانتے اور تم کو ایسا علم حاصل ہے، جو اس نے تم کو سکھایا ہے، وہ مجھے نہیں معلوم۔''

صحیح مسلم کے الفاظ اس طرح ہیں:

((إِنَّكَ عَلَى عِلْمٍ مِنْ عِلْمِ اللّٰهِ عَلَّمَكَهُ اللّٰهُ لا أَعْلَمُهُ ، وَأَنَا عَلَى عِلْمٍ مِنْ عِلْمِ اللّٰهِ عَلَّمَنِيْهِ لَا تَعْلَمُهُ))

''تمہیں اللہ کے علم میں سے ایسا علم حاصل ہے، جسے اس نے تم کو سکھایا ہے، میں اسے نہیں جانتا اور مجھے اللہ کے علم سے ایسا علم حاصل ہے جو اس نے مجھے سکھایا ہے وہ تم کو نہیں معلوم ہے۔''

((أَمَا يَكْفِيكَ أَنَّ التَّوْرَاةَ بِيَدَيْكَ وَأَنَّ الْوَحْيَ يَأْتِيكَ يَامُوسَى! إِنَّ لِيْ عِلْمًا لَا يَنْبَغِيْ لَكَ أَنْ تَعْلَمَهُ وَإِنَّ لَكَ عِلْمًا لَا يَنْبَغِيْ لِيْ أَنْ أَعْلَمَهُ)) ❷

''کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ تورات تمہارے ہاتھوں میں ہے اور وحی تمہارے پاس آتی ہے؟ اے موسیٰ! مجھے ایسے علم حاصل ہے جس کا جاننا تمہارے لیے مناسب نہیں ہے اور تمہیں ایسا علم حاصل ہے، جس کا جاننا میرے لیے مناسب نہیں ہے۔''

صحیح مسلم میں ہے کہ خضر علیہ السلام نے کہا:

((شَيْءٌ أُمِرْتُ بِهِ أَنْ أَفْعَلَهُ إِذَا رَأَيْتَهُ لَمْ تَصْبِرْ)) ❸

''مجھے ایک ایسا کام کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس کو جب تم دیکھو گے تو صبر نہ کر سکو گے۔''

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں خضر علیہ السلام کے نام کی وجہ تسمیہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی ہے:

((إِنَّمَا سُمِّيَ الْخَضِرُ لِأَنَّهُ جَلَسَ عَلَى فَرْوَةٍ بَيْضَاءَ فَإِذَا هِيَ تَهْتَزُّ مِنْ خَلْفِهِ خَضْرَاءَ)) ❹

❶ صحیح بخاری، ح: ۱۲۲، صحیح مسلم، ح: ۶۱۶۳
❷ صحیح بخاری، ح: ۴۷۲۶
❸ ح: ۶۱۶۵
❹ صحیح بخاری، ح: ۳۴۰۲

''ان کا نام خِضر یا خَضِر اس لیے پڑا کہ ایک بار وہ خشک گھاس پر بیٹھے تو وہ گھاس سرسبز وشاداب ہو کر لہلہانے لگی۔''

صحیح احادیث میں خضر علیہ السلام کی شخصیت اور ان کے علم کے بارے میں اس سے زیادہ کوئی تفصیل نہیں ملتی۔

تو کیا اس کی بنیاد پر ان کو نبی قرار دینا صحیح ہے؟ چنانچہ ان کو نبی قرار دینے والوں کے دلائل سے کوئی بھی دلیل ایسی نہیں ہے جو قابلِ قبول ہو۔ چنانچہ خضر علیہ السلام کی نبوت کی دلیل میں کہتے ہیں کہ خضر اللہ کے رسول موسیٰ علیہ السلام کے معلم تھے اور کوئی نبی غیر نبی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کرتا۔

خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا:

﴿ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴾ [سورة الكهف : ٦٦]

''کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تا کہ آپ مجھے اس علم ہدایت میں سے کچھ سکھائیں جو آپ کو عطا کیا گیا ہے۔''

لہٰذا خضر علیہ السلام نبی تھے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کے ساتھ رہ کر ان سے تعلیم حاصل کی۔ لیکن یہ توجیہ خضر علیہ السلام کے لیے نبوت کے ثبوت میں کوئی وزن نہیں رکھتی، اس لیے کہ پہلے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ نبی صرف نبی ہی سے تعلیم حاصل کرتا ہے، جبکہ قرآن وحدیث سے ایک بھی ایسی دلیل نہیں دی جا سکتی کہ کسی نبی کا معلم کوئی بشر رہا ہے، قطعِ نظر اس کے کہ وہ نبی تھا یا غیر نبی کیونکہ نبی کا ماٴخذ علم صرف وحی ہے، چاہے یہ وحی اللہ تعالیٰ اس پر اپنے فرشتوں کے ذریعہ نازل کرتا رہا ہو یا کسی اور ذریعہ سے مثلاً خواب کے ذریعہ یا دل میں کوئی بات ڈال کر جس کو ہم الہام کہتے ہیں۔

خضر علیہ السلام کی نبوت کی دوسری دلیل سورۃ الکہف کی آیت: ﴿ ءَاتَيْنَٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا ﴾ ''ہم نے اس کو اپنی رحمت سے نوازا تھا۔'' [آیت : ٦٥] میں لفظ ''رحمت'' کو قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ لفظ قرآن پاک میں نبوت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ﴾ [الزخرف : ٣٢]

''کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں۔''

یہ صحیح ہے کہ جمہور مفسرین نے مذکورہ آیت میں لفظ ''رحمت'' سے نبوت مراد لیا ہے، لیکن یہ لفظ نبوت کا

مترادف بہر حال نہیں ہے۔ نبوت بلا شبہ رحمت ہے، لیکن ہر رحمت نبوت نہیں ہے، لہٰذا ایک مبہم لفظ سے کسی ایسے شخص کے لیے نبوت کے ثبوت کا دعویٰ کیونکر صحیح ہوسکتا ہے، جس کا ذکر اللہ کی کتاب میں صرف ایک بار آیا ہے اور وہ بھی نام کے بغیر؟

ان دو مثالوں سے یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ جو لوگ خضر علیہ السلام کی نبوت کے قائل ہیں ان کے پاس اپنے اس دعویٰ کی کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو دوٹوک ہو اور جس سے یقین کی ٹھنڈک حاصل ہوتی ہو۔

رہے وہ لوگ جن کا دعویٰ ہے کہ خضر علیہ السلام نبی نہیں، بلکہ ولی تھے، تو ان کا حال پہلے گروہ سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے اور اگر ان کے اس دعوے کے اصل محرک کو نگاہ میں رکھا جائے تو اس کی سنگینی مزید بڑھ جاتی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ خضر علیہ السلام کی ولایت کے قائلین نے ان تین اعمال سے جو خضر علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام کے سامنے انجام دیئے تھے، یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''ولی نبی سے افضل ہوتا ہے۔'' اور پھر اس نہایت سنگین دعوے کی بنیاد پر ایک دوسرا دعویٰ یہ کر ڈالا ہے کہ اولیاء اللہ کائنات میں تصرف واختیار کے مالک ہیں۔((أَلَا سَاءَ مَا يَقُولُونَ)) میں نے حضرت خضر علیہ السلام کے مسئلے میں اتنی تفصیلی بحث صرف اس لیے کی ہے تاکہ یہ واضح کرسکوں کہ انسان جب اپنے ذوق وخیال کو اپنے لیے دلیل راہ بنالیتا ہے اور کتاب وسنت کے نصوص کا مطالعہ ان کے سیاق وسباق سے دور رکھ کر کرتا ہے تو قرآنی قصوں کو افسانوں اور خیالی کہانیوں کا رنگ دے دیتا ہے، جس کی ایک جھلک آپ نے موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے قصے میں دیکھی اور جس کے بعض نمونے یوسف علیہ السلام کے قصے اور ذوالقرنین کے قصے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

درحقیقت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا قصہ بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ اسرارِ کون کے بعض مخفی گوشوں کو بے نقاب کرکے اہل ایمان کو یہ درس دیا ہے کہ اگر اس دنیا میں بعض امور ان کی مرضی اور خواہش کے خلاف وقوع پذیر ہوتے ہیں، تو ان میں ان کا مفاد ہی مضمر ہوتا ہے۔ اس قصے میں خضر علیہ السلام کی شخصیت، ان کی نبوت وولایت اور ان کی زندگی اور موت کا مسئلہ پیش نظر ہے ہی نہیں۔

اوپر کی تفصیلی بحث اور قرآن پاک اور صحیح احادیث میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے قصے سے حاصل ہونے والے نتائج مختصراً درج ذیل ہیں:

1. خضر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نیک اور صالح بندے تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتِ خاص سے نوازا تھا اور ان کو بعض تکوینی علوم سے سرفراز فرمایا تھا۔ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ تین اعمال انجام دیئے، جن کا ذکر قرآنِ پاک اور صحیح احادیث میں آیا ہے؛ یعنی ایک کشتی کو غاصبوں سے بچانے کے

لیے عیب دار کر دینا، ایک نابالغ لڑکے کو اس اندیشے میں قتل کر دینا کہ بڑا ہو کر وہ کافر ہوگا۔ اور بداخلاقوں کی بستی میں ایک گرتی ہوئی دیوار کو سیدھی کر دینا کہ اس کے نیچے دو نابالغ یتیم بچوں کا خزانہ مدفون تھا، جو دیوار کے گر جانے سے کھل جاتا۔

۲۔ خضر علیہ السلام نے یہ تینوں کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے انجام دیئے تھے چاہے یہ حکم ان کو بذریعہ وحی دیا گیا ہو یا بذریعہ الہام دونوں میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

۳۔ یہ تینوں اعمال شرعی نوعیت کے نہیں تھے اور نہ ان کے بیان سے کوئی شرعی حکم بیان کرنا مقصود تھا۔

۴۔ خضر علیہ السلام کو مذکورہ تینوں اعمال انجام دینے کا حکم اُسی ذریعہ سے دیا گیا ہوگا، جس ذریعہ سے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ بچے کو دریا میں ڈال دیں اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ''وحی'' سے تعبیر کیا ہے:

﴿ وَأَوْحَيْنَا إِلَى أُمِّ مُوسَى أَنْ أَرْضِعِيهِ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝٧ ﴾

[القصص: ۷]

''ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ اس کو دودھ پلا اور جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ خوف اور غم نہ کر، ہم اسے تیرے ہی پاس واپس لائیں گے اور اس کو رسولوں میں شامل کریں گے۔''

۵۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو بذریعہ وحی دیا جانے والا یہ حکم شرعی حکم نہیں تھا اسی طرح خضر علیہ السلام کو دیا جانے والا حکم بھی شرعی حکم نہیں تھا۔ بایں معنی کہ قیامت تک جس طرح کسی ماں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بچے کو کسی ممکنہ خطرے سے بچانے کے لیے دریا میں ڈال دے اسی طرح کسی بزرگ یا ولی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ الہام کا دعویٰ کر کے کسی کی املاک کو تباہ یا خراب کرے اور کسی بے قصور انسان کو ہلاک کرے۔

۶۔ حضرت خضر علیہ السلام اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے بعد جو اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کی تھی ٹھیک اسی طرح وفات پا گئے جس طرح آدم علیہ السلام اور ان کے بعد پیدا ہونے والے تمام انبیاء، اولیاء حتی کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے کیونکہ موت اور فنا لازمہ بشریت ہے۔

۷۔ اگر خضر علیہ السلام اس سنت الٰہی سے مستثنیٰ ہوتے اور ان کو کسی خاص مقصد کے لیے زندہ رکھا گیا ہوتا تو

کتاب وسنت میں اس کو واضح طور پر بیان کر دیا جاتا جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی قرآن پاک میں اشارۃً اور احادیث میں صراحۃً بیان کر دی گئی ہے۔

۸ اگر خضر علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان پر یہ فرض ہوتا کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں علی الاعلان حاضری دیتے، آپ پر ایمان لاتے اور آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتے جبکہ کسی بھی صحیح حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کی حاضری، آپ پر ایمان لانے اور آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے کا ذکر نہیں آیا ہے۔

۹ صحابۂ کرام، اجلۂ تابعین اور ائمہ حدیث وفقہ سے بھی ان کی ملاقاتوں کا کوئی ذکر صحیح سند سے منقول نہیں ہے۔

۱۰ بعد کے ادوار میں لوگوں سے ان کی ملاقاتوں کے تذکرے اپنی کثرت کے باوجود ناقابلِ تصدیق ہیں، اس لیے نہیں کہ جن لوگوں نے ان سے اپنی ملاقاتوں کے تذکرے کیے ہیں اور کر رہے ہیں وہ سب جھوٹے ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے کہ یہ لوگ جس شخص سے اپنی ملاقاتوں کے تذکرے کر رہے ہیں اس کے بارے میں ان کو یہ کس طرح معلوم ہوا یا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خضر علیہ السلام ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی کوئی خاص پہچان بھی منقول نہیں ہے۔

۱۱ خضر علیہ السلام کے قصے کی بنیاد پر کسی صالح یا بزرگ بلکہ ولی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ الہام کا دعویٰ کرے اور اس الہام پر خود عمل کرے یا اس کے بموجب کسی شخص کو کسی کام کا حکم دے یا اس کو کسی کام سے روکے اور نہ اس شخص کو اس حکم کی تعمیل ہی جائز ہے الا یہ کہ وہ کام حدودِ شرع کے اندر ہو، کیونکہ ولی یا صالح افراد کے الہامات انبیاء علیہم السلام پر نازل ہونے والی وحی یا ان کے کیے جانے والے الہام کی طرح شرعی مأخذ نہیں ہیں۔

احیاء العلوم اور تصوف کی دوسری کتابوں میں خضر علیہ السلام کی طرف منسوب جو دعائیں یا پند ونصائح ملتے ہیں وہ صوفیا کے ذہنوں کی پیداوار ہیں اور دعا سراسر عبادت ہے اور اس کے فضائل توقیفی ہیں اس لیے صرف انہی دعاؤں کا ورد کرنا چاہیے جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں۔

خلفائے راشدین کے فضائل ومناقب

اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات میں جہاں بار بار توحید پر زور دیا گیا ہے اور شرک کی سنگینی سے خبر دار کیا گیا ہے، وہیں ان تمام رخنوں کو بند بھی کر دیا گیا ہے جن سے عقائد میں شرک کے جراثیم داخل ہوتے ہیں اور امم سابقہ کی تاریخ گواہ ہے کہ ان کی گمراہیوں کا بنیادی سبب عقیدت میں غلو تھا۔ پہلے وہ اپنے انبیاء اور اولیاء کی عقیدت میں غلو کی بیماریں میں مبتلا ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ ان کو بشریت کے دائرے سے نکال کر الوہیت کے مقام پر پہنچا دیا۔

امت مسلمہ جس کا طرۂ امتیاز عقیدۂ توحید تھا، جب اس کے افراد پر غیر اسلامی افکار وخیالات کی یلغار ہوئی تو ان کا بھی ایک بہت بڑا طبقہ اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کی بے جا اور مبالغہ آمیز عقیدت کی بیماری میں مبتلا ہو گیا اور اس عقیدت میں اس قدر بے لگام ہو گیا کہ سابقہ قوموں سے دو قدم آگے نکل گیا اور ان کی شان میں ایسے دعوے کرنے لگا جو اسلام کے توحیدی مزاج کے منافی ہیں۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو عمومی طور پر اور خلفائے راشدین کو خصوصی طور پر اُمت میں جو مقام ومرتبہ حاصل ہے، اس کے بارے میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد یہ مقدس ترین جماعت تھی جس نے نبی آخر الزمان اور خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی، آپ کی دعوت پر لبیک کہا، اپنی جان ومال سے آپ کا دفاع کیا، راہِ حق میں بے مثال قربانیاں دیں، نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی بے چون وچرا پیروی کی اور آپ کی رحلت کے بعد اپنے عقیدہ وعمل کے ذریعہ اس آخری دین اور اس کی تعلیمات کی حفاظت کی۔

صحیح احادیث میں خلفائے راشدین کے جو فضائل بیان ہوئے ہیں وہ ہمارے لیے کافی ہیں۔ اس لیے کہ جہاں ہم ان کے ذریعہ ان کے حقیقی مقام ومرتبہ کو جان سکتے ہیں وہیں ان کی عقیدت میں غلو کے مفاسد سے محفوظ بھی رہ سکتے ہیں، لیکن بدقسمتی سے ''وضاعین'' نے دین کے دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبے کو بھی محفوظ نہیں رہنے دیا اور خلفائے راشدین کے فضائل ومناقب میں بے شمار حدیثیں وضع کر کے لوگوں میں پھیلا دیں اور اُن کو وہ درجہ اور مقام دے ڈالا جو انبیاء علیہم السلام کے لیے خاص ہے، بلکہ بعض کو تو مقامِ

الوہیت پر بٹھا دیا۔

ذیل میں بعض ایسی موضوع اور منکر روایات پیش کی جائیں گی جو خلفائے راشدین کے فضائل و مناقب کے بارے میں ''سیر الصحابہ'' یا تصوف کی کتابوں میں ملتی ہیں یا لوگوں میں زبان زد ہیں۔

پہلے میں خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں بعض موضوع روایتوں کا ذکر کروں گا، پھر کچھ صحیح احادیث پیش کر کے ان کے حقیقی مقام ومرتبے کو واضح کروں گا۔ اسی طرح ترتیب وار بقیہ خلفاء کے بارے میں پہلے موضوع اور منکر روایتیں اور بعد میں صحیح احادیث کا ذکر کروں گا تاکہ ہر خلیفۂ راشد کی تصویر کے دونوں رُخ سامنے آجائیں۔

۱۵۶ ...... ((أَنْبَأَنَا أَبُوْ مَنْصُورٍ الْقَزَّازُ ، قَالَ : أَنْبَأَنَا أَبُوْ بَكْرٍ أَحْمَدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ ثَابِتٍ ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُبْنُ قَالَ أَنْبَانَا اَحْمَدَ بْنِ رِزْقٍ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوْسُفَ بْنِ حَمْدَانِ الْهَمْدَانِيُّ قال عَبْدِ بْنِ عَامِرٍ ، قَالَ : أَنْبَأَنَا عَبْدُ بْنُ حُمَيْدٍ ، قَالَ : حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ ، قَالَ : حَدَّثَنَا مُعَمَّرٌ عَنْ قَتَادَةَ ، عَنْ أَنَسٍ ، قَالَ : لَمَّا خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنَ الْغَارِ أَخَذَ أَبُوْ بَكْرٍ بِغَرْزِهِ ، فَنظَرَ النَّبِيُّ ﷺ إِلَى وَجْهِهِ ، فَقَالَ يَا اَبَابَكْرٍ ! أَلَا أُبَشِّرُكَ؟ قَالَ : بَلىٰ! فِدَاكَ أَبِيْ وَ أُمِّي قَالَ : إِنَّ اللّٰهَ يَتَجَلَّى لِلْخَلَائِقِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَامَّةً ، وَيَتَجَلَّى لَكَ يَا أَبَا بَكْرٍ خَاصَّةً))

''ہم کو ابو منصور القزاز نے خبر دی، کہا: ہم کو ابو بکر احمد بن علی بن ثابت نے خبر دی، کہا: ہم کو محمد بن احمد بن رزق نے خبر دی، کہا! ہم سے محمد بن یوسف بن حمدان الہمدانی نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن عبد بن عامر نے بیان کیا، کہا: ہم کو عبد بن حُمید نے خبر دی، کہا: ہم سے عبدالرزاق نے بیان کیا، کہا: ہم سے معمر نے قتادہ سے اور انہوں نے انس سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔ انہوں نے کہا: جب رسول اللہ ﷺ غار سے نکلے تو ابو بکر نے آپ کی رِکاب پکڑ لی۔ پس نبی ﷺ نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا اور فرمایا: اے ابو بکر! کیا میں تمھیں خوشخبری نہ دوں؟ انہوں نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان، کیوں نہیں! تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ قیامت کے دن تمام خلائق کے لیے عمومی طور پر تجلّی فرمائے گا اور اے ابو

یہ حدیث موضوع ہے۔ یہ حضرت انس، حضرت جابر، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔صرف حضرت انس سے تین طرق سے مروی ہے جن میں سے پہلی سند میں محمد بن عبد شامل ہے جس کے بارے میں حافظ ابو بکر الخطیب البغدادی کا قول ہے: روایات کا علم رکھنے والوں کے نزدیک اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اس کی سند اور متن کو محمد بن عبد نے وضع کیا ہے۔ امام الدارقطنی فرماتے ہیں: محمد بن عبد کذب بیانی اور وضع حدیث کا مرتکب تھا۔

دوسری سند کا راوی ''بنوس'' ہے جو مجہول ہے۔ اور تیسری سند میں کئی مجہول راوی شامل ہیں جن میں سے ایک نے محمد بن عبد سے اس کا سرقہ کیا ہے۔

اسی طرح حضرت جابر، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی اس حدیث کی تمام سندوں میں جھوٹے اور وضع حدیث کا ارتکاب کرنے والے راوی شامل ہیں۔

[الموضوعات: ۲/ ۴۰۔۴۶]

حافظ السیوطی نے بھی ''اللآلي المصنوعة: ۱/ ۲۶۲، ۲۶۳'' میں اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے:

((أَنْبَأَنَا سَعِيدُ بْنُ أَحْمَدَ بْنِ الْبَنَّاءِ ، قَالَ : أَنْبَأَنَا أَبُونَصرٍ مُحَمَّدُ بْنُ مُحَمَّدٍ الزَّيْنَبِيُّ ، قَالَ أَنْبَأَنَا أَبُو بَكْرٍ مُحَمَّدُ بْنُ عُمَرَ بْنِ عَلِيٍّ الْوَرَّاقُ ، قَالَ أَنْبَانَا مُحَمَّدُ بْنُ السَّرِيِّ ، وَأَنْبَأَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عُمَرَ الْآرمَوِيُّ ، قَالَ : حَدَّثَنَا أَبُوالْحُسَيْنِ بْنُ الْمَهْتَدِى قَالَ : أَنْبَأَنَا أَبُو حَنِيفَةَ عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ الصُّوفِيُّ ، قَالَ : حَدَّثَنَا جَعْفَرُ بْنُ مُحَمَّدٍ الْخُلْدِيُّ ، قَالَ : حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْقَطَّانُ ، قَالَا : حَدَّثَنَا جَعْفَرُ بْنُ مُحَمَّدٍ الطَّيَالِسِيُّ قَالَ : حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ دَاوُد الدِّمَشْقِيُّ ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ زِيَادٍ عَنْ مَيْمُوْن ، وَهُوَ ابْنُ مِهْرَانَ عَنِ الْمُسَيَّبِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ، عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ الْيَمَانِ ، قَالَ : صَلَّى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةَ الْفَجْرِ ، فَلَمَّا الْفَتَلَ مِنْ صَلَاتِه قَالَ : أَيْنَ الصِّدِّيْقُ أَبُوْ بَكْرٍ ؟ فَلَمْ يُجِبْهُ أَحَدٌ ، فَقَامَ قَائِمًا عَلَى قَدَمَيْه ، فَقَالَ : أَيْنَ الصِّدِّيْقُ أَبُوبَكْرٍ؟ فَأَجَابَهُ مِنْ آخِرِ الصُّفُوفِ بِلَبَّيْكَ بِلَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ، قَالَ : افْرِجُوْا لِأَبِىْ بَكْرٍ ، اُدْنُ مِنِّىْ يَا أَبَا بَكْرٍ ، فَدَنَا أَبُوْ بَكْرٍ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، فَقَالَ يَا أَبَا بَكْرٍ ! لَحِقْتَ مَعِي الرَّكْعَةَ الأُولَى؟ قَالَ : يَا رَسُوْلَ

اللّٰهِ! كُنْتُ مَعَكَ فِي الصَّفِّ الأَوَّلِ وَكَبَّرْتُ وَاسْتَفْتَحْتُ الحَمْدَ وَقَرَأْتُهَا ، فَوَسْوَسَ إِلَيَّ شَيْءٌ مِنَ الطُّهُورِ فَخَرَجْت إِلَى بَابِ الْمَسْجِدِ، فَإِذَا أَنَا بِهَاتِفٍ يَهْتِفُ وَيَقُولُ : وَرَائَكَ فَالْتَفَتُّ فَإِذَا بِقُدَسٍ مِنْ ذَهَبٍ مَمْلُوءٍ مَاءً أَبْيَضَ مِنَ اللَّبَنِ ، وَأَعْذَبَ مِنَ الشَّهْدِ ، وَأَلْيَنَ مِنَ الزُّبْدِ عَلَيْهِ مِنْدِيلٌ أَخْضَرَ مَكْتُوبٌ عَلَيْهِ : لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ أَبُو بَكْرٍ الصِّدِّيقُ ، فَأَخَذْتُ الْمِنْدِيلَ ، فَوَضَعْتُهُ عَلَى مَنْكِبِي ، فَتَوَضَّأْتُ لِلصَّلَاةِ وَأَسْبَغْتُ الْوُضُوءَ وَرَدَدْتُ الْمِنْدِيلَ عَلَى الْقُدَسِ فَلَحِقْتُكَ وَأَنْتَ رَاكِعٌ الرَّكْعَةَ الأُولَى ، فَتَمَّمْتُ صَلَاتِي مَعَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ أَبْشِرْ إِنَّ الَّذِي وَضَّاكَ لِلصَّلَاةِ جِبْرِيْلُ وَالَّذِي مَنْدَلَكَ مِيكَائِيلَ وَالَّذِي أَمْسَكَ رُكْبَتِي حَتَّى لَحِقْتَ الرُّكُوعَ

’’ہم کوسعید بن احمد بن البناء نے خبر دی، کہا: ہم کو ابونصر محمد بن الزینبی نے خبر دی، کہا: ہم کو ابو بکر محمد بن عمر بن علی الوراق نے خبر دی، کہا: ہم کو محمد بن السری نے خبر دی، کہا: ہم کو محمد بن عمر الارموی نے خبر دی، کہا: ہم سے ابوالحسین بن المھدی نے بیان کیا، کہا: ہم کو ابوحنیفہ علی بن الحسین الصوفی نے خبر دی، کہا: ہم سے جعفر بن محمد الخلدی نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن عبدالرحمٰن القطان نے بیان کیا، ان دونوں نے کہا: ہم سے جعفر بن محمد الطیالسی نے بیان کیا، کہا: ہم سے علی بن داؤد الدمشقی نے محمد بن زیاد سے، انہوں نے میمون سے، جو ابن مہران ہے۔ انہوں نے المسیب بن عبدالرحمٰن سے اور انہوں نے حذیفہ بن الیمان سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی اور جب آپ نماز سے فارغ ہوگئے تو فرمایا: الصدیق ابوبکر کہاں ہیں؟ اس کے جواب میں کوئی نہیں بولا تو اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے اور دوبارہ فرمایا: الصدیق ابوبکر کہاں ہیں؟ تو آخری صف سے انہوں نے لبیک لبیک یارسول اللہ کہتے ہوئے جواب دیا۔ آپ نے فرمایا: ابوبکر کے لیے راستہ دو اور فرمایا: اے ابوبکر! مجھ سے قریب آ و، تو ابوبکر نبی ﷺ سے قریب ہوگئے، آپ نے فرمایا: ابوبکر! کیا تمہیں میرے ساتھ پہلی رکعت ملی؟ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں آپ کے ساتھ پہلی صف میں تھا اور میں نے تکبیر کہی اور الحمد للہ شروع کی اور اس

کی قرأت مکمل کر لی۔ بعد میں میرے دل میں طہارت کے بارے میں وسوسہ پیدا ہو گیا اور میں مسجد کے دروازہ کی طرف چلا گیا۔ وہاں میں نے ایک پکارنے والے کو کہتے ہوئے سُنا: اپنے پیچھے دیکھو، یہ سُن کر میں نے مُڑ کر دیکھا تو سونے کی ایک بالٹی دیکھی جو ایسے پانی سے بھری ہوئی تھی جو دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ میٹھا اور مکھن سے زیادہ نرم تھا۔ بالٹی پر ایک سبز رومال رکھا تھا، جس پر **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ابو بکر الصدیق** لکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ رومال اُٹھا کر اپنے کندھے پر رکھ لیا اور خوب عمدہ طریقے سے وضو کیا اور رومال کو بالٹی پر دوبارہ رکھ دیا اور آپ کے ساتھ اس حال میں شامل ہو گیا کہ آپ پہلی رکعت کے رکوع میں تھے، اے اللہ کے رسول! اس طرح میں نے آپ کے ساتھ اپنی نماز پوری کی، یہ سُن کر نبی ﷺ نے فرمایا: خوش ہو جاؤ جس نے تمہیں وضو کرایا وہ جبریل تھے اور جس نے تمہارے لیے رومال رکھا وہ میکائیل تھے اور جس نے میرا گھٹنہ پکڑے رکھا کہ میں رکوع سے کھڑا نہ ہو سکوں یہاں تک کہ تم رکوع میں شامل ہو گئے، اسرافیل تھے۔"

یہ حدیث موضوع اور نبی اکرم ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے اس کے الفاظ اور عبارت سے وضع اور نکارت کی بو آتی ہے۔ امام ابن الجوزی نے "الموضوعات: ۱/۲۷۴" میں اور حافظ السیوطی نے "اللآلی المصنوعہ: ۱/۲۶۵" میں لکھا ہے کہ اس کو وضع کرنے والا محمد بن زیاد ہے جس کے بارے میں امام احمد فرماتے ہیں وہ جھوٹا اور خبیث حدیث وضع کرتا تھا" السعدی اور الدارقطنی نے اس کو کذاب لکھا ہے، اور بخاری، نسائی، الفلاس اور ابو حاتم الرازی نے اس کو متروک الحدیث قرار دیا ہے۔

۱۵۸ ...... ((عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ : كَانَتْ لَيْلَتِي مِنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ ، فَلَمَّا ضَمَّنِيْ وَإِيَّاهُ الْفِرَاشُ قُلْتُ : يَا رَسُوْلَ اللهِ! أَلَسْتُ أَكْرَمَ أَزْوَاجِكَ عَلَيْكَ؟ قَالَ : بَلٰى يَا عَائِشَةُ ، قُلْتُ : فَحَدِّثْنِيْ عَنْ أَبِيْ بِفَضْلِهِ ،قَالَ : حَدَّثَنِيْ جِبْرِيْلُ : أَنَّ اللهَ تَعَالَى لَمَّا خَلَقَ الْأَرْوَاحَ إِخْتَارَ رُوْحَ أَبِيْ بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ مِنْ بَيْنِ الْأَرْوَاحِ ، وَجَعَلَ تُرَابَهَا مِنَ الْجَنَّةِ وَمَاءَهَا مِنَ الْحَيَوَانِ ، وَجَعَلَ لَهُ ،قَصْرًا فِي الْجَنَّةِ مِنْ دُرَّةٍ بَيْضَاءَ مَقَاصِيْرُ هَا فِيْهَا مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ الْبَيْضَاءِ ،وَأَنَّ اللهَ تَعَالَى آلَى عَلَى نَفْسِهِ أَنْ لَا يَسْلُبَهُ حَسَنَةً وَ لَا يَسْأَلَهُ عَنْ سَيِّئَةٍ ، وَإِنِّيْ ضَمِنْتُ كَمَا ضَمِنَ اللهُ عَلَى نَفْسِهِ أَنْ لَا يَكُوْنَ لِيْ ضَجِيْعًا فِيْ حُفْرَتِيْ ، وَلَا

أَنِيسًا فِي وَحْدَتِي ، وَلَا خَلِيفَةَ عَلَى أُمَّتِي مِنْ بَعْدِي إِلَّا أَبُوكِ يَا عَائِشَةُ ، بَايَعَ عَلَى ذَلِكَ جِبْرِيلُ وَمِيكَائِيلُ ، وَعُقِدَتْ خِلَافَتُهُ بِرَايَةٍ بَيْضَاءَ ، وَعُقِدَلِوَاؤُهُ تَحْتَ الْعَرْشِ ، قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى لِلْمَلَائِكَةِ رَضِيتُمْ بِمَا رَضِيتُ لِعَبْدِي ، فَكَفَى بِأَبِيكِ فَخْرًا أَنْ بَايَعَ لَهُ جِبْرِيلُ وَمِيكَائِيلُ وَمَلَائِكَةُ السَّمَاءِ ، وَطَائِفَةٌ مِنَ الشَّيَاطِينِ يَسْكُنُونَ الْبَحْرِ ، فَمَنْ لَمْ يَقْبَلْ هَذَا فَلَيْسَ مِنِّي وَلَسْتُ مِنْهُ ، قَالَتْ عَائِشَةُ ، فَقَبَّلْتُ أَنْفَهُ وَمَا بَيْنَ عَيْنَيهِ وَقَالَ : حَسْبُكِ يَا عَائِشَةُ! فَمَنْ لَسْتِ بِأُمِّهِ ، فَوَاللّٰهِ مَا أَنَا بِنَبِيِّهِ ، فَمَنْ أَرَادَ أَنْ يَتَبَرَّأَ مِنَ اللّٰهِ فَلْيَتَبَرَّأْ يَا عَائِشَةُ!))

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ سے اپنی باری کی رات میں، جب میں اور وہ بستر میں اکٹھے ہوئے تو میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا میں آپ کی بیویوں میں آپ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت نہیں ہوں؟ فرمایا: عائشہ کیوں نہیں! میں نے عرض کیا: مجھے میرے باپ کے کچھ فضائل کے بارے میں بتائیے۔ فرمایا: جبریل نے مجھے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب روحیں پیدا کیں تو ان روحوں میں سے ابوبکر الصدیق کی روح کا انتخاب فرمایا، اس کی مٹی جنت سے لی اور اس کا پانی زندگی سے، اور ان کے لیے جنت میں ایک محل سفید موتیوں سے بنایا جس کے کمرے سونے اور سفید چاندی سے بنائے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ سے یہ عہد کیا کہ ان کو کسی نیکی سے محروم نہیں کرے گا اور کسی برائی کے بارے میں ان سے سوال نہیں کرے گا اور میں نے یہ ضمانت لی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ سے یہ ضمانت لی کہ میری قبر میں میرا ساتھی، میری تنہائی میں میرا انیس وہم نشین اور میرے بعد میری اُمت پر میرا جانشین تیرے باپ کے علاوہ کوئی اور نہ ہوگا۔ اس پر جبریل اور میکائیل نے بیعت کیا اور ان کی خلافت کا عہد سفید پرچم کے ذریعہ لیا گیا اور ان کا علم عرش کے نیچے گاڑا گیا ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم سب اس چیز پر راضی ہوئے جس پر میں اپنے بندے کے لیے راضی ہوا۔ تمہارے باپ کے فخر کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ ان کی خلافت کے لیے جبریل، میکائیل آسمان کے فرشتوں اور سمندر میں بسنے والے شیطانوں کی ایک جماعت نے بیعت کی ۔ لہٰذا جو شخص ان کے اس حق کو نہ مانے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور میرا اس سے کوئی تعلق

نہیں۔حضرت عائشہ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کی ناک اور دونوں آنکھوں کے درمیانی حصے پر بوسہ دیا، آپ نے فرمایا: عائشہ! تمہارے لیے یہ کافی ہے۔پس جس کی تم ماں نہیں ہو، اللہ کی قسم! میں اس کا نبی نہیں، اور جو یہ چاہتا ہے کہ وہ اللہ سے اپنا تعلق منطقع کرلے،

یہ ایک موضوع اور من گھڑت روایت ہے، جس کی تخریج حافظ الخطیب البغدادی " تاریخ بغداد: ۱۴/ ۳۵، ۳۶" میں اس کے راوی ہارون بن احمد القطان کے ترجمہ کے ضمن میں کی ہے، اور امام الذہبی نے " میزان الاعتدال : ۲۸۲/۴، ترجمہ: ۹۱۴۹ " میں اس ہارون بن احمد القطان کے بارے میں لکھا ہے:"اس نے ایک باطل حدیث روایت کی ہے، گویا اس بیچارے کی حدیثوں میں یہ حدیث اس طرح داخل کردی گئی کہ اس کو اس کا احساس نہیں ہوا۔" امام الذہبی نے لکھا ہے:"اس حدیث کی ایک اور سند بھی ہے مگر وہ بھی باطل ہے اور یہ روایت نہایت گندے جھوٹ کی مثال ہے۔"

امام ابن الجوزی نے یہ موضوع حدیث تاریخ بغداد سے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

"یہ حدیث ہارون بن احمد القطان پر اس کی غفلت اور عدم احتیاط کے نتیجے میں داخل کردی گئی، بہت سے ایسے دیندار ہیں جن پر غفلت طاری رہتی ہے۔" [الموضوعات: ۲/ ۵۰]

امام الشوکانی نے بھی "الفوائد المجموعة ، حدیث: ۳۳۱ " میں اس کو موضوع قرار دیا ہے۔

اس جھوٹی روایت کی سند سے قطع نظر اس کے متن اور اسلوب بیان خود اس کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔صحیح احادیث میں نبی اکرم ﷺ کے حسن بیان اور آپ کے منفرد طرز بیان کے جو دل موہ لینے والے نمونے ملتے ہیں کہاں وہ اور کہاں اس روایت کی رکیک اور متبذل زبان اور طرز ادا؟

۱۵۹ ......((عَنِ ابْنِ عُمَرَ ، قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : لَمَّا وُلِدَ أَبُو بَكْرٍ الصِّدِّيْقُ أَقْبَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ عَلَى جَنَّةِ عَدْنٍ ، فَقَالَ : وَعِزَّتِیْ وَجَلَالِیْ لَا دَخَلَكَ إِلَّا مَنْ يُحِبُّ هٰذَا الْمَوْلُوْدَ يَعْنِیْ أَبَابَكْرٍ))

"ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب ابو بکر الصدیق پیدا ہوئے تو اللہ عزوجل جنت عدن، ہمیشہ رہنے والے جنت، کی طرف متوجہ ہوا اور فرمایا: میری عزت وجلال کی قسم! تیرے اندر صرف وہی داخل ہوگا جو اس بچے یعنی ابو بکر سے محبت کرے

یہ روایت باطل ہے اس کی تخریج حافظ الخطیب البغدادی نے ''تاریخ بغداد: ۳/۳۰۹'' میں اس کے راوی محمد بن محفوظ الحربی کے ترجمہ کے ضمن میں کی ہے، اور لکھا ہے کہ اس کی سند میں محمد بن محفوظ کے علاوہ احمد بن محمد الہروی اور دوسرے مجہول راوی شامل ہیں، اور یہ حدیث باطل ہے۔

ابوالحسن علی بن محمد العراق ''تنزیہہ الشریعہ: ۱/۳۴۳، ۳۴۴'' میں لکھتے ہیں: یہ حدیث ابن عمر سے احمد بن محمد الہروی کے طریق سے بھی مروی ہے، مگر اس میں مجہول راوی شامل ہیں۔ احمد بن عصمہ نے اس حدیث کی روایت میں احمد بن محمد الہروی کی متابعت کی ہے اور اس سے محمد بن السری التمار اور میسرہ بن عبداللہ الخادم نے یہ حدیث روایت کی ہے، لیکن یہ دونوں ضعیف اور نا قابلِ اعتبار ہیں۔ الذہبی نے ''المیزان'' میں اور حافظ ابن حجر نے ''لسان المیزان'' میں ''احمد بن عصمہ النیسا پوری عن اسحاق بن راہویہ'' کے بارے میں لکھا ہے کہ اس پر ''وضع'' کا الزام ہے اور وہ قابلِ ہلاکت ہے اس نے موضوع حدیث روایت کی ہے جس کو اسی نے وضع کیا ہے۔

حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں اور بھی موضوع اور باطل روایات ملتی ہیں اور ان سب کا انداز یہی ہے۔

اب میں خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب کے بارے میں چند صحیح احادیث کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں تاکہ جہاں ان کے صحیح مقام ومرتبہ کا اندازہ ہو جائے وہیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ فضائل ومناقب کے بیان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازِ بیان کیا تھا۔

((عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ ، قَالَ : خَطَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ النَّاسَ ، وَقَالَ : إِنَّ اللّٰهَ خَيَّرَ عَبْدًا بَيْنَ الدُّنْيَا وَبَيْنَ مَا عِنْدَهُ ، فَاخْتَارَ ذٰلِكَ الْعَبْدُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ ، قَالَ : فَبَكٰى أَبُوْ بَكْرٍ فَعَجِبْنَا لِبُكَائِهِ : أَنَّ يُخْبِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ عَبْدٍ خُيِّرَ ، فَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هُوَ الْمُخَيَّرُ ، وَكَانَ أَبُوْبَكْرٍ أَعْلَمَنَا ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ مِنْ أَمَنِّ النَّاسِ عَلَيَّ فِيْ صُحْبَتِهِ وَمَالِهِ أَبَا بَكْرٍ ، وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا غَيْرَ رَبِّيْ لَا تَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ ، وَلٰكِنَّ أُخُوَّةُ الْإِسْلَامِ وَمَوَدَّتُهُ ، لَا يُبْقَيَنَّ فِي الْمَسْجِدِ بَابٌ إِلَّا سُدَّ إِلَّا بَابَ أَبِيْ بَكْرٍ)) [1]

''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو خطبہ دیا اور

[1] صحیح بخاری، حدیث: ٣٦٥٤۔ صحیح مسلم: ٦١٧٠

فرمایا: بیشک اللہ نے ایک بندے کو دنیا اور اپنے پاس موجود خیر و بھلائی کے درمیان اختیار دیا ہے کہ ان میں سے جو چاہے لے لے تو اس بندے نے اس کو اختیار کر لیا جو اللہ کے پاس ہے' ابوسعید خدری کہتے ہیں: یہ سُن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رونے لگے، تو ہم کو ان کے اس رونے پر تعجب ہوا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایک ایسے بندے کے بارے میں خبر دی ہے جس کو اختیار دیا گیا ہے، لیکن معلوم ہوا کہ جس بندے کو اختیار دیا گیا تھا وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تھی اور ابوبکر ہم میں سب سے زیادہ صاحب علم تھے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک میرے اوپر لوگوں میں اپنی رفاقت اور مال میں سب سے زیادہ احسان ابوبکر کا ہے اور اگر میں اپنے رب کے سوا کسی اور کو دوست بناتا تو ابوبکر کو بناتا، لیکن ان کے ساتھ اسلامی اخوت و محبت کا تعلق ہے، مسجد میں ہر دروازہ بند کر دیا جائے سوائے ابوبکر کے دروازے کے۔''

((عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ ، عَنْ أَبِيهِ ، أَنَّ امْرَأَةً سَأَلَتْ رَسُولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم شَيْئًا ، فَأَمَرَهَا أَنْ تَرْجِعَ إِلَيْهِ فَقَالَتْ : يَا رَسُولَ اللهِ أَرَأَيْتَ إِنْ جِئْتُ فَلَمْ أَجِدْكَ قَالَ أَبِي : كَأَنَّهَا تَعْنِي الموتَ ، قَالَ : فَإِنْ لَمْ تَجِدِينِي فَأْتِي أَبَا بَكْرٍ)) [1]

''محمد بن جبیر بن مطعم سے روایت ہے، وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی چیز کا سوال کیا تو آپ نے اس کو حکم دیا کہ وہ آپ کی خدمت میں دوبارہ آئے، تو اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کا کیا خیال ہے، اگر میں آؤں اور آپ کو نہ پاؤں۔ محمد بن جبیر کہتے ہیں: میرے والد نے بتایا۔ گویا اس کی مراد آپ کی وفات سے تھی۔ آپ نے فرمایا: اگر مجھے نہ پاتا تو ابوبکر کے پاس آجانا۔'' [2]

یہ حدیث حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر بصراحت دلالت کرتی ہے۔

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم : مَنْ أَصْبَحَ مِنْكُمْ صَائِمًا ؟" قَالَ أَبُو بَكْرٍ ، أَنَا ، قَالَ : فَمَنِ اتَّبَعَ مِنْكُمُ الْيَوْمَ جِنَازَةً؟ قَالَ بَكْرٍ ،: أَنَا قَالَ : فَمَنْ أَطْعَمَ مِنْكُمُ الْيَوْمَ مِسْكِينًا؟ " قَالَ أَبُو بَكْرٍ: أَنَا

[1] صحيح بخاری، حدیث : ۷۳٦٠۔ صحيح مسلم ، حديث : ٦١٧٩

فَمَنْ عَادَ مِنْكُمُ الْيَوْمَ مَرِيضاً؟ قَالَ أَبُو بَكْرٍ أَنَا ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: مَا اجْتَمَعْنَ فِيْ امْرِئٍ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ)) [1]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہا: رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: آج تم میں سے کون روزے سے ہے؟ ابوبکر نے جواب دیا: میں، رسول اللہ ﷺ نے پھر پوچھا: آج تم میں سے کس نے جنازے کا ساتھ دیا؟ ابوبکر نے کہا: میں نے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج تم میں سے کس نے کسی مسکین کو کھانا کھلایا؟ ابوبکر نے عرض کیا: میں نے۔ نبی ﷺ نے پھر دریافت فرمایا: آج تم میں سے کس نے کسی مریض کی عیادت کی؟ ابوبکر نے جواب دیا: میں نے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس انسان کے اندر یہ خصلتیں جمع ہو جائیں وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

اوپر حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل میں جو موضوع حدیثیں بیان کی گئی ہیں ان کے اور ان صحیح حدیثوں کے مابین موازنہ کر کے دیکھئے تو آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے ادا ہونے والی حدیثوں میں ایک خاص مہک ہوتی ہے جو ان کو موضوع اور منکر روایتوں سے ممیز کر دیتی ہے لیکن اس کے لیے خاص ذوق کی ضرورت ہے۔

خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے فضائل:

۱۶۰ ...... ((عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: أَوَّلُ مَنْ يُعْطَى كِتَابَهُ بِيَمِيْنِهِ مِنْ هَذِهِ الأُمَّةِ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ ، وَلَهُ شُعَاعٌ كَشُعَاعِ الشَّمْسِ ، قِيلَ: فَأَيْنَ أَبُوبَكْرٍ الصِّدِّيقِ؟ قَالَ: تَزِفُّهُ الْمَلَائِكَةُ إِلَى الْجِنَانِ))

''زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس امت میں جس کے داہنے ہاتھ میں سب سے پہلے نامۂ اعمال دیا جائے گا وہ عمر بن خطاب ہوں گے اور اُن سے سورج کی کرنوں کی طرح روشنی پھوٹ رہی ہوگی۔ عرض کیا گیا: ابوبکر کہاں ہوں گے؟ فرمایا: فرشتے ان کو جنت کی خوشخبری دے رہے ہوں گے۔''

یہ حدیث موضوع ہے اس کی تخریج حافظ الخطیب البغدادی نے " تاریخ بغداد: ۲۰۲/۱۱ " میں، عمر بن ابراہیم کے ترجمہ کے ضمن میں اس سند سے کی ہے:

[1] صحیح مسلم، حدیث: ۶۱۸۲

''ہم کو عبدالرحمٰن بن محمد نے خبر دی، کہا: ہم کو احمد بن علی نے خبر دی، کہا: ہم کو محمد بن احمد بن رزق نے خبر دی، کہا: ہم کو عثمان بن احمد الدقاق نے خبر دی، کہا: ہم سے اسحاق بن سُنین الختلی نے بیان کیا، کہا: ہم سے عمر بن ابراہیم بن خالد نے بیان کیا، کہا: ہم سے مرحوم بن ارطبان نے بیان کیا، کہا: ہم سے عاصم الأحول نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔''

امام ابن الجوزی نے یہ حدیث ''تاریخ بغداد'' سے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''یہ صحیح نہیں ہے، اس کو وضع کرنے کا الزام عمر بن ابراہیم پر ہے جو ''الکردی'' کے لقب سے معروف تھا۔ دارقطنی کہتے ہیں: کذاب تھا اور حدیثیں وضع کرتا تھا۔''

حافظ الخطیب البغدادی نے اس کے بارے میں لکھا ہے: ''وہ ثقہ نہیں تھا، بلکہ ثقہ راویوں حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔''

حافظ السیوطی نے ''اللآلی المصنوعہ: ۱/۲۷۶'' میں اور ابوالحسن علی بن محمد بن العراق نے ''تنزیه الشریعة: ۱/۳۴۶'' میں اس حدیث کے موضوع ہونے میں امام ابن الجوزی سے اتفاق کیا ہے۔

۱۶۱...... ((عَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ : اَتَانِیُ جِبْرِيْلُ ، فَقُلْتُ: يَا جِبْرِيْلُ! حَدِّثْنِیُ بِفَضَائِلِ عُمَرَ فِیُ السَّمَاءِ ، فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ لَوحَدَّثْتُكَ بِفَضَائِلِ عُمَرَ فِیُ السَّمَا مِثْلَ مَا لَبِثَ نُوحٌ فِیُ قَوْمِهٖ أَلْفَ سَنَةٍ خَمْسِيْنَ عَامًا مَانَفِدَتْ فَضَائِلُ عُمَرَ ، وَإِنَّ عُمَرَ حَسَنَةٌ مِنْ حَسَنَاتِ بَكْرٍ))

''حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس ابھی جبریل آئے تھے تو میں نے کہا: جبریل ذرا آسمان میں عمر کے فضائل کے بارے میں کچھ بتاؤ، تو انہوں نے کہا: اے محمد! اگر میں آسمان میں موجود عمر کے فضائل آپ سے، اپنی قوم میں نوح کی مدتِ قیام، یعنی ساڑھے نو سو سال ۹۵۰ تک بیان کرتا رہوں، تب بھی ختم نہ ہوں، عمر درحقیقت ابوبکر کی نیکیوں میں سے ایک نیکی ہیں۔''

یہ حدیث باطل اور موضوع ہے، اس کی تخریج امام ابن الجوزی نے " الموضوعات: ۲/ ۶۶ " میں اس سند سے کی ہے:

" ہم کو علی بن عبید اللہ نے خبر دی، کہا: ہم کو علی بن احمد البند ار نے خبر دی، کہا: ہم کو ابو عبد اللہ بن بطہ نے خبر دی، کہا: ہم سے ابو علی اسماعیل بن محمد الصفّار نے بیان کیا، کہا: ہم سے الحسن بن عرفہ نے بیان کیا، کہا: مجھ سے الولید بن الفضل العنزی نے بیان کیا، کہا: مجھ سے اسماعیل بن عبید اللہ بن نافع البصری نے حماد بن ابی سلیمان سے، انہوں نے ابراہیم النخعی سے، انہوں نے علقمہ سے اور انہوں نے عمار بن یاسر سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......"

امام ابن الجوزی نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ میں اسماعیل کو نہیں جانتا، حافظ ابن حجر نے " لسان المیزان: ۱/ ۴۲۰، ترجمہ: ۱۳۱۱ " میں اس کو باطل لکھا ہے۔ حافظ السیوطی نے بھی " اللآلی المصنوعہ: ۱/ ۲۷۷ " میں امام ابن الجوزی کے قول سے اتفاق کرتے ہوئے، حدیث کے راوی اسماعیل بن عبید کے بارے میں امام ابن حبان کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ " وہ ایسی منکر حدیثیں روایت کیا کرتا تھا، جن کے موضوع ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

امام الشوکانی نے بھی " الفوائد: ۳۳۷ " میں اس کو موضوع لکھا ہے۔

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ ، قَالَ: تَفَاخَرَتِ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ ، قَالَتِ النَّارُ لِلْجَنَّةِ: أَنَا أَعْظَمُ مِنْكِ قَدْرًا ، قَالَتْ : وَلِمَ؟ قَالَتْ: لِأَنَّ فِيَّ الْفَرَاعِنَةَ وَالْجَبَابِرَةَ وَالْمُلُوكَ وَأَبْنَاؤُهَا ، فَأَوْحَى اللهُ إِلَى الْجَنَّةِ: قُولِي : بَلْ لِيَ الْفَضْلُ ، إِذْ زَيَّنَنِيَ اللهُ بِأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ))

" حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جنت اور جہنم نے ایک دوسرے پر اپنی بڑائی جتائی؛ جہنم نے جنت سے کہا: میں تم سے بڑے مقام ومرتبے کی مالک ہوں، کیونکہ میرے اندر فراعنہ، اہل جبروت اور بادشاہ اور ان کے بیٹے ہیں! اس پر اللہ عز وجل نے جنت کو وحی فرمائی کہ تو جواب دے کہ " مجھے تیرے اوپر فضیلت حاصل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ابوبکر اور عمر کے ذریعہ زینت بخشی ہے۔"

یہ حدیث موضوع اور نبی اکرم ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے۔ حافظ السیوطی نے " اللآلی

المصنوعة: ۱/۲۷۹، ۲۸۰ " میں اس کو اس سند سے نقل کیا ہے:

''ہم کو محمد بن عبدالباقی بن احمد نے خبر دی، کہا: ہم کو ابو محمد الحسن بن عبدالملک بن محمد بن یوسف نے خبر دی، کہا: ہم کو ابو محمد الحسن بن محمد الخلال نے خبر دی، کہا: ہم سے علی بن الحسن الانصاری نے بیان کیا، کہا: ہم سے قہدی بن الھلال الراسبی نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابان بن ابی عیاش نے ،الحسن سے، اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا......''

اس سند سے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد حافظ السیوطی نے لکھا ہے: ''یہ موضوع ہے۔ ابان متروک اور قہدی کذاب اور وضع حدیث کا مجرم ہے۔''

ابوالحسن علی بن عراق الکنانی نے بھی " تنزیه الشریعة: ۱/۳۴۶ " میں اس کو موضوع لکھا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ: ''حضرت ابو ہریرہ سے الحسن البصری کا سماع بھی ثابت نہیں ہے۔''

امام ابن الجوزی لکھتے ہیں:

''ابان متروک تھا۔ امام شعبہ نے اس کی جرح میں بڑے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ رہا مہدی بن الہلال الراسبی تو یحییٰ بن سعید نے اس کو کذاب قرار دیا ہے اور یحییٰ بن معین نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کذب بیانی اور وضع حدیث میں معروف لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ امام نسائی اور دارقطنی نے بھی اس کو متروک قرار دیا ہے۔'' [الموضوعات: ۲/۶۹]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس طرح کی دسیوں موضوع اور جھوٹی روایتیں لوگوں میں زبان زد ہیں، حالانکہ ان کے فضائل میں صحیح احادیث کی کمی نہیں ہے، جو صحیحین اور سنن اربعہ میں موجود ہیں۔ ذیل میں چند احادیث پیش کر کے ان کی عظیم شخصیت کے تابناک پہلو کی ایک جھلک دکھانا چاہتا ہوں۔

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم لَقَدْ كَانَ فِيمَا قَبْلَكُمْ مِنَ الْأُمَمِ مُحَدَّثُونَ ، فَإِنْ يَكُ مِنْ أُمَّتِي مِنْهُمْ أَحَدٌ فَعُمَرُ)) [1]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے سابقہ قوموں میں صاحب الہام یا صحیح گمان رکھنے والے لوگ ہوا کرتے تھے، پس اگر میری امت میں ان میں سے کوئی ہے تو وہ عمر ہیں۔''

صحیح مسلم میں " ح: ۶۲۰۴ " حدیث یہ معمولی سے لفظی اختلاف کے ساتھ اُم المؤمنین حضرت

[1] صحیح بخاری، ح: ۳۶۸۹

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر امت میں انبیاء کرام کے علاوہ کچھ ایسے افراد پیدا کرتا رہا ہے جو حق گو ہوتے تھے اور جو حقیقت کی تہہ تک رسائی حاصل کرنے کی غیر معمولی صلاحیت اور خداداد ملکہ رکھتے تھے اور امت مسلمہ میں اس صفت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ متصف تھے۔ اسی بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسری حدیث میں جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، ان الفاظ

((إِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلَى لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِهِ)) [1]

''بیشک اللہ نے ''حق'' کو عمر کی زبان اور دل پر ثابت کر دیا ہے۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو کچھ فرماتے تھے، حق فرماتے اور ان کے دل میں جو خیال پیدا ہوتا وہ بھی حق ہوتا تھا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جب بھی لوگوں کو کوئی معاملہ درپیش ہوتا اور لوگ اس کے بارے میں اپنی رائے پیش کرتے اور حضرت عمر بھی اپنی رائے پیش کرتے تو قرآن میں عمر کی رائے کے مطابق آیت نازل ہوتی۔''

((عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ رضی اللہ عنہ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ مَا لَقِيَكَ الشَّيْطَانُ قَطُّ سَالِكًا فَجًّا إِلَّا سَلَكَ فَجًّا غَيْرَ فَجِّكَ)) [2]

''حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے...... عمر!...... جب کسی راستے میں چلتے ہوئے شیطان کی تم سے مڈ بھیڑ ہو جاتی ہے تو وہ تمہارے راستے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔''

امام نووی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شیطان کے راستے کو ترک کر کے صحیح اور درست راستے پر گامزن تھے اور اُس چیز کے مخالف تھے جسے شیطان پسند کرتا ہے۔ اس حدیث میں ان

[1] الترمذی، ح: ۳۶۸۲

[2] صحیح بخاری، ح: ۳۶۸۳، صحیح مسلم، ح: ۶۲۰۲

کی فضیلت اور دین کے معاملے میں ان کی سختی بیان کی گئی ہے اور ان کے راستے سے شیطان کے فرار کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ معصوم عن الخطأ تھے، کیونکہ انبیاء کے حق میں تو ''عصمت'' واجب ہے، لیکن انبیاء کے سوا دوسروں میں عصمت ممکن ہے۔'' ❶

اس مفہوم کو اس اعتراف سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جو ابلیس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ (39) إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ (40) ﴾ [الحجر: ٣٩، ٤٠]

''ابلیس بولا: اے میرے رب! بسبب اس کے کہ تو نے مجھے بہکایا، میں زمین میں ان کے لیے ...... اولادِ آدم کے لیے ...... دلفریبیاں پیدا کروں گا اور ان کو بہکاؤں گا، سوائے تیرے ان بندوں کے جنھیں تو نے ان میں سے خالص کر لیا ہے اور چن لیا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فضائل کے بارے میں ان چند صحیح حدیثوں سے اوپر مذکور موضوع روایات کی نکارت مزید واضح ہو جاتی ہے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ:

خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا شمار صحابۂ کرام کے اس مقدس گروہ میں ہوتا ہے جس کو قرآنِ پاک میں ﴿ اَلسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ ﴾ کا نام دیا گیا ہے۔ آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیقِ غار اور خلیفۂ اول حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت پر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے، نعمتِ اسلام سے سرفراز ہونے والوں میں آپ کا نمبر آٹھواں ہے۔ آغازِ ایمان سے اپنی مظلومانہ شہادت تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب ترین افراد میں شامل رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یکے بعد دو صاحبزادیوں، حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہما سے عقدِ نکاح کی وجہ سے آپ کو ''ذوالنورین'' کے عظیم اور منفرد لقب سے سرفراز ہونے کا شرف حاصل رہا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو دولتِ ایمان کے ساتھ دولتِ دنیا سے بھی نہایت وافر مقدار میں نوازا تھا، یہاں تک کہ اسلامی تاریخ میں آپ ''عثمان غنی'' کے لقب سے معروف ہوئے اور آپ کی ذات سے مسلمانوں کو مسلسل فیض حاصل ہوتا رہا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کو مکہ

❶ بحوالہ منة المنعم في شرح صحيح مسلم: ٤/ ٨٣

سے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کے سرِ فہرست شیریں پانی کا مسئلہ تھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان کے ہاتھوں اس طرح حل کر دیا کہ آپ نے مدینہ کے ایک یہودی سے شیریں پانی کا ایک کنواں منہ مانگی قیمت پر خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر جبکہ مسلمان نہایت تنگ دستی اور فقر و فاقہ میں مبتلا تھے اور جنگ کی تیاری تو درکنار انفرادی طور پر خود سفر کے اخراجات کے بندوبست کی قدرت نہیں رکھتے تھے، اور غزوے میں شرکت کی سعادت سے محرومی پر خون کے آنسو رو رہے تھے، ایسے ناگفتہ بہ حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے ذاتی مال سے مسلمانوں کے لیے ساڑھے نو سو اونٹ اور پچاس گھوڑے فراہم کیے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن مبارک میں ایک ہزار دینار اور سات سو اونس سونا لا کر ڈال دیا اور اس کے بدلے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ڈھیروں دعائیں وصول کیں۔ درحقیقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ذات سے مسلمانوں کو جو فائدے پہنچے ان کے بیان کے لیے دفتر درکار ہے، پھر بھی وہ ختم نہ ہوں گے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ان فضائل کے علاوہ ان کی ایک اور فضیلت ایسی تھی جو ان کی شناخت اور پہچان بن گئی تھی۔ اور وہ فضیلت یا صفت ''حیا اور شرم'' کی صفت تھی۔ اور اس صفت میں وہ جس بلند مقام پر فائز تھے، اس کا اندازہ اس حدیث سے لگایا جاسکتا ہے جو ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ فرماتی ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں لیٹے ہوئے تھے اور آپ کی ران یا پنڈلی کھلی ہوئی تھی اسی وقت ابوبکر الصدیق نے آپ سے اُذن باریابی چاہا تو آپ نے ایسی حالت میں ان کو اندر بلا لیا۔ پھر حضرت عمر نے اجازت چاہی تو آپ نے ان کو بھی اندر آنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور اپنی وضع نہیں بدلی، اتنے میں حضرت عثمان نے اندر آنا چاہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً گھبرا کر اپنے کپڑے درست کیے اور ان کو اندر آنے کی اجازت دی اور جب وہ چلے گئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: جب ابوبکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے کوئی خاص اہتمام نہیں فرمایا۔ پھر جب عمر آئے تو اس وقت بھی آپ نے کوئی اہمیت نہیں دی، لیکن جب عثمان آئے تو آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے درست کر لیے؟ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَلَا أَسْتَحِي مِنْ رَجُلٍ تَسْتَحِي مِنْهُ الْمَلَائِكَةُ)) [1]

''کیا میں ایسے آدمی سے شرم نہ کروں جس سے فرشتے بھی شرماتے ہیں۔''

---

[1] صحيح مسلم، ح: ٦٢٠٩

لیکن وضاعین حدیث نے دوسرے خلفائے راشدین کی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب کے بارے میں صحیح احادیث کو درخور اعتنا نہیں سمجھا، بلکہ اپنی گندی ذہنیت سے مجبور ہو کر اور امت میں فتنہ و فساد پھیلا اور ان کے عقائد کو بگاڑنے کے لیے دسیوں حدیثیں وضع کر ڈالیں، جن میں سے موضوع حدیثیں پیش کر رہا ہوں:

۱۶۳...... ((عَنْ جَابِرٍ : أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ أُتِيَ بِجَنَازَةِ رَجُلٍ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهَا ، فَقِيلَ لَهُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! مَا رَأَيْنَاكَ تَرَكْتَ الصَّلَاةَ عَلَى أَحَدٍ إِلَّا هٰذَا؟ قَالَ: إِنَّهُ كَانَ يُبْغِضُ عُثْمَانَ أَبْغَضَهُ اللّٰهُ))

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک آدمی کا جنازہ لایا گیا تو آپ نے اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی، اس پر عرض کیا گیا کہ: اے اللہ کے رسول! ہم نے اس کے علاوہ آپ کو کسی اور کی نمازِ جنازہ ترک کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: یہ عثمان سے بغض رکھتا تھا، اس لیے اللہ کے بغض کا سزاوار ہوا۔''

یہ حدیث موضوع اور رسول اللہ ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج امام ابن عدی نے '' الکامل: ۶/ ۲۱۴۳ '' میں محمد بن زیاد القرشی کے ترجمہ کے ضمن میں اور امام الترمذی نے '' سنن الترمذی، ح: ۳۷۰۹ '' میں درج ذیل سند سے کی ہے:

''ہم سے الفضل بن ابی طالب البغدادی اور ایک سے زیادہ لوگوں نے بیان کیا، کہا: ہم سے عثمان بن زفر نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن زیاد نے، محمد بن عجلان سے، انہوں نے ابوالزبیر سے اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......''

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد امام الترمذی نے لکھا ہے: ''یہ حدیث ضعیف ہے، جس کو ہم صرف اسی سند سے جانتے ہیں اور محمد بن زیاد بیحد ضعیف ہے۔'' اور امام ابن عدی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ: ''وہ غیر معروف ہے اور میں نے اس کے بارے میں قدیم علمائے حدیث کا کوئی قول نہیں دیکھا ہے۔ اور وہ صرف اسی ایک حدیث کی روایت سے معروف ہے۔'' امام الذہبی نے '' میزان الاعتدال: ۳/ ۵۵۲، ترجمہ: ۷۵۴۷ '' میں لکھا ہے کہ: ''اس نے ابن عجلان سے حدیث روایت کی ہے، غیر معروف ہے اور موضوع خبر لایا ہے۔ میرے نزدیک وہ الیشکری الطحان المیمونی ہے۔'' امام الشوکانی نے '' الفوائد، ص: ۳۴۰ '' میں امام الذہبی کے اس قول کی توثیق کی ہے۔ محدث محمد ناصر الدین البانی نے بھی اس حدیث

کو موضوع قرار دیا ہے۔ [الضعیفه: ٤ / ٤٨]

یہ موضوع حدیث اسی محمد بن زیاد سے ایک دوسری سند سے، کچھ مختلف الفاظ میں مروی ہے۔ جس میں صاحب جنازہ کو انصاری کہا گیا ہے۔

دور فتنہ کے بعد بعض صحابۂ کرام میں اختلافات کے واقعات تو ملتے ہیں، لیکن نبی اکرم ﷺ کی حیات پاک میں کسی انصاری کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی اور یکے از عشرۂ مبشرہ سے بغض رکھنا بعید از تصور ہے۔

١٦٤ ...... ((عَنْ أَنَسٍ ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ لِلّٰهِ سَيْفًا مَغْمُوذًا فِيْ غِمْدِهِ مَادَامَ عُثْمَانُ حَيًّا فَإِذَا قُتِلَ جُرِّدَ ذَلِكَ السَّيْفُ فَلَمْ يُغْمَدْ إِذًا يَوْمِ الْقِيَامَةِ))

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: بیشک اللہ تعالیٰ کی تلوار اس وقت تک میان میں تھی، جب تک عثمان ...... رضی اللہ عنہ ...... زندہ تھے، لیکن جب وہ قتل کردیے گئے تو وہ تلوار میان سے باہر نکال لی گئی اور قیامت تک میان میں نہیں ڈالی جائے گی۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی تخریج امام ابن عدی نے '' الکامل: ۵/ ۱۷۹۷ '' عمرو بن فائد الاسواری کے ترجمہ کے ضمن میں کی ہے۔ اور لکھا ہے: ''ان الفاظ اور اس متن سے یہ حدیث میں عمرو بن فائد ہی کے واسطہ سے جانتا ہوں اور عمرو بن فائد کی اس کے علاوہ بھی مرویات ہیں، جو منکر ہیں۔''

یہ حدیث امام ابن الجوزی نے '' الموضوعات: ۲/ ۸۴ '' میں نقل کی ہے اور لکھا ہے: ''یہ رسول اللہ ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے، اس کی سند میں عمرو بن فائد نام کا ایک راوی ہے، جس کے بارے میں ابن المدینی کا قول ہے کہ وہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا، الدارقطنی نے اس کو 'متروک' لکھا ہے اور ابن عدی کہتے ہیں: ''اس سند کا دوسرا راوی محمد بن داود کذب بیانی سے کام لیتا تھا۔''

١٦٥ ...... ((عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ ، قَالَ: وَصَفَ لَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ الْجَنَّةَ ، فَقَامَ إِلَيْهِ رَجُلٌ ، فَقَالَ : يَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَفِي الْجَنَّةِ بَرْقٌ قَالَ: نَعَمْ۔ وَالَّذِي نَفْسِيْ بِيَدِهِ ، إِنَّ عُثْمَانَ لَيَتَحَوَّلُ مِنْ مَنْزِلٍ إِلَى مَنْزِلٍ ، فَتَبَرَّقُ لَهُ الْجَنَّةُ))

''حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہا: رسول اللہ ﷺ نے ایک دن جنت کا وصف بیان فرمایا، تو ایک شخص اٹھا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا جنت میں برق ہے؟ فرمایا:

ہاں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! عثمان جب ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہوں گے تو جنت سے چمک اور برق نکلے گی۔''

یہ حدیث بھی باطل ہے امام ابن الجوزی نے یہ حدیث '' الموضوعات :۲/ ۸۵ '' میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: '' یہ حدیث موضوع ہے۔ جس کا مجرم الحسین بن عبداللہ ہے۔'' امام الدارقطنی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ: '' وہ حدیث وضع کرتا تھا۔'' حافظ السیوطی نے بھی '' اللآلی المصنوعة: ۱/ ۲۹۰ '' میں اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔ اس حدیث کی نکارت خود اس کے الفاظ سے ظاہر ہے۔

آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ فضائل اعمال کی کتابوں میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ وتر کی ایک رکعت میں پورے قرآنِ پاک کی تلاوت کیا کرتے تھے، وہ صحیح نہیں ہے۔ امام ترمذی نے '' سنن ، ح:۲۹۴۶ '' میں اس واقعہ کا ذکر '' صیغۂ تمریض '' (روایت ہے) میں کر کے اس کی عدم صحت کی جانب اشارہ کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ جہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی اور خلیفۂ راشد سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے صریح حکم کی خلاف ورزی کرتے تھے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سات دن سے کم مدت میں قرآن ختم کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ❶ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ: '' جو شخص تین دن سے کم مدت میں قرآن ختم کرے گا وہ اس کو سمجھ نہیں سکے گا۔'' ❷ وہیں ایک رکعت میں پورے قرآن کی تلاوت عملی طور پر ممکن بھی نہیں۔ اس لیے کہ اگر قرآن پاک کی تلاوت نہایت تیز رفتاری سے اور بلا توقف بھی کی جائے تو بھی قرآن ختم کرنے میں دس گھنٹے لگیں گے۔ اور کسی شخص کا مسلسل دس گھنٹے کھڑے رہنا جہاں ناممکن ہے، وہیں اس سے یہ بھی لازماً آتا ہے کہ نعوذ باللہ وہ ہر روز فجر کی نماز وقت پر نہیں، بلکہ دن نکلنے کے بعد پڑھتے تھے؟

خلیفۂ چہارم حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے فضائل:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب میں جو صحیح احادیث حدیث کی مستند کتابوں میں منقول ہیں، اگر ان کو جمع کیا جائے اور ان کی روشنی میں ان کی سیرت مرتب کی جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ دورِ صحابہ کے بعد جب امت میں فتنوں نے سر نکالا اور مسلمان سیاسی اختلافات کے شکار ہوئے اور مسلم معاشرے میں غیر اسلامی افکار ونظریات عام ہو گئے تو مسلمانوں میں ایسے فرقے پیدا ہو گئے،

❶ بخاری: ۵۰۵۲ ، مسلم : ۲۷۳۲ ❷ ترمذی: ۲۹۴۹

جو نام کے سوا اسلام سے کوئی اور تعلق نہیں رکھتے تھے اور ان کا مقصد اعلیٰ اسلامی عقائد کو کمزور کرنا اور دلوں سے ان کے اثرات کو مٹا کر ان کو الحاد و زندقہ کا شکار بنا دینا تھا، اس غرض کے لیے انہوں نے دسیوں نہیں، بلکہ ہزاروں حدیثیں وضع کر کے مسلم معاشرے میں پھیلا دیں، اس طرح اس جلیل القدر صحابی اور خلیفۂ راشد کی وہ صحیح تصویر تو صرف کتابوں کی زینت رہ گئی، جو نبی اکرم ﷺ سے ثابت صحیح احادیث میں متعین کی گئی تھی۔ رہے عامۃ الناس اور نام نہاد علماء اور مؤرخین تو ان کے حلقوں میں ایسی موضوع اور جھوٹی روایات پھیل گئیں، جس میں اسلام کے اس بطل جلیل اور خانوادۂ نبوت کے روشن چراغ کو ایک غیر معمولی اور مافوق الفطرت انسان بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ یا اس کی حیثیت اتنی گھٹا گئی ہے کہ اس کو ایک معمولی انسان تک ماننے میں تأمل ہوتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ افراط و تفریط اور ان کے بارے میں یہ دو متضاد نقطہائے نظر درحقیقت اس بات کا نتیجہ ہیں کہ ان کی شخصیت کے تعین میں اسلام کے چشمۂ صافی کتاب و سنت کے بجائے جھوٹی روایات پر اعتماد کر لیا گیا اور جہاں ان کی عقیدت میں غلو اور مبالغہ آمیزی کو ان کی صحیح قدردانی تصور کر لیا گیا، وہیں ان کی تنقیص کو مطلوبِ دین سمجھ لیا گیا۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان جو نقطۂ اعتدال موجود ہے، اس کو واضح کرنے کے لیے میں پہلے چند موضوع روایات کا ذکر کروں گا۔ اس کے بعد ان کے فضائل و مناقب کے بارے میں ایسی کچھ صحیح احادیث نقل کروں گا، جن میں ان کے صحیح مقام و مرتبہ کا تعین کیا گیا ہے۔

۱۶۶ ...... ((عَنْ حَبَّةَ بْنِ جُوَيْنٍ ، قَالَ: سَمِعْتُ عَلِيًّا عَلَيْهِ السَّلَامُ يَقُولُ: عَبَدْتُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ قَبْلَ أَنْ يَعْبُدَهُ رَجُلٌ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ خَمْسَ سِنِيْنَ أَوْ سَبْعَ سِنِيْنَ.))

''حبہ بن جوین سے روایت ہے، کہا: میں نے علی علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا، کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ، اس امت کے کسی بھی آدمی کی عبادت کے پانچ سال یا سات سال قبل اللہ عزوجل کی عبادت کی ہے۔''

یہ روایت موضوع اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام پر جھوٹ ہے۔ اس کا راوی حبہ بن جوین ایک کوڑی کے برابر بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ جھوٹا تھا۔ یحییٰ بن معین نے کہا ہے کہ اس کی روایت کردہ حدیث کا کوئی اعتبار نہیں۔ ابن حبان کہتے ہیں حبہ غالی شیعہ تھا۔ اور حدیث کے علم میں بیحد کمزور تھا۔ رہا اس کی سند کا دوسرا

راوی اجلح بن سلمہ تو اس کے بارے میں امام احمد فرماتے ہیں: اس نے ایک سے زیادہ منکر حدیثیں روایت کی ہیں۔ اور امام ابو حاتم کا قول ہے: اس کی روایت کردہ حدیث نا قابل استدلال ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں: اس کو یہ بھی پتہ نہیں رہا تھا کہ وہ کیا کہتا ہے۔" [الموضوعات: ۲/ ۹۹]

یہ روایت اپنی موضوع سند سے قطع نظر اپنے متن کے اعتبار سے بھی منکر اور خلاف واقعہ ہے، کیونکہ یہ بات تقریباً تمام اہل سیر کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے دس سال قبل پیدا ہوئے اور جب نبی اکرم ﷺ نے ان کو اپنی کفالت میں لیا۔ اس وقت ان کی عمر چار سال تھی۔ اور صحیح قول کے مطابق وہ دس سال کی عمر میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ محمد بن اسحاق نے "سیرت، ص: ۱۳۷" حسن سند سے اس کو نقل کیا ہے۔ اس وضاحت کی روشنی میں جب ان کی عمر پانچ سال، یا سات سال تھی، تو نبی اکرم ﷺ مبعوث بھی نہیں ہوئے تھے۔

اسی طرح یہ بات مسلم ہے کہ سب سے پہلے ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا مشرف بہ اسلام ہوئی تھیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کا دل اسی دن نور سے منور ہو گیا تھا، جس روز نبی اکرم ﷺ پہلی وحی نازل ہونے کے بعد سرزاں و ترساں گھر واپس پہنچے تھے اور حضرت خدیجہ سے فرمایا تھا: ((لَقَدْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي)) "خدیجہ! اپنی جان کا اندیشہ ہے۔" تو یہ سن کر صدق و وفا کی پیکر اور پہاڑ سے زیادہ مضبوط دل کی مالک خاتون نے فرمایا تھا:

((كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيكَ اللّٰهُ أَبَدًا ، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِ)) [1]

"ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں۔"

اس حدیث کی روشنی میں قرین عقل یہی ہے کہ دعوتِ دین کا حکم ملنے پر نبی ﷺ نے سب سے پہلے اپنی پاک طینت زوجہ ہی کو ایمان کی دعوت دی ہوگی، اس لیے کہ پہلی وحی نازل ہونے کے بعد بھی آپ انہی کے پاس پہنچے تھے اور انہوں نے ادنیٰ تأمل کے بغیر آپ کی دعوت قبول کر لی ہوگی، کیونکہ آپ کا دل تو پہلے ہی نبی اکرم ﷺ کی صدق بیانی کی گواہی دے چکا تھا۔

[1] صحیح بخاری بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ح: ۳، صحیح مسلم، ح: ۴۰۳

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد جو تین خوش نصیب افراد مشرف بہ اسلام ہوئے وہ متفقہ طور پر حضرت علی، حضرت زید اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہم ہیں۔ یہ سب ایک ہی دن یا ایک دو دن آگے پیچھے ایمان لائے۔ محدثین اور اہل سیر نے اختلافات سے دامن بچاتے ہوئے یہ کہہ کر اس مسئلے کا حل نکالا ہے کہ مردوں میں پہلے حضرت ابوبکر، عورتوں میں حضرت خدیجہ، بچوں میں حضرت علی اور غلاموں میں حضرت زید رضی اللہ عنہم ایمان لائے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب وہ روایت نہایت منکر اور نا قابل قبول ہے۔

۱۶۷ …… ((عَنْ أَبِیْ ذَرٍّ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : خُلِقْتُ أَنَا وَعَلِیٌّ مِنَ نُوْرٍ ، فَكُنَّا عَنْ یَمِیْنِ الْعَرْشِ قَبْلَ أَنْ یُخْلَقَ آدَمُ بِأَلْفَی عَامٍ ، ثُمَّ خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ ، فَانْقَلَبْنَا فِی أَصْلَابِ الرِّجَالِ ، ثُمَّ جُعِلْنَا فِیْ صُلْبِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ ، ثُمَّ شُقَّ أَسْمَاؤُنَا مِنِ اسْمِهِ فَاِسْمُ اللّٰهِ مَحْمُوْدٌ وَأَنَا مُحَمَّدٌ وَاللّٰهُ الأَعْلَی وَعَلِیٌّ عَلِیٌّ))

”حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں اور علی دونوں نور سے پیدا کیے گئے ہیں، ہم دونوں عرش کے داہنے جانب آدم کی خلقت سے دو ہزار سال قبل موجود تھے، پھر اللہ نے آدم کو پیدا کیا تو ہم دونوں مردوں کے صلبوں میں منتقل ہوگئے، پھر ہم کو عبدالمطلب کی پیٹھ میں رکھ دیا گیا، پھر ہمارے نام اللہ کے نام سے نکالے گئے، پس اللہ کا نام محمود ہے اور میں محمد ہوں اور اللہ الاعلیٰ اور علی علی ہیں۔“

یہ حدیث موضوع ہے، اس کی تخریج امام ابن الجوزی نے ”الموضوعات: ۲/۲۹۵“ میں، حافظ السیوطی نے ”اللآلي المصنوعة: ۱/۲۹۴“ میں، ابن عراق نے ”تنزيه الشريعة: ۱/۳۵۱“ میں اور الشوکانی نے ”الفوائد الموضوعة، ص: ۳۴۲“ میں جعفر بن احمد بن علی بن بیان کے طریق سے کی ہے۔ اور جعفر بن احمد بن بیان تمام ائمہ حدیث کے نزدیک رافضی تھا اور حدیثیں وضع کرتا تھا۔

۱۶۸ …… ((عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَیْسٍ ، أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ صَلَّی الظُّهْرَ بِالصَّهْبَاءِ ثُمَّ أَرْسَلَ عَلِیًّا علیہ السلام فِیْ حَاجَةٍ ، فَرَجَعَ ، وَقَدْ صَلَّی النَّبِیُّ ﷺ الْعَصْرَ ، فَوَضَعَ النَّبِیُّ ﷺ رَأْسَهُ فِیْ حِجْرِ عَلِیٍّ فَنَامَ ، فَلَمْ یُحَرِّكْهُ حَتّٰی غَابَتِ الشَّمْسُ

فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: اَللّٰهُمَّ إِنَّ عَبْدَكَ عَلِيًّا إِحْتَبَسَ نَفْسَهُ عَلَى نَبِيِّكَ ، فَرُدَّ عَلَيْهِ شَرْقَهَا وَفِيْ رِوَايَةٍ: اَللّٰهُمَّ إِنَّهُ كَانَ فِيْ طَاعَتِكَ وَطَاعَتِ رَسُولِكَ فَارْدُدْ عَلَيْهِ الشَّمْسَ ، قَالَتْ أَسْمَاءُ: فَرَأَيْتُهَا غَرَبَتْ ثُمَّ رَأَيْتُهَا طَلَعَتْ بَعْدَ مَا غَرَبَتْ))

''حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے الصہباء میں ظہر کی نماز پڑھی، پھر علی علیہ السلام کو کسی کام سے کہیں بھیجا۔ اور جب وہ واپس آئے تو نبی ﷺ نے عصر کی نماز پڑھ لی تھی، پس نبی ﷺ نے اپنا سر مبارک علی کی گود میں رکھا اور سو گئے اور علی نے اس کو کوئی حرکت دینے سے احتراز کیا۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ اور نبی ﷺ نے بیدار ہونے پر فرمایا: اے اللہ! تیرے بندے علی نے تیرے نبی کی خدمت میں اپنے آپ کو روکے رکھا، تو تو سورج کو دوبارہ طلوع کر دے۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے: اے اللہ! وہ تیری اطاعت اور تیرے نبی کی اطاعت میں مصروف تھا، پس تو سورج کو واپس لے آ۔ اسماء کہتی ہیں: میں نے سورج کو غروب ہوتے بھی دیکھا تھا، پھر اس کو دیکھا کہ غروب ہونے کے بعد دوبارہ طلوع ہو گیا۔''

یہ حدیث موضوع ہے، اس کی تخریج امام طحاوی نے ''مشکل الآثار: ۲/۹'' اس سند سے کی ہے:

''احمد بن صالح نے کہا: ہم سے ابن ابی فُدیک نے بیان کیا، کہا: مجھ سے محمد بن موسیٰ نے عون بن محمد سے، انہوں نے اپنی ماں اُمّ جعفر سے اور انہوں نے حضرت اسماء بنت عمیس سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......''

یہ روایت نقل کرنے کے بعد امام طحاوی نے لکھا ہے کہ محمد بن موسیٰ جو المدنی ہے اور الفطری کے لقب سے معروف ہے۔ اپنی روایت میں محمود ہے، اور عون بن محمد، عون بن محمد بن علی بن ابی طالب ہے اور ان کی ماں اُمّ جعفر، محمد بن جعفر بن ابی طالب کی بیٹی ہیں۔

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ سند ضعیف ہے اور مجہول ہے اور طحاوی کے قول سے اس کی صحت کا ثبوت نہیں ملتا، بلکہ شاید یہ کہہ کر انہوں نے اس کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے، اس لیے کہ انہوں نے عون بن محمد اور ان کی ماں کی جرح و تعدیل سے خاموشی اختیار کی ہے۔''

یہ حدیث ایک دوسری سند سے مختلف الفاظ میں بھی مروی ہے جس کا ترجمہ ہے:

''رسول اللہ ﷺ اپنا سر مبارک علی کی گود میں رکھے ہوئے تھے اور اسی حالت میں آپ پر وحی نازل ہو رہی تھی ، لہٰذا علی نے عصر کی نماز نہیں پڑھی اور سورج ڈوب گیا، تو نبی ﷺ نے دریافت فرمایا: علی! کیا تم نے نماز پڑھی؟ تو انہوں نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول! نہیں۔ اس وقت آپ نے مذکورہ دعا فرمائی۔''

البانی مزید فرماتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ بیدار تھے اور آپ پر وحی اُتر رہی تھی جبکہ پہلی حدیث میں یہ تصریح ہے کہ آپ سو رہے تھے، جبکہ واقعہ ایک ہے اور واقعہ کی راوی بھی ایک ہیں۔

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اپنی سند کے اعتبار سے تو ضعیف ہے، مگر اپنے متن کے اعتبار سے موضوع ہے اور امام ابن تیمیہ نے بھی اس کے متن کے اعتبار سے اس کے موضوع ہونے کا حکم لگایا گیا ہے اور اس کی سند کو صرف ضعیف کہنے پر اکتفا کیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے سورج کے دوبارہ طلوع ہونے کی حدیث کا ذکر طحاوی اور قاضی عیاض وغیرہ نے کیا ہے اور اس کو نبی ﷺ کے معجزات میں شمار کیا ہے لیکن اہل علم اور حدیث کی معرفت رکھنے والے محققین کو یہ معلوم ہے کہ یہ حدیث موضوع اور جھوٹ ہے جیسا کہ ابن الجوزی نے لکھا ہے۔

امام ابن تیمیہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''سورج غروب ہو جانے کے بعد عصر کی نماز قضا ہو گئی اب بطور معجزہ سورج کے دوبارہ طلوع ہو جانے سے نمازی کے لیے اس کے شرعی وقت میں ادا نہیں ہو گی۔''

اور غزوۂ خندق کے موقع پر نبی ﷺ کی نمازِ عصر بھی قضا ہو گئی تھی اور آپ نے اور آپ کے صحابہ نے اس کو قضا ادا کیا تھا، اور اللہ تعالیٰ سے آپ نے یہ دعا نہیں فرمائی کہ وہ سورج کو دوبارہ واپس لے آئے تاکہ آپ نمازِ عصر اس کے شرعی وقت میں ادا کریں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ، نبی ﷺ سے افضل نہیں تھے لہٰذا جب نبی ﷺ نے اور آپ کے اصحاب نے اسے غروبِ شمس کے بعد ادا کیا، تو علی کے لیے ایسا کرنا اولیٰ تھا۔''

[الضعيفه: ۲/ ۳۹۵، ۴۰۱]

۱۶۰ ...... ((عَنْ أَبِيْ ذَرٍّ ، قَالَ : سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ لِعَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ أَنْتَ أَوَّلُ مَنْ آمَنَ بِيْ، وَأَنْتَ أَوَّلُ مَنْ يُصَافِحُنِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ، وَأَنْتَ الصِّدِّيْقُ الْاَكْبَرُ وَأَنْتَ الْفَارُوْقُ ، تُفَرِّقُ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ ، وَأَنْتَ يَعْسُوْبُ

الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَالُ يَعْسُوبُ الكَافِرِيْنَ))

''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہا: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علی بن ابی طالب سے فرماتے ہوئے سنا ہے۔ تم وہ پہلے شخص ہو جو میرے اوپر ایمان لایا اور قیامت کے دن مجھ سے جو شخص سب سے پہلے مصافحہ کرے گا وہ تم ہو گئے اور تم صدیق اکبر اور فاروق ہو، تم حق اور باطل کے درمیان فرق کرتے ہو، اور تم مؤمنوں کے سردار ہو جبکہ مال کافروں کا سردار ہے۔''

یہ حدیث متردک ہے، اس کی تخریج البزار نے اپنی مسند میں کی ہے، اس کی سند کا ایک راوی عباد بن یعقوب رافضی تھا اور ''مذہب رفضی'' کا داعی تھا۔ حافظ ابن حجر نے ''**مختصر الزوائد، حدیث: ۱۸۹۸**'' میں لکھا ہے:

''اس کی سند بے حد کمزور ہے اس کے ایک راوی محمد بن عبید اللہ پر وضع حدیث کا الزام ہے اور دوسرا راوی عباد بن یعقوب کا بڑے ''روافض'' میں شمار ہوتا ہے۔ اور علی بن محمد بن عراق نے ''**تنزیہ الشریعہ: ۱/۳۵۳**'' میں اس حدیث کی مصیبت محمد بن عبید اللہ کو قرار دیا ہے۔ اور عباد بن یعقوب اگرچہ رافضی تھا لیکن روایت حدیث میں سچا تھا، اور ابن حبان نے عباد پر مشاہیر سے منکر احادیث روایت کرنے کا الزام لگایا ہے۔''

۱۷۰...... ((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ، قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ أَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا ، فَمَنْ أَرَادَ الْعِلْمَ فَلْيَأْتِ الْبَابَ))

''حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں، پس جو علم سے بہرہ ور ہونا چاہیے وہ دروازہ کے پاس آئے۔''

اس حدیث کی کوئی بنیاد اور اصل نہیں ہے، یہ حضرت علی، حضرت عبد اللہ، حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم سے کوئی دس (۱۰) طرق سے مختلف لفظوں میں مروی ہے، اور ہر طرق میں جھوٹے، وضاع اور حدیثوں کا سرقہ کرنے والے راوی شامل ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث پانچ سندوں سے درج ذیل الفاظ میں مروی ہے:

((أَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا)) ''میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔''

((أنا مَدِيْنَةُ الْفِقْهِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا)) ''میں فقہ کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔''

((أنا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا ، فَمَنْ أَرَادَ الْعِلْمَ فَلْيَأْتِ الْبَابَ)) ''میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں، پس جو علم حاصل کرنا چاہے وہ دروازے کے پاس آئے۔''

اس کی تخریج ابونعیم نے ''معرفة الصحابة ، حديث:۳۴۶ '' میں اور امام ترمذی نے ''سنن / مناقب علي، حديث:۳۷۲۳ '' میں کی ہے۔امام ترمذی نے اس کو نقل کرنے کے بعد اس پر غرابت اور منکر ہونے کا حکم لگایا ہے۔

یہ حدیث حافظ السیوطی نے ''اللآلي المصنوعة: ۱/۳۰۲،۳۰۸ '' میں اور ابن عراق نے ''تنزیه الشریعه : ۱/۳۷۷،۳۷۸ '' میں نقل کی ہے اور اس کو موضوع قرار دیا ہے۔اور امام ذہبی نے اس حدیث کے بارے میں ''الترتیب / باب: ۲۴ '' میں لکھا ہے کہ یہ حدیث بعض سادہ لوح محدثین نے روایت کی ہے اور اس کے متعدد طرق ہیں اور حدیث موضوع ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دس (۱۰) طرق سے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے چھ طرق سے یہ حدیث مروی ہے اور ان میں سے کوئی طرق بھی جھوٹے، حدیثیں وضع کرنے والے، حدیثوں کا سرقہ کرنے والے راویوں سے خالی نہیں ہے۔امام ابن الجوزی نے اس جھوٹی اور موضوع روایت کی تمام سندیں اور ان کے راویوں کے حالات ''الموضوعات: ۲/۱۱۰،۱۱۸ '' میں پوری تفصیل سے بیان کر دیے ہیں۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے مناقب اور فضائل کے بارے میں اس طرح کی موضوع، بے بنیاد اور منکر روایتیں دسیوں کی تعداد میں کتابوں میں ملتی ہیں اور چونکہ ان حدیثوں کو وضع کرنے والے، اور ان کو رواج دینے والے عام طور پر شیعہ ہیں، اس لیے ان کی مخالفت میں اہل سنت والجماعت سے نسبت کا دعویٰ کرنے والے بعض اہل قلم اور اربابِ سیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص کا ارتکاب کر بیٹھے ہیں اور ان کے فضائل ومناقب کے بارے میں صحیح احادیث کا بھی انکار کر دیا اور بعض نام نہاد مصنفین نے تو حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کی خلافت تک سے انکار کر دیا یا کم ازکم اس کو مشکوک بنانے کی کوشش کر کے اپنی گندی ذہنیت اور ان سے اپنے بغض کا ظہار کیا ہے۔لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں موضوع روایات کے ذکر کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند ایسی مستند اور صحیح احادیث کا بھی ذکر کر دیا جائے جن سے اُمت میں ان کی عظمت وفضیلت کا اظہار ہوتا ہے۔

امام احمد بن حنبل، اسماعیل القاضی، النسائی اور ابوعلی النیساپوری سے یہ منقول ہے کہ جس کثرت سے

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کے بارے میں صحیح احادیث ملتی ہیں کسی اور صحابی کے بارے میں نہیں ملتیں۔

[فتح الباری : ۱۶۷۹/۲]

((عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ، قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَلِيٍّ أَنْتَ مِنِّيْ وَأَنَا مِنْكَ))

''حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علی سے فرمایا: تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔'' ❶

((عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ : أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَوْمَ خَيْبَرَ: لَأُعْطِيَنَّ هٰذِهِ الرَّايَةَ رَجُلًا يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلَى يَدَيْهِ ، يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ ، قَالَ : فَبَاتَ النَّاسُ يَدُوكُوْنَ لَيْلَتَهُمْ أَيُّهُمْ يُعْطَاهَا ، قَالَ : فَلَمَّا أَصْبَحَ النَّاسُ غَدَوْا عَلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، كُلُّهُمْ يَرْجُوْ أَنْ يُعْطَاهَا ، فَقَالَ : أَيْنَ عَلِيُّ بْنُ أَبِيْ طَالِبٍ؟ فَقَالُو : هُوَ ، يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! يَشْتَكِيْ عَيْنَيْهِ قَالَ : فَأَرْسِلُوْا إِلَيْهِ ، فَأُتِيَ بِهِ، فَبَصَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ عَيْنَيْهِ ، وَدَعَالَهُ ، فَبَرأَ ، حَتَّى كَأَنْ لَمْ يَكُنْ بِهِ وَجَعٌ فَأَعْطَاهُ الرَّايَةَ ، فَقَالَ عَلِيٌّ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أُقَاتِلُهُمْ حَتَّى يَكُوْنُوْا مِثْلَنَا؟ فَقَالَ : أُنْفُذْ عَلَى رِسْلِكَ ، حَتَّى تَنْزِلَ بِسَاحَتِهِمْ ، ثُمَّ أدْعُهُمْ إِلَى الإِسْلَامِ ، وَأَخْبِرْهُمْ بِمَا يَجِبُ عَلَيْهِمْ مِنْ حَقِّ اللّٰهِ فِيْه ، فَوَ اللّٰهِ ، لَأَنْ يَهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَكَ مِنْ أَنْ يَكُوْنَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ))

''حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کے موقع پر فرمایا: میں یہ پرچم ضرور ایسے شخص کو دوں گا جس کے ہاتھوں پر اللہ فتح سے ہم کنار کرے گا اور جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے اور جس سے اللہ اور اس کے رسول محبت رکھتے ہیں۔'' کہا: یہ سُن کر لوگوں نے یہ باتیں کرتے ہوئے رات گزاری کی دیکھو کس کو یہ پرچم عطا کیا جاتا ہے اور جب لوگوں نے صبح کی تو ان میں سے ہر ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ اُمید لے کر حاضر ہوا کہ اسی کو پرچم عطا کیا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: علی بن اُبي طالب کہاں ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اُن کی آنکھوں میں تکلیف

❶ صحیح بخاری: ۴۲۵۱

ہے، آپ نے فرمایا: ان کو بلواؤ تو وہ لائے گئے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی آنکھوں میں تھوک کر ان کے لیے دعا فرمائی تو اس طرح شفایاب ہو گئے گویا اُن کو کوئی تکلیف تھی ہی نہیں ، پھر آپ نے ان کو پرچم عطا فرمایا۔ اس پر علی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا میں ان سے اس بات پر جنگ کروں کہ وہ ہماری طرح ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا: آہستہ آہستہ آگے بڑھو یہاں تک کہ ان کے علاقے میں پہنچ جاؤ، پھر ان کو اسلام کی دعوت دو اور ان کو بتاؤ کہ اسلام میں اللہ کے حق کے طور پر ان پر کیا فرائض ہیں۔ اللہ کی قسم! اگر اللہ تمہارے ذریعہ کسی ایک آدمی کو ہدایت سے سرفراز کرے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے زیادہ بہتر ہے۔''

حضرت عمر فاروق فرماتے ہیں اس دن کے سوا میں نے کبھی امارت کی خواہش نہیں کی، اس دن اس اُمید میں میں نے اپنے آپ کو نمایاں کیا کہ مجھے امارت کے لیے بلایا جائے گا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے علی بن ابی طالب کو بلا کر امارت کا پرچم ان کو عطا فرمایا۔'' ❶

رومی سلطنت سے کشمکش کی ابتداء فتح مکہ سے پہلے ہی ہو چکی تھی، نبی ﷺ نے حدیبیہ کے بعد اسلام کی دعوت پھیلانے کے لیے جو وفود عربوں کے مختلف خطوں میں بھیجے تھے ان میں سے ایک وفد شمال کی طرف شامی سرحد سے متصل قبائل میں بھی گیا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر عیسائی تھے اور رومی سلطنت کے زیرِ اثر تھے۔ ان لوگوں نے اس وفد کے ۱۵ آدمیوں کو قتل کر دیا اور صرف وفد کے رئیس حضرت کعب بن عُمیر غفاری بچ کر مدینہ واپس آئے۔ اس زمانے میں رسول اللہ ﷺ نے بصری کے رئیس شرحبیل بن عمرو کے نام بھی دعوتِ اسلام کا پیغام بھیجا، مگر اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ بر حضرت حارث بن عُمیر رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ شرحبیل عیسائی تھا اور براہِ راست قیصر روم کے احکام کا تابع تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے شرحبیل کو اس کے اس غیر انسانی اقدام پر سبق دینے اور مسلمانوں کے لیے اس علاقے کو امن بنانے کے لیے ۸ ہجری میں میں تین ہزار مجاہدین کی ایک فوج بھیجی جس کے امیر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ تھے۔ صحابہ کرام کا یہ مختصر دستہ ''موتہ'' کے مقام پر شرحبیل کی ایک لاکھ اور ہرقل کی مزید ایک لاکھ فوج سے ٹکرا گیا۔ تین ہزار جاں فروشوں کا یہ مختصر دستہ دو لاکھ تجربہ کار اور تمام ہتھیاروں سے لیس فوج کا مقابلہ کر رہا تھا اس جنگ میں مسلمانوں کے تین امراء زید بن حارثہ، جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے۔ اور مسلمانوں نے بالاتفاق حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اپنا سپہ سالار بنالیا جو صرف چند ماہ قبل مسلمان

❶ صحیح بخاری، حدیث: ۳۰۰۹، ۳۷۰۱۔ صحیح مسلم، حدیث: ۶۲۲۲، ۶۲۲۳

ہوئے تھے۔ حضرت خالد نے اپنی خاص حکمت عملی اور اپنی فوجی مہارت کے ذریعہ مسلمانوں کو دو لاکھ رومی فوج کے جبڑوں سے نکال لیا، جس کو زبانِ نبوت نے فتح کا نام دیا۔ اس موقعہ کے دوسرے سال ۹ ہجری میں نبی اکرم ﷺ کو اطلاع ملی کہ قیصر روم مسلمانوں کو ''موتہ'' کی سزا دینے کے لیے فوجی تیاریاں کر رہا ہے، تو آپ نے تبوک کے مقام پر اس کا مقابلہ کرنے کی غرض سے مسلمانوں کو تیار کرنا شروع کیا۔ اور رجب ۹ ہجری میں تیس (۳۰) کی فوج لے کر شام کی جانب روانہ ہوئے۔ اور مدینہ میں اہل بیت اور مسلمان خواتین اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی غزوہ میں نبی اکرم ﷺ کی معیت کے شرف سے محروم ہو رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں کے ساتھ چھوڑے جا رہے ہیں؟ ایک بہادر اور سراپا سپاہیانہ صفات سے متصف اس عظیم انسان کے اس سوال میں جو کرب مضمر ہے اس کا اندازہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں، لیکن نبی اکرم ﷺ نے ان کو جو جواب دیا وہ بھی ان کے فضائل و مناقب کے باب میں ایک منفرد شان رکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

((أَلَا تَرْضَى أَنْ تَكُونَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَىٰ، إِلَّا أَنَّهُ لَيْسَ نَبِيٌّ بَعْدِي؟)) ❶

''کیا تمہیں یہ پسند نہیں ہے کہ میری نسبت تمہیں وہ مقام حاصل ہو جو ہارون کو موسیٰ کی نسبت حاصل تھا؟''

کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ فضیلت و منقبت کے لیے اس نبوی سند سے بھی بڑی کوئی سند ہو سکتی ہے؟

جو لوگ شیعوں کی مخالفت کی آڑ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقام و مرتبے کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے دلوں میں ان کے لیے بغض و نفرت کے جذبات رکھتے ہیں ان کو درج ذیل ارشادِ نبوی کے آئینہ میں اپنا مکروہ چہرہ دیکھ لینا چاہیے:

((عَنْ زِرٍّ، قَالَ) : عَلِيٌّ: وَالَّذِي فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ إِنَّهُ لَعَهْدُ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ ﷺ إِلَيَّ: أَنْ لَا يُحِبَّنِي إِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا يُبْغِضَنِي إِلَّا مُنَافِقٌ)) ❷

''حضرت زر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس ذات کی قسم! جس نے دانے کو پھاڑ کر اس سے پودا نکالا اور خلق کو وجود بخشا، مجھ سے نبی اُمی ﷺ کا یہ وعدہ ہے کہ مجھ سے

❶ صحیح بخاری، حدیث: ٤٤١٦۔ صحیح مسلم، حدیث: ٦٢٢٠

❷ صحیح مسلم، حدیث: ٢٤٠

صرف مؤمن محبت رکھے گا اور صرف منافق مجھ سے بغض رکھے۔''

نبی اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد آپ کے اہل بیت پر جو افتاد پڑنے والی تھی اور ان کی حرمت جس طرح پامال ہونے والی تھی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی کو اس سے مطلع کر دیا اسی وجہ سے رسول اکرم ﷺ نے اس دنیا سے رخصت ہونے سے قبل امت کو یہ تاکید فرمادی کہ وہ اہل بیت کے بارے میں کوئی بھی موقف اختیار کرتے وقت اللہ تعالیٰ کو اپنے ذہن و دماغ سے کبھی اوجھل نہ ہونے دیں۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ جن کی صدق گوئی اور صحتِ سماعت کی تائید اللہ تعالیٰ نے خود فرمائی اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ قَدْ صَدَّقَكَ يَا زَيْدُ)) [1]

''اے زید! بیشک اللہ نے تمہاری تصدیق فرمادی ہے۔''

فرماتے ہیں:

''ایک دن رسول اللہ ﷺ نے مکہ اور مدینہ کے درمیان خم نامی چشمے کے پاس ہمیں خطبہ دیا۔ اس میں آپ نے اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور ہمیں وعظ ونصیحت فرمائی۔ پھر آپ نے فرمایا:

((أَلَا أَيُّهَا النَّاسُ! فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ ، يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ رَسُولُ رَبِّي ، فَأُجِيبَ ، وَأَنَا تَارِكٌ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ: أَوَّلُهُمَا كِتَابُ اللّٰهِ فِيهِ الْهُدَى وَالنُّور ، فَخُذُوا بِكِتَابِ اللّٰهِ ، وَاسْتَمْسِكُوا بِهِ فَحَثَّ عَلَى كِتَابِ اللّٰهِ وَرَغَّبَ فِيهِ ، ثُمَّ قَالَ: وَأَهْلُ بَيْتِي ، أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي ، أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي ، أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي)) [2]

''اے لوگو! خبردار میں بشر کے سوا کچھ نہیں ہوں۔ قریب ہے کہ میرے رب کا قاصد آجائے اور میں اس پر لبیک کہوں میں تمہارے اندر دو نہایت گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ ان میں پہلی چیز اللہ کی کتاب ہے، جس میں ہدایت اور روشنی ہے، تو اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہنا۔ حضرت زید فرماتے ہیں: نبی ﷺ اللہ کی کتاب پر لوگوں کو ابھارا اور اس کی ترغیب دلائی، پھر فرمایا: اور میرے اہل بیت، میں تم لوگوں کو اپنے اہل بیت کے بارے میں

[1] صحیح بخاری، ح: ۴۹۰۰، صحیح مسلم، ح: ۷۰۲۴
[2] صحیح مسلم، ح: ٦٢٢٥

اللہ کو یاد دلاتا ہوں، میں تم لوگوں کو اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ کو یاد دلاتا ہوں، میں تم لوگوں کو اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ کو یاد دلاتا ہوں۔''

جب حضرت زید سے پوچھا گیا، کہ نبی ﷺ کے اہل بیت سے کون مراد ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: آپ کے اہل بیت سے وہ لوگ مراد ہیں، جن پر نبی ﷺ کے بعد صدقہ حرام ہے، اور وہ آل علی، آل عقیل، آل جعفر اور آل عباس ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں صدقہ لینا حرام ہے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ استنباط بالکل صحیح اور مطابق واقعہ ہے۔ کیونکہ جب ''آیتِ مباہلہ'' نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ:

﴿ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ قف ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (61) ﴾ [آل عمران: ٦١]

''تمہارے پاس علم آجانے کے بعد، جو کوئی عیسیٰ کے معاملے میں تم سے جھگڑا کرے، تو اس سے کہہ دو کہ آؤ ہم اور تم اپنے بچوں کو، اپنی عورتوں کو اور اپنے آپ کو بلائیں پھر اللہ سے دعا کریں کہ جو جھوٹے ہیں ان پر اللہ کی لعنت ہو۔''

یہ حکم ربانی نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو بلایا اور فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ أَهْلِي)) [1]

''الٰہی! یہ ہیں میرے اہل۔''

اوپر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب کے بارے میں جو چند صحیح احادیث نقل کی گئی ہیں، ان سے امت میں ان کے صحیح مقام ومرتبے کا تعین ہو جاتا ہے ان حدیثوں سے بصراحت یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی سے محبت ایمان کی علامت اور ان سے کسی بھی درجے میں بغض ونفرت نفاق کی علامت ہے۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ کے ان ارشادات کے آئینے میں ان لوگوں کے کردار کا تعین کیا جا سکتا ہے، جنہوں نے مسئلہ خلافت سے متعلق ان کے بارے میں اپنے بغض وکراہیت کا اظہار کر دیا ہے۔ اور ان کی ''خلافت'' کو ''باغیوں کی حکومت'' کہہ کر اپنی عاقبت خراب کر لی ہے اور اس خلیفۂ راشد کی فضیلت وعظمت کو گھٹانے کی غرض سے تاریخی واقعات کے بیان میں حد درجہ بد دیانتی سے کام لیا ہے۔ اس بحث کے ''مسک الختام'' کے

[1] صحیح مسلم، ح: ٦٢٢٠

طور پر ذیل میں ایک صحیح حدیث نقل کر دینا چاہتا ہوں۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ اس بات کو سخت ناپسند فرماتے تھے کہ لوگ حضرت علی پر تنقید کریں اور ان کی ذات میں کیڑے نکالیں۔

امام ترمذی نے "سنن، ح: ۳۷۱۲، ۳۷۱۳" میں امام نسائی نے "الخصائص، ص: ۱۳، ۱۶، ۱۷" میں، امام ابو حاتم ابن حبان نے اپنی "صحیح، حدیث: ۲۲۰۳" میں، امام الحاکم نے "المستدرك: ۱۱۰/۳" میں، الطیالسی نے اپنی "مسند: ۸۲۹" میں، امام احمد نے "مسند، ح: ۲۰۱۷۰" میں اور امام ابن عدی نے "الکامل: ۵۶۸/۲، ۵۶۹" میں "عن سلیمان الضبعی عن یزید الرِّشلك عن مطرف عن عمران بن حصین رضی اللہ عنہ" کی سند سے یہ روایت نقل کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب کی سربراہی میں ایک فوجی دستہ کسی فوجی مہم پر بھیجا۔ اس مہم کے دوران حضرت علی نے ایک لونڈی کو اپنے لیے خاص کر لیا تو لوگوں نے اس فعل کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور چار صحابہ نے آپس میں یہ طے کیا کہ جب وہ رسول اللہ ﷺ سے شرف ملاقات حاصل کریں گے تو آپ کو حضرت علی کے اس فعل سے آگاہ کریں گے، مسلمانوں کا یہ معمول تھا کہ جب وہ سفر سے واپس ہوتے تو سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ سے شرف سلام حاصل کرتے، پھر اپنے گھروں کا رخ کرتے، چنانچہ جب فوجی دستہ واپس مدینہ پہنچا تو نبی ﷺ کی خدمت میں سلام کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ اس وقت اُن چاروں میں سے ایک نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ علی نے ایسا اور ایسا کام کیا؟ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے ان صحابی سے اعراض فرمایا۔ پھر دوسرے صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے بھی وہی بات کہی جو پہلے نے کہی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی بات سے بھی اعراض فرمایا۔ پھر تیسرے اٹھے اور انہوں نے بھی وہی بات کہی، اس وقت بھی آپ نے اعراض فرمایا۔ پھر چوتھے اٹھے انہوں نے بھی وہی بات کہی جو تینوں نے کہی تھی، اس وقت رسول اللہ ﷺ ان کی طرف متوجہ ہوئے درانحالیکہ غصہ آپ کے چہرۂ مبارک سے عیاں تھا۔ آپ نے فرمایا:

((مَا تُرِيْدُوْنَ مِنْ عَلِيٍّ؟ مَا تُرِيْدُوْنَ مِنْ عَلِيٍّ؟ مَا تُرِيْدُونَ مِنْ عَلِيٍّ؟ إِنَّ عَلِيًّا مِنِّيْ وَأَنَا مِنْهُ ، وَهُوَ وَلِيُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدِي))

"تم لوگ علی سے کیا چاہتے ہو؟ تم لوگ علی سے کیا چاہتے ہو؟ تم لوگ علی سے کیا چاہتے ہو؟ بیشک علی مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ اور میرے بعد وہ ہر مومن کا دوست اور خیر خواہ ہے۔"

اور حضرت بریدہ سے ان کے بیٹے عبداللہ کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے شکایت کرنے والے سے منع فرمایا:

((لَا تَقَعُ فِيْ عَلِيٍّ ، فَإِنَّهُ مِنِّيْ وَأَنَا مِنْهُ ، وَهُوَ وَلِيُّكُمْ بَعْدِيْ ، وَإِنَّهُ مِنِّيْ وَأَنَا مِنْهُ ، وَهُوَ وَلِيُّكُمْ بَعْدِيْ)) [1]

علی میں عیب نہ نکالو، کیونکہ وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں اور وہ میرے بعد تمہارا ولی ہے۔ اور وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں اور وہ میرے بعد تمہارا ولی اور دوست ہے۔"

اور حضرت زید بن ارقم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ ، وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ)) [2]

"میں جس کا مولیٰ ہوں، علی اس کا مولیٰ ہے۔ اے اللہ! تو اس کو دوست بنا جو اس سے محبت کرے اور اس سے دشمنی کرے جو اس سے عداوت رکھے۔"

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

"یہ حدیث زید بن ارقم، سعد بن ابی وقاص، بریدہ بن الحصیب، علی بن ابی طالب، ابو ایوب الانصاری، البراء بن عازب، عبداللہ بن عباس، انس بن مالک، ابوسعید الخدری اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔" [الصحیحہ، ح : ۱۷۵۰، ۴/ ۳۳۰، ۳۴۴]

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ

كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ.

1 مسند احمد، ح: ۲۳۰۳۴

2 مسند، ح: ۱۹۵۴۱، ۱۹۵۴۳